منظور شدہ محکمہ تعلیمات کراچی بموجب سرکلر نمبر ڈی ای / آر جی ڈی / ۳-۵۸۰۳-۵۱۰۰۲ مورخہ ۲۶ ستمبر ۱۹۶۰ء

290-F

اردو ادب کا ڈائجسٹ

نقش کراچی

۱ — ۶۵

جنوری ۱۹۶۵ء

ادارہ

شاہد احمد دہلوی۔ شمس زبیری

33495

15.6.76

قیمت ایک روپیہ — سالانہ بارہ روپے

کاشانۂ اردو۔ پوسٹ بکس ۷۳۰۲۔ کراچی ۳

فون نمبر ۲۰۱۵۶

ترتیب

افسانے

منظومات

طنز و مزاح

مضامین

عسکری

ہمارے سب سے بڑے قومی مسئلے پر ایک فکر انگیز کتاب

پاکستانی کلچر

قومی کلچر کی تشکیل کا مسئلہ

از **جمیل جالبی**

"یہ تصنیف اپنے موضوع کی اہمیت، اپنی معنوی خوبی اور فاضل مصنف کی خوشدلانہ کاوش کے لحاظ سے بڑی قابل قدر تصنیف ہے اس کی زبان اس کا اسلوب بیان اس قدر شگفتہ، سلیس و دلکش ہے کہ وہ ایک دلچسپ داستان معلوم ہوتی ہے۔"

——— علامہ نیاز فتحپوری

"اس کتاب میں بے شمار مسائل ہیں جو توجہ طلب ہیں۔ خدا کرے کہ یہ کتاب تعلیم یافتہ لوگوں کو بیدار کر دے۔"

——— ڈاکٹر سید عبد اللہ

"پہلی مرتبہ اس ملک کے ایک دانشور کو یہ سعادت نصیب ہوئی کہ وہ اس مشکل مسئلہ پر ایسی مدلل اور تفصیلی بحث کرے۔ یہ کتاب خیال و اظہار کی آزادی کی قابل تعریف مثال پیش کرتی ہے"

——— ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری

"جمیل جالبی صاحب نے جس طرح مسئلہ کی پیچیدگیوں کا تجزیہ کیا ہے۔ وہ اپنی جگہ نہایت سنجیدہ اور ہوشمندانہ ہے۔"

——— محمد حسن عسکری

اس دور کی ایک بہترین کتاب جسے ۱۹۶۴-۶۵ء کا داؤد ادبی انعام بھی ملا

قیمت ۸/=

ناشر۔ مشتاق بکڈپو۔ شیلڈن روڈ۔ نزد اردو کالج۔ کراچی

ستیہ پرکاش سنگر

افکار۔کراچی

درد سوا ہوتا ہے

"میں اس بات کو کہے بنا نہیں رہ سکتا۔ کہ ملک کی حالت دن بدن خراب ہوتی جا رہی ہے۔" لالہ گردھاری لال نے لفافے میں سے برفی نکال کر طشتریوں میں رکھتے ہوئے کہا۔ لفافہ ردّی کاغذوں سے بنا تھا اور سیاہی کے داغ برفی پر بھی لگ رہے تھے۔ لالہ جی نے برفی چار طشتریوں میں رکھی ایک بڑے دونے میں سے گلاب جامن نکال کر دوسری طشتریوں میں رکھے۔ ایک لفافے میں سے سموسے نکال کر ایک ہی طشتری میں ڈال، چینی کی پلیٹ اُس کے پاس رکھدی۔ پھر بولے۔

"پروفیسر صاحب شروع کیجئے۔"

آٹھ گھنٹے کی بس یاترا کے بعد میں اس شہر میں لکچر دینے کے لئے پہنچا تھا۔ وہاں پہنچتے ہی میزبان نے مجھ سے کھانے کے لئے پوچھا۔ ہندوستانی معاشرت کے مطابق میں نے ایک بار اس لئے انکار کیا کہ وہ دوسری بار اصرار کریں گے۔ لیکن انھوں نے صرف مجھے آرام فرمانے کے لئے کہا۔ اور چلے گئے ایک چھوٹے قصبے میں ڈاک بنگلے کا وجود معمولی بات نہ تھی۔ لیکن یہ بنگلہ انگریزی سرکار کی برکت کا نتیجہ تھا۔ چوکیدار بھی تھا۔ پنکھے تھے۔ بجلی تھی۔ نواڑی پلنگ تھا۔ بستر میں لے نہیں گیا تھا۔ وہاں سے ملنے کا سوال نہیں پیدا ہوتا تھا۔ سر کے نیچے تولیہ اور پیٹ پر چادر باندھ میں سو گیا۔ لیکن اتنی محنت تکان کے بعد نیند بھی غائب ہو گئی۔ یا اس وجہ سے نہیں آرہی تھی، یا شاید بھوک کے کارن غائب تھی۔ جالی کا دروازہ بند نہیں ہوسکتا تھا۔ باہر کھیلتے ہوئے چھوٹے بچے اس چڑیا گھر کے نووارد جانور کو دیکھنے کے لئے جھانکنے لگے۔ پورے پانچ بجے میزبان صاحب تشریف لائے اور بولے

"چائے تیار ہے!"

"میں بھی تیار ہوں۔" میں نے کہا۔

"چلئے!"

"کہاں؟"

"چائے پینے۔"

"کہیں باہر؟"

"ہاں سیٹھ نگر لالہ گردھاری لال مہاجن کے یہاں۔"

لیکن ہم ان کے ہاں نہیں، ان کی دکان پر گئے۔ باہر ان کے نام کا بورڈ تھا۔ گردھاری لال۔ بی اے۔ اس کے اوپر ایک بڑا بورڈ تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ایک سیمنٹ کمپنی کے ایجنٹ ہیں۔ دکان کے اندر ایک طرف گدے بچھے تھے۔ اس پر گاؤ تکیے لگے تھے۔ بائیں دیوار کے ساتھ ایک بنچ پڑا تھا، سامنے میز رکھی تھی۔ اور اس کے اردگرد کرسیاں تھیں۔ پرانی، مڈل اور جدید تہذیب کی کیا خوب آمیزش تھی۔ وہ خود کالے رنگ کے تھے لیکن سفید بش شرٹ پہنے تھے۔

ہمارا استقبال کرنے کے بعد انہوں نے لڑکے سے چائے لانے کو کہا۔ لیکن چائے کی بجائے وہ مٹھائی اور سموسے لے آیا۔ یہاں بھی مٹھاس اور نمکین کالی گلاب جامن اور سفید برفی کی آمیزش تھی۔ مجھے ان تینوں چیزوں میں سے کوئی بھی پسند نہیں۔ گلاب جامن اور برفی دانتوں کے لئے اور سموسے پیٹ کے لئے مضر ثابت ہوتے ہیں۔ کم از کم حکیم صاحب کا یہی مشورہ ہے کہ میں ان تینوں سے پرہیز کروں۔ لیکن بھوک کی شدت اور حکیم صاحب کی عدم موجودگی نے مجھے پرہیز گاری سے ہٹا کر ان کی طرف توجہ کے لئے آمادہ کیا۔

"حالات ٹھیک نہیں" مہاجن صاحب کی آواز میرے کان میں پڑی۔

"شاید نہیں ہیں۔ اس لئے تو مجھے پانچ بجے تک بھوکا رہنا اور اب ان تینوں ممنوعہ اشیاء سے پیٹ بھرنا پڑا۔

"امیر امیر اور غریب غریب ہوتے جا رہے ہیں"

"یہ بات تو میں نے پہلے بھی سنی ہے" میں نے رومال سے منہ پونچھتے ہوئے کہا۔

"سبھی سمجھدار لوگ ایسا کہیں گے" وہ بولے "ارے لڑکے چائے لا"

"شاید وزیر اعظم نے بھی ایسا کہا تھا"

"سبھی سمجھدار لوگ ایسا کہیں گے"

"لیکن ایسا کیوں ہو رہا ہے؟"

"اس لئے کہ آپا دھاپی مچی ہے۔ کوئی کام نہیں ہو رہا۔ کوئی ترقی نہیں ہو رہی"

"ایسا مت کہئے" میں نے ازراہ احتجاج کہا "اتنے کارخانے بن رہے ہیں۔ فولاد کے کارخانے، سیمنٹ، کھاد کے کارخانے، کپڑے کے کارخانے اور نہ جانے کن کن چیزوں کے کارخانے بن رہے ہیں؟ دیش ترقی کی راہ پر گامزن ہے اور آپ [illegible] منکر ہیں"

"اجی صاحب، کوئی ترقی نہیں ہو رہی، ہم جہاں تھے وہیں ہیں جو حالت انگریز کے زمانے میں تھی۔ اب اس سے بدتر ہے۔ لے آئے چائے؟ لاؤ۔ یہاں رکھو میرے پاس"

انہوں نے ان دقیانوسی سفید پیالوں میں کالی کالی چائے انڈیل دی۔ سب کی طرف سے پہلے بڑھائے اور میرے میزبان مسٹر وشنو شرما سے مخاطب ہوئے۔

"کیوں شرما صاحب! آپ کا کیا وچار ہے؟"

"میں تو آپ سے سو فیصدی رضامندی کا اظہار کرتا ہوں اور یہ پہلی بار نہیں"

انہوں نے چائے کا گھونٹ پیتے ہوئے کہا۔

"آپ بھی شروع کیجئے پروفیسر صاحب!"

میں نے پیالی کو منہ سے لگایا۔ اور چائے کا گھونٹ بھرا۔ دل نے کہا "حلق میں لے جانے کے بجائے اسے باہر تھوک دو۔ یا اندر سفید چاندنی ہی پر تھوک دو۔ چائے کی پیالی دیوار پر دے مارو" لیکن اپنے دل کو مجھ سے بڑھ کر دوسرا کوئی نہیں جانتا۔ ہمیشہ... بچپن ہی سے

"لیکن ایسی سزاؤں کے ملنے پر اُن زمانوں میں جرم کم ہو گئے ہوں، ایسا بھی نہیں" میں نے کہا۔

"واہ پروفیسر صاحب، آپ کیسی بات کر رہے ہیں؟ سخت سزا ملنے پر جرم کا اعادہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کیوں شرما صاحب؟"

لیکن شرما صاحب اس وقت مرچی والا سموسہ نگل چکے تھے۔ اور بطور کفارہ اپنی آنکھوں کو رومال سے پونچھ رہے تھے ان اہم معاملات کیطرف متوجہ ہونے کے سبب ان کا دھیان ملکی مسائل سے ہٹ گیا تھا۔ بولے۔

"کیوں نہیں، کیوں نہیں!"

"کیوں نہیں کیا؟" گردھاری لال جی نے پوچھا۔

"آپ بجا فرماتے ہیں" انہوں نے جواب دیا۔

"میں تو اس بات کے حق میں ہوں" سیٹھ جی انھیں نظر انداز کرتے ہوئے بولے "کہ جب تک مجرم کو پبلک میں لا کر عبرت ناک سزا نہ دی جائے گی۔ بے ایمانی جیسے خطرناک مرض کا علاج ایک دم ناممکن ہے۔ پھر آنا۔ ابھی جاؤ" انہوں نے ہوا میں ہاتھ گھماتے ہوئے، دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے گردن گھما کر دیکھا۔ دروازے میں دو اشخاص کھڑے تھے۔ دیہاتی قسم کے، سروں پر پگڑیاں رکھے، کالروالی کھدر کی قمیض پہنے اور تہمد باندھے۔

میں نے کہا "ابھی جاؤ۔ چلو۔ چلو"

وہ چلے ضرور۔ لیکن باہر جانے کے بجائے وہ کمرے کے اندر آ گئے۔ اور بنچ پر بیٹھ گئے۔ سیٹھ جی نے انھیں نظر انداز کر کے اپنی تھیوری کی الاپ لگائی۔

"اس بے ایمانی نے ملک کا بیڑہ غرق کر دیا۔ چاروں طرف رشوت اور خیانت کا بول بالا ہے۔ کنبہ پروری اور اقربا پروری کا زور ہے۔ اور اس کا علاج ایک ہی ہے، بے ایمان افسروں کو سنگین سزا دی جائے۔ انہیں پبلک کے سامنے عبرت ناک سزا ملنی چاہئے۔

"سیٹھ جی! ہمیں جلدی ہے"

"پھر آنا"

"یہ نہیں ہوگا۔ ہم ابھی لے کر جائیں گے"

"اچھا ایک گھنٹہ رک جاؤ"

"ہمارے پاس وقت نہیں"

"اچھا آگے آؤ" "پروفیسر صاحب معاف کرنا" "ہاں، کہاں ہے درخواست؟"

"یہ رہی"

"تو ابھی دو بوریاں دے دیتا ہوں"

"ہمیں بیس چاہئیں"

"اچھا تین لے لو"

"ہمیں تو بیس چاہئیں"

"بیس نہیں دے سکتا"

"ہمیں پرمٹ لے چار ماہ ہو گئے۔ اس کے بعد کھولا گاؤں کے نمبردار کو آپ نے پچیس بوریاں دیں۔ منادواں خورد کا زمیندار آپ سے بیس بوریاں

چاول کلاں کے بنئے کو پچھلے ماہ چالیس بوریاں دیں۔ یہ سب بوریاں کہاں سے آگئیں؟ بعد میں پرمٹ لینے والے ہم سے پہلے کیسے نپٹ لئے گئے؟"

"ان سب باتوں سے تمہیں کوئی واسطہ نہیں۔"

"یہی تو آپ کی بھول ہے اور ہم اس بھول کو دور کرنے آئے ہیں۔"

"لیکن میرے پاس ابھی بوریاں نہیں۔ اگر آپ کو بہت ضروری چاہئیں تو میں کسی دوسری جگہ سے دلوانے کی کوشش کر سکتا ہوں۔ لیکن شاید دام زیادہ دینے پڑیں گے۔"

"خیر ہم آپ سے اتنی گذارش کرنے آئے ہیں۔ کہ ہم ابھی ڈی سی صاحب کے پاس جا رہے ہیں۔ اور انہیں سارے معاملے سے آگاہ کریں گے۔"

"ابھی جایئے، سیٹھ گردھاری لال ایسی باتوں سے نہیں ڈرتا۔"

"تو بے کرم جی کی۔"

اور دونوں جانے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے

"اچھا۔ اچھا۔ ذرا رکو۔ بیٹھو۔"

"لالہ جی۔ اب یہ بلیک مارکیٹ والا معاملہ نہیں چلے گا۔ نئے ڈی سی تک ہماری بھی رسائی ہے وہ ہماری ہی برادری کا ہے۔"

"کون چودھری بنواری لال؟"

"جی چودھری بنواری لال۔"

"اچھا۔ اچھا۔ رکو۔"

پھر وہ پوری سنجیدگی سے مجھ سے مخاطب ہو کر بولے۔

"اچھا پروفیسر صاحب۔ آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ آپ پڑھے لکھوں سے بحث کر کے بہت لطف آتا ہے۔"

پھر وہ کرسی پر سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

مجھے بھی اٹھنا پڑا۔

انہوں نے اپنا دایاں ہاتھ مصافحے کے لئے بڑھایا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے ان کی تقلید میں ایسا کرنا پڑا۔

"اچھا نمستے۔ انہوں نے میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے اور فوراً بعد اسے رہائی دیتے ہوئے کہا۔" اب میں ذرا بزنس کی طرف بھی توجہ دے لوں۔ آپ جیسے لوگوں سے بحث کر کے دماغی قوت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اچھا نمستے۔ انہوں نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

چائے ادھوری چھوڑ کر میں شرما صاحب کے ساتھ باہر نکل آیا۔ اور سڑک پر آکر اپنی دماغی قوت کا اندازہ لینے لگا۔ اس میں [illegible] نہ ہوا تھا۔ ہاں معلومات کا خزانہ پہلے سے بڑھ گیا تھا۔

فکرِ نو کا ترجمان

سہ ماہی سیپ کراچی

کا چوتھا شمارہ عہد آفریں تب و تاب کے ساتھ شائع ہو گیا

واجدہ تبسم

آجکل دہلی

راہ

دالان کی پچھلی طرف سے نرگس دوڑتی ہوئی اور ہانپتی ہوئی بولی۔ "اے بی بی جلدی کیجئے، جلدی چلئے صنوبر بچہ دے رہی ہے۔"

بڑی بیگم نے ایک زوردار دھڑاک کے ساتھ پاندان کے ڈھکنے کو گرایا اور کچھ مسکراتی کچھ جھلاتی ہوئی بولیں۔

"آج اس کی شادی کر دو تو اگلے برس بچہ جننے کو تیار ہو جائے۔ اور دیکھو تو کم بختیا کو بات کرنے بھر کا سلیقہ نہیں۔ میں پوچھوں کیوں ری بچہ بھینس دیتی ہے یا عورت۔؟"

ماما نے ہنس کر بی بی کی بات سے بات ملائی۔ "بی بی یہ آپ کا لاڈ پیار ہی تو ہے کہ شادی کے قابل ہوتے ہوتے بھی سب اپنے آپ کو بچہ ہی جانتے ہیں اور بات کرنے کی گت بھی نہ آئے ہے۔"

مگر ماما کی بات پوری ہونے سے قبل ہی بڑی بیگم لپک جھپک انگلی سے ہلکا چونا چاٹتی نوکر خانے تک پہنچ چکی تھیں۔ وہاں دیکھا تو سچ مچ صنوبر کا حال تباہ تھا۔ درد کی شدت سے اس کا منہ پہلے سے ہرا نیلا پڑ چکا تھا۔ دائی اپنی سی کوشش کر کے ہار چکی تھی۔ صنوبر کا حال دیکھا نہ جاتا تھا۔ یہاں سے وہاں تک جتنی مامائیں، نوکرانیاں، ان کی ملنے جلنے والیاں تھیں سب بدحواس۔ سبھوں کی زبانیں آپ ہی دعا مانگے جا رہی تھیں۔

"مولی نور خاں کا باغ ہنستا رکھیو۔!"

"خدایا بچپن ہے، ارمان بھری جان ہے اپنا فضل کریو۔"

خود نور خاں باہر کھڑا ہوا جو اپنے ہاتھ مل رہا تھا کیسے کیسے ارمانوں سے چاؤ چونچلوں سے بیاہ کر لایا تھا۔ ابھی سال بھی تو نہ گزرا تھا۔ دھان پان سی لڑکی نو مہینے بچہ کو سنبھالتے سنبھالتے پیلی پڑ چکی تھی۔ اللہ نے اسے اتنی استطاعت دی ہی نہیں تھی کہ پھل پھلاری دودھ گھی کھلا کر حاملہ کو صحت کی طرف [illegible] اور نہ بہبود سے کے دن جس طرح گزرتے ہیں ایسے ہی نور خاں اور صنوبر کے بھی گزر رہے تھے۔ ہاسپٹل لے جانے کا حویلی میں نہ تو رواج تھا نہ [illegible] کی ضرورت ہی سمجھی۔ اپنے ابا اور دادا سبھی کو ان سے ہاسپٹلوں میں جنم لیا تھا کہ ہم انگریز میموں سے مشورے لیتے رہیں۔

"ارے خدایا مر گئی۔ مولی میری مشکل آسان کر دے۔" صنوبر کی باریک اور تیز چیخ خدایا نے سن لی اور واقعی اس کی مشکل آسان کر دی۔ صنوبر کی چیخ کے ساتھ ہی ایک اور ننھی منی سی چیخ اس دنیا میں گونجی۔ دائی نے اعلان کیا۔ "بیٹی۔"

لیکن دائی کی بات سننے کی کسی کو فرصت نہ تھی۔ سبھی اور خاص طور سے بڑی بیگم اس خون کی ندیا کو سہم کر دیکھے جا رہی تھیں جس میں کسی کی زندگی کی ناؤ ڈولتی ڈگمگاتی جا رہی تھی۔ ڈوبی جا رہی تھی۔

"ہائے متیا" دائی سہم کر بولی۔ "دیکھنے دکھانے کو تو سوکھے پتے سار پیلی تھی اور یہ ندی — ؟"

بڑی بیگم حیران و پریشان پتھر سی مورت بنی کھڑی تھیں۔ وہ بڑی ہی حوصلے والی عورت تھیں۔ پریشانیوں کو مسکرا کر ٹال جانے والی۔ بڑے سے بڑے اور کٹھن سے کٹھن لمحات بھی ان کی مسکراہٹ کو ملیامیٹ نہیں کر سکتے تھے۔ ان کی سوچ کا اندازہ سب سے نرالا تھا۔ اگر وہ یوں ہمت والی نہ ہوتیں تو اپنی اتنی زندگی بغیر مرد کے سہارے کے یوں نہ گزار سکتیں۔ ان کی ساری زندگی یونہی گزر رہی تھی کہ ایک دیوار آڑ باز و گھنگھرو چھنک رہے ہیں اور طبلہ دھنک رہا ہے۔ اس چھن چھن اور دھن دھن کے ہتھوڑے زندگی بھر اس دل پر ایسے پڑے کہ وہ فولاد بن کر رہ گیا۔ مگر اس وقت وہ سارے حوصلے بھول چکی تھیں — یہ نہیں کہ انہوں نے آج تک کوئی موت نہ دیکھی ہو — کون بشر ایسا ہوگا جس نے اپنی زندگی میں دو ایک بار حیات کا تار ٹوٹتے نہ دیکھا ہوگا۔ بڑی بیگم بھی کوئی الگ نہیں تھیں لیکن زندگی کا یہ روپ وہ آج پہلی بار دیکھ رہی تھیں جب کوئی اپنے جیون کا سارا رس کسی ایک ننھے منے پودے کو دے دیتا ہے کہ وہ پھلے پھولے اور خود فنا ہو جاتا ہے۔

بڑی بیگم نے بچوں کے سے ڈر جانے والے جذبے کے ساتھ سہم کر صنوبر کی طرف دیکھا جس کا سونے کی طرح پیلا اور دمکتا ہوا چہرہ ابھی ابھی دائی نے سرخ چادر سے ڈھک دیا تھا۔ وہ سہاگن مری تھی نا؟ اُسے ایک دلہن کی طرح پورے سنگار، چاؤ اور سرخ لباس میں دفنایا جائیگا اُسے ایک بار پھولوں کا گہنا پہنایا جائے گا۔ ایک بار پھر اس کا دولہا اس کی ڈولی کو سہارا دے گا۔ وہ دلہن بن گئی ہے نا!

بڑی بیگم نے لرز کر دیکھا۔ سامنے اس کا دولہا کھڑا تھا۔ ابھی سال بھر پہلے جب بڑی بیگم خود بیٹے کی طرح پال پوس کر جوان کئے ہوئے اس بیٹے کو دولہا بنا کر دلہن بہو کو لانے کے لئے گئی تھیں تو یہی چہرہ خوشیوں اور امیدوں سے کس طرح چڑھتے سورج کی طرح جگ مگ جگ مگ کر رہا تھا۔ آج چہرے کا سورج غروب ہو چکا تھا اور دل کی وادیوں میں گھٹا ٹوپ اندھیروں کا راج تھا۔ دائی نے ننھی منی سی گڑیا کو چادر میں لپیٹ کر باپ کی گود میں دے دیا۔

باپ نے ایک لمحہ کو اسے دیکھا اور دوسرے ہی لمحے وہ پھپھک کر عورتوں کی طرح رو پڑا۔

"میں اسے کیسے پالوں گا۔ امی کیا کروں۔ خدایا!"

ایک دم بڑی بیگم ہوش میں آگئیں۔ میاں کی بے وفائی سے ٹوٹا دل انہوں نے سدا اسی طرح جوڑنے کی کوشش کی تھی کہ سدا دوسروں کے کام آنا۔ یہ چیز رفتہ رفتہ ان کی عادت، ان کی فطرت بن گئی اور اب یہ تھا کہ خدا ترسی کا ایسا جذبہ ان کے دل میں گھر کر چکا تھا کہ وہ کہیں ایسے موقع پر پیچھے نہ ہٹیں۔ ان کی اپنی تو لے دے کے دو ہی اولادیں ہوئی تھیں جو جوان ہونے کے بعد بیاہی بھی جا چکی تھیں۔ بیٹی اپنے گھر کی تھی اور بیٹا اپنی بیوی کے ساتھ گاؤں میں چھوٹے سے رجواڑے کو سنبھالے ہوئے تھا۔ اور بڑی بیگم کی زندگی کا اب یہی مصرف تھا کہ کسی یتیم لڑکی کو لے کر پال لیا کسی ناجائز اولاد کو کلیجے سے لگا لیا۔ کوئی بھیک منگی منگتی منگاتی حویلی کے دروازے پر آ نکلی تو اسے اپنے دامن میں پناہ دے دی۔ کسی نے لجا جت سے دو روٹی مانگی تو انہوں نے گھر کا کونا ہی دے دیا۔ بے پناہ دولت کا انہوں نے یہی خرچ کا ذریعہ بنا رکھا تھا۔ ان کی حویلی کیا تھی اچھا خاصا لنگر خانہ تھا۔ پھر یہ تھا کہ پالی پوسی لڑکیوں لڑکوں کی شادی خود ماں بن کر کر رہی ہیں۔ زچگیوں میں عمل دخل دے رہی ہیں۔ کسی کی بسم اللہ کا ہنگامہ رچا رہی ہیں۔ کسی کی ختنہ کا دھوم دھڑکا مچا رکھا ہے۔ ایسے میں وہ گھونگھرو کے چھناکے اور طبلے کے دھماکے بالکل بھول چکی تھیں۔ وہ سوچتیں میرا دل تو دنیا میں بہل ہی گیا عاقبت بھی خدا ضرور روشن کر دے گا۔ کسی یتیم بچے کے سر پر ہاتھ پھیر دینے سے اتنی ہی نیکیاں شمار ہوتی ہیں جتنی کہ اس کے سر پر بال — تو یہاں صرف سر پر ہاتھ پھیرنے کا سوال تو نہ تھا۔ وہ تو جسے بھی اپنی گود میں ایک بار لے لیتیں خدا کے بعد یہ اس کا واحد سہارا بن جاتیں۔ اس کی زندگی سنوار دیتیں۔ اس کی خوشیاں ان کی اپنی خوشیاں ہو جاتیں اور اس کا ہلکا سا غم بھی ان کی آنکھوں سے گنگا جمنا بہا دیتا۔ نور خاں بھی انہیں کا پروردہ تھا۔ بعد میں تھوڑا بہت پڑھا لکھا کر انہوں نے اسے اپنی زمینوں کا حساب رکھنے کے لئے منشی کا درجہ دے دیا تھا۔ اس کی شادی بھی انہوں نے ہی اپنی پسند سے پارسال ہی کروائی تھی

انھوں نے سوچا بھی نہ تھا کہ ننھی بہار سے بھری یہ بگیا دم بھر میں یوں اجڑ کر رہ جائے گی!

نور خاں حویلی سے ملحق، مگر ایک کمرے میں اپنی بیوی کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کی حیثیت نوکروں کی سی نہ تھی۔ وہ پڑھا لکھا تھا اور دوسروں کے علاوہ وہ خود بھی اپنے آپ کو اوروں سے ذرا ممتاز سمجھتا تھا۔ اس نے بڑی بیگم سے کہہ رکھا تھا اور بڑی بیگم نے وعدہ بھی کر لیا تھا کہ صنوبر کے ماں بننے کے بعد وہ ایک چھوٹی سی زمین پر خود کاشت کر کے خودمختار زندگی گزار سکتا ہے۔ بڑی بیگم نے زمین بھی اس کے نام کر دی تھی۔ لیکن بیس ایکڑ زمین پھاکر بیٹے کی بجائے صنوبر نے پانچ ہاتھ کے ٹکڑے کو زیادہ ترجیح دی۔ اب سارے ارمان دفن ہو چکے تھے اور وہ ۔ کہ جس کے دل میں ایک لمبی اور بھری پُری زندگی گزارنے کا ارمان تھا مکھڑا لپیٹے رہا تھا۔

"میں اسے کیسے پالوں گا۔۔؟ میں کیا کروں خدایا؟"

"لاؤ میاں اسے مجھے دے دو۔ میں نے تمہیں پال پوس کر بڑا کیا تو کیا اس ننھی منی جان کو نہیں کر سکتی۔۔؟" اک دم بڑی بیگم کا لہجہ اعتماد سے بھر گیا۔

نور خاں کے بہتے آنسو اک دم رک گئے۔ ارے ۔ خدا کے بعد اس عظیم سہارے کو وہ کیسے بھول گیا تھا؟ وہ زندگی کو بوجھ کیوں تصور کر بیٹھا تھا؟ ان تجربہ کار ہاتھوں اور خدا ترس اور محبت بھرے دل میں چھپ کر تو یہ ننھی کلی دنوں ہی دنوں میں پھول بن جائے گی ۔۔ میں کیوں فکر کرتا تھا۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر چادر میں لپٹی ننھی سی جان بے حد محفوظ ہاتھوں میں دے دی۔

اس ذمہ داری پر بڑی بیگم کا دل ایک لمحے کو کانپ سا گیا۔ یہ حقیقت تھی کہ وہ اس قسم کی عظیم سے عظیم ذمہ داریاں اپنے سر لے چکی اور راسے نبھا چکی تھیں لیکن یہ [illegible] نوعیت کی پہلی ذمہ داری تھی کہ اتنی ننھی سی جان کہ جو ابھی چند گھنٹوں کی بھی نہ ہوئی تھی۔ ان کے سایہ عاطفت میں آئی۔ آج تک کے پلنے والے بچوں میں کوئی دکھ ڈال سے کم کا نہ تھا، لیکن یہ جان جس نے ماں کے دودھ کو منہ تک نہ لگایا۔ اوپر کے دودھ سے کس مصیبت سے پلے گی؟ لیکن ان کے کانپتے دل کو قرار اسی لمحہ آ گیا جب انہوں نے ساتھ ہی یہ بھی سوچا کہ جتنی کٹھنائیاں مجھے پالنے پوسنے میں درپیش ہوں گی جنت کا اتنا ہی اونچا مقام مجھے ملے گا۔ اور وہ بے حد پُرسکون ہو گئیں۔

بڑی بیگم کی زندگی کا یہ دور سب سے جدا تھا۔ نئے نئے تجربے ہو رہے تھے۔ نئی نئی مشکلیں نپٹنی پڑ رہی تھیں اور دل سمجھاتا تھا انہیں ننھا منا روپ مت دو۔ یہ بڑے بڑے معرکے ہیں جو تمہاری جنت کو جانے والی راہوں کو استوار کر رہے ہیں۔ بڑی بیگم کے اپنے بھی دو بچے ہوئے تھے مگر ان بچوں کو پالنے اور اس بچی کو پالنے میں واقعی زمین و آسمان کا سا فرق تھا۔ وہ ان کے خود کے بچے تھے، وہ ماں تھیں، خود ہی اپنا دودھ پلاتی تھیں۔ اوپر کے دودھ کی کھٹ کھٹ اور مصیبت کا انہیں کچھ اندازہ ہی نہیں تھا۔ پھر یہ تھا کہ اپنے بچے اپنے ہی بچے ہوتے ہیں۔ مار دو، ٹھونک دو، غصہ آئے تو پیٹ ڈالو۔ کون باز پرس کرنے چلا ہے۔ مگر اب وہ بات نہ تھی۔ ہر چند کہ یہ بھی اپنی ہی بچی جیسی تھی مگر اس کی مسلسل ریں ریں سے تنگ آ کر کبھی ان کا جی اُسے ایک آدھ دھپّہ جڑ دینے کو چاہتا تو ایسا لگتا کہ خدا کی آنکھیں صرف انہیں پر مرکوز ہیں۔ اور وہ ڈگمگا جاتیں۔ "ایسے سے مجھے جنت کیسے مل پائے گی؟" ان کے اپنے بچے پرآیائیں تھیں۔ میاں لاکھ بے وفا اور بددل تھے۔ مگر مرد کی ذات کا پورا کمینہ پن ان میں موجود تھا جو عورت کو جوتی تلے کی چیونٹی سمجھنا اور دبانا اپنا حق جانتا ہے مگر اپنی اولاد کو کلیجے کی کور سمجھتا اور اس کی آسائش اور آرام کا پورا خیال رکھتا ہے۔ نواب صاحب بھی بالکل مرد تھے ۔۔ بیوی کو جتنی بے توجہی بخشی، اولاد کو اتنی ہی توجہ اور محبت کی گرمی دی۔ چین بھی آواز سنتے تو دوڑے آتے کہ بچہ کیوں رو دیا۔ کیسے رو دیا؟ انہوں نے ایک ایک بچے پر دو دو آیائیں رکھ چھوڑی تھیں۔ دودھ ماں ہی پلاتی تھیں۔ نگرانی بھی ان کی اپنی ہی تھی۔ یہاں یہ اڑچن آن پڑی تھی کہ اگر آیا نہ رکھتیں تو خدا کے آگے جواب دہ ہوتیں کہ اپنے برتنے پر لیا تھا تو پھر آرام کی کیوں سوچی ۔۔؟ ڈبے کا اوپر کا دودھ بنانا، رات بے رات، ٹہلنا، اپنے ہاتھوں گھوٹ گھوٹ کر کھلانا، بس بڑی بیگم بن داموں کی غلام بن کر رہ گئیں۔

انہیں دنوں ایک دل ہلا دینے والا واقعہ رونما ہو گیا۔ نور خاں بیل گاڑی میں زمینوں پر سے حساب کتاب کی جانچ کر کے واپس آ رہا تھا کہ

بیل گاڑی اوبڑ کھابڑ راستوں سے، پتھروں سے ٹکراتی نیچے آپڑی اور اس کے تلے نور خاں مرچ دھنئے کی طرح پس کر رہ گیا۔ جانے والا تو اپنی جان سے گیا مگر بڑی بیگم ذمہ داری کے دوہرے بوجھ تلے دب گئیں۔ اب وہ ایک معصوم یتیم یسیر کی نگہ دار ٹھہریں۔ کیسے کڑے مقام پر خدا نے انہیں لاکھڑا کردیا تھا۔ انہیں اس بوجھ سے اپنی کمر ٹوٹتی محسوس ہوئی۔ مگر اسی خدا ترسی کے جذبے اور جنت کی آس نے انہیں سہارا دیا اور وہ تن من سے جٹ گئیں۔

نمی چونکہ ان کی حیات کی خوشیوں کا سہارا بن کر آئی تھی، اس لئے انہوں نے اس کا نام مسرت رکھا۔ ویسے تو انہوں نے اسے ہزار نام دے رکھے تھے۔ بالکل اسی طرح، جیسے کہ ایک ماں۔ سگی ماں اپنی سگی اولاد کو ہزاروں ہی پیارے بھرے ناموں سے پکارتی رہتی ہے۔

بڑی بیگم نے اب تک جتنے بھی بچوں کو پالا تھا، یہ سمجھ کر پالا تھا کہ بس بچے ہیں، پل جائیں بڑے ہو جائیں۔ اپنے اپنے ٹھکانوں سے بیٹھ جائیں۔ مگر مسرت کی بات ہی کچھ اور تھی۔ انہوں نے ایک دن ہر خاص و عام میں اعلان کردیا کہ مسرت میری بیٹی ہے۔

کسی بات کو منہ سے کہدینا اور ہے نباہنا اور۔ مگر دیکھنے والوں نے دیکھ لیا کہ بڑی بیگم نے منہ سے اگر یہ بات نکال دی تو واقعی دل سے اسے نباہ کر ہی چھوڑا۔ زمانہ بدل رہا تھا۔ انہوں نے عربی اردو تعلیم کے ساتھ ساتھ مسرت کے لئے ایک انگریز مس بھی رکھی جو اسے بے حد جانفشانی سے انگلش پڑھانے لگی۔ ساتھ ہی سیون پرودن، نیٹنگ، پکوان، سلیقہ، قرینہ، غرض کوئی بات ایسی نہ چھوڑی جس کا بڑی بیگم نے بطور خاص خیال نہ رکھا ہو۔ مسرت ابھی آٹھ نو سال کی ہی ہوگی کہ اس نے خود بھی بڑی بیگم کی محبت کو پرکھ لیا۔ کبھی نہ کبھی، کسی نہ کسی موقعے پر کوئی نہ کوئی تو پوچھ ہی بیٹھتا "اے ہے بڑی بیگم آپ تو بچی کے پیچھے جان تباہ کئے دے رہی ہیں"۔ تو وہ مسرت کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہتیں ۔"وہ تو میری بیٹی ہے۔ اور یہ تو سوچو یتیم یسیر ہے۔ اس کے طفیل تو مجھے جنت ملے گی"۔

انہیں دنوں رمضان کے مبارک مہینے کی بات ہے۔ یوپی سے ایک مولانا صاحب بطور خاص تراویح کی نمازیں پڑھانے کے لئے گاؤں بلوائے گئے۔ مہینے بھر تک انہوں نے ہر کس و ناکس کے منہ سے یہی بات سنی کہ بڑی بیگم کس قدر خدا پرست ہیں۔ کس طرح غریبوں کے لئے ان کی تجوری کا منہ کھلا ہوا ہے۔ کیسے کیسے انہوں نے اپنی زندگی تمام تر انہیں لوگوں کے لئے وقف کر رکھی ہے جو مصیبت کے مارے ہیں اور یہ کہ ایک یسیر اور یتیم لڑکی کو کس طرح جگر کا ٹکڑا بنا کر رکھا ہے۔

مہینے کے ختم پر جب وہ واپس یو۔پی جانے لگے تو پردے کی آڑ سے بڑی بیگم سے بات چیت ہوئی۔ انہوں نے بغیر کسی قسم کی خوشامد چاپلوسی کے واقعی سچائی کے ساتھ کہا۔

"بیگم صاحبہ آپ یہ سب جو کچھ کر رہی ہیں خدا کے ہاں آپ کی نجات ہی نجات ہے"۔

بڑی بیگم کی تشکر سے بھرائی آواز آئی ۔"مولانا صاحب بس یہی دعا ہے کہ خدا عاقبت بخیر کرے۔ دنیا کے مزے تو چکھ لئے اب آخرت کی دھن ہے"۔

"ارے یہ آپ کیا کہتی ہیں۔ آپ کچھ نہ کرتیں، لیکن صرف ایک یتیم یسیر لڑکی کو پال کر ہی آپ نے وہ کچھ کیا ہے کہ جس کا اظہار الفاظ میں ممکن ہی نہیں"۔

بڑی بیگم نے تڑپ کر بات کاٹی ۔"مولانا صاحب اسے یتیم لڑکی کے نام سے نہ پکاریئے ۔ میری بیٹی ہے وہ ۔ اسے اسی طرح مخاطب کیجئے جیسے وہ ....." ان کی آواز پھوٹ بہی۔

"مرحبا۔ مرحبا" مولانا صاحب بے اختیار ہو کر پکار اٹھے "مبارک ہیں آپ۔ مبارک ہیں وہ در و دیوار جن کی پناہ میں آپ رہتی ہیں۔ مبارک ہے وہ زمین جس پر آپ قدم دھرتی ہیں۔ آپ کی جگہ برحق ہے۔ جنت میں آپ کا بلند مقام برحق ہے ....." اور وہ اللہ ہو۔ اللہ ہو کا ورد کرتے ہوئے

اٹھ کھڑے ہوئے۔

اس دن سے بیگم پر ایک نئی دنیا کے دروازے کھل گئے۔ ان کی محنت خدا نے سپھل کر دی۔ اتنے بڑے مولانا فرما گئے کہ جنت بخشا ہے تو یقینی ہوگی۔ اور یہ سب نیک اعمال کا نتیجہ ہے ــ اور یہ اعمال مسرت کے قدموں کے طفیل ہیں۔ وہ اسے جی جان سے نہارنے لگیں۔

صالحہ ان کی اپنی بڑی بیٹی سال کے سال ماں کے ہاں گرمیاں گزارنے اور آم کھانے آتی تھیں۔ ماں نے مسرت کو گود لیا تھا تبھی سے وہ کھٹکیں لیکن منہ سے کچھ بول نہ پاتی تھیں۔ جانتی تھیں کہ ماں نے زندگی بھر ہر طرح کے دکھ سہے۔ اب بڑھاپے میں دل بہلانے کی خاطر یہ سہارے پال رکھے ہیں۔ اور ان کی برابری کا کوئی جوڑی دار ہوتا تو شاید طوفان اٹھا لیتیں بھی۔ مگر جانتی تھیں کہ جتنے ہیں سب ایسے ویسے ہی ہیں۔ کسی کے ماں باپ نے غربت کے مارے لا کر گود ڈال دیا ہے۔ کوئی حرام کا تھا تو کوئی کھدرے، نالے پرنالے سے برآمد کیا ہوا ہے۔ کوئی بھٹکتا بھٹکاتا آ کر گلے پڑ گیا ہے۔ لیکن مسرت کو چونچلوں سے لیا تھا وہ دل برا کر دینے کے لئے بہت کافی تھا، مگر ٹال گئیں۔ ہر برس آتیں اور بدلا رنگ دیکھ کر جاتیں۔ ماں نے جب اعلان کیا تھا کہ مسرت بیٹی ہے تو ان کا ماتھا ٹھنکا۔ اب تو یقیناً یہ بھی جائداد کی ایک وارث ٹھہری۔ مگر ماں کے آگے بھلا بول ہی کیا سکتی تھیں۔ لیکن اس سال تو پیمانہ ہی چھلک گیا۔ بڑی بیگم کی زندگی کا رخ ہی مولانا صاحب نے پھیر دیا تھا۔ جب سے انہوں نے اتنے پہونچے ہوئے بزرگ کے منہ سے یہ بات سن لی تھی کہ وہ جنت کی واقعی مستحق ہیں، ان کی محبت مسرت سے کچھ زیادہ ہی سوا ہو گئی تھی۔ وہ یہ رہی کہ انہوں نے اپنے مہر میں ملنے والی تمام جائداد بھی مسرت کے نام جیتے جی لکھ دی جو کم و بیش سوا لاکھ ڈیڑھ لاکھ کی بنتی تھی ــ یہ وار ایسا نہ تھا کہ بیٹی چپ سے سہار جاتیں۔ بھئی ظاہر ہے کہ اس کے بیچ میں یہ نصیبوں جلی مسرت نہ ٹپک جاتی تو یہ انہیں کا تو حق ہوتا نا۔ بڑے ارمان سے ماں سے کہا۔ "اماں بیگم۔ آپ نے بنا سوچے سمجھے اتنی بڑی جائداد مسرت کے نام کر دی۔" بڑی بیگم بے حد مطمئن انداز سے مسکرائیں۔ "تو کیا ہوا بیٹی تمہارے جہیز میں بھی تو کم و بیش ایک لاکھ نقد اور ایک لاکھ کا زیور کپڑا گیا ہے۔ وہ بھی تو میری ہی بیٹی ہے۔" رکتے رکتے صالحہ بولیں۔ "مگر اماں بیگم۔ گود لی ہوئی اور سگی اولاد میں کچھ تو فرق رکھیں آپ ــ کیا سچ مچ وہ میری برابری کر سکتی ہے۔ اور کیا سچ مچ آپ اسے مجھ سے زیادہ چاہ سکتی ہیں۔"

اسی لمحے مسرت کسی کام سے ادھر آ نکلی۔ لمحے بھر کو تو صالحہ بھی اسے دیکھ کر بات کرنی بھول گئیں۔ غضب خدا کا۔ کیا رنگ روپ پایا تھا۔ کیا دبدبہ کیسی شان۔ کیسی پاکیزگی برس رہی تھی صورت پر۔ سچ۔ ہے خدا حسن کی دولت جسے چاہتا ہے دے دیتا ہے۔ اس میں غریب امیر کی تخصیص نہیں رکھتا۔ جیسے بڑے پائنچوں کے گلابی غرارے گلابی فراک اور ہلکے سبز دوپٹے میں کیسی نکھر رہی تھی کہ جی چاہتا تھا انگ انگ کو چوم چوم لیں۔

بڑی بیگم ان کی بات کا جواب دے رہی تھیں۔ "بیٹیا محبت نفرت کا ڈیلا ہے۔ پالو رکو پالو اس سے بھی ہو جاتی ہے اور دل پھر جائے تو سگی اولاد کی طرف ہو لگنے تک کو جی نہیں چاہتا۔ مسرت کی بات ہی اور ہے۔ میں نے اسے جی جان کا ٹکڑا بنا کر پالا ہے۔ سچ کہتی ہوں اتنی محبت اور رنج میں نے تم دونوں بہن بھائی پر بھی نہیں صرف کی تھی۔ مجھے سچ مچ اس کی اتنی ہی محبت آتی ہے جتنی تم دونوں کی۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ تم سے بھی زیادہ۔ اس کی یہی وجہ ہے کہ وہ یتیم لیسر ہے۔ اسے میں نے جتنی محبت دی ہے۔ اس کے صلے میں مجھے اتنی ہی نیکیاں ملیں گی...... میری بیٹی بھی ہے میری عاقبت میری نجات اور میری جنت کا راستہ بھی۔"

مسرت نے ایک ٹک رک کر یہ ساری باتیں سنیں۔ اس نے پہلے بڑی بیگم کی طرف دیکھا۔ پھر صالحہ کی طرف۔ منہ سے کچھ نہیں بولی۔
صالحہ بیگم بھی چپ رہ گئیں۔ بات آئی گئی ہو گئی۔

چند سال اور گزر گئے۔ مسرت نے شہر جا کر میٹرک کا امتحان بھی دیا اور پاس بھی ہوئی۔ اب بڑی بیگم کو اس کے مستقبل کی، شادی کی فکر تھی۔ مگر خود مسرت چاہتی تھی کہ ابھی کچھ اور پڑھ لے۔ زمانہ آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ اپنے پیروں پر آپ کھڑی ہونا چاہتی تھی۔ ایک دن بڑی بیگم کے سامنے اس نے اپنے خیالات کا اظہار کیا تو وہ حیران حیران سی بولیں۔

"بیٹی۔ تجھے کمانے دھانے کی کون حاجت ہے۔ میں نے تیرے نام اتنی اتنی بھی نہیں ڈیڑھ لاکھ کی جائداد کردی ہے کچھ نہ کرے۔ اگر صرف بینک میں ہی یہ رقم رکھی رہے تو ہر ماہ ۶۔۷ سو آجائیں۔ کیا اتنے میں تیری گذر بسر نہیں ہو سکتی۔؟"

"نہیں امی۔ ایسی کوئی بات نہیں۔" مسرت بے بسی سے بولی۔ "آپ سمجھتی نہیں ہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔"

"تو اور کیا مطلب تھا۔؟" بڑی بیگم ذرا بناوٹی غصّے سے بولیں۔ "کیا تو مجھے ماں نہیں سمجھتی۔؟"

مسرت نے اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لئے۔ "امی خدا کے لئے یوں نہ سوچیے۔ میں نے کب کہا آپ میری ماں نہیں ہیں" وہ بھرائی آواز سے بولی: "خدا کے بعد تو جو کچھ ہیں آپ ہی ہیں۔ میرے لئے اور کون ہے۔۔"

آگے اس سے کچھ کہا نہ گیا۔ وہ رو پڑی۔ اس کے ساتھ بڑی بیگم بھی رو دیں۔ مسرت سچ مچ ان کی جان ایمان بن کر رہ گئی تھی وہ اس کی آنکھوں میں آنسو کیسے دیکھ پاتیں جبکہ اس کے چہرے پر غم کی ہلکی سی چھاپ بھی انہیں دنوں ملول کر دیتی۔ وہ اس کے آنسوؤں اور مسکراہٹوں، غم اور خوشیوں، اس کے اندھیروں اجالوں کی۔ سبھی چیزوں کی وہی ذمہ دار تھیں۔ یہ ناممکن تھا کہ ان کے جیتے جی کوئی مسرت کی طرف انگلی بھی اٹھا سکتا اور اسے ایک بول بھی بول سکتا۔ بیٹے سے تو اسی مارے مدّت ہوئی بول چال بند ہو چکی تھی جب سے کہ انہوں نے جائداد کا وارث مسرت کو قرار دے دیا تھا۔ صالحہ بھی بگڑیں بہت۔ مگر قدرتی بات ہے کہ بیٹیاں ماں سے زیادہ قریب ہوتی ہیں اس لئے وہ ماں سے ٹوٹ تو نہ سکیں ہاں شیشے میں بال ضرور پڑ گیا۔ مگر یہ کوئی ایسی بات نہ تھی، جس کی وجہ سے بڑی بیگم بدل ہو کر بیٹے بیٹی کی بات مان جائیں۔ وہ جس مقصد کو لے کر چلی تھیں وہ مقصد، وہ راہ سیدھی جنّت تک پہونچتی تھی۔

مسرت خوبصورت تھی، جوان تھی، تعلیم یافتہ تھی اور پیسے والی بھی۔ جب یہ ساری خوبیاں ایک جگہ جمع ہوں تو پیام یوں ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے ہیں جیسے آندھی پانی سے کچّی امیاں ٹپا ٹپ گرتی ہیں۔ قریبی لوگوں کو معلوم بھی تھا کہ مسرت بڑی بیگم کی اپنی سگی بیٹی نہیں۔ مگر ڈیڑھ دو لاکھ کی جائداد نے کچھ سوچنے کا موقع ہی نہ دیا۔ پیام لانے والوں میں وہ بھی تھے جنہوں نے بڑی بیگم کے اس اقدام پر ناک بھوں چڑھائی تھی کہ اور کچھ نہیں سوجھا تو غلام زادے کی یتیم بیسیر لڑکی کو ہی بیٹی بنا ڈالا اور وہ بھی جو اس نیک قدم کو جی جان سے سراہتے تھے اور چاہتے تھے کہ واقعی اس بے مثال ہیرے کی جوت انہیں کے مقدر کی جوت بن جائے۔

بڑی چھان بین کے بعد آخر کار بڑی بیگم نے ایک خاندانی لڑکا پسند ہی کر لیا۔ لڑکا بے حد قابل، بے حد سوجھ بوجھ والا تھا۔ سول انجینئر تھا۔ گھر کا بھی کھاتا پیتا تھا اور تنخواہ بھی آٹھ سو تھی۔ زیادہ زر زیور دولت کی بڑی بیگم کو لالچ تھی نہ خواہش۔ خدا کا دیا ان کی مسرت کے پاس اتنا کچھ موجود تھا کہ زندگی بھر چاہتی تو چار کو کھلا کر خود کھا سکتی تھی۔ وہ صرف شرافت پر جان دیتی تھیں سو خدا نے ان کی سن لی۔

جہیز کا جوڑ جاؤ ہونا شروع ہوا تو بس یوں لگتا تھا کہ گھر میں دوکانیں کھل گئی ہیں۔ حویلی کتنی بڑی تھی۔ اس کمرے میں کپڑے سل رہے ہیں۔ اس کمرے میں جوڑوں پر گوٹا کناری ٹنک رہا ہے۔ اس کمرے میں سنار بیٹھا ٹھک ٹھک کر رہا ہے۔ اس کمرے میں برتنوں کا ڈھیر لگا ہے۔ تو اس کمرے میں تیار زیورات کی جانچ ہو رہی ہے۔

رقعے چھپے اور مقررہ تاریخ پر لوگ باگ آنے شروع ہوئے۔ ان میں جلنے والے بھی تھے اور سچے دل سے خوش ہونے والے بھی۔ مسرت مایوں منجے بیٹھ چکی تھی۔ سنہرے لباس میں اس کا حسن اور نکھر آیا تھا۔ جو دیکھتا بس دیکھتا رہ جاتا۔ بڑی بیگم کا کمرہ اس کے کمرے سے ملحق ہی تھا۔ ملنے جلنے والیاں آتیں۔ اس کا چہرہ دیکھ جاتیں اور پھر دان جہیز کا نظارہ کرتی بڑی بیگم کے پاس پہونچ کر گفتگو کا ایک ہی موضوع باقی رہ جاتا۔ "بیگم آپ نے تو واقعی حد کر دی حد۔ کیا طل پا لیے کہ بس واہ۔" بڑی بیگم مطمئن لہجے میں بڑے انکسار سے کہتیں۔ "میں نے کیا کیا ہے بی بی۔ سب حوصلہ خدا کا دیا ہوا تھا ورنہ میں کیا کر سکتی تھی۔ بس خدا نے سن لی۔ لڑکی اپنے گھر کی ہو جائے اور بس۔ پھر میں اللہ اللہ کروں۔ سوائے عاقبت کے اب کوئی فکر نہیں۔"

کہنے والیاں ہاں میں ہاں ملاتیں۔ "اور کیا۔ اب آپ نے اتنا بڑا ایثار کیا ہے تو خدا کے ہاں جنّت تو آپ کی ہی منتظر ہے بس۔"

"ہاں بی بی۔ حضور صلعم نے فرمایا ہے کہ جس نے تین لڑکیوں کو پال پوس کر جوان کیا اور بیاہ دیا وہ جنّت کا مستحق ہو گیا۔ یہ میرے ہاتھوں گیارہویں

لڑکی بیاہی جا رہی ہے۔ صرف جنت کی اور خدا کی خوشنودی کی آس ہے ورنہ اب دنیا میں اور کیا رہ گیا ہے!"
باہر کے کمرے میں مسرت بیٹھی سنتی رہتی۔ بیٹھے بیٹھے آپ ہی آپ اس کی سسکیاں ابھرنے لگتیں۔ کون جانے میکہ چھٹنے پر یہ آنسو بہتے تھے یا اور کوئی غم چپکے چپکے اسے کھائے جاتا تھا۔!

اگلا دن عقد خوانی کا تھا۔ ایک دن پہلے مہندی ہوتی تھی۔ ہرے ہرے جوڑے میں مسرت کومل ڈالی کی طرح جھکی جا رہی تھی۔ جھین پلو میں سے عارض کی تابانی جھلکتی تو کچھ یوں لگتا کہ شاید سورج ابھی اندھیرے سے طلوع ہوگا۔

مہمان بی بیاں کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں۔ وہ دھوم دھڑکا تھا کہ کان پھٹ کر رہ جائیں۔ زنانے مردانے دونوں جگہ لوگوں کا ہجوم تھا۔ لوگوں کا اندازہ تھا کہ دان جہیز کو تو چھوڑو، صرف بارات اور مہمانوں کا اوپری خرچ ہی کوئی تیس چالیس ہزار کا پڑ جائے گا۔ کل کا دن تو بڑے ہنگامے کا ہوگا۔ اس خیال سے حویلی میں آج ہی سے جہیز جمانا شروع کر دیا گیا۔ بھر بھر کمرے جہیز سے اٹے پڑے تھے۔ بڑے وسیع ہال میں جگ مگ کرتی کار، ریڈیو سیٹ، گراموفون، فریج گرام، صوفہ سیٹ، ڈبل بیڈ، کیا کیا نہ تھا بس حویلی کیا تھی دو کانوں کا روپ ہو کر رہ گئی تھی۔

بڑی بیگم مسرت کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کی آنکھیں بار بار بھر آتیں اور وہ آنسو پی جاتیں۔ کل مسرت پرائی ہو جائے گی۔ کتنی مصیبتوں سے پالا۔ کتنی محبت اسے دی۔ سب چیزوں سے منہ موڑ کر سارے بندھن توڑ کر وہ بڑی بیگم کو اکیلا چھوڑ کر چلی جائے گی! جھر جھر بہتے آنسوؤں کو اب انہوں نے روکنے کی کوشش کی ہم نہیں۔ اسی دن کے لئے تو وہ آس مند تھیں۔ صرف اسی دن کے لئے اتنی ساری کٹھنائیوں کو وہ شربت جان کر پی گئی تھیں کہ بیٹی اپنے گھر کی ہو جائے۔ آخر کو بیگم تھی۔ کوئی اونچ نیچ ہو جاتی تو ساری دنیا مل کر ان کے منہ پر کالک تھوپ گدھے پر بٹھا دیتی۔ کل اس کے وداع ہوتے ہی ان کی نامکمل جنت میں آخری اینٹ بھی رکھ دی جائے گی اور وہ اپنے خدا کے آگے سرخرو ہو سکیں گی۔

بڑی بیگم اپنے خیالات سے جب چونکیں، تب ممانی جان نے ان کا شانہ تھپ تھپا کر کہا۔

" مبارک ہو بہن۔ خدا نے تمہاری دیرینہ آرزو پوری کی۔ لڑکی اپنے گھر کی ہو جائے اس سے زیادہ ایک ماں کی تمنا اور کیا ہو سکتی ہے"۔

" ہاں بی بی۔" بڑی بیگم اور کچھ نہ کہہ سکیں۔ بھر بھر آنے والے آنسوؤں نے ان کا گلا دبوچ لیا۔ مہمان بیبیوں میں سے کوئی بولیں۔

" مگر بڑی بیگم آپ پر واقعی کمال حیرت ہے۔ آپ نے کس طرح بیس برسوں تک اپنے وجود کو بھلا کر بالکل ایک نوکر بن کر بٹیا کی خدمت کی ہے۔ کبھی دیکھنے والوں کو ایسا لگا ہی نہیں کہ یہ آپ کی سگی بٹیا نہیں"۔

" نہیں نہیں۔" بڑی بیگم تڑپ کر بولیں۔" ایسا نہ کہئے۔ ایسا نہ سوچئے۔ وہ میری سگی بیٹی ہے بلکہ سگی سے بھی بڑھ کر ہے۔ اسے اس منزل تک پہنچا کر میں خود بھی تو جنت کی اہل . . ."۔ بات ابھی بڑی بیگم کے منہ میں ہی تھی کہ مسرت کی کانپتی آواز پوری طاقت کے ساتھ کمرے میں ابھری۔" میں آپ کی بیٹی نہیں ہوں بڑی بیگم۔ میں آپ کی بیٹی نہیں۔ بیس برسوں سے اس جملے کو سنتے سنتے خدا گواہ ہے میرے کان پک گئے ہیں۔ میں جانتی ہوں میں آپ کی بیٹی نہیں صرف وہ راہ ہوں جس پر چل کر آپ جنت پا سکیں گی۔ آپ نے زندگی میں کبھی مجھے ماں کی محبت نہیں دی کبھی باپ کا پیار نہیں دیا۔ کبھی مجھے اپنی اولاد نہ جانا۔ جانا تو بس یہ جانا کہ میں ایک سہارا ہوں آپ کی جنت کے حصول کا۔ آپ کی دولت، عزت، جائداد، دان دہیز یہ سب فریب ہے، دکھاوا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ اصلیت کیا ہے۔ اصلیت صرف یہ ہے کہ آپ کو جنت چاہیے تھی جو آپ نے میرے خون کے بدلے واقعی حاصل کر لی"۔ بڑی بیگم نے گھبرا کر دیکھا۔" مسرت، مسرت یہ کیا کہہ رہی ہے تو۔ کیا ہو گیا ہے تجھے، تو ہوش میں ہے یا نہیں۔ لوگ کیا سوچیں گے۔ کیا کہیں گے۔ ذرا ہوش کی لے۔" مسرت پلنگ پر سے اٹھ کر بھاگی۔" میں ہوش میں ہوں۔ پورے ہوش میں۔ بیس برس سے ہوش میں ہی تو ہوں۔ لیکن آج میں اپنے ہر نفس کو بھول جانا چاہتی ہوں۔ لیکن ایک دعا کرتی جاؤں گی کہ خدا آپ کو واقعی جنت دے۔ بیس برسوں تک آپ نے جس خلوص اور جس چاہت سے جنت کی آرزو کی ہے، اگر خدا نے نہ دی تو اس جیسا ناانصاف کوئی نہیں۔" بڑی بیگم اسے سنبھالنے کو لپکیں مگر وہ سب سے بلند اور اونچی ٹیک پر سے نیچے چھلانگ لگا چکی تھی۔ انہوں نے مڑ کر نیچے جھانکا بیٹی سرخ خون کی ندی سی بہہ نکلی تھی۔ ان کی قطعاً سمجھ میں نہ آیا کہ یہ ندی جنت کو جا رہی ہے یا دوزخ کو ۔ ۔ ۔ !

انور عنایت اللہ

محمود - دہلی

سلامت محل

شروع کرتا ہوں میں نام سے خداوند تعالےٰ کے جو پرورش کرنے والا ہے ہر خاص و عام کا۔ اُس کی قدرت کا کیا ٹھکانہ جس نے سخن کو زبان پر پیدا کیا۔ بقول شاعر ؎

بنام جہاں دار جاں آفریں   حکیم سخن بر زباں آفریں

یہ بندۂ ناچیز سلامت محل کا پُرورده ہے۔ سلامت محل کے مکینوں کی داستان غریب و سادہ و رنگین ہے۔ یعنی یہ کہ اس میں غربت کم ہے رنگینی زیادہ ہے اور بہ حکم جناب حاجی میاں ابوالفتح جوتے والے، مالک سلامت محل، یہ مختصر سوانح عمری قلم بند کی جا رہی ہے آج جمعہ ہے اور جون کا مہینہ اور سال ہے ۱۹۵۲ عیسوی۔

نوشیرواں روڈ پر جو سُرخ، طویل، خاموش بظاہر پروقار کوٹھی ہے، قیام پاکستان سے پیشتر اس کا نام نہ جانے کیا تھا۔ اب تو وہ سلامت محل کہلاتی ہے۔ کہتے ہیں۔ حاجی میاں ابوالفتح جوتے والے نے اُسے ایک دہشت زدہ سندھی سے کوڑیوں کے مول خریدا اور پھر اپنی دوسری بیگم، خجستہ سلامت بانو کو اس کی نام رکھائی کے سلسلے میں شرف ملاقات در تخلیہ بخشا۔ وہ اپنی اس سابق چہیتی بیگم کو اکثر صرف رسمی شرف ملاقات بخشا کرتے پچھلے چار برس سے یہ رسمی ملاقات حدود سے کبھی تجاوز نہیں کرتی تھی۔ اسی لئے ان کے درجن بھر بچوں میں سب سے چھوٹے کی عمر ساڑھے تین سال تھی۔ سادہ لوح بیوی کو تخلیہ میں بلوا گیا تو بے چاری کی سمجھ میں نہ آیا۔ کہ آج یکایک حاجی میاں صاحب اس قدر مہرباں کیوں ہو گئے۔ بیگم نے جلدی سے کپڑے بدلے، بناؤ سنگھار کیا۔ اور اپنے غرارے کے پائنچے سنبھالتی ہوئی تیزی سے شوہر کے اجلاس میں پہنچیں۔ حاجی میاں صاحب ا حسب معمول اپنی پٹلی سی توند سہلاتے گاؤ تکیے کے سہارے مسند پر براجمان تھے۔ وہ اپنی مختصر سی داڑھی پر ہاتھ پھیر رہے تھے۔ اور خلاف معمول مسکرا بھی رہے تھے۔ اُن کے سیاہ فام چہرے سے خوشی اور آسودگی نمایاں تھی۔ آج میاں خوش تھے۔ تو بیگم بھی فوراً خوش ہو گئیں۔ ایک طرف بیٹھتے ہوئے انہوں نے پیار بھری شکایت کی۔ "آپ نے بہت دنوں کے بعد یاد کیا۔ سنا ہے دشمنوں کے انگوٹھے پر چوٹ آ گئی تھی۔ اب کیسا ہے انگوٹھا؟"۔

"انگوٹھے کو مارو گولی صدو کی ماں ــــ آج ہم بہت خوش ہیں۔ ہم نے آخر یہ کوٹھی خرید ہی لی۔ آج اس کی رجسٹریشن ہو گئی ہے۔ خدا کی قسم کل رات استخارہ کیا تھا۔ نکلا، دوسری بیوی سے تعلقات بڑھاؤ۔ مبارک ثابت ہوں گے۔ ویسے مجھے اس عمر میں نئے بچے کی خواہش نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی میں تعلقات بڑھانا چاہتا ہوں ــــ اب یہ بتاؤ صدو کی ماں۔ کیا نام رکھیں اس نئی کوٹھی کا؟ مجھے تو فتح محل پسند ہے۔ لیکن پنڈت جی نے

ایک کمبخت کبابئے نے اپنی دکان کو "فتح محل" نام دے رکھا ہے۔ بدمعاش کہیں کا۔ جی چاہتا ہے اس کی دوکان لٹوا دوں ۔۔ خیر۔ انشاء اللہ یہ بھی ہوگا۔ ذرا قدم جم جائیں۔ ۔ اپنے!"

یہاں پہنچ کر وہ اپنا گنجا سر کھجانے لگے۔ بیگم بڑی فرمانبرداری سے حاجی میاں صاحب کا منہ تک رہی تھیں۔ ایسے موقعوں پر وہ صرف منہ تکا کرتیں، کیونکہ بھلا مجازی خدا کے سامنے کہیں کنیز بول بھی سکتی ہے وہ تو شوہر کے پیر کی جوتی ہے اسے ہر حالت میں جوتی ہی رہنا چاہئے۔ حاجی میاں صاحب نے بیگم کو خاموش گوش بر آواز دیکھا تو بڑے پیار سے ان کے بھرے بھرے گال پر چٹکی لی اور اپنے مصنوعی دانت درست کرتے ہوئے بولے

"خدا کی قسم۔ ہم اس کا نام سلامت محل کیوں نہ رکھیں؛ شاہجہاں نے تاج محل بنا کر اپنی بیوی کو زندہ جاوید کر دیا۔ ہم بھی تمہیں زندہ جاوید کر دیں گے صدّو کی ماں!"

صدّو کی ماں نے شوہر سے زیادہ تاریخ پڑھ رکھی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ شاہجہاں کا تاج محل اس کی چہیتی بیگم کا مقبرہ تھا۔ حاجی میاں صاحب اپنی چہیتی بیگم کے لئے اس کی زندگی ہی میں اس کا مقبرہ بنا رہے تھے۔ زندہ در گور تو وہ تھی ہی۔ اب صرف مقبرے کی کسر تھی۔ سو حاجی میاں صاحب وہ بھی پوری کرنے کی ٹھان رہے تھے۔ وہ خاموش بیٹھی اپنا گال سہلاتی رہی۔ اور مسکراتی رہی اور نئی کوٹھی کا نام سلامت محل رکھ دیا گیا۔ اور در و دیوار کے علاوہ گوشہ و محراب پر بھی پاکستان کی مختلف زبانوں میں کوٹھی کا نام بڑے بڑے سنہری حروف میں لکھوایا گیا تاکہ دور سے نظر آ جائے۔

نہ جانے اس کوٹھی کا رنگ پہلے کیا تھا۔ کراچی میں یوں تو بارش ہوتی ہی نہیں تھی۔ لیکن جب سے مہاجرین اس طرف آئے تھے۔ اس شہر کی تو ہر چیز بدل گئی تھی۔ اب یہاں خوب بارش ہوتی تھی۔ ان بارشوں کی وجہ سے کوٹھی کا رنگ بالکل ہی چوپٹ ہو گیا تھا۔ نئے رنگ کے سلسلے میں ایک دن حاجی میاں صاحب نے اپنے منیم کے سر پر ایک دھول جمائی۔ اور پھر اس سے مشورہ شروع کر دیا۔ یہ بوڑھا تجربہ کار بے فکر منیم انھیں سستے داموں کراچی میں مل گیا تھا جس پر ترس کھا کر حاجی صاحب نے اسے اپنے در پر پڑا رہنے دیا تھا۔ یہ ان کی پرانی کوٹھی کے گیراج میں مع اپنے دس بچوں کے اور ایک عدد بیوی کے رہتا تھا۔ ہر روز دکان پر پہنچ کر حاجی میاں صاحب اس بے فکرے کی پیٹھ تھپکتے اور بڑی محبت سے اس کی چندیا پر ایک دھول جما کر اسے ایک مادر زاد ننگی گالی دیتے۔ انھیں گالیاں دینے میں ایک خاص مہارت تھی۔ مثلاً وہ جب کبھی ماں کی گالی دیتے تو فوراً اس کی بہن اور بیٹی کے ساتھ ناشائستگی سے پیش آنے کی اپنی دیرینہ آرزو کا بھی ضرور اظہار کر دیتے۔ اسی طرح باپ اور بیٹے کی گالیاں دیتے ہوئے وہ بڑے شاعرانہ انداز میں بیوی اور ماں کی گالیاں بھی اس میں ملا دیتے۔ منیم، حاجی صاحب کی گالی بڑی وفاداری سے سنتا رہتا اور "حضور کی بندہ پروری ہے" کہتا رہتا۔

ایک دن حاجی صاحب نے حسب معمول گالیاں دیں اور کوٹھی کو نئے سرے سے رنگنے کا مسئلہ چھیڑ دیا۔ اس پر منیم جی نے حسب عادت اپنے زرد زرد سے دانت نکالے اور کانوں پر عینک کی کمانیاں درست کیں اور غلامانہ انداز میں ہاتھ ملتے ہوئے رائے دی۔

"بندہ پرور ۔۔ ان دنوں ہر بات میں ترقی پسندی کا اظہار کرنا فیشن سا ہو گیا ہے۔ دیکھئے نا۔ ہر میدان میں روس کی جیت ہو رہی ہے اس لئے دنیا بھر میں سرخ رنگ بڑا ہر دلعزیز ہو رہا ہے۔ اس ناچیز کی رائے تو یہ ہے کہ حضور پرنور، فیض گنجور، کی کوٹھی سرخ ہونی چاہئے۔"

حاجی میاں صاحب کو منیم جی کی یہ تجویز پسند آئی۔ انھوں نے اس کی چندیا پر پیار سے ایک چپت لگائی اور محبت سے ماں کی گالی دی اس کی بہن اور بیٹی کے ساتھ ناشائستگی سے پیش آنے کا عزم ظاہر فرمایا۔ اور جیب سے ایک اٹھنی نکال کر منیم جی کو "بخشش" دی۔ اسی شام کو سلامت محل نے سرخ لبادہ اوڑھ لیا۔ اور بڑے فخر سے حاجی میاں ابوالفتح جوتے والے خود کو ترقی پسند شمار کرنے لگے۔

نئی کوٹھی کی سجاوٹ کی طرف سے مطمئن ہو کر حاجی میاں صاحب نے اس ذلیل کبابیئے کا دھیان کیا۔ صبح شام اٹھتے بیٹھتے انھیں "فتح محل لبابوں کی مشہور دکان" کا سائن بورڈ بری طرح کھٹکتا۔ یوں لگتا یہ ذلیل کبابیا اُن کا، ان کی عظمت کا، ان کے جاہ و حشم کا، ان کی اس خوبصورت

کوٹھی کا منہ چڑا رہا ہے۔ ایک دن صبر کا پیالہ لبریز ہو گیا۔ انہوں نے اسے بلوایا۔

محمد فتح کبابئے کی بھی کوئی معمولی شخصیت نہ تھی۔ وہ جنگ آزادی کا ایک بڑا سرگرم رکن تھا۔ ایک غیور سپاہی تھا۔ اس نے میرٹھ میں غیر ملکی حکومت کے خلاف ہڑتالیں کرائی تھیں۔ پولیس کے ڈنڈے کھائے تھے۔ اور کئی بار جیل گیا تھا۔ اس کی قربانیوں کی تو ایک طویل داستان تھی۔ اس لئے جب حاجی میاں ابو الفتح نے اس پرانی عمارت کی دھونس جماتے ہوئے رائے دی۔ کہ وہ اپنی سائن بورڈ فوراً بدل دے۔ ورنہ انھیں دوسری سخت تدابیر اختیار کرنی ہوں گی۔۔ تو محمد فتح کو حاجی میاں صاحب کا تحقیر آمیز لہجہ بے حد برا لگا۔ اس نے اپنا سینہ پھلا کر اپنی بڑی بڑی مونچھوں پر تاؤ دے کر صاف لفظوں میں حاجی صاحب کو جتا دیا۔ کہ وہ اپنی دکان کا ایک مالک ہے۔ اس لئے اس کا جو جی چاہے گا وہ کرے گا۔ وہ ہوتے کون ہیں اُسے حکم دینے والے؟۔۔ وہ رئیس ہوں گے تو اپنے گھر کے۔۔۔ وہ بھی اپنے گھر کا رئیس ہے!!

یہ کہہ کر محمد فتح کبابئے نے مونچھوں پر تاؤ دیا۔ اور وہاں سے لوٹ آیا۔ حاجی میاں صاحب اس کی بد تمیزی پر تلملا کر رہ گئے۔

ایک صبح شہر کے سارے اخباروں میں یہ خبر جلی حروف میں شائع ہوئی۔ کہ حاجی میاں ابو الفتح جوتے والے نے ملک کے کئی امدادی فنڈوں میں ایک لاکھ روپیہ چندہ دیا ہے۔ خود حاجی میاں صاحب کے دو اخبار تھے۔ ایک انگریزی اور ایک اردو۔ دونوں اخباروں نے اس عطیہ پر اداریئے لکھے اور حاجی میاں صاحب کو ملک وملت کا سب سے بڑا بہی خواہ گردانا۔ اسی شام کو خدا کا کرنا یہ ہوا۔ کہ پولیس کے چند سپاہی حاجی میاں صاحب کے زر خرید غنڈوں کے ساتھ محمد فتح کبابئے کی دوکان پر پہنچے۔ سرخ پگڑیوں کو دیکھ کر محمد فتح کی سمجھ میں نہ آیا کہ ایسے امن پسند شہری کے گھر پر جس نے حصول آزادی کے لئے بے شمار قربانیاں دی تھیں۔ جس کی خدمات کا خود وزیر اعظم خواجہ صاحب کو بھی اعتراف تھا۔ اس کے یہاں آخر سرخ پگڑی والوں کا کیا کام تھا پولیس نے آتے ہی اُسے حکم دیا۔ کہ یہ زمین حاجی میاں صاحب کے نام الاٹ ہو گئی ہے۔ یہاں وہ ایک مسجد بنانا چاہتے ہیں۔ اس لئے شام تک اسے دکان خالی کر دینی ہو گی۔ پولیس تو حکم سنا کر چلی گئی۔ لیکن حاجی میاں صاحب کے نوکروں نے میدان خالی پا کر کبابئے محمد فتح کا سارا سامان سڑک پر، پھینک دیا۔ کبابئے نے مداخلت کی کوشش کی۔ تو اس کی خوب مرمت کی گئی۔ اور حاجی میاں صاحب نے اپنا رسوخ استعمال کر کے اس پر امن خطرے میں ڈالنے کا الزام لگوایا اور جیل میں بند کروا دیا۔

آج کل کباب کی دوکان کی جگہ حاجی میاں صاحب کا شاندار کتا خانہ ہے جہاں ان کے درجن بھر اعلیٰ نسل کے کتے پلتے ہیں۔ سنا ہے تین ماہ تک جیل میں چکی پیسنے کے بعد بھی محمد فتح کبابئے کی سمجھ میں یہ نہ آیا۔ کہ حاجی میاں صاحب کی سرخ کوٹھی کا سُرخ پگڑی والوں سے کیا تعلق ہے؟ وہ پہروں سوچتا۔ ملک اور ملت کی خاطر قربانیاں پیش کرنے کا تصور اب کس قدر بدل گیا تھا۔ یہ لفظ بھی ایک عظیم انقلاب سے دوچار ہو چکا تھا جسے ہم کل تک قربانی کہتے تھے وہ آج حماقت کہلاتی تھی!

فتح محل پر قبضہ کرنے کے بعد حاجی میاں صاحب نے عوام کی خدمت کی خاطر، ایک درجن بسیں خریدیں۔ اور شہر کے اہم روٹس پر انھیں شتر بے مہار کی طرح آزاد چھوڑ دیا۔ جوتے والے "ٹرانسپورٹ" کی بسیں کافی ہر دلعزیز ثابت ہوئیں۔ کیونکہ اس میں بیٹھنے والوں کے لئے ہر طرح کی آزادیاں، حاصل تھیں۔ عموماً چالیس نشستوں کی بسوں میں اسی مسافر سفر کیا کرتے۔ وقت کی اہمیت کا بھی ان کے ڈرائیوروں کو خوب اندازہ تھا۔ ایک گھنٹہ کا راستہ اکثر آدھے گھنٹے میں طے ہو جاتا۔

حاجی میاں صاحب اللہ کے نیک بندوں میں سے ہیں۔ خیرات کرتے ہی رہتے ہیں۔ رمضان میں باقاعدہ لنگر کا انتظام ہوتا ہے۔ سردیوں میں لحاف تقسیم ہوتے ہیں۔ کئی حج کر چکے ہیں۔ بلکہ حج کرنا تو گویا ہر سال کا معمول ہے لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ حج ہی کی برکت ہے کہ ہر سال ان کی دولت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ وہ اپنی متعدد بیویوں کو بھی ہمیشہ حج پر لے جاتے ہیں اور جب وہ حج سے آتے ہیں تو ان کی بیویاں۔۔۔ اللہ کی شان۔ زیورات میں لدی پھندی آتی ہیں

شہر میں مسجدوں کی کمی دیکھتے ہوئے انہوں نے خاص طور پر برادری کے لئے ایک خوبصورت مسجد اور کئی یتیم خانے بنوائے ہیں۔ مسجد کے در و دیوار اور میناروں پر ان کا نام جلی حروف سے لکھوایا گیا ہے "مسجد ابوالفتح مخصوص برائے ممبران برادری"
کہتے ہیں حاجی میاں صاحب کو اپنا پورا نام لکھوانے کی ضد تھی۔ تاکہ قیامت کے دن فرشتے اس مسجد کے خالق کو پہچاننے میں غلطی نہ کرسکیں لیکن مصاحبوں نے دبے لفظوں میں سمجھایا۔ کہ ایک تو مسجد کا نام ویسے ہی طویل ہوگیا ہے۔ دوسرے اس میں فارسی تراکیب کسی حد تک کھٹکتی ہیں۔ تیسرے یہ کہ مسجد کے دیوار پر "جوتے والے" لکھوانا کچھ عجیب سا لگے گا۔ آخری بات تو حاجی میاں صاحب کی سمجھ میں فوراً آگئی لیکن پہلی دو باتوں پر انہوں نے مطلق دھیان نہیں دیا۔ اور جھنجھلا کر کہا۔

"فارسی تراکیب کوئی ایران والوں کے گھر کی کھیتی ہے؟ اس میں تبدیلیاں کرنے کا ہمیں بھی پورا حق ہے آخر ہمارے یہاں بھی مرزا صاحبان اور نذرالاسلام کی قسم کے بہت سے شاعر پیدا ہوئے ہیں۔ جنھوں نے ساری عمر فارسی میں شاعری کی اور نام پیدا کیا۔ اس بلیغ اور فصیح تشریح کے بعد کس میں تاب تھی۔ کہ زبان ہلاتا۔

فرسودہ خاندانی رسوم کے مٹانے میں بھی حاجی میاں صاحب کا بڑا ہاتھ ہے۔ برادری میں شادی کی ایک نہایت فرسودہ رسم تھی۔ کہتے ہیں کہ شادی کے بعد دلہن صرف آدھی رات اپنے شوہر کے ساتھ گزارنے کے بعد میکے واپس آجاتی۔ اور اس وقت تک شوہر کے یہاں نہ جاتی جب تک سسرال سے بلاوا نہیں آجاتا۔ اس رسم میں طرفین یہ ضرور خیال رکھتے۔ کہ جتنی تاخیر سے بلوایا جاتا۔ خاندان کی ناک اتنی ہی اونچی ہوتی۔ اکثر دلہن مہینوں میکے میں پڑی رہتی۔ اس نصف سہاگ رات۔ کے تصور ہی سے اندر ہی اندر تڑپا کرتی۔ اور خاندان کی ناک روز بروز اونچی ہوتی جاتی۔ اسی لئے برادری میں چپٹی ناک مفقود ہے۔ لیکن۔ خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اُن کی اپنی لاڈلی بیٹی کی بھی شادی ہوئی۔ وہ بھی حسب معمول رات کے چند گھنٹے اپنے شوہر کے ساتھ گزار کر میکے لوٹ آئی۔ ہفتے گذر گئے لیکن سسرال والوں نے اپنی اونچی ناک کی حفاظت کرتے ہوئے دلہن کو واپس نہ بلوایا۔ ادھر حاجی میاں صاحب کو بھی اپنی اونچی ناک کا اتنا ہی خیال تھا۔ لوگوں کا کہنا ہے۔ کہ دولہا دلہن ایک دوسرے کے قرب کے لئے اندر ہی اندر تڑپتے رہے۔ اور اونچی ناک لٹھ لئے دروازے پر پہرہ دیتی رہی۔

ایک رات چیخ پکار سے حاجی میاں صاحب۔ کی آنکھ کھل گئی۔ گھبرا کر اُٹھے تو خبر ملی کہ چور پکڑا گیا ہے۔ چور ان کی جوان لاڈلی کے کمرے کی دیوار پھاند کر بھاگ۔ رہا تھا۔ کہ وفادار چوکیدار۔ نے اسے پکڑ لیا۔ حاجی میاں صاحب اُس بدمعاش کو مادرزاد ننگی گالیاں دیتے ہوئے، اُس کی ماں، بہن، حتیٰ کہ دادی تک سے طرح طرح کی خوش فعلیاں کرنے کا بانگ دہل اعلان کرتے ہوئے، چیختے چنگھاڑتے، اپنی توند سنبھالتے وہاں پہنچے۔ جب چور کو روشنی میں لایا گیا۔ تو دونوں کی سٹی گم۔ یہ انکشاف ہوا کہ یہ تو دولہا میاں ہیں جو۔ اُن کی لاڈلی کو یعنی اپنی نو بیاہتا بیوی کو سوم رسنے چلے آئے تھے۔

اس سانحہ کے بعد لوگوں نے اکثر حاجی میاں صاحب کو اپنی فرسودہ رسموں کے خلاف گھنٹوں بڑی فصاحت اور بلاغت سے تقریریں کرتے سنا ہے۔

حاجی میاں ابوالفتح جوتے والے نے امدادی فنڈوں میں چندے دے کر اپنی دنیا بنالی ہے۔ عاقبت تو نمازیں پڑھ کر، متواتر کئی حج کرکے اور مختلف شہروں میں۔ "مساجد ابوالفتح مخصوص برائے ممبران برادری" بنوا کر سنوار ہی چکی۔ اب وہ دنیا کے بکھیڑوں سے دور خاموش زندگی بسر کرتے ہیں۔ ہر ہفتے کی رات کو دوستوں کے اصرار پر بلاناغہ ایک جھنجھناتی اور کھنکھناتی پارٹی ہوجاتی ہے۔ تو اتوار کی صبح تک جاری رہتی۔

اس بندہ ناچیز، حقیر فقیر نے حاجی میاں ابوالفتح جوتے والے کی مختصر سی سوانح عمری قلمبند کرلی ہے اور مجھے یقین ہے۔ حاجی میاں صاحب بھی سلطان محمود غزنوی کی طرح میری اس جان توڑ محنت کا منہ مانگا صلہ ضرور دیں گے۔ صاف گوئی، حق گوئی، راست گوئی اور

دیگر سازی گوئیوں" کے معاملے میں یہ خالد بھی فردوسی سے کم نہیں ہے۔

یہ امداد ایزدی و توفیق صمد بے نیاز۔ سوانح عمری حاجی میاں ابوالفتح جوتے والے ختم ہوئی۔ دعا گو کا رسید یہ ہے کہ وہ ہم سب کو ان نفوسِ قدسیہ کے پیروی کی توفیق عطا کرے۔ ع

این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

تمت بالخیر۔

مکرر۔ اس عظیم سوانح عمری کا عنوان "سلامت محل" اس لئے ہے۔ کہ سلامت محل ہی نے حاجی میاں ابوالفتح جوتے والے کو وہ بنایا جو وہ آج کل ہیں!!!

اُردو کے مایہ ناز شاعر عبدالعزیز خالد کی

تخلیقات

سرودِ رفتہ	یونانِ قدیم کی شاعرہ سیفو کے نغمے	چار روپے
غزل الغزلات	عہد نامہ عتیق کا نغمہ سلیمان	ایک روپیہ پچھتر پیسے
دکانِ شیشہ گر	منظوم ڈرامے	تین روپے
برگِ خزاں	" " "	چار روپے
ورقِ ناخواندہ	" " "	تین روپے
سلونی	دوسرا ایڈیشن معہ اضافہ ترگوم	تین روپے پچاس پیسے
گل نغمہ	ٹیگور کی گیتانجلی اردو شعر میں	چار روپے
زنجیرِ رمِ آہو	طویل و مختصر نظمیں	دو روپے
کلکِ موج	افکارِ تازہ۔ غزلیں، نظمیں	سات روپے ۵۰ پیسے
فارقلیط	نام ختم رسل، انجیل میں ہے فارقلیط نعت و نام رسول ہاشمی ــــــ	۸ روپے

ملنے کا پتہ **مشتاق بک ڈپو**

نزد اُردو کالج۔ شلٹن روڈ۔ کراچی ۱

رضیہ فصیح احمد ماہِ نو کراچی

پائلٹ

"باجی، باجی — باجی دیکھئے!"

اس نے ماتو کو نظر انداز کرکے اوپر سے آنے والی زیادہ پرشور آواز کی طرف دیکھنا شروع کیا۔ ہری پٹی اور سفید جسم والا ہوائی جہاز بہت نیچے، بہت ہی نیچے گویا اُن کے سروں پر سے اڑتا چلا جا رہا تھا۔ اس کی رفتار سست تھی مگر نیچا ہونے کی وجہ سے گھن گرج بہت تھی۔ وہ بڑے وقار سے آہستہ آہستہ گزرا، ایسا معلوم ہوا جیسے سیدھا سامنے والے پہاڑ سے جا کر ٹکرا جائے گا۔ اور جب ذرا نزدیک پہنچا تو بالکل ایسا محسوس ہوا جیسے وہ پہاڑی پر بنے ہوئے سفید اور سبز رنگوں والے مکان کے دروازے میں گھستا چلا جائے گا۔ لیکن جب وہ گزرا تو وہ منہ پھاڑے دیکھتی رہ گئی۔ جہاز پہاڑ کے بلند ترین درختوں کی بلند ترین چوٹیوں سے بھی اوپر گزر گیا تھا۔

اس کے غائب ہو جانے کے بعد وہ دفعتاً دل پر ہاتھ دھر کر بیٹھ گئی۔ "واحد! یہ ضرور واحد ہوگا۔"

مجھے تو لکھا تو تھا۔ "واحد پائلٹ ہو گیا ہے۔ اس کی روٹ ... سے .... تک ہے۔ تمہاری طرف سے تو اس کا جہاز جاتا ہوگا۔" ہاں اسے معلوم ہو گیا ہے [illegible] واحد کا جہاز اسی طرف سے جاتا ضرور ہے۔ اس نے اکثر باہر بیٹھے ہوئے یہ جہاز گزرتے دیکھے تھے مگر وہ سب یہاں سے بہت دور وادی کے پچھلا نیچے پہاڑی کے [illegible] منظر میں سفید کپڑے کی طرح چلتے نظر آتے تھے۔ مگر یہ تو عین اس کے سر پر سے گزرا تھا۔ واحد کو زیادہ سے زیادہ ان کا علاقہ ہی معلوم ہوگا مگر یہ کیا [illegible] کہ وہ بالکل اس گھر کے اوپر سے گزرا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہ اس وقت دوربین لگائے دیکھ رہا ہو اور اس نے مجھے اوپر کی طرف نظریں اٹھائے [illegible]۔ وہ سارا دن بڑی بشاش رہی۔ بار بار [illegible] جانی خوشی کا نغمہ اُن جانے پن ہی میں اُس کے ہونٹوں پر تیر جاتا۔ رات کو سونے سے پہلے چپکے سے اپنے کمرے [illegible] ہوئے کلنڈر میں آج کے [illegible] سرخ نشان کھینچا۔ اور بستر پر لیٹ کر جہاز کی مدھر خیالی آواز سنتی رہی۔

ک[illegible] سرخ نشان والے دن کے انتظار میں وہ ابھی پوری طرح گھلنے بھی نہ پائی تھی۔ کہ ایک دن اچانک پھر وہی جہاز، بالکل اسی طرح اوپر سے گزرا۔ وہ گھر کے اندر بیٹھی تھی۔ آواز سنتے ہی وہ لپک کر باہر آئی۔ اور غیر شعوری طور پر زور زور سے ہاتھ ہلانے لگی۔ ماتو اور رآنی پہلے سے ہی کرد [illegible] اس لئے انہوں نے اس کی [illegible] حرکت کو محسوس نہیں کیا۔ جب جہاز اس پہاڑی کو بالکل اسی خواب ناک انداز میں پار کر گیا۔ تو وہ اپنی اس حرکت پر شرمندہ سی ہوئی مگر دل میں مسرت کی ہلکی سی لہر بھی تھی کہ کیا معلوم واحد نے دیکھ ہی لیا ہو!!

[illegible] دن پھر ہوائی جہاز کی مدھر گھر اس کے حواسوں پر جلترنگ سا بجاتی رہی۔ ہائے اللہ! بالکل ہمارے گھر پر سے — کیا کسی دن ایسا بھی ہوگا کہ

مد کوئی لفافہ جس کے اندر اس کی تصویر ہوگی، یا گلاب کے پھولوں کا گلدستہ یا کوئی رومال اوپر سے پھینک دے گا۔ جس پر "ڈبلیو" کڑھا ہوگا۔ اگر ایسا ہو
لتنا اچھا ہے۔ اور جب اس کا خیال کی خوبصورتی سے دل بھر گیا۔ تو اس کے مضحکہ خیز پہلو بھی سامنے آنے لگے۔ اتنی بلندی سے لفافہ اور رومال نہ جانے کہاں
پہنچے گا۔ اور پھولوں کی پتیاں پتیاں تک چور چور ہو جائیں گی۔ اور پھر وہ یہ کیسے کر سکتا ہے۔ جب کہ اس کے اور ہمارے گھر کی خاندانی لڑائی ہے۔ نجمہ
، تو ہینے دو ہینے میں کسی اور سہیلی کے پتے پر میرے نام ایک خط بھجوا دیتی ہے۔ تو کیا میں صرف اس جہاز کو تکتی رہوں گی۔ خود اسے کبھی نہ دیکھ سکوں گی۔
ں وہ ضرور کچھ نہ کچھ کرے گا۔ یہ اس کے خلوص کی نشانی نہیں تھی۔ کہ جب گھر کا صحن اس کے قدموں پہ حرام تھا۔ اس گھر کی فضا کو اس نے اپنے اوپر حلال
یا تھا۔ کاش یہ بڑے دلوں کے اخلاص کو سمجھ لیتے۔ اور پھر وہ یہ سوچ کر پریشان ہوتی رہی۔ کہ وہ امی اور ابا کو کس طرح بتائے کہ یہ واحد ہے جو ہر ہفتے اپنی
جودگی کا احساس دلانے، اپنی حیثیت منوانے، خوشامد کے طور پر اس گھر کا طواف کرنے آتا ہے۔ تاکہ جب وقت آئے۔ تو اس کے ابا اس کی امی، اس کی
، ونا وٗں کو یاد رکھیں اور انکار نہ کریں۔۔۔ واحد کا یہ اصرار، یہ طواف کتنا بلند تھا۔ اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کو نوکروں کے ذریعہ گھر سے
یں نکلوایا جا سکتا تھا۔ اس سے یہ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ کہ گھر والے گھر پہ نہیں ہیں۔ وہ آتا تھا۔ اور "مجھے یاد رکھنا؟" "مجھے یاد رکھنا" کہتا ہوا سر سے گزر جاتا
ا۔ اور وہ اسے یاد رکھتی تھی۔ اس سہانی آواز کے انتظار میں جیتی تھی۔ جس کا کوئی دن کوئی وقت مقرر نہیں تھا۔ مگر جو ہفتے میں ایک بار ضرور سنائی دیتی
ہ۔ وہ پورا جہاز اور اس جہاز کا ایک حصہ تصویر کی طرح اس کی نظروں میں سما گیا تھا۔ یہاں تک کہ جہاز کے شناختی نشان بھی اکثر تنہائی میں اس کی آنکھوں
سامنے تیرا کرتے۔

اور آخر ایک دن یہ راز اس کی برداشت سے باہر ہو گیا۔ جب وہ جہاز بردباری، بلند آہنگی سے سر پر سے گزر گیا۔ تو اس نے جھک کر ماٹو کے کان
ں کہا۔ "جانتے ہو اس جہاز میں کون ہے؟"

"ہاں آدمی" ماٹو نے پاگل پن سے کہا۔

"آدمی نہیں! واحد۔۔۔ واحد بھائی تمہارے، جو لاہور میں رہتے تھے نا۔ ہمارے گھر کے پاس۔ شام کو سفید پتلون قمیص پہن کر ٹینس کھیلنے جایا کرتے
۔ بڑے بڑے کالے کالے بال تھے جن کے گردن تک اور بڑی بڑی کالی کالی آنکھیں تھیں جن کی۔۔۔"

"ہاں جو ہمیں ٹافی دیتے تھے کبھی کبھی" ماٹو کو یاد آیا۔

"وہی وہی۔ وہ ہوتے ہیں اس جہاز میں"

"اچھا۔۔۔ وہ کیا کر رہے ہیں اس جہاز میں"

"اسے چلا رہے ہیں"

"ہیں! باجی وہ اسے چلا رہے ہیں!"

"ہاں۔" اس دن ماٹو کو اپنے راز میں شریک کر کے وہ بے حد خوش تھی۔ اس کا دل چاہا وہ یہ بھی اگل دے۔ "وہ میری ہی خاطر ادھر سے گزرتے
۔ اتنے نیچے، بڑے ہمت والے ہیں وہ۔ میں نجمہ کو لکھوں گی" واحد سے کہنا اتنے نیچے جہاز نہ لایا کریں۔ مجھے ڈر لگتا ہے" پھر وہ خیالات کے ریلے میں بہنے
گر جہاز اوپر سے گزرا تو اسے آواز کس طرح آئے گی۔ اسے کیسے پتہ چلے گا۔ کہ واحد آیا تھا۔ اگر واحد نے اسے باہر کھڑا نہ دیکھا تو اسے افسوس ہوگا۔ مگر کچھ بھی
۔ وہ ضرور لکھے گی۔ کہ واحد سے کہنا اتنے نیچے جہاز نہ لایا کریں۔ نجمہ یہ جملہ واحد کو سنائے گی۔ وہ مسکرائے گا۔ آنکھوں کی جوت بڑھ جائے گی۔ پھر وہ بال پیچھے
کر کے سیٹی بجانے لگا۔ اور اگلی دفعہ۔۔۔ اگلی دفعہ شاید اس کا جہاز اس سے بھی نیچے اترے گا، اس سے بھی نیچے۔

کئی دن سے موسم شام کو یکایک خراب ہو جاتا تھا۔ مغرب کی طرف سے ایکا ایکی گہرے گہرے بادل اٹھتے۔ اور گھٹا ٹوپ ہو جاتا۔ پھر ان میں سے نیلے
، رنگ کی خوفناک سی بجلی چمکتی۔ جو شیشوں والے کمرے سے ہوتی ہوئی اندر تک در آتی۔ اور اس کے بعد اتنے زور کی کڑک کہ دل لرز کر رہ جاتا۔ کچھ دیر یہ

تماشا ہوتا۔ اور پھر یکایک بوندیں پڑے بغیر ہی اولے گرنے شروع ہو جاتے، دھڑ دھڑ، تڑاد تڑ۔ اولوں کے ساتھ بجلی کی چمک اور بادل کی گرج، خوف کی گھٹا بڑھ جاتا۔ آج اس قسم کے موسم کو یہ چوتھا دن تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اچھی خاصی دھوپ تھی۔ مانو اور رانی دونوں بچے امی سے پوچھ کر سیر کے لئے چلے گئے۔ یکایک موسم خراب ہو گیا۔ تو امی اور ان کی تسلی کے لئے ابا بھی برآمدے میں آ کھڑے ہوئے۔ بجلی کے ڈر کے باوجود وہ ذرا آگے آ کر پگڈنڈی پر مانو اور رانی کو دیکھنے گلاب کی باڑھ پر جھک گئی۔ دفعتاً وہی جانی پہچانی آواز آئی۔ اس نے گھبرا کر اوپر دیکھا۔ ہری پٹی اور سفید جسم والا ہوائی جہاز اسی متانت اور وقار سے چلا آ رہا تھا۔ مشرق کی طرف سے پہلے سے بھی نیچے جیسے مغرب کی طرف سے دھواں دار بادلوں کو چیلنج کر رہا ہو۔

"جانے کون پگلا ہے، اس موسم میں اتنے نیچے جا رہا ہے۔" امی مانو اور رانی کو بھول کر اوپر کی طرف دیکھنے لگیں۔ وہ تو پہلے سے ہی اوپر دیکھ رہی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ تھوڑا سا اوپر اٹھا ہوا تھا جیسے وہ اس موسم میں اتنے نیچے آ جانے پر احتجاج کر رہی ہو۔ ابا بھی ادھر ہی دیکھ رہے تھے۔ ہمیشہ کی طرح گھر میں گھستے گھستے جیسے وہ ارادہ بدل کر اوپر سے گزر گیا۔ اور پہاڑ کے پیچھے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اور پھر ایک زور کا کڑاکا ہوا۔

"اللہ رحم!" امی نے دونوں ہاتھوں سے کان بند کر لئے۔ "کتنے زور کی کڑک ہے۔"

"یہ کڑک نہیں دھماکا بھی ہے جہاز کریش ہو گیا۔ وہ دھواں دیکھ رہی ہو۔"

اس لمحے، بالکل اسی لمحے موٹے موٹے اولے برسنے لگے۔ نہیں معلوم اس نے ابا اور امی کے ان جملوں کا کتنا حصہ سنا، ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے تیز برچھے کی انی اس کے سینے میں اتار دی ہو۔ وہ جھونک کھا کر گری اور بے ہوش ہو گئی۔

پورے طور پر ہوش میں آنے سے پہلے اس کے کانوں میں کسی کے باتیں کرنے کی آواز آئی۔ "دل کی بہت کمزور ہے، ادھر بجلی کڑکی، ادھر جہاز کا دھماکا ہوا۔ بس یہ غش کھا کر گر پڑی، بارہ گھنٹے سے بے ہوش ہے۔"

اور اس وقت پورے ہوش میں آ کر جیسے کسی نے برچھے کی انی دوبارہ اس کے دل میں پیوست کر دی تو جہاز کا کریش محض واہمہ نہ تھا۔

اس نے آنکھیں کھول دیں۔ باتیں کرنے والے شاید برآمدے میں تھے کمرہ خالی تھا۔ اس نے کروٹ بدلی۔ مانو اخبار ہاتھ میں لئے سامنے سے گزرتا گزرتا اس کو ہوش میں دیکھ کر اندر آ گیا۔

"باجی، باجی، دیکھئے کل کے کریش کی تصویر اس میں آئی ہے۔ پائلٹ کی تصویر بھی ہے اور اس کے بیوی بچوں کی بھی ـــ!"

"بیوی بچوں کی ـــ" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ یہ کل کے کریش کی تصویر تھی۔ جہاز پہاڑیوں میں گرا ہوا زمین پر ڈھیر کی شکل میں پڑا تھا۔ پائلٹ کی تصویر بھی تھی، ایک چھ فٹے قد آور جوان کی تصویر۔ جس کے چھوٹے چھوٹے بال تھے اور جو بیوی اور دو بچیوں کے ساتھ کھڑا مسکرا رہا تھا۔ حادثے کی خبر میں لکھا تھا۔ پائلٹ کی بیوی کا گھر حادثے کی جگہ سے صرف چند فرلانگ دور تھا۔

اس نے ایک گہرا لمبا سا سانس لیا ـــ وہ واحد نہیں تھا۔ اس کا دل چاہا اسی وقت اٹھ کر وضو کرے اور سجدۂ شکر بجا لائے کہ وہ واحد نہیں تھا۔ مگر اس وقت برچھی کی انی پھر اس کے دل میں چبھی۔

تو وہ واحد نہ تھا۔ جو ہر ہفتے ان کے گھر کے اوپر سے گزرا کرتا تھا۔ وہ کوئی اور تھا ـــ وہ کوئی اور کیوں تھا۔

ادب کا اعلیٰ معیار ہمارا معیار ہے اور نیا دور کا نام اس معیار کی ضمانت ہے

نیا دور کراچی

کا تازہ شمارہ ۳۵-۳۶ شائع ہو گیا ہے

سبطِ اختر
منشورہ کراچی

گردشِ کارواں

جاڑوں کی راتیں ـــــ جب کھانا کھانے کے بعد پانی پیو تو ٹھنڈی تلوار سی حلق سے پیٹ تک اترتی چلی جاتی ہے۔ اور اس کے بعد کپکپی۔ دانت بُری طرح بجنے لگتے ہیں۔ بستر میں لیٹ کے لحاف اوڑھو تو ٹھنڈا پالا لحاف عجیب سا محسوس ہوتا ہے۔ ٹھنڈا بھی گرم بھی۔ تھوڑی دیر تک لوسی سی کرتے ہوئے ٹانگیں سکیڑے ہوئے پڑے رہو۔ سب طرف سے لحاف کو دبائے رہو۔ بس ایک کروٹ سے۔ ذرا جنبش ہوئی اور لحاف اٹھا سا سرکا اور سردی کا ایک تیر تنکے لگا۔ لیکن کچھ دیر بعد اس میں گرمی آنی شروع ہوتی ہے۔ اس کے بعد آرام سے ٹانگیں پھیلا لیں اور سوچنے کا سلسلہ شروع۔ سوچنے کے لئے باتوں کی کوئی کمی ہے وہ میں تو کہتی ہوں باتوں کی ضرورت ہی نہیں۔ سردیوں کی راتیں چاہے کتنی ہی لمبی کیوں نہ ہوں لیکن فجر کی نماز میں جاڑوں بھر میں بس گنتی ہی کی ہوتی ہوں گی۔ اور وہ بھی جب اماں جی کو ضد ہو جائے اور وہ لحاف کھینچ کے الگ ڈال دیں تو۔ یہ بھی نہیں ہے کہ نیند ہی اس بُری طرح ٹوٹتی ہو۔ بس یہی ہے کہ خیالات جنہیں کیوں اس عمر میں خیالات اتنا بھٹکا کرتے ہیں کہ اگر شروع رات سے لگے تو آدمی رات تک نیند کا نام ہی نہیں۔ اور اگر مغرب کے وقت ہی سے نیند نے گھیرا کیا تو جلدی سے پڑ کے سو گئے۔ رات میں کسی خواب سے چونک کے آنکھ کھلی تو پھر بے تکے خیالات کا تانا بانا بنا جانے لگا۔ ابھی ایک بات پر سوچ رہی ہوں اس میں کوئی دوسری بات نکل آئی اس پر سوچنے لگی اور یہ سلسلہ چلے جا رہا ہے۔ اصل میں سوتے میں خواب دیکھنا اور جاگنے میں سوچنا ایک سا ہے۔ اگر سوچتے سوچتے سو گئے تو خواب بھی وہی دیکھنے لگے۔ اور اگر خواب دیکھتے دیکھتے آنکھ کھل گئی تو اسی خواب پر سوچنے لگے۔ یہ سوچنا اور خواب دیکھنا ہی سوتے جاگتے میں ایک قسم کا ربط قائم کرتا ہے۔

دوپہر کیا ہوا، سب لوگ بیٹھے تھے۔ چچی جان بھی آئی ہوئی تھیں۔ جانے کیا ذکر ہو رہا تھا۔ بھابی کہنے لگیں۔

"وہ تو بچپن ہی سے اس قسم کا مادہ انسان کے اندر ہوتا ہے۔" میں ویسے ہی اپنے کام میں لگی رہی بھابی کی بات پر کوئی دھیان نہ دیا۔ وہ کہتی رہیں "جب یہ چھوٹی سی تھی۔" بھابی کا اشارہ میری طرف تھا۔ "اس کے پاس ایک بہت خوبصورت سا بٹوا تھا۔ میں نے سیکڑوں خوشامدیں کیں ذرا دیکھنے کو دیدے۔ طرح طرح سے بہلایا پھسلایا مگر نہیں جی۔ ذرا جو مروت کی ہو خدا کی بندی نے۔ حالانکہ مجھ سے زیادہ اس زمانہ میں اسے کوئی بھی عزیز نہ ہوگا۔" اب میں ذرا غور سے ان کی بات سن رہی تھی ـــــ ویسے وہ واقعہ مجھے بالکل یاد نہیں رہا تھا وہ کہہ رہی تھیں "اسی وقت اچھن بھائی آگئے۔ انہوں نے ویسے ہی بٹوے کو چھو کے دیکھا اور اس نے جھٹ ان کے آگے بڑھا دیا" ہاں جی۔ چچی جان اور بھابی زور زور سے ہنسنے لگیں۔ بات میری سمجھ میں آگئی تھی۔ مجھے بڑی طرح شرم آنے لگی۔ میں نے ایک ترچھی نظر سے بھابی کو دیکھا اور وہاں سے اٹھ کے چلی آئی۔

"عجیب آدمی ہیں یہ بھی۔" مجھے کچھ غصہ سا آ رہا تھا۔ وہ بات تو مجھے یاد بھی نہ رہی تھی اور ایسا میرے دل میں کوئی خیال ہی نہ تھا، تھوڑی دیر بعد

بھابی میرے پاس آئیں۔ میں نے ان سے کچھ برا مانتے ہوئے کہا۔

"بڑی وہ ہو تم"

"کیا بڑی وہ ہو۔" وہ بڑے انداز سے بولیں "میں نے کوئی جھوٹ تھوڑی کہا ہے۔ جب ہی تو اچھن بھائی کا اتنا خیال رکھتی ہے۔" مجھے کیا غرض پڑی تھی اچھن بھائی کا خیال رکھنے کی۔ میرے لئے تو جیسے بھائی جان ویسے اچھن بھائی۔ ہاں یہ بات تھی کہ اچھن بھائی ہمارے ہاں بہت کم آتے تھے اس وجہ سے میں ان کی خاطر کافی کیا کرتی تھی۔ اور وہ ایک شرمیلے۔ کیا مجال جو بغیر خاطر تواضع کے کوئی چیز چکھ بھی لیں۔ ابھی اس شب برات کو انہیں زبردستی بلوایا۔ بڑے نخروں کے بعد آ تو گئے مگر حلوہ کھانے میں تکلف۔ میں نے بھی زبردستی ان کے منہ میں ٹھونس ٹھونس کے کھلایا اور پھر بھی میرے دل میں ایسا خیال نہ آیا۔ اور میں تو یہ کہوں گی کہ اگر بھابی اس وقت یہ بات نہ کہتیں تو کبھی میرا ذہن اس طرف جاتا ہی نہیں۔ لیکن نہ جانے کیوں اس وقت بھابی کی بات ایسا کام کر گئی کہ میرے دل پر ایک بوجھ سا سوار ہو گیا۔ دن بھر تو خیر مصروفیت کی وجہ سے دھیان ٹلا رہا۔ مگر اب رات میں جو فرصت پا کر بستر پر لیٹی ہوں تو پچھلی ساری باتیں تصور میں گھومنے لگیں۔ اور جو خیال پہلے دل میں نہ آیا تھا اب ہر بات پر یہی جی چاہتا کہ اس وقت بھی یہی خیال میرے دل میں ہوتا۔

ایک بار ایسا ہوا۔ ہم سب لوگ آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ اچھن بھائی کو بڑی مشکل سے تیار کیا۔ خیر وہ بھی کھیلنے لگے۔ میں چور بن گئی تھی۔ میں بہت دوڑ دوڑ بہت دوڑوں۔ کبھی چبوترے پر کبھی نیچے۔ اور سب مجھے بچا بچا کے بھاگ جائیں اور دھپا چھو لیں۔ مجھے پھر سے چور بننا پڑتا۔ جب بہت دیر ہو گئی اور میں ہانپنے لگی تو کیا ہوا۔ اچھن بھائی کو کچھ ترس آیا اور وہ جان بوجھ کر مجھ سے چھو گئے۔ اس کے بعد ایسا ہوتا جب وہ چور ہوتے اور میں ان کے قریب بھی ہوتی تو وہ مجھے چھوڑ کے کسی اور کو چھو لیتے۔ ایسی ہی اور بہت سی پرانی باتیں۔ اور یہ سوال خود بخود دل میں اٹھتا کہ ایسا کیوں ہوتا تھا۔ آدھی رات تک اسی طرح ذہن بھٹکتا رہا۔ پھر تو اپنے آپ ہی دیر سے آنکھ کھلتی۔ اور اماں جی کو تو بس صلواتیں سنانے سے مطلب ہے۔

"کیا آفت کی نیند ٹوٹے ہے بچی کو۔ جانے اللہ ماری پڑی نیلی ہو رہی ہے۔" اب انہیں کوئی کیا بتائے کہ آدھی رات بھی سونا نصیب نہیں ہوا۔ اور بھابی کی باتیں تو دیکھو مسکراتی ہوئی میرے قریب آئیں اور آہستہ سے بولیں۔

"جوانی کی نیند ہے کوئی مذاق ہے ــــــ" بس پانی پانی ہو کے رہ گئے۔ ایک بار رحم طلب نظروں سے انہیں دیکھا انہوں نے عجیب معنی خیز انداز سے انہیں دیکھا۔ انہوں نے عجیب معنی خیز انداز سے گردن ہلا کر زیر لب کچھ کہا اور اپنے کام میں لگ گئیں۔ میں انہیں کچھ جواب تو دیتی لیکن بھئی جب دل میں چور ہوتا ہے تو ہر بات جا کے نشانے پر لگتی ہے اور بھابی کو تو اس چور کا پتہ تھا۔ بلکہ بھابی نے ہی یہ چور پیدا کیا تھا۔ میں نے دانتوں میں دوپٹہ کا کونہ دبا لیا اور منہ پھیر کر مسکرانے لگی۔

بھابی ہمارے سگے چچا کی لڑکی ہیں۔ مجھ سے زیادہ بڑی بھی نہیں۔ یہی کوئی سال سوا سال بڑی ہوں گی۔ بچپن میں ہم دونوں ساتھ کھیلتے تھے۔ یہ بات بھی تھی کہ ان کی کوئی ہمجولی نہیں تھی۔ سب میری ہی عمروں کی لڑکیاں تھیں۔ میں پہلے انہیں صفیہ کہتی تھی۔ مگر اماں جی ڈانٹتی تھیں کہ تجھ سے بڑی ہے نام کیوں لیتی ہے۔ انہیں صفیہ آپا کہتے ہوئے کچھ عجیب سا لگتا۔ بھئی جب ساتھ کھیلتی ہیں تو کتنی ہی بڑی ہوں۔ مگر اماں جی کی ڈانٹ سے مجھ کو انہیں صفیہ آپا کہنے کی عادت ڈلی۔ ہم ادھر ادھر سے تلاش کر کے اپنے مطلب کی کچی اینٹیں جمع کرتے بڑی محنت سے انہیں توڑ کے ٹکڑے کرتے اور کنوئیں کی من پر بیٹھ کے خوب گھستے۔ اور جب چکنی چکنی گول گول گٹیں تیار ہو جاتیں تو سہ دری کے کچے فرش پر پھسکڑا مار کے بیٹھ جاتے اور گھنٹوں کھیلتے رہتے۔ تھیں بڑی بے ایمان۔ جب ایک گٹ اٹھاتے میں برابر والی گٹ ہل جاتی تو کنکھیوں سے میری طرف دیکھتیں کہ کہیں میں نے دیکھ تو نہ لیا اور جب میں گٹیں مانگتی تو صاف مکر جاتیں۔

"ہٹ۔ ہلی کہاں ہے۔"

"اجی واہ۔ ہل تو گئی۔" مجھے غصہ آ جاتا۔ میری باری ہی کتنی دیر لگاتی مگر کیا مجال جو وہ مان جائیں۔ اور اگر میری باری ہو تو آنکھ بچا کے چپکے سے کوئی گٹ

ملا کے مکھ دیتیں۔ اگر میں سمجھ نہ پاتی تو گٹ اٹھانے میں بل گئی اور میری باری گئی۔ اور اگر میں نے دیکھ لیا تو بس اڑی ہوئی ہیں بے ایمانی پر۔

"چلا مٹو بے ایمنٹی چور کہیں کی۔" بس یکر آگ لگ جاتی۔ کھیل ختم ہو جاتا اور میں ملی بھینی الگ جا کے پڑ رہتی۔ مگر تھوڑی ہی دیر گذرنے پائی تھی کہ وہ گڑیاں لے کے بیٹھ جاتیں۔ میرا بھی جی للچا جاتا اور ہم کارنس کے نیچے والے بڑے سے طاق کے آگے بیٹھ کے گڑیاں کھیلنا شروع کر دیتے۔ ہم نے کتنی ہی گڑیوں کے بیاہ کئے۔ مگر ہمیشہ انہوں نے اپنا ہی گڈا کیا۔ اسی بہانے میری جانے کتنی گڑیوں کو بیاہ کے لے گئیں۔ کبھی کبھی جب زیادہ لڑکیاں جمع ہو جاتیں تو ہم لوگ دلہن دلہن کھیلتے۔ میں چپکے چپکے بڑے کمرے میں جاتی اور حبت کے صندوق میں سے کامدانی کا سرخ ریشمی دوپٹہ جمپر کے اندر چھپا کے لے آتی۔ اور کھیل شروع ہو جاتا۔ صفیہ آپا کو دلہن بننے کا بڑا شوق تھا۔ جہاں کسی کو دلہن بنانے کا ذکر آیا اور صفیہ آپا ہر بار خود دلہن بننے کو تیار۔ میرا جی جلتا تھا ان کی اس بے حیائی پر۔ کبھی کوئی دوسرا بھی اگر دلہن بننے کو کہے تو ذرا شرما کے دلہن بنو۔ یہ کیا کہ اپنے آپ ہی ٹانگ اڑائے دے رہی ہیں۔ میں نے جو ایک بار خود دلہن بننے کی خواہش ظاہر کی تو اماں جی سے شکایت کرنے کی دھمکی دینے لگیں۔ میں نے گھنٹوں منت سماجت کی تب کہیں جا کے مانیں۔

دس برس کی عمر تک بغیر برقعہ کے اکیلی گھر سے نکل آتی تھیں۔ ذرا چچی جان کی آنکھ بچی، صفیہ آپا پھاٹک کے باہر۔ اور چلی آرہی ہیں منہ اٹھائے ہمارے ہاں۔ اماں جی اکثر چچی جان سے کہتی بھی تھیں۔

"اے بھاوج کیا آفت ہے۔ ڈھو کی ڈھو ہو گئی صفیہ ابھی تک بے پردہ نا کرایا تم نے۔"

"پھرنے دو کل بسنی کو لونڈوں کی طرح۔ کسی صورت بیر جھتا ہی نا گھر میں۔" چچی جان جواب دے دیتی تھیں اور بات آئی گئی ہو جاتی تھی۔ میں حالانکہ عمر اور ڈیل دونوں میں ان سے بہت چھوٹی تھی۔ لیکن سات سال کی عمر سے میرا گھر سے نکلنا بند کر دیا گیا تھا۔ میں ہی کیا ہمارے گھر میں سب ہی پدی ایسے تھے۔ ذرا ذرا گھونٹے۔ ابا جی کا ڈیل بہت کم تھا۔ انہی کا اثر اولاد پر پڑا تھا۔ بھائی جان کو تو بہت دنوں تک ان کے دوست ٹوئیاں کہتے تھے۔ میں بھی سات سال کی عمر میں پانچ سال کی لگتی تھی۔ برقعہ اوڑھ کے جب چچا کے گھر جاتی تھی تو سب ہنستے تھے ہمارے چچا کے یہاں۔ چچا خود لمبے چوڑے۔ بلّی کے بلّے۔ بالکل جاٹ معلوم ہوتے تھے۔ اچھن بھائی خیر چوڑے تو خاک بھی نہ تھے بس لمبے ڈول سے تھے۔ اور اس پہ علی گڈھ تراش کا چھوٹی مہریوں کا پائجامہ پہننے کا شوق۔ معلوم ہوتا تھا بانس کے ڈنڈوں پر کپڑا منڈھ دیا گیا ہو۔ جسم پہ بوٹی مدتوں نہ چڑھی۔ سو کم ٹی ایسے تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ صفیہ آپا کے حصہ کی حیا شرم اچھن بھائی کے حصہ میں آگئی تھی اور اچھن بھائی کے حصہ کا سارا جسم صفیہ آپا کو مل گیا تھا تو غلط نہ ہوگا۔ وہ جتنی موٹی تازی تھیں اتنی ہی لمبی تھیں۔ مجھ سے تو چار پانچ سال بڑی معلوم ہوتی تھیں۔ خوب بھرا ابھرا جسم۔ موٹے تندرست ہاتھ پیر۔ لٹکتے ہوئے گال۔ جب چھوٹی سی تھیں تو بھائی جان اکثر ان کے گال کا گوشت چٹکی میں لیتے ہوئے چچی جان سے کہتے تھے۔

"اچھے خاصے ایک شاندار سی پلاؤ کی دعوت ہو جائے۔ مگر آپ کوئی . . . . ."

"کچھ پاگل ہوا ہے لڑکے۔" اماں جی بھائی جان کو گھور کے دیکھتیں "کیوں خدا نہ کرے . . . . ." اور صفیہ آپا اپنا گال پکڑے بہت دیر تک بیٹھی رہتیں۔ ان کے گالوں پر خون سا چھلک آتا اور بھائی جان کی انگلیوں کے سرخ سرخ نشان بہت دیر تک ان کے گال پہ بنے رہتے تھے۔

چودہ پندرہ سال کی عمر تک تو خیر صفیہ آپا کوئی غیر معمولی رفتار سے نہیں بڑھیں۔ لیکن اس کے بعد تو ایک سال میں سٹا کا بھٹہ سی وہ جا نکلیں ایک دم سے پوری عورت معلوم ہونے لگیں۔ بڑے مزے کی ایک بات ہوئی۔ بھائی جان علی گڈھ میں تھے۔ جب وہ بی۔ اے کا امتحان دے کے آئے تو صفیہ آپا ہمارے ہی یہاں تھیں۔ دروازے پر ہی سے بھائی جان کی نظر جب ان پر پڑی تو سمجھے جانے کون عورت ہے۔ وہ جھٹ کے کیواڑ کی آڑ میں ہوگئے۔ اور مجھے آواز دینے لگے۔ میں بھی کہوں کہ یہ کون ہے جو اس بے تکلفی سے مجھے پکار رہا ہے۔ بعد میں تو ہم لوگ خوب ہنسے۔ اور صفیہ آپا تو بس کٹی جا رہی تھیں۔ مگر صفیہ آپا کی شرم کی ایک اور وجہ بھی تھی۔ بھائی جان جب علی گڈھ ہی میں تھے تو ان کی شادی کی فکر جانے لگی تھی۔ بھائی جان سے رائے مانگی گئی تو انہوں نے صاف صاف لکھ دیا کہ شادی کروں گا تو صفیہ سے ورنہ کروں گا نہیں۔ تب میں کراو پر سارا زور

کھلا۔ جب بھائی جان یہیں پڑھا کرتے تھے تو اکثر صفیہ آپا ان کی غیر موجودگی میں کسی بہانے سے میرے پاس سے اٹھ کر چلی جاتی تھیں اور بھائی جان کے کمرے میں جانے کیا ٹٹولا کرتی تھیں۔ یا اکثر کبھی جب بھائی جان اور وہ قریب قریب بیٹھے ہوتے تو ان میں نہ معلوم کیا کیا باتیں ہوتی رہتی تھیں جب میں وہاں جاتی تو دونوں ایک دم سے گم سم ہو جاتے۔ ایک عجیب سی خاموشی اور صفیہ آپا کا چہرہ سرخ ہوتا۔ ان کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ہوتی اور بھائی جان بے مقصد کے مجھ سے کوئی بات پوچھنے لگتے۔ اماں بی نے بھائی جان کے خط والی بات کہہ دی تھی۔ لیکن وہ ایک بے حیا۔ اسی طرح ہمارے یہاں آتی رہیں۔ نہ کسی سے شرمانا۔ نہ کچھ۔ میں نے جب ایک بار انہیں ٹوکا تو پٹ جواب دے دیا۔

"چل ہٹ۔ ابھی کوئی منگنی تھوڑی ہوئی ہے۔" اے لو۔ مجھے ہنسی بھی آئی اور غصہ بھی۔ یا شاید صفیہ آپا ٹھیک ہی کہتی تھیں۔ کیونکہ جب منگنی ہو گئی تو وہ تو ایسی بدلیں کہ کیا کوئی بدلے گا۔ ہمارے گھر کا آنا جانا تو بند ہوا ہی۔ ہمارے گھر کے ہر فرد سے چھپنے لگیں۔ یہاں تک کہ میں بھی ان کے یہاں جاتی تو کمرہ میں منہ لپیٹ کے پڑ جاتیں۔ مجھے بڑا برا لگتا۔

"واہ۔ یہ بھی کوئی بات ہے" ایک بار میں نے زبردستی انہیں اٹھا کے ان کا منہ کھول دیا۔ مگر وہ تو شرم کے مارے دوہری ہوئی جا رہی تھیں۔ کتنی اچھی لگی تھیں وہ شرمائی ہوئی۔ ان کی لانبی لانبی پلکیں ان کے رخساروں پر ایک زاویہ سے سایہ کئے ہوئے۔ کوئی دیکھتا تو حیرت کرتا کہ یہ ابھی کچھ دن پہلے والی صفیہ آپا ہیں۔ مجھی جان کہتی تھیں کہ وہ اس وقت بھی ایسی ہی تیز و طرار تھیں۔ صرف میرے سامنے جانے کیوں اتنی شرماتی تھیں۔ میں نے کچھ ہی دن میں پھر انہیں ہموار کر لیا مجھے اب ان کے اوپر بڑا لاڈ آنے لگا تھا۔ ویسے میں نے ایک آدھ بار سب کے سامنے انہیں بھابی کہا تو وہ پھر شرمانے لگیں۔ لیکن اکیلے میں میں ہمیشہ انہیں بھابی ہی کہنے لگی تھی اور وہ شرماتی بھی نہیں تھیں۔ شاید ایسا کہنا انہیں بھی اچھا ہی لگتا تھا کیونکہ جب میں انہیں بھابی کہہ کے کسی بات کو کہتی تو وہ فوراً مان لیتیں ورنہ صفیہ آپا اور اتنی آسانی سے مان جائیں۔ وہ ہر کام میری مرضی کے مطابق کرتیں مجھ سے رائے لیتیں خواہ وہ قمیر کے گلے ہوں، پاجاموں کی کلیاں ہوں یا تکیہ غلافوں کے پھول ہوں۔

شادی کے دنوں میں بھی میں اپنے گھر میں نہ ٹکتی تھی۔ اماں بی لاکھ کہتیں۔

"اپنے گھر کے کام کے لئے کون سے نوکر چاکر لگا دیئے ہیں جو وہاں کے کام پر جٹی ہوئی ہے۔" لیکن میں چچا کے یہاں کا کام خوب کرتی تھی۔ اصل میں بھابی اکیلی تھیں۔ یہ سب سہیلیوں کو بھی انہیں کے یہاں لے جاتی تھی اور ان کے یہاں خوب گیت ہوتے تھے۔ اماں بی اور بھائی جان کو بہت برا لگتا تھا کہ اپنے یہاں شادی بالکل معلوم ہی نہ ہوتی تھی۔ نہ گیت، نہ کوئی رونق۔

شادی کے کچھ دن بعد تک تو بھابی کے بہت نخرے رہے۔ بغیر میرے سہارے کے ہلتی ہی نہ تھیں۔ میں ہی تو ان کے بنا بنا کے کھلاتی تھی۔ لیکن اس کے بعد میں نے کہہ دیا۔ "بھیا تمہارا گھر ہے۔ خود اٹھو۔ اپنے کام کرو۔ میں کوئی فالتو تھوڑی ہوں۔" لیکن میں نے یہ بھی پیار ہی میں کہا تھا۔ کیونکہ اس کے بعد بھی جب وہ کوئی کام کرنے کو اٹھتی تھیں تو میں جھٹ انہیں روک کے خود ان کا کام کرتی تھی۔ مجھے بڑا اچھا لگتا تھا ان کا کام کرتے ہوئے۔

یعنی لاکھ کوئی ایک ہی گھر کی کھیلی اور رہی ہوئی لڑکی ہو جب نئی بیاہی دلہن ہوتی ہے تو شرم تو آتی ہی ہے۔ پھر کچھ دن لگتے ہیں جھجک ختم ہونے میں۔ بھابی بھی آہستہ آہستہ ہمارے گھر کے ماحول میں دھل گئیں۔ پہلے میں اکیلی گھر کا کام کرتی تھی۔ اب ہر کام میں بھابی میرے ساتھ لگی ہوئی تھیں میں مصالحہ پیس رہی ہوں تو بھابی آٹا گوندھ رہی ہیں۔ میں برتن مانجھ رہی ہوں تو بھابی گوشت بھون رہی ہیں۔ اماں بی کو ہم لوگوں نے بالکل چھٹی دے دی تھی۔

بھابی میں اور مجھ میں ہنسی مذاق تو پہلے ہی بہت ہوتا تھا۔ لیکن اب رشتہ ایسا ہو گیا تھا کہ چھیڑ چھاڑ میں اضافہ ہو گیا۔ بھابی کو چھیڑنے میں مجھے بڑا مزہ آتا۔ شروع شروع میں تو وہ خاموشی سے ہر بات سنتی رہیں۔ شاید سوچتی ہوں گی کہ میرا وقت آنے دو۔ اور اب ان کا وقت آ گیا۔ ایسی ایسی پھبتیاں کستیں کہ کیا بتاؤں۔ ہر بات میں اچھن بھائی کو ٹھونس دیتیں۔

"اچھن بھائی کئی دن سے نہیں آئے۔" وہ بیٹھے بیٹھے میری طرف دیکھتے ہوئے کہتیں۔ میں کوئی بات کہتی ہوتی ہوتی تو وہ میرے حلق ہی میں اٹک کے

رہ جاتی۔ کوئی جواب نہ بن پڑتا۔ دوسرے تیسرے روز بلاوجہ میرے نام سے انجمن بھائی کو بلا لیتیں اور زبردستی مجھے ان کے پاس بٹھائے رکھتیں۔ میں بڑی مصیبت میں شرمانے کا کوئی موقع نہیں۔ یعنی چچا کے لڑکے ہی تو ہیں۔ جیسے پہلے تھے ویسے ہی اب۔ اور نہ شرماؤں تو کیونکر۔ بھابی نے ایک عجیب سا احساس جو دل میں پیدا کر دیا تھا۔ خود بخود انجمن بھائی کے سامنے نظریں جھک جاتی تھیں۔ جب اماں جی قریب میں نہ ہوتیں تو بھابی کوئی اچھی سی چیز انجمن بھائی کو دیتیں۔

"لو انجمن بھائی۔ یہ اس نے بنائی ہے تمہارے لئے۔" میرا عجیب عالم۔ کاٹو تو خون نہیں۔ یوں کہنا اور اب تو ایسا ہو گیا تھا کہ جب انجمن بھائی کو آئے ہوئے کئی دن ہو جاتے تو میرا خود انہیں دیکھنے کو جی چاہنے لگتا تھا۔ شروع شروع میں تو میں انہیں دیکھنے کے بہانے تلاش کیا کرتی۔ چچا کے یہاں جاتے ہوئے تو جانے کیوں بڑی شرم سی آنے لگی تھی۔ میں اب کوئی کام نکال دیتی کہ اماں جی یا بھابی خود ہی انجمن بھائی کو بلا لیتیں۔ رفتہ رفتہ بھابی کو میرے دل کی حالت کا اندازہ ہوتا گیا۔ انہیں محسوس ہو جاتا کہ میں انجمن بھائی کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ جہاں میں ذرا اداس ہوئی اور انہوں نے انجمن بھائی کو بلا بھیجا۔ آخر میں تو بھابی بالکل میری رازدار ہو گئیں۔ خود تو انجمن بھائی سے کچھ کہنے کی ہمت نہ پڑتی۔ میں ہر بات بھابی کو بتا دیتی اور انجمن بھائی بھی بھابی ہی کے ذریعہ مجھ سے بات کرتے تھے۔ اصل میں بھابی نے انجمن بھائی پر بھی وہی طریقہ استعمال کیا تھا۔ جو میرے اوپر کیا تھا۔ یا شاید انجمن بھائی نے خود ہی بھابی سے کہا ہو۔ کیونکہ بھابی یہی کہتی ہیں کہ بہت دن ہوئے انجمن بھائی نے خود ہی بھابی سے کہا تھا۔ ویسے مجھے بھابی کی بات کا یقین نہیں ہے۔ بھلا انجمن بھائی جو اتنے شرمیلے ہیں کہ لڑکیوں کو بھی مات کر دیا ہے وہ خود کہیں گے۔ توبہ توبہ۔

جب زمینداری ختم ہوئی ہے تو لوگوں کے یہاں فاقوں تک کی نوبت آگئی۔ ہمارا اور چچا کا گھر بھی زمینوں کی آمدنی ہی کے سہارے چلتا تھا لیکن ہم پر اس کا زیادہ اثر نہیں پڑا۔ اس کی وجہ یہ بھی کہ اول تو گھر کا کوئی زیادہ خرچ نہ تھا۔ دونوں گھروں میں گنتی کے افراد تھے۔ آمدنی بھی کوئی خاص نہ تھی۔ وصول ہونے کے بعد دونوں گھروں کے برابر حصے لگتے تھے تو اتنا مل جاتا تھا کہ اچھے خوشحال طریقہ سے زندگی گذرتی تھی۔ لوگوں میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ تنگی کبھی نہ ہوئی اور نہ کبھی زیادہ دکھاوا ہی۔ دوسرے یہ کہ زمینداری ختم ہونے سے کچھ دن پہلے بھائی جان اور انجمن بھائی تعلیم ختم کر کے اچھے خاصے جگہوں پر ملازم ہو گئے تھے۔ جو آمدنی زمینداری کے زمانے میں ہوتی تھی قریب قریب وہی اب بھی ہوتی تھی۔ اور زمینداری کی آس ہی کیا تھی۔ کسانوں نے آخر میں دینا ہی بند کر دیا تھا۔ بلاوجہ جان کا خطرہ مول لے کے ابا جی اور چچا گاؤں جاتے تھے اور منہ لٹکائے آجاتے تھے۔ پھر بھی کچھ نہ کچھ اثر تو پڑا ہی۔ پہلے کسی نہ کسی بہانے سے سال میں دو تین اچھی تقریبیں ہو ہی جاتی تھیں اور دونوں گھروں میں خوب جی کھول کے مہمان داری ہوتی تھی۔ میری روزہ کشائی ہی میں ایک ڈیڑھ ہزار سے کیا کم خرچ ہوا ہو گا۔ اسی طرح ہر سال بھائی جان اور انجمن بھائی کی کامیابی پر خوب شاندار دعوتیں دی جاتی تھیں اور بھائی جان کی شادی۔ یاد رہے گا شہر والوں کو بھی کہ ہاں کبھی کوئی شادی دیکھی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آئندہ تقریب نہ کرنے کی قسم کھا رہے ہوں۔ جو کچھ حسرتیں نکالنی ہیں نکال لو۔ اصل میں وجہ یہ بھی کہ کبھی کاشتکاروں پر سختی نہیں کی گئی۔ جتنا وہ دیدیتے تھے وہی کافی ہوتا تھا۔ کوئی ہوس تھوڑی تھی۔ بلاوجہ انہیں پریشان کر کے کیا ملتا۔ اسی لئے خوشیوں کے موقعوں پر ایک بار کاشتکاروں کو آگاہ کر دیا جاتا تھا۔ اور بس۔ منوں اناج کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ مگر اب دل چاہے کی خوشیاں تو دور رہیں تیج تہوار بھی آتے تھے تو بہت پہلے سے فکر شروع ہو جاتی تھی۔ تقریبوں کے بارے میں تو سوچتے ہوئے بھی بڑا ڈر لگنے لگا تھا۔ کہاں سے آتا اتنا روپیہ۔ بندھی ٹکی تنخواہ میں کوئی حسرتیں تھوڑی نکالی جا سکتی تھیں۔ اب چپ چپاتے کوئی کام کرنے میں بڑا دل دکھتا تھا۔ لوگوں کی نظریں اٹھنے لگتی ہیں۔ طرح طرح کی باتیں بنتی ہیں اور تیر کی طرح جا کے دل پر لگتی ہیں۔

انجمن بھائی سے میری منگنی ہو گئی تھی۔ منگنی تو خیر چپ چپاتے ہو گئی سال۔ اب منگنی کوئی کہاں دھوم دھڑکے سے کرتا۔ مگر شادی تو ایسے نہیں ہو سکتی تھی۔ اس میں تو دو چار ہزار کا سوال ہوتا ہی ہے۔ جوان لڑکی کو زیادہ دن گھر میں بٹھائے رکھنا ٹھیک بھی نہیں ہے۔ اس لئے

شادی ٹالی بھی نہیں جا سکتی تھی۔ مگر شادی ٹل رہی تھی۔ اور دونوں طرف سے ٹل رہی تھی۔ نہ اباجی ہی کچھ کہتے تھے اور نہ چچا ہی۔ آخر لڑکے والوں کو بھی تو خرچ کرنا پڑتا ہی ہے۔ بلکہ انہیں زیادہ ہی کرنا ہوتا ہے۔ اور حالات دونوں گھروں کے ایک سے۔

زمینداری بانڈ جو ملے تھے وہ کُل ساڑھے سات ہزار کے تھے۔ اب یا تو کوئی برسوں انتظار کرتے قسطیں وصول کرنے کے لئے۔ یا بھیا غرض ہو تو بھناؤ کوڑیوں کے مول۔ بڑی مشکل سے کوئی چار ہزار ملے اور دونوں گھروں کا خرچ۔ سچ بات تو یہ ہے کہ چچا کا بھی برابر کا حق ہوتا مگر روپیہ ہی کتنا تھا جس میں حصے بخرے لگتے۔ پھر غرض میں تو سب ہی اندھے ہو جاتے ہیں۔ اور چچا نے عقلمندی یہ کی تھی کہ اپنے حصہ کی وصولی کے لئے مختارنامہ بھی اباجی کے نام پہلے ہی سے لکھ دیا تھا۔ انہوں نے بھی شاید یہ سوچا ہو کہ وقت پر کوئی دشواری نہ ہو۔ اباجی کچھ دنوں تک چچا سے بہانے بناتے رہے۔

"ابھی بھنے ہی نہیں" چچا دو ایک روز اور انتظار کرتے۔ وہ بھی کوئی اتنے سیدھے تھوڑی تھے۔ سب سمجھتے تھے۔ ملنے جلنے میں وہ پہلے والا طریقہ نہیں رہا۔ پہلے چچا دن میں دو ایک بار ہمارے یہاں آتے تھے۔ اباجی بھی کئی کئی دفعہ جایا کرتے تھے مگر اب چچا تین چار روز میں کبھی آجاتے تھے۔ اور اس میں بھی کسی نہ کسی طرح وہ بانڈوں والا ذکر چھیڑ دیتے۔

"سرفراز کے بانڈ تو بھن گئے" اور اباجی کسی بھی طرح انہیں ٹال کے کوئی اور تذکرہ نکالدیتے۔ اباجی تو اب چچا کے گھر کا رُخ ہی نہ کرتے تھے۔ چچا کا گھر ہی کیا۔ اب وہ کہیں نکلتے ہی نہ تھے۔ بس دن بھر کمرہ میں لیٹے حقہ گڑگڑاتے رہتے۔

کتنا خوفناک سکون ہو گیا تھا ہمارے یہاں۔ بڑوں کی باتیں پوری طرح تو ہماری سمجھ میں آتی نہ تھیں۔ لیکن اتنا اندازہ ہو گیا تھا کہ کوئی غیر معمولی بات ہونے والی ہے۔ عجیب سی ویرانی چہروں پر نظر آتی۔ بھابی اس بار جو چار روز اپنے گھر رہ کے آئیں تو بدلی ہوئی سی نظر آنے لگیں۔ ان کے چہرے کی وہ شادابی نہ جانے کہاں کھو گئی تھی۔ ہر وقت۔ اداس اداس۔ پریشان۔ ڈری ہوئی سی۔ اب مجھے اور وحشت ہونے لگی۔ سوچتی تھی بھابی سے معلوم کروں۔ انہیں شاید کچھ معلوم ہو۔ لیکن کچھ بات کرنے کی ہمت نہ ہوتی۔ خدا جانے کیا بات ہو۔ ایک عجیب سا انقلاب اپنے مزاج میں محسوس کرنے لگی تھی۔ کوئی بات ہی منہ سے نہ نکلتی۔ ایسا معلوم ہوتا ابھی کچھ بولی تو ایک چیخ سی بلند ہو جائے گی جو ہونٹوں سے نکل کر ساری فضا میں پھیل جائے گی۔ کچھ کہنے کے لئے ہونٹ کھولتی مگر فوراً ہی پوری قوت لگا کے آواز روک لیتی۔ جب بہت دیر ہو جاتی۔ وقت گزرتا چلا جاتا۔ تو بڑی کوششوں کے بعد زبان کھلتی۔

"آج کیا پکے گا" اور اتنا کہتے ہوئے ڈھیروں تھوک حلق میں اٹک جاتا۔ پورے گھر کا ایک عجیب عالم ہو گیا تھا۔ ایک سنسنی سی پھیل گئی تھی۔ جیسے دھماکے کے فلیتے میں چنگاری لگ چکی ہو اور سب اس کے پھٹنے کے انتظار میں کانوں پر ہاتھ رکھے بیٹھے ہوں۔ اب پھٹا۔ اب پھٹا۔ جانے کیسی آواز ہو۔ منگنی کے بعد بھی انجمن بھائی اکثر آیا کرتے تھے۔ اتنا تھا کہ دروازہ پر آکر آواز دیتے تھے اور میں فوراً کوٹھری میں چلی جاتی تھی۔ مگر ادھر بدلے ہوئے حالات نے ان کا آنا بھی بند کر دیا تھا۔ یا اللہ ان کی آواز بھی نہیں سن سکتی۔ بھابی کو بھی جانے کیا ہو گیا تھا کہ خود بھی انہیں نہیں بلواتی تھیں۔ میرا کچھ کہنے کا موقعہ تھوڑی رہ گیا تھا۔ جب بہت جی گھبراتا تو بھابی کے پاس جا کے بیٹھتی۔ شاید وہی کچھ جی بہلانے کی بات کریں۔ مگر وہاں بھی وہی سکوت۔ دم گھٹنے لگا تھا اس خاموشی میں۔ کبھی کچھ ہونا چاہئے۔ کچھ بھی ہو۔ یہ وقفہ تو بڑی الجھن کا ہے۔

ایک روز سہ پہر کو چچا آئے۔ کئی روز میں آئے تھے۔ اور ان کے آنے کی امید بھی تھی۔ مگر ان کے تیور کچھ بگڑے ہوئے تھے۔ میں کھٹک گئی۔ اباجی چوکی پر بیٹھے ظہر کی نماز کے لئے وضو کر رہے تھے۔ ایک لمحہ کے لئے ان کے چہرہ کا رنگ بھی بدلا۔ نظریں چچا کے چہرہ پر جم گئیں۔ کلی کے لئے چلّو میں جو پانی لیا تھا وہ قطرہ قطرہ ہو کے ٹپکنے لگا۔ لیکن فوراً ہی جیسے وہ چونک گئے اور دوبارہ لوٹے میں سے پانی انڈیلتے ہوئے اماں جی کو آواز دی۔

"اجی فلاوہ نکال لائیو" چچا صحن میں پلنگ پر بیٹھ گئے۔ ان کے چہرہ پر قدرے اطمینان آگیا تھا۔ اماں جی چھالیہ کترا کو کا بٹوہ تلاش کر رہی تھیں فوراً اُسے چھوڑ کر کمرہ میں چلی گئیں اور تھوڑی دیر میں ہاتھ میں نوٹوں کا ایک بنڈل لئے باہر نکلیں اور ایک بے پرواہی کے سے انداز سے چچا کے آگے ڈالدیا چچا نے جلدی جلدی گنے۔ ایک ہزار تھے۔

"ایک ہزار —!" چچا نے ایسے کہا جیسے روپیہ لے نہ رہے ہوں بلکہ دینے پڑ رہے ہوں۔

"ہاں اور کیا" ابا جی باچھوں کا پانی جھٹکتے ہوئے بولے۔ ان کا لہجہ سنجیدہ تھا۔ چچا خاموش ہو گئے۔ چھوٹے تھے خاموش نہ ہوتے تو کیا کرتے۔ لیکن روپے میں بڑی طاقت ہے۔ چچا کو کل روپے کا پتہ تو تھا ہی۔ ان کے دل میں بال پڑ گیا۔ اباجی کو بھی اس بات کا احساس تھا۔ لیکن ہاتھ آئی ہوئی دولت کو کون چھوڑ دیتا ہے۔ رنجش بڑھتی گئی۔ کچھ دن تک کھچے کھچے ملے۔ مگر دل میلے ہوں تو سب رشتے ناتے دھندلے پڑ جاتے ہیں۔ ملنا جلنا بند ہو گیا۔ چچا نے اٹھنے بیٹھنے والوں میں کچھ ذکر کیا۔ اور سارے میں بات پھیل گئی۔ اباجی نے اپنے ملنے والوں میں چچا کی برائیاں بیان کیں اور انہیں خوب بدنام کیا۔

اب گھر کا ماحول تھوڑا اور بدل گیا۔ وہ خوفناک سکوت ایک چڑچڑے پن میں تبدیل ہو گیا۔ ذرا ذرا سی بات پر غصہ آ جاتا۔ بھابی نے ایک روز کے لئے اپنے گھر جانے کی خواہش ظاہر کی اور اماں جی کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

"کون سے ضروری مشورے کرنے ہیں ماں باپ سے۔ کوئی ضرورت نہیں ہے" بھابی کا چہرہ اتر گیا۔ چپ چاپ جا کے کمرہ میں پڑ گئیں۔ میں تھکی تھکی نظروں سے سب کچھ دیکھتی رہی۔ میرا دل بھر آیا۔ بھابی کے کمرہ میں گئی۔ بھابی نے مجھے دیکھا میں نے بھابی کو۔ ان کے گال آنسوؤں سے بھیگے ہوئے تھے۔

"بھابی" میرے منہ سے صرف اتنا ہی نکلا اور میں بھابی سے لپٹ گئی۔ ہم دونوں بہت دیر تک روتے رہے۔ اور اب روزانہ ایسا ہی ہوتا۔ اماں جی بھابی سے کوئی بات کرتیں تو بہت جھنجھلا کے کرتیں۔ پہلے ایسا ہوتا تھا کہ اماں جی کو کوئی کام کرانا ہوتا تھا تو مجھ سے کہہ دیتیں۔ یہ اور بات تھی کہ بھابی خود میرے ساتھ مل کر وہ کام کرتیں۔ لیکن اب اماں جی مجھے بلا کر پاس بٹھا لیتیں۔ اور بہت غصہ کے انداز میں بھابی سے کہتیں۔

"دری صفیہ۔ آج جھاڑو نہیں لگائی صحن میں" بھابی بے چاری جلدی جلدی جھاڑو دینے لگتیں۔ میں اگر ان سے پہلے اٹھتی تو اماں جی مجھے کوئی اور غیر ضروری کام کرنے کو بتا دیتیں۔ میں پوری طرح محسوس کر رہی تھی کہ اماں جی کا رویہ بھابی کے ساتھ بہت سخت ہو گیا ہے۔ ایک بار میں نے چپکے سے بھابی کی طرف سے کچھ کہنا چاہا تو اماں جی نے مجھے سختی سے روک دیا۔

"خبردار جو تم اس کی حمایت میں بولیں" میری زبان بند ہو گئی۔ یا اللہ۔ اتنی مجبوری! یہ کیا ہوتا جا رہا ہے۔ ایک معمولی سی بات نے حالات کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ اب قصور وار کسے کہا جائے۔ بھئی شادی کرنی تھی۔ خاموشی سے کر دیتے تو کیا ہو جاتا۔ اباجی کو بھی ایسی ضد پڑی تھی۔ سارے چھوٹے تھے ان کا دل رکھ لیا ہوتا۔ اور تمہاری بات بھی تو ان سے اڑی تھی۔ مگر اپنی ناک جو کٹتی۔ بہرحال۔ بات بگڑنی تھی کچھ دنوں تک چچا نے دوسرے لوگوں کے ذریعہ اباجی سے باقی روپیہ کا مطالبہ کروایا۔ مگر اباجی کا فیصلہ۔ پہاڑ ٹل جائے مگر وہ اپنی جگہ سے نہیں ہل سکتا تھا۔ چچا نے منگنی توڑ دی۔ ویسے چاہے اباجی خود ہی منگنی توڑ دیتے اور وہ اماں جی سے چپکے چپکے مشورے کیا ہی کرتے تھے۔ مگر چچا کے منگنی توڑنے سے آگ ہی تو لگ گئی۔ دن بھر ادھر ادھر چکر کاٹتے رہے۔ بھائی جان کو بار بار بلا کر سرگوشیاں کرتے۔ بھائی جان کچے دل کے۔ انہیں کہاں تاب۔ خوب روئے۔ مگر اباجی کی نیچی ہوتی ہوئی ناک کے آگے بھائی جان کا دل بہت سستا تھا۔ رات کے ایک بجے تک انہیں بہلا پھسلا کے رام کر لیا۔ اور صبح اٹھ کے پہلا کام یہ کیا کہ بھائی جان سے طلاق نامہ لکھوا کر بھابی کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اور بس قصہ ختم۔

یہ سارا عرصہ میرے اور بھابی کے اوپر بڑا سخت گذرا۔ ہم دونوں جیسے چکی میں پسے جا رہے تھے۔ چکی کے پاٹوں کی طرح ہر وقت کانوں میں گھوں گھوں کی آوازیں گونجتی رہتیں۔ خاموشی سے سب کچھ دیکھتے رہے اور آنے والے حالات کا انتظار کرتے رہے۔ اور ایسا ہو گیا تھا جیسے ہم لوگ ہر انقلاب دیکھنے کے لئے تیار ہو گئے تھے۔ بڑی سے بڑی بات بھی غیر متوقع نہ معلوم ہوتی تھی۔ جیسے پہلے ہی سے غیر شعوری طور پر دل میں یہ بات پیدا ہو جاتی تھی کہ یہ سب ہو گا۔ اور وہی ہوا۔ ہم لوگوں پر کوئی غیر معمولی اثر نہیں۔ میں اور بھابی مل کے پہلے بھی روتے تھے۔ اب بھابی طلاق کے بعد جب گھر جا رہی تھیں۔ تب بھی

ان سے مل کے روئی۔ اور اماں جی نے زبردستی مجھے کھینچ کے بھائی کو باہر دھکیل دیا۔ یہ کوئی خاص بات نہ معلوم ہوئی۔ جیسے اس کی بھی پہلے ہی سے امید تھی۔

اور اب جب رات میں بستر میں لیٹتی ہوں تو سیکڑوں خیال آتے ہیں۔ ایک کے بعد دوسرا، دوسرے کے بعد تیسرا۔ اور یہ سلسلہ چلے جاتا ہے۔ دل کے اوپر کوئی غیر معمولی نقش چھوڑے بغیر۔

کلثوم کی اماں کہہ رہی تھیں کہ بھائی کے لڑکا ہوا ہے۔ اچھا خوبصورت سا لڑکا ہوگا۔ بالکل بھائی جان کے اوپر گیا ہوگا۔ گھنگھنا سا۔

محمد ولی کے اولاد نہیں ہوتی۔ سنا ہے وہ دوسرا بیاہ کرنے والا ہے۔ آج کل چچا کا اس کے یہاں بہت آنا جانا ہے۔

اجمن بھائی کی ترقی ہوگئی ہے۔ اور شام کو وہ تحصیلدار صاحب کی لڑکی کو ٹیوشن پڑھانے بھی جانے لگے ہیں۔ اللہ اجمن بھائی کیسے پڑھاتے ہوں گے لڑکی کو۔

بھائی جان کہہ رہے تھے کہ وہ ایک لڑکی سے عدالت میں قانونی شادی کرنے والے ہیں۔

جب ان خیالات سے پیچھا چھوٹتا ہے تو سوتے میں عجیب عجیب خواب دکھائی دیتے ہیں۔ وہ جیسے بہت سے لوگ آہستہ آہستہ جا رہے ہوں خاموش گم سم۔ ایک دم سے سب کی رفتار تیز ہو جاتی ہے اور تیز۔ اور تیز۔ پھر اتنی گرد اٹھتی ہے اتنی گرد اٹھتی ہے کہ وہ لوگ دکھائی نہیں دیتے۔ یا اللہ۔ ہر طرف گرد ہی گرد۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اس گرد کے طوفان میں میں اکیلی بھٹکتی پھر رہی ہوں۔ کبھی ادھر کبھی ادھر۔ کہیں راستہ نہیں ملتا۔ کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ صرف گرد ہی گرد۔

جب آنکھ کھلتی ہے تو صبح ہونے والی ہوتی ہے اور میں فجر کی نماز پڑھنے کھڑی ہو جاتی ہوں۔

گنجینۂ گوہر

• شاہد احمد دہلوی کا اسلوبِ بیان اور طرزِ ادا دلکش ہے۔ ایسی پیاری زبان اور شریت سے اتنا بھرپور طرزِ بیان اُردو کے بہت کم ادیبوں کو حاصل ہوا ہے۔

گنجینۂ گوہر میں شاہد احمد دہلوی نے سترہ باکمال فن کاروں کے بارے میں اپنے مشاہدات، تجربات اور محسوسات کو دلّی کی ٹکسالی زبان کے جادو میں سمو دیا تو ان باکمال شخصیتوں کی ایسی متحرک تصویریں، جنم پا گئیں۔ جنہیں ہر شخص بے تکلف دیکھ سکتا ہے۔ قیمت چھ روپے

ملنے کا پتہ مشتاق بک ڈپو۔ شلٹن روڈ۔ نزد اُردو کالج۔ کراچی ۵

انور سجاد فنون۔ لاہور

گائے

کوئی وہاں جا کے دیکھے اور آ کے مجھے بھی بتائے کہ کیا ہوا —؟ مجھے تو صرف اتنا پتا ہے کہ ایک روز انھوں نے مل کر فیصلہ کیا تھا۔ کہ اب گائے کو بوچڑ خانے دے ہی دیا جائے۔

"اب اس کا دھیلا نہیں ملتا۔" ان میں سے ایک نے کہا تھا۔ "ان مٹی بھر ہڈیوں کو کون خریدے گا؟"

"لیکن بابا۔ مجھے اب بھی یقین ہے۔ اگر اس کا علاج باقاعدگی سے —"

"تم چپ رہو جی — بڑے آئے عقل والے۔"

بگا چپ کر کے الگ ایک طرف ہو گیا تھا اور بابا اپنی داڑھی میں عقل کو کریدتا ہوا اس کے بڑوں کے ساتھ سر جوڑ کے بیٹھ گیا تھا۔ جب میں زبان ہلاتا ہوں یہ بوچڑ بن جاتے ہیں۔ جس روز سے میں نے اپنے کو پہچانا ہے۔ اسی روز سے چتکبری کو بھی جانتا ہے اور جس دن سے یہ لوگ اسے بوچڑ خانے لے جانے کی سوچ رہے ہیں۔ اُس دن سے میں ہر لمحہ یتیم ہوتا ہوں، یتیم ہوتا ہوں، میں کیا کروں، یہ سب مجھ پر ہنستے ہیں۔ کہ میں اس کی اتنی خدمت کیوں کرتا ہوں۔ ان ہڈیوں سے اتنا پیار کیوں کرتا ہوں۔ کیوں کرتا ہوں۔

"آپ اسے بوچڑ خانے کے بجائے اسپتال کیوں نہیں بھجوا دیتے۔" بگے سے رہا نہیں جاتا تھا۔

"یہ ٹھیک نہیں ہو سکتی۔ اس کے علاج پر خوامخواہ پیسہ کیوں برباد کیا جائے؟"

میں نا سمجھ ہوں ابھی تو کل ہی ماں نے دھاگے میں پندرھویں گرہ لگائی ہے۔

"آپ علاج کر کے دیکھیں تو سہی۔"

"بڑوں کی باتوں میں دخل نہ دیا کرو۔"

میرا جی چاہتا ہے کہ میں — کہ میں آپ سب کو بوچڑ خانے دے آؤں۔

پھر سب نے مل کر گائے کی زنجیر پکڑی تھی۔ لیکن جیسے گائے کو بھی سب کچھ معلوم تھا۔ وہ اپنی جگہ سے ایک انچ نہیں ہلی تھی۔ انھوں نے مار مار کے اس کا بھُرکس نکال دیا تھا۔ بگا ایک طرف کھڑا پتھرائی ہوئی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

شاباش میری چتکبری۔ میری گائے، میری گئو ماتا، ہلنا نہیں، تم نہیں جانتیں یہ لوگ تمہارے ساتھ کیا سلوک کرنے والے ہیں، جانا نہیں، ہلنا

نہیں، ننہ — ورنہ — نہیں تو ——

گائے اپنی جگہ پر اڑی مڑ مڑ کے اس کی طرف دیکھتی رہی تھی۔ ذرا ہٹ کر گائے کا بچھڑا کھونٹے کے ساتھ رسّی سے بندھا بے تعلق بیٹھا تھا۔ ہڈیوں پر لاٹھیوں کی بوچھاڑ اُسے نہیں سنائی دیتی تھی۔ بچّے کے کان بھی بند ہو رہے تھے۔ رفتہ رفتہ ——

سارے بزرگ ہانپتے ہوئے پھر سر جوڑ کر بیٹھ گئے تھے۔ پھر فیصلہ ہوا تھا۔ کہ اگر یہ اب چل بھی پڑے تو ممکن ہے راستے میں کھبا ہو جائے۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ اسے ٹرک میں لاد کر لے جایا جائے۔ ٹرک میں تو اسے اٹھا کر بھی لادا جا سکتا ہے۔

اگلے روز ٹرک بھی آ گیا تھا۔

ٹرک کی آواز پر گائے نے مڑ کر دیکھا تھا۔ آنکھیں جھپکی تھیں۔ اور پھر کھرلی میں منہ ڈال دیا تھا۔ جہاں بکّا چارہ ڈال کے ابھی ابھی ٹرک کو دیکھنے گیا تھا۔

"آپ لوگ لے واقعی؟ ..." اسے یقین نہیں آ تا تھا۔

"نہیں تو ہم مذاق کر رہے ہیں کیا؟" ایک نے کہا تھا۔

"بابا! یہ گائے مجھے دے دو۔ میں اسے ——"

"حکیم کی اولاد!" دوسرے نے کہا تھا۔

"بابا اس کے بغیر میں ——"

"مجنوں کا بچہ!" تیسرے نے کہا تھا۔

چوتھا پانچواں سارے بزرگ، سارے بزرگ سارے ایک سے ہیں۔ اور بابا جو اپنی داڑھی کو عقل کا گڑھا سمجھتا ہے، جانے اُسے کیا ہو گیا ہے

"بیٹے —— ٹرک والے کو دس روپے دے کر ہم بہت فائدے میں رہیں گے۔"

او کم بخت سوداگرو، مجھ سے لو روپے، مجھ سے لو، یہ لو، لیکن میری مٹھی میں تو اس وقت ہوا ہے۔ جب جب میں بڑا ہو جاؤں گا ——

ہا ہا ہا ہا!

جب، جب میں کمانے لگوں گا ——

ہا ہا ہا ہا!

تب، تب تک تو چتکبری کی ہڈیوں کا سرمہ بن گیا ہو گا۔ میں، میں کیا کروں ——

ان میں سے ایک گائے کو لانے کے لئے کھرلی کی طرف گیا تھا۔ بکّا بھی اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا تھا۔ یونہی دیکھنے کے لئے بڑے نے اس کی زنجیر کھولی تھی۔ گائے نے کھرلی میں منہ مار کے دانتوں میں پتے دبائے تھے۔ مڑ کے بکّے کو دیکھا تھا اور جانے کے لئے کھُر اٹھایا تھا۔

"نہ۔ نہ۔ نہ" بکّا چیخا تھا۔

"بکو مت۔"

گائے کھڑی ہو گئی تھی۔

"ہے، ہے، ہے۔" بڑے نے زور لگایا تھا۔

"نہ چتکبری، نہ —— نہ مجھ کو ملتا —— نہ۔"

"چپ بھی کرو گے یا کھینچوں تمہاری زبان۔"

بچے نے زبان کو قید کر دیا تھا۔ بڑے نے پھر زنجیر کو جھٹکا دیا تھا۔ "چلو میم صاحب! ٹرک والا تمہارے باپ کا نوکر نہیں جو سارا دن کھڑا رہے"
گائے کی آنکھیں باہر کو نکل آئی تھیں۔ زبان قید میں پھڑ پھڑا کے رہ گئی تھی۔ لیکن وہ مشت استخواں وہیں کی وہیں تھی۔ بچّا مسکرایا۔ پھر فوراً ہی اُداس ہو گیا تھا۔

یہ تو ۔۔ یہ تو بک بھی چکی ہے، اسے جانا ہی ہوگا۔ مجھے اب بھی یقین ہے۔ کہ اگر تھوڑی سی رقم لگا کر اس کا علاج باقاعدگی سے کیا جائے تو ۔۔ تو ۔۔ لیکن میں ان بندرگوں کا کیا کروں ۔ کاش میں حکیم ہی ہوتا، اس کم بخت بچھڑے کو بھی شرم نہیں آتی۔ ماں کے جسم پر نیل پڑ رہے ہیں۔ اور یہ باہر کھڑا، اَنڈے بیچنوں کی طرح دیکھے جا رہا ہے۔

زبان پھڑ پھڑا کے رہ گئی تھی۔

پھر ان میں سے ایک کو بڑی اچھی سوجھی تھی۔ اُس نے گائے کی دم پکڑ کر اُسے تین چار بل دیئے تھے۔ وہ پیٹھ کے درد سے دور بھاگی تھی۔ اس نے بچّے کی طرف دیکھ کر قہقہہ لگایا تھا۔ پیٹھ کا درد گائے کو ہانکتا ہوا بالکل ٹرک کے پاس لے آیا تھا۔ بچّے کا دل بہت زور سے دھڑکا تھا۔

دُر فٹے منہ، لعنت، لاکھ لعنت ۔۔۔

ٹرک والے نے گائے کے چڑھنے کے لئے ٹرک سے زمین پر تختہ لگا دیا تھا۔ گائے نے تختے پر کھُر رکھا۔

"نہ چڑھنا"

"اس کی زبان کاٹ لو ۔۔ یہ گائے کو ورغلاتا ہے، ڈراتا ہے!"

بچّا پھر منہ بند کر کے پیچھے ہٹ گیا تھا۔ گائے نے پہلے تختے کو دیکھا پھر بچّے کی طرف۔

دُر فٹے منہ۔ لعنت ۔۔ لاکھ لعنت۔

بچّے کا سر شرم سے جھک گیا تھا۔

اس کے علاوہ میں اور کیا کر سکتا ہوں ۔۔ کیا کر سکتا ہوں۔

وہ ابھی تک نہیں ڈری تھی۔ پھر اس نے مشکوک نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھ کر بڑے زور سے پھنکار ماری تھی۔

میری چتکبری جانتی ہے۔ جانتی ہے کہ وہ تختے پر قدم رکھ کر ٹرک میں چلی جائے گی۔ لیکن وہ نہیں جانتی۔ کیوں؟ کیوں وہ چڑھنا نہیں چاہتی؟

ان سب نے مل کر اس کی پیٹھ پر لاٹھیاں برسائی تھیں۔ گائے کی ٹانگیں تھرکی تھیں۔ لیکن وہ اپنی جگہ سے قطعی نہیں ہلی تھی۔ جب انھوں نے مل کر دوسرا وار کیا تھا۔ تو وہ پھر تکلیف سے دور بھاگنے کو تھی۔ کہ بابا کی داڑھی میں عقل نے جوش مارا تھا۔ اور اس نے جا کر اس کے منہ پر لاٹھی ماری تھی۔ گائے پھر تختے کی طرف منہ کر کے سیدھی ہو گئی تھی۔ بابا نے ہانپتے ہوئے کہا تھا۔ "آؤ بیٹو!" اور ان سب نے مل کر لاٹھیوں کا مینہ برسایا تھا۔

بچّا دور کھڑا تھا۔ بالکل بے تعلق، بے حس۔

"یوں بات نہیں بنے گی" ایک نے اپنے سانس پر قابو پاتے ہوئے کہا تھا۔

"تو پھر؟"

وہ ٹرک کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑے سوچ ہی رہے تھے۔ کہ جانے گائے کو کیا سوجھی تھی۔ پلٹ کر یکدم بھاگ اٹھی تھی۔ اور دھول اڑاتی بچّے کے قریب سے بالکل اجنبیوں کی طرح گزر گئی تھی۔

بچّا ۔۔۔ جسم کا مفلوج حصہ

دیکھو ۔۔ دیکھو وہ تو بائیں طرف ۔۔۔ ایک چونکا تھا۔

"قدرتی بات ہے" بابا نے اپنی داڑھی میں انگلیاں پھیرتے کہا تھا۔
گائے اپنے بچھڑے کو چاٹ رہی تھی۔ اور بابا کی آنکھیں مکاری مسکراہٹ سے چمک اٹھی تھیں۔
"اس بچھڑے کو یہاں لے آؤ۔ یہ چال تو ہمیں کل ہی چل جانی چاہئے تھی۔ ٹرک کے پیسے بھی بچ جاتے۔"
نکا ـــ مفلوج وجود۔۔

ان میں سے ایک نے بچھڑے کی رسی پکڑی ہی تھی۔ نکے کی زبان لرزی تھی۔ گائے کچھ سوچتی قدم اٹھاتی، رکتی چلتی، بچھڑے کے پیچھے پیچھے اس کے قریب سے گزری تھی۔ تو آہستہ سے نکے کی زبان سے گالی پھسلی تھی۔ بچھڑا تختے پر چڑھ کے چوکڑیاں مارتا ہوا ٹرک میں چلا گیا تھا۔ گائے تختے کے پاس جاکے پھر رکی تھی۔ بڑی حیرانی سے بچھڑے کو دیکھ کر آہستہ آہستہ گردن موڑ کر نکے کو دیکھا تھا۔ ایک نے فوراً بغل سے چھلوں کا گٹھا نکال کر گائے کے آگے کر دیا تھا۔ اس نے چند ڈنٹھل دانتوں میں لے لئے۔ اور پھر کچھ سوچ کر زمین پر گرا دیئے تھے۔ اور اگلا کھر تختے پر رکھ دیا تھا۔ پھر دوسرا کھر۔
خدا معلوم نکے کو کیا ہوا تھا۔ یکدم اس کے سارے جسم میں تازہ تازہ گرم گرم لہو کا سیلاب آگیا تھا۔ اس کے کان سرخ ہو گئے تھے۔ اور دماغ بے طرح بجنے لگا تھا۔ وہ بھاگا بھاگا گھر گیا تھا۔ اور دیوار سے بابا کی دونالی بندوق اتار کے اس میں کارتوس بھرے تھے۔ اسی جنون میں بھاگتا ہوا باہر آگیا تھا۔ اور کاندھے پہ بندوق رکھ کے نشانہ باندھا تھا۔

اس نے کھلی آنکھ سے دیکھا۔ بچھڑا ٹرک سے باہر گائے کے گرائے ہوئے ڈنٹھوں میں منہ مار رہا تھا۔ ٹرک میں بندھی گائے باہر منہ نکال کر بچھڑے کو دیکھ رہی تھی۔ ان میں سے ایک گائے کو لے جانے کے لئے ٹرک میں بیٹھا تھا۔ اور بابا ایک ہاتھ سے اپنی داڑھی میں عقل کو سہلاتا ہوا باہر کھڑے ڈرائیور سے ہاتھ ملا رہا تھا۔

پھر مجھے نہیں پتا کیا ہوا ـــ نکے نے کسے نشانہ بنایا، گائے کو، بچھڑے کو، ڈرائیور کو، بابا کو یا اپنے آپ کو ـــ یا وہ ابھی تک نشانہ باندھے کھڑا ہے ـــ
کوئی وہاں جاکے دیکھے اور آکے مجھے بھی بتائے کہ پھر کیا ہوا۔ مجھے تو صرف اتنا پتا ہے کہ ایک روز ـــ

ایک نیا رسالہ
ایک نئی کتاب
"اظہار"
کا
"جدید شعری ذہن نمبر"
۱۹۶۵ء کے آغاز میں طلوع ہوگا۔
مرتبین :ـ مدیر نثر، باقر مہدی ــ مدیر نظم :ـ قاضی سلیم ـ۔ ۔ منیجنگ ایڈیٹر گرلش چند۔ قیمت دس روپے
۳۰ ـ چوپاٹی روڈ ـ بمبئی ۷

افسر آفذ — سیپ۔ کراچی

پھر کوئی آیا دلِ زار.....

"دل بھی اک آئینہ تھا ٹوٹ گیا۔ چھوڑیئے اشک کیوں بہاتے ہیں" ناہید نے رضیہ کو یہ شعر گنگناتے سنا تو اسے یوں محسوس ہوا۔ گویا یہ شعر اس کی اپنی زندگی کی تفسیر تھا۔ "میں بھی اک ٹوٹا ہوا آئینہ ہوں کون رکھے گا مجھے سنبھال کر" اس نے خود سے سوال کیا۔ اور اداس ہو گئی اور پھر اس نے اس کو مختلف پہلوؤں سے اپنی طویل زندگی کے پھیلے ہوئے لمحات پر منطبق کر لیا۔ وہ اس وقت جوان تھی۔ غیر شادی شدہ تھی۔ لیکن اس نے بچپن سے لے کر اس عمر تک کا جو سفر کیا تھا وہ بڑا تکلیف دہ اور تھکا دینے والا تھا۔ اور اب تو وہ یوں محسوس کرتی تھی۔ گویا کسی بھی لمحہ بے جان ہو کر یوں ہی چلتے چلتے دم توڑ دے گی۔

منزل؟۔ منزل کیا ہے؟۔ وہ کہاں جانا چاہتی ہے۔ اس کو خود معلوم نہ تھا۔ اور اس بے مقصد سفر میں چلتے ہوئے اس کو نہ معلوم کیوں کسی..... معجزہ کے ظہور کی امید تھی۔ ایسے معجزہ کی توقع جو حالات کے سیلاب میں بہتی ہوئی اس کی بے یار و مددگار زندگی کی نیا کو کسی پرسکون ساحل پر پہنچا دے

"دل بھی ایک آئینہ تھا ٹوٹ گیا" اس نے یوں محسوس کیا گویا صبر و ضبط کے وہ تمام بند جن سے وہ آج تک۔ اپنے غم کے سیلاب کو روکے ہوئے تھی۔ آج محض تنکے بن کر رہ گئے ہیں۔ جو سیلاب کے پانیوں پر بغیر کسی منزل کے بہتے چلے جاتے ہیں۔

"ہاں۔ میری ماں میرا دل ہے" اس نے بے حد اداسی سے سوچا۔ مایوسیوں کے جلے اُس کے ذہن کے تمام گوشوں کو لپیٹ چکے ہیں۔ اور پھر اُس کے کانوں میں سیٹیاں بجنے لگیں۔ (ناہید ڈارلنگ۔ ناہید ڈارلنگ) "اف مجھی کیا یہ الفاظ کہنے ضروری تھے؟"

"دل بھی اک آئینہ تھا" میں ایک ٹوٹا ہوا آئینہ، بے کار بے مصرف، میں ناحق ٹکڑے ٹکڑے چن چن کر۔ پھر اس نے ان ٹکڑوں کا شمار کیا جن کو وہ متاعِ حیات سمجھتی تھی۔ آج تک اس کو کوئی بھی شے مسلم نہ مل سکی تھی۔ شکستگی اور ادھورے پن سے اس کی زندگی عبارت تھی۔ یہ ٹکڑے ان خیالات کے تھے جن میں اس نے زندگی گزاری تھی۔ اور خیالات کے یہ شیش محل وقت کی رفتار کے ساتھ اس کے اندر ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرتے جاتے تھے۔ "جو لوٹ گیا سو بوٹ گیا۔ لیکن امی۔ امی؟؟ مگر میں نے پایا ہی کیا تھا۔ مجھ سے رفتہ رفتہ وہ تمام چیزیں دور ہوتی جا رہی ہیں جن کو میں چاہتی ہوں۔

شام جب وہ سب کے ساتھ کھانے کی میز پر بیٹھی۔ تو اس کو یوں لگا۔ گویا اس کا دل غم کے بوجھ سے ابھی حلق سے باہر آ جائے گا۔ وہ چار لقمے بید سے نوالے حلق سے اتار کر وہ اُٹھ گئی۔ "کیا ہوا؟" رضیہ نے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟" شاہینہ نے پوچھا تھا۔ اور اس نے انتہائی بے ہودہ سا بہانہ بنا دیا تھا اور پھر فوراً ہی دل ہی دل میں پشیمان ہو گئی تھی۔ "آدمی جھوٹ بولے تو اس طرح بولے کہ خود کو پشیمانی نہ ہو۔" اس کو یاد آیا کہ شاہینہ نے ایک

مرتبہ اس سے کہا تھا۔

"کون ہے جسے میری پروا ہے۔ اگر رضیہ یا شاہینہ یوں اٹھ جاتیں تو ہر ایک بار بار پوچھتا۔ اظہر اور جاوید ان کے پیچھے پیچھے کمرے تک جاتے۔ مگر میں ایک ٹوٹا ہوا آئینہ۔ جب آنکھ کھلی گل کی تو موسم تھا خزاں کا۔"

"آخر بہار کیا ہے؟" اس نے خود سے سوال کیا تو اس نے محسوس کیا۔ کہ وہ بہار جو دل میں پھول کھلاتی ہے۔ تصور کو شادابی بخشتی ہے خیالات کو رنگینی عطا کرتی ہے اور ذہن کو جلا دیتی ہے۔ اس کی زندگی میں کبھی آئی ہی نہیں۔ جب آنکھ کھلی گل کی ــــ

ماموں کے گھر کا ترقی یافتہ ماحول اس قدر تنگ تھا۔ کہ اس کو قبول نہ کر سکا۔ رضیہ اسے [illegible] کہتی۔ شاہینہ "اللہ میاں کی گائے" اور اظہر اسے سڑا سانپ کہہ کر یوں جاوید طرف داد طلب نظروں سے دیکھتا۔ گویا اس نے کوئی نہایت عمدہ بات کہی ہو اور جاوید اس کا تعلق موہنجو داڑو کی تہذیب سے ثابت کرنے کے لئے زمین آسمان کے قلابے ملا دیتا۔

ڈرائنگ روم سے اظہر، جاوید، رضیہ اور شاہینہ کے باتیں کرنے اور قہقہوں کی تیز آوازیں آرہی تھیں۔ غم کے اس تیز و تند ریلے سے گھبرا کر وہ اٹھی اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گئی۔ کوریڈور سے گزرتے ہوئے ایک نظر اس نے چھوٹے کمرے میں دیکھا۔ خالہ بی پلنگ پر بیٹھی کوئی وظیفہ پڑھ رہی تھیں۔ "نہ معلوم کونسی تمنا ہے جسے پورا کرنے کے لئے تم عبادت کا سہارا لے رہی ہو۔" اس نے دل میں کہا اور خالہ بی اگر تمہاری تمنا پوری ہو بھی گئی تو تم کتنے دن اور زندہ رہو گی؟"

ماموں اور ممانی حیدر آباد کسی شادی کے سلسلے میں گئے ہوئے تھے۔ اس خیال سے کہ گھر میں لڑکیاں اکیلی رہیں گی۔ وہ اپنے بھتیجوں اظہر اور جاوید سے گھر پر رکنے کی تاکید کر گئے تھے۔ اور یہ سوچتے ہوئے کہ جوان لڑکوں اور لڑکیوں پر کسی بزرگ کی موجودگی کا خوف طاری رہے انہوں نے خالہ بی کو اس عرصہ کے لئے بلا لیا تھا۔ جن کی آنکھیں اپنی انگلیاں نہ دیکھ سکتی تھیں۔ اور جن کے کانوں میں فلمی گانوں کی آواز قرأت بن کر پہنچتی تھی۔

خالہ بی کمرے کے سامنے سے گزر کر وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئی۔ اور اچانک اسے روشنی سے تاریکی میں آجانے کا احساس ہوا۔ اسے شبہ ایک عرصے سے تھا۔ لیکن آج یہ تمام شبہات برہنہ ہو کر اس کے سامنے آگئے تھے۔ اظہر جاوید، رضیہ اور شاہینہ کے چہرے فق تھے اور کمرے میں اضطراب، بے چینی اور خوف کا ملا جلا سناٹا پھیل گیا تھا۔

"ابرار کو کہیں بھیجا ہے؟" ناہید نے بے ہودہ سا بہانہ اپنی آمد کے سلسلے میں بنایا۔

"ہاں میں نے سگریٹ منگائی ہے!" اظہر نے فوراً کہا۔ اس کا حلق سوکھا ہوا تھا۔

"جب وہ آئے تو میرے پاس بھیج دینا۔ سر میں درد ہو رہا ہے سیریڈون منگوانی ہے۔" حالانکہ اس کے سر میں درد خاک نہیں ہو رہا تھا۔ وہ تو بس واپس جانا چاہتی تھی۔ اور بغیر جواب کا انتظار کئے وہ الٹے قدموں واپس ہو گئی۔ اس کے ذہن میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ ڈرائنگ روم سے سرگوشیاں یوں ابھر رہی تھیں۔ گویا لاکھوں مکھیاں کوڑے کے ڈھیر پر بھنبھنا رہی ہوں۔

خالہ بی کے کمرے میں پہنچ کر وہ ٹھٹھکی اور دروازے پر کھڑی ہو گئی۔ "تمہاری موجودگی تو اس وقت کچھ کارآمد ہوتی جب رضیہ اور شاہینہ اظہر اور جاوید سے کسی قسم کا خطرہ محسوس کرتیں۔ خالہ بی" اس نے یہ تمام الفاظ دھیمے اور ہلکے لہجے میں کہے تھے۔ اور خالہ بی نے اپنے ہاتھ کو اس طرح ہلایا۔ گویا کان کے قریب بھنبھنانے والے مچھر کو اڑا رہی ہوں۔ "کیسے کم بخت مچھر ہیں۔" اور یہ کہہ کر انہوں نے پھر اطمینان سے تسبیح کے دانے کھٹا کھٹ گرانے شروع کر دیئے۔

"اے خالہ بی کچھ خبر بھی ہے تمہیں آگ اور پھونس کا ملاپ ہو رہا ہے، تمہیں آنچ بھی نہیں پہنچی" اس مرتبہ اس کی آواز قدرے اونچی تھی۔ خالہ بی نے دروازے کی طرف آنکھیں پھیرتے ہوئے زور سے کہا۔

"کون ہے؟"

"کون ہے" ڈرائنگ روم سے ابھرتی آواز ابھری۔

ڈرائنگ روم سے اٹھتے والی کھسیوں کی بھنبھناہٹ ختم ہو چکی تھی۔ وہ خاموشی سے نیم تاریک، کوریڈور میں رینگ گئی۔ اور اپنے کمرے میں داخل ہو گئی۔ اس نے محسوس کیا۔ گویا کوئی کوریڈور میں چند قدم آ کر واپس جا رہا ہو۔ اس نے دروازے سے جھانک کر دیکھا۔ شاہینہ ڈرائنگ روم میں داخل ہو رہی تھی۔

"ہوتا کون۔ خالہ بی کے کان بج رہے تھے" شاہینہ نے کہا تھا اور اس کے لہجے میں ناہید نے یوں محسوس کیا۔ گویا کوئی جوان بیوہ اپنے شوہر کی نعش پر بین کر رہی ہو۔ اور اس کے بعد پھر ڈرائنگ روم میں بھنبھناہٹ شروع ہو گئی۔

"تم۔ تم سب لوگ مردہ ہو۔ تم سب لوگ زندگی سے دور ہو۔ اور میں، میں تنہا ہوں۔ ٹوٹا ہوا آئینہ۔ کون اپنائے گا اسے، اس کی شکستگی کی آواز بھی تو کوئی نہیں سنتا" میں ہوں اپنی شکست کی آواز" میں تنہا ہوں۔ ان سب سے مختلف ہوں، یہ میرا جرم تو نہیں۔ پھر (ناہید ڈارلنگ آئی ایم سوری ٹو ٹیل یو، بٹ) ۔۔ نہیں کیا کیا فرودی تھا کہ تم یہ الفاظ مجھ سے کہتیں۔ اس کے سامنے کھلی ہوئی کھڑکی تھی۔ جس پر عشق پیچاں کی بیل، الجھ رہی تھی۔

"میں ایک ایسا پودا ہوں جو کسی ویران کھنڈر کی شکستہ دیوار میں اُگ آیا ہو۔ تنہا اداس اور اکیلا، نہ زمین سے متعلق نہ آسمان سے، جو خود میں اپنی دنیا ہو۔ جس کی پرورش شکستہ بنیادوں نے کی ہو۔ اور جس کے سہارے ٹوٹتے والے تارے ہوں" اس نے اپنی زندگی کے متعلق یہ نتیجہ اخذ کیا تھا۔ کھڑکی میں کھڑے ہوئے اس نے یہ تمام کچھ واضح الفاظ میں ہونٹوں سے یوں ادا کئے، گویا کسی زخم کے ہونٹ کھل گئے ہوں ۔۔

اکثر یوں ہوتا، جب وہ بہت پریشان ہوتی، غم کا سایہ اس پر گہرا ہو جاتا تو وہ باہر لان پر ننگے پیروں ٹہلا کرتی۔ اور خالی خالی آنکھوں سے آسمان تکتی رہتی۔ اور ان گنت ستاروں میں اپنے ستارے کو ڈھونڈتی رہتی جو اس کو کبھی نہ ملتا۔ یہاں تک کہ وہ بے حد تھک جاتی۔ پھر وہ واپس آتی اور بے دم ہو کر پلنگ پر گر جاتی۔ لیکن آج باہر جانے کے لئے اس کو ڈرائنگ روم کے سامنے سے گزرنا پڑتا۔ وہ نہیں چاہتی تھی۔ کہ دوبارہ، ان مردوں سے سامنا ہو۔

عشق پیچاں کی الجھی ہوئی بیل پر کھلے ہوئے اس تنہا نیلے پھول کو جو کھڑکی میں اندر کی طرف منہ بند کئے کلی کی مانند لگا ہوا تھا۔ اس نے ہونٹوں سے چوما تو اس ذرا سی ٹھیس سے وہ جھڑ کر نیچے گر گیا۔

(Nahid darling, I am sorry to tell you,

but you are educated, your mother——)

اس نے اپنے کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ اُف خدا۔ نیلے منہ بند پھول نے اس کے ہونٹوں سے مس ہوتے ہی گر کر اس کو واپس اسپتال پہنچا دیا تھا۔ تو کیا میری ماں۔ میری ماں بھی یوں ہی گرنے والی ہے۔ یونہی" اس نے بھرے ہوئے دل سے پوچھا۔ آج تو بے سبب اداس ہے جی۔ اور بے سبب کیوں؟ ۔ سبب تو ہے! ہر چیز کا سبب ہے، یہ شاعری؟

پھر وہ کتابوں کی شیلف کی طرف بڑھی۔ جو افسانے اسے پسند تھے۔ ان کی دو دو چار چار سطریں پڑھیں۔ جو شاعر اسے پسند تھے ان کے دیوان اٹھائے الٹ پلٹ کر دیکھے اور واپس رکھ دیئے۔

"یہ ادب، شاعری، فلسفہ، منطق، سب الفاظ کا چکر ہیں۔ سب اچھلے اور پایاب ہیں۔ یہ جسم تو بھگو سکتے۔ پیاس نہیں بجھا سکتے۔ تسکین کی

33495

طرف اشارہ کرتے ہیں۔ تسکین کا ذریعہ نہیں بنتے۔ تو پھر ان کا مصرف کیا ہے؟ کیا مصرف ہے اس کا۔ یہ کیا چیز ہے ہوا کیا ہے؟ — کیا نہیں ہے؟" وہ سوچتی رہ
ابھی وہ اس سوال کا جواب تلاش نہ کر پائی تھی۔ کہ ابرار آیا۔ ٹرے کو اسٹول پر رکھ کر وہ اسٹول اس کے پاس لے آیا۔

وہ پلنگ سے اٹھی اور ٹرے سے پانی کا گلاس اٹھا لیا۔

"ایاّ نے" ابرار نے کہا۔ "آپ کی طبیعت خراب ہے آج رات کھڑکی اور دروازے بند کر کے سوئیے گا۔"

سیریڈون کی ٹکیا پانی سے نگلنے کے بعد ناہید نے گلاس رکھتے ہوئے ابرار کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ اسے یوں لگا گویا اس جملے کے پیچھے کوئی عجیب سی حقیقت پوشیدہ ہے۔ اس نے زندگی کے مختلف ادوار میں دوسروں سے اپنے احساسات پوشیدہ رکھے تھے۔ اس نے کبھی کسی کو یہ اجازت نہ دی کہ کوئی اس کے چہرے سے اس کے دل کے اندر جھانک سکے اور وہ جانتی تھی۔ کہ کس موقع پر کس انداز میں ایک اہم اور غیر معمولی بات کو انتہائی معمولی طور پر بیان کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت اس نے ابرار کے لہجے میں بھی کچھ کیفیت پائی۔

"مگر کیوں؟" اس نے ابرار سے کہا۔ ——— "میں تو سردیوں میں بھی کھڑکیاں بند کر کے نہیں سوتی، بند کمرے میں تو میرا دم گھٹ جاتا ہے پتہ نہیں میں اس چہار دیواری کو بھی کیسے برداشت کرتی ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے دودھ کا گلاس اٹھا لیا۔ ابرار خاموش رہا۔

"آخر بات کیا ہے؟" اس نے گلاس واپس ٹرے میں رکھتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں، کچھ بھی تو نہیں۔" ابرار نے ٹرے اٹھاتے ہوئے کہا۔

"کچھ تو بتاؤ۔"

میری بات یاد رکھئے گا بجیا!" اور ابرار تیزی سے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

"ابرار سنو تو" ناہید چیخی۔ لیکن بڑھتے ہوئے قدم واپس نہ ہوئے۔

وہ دیر تک ابرار کے اس جملے کو سمجھنے کی کوشش کرتی رہی۔ پھر اس کے خیالات کی رو اعجاز کی طرف بھٹک گئی۔ جو بہت دور انگلینڈ، اعلیٰ تعلیم کے لئے گیا ہوا تھا۔ اور پھر اس کو اپنی ماں یاد آئی جو سینی ٹوریم میں پڑی انتظار کر رہی تھی۔ اس جسم کا، اس ہستی کا انتظار جس کی تصویر ناہید نے اپنے تصور کے سہارے اپنے ذہن کی نظروں سے دیکھی تھی۔ یہ تصویر ناہید نے اپنی ماں کی گفتگو سے اخذ کی تھی جس کے دوران اس کی ماں کی آنکھیں بھیگ جاتی تھیں گفتگو ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی۔ الفاظ بکھر جاتے اور سسکیاں ابل پڑتیں۔ اور پھر بڑی دیر تک وہ ناہید کو ٹکر ٹکر گھورتی رہتی۔ اور اس وقت اس کی نظروں کے سامنے اس کی ماں کا چہرا تھا۔ اور کانوں میں ناہید ڈارلنگ کی تکرار — یا خدا!

اس کا دل بھر آیا۔ اس نے چاہا کہ خوب زور زور سے روئے، پھر اس نے سوچا کل اس کو اسکول میں کیا کچھ پڑھانا ہے۔ اور اس نے "بانگِ درا" اٹھالی۔

پچھلی رات کا زرد، اداس اور پیلا چاند اٹک کر رہ گیا تھا۔ ناہید نے اُسے یوں ہی محسوس کیا تھا۔ گویا چاند ویسے سیاہ کنوئیں میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔ اور لمحہ بھر کو اسے دیکھنے کے لئے رک گیا تھا۔ یہ رات اُس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹی تھی۔ تمام رات وہ اسی کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی تھی۔ اس وقت سے جب رات ابھی تاریک تھی۔ اور سیاہ چادر پر بکھرے ہوئے تارے جھلملا رہے تھے۔ تمام رات چپ چاپ سرسراتی ہوئی ہوا عشق پیچاں کے پتوں سے الجھ الجھ کر روتی رہی تھی۔ پھر چاند کھڑکی سے اترا تھا۔ اور رفتہ رفتہ دور ہوتا چلا گیا۔ اور اب اسے دیکھنے کے لئے ٹھہر گیا تھا۔ چاند کی روشنی مدھم ہوتی ہی گئی اور اب پھیکا بے نور چاند سرمئی پس منظر میں یوں ٹنگا رہ گیا تھا۔ گویا کسی غبارہ کی ہوا کم ہو جائے۔ اور اس کی چمک اڑ جائے۔

ناہید نے تکیہ کے نیچے سے ایک پرچہ اٹھایا۔ اور ایک مرتبہ پھر اس پر لکھے ہوئے ایک ایک لفظ کو غور سے پڑھنے لگی۔

ماموں جان ۔ مجھے افسوس ہے جب آپ کو یہ خط ملے گا۔ میں آپ کے گھر سے جا چکی ہوں گی۔ جو کچھ میرے ساتھ ہوا اس کی تفصیل بتانا میرے بس میں نہیں۔ رضیہ، شاہینہ، اظہر اور جاوید بھی کچھ نہ بتا سکیں گے۔ کہ ان کے ضمیر مردہ اور صحیح بات کہنے کے لئے ان کی زبانیں مفلوج ہیں۔ رضیہ اور شاہینہ اس حد کو پھلانگ چکی ہیں۔ جہاں وہ اظہر اور جاوید کو اپنی دوشیزگی کے لئے خطرہ سمجھ سکیں اور اسی بنا پر میں ابرار کو اپنے ساتھ لئے جا رہی ہوں۔ دنیا کو دھوکہ دینے کے لئے خالہ ہی کی موجودگی کافی ہے۔ (ناہید)

خط پڑھنے کے بعد اس نے سوچا کہ جو کچھ وہ کر رہی ہے ایک روایت کی تجدید ہے ایک مرتبہ پہلے بھی، یہ اس کے ہوش سے پہلے کی بات ہے۔ جو بہرحال اس تک منتقل ہو گئی تھی۔ اس کی ماں نے ایسی ہی راہ اختیار کی تھی۔ اس کی پھوپھی اس کی ماں کے پاس تایا کا پیغام لائی تھیں جو پہلے ہی تین بیویاں کو نگل چکے تھے۔ اور اب رنڈوے بنے بیٹھے تھے۔ "آخر کو ناہید کی ماں تم کب تک یونہی بیٹھی رہو گی۔ اچھا ہے گھر کی مٹی گھر کو لگے۔" اور پھر انہوں نے تایا کا پیغام دے دیا تھا۔

اس پر امی نے کہا تھا۔ "کون کہتا ہے میرے شوہر کا انتقال ہو گیا ہے۔ وہ زندہ ہیں اور ضرور واپس آئیں گے۔"

"یہ سب جھوٹ ہے۔" پھوپھی نے کہا۔ "وہ تو کب کے مر کھپ گئے۔ زندہ ہوتے تو واپس آ گئے ہوتے۔"

اور پھر امی نے پھوپھی کو اتنی زور سے جھڑکا تھا۔ "وہ میرے لئے زندہ ہیں۔ میرے تصورات میں ابھی زندہ ہیں۔ انہیں مردہ سمجھنے والے خود مر چکے ہیں۔" اور دوسرے ہی دن وہ اس مکان سے اٹھ آئی تھیں۔ "بھلا امی ایسے ماحول میں کیوں کر رہ سکتی تھیں۔ جہاں ان کے خیالوں اور تصورات کو لوگ جھٹلاتے تھے۔ آج میں پھر اس روایت کی تجدید کروں گی۔ میں بھی انہیں کی بیٹی تو ہوں۔ ناہید نے سوچا۔ پھر اس نے تشکر آمیز نگاہوں سے ابرار کو دیکھا جو دروازے کے قریب زمین پر بستر جمائے سو رہا تھا۔ "میرے محسن!" ناہید کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

ابرار کے لہجہ میں پوشیدہ خطرہ کی بو اس نے سونگھ لی تھی۔ اس کے پیش نظر اس نے کھڑکی بند کر لی تھی۔ اور پھر ناول پڑھتے پڑھتے اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ اور پھر اچانک اس کی آنکھ کھلی۔ کمرہ میں گھپ اندھیرا تھا۔ اور وہ سخت بازوؤں کی تنگ گرفت میں تھی۔ پھر روشنی کا جھماکا ہوا۔ اور بیساختہ اس کے منہ سے چیخ نکلی۔ "کیا ہوا۔ کیا ہے آپا؟" اور باہر دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز بازوؤں کی گرفت یک لخت ڈھیلی ہو گئی۔ اس نے بڑھ سوچا ابرار دروازے میں کھڑا تھا۔ اور کمرے میں رضیہ، شاہینہ، جاوید اور اظہر۔

نکل جاؤ تم سب کمینے، ذلیل، رذیل" اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جب رضیہ کمرے سے نکل رہی تھی۔ تو ابرار نے ایک جھٹکے سے کیمرہ چھین لیا تھا۔ اور زور سے فرش پر پٹخا تھا۔

پھر ابرار اسے بتا رہا تھا۔ "آپا، اتفاقاً میں نے ان کی باتیں سن لی تھیں۔ انھوں نے نہ معلوم کیا کچھ سوچا تھا۔ میں آپ کو یہ سب کیسے بتاتا آپا۔ بس میں نے یہی کیا، باہر کھڑا رہا۔"

پھر اس نے ابرار سے کہا تھا۔ کہ وہ اپنا بستر اسی کے کمرے میں لے آئے اور اس کے بعد وہ رات بھر نہ سو سکی تھی۔ وہ اٹھی اور انتہائی احتیاط سے دروازہ پار کیا۔ لیکن ابرار کی آنکھ کھل گئی۔

میں اوپر جا رہی ہوں، تم میرا تمام سامان، کتابیں، کپڑے وغیرہ باندھ لو۔" اس نے رات ہی اپنی ایک سہیلی نرگس کے ہاں منتقل ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

اس کا معمول تھا، صبح سویرے ابھی سورج نہ نکلا ہوتا وہ اٹھ جاتی، برش پر ٹوتھ پیسٹ لیتی اور چھت پر چلی جاتی۔ تمام ماحول خوشگوار خنکی میں لپٹا ہوتا۔ منڈیر پر بیٹھی وہ دانت صاف کرتی۔ اور سورج نکلنے سے پہلے کے سناٹے میں آوازیں سنتی رہتی۔ دودھ والے کی سائیکل کی آواز، منڈی سے

سبزی لانے والے کی ریڑھی کی آواز، اونٹ گاڑی کی آواز اور دور قومی شاہراہ پر گزرنے والی بسوں، گاڑیوں اور ٹیکسیوں کی آوازیں جو تاریکی میں کہیں دور سے آتی، اور کہیں دور ڈوبتی محسوس ہوتیں "زندگی بھی تو ایک آواز ہے جو اندھیرے سے ابھرتی ہے اور اندھیرے میں ڈوب جاتی ہے" دن کے چوبیس گھنٹوں میں صبح کے ان چند لمحات میں اس کو اپنی زندگی کا احساس ہوتا۔ وہ اپنا وجود اپنی آواز پالیتی۔ جو سورج کے طلوع ہونے کے ساتھ پھر کھو جاتا۔ صبح کے ان تسکین بخش لمحات میں وہ گزرے ہوئے دن کی یادوں سے اپنے غم کو اور بوجھل بناتی۔ اور ہر روز اسے یوں محسوس ہوتا کہ اس کا غم پہلے سے زیادہ گہرا ہو گیا ہے۔ بڑی دیر تک وہ خود میں اٹھنے کی سکت نہ پاتی۔ وہ منڈیر پر بیٹھی رہتی۔ یہاں تک کہ سورج کی پہلی کرن اس کے چہرے کو چھوتی اور وہ گہرا سانس لے کر اٹھ جاتی اور کہتی۔ "یا خدا! میرا انتظار ختم ہوگا یا نہیں"

دن کے مصروف لمحات میں وہ لوگوں کو بھاگتے دوڑتے دیکھتی اور سوچتی "یا اللہ! یہ لوگ کیسے ہیں؟ یہ تھک کیوں نہیں جاتے" دن کے ان لمحات میں اس کو اپنے وجود کے گم ہونے کا احساس ہوتا۔ اور پھر گویا تمام دن وہ خود ہی کو تلاش کرتی۔ بہت سے لوگوں کی آوازوں میں اس کی اپنی آواز کے معدوم ہونے کا احساس ہوتا۔

طلوع ہونے والے سورج کی پہلی کرن معلوم کب کی اس کے گالوں کو چوم کر اور انہیں شہابی بنا کر فضا کی آغوش میں جا سوئی تھی۔

"اپیا۔ خالہ بی یاد کر رہی ہیں" ابرار یہ کہہ کر واپس جا چکا تھا۔

"یا اللہ مجھے کس کا انتظار ہے۔ میرا انتظار کب ختم ہوگا" پھر وہ بوجھل قدم اٹھاتی زینے کی طرف بڑھ گئی۔

نرگس کے ہاں پہنچ کر ناہید نے یوں محسوس کیا۔ گویا وہ دیواریں جن میں وہ اب تک مقید تھی۔ اب اور کشادہ ہو گئی ہیں۔ "قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں۔ اور میں زندہ رہنے کے لئے بھی مجبور ہوں اور غم اٹھانے کے لئے بھی"

نرگس شادی شدہ تھی۔ بوڑھے باپ کے پاس رہتی تھی۔ اور بیوگی کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ اس کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی۔ کہ وہ محض بیوی بن سکتی تھی طوائف نہیں۔ جبکہ اس کے شوہر کا تقاضہ یہی تھا۔ اور یوں وہ سہاگن ہونے کے باوجود بیوہ ہو گئی تھی۔ اور اس کا شوہر کسی اور شہر میں طوائفوں اور سوسائٹی گرلز سے عشق لڑا رہا تھا۔ اور شاید کبھی بھولے سے بھی اپنی بیوی کو یاد نہ کرتا تھا۔ جب بھی اس کی منتظر تھی۔ اور اب بھی اپنی آغوش اس کو خوش آمدید کہنے کے لئے وا کئے ہوئے تھی۔ یہ پوری داستان نرگس کے چہرے پر لکھی ہوئی تھی۔ نرگس کی آنکھوں میں انتظار کی ویرانی تھی۔ ہونٹوں کے پھول مرجھا چکے تھے اور چہرے پر گہری گہری لکیریں ابھرنے لگی تھیں۔ جو اس کے غم کا پتہ دیتی تھیں۔ ناہید سے تمام واقعات سننے کے بعد اس نے کہا۔

"یہ دور شرکی قوتوں اور ظلمتوں کا دور ہے۔ ہم ایسی لڑکیاں اس دور کے لئے "Misfit" ہیں"

"ہم سب بھٹک رہے ہیں، ہم سب اندھے ہیں" ناہید نے کہا۔

میرا خیال ہے تم آج اسکول نہ جاؤ۔ سینی لوڈیم جاؤ، امی کو سب حالات معلوم ہونے چاہئیں" نرگس نے کہا۔ اور ناہید کے کانوں میں سیٹیاں بجنے لگیں۔

Nahid darling I am sorry to tell you, but
you are educated, your mother ————

"نرگس۔ کیا تعلیم یافتہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی محض حقیقت پسند بن کر رہ جائے۔ کیا احساسات کی کوئی وقعت نہیں"

"شاید ایسا ہی ہو۔ مگر وہ لوگ جو اپنے تصورات اور خیالوں کے مطابق زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ وہ ہمیشہ گھاٹے میں رہتے ہیں۔ اور تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود جاہل رہتے ہیں"

نہ نرگس ہی ناہید کا جملہ سمجھ پائی تھی اور نہ ناہید ہی کو نرگس کا جواب سمجھ میں آیا تھا۔ وہ دونوں جاہل تھیں۔

سینی ٹوریم پہنچ کر اس نے اپنی ماں کو دیکھا۔ جو سفید چادر اوڑھے لیٹی تھی۔ سفید چادر کے نیچے چند آڑی ترچھی لکڑیاں چھپی تھیں جو اس کی ماں کا جسم تھیں۔ نرس نے اُسے بتایا تھا۔ کہ مریضہ نے گزشتہ رات انتہائی تکلیف میں گزاری تھی۔ اور تھوڑی دیر پہلے آنکھ لگی تھی۔

اپنی ماں کی یہ حالت دیکھ کر اس کا دل بھر آیا۔ انتظار کے بیس طویل سالوں کے ایک ایک لمحہ کی مکمل داستان۔ انتظار جو اس ہستی کا تھا جو اجنبی خاک کا حصّہ بن چکا تھا۔ لیکن اس کی ماں مایوس نہ تھی۔ وہ آج بھی منتظر تھی۔ "ناہید مجھے یقین ہے مجھے یقین ہے میری بچی، میں یہ بات تم ہی سے کہہ سکتی ہوں۔ دوسرے شاید مجھے پاگل سمجھتے ہیں۔ مگر مجھے یقین ہے کہ تم مجھے پاگل نہ جانوگی" اور پھر وہ سرگوشی کے لہجہ میں کہتیں تمہارے ابّا زندہ ہیں مجھیں تمہارے ابّا زندہ ہیں وہ ضرور واپس آئیں گے۔" اور پھر وہ نہ معلوم کیا کیا باتیں کرتی رہتیں۔

اس نے یہی جملہ اپنی ماں سے نہ معلوم کتنی بار سنا تھا۔ وہ بچپن ہی سے یہ جملہ سنتی آئی تھی۔ اپنے انتہائی بچپن کی باتیں اسے یاد تھیں وہ روزانہ امی کے ساتھ اسکول جاتی اور واپس آجاتی۔" میں کہتی ہوں بیٹی تمہارے ابّا آج شام کو آجائیں گے۔" شام ہو جاتی، رات کے سائے بڑھ جاتے اور دوسرے دن کی صبح پر یہ اُمید ٹل جاتی۔" لیکن وہ سورج کبھی طلوع نہ ہوا جو اس صبح کی کوکھ سے ابھرتا جب انتظار کی یہ مدّت ختم ہو جاتی۔ اور خود وہ بھی تو اب منتظر تھی۔ کس کی، شاید ابّا کی ــ شاید ابّا کی۔

اپنی ماں کے چہرے کو دیکھتے ہوئے اسے یہ تمام باتیں یاد آئیں۔" میری امّی ـــ میری امّی ـــ تم اتنی سمجھدار ہو اور اتنی باہمت۔ لیکن تم یہ کیوں نہیں جانتیں کہ ابّا اس دنیا میں موجود نہیں۔ تم میں اتنی ہمت کیسے ہے کہ انتظار کا مسلسل زہر پینے کے باوجود آج تک زندہ ہو۔"

اس کی ماں کی شادی کو ابھی تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا۔ کہ اس کے ابّا کو جنگ پر جانا پڑا۔ اس نے غیروں سے جنگ میں حصّہ لیا۔ تاکہ اس کی بیوی اور بچی ایک غلام ملک میں پرورش پاتی رہیں۔ وہ بچی جس کو اس نے نہ دیکھا تھا۔ اور جس کی پیدائش کی خبر اس نے محاذ جنگ پر ایک سنسر شدہ خط میں پڑھی تھی۔ رات کے وقت وہ محاذ پر بیٹھا چاندنی رات میں خط لکھ رہا تھا۔ کہ ایک زوردار دھماکے کے ساتھ وہ خود اجنبی خاک کا حصّہ بن گیا۔ اس کے خط کا گھر پر انتظار ہوتا رہا۔ یہ خط کبھی نہ آیا۔ پھر طویل عرصے کے بعد سرکار کی طرف سے ایک طویل فہرست اس نوٹ کے ساتھ ملی: مندرجہ ذیل لوگ لاپتہ ہیں۔ گمان غالب ہے کہ یہ افراد دشمن کی قید میں ہیں۔ فہرست میں انتظار حسین کے نام کے سامنے سرخ نشان لگا ہوا تھا۔ پھر امید وبیم کا ایک طویل عرصہ شروع ہوا۔ سرکار کی طرف سے بیگم انتظار حسین کے نام مخصوص رقم کا منی آرڈر آتا رہتا۔ پھر بڑے دھوم دھام سے" وکٹری ڈے" منایا گیا۔ انتظار ختم ہوا۔ مایوسیوں کے بادل جو امید کے سورج کو ڈھانپے ہوئے تھے چھٹ گئے۔ اور پھر رفتہ رفتہ یہ سورج تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ چاروں طرف تاریکی پھیل گئی۔ لیکن اس کی ماں نے اپنے دل میں انتظار کی جو شمع روشن کر رکھی تھی۔ وہ اب بھی فروزاں تھی۔

کبھی کبھی ناہید اپنی خوش مذاقی کے اظہار کے لئے بڑے زور سے کہتی۔

"میں انتظار کی بیٹی ہوں اور مجھے انتظار نے جنم دیا ہے۔"

ناہید اماں کے بیڈ کے قریب کرسی پر بیٹھی اماں کے چہرے کو دیکھتی رہی اور ان واقعات کو دہراتی رہی۔ جو یا تو خود اس کی ماں نے اسے بتائے تھے یا پھر دوسرے لوگوں سے سُنے تھے۔ وہ دیر تک یونہی بیٹھی رہی اک سکتہ رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے" یہ مصرع اس کے ذہن میں آیا۔ اور وہ لرز کر رہ گئی پھر اس نے انتہائی غور سے سینے کے اوپر چادر کو دیکھا۔ اور سانس کے ساتھ چادر کے خفیف سے اتار چڑھاؤ کو دیکھ کر مطمئن ہو گئی۔ اور پھر اس نے سرہانے وہ اُونی شال رکھی جو وہ پچھلے دن ہی اماں کے لئے خرید کر لائی تھی۔ اور پھلوں سے بھری ٹوکری میز پر رکھ کر باہر آگئی۔

وارڈ کے برآمدے میں وہ آہستہ قدموں سے آگے بڑھ رہی تھی۔ کہ سامنے سے ڈاکٹر فہمیدہ آتی نظر آئی۔" ہیلو ناہید۔"

"ہیلو ڈاکٹر" ناہید نے بڑی مشکل سے کہا اور تیزی سے نکل چلی گئی۔

"پور ڈارلنگ!" ڈاکٹر فہمیدہ نے سوچا تھا۔ اور اس وقت جب اس نے ناہید کو مخاطب کیا تھا۔ تو ناہید کو یوں لگا گویا موت کا فرشتہ اس کے سامنے آگیا ہو۔

گھر پہنچ کر وہ بے سدھ پلنگ پر گر پڑی اس کے ذہن میں ایک آندھی سی چل رہی تھی۔ ایک سناٹا تھا جو اس کے وجود کے گرد پھیل گیا تھا۔ اور اس سناٹے میں اس کو اپنے وجود کے ٹوٹنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس کو اپنی ماں کی زندگی کے متعلق کوئی خوش فہمی نہ تھی۔ لیکن یہ کیا۔۔ یہ کیا ہونے والا ہے۔ کیوں ہو رہا ہے؟ ان سوالات کے جواب اس کے پاس نہ تھے۔ اس وقت وہ خود کو بے سہارا سمجھ رہی تھی۔ شاخ سے ٹوٹا ہوا پتہ جو آندھیوں کے دوش پر اڑتا چلا جاتا ہے۔

گزشتہ دن کی بات ہے۔ وارڈ سے نکلنے کے بعد وہ ڈاکٹر فہمیدہ سے ملنے گئی تھی۔ جو کسی زمانے میں اس کی کلاس فیلو تھی۔ اور انہوں نے کہا تھا۔

"Nahid darling I am sorry to tell you, but you are educated, your mother will be leaving you soon."

ڈاکٹر فہمیدہ نے یہ جملہ اجنبی زبان میں شاید اس لئے کہا تھا۔ کہ جملے کی نشتریت کم ہو جائے۔ مگر بات تو مفہوم کی تھی۔ "Soon" آج بھی ہو سکتا ہے۔ کل بھی۔۔ "Soon" ۔ ایک شے رہ گئی تھی سو وہ بھی خوش ہے۔

وہ دن یوں ہی گزر گیا۔ برابر کے کمرے سے نرگس کے بوڑھے باپ کی کھانسی ابھرتی رہی تھی۔ ابرار کا کچھ پتہ نہ تھا۔ اور اسے کوئی کام نہ تھا۔

غم و اندوہ کے اس اندھیرے میں اسے اعجاز یاد آیا۔ جس کا ایک عرصہ سے کوئی خط نہ آیا تھا۔ وہ اعجاز کو خط لکھنے میں مسرت محسوس کرتی تھی لیکن کبھی خط لکھنے میں پہل بھی اس کی طرف سے نہ ہوتی۔ مگر آج۔۔ مگر آج سے کچھ درد میرے دل میں سوا ہوتا ہے۔ اس نے پیڈ اٹھایا۔ اور لکھنا شروع کیا۔

"اعجاز!

خدا کرے تم ہمیشہ خوش رہو۔ تمہارا خیال ہے کہ میں ایک دقیانوسی لڑکی ہوں۔ لیکن تم یہ تو بتاؤ کہ کیا یہ خامی اتنی بڑی ہے کہ مجھے اس کی بنا پر بالکل ناکارہ سمجھ لیا جائے۔ تم لوگ، دقیانوسیت کے اتنے مخالف کیوں ہو؟ اگر تمہیں ہزاروں سال پرانا ڈھانچہ مل جائے تو اس کی بازیافت پر بغلیں کیوں بجاتے ہو؟ تھیسس کیوں لکھتے ہو۔ ہزاروں سال پرانی تہذیب کے باقیات کو عجائب خانوں کی بڑی بڑی عمارتوں میں کیوں سجاتے ہو۔ اور اس مردہ تہذیب پر کیوں فخر کرتے ہو اس کے باوجود تم ایک ایسی لڑکی کو کیوں قبول نہیں کر سکتے جو اب بھی مٹتی ہوئی تہذیب کی نشاندہی کرتی ہے۔ تم ماضی بعید سے اتنا پیار کیوں کرتے ہو۔ اور ماضی قریب سے جس کے رشتے بلا واسطہ حال سے ملے ہیں کیوں نفرت کرتے ہو؟"

(اس کے بعد اس نے بڑی تفصیل سے گذشتہ شب کا قصہ لکھا)

"میں آج امی کو دیکھنے سینی ٹوریم گئی تھی۔ کس قدر افسوس ہوا مجھے ان کی حالت دیکھ کر۔ مجھے رونا آرہا ہے کہ میں جو ان کا خون ہوں۔ اُن کی حالت پر صرف افسوس کر سکتی ہوں۔ امی۔ یہ میرے لئے تو ایک بہت بڑا سوال ہیں۔ ان کا وجود میرے لئے ڈھارس کا باعث ہے۔ ان کے وجود میں میں نے اپنے باپ کو دیکھا ہے ان کی آنکھوں سے میں نے اپنے باپ کی تصویر دیکھی ہے ایک باپ حقیقت میں کیسا ہوتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کیسا ہو سکتا ہے۔ میں البتہ یہ لکھ سکتی ہوں، تو پھر تم ذرا تفصیل سے لکھنا کہ باپ حقیقت میں کیسا ہوتا ہے؟"

یہاں پہنچ کر اس نے اپنی نم آنکھوں کو صاف کیا۔ اور پھر لکھنا شروع کیا۔

"اب سوجاؤ ناہید، رات کافی ہوگئی ہے۔"

"مگر دن کب نکلا تھا؟" اس نے کہا۔ اور جغرافیہ کی کتاب اٹھالی لیکن وہ کچھ نہ پڑھ سکی۔ اُس کا ذہن خطے کر سمندروں اور بر اعظموں پر برق رفتاری سے اڑ رہا تھا۔ یہ عدن ہے، یہ اسکندریہ ہے، یہاں ہم نہر سوئز پار کر کے آئے ہیں۔ یہ روم ہے، یہ مالٹا ہے، یہ لزبن ہے، یہ لندن ہے، یہ اعجاز ہے۔ اور ڈاکیہ وردی پہنے دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔ اس کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ جغرافیہ کی کتاب اس کے سینے سے ڈھلک جاتی ہے پھر وہ جغرافیہ کی کتاب کو سرہانے رکھ کر درود شریف پڑھتے پڑھتے سوجاتی ہے۔ اور رات بھر ۶۰ واٹ کا بلب، دو جسموں پر سلگتا رہا۔ جن کی روحیں روشنی اور پیار کی تلاش میں کھوئی ہوئی تھیں۔

زندگی ایک مرتبہ پھر اپنے ڈھرے پر چل نکلی تھی۔ دن گزرتے رہے۔ راتیں ڈھلتی رہیں۔ وقت سسکتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ اس کی ماں کی طبیعت قدرے سنبھل گئی تھی۔ اور وہ یوں محسوس کرتی۔ گویا ایک کڑا وقت گزر گیا ہے۔ ایک بری گھڑی ٹل گئی ہے۔ "مگر کب تک کے لئے؟" یہ ایک ایسا سوال تھا جو اس کے لئے ہمیشہ پریشانی کا سبب بنا رہا۔ اس کے ماموں نے اس کو واپس لے جانے کی بے حد کوشش کی۔ مگر اس نے صاف انکار کر دیا۔

"میں جس کے لئے زندہ ہوں۔ اس کے لئے یہاں بھی زندہ رہ سکتی ہوں!" اس کا جواب تھا۔

ڈاکٹر فہمیدہ نے ٹھیک ہی کہا تھا۔

دو ہفتہ بعد ہی اس کو اسکول میں ڈاکٹر فہمیدہ کا فون ملا اور وہ فوراً آسینی ٹوریم پہنچی۔ اس کی ماں کی حالت بے حد نازک تھی۔ ناہید نے محسوس کیا کہ وہ وقت آگیا ہے جب اس طویل رفاقت کا سلسلہ ختم ہو جائے گا اور یہ سوچ کر خود اس کی حالت دگر گوں ہوگئی۔ "موت کا ایک دن معین ہے"۔ وہ تو ٹھیک ہے، وہ سوچتی۔ "مگر کیا ہی اچھا ہوتا۔ کہ یہ تعین بھی انسان کے اپنے اختیار میں ہوتا۔" ماں بیٹی دونوں کو آنے والے لمحہ کا پورا احساس تھا۔ دونوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ دونوں کی زبانیں گنگ تھیں ایسے وقت میں کیا کہا جاسکتا تھا۔ تین دن اس کی ماں نے جانکنی کے عالم میں گزارے وہ باقاعدہ موت سے جنگ میں مصروف تھی۔ اور آخری لمحہ تک موت کا خوف بھی اس کے انتظار کو ختم نہ کرسکا۔

یہ تین دن ناہید نے اپنی ماں کے پاس گزارے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو ٹکر ٹکر گھورتی رہتیں۔ انہوں نے خاموشی میں ایک دوسرے سے باتیں کیں۔ اس عرصہ میں ناہید کو یوں لگا۔ گویا اس کی ماں کا ہر ہر جذبہ، ہر احساس، ہر تصور خود اس میں منتقل ہو رہا ہے یہ چوتھی رات تھی۔ اس کی ماں بڑے پرسکون انداز میں اس کو دیکھ رہی تھی۔ اور پھر ناہید نے اپنے آپ میں ایک عجیب نامعلوم سی تبدیلی محسوس کی گویا خود اس میں اس کی ماں کی پوری شخصیت حلول کرگئی ہو۔ "میں جارہی ہوں بیٹی ــــ تمہارے ابا ضرور آئیں گے۔"

اور وہ اس نئے غم اس نئے بوجھ کو برداشت نہ کرسکی۔ جب اسے ہوش آیا تو اس کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ "امی ــ" اس کے منہ سے پہلا لفظ نکلا جو بذات خود ایک مکمل سوال تھا۔ نرگس اور ابرار کی آنکھوں کے آنسوؤں میں اس نے اپنا جواب پایا۔ اور پھر بڑے سکون سے پوچھا۔ "ان کو دفنا دیا گیا؟"

"ہاں!" نرگس اور ابرار نے بیک وقت کہا۔

"کون ستارے چھو سکتا ہے، راہ میں سانس اکھڑ جاتی ہے۔" اس نے بے دلی سے سوچا۔

"ناہید بیگم ـــ اعجاز نے لکھا تھا۔ "یونیورسٹیوں کا کام صرف اتنا تھا۔ کہ انہوں نے میرے ہاتھ میں ڈگریوں کے پرزے تھما دیئے۔ مگر وہ شعور وہ ذہن، وہ لیاقت، وہ ذہانت جس سے انسان انسان بنتا ہے۔ میں نے تم سے حاصل کیا ہے۔ تم سراپا احساس ہو اور ذہن، میری تہذیب

میں تمہارا بہت بڑا دخل ہے۔"

"شریر!" وہ بڑبڑائی۔ "تم بچپن ہی سے ایسے ہو" اس کے سامنے امجد کا چہرہ تھا۔ آنکھوں پہ سیاہ عینک، ہونٹوں پر مچلتی ہوئی مسکراہٹ، "ناہید بیگم" وہ اکثر کہا کرتا تھا "تم جدید تر دقیانوس ہو۔ آج کے دور میں دیوتاؤں اور اوتاروں کا سلسلہ بند ہو گیا ہے اگر میرا بس چلے تو تمہاری پرستش کرواؤں لوگوں سے کہ تم اسی قابل ہو۔"

ناہید نے پھر خط پڑھنا شروع کیا۔ "تو بھی بات کہنے کی یہ ہے۔" اور پھر جوں جوں وہ خط پڑھتی گئی۔ اس کی آنکھیں دھندلاتی گئیں۔ اس کا دل ڈوبتا چلا گیا۔ اور جب اس نے خط ختم کیا تو خط کے کئی حروف اس کے آنسوؤں کی بنا پر پھیل گئے تھے۔

"تم ہمیشہ ہی سے کھلنڈرے رہے تھے۔ آج تم نے احساسات کو بھی ایک کھیل بنا ڈالا" اس نے دل ہی دل میں کہا اور خط کو اتنی احتیاط سے تکیے کے نیچے رکھا۔ گویا کوئی میت لحد میں اتاری ہو اور پھر وہ بھاری دل کے ساتھ پلنگ پر لیٹ گئی۔

"ڈھل چکی رات بکھرنے لگا تاروں کا غبار" اس کا ذہن لگاتار اس مصرعہ کی گردان کرتا رہا۔ وہ پلنگ پر پڑی چھت کو تکتی رہی جس کے ایک کونے میں لکڑی اپنا جالا بننے میں مصروف تھی۔ اس کے دل میں غم کا ایک سمندر تھا۔ "ہمارا کیا ہے۔ ہمارا کیا ہے۔ ڈھل چکی رات بکھرنے لگا تاروں کا غبار ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے۔ ہم ہیں چراغِ آخرِ شب، نیند آتی ہے۔ اگر جلتی ہوئی آنکھوں میں کوئی دیوانے کی زنجیر ہلا دیتا ہے۔ صنوبر کے رفیق، ببول کو نہ جلاؤ، بند گر جلائے اگر جلتے ہوئے شعلوں پہ آگ بھی بولتی ہے، آگ بھی بولتی ہے؟"

پھر وہ اٹھ بیٹھی، میز سے رائٹنگ پیڈ اٹھایا اور لکھنا شروع کیا۔

"— اور جب زندگی کے تمام سہارے ٹوٹ جاتے ہیں تو نہ جانے وقت کیوں ظالم ہو جاتا ہے۔ میرا کوئی دوست نہیں، کوئی دشمن نہیں کتنی تنہائی ہے۔ کوئی ویرا[illegible] ویرانی ہے، وقت نے مجھ پر کوئی ستم نہیں کیا، یا کیا ہے؟ — کس کو پتہ؟ میں نے تمام عمر ٹوٹے ہوئے رشتوں کو جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ میں نے اپنی زندگی بکھرے ہوئے سہاروں کو یکجا کرنے میں بسر کی ہے۔ میں نے اپنے سہاروں میں پڑے ہوئے رخنے رفو کرنے میں ایک ایک لمحہ حیات صرف کیا ہے۔ میری انگلیاں چھلنی ہو گئیں۔ مگر ہر رخنہ جس کو میں نے رفو کرنا چاہا بڑھتا ہی گیا۔ اور آج میں خود ایک بہت بڑا رخنہ بن کر رہ گئی ہوں۔ ایک زندہ گھاؤ میری تصویر — یہ کیا ہے —؟ یہ کیوں ہے؟ —

اور اب نہ معلوم کون میرے کانوں میں سرگوشیاں کر رہا ہے۔ شاید یہ وقت کی آواز ہے۔ مگر نہیں میرا خیال ہے کہ یہ ماضی کی آواز ہے۔ وقت میرے نزدیک مایوس کن حقیقت نہیں۔ تو پھر یہ ماضی، گذرے ہوئے وقت کی سرگوشی ہے جو مجھ سے مخاطب ہے "ناہید — جوڑنا اب ٹوٹے ہوئے رشتے۔ چاک گریباں رہنے دے، تو کیا میری تمام زندگی اب ان ٹوٹے ہوئے رشتوں کے مدفن میں گزرے گی؟ آخر رشتوں کا — سہاروں کا، کیا فائدہ؟ اور اگر فائدہ ہے تو ان کی ٹوٹ پھوٹ میں کونسی تخلیقی قوت کارفرما ہے — ماضی کی اس سرگوشی کے لئے میرا جواب یہ ہے۔ میں اب گریباں ہی ختم کئے دیتی ہوں، پھر اس کو چاک کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوگا — میں ٹوٹے ہوئے رشتوں کو کیسے جوڑ سکتی ہوں۔ جب کہ خود میں ایک ٹوٹا ہوا رشتہ ہوں — جس نے شاید کبھی وقت کا ساتھ نہ دیا — مگر —؟

یہاں پہنچ کر وہ رکی۔ اس نے پھر شروع سے تمام خط پڑھا۔ مگر اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ وہ کونسی ایسی بات ہے جو خود اس کو کھٹک رہی ہے کہ غلط الفاظ اس کے قلم سے نکل گئے ہیں۔ "اب چھوڑو بھی کیا ٹھیک ہے کیا غلط — یہ سب اضافی باتیں ہیں۔ جو گفتگو، جو عمل، جو خیال وقت کی اکائی میں موزونیت سے ڈھل جائے۔ وہی ٹھیک ہے۔ ورنہ کوئی چیز اپنی خالص شکل میں غلط نہیں۔ یہ وقت ہے جو ایک چیز کو غلط اور ایک

کو مسخ کر دیتا ہے۔ وقت ہی سب سے بڑا منصف ہے:

"اعجاز کو خط لکھ رہی ہو کیا؟" نرگس نے کروٹ بدل کر پوچھا تھا۔ "ہوں" کہہ کر اس نے پھر لکھنا شروع کیا۔

"سنو۔ اُمی کا انتقال ہو گیا، میں نے سوچا ہے ان کی قبر پہ یہ کتبہ لگوا دوں۔

"مدفن انتظار"

زوجۂ انتظار ـــ جس نے واقعتاً انتظار سے شادی کی

اُمی کی موت نے مجھے دہلا کر رکھ دیا ہے۔ یا اللہ آخر اب میں کس کے لئے زندہ رہوں، سنو اِتم ٹھیک ہی کہا کرتے تھے کہ میں دقیانوسی ہوں۔ میرا خیال ہے میں تمہاری واپسی کا انتظار نہ کر سکوں گی۔ میں اس وقت سے پہلے ختم ہو چکی ہوں گی۔ میں جانتی ہوں کہ تم میرا مضحکہ اڑاؤ گے مگر میں کیا کروں کہ مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے۔ اب تم اسے کچھ ہی نام دے سکتے ہو۔ دقیانوسیت، یاسیت، نا اُمیدی، خلل دماغ یا کچھ اور کہنے کا مطلب کہ تم واپسی پہ میری قبر کو اس کتبہ سے سجا دینا۔

(ــــــــــــــــــــ ـ ــــــ)

پہلی سطر تمہاری مرضی پر منحصر ہے جو چاہے لکھوانا۔

(ناہید چاہتی تھی۔ کہ اعجاز جو اس کی مرضی سے اس کی زندگی کا عنوان نہ بن سکا۔ اس کی موت کے لئے کوئی اچھا سا عنوان پسند کرے)

"وہ جو لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر تھی۔ جس کی زندگی بے وقت کی راگنی تھی۔ مگر جس نے مرنے میں

بہت دیر کی۔ اور جو وقت کے کسی بھی خانے میں موزوں نہ ہو سکی ـــــ وہی ناہید"

اس کے بعد سنو تمہارا خط ملا اور ساتھ ہی تمہاری اور استھر کی فوٹو بھی۔

اس کی آنکھ سے ایک آنسو ٹپ سے کاغذ پر گرا۔ "چشمِ خوں بستہ سے کل رات لہو پھر ٹپکا" اس نے سوچا۔ برابر کے پلنگ پر نرگس نے کروٹ بدلی ـــ

"یقین کرنا ۔ مجھے اپنی آنکھوں پہ یقین نہ آیا۔ میں نے ہزاروں مرتبہ خواب میں تمہاری تصویر کے ساتھ اپنی تصویر فریم میں لگی دیکھا ہے استھر کو میرے اس خواب کی تعبیر پہ ڈاکہ ڈالنے کا کوئی حق نہ تھا۔

اس نے سوچا کہ یہ لائن کاٹ ڈالے پھر مگر اب کیا ہوتا ہے۔ ان سطور کا اب کیا وقعت، وقت آگے نکل گیا ہے، میں پیچھے رہ گئی ہوں"

"مگر خیر چھوڑو بھی ـــ مجھے تمہاری پسند پہ پورا اعتبار ہے۔ جانتی ہوں کہ استھر یقیناً مجھ سے کہیں بہتر ہو گی۔ اس میں کئی خوبیاں ہوں گی۔ وہ ایک مکمل ترین لڑکی ہو گی۔ دنیا کی تمام خوبیوں کا مجموعہ کہ تم ایسے شخص نے اس کو پسند کیا ہے۔ مگر نہ جانے کیوں میں استھر کو خراب سمجھتی ہوں۔ شاید امی کی موت نے میرے ذہن پہ برا اثر ڈالا ہے۔

بہر حال میری دعا ہے کہ تم اور استھر خوش و خرم رہو۔

حرفِ مکرر

"ناہید"

جسے شاید اب مٹ جانا چاہئے۔

خط ختم کرنے کے ساتھ اس نے سوچا۔ گویا وہ اپنا آخری فرض بھی پورا کر چکی ہے اور وہ بڑی دیر تک بے حس و حرکت یوں بیٹھی رہی گویا کوئی بڑی منزل طے کرنے کے بعد سستانے کے لئے ٹھہری ہو۔ "اب آگے کیا ہے۔ ہم ہیں اور اک نظامِ تیرہ شبی۔" وہ ان ٹوٹتے ہوئے رشتوں اور بکھرے ہو-

سہاروں کے متعلق سوچتی رہی۔ جن کو سمیٹنا اس کے لئے ناممکن تھا۔

رات چپکے چپکے بہتی رہی۔ برابر کے پلنگ پر نرگس کروٹیں بدلتی رہی۔ اور وہ بے حس و حرکت پلنگ پر بیٹھی ایسی چیزوں کے متعلق سوچتی رہی جو تاریکی میں گم ہو چکی تھیں، یا جن کو گم ہونا تھا۔

رات گئے نرگس نے کروٹ بدل کر کہا۔ "ابھی تک جاگ رہی ہو ناہید، اب سو جاؤ۔"

"ہاں! اب سونا ہی تو باقی رہ گیا ہے زندگی میں۔" اس نے جواب دیا، اور پھر دل ہی دل میں بولی۔

اور تم بھی تو جاگ رہی ہو نرگس، اس شوہر کے انتظار میں جو اس وقت نہ معلوم کس کوٹھے پر خراٹے لے رہا ہوگا۔ اور اس کے دل میں ہلکا سا خیال بھی نہ ہوگا۔ کہ بہت دور ایک بیوی، اپنے بیوی ہونے کے جرم کی پاداش میں ابھی تک کروٹیں بدل رہی ہے، ہم دونوں منتشر روحیں ہیں۔ مشرق کی بھٹکی ہوئی روحیں، تم نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ ہم اس ماحول کے لئے "misfit" ہیں۔ ہمیں اس ماحول میں زندگی گزارنے کا کیا حق؟ تم کیوں زندہ رہنا چاہتی ہو؟ —— امی نے زندہ رہ کر کیا کر لیا —— میں کیوں زندہ رہوں۔ مسلسل انتظار، کرب، بے چینی، مایوسی، ناامیدی، یہی آل ہے مشرقی عورت کا۔ تمہیں معلوم نہیں، ڈھل چکی رات، اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا۔ اب تمہیں بھی اور مجھے بھی، اپنے بے خواب کواڑ مقفل کر لینے چاہئیں۔ یہ دیدے یوں ہی ویران رہیں گے۔ کھنڈر کی شکستہ دیواریں ٹوٹ رہی ہیں۔ اور ایک دن وہ دیوار بھی زمین پر آ رہے گی۔ جس پر ایک پودا اگا ہوا ہے کہ وقت سے علیحدہ ہو کر دوامی زندگی نہیں مل سکتی۔ وقت کو نظر انداز کرنے والوں کا یہی انجام ہونا ہے جو امی کا ہوا ہے جو تمہارا ہوگا۔ اور جو میرا ہونا ہے، کون ایک میت کو اپنائے گا۔ رنگ و بو پھول خزاں سے ہی لیا کرتے ہیں۔ اور زندگی کیا ہے۔ کیا ہے۔ زندگی صرف بہاروں کا تماشا تو نہیں۔ ہمارا کیا ہے، برگ خزاں دیدہ —— "ناہید بیگم تم مجھے بہت بد مذاق کہا کرتی تھیں۔ ان سے ملو، یہ ہیں تمہاری بھابی اسٹیلا۔ کہو"

"خوب، خوب، تیر الزام بھی، سنگ دشنام بھی ان کا دمساز اپنے سوا کون ہے۔ شہر قاتل میں اب باصفا کون ہے۔ رخت دل باندھ لو —— دلفگارو چلو۔ دلفگارو چلو —— اب یہاں کوئی نہیں آئے گا۔"

پھر اس نے لائٹ آف کی۔ اور پلنگ پر لیٹ کر کھلی آنکھوں سے تاریکی میں دیکھنے لگی۔ اور نہ معلوم کب تک دیکھتی رہی۔

"زندگی ریت سہی درد کا چشمہ بھی تو ہے"

شہرِ آرزو

کے بعد

باقر مہدی کا نیا شعری مجموعہ

"ریت اور درد"

(زیرِ طبع)

آظم میرزا
انکار کراچی

ٹوٹے دل کی صدا

ولائتی گھر میں داخل ہوا، تو اس کا سانس دھونکنی کی مانند چل رہا تھا۔ چھپر کے نیچے کھڑے ہو کر وہ جھکا۔ میلی دھوتی کے پہرے سے چہرے کا پسینہ پونچھا۔ اور تپتے ہوئے صحن میں نظریں گھما کر پھولے ہوئے سانس کو قابو میں کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

کمرے میں اس کی بیٹی مریم منی کے بیلے میں ستو گھول رہی تھی۔

ولائتی نے دہلیز پر بیٹھ کر اندر جھانکا۔

مریم کو اس کی موجودگی کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ پھٹے ہوئے دوپٹے سے پیالہ ڈھانپ کر اس کے قریب آگئی۔

"ابا، اب طبیعت کیسی ہے؟"

صبح جب وہ گھر سے نکلا تھا، تو اس کے سر میں درد تھا، اور حرارت بھی محسوس کر رہا تھا۔

اس نے مریم کی طرف نظر بھر کر دیکھا، اور پھر اس نے یوں نظروں کا زاویہ بدل لیا، جیسے اسے خدشہ پیدا ہو گیا ہو کہ کہیں مریم اس کی آنکھوں میں وہ تحریریں نہ پڑھ لے۔ جو آدمی کو سوگوار بنا دیتی ہیں۔ غم کے اتھاہ سمندر میں ڈبو دیتی ہیں۔ اور زندگی کی ساری رونقیں سمٹ کر ایک بدوضع دھبے میں چھپ جاتی ہیں۔ اور کراہتوں کے دائرے روح کے گرد یوں پھیلنے لگتے ہیں۔ جیسے ریشم کا کیڑا اپنے ہی تاروں میں الجھ کر دم توڑ رہا ہو۔

مریم کھجور کا پنکھا پکڑ کر اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔

"ابا، دوا تو پی ہوگی؟"

"ہوں۔" ولائتی نے اس کے سوال کو نظر انداز کر کے کہا۔ "تین بجے چلا تھا، اب ساڑھے تین کا وقت ہوگا۔ مگر تپش میں ذرہ بھر فرق نہیں پڑا۔ سورج آگ برسا رہا ہے۔"

مریم کی تشویش کم نہ ہوئی تھی۔

"ابا، تم اپنی صحت کا خیال کیوں نہیں کرتے۔ ہم تو روکھی سوکھی کھا کر گزارہ کر ہی لیتے ہیں۔ کسی ڈاکٹر سے دوا لے آتے ہوتے۔!"

ولائتی نے اس کے چہرے پر کرب کی پرچھائیاں دیکھ کر کہا۔

"تم نے بھی کچھ کھایا ہے یا نہیں۔ ماں کب سے گئی ہوئی ہے؟"

اور پھر اسے اپنے دوسرے سوال پر خود ہی اچنبھا ہوا۔ کیونکہ وہ تو اپنی بیوی کو شادی والے گھر دیکھ کر آرہا تھا۔ اور صبح اس کے ساتھ ہی وہ ٹھیک

گلے میں ڈال کر دونوں چھوٹی بیٹیوں کے ساتھ باہر نکل گئی تھی اور ابھی تک شاید اسے شادی والے گھر سے بدھائی نہ مل سکی تھی۔ اسی لئے واپس نہ لوٹی تھی۔
اُسے مریم کی بھوک کا خیال ستانے لگا۔

"بیٹی، چولہا تو خالی پڑا ہے اس میں تو راکھ تک نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کچھ پکایا نہیں ہے؟"

"ستو گھولے ہیں، اماں کا انتظار کر رہی ہوں، وہ آجائے تو ایک آنہ کا گڑ منگالوں۔"

اُس نے دُزدیدہ نظروں سے ولائتی کی طرف دیکھا

اور ولائتی کو سینے میں ایک پھانس سی چبھتی محسوس ہونے لگی۔

"میں کیسا ناکارہ ہوں۔ میں ایک آنہ کا گڑ بھی لاکر نہیں دے سکتا۔ اور نہ بچوں کو ہی ہمت پڑتی ہے کہ مجھ سے کچھ مانگ سکیں۔ میں اُن کے لئے ہَوّا بن چکا ہوں۔"

اس نے جیب ٹٹولی کہ صبح اس نے بیوی سے زبردستی ایک روپیہ چھینا تھا، اور افیم خریدنے کے بعد تین آنے بچے تھے۔ اور ماسٹر سے ابھی رقم نہ ملی تھی۔ آج دفعہ ماسٹر سے التجا بھی کی تھی کہ اس کی بقیہ رقم اسے دے دے۔ کیونکہ بخار کی وجہ سے وہ زیادہ دیر تک وہاں ٹھہر نہیں سکتا۔ لیکن ماسٹر نے بھی ٹرخا دیا تھا۔ کیونکہ لڑکے والوں سے پوری رقم ڈولی لانے کے بعد ملتی تھی۔ اور ابھی تو وہ بارات چھوڑ کر آئے تھے۔ اور ڈولی شام کو لائی تھی۔ باجا بجاتے ہوئے ولائتی کو کئی بار چکر آگیا تھا۔ اور بڑی مشکل سے دوسرے ساتھیوں کے سُر کا ساتھ دے سکا تھا۔ اب اسے وہم ہو گیا تھا کہ زیادہ دیر تک وہاں ٹھہرا رہا تو اس کی زندگی کی طنابیں ٹوٹ جائیں گی۔ اسی وہم کی گرمی نے بخار کی حدت پر حملہ ہو کر اسے گھر تک پہنچا دیا تھا۔ اور اب بیٹی کی بھوک کے خیال سے اسے افسوس ہو رہا تھا کہ گھر آتے وقت وہ اس کے کھانے کے لئے کوئی چیز کیوں نہ لے آیا۔

پہلے تو اسے لڑکی والے گھر کی دعوت کا خیال آنے پر غصہ آگیا۔ اگر وہاں پر انہیں کھانا کھلا دیا جاتا تو شاید وہ مٹھی بھر چاول رومال میں باندھ کر لے آتا لیکن وہاں تو دولہا کے گھوڑی سے اترنے پران کی ضرورت ختم ہو گئی تھی، اور نہ لڑکے کے باپ نے ماسٹر کو صرف ڈولی کے وقت ہی آنے کی تاکید کی تھی کھانے کے لئے کسی نے بھی نہ کہا تھا۔ نہ شرف دین نے ہی کوئی توجہ دی تھی ـــ اور شرف دین کا خیال آنے پر وہ یوں محسوس کرنے لگا جیسے تالاب کی سیڑھی پر نہاتے ہوئے اس کا پاؤں پھسل گیا ہو۔ اور وہ گہرے پانی میں غوطے کھا رہا ہو۔

دروازے کی چوکھٹ سے سر گڑتے ہوئے اس کی اذیت میں اضافہ ہو گیا تھا... بےقرار ہو کر اس نے اپنی سوچ کا رخ بدلنے کی خاطر مریم سے کہا

"مریاں بیٹی ـــ جا ستو پی لے۔ پیالے میں مکھی نہ پڑ جائے۔" اور پھر بے اختیارانہ وہ مسکرا پڑا۔ مکھی پڑنے سے کیا ہوتا ہے۔ مکھیوں کی فوج بھی گر پڑے تو وہ ستو ہی رہیں گے۔ ہم کوئی بڑے آدمی تھوڑی ہیں کہ مکھی پھڑ پھڑنے سے دودھ سے بھرا گلاس نالی میں اوندھا کر دیں..... یہ سب ضرورت کے کرشمے ہیں۔

پھر اسے خود پر تعجب ہونے لگا کہ وہ ایسا کیوں سوچ رہا ہے ـــ اسے ایسا سوچنے کا کیا حق ہے ـــ اُسے تو ایسا سوچنے کا کوئی اختیار نہیں ـــ آج ہی نہیں، کئی دنوں سے وہ ایسا سوچ رہا تھا... اس سوچ کے سوتے شرف دین کی بیٹی کی شادی کی خبر سنکر پھوٹے تھے۔ اور پھر ان سوتوں میں جوش اس وقت پیدا ہوا تھا جب اس کی بیوی نے ایک رات اس کی ٹانگیں دباتے ہوئے سرگوشی کی تھی۔

"یہ نیا ہمسایہ امیر خاں جو آیا ہے نا ـــ اس کا بڑا لڑکا نجیب خاں تو اول نمبر کا شہدا ہے۔ کھڑکی میں بیٹھا گنگناتا رہتا ہے۔ ہمارے صحن پر سے تو اس کی نظریں ہٹتی ہی نہیں ہیں ـــ مریاں کو تو آج میں نے خوب لتاڑا تھا۔"

"ہوں۔"

ولائتی کی ہوں، غصے کا اظہار تھی یا بے بسی کی علامت۔ یہ وہ خود بھی نہ جان سکی تھی اور دیر تک امیر خاں کے گھر والوں پر گند اچھالنے کے بعد بھی ولائتی کے منہ سے کوئی گالی نہ سن سکی تھی۔

وہ کئی دنوں تک امیر خاں سے شرف دین کا موازنہ کرتا رہا۔ امیر خاں اس کا ایک خوشحال ہمسایہ تھا۔ اور شرف دین اس کا فیکٹری کا ساتھی تھا۔ وہ اکٹھے ہی استاد مہر کے شاگرد ہوئے تھے۔ اور چیلم بھرنے کی ڈیوٹی کے بعد فٹ بال سینے کے دھاگے پر موم ملنے تک وہ دونوں ایک ساتھ رہے تھے۔ استاد کے گھر سے دوپہر کو روٹی لانے بھی وہ اکٹھے ہی جایا کرتے تھے۔ شرف دین کا جی تو کام میں لگ گیا تھا، لیکن ولائتی کے لئے اس ماحول کی اجنبیت دور نہ ہو سکی تھی۔ جب باجوں کی آواز اس کے کان میں پڑتی تو وہ چونک پڑتا۔ کام چھوڑ کر بُت بن جاتا... سارے کاریگر ہی اس سے گانے کی فرمائش کیا کرتے تھے۔

استاد مہر بھی اس کا کندھا دبا کر کہتا۔

" چل بیٹا۔ ہو جائے کوئی گانا "

کبھی وہ ہیر کے بول اٹھاتا۔ کبھی ماہیا شروع کر دیتا۔ پہاڑی لے میں اس کے گانے کی ادا بڑی پیاری تھی۔ اور پھر گانا ختم کر کے وہ یوں کاریگروں کی طرف دیکھتا جیسے داد کی بجائے نقد کچھ وصول کرنے کے لئے بے قرار ہو۔ لیکن وہاں تو وہ استاد مہر کا شاگرد تھا۔ پیٹ پر طبلہ بجا کر بدھائی مانگنے والا مراثی کا بیٹا نہ تھا۔

پھر وہ شرف دین کے ساتھ چیپ فٹ بال سینے لگ گیا۔ پہلے دن جب شرف دین کو چار آنے مزدوری ملی تو وہ خود کو بلندیوں پر اڑتا محسوس کرنے لگا۔ لیکن ولائتی کو ذرا بھی خوشی نہ ہوئی تھی۔ اسپنے باپ کی مار کا ڈر نہ ہوتا تو وہ پہلے ہی دن آنکھ بچا کر بھاگ جاتا۔ لیکن باپ کے دانت کچکچاتے ہوئے چہرے کا خیال آنے پر اسے اپنی ہڈیاں چرمراتی ہوئی محسوس ہونے لگتی تھیں۔ اور چار آنے وہ خود خرچ کرنے سے معذور تھا۔ بے بسی کے شدید احساس کے تحت جب اس نے چار آنے باپ کی ہتھیلی پر رکھے تھے، تو دق کے مریض کی مانند اس کے ارمان سینے ہی میں گھُٹ کر رہ گئے تھے۔

وہ باہر نکل کر پھڑپھڑایا تو تھا۔ مگر پر کٹے ہوئے پنچھی کی مانند وہ قوت پرواز کھو چکا تھا۔

شرف دین چیپ فٹ بال کے بعد ٹیپ فٹ بال سینے لگ گیا۔ لیکن ولائتی جہاں تھا وہیں رہا۔ جیسے یہی اس کی آخری منزل ہو۔ اس کی مسیں بھیگیں تو باپ نے شادی کر دی۔ کاریگر ہونے کی وجہ سے رشتہ بھی جلد مل گیا۔ لیکن وہ تو برادری کے دوسرے نوجوانوں کی مانند حد بندیوں سے آزاد ہونے کا متمنی تھا۔

باپ نے دنیا سے منہ موڑا تو اس نے چیپ فٹ بالوں سے چھٹکارا حاصل کر لیا۔ ماں بہتیرا چیخی چلائی۔ سسرال والوں نے بھی سمجھایا۔ لیکن اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔

پلوٹھی کی بیٹی کا ابھی دودھ بھی نہ چھوٹا تھا کہ روشاں اپنی قسمت کو کوستی دوسری مراثنوں کے ساتھ گلی گلی گھومنے لگی۔ رنگ روپ میں دلکشی تھی۔ لوگوں کے مذاق کا نشانہ زیادہ ہی بنتی تھی۔

اور ولائتی آزادی حاصل کر کے یہ تک بھولتا جا رہا تھا کہ گھر کا نقشہ بدل رہا ہے۔ اور ماں کا دمہ اذیت ناک بن گیا ہے۔ اور بچی بھوک سے بلبلا اٹھتی ہے۔ اور روشاں ہوس ناک نظروں کی تاب نہ لا کر روتی رہتی ہے۔

ماسٹر خیرات حسین کے چوبارے پر اس کا زیادہ وقت گزرتا تھا۔ ۔ چرس کے دھوئیں میں ساری دنیا کی سیاست ہچکولے کھاتی تھی، اور ترنگ میں آ کر ولائتی خود کو کسی الف لیلیٰ کی سلطنت کا ولی عہد سمجھ بیٹھا تھا۔ پہلے تو ماسٹر اسے ویسے ہی ساتھ لے جاتا تھا۔ وہ باجے کے منہ پر ہونٹ رکھ کر بس گال پھلا لیتا تھا۔ اور اس کے عوض اسے دوسرے آدمیوں سے آدھی مزدوری مل جاتی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ وہ سُر نکالنے لگا۔ انگلیوں کی حرکت سُروں کو مقید کرنے لگی۔

ماسٹر اس کے باپ کا دوست ہونے کی وجہ سے اس پر خاص توجہ دے رہا تھا۔ باجے کے بجائے وہ اسے کلارنٹ بجانے کی مشق کرانے لگا۔

یہ کام اگرچہ مشکل تھا۔ پھر بھی چابیوں کی پہچان ہونے کے بعد وہ اس مشکل پر قابو پانے کے قابل ہو گیا تھا۔

اب اس کی زیادہ قدر کی جاتی تھی۔ اور ماسٹر اسے اپنے پاس سے چرس بھرے ہوئے سگریٹ مفت دے دیا کرتا تھا۔ اس کا زیادہ وقت ریاض ہی میں گذرتا تھا۔ اور گھر کی حالت اور زیادہ بگڑتی جارہی تھی۔

انہیں دنوں فسادات کی آگ پھیل رہی تھی۔ کارخانے بند ہوتے جا رہے تھے۔ کاریگر بے کاری کی گردش میں پھنس گئے تھے۔ شرف دین کے لئے بھی کام نہ رہا تھا۔ اور ولائتی کو اس وقت احساس ہوا تھا کہ وہ شرف دین سے بہت بلند ہے۔ اس کے پاس جو فن ہے اس کی بدولت وہ بھوکا نہیں مرسکتا۔ لیکن گھر والوں کے متعلق اس نے اس وقت بھی نہ سوچا تھا کہ اس کے فن سے ان کی ڈھارس کیسے بندھ سکتی ہے۔

جب حالات سدھرے تو پرانی فیکٹریوں کی جگہ نئی فیکٹریاں وجود میں آگئیں۔ نئی نئی کمپنیوں کے بورڈ آویزاں ہو گئے۔ آرڈر آنے لگے۔ اور مال سپلائی ہونے لگا۔

شرف دین اب استاد بن گیا تھا۔ جس نئے سرمایہ دار کے پاس وہ ملازم ہوا تھا، اسے کام کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ اس لئے شرف دین کی اہمیت بہت بڑھ گئی تھی۔ اور ولائتی اب بھی باجا بجانے والا ہی تھا۔ اس کی بلندی پھر پستی میں تبدیل ہو گئی تھی۔ اور دو اور بچیوں نے جنم لے لیا تھا۔ اور گھر میں فاقوں کی تعداد بڑھتی جارہی تھی۔

یہ سلسلہ لامتناہی تھا۔ جس نے اس کے رخساروں کی ہڈیوں کو محراب کی مانند ابھار دیا تھا۔ اور اس کے چہرے کی رنگت کو سیاہی مائل بنا دیا تھا۔ اس کے بازوؤں کی ابھری ہوئی مچھلیوں کو سکھا دیا تھا اور افیم کی مقدار بڑھا دی تھی۔ اور اسے چڑچڑا بنا دیا تھا۔ اب بات بات پر وہ بیوی سے الجھ پڑتا۔ بچوں کو ڈانٹ دیتا۔ مارنے سے بھی باز نہ آتا۔۔۔ اور بیوی کے پاس دو چار پیسے جو ہوتے بے رحمی سے چھین لیتا تھا۔۔۔ وہ وقت سے پہلے ہی بوڑھا ہو گیا تھا۔

پھر بھی آزادی کا خیال اسے ماسٹر کی بیٹھک سے کہیں اور نہ جانے دیتا تھا۔ کلارنٹ پر نئی نئی طرزیں نکالتے ہوئے اس پر خود فراموشی کی حالت طاری ہو جاتی تھی۔

بیٹھک میں بیٹھے ہوئے سارے آدمی سانس روک کر یوں ہمہ تن گوش بن جاتے۔ جیسے ذرا سی رکاوٹ بھی راگ کے قتل کا موجب بن جائے گی۔ کئی ایک تو اس سے حسد بھی کرنے لگے تھے۔ ان کا بس نہ چلتا تھا، ورنہ وہ اسے پارہ کھلا کر ناکارہ بنا چکے ہوتے۔ ماسٹر اپنے دبدبے کی وجہ سے بلنے والوں میں کافی مشہور تھا۔۔۔ اور ولائتی اس کا چہیتا بن چکا تھا۔ اور اس سے بگاڑ پیدا کر کے کوئی بھی لگی ہوئی روزی پر لات مارنا نہ چاہتا تھا۔

کئی بار ایسا ہوا کہ جس بارات میں ماسٹر کے بینڈ کو بلایا گیا۔ اس بارات میں شرف دین بھی خوش وضع لباس میں شامل ہوا۔ دونوں ابھی تک بچپن کے واقعات نہ بھولے تھے۔ اس لئے ولائتی کلارنٹ کی چابیوں پر ایسی فنکارانہ محویت سے انگلیوں کو حرکت دیتا کہ براتی جھوم جھوم اٹھتے۔۔۔ نوٹوں کی بارش سی ہونے لگتی۔۔۔ ہر دس قدم پر وہ رک جاتا۔ اور پھر وہ شرف دین کے سامنے کھڑے ہو کر پہاڑی لے میں نغمگی کا دریا بہا دیتا۔۔۔ اور شرف دین ماضی کی گہرائیوں میں اترتا چلا جاتا۔۔۔ اور پھر بڑے فخر سے دوسرے باراتیوں کو بچپن کی کوئی کہانی سنا دیتا تھا۔۔۔ ولائتی کو محسوس ہوتا کہ وہ اب بھی شرف دین سے بہت بلند ہے۔

لیکن ۔۔۔ شرف دین کی بیٹی کی شادی کی خبر جب سے سنی تھی۔ اس میں ایک عجیب تغیر پیدا ہو گیا تھا۔ اس دن گھر آ کر اس نے مریم کو سر سے پاؤں تک بڑے غور سے دیکھا تھا۔ اس کا یہ جائزہ اس کے لئے تکلیف دہ بن گیا تھا۔ پھر وہ گھر کی ہر چیز کا معائنہ کرنے لگا تھا۔ کوئی چیز بھی ایسی نظر نہ آئی تھی۔ جو نئی خریدی گئی ہو۔۔۔ ہر چیز پرانی تھی۔ اور صرف مریم کی جوانی ایسی تھی جو نئی معلوم ہوتی تھی۔ پھر اسے یہ نیا پن بھی کمرے کی بوسیدگی میں گم ہوتا دکھائی دینے لگا۔ اور وہ روشنی سے اپنے پیچھے باہر نکل آیا تھا۔

اس کے بعد ماسٹر کی بیٹھک اسے عجیب پراسرار معلوم ہونے لگی۔۔۔ جیسے بھٹکی ہوئی روحوں کی سرگوشیاں باجوں کی بل کھاتی ہوئی نالیوں میں تڑپ رہی ہوں۔۔۔ جیسے زنگ آلود دروازوں کو کھولنے کی ناکام کوشش کی جارہی ہو۔۔۔ کلارنٹ کی چابیوں پر انگلیاں جما کر جب وہ ماؤتھ پیس ہونٹوں میں دباتا

تو اس کے ہونٹ جلنے لگتے۔ اور آوازیں نکلتی جیسے کوئی آسیب زدہ کنواری چیخ رہی ہو۔

مریم کی جوانی کے متعلق ہر وقت سوچتے رہنے سے وہ خود کو پہچان رہا تھا۔ اگر شرف دین کا ساتھ نبھا رہا ہوتا تو اس وقت وہ بھی مستری ہوتا کسی فیکٹری میں وٹ بال سینے کے بجائے سئے ہوئے وٹ بالوں کی پڑتال کیا کرتا۔ اور بیٹی کی شادی کے لئے بارات سے کئی دن پہلے تیاریاں کر رہا ہوتا... مریم پھٹے ہوئے دوپٹے اور پیوند لگی قمیص شلوار میں نظر نہ آتی۔ اور روشاں پڑھائی لینے کے لئے گھر سے نکلنے کے بجائے گھر بیٹھ کر پڑھائی دیا کرتی۔

وقت نے اس کی روح میں گہری خواہش پیدا کر دی تھی۔ ٹھنڈے فرحت بخش پھاہے کے لئے اس کی روح کراہ رہی تھی۔ اور دل کے سارے گوشوں میں یوں ٹیسیں ابھر رہی تھیں جیسے گرم توے پر پانی کی بوندیں پڑ رہی ہوں۔

انہیں دنوں اس کی ماں پر دمہ کا ایسا دورہ پڑا کہ اس کے اکھڑے ہوئے سانس کو سنبھالا نہ مل سکا۔

سب سے زیادہ دکھ روشاں کو ہوا تھا۔ اس کی ساس سب کی غیر حاضری میں مریم کی حفاظت کیا کرتی تھی۔ مریم کے جوان ہونے پر روشاں اُسے اپنے ساتھ نہ لے جاتی تھی۔ وہ اپنی جوانی پر بہت سی تہمتیں برداشت کر چکی تھی۔ اور اس کا بدلہ مریم کی جوانی سے نہ لینا چاہتی تھی... اس کی ساس کا بڑھاپا ایک پناہ گاہ تھا جس میں مریم کی جوانی دبکی ہوئی تھی۔ اب یہ پناہ گاہ ڈھے گئی تھی۔ اور روشاں امیر خاں کے مکان کی کھڑکی کی طرف دیکھ کانپ اٹھتی تھی۔

ولائتی کو ماں کی موت کے بجائے اس رقم کا غم تھا، جو وہ ماسٹر سے ادھار لے کر تجہیز و تکفین کے علاوہ برادری کے کھانے پر صرف کر چکا تھا۔ دسویں کے ختم پر اسے بہت طیش آیا تھا، کیونکہ وہ دن برادری کے لئے کسی شادی کی تقریب سے کم نہ تھا... ابھی چالیسویں کا ختم باقی تھا۔ اور ناک بچانے کے لئے اس کے پاس کچھ بھی نہ رہا تھا۔

اسے سوچ میں ڈوبے دیکھ کر روشاں سمجھتی تھی کہ ماں کا سوگ ہی منا رہا ہے۔ لیکن ولائتی تو امیر خاں سے شرف دین کا موازنہ کرتا رہتا تھا۔ شرف دین کی بیٹی جہاں بیاہی جا رہی تھی۔ وہ لوگ کارخانہ دار تھے۔ شہر سے باہر نئی کوٹھی بنوائی تھی، ہر ایک کے پاس الگ الگ اسکوٹر تھا... اور اس کا ہمسایہ امیر خاں کسی دفتر میں ملازم تھا۔ ظاہری حالت رئیسانہ تھی۔ نجیب خاں کالج کی تعلیم ختم کرنے کے بعد افسر بننے کے خواب دیکھ رہا تھا... ولائتی ان کے سامنے بہت ہی پست تھا۔ معاشرے میں وہ ان کی برابری کا خواب تک نہ دیکھ سکا تھا۔

جب روشاں ان کے مکان کی کھڑکی کی طرف دیکھ کر نفرت سے بڑبڑانے لگتی تو ولائتی خلاؤں میں نظریں گھماتے ہوئے یوں محسوس کرتا جیسے دور سے آنے والے کسی نغمے کی لَے اس کی زندگی کے ویرانوں میں گونج بن کر پھیلتی جا رہی ہو۔ وہ مریم کے مستقبل کے خاکے میں کئی رنگ بھرتا، بیل بوٹے بناتا — اور پھر خود ہی برش پھیر دیتا — اس وقت وہ یوں دکھائی دیتا۔ جیسے اس کی بیچارگی انتہا کو پہنچ گئی ہو۔

اس نے آج تک ہمسایوں کے خلاف کوئی لفظ منہ سے نہ نکالا تھا۔ نہ مریم سے ہی باز پرس کی تھی۔ اور نہ روشاں کے کیڑے سوالات کا جواب دیا تھا۔

روشاں جب اسے مریم کے لئے بر تلاش کرنے پر اکساتی، تو اس وقت بھی وہ اس کے خوف آمیز تقاضے پر توجہ نہ دیتا تھا۔ جس معیار کی اسے تلاش تھی، اس تک پہنچ اس کے بس کی بات نہ تھی۔ برادری میں جو لڑکے تھے... ان کا کردار اس سے مختلف نہ تھا... اور وہ اپنی جوانی کے حادثات کو دہرانے پر خود کو آمادہ نہ کر سکا تھا۔

روشاں کے تقاضے ساس کے مرنے کے بعد شدت اختیار کرتے جا رہے تھے اور اس کی سنجیدگی گہری ہوتی جا رہی تھی۔ اور کوئی بھی اس کے سینے کے اندر اُبلتے ہوئے لاوے کی کیفیت نہ جان سکا تھا۔

یہی لاوا اب بھی اُبل رہا تھا، اور مریم اس سے بے خبر تھی۔ وہ جان نہ سکی تھی کہ ولائتی کیوں اس کے متعلق اتنا فکر مند ہے۔ اور اس کی بھوک نے کیوں اس کے ارمانوں کو جھلسا دیا ہے — وہ پنکھا جھلا رہی تھی۔ اور ولائتی گہرے جلتے ہوئے سانس بھر رہا تھا — اس نے جیب سے تین آنے نکال کر مریم کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ــــ لے گرد مثالے۔ بچھکے ستو حلق سے کیسے اتریں گے؟"

مریم خاموش رہی۔

ولائتی نے اُس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ پھر اس کی نظریں مریم کی نظروں کے تعاقب میں اوپر اٹھنے لگیں۔ اور اوپر کھلی کھڑکی سے نظریں ٹکرا کر یوں جھک گئیں۔ جیسے نیلگوں فضا میں تیرتے ہوئے شکرے کے پنجوں سے زخمی کبوتر چھوٹ گیا ہو۔ وہ گھٹنوں پر ہتھیلیوں کا بوجھ ڈال کر کھڑا ہوا اور ڈگمگاتے قدموں سے چارپائی تک آگیا۔۔۔ اس نے بیٹھنا چاہا۔ مگر دھپ سے چارپائی پر گر پڑا۔ اس کا سانس ٹوٹنے لگا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ مریم کو سینے سے لگا کر سمجھائے۔

"نادان بچی۔ تو کن خوابوں کے تعاقب میں سرکنڈوں پر بھاگ رہی ہے۔۔۔ افق کے قرمزی رنگوں سے نظریں ہٹا کر اپنے زخمی پاؤں کی طرف دیکھ۔۔۔ کتنا خون بہہ رہا ہے۔۔۔ اور پھر میری طرف دیکھ کہ آرزوؤں کی جلن نے زندگی کی ہر کیاری میں تھوہر کے پودے اگا دیئے ہیں۔"

مریم دروازے پر کھڑی رہی۔

ولائتی نے نحیف آواز میں کہا۔ "تو خود ہی گڑھے آ۔۔۔ کب تک ماں کا انتظار کرے گی۔ شرف دین جب مجھے نہیں پہچان سکا تو اس سے مروّت کیسے برتے گا۔"

مریم نے قریب آکر ایک آنہ لے لیا، اور چپکے سے باہر نکل گئی۔

اس کے جانے کے دو تین منٹ بعد ایک نو دس سال کا لڑکا اندر آگیا۔

ولائتی نے اسے غور سے دیکھ کر پوچھا۔ "کیا بات ہے بیٹا! کسے ڈھونڈ رہے ہو؟"

لڑکا سہم گیا۔

ولائتی نے پیار سے پوچھا "کس کی تلاش ہے؟ ادھر آجاؤ۔ شاباش! کیا لینے آئے ہو؟"

"جی۔۔۔" لڑکے نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔ "مریم۔۔۔ کہاں۔۔۔ ہے۔۔۔؟"

"ابھی آتی ہے۔۔۔ پیڑھی پر بیٹھ جاؤ۔"

پھر ولائتی نے چونک کر پوچھا۔

"کہاں رہتے ہو؟ کس کے بیٹے ہو۔۔۔؟"

"جی۔۔۔ ساتھ والے مکان میں رہتا ہوں۔۔۔ میرے ابا کا نام امیر خاں ہے۔"

ولائتی اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"امیر خاں۔۔۔" اُس نے دل میں یہ نام کئی بار دہرایا۔۔۔ اور اسے محسوس ہونے لگا جیسے اس کا دامن سرکنڈوں والی باڑھ سے الجھ گیا ہو، اور جھٹکے دینے سے دامن تار تار ہوا جا رہا ہو۔

مریم گڑ لے کر آگئی۔ اور لڑکے کو بیٹھا دیکھ کر دروازے پر ہی ٹھٹھک کر رہ گئی۔

لڑکا اس کی طرف دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔

مریم پیچھے کی طرف سرکنے لگی۔

اور لڑکا باہر نکل گیا۔

ولائتی بت بنا بیٹھا تھا، جیسے وہ حنوط شدہ لاش ہو۔

مریم جب اندر داخل ہوئی تو اس کے چہرے کا رنگ متغیر تھا۔ اور اس کی حرکات میں اضطرابی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ ولائتی کے لب مرتعش ہوئے۔ لیکن اس کا گلا آواز کو اپنی سخت گرفت میں لے چکا تھا۔ ولائتی پھر لیٹ گیا۔

مریم چارپائی کے قریب آئی اور سراسیمہ ہوکر بولی۔ "ابا سو لینے سے بھی طبیعت ٹھیک ہوجاتی ہے۔"

"ہاں بیٹی۔" ولائتی نے کروٹ بدل کر کہا۔ "مجھے سو جانا چاہئے، ہمیشہ کی نیند۔"

اسے پلکوں پر نمی محسوس ہوئی۔ اس نمی کو اس نے انگلیوں کے پوروں میں جذب کر لیا۔ اور اس کی سوچ میں بھنور پڑنے لگے۔ "وہ لڑکا کیوں آیا تھا؟ — مریم سے اس نے کیا کہا تھا؟ — یہ گھبرائی ہوئی کیوں ہے؟ — میں اسے کیسے سمجھاؤں — جوانی تو بڑھاپے کی زبان سمجھتی ہی نہیں — کاش! اشرف دین کا مقدر مجھے مل جاتا — ؟"

آنکھیں بند کئے وہ لیٹا رہا — اس کے سانس چلتے رہے — اس کی سوچ تپتی رہی — بہت دیر تک وہ اسی حالت میں لیٹا رہا — چپ چاپ بے حس و حرکت — سوچ کی کھردری ڈھلوان سے پھسل پھسل کر بے سُدھ — پھر ذہنی گھٹن محسوس کرنے لگا۔ جیسے اس کا چہرہ ریت میں دھنس گیا ہو۔

لیکایک اذیت کے ساتھ اس نے آنکھیں کھولیں۔ کمرے میں دھندلکے ناچتے دکھائی دیئے۔

اس نے بے قرار ہوکر آواز دی۔

"مریاں — پانی کا گلاس لانا —"

کوئی جواب نہ پاکر وہ بیٹھ گیا۔ پھر متوحش نظروں سے کمرے کا جائزہ لے کر چلا اٹھا۔

"مریاں — کہاں ہو مریاں — ؟"

چارپائی سے نیچے اترا، تو اسے چکر آ گیا۔

باہر نکل کر اس نے نظر اوپر اٹھائی۔ کھڑکی بند تھی۔

وہ تیزی سے اندر داخل ہوا۔ ٹھوکر لگنے سے پیالہ اوندھا ہوگیا۔ اور گھلے ہوئے ستّو نے فرش پر پھیل کر عجیب سا نقشہ بنا دیا۔ دیوار کے پاس مریم کے پرانے کپڑے پڑے تھے۔

ولائتی کا ذہن ماؤف ہوگیا۔ بلبلے بلبلے ڈگ بھرتا وہ گلی میں آ گیا۔ گلی ویران پڑی تھی — ہانپتا ہوا جب وہ گلی سے نکل کر بازار میں آیا، تو دور سے آنے والی باجوں کی آواز سنکر وہ وہیں رک گیا۔

"مریاں — تیری ڈولی بہت دور نکل گئی ہے — تیرا مقدر تجھے میری برادری کے حصار سے نکال کر لے گیا ہے۔ شاید تیرا انجام تیری ماں سے مختلف ہو — لیکن — میں تیرے لئے کر بھی کیا سکتا تھا۔"

وہ وہیں بیٹھ گیا۔

روشنی اور اندھیرے کے سنگم پر وہ سوکھے پتّے کی مانند لرز رہا تھا۔

نقش ادب کی خدمت کرتا ہے۔ آپ نقش کی سرپرستی کیجئے۔
نقش خریدیئے — نقش میں اشتہار دیجئے۔
فرصت کے لمحات کا بہترین ساتھی۔ ماہنامہ نقش کراچی

فکرِ نو کا ترجمان

سہ ماہی **سیپ** کراچی

• بلقیس جہاں • ڈاکٹر سید شاہ علی • بلراج کومل • محمد رئیس • جعفر شیرازی • صہبا اختر

• عفت موہانی • ڈاکٹر سہیل بخاری • شاہد منصور • غزل گو شعراء • اختر ہوشیارپوری • اسد محمد خاں • نسیم درانی

• خوبصورت دیدہ زیب کتابت طباعت • صفحات ۳۶۲ • قیمت ۳۰ روپے

یہ شمارہ آج ہی اپنے قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیے •

مینیجر:- سہ ماہی سیپ • بلاک ڈی • شیر شاہ کالونی۔ کراچی ۲۸

چند اہم کتابیں

مقدماتِ عبدالحق ۔ بابائے اردو کی خدمتِ ادب کا روشن پہلو کسی کی نظر میں کچھ بھی ہو لیکن مرزا محمد بیگ کا کہنا ہے کہ دوسروں کے کام کو اجاگر کرنا بابائے اردو کا کارنامہ ہے۔ اور ڈاکٹر عبادت بریلوی کا قول ہے کہ بابائے اردو کی صحیح شخصیت دوسروں کی شخصیتیں ابھارنے ہی میں نمایاں ہوتی ہے اور ان کا یہ احسان سب سے زیادہ فنکاروں پر ہے جن کی قلم کاری کے جوہر "مقدماتِ عبدالحق" سے روشنی میں آئے یہ مقدمات عرصہ ہوا دکن میں شائع ہوئے تھے ۔ جن کو خود بابائے اردو کی ترمیم و اضافہ کے بعد ڈاکٹر عبادت بریلوی نے از سرِ نو ترتیب دیا ہے ۔ اور یہ بیش قیمت مجموعہ اُس دمکتے ہوئے آفتاب کے مترادف ہے جو اپنے دامن میں اَن گنت ستاروں کی روشنی لئے ہے اور اپنی چمک سے ستاروں کی روشنی کم کرنے کے بجائے بڑھا رہا ہے ۔ علمی ہمہ گیری اور ادبی جامعیت کی ایک عظیم تالیف ۔ اردو ادب کا ایک شاہکار ۔

قیمت مجلد ۱۷ روپے ــــ پیپر بیک ۵۰ ــ ۱۲ روپے

تاریخِ اسلام ۔ عرب فنِ تاریخ کے موجد کہے جاتے ہیں ۔ لیکن یہ بھی ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ عربوں کی تاریخی اساس روایات پر رکھی ہوئی ہے جن میں مشرق و مغرب کا اختلاف ہے اسی لئے سید امیر علی نے جب HISTORY OF SARASENS لکھنا شروع کی تو مستشرقین کے ساتھ ساتھ یورپ کے مورخین کی رایوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا ۔ اور ہزاروں صفحات پر پھیلے ہوئے واقعات کو پانچ سو صفحات میں سمیٹ دیا ۔ تاریخ دانوں کا اتفاق ہے کہ اسلام کی مختصر تاریخ اب تک اس سے اچھی لکھی نہیں گئی جو زاویۂ نگاہ کے اعتبار سے کسی مکتبۂ خیال کی پابند نہیں ۔ بہر صورت ایک غیر جانبدارانہ تحقیق ہے ۔ اس تاریخ کے کئی ترجمے اس سے قبل شائع ہو چکے ہیں لیکن وہ سب ناپید ہیں ۔ زیرِ نظر ترجمہ دِشتی محمود آبادی نے ایک نئی ترتیب کے ساتھ پیش کیا ہے جس سے واقعات کو سمجھنا آسان ہو گیا ہے

قیمت : ۔ ۹ نو روپے

مختصر تاریخ ادبِ اُردو ۔ اردو ادب کی تاریخ، ہندوستان کی تمدنی اور انقلابی تاریخ کے ساتھ چلتی ہے جس پر ملک کے اکثر اہلِ قلم نے قلم اٹھایا ہے ۔ اور اردو میں کئی مکمل اور جامع تاریخیں موجود ہیں ۔ لیکن ڈاکٹر اعجاز حسین نے جس اختصار کے ساتھ یہ تاریخ مرتب کی ہے وہ اپنی افادیت کے لحاظ سے طلبا اور اہلِ ذوق دونوں کے لئے یکساں طور پر اہم ہے اور اسی لئے اساتذہ کرام اس کے مطالعہ کی سفارش کرتے ۔ چند سو صفحات میں سموئی ہوئی زبان اردو کی سرگزشت میں تقسیم کے بعد کا دَور بھی شامل کر دیا گیا ہے ۔ اور حال و ماضی کا یہ آئینہ ضروری صحت کے بعد بارِ دیگر پیش کیا جا رہا ہے ۔

ترکی حور ۔ اردو میں تمثیل نگاری کا نقشِ اوّل امانت کی اِندر سبھا ہو یا کوئی اور کتاب، لیکن اب تو آغا حشر کا نام اردو ڈرامہ سے منسلک ہو کر رہ گیا ہے ۔ اور ان کے ڈرامے آج بھی اتنے ہی مقبول ہیں جتنے اپنے عروجی دَور میں ہوں گے ۔ "ترکی حور" آغا حشر کا ایک کامیاب ڈرامہ ہے جو افادۂ عامہ کے خیال سے سستے ایڈیشن میں شائع کیا گیا ہے ۔ قیمت : ۔ ایک روپیہ ۵۰ پیسے

مسدّس ۔ حالی افقِ مشرق کے ادبی آفتاب کی ایسی کرن تھے جس نے اُردو نظم و نثر دونوں کو جگمگا دیا ۔ ڈاکٹر بجنوری "دیوانِ غالب" کو "ویدوں" کے بعد ہندوستان کی دوسری الہامی کتاب کہتے ہیں ۔ لیکن غالب کے اس شاگردِ رشید نے مسدس لکھ کر بتا دیا کہ... ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں ۔ مسدس کا صدی ایڈیشن صحت کے التزام کے ساتھ شائع کیا گیا ہے ۔ قیمت ۲ روپے ۵۰ پیسے

اُردو اکیڈمی سندھ ـ کراچی ـ حیدرآباد ـ لاہور

نعیم آروی

صبح سے شام تک تقریباً روز کا یہی معمول تھا۔

گمٹی سے نکل کر پسنجر گاڑیاں شاہ پور کے اسٹیشن پر ٹھہرتیں تو قیامت کا ہنگامہ شروع ہو جاتا۔

افراتفری، چھینا جھپٹی میں بعض اوقات راہگیر جانے والے یاتری ہڑبڑا کر بدری پرشاد جانے والی گاڑی پر سوار ہو جاتے اور کبھی کبھی تو ایسا ہوتا کہ صرف سامان ہی یاترا پر روانہ ہو جاتا۔ اور بیچارہ یاتری مسافروں کی بیچ میں پھنسا ہاتھ پیر مارتا رہ جاتا۔ یہ منظر کچھ ایسا ہوتا تھا جسے دیکھنے کی لت مجھے بچپن ہی سے پڑی تھی۔

میں روزانہ اسکول سے چھٹتے ہی اسٹیشن کی طرف روانہ ہو جاتا اور جب تک گاڑی اسٹیشن نہ چھوڑ دیتی۔ اپنے چند سنگیوں سمیت مزے مزے سے تماشہ دیکھتا رہتا تھا۔ واپسی پر تسننگ کرتی ہوئی مال گاڑیاں جن پر گنے لدے ہوتے تھے تاکتے۔ ریلوے یارڈ کے چوکس چوکیداروں کی کڑی نگرانی کے باوجود سرخ رنگ کے گنوں پر اتنا زبردست ہلہ بولتے کہ بیچارے چوکیدار ہائے، ہائے کرتے رہ جاتے اور منٹوں میں مال غنیمت سمیٹ کر نو دو گیارہ ہو جاتے۔

شاہ پور اسٹیشن سے شہر آنے کے لئے دو راستے تھے۔ ایک پر گھوڑا گاڑیاں، بیل گاڑیاں اور مال گودام سے مال ڈھونے والے "راجپوت ٹرانسپورٹ" کے ٹرک مٹھیا، سیول اسپتال شیو گنج سے ہوتے ہوئے چوک جامع مسجد کے پاس بڑی بڑی دکانوں میں جو ہلدی، سپاری، باسمتی چاول اور پھلوں کا تھوک بیوپار کرتے تھے۔ مال اتارتے، پھر دوسرے ٹرپ کے لئے دندناتے ہوئے اسٹیشن کی طرف نکل جاتے تھے۔ راجپوت ٹرانسپورٹ سروس کے ملازم زیادہ تر سکھ ہوتے تھے جن کے بالوں میں کنگھا پھنسا ہوتا تھا۔ بغل میں کرپان بھی لٹکا ہوتا۔ مگر منہ اور ناک سے سگریٹ کا خوب گھنا گھنا دھواں چھوڑتے تھے اور شام کے وقت مٹھیا کے پاس پاسیوں کے غلیظ ڈیرے میں تاڑی پیتے اور اپنے کلینروں کے ساتھ مل کر ہلا گلا کرتے تھے۔ شہر کی یہ پکی سڑک تمام دن مصروف رہتی تھی۔ سڑک کے دونوں جانب شہری وضع قطع کی دکانیں تھیں اور ان کے عقب میں رہائش گاہیں، گلیوں کا تار سارے شہر میں بچھا ہوا تھا۔ ایک گلی دوسری گلی سے ملی ہوئی تھی۔ اس طرح شہر کی تمام گلیاں آپس میں گتھم گتھا تھیں۔

دوسرا راستہ قدرے سنسان رہتا تھا۔ دو رویہ درختوں کے بیچ سے کچی سڑک "رمنا میدان ہوتی ہوئی مہاراجہ کالج کے احاطے میں جا کر ختم ہوتی تھی۔ کالج کھلنے اور بند ہونے کے وقت ہندو ودیارتھی اور مسلم طلبا اس سڑک پر چلتے ہوئے نظر آتے تھے۔ باقی سارے وقت سڑک تنہا اور اکیلی ہوتی تھی۔ بارش برس کر ختم ہو جاتی پھر ہوا تیزی سے چلتی تو دیر تک جھڑی لگ جاتی۔ پیڑوں کے پتوں سے پانی کے قطرے بڑی آہستگی سے ٹپکتے تھے اور ساری فضا بھینی بھینی

خوشبو میں رچ جاتی تھی۔

یہ سڑک میری کمزوری تھی۔ اکثر اس سڑک کے سلسلے میں میرے دوستوں سے جھڑپ بھی ہو جاتی کیونکہ وہ شہر کی سڑکوں پر گشت کرنا زیادہ پسند کرتے تھے۔ وہ مجھے چھیڑنے کے لئے کہتے کہ "مجھ میں کسی سنت کی روح حلول کر گئی ہے۔ ابھی سے میں اپنے آپ کو تیاگ کا عادی بنا رہا ہوں۔" اسی سڑک پر بیچی اور رام کے بنیروں سے گھرے ہوئے سنگ مرمر کی ایک اونچی سی دیوار کھڑی تھی۔ اس اکہری دیوار کے متعلق شاہ پور کے پوپلے منہ والے بڑھے ہل ہل کر کہتے کہ اٹھارہ سو ستاون میں بابو کنور سنگھ نے اسی جگہ انگریز رنگروٹوں کو بڑی بھاری شکست دی تھی۔ اس لڑائی میں بے شمار انگریز مارے گئے تھے۔ بعد میں جب کلکتہ سے کمک ہوئی تو انگریزوں نے دوبارہ یہاں پر قبضہ کر لیا۔ لڑائی میں مارے جانے والے انگریز شہیدوں کے نام پر یادگار تعمیر کی گئی جس کی افتتاح لاٹ صاحب بہادر نے بنفس نفیس یہاں آن کر کی تھی کتبے پر انگریزی زبان کے مشہور شاعر کی نظم لکھی ہوئی تھی، جس میں تاج کے نام پر اجنبی زمین پر مٹنے والے انگریز سپاہیوں کو خراج عقیدت پیش کیا گیا تھا۔ ہمارے کنور سنگھ نے کون سی جگہ سڑ گل کر مٹی میں ملے ہوں گے؟

یہ سڑک شاہ پور کے ہندو راجپوت و مسلمان چودھریوں کی جنگ آزادی، اتحاد اور محبت کی عظیم مثال بن چکی تھی اس کا تذکرہ تاریخ کے صفحات میں نہیں ملتا مگر شاہ پور والوں کے دلوں میں محفوظ رکھا گیا۔ انگریز حکام نے جب دیکھا کہ شاہ پور میں ہندو مسلم اتحاد ایک اٹل حقیقت بن چکی ہے اور انہوں نے پورے اعتماد کے ساتھ اس سڑک کو اپنی زندگی کا درشن بنا لیا ہے تو وہ ڈر گئے۔ کہ کہیں تاریخ کے اوراق ان کی طرف لوٹنا نہ شروع کر دیں۔ ترنت اپنی زنبیل سے فساد کی کوڑی نکال کر باہر پھینکی اور نتیجہ کا انتظار کرنے لگے۔

شاہ پور کی میونسپلٹی کے اجلاس میں اب تک جب پہلی مرتبہ اس سڑک کا نام کنور مارگ رکھنے کی تحریک پیش کی گئی تو بہت سے اراکین ہڑبڑا کر اپنی جگہ کھڑے ہو گئے۔ ارے بھائی یہ کیسے ممکن ہے ... یہ سب کیا ہے ... یہ کیسے ہوا ...؟

لوگوں کی حیرانی اپنی جگہ تھی۔ مگر ہردے سنگھ خوب سمجھتے تھے کہ گوروں کی یہ فراخدلی مستقبل میں شاہ پور کے لئے ایک مصیبت بن جائے گی۔ وہ اس نتیجے سے باخبر ہو چکے تھے جو بعد میں اس نام کی وجہ سے پیش آنے والے تھے۔ انگریزوں کی اس فراخدلی کی وجہ صرف ہندو مسلم اتحاد کو پارہ پارہ کرنا تھا۔ ورنہ "کنور مارگ" تو اسی روز جنگ کے بعد کنور سنگھ کے ایک ایک ہمدردوں کو چوک جامع مسجد کے پاس کھڑا کر کے ان کے سینے میں سنگینیں اتار دی گئی تھیں۔ انہوں نے اپنے چند رفقاء کی مدد کے سہارے بڑی مشکل سے اجلاس کے دوسرے اراکین کو اپنے خیالات سے مطلع کیا اور پیش آئندہ حالات کی خبر دی۔ وہ اجلاس میں گرج گرج کر بولے "ایک ایسی جگہ کو جہاں کنور سنگھ کے خون کے ساتھ مسلمان چودھریوں کا خون بھی شامل ہے۔ اپنی تمام تر ہمدردیاں اور فخر محض ایک نام سے وابستہ کر دینا سراسر حماقت ہے۔ اور شاہ پور کے مسلمانوں کے جذبات سے کھیلنا بھی ہے۔ اس سڑک کا نام تو کچھ ایسا رکھئے جو شاہ پور کے تمام باشندوں کے احساسات و جذبات کی ترجمانی کر سکے۔ اور آنے والی نسلوں کے لئے ایک پیغام ہو۔ یہ سڑک آزادی، جدوجہد اور اتحاد کی ایک علامت ہے۔ بہتر ہے کہ اسے ایسا ہی رہنے دیں۔ نام سے دلوں میں دیوار کھڑی ہوتی ہے"۔

ہردے سنگھ میرے محلے میں رہتے تھے۔ اونچا قد، سرخ و سفید چہرہ، گھنی مونچھیں۔ چلتے تو زمین ڈگر ڈگر کرنے لگتی تھی۔ ان کے گھر سے ہمارے گھر کے تعلقات اپنوں جیسے تھے۔ میں بلا تکلف رسوئی گھر میں گھس کر پاہتی کے لڈو اور بیسن کی پوریاں بھکوس جاتا تھا۔ ہردے سنگھ کی بیوی بیدھے بھاؤ کی ایک انتہائی سادہ مزاج عورت تھیں۔ رسوئی گھر میں گھستے ہی ہرے رام۔ ہرے رام کہتی ہوئی وہ میرے پیچھے چمٹا لے کر لپکتیں۔ مگر میں اتنی دیر میں اپنا کام دکھا جاتا۔ ہردے سنگھ اور ان کی لڑکی پروتما خوب ہنستے اور بیٹھے بیٹھے میری تیزی پر داد کے ڈونگرے برساتے۔

پروتما بڑی خوبصورت لڑکی تھی۔ ہردے سنگھ اسے بڑے چاؤ سے پڑھا رہے تھے۔ شروع شروع میں محلے کے پرانے خیالات کے بزرگوں نے پروتما کی پڑھائی کی زبردست مخالفت کی۔ مگر یہ مخالفت ہردے سنگھ کے اٹل فیصلہ کے سامنے ریت کی دیوار ثابت ہوئی۔ انہوں نے یہ کہہ کر لوگوں کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا کہ "ہمیں زندہ رہنا ہے اور آزادی کی جنگ لڑنی ہے"۔ وہ ایک حد تک سر سید تحریک کے حامیوں میں سے تھے۔ مگر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے انہیں

سخت اختلاف تھا۔ وہ اکثر کہتے کہ ہندوستان میں صرف ایک قوم آباد ہے۔ ہندوستانی۔ اور آزادی کی جنگ لڑنے کے لئے ہندوستانیوں کی ضرورت ہے۔

پرمتما اور میں ساتھ ہی ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ ہم نے میٹرک پاس کرنے کے بعد اکٹھے ہی مہاراجہ کالج کے پہلے سال میں داخلہ لیا تھا۔ ہردے سنگھ، ہندی سنسکرت اور اردو ادب کے عالم تھے۔ اور فارسی زبان پر ہزار جان سے فریفتہ۔ وہ بلاناغہ شام کے وقت ہمیں پڑھاتے تھے۔ میری کوتاہ مغزی پر جی کھول کے ہنستے اور کبھی کبھی بگڑ جاتے۔ "جو اچھا بالک فارسی نہ جانتا ہو اسے دو نا۔ سیکھو سیکھو" میری بات کو گرہ میں باندھ لو۔ پرمتما بھی میری کمزوری کا خوب مذاق اڑاتی۔ وہ اکثر چھیڑ چھیڑ کر کہتی، "پڑھو فارسی، نہ پڑھو تو تیل کی دکان کیسے کھلے گی!"

کالج کی چھٹی کے بعد جب ہم گھر لوٹتے تو درختوں سے گھرا ہوا سنسان راستہ ہوا سے بجتے ہوئے پتوں کی دھیمی دھیمی سرگوشیاں سنتے گزر جاتا۔ کبھی پرمتما راستے میں گرے ہوئے پھولوں کو چن کر اپنے بالوں میں سجاتی اور پھر بڑی معصومیت سے پوچھتی: "میاں بھائی میں کیسی دکھتی ہوں؟" میں اس سے ذرا الگ ہٹ کر کہتا، "بالکل بھتنی جیسی۔" ایسے موقع پر اس کی تیز ناخنوں والی انگلیاں ٹھیک میرے منہ کی طرف بڑھتی تھیں۔ انگریزوں کی یادگار کے پاس پہونچ کر ہم لمحہ بھر کے لئے ٹھٹک جاتے تھے۔ نظم پڑھتے اور چپ چاپ آگے بڑھ جاتے۔ ایک دن میں نے کھریا مٹی سے نظم کے اوپر لکھ دیا: "ان ہندوستانی سپاہیوں کے نام جنہوں نے آزادی کی پہلی جنگ لڑی اور حق و صداقت کی راہ میں مارے گئے۔ انہیں مردہ نہ کہو کیونکہ وہ زندہ ہیں۔" یہ میری سیاسی شعور کی پہلی اڑان تھی۔ یہ بات جب ہردے سنگھ تک پہونچی تو وہ بہت خوش ہوئے۔ مجھے شاباشی دیتے ہوئے اپنی بیوی سے بولے۔ "ارے سنتی ہے بھاگیہ وان، میں نہ کہتا تھا کہ گنگے کا پوت گوکل کا کنہیا ہے۔ اب سفید پگڑی والے کی خیر نہیں۔" ہردے سنگھ نے جب میرا کارنامہ ابا میاں کو سنایا تو وہ ہنستے ہوئے بولے "یار ہردے! تیری صحبت بچے کو خراب کردے گی۔" ہردے سنگھ مزے مزے سے جھومتے ہوئے بولے، "ابے جا، تو تو چاہتا ہے کہ یہ لڑکا تیری طرح پیسہ ڈھالنے کی مشین بنے، مگر میری زندگی میں کبھی ایسا نہیں ہو سکتا سمجھے بھائی۔" ابا میاں ہنستے ہوئے نماز پڑھنے کے لئے جامع مسجد چلے گئے۔

وہ زمانہ میری شرارتوں کا زمانہ تھا۔

میری زندگی میں ایک پرسکون ٹھہراؤ تھا۔ حسن تھا۔ میرا جی چاہتا کہ میں پھیل کر وقت اور زمین پر محیط ہو جاؤں۔ تمام اچھائیوں کو اور تمام خوبصورتیوں کو اپنے اندر سمیٹ لوں۔ میں تمام خبروں سے بے خبر، فکروں سے آزاد اپنے آپ میں گم تھا۔ اسی بے فکری کے زمانے میں گرمی کی لمبی چھٹیاں آگئیں اور کالج لمبی مدت کے لئے بند ہوگیا۔ دن بھر ایرگن سے ندی نالے کے ٹھنڈے پانی میں بیٹھے ہوئے بگلوں کا شکار کرتا۔ رتن تلیا میں مچھلیاں مارتا اور شام ہوتے ہی چند دوستوں سمیت گنے چرانے کے لئے اسٹیشن کی طرف چل دیتا۔ اور باقی جو وقت بچتا وہ پرمتما کے ساتھ جھک جھک میں گزر جاتا۔ گرمیوں کی تعطیلات کے بعد کالج کھلا تو وہاں کی فضا ایک دم سے بدلی ہوئی ملی۔ لڑکے، لڑکیاں درجوں میں جانے کے بجائے باہر درختوں کے نیچے ٹولیوں میں بیٹھے چہ میگوئیاں کرتے ہوئے ملتے۔ دلی، کلکتہ اور یوپی کے تقریباً بہت سے ضلعے اور قصبوں میں سوراجیوں نے اندولن تحریک شروع کردی تھی۔ ہر جگہ کالجوں کے نوجوان طلبا کی بھاری تعداد اس تحریک میں شامل ہو کر وسیع پیمانے پر جلوس نکالتی اور آزادی کے لئے مظاہرے کر رہی تھی۔ روزانہ خبر پہونچتی کہ فلاں کالج کے طلبا پر گولیاں چلادی گئیں۔ اتنے طلبا کو جیل کے اندر بند کردیا گیا۔ سوراجیوں کے جلوس پر لاٹھی چارج ہوا۔ اور سڑکوں پر لیٹے ہوئے کانگریسیوں پر پیشاب پھیلانے کے ٹب الٹ دیے گئے۔ ایک دن جنرل ملک سمرام کے گورے رسالوں نے سڑک پر لیٹے ہوئے نہتے طلبا پر گھوڑے دوڑا دیئے تو مہاراجہ کالج کے لڑکوں کی آنکھوں میں خون کی لالی اتر آئی۔ جذبات سے مغلوب ہو کر انہوں نے کرانتی کاریوں کے راستے پر چلنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس جذباتی فیصلے کے پیچھے کوئی تاریخی تسلسل یا منطقی دلائل نہیں تھے، محض جذبات کے تیز رو میں بہنے والے نوجوانوں کا سلگتا ہوا ذہن تھا۔ جو وقت، مصلحت اور عقل سے سمجھوتہ کرنے کے لئے کسی قیمت پر تیار نہیں تھا۔ گاندھی جی کی دیش بھگتی سے بھلا کس کو انکار تھا۔ مگر اہنسا تحریک سحر کی طرح کانگریسیوں کے ذہن سے چمٹی ہوئی تھی۔ گورکھے سپاہیوں کی برستی ہوئی لاٹھیاں اور بندوقوں سے تڑپ تڑپ کر نکلتی ہوئی گولیوں کی زد میں آکر کانگریسی رضاکار سڑک پر آناً فاناً دم توڑ دیتے۔ لیکن مرتے مرتے "اہنسا ہمارا دھرم ہے" کا نعرہ ضرور بلند کر جاتے تھے۔ "اہنسا پرمو دھرما"۔

نوجوان طلبا کے نزدیک آزادی کا یہ وسیلہ انتہائی بزدلانہ اور سخت ٹھیرا کر دینے والا تھا۔ کانگریسیوں نے طلبا کے اس فیصلے کو — ANTI

GANDHI MOVEMENT. قرار دے کر ترنت ساتھ چھوڑ دیا۔ مگر لہو میں گرمی تھی اور خیالوں میں اونچی پرواز کا جوش، پرواہ کرنے والا تھا ہی کون۔

سہ پہر کی خوشگوار روشنی میں "ناٹک سبھا" کی بلند و بالا عمارت کی لمبی لمبی سیڑھیوں پر کھڑی ہو کر پردتما خوب دھاڑ دھاڑ کر بولی "ساتھیو۔ ہر صبح اپنے لئے ایک نیا سورج لے کر طلوع ہوتی ہے۔ ہماری جدوجہد نے ہندوستان کی قسمت میں اب ایک ایسی صبح لکھ دی ہے جو اپنے لئے اپنی آزادی کا ایک نیا سورج لے کر طلوع ہوگی۔ مگر اس صبح کے لئے ہمیں اپنے جانوں کی بے دریغ قربانیاں دینی ہوگیں۔ ہمیں اپنا لہو بہانا پڑے گا۔ مگر ہم طاقت کا جواب طاقت اور اینٹ کا جواب پتھر سے دیں گے"۔ پردتما کی تقریر کے آخری حصے نے نوجوان لڑکوں کے رگوں میں آگ بھر دی۔ اور وہ کچھ کرنے کے لئے تڑپ اٹھے۔

شاہ پور کی سیاسی سرگرمیوں کی خبر جب انگریز حکام تک پہونچی تو دھڑا دھڑ بکتر بند گاڑیاں مہاراجہ کالج میں پہونچنی شروع ہوگئیں۔ گورکھے سپاہیوں نے جھٹ پٹ کالج کے احاطے کا محاصرہ کر لیا۔ اور کالج کے باہر درختوں کے نیچے نیچے دور تک فوجی کیمپ نصب کر دیئے گئے۔ سارے ۔۔۔ دن سنسان پڑی رہنے والی سڑک پر گورے سپاہی ہاتھوں میں بندوق لئے گھومتے رہتے تھے۔ وہ ایک دوسرے سے فحش اور گندہ مذاق کرتے رہتے اور شام کے جھٹپٹے میں ریلوے کراسنگ کے پاس کوئلہ چننے والی بھیل عورتوں کو زبردستی اٹھا کر درختوں کے جھنڈ میں گھس جاتے۔ جہاں سے دیر تک وحشی قہقہے اور گھٹی گھٹی چیخیں بلند ہوتی رہتی تھیں۔ کبھی کبھی رات کے وقت تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لڑکے انگریز فوجیوں کے خیمے پر شبخون مارتے، ہلکی فائرنگ ہوتی۔ ایک دو انگریز سپاہیوں کی جان لے کر تاریکی میں منتشر ہو جاتے۔ یونیورسٹی میں علم کیمیا اور طب پڑھنے والے طلبا، خوب دھماکے چھوڑنے والے بم بناتے اور رات رات بھر فوجی کیمپوں پر پھینکتے رہتے تھے۔

مارچ کا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ درختوں سے پتے اور سرخ سفید پھول جھڑنے لگے تھے۔ اور ہمیشہ کی طرح ہر صبح مارچ کی ملائم دھوپ شاہ پور کے منڈیروں پر اور چھتوں پر پھیل جاتی تھی۔ عام ہڑتال اور مظاہرے کے دن فضا خوشگوار ہونے کے باوجود کسی معصوم بچے کی طرح سہمی ہوئی تھی۔ ہر چہرے پر آنے والے واقعات کی سنگینی کا شدت سے احساس تھا۔

ہردے سنگھ نے آبامیاں کی موجودگی میں پردتما اور میرے ماتھے پر تلک لگا کر یہ کہتے ہوئے وداع کیا۔ "دھرتی ماتا، تیری آزادی کے لئے میرے پاس جو کچھ تھا اسے پیش کر رہا ہوں۔ ایک میری جان ہے سو وہ بھی تیرے لئے وقف ہے"۔ آبامیاں مجھے اپنے سینے سے لگاتے ہوئے بولے۔ "میاں زندگی اسی لئے ملتی ہے کہ اسے اچھے اصولوں اور اعلیٰ مقصد کے حصول کے لئے قربان کی جائے ۔۔ تم مر گئے تو تمہاری زندگی رائیگاں نہیں جائے گی"۔

زندگی میں پہلی بار آبامیاں اتنے کھل کر مجھ سے ملے تھے۔ پہلی بار ان کی عظمت اور محبت کا احساس ہوا۔ ان کی جذبات میں ڈوبی ہوئی آواز نے منٹوں میں میری زندگی کی ایک سمت تعین کر دی۔ "زندگی اسی لئے ملتی ہے کہ اسے اعلیٰ مقصد کے حصول کے لئے قربان کی جائے"۔ وقت کا وہ لمحہ کتنا عظیم ہوتا ہے جس میں انسان زندگی کی تمام توانائیوں کو محسوس کرتا ہے۔ میں نے اس لمحے کے اندر زندگی کی سچائیوں کو پالیا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو محسوس کر لیا تھا۔ میں نے پردتما کی طرف دیکھا جو چارپائی کی پٹی سے لگی میری طرف دیکھ رہی تھی۔

آنگن میں دوپہر کی دھوپ اتر آئی تھی۔ بھورے رنگ کی گائے کھونٹے سے بندھی ہوئی بڑی خاموشی سے جگالی کر رہی تھی۔ چارے والے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ پیال اور گوبیوں کے پتے بڑی بے ترتیبی سے کمرے میں بکھرے ہوئے تھے۔ ہردے سنگھ چارپائی پر لیٹ گئے تھے۔ ان کے پیروں کا نچلا حصہ دھوپ میں تھا۔ پاس ہی آرام کرسی پر آبامیاں کسی سوچ میں گم کرسی کے ہتھے پر انگلیاں بجائے جا رہے تھے۔ "اس گھر کی چہار دیواری کے اندر کتنی معصومیت ہے۔ یہاں اپنائیت کا کس قدر بھرپور احساس ملتا ہے۔ میں نے لمحہ بھر ان تمام منظر پر سرسری نظر دوڑاتے ہوئے سوچا۔ آبامیاں ۔ آبامیاں آپ کیا سوچ رہے ہیں، کیا آپ اپنے نالوں پر شرمندہ ہیں ۔ اپنے کئے پر پچھتا رہے ہیں ۔ مگر شرمندگی اور پچھتاوے تو ان لوگوں کے حصے میں آتے ہیں جو اپنی پوری عمر بغیر کسی مقصد کے۔ زندگی کو صرف زندگی سمجھ کر گزار دیتے ہیں۔ آپ ۔ میں ۔ ہردے سنگھ ۔ پردتما بی بی، ہم سب کی زندگی کا ایک واضح مقصد ہے۔ ہم چاہے زندہ رہے یا مر جائے ہم کبھی اپنے آپ سے شرمندہ نہیں ہوں گے۔ ہردے کاکا کا یہ چھوٹا سا گھر صرف اینٹ پتھروں کی چہار دیواری تو نہیں ہے۔ یہاں زندگی کا بھرپور احساس ملتا ہے۔

زندہ رہنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ اس چھوٹے سے گھر میں ہم پورے ہندوستان کی جھلک دیکھ سکتے ہیں۔ محبت، اپنائیت اور خلوص کا جذبہ اس گھر کی بے جان دیواروں میں بھی ملتا ہے۔ یہ حق کب کسی کو پہونچتا ہے کہ وہ اس گھر کے سکون کو تباہ کر دے۔ اس گھر کی معصومیت اور حسن کو نوچ پھینکے۔ اور اس پر قبضہ کر بیٹھے۔ آبا میاں ــ ہم اپنے آپ سے کبھی شرمندہ نہیں ہوں گے۔ کبھی نہیں ــ

"میاں بھائی اب چلو بھی ــ جنے کھڑے کھڑے کیا سوچنے لگے"۔ پردتما کی آواز پر میں چونکا۔

ہاں، ہاں بھئی چلو۔ میں نے دھیرے سے کہا اور ہم دونوں ڈیوڑھی سے باہر نکل آئے۔

لڑکوں کا جلوس بڑے پرامن طریقہ سے شہر کی سڑکوں گزرتا رہا۔

چوک جامع مسجد، شیو گنج، ٹھیا، چاہ دیوا، سول اسپتال، عظمت پور، شاہ پور کے سارے محلے ایک کے بعد گزرتے گئے۔ سڑکیں ختم ہوتی گئیں مگر طلبا کا یہ جلوس اپنے سینے میں آزادی کی مشعلیں جلائے آگے بڑھتا گیا، اور آخر یہ بڑھتا ہوا سیلاب مہاراجہ کالج کے پاس پہونچ کر تھم گیا۔ لڑکوں نے غلامی کے خلاف، سامراجیوں کے خلاف جنہوں نے تجارت کے بہانے ہندوستان پر اپنی اقتدار کا پنجہ گاڑ دیا تھا، خوب خوب نعرے لگائے۔ مہاراجہ کالج کی پہلی منزل پر یونین جیک کو لہراتا ہوا دیکھ کر چند لڑکے بری طرح بپھر گئے۔ وہ یونین جیک کو اتار پھینکنے پر اس طرح سے اڑ گئے، جیسے آج غلامی کی تمام پابندیاں، تمام حدیں مٹا کر ہی دم لیں گے۔ انگریز کلکٹر حالات کو اچانک پلٹا کھاتے ہوئے دیکھ کر بوکھلا گیا۔ ہنگامی حالت کا اعلان ہو گیا۔ گورکھے سپاہی اپنی بندوقیں سیدھی کئے ہوئے حکم کے منتظر تھے۔ مگر لڑکے اپنی ضد پر قائم تھے۔ میں نے سمجھانے کی بہت کوشش کی۔

"یارو۔ ہمارا آج کا مظاہرہ پرامن مظاہرہ تھا۔ اس جلوس کا مقصد صرف یہ واضح کرنے کا تھا کہ ہم ایک پرامن ملک کے باشندے ہیں۔ آزادی ہمارا پیدائشی حق ہے۔ اور ہم اس آزادی کے لئے آخری دم تک لڑتے رہیں گے۔ اگر پرامن طریقے سے ہمارا مطالبہ نہیں مانا گیا تو ہم دوسرے ذرائع بھی اختیار کریں گے"۔ مگر اس ہنگامے میں دھیان سے میری بات کون سنتا۔ جلوس کے اگلے حصے سے کٹ کر چند لڑکے اور لڑکیاں کالج کی عمارت کے پاس پہونچ چکے تھے۔ کلکٹر نے لاؤڈ اسپیکر سے کئی ایک وارننگ دی۔ میں نے جلدی جلدی چند لڑکوں کو جلوس کے پچھلے حصے میں نظم و ضبط قائم رکھنے کی ہدایت دے کر بھیڑ کو چیرتا ہوا آگے بڑھا۔ اور اس سے پہلے کہ میں وہاں پہونچ کر حالات کو سنبھالنے کی کوشش کرتا کہ اچانک لڑکیوں کے جھنڈ سے پردتما تیر کی طرح نکلی اور کالج کی پہلی منزل کی طرف تیزی سے بڑھی۔ میں نے بے بسی سے کلکٹر کی طرف دیکھا جس کے ہونٹوں پر ایک خبیث مسکراہٹ رینگ رہی تھی۔ اس کی انگلی کے ہلکے اشارے پر تڑسے گولی چلی اور پردتما یونین جیک کا بانس پکڑے ہوئے نیچے جھول گئی۔ میری آنکھوں کے نیچے موت کی سیاہ تاریکیاں امنڈ آئیں، میں نے پاگلوں کی طرح بانس کے سہارے اوپر چڑھ کر پردتما کے جسم کو اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔ گولی ٹھیک اس کے سینے میں بیٹھی تھی۔ تازہ تازہ لہو سے اس کا جسم تربتر ہو رہا تھا۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی تھی۔ مگر موت کی آخری ہچکی نے اس کے ہونٹوں کو بے جان کر دیا۔ نیچے کھڑے ہوئے لڑکے دم بخود تھے۔ گورکھا سپاہیوں نے اپنی بندوقیں نیچے کر لی تھیں۔ میں پردتما کا مردہ جسم اپنے ہاتھوں میں لئے ہوئے نیچے اترا تو تمام لڑکے اشکبار تھے۔ طلبا کا ماتمی جلوس بڑی خاموشی سے کالج کے صدر دروازے سے نکل کر دو رویہ درختوں سے گھرے ہوئے سنسان سڑک پر آگے بڑھا۔ میرے بازوؤں میں پردتما کا جسم تھا۔ اس کے لمبے لمبے سیاہ بال نیچے جھول رہے تھے۔ اور اس کی آنکھیں کچھ کہنے کی حسرت میں کھلی ہوئی تھیں۔ سڑک کے دونوں طرف آم اور پیپل کے پیڑ سر نہوڑائے ساکت کھڑے تھے۔ اور پروا کی تیز لہریں شاخوں میں الجھی ہوئی پھنکار رہی تھیں "یہ میری محبوب سڑک ہے۔ دو رویہ درختوں کے بیچ سے گزرتی ہوئی سنسان سڑک۔ میں اس سڑک سے کئی بار گزرا ہوں۔ کبھی اکیلے، اور کبھی پردتما کے ساتھ۔ اب میں اس سڑک سے ہمیشہ تنہا گزرا کروں گا۔ پردتما میرے ساتھ نہیں ہوگی۔ پردتما ان درختوں کے پیچھے گم ہو گئی۔ کھو گئی۔ آسمان پر اٹھالی گئی" ننگے پیر، ننگے سر ہردے سنگھ نے جب پردتما کے جسم کو اپنے بازوؤں میں سمیٹا تو مجھے محسوس ہوا جیسے ہردے سنگھ نے ساری کائنات کو اپنی آغوش میں بھر لیا۔ پردتما کی سمادھی انگریزوں کی یادگار کے پاس ہی بنائی گئی۔ اس کی سمادھی پر پھول چڑھانے کے لئے سارا شاہ پور ٹوٹ پڑا تھا۔ اسی شام کو مجھے چند دوستوں سمیت گرفتار کر لیا گیا۔

جیل میں اکثر سوگوار ہردے سنگھ مجھ سے ملنے آتے تھے۔ میری ہمت بڑھاتے، پر دم تاکی باتیں کرتے، اور کبھی کبھی جوش میں آتے تو سلاخیں پکڑ کر زور زور سے بولنے لگتے۔ "یہ سلاخیں تو ہمیں قید کر سکتی ہیں۔ تمہارے جسم پر تو پابندی عائد کر سکتی ہیں۔ مگر تمہارے خیالات و احساسات پر ان کی گرفت ناممکن ہے، یہ ہمیشہ آزاد رہے ہیں۔ اور ہمیشہ آزاد رہیں گے۔ ہندوستانی اپنے جسم میں نہیں دماغ میں زندہ رہتا ہے"۔

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء سے کچھ روز پیشتر وہ مجھ سے ملنے آئے۔ آزادی کا مژدہ سنایا۔ میرے گھر کی خیریت سنانے کے بعد گھبرائی ہوئی آواز میں بولے "تیرا بابا پاکستان جانے کے لئے پر تول رہا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس نے اپنے آپ کو پاکستان جانے کے لئے کس طرح آمادہ کر لیا۔ اپنی زمین، اپنا گھر، صدیوں کی میل محبت، سماجی رشتے۔ روایتیں۔ سب کچھ کیسے بھلا بیٹھا۔ مگر میری بات کان کھول کر سن لو۔ کم از کم میری زندگی میں تم لوگ پاکستان نہیں جا سکتے۔ جیل سے چھوٹنے کے بعد کہیں تو بھی باپ کی ہاں میں ہاں نہ ملانے لگنا سمجھے!"

"شاہ پور مرکزی جیل کے آہنی دروازے سے باہر نکلا تو آسمان کے غربی کنارے شام کے دھندلکے میں گم ہو رہے تھے۔ اور فضا میں زمین کے مٹیالے غبار چکراتے پھر رہے تھے۔

آزادی کی فضا میں سانس لینے کے باوجود میں نے اپنے آپ کو قید کی اور جبر کی بے پناہ گرفتوں میں ڈوبا ہوا محسوس کیا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ برسہا برس ذہن کے بند دریچوں کے اندر پلنے والے تصورات جب باہر کی ٹھوس اور بے رحم حقیقتوں سے ٹکرا کر تتر بتر ہو جاتے ہیں تو ہمیں سچائی اور صداقت کی ایسی بھونڈی بھونڈی شکلیں نظر آتی ہیں۔ جنہیں دیکھنے، سننے اور سمجھنے کے بعد دنیا کے سب سے پہلے انسان کے دکھوں کا احساس ہوتا ہے، وہ جو دھرتی کی زمین کی ٹھوس سطح پر کھڑا رہنے والا انسان جس کے چاروں طرف تنہائی اور سناٹے کا گہرا سوچ بچار ہے۔ اور وہ اپنے آپ میں چھپا، ڈرا ڈرا ہراساں اور کھوج کی نظر ڈالتا ہے۔۔ تنہا، اداس اور خوفزدہ انسان۔

جیل کے دروازے پر آبا میاں اور ہردے سنگھ افسردہ ملول کھڑے ہوئے ملے۔ سارا راستہ خاموشی سے گذر گیا۔ گھر آ کر میں نے ابا میاں سے پوچھا کہ کیا میری رہائی کی خبر میرے دوستوں کو نہیں ملی تھی؟

ابا میاں سگریٹ کا لمبا کش کھینچتے ہوئے بولے "خبر تو سب کو تھی۔ مگر اس کا کیا کیا جائے کہ اب لوگ خبر سے بے خبر رہنا چاہتے ہیں۔ وہ جوش و خروش اور یکجہتی جو تمہارے جیل جانے سے پہلے تھی ختم ہو چکی ہے۔ دو قومی نظریے کی بنیاد پر پاکستان کا مطالبہ اور پاکستان کا وجود انتہا پسند لوگوں کے لئے اچھا خاصا بہانہ ہاتھ لگ گیا ہے۔ اور وہ اس کی آڑ لے کر اپنے ہر فعل کو جائز تصور کرتے ہیں۔ اس وقت سمو چا ہندوستان جہل میں ڈوبا بربریت کے عظیم الشان مظاہرے پر تلا بیٹھا ہے، ہمارا خلوص، ہماری قربانیاں مشکوک ہو چکی ہیں اور میں سمجھتا ہوں" وہ بڑے یقینی لہجے میں بولے۔ "یہ کیفیت وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی جائے گی۔ ہندوستان کے لئے ہمارا وجود ہمیشہ کے لئے غیر یقینی اور متزلزل ہو چکا ہے"۔ ابا میاں رکے اور اپنی پرانی عادت کے تحت میز پر انگلیاں بجانے لگے۔ اماں صحن میں کھٹولی پر بیٹھی جانے کس بات پر بڑبڑا رہی تھیں۔ دوسرے کمرے میں میری چھوٹی بہن اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اپنے بالوں میں نیلے رنگ کی ربن باندھنے مصروف تھی۔

یہاں کے مسلمان کیا سوچ رہے ہیں۔۔؟ میں نے پوچھا۔

ترک وطن ۔۔ ترک وطن ۔

"میاں بوریا باندھو" وہ بڑے اعتماد کے لہجے میں بولے، ہمیں پاکستان چلنے کے لئے ہر وقت تیار رہنا چاہئے۔

"اور ہردے سنگھ؟ کیا وہ ہمیں جانے دیں گے"۔ میں نے دھیرے سے پوچھا۔

"ہردے سنگھ" ابا میاں نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ ایک دن وہ خود مجھے بلا کر پاکستان چلے جانے کا مشورہ دے گا بیچارہ ہردے سنگھ میرے بچپن کا دوست، میں اسے اچھی طرح سے جانتا ہوں وہ ایک بے حد نیک اور کھلے ہوئے دل کا صاف انسان ہے۔ مگر اللہ!

اپنی آنکھیں بند کرکے اپنے آپ کو اپنے نظریئے کا غلام بنالیا ہے۔ تم جانو، زندگی کی ٹھوس حقیقتیں کسی کے ساتھ رعایت نہیں کرتیں۔ آنکھیں بند کرکے اپنے نظریئے کے گھروندے میں چپکا بیٹھا ہردے سنگھ اپنے آپ کو بے حد محفوظ سمجھتا ہے۔ مگر ایک دن جب اس کا گھروندا ٹوٹ جائے گا۔ اس کے چاروں طرف کی کھڑی ہوئی مضبوط دیواریں ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر جائیں گی۔ تو وہ اپنے آپ سے شرمندہ نظر آئے گا۔ وہ مجھے میرے گھر، میری زمین اور صدیوں کی محبت کا واسطہ دے کر یہاں روکنا چاہتا ہے۔ مگر اس سادہ لوح انسان کو خبر نہیں کہ سارے رشتے اور سماجی بندھنیں اور روائتیں وقت کے جبر کے سامنے دم توڑ رہی ہیں۔ ہم ایک ایسی مٹتی ہوئی قوت ہیں جسے زندہ رہنے کے لئے ازسر نو سوچنا پڑے گا۔ ہمیں اپنے وجود کو منوانے کے لئے جدوجہد کرنی پڑے گی۔ اگر ہم نے حالات سے سمجھوتہ کرلیا اور بزدلی سے بیٹھو رہے تو وقت ہمیں کچلتا ہوا ہمارے اوپر سے گزر جائے گا۔ سنو میاں، ہم جہاں بھی رہے۔ اپنی تمام اچھائیوں اور برائیوں سمیت، ہماری ایک صورت، ایک جسم، ایک وحدت ہونی چاہئے اور اب ہندوستان میں یہ ایک غیر ممکن بات ہے۔"

بات کرتے کرتے آبادیاں خاموش ہو چکے تھے۔ کمرے کے گہرے سکوت میں مجھے اپنے وجود کا احساس بڑا غیر ضروری سا محسوس ہو رہا تھا —— اپنے وجود کا احساس، گہرا اور ٹھوس احساس، خیالات کے پیچ در پیچ سلسلے، زندگی کی اکتا دینے والی بیرحم حقیقتیں، الفاظ، کردار، یہ ساری چیزیں یکدم سے پیرا کر دینے والی ہیں —— میں اکتا گیا ہوں۔ مجھے تنہائی چاہئے۔ مجھے یہاں سے کہیں اور چلا جانا چاہئے —— اس وقت نہ جانے کیوں مجھ پر جھنجھلاہٹ سوار تھی۔ منہ ہاتھ دھو کر باہر نکلا۔ روشنی کی آخری کرن بھی ہردے سنگھ کی اونچی حویلی کی چھت پر بجھتی جا رہی تھی۔ شفق کی سرخی میں ابھرتا ہوا ہلالی چاند بے حد مدھم اور پراسرار سا نظر آ رہا تھا —— اکثر گھروں کے دروازے جو ہمیشہ شام کے وقت کھلے ہوئے ہوتے تھے اس وقت بند تھے۔ سڑک پہ خاموشی تھی۔ کہیں کہیں منڈیروں اور چھتوں پر بیٹھے ہوئے بچے اپنی پتنگ جلدی جلدی نیچے اتار رہے تھے۔ ان کی مائیں گالیاں دے دے کر انہیں نیچے بلا رہی تھیں۔ "چھٹ" کا تہوار نزدیک تھا۔ مگر ساری جگہوں پر خوف اور اکتاہٹ طاری تھی۔ راستے میں مجھے اچانک اُدے شنکر ملا۔ وہ میرا ہم جماعت اور میرے اچھے دوستوں میں سے تھا۔ بڑی اجنبیت سے ملا کہنے لگا۔ "ابے، تم جیل سے کب چھوٹے؟ تم کو تو ابھی جیل ہی میں رہنا چاہئے تھا" کیا کر رہے پوچھ کر میرے لہجے کی سرد مہری نے اس کی ہمت توڑ دی۔

"اچھا بھئی —— میں چلتا ہوں۔ اندھیرا ہو رہا ہے۔ مجھے ذرا جلدی گھر پہنچنا ہے۔ اور ہاں" وہ چلتے چلتے اچانک رک کر بولا —— "سنا ہے تم لوگ پاکستان جا رہے ہو —— کب تک؟"

میں کچھ جواب دیئے بغیر آگے بڑھ گیا۔ "یہ میرا دوست اُدے شنکر ہے۔ میرے بچپنے کا دوست، ہم دونوں ایک دوسرے کو برسوں سے جانتے ہیں۔ ہماری دوستی میں وقت کا ایک ایک لمحہ صرف ہوا تھا۔ ہم نے بڑی محنت سے ایک دوسرے کو پہچاننے کی کوشش کی تھی —— مگر ابھی —— وقت کے اس لمحے میں ٹھہر کر جب ہم ملے تو ایک دوسرے کے لئے کتنے اجنبی نکلے۔" اُدے شنکر —— اُدے شنکر —— میں ہر زمانے میں، ہر جنم میں ایک نیا روپ بھر کے تم سے ملنے آؤں گا۔ مگر تم مجھے پہچان نہیں سکو گے۔ چلو خیر میں بحث نہیں کرتا۔ اس وقت تو میں اپنی تلاش میں نکلا ہوں —— اپنے وجود کا کھوجی۔ دنیا کا پہلا انسان —— تنہا، اداس اور خوفزدہ ——"

کئی ہفتوں کے سوچ بچار کے بعد آخر میں ہردے سنگھ سے ملنے کے لئے ان کی حویلی میں داخل ہوا۔

وہ برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھے اونگھ رہے تھے۔

ان کی بیوی چارپائی پر بیٹھی رامائن پڑھ رہی تھیں۔ اور سارے سے لے کر آنگن تک ایک بے حد چبھتی ہوئی خاموشی مسلط تھی۔ "پر دیسا —— پر دیسا تم وہاں ٹھاٹ سے لیٹی پڑی ہو۔ آؤ۔ دیکھو۔ تمہارے بغیر یہ گھر کرب مسلسل کی ایک علامت بن چکا ہے، تمہاری ماں، تمہارے پتا تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ اس گھر کے کھلے ہوئے دروازے تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں۔"

میں دھیرے دھیرے چلتا ہوا ہردے سنگھ کے پاس ہی چبوترے پر بیٹھ گیا۔ ہردے سنگھ کی بیوی نے جلدی سے مجھے کھٹیا لا کر دی۔ اور پاس

ہی وہ بھی خاموشی سے بیٹھ گئیں۔

"دن کے ختم ہوتے ہوئے اجالے کو تم دیکھ رہے ہو۔" ہردے سنگھ میری طرف دیکھتے ہوئے بولے "میں یہاں بیٹھا اکثر سوچتا رہتا ہوں کہ اگر اس اجالے کا تھوڑا سا حصہ ایک بوند، ایک قطرہ ہماری زندگی میں آجاتا تو شاید ہمارے اردگرد جو یہ نفرت، جہل اور تعصب کی تاریکیاں پھیلی ہوئی ہیں ختم ہوجائیں کیا ایسا ممکن نہیں ہے؟ تم نے بائبل پڑھی ہے۔ خیر، عہدنامہ عتیق کی ابتدا ہی روشنی کے تذکرے سے ہوتی ہے۔" خدا نے کہا روشنی ہوجائے اور روشنی ہوگئی۔ اور خدا نے دیکھا روشنی بہت اچھی ہے "ہاں، میں بھی روشنی کے انتظار میں ہوں۔ روشنی کو دیکھنا چاہتا ہوں، محسوس کرنا چاہتا ہوں۔ اور کہنا چاہتا ہوں۔ یہ روشنی بہت اچھی ہے"۔ وہ کچھ دیر چپ چاپ ہوا سے ہلتی ہوئی شاخوں کو دیکھا کئے۔ پھر اچانک بولے۔

سنا ہے تم لوگوں نے پاکستان جانے کا ارادہ مکمل کرلیا ہے۔ آخر کیوں۔ کیا تم لوگ یہاں نہیں رہ سکتے"۔

میں ہردے سنگھ کے اس اچانک سوال سے سپٹا گیا۔ بڑی مشکل سے ضبط کرتے ہوئے دبے لہجے میں بولا۔ "ہاں، چاچا۔ تم نے ٹھیک ہی سنا۔ پہلے پاکستان جانے کا ارادہ صرف ابا میاں کا تھا۔ مگر اب میں بھی اس ارادے میں شامل ہوگیا ہوں۔ ہمیں پاکستان چلے ہی جانا چاہیے۔ آخر ہم کب تک محض چند خوش فہمیوں کے سہارے یہاں زندہ رہ سکتے ہیں۔ پاکستان کا تصور جو پہلے ذہن کا ایک مبہم خاکہ تھا اب مکمل ہوچکا ہے۔ ایک فیصلہ کن حقیقت کی شکل اختیار کرچکا ہے۔ زمین کی تقسیم کے ساتھ ساتھ آدمیوں کا بٹوارہ بھی ضروری ہے۔ اس حقیقت سے نہ آپ انکار کرسکتے ہیں۔ اور نہ میں۔ مجھے اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لئے آپ سے جدا ہونا پڑے گا۔ میں اپنے گھر میں اجنبی بن کر زندہ نہیں رہ سکتا ہردے چاچا۔" میری دو ٹوک بات شاید ہردے سنگھ کو بری لگی تھی۔ وہ خاموش تھے۔ اندھیرے میں ان کا چہرہ ڈوبتا جارہا تھا۔ ہردے سنگھ کی بیوی بھی خاموش تھیں شاید۔ شاید پردتما کی یادوں نے انہیں گھیر رکھا تھا۔ یا پھر وہ میرے بارے میں سوچ رہی ہوں گی کہ میں کتنا کٹھور ہوں۔ بے مروت ہوں۔ آخر مسلمان ہوں نا۔۔۔

رات بڑی تیزی سے پھیل رہی تھی۔

تقریباً تین ماہ بعد شاہ پور کی میونسپلٹی کے اجلاس میں ایک بار پھر "کنور مارگ" کی تحریک پیش کی گئی، اور اس مرتبہ یہ تحریک بڑی بھاری اکثریت سے منظور کرلی گئی۔ ہردے سنگھ اپنا استعفیٰ داخل کرکے جب گھر لوٹے تو وہ ٹوٹے ہوئے تھے۔ نڈھال، تھکے تھکے۔ وہ اپنی حویلی میں ابا میاں سے دیر تک باتیں کرتے رہے۔ گھنٹے دو گھنٹے کے بعد جب ابا میاں ان کی حویلی سے لوٹے تو کہنے لگے۔ "شہر کی حالت دن دن خراب ہوتی جارہی ہے۔ ہم کل ہی صبح کی گاڑی سے پاکستان چل رہے ہیں۔۔!"

دوسرے روز صبح ہی صبح یکے ہمارے گھر کے دروازے پر کھڑے تھے اور ضروری سامان ان پر رکھا جارہا تھا

ابا میاں ہردے سنگھ سے ملے بغیر نکل جانے کی کوشش میں تھے۔ جیسے تیسے کرکے ابھی ہمارا یکہ چند ہی قدم بڑھا ہوگا کہ اچانک ہردے سنگھ کی حویلی سے رونے پیٹنے کی آواز سنائی دی۔ ہم ہڑبڑا کر یکے سے نیچے کودے اور بھاگتے ہوئے ہردے سنگھ کی حویلی میں داخل ہوئے۔ ڈیوڑھی کی چھت کی کڑیوں سے لٹکی ہوئی ہردے سنگھ کی لاش دھیرے دھیرے جھول رہی تھی۔

میں بے اختیار ہوکر ہردے سنگھ کے پیروں سے لپٹ گیا۔ ابا میاں کی آنکھیں ابل پڑی تھیں۔ ان کے گلے سے خرخراتی ہوئی آواز نکل رہی تھی۔

"ہردے۔ میرے پیارے ہردے یہ تونے کیا کیا۔۔؟"

امرتسر جانے والی گاڑی شاہ پور کے اسٹیشن سے نکل کر گمٹی میں داخل ہوئی تو میں نے کھلی ہوئی کھڑکی سے مہاراجہ کالج دیکھا۔ عمارت پر ترنگا جھنڈا لہرا رہا تھا، احاطے میں بڑی آسودگی اور بے فکری سے کالج کے لڑکے گھوم رہے تھے۔ احاطے کے دوسری جانب سنسان سڑک پر جس کے دونوں جانب درختوں کی قطاریں تھیں۔ جہاں میں اور پردتما دھیرے دھیرے چلتے ہوئے یادگار دیوار کے پاس پہونچ کر نظم پڑھتے تھے صاف نظر آرہی تھی۔ وہیں پردتما کی سمادھی بھی تھی۔ جہاں درختوں کے خشک پتے اور مرجھائے ہوئے پھول بکھرے رہتے تھے۔ سنسان، اداس تنہا سمادھی۔

کھڑکی سے گذرتی ہوا نے سرگوشی کی۔ میاں بھائی میں کیسی دکھتی ہوں۔ "میں نے دھیرے سے کہا۔ بہت اچھی۔ بہت خوبصورت پر ممتالی بی۔ ٹرین گمٹی سے نکل کر تیزی سے سیٹیاں دیتی ہوئی بھاگ رہی تھی۔ چکر کھاتے ہوئے دھان کے کھیت، بجلی کے کھمبے، تاروں پر بیٹھی ہوئی فاختہ پیچھے کی طرف لوٹ رہے تھے۔ دھیرے دھیرے سارے منظر دھندلاتے گئے۔ میں نے کھڑکی بند کر دی۔ اور ٹانگیں پھیلا کر برتھ پر لیٹ گیا۔ ابا میاں خاموشی سے دوسری برتھ پر چھوٹی بہن کے لئے بستر کھول رہے تھے۔ اماں بی ٹکر ٹکر پیچھے کی طرف تکے جا رہی تھیں۔

منی بستر پر لیٹی لیٹی اپنی توتلی زبان سے بولی "ابا میاں۔ ابا میاں، ہم تہاں جا رہے ہیں۔" ابا نے لمحہ بھر کے لئے بڑی پیار بھری نظروں سے منی کو دیکھا۔ اور بڑی بشاشت سے بولے "گھر۔"

دیواریں

حمید کاشمیری کے منتخب افسانوں کا مجموعہ عنقریب شائع ہو رہا ہے

• سفید کاغذ • آفسٹ کی دیدہ زیب چھپائی • خوبصورت گٹ اپ • قیمت ۶ روپے

ناشر — **مکتبۂ ماحول**۔ بہادر شاہ مارکیٹ۔ بندر روڈ کراچی

براہ کرم میرا تولیہ استعمال نہ کیجئے

آپ کے چہرے پر دانے ہیں تو یہ جملہ آپ کو بھی سننا پڑیگا

اور کالے رنگ والوں سے مذاق میں بھی یہ بات کہہ دی جاتی ہے لیکن باعزت طریقہ یہی ہے کہ داغ دھبے، دانے اور مہاسے دور کرنے کے لئے جلد کی بہترین غذا **ایکس** کریم استعمال کیجئے۔

چہرے کے داغ دھبے، دانے اور مہاسے صاف کرکے رنگ گورا کر دیتی ہے۔

ادب کا اعلیٰ معیار ہمارا معیار ہے

اور

نیا دور کا نام اس معیار کی ضمانت ہے

نیا دور کراچی

کا تازہ شمارہ ۳۵-۳۶

شائع ہوگیا ھے

☆ اس میں پاکستان اور ہندوستان کے بہترین لکھنے والے اپنی معیاری اور اعلیٰ تخلیقات کے ساتھ شریک ہیں۔

• اپنے کسی قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیے یا براہ راست ہمیں لکھئے۔

منیجر **نیا دور** کراچی ۵

م م راجندر

اپنے پرائے

اس دنیا میں بعض مرتبہ دوسرے بھی ایسے اپنے بن جاتے ہیں کہ یہ خیال ہونے لگتا ہے کہ پیار کا رشتہ شاید جنم جنم سے چلا آتا ہے۔
ایسا ہی پیار کا رشتہ میرے بچے ڈمپی اور اس چھوٹی سی لڑکی توشی کے درمیان تھا جس سے ہمارا کوئی خون کا رشتہ نہیں تھا۔ توشی اور ڈمپی کو ایک دوسرے کو دیکھے ہوئے تقریباً ایک سال ہو گیا ہے، مگر چھوٹا سا بچہ ہوتے ہوئے بھی ڈمپی اپنی آنٹی توشی کو نہیں بھولا ہے۔ کئی سو میل کے فاصلے نے انہیں نظروں سے تو دور کر دیا ہے۔ مگر دل کی آنکھوں سے وہ ایک دوسرے کو ضرور دیکھ لیتے ہیں۔

ڈمپی کے بارے میں تو میں جانتا ہوں کہ اس نے اپنی ماں کی گود میں سوتے ہوئے بھی اچانک جاگ کر اپنی آنٹی کو پکارا ہے۔ اور اس کی چھوٹی سی آنٹی کی تڑپ ان پوسٹ کارڈوں سے ظاہر ہے جو ہر ہفتے آتے ہیں اور اس ڈمپی کے نام ہوتے ہیں جو انہیں پڑھ بھی نہیں سکتا۔

توشی اب چودہ برس کی ہو گی۔ لیکن پہلی بار میں نے اُسے کوئی نو سال ہوئے اپنی شادی کے موقعے پر دیکھا تھا۔ وہ محلے کی ایک لڑکی تھی اور شادی کی بھیڑ میں گلی محلے کے پچاسوں بچوں میں، جو اس موقعے پر امنڈ آتے ہیں، وہ بھی شامل تھی، مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ ایک تقریب میں ایک خوبصورت بھولی بھالی سی بچی میرے بہت قریب آکر کھڑی ہو گئی تھی۔ اور مجھے اور میرے کپڑوں کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ مجھے وہ اتنی اچھی لگی تھی کہ میں نے اسے پکڑنا چاہا تھا مگر وہ بھاگ گئی تھی۔ اس کے بعد شادی کے ان دو دنوں میں وہ بیسیوں مرتبہ آئی ہو گی۔ اور ایک دو دفعہ میں نے چند بچوں کے درمیان اس سے بات بھی کی اور اس کا نام پوچھا۔

اُس وقت وہ کوئی پانچ سال کی ذہین مگر شرمیلی بچی تھی۔

یہ شادی کے ہنگامے کی بات تھی۔ میں بھول بھی گیا۔

شادی کے بعد میں اپنی سسرال جاتا رہا، لیکن گھر میں آنے والے بچوں میں توشی نظر نہ آئی۔ اور نہ میں نے اُس کے بارے میں پوچھا۔

لیکن ایک ایسے ہی موقعے پر جب گھر میں کچھ چھوٹے بچے ناچ اور گا رہے تھے، مجھے یکایک توشی کا خیال آیا، اور میں نے فوراً پوچھا کہ وہ چھوٹی سی بچی توشی کہاں ہے؟ پتہ لگا کہ میری شادی کے دو ماہ بعد ہی ان لوگوں کا تبادلہ کسی اور جگہ ہو گیا تھا۔ اور انہیں گئے ہوئے دو تین سال ہو گئے تھے۔

اس کے بھی کئی سال بعد کی بات ہے۔ میں دفتر سے گھر آیا تو اپنی بیوی کو ایک دس گیارہ سال کی لڑکی سے بات کرتے ہوئے پایا۔

میری بیوی میرے داخل ہوتے ہی بولی:

"آپ اسے پہچانتے ہیں؟"

"نہیں تو!" میں سوچتے ہوئے بولا۔

"یہ توشی ہے، وہی چھوٹی سی لڑکی، جو شادی کے وقت آپ کے پاس بہت آتی تھی، اور جس کے بارے میں آپ نے ایک بار پوچھا بھی تھا" میں نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ بچپن کی بھولی توشی اور اب ذرا بڑی توشی میں کوئی فرق نہیں تھا۔ بس جیسے کسی چھوٹی سی تصویر کو کسی نے بڑا بنا دیا تھا ویسے ہی خوب صورت، دبلی، پتلی، شرمیلی اور بھولی بھالی!

میری بیوی بولی:

"ان کا تبادلہ یہیں ہو گیا ہے۔ اور یہ لوگ پرسوں ہی سے یہاں آئے ہیں۔ ہمارے پیچھے کی گلی میں جو کونے کا مکان خالی تھا، وہی انہوں نے لیا ہے۔ ان کے پتا جی بھی آئے تھے مگر ان کے یہاں ان کے کوئی دوست آئے تھے تو وہ چلے گئے۔ میں نے توشی کو روک لیا کہ ٹھہر کر چلی جائے گی — دیکھا آپ نے؟ اب تو یہ بڑی ہو گئی ہے چھٹی میں پڑھتی ہے۔ کیسی گڑیا سی تھی، چھوٹی سی۔ مجھے بازار میں ادھر اُدھر مل جاتی تو شاید پہچان بھی نہ سکتی۔"

یہ ڈمپی کی پیدائش سے پانچ چھ مہینے پہلے کی بات ہے، توشی میری بیوی سے کافی گھل مل گئی اور وہ اپنا بہت سا وقت ہمارے یہاں ہی گذارتی تھی۔ وہ اپنی کتابیں لے کر میری بیوی کے پاس ہی چلی آتی، اور وہیں پڑھتی رہتی۔ ہمارا اور اُن کا آپس میں بڑا ہی میل ہو گیا۔ بلکہ ڈمپی کے ہونے کا وقت آیا تو توشی کی ماں نے پوری مدد کرنے کا وعدہ کیا اور اس وعدے کو توشی کی ماں اور توشی نے ایسے نبھایا جیسے صرف اپنی ماں اور بہن ہی نبھا سکتی ہے۔

ڈمپی ہماری شادی کے کئی سال بعد ہوا تھا، اس لئے قدرتی طور پر ہماری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ اس خوشی میں توشی اور اس کی ماں بھی شریک تھیں۔ توشی بھی اپنے گھر میں اکیلی ہی تھی۔ اور ڈمپی کے ہونے پر اس نے بالکل ایک بھائی کے ہونے کی خوشی محسوس کی۔

مجھے آج بھی وہ دن یاد ہیں جب اس نے اپنی پڑھائی کا حرج کر کے دن رات ہمارے گھر میں بے حد کام کیا تھا۔ چھوٹی سی لڑکی ہوتے ہوئے بھی اس نے بڑی عورتوں کی طرح تقریباً سارا گھر ہی سنبھال لیا تھا۔ وہ دن رات ڈمپی کو لئے بیٹھی رہتی۔ اس گڑیا سے بچے کے ساتھ جس کی آنکھیں بھی شاید اسے نہیں دیکھ سکتی تھیں وہ گھنٹوں کچھ نہ کچھ بولتی رہتی تھی۔ پھر ایک روز توشی نے ڈمپی کو اس کا یہ نام دے دیا۔ وہ کہنے لگی کہ "جب یہ ہنستا ہے تو اس کے ننھے سے گال میں ایک گڑھا پڑ جاتا ہے اور مجھے اس کا نام ڈمپی پسند ہے"۔ توشی کی پسند ہم سب کی پسند ہو گئی اور سندیپ کا دوسرا نام ڈمپی ہو گیا۔

وقت ہنسی اور خوشی کی بھرپور چھلانگیں مارتا گذر رہا تھا۔ توشی کی گود میں اُچھلتا کودتا اور ہنستا چیختا ڈمپی بھی بڑھتا رہا۔ جوں جوں وہ بڑھتا رہا۔ وہ بہت ہی خوب صورت بچہ بنتا گیا۔ اور ایک روز میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ توشی اور ڈمپی کے چہرے کے خد و خال بہت حد تک ایک دوسرے سے ملتے تھے۔ نہ جانے قدرت کے کون سے اصول نے ڈمپی کو توشی کے چہرے کی گولائی، اس کے نقش، خوبصورتی اور بھولا پن دے دیا تھا۔ پھر یہ مشابہت کا خیال زیادہ مضبوط ہوتا گیا، اور توشی اور ڈمپی بالکل بھائی بہن لگنے لگے۔ اور یہ خیال ہمارا ہی نہیں تھا بلکہ توشی اسے گود میں لئے باہر کھلاتی ہوتی تو باہر والے بھی ایسا ہی کہتے۔ اور وہ بعض مرتبہ توشی سے کہہ بھی دیتے تھے۔

پھر وہ منزل آئی جب ڈمپی ڈیڑھ سال کا ہو گیا، اور کچھ بولنے لگا، وہ توشی کو کبھی توشی اور کبھی آنٹی کہنے لگا۔ یہ دونوں لفظ اس نے گھر میں سے تھے، کیونکہ توشی میری بیوی کو آنٹی کہتی تھی۔ اور ہم دونوں اسے توشی کہتے ہی تھے۔ اس طرح چھوٹی سی توشی ڈمپی کی آنٹی بن گئی۔

ڈمپی توشی کے ساتھ بہت زیادہ ہل گیا تھا۔ وہ بے چاری اسکول جانے سے پہلے بھی ایک دفعہ آتی اور اسکول سے واپس آکر فوراً ہی پھر آجاتی۔ ڈمپی بے تابی سے اپنی آنٹی کی راہ دیکھتا۔ اور صبح شام جب توشی جانے لگتی تو وہ اس کے ساتھ جانے کے لئے مچلتا اور زمین پر لوٹ پوٹ ہو کر رونے لگتا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ توشی سے اس کا رونا برداشت نہ ہوا اور وہ اسے ساتھ ہی لے گئی اور پھر وہ اسے خود دے گئی۔ یا ہم میں سے کوئی جا

لے آیا۔

ایک روز اسی طرح توشی کے ساتھ ڈمپی شام کو چلا گیا۔ مگر دو گھنٹے گذر گئے اور اسے کوئی دینے نہیں آیا۔ اس کے سونے کا وقت ہوگیا تھا۔ اس لئے میں اسے لینے چلا گیا۔

میں وہاں گیا تو توشی نظر آئی نہ ڈمپی۔

توشی کی ماں نے پلنگ کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ:

" وہ لیٹے ہیں "

میں نے لحاف اٹھا کر دیکھا۔ توشی سوئی پڑی تھی اور اس کی گود میں مڑا ہوا ڈمپی بھی آرام سے سو رہا تھا، میں نے آہستہ سے توشی کا ہاتھ ہٹایا اور ڈمپی کو گود میں اٹھالیا۔

میں نے توشی کی ماں سے کہا۔

" توشی آج ساڑھے سات بجے ہی سوگئی؟"

" ہاں کل دیر تک پڑھتی رہی۔ بچہ ہے۔ ڈمپی کو سلاتے سلاتے خود بھی سوگئی "۔

دو سال کا ڈمپی بہت ہی نٹ کھٹ، شرارتی ڈمپی تھا۔ ماں باپ اور آنٹی کے لاڈ پیار میں پلا ہوا ڈمپی کافی شریر ہوگیا تھا۔ اس کا اور توشی کا آپس کا پیار بڑھتے ہوئے چاند کی طرح ہر روز بڑھ رہا تھا۔ اب وہ اپنی آنٹی کے گھر جانے کے لئے کسی کی گود کا محتاج نہیں تھا۔ اور توشی کے اسکول سے آنے سے پہلے ہی وہ اپنی ٹانگوں سے گرتا پڑتا اس کے گھر پہونچ جاتا۔

توشی کو اسکول میں کھانے کے لئے گھر سے ایک آنہ روز ملتا تھا اور وہ بے چاری اسی میں سے ہر روز ڈمپی کے لئے ایک ٹافی یا گولی لے آتی۔ اسے لیتے ہی ڈمپی کے گالوں کے گلاب کھل جاتے، اور وہ اپنی ننھی سی ہتھیلی پر اسے ایسا دیکھتا جیسے کسی ننھی منی پری نے اسے جادو کی ٹافی دی ہو۔ ایک چھوٹی بچی ماں کا پیار بھی دے سکتی ہے، یا پھر بڑی بہن کا پیار بھی ماں کا پیار ہے، یہ بات تو توشی نے ثابت کردی تھی۔ ڈمپی کے ساتھ اس کی والہانہ محبت نے اسے ڈمپی کی بہن اور ماں دونوں بنادیا تھا۔ دن کے وقت ڈمپی کی ماں توشی تھی۔ اور رات کے وقت اس کی اپنی ماں۔ جیسے توشی میں کوئی مقناطیس لگا تھا۔ ڈمپی دن بھر توشی کے گھر کے چکر لگاتا رہتا۔ اور گھر پہونچ کر جب اسے یہ پتہ لگتا کہ آنٹی اسکول گئی ہوئی ہے تو منہ لٹکائے اداس واپس آجاتا۔ حالانکہ توشی ہر روز اسکول جاتی تھی۔ مگر ڈمپی کے ننھے سے ذہن میں یہ بات نہیں آئی تھی اور وہ تیار ہوکر سب سے پہلے سیدھا توشی کے گھر جاتا اور یہ سن کر لوٹ آتا کہ توشی اسکول گئی ہے۔ مگر اسکول جانے سے پہلے صبح کا ایک چکر اور دوپہر کے بعد کئی چکر ڈمپی کی زندگی کا جزو بن گئے تھے اور وہ ماں کے روکنے سے بھی نہیں رکتا تھا۔

آہستہ آہستہ میری بیوی کو یہ برا لگنے لگا کہ توشی کے بغیر ڈمپی کو چین نہیں آتا۔ کئی بار اس نے ڈمپی کو توشی کے گھر یا اس کے ساتھ جانے سے روکا بھی۔ اس میں کسی حسد کے جذبے کو دخل نہیں تھا۔ اور شاید ہر ماں ان حالات میں ایسا ہی کرتی، اس کے علاوہ توشی کو گھر کا کام اور اپنی پڑھائی بھی کرنی ہوتی تھی۔ اور ہمیں یہ برا لگتا تھا کہ ڈمپی توشی کے ساتھ اس طرح چپکا رہ کر اس کا وقت ضائع کرے۔

مگر توشی میں نہ جانے پیار اور شفقت کی کون سی کشش تھی۔ اور ڈمپی اور ان کا کون سے جنم کا ساتھ تھا کہ ڈمپی اور توشی ایک دوسرے کے ساتھ زیادہ وابستہ ہوتے گئے۔

ایک روز بڑی ٹھنڈ تھی۔ میں، میری بیوی اور توشی کچے کوئلوں کی ایک انگیٹھی کے گرد بیٹھے ہوئے تھے۔ شام کے سات بجے ہوں گے۔ میری بیوی ڈمپی کو گود میں لٹا کر سلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر وہ سو نہیں رہا تھا۔ جب توشی جانے کے لئے اٹھی تو وہ ماں کی گود سے اتر کر توشی کی گود میں چڑھ

گیا۔ میری بیوی کو برا لگا۔ کیونکہ توشی کو پہلے ہی دیر ہو گئی تھی۔ اس نے ڈمپی کو آگے بڑھ کر کھینچ لیا اور اس پر خفا ہونے لگی۔

لیکن ڈمپی مچلتا رہا۔

توشی بولی۔

"لاؤ میں لے لوں۔ سلا کر چلی جاؤں گی۔"

ڈمپی توشی کی گود میں لیٹ گیا، لیکن سونے کے بجائے اس سے کھیلنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں نیند نہیں تھی، مگر وہ توشی کی گود سے اترنے کے لئے تیار نہیں تھا۔

ساڑھے سات بجے توشی گئی، مگر ڈمپی اس وقت تک نہیں سویا تھا۔ توشی جانے لگی تو وہ اس کے ساتھ جانے کی ضد کرنے لگا۔ لیکن اس کی ماں نے اسے زبردستی روک لیا۔

توشی کے جاتے ہی غصے میں میری بیوی نے ڈمپی کے دو تین تھپڑ مار دیئے اور اسے لے کر پلنگ پر لیٹ گئی اور زبردستی سلانے لگی۔ مار کھا کر اور سسکیاں لیتا ہوا ڈمپی سو گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کی ماں بھی۔ تھوڑی دیر میں مجھے بھی نیند آنے لگی۔ اور میں بتی بجھا کر سو گیا۔

کوئی شاید نو بجے ہوں گے۔ میری اچانک آنکھ کھل گئی۔ ڈمپی نیند میں بڑبڑا رہا تھا کہ۔

"آنٹی کے پاس سوؤں گا۔"

میں نے اسے اٹھا کر اور تھپک کر اپنے پاس سلا لیا۔ میری پھر آنکھ لگ گئی۔ مگر تھوڑی دیر میں ہی کھل گئی۔ کیوں کہ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ڈمپی میرے بستر پر نہیں ہے۔ میں نے اٹھ کر بتی جلائی تو دیکھا کہ ڈمپی دروازے سے لگا کھڑا ہے۔ میں نے اسے گود میں لیا تو وہ سوتے ہوئے بولا کہ۔

میں آنٹی کے پاس سوؤں گا۔"

میرا دل رحم سے بھر گیا۔ میں نے گھڑی کی طرف دیکھا، دس بجے تھے۔ میں نے کمبل لیا، ڈمپی کو اور اپنے آپ کو اس میں لپیٹا، اور آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔

توشی کے کمرے میں ابھی تک روشنی تھی۔ میں نے کھڑکی کے شیشوں میں سے جھانکا۔ توشی ابھی تک پڑھ رہی تھی۔ میں نے شیشے پر کھٹ کھٹ کی اور توشی نے مجھے دیکھتے ہی لپک کر دروازہ کھول دیا۔ جیسے وہ میرا مطلب جانتی تھی یا جیسے جو کچھ ڈمپی پر گزر رہی تھی وہ اسے سمجھتی رہی تھی، اس نے فوراً کمبل میں سے ڈمپی کو لے لیا، اور اسے اپنے سینے سے چمٹاتی ہوئی چارپائی پر لیٹ گئی۔

وہ پہلا دن تھا جب ڈمپی رات بھر گھر سے باہر سویا۔ میں گھر لوٹا تو بیوی دروازے پر کھڑی تھی اور پریشان تھی، مجھے خالی ہاتھ دیکھ کر گھبرائی۔ میں نے سب کچھ بتا دیا تو وہ بولی۔

"آپ نے ٹھیک نہیں کیا۔ ڈمپی کو آپ نے ہی خراب کیا ہے۔ ڈمپی کا توشی کے ساتھ اتنا لگاؤ میں پسند نہیں کرتی۔ وہ پھر پرائی لڑکی ہے۔"

میں نے کہا۔

"تم خواہ مخواہ ایسا سوچتی ہو۔ اس میں اپنے پرائے کی کیا بات ہے۔ یہ دو بچوں کا پیار ہے۔ اور ایسا غیر قدرتی بھی نہیں۔ وقت کے دو چار سال شاید اس پیار کے بلبلے کو توڑ دیں گے۔ ڈمپی دو ایک سال میں اسکول جانے لگے گا اور توشی کون سی سدا یہیں رہے گی۔"

لیکن دو ایک سال سے بہت پہلے ہی پیار کا یہ ننھا سا بلبلا پھوٹ گیا۔ اور وہ ننھی ننھی معصوم دھارائیں الگ ہو گئیں۔ ہمارے دفتر کی

ایک شاخ شیلانگ میں کھل گئی اور مجھے وہاں جانے کا حکم ہوگیا۔ میں نے بڑی کوشش کی کہ وہاں نہ جاؤں، مگر کامیاب نہ ہوا یا توشی نے جب یہ سنا کہ ہم اتنی دور آسام جارہے ہیں۔ تو وہ دھک سے رہ گئی۔ اس کا معصوم گلابی چہرہ ایک دم سفید سا ہوگیا۔ اور اس کی آنکھوں میں تیرتے ہوئے سیاہ دھبے ٹھہر سے گئے وہ دو ایک روز ہمارے یہاں آئی بھی نہیں۔

ڈمپی یہ جان کر کہ اب ہم جارہے ہیں۔ بڑا خوش ہوا اور کہتا رہا کہ ہمارے ساتھ آنٹی بھی جائیں گی۔ جو بھی اس سے پوچھتا کہ کون کون جائے گا" تو وہ ہم سب کے ساتھ آنٹی کا نام بھی لے دیتا۔ اور توشی یہ سنتی تو اس کا کلیجہ منہ کو آجاتا۔ وہ شاید اس بات کو برداشت نہیں کرسکتی تھی۔ اور فوراً اس جگہ سے اٹھ کر بھاگ جاتی۔ شاید وہ کہیں جاکر تنہائی میں روتی یا اپنے آنسوؤں کی ندی کو اپنی آنکھوں میں ہی پی جاتی۔

اور پھر وہ دن بھی آگیا۔ جب دو معصوم دلوں کے آبگینے چور چور ہوگئے، ہمارا سامان لدرہا تھا اور ہم جانے والے تھے۔ توشی اپنے گھر کے کسی کونے میں بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔ اور ڈمپی اپنے نئے نئے کپڑے پہن کر توشی آنٹی کو بلانے کے لئے چلا گیا تھا۔ لیکن آنے کی بجائے توشی نے اسے اپنے سینے سے بھینچ لیا تھا۔ اور توشی کو روتا دیکھ کر ڈمپی بھی رونے لگا تھا۔ ہم دونوں توشی کے گھر گئے تو ڈمپی روتا ہوا توشی کا دامن کھینچ کر اسے چلنے کو کہہ رہا تھا۔ ہم بڑی مشکل سے توشی کو اپنی ٹیکسی پر لائے۔ ہم نے روتے چیختے ڈمپی کو زبردستی ٹیکسی میں بٹھایا۔ وہ آنٹی آنٹی چلا رہا تھا۔ مگر آنٹی کی آنکھوں میں آنسوؤں کے اتنے بڑے بادل جھوم آئے تھے کہ اس کی آنکھوں کے سورج بھی اوجھل ہوگئے تھے اور وہ اپنے ڈمپی کو دیکھ بھی نہیں سکتی تھی۔

جب تک ہم اسٹیشن پر نہیں پہنچے ڈمپی روتا رہا اور توشی کو پکارتا رہا۔ ریل میں بیٹھتے ہی جیسے اس کے ننھے سے دل کو بھی توشی کی مجبوری کا پتہ لگ گیا تھا۔ وہ میرے گھٹنوں پر سوگیا۔ اس کے گرم گال سوجے ہوئے تھے اور اس کی اداس سرخی کو آنسوؤں کی کتنی ہی میلی لکیریں کاٹ رہی تھیں۔ میں نے اس کے گال پر ہاتھ رکھ کر اسے سینے سے چمٹا لیا۔ مگر اچانک میرا دل تڑپ اٹھا۔ کیونکہ ڈمپی کے غم کو تو تھوڑی دیر کے لئے نیند نے ڈس لیا تھا۔ مگر ریل کے ڈبے کی کھڑکی کی ان سخت اور ٹھنڈی سلاخوں کے پرے۔ اسی ٹھنڈی اور سخت دنیا میں۔ ایک پرائی لڑکی کسی کونے میں بیٹھی اب تک رو رہی ہوگی!

اہم سرکاری مطبوعات

۱۔	دستاویزات کانسٹی ٹیوشن .. .. جلد اول	۲۰ روپے	۳۷	پیسے
۲۔	" " " .... جلد دوئم	۱۸ روپے	۸۷	پیسے
۳۔	" " " .. .. .. جلد سوئم	۱۳ روپے	۳۷	پیسے
۴۔	" " " .. .. .. جلد چہارم	۸ روپے	۱۲	پیسے
۵۔	مینول درآمد و برآمد کنٹرول	۵ روپے		
۶۔	پاکستان بجٹ .. .. ۱۹۶۳ .. .. ۱۹۶۴	۴ روپے	۱۲	پیسے
۷۔	پاکستان میں بجلی کی فراہمی کے اعداد و شمار ۱۹۵۸	۳۳ روپے	۲۵	پیسے
۸۔	جائزہ تجارت بیرونی (درآمد) جلد دوئم جولائی۔دسمبر ۱۹۶۰ ــ ۱۹۶۱ ــــــ	۶۲ روپے		

ان جگہوں سے حاصل کیجئے

۱۔ منیجر آف پبلیکیشنز، حکومت پاکستان، بلاک نمبر ۴۴۔ شاہراہ عراق کراچی
۲۔ مغربی پاکستان کے تمام مقررہ ایجنٹ

عثمان عرفانی
فنون۔ لاہور

آفریدگار

آخر دسمبر کی ایک ٹھٹھرتی ہوئی رات جبکہ تمام جاندار اپنے اپنے ٹھکانوں پر آرام کر رہے تھے۔ سمندر کی تہ میں جیہوا کے ہیکل کے کاہنوں کی پنچایت منعقد تھی۔ کاہن معبد کے باہر نیم دائرے کی شکل میں بیٹھے تھے۔ اور ان کے چہرے مغموم تھے۔ پنچایت کا سرپنچ ہیکل کا کاہن اعظم منا ترس ایک بوڑھا او دبلا تھا۔ جو بار بار اپنے پنجوں کو اپنی لمبی لمبی مونچھوں پر پھیرتا تھا۔ جس سے اس کی بے چینی کا پتہ چلتا تھا۔ مقدمہ بڑا ہی اہم تھا۔ ہیکل کی ایک راہبہ سیپ جس کا نام مترہ تھا، ملزمہ تھی۔ مترہ ایک طرف معبد کی دوسری پجارنوں کے حلقے میں خاموش و مطمئن بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پر نور تھا اور لبوں پر مسکراہٹ۔

تھوڑی دیر کے بعد کاہن اعظم کے اشارے پر پنچایت کی کارروائی شروع ہوئی۔ اور کیکڑے کاہن نے اٹھ کر کہنا شروع کیا۔ "خداوند جیہوا کے ہیکل میں داخل ہونے سے پیشتر ہر راہبہ پاک اور کنواری رہنے کا عہد کرتی ہے۔ لیکن آج ہمارے سامنے ایک ایسا مقدمہ ہے جس سے ہمارے سر ندامت سے جھکے ہوئے ہیں اور دل خداوند جیہوا کے غضب سے لرزاں۔ ایک راہبہ نے بدعہدی کی ہے اور خداوند جیہوا کے ہیکل کے تقدس کو پامال کرنے کی جرأت کی ہے پس اے معزز و بزرگ۔ سنو! اب آپ کا فرض ہے کہ مجرم کو سزا دیں۔ تاکہ ہم سب خداوند جیہوا کے غضب کا شکار ہونے سے بچ سکیں۔"

جیسے ہی کیکڑا اپنی تقریر ختم کر کے بیٹھا، ایک گھونگے کاہن نے اٹھ کر سوال کر دیا۔ "دوسری سیپیوں کے بارے میں پنچایت کا خیال ہے؟"

لیکن کاہن اعظم نے اسے ڈانٹ دیا۔ "دوسری سیپیوں سے ہمیں کیا سروکار، ہمیں تو صرف ایک راہبہ اور ہیکل کے تقدس کے معاملے پر غور کرنا ہے۔"

اور گھونگے سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔ وہ خاموش ہو گیا۔

پھر ایک اور کاہن نے مشورہ دیا۔ "القینہ اس معاملے میں کیا کہتی ہے، میرے خیال میں اس سے بھی پوچھ لینا چاہئے۔"

اور کاہن اعظم نے اس کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے القینہ کو سر کے اشارے سے بیان دینے کے لئے کہا۔

القینہ ایک اور سیپ تھی۔ اور پجارنوں کی سردار۔ کاہن اعظم کا اشارہ پا کر وہ اپنی جگہ پر مودب کھڑی ہو گئی۔ اور بڑے ہی مغموم لہجے میں بولی۔ "معزز و مقدس کاہنو! یہ واقعی معاملہ ہے۔"

پنچایت پر سکوت طاری ہو گیا۔ اور پھر تھوڑی دیر بعد آپس میں سرگوشیاں ہوئیں۔ اور اب کاہن اعظم نے کچھوے کاہن کو اشارہ کیا کچھوے نے اپنی ٹانگیں اکڑا کر اور اپنی گردن کھوپڑی سے باہر نکال کر، مرّہ سے سوال کیا۔ "تم مرّہ مقدس ہیکل کی راہبہ تھیں۔ تم نے اپنے خلاف الزام سن لیا۔ اب اگر تم اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتی ہو۔ تو کہو۔ تاکہ انصاف کیا جا سکے"

اور مرّہ نے اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے بڑے ہی اطمینان سے جواب دیا۔ "میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ میں بالکل پاک ہوں۔ یہ جون کے شروع کی بات ہے میں سمندر کی سطح پر گئی تھی۔ خداوند مسطرا نے مجھ پر اپنا پرتو ڈالا۔ اور اب میں اس کی امین ہوں۔ اور اس وقت کی منتظر ہوں جب صادق اقبال مند ہوں گے"

مرّہ یہ کہہ کر خاموش ہو گئی۔ تمام کاہن پھٹی پھٹی نگاہوں سے مرّہ کو گھورنے لگے۔ ایک مرتبہ پھر سرگوشیاں ہونے لگیں۔ اور آخر کاہن اعظم نے فیصلہ سنا دیا۔ "خداوند جیہوا کے ہیکل کی بے حرمتی اور بدعہدی کی پاداش میں ہمیں، مرّہ کو، جو کہ ہیکل کی راہبہ تھیں۔ جلاوطنی کی سزا دی جاتی ہے"

مرّہ نے فیصلہ انتہائی سکون سے سنا۔ اس کی جبیں پر ایک شکن تک نہ آئی۔ پنچایت رخصت ہو گئی۔ لیکن مرّہ اپنی جگہ پر بیٹھی رہی۔ اور پھر یکایک سمندر میں تلاطم برپا ہو گیا۔ کاہن اور پجارنیں پریشان ہو گئے۔ "شاید انہوں نے فیصلے میں تاخیر کی۔ شاید خداوند جیہوا ناراض ہو گئے"

اور وہ سب کے سب معبد میں سربسجود ہو گئے۔ سمندر نے مرّہ کو اٹھا کر ساحل پر پھینک دیا۔ اور پھر خاموش ہو گیا۔ مرّہ ریت پر پڑی سسکتی رہی اور دیر تک درد و کرب میں مبتلا رہی۔ اور پھر جب آسمان پر ایک ستارہ انتہائی روشن ہو کر غروب ہو گیا، تب صبح ہو گئی۔

کو کلا بستی کے مچھیرے جب اپنے جال لئے سمندر پر آئے تو اُن میں سے ایک بوڑھا جس کا اکلوتا بیٹا سخت بیمار تھا۔ غمگین و متفکر آہستہ آہستہ سب سے پیچھے آرہا ہے۔ وہ ایک چمک، ایک کرن دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔

اُس نے جھک کر دیکھا تو ایک سیپ اپنی گود میں ایک آبدار موتی لئے پڑی تھی۔ اور دوسرے لمحے بوڑھے نے موتی سیپ کی گود سے نوچ لیا اور اُلٹے پاؤں بستی کی طرف اس تیزی سے بھاگ کھڑا ہوا۔ جیسے اُس پر پھر سے جوانی آ گئی ہو۔

بستی میں پہنچ کر اُس نے موتی بستی کے سب سے بڑے دانا کی گود میں ڈال دیا۔ اور ہانپتے ہوئے، سوالیہ نظروں سے اُس کی طرف دیکھنے لگا بستی کا دانا اُسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اور اس نے بوڑھے سے پوچھا۔ "تم نے اسے کہاں سے پایا؟"

اور بوڑھے نے جواب دیا۔ "مسرتوں کے دروازے پر"

بستی کے دانا نے، موتی کی آب کو غور سے دیکھا۔ پھر یکایک اُس کی نگاہوں میں چمک آ گئی۔ اور وہ خلا میں گھورتے ہوئے کچھ سوچ کر اپنے اردگرد بیٹھے ہوئے چرواہوں اور مچھیروں کی طرف دیکھ کر بولا۔ "مبارک ہو۔ اب تمہارے بیمار شفا پائیں گے۔ یہ تو سچا موتی ہے"

بوڑھے کی آنکھوں میں خوشی ناچ اٹھی۔ مچھیرے اور چرواہے آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ دانا موتی کی آب دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ کہ بادشاہ کا پیادہ، جو گشت پر تھا۔ شور سن کر ادھر آیا۔ اُس نے جھانک کر دیکھا۔ دانا کی گود میں نایاب موتی دیکھ کر سوچ میں پڑ گیا۔ پھر جیسے اُسے کچھ یاد آ گیا ہو۔ اس نے لپک کر دانا کی گود سے موتی چھین لیا۔ "کمبختو یہ تو تاجداروں کو زینت بخشنے والا ہے، تم بھکاریوں نے اسے کہاں چھپا رکھا تھا؟"

اور وہ بادشاہ کے دربار کی طرف بھاگ گیا۔ بستی کے دانا کے احتجاج کو نظر انداز کرتے ہوئے۔ بوڑھے کی التجاؤں کو ٹھکراتے ہوئے

سچا موتی بادشاہ کے سامنے دھرا تھا۔ اور پیادہ ہاتھ باندھے مودب کھڑا تھا۔ بادشاہ نے سچے موتی کی آب دیکھی تو سنبھل کر بیٹھ گیا اور حکم دیا۔ "اسقف کو بلاؤ"

اور اسقف نے آکر موتی کو پرکھا۔ کتابوں کی ورق گردانی کی، زائیچے کھینچے اور پھر خوشی سے چیخ اٹھا۔ "خداوند! مبارک ہو۔ سعد ہے"

بادشاہ نے پیادے کو انعام دیا۔ اور جوہری کو بلانے کا حکم دیا۔

اور پھر جوہری نے آکر سچے موتی کے سینے کو چھید کر اُسے بادشاہ کے تاج پر سجا دیا۔

تمام درباریوں کی گردنیں جھک گئیں۔

کون جانے، بادشاہ کی سطوت و جبروت کے سامنے یا مصلوب سچے موتی کے سامنے!

جدید شاعری کا

عہد آفریں شاعر

اخترالایمان

کا

نیا شعری مجموعہ

بنتِ لمحات

(زیرِ طبع)

۲۷۔ ریلو روڈ۔ باندرہ۔ بمبئی ۵ (بھارت)

مقبول حسین

سریتا۔ نئی دلی

ناک کٹ گئی

بات صرف ایک آدمی یا ایک خاندان کی نہیں تھی، جو انہیں تک محدود ہو کر رہ جاتی، بلکہ یہ عظیم پور کی پوری آبادی کی عزت آبرو کا سوال تھا۔ عظیم پور یوپی اور بہار کی سرحد پر تقریباً پانچ چھ ہزار آدمی پر مشتمل ایک چھوٹا سا پرانا قصبہ ہے جہاں کے قریب قریب ۸۰ فی صدی لوگ ایک ایسی برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔ جن کا خیال ہے کہ آج سے تقریباً دو سو برس پہلے اُن کے باپ دادا ایک دور دراز ملک سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے تھے۔ اور یہاں بس کر انہوں نے مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔

ان کا خاص پیشہ تجارت ہے اور اس میں وہ اس قدر ابھرے۔ کہ جلد ہی اس کو فروغ دے کر ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیل گئے اور یہاں سے بھی آگے نکل کر نیپال راج میں انہوں نے [illegible] اثر قائم کر لیا ان کی اپنی الگ تہذیب تھی، اپنے الگ رسم و رواج تھے جن کا سختی سے پابند رہنا وہ اپنا اہم فریضہ سمجھتے تھے۔

مگر ایک وقت ایسا بھی آ گیا جب بہت سے سرپھرے نوجوانوں نے ہندوستان کے اندر [illegible] طبقوں میں شادیاں کر لیں اور بہت سے سرکش لڑکوں نے پہاڑی دوشیزاؤں کو لا کر اپنے بزرگوں کے غم و غصہ اور چیخ پکار کے باوجود گھروں میں بٹھا دیا۔ اور اس طرح آنے والی نسلوں کے لئے بھی ایک نیا راستہ کھول دیا۔ حالاں کہ برادری کے کٹر لوگ آج بھی نہیں چاہتے کہ ان کے لڑکوں کی شادی کسی غیر برادری میں ہو۔ مگر وقت آنے پر انہیں اپنی باقاعدہ کی ضد کے آگے جھکنا پڑتا ہے۔ ہاں، ایک رواج البتہ اب تک سختی سے قائم ہے کہ ان کے یہاں کی لڑکیاں نہ تو باہر نکل پاتی ہیں اور نہ کسی غیر برادری کے شریف اور ہونہار لڑکے سے شادی کرنے کا خواب دیکھ سکتی ہیں۔ اگر اتفاق سے کوئی پاگل لڑکی بغاوت پر آمادہ ہو بھی جاتی ہے تو اُس کے ساتھ ساتھ، اس کے گھر والوں کو بھی کچل دیا جاتا ہے تاکہ آئندہ کوئی ایسا قدم اٹھانے کی جرأت نہ کر سکے۔

اور یہی وجہ تھی کہ جب برادری کے لوگوں نے سنا کہ انور نے اپنی بہن کو نرس بنا کر لکھنؤ بھیج دیا ہے تو قصبے میں ایک بھونچال آ گیا اور جو جہاں تھا وہیں اپنے غم و غصّہ کا اظہار کرنے لگا۔ بزرگوں کی پیشانی پر تو سینکڑوں بل پڑ گئے۔ اور وہ کھانستے ہوئے بڑبڑا اُٹھے۔

"ہوں آخر وہ نرس ہو ہی گئی۔ وہ تو جس وقت اس نے باہر جا کر انگریزی پڑھنا شروع کیا تھا۔ ہم اسی وقت سمجھ گئے تھے کہ ایک نہ ایک دن وہ ہم لوگوں کی ناک کاٹ لے گی۔"

اور جس وقت اس کی بھنک گھر کے اندر بیٹھی ہوئی عورتوں کے کان میں پڑی تو ان کی انگلیاں ناک پر پہنچ گئیں۔ اور منہ حیرت سے کھل گئے انہوں

غمزا نور کو کوسنا شروع کیا۔ اُس کے دیدے کا پانی مر گیا۔ اے اللہ! جوان بہن کو اسپتال میں نرس بنا دیا۔ توبہ توبہ ایسا بھی کوئی بھائی ہوتا ہے۔

اور پھر اس کانا پھوسی کا سلسلہ اتنا بڑھا کہ دو دن کے اندر ہی ایک وبائی مرض کی طرح قصبے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل گیا اور انور کا اٹھایا ہوا یا قیاساً عدم پیروی برادری کے لئے اب صرف درد سر کا باعث اور مستقل بحث کا موضوع ہی نہیں بن کر رہ گیا تھا۔ بلکہ عظیم پور کی پوری آبادی نے کندھے سے کندھا ملا کر اپنے نسلی امتیاز اور خاندانی وقار کے بت کو گرنے سے بچانے کے لئے اس کے خلاف ایک سخت محاذ قائم کرنا شروع کر دیا تھا۔ محاذ اتنا سخت نہ ہوتا۔ اگر انور گورکھپور کی کچہری میں ملازم ہونے کی بجائے برادری کے بڑے آدمیوں کی طرح مردار چمڑے، ہڈی یا شراب کا ٹھیکیدار ہوتا۔ مگر چونکہ ملازمت ایک چھوٹا کام ہے۔ اور ایک چھوٹے آدمی نے ایسی حرکت کر دی تھی۔ اس لئے اس کی سزا ملنی ضروری تھی۔ اور لوگوں نے اس کی سزا تجویز بھی کر لی تھی۔ یا تو اس کو اپنی بہن کو گھر بلانا ہوگا۔ یا زندگی کے ہر اہم اور غیر اہم معاملات میں برادری سے مستقل طور پر قطع تعلق کر لینا ہوگا لوگوں نے یہ فیصلہ تو کر لیا۔ مگر اس سے ملاقات نہ ہو سکی۔ اس لئے کہ وہ تو وہاں سے ستر میل دور گورکھپور کی کچہری میں فائلوں کی ورق گردانی کر رہا تھا اور اس کی بہن عذرا لکھنؤ میں کراہتے ہوئے مریضوں کے حلق میں پانی ٹپکا رہی ہے۔

لوگوں نے بہت دنوں تک اس کا انتظار کیا کہ جب کبھی وہ عظیم پور آئے۔ تو اس سے دو ٹوک بات ہو جائے۔ مگر شاید اُسے بھی اس بات کی خبر ہو گئی تھی۔ گھر آنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ اور گھر آتا بھی کیا۔ ماں باپ تھے نہیں۔ بہن کو لکھنؤ میں نوکری مل گئی تھی۔ اور اس کے اپنے بچے گورکھپور ہی میں رہتے تھے نتیجہ یہ ہوا کہ دھیرے دھیرے طوفان کا زور کم ہونے لگا۔ اور لوگ اس واقعے کو بھولنے لگے۔ اگر اتفاق سے کبھی کبھار تذکرہ چھڑتا بھی تو تھوڑی دیر کے لئے نہ تو اس میں وہ پہلے جیسی تندی تھی اور نہ لوگوں کے اندر وہ پہلے جیسی بے چینی اور جوش و خروش ہی رہتا۔ لوگ لاشعوری طور پر اسے اب برادری سے بالکل خارج کر چکے تھے۔

مگر ٹھیک چار مہینے کے بعد جب ایک دن انور گھر کی مرمت کے سلسلے میں عظیم پور پہنچا اور اتفاق سے عذرا بھی دو ہفتے کی چھٹی لے کر آ گئی تو ایک بار پھر دبی ہوئی چنگاری بھڑک اٹھی۔ ذرا اونگھتے ہوئے لوگوں نے پھر آنکھیں کھول دیں اور فرسودہ موضوع ایک بار پھر زور شور کے ساتھ زیر بحث آ گیا۔ اس دفعہ تو نئے نئے الزامات بھی لگائے جانے لگے اور نئی نئی پھبتیاں بھی کسی جانے لگیں۔ مگر انور پر اس کا کچھ بھی اثر نہیں ہوا۔ وہ تو اُن لوگوں کے سامنے بالکل بہرا اور گونگا بن چکا تھا۔

قصبے کے لوگوں نے کئی دفعہ اُسے اشارے اور کنائے سے سمجھانا چاہا، مگر جب وہ بالکل چکنا گھڑا ہی نکلا۔ تو پھر ایک دن شام کے وقت پندرہ بیس آدمیوں کا ایک وفد اُس کے مکان کی طرف چل پڑا۔ اس وفد میں ہر طرح کے لوگ موجود تھے۔ جوان بھی بوڑھے بھی، پڑھے لکھے بھی، اور ان پڑھ بھی اور ہر آدمی اپنے اپنے لہجے میں بڑبڑاتا ہوا اس کے مکان کی طرف بڑھ رہا تھا۔

جب انور کو ان کی آمد کی خبر ہوئی۔ تو وہ کچھ چونکا۔ مگر جلدی جلدی عذرا کو حقہ پانی کا انتظام کرنے اور اسے اندر رہنے کی تاکید کر کے باہر نکلا اور دروازے پر پہنچ کر نہایت خلوص اور خندہ پیشانی سے ان کا استقبال کیا۔ اور زنان خانے سے ملے ہوئے بڑے کمرے میں لا کر انہیں بٹھایا حقہ، پان اور بیڑی کا دور چلنے لگا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ مگر نہ تو انور نے ہی ان سے یہاں اس طرح یکایک آنے کا مقصد پوچھا اور نہ انہوں نے ہی یہاں اس طرح اچانک پہنچ جانے کی وجہ بتائی۔

سورج ڈوب گیا اور چراغ جل اُٹھے۔ مگر اصل گفتگو اب تک شروع نہ ہوئی، حالانکہ بزرگوں نے کئی بار کھنکار کر گلا صاف کیا۔ کئی بار آپس میں آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے کئے۔ مگر خاموشی بدستور طاری ہی رہی۔ آخر انور نے ہی اکتا کر بات چیت کا آغاز کیا۔

کہئے [illegible] آج اتنے لوگ اکٹھا ہوئے ہیں؟

یہ سوال سن کر تمام لوگ اپنی اپنی جگہ سنبھل کر بیٹھ گئے۔ مجمع میں کانا پھوسی شروع ہو گئی۔ اور پھر اطمینان سے جمن میاں نے جو اسی بستی کے ایک سن رسیدہ بزرگ اور انور کے بہت ہی قریبی رشتہ داروں میں سے تھے۔ اگالدان میں پان تھوکتے ہوئے جواب دیا۔

"ہاں، خاص ہی بات ہے، پوری برادری کی عزت آبرو کا سوال ہے"

انور جمن میاں کے پینترے کو تاڑ گیا۔ اُس نے اطمینان سے پہلے مجمع کی طرف دیکھا پھر جمن میاں کے چہرے پر ابھرتی ہوئی تشویش کی لکیروں کی طرف دیکھا اور انجان بنتے ہوئے بول اٹھا۔

"کیا بات ہے دادا؟"

"تم نے اپنی بہن کو لکھنؤ بھیجا ہے؟" انہوں نے سوال کیا۔

"ہاں بھیجا تو ہے!"

"تم نے اُسے نرس بنایا ہے؟"

"ہاں بنایا تو ہے!"

"تم نے کس سے رائے لی تھی؟"

"جی نہیں، رائے تو نہیں لی تھی!"

"رائے نہیں لی تھی" جمن میاں یک بیک بگڑ گئے "اب تو، ایک تو ہی رہ گیا تھا اس قسم کی حرکت کرنے کے لئے، انور کان کھول کر سن لو۔ اگر تم نے اسے لکھنؤ سے واپس نہیں بلایا۔ تو ہم سے برا کوئی نہ ہوگا۔ آخر ہماری بھی لڑکیاں ہیں، دیکھتے ہو۔ کیسے رہتی ہیں؟"

اتنا کہہ کر وہ کچھ نرم پڑ گئے۔ اور پھر ایک بار انہوں نے اپنے گرد کا جائزہ لیا۔ اور اس کے بعد کچھ ایسی نظروں سے انور کی طرف دیکھنے لگے۔ گویا ابھی وہ اقرار میں سر ہلا کر "ہاں" کہہ دے گا۔ مگر نہ تو اس نے سر ہی ہلایا اور نہ ہاں ہی کہا۔ خلاف توقع وہ ان سے سوال کر بیٹھا۔

"تو دادا عذرا کو زندگی بھر گھر ہی میں رکھوں؟"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ دادا کہ لڑکی اپنے گھر کی ہوتی ہے، اب بھائی کے گھر کی نہیں وہ اکیس سال کی ہو رہی ہے"

"میں سمجھا نہیں"

"میں اس کی شادی کی طرف اشارہ کر رہا تھا"

"ہوں، اُس کی شادی بھی ہو جائے گی بھئی!"

"مگر کب اور کس سے؟ ہے کوئی آپ کی برادری میں لڑکا اس کے لائق"

"ہے کیوں نہیں، اس کی شادی میں اپنے پوتے سے کر دوں گا"

"ارے" انور یک بیک چونک گیا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ اُبھری۔ پھر وہ لاکھ ضبط کے باوجود کھل کھلا کر ہنس پڑا۔

"دادا، کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ محمود کی شادی آپ عذرا سے کریں گے، اُسی عذرا سے جس کا بھائی کسی دن آپ کے دروازے سے اس لئے لوٹ آیا تھا۔ کہ آپ کی فرمائش کی فہرست بہت لمبی تھی۔ اور اس کی جیب بہت ہلکی تھی۔ آپ کی باتیں بہت تلخ تھیں۔ اور وہ بہت حساس تھا۔ کسی اور کا نام لیجئے دادا، اس لئے کہ عذرا کو بھی نہ جانے کیسے معلوم ہو گیا ہے۔ کہ آپ کا پوتا دست شرابی ہے اور ایک ایک نشست میں پانچ پانچ

سو روپے جوئے میں ہار جاتا ہے۔ بولئے ہے کوئی دوسرا لڑکا آپ کی نظر میں ؟"

مگر دادا کیا بولتے۔ انہیں تو ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے انہیں کسی نے بیچ بازار میں ننگا کر دیا ہو۔

"بولئے دادا، انور کی آواز پھر اُبھری۔" جب آپ نے چھیڑ ہی دیا ہے تو یہ مسئلہ پھر حل ہو جائے"

مگر خاموشی طاری رہی اور پورا مجمع کبھی انور کو دیکھ رہا تھا، کبھی جمن میاں کو، اور اس مجمع میں حاجی محمد رزاق، شیخ نور محمد، بقربدن اور جھگیلو میاں جیسی معزز ہستیاں بھی تھیں۔

"کیوں جھگیلو میاں آپ کا وہ چیک ابھی تک بھنا کہ نہیں جس کی قیمت آپ نے مڈل کے بعد ہی آٹھ ہزار لگا رکھی تھی۔ اور نور سے چاچا! آپ نے بھی تو میری درخواست کو حقارت سے ٹھکرا دیا تھا۔ کہئے اب تو آپ کی اپنی لگائی ہوئی رقم کا منافع مل گیا نا۔ لڑکا تو ملک اور قوم کے تحفظ کے لئے فوج میں بھرتی ہو گیا۔ مگر آپ لوگوں کی کمر ہی ٹوٹ گئی۔ چاچا، گھبرائیے نہیں، ابھی تو بھاؤ اور بڑھے گا۔ ہو سکتا ہے۔ ایکے لوٹنے کے بعد اپنوں میں بہت سے ہوائی جہاز تک دینے والے نکل آئیں۔ بس تھوڑا سا انتظار اور کریجئے۔ ہم لوگوں کے متعلق تو آپ لوگ ناحق پریشان ہیں۔ اول تو میرے پاس اتنی دولت نہیں ہے۔ کہ آپ لوگوں کی ہر جائز اور ناجائز مانگ پوری کر سکوں اور دوسری بات یہ ہے کہ میں برادری کے رسم و رواج سے مجبور ہو کر ایک جاہل لڑکے کی خریداری پر پیسہ خرچ کرنے سے بہتر لڑکیوں کی صحیح تعلیم و تربیت پر خرچ کرنے کو سمجھتا ہوں۔ اب آپ لوگ جائیے، وہ خود اپنی شادی جہاں بہتر سمجھے گی کرے گی۔"

"کیا؟" یہ یک وقت کئی آوازیں ابھریں۔ مگر انور نے کسی کی طرف دھیان نہیں دیا۔ جمن میاں کے پاس دھیرے سے سرک آیا۔ اور نہایت ہی رازدارانہ انداز میں بولا۔

"دادا! سُنا ہے، عبدل باورچی کا لڑکا منشی دل محمد کی بیوی کو لے کر آج پندرہ دن سے کہیں بھاگ گیا ہے۔"

"چپ بے۔" یک بیک جمن دادا غصے میں چلا اُٹھے۔ اور پھر دوسروں سے مخاطب ہوتے ہوئے بولے۔" اٹھو بھائیو اُٹھو، ہم لوگ اس سے مصالحت کی بات کرنے آئے تھے۔ مگر یہ اپنے دروازے پر بھی کیچڑ ہی اُچھال رہا ہے۔"

لوگوں نے غیظ و غضب اور نفرت سے ایک بار پھر انور کی طرف دیکھا۔ وہ نہایت اطمینان سے طشت سے پان اٹھا کر منہ میں رکھ رہا تھا

"چلو بھائیو! چلو یہاں سے۔" دادا نے اپنی کمر پہ ہاتھ رکھ کر اُٹھتے ہوئے کہا۔" ناک تو آخر کٹ ہی گئی۔"

تمام لوگ ایک جھٹکے سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ مگر ابھی وہ لوگ باہر نکلنے بھی نہ پائے تھے کہ ایک دوسرا جھٹکا لگا۔ بیٹھک میں کھلنے والے زنانخانے کا دروازہ کھولے عذرا کھڑی تھی۔

اُٹھے ہوئے قدم وہیں رک گئے۔

نوجوانوں نے چونک کر اُس کی جرأت اور حوصلہ کو دیکھا۔ اُس کے حسن اور شباب کو دیکھا اور دیکھتے رہ گئے۔ بوڑھوں نے بھی یہ سب کچھ دیکھا مگر اس کی بے حیائی اور بے باکی پر نفرت اور چڑچڑاہٹ سے ہونٹ سکوڑ کر نظروں کو دوسری طرف پھیر لیا۔

" دادا" عذرا نے جمن میاں کو مخاطب کیا۔ اگر پورے ملک اور قوم کی عزت بچانے کے لئے آپ جیسے لوگوں کی تھوڑی سی ناک کٹ لی جائے تو......

عذرا نے ابھی یہ جملہ پورا بھی نہ کیا تھا۔ کہ سب کے سب ایک شعلے کی مانند بھڑک اُٹھے۔ اور پاؤں پٹکتے ہوئے باہر نکل گئے۔ اور پیچھے سے بھائی اور بہن کا ملا جلا ایک زوردار قہقہہ گونج اٹھا.....

قیصر تمکین
الشجاع۔ کراچی

ردِّ عمل

دیپک بابو کا کمرہ کیا ایک اچھا خاصا عجائب گھر تھا۔ ہر طرف کتابوں اور رسالوں کے ڈھیر تھے۔ میز کے خانوں میں ہر موضوع اور ہر مسئلے پر پرانے اخباروں کے تراشے بھرے پڑے تھے ایک طرف وائلن ٹنگا ہوا تھا۔ دوسری طرف انگریزی، ہندی اور اردو شاعروں کے دیوان اور انتخاب رکھے تھے وسط میں آرام کرسی تھی جس کے بازو کے میز پر ایک ٹائپ رائٹر کے ساتھ ہی قلموں اور پنسلوں کے ڈھیر کے ڈھیر گلاسوں میں رکھے تھے۔ ایک اور سمت دیوار کے اندر نصب الماری میں کلاسیکی ادب کے ترجمے اور نمائندہ انتخاب تھے۔ دیواروں پر ٹیگور، شیکسپیر اور ٹالسٹائی کے فوٹوں کے ساتھ ہی مختلف نمائندہ آرٹ اسکولوں اور آرٹسٹوں کے فن پارے بھی آویزاں تھے۔ ایک اور طرف ریڈیوگرام تھا جس کے ساتھ ہی سترھویں اٹھارہویں اور انیسویں صدی کی موسیقی کے ٹیپ ریکارڈ بھی رکھے تھے اس کے علاوہ جگہ جگہ سنگتراشی کے نمونے بھی رکھے تھے۔

جب کوئی ملنے والا آتا تو دیپک بابو اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے مٹی چینی کے پیالوں میں کافی تیار کرتے اور اس مدت میں ادب و فنون کے مسائل کا ذکر کرتے رہتے۔ پرانی تصاویر کے اچھے مرقع اس وقت یورپ کی کن گیلریوں میں موجود ہیں۔ فلاں ادب یا علم کی کتاب کا فلاں نسخہ اس وقت دنیا کی کس لائبریری میں ہے۔ یا فلاں دور کے موسیقار نے کن دھنوں سے کونسی موسیقی تیار کی تھی وغیرہ وغیرہ۔

ان تمام امور میں بہت ہی ڈوب کر اور انہماک کے ساتھ بحث کرتے وقت دیپک بابو کچھ اس طرح کے انسان لگتے جس کے خمیر میں دنیا کی ساری تہذیبوں کے عناصر شامل ہوں اور شاید جس کی مٹی سات سمندروں کے پانی سے گوندھی گئی ہے۔

انہوں نے شادی نہیں کی تھی بلکہ عمر کے بیشتر قیمتی سال یورپ اور امریکہ کے تہذیبی خزانوں سے کسب فیض میں گزارے تھے۔ آج کل وہ ملک و بیرون ملک کے ممتاز اور معیاری اخبارات اور جرائد کے لئے مضامین و تبصرے لکھا کرتے تھے۔ اور ان کی آمدنی ان کی ضروریات سے بہت زیادہ تھی۔ ہاں ان کے دوستوں کا حلقہ بہت ہی وسیع تھا۔ جس میں ہر ملک اور ہر زبان کے ادیب آرٹسٹ اور موسیقار شامل تھے۔

ایک دفعہ دیپک بابو اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے کچھ جرمن ریکارڈ بجا رہے تھے۔ جھٹپٹے کا وقت تھا اور چاروں طرف جاڑوں کی ٹھنڈی اور بے کیف شام پھیلتی جا رہی تھی۔ ایسے میں ان کی نظر ایک دو چیونٹیوں پر پڑی جو شکر کے ایک دانے کو حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کر رہی تھیں۔ یہ دانہ کاغذ کے ایک ٹکڑے پر تھا اور یہ کاغذ ایک گلاس کے اوپر ڈھکا ہوا تھا۔ گلاس کے چاروں طرف چلنے کے بعد چیونٹیاں پھر گر پڑتیں۔ مگر چھت کی طرح چھائے ہوئے کاغذ تک پہنچنا ان کے لئے مشکل تھا۔

دیپک بابو نے ٹیپ ریکارڈ بند کیا۔ انہوں نے میز پر تھوڑی سی شکر ڈالی دی۔ اور پھر ایک پنسل کی نوک سے دونوں چیونٹیوں کو گلاس پر سے

دھکیل کر شکر کے پاس گرا دیا، دونوں چیونٹیوں نے اپنی ہمالیائی مہم ترک کر دی اور شکر کی طرف متوجہ ہوگئیں۔ تھوڑی ہی دیر میں وہاں بہت سی چیونٹیاں جمع ہوگئیں۔ دیپک بابو مسکرائے اور پھر ان کو ایک نظم کا آخری حصہ یاد آگیا۔ جس میں شاعر نے ایک مچھر کا مقبرہ تعمیر کرایا تھا اور اس کی لوحِ مزار پر کچھ اس طرح کی عبارت کندہ کرائی تھی۔

"ہر زندگی اپنی جگہ پر قیمتی ہے۔ موت مچھر کی ہو یا ہاتھی کی۔ بزمِ کائنات کا ایک روشن چراغ گل کر دیتی ہے۔"

پھر ان کو فرانکوئی دیلان کی نظم "لوحِ مزار" یاد آئی۔ مگر اپنی شدت کے اعتبار سے ایک مچھر کی موت پر لکھا جانے والا مرثیہ دیلان کے "بیلے دی پینڈو" سے زیادہ اثر انگیز معلوم ہوا۔"

"کاش ہم سب زندگی کی قدر کرنا سیکھیں۔" انہوں نے یہ سوچتے ہوئے اپنے وسیع کمرے پر نظر ڈالی جس میں ایک مدھم سا لیمپ روشن تھا اور چاروں طرف تہذیبِ انسانی کے نمونوں کی آڑ میں ارتقائے تمدن کی صدیاں کچھ کہتی کچھ سوچتی معلوم ہو رہی تھیں۔

رات کو وہ ہوٹل سے کھانا کھا کر دیر میں لوٹے پھر انہوں نے سگار جلایا اور آرام کرسی پر لیٹ کر کچھ سوچنے لگے۔ ان کا ارادہ تھا ہلکی سی نیند لے کر دو تین بجے اٹھیں اور ایک مضمون ٹائپ کریں۔ ان کو رات کے سناٹے میں ٹائپ رائٹر کی آواز بہت بھلی معلوم ہوتی تھی اس لئے وہ ہمیشہ اپنے مضامین آخر شب میں ٹائپ کرتے تھے۔

انہوں نے کاہلی سے آرام کرسی پر لیٹے ہی لیٹے ہاتھ بڑھایا۔ ایک کتاب اٹھائی اور بغیر اس کا نام دیکھے یوں ہی پڑھنے لگے۔ ملکی فلسفی یورپ کے مفکروں سے زیادہ دقیق النظر اور گمبھیر ہیں۔ انہوں نے عالم کی جو تعبیر کی تھی وہ خارجی حقائق اور عقل پر نہیں بلکہ واردات باطنی اور وجدان کشف پر مبنی تھی۔ ان کا کہنا ہے کہ عقل ہر چیز کو پارہ پارہ کر دیتی ہے۔ وجدان وحدت کا ضامن ہے "میں فریب ہے، مایا ہے۔ فرد چھلیا ہے۔ مظہر ہے عالم میں صرف برہما یا پرمیشور کا وجود ہے۔ بصیرت کا نقطۂ عروج نروان ہے۔۔۔ وہ پڑھتے پڑھتے سو گئے۔ ایک عجیب کیفیت و طمانیت کے احساس سے۔۔۔

ٹائم پیس نے ڈھائی بجے زور زور سے الارم بجانا شروع کر دیا۔ دیپک بابو گھبرا کر اٹھے۔ پورے کمرے میں گرمی اور دھوئیں کی گھٹن تھی۔ کتابوں کی الماری میں سے ہلکی ہلکی آنچ نکل رہی تھی اور گہرا دھواں اٹھ رہا تھا۔ "آگ" ان کا دماغ ایک دم پوری طرح بیدار ہو گیا۔ وہ پانی کے لئے دوڑے مگر دھوئیں کی گھٹن میں آگے بڑھنا مشکل ہو گیا۔ انہوں نے لپک کر کھڑکی کھولی جس کے ساتھ ہی ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ اور چاروں طرف شعلے بھڑک اٹھے وہ ایک ایک چیز کو اٹھا کر بچانے کی کوشش کرتے مگر دوسری چیزوں کا خیال آتا۔ اگر وہ کتابوں اور کاغذوں کو بچانے کی جدوجہد کرتے تو ان کی توجہ دیواروں پر آویزاں بیش قیمت روغنی تصاویر کی طرف جاتی ان کی آنکھوں میں دھواں گھسا جا رہا تھا۔ بائبل کے ایک نسخے کو بچانے کے لئے انہوں نے اپنے ہاتھ جلا لئے اور منہ پر تیز لپکا لگا وہ مرتے ہوئے سپاہی کی طرح جس کو خندق میں گولی لگی ہو، بہت ہی بھیانک آواز میں چیخنے اور مایوسی سے دروازہ پیٹنے لگے۔ اتنے میں ان کے گاؤن نے بھی آگ پکڑ لی۔ انہوں نے بہت بے احتیاطی اور وحشت سے چٹخنی کھولنے میں ہاتھ زخمی کر لیا اور دروازہ سے باہر پھاند پڑے۔

تب تک وہاں بہت سے آدمی جمع ہو چکے تھے۔ چاروں طرف طرح طرح کا شور ہو رہا تھا۔ جب وہ چوٹ اور جلن سے زخمی حالت میں اسپتال کی طرف جا رہے تھے تو دماغ میں صرف آگ بجھانے والے انجنوں کی آواز گونج رہی تھی۔

دوسرے دن سہ پہر کے وقت جب دیپک بابو کو ہوش آیا تو ان کے ہونٹھ پر جلن تھی جن پر طرح طرح کے پھائے لگے ہوئے جسم پر جگہ جگہ آبلے پڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے کچھ بولنے کی کوشش کی۔ مگر منہ سے صرف آ۔ آ نکلا۔

ان کے سر کے بالوں کا ایک حصہ بھی جل چکا تھا اور دماغ میں صرف ٹن ٹن کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ وہ ادب اور آرٹ کے نمونے جل گئے۔ وہ زندگی کی بھرپور رعنائیاں ختم ہوگئیں۔ وہ تہذیب و ثقافت کے آثار معدوم ہو گئے۔ باخ موزارٹ اور بتھوون کے نغمے خاموش ہو گئے۔۔۔ یہ کیوں اور کیسے جل گئے۔ اب کچھ نہیں باقی، کچھ نہیں۔ کمرے میں دھندلائی ہوئی شبیہوں اور رنگوں کی طرح صرف ایک ہی بات ان کے ذہن میں ابھری، یہ سب اچانک

جل گیا، مٹ گیا۔ اب کچھ نہیں باقی۔

ہاں اب کچھ باقی نہیں۔ دیپک بابو کرب انگیز آواز میں بہ آ۔ بہ آ۔ کر کے چیخے اور پھر ایسے بیہوش ہوئے کہ ان کا دماغ ماؤف ہو گیا۔

اب بسنت رت آئی ہوئی ہے۔ چاروں طرف ہلکی خوشگوار گرمی ہے۔ اسپتال کے باہر آموں کے درختوں پر کوئلیں کوک رہی ہیں۔ سارے میں نئی زندگی اور نئی امنگیں انگڑائیاں لے رہی ہیں۔ مگر دیپک بابو ذہنی طور پر مفلوج ہیں۔ جب کوئی ملنے والا آتا ہے تو وہ اس کو پہچان نہیں پاتے۔ بڑی مشکل سے ان کا ہاتھ اٹھتا ہے پورا بدن پانی بھرے غبارے کی طرح تھل تھل کرتا ہوا ہلتا ہے اور منہ سے بیچارگی سے آواز نکلتی ہے۔ بہ آ۔ بہ آ۔

سب امتیاز ختم۔ برے بھلے کی تفریق ختم۔ جان پہچان کے آثار ختم۔ چاروں طرف بس سائیں سائیں ہے۔ ہوا کا سناٹا۔ ہر طرف ایک ہو کا عالم جیسے کسی بھرے گھر سے ایک ساتھ کئی میتیں اٹھ گئی ہوں۔ اور رونے والوں کی آنکھیں خشک ہو چکی ہوں۔

مس تاراپور دیپک بابو کی پرانی جاننے والی تھیں۔ اس حادثے کا علم جب ان کو ہوا تو وہ ان کو دیکھنے آئیں۔ مگر دیپک بابو ان کو پہچان نہیں سکے۔ مس تاراپور نے ہاتھ جوڑ کر نمستے کی۔ مگر دیپک بابو نے صرف وحشی نگاہوں سے ان کو دیکھا اور کوئی جواب نہیں دیا۔ بلکہ لڑکھڑاتے قدموں سے ڈرنے لگے۔ ان کے منہ سے بہ۔ بہ۔ بہ کی آواز نکلی بدن قابو میں نہیں تھا۔ اس لئے نرس نے ان کو سنبھالنے کی کوشش کی مگر ان کے بھاری بدن کا بوجھ سنبھال نہ سکی۔ اور خود بھی دیپک بابو کے ساتھ گر پڑی۔

مس تاراپور کو یہ حال دیکھ بہت رنج ہوا۔ وہ کرسی پر بیٹھی ایک تماشائی کی طرح یہ سارا المیہ دیکھ رہی تھی۔ نرس نے اپنے کو سنبھالا۔ مگر دیپک بابو اٹھ نہیں پائے۔ وہ گھٹنوں کے بل آگے ٹیکتے ہوئے کھسکنے لگے۔ اور ان کے منہ سے برابر وہی مہیب اور روح فرسا آواز نکل رہی تھی۔ بہ۔ بہ بہ آ۔

مس تاراپور نے کچھ کہنا چاہا۔ مگر دیپک نے دونوں ہاتھوں سے اس کی ٹانگ پکڑ لی اور دانت اس کی ننگی پنڈلیوں میں پیوست کر دیئے۔ مس تاراپور درد کی شدت سے بے اختیار ہو کر چلائی۔ دو ایک آدمی اور آ گئے اور انہوں نے بڑی مشکل سے گھسیٹ کر دیپک بابو کو بستر پر ڈالا۔

اس واقعہ پر ڈاکٹروں میں بڑی بحث ہوئی۔ اور دیپک بابو کی ذہنی کیفیت کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے ڈاکٹر مہرا نے کمرہ بند کر کے دیپک بابو کو طرح طرح کے رنگوں کی روشنی دکھائی۔ وہ خاموشی سے رنگوں کی تبدیلی دیکھتے رہتے۔ مگر جب روشنی کی جاتی اور ان کے پرائیویٹ وارڈ کے دروازے کھول دیئے جاتے تو وہ وحشی نگاہوں سے باہر جھانک جھانک کر دیکھتے اور اچھل اچھل کر بہ بہ بہ آ... کرنے لگتے۔

تاراپور کا قصہ پڑھ کر فہیم سُوار ز کو بھی بڑا تعجب ہوا۔ وہ برسوں سے اسی شہر میں رہ رہا تھا۔ بلکہ یورپ کے دورے کے زمانے ہی میں ان کی دیپک بابو سے جان پہچان ہوئی تھی۔ دیپک بابو کی موجودہ حالت سے وہ بہت متاسف تھا۔ ایک روز وہ کچھ پرانے کلاسیکی موسیقاروں کے ریکارڈ لے کر دیپک بابو سے ملنے گیا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید قدیم موسیقی ان کے ذہن کے کچھ بے حس پہلوؤں کو جھنجھوڑ کر رکھ دے گی اور اس طرح دماغ میں شاید کچھ حرکت پیدا ہو۔

ایک ڈاکٹر اور نرسوں کی موجودگی میں شوار ز نے اپنے ٹیپ ریکارڈ پر باخ کا ایک ریکارڈ بجایا۔ دیپک بابو مسہری پر زور زور سے اچھلنے لگے۔ دو تین اور لوگوں نے بھی اس ردعمل کا بغور مشاہدہ کیا۔ مگر سوارز کی سات سالہ بچی دیپک بابو کی حرکتیں دیکھ کر ڈر گئی اور رباب کی آڑ میں چھپ کر جھانک جھانک کر دیپک بابو کو حیرت سے دیکھنے لگی۔

ریکارڈ ختم ہونے کے بعد دیپک بابو پھر خاموش ہو گئے۔ ان کا تھل تھل کرتا ہوا بدقطع اور بے ہنگم بدن ڈولنا بند ہو گیا۔ اور اب وہ کسی بھینسے کی طرح خر خر کر رہے تھے۔

"اچھا تو پھر کیا؟ وہ سب لوگ باہر نکلے تو ایک عجیب سی خاموشی تھی جس کو دور کرنے کے لئے ڈاکٹر مہرا نے آپ ہی آپ سوال کیا۔

اس سلسلے میں ماہر نفسیات کی مدد لینے اور ان کا باقاعدہ اعصابی و نفسیاتی جائزہ لئے جانے کی ضرورت ہے۔ ایک نے کہا اور دوسرا بولا۔ ان کے پیروں میں چلنے کی طاقت تو آسکتی ہے۔ جسم کے دوسرے اعضا بھی ٹھیک ہو سکتے ہیں۔ مگر دماغ کا بغور مشاہدہ کرنے کی ضرورت ہے۔

وہ سب برآمدے میں کھڑے آہستہ آہستہ گفتگو کر رہے تھے۔ سب کا خیال یہی تھا کہ کیس یہاں سے منتقل کر کے کسی دماغی امراض کے اسپتال میں بھیج دیا جائے۔

ڈاکٹروں کے پیچھے کھڑی ہوئی نرسوں کو ذرا سکون ہوا کیونکہ اب دیپک بابو سے لوگ ڈرنے لگے تھے۔

شوارز نے کہنا شروع کیا۔ میرا خیال ہے۔۔۔

دیپک بابو کے کمرے سے ایک روح فرسا چیخ بلند ہوئی اور سب لوگ اس طرف دوڑ پڑے۔ دیپک بابو نے این کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ اس کے پتلے پتلے ہاتھ دونوں طرف اس طرح پھیلے ہوئے تھے جیسے اس کو صلیب پر چڑھا دیا گیا ہے۔ اس کی ہلکی نیلی نیلی آنکھیں باہر ابل پڑی تھیں۔ شوارز ہائے کر کے این کے اوپر گر پڑا۔

سات سالہ معصوم این کی لاش سوارز کے بدن کے بوجھ سے اور بھی کچل گئی۔ دیپک بابو دونوں ہاتھ ریت پر ٹیکے ہوئے اوندھے منہ پڑے تھے اور اپنی مخصوص ڈراؤنی آوازمیں "بہ۔ بہ۔ بہ۔ با" کر رہے تھے۔

سب لوگ صرف ساکت کھڑے تھے۔ وارڈ کے دروازے پر بیسیوں آدمیوں کا ہجوم طرح طرح کی آوازیں نکال رہا تھا مگر اندر صرف شوارز کی سسکیاں گونج رہی تھیں یا دیپک بابو کا بدن پانی بھرے غبارے کی طرح تھل تھل کر رہا تھا۔

ڈاکٹر مہرا نے وارڈ کا دروازہ بند کرا دیا۔ این کی لاش اناٹمی ہال کی طرف بھجوا دی۔ اور کئی لوگ شوارز کو پکڑ کر الگ لے گئے۔ وہ برابر اپنے بال نوچ رہا تھا اور جرمن زبان میں برابر میں اکیلا رہ گیا۔ میں اکیلا رہ گیا۔ چلا رہا تھا۔

شوارز کا غم دل ہلا دینے والا تھا۔ اس کی زندگی اور دکھ سکھ کا سارا سہارا صرف این تھی۔ جس کی پیدائش کے سلسلے میں اس کی چہیتی بیوی کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس کی آواز نہ جانے کن ویرانوں میں بازگشت کرتی معلوم ہو رہی تھی ۔ "میں اکیلا رہ گیا۔ میں اکیلا رہ گیا"

اس واقعہ کے بعد دیپک بابو کو سائکیاٹری سنٹر بھیج دیا گیا۔ جہاں ان کو ایسے کمرے میں رکھا گیا۔ جس کے دروازے اور کھڑکیوں پر لوہے کی جالیاں لگی تھیں۔ اگر کوئی بھولا بسرا دوست اب بھی ان کو دیکھنے چلا جاتا تو اس کو صرف جالیوں سے اندر جھانکنے کی اجازت ملتی۔

شوارز پندرہ بیس دن تک کھویا کھویا رہا وہ نہ کسی سے بات چیت کرتا نہ پڑھتا لکھتا بس ہر وقت این کی تصویر سامنے رکھے رویا کرتا۔ اکیلے میں اس کو این کی آواز سنائی دیتی۔ کبھی وہ ایک کونے کو خالی خالی نظروں سے دیکھتا جہاں این چھوٹی سی میز کرسی پر بیٹھ کر ڈرائنگ بنایا کرتی تھی۔ اور کبھی دوسرے کونے کو جہاں این خوشی سے اچھلتی اور تالیاں بجاتی تھی۔ کبھی اس کو معلوم ہوتا جیسے این اسکول بس سے اتری ہے اور سیدھی دوڑی ہوئی اس کے گلے میں باہیں ڈالنے چلی آ رہی ہے۔ وہ چونکتا اور معلوم ہوتا یہ سب وہم ہے۔ لو اور دھوپ کا موسم آ گیا تھا۔ مگر وہ پہاڑ پر نہیں گیا۔ پھر جب رفتہ رفتہ طبیعت سنبھلی تو اس نے پھر کلاسیکی موسیقی کے ریکارڈوں سے دل بہلانا شروع کر دیا اور دیپک بابو کے بارے میں ساری تلخی بھول جانے کی کوشش کی۔

نومبر تک اس کی طبیعت بالکل بحال ہو گئی۔ مگر ریسرچ کی طرف سے اچاٹ ہو گئی۔ اور اس نے واپس فرانکفرٹ جانے کی تیاری شروع کر دی۔

واپسی سے قبل اس کے دل میں بے اختیار خواہش جاگی کہ دیپک بابو سے ملتا چلے اس نے سائکیاٹری سنٹر کے انچارج کو فون کیا اور وقت طے کر کے ایک شام کو شہر سے بہت دور پر واقع سنٹر کی طرف چل پڑا۔

دیپک بابو کی نگراں ڈاکٹر رستم شوارز کو سنٹر کے سب سے الگ اور اکیلے کمرے میں لے گئی جہاں ہلکے دھندلکے میں کھڑکیوں سے جھانک کر اس نے دیپک بابو کو دیکھا۔ وہ ٹانگوں کے بل کھڑے ہوئے کھڑکی کی جالیوں کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے ہوئے باہر دیکھ رہے تھے۔ اور کھڑکی کے پاس ہی باہر کی طرف دو چنگاریاں ایسی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ شوارز کو حیرت ہوئی مگر ڈاکٹر رستم نے بتایا کہ شام ہوتے ہی سنٹر کے بچھواڑے بھیڑیے، لکڑبگھے اور سیار جمع ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے دو ایک تو کمرے کی دیوار تک آ جاتے ہیں۔ مگر بیچ میں کانٹے دار تاروں کی وجہ سے کھڑکی کے قریب نہیں آ پاتے۔ دیپک بابو

بڑی دلچسپی سے ان بھیڑیوں اور سیاروں کو دیکھتے ہیں اور ان ہی کی طرح آوازیں نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ڈاکٹر روتھ نے برآمدے کا سوئچ دبایا جس سے دیپک بابو کے کمرے میں روشنی ہو گئی۔ روشنی ہوتے ہی بھیڑیا بھاگ گیا۔ اور دیپک بابو نے اپنی وحشی آنکھوں سے دروازے کی طرف دیکھا۔ شوارز پر نظر پڑتے ہی جیسے ان کا دماغ پھر پلٹا کھا گیا وہ فوراً اوندھے گر پڑے اور ہاتھوں کے بل کھڑے ہو کر زور زور سے ٹانگیں چلانے لگے۔ ان کے منہ سے پھر ایک بار وہی ذہن کو ماؤف کر دینے والی آواز نکلنے لگی "بہ۔ بہ۔ بہ۔ آ"

شوارز کو این یاد آگئی اور اس کی آنکھوں سے آنسو نکلنے لگے۔ ڈاکٹر روتھ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور ڈرائنگ روم میں لے جا کر اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی۔

"کیا یہ پھر عام آدمی کی صفات اختیار کر سکتے ہیں۔ شوارز نے پھر موضوع کو دیپک بابو کی طرف موڑ دیا۔

میرے خیال میں بالکل ممکن ہے۔ مگر اس کے لئے کوئی بہت ہی سخت صدمہ ضروری ہے۔ جس سے ان کی ذہنی بے حسی پھر متحرک ہو سکے۔ مگر یہ سب میرا خیال ہے۔ اصل میں ہم لوگ کوئی واضح علاج نہیں سوچ سکے ہیں۔

"مگر ان کے سارے زخم تو ٹھیک ہو گئے ہیں۔ بدن بھی اب بالکل نارمل ہے۔"

"ہاں یہ سب تو سرجری اور دوا علاج سے ٹھیک ہو ہی جاتا ہے۔ لیکن اصل بیماری دماغ کی ہے جب دماغ کام کرنے لگے گا تو پھر آپ ہی آپ عام انسانوں کے ڈھنگ سے وہ طور طریقے اختیار کر لیں گے۔"

افسوس افسوس۔" شوارز زیر لب بڑبڑایا۔

وہ ڈاکٹر روتھ کے اصرار پر رات کو وہیں رک گیا۔ اس نے دو تین اور مریضوں کو بھی دیکھا جو کسی غیر معمولی اعصابی کمزوری میں مبتلا تھے۔ مگر دیکھنے میں بالکل متوازن اور صحیح الدماغ معلوم ہوتے تھے۔

رات کو سوتے سوتے شوارز چونک پڑا۔ اس نے خواب میں این کو مسکراتے اور شرارتیں کرتے دیکھا تھا۔ آنکھ کھلتے ہی جیسے اسے احساس ہوا کہ این اب کبھی مسکراتی ہوئی رقصاں جولاں اس کے پاس نہیں آسکتی تو وہ بچوں کی طرح ہاتھ مل مل کر رونے لگا۔

اس وقت کچھ گھبراہٹ ہوئی۔ کھٹ کھٹ کرتی ہوئی کچھ نرسیں دوڑتی معلوم ہوئیں۔ شوارز باہر نکلا تو اس نے ایک نوکر کو تیزی سے جاتے دیکھا اس نے نوکر سے پوچھا کہ کیا ہوا وہ اپنی مخصوص زبان میں "غجب ہو گیا" کہتا ہوا آگے چل دیا۔ سب کو ایک طرف جاتے ہوئے دیکھ کر شوارز بھی ادھر چل دیا۔ دیپک بابو کے کمرے کے سامنے ہجوم تھا۔ ڈاکٹر روتھ ایک ملازم کو بہت ہی غیر شائستہ زبان میں ڈانٹ رہی تھی۔

نرس نے بتایا کہ دیپک بابو کس طرح کھڑکی کھول کر باہر پھاند پڑے۔

سب لوگ ٹارچیں اور لاٹھیاں لے کر باہر نکل رہے تھے۔ سنٹر کے انچارج میک وائٹ نے احتیاط کے طور پر پستول نکال لیا۔

وہ لوگ جیپ میں بیٹھ کر جنگل کی طرف بڑھے ہی تھے کہ ان کو جھاڑیوں میں دور تک خون ہی خون نظر آیا۔ " THAT AND THE MATTER " میک وہائٹ نے آہستہ سے کہا۔

وہ سب چپ چاپ سنٹر کی طرف واپس چل دیئے۔ مگر جنگل میں بھیڑیوں اور سیاروں کی خوفناک آوازیں برابر گونج رہی تھیں۔

نقش ادب کی خدمت کرتا ہے آپ نقش کی سرپرستی کیجئے۔
نقش خریدیئے • • نقش میں اشتہار دیجئے
فرصت کے لمحات کا بہترین ساتھی۔ ماھنامہ "نقش" ۔ کراچی

نعیم زبیری
پیکر۔ حیدرآباد دکن

دُوہری شخصیت

سیلے ہوئے سرد۔ اور تاریک ۔ سیل میں ہنگرین قیدی چپ چاپ بیٹھے تھے انھیں اچھی طرح پتہ تھا۔ کہ وہ ابھی تک کیوں زندہ ہیں؟۔ دراصل نازیوں کا وہ اسکواڈ جسے سزائے موت کو تکمیل تک پہنچانا تھا۔ جدوجہد آزادی کے بڑے لیڈروں ہی کے سلسلے میں اتنا مصروف تھا کہ اسے ان قیدیوں پر توجہ کرنے کی فرصت نہیں ملی تھی۔

پتھریلے فرش پر قیدیوں کے ہجوم کے درمیان ۔۔۔ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے، اسالہ گیبار اور ایلونا بھی بیٹھے تھے ۔۔ گیبار ۔۔ ایلونا سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اب وقت گزر چکا تھا۔

"مرد پہلے" ایک سپاہی چلایا ۔۔ گیبار اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور آخری مرتبہ ایلونا کے ہاتھ کو دبا کر ان لوگوں میں اپنی جگہ کھڑا ہو گیا۔ جنہیں بڈاپسٹ کے بیچوں بیچ ۔۔ تین میل دور ۔۔ ڈینوب کے کنارے جانا تھا۔

صبح کے تین بجے تھے۔ گیبار کو دوسرے لوگوں کے ساتھ ہی پانی کی طرف منہ کر کے کھڑا کر دیا گیا تھا ۔۔ ایک تیز سرچ لائٹ ان کے تھکے ہوئے چہروں پر پھیل گئی۔

اور پھر حکم دیا گیا "فائر"

گیبار نے گولیوں کو اپنی پیٹھ میں دھنستا ہوا محسوس کیا۔ اور جیسے ہی وہ سر کے بل دریا میں گرا اس نے سوچا، اچھا تو موت کا احساس ایسا ہوتا ہے ؟ ۔۔ ایلونا ۔ کاش موت تمہارے لئے اتنی تکلیف دہ نہو ۔ پانی ۔ کتنا گہرا ہے ؟

"گہرا ۔۔ بالکل برفیلا ۔۔

مجھے کتنی سردی لگ رہی ہے"

لیکن گیبار کار اس جس کی عمر اب ۲۵ سال ہے اور جو اب لندن کا باشندہ ہے موت کے منہ سے نکل آیا۔ اس کی دوسری زندگی اس وقت شروع ہوئی جب کہ ایک مچھیرے نے اسے فائرنگ اسکواڈ سے دو سو گز دور پانی سے باہر نکال لیا

وہ زخمی لڑکے کو اپنے ساتھ گھر لے گیا۔ اسے چھپا لیا۔ وہ اور اس کی بیوی چھ مہینے تک اس کی تیمار داری میں لگے رہے اور اس ساری مدت میں وہ صرف چار مرتبہ کچھ منٹ کے لئے ہوش میں آیا۔

بالآخر ــــ ایک ڈاکٹر نے جو خفیہ طور پر اس کا علاج کر رہا تھا۔ اُسے ایک فرضی نام سے ایک دواخانے میں شریک کروا دیا۔ اور وہ اُس وقت تک وہیں رہا جب تک کہ جنگ ختم نہ ہو گئی۔ اور نازی فرار نہ ہو گئے۔

جب وہ اچھا ہو گیا۔ تو اُس نے سرکس میں کام شروع کر دیا۔ جہاں اُس کی ملاقات جوڈیتھ سے ہوئی جو ٹکٹیں بیچا کرتی تھی۔ وہ ا شادی کرنا چاہتا تھا۔ لیکن ایلونا کی یاد اس کا پیچھا کر رہی تھی۔

حیران ــــ پریشان وہ اپنی پہلی محبوبہ کی تلاش میں سرگرداں رہتا۔ آفیسرز اس سے بار بار کہتے۔

"تم سمجھتے کیوں نہیں۔ وہ مر چکی ہے۔ دفن ہو چکی ہے ــ کوئی نہیں جانتا کہاں؟"

"وہی حال تو میرا بھی ہے ــ تمہارا بھی ــــ ہم سب ہی کا" گیبار بحث کرتا۔ دماغی امراض کے ایک دواخانے میں ماہرین نے پتہ چلایا۔ کہ وہ دوہری شخصیت کا حامل ہے۔

گیبار نے کئی سال بعد مجھے بتایا۔ "مجھے پورا یقین تھا۔ کہ مجھے سزائے موت دی جا چکی ہے ــــ میں مر چکا تھا۔ اور مجھے اس بات کا بھی پورا یقین تھا۔ کہ میرے چاروں طرف سب ہی لوگ مُردہ ہیں۔"

"مجھے غالباً یقین ہو گیا تھا۔ کہ یہ زندگی موت کے بعد کی ہے اور وہ سارے دوست اور رشتہ دار جو مر چکے تھے۔ ایک طرح سے زندہ ہیں۔"

"میں نے سوچا کہ مجھے ایلونا کو ڈھونڈنا چاہیئے۔ کیونکہ ہم دونوں ہی مُردوں کی دنیا میں رہتے ہیں۔ میں اس سے صرف اتنا کہنا چاہتا تھا۔ کہ میں کسی اور سے شادی کرنے والا ہوں۔"

"پاگل خانہ سے ایک مایوس العلاج لیکن بے ضرر فاترالعقل کی حیثیت سے نکل کر گیبار جوڈیتھ کے پاس لوٹ آیا۔ جس کے دل میں اب بھی اس کے لئے پورا بھروسہ تھا۔

اس نے کبھی امید کا دامن نہیں چھوڑا۔ اور ایک دن اُسے پتہ چلا۔ کہ ایک برطانوی ماہر نفسیات ہنگری میں چھٹیاں گزارنے آیا ہوا ہے۔ مریض سے دو مرتبہ بات چیت کے بعد اس نے جوڈیتھ سے کہا۔

"میں ایک انتہائی غیر روایتی طریقہ استعمال کرنے کے لئے تیار ہوں۔"

اس کے طریقے کا دارومدار پہلے تو اس بات پر تھا۔ کہ ایسی تمام معلومات اور چھوٹی چھوٹی اور غیر اہم باتیں تک بھی جو گیبار کے ماضی سے متعلق ہوں جمع کر لی جائیں۔

جوڈیتھ نے ایسی تمام جگہوں اور تمام لوگوں کی سینکڑوں تصاویر لیں جنہیں گیبار کبھی جانتا تھا۔ اس نے گیبار کی ماں کی آواز کو ٹیپ ریکارڈ کیا۔ جس میں ماں اپنے بچے سے اس کے بچپن ہی کے انداز میں بات چیت کر رہی تھی۔ اس نے دیہات کے چرچ کی گھنٹیوں حتیٰ کہ ایک کتے کے بھونکنے کو بھی ریکارڈ کیا۔ کیونکہ گیبار جب پانچ برس کا تھا تو اسے ایک کتے نے کاٹ لیا تھا۔

پھر اس سے کہا گیا۔ "گیبار کے سابقہ ہیڈ ماسٹر کے پاس جاؤ اور اس کی یہ بات ریکارڈ کرو ــــ تم سوسائٹی پر ایک بوجھ ثابت ہو گے اور پھر گولیوں کی آوازیں ریکارڈ کرو۔"

تصویروں کو دیواروں پر لگا دیا گیا ــــ ٹیپ ریکارڈ کئے ہوئے جملوں اور آوازوں کو مناسب انداز میں ترتیب دیا گیا۔ اور ہر قسم کی مانوس گھریلو چیزوں کو جن میں گیبار کے دادا کی دیواری گھڑی اور کھلونے بھی شامل تھے۔ گیبار کے اطراف کمرے میں رکھ دیا گیا۔ جہاں اس کے اطراف پردے رکھ دیئے گئے تھے۔ تاکہ فوراً ہی اس کی نظریں کمرے پر نہ پڑیں۔

ہپناٹزم کا عمل رات کے نو بجے شروع ہوا، اور چار گھنٹے پندرہ منٹ تک جاری رہا۔ پہلے ہی سے تیار کی ہوئی ایک تحریر کی مدد سے ماہر نفسیات نے گیبار کے بچپن کو ٹٹولا۔ اور اس دوران میں روشنی کا دائرہ مخصوص تصویروں پر ڈالا جاتا رہا۔ ۔ اور وقتاً فوقتاً ریکارڈ کی ہوئی آوازیں ۔ یا چلنے سُنائے جاتے رہے۔

پھر اُس نے ۔۔ گیبار کو بتدریج اُس کے لڑکپن کے بعض اہم واقعات کی تفصیلات یاد دلائیں۔ اور پھر اس کے ذہن کے پردہ پر ان دنوں کو جب گیبار نے جنگ میں شرکت کی۔ اور گرفتار ہوا۔ اور پھر ان آخری چند گھنٹوں کو جو اُس نے نازی کیمپ میں ایلونا کے ساتھ گذارے پیش کیا۔

ان لمحات میں جب گولی چلائی جانے والی تھی ۔۔ تیز روشنی ایک دم پھیل گئی اور اچانک بندوقیں چلنے کی آواز آئی تو بستر میں، لیٹے لیٹے گیبار کے چہرے پر شدید کرب کے آثار نمایاں ہوگئے۔ ایسا محسوس ہوا جیسے اسے دوبارہ گولی ماری گئی ہو۔

جوڈیتھ اس کی حالت کو برداشت نہ کرسکی۔ اور رو پڑی ۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں ماہر نفسیات نے برف کا ایک بہت ٹھنڈا ٹکڑا گیبار کے سینے سے لگا دیا۔ گیبار بڑبڑایا۔

"اچھا ۔۔ تو ۔ موت کا احساس ایسا ہوتا ہے ۔۔ ایلونا ۔ کاش موت ۔۔ تمہارے لئے اتنی تکلیف دہ نہ ہو ۔۔ پانی کتنا گہرا ہے؟"

"گہرا ۔۔ بالکل برفیلا ۔۔ مجھے کتنی سردی لگ رہی ہے؟"

"نہیں ۔۔ یہ موت نہیں ہے۔ تم ۔۔ زندہ رہو گے ۔ تم ۔ زندہ رہو گے۔" ڈاکٹر نے سرگوشی کی۔

اور گیبار ۔۔ فوراً ہی گہری نیند کی آغوش میں کھو گیا ۔۔ وہ اب بالکل پرسکون تھا۔ بالآخر اسے اپنے متعلق حقیقت کا پتہ چل گیا تھا۔

اب اسے پتہ تھا کہ ۔۔ وہ زندہ تھا۔

گیبار کو ہپناسس کے متعلق کچھ یاد نہیں ہے۔

"صبح میں نے۔ اس نے کہا۔ "ہم ادھر ادھر کی مختلف باتیں کرتے رہے۔ اور یہ بات مجھے بہت بھلی معلوم ہوئی۔ کہ لوگ مجھ سے بار بار یہی سوال کرتے رہے کہ میں زندہ ہوں، یا مُردہ؟

"بلاشبہ میں زندہ تھا۔" مجھے پتہ تھا کہ مجھے گولی ماری گئی تھی۔ لیکن میں بچ گیا تھا ۔۔ مجھے قطعی یاد نہیں تھا کہ کبھی میں نے خود کو مُردہ ۔۔ یا دوسری دنیا میں بھی تصور کیا تھا۔"

زندگی کے لئے اپنی اس سخت کش مکش کے بارے میں گیبار کو کئی سال بعد پتہ چلا۔ کیونکہ جوڈیتھ نے گیبار سے اپنی شادی کے ایک عرصے بعد تک بھی اس راز کو اس ڈر سے اپنے سینے سے لگائے رکھا کہ کہیں اس بات سے گیبار کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔

آج کل یہ دونوں کیلیڈونین روڈ لندن کے ایک دو کمروں والے فلیٹ میں رہتے ہیں اور وہ شخص جسے دوبارہ زندگی ملی ایک پیشہ ور پیانو نواز ہے۔

• فرصت کے لمحات کا بہترین ساتھی ماہنامہ نقش کراچی

وقار محسن

سریتا۔ دہلی۔

طاق والے میاں صاحبؒ

"تیرا یہ بچہ بھی مرے گا۔" جھنڈو شاہ کی کرخت آواز دیر تک مزار کے اندر گونجتی رہی۔

"یا پیر! میرا بچہ بڑی مرادوں کا ہے۔ اگر چاروں بچوں کی طرح یہ بچہ بھی نہ بچ سکا تو میری دنیا اندھیری ہو جائے گی۔" وھیرو جلاہا جھنڈو شاہ کے قدموں میں گر پڑا۔

"جھنڈو شاہ کی بات پتھر کی لکیر کی طرح اٹل ہے۔" چارخانے کی تہمد کی گانٹھ کستے ہوئے جھنڈو شاہ چنگھاڑے۔

"میں تباہ ہو جاؤں گا شاہ جی۔ طاق والے میاں کا واسطہ دیتا ہوں۔ میرے اوپر رحم کرو۔ میں چہلم پر ایک بریانی کی دیگ اور بڑے پھولوں والی ریشمی چادر چڑھاؤں گا۔" وھیرو نے شاہ جی کے سرخ بنیان کی بدبو کو نظرانداز کرتے ہوئے ان کے شانے پر اپنا سر ٹیک دیا۔

"دور ہو جا، حرام کے پلے!" شاہ جی دھاڑے اور دوسری طرف جھاڑو دیتے ہوئے فیقرو کو قہر آلود نظروں سے گھورا جس کا ایک ہاتھ چڑھاوے کے لڈوؤں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ نظریں ملتے ہی فیقرو کے ہاتھ میں بریک لگ گیا اور پیلے پیلے دانتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ پھر صفائی کرنے میں مشغول ہو گیا۔

وھیرو ایک دم اٹھ کھڑا ہوا، جیسے گوشت پوست کا نہیں، اسپرنگ کا بنا ہو۔ اس کا چہرہ خوشی سے سرخ ہو رہا تھا۔ پیر جی کے منہ سے نکلے ہوئے یہ پانچ لفظ کیا ان بردانوں سے کم تھے جو یم راج نے ساوتری کو دیئے تھے۔ شاہ جی نے اسے حرام کا پلہ کہا تو جیسے فرعون کا خزانہ اسے مل گیا کیونکہ شاہ جی گالی دیں تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ انہوں نے سائل کی التجا سن لی۔

"اگلے جمعہ کو سوا تیرہ سیر چاول اور دو دمڑی لنڈ اور اگربتی وغیرہ لے کر عشا کی نماز کے بعد اپنی جورو کو بھیج دے اگر موقع ہوا تو چلا کھینچ دوں گا۔ اور ہاں جاتے ہوئے گھی وغیرہ کے لئے فیقرو کو سوا سات روپیہ دیتا جیو، حرامی کے بچے۔" یہ کہتے ہوئے شاہ جی برابر والی کوٹھڑی میں چلے گئے، جو صرف خواتین کے لئے مخصوص تھی۔ اور ان کی مرادوں کی دعا شاہ جی تخلیہ میں ہی کرتے تھے۔

طاق والے میاں صاحب کی کرامات سے کون واقف نہیں تھا۔ صرف قصبہ رسول پور میں ہی نہیں دور دور تک ان کی بزرگی اور قہر کے چرچے تھے۔ رسول پور ایک چھوٹا قصبہ ہے۔ نمبردار کی کوٹھی کے علاوہ تقریب قریب سبھی مکان چھپر یا کھپریل کے نظر آتے ہیں۔ نمبردار کے گھر کے آگے جب کنوئیں کے پاس سے گھٹنوں گھٹنوں کیچڑ کو پار کر کے ہم جلاہوں کی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو جن کے پیڑوں کے پیچھے طاق والے میاں صاحب کے مزار کی چمکتی ہوئی

بُرجی نظر آنے لگتی ہے، آگے چلا ہے، چرخوں اور کھڈیوں میں سب نظر آتے ہیں۔ اور پاس ہی مسجد کے کنوئیں کی چرخی، جو اب گھس کر آدھی رہ گئی تھی۔ ان کے استعمال کے لئے تال کا کام کرتی ہے۔

مسجد کے سامنے جو پیپل کا پیڑ ہے۔ وہ قصبہ کا موٹر اسٹینڈ ہے۔ وہی مسافر خانہ ہے۔ وہی ٹکٹ گھر ہے اور جس کے نیچے زیادہ تر یا تو گاؤں کے پرائمری اسکول سے بھاگے ہوئے بچے گولی کھیلتے ہوئے ملیں گے۔ یا تین چار خارش زدہ کتے محوِ خواب نظر آئیں گے۔ یہیں سے بن شروع ہو جاتا ہے جس میں بندر بہ کثرت موجود ہیں اور باوجود اُن کے مظالم کے اُن کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جا سکتی۔ کیوں کہ وہ میاں صاحب کے زیرِ سایہ ہیں۔

بَن کے اختتام پر طاق والے میاں صاحب کا عظیم الشان مقبرہ ہے۔ مقبرے کے پیچھے ایک چھوٹی سی رہٹ ہے۔ جس کا پانی صرف ٹھنڈا ہی نہیں گاؤں والوں کا اعتقاد ہے کہ اکسیر کا کام بھی کرتا ہے۔ کبوتروں کی کابکوں اور مرغیوں کے کھانچوں کے پیچھے جو ایک گینڈے نما شخص بادام پیس رہا ہے یہ فیروز ہے، یعنی مجاور، جھنڈو شاہ کا پرائیویٹ سیکریٹری اور اُن کے بعد اس مزار کا وارث۔

جھنڈو شاہ طاق والے میاں صاحب کے مزار کے مجاور خاص ہیں۔ وہ دُکھی دلوں اور میاں صاحب کے بیچ کی کڑی ہیں۔ طاق والے میاں صاحب جھنڈو شاہ کے ذریعے پاسے گئے پیغامات سیدھے نیلی چھتری والے کے حضور پیش کرتے ہیں۔ اور جو خاص اور ارجنٹ مرادیں ہوتی ہیں، اُن کو فوراً پاس کرا لیتے ہیں۔ صرف خرچ زیادہ ہوتا ہے۔ جھنڈو شاہ کے منہ سے نکلا ہر ایک لفظ گاؤں والوں کے لئے ایک آیت ہے۔

آج چہلم کی چودہ تاریخ ہے۔ ہر سال اس دن طاق والے میاں صاحب کا عرس ہوتا ہے اور دو دن کے لئے بن گلزار بن جاتا ہے۔ پورا بن لوگوں کے ہجوم سے بھرا پڑا ہے۔ لوگ بچوں کو کندھوں پر بٹھائے چڑھاوا چڑھانے آ رہے ہیں۔ کچھ مرادیں پوری ہونے اور کچھ مرادیں پانے کی تمنا میں۔

اندر سے چمپا بائی کی بے ہنگم آواز آ رہی ہے۔ جو قوالی گاتے گاتے کسی فلمی گانے کی دھن پکڑ لیتی ہے۔ جھنڈو شاہ آج بے حد بارعب ریشمی پھولدار تہہ باندھے، جو کسی چلمن کا ٹکڑا معلوم دیتا ہے۔ بیچ قالین پر بیٹھے ہوئے بری طرح سر دھن رہے ہیں۔ اُن کی لال لال چڑھی ہوئی آنکھیں، صاف لال پری اور چُنیا بیگم کی کرامت ظاہر کر رہی ہیں۔ مگر پھر بھی چودھری کرامت علی شیخ نیاز محمد کی پسلی میں ٹہوکا دے کر انھیں اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں، جو اس وقت مجو چمار کی بیوی کو گھور رہے تھے۔

"اماں یار نیاز، ذرا شاہ جی کو تو دیکھو اُن کی آنکھیں کیسا جلال برسا رہی ہیں۔ اس وقت یہ یادِ الٰہی میں دنیا سے بالکل بے خبر ہیں۔"

جھنڈو شاہ کے آگے جو لوگ سر جھکائے بیٹھے ہیں۔ ان میں صرف گاؤں کے جاہل اور گنوار کسان ہی نہیں، تعلیم یافتہ لوگ بھی ہیں۔ یہ شاہ جی کے دائیں طرف جو سفید دھوتی اور ململ کا کرتا پہنے صاحب بیٹھے ہیں۔ وہ جمشید پور سے طاق والے میاں صاحب کی بارگاہ میں آئے ہیں۔ وہ کالج کے نامنہ کے پروفیسر ہیں۔ جن کا کام طالب علموں کی زندگی کو مختلف زاویوں اور پہلوؤں سے جانچ کر آراستہ کرنا ہے۔ اُن کے بائیں ہاتھ کو حشمت حسین بیٹھے ہیں جو تحصیل حسن پور کے داروغہ ہیں۔ اور اپنے علاقے کے ذہین دماغوں میں سے ایک ہیں۔

بہت دیر تک شاہ جی سر دھنتے رہے اور پھر اچانک لوبیا بھنے کی طرح ایک طرف کو لڑھک گئے۔

شام ہو چلی تھی، دھوپ پیڑوں کی جڑوں کو چومتی ہوئی پھنگی تک پہنچ گئی تھی۔ آہستہ آہستہ مزار خالی ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اور جب لوگ مزار کا آخری دیدار کرتے ہوئے چلے گئے۔ تو فیروز نے اپنا اونٹ سی گردن اٹھا کر دیکھا۔ اور آواز لگائی "شاہ جی لائن کلیر ہو گئی۔"

شاہ جی نے جماہی لی۔ اور اپنا مٹکا سی توند پر جو ان کے جسم کا الگ حصہ معلوم ہوتی تھی، ہاتھ پھیرتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"ابے فیروز! کوئی مرغا وغا بھی آیا؟" انھوں نے چادروں اور لڈوؤں کے ڈھیر پر ایک اُچٹتی نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

"صرف چھ آئے ہیں پیر و مرشد، یعنی یوں سمجھیے کہ آپ کے دو وقت کا ناشتہ۔"
فیقرو نے منہ کا پانی نگلتے ہوئے جواب دیا۔

رات کو جب جنڈو شاہ کھانے سے فارغ ہو کر بیٹھے تو وہ کسی گہری سوچ میں کھوئے ہوئے تھے۔ کبھی اُن کے ماتھے پر سلوٹیں پڑ جاتیں، کبھی خود ہی مسکرانے لگتے۔ فیقرو بہت دیر سے مرغے کی بچی ہوئی ہڈیوں کو چچوڑتے ہوئے شاہ جی کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

اچانک شاہ جی چونک کر بولے: "ابے او فیقرو! ابے کہاں مر گیا گدھے کی اولاد۔"

فیقرو نے حلق کا پانی نیچے اتارتے ہوئے جواب دیا۔ "آیا شاہ جی ذرا چلم بھر رہا تھا۔"

جب فیقرو نے چلم حقے پر رکھ دی اور معمول کے مطابق شاہ جی کے پیر دبانے لگا۔ تو شاہ جی نے سکوت توڑا۔ "ابے فیقرو! تو رہا حرام خور کا حرام خور" اتنا کہہ کر وہ رُکے اور کچھ سوچ کر پھر اپنی بات جاری کی "ویسے تو طاق والے میاں صاحب کو کافی شہرت حاصل ہے پھر بھی میں چاہتا ہوں کہ ان کی کرامت سے زیادہ سے زیادہ لوگ واقف ہوں۔ تاکہ خلق کو میاں صاحب کی کرامت سے زیادہ سے زیادہ فیض حاصل ہو۔" اتنا کہہ کر شاہ جی نے پاس رکھی تپائی سے بوتل اٹھائی اور ہونٹوں سے لگائی۔ تھوڑی دیر فیقرو کے دل کی دھڑکن اور شاہ جی کی غٹ غٹ ایک تال پر چلتی رہی۔ پھر شاہ جی نے بنیان سے باچھیں پونچھتے ہوئے سلسلۂ کلام جاری کیا۔

"میں چاہتا ہوں کہ کل ہی تم اس نیک کام کے لئے روانہ ہو جاؤ۔ اور جگہ جگہ گھوم کر لوگوں کو میاں صاحب جیسی عظیم ہستی کے بارے میں آگاہ کرو۔"
آدھی رات تک فیقرو جاگتا رہا۔ شاہ جی کا حکم ٹالنے کی اُس کی مجال نہ تھی۔ اور ایسی مقدس زرخیز جگہ سے وہ جانا نہیں چاہتا تھا۔ جہاں شاہ جی کے طفیل ..... اتنا سوچ کر ہی اُس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اور پھر سے ایک کونے میں تھوکتے ہوئے اُس نے شاہ جی کی ماں بہن سے دو تین رشتے قائم کئے اور چادر تان لی۔

صبح کو ڈنڈ پیلنے سے پہلے شاہ جی نے تیل ملوانے کے دوران فیقرو سے کہا۔ "فیقرو! جلدی تیار ہو جا۔ تمہارے لئے کچھ ضروری سامان کو رحیمو کمہار سے کہہ دیا ہے، جو تمہیں بستی کے باہر آم کے باغ کے نکڑ پر دے دے گا۔"

یہ کہتے ہوئے شاہ جی اُسے مقبرے کے پیچھے لے آئے اور ایک بھورے رنگ کے گدھے کی رسی پکڑاتے ہوئے بولے۔ "اس سے بہتر سواری تمہارے ہاتھ نہیں آ سکتی۔"

آج فیقرو کو چلتے چلتے دوسرا دن تھا۔ اور اب تک نہ اُس نے آرام کیا تھا اور نہ کسی سایہ دار پیڑ کے نیچے پڑاؤ کیا تھا۔ راستے میں جو گاؤں پڑتا وہاں کھانے کا سامان رکھ لیتا اور پھر سفر شروع کر دیتا۔ روپیہ فیقرو نے شاہ جی کی آنکھ بچا کر انٹی میں اڑس لیا تھا۔ اس وجہ سے کھانے پینے کی طرف سے اس کو فکر نہ تھی۔ آج صبح سے ہی فیقرو کا گدھا کچھ اداس نظر آ رہا تھا۔ اور فیقرو کے بے حد اصرار کے باوجود گھاس دانہ تک نہ چکھی۔ لیکن دوپہر کو تو اس کی حالت بہت خراب ہو گئی۔ اور شام تک وہ فیقرو کو اکیلا چھوڑ کر چل بسا۔

فیقرو کافی پریشان اور متفکر تھا۔ ایک تو جو کچھ سامان تھا اس کو ڈھونڈنے کا سوال تھا اور اکیلے سفر میں ایک گدھا ہی تو اس کا غمگسار رہا تھا جس سے وہ کبھی شاہ جی کے کرتوتوں کا ذکر کرتا اور پھر اپنی بدقسمتی کا رونا روتا اور پھر ایک دم چونک کر چاروں طرف دیکھنے لگتا۔ کہ کہیں کسی نے سنا تو نہیں۔ بہت دیر وہ سر جھکائے بیٹھا رہا۔ پھر اچانک خوشی سے اس کا چہرہ چمکنے لگا۔

فیقرو نے کبھی طاق والے میاں سے کوئی مراد نہیں مانگی تھی۔ ہاں اگر جب شاہ جی کہیں گاؤں میں چلّہ کھینچنے جاتے تو فیقرو میاں صاحب کے کان میں کہتا کہ کسی طرح وہ شاہ جی کو بھی جلد سے جلد اپنے پاس بلا لیں۔ کیونکہ اب ولی عہد کو تاج سنبھالنے کی جلدی تھی۔ آج اچانک اس ہم سفر کی موت پر جو اُسے

مستقبل کی تصویر نظر نہیں آئی۔ اس کے بُرانے خوابوں کی تعبیر کا عکس جھلک رہا تھا۔

فقیرو اس وقت رسول پور سے آٹھ کوس دُور نکل آیا تھا۔ اور سامنے مقیم پورے کی بستی کے مکان نظر آرہے تھے۔

اگلی صبح جب سورج کی پہلی کرن نے گیہوں کی سنہری بالیوں کو چھوا تو کھیتوں پر جاتے ہوئے کسانوں نے دیکھا کہ کیکر کے پیڑ کے نیچے جہاں اکثر گدھوں اور کوؤں کی محفل جا کرتی تھی، ایک قبر کا اضافہ ہو گیا ہے اور کیکر کے تنے سے لگا ایک شخص ہاتھ میں بڑے بڑے دانوں کی تسبیح لئے بیٹھا ہے۔ اور اس کی اشکبار آنکھیں آس پاس کی زمین کو گیلا کر رہی ہیں۔

شام تک مقیم پورے کی بستی میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی کہ کوئی بہت بلند پایہ کے پیرو مرشد خدمت خلق کے لئے اپنے مرید کے ساتھ نکلے تھے کہ اچانک پروردگار دو عالم کی طرف سے بلاوا آگیا۔ اور وہ مقیم پورے کی سرزمین کو یہ فخر عطا کرتے ہوئے کہ ان کا جسم اس سرزمین میں آرام کرے، اس جہانِ فانی سے پردہ کر گئے۔ اگلی صبح کو ہی لوگ کدالیں اور پھاوڑے لے کر آ گئے اور اب کیکر کے پیڑ کے نیچے ایک صاف ستھرا جھونپڑا اور ایک سفید پُتی ہوئی قبر نظر آرہی تھی۔

اس واقعے کو چار سال گزر گئے ہیں۔ اور اگر اب کوئی شخص مقیم پورے کی سرحد میں داخل ہوتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے راستہ بھول گیا ہو کیونکہ آم والے باغ سے لے کر کمہاروں کے جھونپڑوں تک چھوٹی چھوٹی دکانیں نظر آتی ہیں۔ اور کنڈے کی پلیا ہی سے جو گاؤں سے ایک میل دور واقع ہے ایک نئے اور چمکیلے مقبرے کے مینار نظر آنے لگتے ہیں۔ مقبرے کے برابر ایک کشادہ کمرہ ہے جس کا پورا فرش سفید چاندنی سے ڈھکا ہوا ہے۔ بیچ میں قالین پر، گاؤ تکئے سے کمر لگائے ایک شخص، جس کا چہرہ کالی ایک بالشت کی داڑھی سے کافی پُرنور معلوم ہوتا ہے، آہستہ آہستہ منہ میں انگور ڈال رہا ہے اور چاروں طرف چڑھاوے کی مختلف چیزوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ یہ فقیرو ہے اس مزار کا مجاور خاص۔

ادھر چار سال سے جب جھنڈو شاہ کو فقیرو کی کوئی خبر نہیں ملی، تو ان کو فکر ہوئی۔ ایک دن صبح سویرے نمبردار کا رتھ کسوا کر رسول پور سے فقیرو کی تلاش میں روانہ ہوئے۔ اگلے روز جب سہ پہر کے وقت شاہ جی مقیم پورے کی حدود میں داخل ہوئے تو سنہرے میناروں والے مزار اور چاروں طرف بھیڑ بھاڑ کو دیکھ کر چونکے، کیوں کہ جب کبھی شاہ جی یہاں آتے تھے۔ تو چرواہوں کے مویشیوں اور آوارہ گدھوں کے علاوہ اور کچھ نہ نظر آتا تھا۔ اس کے علاوہ شاہ جی کو اس لئے اور تشویش تھی۔ کہ آخر ان کے بزنس میں دوسرا حصہ دار کہاں سے کود پڑا۔ آخر کار شاہ جی نے رتھ رکوا کر تولیے سے اپنی چمکتی ہوئی چندیا صاف کی اور پاس سے گزرتے ہوئے تل شکری والے کو پاس بلا کر پوچھا۔ "ارے بھئی یہ کس کا مزار ہے؟"

پہلے تو تل شکری والے نے شاہ جی کو نیچے سے اوپر تک گھورا۔ اور پھر یہ سوچ کر کہ شاید نووارد ہے' ہنستے ہوئے جواب دیا۔ "پہلوان! ان کو نہیں جانتے، ارے بھئی، یہ پیرو مرشد جھنڈو شاہ کا مزار ہے۔ اور آج ان کا عرس ہے۔"

اتنا کہہ کر خوانچہ والا جھنڈو شاہ کی کرامتوں کے قصیدے پڑھتا رہا۔ مگر جھنڈو شاہ کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ بہت دیر تک اسی طرح گم سم بیٹھے رہے کہ ایک گاڑی بان کی آواز نے انہیں چونکا دیا۔ وہ بیچ راستے میں سے رتھ ہٹانے کے لئے چیخ رہا تھا۔

اچانک ایک خیال شاہ جی کے دماغ میں کوندا اور وہ رتھ کو کھول کر بیلوں کو ایک طرف باندھنے کے بعد برابر والے کمرے میں داخل ہو گئے جہاں سے قوالی کی آواز آرہی تھی۔ دروازے میں داخل ہوتے ہی اُن کی نظر سامنے گاؤ تکئے سے لگے شخص پر پڑی۔ اور ان کا اندازہ صحیح نکلا۔ باوجود چوڑی داڑھی کے شاہ جی نے اپنے ولی عہد کو ایک ہی نظر میں پہچان لیا۔

جب رات کے گیارہ بجے محفل اٹھی اور مزار تقریباً خالی ہو گیا۔ تو فقیرو نے جواب کتے والے میاں صاحب کے نام سے مشہور تھے۔ اپنی نیم باز کھلی

جنبش دی، تو سامنے کی دیوار سے ٹیک لگائے ایک شخص کو اپنی طرف گھورتے پایا۔ پہلے تو فقیرو کوئی مرید یا سائل سمجھ کر نظرانداز کر گیا۔ اور آنکھیں بند کر لیں جو بھانگ کے اثر سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ مگر جب "ادھار کے پتے کی آواز مقبرے میں گونجی تو فقیرو کا نشہ ایک ہی لمحے میں ہرن ہو گیا۔ اور لڑکھڑاتے قدموں سے وہ شاہ جی کے پیروں میں گر کر گھگھیایا۔

"مجھے معاف کر دو شاہ جی!"

تھوڑی دیر سکوت رہا۔ پھر فقیرو شاہ جی کے قدموں میں سسکتا رہا۔ شاہ جی دھاڑے۔ "کیوں بے سُوَر، کیا ڈھونگ ہے؟ میں تیرا باپ زندہ بیٹھا ہوں۔ اور تو میرے مزار کا مجاور بنا بیٹھا ہے۔"

"میرے اوپر رحم کرو، صرف اس بار معاف کر دو شاہ جی۔" فقیرو اور زور سے شاہ جی کے قدموں سے لپٹ گیا۔

"پوری بات بتا نہیں تو ایسا دھوبی پاٹ ماروں گا۔ کہ ساری مجاوری نکل جائے گی۔" شاہ جی دھاڑتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔

"وہ بات یہ ہے شاہ جی کہ۔۔۔۔ کہ۔" فقیرو نے کانپتے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ اور پھر جب شاہ جی کی آگ برساتی ہوئی آنکھوں پر نظر پڑی تو جلدی سے سلسلۂ کلام جاری کیا۔ "شاہ جی بات یہ ہے کہ وہ ۔۔۔۔ وہ گدھا ۔۔۔۔ وہ گدھا جو آپ نے میرے ۔۔۔۔ میرے ساتھ کیا تھا ۔۔۔۔

وہ ۔۔۔۔ وہ ۔۔۔۔ وہ مر گیا۔" اور اتنا کہہ کر وہ پھر خاموش ہو گیا۔

"آگے بولے گا بھی۔" اتنا کہہ کر شاہ جی نے آستینیں چڑھائیں۔

"بتاتا ہوں شاہ جی۔" فقیرو شاہ جی کی زد سے بچتا ہوا گر پڑا۔ "یہ مزار۔۔۔۔ یہ مزار ۔۔۔۔ اُسی ۔۔۔۔ اسی گدھے کا ہے۔" اور اتنا کہہ کر وہ پھر شاہ جی کے قدموں سے لپٹ گیا۔

فقیرو کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اب شاہ جی کا قہر نازل ہو گا۔ کہ اچانک وہ چونک پڑا، کیونکہ شاہ جی بڑی نرمی سے اس کی پیٹھ سہلا رہے تھے اور بہت ہی پیار سے اسے اُٹھنے کو کہہ رہے تھے۔ فقیرو نے جب ڈرتے ڈرتے کنکھیوں سے شاہ جی کی طرف دیکھا۔ تو اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، کیونکہ غصہ اور جلال کی جگہ شاہ جی کا چہرہ ایک پدرانہ شفقت سے منور تھا۔

کچھ دیر تک فقیرو کو فخریہ نظروں سے دیکھنے کے بعد شاہ جی بولے۔ "فقیرو، آج زندگی میں پہلی بار تو نے ایسا کام کیا جس سے مجھے یقین کامل ہو گیا ہے کہ تو میری جگہ سنبھالنے کے لائق ہے، اور چونکہ آج میں بہت خوش ہوں اور پھر تو تنہا میری کل جائداد کا وارث بھی ہے، میں تجھے ایک اہم راز بتانا چاہتا ہوں۔"

کچھ دیر مسکراتے رہنے کے بعد شاہ جی فقیرو کے حیرت سے کھلے ہوئے منہ کی پروا نہ کرتے ہوئے بولے۔ "فقیرو سن! وہ طاق والے میاں صاحب کا مزار اصل میں اُس کی ماں کا مزار ہے، جس کے مزار کا تو مجاور ہے۔"

ناشر ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ شمس زبیری   کتابت ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ چراغ الہ آبادی

سرورق ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ناظمن لال   طباعت ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ انٹرنیشنل پریس کراچی

اشاعت ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ جنوری ۱۹۶۵ء

مقام اشاعت

کاشانۂ اردو۔ ۲/۶ ۔ ایبٹ روڈ ۔ صدر ۔ کراچی ۳

انعامی بانڈ

آنند نرائن ملا

نقوش - لاہور

یوں نظر پہ پلکوں کے چھائے ہیں گھنیرے سائے — جھنڈ میں درختوں کے جیسے دھوپ کھو جائے
زندگی کی دکاں میں ہم نے دل کے سکوں سے — جب بھی کچھ کیا سودا ہاتھ اشک ہی آئے
پہلی پہلی الفت کی وہ ادائے معصومی! — آپ اٹھائے ہر پردہ اور آپ شرمائے
روشنی کا لے کر نام لڑ رہے ہیں آپس میں — اس طرف بھی کچھ سائے اس طرف بھی کچھ سائے
دل کی گزری یوں اکثر مصلحت کی دنیا میں — جیسے طائر اپنے پر تولے اور رہ جائے
آنکھ میں وہی اب بھی آنسوؤں کا موسم ہے — کتنے مہر سونلائے، کتنے چاند گہنائے
زندگی کے شایاں اب ہو چلا ہے دل شاید، — آئے اشک آنکھوں میں اور تم نہ یاد آئے
ایک رتجگا کر لیں، دل جواں ہے رات اپنی — راہِ زیست میں شاید پھر نہ یہ مقام آئے
ہو نہ جائے دشمن کا وار کامیاب آخر — دیکھ تیرے دل میں بھی دشمنی نہ آ جائے
دل میں ہر طرف پھیلی چاندنی انھیں کی ہے — وہ لطیف سے غم جو اشک بن نہ بن پائے
یوں کسی کی یاد آئی جیسے ایک چنچل نار — گھوم گھوم کر دیکھے دیکھ دیکھ مسکائے

آہ پیریٔ ملا! ورنہ کیا یہ ممکن تھا؟
زیست اور نظر پھیرے پاس سے گزر جائے

شان الحق حقی — نقوش۔لاہور

خوش اداؤں میں ہے خوش بیانوں میں ہے
دل گرفتار سو دل ستانوں میں ہے

ان دنوں اہل دل کی تو کیا مقدرت
پارسائی بڑے امتحانوں میں ہے

روزِ وعدہ! خدایا زمانے کی خیر
دل ابھی سے گھرا سو گمانوں میں ہے

زندگی میں طلسم و تماشا بہت
آدمی ہے تو قصّوں فسانوں میں ہے

حسن، آسودہ صحرا میں ہے آج کل،
عشق سرگشتہ آئینہ خانوں میں ہے

مختصر ہو گئیں دل کی پہنائیاں
اب تو کچھ لطفِ سیر آسمانوں میں ہے

صحبت شام مے خانہ مت پوچھیے،
صبح تعطیل سی کارخانوں میں ہے

اس کے دشنام شیریں کا کیا پوچھنا
ایک اپنی زباں سو زبانوں میں ہے

کاش مجھ پر بھی ہو جائیں روشن وہ راز
جن کا چرچا مرے رازدانوں میں ہے

ترجمانی ہی کا بول بالا رہا
آدمی آج تک بے زبانوں میں ہے

درد والے بھی سنتے ہیں بے درد بھی
کچھ عجب لطف غم کے فسانوں میں ہے

اقبال صفی پوری — سنگ میل۔کراچی

ہوئی کچھ اور مذاقِ جنوں کی رسوائی
ترے بغیر چمن میں بہار کیوں آئی؟

عجیب شے ہے تری گفتگو کی رعنائی
کہ جیسے دور کہیں بج رہی ہو شہنائی

جمالِ دوست سحر تھا، خیالِ دوست ہے شام
کہاں پہ آنکھ کھلی تھی کہاں پہ نیند آئی

جہانِ عشق میں وہ بھی مقام ہے کہ جہاں
خرد ہے صرف تماشا، جنوں تماشائی

ہزار لطف و کرم سے سمجھ میں آ نہ سکی
وہ بات جو تری اک بے رخی نے سمجھائی

ہم انتظار میں بیٹھے ہیں اب بھی اے اقبال
اس انجمن سے نظر لوٹ کر نہیں آئی

محشر بدایونی

جنگ۔ کراچی

حسبِ توفیق اے منصفانِ سخن، فن پرستوں کی توقیر کرتے رہو
یہ بھی کرتے رہیں فرضِ خامہ ادا تم بھی نام انکے تحریر کرتے رہو

باہر آوازۂ گُل ہے پابستگان زور ہی اور کیا ہے تمہارا یہاں
کچھ امنگوں کو نغمہ بناتے رہو کچھ خیالوں کو تصویر کرتے رہو

بات کچھ ایک دو دم کی یارو نہیں کوئے خنجر میں ان کا ٹھکانا ہیں یہیں
سر نہ دو ہدیۂ خون سر نذر دو کچھ تلافیٔ تقصیر کرتے رہو

زندگی یوں تو ہوگی اذیت سے طے ساتھیو جان لو یہ سفر کھیل ہے
لمحے لمحے کا بوجھ اپنے شانوں پہ لو رقص زنجیر زنجیر کرتے رہو

جن در و بام کے پے بہ پے عہد تم باندھتے تھے سو آج انکی راہیں کھلیں
ہوگئی رونشینوں سے خالی زمیں اب محل اُس پہ تعمیر کرتے رہو

وقت کے حادثے دیکھتے دیکھتے حسرتِ کشتگی میں یہاں مر گئے
کچھ بھی گذرے کسی پر تمہیں اس سے کیا تیز تم اپنی شمشیر کرتے رہو

رات محشر بچشم ہزار آرزو تم نے دیکھا تھا جو خواب یک شعلہ رو
رہگذر رہگذر انجمن انجمن اب تلاش اس کی تعبیر کرتے رہو

شمس زبیری

سیپ۔ کراچی

نشاطِ الم میں محو تھے ہم فریبِ کرم میں آ نہ سکے
بشوقِ ستم انہیں بھی تو ہم فسانۂ غم سنا نہ سکے

قریب ترے جو بیٹھ گئے وہ لوگ کہیں ٹھہر نہ سکے
جو تجھ سے نظر ملا کے گئے کسی کو نظر میں لا نہ سکے

شریک تو بزم میں تھے سبھی مگر تھے کچھ ایسے سہمے ہوئے
چراغ بجھا تو بڑھ کے ذرا چراغ کی لَو بڑھا نہ سکے

یہ دوری و قرب کچھ بھی نہیں ہے اہلِ گناہ و دل کیلئے
وہ لوگ ترے قریب رہے قریب ترے جو آ نہ سکے

سیاہیٔ شب مٹائیں گے کب کہاں گئے اب وہ اہلِ خبر
کہ شمعِ کہن بجھا تو گئے، چراغ نیا جلا نہ سکے

اختر ہوشیار پوری

کامران سرگودھا

سکونِ دل بھی ہیں آرامِ جاں بھی
وہ یادیں جن میں ہیں کچھ تلخیاں بھی

یہ آنکھیں جن کو ویراں دیکھتے ہو
انہی راہوں سے گذرے کارواں بھی

دلِ حسرت زدہ کی ، یادگاریں
چمن بھی ، لالہ و گل بھی خزاں بھی

محبت صرف غم ہی غم نہیں ہے
محبت میں ہیں کچھ سرمستیاں بھی

کبھی شعلہ ، کبھی شبنم ، کبھی پھول
یہ دردِ دل کہ ہے دردِ جہاں بھی!

دیارِ شب میں تجھ کو ڈھونڈتے ہیں
دلِ ناداں بھی عمرِ رائگاں بھی

مسافر ہی کہیں اختر نہ بیٹھے
تمہارے رستے میں کسی کا آستاں بھی

نظیر صدیقی

ہم قلم۔ کراچی

کسی دل میں میرے لئے پیار کیوں ہو
یہ ایثار ہے اور ایثار ، کیوں ہو
تباہی ہو جب آرزو کا مقدر
تو دِل اس تباہی سے ہشیار کیوں ہو
یہ خود دار ہونا ہی لایا خرابی ،
محبت میں انسان خود دار کیوں ہو
کوئی اپنے ہی غم سے خالی کہاں ہے
جہاں میں کوئی میرا غم خوار کیوں ہو؟
نہ پہلا سا ملنا ، نہ آنا نہ جانا ،
اَب اتنے بھی تم مجھ سے بیزار کیوں ہو
اسی کش مکش نے ڈبویا جہاں کو ،
انہیں جیت کیوں ہو ، مجھے ہار کیوں ہو
جفا پہ نہیں جب وہ دل ہی میں نادم
نظر سے ندامت کا اظہار کیوں ہو
اگر بخش دینے پہ تیار ہو تم — !
مجھے جرم سے اپنے انکار کیوں ہو

نقش کراچی

نقوش۔ لاہور

ساحر ہوشیارپوری

بیسویں صدی۔ دلّی

مظہر امام

لاکھ تقاضے، ایک جوانی
ہو کے رہی آخر نادانی

عالم عالم ان کا جلوہ
دل اپنا صحرا، ویرانی

کل تک جو بستے تھے دل میں
آج ہوئے ہیں دشمنِ جانی

پتھر ہیں اس دور کے انساں
کس کو سناؤں، رام کہانی

اُن سے مجھے اُمّیدِ کرم ہے
جو ہیں ظلم و جور کے بانی

تیری محبّت کا یہ چلن ہے
جیسے وقت کا بہتا پانی

کیسا دل، کیا اس کے ارماں
کیا بیوہ کیا اس کی جوانی!

عشق کی اِک خاموش نگاہی
حسن کی ساری شعلہ بیانی

فطرت کی مجبوری سمجھو
دل نے عقل کی بات نہ مانی

مانا حسن میں تو یکتا ہے
عشق میں میرا کون ہے ثانی

محفل پر ہے وجد کا عالم
ساحر، تیری سحر بیانی

ساتھ بہتے ہوئے دھارے کے نہیں بہہ سکتے
میر کے رنگ میں ہم شعر نہیں کہہ سکتے

دشتِ احساس کی زنجیر لیے پھرتے ہیں
ہم کسی شہر میں آزاد نہیں رہ سکتے

نبضِ ہستی میں ابھی تھوڑی دھمک باقی ہے
ہائے ہم لاش کو بھی لاش نہیں کہہ سکتے

جانتے ہم بھی ہیں کیا چیز ہیں احباب عزیز
لیکن افسوس سرِ عام نہیں کہہ سکتے

دورِ جمہور میں ہر اک کا برابر حق ہے،
ہم تری بزم میں تا دیر نہیں رہ سکتے

کیا گلستاں کو نکھاریں گے نقیبانِ بہار
اپنے کمرے میں سلیقے سے نہیں رہ سکتے

شان سے چھاپتے ہیں جن کو مدیرانِ شہیر
کاش ہم ایک بھی ویسی غزل کہہ سکتے

فارغ بخاری — منشور۔ کراچی

طلوع

کہیں چھٹا ہے غبارِ ظلمت، شبِ الم مختصر ہوئی ہے
کسی جگہ پَو پھٹی ہے شاید، کہیں تو دیکھو سحر ہوئی ہے
کہیں تو ٹوٹے حصارِ زنداں، کہیں قفس میں شگاف آیا
کہیں تو دیوانگی اسیروں کی کچھ نہ کچھ کارگر ہوئی ہے
کہیں تو فتح و ظفر نے خود بڑھ کے اہلِ ہمت کے پاؤں چومے
کہیں تو اہلِ نظر کے قدموں سے آشنا رہ گزر ہوئی ہے
کہیں تو چھوٹے خزاں گزیدہ چمن میں کچھ قافلے گلوں کے
کہیں تو اُجڑے ہوئے دیاروں کو فصلِ گل کی خبر ہوئی ہے
کہیں وفاؤں کے اسمِ اعظم نے سرکشی کا طلسم توڑا،
کہیں تو آئینۂ محبت میں وہ پری جلوہ گر ہوئی ہے
کہیں تو چلمن ہٹی ہے آخر، کہیں تو رُخ سے نقاب اُٹھا
کہیں تو حسنِ جمال آرا سے زینتِ بام و دَر ہوئی ہے
کہیں تو فرقت کی رات بیتی، کہیں تو صبحِ وصال آئی!
کہیں تو آنسو بنا ہے تارا، کہیں تو شبنم گہر ہوئی ہے

بمل کرشن اشک — ادبِ لطیف۔ لاہور

نظم

یہ کسے معلوم ہے
آرزو کے جنگلوں میں کیا ملے گا
کون سا وہ پیڑ ہے جو سوکھ کر گر جائے گا
کون سا غنچہ کھلے گا
اس لئے ہر شاخ کو ہر برگ کو دل میں چھپائے
اور سینے سے لگائے پھر رہے ہیں
دیکھتے ہیں ایک اک کر کے شجر سب گر رہے ہیں
پھر بھی ہر پودے کو اپنے آنسوؤں سے سینچتے ہیں
پتیوں کو رقص میں لانے کی خاطر
سرد آہیں کھینچتے ہیں
آرزو کے جنگلوں میں گھومتے ہیں
اور سلگتے ہونٹ سے کانٹوں کی نوکیں چومتے ہیں
ایک دن تو بور آئے گا کہیں
پھول آئے گا کہیں
ایک دن تو......
کون سے دن؟...... یہ کسے معلوم ہے۔

ظہور نظر — نقوش۔ لاہور — منیر نیازی — ادبِ لطیف لاہور

دوراہا

اے غمِ آوارہ و تشنہ سنو!
اے دلِ واماندہ و تنہا سنو!!
اک طرف ہے مضطرب خوابوں کا بحرِ نیلگوں
ہمہماتا، کھولتا، انگڑائیاں لیتا ہوا
اِک طرف ہے پرتوِ عمرِ گریزاں کا فسوں
زندگی کی بے ثباتی کو صدا دیتا ہوا
اس سے پہلے تو کبھی دیکھا نہ تھا
ایسا منظر ایسا امکانِ وجود
ڈر رہا ہوں تندبادِ رفتگاں
پار کر جائے نہ فردا کی حدود
اے غمِ آوارہ و تشنہ کہو!
کس طرف جاؤں کدھر کا رخ کروں؟
رنگ کس کا کس طرح تصویرِ فردا میں بھروں؟؟
دسترس میں میری دونوں ہی نہیں
مضطرب خوابوں کا بحرِ نیلگوں بھی بے کنار!
پرتوِ عمرِ گریزاں کے فسوں بھی بے شمار!!
اے دلِ واماندہ و تنہا کہو!
اشک آنکھوں میں نہ گر آئیں تو روؤں کس طرح؟
جاگتی سوچوں کے ہنگامے میں سوؤں کس طرح؟؟

تصویروں کا باطن

اِک موسم میں سارے شجر بنجر بنجر سے لگتے ہیں
پھر بھی اندر تیرا سا ہے اُن کا یُوں اوپر سے لگتے ہیں
جیسے اچانک کبھی کھنڈر آباد نگر سے لگتے ہیں
دل ہیبت سے بھرے ہوئے اور چہرے اُنکے خالی ہیں
جو کچھ ہے باطن میں ہے اور ظاہر جن کے خالی ہیں
آنکھ جمی ہے ان چہروں پر سارے عہد کے لوگوں کی
جیسے انہی کے پاس دوا ہے اُنکے سارے روگوں کی

باقر مہدی — دورِ حیات۔ بمبئی

اِتنا چاہا تھا ۔۔۔۔ !

اتنا چاہا تھا کہ ہر خواہش غم کی خاطر
راکھ چنگاری بنے، شعلہ بنے، درد بنے،
زندگی فکرِ مہ وسال سے آزاد رہے
وَلولے اتنے ہوں سرکش کہ خیالات کا لاوا برسے!
یہ تصور نہ رہے کل کے لئے جینا ہے،
اور پھر سلسلہ سود و زیاں کے حلقے
ٹوٹ کر راہ میں یوں تڑپیں کہ جیسے کتنے
خواب ریزہ ہوئے۔ (یادوں کی خلش چھوڑ گئے)

میں نے سوچا تھا جہنم ہی میں رہنا ہے اگر
کیوں نہ گمراہ رہوں اور ہر اک منزل پہ
دل پکارے کہ کوئی اپنا ۔۔ کوئی اپنا ہے!
دوست یا دشمنِ جاں آجائے،
صرف میں اتنا کہوں ۔۔۔ !
"توڑ دو خوف کی زنجیروں کو
اور کوئی بھی سہارا نہ رہے
اس جہنم میں یہی کافی ہے ہم سرکش ہیں!"
مگر ایسا نہ ہوا،
دوست یا دشمنِ جاں
خود فریبی کے طلسمات میں اتنے ہیں اسیر،
اپنے جینے کا صلہ مانگتے ہیں!
آج تک سلسلۂ سود و زیاں باقی ہے !! ۔۔

شاذ تمکنت — سیپ۔ کراچی

المیہ

ذرا سی آرزوئے وصل باقی ہے بہت سمجھو
کہ سانسوں کو غنیمت، زندگی کو مصلحت سمجھو

تمہیں بھولا ہوا ہوں اور زندہ ہوں یہ مت سمجھو
یہاں یہ حال ہے بس خیریت ہی خیریت سمجھو

نہ چاہو بھی تو یہ دنیا ہے خوش رہنا ہی پڑتا ہے
شریکِ زندگی سے جھوٹ سچ کہنا ہی پڑتا ہے

عبدالمجیب سہالوی

نیا دور، لکھنؤ

تعزیت

ہمارا خیال ہے کہ مرنے سے زیادہ مرنے والے کی تعزیت مشکل ہے۔ کیونکہ موت تو بن بلائے ہنستی ہوئی خود گھر پر آجاتی ہے اور تعزیت کے لئے منہ لٹکائے ہوئے دوسرے کے گھر جانا پڑتا ہے اور جانا ہی نہیں بلکہ مرحوم کی "بے وقت موت" کو چاہے وہ نوے برس کی عمر ہی میں کیوں نہ ہوئی ہو، ایک "ناقابل تلافی نقصان" ثابت کرتے ہوئے ان کی فرضی خوبیوں کی فہرست اس تفصیل کے ساتھ گنانا ہوتی ہے کہ اگر مرحوم سن پائیں تو خود انہیں ہنسی آجائے اور انہیں اپنی موت پر رشک آنے لگے اس لئے کہ زندگی میں کسی کو کبھی ان کے حق میں ایک کلمۂ خیر کہنے کی توفیق نہ ہوئی اور موت کی بدولت آج انہیں تعزیت کرنے والوں کے منہ سے ایسے مدحیہ قصیدے سننے کو مل رہے ہیں کہ کیا کسی بادشاہ کو زندگی میں درباری شاعروں سے سننے کو ملے ہوں گے۔

تعزیت پرخلوص بھی ہوتی ہے اور رسمی بھی۔ مگر وہ چاہے رسمی ہو چاہے مخلصانہ دونوں مشکل ہیں۔ کیونکہ اگر مرنے والے سے آپ کو خلوص تھا تو آپ کی حالت خود تعزیت کے لائق ہوگی۔ اور ایسی حالت میں آپ تعزیت کرنے جائیں گے تو آپ مرحوم کے پس ماندگان کو تسلی دینے کے بجائے خود رونے لگیں گے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے ؎

تسلی میں بھی تخمِ غم بو دیئے　　　وہ سمجھاتے سمجھاتے خود رو دیئے

اور اگر آپ رسمی طور پر اس خیال سے تعزیت کے لئے نکلے ہیں کہ

کیا خوب سودا نقد ہے اِس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے

آج آپ جن کی تعزیت کے لئے جا رہے ہیں۔ کل ان کے لڑکے آپ کی تعزیت کے لئے آئیں گے یا یہ کہ مرحوم آپ کے کسی بزرگ کی موت پر آپ کے گھر تعزیت کے لئے آئے تھے تو ایسی صورت میں تعزیت کا کام مشکل سے مشکل تر ہو جاتا ہے۔ کیونکہ آپ دراصل تعزیت کرنے نہیں بلکہ اس تعزیتی قرض کو ادا کرنے جاتے ہیں جو آپ پر واجب الادا تھا۔ اور آپ جانتے ہیں کہ قرض کی ادائیگی کوئی آسان کام نہیں۔ خصوصیت کے ساتھ وہ قرض جو ترکے میں ملا ہو۔ اور پھر اس قرض کا کیا کہنا جو روپوں پیسوں کا نہیں، آنسوؤں غموں کا ہو۔ پیسے کا قرض تو ایک سے اُدھار لے کر دوسرے کو ادا کیا جا سکتا ہے۔ لیکن آنسو نہ اُدھار لئے جا سکتے ہیں نہ دیئے جا سکتے ہیں۔ اُن کے لئے تو ایکٹروں یا گویوں کی طرح ریاض کرنا ہوتا ہے، اسی لئے تعزیت ایک فن ہو گیا ہے اور ظاہر ہے کہ کسی فن کے حصول میں کتنے پاپڑ بیلنا پڑتے ہیں۔ خدا نظرِ بد سے بچائے، اگر آپ شاعر ہیں تو ایک اور مثال پیش کر دوں۔ شاعر ہونے کی وجہ سے آپ جانتے ہی ہیں کہ سیروں خون تھوکنا پڑتا ہے تب جا کے شعر برآمد ہوتا ہے۔ بس یہی حال تعزیت کا ہے۔

گڑے مردے اکھاڑنے پڑتے ہیں۔ اپنے باپ دادا کی موت یاد کرکے آنسو اکٹھا کرنے پڑتے ہیں اور پھر جب یہ سارے درد و غم جمع ہو جاتے ہیں تب کہیں جاکے تعزیت کا قرض ادا ہو پاتا ہے۔

قرض کے ذکر پر یاد آگیا کہ تعزیت کرنے کی طرح قرض مانگنا بھی بڑے سخن کار کا کام ہے۔ قرض اور تعزیت دونوں کے لئے منہ لٹکانا ضروری ہوتا ہے لیکن فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ قرض کے لئے گھر سے نکلتے وقت منہ خود بخود لٹکا ہوتا ہے اور تعزیت کے لئے مرنے والے کے گھر پہنچ کر منہ لٹکانا پڑتا ہے۔ منہ کے خود لٹکے ہونے اور ارادتاً لٹکانے میں جو نازک فرق ہے۔ اسے صرف حالات سے مجبور ہوکر قرض مانگنے والے کا ہی دل محسوس کر سکتا ہے، رسمی تعزیت کرنے والے کبھی محسوس نہیں کر سکتے۔ جہاں تک ہماری ذات کا تعلق ہے قرض کی مصیبت بار بار برداشت کرنے کی وجہ سے ہمیں یہ فائدہ ضرور ہوا کہ ہمارے لئے تعزیت کی مشکل اس حد تک ضرور آسان ہوگئی ہے کہ ہمیں مرنے والے کے گھر پہنچ کر زبردستی رونا سا منہ نہیں بنانا پڑتا۔ بلکہ ہماری صورت ہی اب روہانسی ہوگئی ہے۔ البتہ اگر کسی جگہ خلوص کی بنا پر زیادہ رقت طاری کرنے کی ضرورت ہوئی تو ہم تعزیت کے وقت قرض کی ادائیگی کا بھی تصور کر لیتے ہیں۔ اس طرح فاقہ مستی کے رنگ لانے کے خوف سے ہمارا چہرہ خاصا سوگوار ہو جاتا ہے اور مرنے والے کے پسماندگان کے دلوں پر ہمارے خلوص کا کافی اثر پڑتا ہے۔ حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ اس میں خلوص و ہمدردی سے زیادہ ہمارے حالات کو دخل ہے۔ جنہوں نے ہمیں بغیر کسی خاص کوشش کے تعزیت جیسے مشکل فن میں اُن پیشہ ور تعزیت مندوں سے کہیں زیادہ کامیاب بنا دیا ہے۔ جو اس تاک ہی میں بیٹھے رہتے ہیں کہ کوئی اللہ کو پیارا ہو اور وہ اپنے فن کے مظاہرے کے لئے پہنچ جائیں۔

آپ کہئے گا کہ یہ پیشہ ور تعزیت مند کیسے ہوتے ہیں۔ میرے خیال میں پیشہ ور تعزیت مند وہ ہیں جو ایک خاص بندھے ٹکے انداز میں تعزیتی تقریر کرتے ہیں اور اس تقریر کے دوران جگہ جگہ شعر بھی پڑھتے جاتے ہیں، مثلاً

حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

ایک پیشہ ور تعزیت مند، پرسے میں پہنچتا ہے اور پہنچتے ہی زندگی کی بے ثباتی کا ذکر کرتا ہے کہ مشیت ایزدی میں کیا چارہ ہے ؎

موت سے کس کو رستگاری ہے　　　آج وہ کل ہماری باری ہے

آدمی پانی کا بلبلہ ہے۔ ایک دم کا ٹھکانا نہیں۔ پھر آہ سرد بھرتے ہوئے شعر پڑھتا ہے ؎

ہستی اپنی حباب کی سی ہے　　　یہ نمائش سراب کی سی ہے

بھیا صبر کرو، جس کی امانت تھی اس نے لے لی۔ اپنا یہاں کیا ہے جس پر بھروسہ کیا جائے۔ سامان سو برس کے ہیں کل کی خبر نہیں۔ ہم کو بھی ایک دن اسی راہ پر جانا ہے۔ ہر ایک پر یہ دن آنے والا ہے۔ ع

بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

صبر کرو، صبر کے سوا چارہ کیا ہے۔

مجھے دیکھو۔ پانچ کو قبرستان پہنچا چکا ہوں۔ لیکن مجھ کمبخت کو موت نہیں آئی۔ آہ مگر موت مانگنے سے کب آتی ہے۔ اگر مانگے ملتی تو میں کب کا مر چکا ہوتا اور آج اپنے فضلو بھائی کے پرسے کے لئے نہ آنا پڑتا۔ کیا کہوں مرحوم کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر رہی ہے۔ کیا ہنس مکھ آدمی تھے۔ بڑی سے بڑی مصیبت پڑے چہرے پر شکن نہ آتی تھی۔ پر دوسروں کی مصیبت نہ دیکھ سکتے تھے۔ مجن کی موت پر تعزیت کے لئے گئے۔ مگر مجھے تسلی دینے کے بجائے خود پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ لوگ پکڑ نہ لیتے تو پچھاڑ کھا کر گر پڑتے۔ خدا مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے۔ آدمی کیا تھے فرشتہ تھے۔ کیا اخلاق تھا مرحوم کا۔ منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ کبھی کسی کو کڑی بات نہ کہی۔ صوم و صلوٰۃ کے ایسے پابند کہ ایک وقت کی نماز قضا نہ ہوئی۔ حالانکہ مرحوم کو عید بقر عید کے علاوہ کسی نے مسجد کی طرف جاتے بھی نہیں دیکھا، چہرے پر نور برستا تھا۔ ہائے! آپ کو کیا صبر دلاؤں خود اپنا کلیجہ پھٹا جاتا ہے۔ دل کو یقین نہیں آتا کہ وہ ہم سے جدا ہوگئے۔ ایک وضعدار

ملاقات نہ ہوتی تو چین نہ پڑتا۔ یہ مستقل جدائی کیونکر برداشت ہوگی۔ مگر رونے سے کیا ہوگا۔ آنسوؤں سے غم نہلنے سے رہا۔ صبر کرنا چاہیے۔ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ اپنے کو سنبھالئے! روئیے نہیں۔ رونے سے مرحوم کی روح کو رنج ہوگا۔ صبر کیجئے۔ دونوں وقت ملتے ہیں۔ مرنے والا تو گیا اب وہ لوٹ کر آنے والا نہیں!"

مگر اب تعزیت زیادہ مشکل نہیں رہی اس لئے کہ فن تعزیت کے فن کاروں نے جیسا کہ آپ نے ابھی دیکھا اچھا خاصا تعزیتی لٹریچر رسمی تعزیت کرنے والوں کی آسانی اور سوگواروں کی پریشانی کے لئے فراہم کر دیا ہے جس میں مرحوم کی بے وقت موت کو ناقابل تلافی نقصان قرار دینے سے لے کر مرحوم کے جوار رحمت میں جگہ پانے کی توقع تک تمام مراحل کے لئے ڈھلے ڈھلائے جملے موجود ہیں۔ بس اب تعزیت کرنے والے کا کام صرف منہ بنا کر اور موقع بے موقع آہ سرد بھر کر انہیں جملوں کو بے دھڑک دہرا دینا ہے

کلاکار نہیں تعزیت کار اپنے فن کی کامیابی اسی میں خیال کرتے ہیں کہ مرے پہ سو دُرّے کے بطور غم نصیب پسماندگان کے سامنے مرنے والے کی پیدائش سے لے کر آخری ہچکی تک تمام واقعات پوری تفصیل کے ساتھ بار بار ایسے رقت آمیز لہجے میں دہرائیں کہ پسماندگان کے زخموں کو مندمل ہونے اور آنسوؤں کو خشک ہونے کا بالکل موقع نہ ملے۔ اور دنیا کی بے ثباتی کا وہ نقشہ کھینچیں کہ اُن کے دل میں صبر کا حوصلہ پیدا ہونے کے بجائے خودکشی کا جذبہ پیدا ہو جائے یا کم سے کم وہ شدت غم سے بے قابو ہو کر سر پھوڑنے اور کنوئیں میں پھاندنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ چنانچہ کبھی کبھی تو بوڑھی بیوہ عورتوں کو کسی نوجوان بیوہ کی تعزیت کرتے وقت اس قسم کی تلقین کرتے بھی سنا گیا ہے۔ "رنڈاپے کی زندگی سے تو موت بہتر ہے۔ کوئی میرے دل سے پوچھے کہ میں نے بیوگی کے یہ بتیس سال کیسے کاٹے ہیں۔ میرا بس چلتا تو میں بھی کچھ کھا کر مرحوم کے ساتھ مٹی میں مل جاتی۔" گویا ان بیوہ ان بڑی بی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ نوجوان بیوہ کے لئے اب کوئی چارۂ کار نہیں، سوائے اس کے کہ وہ زہر کی پڑیا منگا کر اپنی زندگی سے چھٹکارا حاصل کرے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان بوڑھی بیواؤں کا کام صرف نوجوان بیواؤں کو اپنی غلطی سے آگاہ کر کے انہیں خودکشی کے لئے آمادہ کرنا رہ گیا ہے

ایک مرتبہ میرے ایک قریبی دوست کے بچہ کا انتقال ہو گیا۔ پلوٹھی کا لڑکا تھا۔ ماں باپ دونوں کی آنکھ کا تارا۔ اس کے مرنے کا دونوں کو قدرتاً بڑا قلق ہوا۔ میں دورے پر گیا ہوا تھا۔ چار روز بعد جب واپس آیا تو بیگم سے اس سانحہ کی اطلاع ملی۔ سامان گھر پر ڈالا، سیدھا دوست کے گھر روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچا تو دیکھا کہ ان کی روانگی کا انتظام ہے۔ کچھ سامان باہر رکھا ہے۔ اور ایک تانگہ بھی کھڑا ہے۔ بہرحال میں نے آواز دی تو انہیں جھنجھلا کر زور سے یہ کہتے سنا کہ کہہ دو گھر پر نہیں ہیں۔

بات سن رہا تھا پہلے تو میں یہ سب سن کر سوچنے لگا کہ اب کیا کروں مگر پھر زور سے پکارا کہ "بھائی میں ہوں سعید!" یہ سنتے ہی وہ ڈیوڑھی میں آ گئے اور لپٹ کر رونے لگے۔ میرا بھی دل بھر آیا۔ مگر زبان سے تسلی اور تعزیت کے الفاظ نکلنے نہیں پائے تھے کہ دل نے بے ساختہ یہ آواز دی۔ ع

جس سے بڑھے بے تابی دل کی ایسی تسلی رہنے دے

زبان نے دل کے مشورے کو فوراً مان لیا کیونکہ اسے بارہا تجربہ ہو چکا تھا کہ نازک جذبات کی ترجمانی اس نے ہمیشہ خاموش رہ کر زیادہ اچھے طریقہ پر کی ہے ہم دونوں تھوڑی دیر تک خاموش رہے۔ اس کے بعد میں نے بچہ کی بیماری اور موت کے متعلق کچھ پوچھنے کے بجائے ان کی روانگی کا سبب دریافت کرنا زیادہ مناسب خیال کیا۔ انہوں نے کہا کہ بچہ کی جدائی سے ہم دونوں کے دلوں پر جو گذری ہے۔ اس کے متعلق کچھ کہنا ہی بے کار ہے۔ لیکن ماں کی بری حالت ہے۔ چار دن ہو گئے ہیں۔ طرح طرح سے بہلانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ لیکن تعزیت کرنے والوں نے میری اور خاص طور پر میری بیوی کی زندگی تلخ کر دی ہے۔ میری ہزار کوشش کے باوجود ان ظالموں نے ایک منٹ کے لئے غم بھلانے کی فرصت نہ دی۔ اور جب میں نے محسوس کیا کہ تعزیت کرنے والی بیویاں رُلا رُلا کر بچہ کے ساتھ میری بیوی کو بھی قبرستان پہنچائے بغیر دم نہیں لیں گی۔ تو میں نے فیصلہ کر لیا کہ تھوڑے دنوں کے لئے یہاں سے ہٹ جاؤں۔ چنانچہ ہم لوگ دو ہفتے کے لئے پہاڑ پر جا رہے ہیں تاکہ ہمارے دکھے دل نادان تعزیت کرنے والوں کی بے داد سے بچ سکیں۔ اور زخموں کو مندمل ہونے کا موقع مل سکے۔ ابھی وہ یہ جملہ پورا

بھی نہ کر پائے تھے کہ میں نے دیکھا کہ ایک رکشا سڑک سے ان کے گھر کی طرف مڑ رہا ہے اور اس پر ایک برقعہ پوش خاتون بیٹھی ہیں۔ مجھے فوراً موقعہ کی نزاکت کا احساس ہوا اور میں نے دوڑ کر رکشے والے سے پوچھا "کس کے یہاں جانا ہے"۔ اس کے جواب میں برقعہ پوش خاتون نے بھرائی ہوئی آواز میں میرے دوست کا نام لیا۔ میرا ماتھا ٹھنکا اور میں نے خیال کیا کہ اگر اس وقت یہ خاتون تعزیت کے لئے وہاں گئیں تو کہیں انہیں گھر واپس ہونے کے بجائے اسپتال نہ جانا پڑے۔ اس لئے میں نے منہ سکھا کر کہا کہ میں انہی کے گھر سے لوٹ رہا ہوں۔ ان کی بیوی کی حالت زیادہ خراب ہو گئی تھی۔ اس لئے میرے دوست انہیں لے کر ان کے میکے چلے گئے ہیں اور غالباً ایک ماہ بعد واپس آئیں۔ اس پر انہوں نے ایک آہ سرد بھر کر کہا کہ ہاں بیٹا! مصیبت ایک طرف سے نہیں آتی۔ میں نے جلدی سے کہا جی ہاں! دیکھئے نا چاروں طرف سے چلی آرہی ہے۔ اس کے بعد وہ دل میں تعزیت کی تمنا لئے اپنے گھر واپس گئیں۔

فرصت کے لمحات کا بہترین ساتھی

ماہنامہ **نقش** کراچی

نقش آپکو اردو ادب کی رفتار سے آشنا رکھتا ہے۔
نقش ہر ماہ پاک و ہند کے معیاری رسائل سے منتخب افسانے
غزلیں، نظمیں، طنزیے اور مضامین پیش کرتا ہے
نقش کو پاک و ہند کے ادبی رسائل اور تمام ادیبوں کا تعاون
حاصل ہے۔
نقش کا ہر شمارہ خاص نمبر کی اہمیت رکھتا ہے
نقش ادب کی خدمت کرتا ہے آپ نقش کی سرپرستی کیجئے
نقش خریدیئے۔ نقش میں اشتہار دیجئے۔

گھر کے ہر فرد کے لئے

دنیا بھر کی معلومات
اور
دلچسپیوں کا مرقع

عالمی ڈائجسٹ

قیمت ایک روپیہ پچیس پیسے

ماہنامہ عالمی ڈائجسٹ "انشا"
گارڈن ایسٹ کراچی ۳

نقش کراچی

محمد خالد اختر

فنون۔ لاہور

سعادت حسن منٹو

آزاد مشرب، مضطرب منٹو۔ ایک اور واحد منٹو کی موت سے اردو ادب کی دنیا پر ایک ایسی گھٹا ٹوپ افسردگی کا بادل چھا گیا ہے جس کی مثال ہماری پوری یادوں میں مشکل سے ملے گی۔ ادب پیدا کرنے والے پہلے بھی گذرتے رہے ہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کسی کی موت سے بھی ہم نے اپنے کو اس درجہ غریب اور کم مایہ نہیں محسوس کیا جس قدر اس بوہیمین مصنف کی موت سے۔ نثر کا عظیم نگار ہم میں سے اٹھ گیا ہے اور اس کے بغیر فن اور انسانیت کی محفل سونی اور ویران ہو گئی ہے۔ ویسے تو یہ نقصان ساری انسانیت اور ساری ادبی دنیا کا نقصان ہے مگر ہم میں سے کتنوں کے لئے، جو اُسے محض اس کے افسانوں کے ذریعے جانتے تھے، یہ ایک نہایت شدید ذاتی نقصان ہے۔ اتنا ذاتی جتنا ایک بے حد پیارے عزیز دوست کا گذر جانا۔ اب بوہیمیا کے پُر تعمیر کوچوں میں روشنیاں ماند پڑ گئی ہیں، اور دنیا کو کھونے والے اور اس کے رواجوں کی جکڑ بندیوں سے آزاد بوہیمیا کے باسی اپنے استاد، اپنے بادشاہ سے محروم ہو گئے ہیں۔ تاہم یہ اقرار کرنا پڑے گا کہ یہ سوگ صرف بوہیمیا والوں کا سوگ نہیں۔ انسان سے محبت کرنے والے جھوٹ اور ریاکاری سے نفرت کرنے والے، اردو نثر کے عاشق، سب آج اس بچھڑ جانے والے مصنف کے لئے روتے ہیں۔ اس کے حرف گیر، اس کی ادبی عظمت کے منکر، اس کی ذات پر اوچھے وار کرنے والے، اس کی زندگی میں بڑے مصروف رہے۔ انہوں نے اس کے فن کو بڑھئی کی کاریگری سے تشبیہ دے کر اس کا مذاق اڑایا۔ وہ بے چارے اس سے آگاہ نہ تھے کہ اس طرح دراصل وہ اس فن کی عظمت کا اعتراف کر رہے تھے۔ اگر اس کا فن واقعی کاری گری تھا اگر واقعی یہ اتنا ہی آسان تھا تو وہ خود کوشش بسیار کے باوجود اس جیسی ایک بھی کہانی کیوں نہ لکھ سکے۔ انہوں نے اسے فحش نگار کہا اور ایک بہادر، رگمذر ماندہ روزگار مصنف کی عجیب وارفتہ مزاج زندگی کو دنیاوی عزت داری کی عینک سے دیکھ کر ناک بھوں چڑھائی ہے۔ وہ خود چاہے نیکی کے پتلے ہوں مگر انہیں اس انسان کی عظمت کا کیا اندازہ ہو سکتا تھا۔ یہ لوگ اس کی زندگی میں مصروف رہے۔ چپکے سے۔ سرگوشیوں میں انہوں نے گلیور ز ٹریولز کے جانشینوں کی طرح دیو کے پاؤں سے زمین کھود کر اُسے گرانے کی کوشش کی کہ زندگی میں وہ اس سے ڈرتے تھے۔ اب وہ بھی اس کی موت کے سانحے سے سن ہو گئے ہیں۔ شاید انہوں نے اس مرے ہوئے "آوارہ مزاج" کی کمزوریاں اور کوتاہیوں کو اب معاف کر دیا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی اپنے گریبانوں میں جھانک کر اس برائی، اس کمینگی کی ایک جھلک دیکھ لی ہے جو ان کے دلوں میں چھپی بیٹھی ہے۔ ان میں شاید اب ایسا کوئی نہیں جسے اس کی موت سے تھوڑا بہت صدمہ نہ پہونچا ہو گا انہیں بھی غالباً احساس ہوا ہے کہ یہ موت کوئی معمولی موت نہ تھی اور یہ کہ اس کی موت سے ہمارے ادب میں ایک ایسا خلا پیدا ہو چکا ہے جو آسانی سے پر نہیں ہو سکا۔ ہمارے پاس یقیناً اب بھی الفاظ کی رنگین مصوری کرنے والے، رومانیت اور شعریت کے دیئے جلانے والے مصنف موجود ہیں۔ لیکن مختصر افسانہ نگار کا استاد ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا ہے۔ وہ اب پھر نہیں آئے گا، اردو ادب ــــ بلکہ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ دنیا کا ادب ــــ اس کے جانے

صحیح معنوں میں مفلس ہوگیا ہے۔ وہ موپاساں اور چیخوف کی صف میں تھا۔ وہ ان کا ہمسر تھا، شاید بلحاظ فن ان سے بھی قد آور تھا۔ وہ اپنی مختصر زندگی میں ہمارے ادبی منظر پر ایک دیپک کی طرح چھایا ہوا تھا۔ سچے موتیوں کی سی پاک نثر میں وہ اپنے افسانوں سے ہمارے سوئے ہوئے ضمیروں کو جھنجھوڑ کے دیتا تھا۔ ہماری خود طمانیت، اور مصلحت کوشی میں احساس کی سوئیاں چبھوتا تھا۔ اور بار بار ہمیں ایک ایسا مکمل صاف شفاف آئینہ دکھاتا تھا جس میں ہم اپنے اصل روپ کا عکس دیکھنے سے نہ بچ سکتے تھے۔ وہ ہمیں سوچنے اور ایک بہتر انسان بننے پر مجبور کرتا تھا۔ اور جب میں ایک بہتر انسان کہتا ہوں تو میری مراد آپ کے سلجھے ہوئے کفایت شعار مصلحت اندیش انسان سے نہیں ہے جو محض اپنی خود غرضی کو اپنی سوجھ بوجھ کا نام دیتا ہے، اور جس کے سامنے اپنی اور اپنی اولاد کی بہتری اور ترقی کے سوا اور کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ ہمارے ادب میں تشریح نیکی اور مصلحت اندیشی کی تعلیم اور ہدایت ایک سے زیادہ معنوں نے دینے کی کوشش کی ہے۔ اس آشرم کا بڑا پروہت ہمارے ہاں ڈپٹی نذیر احمد ہے جس کے ناول ہمیں یہ تعلیم دیتے ہیں کہ ہم نذیر احمد جیسے بن جائیں۔ دنیاوی لحاظ سے عزت دار، صوم وصلوٰۃ کے پابند، کفایت شعار اور گاٹھ کے پورے۔ منٹو کے "بہتر انسان" میں ان اوصاف میں سے کوئی چیز بھی نہیں۔ مگر انسانیت کی اصل روح اس میں موجود ہے، وہ ایک ایسا انسان ہے جس کا نام لینا مشہ دیکھنا بھی آج کے ڈپٹی نذیر احمد گوارہ نہ کریں گے۔ اور اپنے بچوں کو اس کے پاس بٹھانا گناہ سمجھیں گے۔ منٹو کا "بہتر انسان" اشرف میں سے نہیں۔ آپ اسے نہ مسجد میں پائیں گے، اور نہ ہی غالباً کلب ہاؤس میں۔ آپ اسے زندگی کی سڑک پر رواں دواں پائیں گے، اپنے ہم جنسوں سے محبت کرتا ہوا، اپنی زندگی کے خزانے کو ایک کنجوس کی طرح سینے سے لگائے رکھنے کی بجائے ایک سخی کی طرح لٹاتا ہوا۔ سعادت حسن منٹو کسی "ازم" کا مبلغ نہ تھا۔ اس نے اپنے بے مثل فن کو کسی پرانے زمانے، ضابطۂ اخلاق کے تابع کر کے اسے بے جان اور جھوٹا نہیں بنایا تھا اور اگر اس کا کوئی ازم تھا۔ کوئی ضابطہ اور کوئی مسلک حیات تھا جسے وہ شدت سے اپنائے ہوئے تھا، تو یہ مسلک تھا۔ انسانیت سے محبت کا مسلک، اور اس سے بڑا مسلک اور ہو بھی کیا سکتا ہے؟ ایسے آدمی کی موت کتنا بڑا نقصان ہے۔ خاص طور پر اس لئے کہ وہ ایک بڑا فن کار بھی تھا۔ ہمارا نقصان اس لئے بھی ناقابل تلافی ہے کہ منٹو ابھی اپنے فن کی معراج تک نہیں پہونچا تھا مجھے یقین ہے کہ بڑے اور عظیم تر شاہکاروں کو ابھی اس کے قلم سے نکلنا تھا۔ اس کا ذہن شیکسپیئر کے ذہن کی طرح زرخیز تھا۔ لاتعداد کرداروں کی جنہیں اس میں زندگی سے روشناس ہونے کے لئے تڑپ رہی تھیں اور یہ مکمل اور حساس فن کار ہمیشہ اور ہر لمحہ اپنے فن میں تکمیل کے لئے کوشاں تھا۔

جو کچھ اس نے ہمارے ادب کو دیا ہے وہ عظیم اور انمٹ ہے۔ ان لازوال چیزوں میں سے جو ایک بار عالم وجود میں آجانے کے بعد زندہ رہتی ہیں۔ اس کے لئے شاہکار لکھنا ایک ایسا ہی معمول تھا۔ جیسا اس کے کئی ہم عصر افسانہ نگاروں کے لئے بے جان اور پھس پھسے افسانے قلم بند کرنا، اس کی چیزیں زندہ رہیں گی۔ لیکن جیسے اب ہم جیتے جی یاد کرتے رہیں گے۔ جس کا اب ہم سدا سوگ منائیں گے۔ وہ انسان سعادت ہے۔ کیسا خوبصورت انسان تھا وہ؟ وہ ساری انسانیت سے بھائیوں کی طرح محبت کرتا تھا۔ وہ دوسروں کے لئے جان دے سکتا تھا۔ خود وہ ایک لحظے کے لئے بھی الجھنوں اور دکھوں سے آزاد نہ ہوگا ہم سب جانتے ہیں اُسے کس چیز نے مارا۔ مگر نہیں اس کی قاتل شراب نہ تھی "کوئی تنگی سی تنگی ہے۔ کوئی ترشی سی ترشی ہے"۔ اس نے ایک دفعہ چچا سام کے نام ایک خط میں شکایت کی اور وہ تنگی و ترشی اس کی زندگی میں ایک زندہ ہولناک حقیقت تھی۔ ہم سب جانتے ہیں اُسے بچایا جا سکتا تھا۔ لیکن جب وہ مر رہا تھا خودکشی کر رہا تھا تو ہم اس کے افسانے پڑھنے اور ان پر تنقیدیں کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ اس کو بچانے کے لئے ہم نے ایک انگلی تک نہ ہلائی۔ ڈپٹی نذیر احمد ہمارے رگ و ریشے سے کبھی گئے نہ تھے۔ ہمارے دل منٹو کے دل کی طرح بڑے اور فراخ نہ تھے کہ ساری دنیا کو محبت کے بازوؤں میں سمیٹ لیتے۔ وہ شخص سب انسانوں سے پیار کرتا تھا۔ اس سے کسی کو اس "دو اور دو چار" کی دنیا میں پیار نہ تھا اور ہماری آنکھوں کے سامنے وہ "تنگی اور ترشی" کی نذر ہو گیا۔ تنگی اور ترشی جو اس کے بھائیوں اور ہم جنسوں کی کمینگی اور حسد کے پن کے سوا اور کچھ نہ تھی۔ ہم میں سے کتنے ہی اب جب منٹو کے بارے میں سوچتے ہیں، اپنے کو مجرم محسوس کرتے ہیں۔ منٹو کو خود منٹو نے ایک تدریجی خودکشی کے عمل سے مارا، تاہم ہم اس کی موت کی ذمہ داری سے خود کو مطمئن ضمیر کے ساتھ بری نہیں کر سکتے۔

"انسان سعادت" جیسا میں اسے جانتا تھا

میں ۱۹۵۱ء کے گرما میں چند دنوں کے لئے لاہور میں اپنے ایک ناشر دوست کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ ان دنوں منٹو لاہور میں نیا نیا آیا تھا۔ اور

میرا ناشر دوست اس کی چند ایک کتابیں چھاپ رہا تھا۔ منٹو نے اس کے ادارے سے شائع ہونے والے ایک نئے ادبی مجلے کی ترتیب کے لئے بھی رضامندی ظاہر کی تھی (یہ مجلہ بڑی آب و تاب سے نکلا مگر دو شماروں کے بعد ہی تجارتی وجوہ کی بنا پر ایک خاموش موت مر گیا)۔ میرا ناشر دوست منٹو سے بڑا متاثر تھا۔ "بڑا پیارا آدمی" "ایشیا کا سب سے عظیم انسان"۔ یہ ان توصیفی القاب میں سے چند تھے جن سے وہ ایک پجاری کی مذہبی دیوانگی سے اپنے ادبی بت کے سنگھاسن پر چڑھاوے چڑھاتا تھا۔ ایسے القاب کا مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا میں اس عمر سے قدرے آگے گذر آیا تھا۔ جب ہر مصنف کا نام اپنے گرد شان اور عظمت کا ہالہ لئے ہوتا ہے۔ میں برتری کے انداز میں اپنے شرمیلے اور جھینپو دوست کی قصیدہ گوئی پر مسکراتا اور اس کے ساتھ چل کر منٹو سے ملنے کے وعدوں کو کل پر ٹالتا جاتا۔

پھر ایک صبح مجھے بتلایا گیا کہ "ایشیا کا سب سے بڑا انسان" مجھ سے ملنا چاہتا ہے ۔ وہ مجھے میرے ایک افسانے کے سلسلے میں دیکھنا چاہتا تھا۔ میں نے ہر دوار میں اپنے سفر پر ایک لمبا افسانہ لکھا تھا۔ ہر ایک پچیس سالہ نوجوان لکھنے والے کی طرح مجھے یقین تھا کہ میں نے ایک شاہکار لکھا ہے۔ مگر ان مدیروں کی رائے جنہیں میں نے اسے چھاپنے کے لئے بھیجا، میری رائے سے مختلف تھی نتیجہ یہ تھا کہ افسانہ بڑے عرصہ تک اشاعت پذیر نہ ہو سکا تھا۔ پھر میں نے اسے اپنے ناشر دوست کو بھجوایا۔ اس نے اسے منٹو کو پڑھنے کے لئے دیا۔ منٹو نے اسے پسند کیا۔ مگر وحشیانہ کانٹ چھانٹ اور کتر بیونت سے اسے آدھا کر ڈالا۔ کئی ایسے پیروں کے پیروں پر لکیر پھیر دی جو میرے نزدیک بڑے خوبصورت اور سحر انگیز تھے۔ لیکن جو افسانے کی وحدت تاثر میں یقیناً کسی طرح مددگار نہ تھے۔ یہ افسانہ "اردو ادب" (جو میرے ناشر دوست کے مجلے کا نام تھا) میں چھپنے کے لئے چن لیا گیا۔ لیکن جب میرے دوست نے مجھے لکھا کہ اس کی تھوڑی سی قطع برید کی گئی ہے تو میں نے اپنے افسانے کو ایک نئے روپ میں، مجھے دکھائے بغیر شائع کرنے سے روک دیا۔ افسانے کا مسودہ مجھے بھیجا گیا۔ مجھے فی الواقع بڑا غصہ آیا۔ میرے افسانے کی اس صفائی سے کانٹ چھانٹ کرنے والا منٹو کون تھا! میں اپنی حماقت میں یہ نہ سوچ سکا کہ یہ کتر بیونت فن کے ایک استاد نے کی تھی اور اس طرح ایک ژولیدہ اور پریشان رپورتاژ سے ایک نادر لطافت اور تاثر کا مختصر افسانہ بن گیا تھا۔ یہ افسانہ بعد میں "کھویا ہوا افق" کے عنوان سے "سویرا" میں چھپا۔ اب بھی میرا خیال ہے کہ میں شاید اس سے بہتر کہانی کبھی نہ لکھ سکوں گا۔ صرف منٹو کی کانٹ چھانٹ نے اسے ایک کامیاب کہانی بنا دیا۔ مجھے یہ کہنا چاہئے کہ یہ میری نہیں بلکہ منٹو کی اچھی کہانیوں میں شمار ہو سکتی ہے۔ کیونکہ بات کہنے کی نسبت اسے ان کہا چھوڑنا کہیں بڑا فن ہے۔ یہ سچ ہے کہ چھوٹی سی چیز سے فن میں عظمت آ جاتی ہے۔ مگر عظمت کوئی چھوٹی چیز نہیں اور ہمارے بہت سے افسانہ نگار بات کو بہت زیادہ کہہ کر اپنی تخلیقات پیدا نہیں کرتے بلکہ انہیں ہمیشہ کے لئے دفن کر دیتے ہیں۔ مگر اس وقت میں یہ سب کچھ نہ سمجھتا تھا، اور مجھے منٹو سے اس کی اس بے رحم تصحیح کی وجہ سے کافی کدسی تھی اب جب وہ مجھ سے ملنے کا خواہش مند تھا تو مجھے چار و ناچار اپنے دوست کے ہمراہ اس کے ہاں جانا پڑا۔

وہ ہال روڈ پر بنگلہ نما مکانوں کے بلاک میں سے ایک تھا۔ وہ اس کی نچلی منزل میں رہتا تھا۔ یہ چھوٹے خوشنما مکان نیم دائرے میں ایک سبز گول باغیچے کو احاطہ کئے ہوئے تھے۔ جگہ یقیناً ایسی تھی جسے انگریزی میں "پاش" کہا جا سکتا تھا۔ اردو کے ایک مصنف کے لئے بہت زیادہ "پاش" جس کی گذر محض اس کی تحریروں پر تھی۔ میں یہ توقع کر رہا تھا کہ منٹو غلیظ بالکنیوں والے ایک تنگ و تاریک فلیٹ میں رہتا ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ برآمدے کے باہر سبز بیلوں کی جھنڈی بھی موجود تھی۔

میرے دوست کے دستک دینے پر ایک آدمی نے آ کر دروازہ کھولا۔ ایک آدمی جس کا سر بڑا اور گنبد نما تھا اور جس کی آنکھیں اس کے کھلے فراخ ماتھے کے نیچے جیسے باہر نکلی ہوئی تھیں۔ یہ ایک انسان کی آنکھیں نہ تھیں۔ میں نے ایسی عجیب آنکھیں پہلے کسی انسانی چہرے میں نہ دیکھی تھیں۔ یہ آدمی ایک بے عیب، سپید پاجامے اور کرتے میں ملبوس تھا۔ اور اپنے ایک ہاتھ میں ایک کھلا نا وینٹن پن لئے ہوئے تھا۔ خوشی اور اخلاص کی روشنی چمکی اور اس نے اتنی گرم محبت سے تمتماتا ہوا ہاتھ ملایا کہ اسی وقت میری ساری سرد مہری، سارا جھینپو پن دور ہو گیا۔ تاریک اجنبی دیوار جو دو انسانوں کے درمیان ہوتی ہے پانی کی طرح بیٹھ گئی۔ میں اسے جانتا تھا۔ وہ میرا برسوں کا دوست تھا۔ منٹو لمبے کوچ پر بیٹھ گیا۔ اس پر ایک کاپی یک کھلی رکھی تھی، ہمارا

آنے سے پیشتر وہ ایک افسانہ لکھنے میں مصروف تھا۔ یہ افسانہ اس کی کہانیوں کے مجموعہ "چغد" میں شامل ہے۔ ان دنوں وہ ہر روز ایک افسانہ مکمل کر
اپنے ناشر کے حوالے کر رہا تھا۔ ایک افسانے کا معاوضہ اسے تیس یا بیس روپے مل جاتے تھے۔ یہ دقت پہلے آشفتہ مزاج بوہیمین کے لئے بڑے کام کی شے تھے ما
سے وہ کافر حاصل کی جا سکتی تھی جو اس کے منہ سے لگی ہوئی تھی اور جو اس کی "تلخی و ترشی" کے درد کو تسکین دیتی تھی۔ ان سے اس کی بیوی اور پیارے بچے آ
اور قناعت کی گھڑیوں سے ہمکنار ہو سکتے تھے۔ کمرے میں ہر چیز صاف ستھری اور قرینے سے رکھی ہوئی تھی۔ کاؤچ کے پاس تپائی پر ایک گلدان تھا۔ اس میں ا
چکیلے پھول تھے! اور ایک ایش ٹرے بھی تھی! ۔ یہ آدمی نازک مزاج اور نفاست پسند ہے۔ میں نے سوچا، وہ اپنی زندگی میں بھی اسی نظم اور قرینے
پسندانہ ہے جسے وہ اپنی تخلیقات میں بروئے کار لاتا ہے۔ ہر ایک لفظ تراش سے درست اور اپنی جگہ پر قرینے سے بیٹھا ہوا۔ یہ ایک بڑے مصنف کا کمرہ نہ
یہ ایک شہر کے اچھے کھاتے پیتے وکیل یا آفس سپرنٹنڈنٹ کا کمرہ ہو سکتا تھا۔ ایک مصنف کے کمرے میں آدمی ایک پر تصویر افراتفری کی توقع کرتا ہے۔ ہر چیز
اوپر، میز پر کاغذوں اور کتابوں کے گرد انبار، باسی قہوہ کے پیالے، فرش پر پڑے ہوئے سگرٹوں کے ٹکڑے۔ بعض عظیم ترین مصنفوں نے ایسے کمروں
اپنی بڑی کتابیں تخلیق کی ہیں۔ بالزاک ایسے ہی ماحول میں کام کرتا تھا اور اپنے گرد کی بے نظمی میں خوش تھا۔ اس طرح مجھے یقین ہے۔ دوستوں کی ا
تھا۔ جس کا لکھنے کا کمرہ (جب وہ جیل کا مجوزہ ہوتا تھا) ایک باقاعدہ پسارخانہ ہوتا تھا.... اسی طرح بدنظمی اور افراتفری کا حامل ان کا عظیم فن ہے۔ ان
بڑے ناول لمبے ہوئے، طوفانی اور ناتراشیدہ ہیں۔ اچھی چیزوں سے بھرے ہوئے۔ لیکن بہت کچھ کچرے اور ردی سے بھی اٹے ہوئے۔ ان میں نظم اور رنگ
کا شائبہ نہ تھا۔ ان کے ناولوں کو پڑھنا گویا ایک وسیع کباڑخانے میں داخل ہونا ہے۔ جہاں پہلے پہل تو انسان پریشان ہو جاتا ہے، پھر کباڑ کے ڈھیروں میں
اس کی آنکھ نوادر پر پڑتی ہے۔ اور کیسے عجیب نوادر! پریشانی اور الجھن کے درمیان پڑھنے والے کے دماغ میں لو جل اٹھتی ہے اور اسے اپنی محنت اور
کا خوبصورت صلہ مل جاتا ہے۔ منٹو اپنے فن میں پھیلاؤ اور بے ترتیبی سے نفرت کرتا تھا۔ یہی نفاست پسندی، نظم اور سلیقے سے محبت وہ اپنے ارد گرد کی چیز
میں پسند کرتا تھا۔ ہر چیز اپنی ٹھیک جگہ پر ہونی چاہئے۔ ہر شے صاف ستھری ہونی چاہئے۔ اس کے صفائی اور قرینے کے وہم کے بارے میں میرے ایک دوست نے
کئی ایک دلچسپ باتیں بنا رکھی تھیں۔ اب میں نے اس کا خود تجربہ کیا۔ میرے سامنے کاؤچ پر اپنی سپید لمبی مخروطی انگلیوں میں ایک جلتا ہوا سگرٹ پکڑے اور ب
گائے جیسی بڑی آنکھوں سے دیکھتا ہوا جو بونے سے قد کا شخص بیٹھا تھا۔ وہ اپنی ذات میں بھی ستھرے پن کا قائل تھا۔ اس کے کپڑے سپید اور اجلے تھے۔ اس
ایک غیر قدرتی رنگت والے چہرے میں سب سے زیادہ اظہار کرنے والی اور مستحکم اس کی بڑی امڈتی ہوئی آنکھیں تھیں۔ وہ فی الواقع غیر انسانی اور خوفناک تھ
جنہیں گویا دیوتاؤں نے خصوصیت سے انسانوں کی روحوں میں جھانکنے، ان کی اچھائی اور کمینگی کی عکاسی کرنے کے لئے بنایا تھا۔ میں نے انہیں خوفناک
ہے۔ یہ پوری سچائی نہیں، چونکہ یہ "ریپ وین ونکل" کے گاؤں کی پہاڑیوں کی طرح ہمیشہ ایک ہی رنگ اور یکساں کیفیت کی نہ رہتی تھیں۔ وہ خوشی اور محبت
سے بھی لبریز ہو سکتی تھیں۔ اور پھر ان سے خوبصورت اور کوئی آنکھیں نہ ہوتی تھیں۔ وہ چلبلی ہنستی ہوئی آنکھیں بھی بن جاتی تھیں اور اتنی معصوم بھی جتنی ایک
پیتے بچے کی آنکھیں.. اور وہ پتھر کی آنکھیں بھی تھیں۔ تلخ اور سرد مہر! میں نے بعد میں ان کی یہ سب مختلف کیفیات دیکھیں۔ اس کی آنکھ کے بدلنے سے وہ ا
بھی بدل جاتا تھا۔ بعض وقت اتنا مختلف کہ آپ اس کو پہچانتے نہ تھے اور ڈر جاتے تھے۔ مگر اس روز اپنے اس کمرے میں منٹو سے زیادہ پیارا میٹھا دوست
کوئی نہ ہو سکتا تھا۔

ہمارے معذرت کرنے پر کہ ہم اس کے کام میں مخل ہوئے ہیں، اس نے خندہ پیشانی سے کہا۔ نہیں بالکل نہیں، اس کے لکھنے میں اس سے ک
ہرج نہیں ہوتا۔ ہمارے جانے کے بعد وہ افسانے کو اسی سرے سے پھر شروع کر دے گا۔ جہاں اس نے اسے چھوڑا تھا۔ اس نے مسودہ اٹھا کر ہمیں دکھ
آخری فقرہ ابھی نامکمل تھا۔ وہ موڈ اور الہامی لمحے کا قائل نہ تھا۔ اس نے کہا کہ رات کو سوتے وقت وہ دوسرے روز کے افسانے کی کہانی کے موضوع کے
بڑے ہاتھ پاؤں مارتا ہے مگر کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ صبح تک اسے کوئی پتہ نہیں ہوتا کہ وہ کیا اور کیسا افسانہ لکھے گا۔ پھر حجامت بنانے کے لئے یا غسل کرتے ہوئے ا
کوئی خیال سوجھتا ہے۔ پلاٹ ذہن میں آتا ہے پھر چند کردار ابھرتے ہیں اور وہ افسانہ لکھنے بیٹھ جاتا ہے۔ پھر لامحالہ کردار خود افسانے کا بیڑا اٹھا لیتے ہیں

ہی کو تخلیق نہیں کرتا۔ وہ اس کی تخلیق کرتے ہیں۔ وہ اپنے کرداروں کے سامنے بے بس ہوتا ہے۔ منٹو ہمیشہ یہ بات اپنے دوستوں میں دہراتا تھا مگر اپنے پیر نوشس میں ایک چھوٹے سے خاکے میں اس نے اقبال کیا کہ یہ محض بکواس ہے۔ میری رائے میں صداقت ان دونوں انتہاؤں کے درمیان ہے۔ منٹو پلاٹ اور کرداروں کو سوچتا تھا مگر ایک دفعہ جان پڑنے کے بعد کردار مصنف کو اپنے ساتھ ساتھ چلاتے تھے اور افسانہ اپنے کو خود لکھتا جاتا تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ جوہری کی صناعانہ نگاہ ہار میں پروئے جانے والے ایک ایک ہیرے کو پرکھنے سے بیگانہ ہو جاتی تھی۔ فن کار ہمیشہ چوکس اور ہوشیار رہتا تھا۔ چونکہ وہ جاندار کردار پیدا کر سکتا تھا۔ اور الفاظ کی مصوری کا ماہر تھا۔ یہ کام اس کے لئے نسبتاً سہل تھا۔ لیکن اس کے نقادوں کا اس کے اپنے الفاظ کو جبراً کر یہ سمجھ لینا کہ اس کا فن سہل تھا بڑا حیرت ناک ہے۔

" اوئے محمد خالد اختر یار" اس نے اٹھ کر میری طرف سگریٹ کا پیکٹ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "توں سنیائے میرے کولوں خواہ مخواہ بگڑ یا ہویا ایں۔ بھائی مینوں تیری چیز پسند آئی سی۔ میں اس دے وچ تبدیلی تے کوئی نہیں کیتی۔ صرف کٹ پھٹ کیتی اے۔"

اس کی اس معذرت سے میں شرمسار ہو گیا۔ اس کی آنکھیں مجھے محبت سے کچھ ملزمی سے دیکھ رہی تھیں۔ "نہیں منٹو صاحب! میں ناراض تو نہیں ہوں"

" ہاں! یہ چیز زندہ رہے گی" اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

میں اسے اچھی طرح نہ جانتا تھا اس لئے میں نے اپنی اس تعریف کا قدرے برا مانا۔ یہ آدمی اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے؟

" اچھا ہن ٹھہر یا کا تا کچھ دیر۔ میں کل آواں گا۔ توں مینوں بڑا پیارا لگنا ایں۔" منٹو نے ہمیں الوداع کرتے ہوئے کہا۔ اس نے میرے کچا ادیر مکمل فتح پالی تھی۔ یہ منٹو کا ایک چہرہ تھا۔ لیکن جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے اس کے کئی چہرے تھے۔

اس پہلی ملاقات کے بعد میں لاہور میں اپنے مختصر قیام کے دوران اس سے کئی بار ملا۔ اُسے میرے لکھنے کی کوشش سے دلچسپی ہو گئی تھی۔ لیکن مجھے یہ خدشہ لاحق رہتا تھا کہ کہیں اس کی بڑی بڑی وحشت ناک آنکھیں میرے اندر نہ جھانک رہی ہوں اور کہیں وہ سچائی کو نہ بھانپ لیں۔ شاید وہ مجھے اپنے کسی افسانے کا کردار بنانا چاہتا ہے۔ میں اس خیال سے کانپتا تھا۔ میں خوش قسمت ہوتا اگر وہ مجھے اپنی کسی کہانی کے کرداروں میں سے ایک بنا لیتا۔ یوں میں جاوداں ہو جاتا کہ وہ انسانی فطرت کا طالب علم تھا۔ اور راست رو تھی، ریاکار دنیا میں سچے اخلاص کا جویا۔ اس کی مجھ میں دلچسپی بھی زیادہ تر اس لئے تھی۔ پچیس سال کی جوانی خود غرض ہوتی ہے۔ وہ کھلے بازوؤں سے آگے بڑھا۔ میں نذیر احمد اور اس کے مقلدوں کے چند نایاب پند و نصائح پر عمل کرتے ہوئے پیچھے اپنے خول میں سکڑ گیا ان پند و نصائح کے بغیر دنیا رہنے کے لئے سنہری جگہ بن سکتی ہے۔

پہلی ملاقات کے دوسرے روز ہی وہ میرے ناشر دوست کے ہاں مجھ سے ملنے آیا۔ میں اس دن بخار میں اکیلا پڑا تپ رہا تھا۔ منٹو نے تقریباً سارا دن میرے پاس گذارا۔ مجھے یاد ہے کہ اس نے میری بیماری کا مذاق اڑایا اور اپنے کرتے کی جیب میں سے برانڈی کی ایک چھوٹی بوتل سے مجھے پانچ چھ گھونٹ چڑھا جانے پر مجبور کیا۔ مجھے مجبور کرنے کی خاص ضرورت نہ تھی اور میں نے اچھے لمبے گھونٹ لئے۔ منٹو نے مجھے یقین دلایا کہ اب میں ٹھیک ٹھاک ہو جاؤں گا۔ اسے برانڈی کی چنگا کر دینے والی تاثیر پر مکمل ایمان تھا۔ اسے وہ زکام سے لے کر لیکوریا تک سب امراض کے لئے اکسیر سمجھتا تھا۔ اُس کی باتیں اب مجھے یاد نہیں رہیں ہاں وہ مجھے بہلانے کے لئے متواتر بولتا رہا۔ اس نے کسی سے ملاقات کا ایک طویل اور قدرے بے سرو پا قصہ شروع کیا جس نے اس وقت مجھے شدت سے بور کیا... منٹو کی زبان بہکی اور لڑکھڑاتی تھی۔ مگر اس کے دماغ کی صفائی دھندلائی نہ تھی اور اس کی پچھلی گفتگوؤں کی تفصیلات کی یاد کبھی غلطی نہیں کرتی تھی۔ اتنے گھنٹوں تک اس کی باتوں نے مجھے کچھ تھکا دیا۔

وہ دوسرے دن میرے ناشر دوست کے پاس شاید اپنے ایک افسانے کے پیسے مانگنے کے لئے آیا۔ اس دن وہ ایک بدلا ہوا منٹو تھا۔ اس کی آنکھیں پتھر اور برف کی تھیں۔ میں اس کے پاس جا بیٹھا اور اسے باتوں میں لگانے کی کوشش کی۔ ایک گھنٹے میں اس نے ایک لفظ نہ کہا اور مجھے اس طرح دیکھا جیسے ہم مکمل اجنبی ہوں۔ یہ میرے لئے ایک عجیب اور غیر مرئی تجربہ تھا۔ میں نے سوچا کوئی تاریک قوت اس پر مسلط ہے۔ پیسے لے کر وہ ایک لفظ کہے بغیر چپ چاپ

اٹھ کر چلا گیا۔

اسی شام وہ پھر آیا تو بڑے اچھے موڈ میں تھا اور بڑا زندہ دل دوست ثابت ہوا۔ اس سے اگلے دن ہی وہ مجھے اپنے ہمراہ لاہور کی فلمی دنیا کی سیر کرانے لے گیا۔ یہاں اُسے ہر کوئی جانتا تھا۔ کئی ڈائریکٹروں اور ایکٹروں کی شادیوں میں اس کا ہاتھ تھا۔ ایک بار میں نے اس کی آنکھوں کو بھڑکتے ہوئے اور اس کے چہرے پر تمتماہٹ کو اچھلتے ہوئے دیکھا۔ ایک فلم اسٹوڈیو میں منٹو سے تعارف کرائے جانے پر ایک ایکٹر نے اس مشہور نام سے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ منٹو ہمیں ایک ایسے اسٹوڈیو میں بھی لے گیا جہاں اس کی ایک کہانی فلمائی جا رہی تھی۔ باہر آنے پر میں نے اسے سخت غصے کی حالت میں دیکھا۔ اس کا مختصر جسم پتے کی طرح ہلتا تھا۔ ڈائرکٹر نے اپنے قبیلے کے طور کے مطابق منٹو کی کہانی کو زیادہ "پاپولر" بنا دیا تھا۔ منٹو جلے ہوئے دل سے اسے بے نقط سناتا رہا۔ "اخیر ہے جگر بکواس اے!"

ایک صبح میرا ناشر دوست مجھے اور منٹو کو اپنے ایک کام کے لئے ہمراہ لے گیا۔ اس نے ہومیوپیتھک کالج کا آغاز کرنے کی ٹھانی تھی۔ اور وہ نئے وزیرِ صحت و تعلیم سے درخواست کرنا چاہتا تھا کہ وہ اس کے افتتاحی جلسے کی صدارت کرے۔ وزیر کی کوٹھی پر جا کر منٹو نے اپنا ارادہ تبدیل کر دیا۔ "جاؤ بھئی تسیں وزیراں نوں ملو، اسیں ایتھے بیٹھے آں۔" جب ہم وزیر صاحب سے مل کر باہر آئے تو منٹو ہمیں کہیں نظر نہ آیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم نے اُسے ایک فقیرنی کی کُٹیا میں سے ہمیں پکارتے ہوئے سنا۔ جہاں وہ بڑے مزے سے اکڑوں بیٹھا انسانی فطرت کی کتاب پڑھ رہا تھا۔ میرا خیال ہے، یہی اس کی عظمت تھی۔ انسانوں میں شدید طور سے دلچسپی کی وجہ سے اس کے تجربے اور تاثرات "فرسٹ ہینڈ" تھے۔ وہ اپنے ان ہم عصروں کی طرح نہ تھا، جو انسانی فطرت کا علم کتابوں سے حاصل کرتے ہیں یا جو اونچے گھوڑوں پر سوار زرق برق راستوں پر سے گذرتے ہیں۔

انہی دنوں منٹو کے دو خوجے دوست چنیوٹ سے لاہور آئے تھے۔ یہ مجھے معلوم نہیں کہ منٹو نے انہیں کیسے دریافت کر لیا۔ اور وہ اس کے دوست کیونکر تھے۔ منٹو ان کے متعلق بے حد پرجوش تھا۔ "اختر" اس نے مجھے کہا۔ "چل تینوں اناں نال ملاواں۔ بڑے مزیدار آدمی نیں۔" اس نے بتایا کہ دونوں خوجے فلیٹی ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہ اپنے ساتھ چاندی کا ایک ہاون دستہ لائے تھے اُسے وہ بھنگ گھوٹنے کے لئے استعمال میں لاتے تھے۔ منٹو کے لئے وہ ایسے تھے جیسے ایک بچے کے لئے سونے کا خزانہ۔ وہ انہیں انسانیت کے دو دلچسپ نمونے سمجھتا تھا۔ مجھے ایسے لوگوں سے ملنے کا ذرہ بھر شوق نہ تھا۔ میں منٹو کے ساتھ فلیٹی میں نہ گیا۔ لیکن ایک روز مال روڈ پر منیاری کی ایک دکان میں ان دونوں کی زیارت نصیب ہو ہی گئی۔ ان میں سے ایک گیروے رنگ کا لاچا اور ایک لمبا کرتا پہنے ہوئے تھا۔ منٹو ان کی مصاحبت میں تھا اور ان کی صحبت میں بڑا خوش اور مغرور لگتا تھا۔ وہ فی الواقع زندگی کے کوچوں کا کھلنڈرا شوخ لڑکا تھا۔ اسی اسکول میں اس نے ہر قسم اور ہر قماش کے لوگوں سے آسانی اور بے تکلفی سے دوست بنا لینے کا فن سیکھا۔ منٹو چنیوٹ کے ان خوجوں پر ایک افسانہ لکھنا چاہتا تھا۔ وہ افسانہ نہ لکھا جا سکا۔ اور خوجے بدقسمتی سے ابدیت کا تمغہ پانے سے بال بال بچ نکلے۔ منٹو کی ایک ہولناک دہلا دینے والی تصویر میرے لوحِ ذہن پر نقش ہے (ان سطروں کو لکھتے وقت بھی وہ تصویر، وہ منظر اصلی زندگی کی طرح میرے سامنے ابھر رہا ہے)

ایک چلچلاتی دوپہر کو میں اور میرے چند دوست تانگے سے مال روڈ کے "چینیز" کے ریستوران کے سامنے اترے۔ پاس ایک برف بیچنے والے کی دکان کے سامنے سر پر تولیہ لئے اور لال پتھریلی نگاہوں سے خلا میں دیکھتا ہوا سعادت حسن منٹو کھڑا تھا۔ آشفتگی اور انسانی تنہائی کی مکمل تصویر۔ اسے اس طرح دیکھ کر ایک چاقو میرے کلیجے میں سے گذر گیا۔ اپنے دوستوں کو چھوڑ کر میں اس کے پاس گیا۔ اس نے مجھے کوری انجانی نظروں سے گھورا۔ "میں برف لینا اں پیالہ" اس نے لڑکھڑاتی زبان سے کہا۔ برف بیچنے والا اپنے شرابی گاہک کو عجیب طرح سے تک رہا تھا۔ اس بیچارے کو کیا پتہ تھا کہ اس سے بڑا اور عظیم تر آدمی اس کی دکان پر کبھی نہ آئے گا۔ منٹو نے برف کی بڑی سِل کی سِل خریدی۔ اسے تولئے میں لپیٹا۔ "جاؤ تسیں۔ اپنے دوستاں نال چینیز جاؤ۔ جاؤ تساں"۔ اس نے "ینالمبا" ہاتھ بڑھایا اور تولئے میں لپٹی ہوئی برف کی سِل کو بغل میں دابے وہ جھکے ہوئے بے مقصد قدموں سے "زمزمے" کی طرف چل پڑا۔ میرا دل چاہا میں اس کے ساتھ جاؤں مگر "چینیز" میں میرے دوست میرا انتظار کر رہے تھے۔

منٹو کی زندگی موپاساں کی ایک کہانی "بیڑا" ایک جوہر اوڈ کے ہیرو کی طرح خالی اور رسوائی تھی وہ ایک ایسے جہاز کی مانند تھا جس کا لنگر ٹوٹ چکا ہو۔ اس کے لئے

پر آلام دنیا کے سمندر میں کوئی امن کا جزیرہ نہ تھا اور وہ اس خلا کو سستی تند شراب کے متواتر گھونٹوں سے پر کرتا تھا۔ یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ تشنگی پیدائشی تھی یا اس کے ہم جنسوں کی کمینگی اور خود غرضی جس نے اسے الکحل کے دروازے پہ بے بس ڈال دیا۔ شاید اس کی اپنی (آرٹسٹ کی) تنہائی اس کے پینے کا سبب تھی۔ الفاظ کی مصوری ایک تھکا دینے والا، خون پی لینے والا کام ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ منٹو ہر لمحہ ایک آرٹسٹ تھا۔ صحیح لفظ کے لئے اس کی کاوش پیہم اور مسلسل تھی۔ بڑی آنکھیں ہمیشہ دوسرے انسانوں کے دلوں میں غوطے لگاتی تھیں۔ اور اس کا ذہن بے رحمی سے چھوٹی سے چھوٹی تفصیل محفوظ کرتا جاتا تھا۔ اس کی یہ عادت بعض دفعہ اس کی صحبت کو بوجھل بنا دیتی تھی۔ اس کی صحبت ایک نارمل تجربہ نہ تھا۔

مجھے ۱۹۵۱ء کا وہ عجیب دہشت ناک دن ابتک یاد ہے جس کے خیال سے اب بھی میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایسا دن میری زندگی میں ہوتا ہے۔ اس چمکیلے سورج کی دنیا کی بجائے کسی تاریک اور دیوانی دنیا سے اس کا تعلق معلوم ہوتا ہے۔ اسی سال کے کرسمس میں ہم کار میں لاہور آئے۔ اور میکلوڈ روڈ پر لاہور ہوٹل میں اترے۔ ہم تین دوست تھے۔ ایک کو میں ایپی کیورس کہوں گا چونکہ وہ اپنے کو بھی ایپی کیورس کہتا تھا اور فلسفیانہ مزاج رکھتا تھا۔ دوسرے کا نام پیٹر ہوگا۔ پیٹر ایک شاعر تھا اور ایک کامریڈ بھی۔ ہم ایپی کیورس کی کار میں لاہور گلچھرے اڑانے کے واحد اور بلند مقصد سے آئے تھے۔ میں ایک پرسکون، ٹھنڈے خون کا شخص ہوں۔ گلچھرے اڑانے کے لئے طبعاً اور جسمانی لحاظ سے ناموزوں، مگر شوریدہ ایپی کیورس اور پیٹر مجھے زبردستی اپنے ہمراہ گھسیٹ لائے تھے۔ لاہور، میری طالب علمی کا لاہور مجھے ہمیشہ ایک پرکشش شہر لگا ہے۔ یہاں پہنچنے کے بعد دوسرے دن لوہاری دروازے کے باہر اپنے ناشر دوست کی دکان پر مجھے بتایا گیا کہ منٹو صاحب میرا اور ایپی کیورس کا انتظار کر کے ابھی ابھی گئے ہیں۔ میرے ناشر دوست نے منٹو کو ہماری آمد کی تاریخ سے مطلع کر رکھا تھا۔

ہم وہاں ابھی کھڑے ہی تھے کہ منٹو اور راہی تانگے میں وہاں آ پہنچے۔ منٹو اترتے ہی ہماری طرف لپکا "اوئے اختر میں تے بڑے دن دا تیرا انتظار کر رہیاں آں۔ رشید کولوں پچھ کے کئی چکر لائے نیں"۔

ایپی کیورس اور پیٹر نے اس بلائے ناگہانی کو پسند نہ کیا۔ ان کے دوسرے پروگرام تھے اور اب ظاہر تھا کہ منٹو ان کو نہ چھوڑے گا۔

منٹو نے کہا "آؤ چلئے، فیر گھر چلئے۔ پیا دسدے تے افریقیا تریا ہویا اے"۔ افریقہ! اس کے چند قرابت دار تھے جن کا نیروبی میں کاروبار تھا۔

میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے سے شراب چھلکی پڑ رہی تھی اور اس کی زبان معمول سے زیادہ لڑکھڑاتی تھی۔ منٹو کار میں بیٹھ گیا اور ہم نے لاہور ہوٹل میں جانے کا فیصلہ کیا۔ "پر یار راہی۔ ساڈا ادارہ تے ختم ہو گیا۔ اوہ تے چل کر کراں لگے گی۔ چلو لے لیاں گا۔ پر پیسے۔ چلو پیسیاں دی بھی فکر نہ کر۔" اس نے پیچھے ہماری طرف دیکھا۔ "اپنا خالد چوہلے۔ ریاض اے۔ پندرہ روپے تے اناں کولوں کڈ آں گے..."

پندرہ روپے سے ہاتھ دھونے کے خیال نے ہمیں زیادہ خوش نہ کیا۔ "منٹو صاحب" میں نے کہا "آپ کے لئے لاہور ہوٹل میں بلیک اینڈ وائٹ پڑی ہے"۔ پیٹر اپنے ساتھ وہسکی کی ایک بوتل لے کر آیا تھا۔

لاہور ہوٹل کے کمرے میں پہنچ کر منٹو بڑے مزے سے نیچے فرش کی دری پر بیٹھ گیا۔ "لیا بھئی پیٹر"۔ پیٹر نے بلیک اینڈ وائٹ کی بوتل کھولی۔ اور اس میں سے شراب ایک گلاس میں انڈیلی... منٹو اسے ایک گھونٹ میں چڑھا گیا۔ اسے پیتے دیکھ کر آدمی کو ڈر لگتا تھا۔ جتنا وہ پیتا تھا۔ اتنا ہی وہ زیادہ پیاسا ہو جاتا تھا۔ ہر پندرہ بیس منٹ کے بعد پیٹر اس کے لئے گلاس میں وہسکی ڈالتا اور وہ اسے اپنے اندر ڈال لیتا۔ اس کی گفتگو منتشر اور بے ربط تھی۔ اس کی بڑی بوڑھے ہرن کی سی آنکھیں جو اپنے افق سے بھٹکی ہوئی اور کسی کھوئی چیز کی متلاشی تھیں۔ اب اپنے اندر ایک چنچل بچے کی مسکراہٹ لئے ہوئے تھیں۔ کچھ دیر تک وہ میرے ایک ناول کے مسودے کے بارے میں مجھ سے چھیڑ کرتا رہا۔ "اوئے اختر میں تیرا ناول پڑھیا اے۔ نرا بکواس۔ بکواس۔ اوہ ساری گل جس واسطے توں دو سو صفحے لکھے نیں، چھ صفحیاں وچ کہی جا سکدی سی۔ اوئے تو لکھیا کر پر تھوڑا۔ تھوڑا۔"

میں نے اپنے شاہکار کو بکواس کا نام پانے کا ذرا بھی برا نہ منایا۔ یہ بکواس سہی، مگر منٹو نے اسے پڑھا تھا! ہم مسحور اور کچھ سہمے ہوئے اس عجیب آدمی کی بکتی

اور سیاق باتیں سنتے رہے، آنکھیں جلتے انگارے بن گئیں۔ اس کا ہاتھ رعشہ زدہ ہو گیا۔ پھر بھی اس نے اپنے ذہن کی صفائی ایک لمحہ کے لئے نہ کھوئی۔ ہمارے لئے یہ ایک وحشت ناک خواب میں سانس لینا تھا۔

وہ کئی ایک بار اٹھا "چل راہی چلئے، اناں کیہ جانا ہو وے گا"۔ وہ ہماری طرف ملومانہ آنکھوں سے دیکھتا پھر بیٹھ جاتا اور اُٹھ چل کے کی کراں گے۔ اُتھے افریقہ اترا ہویا اے"۔

چار گھنٹے کی بادہ نوشی کے بعد اُسے غنودگی سی آ گئی، اور وہ پلنگ پر ایک بچے کی طرح اکٹھا ہو کر اور اپنی بانہہ کو اپنی آنکھوں پر رکھ کر سو گیا۔ اس پریشان بے قرار نیند سے وہ آدھ آدھ گھنٹے کے بعد بیدار ہوتا اور بستر پر اٹھ بیٹھتا۔ ٹریژر آئی لینڈ کے بحری قزاق بلی جونز کی طرح وہ ہم پر لال آنکھیں گاڑتا اور رہائٹ کی دوا کے ایک اور گلاس کا حکم دیتا۔ ڈسکارسے ہیں انکار کی جرأت نہ ہوتی تھی۔

ایک دفعہ اس نے مجھے اور راہی کیو رس کو آواز دی۔ "ایتھے آکے بیٹھو نا یار ے" ہم اس کے پاس جا کر بیٹھے۔ کچھ گھبرائے سے کچھ سحر زدہ ۔۔۔ "اوئے اختر توں بکواس لکھیا اے۔ لکھیا کر لیکن مختصر، مختصر"۔

ہم نے اس کی کہانیوں کا کسی طرح ذکر کر دیا۔ وہ غصے میں بھڑک اٹھا۔ ناتواں جسم کپکپانے لگا۔ "میرا ذکر چھوڑ دیو"۔ اس نے کہا "میری بات نہ کرو"۔ اس نے اپنی ایک انگلی کا قلم بنا کر دوسرے ہاتھ پر لکھنے کا اشارہ کیا۔ "میری بات چھوڑو۔ میں ایک سطر لکھ دوں وہ آرٹ ہے"۔ وہ اپنی انانیت کے موڈ میں تھا۔ ہم سہم کر دبک گئے۔ عجیب بات یہ تھی کہ یہ کوری شیخی نہ تھی۔ اس کا دعویٰ سو فی صدی درست تھا۔ جو کچھ وہ لکھ دیتا تھا، آرٹ تھا۔

اس کا غصہ فوراً اتر گیا اور اس نے ایک التجا کے لہجے سے کہا: "اختر ایس بک بک توں میں نکلنا چاہنا۔ مینوں اپنے نال پہاڑاں تے لے چلو ۔۔۔ دور، مینوں کڈ لو ایتھوں ۔۔۔"

میں نے کہا کہ ہم اسے اپنے ساتھ کاغان کی وادی میں لے چلیں گے۔

"مینوں اس بلا توں دور رکھنا"۔ اس نے وہسکی کی بوتل کی سمت اشارہ کیا۔ اس کی آنکھیں آزادی اور کوہستانی ہواؤں کے تخیل سے خواب آلود ہو گئیں۔ اچانک اس کا چہرہ اداس اور سنجیدہ ہو گیا۔ "میرے بیوی بچے اتھاں دال کی ہوئے گا۔ اتھاں دا انتظام کرنا پیئے گا"۔ ایک دفعہ اس نے یہ بھی کہا: "میں مر جاؤں گا منٹو مر جائے گا تو اختر تو دی رو ئیں گا۔ تساں سارے رو و گے"۔

باہر گہری شام پڑنے پر وہ آخر گھر جانے کے لئے اٹھا۔ "چلئے بھئی افریقہ نوں چلئے"۔

میں اسے اور راہی کو نیچے سڑک پر چھوڑنے آیا۔۔ میکلوڈ روڈ پر نیلے اندھیرے میں تانگوں اور موٹروں کی روشنیاں اچھل رہی تھیں اور زندگی کا پر رنگ دلچسپ اور احمقانہ میلا لگا تھا۔ راہی نے ایک تانگے کو آواز دی۔ منٹو نے مجھ سے اپنا ہاتھ ملایا "اچھا بھئی اختر"۔ پھر اچانک اجنبیت اور کھنچاؤ کی رسی میرے اندر ٹوٹ گئی اور میں نے اس پیارے اکیلے آدمی کو گلے لگا لیا۔

جب میں اسے تانگے میں سوار کرا کے لوٹا تو میری آنکھوں میں انسان کی تنہائی کے المیہ کا خیال کر کے آنسو آ گئے۔ میں نے منٹو کو پھر کبھی نہ دیکھا۔ جب اس کی کہانی "موذیل" چھپی تو میں نے منٹو کو ایک بے حد عقیدت مندانہ اور تعریفی خط لکھا۔ اس قسم کا خط جو ایک چیلا اپنے گرو کو لکھتا ہے۔ میں نے لکھا کہ وہ ایشیا کا یقیناً سب سے بڑا آدمی ہے۔ اس خط سے اسے خوشی ہوئی اور اس نے مجھے اپنے واحد خط میں جواب دیا کہ میں منٹو کے غبارے میں اتنی ہوا نہ بھر دوں کہ وہ پھول کر آسمان کی پہنائیوں میں اوجھل ہو جائے۔ اس نے اسی رات کی بات کو دہرایا کہ اس نے اپنے کرداروں کو پیدا نہیں کیا بلکہ اس کے ہر نئے کردار کے بعد ایک نیا منٹو جنم لیتا ہے۔

یہ خط مجھ سے کھو گیا ہے۔ اب اسے حاصل کرنے کے لئے میں کیا کچھ دینے کو تیار نہیں ہوں۔ اس آخری ملاقات کے بعد میں دو تین بار لاہور گیا۔ منٹو سے نہ ملا۔ اس سانحے پر میں عمر بھر پچھتاتا رہوں گا۔ اس کی خبریں مجھے ملتی رہتیں۔ اس کی بیماریاں۔ اس کے شراب چھوڑنے کی خاطر دماغی ہسپتال میں داخلے۔ اس کی

اپنے بیوی اور بچوں کو آرام سے رکھنے کی تند کش مکش۔ مگر پچھلے چار پانچ مہینے سے مجھے اس کی کوئی خبر نہیں ملی تھی۔

پھر سرما کی ایک سرخ اداس شام ___ پتے سڑک پر بکھرتے ہوئے اور ایک آندھی چلتی ہوئی۔ اور پیٹر ایک غم زدہ چہرے سے تانگے میں سے چلاتا ہوا "ترا منٹو مر گیا"۔

میں اس وقت گاڑی پکڑنے کے لئے اسٹیشن جا رہا تھا۔ پیٹر مذاق کر رہا ہوگا۔ جس طرح اس کی عادت تھی۔ مگر اس کے چہرے نے مجھے بتایا کہ یہ مذاق نہیں ہے۔ میرا دل ڈوب۔ دنیا گھیا اوپر نیچے ہوگئی۔ ہم میں سے کتنوں کے لئے زندگی کی لو اس دن بجھ گئی۔

یہ ایک عہد کا اختتام تھا ___ عہد سعادت حسن منٹو۔

"آرٹسٹ منٹو"

"آرٹسٹ" "انسان سعادت حسن" سے الگ نہ تھا۔ ایک دوسرے کا پرتو اور عکس تھا۔ یہ چیز شاید ہر بڑے فن کار کے بارے میں کافی صداقت سے کہی جاسکتی ہے۔ لیکن منٹو کے بارے میں یہ بات ایک سے زیادہ لحاظ سے سچ تھی۔ اس کے آخری ایک دو سال میں آرٹسٹ اور انسان اس طرح غیر منقسم طور پر گتھ گئے تھے کہ ایک کو دوسرے سے الگ بتانا مشکل تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بعض وقت رمیباکہ اس کے ایک نقاد دوست نے ایک دفعہ کہا) اس کی صحبت شریف رواجی فطرتوں کے لئے بوجھل ہونے لگتی تھی۔ وہ ہر وقت آرٹسٹ تھا۔ صحیح لفظ کی تلاش اور اپنے فن کی کارفرمائیوں سے، اس درجہ بھنکتا ہوا کہ وہ لوگوں کے لئے ناقابل برداشت ہو جاتا۔ اور وہ اس سے بچ کر اپنی چین بھری سمجھدار دنیا میں جانے کی خواہش کرنے لگتے۔ شریف دنیا دارانہ معیار سے اس کا ردیہ اس کا طریق حیات یقیناً "کرینکش" اور نامناسب تھا اور اس کی صحبت میں سورج اور کھلی ہوا کی کمی تھی۔ ایک آرٹسٹ کی حیثیت سے وہ زندگی کا ایک ایک لمحہ بھر پور طریق سے جیتا تھا اور جب وہ کسی سے ملتا تو وہ محض رسمی واقفیت پر قانع نہ ہوتا بلکہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ شخص کیا ہے اور یہ چیز بھلے مانسوں کے لئے بڑی پریشان کن ہوتی۔ وہ اپنے اور اپنی کتاب زندگی انسانیت اس کی کتاب تھی اس کے درمیان کوئی تکلف اور "اچھے" اخلاق کی دیوار برداشت نہ کر سکتا تھا۔ اس کے اندر کا آرٹسٹ ہمیشہ ہر ملنے والے کی روح میں جھانکتا رہتا تھا اور یہ پتہ لگاتا رہتا تھا کہ اس میں سونا کتنا ہے اور زنگ آلود لوہا کتنا۔ منٹو ہر لمحہ اپنے افسانے خود جیتا تھا اور اس ایک کہانی کے مقابلے میں جسے وہ حقیقتاً لفظوں میں لاتا تھا بیسیوں اس کے ذہن میں ہوتی تھیں۔ میرا خیال ہے اس نے ڈیڑھ سو یا دو سو کے قریب مختصر افسانے لکھے ہوں گے۔ مجھے یقین ہے کہ کئی ہزار افسانے پلاٹ اور کرداروں سے متعلق اس کے اندر جل رہے تھے جنہیں وہ نہ لکھ سکا۔ وہ بعض دفعہ بڑا کھرا اور ظاہراً "بداخلاق" ہوتا۔ جسے بے سمجھ ظاہر بیں برا مانتے۔ یہ اس کا لوگوں کو کھولنے کا طریقہ تھا۔ ہم سب بند کتابیں ہیں اور دیکھا جائے تو ہمارے بہترین دوست بھی ہمارے متعلق تاریکی میں ہوتے ہیں۔ ہم خود بھی یہی چاہتے ہیں کہ ہمارا اصل تاریکی میں رہے اور ہماری کمینگی اور غلاظت ان پر آشکارا نہ ہو۔ آرٹسٹ منٹو فوراً آدمی کو بھانپ جاتا تھا اور اس کی فطرت کو لاشعور کے آئینے میں منعکس کر لیتا تھا۔ بوڑھے ہرن کی سی آنکھیں سب کچھ دیکھ لیتی تھیں۔ مرپسان میں بھی یہ خداداد خوفناک صفت تھی مگر جہاں عظیم فرانسیسی کو اس کے علم نے فطرت انسانی کے متعلق حد درجہ تلخ اور سنگی بنا دیا تھا۔ منٹو نے آدمی کی کمینگی اور جھوٹ کے باوجود اس سے رشتۂ محبت استوار رکھا۔ سارے انسانوں کا درد اور حزن اس اکیلے بادہ گسار میں تھا اور سب آدمی اس کے اپنے بھائی تھے۔ یہ محبت اور یہ درد اس کے ہر ترشے اور چھانٹے ہوئے افسانے میں نمایاں ہے اور اس واحد چیز کی بدولت اسے فرانسیسی دیوسے ایک لحاظ سے بڑا افسانہ نگار کہا جا سکتا ہے۔

میں نے لکھا ہے کہ آرٹسٹ اور انسان ایک تھے۔ وہ ایک ضرور تھے۔ لیکن ایک اہم فرق کے ساتھ۔ جہاں انسان سعادت، اپنی دنیاوی زندگی میں بے حد جذباتی ہو جاتا تھا۔ احساسات کی انگلیوں کے نیچے ایک طرب آمیز ساز ___ وہاں آرٹسٹ منٹو سرد اور سخت اور بے رحم تھا۔ آرٹسٹ منٹو برف تھا۔ اور اپنی تخلیقات سے جذبات کے خود رو گنجلک پودوں کو اس سفاکی سے چھانٹتا تھا جیسے ایک محتاط باغبان اپنی کیاریوں سے زہریلی بیلوں کو۔ یہ وہ شعوری طور پر یا ارادتاً نہیں کرتا تھا بلکہ یہ اس کے لئے قدرتی تھا۔ ایسے کئی مصنف ہیں۔ غالباً بہت زیادہ، جو کسی مقصد میں خلوص کے ساتھ یقین رکھنے کی وجہ سے یا اپنی

فیشن کی خاطر جذبات کی رو میں بہہ جاتے ہیں۔ ان کی تخلیقات میں آبدار نثری ٹکڑے ہوتے ہیں۔ اور خوبصورت منظر نگاری کے صفحوں کے صفحے۔ لیکن ان کی مقصدی جذباتیت ایک پھنسی کی طرح بڑی ہوتی ہے۔ وہ اپنی تخلیقات کو اپنے ہاتھوں ایسے مکمل اور کامیاب طریق سے دفن کرتے ہیں کہ ہزار مسیحا بھی انہیں جلا نہیں سکتے۔ اور ان کی لکھی ہوئی چیزیں (گو وہ وقتی طور پر بڑا چھبیلا چکیلا تماشہ پیدا کرتی ہیں) پیدائش ہی میں جان دے دیتی ہیں۔ آرٹسٹ منٹو جانتا تھا کہ ایک فن پارے کے لئے مقصدیت اور جذباتیت زہر قاتل ہے۔ ایک تخلیق بہت زیادہ کہی ہوئی باتوں سے مرتی ہے نہ کہ ان کہی باتوں سے۔ اسی لئے وہ بے باکی سے، بے رحمی سے اختصار کرتا تھا۔ کہانی میں جو فقرہ ہو، ضروری ہو، وہ کرداروں میں دم پھونکے یا کہانی کی سالمیت میں معاونت کرے۔ اگر وہ فقرہ ان چیزوں میں سے کچھ بھی نہیں کرتا تو خواہ اس کا خیال کیسا تازہ اور انوکھا ہو، کہانی میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ کہانی اس کے بغیر بہتر ہوگی۔ منٹو ایک بڑا آرٹسٹ تھا کیونکہ وہ ہم عصروں سے زیادہ قربانی کر سکتا تھا۔ مجھے یاد ہے اس نے ایک دفعہ کہا تھا کہ وہ "کھول دو" کو اپنی عظیم ترین کہانی سمجھتا ہے، کیونکہ اس میں ایک بھی فقرہ زائد نہیں۔ اب "کھول دو" بے حد مختصر مختصر افسانہ ہے اور شاید مختصر ترین جو منٹو نے لکھا ہے۔ اس کے افسانے کبھی کتابی دس بارہ صفحوں سے لمبے نہیں ہوتے۔

وہ سومرسٹ ماہم کی طرح اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ ایک مختصر افسانے کا ایک 'شروع' ہونا چاہئے۔ ایک 'وسط' اور ایک 'انجام'۔ اس کا واضح طور متعین پلاٹ ہونا چاہئے۔ اگر اس لکھی ہوئی چیز کا 'شروع' اور 'وسط' تو ہے مگر آخر میں کہانی کسی انجام کو نہیں پہنچتی اور راہ میں اٹکی رہ جاتی ہے تو یہ اور تو سب کچھ ہو سکتی ہے "مختصر افسانہ" نہیں ہو سکتی۔ منٹو اپنی کہانیوں کو صفائی سے ایک چونکا دینے والا انجام دیتا تھا۔ اس کی کئی کہانیوں کے انجام یقیناً عظیم ہیں۔ اور ان کا سارا زور دراصل ان کے آخری فقروں میں ایستادہ ہے۔ "کھول دو"، "موذیل" اور "ٹوبہ ٹیک سنگھ" کے خاتمے عظیم ہیں اور وہ دنیا کی عظیم ترین کہانیوں میں سے ہیں۔ اس کے حرف گیروں نے اس کی کہانیوں کے ان انجاموں کو محض مداری کے ہاتھوں کی صفائی کہہ کر تمسخر اڑایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کا فن زندگی کے مطابق نہیں ہے۔ دنیا کے بڑے مختصر افسانہ نگاروں کی مانند منٹو اس سچائی کو جانتا تھا کہ فن کبھی زندگی کے مطابق نہیں ہوتا۔ فن زندگی کی عکاسی نہیں ہے جو الجھی ہوئی ہے، جس کا کوئی سر پیر نہیں، اور جس میں مسلسل تخیل کی گزشتہ تصویروں، دوستوں کے ساتھ بے رنگ گفتگوؤں اور ایک لامحدود بے منطقی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ایک فن پارہ اس کے برعکس ایک "شکل"، واضح اور موثر چیز ہے۔ شولسن اپنے ایک مضمون میں فن پارے کو اقلیدس کے دائرے کی مانند بتاتا ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ منٹو پہلے اور آخر ایک مختصر افسانہ نگار تھا۔ اس کی کہانیاں اتنی مختصر ہیں ـــــ کہ ایک طرح وہ جسم کے بغیر ہیں۔ اس کی نثر چھوٹے چھوٹے فقروں پر مشتمل ہے اور حیران حد تک رنگینی سے دور ہے۔ اس کی لغت بھی ہم عصروں کی نسبت محدود ہے۔ منٹو کا جینیس میری رائے میں ناول لکھنے کے لئے موزوں نہ تھا۔ منٹو کا خیال تھا کہ ناول اس بات کو کوئی سو صفحے میں پھیلا کر کہنے کا فن ہے جو پانچ صفحوں میں سمیٹی جا سکتی ہو۔ مسلسل اور لگاتار محنت جو ایک ناول لکھنے کے لئے درکار ہے، منٹو کے مضطرب ذہن کو راس نہ آتی۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وہ کوئی ناول شروع کرتا تو چند دن بعد اس سے تنگ آکر اسے بیچ میں چھوڑ دیتا۔ اس کا خیال تھا کہ بہت کم لمبے ناول ہیں جو زندہ رہ سکتے ہیں۔

اس کے فن کے بارے میں ایک اور نکتے کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ اس نے لامحالہ اپنے کرداروں کو روندے ہوئے طبقے سے چنا۔ یہ بڑا انسانیت پرست، طوائفوں، ہمارے بھائیوں، موذیلوں سے محبت کرتا تھا اور ان کے متعلق لکھتا تھا۔ اب کچھ تو یہ اس وجہ سے تھا کہ اپنی ساری زندگی اس نے سوسائٹی سے دھتکارے ہوئے لوگوں کے ساتھ گزاری۔ وہ اس زندگی کو اپنی ہتھیلی کی مانند جانتا تھا۔ وہ ان لوگوں سے ملتا تھا اور ان سے باتیں کی تھیں۔ لیکن اصل وجہ اور تھی۔ مجھے یقین ہے اسے بڑے آدمیوں اور زندگی کے زرق برق راستوں سے کبیدگی تھی۔ اس کے نزدیک دبلے روح، کھوکھلے اور شیخی خورے تھے۔ وہ دلچسپ نہ تھے اس لئے اس نے ان کو شاذ و نادر ہی اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا۔ ان عزت داروں اشراف کی بجائے اس نے طوائفوں اور غنڈوں اور تانگے والوں کے متعلق لکھا۔ اس نے ان کے اندر کے سونے کو نکالا اور انسانی روح کی عظمت اور خوبصورتی کی ایسی تصویر کھینچی کہ اس کے انسانوں کو پڑھنے والے یقیناً بہتر انسان بن گئے۔ ان کو اس حقیقت کا احساس ہوا کہ آوارہ موذیل تمہاری باعفت، سگھڑ، دیندار خواتین سے کہیں عظیم اور خوبصورت عورت تھی۔ وہ اتنی اچھی اور نیک تھی کہ وہ خود بھی اس کی گرد کو نہ پا سکتے تھے۔ منٹو نے ہمیں انسانوں میں اصلی عظمت سے روشناس کیا۔

اس نے ادب میں دلیری اور بے باکی سے وہ کچھ کیا جو پہلے کسی نے کرنے کی جسارت نہ کی تھی۔ مجھے ان لوگوں کے ہوش و حواس کی سلامتی پر شک ہوتا ہے جو اصرار کرتے ہیں کہ وہ فحش نگار ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ منٹو نے کبھی کوئی فحش کہانی نہیں لکھی۔ کیا "کھول دو" ایک فحش کہانی ہے؟ کیا اس بے مثال تند و تلخ شاہکار کو پڑھنے کے بعد ہم یہ خواہش کرنے لگتے ہیں کہ کاش ہم اس بازیافتہ عورت کو ٹرک میں لانے والے بہادروں کے ساتھ ہوتے؟ اگر ہم یہ خواہش کرنے لگتے ہیں تو فحاشی ہمارے اندر ہے۔ منٹو میں نہیں۔ منٹو نے تو فحاشی پر اس زمانے میں سب سے دلیرانہ سب سے تیکھا وار کیا ہے۔ میں ایک سطر لکھ دوں، وہ آرٹ ہے "ایک فانی ناتواں آدمی کے لئے یقیناً ایک اونچا دعویٰ! مگر حیرانی کی بات ہے کہ یہ کس قدر سچ ہے۔ ایک سطر بھی جو اس نے لکھی، آرٹ ہے۔

ایک خط

سو یہ تھا آرٹسٹ منٹو اور انسان سعادت۔ ایک دوست نے مجھے بتایا کہ دہلی میں ایک شام اس نے منٹو کو ایک بدرو کے کنارے پڑا پایا۔ منٹو نے اسے سرد پتھریلی نگاہوں سے دیکھا اور اپنے وہاں ہونے کو گویا سمجھانے کی خاطر کہا کہ وہ بدرو میں اچھائیاں ڈھونڈ رہا ہے۔ "اچھائیاں؟" میرے دوست نے حیرت سے پوچھا۔ "ہاں اچھائیاں" منٹو نے جواب دیا۔ "لیکن میں بدرو میں غلاظت اور گندگی کے سوا کچھ نہیں دیکھ رہا ہوں۔ میری زندگی بھی ایک ایسی ہی بدرو ہے اور میرا عارف بیٹا تو ایک ستھری اور آلودگی سے پاک شے تھا اور وہ سات دن پہلے مر چکا ہے۔" جب منٹو نے یہ الفاظ کہے، تو اس کا چہرہ روایتی غم و الم سے جامد اور خوفناک ہو رہا تھا۔ وہ ہمیشہ زندگی کی بدرو میں اچھائیاں ڈھونڈتا رہا تھا۔ کوئلوں کے انباروں میں لعل۔ یہ مبہم تلاش اکثر بے سود ہوتی تھی۔ اس جستجو میں اس کی آنکھیں کھوئی کھوئی سی رہتی تھیں۔ وہ کسی گنوائی ہوئی چیز کو ڈھونڈتا معلوم ہوتا تھا۔

وہ یہ کہنے کا مشتاق تھا کہ اگر ایک شخص لکھنا چاہتا ہے تو اسے پڑھنا بالکل نہیں چاہئے۔ کہ اس سے مصنف کی "اوریجنلٹی" ختم ہو جاتی ہے۔ اسے زندگی کو ایک پرجوش ولولے سے جینا اور زندگی کی کتاب کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ یہی اس کا اپنا طریقہ تھا اور اس نے عرصہ سے پڑھنا ترک کر رکھا تھا۔ وہ گورکی کو بہت بڑا فنکار تصور کرتا تھا۔ کیونکہ گورکی نے اپنا انسانی فطرت کا علم اور اپنا فن لمبی اسٹرک پر سے حاصل کیا تھا۔ منٹو جانتا تھا کہ کتابیں اصل زندگی کا بالکل بے خون بدل ہیں۔ لائبریریوں میں بیٹھ کر زندگی کا مطالعہ کرنے والے کبھی عظیم فن پیدا نہیں کرتے۔ ... میری رائے میں سارے اردو ادب میں غالب کی مثال کو چھوڑ کر کوئی اور اس کے رتبے کو نہیں پہنچ سکتا۔ فطرت انسانی کے نباض ہونے کی حیثیت میں وہ شیکسپیر کے پاس جگہ پانے کے لئے نااہل نہیں۔ ممکن ہے کتنوں کو میری یہ مدح سرائی مبالغہ آمیز اور انصاف سے کوسوں دور لگے۔ مگر وقت یہ ثابت کر دے گا کہ منٹو کا فن باقی رہنے والا ہے۔

یہ مثال دینے کے لئے کہ اس کی موت نے سلجھے ہوئے اور حساس ذہنوں پر کیا اثر کیا اور کتنے جذبوں کو ان کے دلوں میں ابھارا، نیچے میں اپنے ایک دوست کا اقتباس تقریباً اسی کے الفاظ میں دیتا ہوں جو اس نے مجھے منٹو کی وفات کے چند دن بعد لکھا۔

"منٹو پر قلم اٹھانا کوئی آسان بات نہیں۔ خاص کر اس کے لئے جو اس بڑے انسان کے متعلق اس قدر کم جانتا ہو اور جو کچھ تھوڑا بہت مجھے اس بارے میں علم ہے تمہارے تعارف کی بدولت ہے۔ اس کی موت نے ادبی حلقوں میں غم اور محرومی کی چادر ڈال دی ہے خصوصیت سے ان ناشروں پر جنہوں نے اس کی کتابوں سے ہاتھ رنگے ان بے چاروں کا ٹکسال بند ہو گیا ہے۔ اور سنہری انڈے دینے والی مرغی اب نہیں رہی۔ بہت سے چوٹی کے اخباروں نے اس خبر پر جلی سیاہ حاشئیے چڑھائے۔ بہت سی سوگواری کی محفلیں مچیں۔ ریڈیو پر تقریریں کی گئیں۔ مقالے پڑھے گئے اور پڑھے جائیں گے۔ منٹو نمبر نکلیں گے۔ وہی لوگ جن کے نزدیک وہ راندۂ درگاہ اور قابل دار تھا اب اچانک اس پر مہربان ہو گئے ہیں۔ اس سب ادبی شعور اور ہمدردی کی ظاہرداری کے باوجود بہت تھوڑے ایسے تھے جنہوں نے اس انسان کی پاک روح کو پہچانا۔ یہ سب اونچی اور بلند بانگ باتیں بڑی بھلی اور خوش آئند ہیں۔ لیکن اس درد سے بھرے ہوئے انسان کا درد کسے ہے جو اپنے توانا قلم سے فن تخلیق کو دیتا تھا۔ لوگ حالات سے فائدہ اٹھانے میں بے حد طاق تو ہیں لیکن قدروں کی طرز دیکھو۔ بالشتئے ایک دیو کو اپنے حقیر پیمانوں سے ناپتے ہیں۔ جب میں ان کی باتیں سنتا ہوں تو معاف کرو مجھے

م - ع - باسط
پیسکر - حیدرآباد دکن

جانوروں پر موسیقی کا اثر

شکاگو کے چڑیا گھر کے ۱۲۰ نر اور مادہ مگرمچھ موسمِ بہار میں بھی ایک دوسرے سے لاپرواہ تھے۔ اور ایک دوسرے میں کسی بھی قسم کی دلچسپی نہیں لے رہے تھے۔

اُن کے اس طرزِ عمل سے پریشان محافظانِ چڑیا گھر کو آخر ایک تدبیر سوجھی۔ انہوں نے فرانسیسی بگل بجانے والے ایک آدمی کو چڑیا گھر بلایا جس نے اس بگل سے ایک خاص قسم کی آواز متعدد بار نکالی۔ یہ گونجتی ہوئی آوازیں، مگرمچھوں کی ان آوازوں سے مشابہ تھیں جو وہ اپنی، ماداؤں کو جنسی فعل کی انجام دہی پر اکسانے کے لئے نکالتے ہیں۔ ان آوازوں نے نر اور مادہ دونوں ہی مگرمچھوں کو موسمِ بہار کی اس خوش گوار شام کا لطف اُٹھانے پر مائل کیا۔

نیویارک میں ایک ڈیری فارم کے مالک نے اپنی گایوں کا دودھ دوہتے وقت انھیں ایسی موسیقی سنانی شروع کی جو ان کے لئے تسکین بخش تھی اور یہ معلوم کیا کہ گایوں نے دس فیصد زیادہ دودھ دیا۔ سائنسدان دودھ میں اضافہ کی توضیح اس طرح کرتے ہیں کہ دل کو خوش کرنے والی موسیقی گایوں کو مسرور کرتی ہے اور ان کے اعضا میں نرمی پیدا کرتی ہے جس کی وجہ سے دودھ ان کے تھنوں سے آسانی کے ساتھ باہر نکلتا ہے۔

برطانیہ کے ایک مقام ایسم میں موسیقی کے ذریعے ایک بیمار گھوڑی کا اس وقت علاج کیا گیا۔ اور وہ صحت مند ہوگئی۔ جبکہ ہر قسم کا علاج غیر سود مند ثابت ہو چکا تھا۔ اس عمدہ نسل کی گھوڑی نے ایک ہفتہ سے کھانا پینا بند کر دیا تھا۔ اس کا سائیس ہر قسم کا ہر علاج کروا چکنے کے بعد آخرکار اس کے اصطبل میں ایک گراموفون لایا اور ستار اور شوخ موسیقی کے بہت سے ریکارڈ بجائے۔ گھوڑی نے اپنے کان کھڑے کر لئے اور اپنا چارہ کھانے لگی۔ یہ ریکارڈ اس کے ہر کھانے کے وقت بجائے گئے۔ اور تین دن کے اندر ہی اندر گھوڑی حسبِ معمول اپنا چارہ کھانے لگی۔

آسٹریلیا کے ایک مقام ملبورن میں ایک سرکس کا بہت ہی سدھا ہوا شیر جس کا نام فلپ تھا بری طرح جھلا گیا تھا۔ اور زیادہ سے زیادہ، خطرناک بنتا جا رہا تھا۔ اس کی تربیت کرنے والے شخص نے اُسے گلن طرکی موسیقی کے چند ریکارڈ سنائے۔ لیکن فلپ انھیں سن کر اور بھی زیادہ بے قابو ہو گیا۔ ہر طرح سے مایوس ہو کر آخرکار تربیت کنندہ نے وینیس والیئز موسیقی کے چند ریکارڈ بجائے۔ انھیں سن کر فلپ کسی بلی کے بچے کی طرح بہت رواں ہو ۔ ۔ ۔ گیا

اس طرح حیوانی دنیا میں غیر معمولی طور پر موسیقی کو استعمال کرنے کی یہ چار بالکل ہی نئی مثالیں ہیں، ہم جب یہ جانتے ہیں۔ کہ انسانوں پر موسیقی کا بہت گہرا اثر ہوتا ہے۔ ہم لوریاں گا گا کر اپنے بچوں کو سلاتے ہیں۔ ماہرین نفسیات کہتے ہیں۔ کہ تسکین بخش موسیقی انسانوں کی نبض کی رفتار کو کم کر دیتی ہے۔ اس کے برعکس فوجی موسیقی نبض کی رفتار کو بڑھاتی ہے۔ اور ہم اپنے آپ میں ایک جوش محسوس کرتے ہیں۔

اب سائینداانوں کو پتہ چل رہا ہے۔ کہ جانوروں پر بھی موسیقی کا کم و بیش ویسا ہی اثر ہوتا ہے جیسا کہ ہم پر ہوا کرتا ہے۔ موسیقی سے جانوروں کا دل بہلانے کے مختلف تجربوں کے ذریعہ جس دلچسپ حقیقت کا انکشاف ہوا ہے وہ یہ ہے کہ جانور پرانے طرز کی موسیقی کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ جاز اور راک موسیقی نے انھیں از خود رفتہ بنا دیا۔ مرکزی فرانس کے ایک علاقے رومانجس کے گوالے نے اپنی گایوں کو موسیقی سنائی والٹز کی دل خوش کن اور سیدھی سادی دھنوں کے نتیجہ میں ان کا دودھ متوقع مقدار تک بڑھ گیا۔ لیکن بی۔ باپ موسیقی کو سن کر وہ پاگل سی ہو گئیں اور ان کا دودھ بڑی حد تک خشک ہو گیا۔

لندن کے چڑیا گھر کے دریائی شیر اس وقت تک اپنے کنکریٹ کی چٹانوں پر سرخوشی اور مستی کے عالم میں پڑے رہے۔ جب تک کہ موسیقی کے ذریعے ان کا دل بہلانے والے موسیقاروں نے قدیم طرز کے راگ بجانا بند کر کے جدید طرز کے راگ بجانے نہ شروع کر دیے۔ ان نئے طرز کے راگوں کو سنتے ہی دریائی شیروں نے غراتے ہوئے پانی میں غوطہ لگایا۔ اور پھر سطح آب پر نہیں آئے۔ جاز نامی موسیقی کو سن کر لومڑیاں بے چینی کے ساتھ اس طرح چکر کاٹنے لگیں۔ جیسے وہ کسی تکلیف میں مبتلا ہو گئی ہوں۔ پیرانامی دو جانور آئرلینڈ کی جگ نامی موسیقی کو سن کر وحشیانہ انداز میں غرانے لگے۔ لیکن جب "ہوم سویٹ ہوم" اور "انی لاری" بجایا گیا تو وہ اسے سن کر بہت لطف اندوز ہوئے۔ گینڈے نے یہ معلوم کرنے کے لئے ذرا سا بھی توقف نہیں کیا۔ کہ جو موسیقی بجائی جا رہی ہے وہ اس کی پسندیدہ ہے بھی یا نہیں۔

گو کہ سبھی جانور جاز نامی موسیقی کو پسند نہیں کرتے۔ لیکن انسانوں کی طرح مختلف جانور موسیقی کے مختلف مذاق کا مظاہرہ کرتے ہیں ۱۹۵۴ء میں میاری لینڈ کے ایک مقام لارل میں ملکہ انگلستان کے گھوڑے لانڈوا کا مشقی باجوں اور نقاروں کے ساتھ استقبال کیا گیا۔ لانڈوا نے ہوائی جہاز سے اسوقت تک باہر قدم نہیں رکھا جب تک کہ ان باجوں کی ہنگامہ پرور آوازیں ختم نہ ہو گئیں۔

انٹارٹیکا کے پنگوئن جنہیں گلبرٹ اور سلی وان کی موسیقی نے بے خود کر دیا تھا۔ کیپٹن اسکاٹ کے بحری جہاز "ڈسکوری" کے ملاحوں کے گانے کی آواز میں آواز ملا کر چلانے لگے۔ انٹارٹیکا کا ایک اور کھوجی سرارنسٹ۔ شیاکلٹن بیان کرتا ہے کہ پنگوئن ہلکے اور میٹھے سروں کو پسند کرتے ہیں۔ لیکن جب انھیں والٹزی اور اونٹا گئیں، ولیّ سنایا گیا۔ تو وہ تڑپ کر دور بھاگ گئے۔ ماہی خور چڑیاں بھی رفو چکر ہو گئیں بیشتر کتے موسیقی کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ لیکن ایک برطانوی کتا تو کسی حد تک ماہر فن بھی تھا۔ یہ کتا جس کا نام بینی تھا مڈل مکس نامی ایک مقام پر رہتا تھا۔ وہ "ڈوہ رے می سوہ لائی ٹوڈ" گا سکتا تھا۔ اور بڑی ہی خوبصورتی سے رمبا ناچ سکتا تھا۔

یہاں تک کہ کیڑے بھی موسیقی کی آوازوں کو سننے اور ان سے محفوظ ہونے کی قدرت رکھتے ہیں۔ جب لندن کے چڑیا گھر میں ایک وائلن نواز نے وائلن بجانا شروع کیا تو چڑیا گھر کی مکڑیاں آپس میں لڑنا چھوڑ کر توجہ کے ساتھ وائلن سننے لگیں۔

جانوروں پر نہایت ہی چالاکی کے ساتھ موسیقی کو استعمال کر کے قدیم زمانہ میں ایک زبردست جنگ جیتی گئی۔ آج سے دو ہزار پانچ سو سال پہلے سائیرائٹس نے اٹلی کے ایک بڑے حصے پر قبضہ کر لیا۔ انہوں نے جرأت مندی کے ساتھ کارتھن نامی چھوٹے سے شہر پر حملہ کیا۔ اور کارتھن کی فوج کے مقابلہ میں زبردست گھوڑا سوار فوج لے کر آگے بڑھے۔

کارتھیج کی صفوں سے اہلِ کارتھ کا ایک جتھا چھوٹا سا نمودار ہوا۔ جن کے ہاتھوں میں ہتھیاروں کے بجائے بنسریاں تھیں اور انھوں نے بنسریاں بجانی شروع کر دیں۔ انھوں نے بڑی ہوشیاری سے ساتبرائٹ فوج کی ایک کمزوری کا پتہ چلایا تھا۔ وہ کمزوری یہ تھی کہ جنگی گھوڑوں کو موسیقی پر رقص کرنے کی تربیت دی گئی تھی۔ موسیقی کو سُن کر گھوڑے ناچنے لگے اور رقص کرتے ہوئے آگے بڑھے اور اپنے سواروں کو کارتھ فوجیوں کے ہاتھوں بے بسی کے عالم میں قتل کروادیا۔

موسیقاروں نے ہمیں محظوظ کرنے کے لئے بعض اوقات جانوروں کی آوازوں کو موسیقی میں شامل کیا ہے۔ چند سال قبل امریکہ میں بلیور ڈج مونٹین فیسٹول کے موقع پر موسیقار ولیم ہاکر موسیقی کا ریہرسل کر رہا تھا۔ تو قریب کی ندی کے کچھ مینڈک بھی سازوں کی آواز کے ساتھ اپنی آواز ملانے لگے۔ ولیم ہاکر نے ان کی آوازوں کو اس قدر پسند کیا۔ کہ اس نے ان آوازوں کو اپنی موسیقی میں شامل کر لیا۔

لوئیس یازدہم کے زمانے میں بین نامی مقام کا رہنے والا ایک باجہ ساز جس کا نام ابٹ تھا بادشاہ کو موسیقی کے ذریعے خوش کرنے کا بے حد خواہش مند تھا۔ اس نے ایک باجہ بنایا جس میں ایک چھوٹا سا کی بورڈ لگا ہوا تھا۔ اور اس کے پیچھے سوروں کو رسیوں سے ایک لائن میں باندھ دیا۔ جب ابٹ نے وہ باجا بجایا تو ان سوروں پر وزنی ہتھوڑے بڑے زور سے گرنے لگے۔ انہوں نے اس پر کم و بیش سُروں کے مطابق اپنی آوازیں نکال کر احتجاج کیا۔ ان آوازوں کو سُن کر بادشاہ اور اس کے درباری بے حد مسرور ہوئے۔

یہ ممکن ہے کہ ہماری موسیقی کی آوازیں جانوروں کی سمجھ میں آتی ہوں۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کے ماہر حیوانات ڈاکٹر ڈسمانڈ موریس کا بیان ہے کہ جانوروں کی ہر قوم اپنی مخصوص زبان رکھتی ہے۔ یعنی ایک مخفی اشارت کی زبان جس کے ذریعہ جانور ایک دوسرے سے بات چیت کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم بہت ہی جلد ان کی زبان کے ان مخفی اشارات کو سمجھ لیں گے۔ اور ان سے گفتگو کریں گے۔ جانور ہم سے کیا بات چیت کریں گے یہ مسئلہ ایک علیٰحدہ نوعیت کا ہے۔

بقیہ:- سعادت حسن منٹو

ایسا لگتا ہے۔ جیسے ایک گھریلو بولنڈا زندگی اصطلاحات پر بولنے لگ جائے۔ کم آدمیوں کو اس ادبی شعبے کے گل ہونے کا افسوس اور درد ہے مادر جنم کے ویسے اس کے سامنے نہ جل سکتے تھے اب اطمینان کا سانس لیں گے۔ ویسے اب نہیں ہے۔ اس لئے بانٹتے اب اپنی ہستی کا احساس کرا سکتے ہیں۔ تم اس خلا کو محسوس کر سکتے ہو یا وہ عام چھوٹے لوگ جن کا غمگسار اور سچا دوست وہ آشفتہ مزاج انسان تھا۔ ایسی دردمندی، ایسی بے باک زندگی ملانے کو پہنچ گئی ہے۔ ایسا دلیر، ایسا خوبصورت انسان اپنے بنانے والے کے پاس جا چکا ہے۔ گلیوں کا آوارہ آدمی، عام کچلا ہوا آدمی، دکھ کی خزاں سے ستا ہوا آدمی اب اپنے سب سے بڑے اور پیارے دوست سے محروم ہو چکا ہے۔

اور اس آخری فقرے کو مرے ہوئے عظیم آدمی پر ہمارا الوداعی سلام بن جانے دو۔ اس سے زیادہ اسے کوئی اور تعریف خوش نہیں کر سکتی۔ اس سے زیادہ اور کوئی کتبہ اس کے مناسب حال نہیں ہے!

منظور شدہ محکمہ تعلیمات کراچی بموجب سرکلر نمبر ڈی۔ای/جی۔وی/۳/۵۸۰۲۔۲۰۰۱/۵/۶۰ مورخہ ۱۶ ستمبر ۱۹۶۰ء

اُردو ادب کا ڈائجسٹ

۲ — ۶۵

33495
15.6.96

ادارہ

شاہد احمد دہلوی شمس زبیری

سالانہ	قیمت
بارہ روپے	ایک روپیہ

کاشانۂ اُردو۔ پوسٹ بکس ۷۳۰۲۔ کراچی ۳
فون نمبر ۵۶ ۱۵۰ ۷

ترتیب

افسانے

طنز و مزاح

منظومات

مضامین

ہمارے سب سے بڑے قومی مسئلے پر ایک فکر انگیز کتاب

پاکستانی کلچر

قومی کلچر کی تشکیل کا مسئلہ

از جمیل جالبی

"یہ تصنیف اپنے موضوع کی اہمیت، اپنی معنوی خوبی اور فاضل مصنف کی خوشدلانہ کاوش کے لحاظ سے بڑی قابل قدر تصنیف ہے۔ اس کی زبان اس کا اسلوب بیان اس قدر شگفتہ، سلیس دولکش ہے کہ وہ ایک دلچسپ داستان معلوم ہوتی ہے۔" —— علامہ نیاز فتحپوری

"اس کتاب میں بے شمار مسائل ہیں جو توجہ طلب ہیں۔ خدا کرے کہ یہ کتاب تعلیم یافتہ لوگوں کو بیدار کردے۔" —— ڈاکٹر سید عبداللہ۔

"پہلی مرتبہ اس ملک کے ایک دانشور کو یہ سعادت نصیب ہوئی کہ وہ اس مشکل مسئلہ پر ایسی مدلل اور تفصیلی بحث کرے۔ یہ کتاب خیال و اظہار کی آزادی کی قابل تعریف مثال پیش کرتی ہے۔" —— ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری۔

"جمیل جالبی صاحب نے جس طرح مسئلہ کی پیچیدگیوں کا تجزیہ کیا ہے وہ اپنی جگہ نہایت سنجیدہ اور ہوشمندانہ ہے۔" —— محمد حسن عسکری

اس دور کی ایک بہترین کتاب جسے سنہ ۶۵-۱۹۶۴ء
کا داؤد ادبی انعام بھی ملا

ناشر: مشتاق بک ڈپو۔ شیلڈن روڈ۔ نزد اردو کالج کراچی ۱

عصمت چغتائی
منشور۔ کراچی

کایا پلٹ

"اے تو اسی سال تو بی ایس سی کیا ہے۔ نوکری کی تلاش میں ہے۔"
"ایسے بی ایس سی نہ جانے کتنے جھک مارتے پھرتے ہیں۔ بہت سے بہت ڈیڑھ سو کی نوکری مل جائے گی۔"
"کیوں جی فسٹ پاس ہوا ہے کہ نہیں۔"
"ارے تم تو گھاس کھا گئی ہو۔ فسٹ کلاس پاس ہونا کون سی بڑی بات ہے۔ تشی کا نصیب پھوڑنا چاہتی ہو۔؟"
"اے تو کون سا ابھی بیاہ ہوا جاتا ہے۔ نوکر چاکر ہو جائے تب دیکھا جائے گا۔"
"اجی وہ سوتے میں بھی منڈھے کر آ جائے تو میں اپنی بیٹی اُسے نہیں دوں گا۔ سروپ جی ادھر سوائی مادھو پور میں لڑکا ہے اُس کے لیے جان توڑ کوشش کر رہے ہیں۔ بس دسہرے تک بات پکی ہو جائے گی۔"
"اور جو تشی کو لڑکا نہ پسند آیا تو ــ"
"مجال ہے تشی کی چوں چوں بھی کر جائے۔ اس کنگال سے شادی کر کے ساری عمر کا رونا۔ جبھی تو تم سے کہتا ہوں کہ اسے منع کیوں نہ کیا۔ یہ بھی کوئی طریقہ ہے۔؟"
"اے جی تو مجھے کیا معلوم تھا کہ تم لڑکی کی بات کہیں اور کر رہے ہو۔ کون ہے لڑکا۔ کیا کرے ہے؟"
"راشن آفس میں کہیں نوکر ہے۔ چار سو کماتا ہے۔ آگے اور ترقی ہو گی۔"
"چار سو کی ایسی راشن آفس میں کیسی نوکری ہے؟"
"جبھی میں نے ساری اوپر کی آمدنی لگا کر بتایا ہے۔ یہی سروپ جی کہتے ہیں۔ اچھی آمدنی ہو جاتی ہے۔ بس کم سے کم چار سمجھو۔"
"ابھی تو وہ ایم اے کرنے کو کہے ہے۔"
"بس جی بس ایم اے ویم اے کچھ نہیں کرنا ہے۔ زیادہ پڑھانے سے لڑکیاں بالکل ہی ہاتھ سے نکل جاتی ہیں۔ ساڑھے آٹھ بج رہے ہیں۔ اور آپ کی لاڈلی ابھی تک نہ جانے کہاں گل چھرّے اڑا رہی ہیں۔"
بس رہنے بھی دو۔ خواہ مخواہ بکواس کیے جا رہے ہو۔ میری لڑکی ایسی چھچھوری نہیں۔"

"ارے آجکل کی ساری لڑکیاں آوارہ ہوتی ہیں۔ گھر سے بہانہ کرکے چلی جاتی ہیں اور نہ جانے کیا کیا بدکاریاں کرتی پھرتی ہیں۔"
"شرم نہیں آتی اپنی بیٹی کو بدکار کہہ رہے ہو۔" شرمیتی جی کا گلا بھر آیا۔
"تم ہی سوچو، ساڑھے آٹھ بج گئے، اور لڑکی غائب ہے۔" شرما جی چنگھاڑے۔ "کہے دیتا ہوں ساری عمر سر پکڑ کر روؤ گی۔ میں تو ایک گھڑی اپنے گھر میں نہیں ٹکنے دوں گا۔ کھڑے کھڑے نہ نکال دیا ہو تو نام نہیں۔ آج ذرا آجائے بے شرم کہیں کی۔" شرما جی غصے سے پھنکارتے ہوئے ٹہلنے لگے۔
"بڑے آئے نکالنے والے۔ بے شرم خود ہو جو معصوم بچی پر الٹے سیدھے عیب مڑھ رہے ہو۔" شرمیتی جی دھاڑ دھاڑ رونے لگیں۔
"ارے ابھی تو دیکھتی جاؤ، کیسا سر پکڑ کر لڑکی کی جان کو روؤ گی۔ کیا وہ میری بیٹی نہیں ہے! ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو۔ کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو کہیں منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں رہوں گا۔ تم تو گھر میں بیٹھی رہتی ہو۔ دنیا کے طعنے تو مجھے ہی سننا پڑیں گے۔ اب اس کے سوا اور کیا چارہ ہے کہ کچھ کھا کر سو رہوں۔ بس تم ماں بیٹی کے کلیجے میں تو جب ہی ٹھنڈک پڑے گی۔"
"بھگوان کے لیے ایسی باتیں نہ کیجیے۔ بس نہیں ملی ہوگی۔ یا ٹرین چھوٹ گئی ہوگی۔ اسی مارے دیر ہو گئی ہوگی بس آتی ہی ہوگی۔"
"خاک آتی ہوگی۔ جلسہ کبھی کا ختم ہو چکا ہوگا۔ آنا ہوتا تو آجاتی۔"
"آوے گی کیوں نہیں۔ برے شگن منہ سے نہ نکالو۔"
"اب میں تم سے کیا کہوں، بیکار پریشان ہو جاؤ گی۔ خود ہی سوچو۔ جوان لڑکی راتوں کو غائب رہے۔ ان حرکتوں کا کیا انجام ہوگا۔ زمانہ خراب ہے۔ ان لفنگے لڑکوں پر بھروسہ کرنا سخت حماقت ہے۔ انگریزی فلمیں دیکھ دیکھ کر وہی بدمعاشیاں....."
"ہے بھگوان مجھے تو موت ہی آجائے۔" شرمیتی جی بے قابو ہو گئیں۔
"موت آجائے تو بڑے بھاگ سمجھنا۔ موت سے بھی بری گت ہوگی۔ آئے دن ایسے واقعے ہوتے رہتے ہیں۔ کہ لڑکی کو کوئی بدمعاش بھگا کر لے گیا۔ اور ......"
"میری بیٹی ایسی نادان نہیں۔"
"ایک تم بڑی ودھوان ہو۔ اور دوسری تمھاری بیٹی صاحبہ ہیں۔ ذرا سوچو ڈوب مرنے کی بات ہے یا نہیں۔ کیا سمجھتی ہو تم آجکل کے نوجوانوں کو۔ لڑکی آخر کو جوان ہے۔ بچی تو نہیں۔ سچ بتاؤ کیا تم قسم کھا کر کہہ سکتی ہو تمھاری لڑکی تم سے کہے بغیر کچھ نہیں کرتی؟ یہ راتوں کو جو غائب رہتی ہے تو کیا لڑکے کے ساتھ بیٹھ کر گیتا کا پاٹ کیا کرتی ہوگی۔ چوما چاٹی تو ہوتی ہوگی، اور کون جانے ....."
"بھگوان نہ کرے، میری لڑکی ایسی نیچ نہیں۔"
"اسے آجکل کا یہی فیشن ہے۔ اندھیرے اجالے کیا کچھ نہ ہوتا ہوگا۔ جبھی تو تم سے کہتا ہوں، جب انسان پر شیطان سوار ہو جاتا ہے تو پھر بے چاری لڑکی۔ اب تم سے کیا کہوں؟ یہ بمبئی شہر ہے۔"
"ہو ___ہو ___" شرمیتی جی رونے لگیں۔
"اور ایسے موقع پر نوجوانوں کو اپنے اوپر قابو نہیں رہتا۔ اگر لڑکی شریف ہو اور انکار کرے تو پھر بالکل راکھشش بن جاتے ہیں۔ آئے دن ایسے کیس ہوتے رہتے ہیں کہ لڑکی نے چیں چپڑ کی اور دھر کے دبا دیا ٹینٹوا۔ نہ سالی زندہ رہے گی، نہ پوچھ گچھ ہوگی۔ ریپ اور مرڈر کے کتنے واقعات ہوتے ہیں۔ ابھی اسی دن اخبار میں نکلا تھا۔ کس بری طرح گلا گھونٹا تھا لڑکی کا کہ بس۔"
"اے بھگوان۔ اسے موت آئے ستیش کے بچے کو۔ انگ انگ سے کوڑھ پھوٹے۔ اس کے ہتھے کٹے پھوٹیں۔ ارے میری لونڈیا کو

ہاتھ لگا کر تو دیکھے۔ چھاتی پر چڑھ کے لہو نہ پی جاؤنگی۔ ارے آنے تو دو حرام خور کو۔ مجھے کیا معلوم تھا یوں آستین کا سانپ بن کر ڈسے گا۔ ہائے میری مٹر داسی لتشی۔ اے جی تم نے مجھ سے پہلے کیوں نہ کہا۔؟"

"تم میری سنتی کب ہو جو تم سے کچھ کہتا۔ بھئی آزاد خیال کٹم کی بیٹی ہو۔ تمھارے ہاں تو سب ہی کچھ چلتا ہے۔ تمھاری سگی بہن کھلے بازار ناچتی پھرتی ہیں۔ سارے یورپ میں ٹانگیں اچھالتی پھرتی ہیں۔ بھیا تمھارے طبلچی۔"

"طبلچی کاہے کو ہوتا ——ستار۔"

"ارے وہ ستار ہو یا سارنگی طبلہ ہو ایک ہی بات ہے۔ تم لوگ تو انھیں کلاکار ہی کہتے ہو۔ ہاں جی تم لوگوں کا کیا کہنا اونچے لوگ ٹھہرے۔ اور ہم بیچارے پرانے زمانہ کے لوگ —— مگر اتنا یاد رکھو تم نے اور تمھاری بہنانے اگر میری لڑکی کو پیشہ کرایا تو سات پیڑھی تک جیتا نہ چھوڑوں گا۔"

"اے تمھارے منھ میں خاک۔ پیشہ کریں تمھاری اماں بہنا۔ خبردار جو تم نے میری بچی کو کچھ کہا۔"

"تمھاری ہی بچی ہے۔ میری کوئی نہیں لگتی ——؟ بس تم اپنی سی کروگی اور میں بیٹھا منھ تکوں گا۔؟"

"ارے ابھی تم نے مجھے پہچانا نہیں۔ میں بڑا اسور آدمی ہوں۔ بھگوان کی سوگند آج اس بدذات لونڈیا کو آنے دو اُسے اور اُس کے یار کو کھود کے نہ گاڑ دیا ہو تو۔"

شریمتی جی نے دھڑا دھڑ منھ پیٹ لیا۔ ہائے اُن کی پھول سی بچی۔

"ارے بھگوان کے لیے پولیس کو فون کیجیے۔"

"ہوں اب کورٹ کچہری میں بھی منھ کالا کرواؤ گی۔؟ نہیں بس آج فیصلہ ہو کر رہے گا۔" دھڑ دھڑ کرتے شریمان جی بیڈ روم میں گئے۔ اور پستول نکال کر دھڑا دھڑ گولیاں بھرنے لگے۔"

"یہ کیا کر رہے ہیں؟" شریمتی جی پیلی پڑ گئیں۔

"وہی جو ایک شریف آدمی کو کرنا چاہیئے۔" گولیاں بھر کر پستول انھوں نے سامنے میز پر رکھ دیا۔

"ہے بھگوان —— ہے گوپال —— ہے پرمیشور ——"

"کیا چاہتی ہو؟" شریمان جی چنگھاڑے۔ "کیا وہ آئے تو اُسے شاباشی دوں کہ واہ بیٹی تو نے کٹم کی لاج مٹی میں ملادی۔ یہ میرے اوپر بڑا احسان کیا۔" شریمتی جی ہچکیوں سے بین کر کر کے رونے لگیں۔

"ہائے میری لتشی۔ کیا اسی دن کے لیے پالا تھا تجھے۔ ارے تجھے موت کیوں نہ آگئی۔"

شریمان جی کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ پیروں پر قابو نہ تھا لڑکھڑا کر صوفے پر گر پڑے۔ کبھی کھڑکی کی طرف دیکھتے کبھی دروازے کی طرف۔ پھر غصہ سے لال آنکھیں پستول پر پلٹ کر جم جاتیں۔ پونے نو ہو چکے تھے۔ پانی پل پر سناٹا ہو گیا تھا۔ اکا دکا بس گزر جاتی اور پھر خاموشی۔ ان کے کان سنسنا رہے تھے۔ کنپٹیاں پھٹی جا رہی تھیں۔ شریمتی جی عورت تھیں رو رو کر جی کی بھڑاس نکال رہی تھیں۔ مگر وہ تو بھوں بھوں رو بھی نہیں سکتے تھے۔ دل کی دہشت دور کرنے کے لیے اخبار اُٹھا لیا۔

"سمندر سے ایک گمنام لاش۔" اوہ یہ تو کل کی بات ہے۔ یقیناً لتشی کی لاش نہیں ہو سکتی۔" ساس سے جھگڑا ہونے پر کپڑوں میں آگ لگا کر ——"

مگر لتشی کی تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔ اگر شادی ہو چکی ہوتی تو اس وقت وہ کس قدر چین سے بیٹھے کر اس درد کا

معمہ حل کرکے لاکھوں کمانے کے پلان بنا رہے ہوتے۔ اور شریمتی جی بجائے بھول بھول روتے کے نواسے کے لیے سوئیٹر بن رہی ہوتیں ـــ نواسہ ـــ اف۔

نشی کے بال بکھرے ہوئے ہیں، ماتھے سے خون جاری ہے۔ پتا جی میں لٹ گئی۔ دھڑ سے زمین پر گرتی ہے!

چونک کر شریمان جی نے ڈرا دینے سپنے کو جھٹک دیا۔ نشی ـــ نشی ـــ میلے کچیلے چیتھڑوں میں یہ ننھی سی جان۔ پتا جی ـــ ماتا جی ـــ یہ پھول۔ میری بھول کا پھول۔ شما کیجیے ـــ شما کیجیے۔

انھوں نے لپک کر پستول پر ہاتھ ڈالا۔ پیشانی پر پسینے کے قطرے موتیوں کی طرح چمک اٹھے۔ بازار کا بھاؤ گر رہا ہے۔ گر رہا ہے۔ چڑھ رہا ہے۔ اتر رہا ہے۔

ایک دم ان کے ہاتھوں کی کپکپاہٹ تھم گئی۔

اسکالرشپ ـــ پانچ برس کے لیے۔ لندن۔ اُف۔ اُن کے ہاتھوں سے اخبار گرتے گرتے بچا۔

ستیش کو پانچ سال کے لیے اسکالرشپ۔

"ارے ..... یہ ..... یہ اخبار آج ہی کا تو ہے۔ نہیں کل کا ہے۔ او نہ آج پندرہ ہے نا؟ ارے بولتی کیوں نہیں ہو؟"

"کیا ہے جی؟" شریمتی جی کراہ کر بولیں۔ "ایوننگ نیوز۔ آپ ہی تو لائے ہیں ابھی۔"

"اوہ ـــ ہاں ـــ پڑھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔"

"ہاں وہ اس ابھاگن نشی کے جھگڑے میں بھول گئے۔ اچھا، اب اخبار بعد میں پڑھیئے گا۔ آپ کو میری جان کی سوگند جا کر پولیس میں رپٹ لکھوا دیجیے۔"

"رپورٹ وہ کیوں؟"

"ارے نو بج رہے ہیں لڑکی کا اب تک پتہ نہیں۔"

"تو اتنا گھبرانے کی کیا بات ہے۔ اکیلی تو نہیں گئی۔"

"اسی شیطان کے بچے ستیش کے ساتھ گئی ہے۔"

"گالیاں دے کر کیوں زبان گندی کرتی ہو؟"

"گالیاں نہ دوں تو کیا موئے کی بلائیں لوں۔ دو گھڑی کی آئے مونڈی کاٹے کو۔ میری لونڈیا کو نہ جانے ماٹی ملا کہاں لے گیا۔ ارے سنتے ہو جی۔"

"ہاں ہاں سن رہا ہوں۔ تم عورتوں کو تو ہر بات کا ہول سوار ہو جاتا ہے۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہو جی۔ وہ شیطان میری لونڈیا کا جیون نشٹ کر دے اور ـــ"

"شی ـــ چھ چھ چھ۔ ایسی اوٹ پٹانگ بکواس سے کیا فائدہ۔" بڑے دھیرج سے بولے۔

"مگر ابھی تو خود ہی کہہ رہے تھے کہ ـــ"

"ہاں ہاں، میں نے اگر نشی کی بھلائی کے لیے کچھ کہا تو اس کے یہ معنی تو نہیں کہ بس ـــ کہ بس بالکل ہی لڑکا نکما ہے۔ میرے خیال میں تو ستیش ایسا زیادہ برا ابھی نہیں جتنا ہم سمجھ رہے ہیں۔ اور ماں کے ناتے کوئی دھگدا تمھارے دل میں ہو تو اُسے نکالنے کی کوشش کرو۔"

"کیوں؟ کالا منہ ستیش کے نیچے کا۔ آنے تو سہی۔ جوتی لے کر مونڈی کاٹ کے منہ توڑ کے نہ رکھ دوں تو کہنا۔ نو بج رہے ہیں۔ اور ــــ"

"بڑا رش ہوتا ہے بوری بندر پہ۔ بس نہیں ملی ہوگی۔"

"تو ٹرین سے آجاتے۔" شریمتی جی چڑھ گئیں۔

"جلسہ دیر سے ختم ہوا ہوگا۔"

"میں پوچھتی ہوں بات کیا ہے۔ ابھی تو کہہ رہے تھے ....." شریمتی جی بگڑ کھڑی ہوئیں۔

"یہ او ہو تم تو بال کی کھال نکالتی ہو۔ لو شاید وہ لوگ آگئے۔ ستیش کی ہنسی معلوم ہوتی ہے۔"

"لاؤ مجھے دو پستول۔ میں موئے کے کلیجے میں گولی ماروں گی۔"

"کیا پاگلوں کی سی باتیں کرتی ہو۔ سنو اس وقت تم انھیں کچھ نہ کہنا۔" اُنھوں نے جھٹ پستول دراز میں رکھ دیا۔

"کیوں ــ؟ کیوں نہ کہوں؟" شریمتی جی الجھنے لگیں۔

"میں جو کہتا ہوں۔"

"مگر ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ ــــ"

"او ہو ــ وہ تو کبھی غصہ میں کہہ ہی جاتا ہے انسان۔"

"یہ بات کیا ہے۔ ایکدم یہ پلٹا کیوں لیا۔"

"معلوم ہو جائے گی بات۔" شریمان جی نے اُٹھ کر دروازہ کھولا۔

"ہلو ڈیڈی ــــ" تشی برساتی کا پانی جھاڑتی داخل ہوئی۔ "اُف بس اسٹینڈ پر کھڑے کھڑے مر گئے۔ کیا لمبا کیو تھا۔ جلدی سے کھانا ملے گا۔"

شریمتی جی کچھ بوکھلائی ہوئی تھیں۔ کچھ کہنے کو منہ کھولا ہی تھا کہ جلدی سے شریمان جی بولے۔

"ہاں ہاں ستی تم بھی کھالو۔"

"جی ــ مگر ــ تشی ــ اگر آپ اجازت دیں تو۔"

"میں نے کہہ دیا ستو ڈیڈی اتنی رات کے لیے اجازت نہیں دیں گے۔ تم چلے جاؤ ڈنر پہ۔ میں نہیں جا سکوں گی۔"

"تو پھر میں بھی نہیں جاؤں گا۔"

"ہونہہ مت ــ" تشی تنک کر بولی۔

"کیا بات ہے ــ کیسا ڈنر ــ؟" شریمان جی بڑی نرمی سے بولے۔

"میرے ایک دوست کی شادی ہے۔ ڈنر پر ہم دونوں کو بلایا ہے۔"

"یہ بھی تو بتاؤ کہ قوالی بھی ہے۔ بارہ بج جائیں گے۔" تشی بولی۔

"نہیں ساڑھے دس تک کھانا ہو جائے گا۔"

"آتے آتے گیارہ تو بجیں گے۔ اور اب دیر بھی ہو رہی ہے تمھیں تم چلے جاؤ۔"

"چلی جاؤ تشی ــ؟"

"مگر ڈیڈی دیر ہو جائے گی تو۔"

"ستیش تمھارے ساتھ ہوگا یا نہیں؟"

"جی ہاں!"

"تو بس پھر چلی جاؤ۔"

"ہائے ڈارلنگ ڈیڈی — چلو ستو۔" تشی نے لپک کر برساتی اٹھالی۔

"میری گاڑی لے جاؤ۔ یہ رہیں چابیاں۔ رسان سے نکالنا گاڑی کہیں ٹکر وکر نہ لگے۔" پیار سے بولے۔

"مگر میں بس کھانے کے بعد چلی آؤں گی۔ قوالی تو نہ جانے کب تک ہو گی۔"

"تو کیا ہوا سن کر ہی آنا — یہی تو لوگوں میں خرابی ہے۔ اپنے دلیش کی کلا کی کوئی قدر نہیں کرتے۔"

"نہیں جی یہ رات گئے تک غیر گھر میں رہنا ٹھیک نہیں۔" شریمتی جی نے تیوریاں چڑھالیں۔

"ارے بھائی جانے بھی دو۔ اس میں ہرج ہی کیا ہے۔" شریمان جی نے بیوی کا ہاتھ دبایا۔

"یہ کیا ہو گیا ہے آپ کو۔"

"جاؤ جی تم لوگ۔"

"مگر ممی۔" تشی نے سہم کر ماں کو دیکھا۔

"نہیں جی، تمھاری ممی تو یونہی کہہ رہی ہیں — آخر تمھاری ماسی اتنی بڑی کلاکار ہیں۔ سارے یورپ میں ان کا نام ہے۔ ایک تم ہو کہ کلا کے نام لٹھ بھی نہیں آتا۔ جاؤ قوالی سن کر آنا۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا۔" ان دونوں کے جانے کے بعد شریمتی جی بکھر گئیں۔

"تمھاری سمجھ میں آتا ہی کیا ہے۔ بس سوائے چولھے چکی کی باتوں کے اور کسی طرف عقل ہی نہیں چلتی۔"

"ہاں جی ایک تم ہو عقل کے ٹھیکیدار۔ مگر میں کہتی ہوں یہ کایا پلٹ کیوں ہو گئی۔ ابھی تو توپ بندوق تانے بیٹھے تھے کہ گھڑی بھر میں شیرہ شکر ہو گئے۔ کیوں جانے دیا اس وقت لڑکی کو۔؟"

"تم نہ سمجھو گی۔" شریمان جی مسکرائے۔ "آج کا اخبار بھی دیکھا۔؟"

"کیا دیکھوں، آگ لگے اخبار میں!"

"میرا سر — یہ دیکھو ستیش میر چندانی کو پانچ سال کے لیے سرکاری وظیفہ دے کر ولایت بھیجا جا رہا ہے۔ جانتی ہو ولایت پلٹ کو آجکل کیا گریڈ ملتا ہے —؟"

"میری جانے بلا نہ جانے کیا کہہ رہے ہو؟"

"جبھی تو کہتا ہوں تم نہیں سمجھو گی۔ لڑکی کے بھاگ جگ اٹھے۔ شادی کر کے سنگ ہی بھیج دوں گا میں تو۔ تم عورتوں کے پاس تو عقل جیسی کوئی چیز نہیں ہوتی۔"

"اور جو سوائی مادھو پور میں بات چل رہی ہے۔"

"ارے مارو گولی سالے سوائی مادھو پور کو — تشی اور ستیش کا جوڑ بھی اچھا رہے گا۔"

"اے جی، تو تم نے ستیش کے سامنے ہی ذکر کیوں نہ کیا؟"

"بھئی بڑی ہی موٹی بدھی پائی ہے۔ اری عقل کی دشمن۔ اگر اُس کے سامنے ذکر کر دیتا تو وہ سمجھتا ہم اس لیے تشی کو رات کے وقت اُس کے ساتھ بھیج رہے ہیں کہ اُسے اسکالرشپ ملا ہے؟"

"اوہ سمجھی۔!"

"شکر ہے بھگوان کا۔ کچھ تو سمجھیں۔ بھئی اپنی تشی کو اتنا اچھا لڑکا کہاں ملتا۔ پھر دونوں کا پیار ہے جہیز پر بھی جھگڑا نہیں ہوگا۔"

"کچھ بھی ہو رات کے وقت جوان لڑکی کو بھیجنا ٹھیک نہیں۔ کون جانے۔"

"تم تو بس اسے اپنے کولھے سے لگائے بیٹھی رہو۔ تشی کوئی نادان ہے۔"

"مگر میرا تو جی ڈر رہا ہے۔ کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے تو۔"

"نہیں جی ایسی ویسی بات کچھ نہیں ہو سکتی۔ ستیش بہت شریف بچہ ہے۔"

"جو شیطان ہی سوار ہو جائے تو۔؟"

"تم عورتوں کے دل میں تو فضول کے وہم بھرے ہوتے ہیں۔ اتنا نہیں سمجھتیں کہ ستیش جان بوجھ کر اپنے پیروں پر کیوں کلہاڑی مارے گا۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ اتنا بڑا اسکالرشپ ملا ہے۔ بھگوان نہ کرے کوئی اسکینڈل ہو جائے تو سارا کیریر ختم ہو جائے گا۔ ان باتوں کی بڑی چھان بین ہوتی ہے۔ دوسرے اس میں ہمارا کیا نقصان ہوگا۔ پھر تو اُسے شادی کرنا ہی پڑے گی۔ تم خاطر جمع رکھو وہ کوئی چھچھوری بات نہیں کرے گا۔ اور پھر اپنی تشی کو پسند بھی کرتا ہے۔ نہ جانے کس جنم کا کیا دیا کام آگیا۔ بیٹھے بٹھلائے اتنا اچھا لڑکا مل گیا۔"

"ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔ کہاں ہے ستیش کا نام؟" شریمتی جی اخبار پلٹنے لگیں۔

"اُنھو یہ سامنے ہی تو ہے تیسرے برج پر۔ ستیش میرچندانی۔"

"ہائے رام۔ یہ تو ستیش میرچندانی ہے۔"

"اور میں کیا کہہ رہا ہوں۔؟ میں بھی تو ستیش میرچندانی ہی کہہ رہا ہوں۔"

"پر اپنا ستیش تو رام چندانی ہے۔"

"رام چندانی؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ تم نے پہلے سے کیوں نہ کہا۔؟"

"اے تو مجھے کیا معلوم تھا کہ ـــــ"

"تمھیں تو کچھ معلوم ہی نہیں۔ ننھی ہو نا۔ کتنی دفعہ کہا تم سے لڑکی کو ان سندھیوں سے نہ ملنے دیا کرو۔ ہمارا ان کا کیا جوڑ۔ کم بختوں کے کیا اوٹ پٹانگ نام ہوتے ہیں۔ آنے دو حرام زادے کو۔ کیا سمجھ رکھا ہے۔"

.... شریمتی جی روہانسی ہو گئیں۔

.... شریمان جی غرّائے۔

.... شریمتی بسوریں۔

.... شریمان پھنکارے۔

.... شریمتی جی بھوں بھوں رونے لگیں۔

.... شریمان نے دراز کھول کر پستول نکال لیا۔

ادب کا اعلیٰ معیار ہمارا معیار ہے

اور

نیا دور کا نام اس معیار کی ضمانت ہے

نیا دور کراچی

کا تازہ شمارہ ۳۵-۳۶

شائع ہوگیا ہے

اس میں پاکستان اور ہندوستان کے بہترین لکھنے والے اپنی معیاری اور اعلیٰ تخلیقات کے ساتھ شریک ہیں۔

•

اپنے کسی قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیے یا براہ راست ہمیں لکھئے

منیجر نیا دور — کراچی ۵

انور فنون۔ لاہور

آوازیں۔ گلدستے۔ زلزلے

یار و تمہارے باپ بڑے فرماں بردار ہیں، بنگلہ چوک اور بیرا تمہارے قبضے میں چھوڑ کر بڑے ادب سے سر جھکائے ہوئے اپنے دوست کی شادی پر لاہور چلے گئے ہیں۔

بیرا بھی جا رہا ہے

کہاں؟

لندن۔

یعنی تمہارے ماں باپ لاہور گئے ہیں اور تمہارا بیرا لندن جا رہا ہے؟

جی ہاں!

اور تم اتنے بے غیرت ہو کہ ابھی تک یہیں بیٹھے ہو۔

میرا ارادہ بھی گھاس بندر کی طرف جانے کا تھا۔ گھاس بندر کی نیٹو جیٹی کے پاس ایک پل ہے۔ جس کو کراچی کے باشندے خودکشی کے مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ اب مجھے بھی گھاس بندر کی طرف روانہ ہو جانا چاہیئے۔ لیکن پھر مجھے یاد آیا کہ مفت خوروں کا ایک قافلہ جس کی سرحدیں پھیل کر حرام خوروں اور حلال خوروں دونوں سے مل گئی ہیں۔ آج میرے بنگلے پر "ایٹ ہوم" ہونے کے لئے آئے گا۔ اور چائے کا مطالبہ کرے گا۔ اس لئے میں نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔

کیا اس گوہر فشانی کا مطلب یہ ہے کہ حضور پر نور کا بیرا لندن روانہ ہونے سے پہلے ہم سب کو ایک ایک پیالی چائے عنایت کر سکے گا؟

نہیں۔

کیا؟

کیا!

کیا؟

وہ اس وقت بالی وڈ ہیئر کٹنگ سیلون میں حجامت بنوا رہا ہے۔ ہر پنجابی سفر شروع کرنے سے پہلے حجامت بنوانا اپنا فرض سمجھتا ہے۔

میں نے پنجابیوں کی اس عادت کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ لیکن میں یہ نہیں سمجھ سکا۔ کہ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ شاید وہ اس لئے ایسا کرتے ہیں۔ کہ جب ڈھائی من کا ٹرنک اٹھا کر سفر پر روانہ ہوں تو وہ ڈھائی من سے کم معلوم ہو۔ یا شاید وہ اپنے آپ سے کہتے ہوں۔ کہ سفر سے پہلے حجامت بنو پھر شاید حجام نصیب ہی نہ ہو۔ یا شاید وہ غیر دانستہ طور پر "ٹریول لائٹ" کے اصول کی پابندی کرتے ہیں۔ تاکہ ٹرینیں بوجھ سے تھم نہ جائیں بحری جہاز ڈوب نہ جائیں۔ اور ہوائی جہاز گر نہ پڑیں۔ کچھ بھی ہو۔ مجھے یہ عادت عجیب سی لگتی ہے اور چونکہ میں پنجابی ہوں اس لئے سفر سے میں کبھی حجامت نہیں بنواتا۔ تاکہ لوگ مجھے پنجابی نہ سمجھ لیں۔

جناب عالی، آپ ہماری چائے گول کرنے کا ارادہ تو نہیں رکھتے؟

چائے آ رہی ہے!

بیرا تو تمہارا ہالی ووڈ ہیر کٹنگ سیلون ہے۔ چائے کون لائے گا؟

دوسرا بیرا لائے گا۔

حضرات! میں پوچھنا چاہتا ہوں! کیا آپ نے اپنے گوش نصیحت نیوش بند کر لئے ہیں؟ کیا آپ کو یاد نہیں کہ ایک دانشور نے ایک دلچسپ بات سنانے کی پیشکش کی تھی۔

ہم وہ دلچسپ بات سننا چاہتے ہیں۔

لیکن ٹھہریے! میرا سوال اب بھی اپنے مقام پر قائم ہے۔

عربی مت بولیے۔ اردو بولیے۔

آپ یہ کہنا چاہتے ہیں۔ کہ آپ کا سوال اپنی جگہ پر کھڑا ہے۔

تو اس سے کہئے کہ وہ بیٹھ جائے اور ہمارے ساتھ چائے پیے۔

حیرت ہوتی ہے کہ خدائے ذوالجلال و قادر مطلق کی دنیا گناہوں اور گمراہیوں کے اندھیرے میں کیوں بھٹک رہی ہے اور اس کی مخلوق غلط راستوں پر کیوں جا رہی ہے؟

وہ غلط راستوں پر نہ جائے تو پھر ہمارے لیڈر کہاں جائیں گے؟

ہمارے نائٹ کلبوں کا کیا ہوگا؟

سینما ہال، معبدوں میں تبدیل ہو جائیں گے۔

روک اینڈ رول بند ہو جائے گا۔

میرا خیال ہے قدرت کا موجودہ نظام بہتر ہے۔ تمام گناہوں کی لذت سے بہرہ ور ہو کر توبہ کر لی اور سلیٹ صاف ہو گئی۔ یہ بکواس بند کیجئے یہ کفر ہے۔

یہ بڑا دلآزار موضوع ہے۔ میں نے پہلے بھی اس کو بدلنے کی کوشش کی تھی!

اذان!

اذان ہو رہی ہے۔

یہ اذان کہاں سے آ رہی ہے؟

بنگلور ٹاؤن سے!

اور یہ؟

نورسری ہے۔

اور یہ؟

سندھ مسلم سوسائٹی ہے۔

سندھ مسلم سوسائٹی کی مسجد سے آج کون اذان دے رہا ہے؛ یہ وہ موذن تو نہیں جس کی پیاری آواز میں نے یہاں بیٹھ کر پچھلے ہفتے سنی تھی۔ اس کی آواز سن کر میں وجد میں آگیا تھا میں آج یہاں صرف یہ اذان سننے کے لئے آیا تھا۔ لیکن پہلے ظہر کی اذان اور اب عصر کی اذان، دونوں اذانیں اس موذن کی نہیں۔

مجھے ان سے اتفاق ہے۔ میں بھی سندھ مسلم سوسائٹی کی مسجد کے موذن کا مداح ہوں۔ اذان سن کر مجھ پر ایک عجیب خضوع وخشوع کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اور میرا دل نماز پڑھنے کو چاہتا ہے۔

میں بھی اس موذن کی اذان سے بے حد متاثر ہوں۔ مجھے بارہا خیال آیا ہے۔

دیکھو کوئی کفر نہ بک بیٹھنا۔ اور وہ سامنے کون آرہا ہے؟

غازی نقشبندی!

ادب سے پورا نام لو۔ مولانا رحمت اللہ غازی نقشبندی نائب ناظم اعلیٰ جماعت مساکین۔ کراچی۔

اب اس موضوع کو بدلنے کے سلسلے میں یہ تمہارا آخری چانس ہے اگر مولانا غازی نقشبندی اس بحث میں کود پڑے تو یہ بحث عشا کی نماز تک ختم نہیں ہوگی۔

ارے نہیں۔ بچ گئے۔ بچ گئے۔ مولانا نقشبندی ہماری طرف نہیں آرہے۔ انہوں نے اپنا رخ تبدیل کر لیا ہے وہ مزار شریف کیطرف جارہے ہیں ـــ

بہرحال اب یہ موضوع دوبارہ شروع نہیں ہوگا۔

آپ ایک دلچسپ بات بتانا چاہتے تھے۔ فرمائیے۔

کل شام کے دھندلکے میں میں لال کوٹھی کے بس اسٹاپ پر اتر کر ادھر آرہا تھا۔ کہ مجھے لال کوٹھی کے ڈاکخانے کے سامنے چار لڑکیاں، کھڑی نظر آئیں، خوبصورت، رنگدار بھڑکیلے لباس میں، ان کو دیکھ کر میں اس بنگلے کے مصنوعی حسن کو بھول گیا۔ اور میرے دل میں قدرت کے حسین شاہکاروں کے نظارے سے زمینوں اور آسمانوں میں حسن پیدا کرنے والے خالق اکبر کی حمد وثنا کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ اور میں سیدھا راستہ چھوڑ کر ٹیڑھے راستے پر چل پڑا۔ جب میں لال کوٹھی کے ڈاکخانے کے سامنے پہنچا تو میں دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ اور جب میں دھاڑیں مار مار کر رو چکا تو قہقہے مار کر ہنسنے لگا۔ کیونکہ لال کوٹھی کے ڈاکخانے کے سامنے چار لڑکیاں نہیں کھڑی تھیں۔ بلکہ چار لیٹر بکس کھڑے تھے۔ سبز، سرخ، نیلا، سرخ نئے پینٹ کئے ہوئے۔

ہا ہا ہا

ہا ہا ہا

ہمارے لیٹر بکس پاکستانی نہیں ہیں۔ انگریز ہیں۔ سر پر ہیٹ پہنتے ہیں۔ ایک لمحے کے لئے اپنے سر سے ہیٹ نہیں اتارتے۔ تاکہ انہیں کوئی، پاکستانی نہ سمجھ لے۔ ہمارے ملک میں جگہ جگہ لیٹر بکس ہیٹ پہنے ہیں۔ تاکہ ہمارے دلوں میں انگریزوں کی حکومت کی یاد تازہ رہے اور بڑے بڑے

ڈاکخانوں کے سامنے لیٹر بکس کی قطاریں دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے انگریز تلنگوں کی فوج کا ایک دستہ ہیٹ اور وردی پہنے لائن میں کھڑا ہے
جی نہیں۔ قطعاً نہیں۔ آپ کی آنکھوں کے ناخن بڑھ گئے ہیں۔ اور بڑھ کر آپ کی آنکھوں کے سامنے آ گئے ہیں۔ اس لیے آپ کو صرف وہ چیزیں نظر آتی ہیں جو آپ نے ماضی میں دیکھی ہیں۔ اگر آپ اپنی آنکھوں کے ناخن اتروادیں اور ان پر حال کی عینک لگا لیں تو آپ دیکھیں گے کہ ہمارے لیٹر بکس ہمارے ذہنوں میں ہیٹ کا نہیں بلکہ ایک گنبد کا تصور قائم کرتے ہیں۔ ہمارا گنبد، ہماری اسلامی تہذیب کا سمبل ہے
کیا آپ یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کہ انگریز جنہوں نے ہمارے ملک میں ڈاکخانے اور لیٹر بکس قائم کئے، یہاں اسلام کی تبلیغ کرنے آئے تھے؟

بات صرف اتنی تھی۔ کہ لیٹر بکس کو دیکھ کر ہیٹ نہیں بلکہ گنبد یاد آتا ہے۔
دیکھیے آپ قوالی شروع کرنے کی کوشش کر رہے۔
قوالی شروع ہونے سے پہلے میں ایک لسانی لغزش کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔
فرمائیے۔
آپ نے بحث کے شروع میں کہا ہے۔ آپ کی آنکھوں کے ناخن بڑھ گئے ہیں۔ یہ غلط محاورہ ہے۔ عقل کے ناخن ہوتے ہیں۔ آنکھوں کے ناخن نہیں ہوتے۔
کیوں نہیں؟ اگر عقل کے ناخن ہوتے ہیں تو آنکھوں کے ناخن کیوں نہیں ہو سکتے؟
یہاں ہو سکتے کا سوال نہیں ہے ہونے کا سوال ہے۔ زبان کے اپنے قواعد و ضوابط ہوتے ہیں۔ زبان کو کنافتوں سے محفوظ رکھنے کے لئے ان قواعد و ضوابط کی پابندی لازمی ہے۔ ادب میں محاورے کو بڑا اہم مقام حاصل ہے۔ ہمیں تحریف کا اختیار نہیں۔۔۔ مجھے آپ سے اختلاف ہے۔ زبان قواعد و ضوابط کے قید خانے میں بند نہیں رہ سکتی۔ وہ ان کو توڑ پھوڑ کر آگے بڑھتی، پھیلتی اور وسیع ہوتی رہتی ہے۔
اچھا! ان سے پوچھئے۔ یہ اردو ادب کے اسکالر ہے ہیں اور اردو زبان میں ایک رسالہ نکال رہے ہیں۔ کیوں صاحب، جس طرح عقل کے ناخن ہوتے ہیں۔ اس طرح آنکھوں کے ناخن بھی ہوتے ہیں؟
نہیں۔ نہ عقل کے ناخن ہوتے ہیں اور نہ آنکھوں کے۔۔۔ پھر؟
انگلیوں کے ناخن ہوتے ہیں۔
ہا ہا ہا
ہا ہا ہا
خاموش!
خاموش!

با ادب با ملاحظہ ہوشیار! با ادب با ملاحظہ ہوشیار۔
ملکۂ چائے کی سواری آ رہی ہے۔
چائے آ گئی!
چائے آ گئی!
دیکھو! علی محمد وہیں ڈائننگ ٹیبل پر چائے بناؤ اور یہاں لا کر دے دو۔

اچھا جی!

علی محمد!

جی!

فیروز خاں کہاں رہے؟

صاب، وہ لندن جانے کی تیاری میں تھا۔ باربر شاپ پر حجامت کرا رہا تھا۔ پولیس نے گرفتار کر لیا۔

ہیں! کیوں؟ کیا بات ہے؟ کیا ہوا؟

پولیس کو اس کے قبضہ میں دو کھوئے ہوئے پاسپورٹ ملے ہیں۔ ایک کسی ریاض محمد شاہ کا، دوسرا بوٹا خاں کا۔ سنا ہے وہ کسی جعلی پاسپورٹ بنانے والی کمپنی سے ملا ہوا ہے۔ وہ کمپنی دو ہزار روپے میں جعلی پاسپورٹ بیچتی ہے۔ [illegible] جن کا کام صرف دوسروں کے پاسپورٹ چرا کر کمپنی کو لا کر دینا ہے۔ جب کوئی آدمی اس کمپنی سے پاسپورٹ [illegible] ہے تو وہ کسی پاسپورٹ سے اصل فوٹو اتار کر اس پر لگا دیتی ہے اور دو ہزار روپے لے لیتی ہے۔ فیروز خاں اس کمپنی کے [illegible] کمپنی نے اس کو بھی ایک جعلی پاسپورٹ بنا کر دیا تھا۔ وہ ریاض محمد شاہ بن کر لندن جا رہا تھا۔ اور اس کا کوئی دوست بوٹے خاں بن کر اس کے ساتھ جا رہا تھا۔ پولیس نے چھاپہ مار کر سب کو گرفتار کر لیا۔ چلئے پیجئے۔

چلئے کو گولی مار۔ فیروز خاں کی بات کر۔

یار، تم کس دلدل میں پھنس گئے ہو۔ آرام سے چائے پیو اور ہمیں بھی پینے دو

یار، دراصل آج میں تمہیں ملنے کے لئے تمہارے بنگلے پر نہیں آیا تھا۔ تمہارے سرے فیروز خاں سے ملنے کے لئے آیا تھا۔

کیوں؟

وہ میرے لئے پاسپورٹ کا انتظام کر رہا تھا۔ ہم دونوں اکٹھے لندن جا رہے تھے۔ وہ ریاض محمد شاہ بن کر اور میں بوٹے خاں بن کر۔ میں تیار ہو گیا۔ میں نے کئی دوستوں سے قرض لے کر دو ہزار روپے کا انتظام کیا تھا۔ اس میں ایک انجمن کا چندہ بھی تھا۔

تم بڑے احمق آدمی ہو۔ تم نے یہ پاسپورٹ حاصل کرنے کا کونسا طریقہ نکالا ہے؟

اور کیا کرتا؟ میں نے پاسپورٹ آفس کے سامنے کے دروازے سے پاسپورٹ حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے لیکن کہا۔ یا اب نہیں ہو سکا۔ آخر اب میں پچھلے دروازے سے پاسپورٹ حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں یہ سوچ رہا ہوں۔ کہ اگر تم ریاض محمد شاہ کے ساتھ بوٹے خاں بن کر لندن میں داخل ہو جاتے تو تمہارا کیا معلوم ہوتا اور تم اس کے بیرے۔ تم نے یہ پوزیشن کیوں قبول کی۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا، کہ تم ریاض محمد شاہ بنتے اور وہ بوٹے خاں۔

نہیں۔ جعلی پاسپورٹ پر ریاض محمد شاہ کی" فیروز خاں کے بار تھی۔ اور بوٹے خاں کی میرے برابر۔

میں خوش ہوں تمہیں پاسپورٹ نہیں ملا۔ نہ سامنے کے دروازے سے نہ پچھلے دروازے سے۔ اور میں حیران ہوں۔ کہ ہمارے نوجوان اپنے ملک سے بھاگنے کی کوشش کیوں کر رہے ہیں؟ ہمارے ملک میں کس چیز کی کمی ہے؟

سفید عورتوں کی۔

مذاق چھوڑیئے۔ میں واقعی یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ہم لوگ یورپ کی طرف کیوں کھنچے چلے جاتے ہیں۔ یورپ کے اکثر ملک کئی لحاظ سے ہمارے ملک کے مقابلے میں بدتر ہیں۔ موسم کے لحاظ سے۔ قیمتوں کے لحاظ سے، اخلاق کے لحاظ سے اور یہ ایک حقیقت ہے۔ کہ یورپ امریکہ اور انگلستان

کے باشندے ایشیائی ملکوں میں آکر اپنی زندگی گزار دیتے ہیں۔ اور اس وقت تک واپس جانے کا نام نہیں لیتے جب تک گارڈن پارٹیاں میں الوداعی نظمیں سُناسنا کر اور گلاب اور گیندے کے ہاروں سے لاد کر واپس جانے کے لئے ان کی ہزار ہزار خوشامدیں نہ کی جائیں۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو ہمارے ملک میں ایک ایسی شے مل جاتی ہے جو ان کے ملک میں بالکل نایاب ہے

وہ کیا؟

ملازم۔

ملازم؟

ہاں، ملازم ایک ایسی بے بہا شے ہے جو مغربی ممالک میں کسی قیمت پر نہیں ملتی۔ اس لئے وہاں کے باشندے ان کی تلاش میں افریقہ اور ایشیا پہنچ جاتے ہیں۔ جہاں ملازم کثرت سے پائے جاتے ہیں اور تقریباً مفت مل جاتے ہیں۔

آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ میرے والد ماجد ان دنوں کا ایک قصہ سنایا کرتے ہیں۔ جب انگلستان سے ڈپٹی کلکٹر اور کلکٹر ہماری اسٹیج پر راجوں اور مہاراجوں کا پارٹ ادا کرنے کے لئے بلائے جاتے تھے۔ پچھلی جنگ کے دوران میں میرے والد ماجد کو ایک دفعہ انگلستان جانے کا اتفاق ہوا۔

ایک دفعہ انہوں نے ریلوے اسٹیشن پر ایک عجیب نظارہ دیکھا۔ ایک شخص دو سوٹ کیس دونوں بغلوں میں دبائے اور دو بھاری سوٹ کیس، دونوں ہاتھوں میں لٹکائے گاڑی سے اُتر کر ہانپتا کانپتا ٹیکسی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ابا جان نے پہچان لیا۔ وہ ہمارے ضلع کا سابق ڈپٹی کمشنر تھا۔ اس نے ابا جان کو دیکھ کر کوئی خفت محسوس کرنے کے بجائے ان کو ناشتے پر مدعو کر لیا۔ اور ٹیکسی میں اپنے ساتھ بٹھا کر اپنے گھر لے گیا۔ اس کا گھر پتھر کی اینٹوں کا بنا ہوا تھا۔ جن کو کارخانے کے دھوئیں نے سیاہ کر دیا تھا۔ اور جن پر بارشوں کے پانی نے کائی پیدا کر دی تھی۔ جب ابا جان اور سابق ڈپٹی کمشنر اندر داخل ہوئے۔ تو انہوں نے دیکھا کہ سابق ڈپٹی کمشنر کی بیوی گھٹنوں کے بل جھکی ہوئی صابن کے پانی سے فرش دھو رہی ہے۔ اس نے دیکھتے ہی ابا جان کو پہچان لیا۔ اور خوش آمدید کہنے کے لئے بڑھی اور بولی۔ آپ تھوڑی دیر ڈرائینگ روم میں انتظار کیجئے، میں فرش دھو چکی ہوں۔ ٹب اور کموڈ باقی رہتا ہے کموڈ دھو کر میں ابھی آپ کے لئے ناشتہ لاتی ہوں۔ یہ کہہ کر وہ باتھ روم کی طرف بھاگی۔ اور باتھ روم کے دروازے پر پہنچ کر اندر داخل ہونے سے پہلے وہ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔ آپ بڑے خوش قسمت ہیں۔ ہمارے راشن کارڈ پر ہماری فیملی کو ایک ہفتے میں ایک انڈہ ملتا ہے۔ آج ہمارا انڈے کا دن ہے اور پھر وہ اپنے شوہر سے مخاطب ہو کر بولی۔ جونی ڈارلنگ آج تمہارے راشن کارڈ کا سوٹ آگیا ہے۔ وارڈ روب میں ہے۔ یہ کہہ کر وہ باتھ روم میں چلی گئی۔ جونی نے وارڈ روب میں سے اپنے راشن کارڈ کا سوٹ نکالتے ہوئے کہا۔ میں شلغموں کی تجارت کے سلسلے میں باہر گیا ہوا تھا۔ اچھا ہوا اس دوران میں میرا راشن کارڈ کا سوٹ سل کر آگیا ہے۔ ہمیں راشن کارڈ پر ایک سال میں ایک سوٹ ملتا ہے۔ یہ سوٹ دیکھنے کے قابل ہے۔ ملاحظہ کیجئے۔ یہ کہہ کر جونی نے اپنا سوٹ ابا جان کو دے دیا۔ وہ سوٹ واقعی دیکھنے کے قابل تھا۔ اس کے کوٹ کے نیچے استر نہیں تھا۔ اور اس کی پینٹ کی موہری پر ٹرن نہیں تھے۔ اس کے بعد جونی نے ابا جان سے ایک ایسی بات کی۔ جو کہ وہ مرتے ہوئے نہیں تھکتے۔ جونی نے اپنے سوٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا دیکھئے اس عالمگیر جنگ نے ہماری تہذیب کے کپڑے اتارنے شروع کر دیئے ہیں۔ اور اگر ہم نے جنگوں کے خلاف کوئی موثر قدم نہ اٹھایا۔ تو ایک دن ہم سب ننگے ہو جائیں گے۔ اور اپنی تہذیب کے جنگلات میں وحشیوں کی طرح ناچتے پھریں گے۔ ابھی جنگ کے فلسفے پر بحث ہو رہی تھی۔ کہ جونی کے تینوں بچے ملبوس ہو کر ناشتے کے لئے آگئے۔ جونی کی بیوی نے کموڈ صاف کر کے ناشتہ میز پر لگا دیا۔ اس ہفتے کا انڈا ابا جان کو پیش کیا گیا۔ جونی کے بچوں نے پرزور احتجاج کیا۔ کہ ہر ہفتے جس دن انڈے کا دن ہوتا ہے۔ کوئی نہ کوئی مہمان آجاتا ہے۔ اور ان کو پچھلے کئی مہینوں سے انڈہ نہیں ملا ناشتہ کرنے کے بعد بچے اسکول چلے گئے۔ جونی نے پلیٹیں دھوئیں اور جونی کی بیوی نے ڈائننگ ٹیبل صاف کیا۔

تو بچو اس کہانی سے ہمیں کیا سبق حاصل ہوتا ہے۔

یہ کہ مغربی ممالک میں ملازم نہیں ہوتے۔

اگر مغربی ممالک میں ملازم نہیں ہوتے تو تمہیں کیا۔ تمہارے ابا یہ کہانی سنا کر تمہیں کیوں بور کرتے ہیں؟

وہ چاہتے ہیں کہ میں اپنے بوٹ خود پالش کیا کروں۔

بیٹیا، تمہارے ابا تم سے زیادہ دور اندیش معلوم ہوتے ہیں۔ وہ تمہیں بوٹ پالش کرنے کا پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کر کے تحفظِ نسلِ ملازمین کا مسئلہ حل کر رہے ہیں۔ ایشیا اور افریقہ میں ملازمین کی نسل بڑی تیزی سے ناپید ہو رہی ہے۔ ہمارے ہاں تحفظِ نسلِ ملازمین پر پوری توجہ دینی چاہیے۔

پوری توجہ سے تمہاری کیا مراد ہے؟

پوری توجہ سے میرا مطلب یہ ہے کہ توجہ مکمل اور خالص ہو۔ اس میں کوئی ملاوٹ نہ ہو۔ آج کل ہر چیز میں ملاوٹ پائی جاتی ہے۔ چائے میں ماش کے چھلکوں کی ملاوٹ۔ گھی میں موبل آئل کی ملاوٹ۔ پسے ہوئے مسالوں میں لکڑی کے زنگدار برادے کی ملاوٹ۔

اب آپ براہِ کرم یہ بتائیے کہ توجہ میں کس چیز کی ملاوٹ ہو سکتی ہے؟

توجہ میں وہسکی اور سوڈے کی ملاوٹ ہو سکتی ہے۔ برج اور ڈانس کی ملاوٹ ہو سکتی ہے۔ ریڈیو پر مغربی موسیقی کی ملاوٹ ہو سکتی ہے۔

ہا ہا ہا۔

ہا ہا ہا۔

مجھے یقین ہے کہ جن لوگوں کو تحفظِ نسلِ ملازمین پر مکمل اور خالص توجہ صرف کرنی چاہیے۔ وہ صرف کر رہے ہیں۔ اس کے ثبوت میں، میں ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔

ذرا ٹھہرو۔۔۔ دیکھو، علی محمد، چائے کے برتن آہستہ آہستہ اٹھاؤ، شور نہ ہو۔۔۔ جی!

سخی پور ایک بہت بڑا گاؤں ہے۔ ایک بہت بڑے زمیندار کی راجدھانی۔ وہ زمیندار گیارہ گاؤں میں پھیلی ہوئی ہزاروں ایکڑ زمین کا مالک تھا۔ اس لیے وہ اپنے علاقے میں بہت ہر دلعزیز تھا۔ ایک دن جب اس نے کسی افسر کی دعوت کا انتظام کر رکھا تھا۔ اس کو ایک عورت کے اغوا کے مقدمے میں گرفتار کر لیا گیا۔ جب وہ ایک سال کی قید کے بعد جیل سے باہر آیا۔ تو اس نے مکمل طور پر یہ ثابت کر دیا۔ کہ اس کو اس کے سیاسی دشمنوں نے مقدمے میں لپیٹ دیا تھا۔ پھر اس مزارع نے جس کی عورت کو اس نے اغوا کیا تھا اسے۔۔۔ بہرحال میں جس وقت کا ذکر کر رہا ہوں۔ اس وقت وہ زمیندار زندہ تھا۔ اور سخی پور میں بڑی شان و شوکت سے رہتا تھا۔ آپ یہ سن کر حیران ہوں گے۔ کہ مغرب کی نماز کے بعد سخی پور میں سے کوئی مسافر نہیں گزر سکتا تھا۔

کیوں بھئی؟ یہ کیوں؟ چوروں اور رہزنوں کے ڈر سے؟

نہیں۔

پھر؟

اُس کو رات بھر کے لئے زمیندار کا مہمان رہنا پڑتا تھا۔ زمیندار کے ڈیرے میں رات کو مسافروں کا ہجوم رہتا تھا۔ ان کی پرتکلف کھانوں سے خاطر تواضع کی جاتی تھی اور زمیندار ان کے ساتھ بیٹھ کر دسترخوان پر کھانا کھاتا تھا۔

تو کیا اُس کے پاس اتنا فالتو روپیہ تھا کہ مہمانوں پر خرچ کئے بغیر اس کے لئے کوئی چارہ نہیں تھا۔

نہیں۔ اس کا بال بال قرضے میں بندھا ہوا تھا۔

تو کیا وہ خدمت خلق کے جذبے کے تحت مہمان نوازی کرتا تھا؟
نہیں۔
تو پھر اس کی کیا وجہ تھی؟
اس کی وجہ یہ تھی کہ ڈگن وال کا زمیندار ایسا کرتا تھا۔ اس کے دسترخوان پر بھی رات کو مہمانوں کا ہجوم ہوتا تھا۔
تو پھر ڈگن وال کا زمیندار خدمت خلق کے جذبے سے مہمان نوازی کرتا ہوگا؟
نہیں۔ وہ اس لئے ایسا کرتا تھا کہ باگاں والے کا زمیندار ایسا کرتا تھا۔
اچھا، یار، زمیندار تو ایسا کرتے رہیں گے۔ تم [illegible] سناؤ۔
ایک دن میں بھی سخی پور کے دسترخوان میں شامل تھا۔ اس دن زمیندار ہرن کے شکار پر گیا تھا۔ بریانی کی سینیوں کے ساتھ ہرن کے گوشت کا قورمہ تھا۔ ہم کھانا ختم کر کے سبز چائے کی پیالیاں ہاتھ میں لئے بیٹھے تھے۔ یکایک دس بارہ آدمی پانچ آدمیوں کو جن کے ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے تھے مارتے پیٹتے اُس چبوترے کے سامنے لے آئے جہاں دسترخوان بچھا ہوا تھا۔ اور زمیندار سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔ ملک صاحب! یہ ہیں وہ حرامزادے۔ زمیندار نے پانچوں آدمیوں کی طرف رحم آمیز نظروں سے دیکھا۔ خصوصاً ایک آدمی کی طرف جس کو سب سے زیادہ مار پڑی تھی اور جس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ پھر اپنے مہمانوں سے مخاطب ہو کر بولا۔ میرے مہمانوں کو تعجب ہوگا کہ یہ کون لوگ ہیں۔ بات یہ ہے کہ کچھ عرصہ ہوا یہ شخص جس کی ناک سے خون بہہ رہا ہے۔ شہر سے یہاں آکر ٹھہرا ہوا ہے۔ پہلے دن یہ بھی آپ کی طرح یہاں مہمان تھا۔ میرے مہمانوں میں سے اگر کسی نے کوئی نمک حرام نہ دیکھا ہو تو اس شخص کو دیکھ لے۔ میں نے بھی اس شخص کو دیکھنے سے پہلے کوئی نمک حرام نہیں دیکھا تھا۔ اس نمک حرام نے میرے قیمتی مرغن کھانے کھا کر فوراً اپنی نمک حرامی کا ثبوت بہم پہنچایا۔ اس نے کہا: ملک جی آپ کے گیارہ گاؤں میں سب کچھ ہے لیکن علم کی روشنی نہیں ہے۔ میں اس گاؤں میں اسکول کھولنا چاہتا ہوں۔ میں نے جواب دیا۔ حضرت۔ اگر یہاں علم کی روشنی پھیل گئی اور ہمارے گاؤں کے سب لوگ تعلیم یافتہ ہو گئے، تو ہماری زمینوں پر کام کون کرے گا۔ میں آپ کو یہاں اسکول کھولنے کی اجازت نہیں دوں گا۔ اُس نے میری اجازت کے بغیر میرے مویشیوں کے طویلے کے سامنے میدان میں اسکول کھول لیا۔ لیکن ہم نے اس میں کوئی بچہ داخل ہونے نہ دیا۔ پھر اس نے تعلیم بالغاں کا ڈھونگ رچا کر ان چار آدمیوں کو اپنے ساتھ ملایا۔ اور میرے مویشیوں کے طویلے کے سامنے اُن کی کلاس لگا کر بیٹھ گیا۔ اس پر میرے آدمی اشتعال میں آ گئے۔ اور ان کو پکڑ کر میرے سامنے لے آئے آپ نے دیکھا ہوگا کہ اُس نے بچوں کا اور پھر بالغوں کا اسکول میرے مویشیوں کے طویلے کے سامنے جاری کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آزادی سے پہلے میرے مویشیوں کے طویلے میں ہندوؤں کا ایک اسکول تھا۔ آزادی سے پہلے یہاں ہندوؤں اور سکھوں کے تین اسکول تھے۔ جو وہ اپنے خرچ سے چلا رہے تھے۔ آزادی کے بعد جب ہندو اور سکھ یہاں سے چلے گئے تو میں نے ایک اسکول کو مویشیوں کا طویلہ بنا لیا۔ دوسرے اسکول میں آٹے کی مشین کھول لی ہے اور تیسرے میں یہ مہمان خانہ بنا لیا ہے جہاں آپ بیٹھے ہیں۔ اب یہ نمک حرام چاہتا ہے کہ مویشیوں کا طویلہ خالی کر دوں۔ تاکہ یہ اس میں اسکول کھول لے۔ اور اس نے مجھے دھمکی دی ہے کہ جب تک میں مویشیوں کا طویلہ خالی نہیں کروں گا۔ یہ اپنا اسکول اس کے سامنے میدان میں جاری رکھے گا۔ میرے مہمانوں میں سے اکثر جانتے ہیں۔ کہ اس گاؤں میں کبھی کوئی اسکول کامیاب نہیں ہوا۔ پچھلے دنوں میں حکومت نے بھی یہاں ایک اسکول قائم کیا تھا۔ اس میں کوئی لڑکا داخل نہ ہوا۔ اس لئے حکومت کو وہ اسکول بند کرنا پڑا۔ اگر ہندوؤں اور سکھوں کے ان اسکولوں کو اسکولوں کے طور پر استعمال کیا جاتا اور کوئی لڑکا وہاں پڑھنے نہ جاتا۔ تو یہ عمارتیں ضائع جاتیں۔ اب میرا مویشیوں کا طویلہ میرے مہمانوں کے لئے دودھ، مکھن، دہی اور لسّی مہیا کرتا ہے۔ میری آٹے کی مشین سارے علاقے کو آٹا پیس کر دیتی ہے۔ اور میرا یہ مہمان خانہ مسافروں کی خدمت کے لئے ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔ بتائیے! میں نے کیا جرم کیا ہے؟ اور اس سود کی تھوتھنی سے پوچھیے کہ یہ تعلیم بالغاں کے نام سے میرے مویشیوں کے طویلے کے سامنے میرے آدمیوں میں بیٹھ کر مجھے گالیاں کیوں دیتا ہے؟

مہمانوں میں سے چند ایک نے بلند آواز سے کہا۔ مارو سور کے بچے کو۔ مار مار کے سور بنا دو۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے کہا۔ ملک جی اب ان کے ساتھ کافی ہو گئی ہے۔ اب انہیں معاف کر دیجئے۔

ملک صاحب نے جواب دیا۔ اگر یہ کتے کا تخم مجھ سے معافی مانگ لے۔ تو میں اس کو معاف کرنے کو تیار ہوں۔ اس پر وہ نوجوان جس کی ناک سے خون جاری تھا۔ زمیندار سے ایسے انداز میں مخاطب ہوا جیسے وہ اشعار پڑھ رہا ہے۔ اس نے کہا۔ زمیندار میں تجھ سے کس جرم کی معافی مانگوں، میں نے کیا کیا ہے؟ میں تو تیرے گاؤں میں ان غریب، ان پڑھ، مظلوم کسانوں کے دکھ درد میں شریک ہونے کے لئے آیا ہوں۔ جن کو تیرے ظلم کے ہاتھی اپنے پیروں کے نیچے روندر ہے ہیں۔ او رسن! او نگری کے اندھے راجے! جب تک اس نگری سے ظلم اور جہالت کی کالی رات نہیں جاتی۔ میں بھی اس گاؤں سے نہیں جاؤں گا، ہاں میرا جنازہ جا سکتا ہے، اس پر زمیندار سخت طیش میں آگیا۔ اور اپنے آدمیوں سے بولا۔ حرامزادو! تم اس گستاخ کی باتیں سن رہے ہو۔ اور چپ کھڑے ہو۔ نکال دو اس کا جنازہ یہاں سے۔ ابھی۔ اسی وقت۔ اس پر زمیندار کے آدمیوں نے ان پانچ آدمیوں کو مار مار کر ان کا جنازہ نکالنا شروع کر دیا۔ اور جب جنازہ نکلنے والا ہو گیا۔ تو زمیندار نے یکایک اپنا دایاں ہاتھ اوپر اٹھا کر اپنے آدمیوں سے کہا۔ ٹھہرو! چھوڑ دو ان کو۔ تم میں سے پانچ آدمی ان کے پاس کھڑے رہیں۔ باقی تھانے میں جا کر رپٹ درج کرائیں کہ پانچ آدمیوں نے میرے مویشیوں کے طویلے پر ڈاکہ ڈالنے کی کوشش کی ہے سب مہمان اپنی سانس بند کر کے سبز چائے پینے میں مشغول ہو گئے۔

اس واقعے نے یہ بات پوری طرح ثابت کر دی ہے کہ تحفظ نسل ملازمین کے لئے ہر مناسب قدم اٹھایا جا رہا ہے۔ بند اسکول کھلتے نہیں اور کھلے اسکولوں کو بند کرا دیا جاتا ہے۔ اس طرح ہمارے ملازم طبقے کی نسل کا مکمل تحفظ ہو گیا ہے۔ اور اب اس ملک میں اس جنس کی حد سے زیادہ بہتات ہے اب ہمارے ملازموں کی تعداد ہماری قومی ضروریات کے لئے ہی کافی نہیں ہے بلکہ اب ہم اپنے ملازمین کو ایکسپورٹ بھی کرتے ہیں۔ اس وقت انگلستان میں اسی ہزار پاکستانی ملازمین پاکستان کے لئے غیر ملکی زر مبادلہ کما رہے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ہمیں افزائش نسل ملازمین پر بھی توجہ دینی چاہئے کیونکہ ہمارے ان پڑھ کم اجرت مزدوروں کی تمام دنیا میں مانگ ہے۔

میں اس تجویز کی تائید کرتا ہوں۔

ادارۂ افزائش نسل ملازمین کی مجلس عاملہ کا یہ ہنگامی اجلاس حکومت سے پر زور اپیل کرتا ہے کہ وہ فوری طور پر عائلی قوانین کو واپس لے لے کیونکہ یہ ادارے کے مفاد کے سراسر خلاف ہیں۔ ان سے افزائش نسل ملازمین کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ یہ ادارہ حکومت سے سفارش کرتا ہے کہ عائلی قوانین منسوخ کر کے ان کی جگہ ایسے قوانین نافذ کیے جائیں جن کی رو سے ہماری قوم کے ہر فرد پر شادی کے بجائے شادیاں کرنا لازمی ہو۔ اور قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں سے چار سو روپے فی ممکنہ شادی کے حساب سے جرمانہ وصول کیا جائے۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر ہمارے ملک میں یہ قوانین نافذ ہو جائیں تو ایک سال کے اندر اندر یہاں کثرت اولاد سے تل دھرنے کو جگہ نہیں رہے گی۔ اور ہم اس قابل ہو جائیں گے۔ کہ ان پڑھ مزدوروں اور ادھوری تعلیم والے کلرکوں کی ایک بہت بڑی تعداد غیر ملکوں کو ہر سال ایکسپورٹ کر سکیں گے۔

میں اس قرارداد کی پر زور تائید کرتا ہوں۔

معاف کیجئے۔ اس ریزولیشن کے پاس ہونے سے پہلے میں ایک ترمیم پیش کرنا چاہتا ہوں۔

ضرور۔ ضرور۔

میرا مشورہ ہے۔ کہ اس قرارداد میں شق ۲ کا اضافہ کیا جائے جس میں حکومت سے سفارش کی جائے۔ کہ اس وقت خاندانی منصوبہ بندی کے نام سے جو پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے۔ اس کو خلاف قانون قرار دیا جائے۔ اور اعلیٰ جدید شاعری کے وہ نادر نمونے جو بسوں اور چوراہوں پر خاندانی منصوبہ بندی کا اشتہار کرتے ہیں۔ پبلک کی نظروں سے ہٹا لئے جائیں۔

اس اعلیٰ جدید شاعری کا کوئی نمونہ پیش کیجئے۔

اس کی ایک مثال یہ ہے ــــ بہت نیچے بہت برا حال ـــ تھوڑے نیچے کنبہ خوش حال۔

یہ غلط ہے، اوّل تو یہ جدید شاعری نہیں ہے۔ بلکہ جدید آزاد شاعری ہے۔ دوسرے یہ شعر خوش حال کا نہیں ہو سکتا۔ خوش خاں خٹک کا جدید شعرا میں شمار نہیں ہوتا۔

اس بات کو چھوڑیئے اور شاعر پر مت جائیے۔ بعض بڑے بڑے شاعر بھی ضرورت کے وقت ایسے شعر لکھ مارتے ہیں۔ شاعری کی روح کو دیکھیے یہ دیکھیے کہ اس میں ہمیں تلقین کی گئی ہے کہ ہم زیادہ بچے پیدا نہ کریں۔ غضب خدا کا۔ ہمارے پاس یہی تو ایک انڈسٹری ہے۔ جس میں ہم نے دن دونی اور رات چوگنی ترقی کر کے ایک بلند مقام حاصل کر لیا ہے۔ اور اب اس کی مدد سے غیر ملکی زرمبادلہ کما رہے ہیں۔

میں اس ترمیم کی تائید کرتا ہوں۔

میں تائید مزید کرتا ہوں۔

اب ہمیں اس مسئلے کے نفسیاتی پہلو پر بھی غور کرنا چاہئے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ یورپ، امریکہ اور انگلستان کے باشندے ہمارے ملکوں میں ملازمین کی تلاش میں آتے ہیں۔ ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیے۔ کہ ہم ان ملکوں میں کس چیز کی تلاش میں جاتے ہیں۔

ہیروں کی تلاش میں۔

ہیرے! ہیرے ان ملکوں میں کہاں ہوتے ہیں؟

عام لغت میں ہیرا ایک سفید رنگ کے قیمتی پتھر کو کہتے ہیں۔ پنجابی شاعری میں ہیر ایک گوری چٹی چمکتی، دمکتی، اندھیری راتوں میں اجالا کرنے والی لڑکی کو کہتے ہیں۔

گویا ہم ان ہیروں کی تلاش میں کشاں کشاں یورپ کے ملکوں میں جاتے ہیں۔

جی ہاں!

تو یہ صاحب جو، چور دروازے سے پاسپورٹ حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہیروں کی تجارت کے لیے انگلستان جا رہے ہیں ــــ؟

جی نہیں! ان کے پاس اتنا سرمایہ کہاں ہے کہ یہ ہیروں کی تجارت کریں گے۔ اس کا سبب تو کچھ اور ہے۔

کیا؟

یہ انگریزی ادب کے طالب علم ہیں۔ اور چار سال سے ایم۔ اے میں فیل ہو رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے انگریزوں کے ملک میں جا کر انگریزی سیکھنا آسان ہوگا۔ اس لئے یہ انگلستان جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

گویا یہ اپنے مرض کا ہومیوپیتھک علاج کرانا چاہتے ہیں۔

ہاہاہا

ہاہاہا

حضرات، اگر آپ کو ہنسنے ہنسانے سے فرصت ہو گئی ہو تو میں آپ سے ایک دردانگیز اپیل کرنا چاہتا ہوں۔

کیجئے۔

اے ادارہ تحفظ نسل ملازمین کے معزز ممبرو کوئی میری ملازمت کا بھی انتظام کرو۔

تمہاری درخواست کو رد کیا جاتا ہے۔ تم نے حال ہی میں پاکستان کی سینٹرل سروس کے امتحان میں کامیابی حاصل کی ہے۔ تمہارے لئے ادارۂ تحفظ نسل ملازمین میں کوئی جگہ نہیں ہے۔

لیکن ادارۂ تحفظ نسل ملازمین کے محترم اراکین کو معلوم ہونا چاہیئے کہ امتحان میں کامیاب ہونے کے باوجود مجھے سروس میں نہیں لیا جا سکا۔ اللہ نے تمہیں جس حال میں پیدا کیا ہے اُسی میں صبر شکر سے زندگی گزار دو۔ اس سے باہر نکلنے کی کوشش مت کرو۔

میں جانتا تھا کہ میری کوئی مدد نہیں کرے گا۔ اس لیے میں نے اپنے لیے خود ایک راستہ نکال لیا ہے۔

وہ کیا ہے؟

میں نے لیڈری کا پیشہ اختیار کر لیا ہے۔

ہم اس کی وضاحت چاہتے ہیں۔

میرا ایک دوست تھا۔ جو آٹھویں جماعت تک میرے ساتھ پڑھا۔ وہ آٹھویں جماعت میں آٹھ دفعہ فیل ہو کر پہلوان ہو گیا۔ اور گوجرانوالے کے گنڈوں کو زدوکوب کر کے ان کا سردار بن گیا۔ ایک دفعہ جب یونیورسٹی میں انتخاب ہو رہے تھے۔ اور میں اسٹوڈنٹس یونین کی صدارت کا امیدوار تھا۔ وہ یکایک میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ میں اس کو آٹھ سال کے بعد اس طرح دیکھ کر حیران بھی ہوا اور خوش بھی۔ اس نے آتے ہی کہا۔

سلام علیکم۔ میں ایک سال کی قید کاٹ کر آیا ہوں۔ اور اگر تم نے میری بات نہ مانی تو میں دوبارہ جیل چلا جاؤں گا۔ مجھے بتاؤ کہ تمہارے خلاف الیکشن میں کون کھڑا ہوا ہے۔ میں اس کی گچی پر ایک مُکّا مار کر اس کا منکا توڑ دوں گا۔ اور ذرا ان لڑکوں کی طرف بھی اشارہ کرو جو تمہیں ووٹ دینا نہیں چاہتے، میں یونیورسٹی کی سڑکوں پر ان کے بھیجوں کی بجری بچھا دوں گا۔ خدا کا شکر ہے کہ جب میرا دوست میرے لئے الیکشن کی پالیسی وضع کر رہا تھا۔ میرے ووٹروں نے دوڑتے ہوئے آ کر مجھے میری کامیابی کی خوش خبری دی۔ اور میرے مخالفین کے منکے اور بھیجے بچ گئے۔ اس کے بعد میرا دوست میرے پاس چھ مہینے تک رہا اور پھر مجھ سے ناراض ہو کر کہیں بھاگ گیا۔

کیوں؟ وہ ناراض کیوں ہو گیا؟

وہ چاہتا تھا۔ کہ میں اس کے لئے کراچی میں ملازمت کا انتظام کر دوں۔ لیکن میں اس سلسلے میں اس کی کوئی مدد نہ کر سکا۔ اس لئے وہ مجھ سے ناراض ہو گیا۔ اور مجھے چھوڑ کر کہیں چلا گیا۔

ہم نے آپ سے آپ کی لیڈری کے پیشے کے بارے میں استفسار کیا تھا۔

آپ بیچ میں بکواس مت کیجئے۔ اس سے میری کہانی کا تسلسل ٹوٹتا ہے۔

معافی چاہتا ہوں۔ بیان جاری رہے۔

ایک دفعہ میں اپنے کمرے میں انتہائی مایوسی کے عالم میں سر جھکائے بیٹھا تھا۔ روزگار کے دروازے مجھ پر بند ہو چکے تھے یکایک میرے دروازے پر ایک کار کے ہورن کی لمبی، بے ڈھنگی آواز آئی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ دیکھا میرے دروازے پر ایک خوبصورت قیمتی کار کھڑی تھی۔ اور سٹیرنگ وہیل پر میرا دوست بیٹھا ہے۔ وہ مجھے ہوٹل میں لے گیا۔ چائے کے دوران میں اس نے مجھے بتایا کہ اس کی تنخواہ ڈیڑھ سو روپے ہے اور اس کا الاؤنس تین سو روپے، میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ الاؤنس تنخواہ سے بھی دگنا یہ کیسے؟ اس نے بتایا کہ وہ ایک بہت امیر سیاسی لیڈر کا ڈرائیور ہے۔ جس کے اس کو ڈیڑھ سو روپے ملتے ہیں۔ اور اس کو تین سو روپے باڈی گارڈ الاؤنس ملتا ہے اور کھانا اور رہائش اس کے بنگلے پر مفت۔ اس کے بہت سے دشمن ہو گئے ہیں۔ اس لئے اس نے اس کو اپنی حفاظت کے لئے رکھ لیا ہے وہ اس کا باڈی گارڈ ہے۔ پھر اس نے اچانک پوچھا۔ تمہیں نوکری چاہیئے؟ میں نے کہا۔ ہاں! وہ مجھے سیاسی لیڈر کے بنگلے پر لے آیا۔ اور میری سیاسی زندگی کا آغاز ہو گیا۔

تمہارے فرائض کیا ہیں؟

اپنے سیاسی لیڈر کے لیے تقریریں لکھنا اور جلوسوں کے لیے آدمی مہیا کرنا۔ یہ لیڈری کے زینے کا پہلا قدم ہے۔

لیکن سنا ہے ہمارے ہاں کی سیاسی لیڈری کی ایک بڑی شرط دولت ہے!

دولت دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک روپے پیسے کی دولت۔ دوسری سیاسی شعور کی دولت جن کے پاس روپے پیسے کی دولت ہوتی ہے وہ اپنی لیڈری زینے کے آخری قدم سے شروع کرتے ہیں۔ اور چونکہ اس سے زیادہ بلند ہونے کی گنجائش نہیں ہوتی وہ زینے سے نیچے اترنا، شروع کر دیتے ہیں۔ زینے سے اتر کر وہ اپنے گاؤں والے بنگلے میں جا کر آباد ہو جاتے ہیں اور ہارٹ فیل ہونے کا انتظار کرتے ہیں۔ اور جن کے پاس سیاسی شعور کی دولت ہوتی ہے وہ اپنی سیاسی زندگی زینے کے پہلے قدم سے شروع کرتے ہیں۔ زینے کے آخری قدم پہ پہنچ کر بھی اپنے آپ کو بلند و بالا نہیں سمجھتے۔ وہ ہمیشہ غریب رہتے ہیں۔ وہ ہمیشہ غریبوں میں رہتے ہیں اور آخر اپنے خلوص و محبت اور سادگی سے دلوں کی نیاؤں کو تسخیر کر کے حسرت موہانی کا رتبہ حاصل کر لیتے ہیں۔

یار، تم نے تو اپنی فصاحت کے دریاؤں کے رخ ہماری طرف پھیر دیئے ہیں۔ ہم نے بہت سنی ہیں تمہاری تقریریں۔ فی الحال تم ہمیں اپنا پروگرام بتاؤ۔

کل میرا سیاسی لیڈر کراچی سے آ رہا ہے اور مجھے اُس کے شاندار استقبال کا انتظام کرنا ہے۔ اس نے اپنی تجوری کی چابی میرے ہاتھ میں دے دی ہے۔ اس کی ہدایت ہے کہ تمام پھولوں والوں کے پھولوں کا دو دن کا اسٹاک پیشگی دے کر خرید لیا جائے۔ سونے اور چاندی کے تاروں کے ہار تیار کرائے جائیں۔ استقبال کے لیے ایرپورٹ پر آنے والوں کو ایک روپے سے پچاس روپے تک ان کی سماجی حیثیت کے لحاظ سے معاوضہ دیا جائے۔ عورتوں کو خاص طور پر استقبال کے لیے لانے کی کوشش کی جائے۔ اس کے لیے شادی شدہ عورتوں کو پچاس روپے سے ایک سو روپے تک اور کنواری لڑکیوں کو ایک سو روپے سے پانچ سو روپے تک معاوضہ دیا جائے۔ استقبال کرنے والوں کو ایرپورٹ تک لانے اور جلوس کی شکل میں واپس لے جانے کے لئے شہر کی خوبصورت ترین کاریں استعمال کی جائیں۔ اور ان کو سو روپے فی گھنٹہ کے حساب سے کرایہ ادا کیا جائے۔ اور پیٹرول مفت دیا جائے۔

حضرات، میں اس جلوس کی تیاری کے سلسلے میں آپ کے ساتھ جانے کی پیالی پر گفت و شنید کے لیے آیا ہوں۔

صاحب، اس کارِ خیر کے لیے میں اپنی خدمات پیش کرتا ہوں۔

میں بھی۔

میں بھی۔

میں بھی۔

غرضیکہ ہم سب۔

اور تمہاری کار بھی سو روپے فی گھنٹہ کے حساب سے دو دن کے لیے اپنی تحویل میں لیتا ہوں۔

مجھے منظور ہے۔

اب ہم اس کار میں سارے شہر کے اندر گھومیں گے اور اس جلوس کے لیے آدمیوں کی لسٹ تیار کریں گے۔ ہمیں شہر کے تمام معزز طبقوں کا تعاون حاصل کرنا ہے، تاجروں کا، پروفیسروں کا، وکیلوں کا، ڈاکٹروں کا، ادیبوں کا، صحافیوں کا، کیمرہ مینوں کا، اب ہم کو فوراً یہاں

بے تک وہیں مصری بیلی ڈانس اور برہنگی کے مختلف زاویوں کا مطالعہ کریں گے۔ پھر واپس اسی بنگلے میں آکر آرام کریں گے۔ صبح کو گیارہ بجے اٹھ کر ناشتہ کریں گے۔ اور پھر اپنے کام میں لگ جائیں گے۔ مجھے احساس ہے کہ میرے دوستوں کو اس پروگرام میں سخت تکلیفوں اور مشقتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ لیکن مجھے امید ہے۔ کہ میرے دوست ایک ایسے رہبر قوم کے لئے ہر قربانی دینے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ جس کے پاس ـــ اتنا بہت سا، روپیہ ہے ـــــ

ضرور!

ضرور!

علی محمد!

جی۔

شام کے اخبار لائے ہو۔

جی۔

ان کو یہاں رکھ دو اور ڈرائیور سے کہو گاڑی گیرج سے نکال کر یہاں لے آئے۔ اور پھر چھٹی کرلے۔ ہم خود ڈرائیو کرلیں گے۔

اچھا!

دیکھنا یار! کسی اخبار میں فیروز خان کی گرفتاری اور جعلی پاسپورٹوں کے بارے میں کچھ ہے۔

گولی مارو یار، فیروز خاں کو اس وقت ہم ایک بڑا مقصد لے کر کھڑے ہوئے ہیں۔

اچھا، مجھے دیجئے اخبار، میں دیکھ لیتا ہوں۔

ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔ کہ ہم اس کو اخباروں کے مطالعے میں ضائع کرسکیں۔ اور آپ نے جو دو ہزار روپے ضائع کر دیے ہیں۔ اس کی تلافی کردی جائے گی۔

حضرات میں ان دنوں ایک اہم مسئلے پر غور کر رہا ہوں۔ میں آپ کا ساتھ نہیں دے سکوں گا۔

مولانا، وہ کونسا مسئلہ ہے جو اس مسئلہ سے بھی زیادہ اہم ہے۔

میں نے پہلے بھی اس کی طرف اشارہ کیا تھا۔ لیکن آپ نے اس کو مذاق میں اڑا دیا۔ ہمیں سنجیدگی سے سوچنا چاہئے۔ کہ دنیا کی، اصلاح کیوں نہیں ہو پاتی؟

مولانا اس فکر میں لہولہان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ دنیا میں اصلاح کی گنجائش ہی نہیں۔ دنیا کو اصلاح کی ضرورت ہی نہیں۔ دنیا کو کوئی مرض لاحق ہی نہیں۔ دنیا تندرست و توانا، خوش و خرم، اور زندہ جاوید ہے۔ دنیا کو اصلاح کی ضرورت نہیں ہوتی۔ دماغ کو اصلاح کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور اگر آپ نے پھر اپنا اصلاحی پروگرام ہمارے سامنے رکھا تو ہم آپ کے دماغ کی اصلاح کردیں گے۔

علی محمد!

جی!

گاڑی تیار ہے؟

ہاں جی!

دوستو، اب ہم اپنی مہم پر روانہ ہوتے ہیں۔ روانگی سے پہلے میں یاددہانی کے طور پر آپ کو بتانا چاہتا ہوں۔ کہ ہمیں ایک ایسے لیڈر کو

ہر دلعزیز بنانا ہے جس کے پاس لے دے کے صرف روپیہ پیسہ ہے۔

ہمیں آپ سے اتفاق ہے۔

چلیے!

اُٹھیے!

جلدی!

جلدی!

علی محمد!

جی!

دروازے بند کرو۔

اچھا جی!

آپ کی کار بہت شاندار ہے۔

شکریہ!

دروازہ ابھی بند نہیں ہوا پھر بند کیجئے، زور سے۔

اب ٹھیک ہے۔

لال کھوتی۔

لال کھوتی نہیں۔ لال کوٹھی۔

لال کوٹھی کا ڈاک خانہ!

نرسری!

نرسری کی مارکیٹ۔

سندھ مسلم سوسائٹی۔

سندھ مسلم سوسائٹی کی مسجد!

پٹرول پمپ!

کتنا؟

فل ٹینک۔

عائشہ باوانی اسکول۔

وزارت دفاع کے دفاتر!

برنس روڈ

وکٹوریہ روڈ۔

اسٹریچن روڈ

سید قاسم محمود

سیارہ ڈائجسٹ
لاہور

چیونٹی کا قاتل

منیجر صاحب اب تک نہیں آئے تھے اُن کا انتظار کرتے پورا ایک گھنٹہ ہوگیا تھا۔ میری جیب میں ان کے نام ایک سفارشی رقعہ پڑا ہوا تھا جس میں پُر زور الفاظ میں لکھا ہوا تھا کہ حامل رقعہ کو جس طرح بھی ہوسکے، اپنے دفتر میں ملازم رکھ لیجئے۔ حصول ملازمت کی کوشش مجھے کراچی کھینچ لائی تھی۔ بحری جہازوں کی مرمت کرنے والی اس کمپنی میں میرے لئے یقیناً گنجائش نکل سکتی تھی۔ دفتر بند ہوچکا تھا۔ پھر بھی چپراسی اخلاقاً منیجر صاحب کی واپسی تک کمرے کے باہر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اس خیال سے کہ میں منیجر صاحب کے دوست کا دوست ہوں۔ اور خاص طور پر اُن سے ملنے کے لئے لاہور سے آیا ہوں، کمرہ کھول دیا تھا۔ یوں بھی باہر کی چلچلاتی دھوپ، سمندر کی گرم گرم لُو اور طویل سفر کی تھکن کمرے میں داخل ہوتے ہی ختم ہوگئی تھی۔ اس چھوٹے سے کمرے کو بجلی کی طاقت سے برف کی طرح یخ بنا دیا گیا تھا۔ دیواروں پر ہارڈ بورڈ کے وارنشی تختے جڑے ہوئے تھے۔ لمبی چوڑی آبنوسی میز پر اس سرے سے اُس سرے تک آدھ انچ موٹا شیشہ بچھا ہوا تھا۔ ٹیلیفون کے ساتھ ایک خوبصورت چھتری والا ٹیبل لیمپ جل رہا تھا جس کی ہلکی ہلکی سبز روشنی شیشے کے عجیب و غریب قلمدان پر اور لال نیلی پنسلوں پر اور گھومنے والی نئی کرسی پر پڑ رہی تھی۔ کرسی کے دائیں طرف دیوار کے کونے میں ایک چھوٹی میز پر پھولوں کا گلدستہ رکھا ہوا تھا۔ کمرے کے نفیس ماحول میں پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو رچی ہوئی تھی۔

قلمدان کی طرف سے ایک چیونٹی رینگتی ہوئی میری طرف آرہی تھی۔ آئیے آئیے محترمہ تشریف لائیے آپ ہی کا انتظار تھا۔ آپ وقت گذارنے کے لئے بہترین ساتھی ہیں۔ میں چیونٹی سے کھیلنے میں مصروف ہوگیا۔ پہلے میں اسے بھاگ جانے کی مہلت دیتا تھا اور جب وہ عین میز کے کونے پر پہنچ کر غائب ہونے لگتی، میں پھر راستہ روک کر اسے اُنگلی کے ساتھ ساتھ بیچ میدان میں لے آتا۔ اور اسے چھوٹے چھوٹے چکر کھلانے لگتا۔ کوئی ایک فٹ کے دائرے میں وہ دیر تک میری اُنگلی کے اشارے پر ناچتی رہی۔ پھر جانے کیوں، مجھے خیال آیا کہ اُسے ایک انچ کے اندر اندر چکر کھلائے جائیں۔ تو کیسا رہے۔ دائرہ چھوٹا ہوتے ہوتے ایک انچ میں سمٹ گیا۔ کسی مجبور کو اور زیادہ مجبور کرنے میں کتنی لذت ہے۔ بلیمر کو مجبور کرنے میں فرعون کو بھی ایسی ہی لذت ملی ہوگی۔ . . . .

آٹھ برس پہلے کی بات ہے رشید نے مجھے اپنے گاؤں بلایا تھا ہم دونوں باغ میں مالی کی کوٹھڑی کے باہر بیٹھے ہوئے مالٹے کھا رہے تھے۔ دوپہر کا وقت تھا درختوں کے سائے ان کے آس پاس ہی جم کر رہ گئے تھے ہرے ہرے پتوں میں سنہری سنہری مالٹے چمک رہے تھے باغ کی شمالی کھائی کی طرف سے ایک شخص آہستہ آہستہ ہماری طرف آرہا تھا۔ اس نے اوور کوٹ پہنا ہوا تھا۔ منہ میں سگریٹ تھا بغل میں کتاب تھی اور اس کے سر پر سرس کے اونچے پیڑ کی آخری شاخ پر ایک کالی چڑیا خاموش بیٹھی تھی اور اس کالی چڑیا کے پیچھے بہت دور گہرائی میں نیلے آسمان کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے دوام کسی چیز کو بھی حاصل نہیں ہے۔ آسمان کا چھوٹا سا نیلا ٹکڑا اور یہ خاموش خاموش کالی چڑیا اور یہ اداس اداس چلتا ہوا آدمی اور یہ باغ سب ایک دن یونہی طراماں لڑھک جائیں گے۔ پھر اگلے ہی لمحے میں نے محسوس کیا کہ بے ثباتی کے اس ہولناک احساس کا سبب

اس نئے آدمی کی عجیب و غریب چال ہے۔ قدموں میں لڑکھڑاہٹ تھی۔ استقامت بھی تھی، کوئی تیسری چیز بھی تھی، جسے میں اس وقت نہ سمجھ سکا۔ رشید نے بتایا۔ یہ شخص میرا جگری دوست ہے۔ بہت گریٹ آدمی ہے۔ نام بھی فرقان عظیم ہے۔ اچھے کھاتے پیتے گھرانے کا فرد ہے۔ چار سال سے میرے ہی پاس رہتا تھا۔ غالباً یہ میرے بغیر زندہ بھی نہیں رہ سکتا۔ تھوڑی دیر کے لئے بھی ادھر ادھر ہو جاتا ہوں۔ تو بالکل پاگل ہو جاتا ہے۔ فلسفے اور ادب کا شیدائی ہے۔ میں جب بھی شہر جاتا ہوں۔ اس کے لئے کتابیں خرید لاتا ہوں۔ اسے میرے اور کتابوں کے سوا دنیا کے کسی اور کام سے دلچسپی نہیں ہے۔ وہ جب بالکل قریب آگیا تو ہم احتراماً کھڑے ہوگئے۔ اس لئے بھی کہ وہ ہم دونوں سے عمر میں بڑا تھا اور اس لئے بھی کہ اس کے پورے وجود پر چھائی ہوئی متانت سے بھی زیادہ خاص چیز اس کی آنکھوں میں کوندتی ہوئی وہ بے قرار چمک تھی جو زندگی کو پوری شدت سے بسر کرنے والوں کی آنکھوں میں خود بخود پیدا ہو جایا کرتی ہے۔ چہرے پر اور ماتھے پر لکیریں سی تھیں۔ جو جھریاں یقیناً نہیں تھیں۔ روح کو کچل دینے کی جنگ کے اعصابی آثار تھے۔ نقوش اچھے خاصے تیکھے، خوبصورت اور نوک دار تھے، شیو بڑھی ہوئی گدی پر بال بڑھے ہوئے۔ قمیص کا غلیظ کالر ایک طرف سے اوور کوٹ میں چھپا ہوا اور دوسری طرف سے بڑے بے ہنگم طریقے سے باہر کو بڑھا ہوا۔ کالے کالے ناخن بڑھے ہوئے۔ ناک کے بال بڑھے ہوئے۔ شخصیت میں تراش خراش کی ضرورت تھی۔ تعارف کے لئے اس نے ہاتھ بڑھایا تو میں نے ہاتھ ملانے سے پیشتر یونہی ہنس کر کہا: "رشید صاحب! آپ کے یہ دوست مجھے قاتل معلوم ہوتے ہیں۔" یہ بات کہتے ہی مجھے خوشی محسوس ہوئی کہ اس کی چال میں جو چیز میری سمجھ میں نہ آ رہی تھی، اسے میں نے خود اپنے آپ پر واضح کر لیا ہے۔

رشید نے اپنے دوست کی طرف بامعنی نظروں سے دیکھا جس کا مصافحے کے لئے بڑھا ہوا ہاتھ واپس اپنی جگہ چلا گیا۔ اور اس چمک دار نظریں برابر مجھ پر جمی رہیں۔ رشید نے کہا: "میں ابھی آتا ہوں۔ آپ دونوں باتیں کریں۔" وہ چلا گیا تو میں اپنے والے مونڈھے پر بیٹھ گیا اور وہ رشید والے مونڈھے پر بیٹھتا بیٹھتا چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس نے مجھ سے کوئی بات بھی تو نہیں کی۔ بس مالٹے چھیل چھیل کر مجھے دینے لگا۔ مالٹے پر چھری کی نوک رشید کے مقابلہ میں بڑی نفاست سے چلاتا۔ چار آر پار لکیریں ڈال کر وہ چھری سے چھلکے اتارتا۔ پھر چھری ہی سے مالٹے کا ایک ایک بال دھیرے دھیرے اتارتا۔ نظر کی باریکی مالٹے پر معمولی سا ریشہ بھی فوراً ڈھونڈ لیتی۔ مگر اس کے حرکت کرتے ہوئے دونوں ہاتھوں کی دو دو انگلیاں سگرٹوں کے دھوئیں سے جل جل کر مالٹئی رنگ کی ہو گئی تھیں اور بس اسی وجہ سے اس کا چھیلا ہوا مالٹا کھانے سے طبیعت میں ایک میل سا آجاتا تھا۔ اس کی روح پر چھایا ہوا میل میری روح میں داخل ہوتا ہوا محسوس ہوتا۔

شام ہو گئی مگر رشید اپنے کاموں میں مصروف رہا۔ ہمارے پاس نہ آیا۔ فرقان نے مجھے اس کا آلوؤں کا کھیت دکھایا۔ تمباکو کی پنیری دکھائی، کولھو میں گنے پیلتے ہوئے دکھائے گوبھی، گاجر اور مولی کی الگ الگ کیاریاں دکھائیں۔ اس سفر کے دوران میں وہ خاموش نہیں رہا۔ اس نے ادب، فلسفہ، شاعری سیاست، ہر موضوع پر مجھ سے باتیں کیں۔ ہر موضوع پر اس کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ اس کی رائے بڑی جچی تلی اور حقیقت پسندانہ ہوتی تھی۔ سب کچھ ٹھیک تھا مگر اس کے لہجے میں استقامت اور لڑکھڑاہٹ کے ساتھ ساتھ وہ تیسری چیز کیا تھی جو اب پھر میری سمجھ میں نہ آ رہی تھی۔ ایسا دانشمند شخص قاتل نہیں ہو سکتا۔ مگر اس کی آنکھوں کی زندہ چمک اور انگلیوں پر جمے ہوئے دھوئیں میں کیا تعلق کیا ہے۔ جس کی آنکھوں میں جینے کی ایسی امنگ ہو، وہ اپنے آپ کو دھوئیں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا۔

باتوں ہی باتوں میں وہ میرے اس قدر قریب آگیا تھا کہ اس کی ادا ادا میں چھپی ہوئی تیسری چیز کے متعلق کچھ جاننے کا خیال خود بخود ختم ہو گیا۔ دوستی کے نوزائیدہ احساس نے کھوپڑی میں اگنے والے شاخ در شاخ خیالات کی جڑیں کاٹ دیں۔ میرا دوست اصل میں رشید تھا۔ اور میں اسی کے بلاوے پر یہاں آیا تھا۔ لیکن وہ ہماری نئی دوستی کی ڈور کو مضبوط کرنے کے بجائے کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ادھر ادھر ڈول رہا تھا۔ ہم اسے دور ہی دور سے کبھی اپنے مکان کی اوپر کی منزل میں جاتا ہوا دیکھتے، کبھی مزارعوں کے پاس کھڑا ہوا دیکھتے۔ اس کا تعاقب کرتی ہوئی فرقان کی خاموش خاموش نگاہیں رشید

کے اس خیال کی توثیق کر رہی تھیں: غالباً یہ میرے بغیر زندہ بھی نہیں رہ سکتا۔"

حدیہ ہے کہ رشید رات کو کھانے کے وقت بھی ہمارے پاس نہیں آیا۔ بس ایک منٹ کے لئے کمبل سے کر آیا اور کہنے لگا "بھئی معاف کرنا ہم اتنی دور سے آئے ہو اور میں خاطر مدارات نہیں کر رہا۔ دراصل مجھے سخت بخار ہو گیا ہے۔ لو یہ کمبل لو۔ باقی جس چیز کی ضرورت ہو اوپر سے منگوا لینا" کمبل دے کر پھر نہ اوپر چلا گیا۔ کھانا کھاتے ہی میں تو اتنا غفیل ہو گیا کہ فوری غنودگی میں، میں نے دیکھا تھا کہ فرقان لیمپ کی روشنی میں کتاب کھولے بیٹھا ہے۔ مگر وہ پڑھ نہیں رہا تقریباً آدھی رات کے وقت کسی نے لحاف کا پلو ہٹا کر مجھے جگایا۔ میں فوراً اٹھ کر دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا اور پورے ہوش و حواس سے اپنا سانس روک لیا گھپ اندھیرے میں میری آنکھیں فوراً سے اس خنجر کو ڈھونڈتی پھر رہی تھیں جو ابھی ابھی مجھے قتل کرنے والا تھا یا اب قتل کرنے والا ہے۔ بیٹھک کے روشن دان سے اندر آنے والی چاندنی کی ہلکی ہلکی روشنی میں مجھے بس ایک سایہ نظر آ رہا تھا جو دونوں ہاتھوں سے بستر پر مجھے ڈھونڈ رہا تھا: "بھئی کہاں چلے گئے آپ" یہ ولہجہ قاتل کا نہیں ہو سکتا۔ میں نے اپنا اتا پتا بتانا چاہا۔ لیکن جیسے مجھے سانپ نے کاٹ رکھا تھا۔ سانس روک کر کھڑا رہا وہ اپنی چارپائی کی طرف گیا تو میں نے چاہا کہ چپکے سے باہر بھاگ جاؤں۔ لیکن وہ فوراً ہی واپس آ گیا۔ اس نے دیا سلائی جلائی اور ہنس کر بولا: "ارے آپ مجھ سے ڈر گئے؟" میں ندامت اور خوف کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اس کے ہاتھوں کی طرف دیکھتا رہا اور جب اطمینان ہو گیا کہ ہاتھوں میں تو کچھ نہیں ہے، دل میں کچھ ہو تو ہو۔ میں چارپائی سے نیچے اتر آیا۔

اس نے چپکے سے کہا: "چلو ذرا میرے ساتھ باہر چلو۔"

میں نے بھی چپکے سے جواب دیا "تو یہ تو بہت مشکل بات ہے۔ اس سردی میں آپ باہر کہاں لے جا رہے ہیں مجھے؟"

بولا: "چلئے تو سہی کسی کی زندگی اور موت کا سوال ہے۔"

میں نے کہا "جو بات کرنی ہے، یہیں کر لیجئے۔"

بولا: "مجھے تنہائی چاہیئے۔"

میں نے ذرا بلند آواز سے کہا: "تنہائی تو یہاں بھی ہے۔"

کہنے لگا "آہستہ بولو۔ جلدی چلو۔ ابھی آ جائیں گے۔"

میں کچھ مجبوراً، کچھ اخلاقاً جوتا پہننے بیٹھ گیا ——— اس نے اپنا اوور کوٹ پہنا، ربڑ کے چپل پہنے، سگرٹوں کی ڈبیا اور ماچس اٹھائی۔ میں رشید کا کمبل اوڑھ کر اس کے ساتھ ہو لیا۔ بیٹھک کا دروازہ آہستہ سے بند کر کے اس نے کہا: "ذرا آہستہ چلو۔ کوئی جاگ نہ جائے۔" اس کی اس بات سے مجھے پورا یقین ہو گیا کہ کوئی گہرا راز ہے۔ جو یہ میرے سینے میں اتارنا چاہتا ہے ...... اور وہ خنجر کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ بالکل یوں لگ رہا تھا جیسے مجھے مقتل کی طرف لے جایا جا رہا ہے۔

وہ مسجد کے ساتھ والی گلی میں سے ہوتا ہوا مجھے باغ میں لے گیا۔ پھر مالٹے کے پیڑوں کی درمیانی روش سے گزرتے ہوئے شمالی کھائی کی طرف لے گیا۔ جدھر سے وہ دوپہر کو لوٹنا ہوا تھا۔ کھائی پھلانگ کر ایکھ کا کھیت شروع ہوا۔ ہم کھڑی ایکھ کے ساتھ ساتھ ہوتے ہوئے کھیت کے آخری حصے پر پہنچے جہاں ایک رہٹ تھا۔ وہ کنوئیں کی مینڈھ پر بیٹھ گیا۔ میں بھی اپنی حفاظت کا مناسب فاصلہ دے کر کنوئیں پر ہی بیٹھ گیا۔ دور دور تک چاندنی میں کھیت چپ چاپ سوئے ہوئے تھے۔ چاروں طرف ہوا کا سناٹا تھا۔ کبھی کبھی کنوئیں میں کوئی چیز ڈبکی لگاتی تو نیچے کی بالٹیوں میں لرزش سی پیدا ہو جاتی۔

فرقان نے گفتگو کا آغاز کیا: "دوپہر کو آپ نے میرے متعلق جو رائے دی تھی......"

میں نے کہا: "ارے صاحب، وہ تو مذاق کی بات تھی۔"

فرقان بولا: "مگر میرے لئے یہ بہت سنجیدہ بات ہے۔"
میں نے کہا: "میں آپ سے حلفیہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے محض مذاق کیا تھا۔"
فرقان ایک دم تلخ ہو گیا: "مذاق مذاق میں قتل بھی ہو جاتے ہیں۔ آپ نے میری کس بات سے یہ اندازہ لگایا۔ کیا مجھ میں کوئی قاتلوں والی بات آپ کو نظر آئی تھی؟"

اچانک جھوٹ نے مجھے بچنے کی ایک نئی راہ دکھائی: "جی ہاں! جب آپ نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا تھا، تو میں نے آپ کے ہاتھ کی لکیریں دیکھ لی تھیں۔"

فرقان میرے قریب کھسک آیا اور اپنا ہاتھ آگے بڑھا کر بولا: "آپ غور سے دیکھئے۔ یہ قاتل کا ہاتھ نہیں ہو سکتا۔ میں نے کبھی کسی کا قتل نہیں کیا۔ میں تو ایک چیونٹی تک نہیں مار سکتا۔"

میں اس کے ہاتھ کی لکیریں بظاہر غور سے دیکھنے لگا۔ میں پامسٹری پر اعتقاد نہیں رکھتا۔ پھر بھی اکثر بعض لوگوں کو دھوکا دیتا رہا تھا۔ میں نے محض دکھاوے کی خاطر اُس کی لکیروں کو خوب ٹٹول ٹٹول کر دیکھا۔ اس نے میری مدد کے لئے یکے بعد دیگرے کئی دیا سلائیاں جلا کر مسلسل روشنی بہم پہنچائی۔ آخر میں نے فیصلہ سنایا "جناب دوپہر کو مجھے دھوکا ہوا تھا۔ دراصل یہ لکیر جو انگوٹھے کی طرف مڑ گئی ہے، اس نے آپ کو بچا لیا ہے۔ اگر یہ دماغ کی لکیر سے مل جاتی تو پھر یقیناً آپ سے قتل کا ارتکاب ہو جاتا۔ مگر اب آپ بال بال بچ گئے۔"

فرقان بولا: "آپ مجھے بنا رہے ہیں۔ آپ کا دوپہر کا مشاہدہ ٹھیک تھا۔ میں نے تو ایک قتل کر رکھا ہے۔"
میں نے اپنے لہجے میں وثوق پیدا کرتے ہوئے کہا: "نہیں جناب! آپ میں قتل کرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ ہاتھ کی کوئی لکیر مجرمانہ ذہنیت کا پتا نہیں دیتی۔ پھر آپ کا ماتھا بھی میں نے پڑھا ہے۔ قیافہ شناسی کا کوئی اصول آپ کے مجرم ہونے کا سراغ نہیں دیتا۔ پھر آپ کی آنکھوں میں جو معصوم سی چمک ہے، وہ مجرم کی آنکھوں میں ہو ہی نہیں سکتی۔ کسی ریاضت کرنے والے ہی کی آنکھوں میں یہ خاص قسم کی چمک ہو سکتی ہے۔"
فرقان بولا: "ریاضت اپنے گناہ کو چھپانے کے لئے بھی تو کی جا سکتی ہے۔ آپ نے دوپہر کو مجھے قاتل کہہ کر ایک عجیب عذاب میں مبتلا کر دیا ہے۔ آج تک مجھے اپنے قاتل ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں پورا یقین نہیں تھا۔ مگر آج آپ نے مجھے یقین دلا دیا ہے اور یہ یقین ہی میرے لئے عذاب بن گیا ہے۔"

میں نے کہا: "آخر قصہ کیا ہے۔ کچھ پتا تو چلے۔ مجھے اپنا دوست سمجھو اور جو کچھ آپ کے دل میں ہے، سب کچھ اگل ڈالو۔"
فرقان بولا: "قصہ بہت معمولی سا ہے۔ ایک شخص تھا۔ بہت ہی بھولا بھالا، سیدھا سادھا، ذہین اور شوخ۔ اس نے ایک لڑکی سے محبت کی اور لڑکی کچھ عرصے کے بعد اُس سے چھن گئی۔ کوئی اور اُسے اپنے ساتھ کسی ان جانے شہر میں لے گیا۔ وہ شخص اس ناکامی کو برداشت تو کر گیا۔ مگر کچھ اس انداز سے کہ ماں باپ سے جھگڑ کر الگ رہنے لگا۔ سارے دوست احباب سے کنارہ کر لیا۔ چپکے چپکے شراب اس سے چمٹ گئی اور شراب کے بعد عورت۔ وہ ہر عورت کو، جو بھی اس کے سامنے آتی چیونٹی کی طرح مسل کر گزر جاتا۔ بے شمار چیونٹیاں اس نے روند ڈالیں۔ پھر جب اس نے سوچا کہ ایک چیونٹی بھی تو راہ میں ایسی نہیں آئی جو اُس سے بچ کر نکل جاتے یا اُسے کاٹ ہی لے، تو اس نے چاہا کہ شہر چھوڑ کر کہیں دور نکل جائے۔ وہ شخص ٹرین میں بیٹھا جا رہا تھا کہ راستے میں ایک شخص اُسے ملا۔ وہ اس کا دوست بن گیا اور چند روز کے لیے اُسے اپنے گاؤں لے گیا۔ وہاں اس نے بہت ہی خوبصورت، بھوری بھوری سی چیونٹی دیکھی جس نے پہلے ہی دن اسے اپنی نشیلی آنکھوں سے زور سے کاٹ لیا۔ اب اس شخص نے اسے چکر کھلانے شروع کئے۔ اُسے خوب ہی اپنے اشاروں پر نچایا، اور اُس رات وہ اسے چکر دیتا دیتا یہاں اس کنوئیں کی منڈیر تک لے آیا...... اور یہ نہ سمجھئے کہ وہ اُسے مسلنا چاہتا تھا، ہرگز نہیں۔ اس خیال سے نہیں کہ وہ اس کے محسن دوست کی بہن تھی، بلکہ محض اس لئے کہ وہ توبہ کر کے گھر سے نکلا تھا۔ آہ! کیا قیامت

کی رات تھی وہ۔ بھیا جانماں کے سر دل پر جھک رہا تھا۔ اور وہ کہہ رہی تھی، میں تم سے اتنی محبت کرتی ہوں کہ اگر تم محض مذاقاً بھی مجھے کنوئیں میں چھلانگ مارنے کے لیے کہو تو ابھی کود پڑوں گی۔ اس شخص نے آزمانے کے لئے نہیں، بس ویسے ہی ازراہِ مذاق اس سے کہا: "اچھا ذرا کود کر تو دکھا، مجھے کتنی محبت ہے؟" ابھی یہ فقرہ اس لڑکی نے پوری طرح سنا بھی نہ تھا کہ دھم سے پانی میں گرنے کی آواز آئی۔ اس شخص کو یہ سوچنے میں کئی منٹ لگ گئے کہ یہ مذاق سے بالکل سچ مچ کچھ ہو گیا ہے۔ ایسی جذباتی کہانیاں اس نے پڑھی تو بہت تھیں، مگر دیکھی آج تھیں۔ ان دنوں کنوئیں میں یہ بالٹیاں نہ تھیں۔ پانی سڑا ہوا تھا۔ اور اس شخص کے پاس اپنے دوست کو اور اس کے مزارعوں کو جگانے کا کوئی جواز نہ تھا۔ اگر کوئی جواز تھا تو یہ کہ وہ خود بھی کنوئیں میں گر پڑا۔ پانی کی دلدل میں دیر تک ہاتھ پاؤں چلانے کے بعد آخرکار اسے وہ لڑکی مل گئی مگر وہ جا چکی تھی۔ اس شخص نے بھی گہرائیوں میں اتر جانے کی پوری پوری کوشش کی، لیکن لوگوں نے اُسے بچا لیا۔ ہوش میں آنے کے بعد اس نے اپنے دوست کو بتایا کہ جب میں رات کو اٹھا، تو تیری بہن کسی کے ساتھ بھاگ رہی تھی۔ میں نے ان کا تعاقب کیا وہ شخص تو فرار ہو گیا اور نسیمہ نے کنوئیں میں چھلانگ لگا دی۔ اسے بچانے کے لئے میں بھی کود پڑا۔"

میں نے کہا: "مگر فرقان صاحب، سوال یہ ہے . . . . ."

فرقان جھنجھلا کر بولا: "میری بات ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔ اس شخص کو نسیمہ کے مرنے کا کوئی افسوس نہیں تھا۔ اس نے موت کو کبھی اہمیت نہیں دی۔ زندگی میں جو کچھ ہو رہا ہے۔ اس کے نزدیک فقط وہ اہم ہے۔ اب اُس کا یہ احساس شدت پکڑ گیا کہ اس نے دوست کو دھوکا دیا ہے اس سے جھوٹ بولا ہے۔ اگر وہ اس سے صاف صاف کہہ دیتا، ہاں دوست، تیری بہن میری ہی وجہ سے چلی گئی ہے تو اس کے ضمیر کو وہ دُکھ نہ جھیلنے پڑتے جو وہ اب تک جھیلتا رہا ہے۔ اُسے خوب معلوم تھا کہ اگر وہ گاؤں سے چلا گیا تو چند دنوں کے بعد ہی اس کے دوست کو یہ احساس ہو جائے گا کہ میری بہن کا قاتل وہی تھا، اور اصل وجہ وہ قیامت تک بھی نہ سمجھ سکے گا۔ اپنے جھوٹ کو چھپانے کے لئے اس نے باقاعدہ ریاضت کی ہے۔ ایک لمحے کے لئے بھی اس نے اپنے دوست کو تنہا نہیں چھوڑا کہ کہیں تنہائی میں سچائی اس کے کانوں میں اپنا جادو نہ بھر دے۔ لیکن دوست! تم نے سارا طلسم توڑ دیا ہے۔ جس وقت تم نے کہا تھا: "رشید صاحب! آپ کے یہ دوست مجھے قاتل معلوم ہوتے ہیں" تو تمہیں کیا معلوم، رشید نے مجھے کن نظروں سے دیکھا تھا۔ میری ساری ریاضت اکارت چلی گئی ہے۔ وہ اسی لمحے مجھے اپنی بہن کا قاتل سمجھنے لگا تھا اور اسی لمحے سے وہ مجھ سے دُور ہٹتا چلا گیا۔ وہ تو وہ تھوڑی دیر کے لئے بھی مجھ سے الگ نہیں رہ سکتا تھا۔ مگر وہ آج میرے پاس آیا ہی نہیں۔ تم نے یہ کیا کر دیا دوست! مجھے عذاب میں مبتلا کر دیا ہے۔ اب مشورہ دو، مجھے کیا کرنا چاہیے۔ کیا یہاں سے بھاگ جاؤں، یا اعتراف کر لوں؟"

میں نے کہا: "بھاگ جانے سے یا اعتراف کر لینے سے کچھ بھی نہ ہوگا۔ اعتراف کر لینے سے اس کی بہن واپس نہیں آ جائے گی۔ اس پر خاموشی ہی کا پردہ پڑا رہنے دو۔ بھاگ جانے سے تمہاری زندگی کا مسئلہ حل نہیں ہو جاتا۔ تم بھاگ کر کہیں اور ڈراما پیدا کرو گے تمہاری روح کا خلا بھاگ جانے سے پُر ہو گا نہ اعتراف کر لینے سے۔ اصل علاج یہ ہے کہ تم ایک چیونٹی اور مسل دو۔ بس آخری چیونٹی . . . . . . !"

میں نے لمبی چوڑی آبنوسی میز کے شیشے پر اب تک اپنی چیونٹی کو خدا جانے کتنے چکر کھلا دیئے تھے۔ بے دھیانی میں چکروں کا دائرہ کبھی وسیع ہو کر پوری میز تک پھیل جاتا اور کبھی سمٹ کر ایک انچ میں محدود ہو جاتا۔ میں نے دیکھا کہ میرے بالمقابل میز کے دوسرے سرے پر ایک چار پانچ برس کی پیاری سی لڑکی کھڑی ہوئی ہے۔ میں ایک دم حیران رہ گیا کہ یہ آئی کہاں سے ہے۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی، اور گھومنے والی کرسی کے عقب میں دیوار پر لگے ہوئے سنہری ہینڈل پر ننھا سا ہاتھ رکھا دروازہ کھل گیا چوں کی آواز آئی اور اس کے غائب ہوتے ہی دروازہ خود بخود بند ہو گیا ہاتھ بلوط کی دیوار اور کواڑ آپس میں یوں پیوست ہو گئے کہ بغور دیکھنے سے دروازے کی لکیریں نظر آ سکیں۔ اب میں پھر اس سحرزدہ کمرے میں اکیلا رہ گیا۔ اور ہو میری چیونٹی کہاں چلی گئی۔ میں نے پوری میز پر تلاش کیا، کاغذوں کی تھڑی اٹھا کر دیکھا، ٹیلیفون اور ٹیبل لیمپ تک اپنی اپنی جگہ سے ہل گئے۔ آخر وہ مجھے پنسل کی دم سے چمٹی ہوئی مل گئی، میں پھر اُسے انگلی کے ساتھ ساتھ پھر میدان میں لے آیا۔ بہت خوب محترمہ آپ ہمیں اکیلا ہی چھوڑ چلی تھیں۔ اب کے دروازہ کھلا تو اس

بچّی کے ساتھ ساتھ ایک چھ سات سال کا لڑکا بھی نمودار ہوا۔ دونوں کے چہروں میں غضب کی مشابہت تھی گورے گورے بیضوی چہرے، نقوش
اور نوکدار بڑی بڑی آنکھیں اور ان کی زندہ اور معصوم سی چمک۔

لڑکے نے پوچھا: "آپ کس سے ملنا چاہتے ہیں؟"

میں نے بڑے ادب سے کہا: "میں منیجر صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔"

لڑکے نے پھر پوچھا: "ہمارے ڈیڈی سے ملنا چاہتے ہیں؟ وہ توامی کے ساتھ باہر گئے ہیں۔ شام تو آئیں گے۔"

لڑکی نے اپنا ننھا سا ہاتھ اٹھا کر کہا: "وہ رہے ہمارے ڈیڈی۔"

میں نے گھوم کر اس دروازے کی طرف دیکھا، جہاں سے میں داخل ہوا تھا۔ میں نے کہا: "یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔"

لڑکا ہنس پڑا: "ارے کیسے بدھو ہیں آپ۔ ہمارے ڈیڈی نظر نہیں آتے۔ وہ رہے سامنے۔"

میں نے پھر گھوم کر دیکھا۔ دروازے کے اوپر ایک سنہری فریم کی تصویر میں یہ دونوں بچّے فرقان صاحب کی گود میں بیٹھے مسکرا رہے تھے۔ فرقان
کی آنکھوں کی چمک میں کچھ اور بھی زندگی آگئی تھی، بال سنورے ہوئے تھے، چہرے پر صحت کے آثار نمایاں تھے۔ شخصیت میں بڑی تراش خراش تھی۔
نہیں مجھے کیا ہوا، میں دیوانہ وار میز پر اپنی چیونٹی ڈھونڈنے لگا۔ وہ میز کے آخری کونے پر پہنچ کر غائب ہو رہی تھی۔ میں نے اُسے وہیں کے وہیں مسل دیا۔

فرصت کے لمحات کا بہترین ساتھی

ماہنامہ **نقش** کراچی

نقش آپ کو اردو ادب کی رفتار سے آشنا رکھتا ہے

نقش ہر ماہ پاک و ہند کے معیاری رسائل سے منتخب افسانے، نظمیں اور مضامین پیش کرتا ہے

نقش کو پاک و ہند کے ادبی رسائل اور ادارں اور تمام ادیبوں کا تعاون حاصل ہے۔

نقش کا ہر شمارہ خاص نمبر کی اہمیت رکھتا ہے۔

نقش ادب کی خدمت کرتا ہے آپ نقش کی سرپرستی کیجیے۔

نقش خریدیے ۔ نقش میں اشتہار دیجیے۔

مسعود مفتی

نقوش۔لاہور۔

کردار

ٹرین ایک بھاری گھسیٹ سے رک گئی۔

اسلم نے اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ اور ہینڈ بیگ ہاتھ میں لے کر اترنے لگا۔

نیلے کپڑوں والے ایک شخص نے لپک کر فرشی سلام کیا۔ اترنے میں اسٹیشن ماسٹر کا پاؤں ذرا لڑکھڑایا۔ تو وہ فوراً دونوں ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "بسم اللہ۔ یا اللہ فضل " پھر اس نے جھپٹ کر اسلم کے ہاتھ سے بیگ لے لیا۔ اور پاس کھڑا خوشامد سے مسکرانے لگا۔

دوسری طرف سے ملنے کے لوگ آ رہے تھے۔ کچھ سنجیدہ، کچھ مسکراتے ہوئے۔

"آئیے جی آئیے!" وہ ہاتھ پھیلائے دو قدم ان کی طرف بڑھا اور پھر واپس اسلم کی طرف بھاگا۔

"یہ ہیں حضور شاہ جی ـــ ہمارے ٹکٹ بابو ـــ اللہ خوش رکھے ـــ بڑے نیک آدمی ہیں"

اسلم نے ہاتھ ملایا۔

"اور یہ ہے جی بشیرا۔ سنگل مین اور پھاٹک مین ـــ ابے سیدھا ہو کر چل رے بشیرے ـــ نئے صاحب سے مل رہا ہے۔ اور چلا بھی نہیں جاتا"

اسلم نے حیرت سے دونوں کو دیکھا۔

"اور حضور یہ باقی سب بھی آپ کی رعیت ہیں۔ یہ پانی بھرنے والا۔ یہ جھنڈی والا۔ یہ بھنگی۔ یہ میٹ"

"اور تم کون ہو؟" اسلم پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

"میں جوناب کا خادم کانٹے والا ہوں ـــ اللہ دتہ نام ہے! گاڑیاں شنٹ بھی کرتا ہوں۔ اس اسٹیشن پر سب سے پرانا آدمی ہوں جو پندرہ برس ہو گئے ہیں۔ یہاں مجھے ـــ جو صاحب بھی آتے ہیں ان کا تابعدار ہوں ـــ ابے دیکھتے کیا ہو کھڑے" اس نے اسلم کی رعیت کو ڈانٹا "نکالو اندر سے سامان"

اور وہ سب چونک سے اندر بھاگے۔

اسلم اس کی چرب زبانی پر حیران ہوتا دفتر کی طرف چلا۔ وہ یہاں بطور اسٹیشن ماسٹر تبدیل ہو کر آیا تھا۔ جب اس نے جگہ کا جائزہ لیا تو

مایوس ہوا۔ چھوٹا سا اسٹیشن، معمولی سا پلیٹ فارم، اس پر دو کمرے، ایک اسٹیشن ماسٹر کا اور دوسرا ٹکٹ بابو کا۔ اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں سیون اپ، اور تار کا سامان بھی تھا اور بابو کے کمرے میں ٹکٹوں کی شیلف کے علاوہ متفرق رجسٹر بھی رکھے تھے۔ پلیٹ فارم ویٹنگ روم وغیرہ سجاوٹ سے پاک تھا۔ اور اس کی بجائے پیپل کا ایک بڑا درخت تھا۔ جس کے نیچے پرندوں کی بیٹ سے بھرے ہوئے چند بنچ رکھے تھے۔ ساتھ پانی کا نل تھا۔ جس کے پاس ہی کھمبے کے اوپر شیشے کے چوکور ڈبے میں ٹوٹی ہوئی چمنی والا لیمپ تھا۔ اس کے اوپر ایک تیر لگا تھا۔ جس پر "قبلہ" لکھا تھا۔ سارے اسٹیشن کی یہی کائنات تھی۔ گاڑی کے گذرنے کی ایک لائن پلیٹ فارم کے ساتھ تھی۔ اور دوسری ویسے ہی ساتھ بچھائی گئی تھی۔ جو گاڑیوں کے کراس کے وقت استعمال ہوتی تھی۔ یا شنٹنگ کے کام آتی تھی۔

اسلم تھوڑی دیر دفتر میں بیٹھا جائزہ لیتا رہا۔ کام کچھ زیادہ نہ تھا۔ سارے دن میں دو گاڑیاں آتی تھیں۔ ایک شام اور ایک صبح۔ شام والی گاڑی کے ساتھ دوسری گاڑی کا کراس بھی ہوتا تھا۔ دونوں گاڑیاں مخلوط تھیں۔ یعنی بنیادی طور پر تو مال گاڑیاں تھیں۔ مگر ان کے ساتھ چار پانچ ڈبے مسافروں کے بھی لگ جاتے تھے۔

اسٹیشن چھوٹا سا تھا۔ قریب منڈی بھی کوئی نہ تھی۔ اس لیے وہاں سے زیادہ سامان لادا نہیں جاتا تھا۔ خیال یہی تھا کہ صبح اور شام کے کام کے علاوہ باقی دن فارغ گزرے گا۔

اتنے میں اللہ دتہ اندر آگیا۔ بڑی پلیٹ میں کچھ مالٹے اور سنگترے لاکر بڑی خاطر سے اس نے اسلم کے سامنے رکھے۔ اور خود پاس کھڑا ہوکر مکھیاں ہلانے لگا۔

"ارے اللہ دتہ یہ کیوں لے آئے؟"

"جناب تھوڑی دیر تک تو ہمارے مہمان ہیں۔ اس کے بعد آپ افسر اور ہم ماتحت۔ آپ ہماری کوئی چیز کھائیں گے۔ تو ہم بھی دنیا میں سر اٹھا کر چل سکیں گے۔"

اسلم مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ اور سنگترہ اٹھا کر کھانے لگا۔ اس نے پہلی دفعہ غور سے اللہ دتہ کو دیکھا۔ وہ گٹھیلے جسم کا ٹھگنا سا آدمی تھا۔ عمر کوئی چالیس سال، سر کے بال کافی گھنے، چھوٹا سا ماتھا۔ جس کے نیچے قدرے کھبی ہوئی بے حد چمکدار آنکھیں۔ چوڑے دہانے پر خوشامدانہ مسکراہٹ بڑی تیزی سے نمودار ہو جاتی۔ اور پھر غائب ہو جاتی۔ کندھوں میں دھنسی ہوئی چھوٹی سی گردن اور نیچے چوڑا سا جسم۔ اسلم سنگترے کھاتا رہا۔ اور وہ ہاتھ ہلا ہلا کر، حالات بتاتا رہا۔ کہ یہاں فلاں سال میں فلاں اسٹیشن ماسٹر تھا۔ اس کے بعد فلاں آیا۔ کس کے وقت گاڑی کا حادثہ ہوا۔ کس زمانے میں ریلوے وزیر کا دورہ ادھر سے ہوا۔ وغیرہ۔ وغیرہ۔

اسلم کھا چکا تو۔ اللہ دتہ کہنے لگا۔ "حضور ذرا کوٹھی بھی ملاحظہ کرلیں۔"

کوٹھی کے لفظ پر اسلم مسکرایا۔ مگر اٹھ کر اس کے ہمراہ کوارٹر دیکھنے چلا گیا۔ وہ دیکھ کر اسے کوئی خوشی نہ ہوئی۔ کیونکہ اس سے پہلی جگہ اس کے پاس بہتر کوارٹر تھا۔ "مگر اتنے چھوٹے اسٹیشن پر ہو بھی کیا سکتا ہے۔" اس نے سوچا اور نظر دوڑانے لگا۔ دو کمرے، سامنے، چھوٹا سا برآمدہ۔ تنگ سا آنگن جس کے دروازے پر ٹاٹ کا پردہ لٹک رہا تھا۔ سارے مکان پر انجن کے دھوئیں کا گہرا رنگ تھا۔ اسلم کمرے کے اندر داخل ہوا تو ایک دروازہ دوسرے کمرے میں کھلتا تھا۔ اور دوسری طرف ایک بند کھڑکی تھی۔

"اچھا تو یہ باہر کھلتی ہے" اور وہ کھولنے لگا۔

"نہیں جناب!" اللہ دتہ بولا۔ "یہ باہر نہیں کھلتی۔ ساتھ میرا کوارٹر ہے۔ یہ اسی میں کھلتی ہے۔ اس کی چٹخنی بھی ادھر ہی ہے۔ اس طرف نہیں کھل سکتی۔ میں ہمیشہ سے صاحبوں کے ساتھ رہا ہوں۔ تاکہ ہر طرح سے خدمت کرسکوں۔"

اسلم متعجب ہوا۔ کہ کانٹے والے اور اسٹیشن ماسٹر کے مکان کو ملایا کیوں گیا ہے۔ اور وہ بھی ایسے کہ کھڑکی کانٹے والے کے مکان میں سے کھل جاتی ہے؟
"جوناب! کوئی پندرہ سال پہلے حاجی علی احمد صاحب اسٹیشن ماسٹر صاحب آئے تھے۔ ان کی عیالداری بہت تھی۔ اس لیے میں اپنا کوارٹر چھوڑ کر شہر چلا گیا تھا۔ اور انہوں نے بیچ میں کھڑکی بنوالی تھی"۔

اسلم کے دل میں پہلے خیال آیا تھا۔ کہ اس کو مینخ لگا کر بند کر دے۔ مگر اب اس نے سوچا کہ یہ اچھی تجویز ہے۔ جب وہ بیوی بچوں کو لے آئے گا۔ تو ممکن ہے اسے بھی ساتھ والے کوارٹر کی ضرورت پڑے۔ اسلم کچھ دیر کوارٹر دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔

"کیوں بے اللہ دتہ! یہاں کوئی قلی وغیرہ کھانا بنانا جانتا ہے؟"

"نہیں حضور! ایسا تو کوئی آدمی نہیں۔ مگر اللہ نے چاہا تو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ میری بیوی دو وقت آ کر کھانا بنا دیا کرے گی۔ آپ کی بھی خدمت کرے گی اور بیگم صاحبہ کی بھی۔ ہم تو پرانے خدمت گار ہیں حضور!"

وہ تھوڑی دیر باتیں کرتے رہے۔ پھر اللہ دتہ نے پلاچپ بستر لگا دیا۔ اور خود چلا گیا۔ اسلم کچھ دیر لیٹا رہا۔ گھر کی فضا غیر مانوس تھی۔ خالی خالی کمروں میں سامان کے بنڈل بے ترتیبی سے پڑے تھے۔ جیسے گھر نہ ہو کوئی مسافر خانہ ہو۔ وہ سگریٹ جلا کر چت لیٹا ہوا کبھی چھت کی کڑیوں پر جالے یا گانٹھ کے نشان دیکھنے لگتا۔ اور کبھی دیوار کے اکھڑے ہوئے پلستر پہ نظریں گاڑے بیوی بچوں کے متعلق سوچنے لگتا۔

شام کو اسلم شہر کی سیر کے لیے نکلا۔ عام رواج کے برعکس یہاں کا ریلوے اسٹیشن بالکل گاؤں کا حصہ تھا۔ اور اسٹیشن ماسٹر اور عملہ کے کوارٹروں کے ساتھ ہی گاؤں کی گلیاں آ ملتی تھیں۔ وہ ایک گلی سے دوسری گلی میں مڑتا گیا۔ زیادہ تر کچے مکانات تھے۔ جن میں سے کسی ایک کی ایک آدھ پکی دیوار بھی تھی۔ کچی گلیاں ان کے بیچوں بیچ گزرتی ہوئی آزاد منش نالیاں، جن کی چوڑائی حیرت انگیز طور پہ سمٹتی اور پھیلتی جاتی تھی۔ کہیں متروکہ جائداد کا ناکارہ ملبہ، کہیں دیواروں پر اپلے چپکے ہوئے۔ کہیں کوڑے کا ڈھیر یا پانی کا جوہڑ اور اس کے گرد ننگ دھڑنگ بچے کھیلتے ہوئے۔ کسی چھوٹی سی کوٹھڑی میں مونگ پھلی اور ریوڑی کی دکان، جس کی اہمیت ساتھ لٹکے ہوئے لیٹر بکس سے بڑھ گئی تھی۔ ایک گلی سے نکلا تو آگے بازار تھا جس میں پندرہ بیس دکانیں تھیں۔ نیلی کیتلیوں اور پیالیوں والی چائے کی دکان۔ بنولے۔ کھلی اور دال چنے کی دکان، سبزی کی دکان جہاں پکوڑے بھی بنتے تھے لوہار کی دکان، موچی کی دکان، حکیم صاحب کی دکان جہاں کاپیاں، پنسلیں اور جنتری بھی ملتی تھی۔ ٹاٹ کے پردے کے نیچے ایک حجام بھی تھا۔ اور اسی طرح کی چند اور دکانیں۔

اسٹیشن ماسٹر نیلی پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے مزے مزے چل رہا تھا کہ پھل کی ایک کافی بڑی دکان۔ نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ وہ حیران ہوا کہ اتنے چھوٹے بازار میں پھل کی اتنی بڑی دکان کیسے آ گئی۔ ایک دم پھل والا ہڑبڑا کر اٹھا۔

"سلام جوناب!"

اسلم بڑا حیران ہوا۔ "ابے دتو! تو یہاں کیا کر رہا ہے؟"

"حضور یہ پیٹ پالنے کا ذریعہ ہے۔ تنخواہ کی آمدنی سے تو گزارہ نہیں چلتا۔ ساتھ یہاں کام بھی کرنا پڑتا ہے"۔

"اور اسٹیشن کی ڈیوٹی" کا کیا کرتا ہے؟"

"پتی ہے حضور میری شہ کے ماشکی کے ساتھ۔ جب میں نہیں ہوتا وہ بیٹھتا ہے۔ دونوں جوناب کے نوکر ہیں۔ مالکوں کی مہربانی سے گزر بسر ہو جاتی ہے"۔

"ہوں!" اسلم نے کہا۔ اور آگے بڑھنے لگا۔

"حضور دکان پر آتے ہیں۔ کچھ پھل تو چکھتے جائیں"۔

پھل کھانے کی بجائے اسلم دتو کی آنکھوں میں ٹمٹماتی ہوئی چمک دیکھنے لگا۔

"نہیں میاں! مجھے نماز کو دیر ہو رہی ہے" کہتا ہوا اسٹیشن ماسٹر آگے بڑھ گیا۔

اگلے دن صبح کی گاڑی چلوا کر اسلم فارغ ہوا تو ملاقاتی آنے شروع ہوئے۔ چھوٹے شہر میں سرکاری ملازم کی کافی عزت ہوتی ہے۔ کچھ غرض مند اور کچھ علاقے میں اونچی ناک رکھنے والے لوگ ضرور ان سے رسم و راہ رکھتے ہیں۔ اسلم بھی اس رواج کو جانتا تھا اس لیے جو بھی آیا۔ اس سے خندہ پیشانی سے ملتا رہا۔ دو نمبردار ملنے آئے۔ ملک، چودھری، اور ہر قسم کے لوگ باری باری آئے۔ اسکول ماسٹر، سرپنچ اور امام مسجد ملنے آئے۔ یونین کونسل کے ممبر بھی دو چار آدمیوں کی جلو میں آئے۔ خاندانی حکیم صاحب بھی چھڑی سمیت آئے۔ جب بھی کوئی ملاقاتی آتا۔ دتو اندر اطلاع دینے آتا اور دو چار جملوں میں اس کا تعارف کرا دیتا۔ پھر اسلم ان سے ملتا۔ پچھلی ملازمت کا ذکر ہوتا۔ آئندہ قیام کے لیے اچھی امیدوں کا اظہار کیا جاتا۔ اور پھر ہر خدمت کا وعدہ کر کے لوگ چل دیتے۔

سب سے آخر میں دتو ایک چٹ لایا۔ جس پر لکھا تھا۔ "ملک رحمت علی ۔ تاجر!"

"کون ہے یہ؟" اسلم نے پوچھا۔ تو دتو تعریفی انداز میں بولا۔

"یہاں کا مشہور کاروباری ہے جناب! اور افسروں کا بڑا خدمت گزار ہے۔ سارے اسٹیشن ماسٹر اس پر بڑی مہربانی کرتے رہے ہیں۔ یہ بھی ان کی تابعداری کرتا ہے۔ بہت اچھا آدمی ہے جی جناب!"

"بلا لاؤ!"

چالیس پچاس برس کا بھاری بھرکم آدمی اندر داخل ہوا۔ دو فٹ کا طرہ، سیر بھر کی مونچھیں، صاف ستھری اچکن، لٹھے کی سفید دھلی ہوئی دھوتی، نیچے سے زری والی جوتی کی بیلدار نوکیں جھانکتی ہوئی۔ اور ہاتھ میں بوٹے والی چاندی کی چھڑی۔ وہ اسلم سے بڑے آداب سے ملا۔ باتیں شروع ہوئیں۔ تو اسلم کو معلوم ہوا کہ وہ علاقہ کا زمیندار ہے۔ سوڈا کمپنی کا ایجنٹ بھی ہے۔ شہر کی سگرٹ اور کھاد کی ایجنسی بھی اسی کے پاس ہے، ڈپو بھی اسی کا ہے اور چند ایک چھوٹے موٹے کاروبار اور بھی کرتا ہے۔

"آپ نئی جگہ آئے ہیں۔ بچوں کے آنے پر ایک بھینس بھجوا دوں۔ جب خشک ہو جائے گی دوسری بھجوا دوں گا۔"

مگر اسلم نے انکار کر دیا۔

وہ جانے لگا تو دتو نے بڑے ادب سے اس کی لاٹھی اٹھا کر اسے دی۔ پھر دروازہ کھول کر کھڑا ہو گیا۔ اور ساتھ ہی باہر چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد اسلم نے ویسے ہی دروازے میں سے جھانکا تو ملک صاحب اور دتو بڑے گھل مل کر باتیں کر رہے تھے۔

دو تین روز بعد شام کی گاڑی ذرا لیٹ تھی۔ کراس والی دوسری گاڑی کھڑی رہی اور اسلم مصروف رہا۔ اس لیے شام کو بہت دیر سے فارغ ہونے کے بعد گھر لوٹا۔ باورچی خانے میں دتو کی بیوی اللہ وسائی کھانا پکا کر گھر جا چکی تھی۔ وہ روزانہ آ کر کھانا بناتی تھی۔ دتو کے ساتھ مل کر کھلاتی تھی۔ اور پھر باورچی خانے کا کچھ کام کرنے کے بعد چلی جاتی تھی۔ اسلم کا خیال تھا کہ مہینہ پورے ہونے پر اسے کچھ تنخواہ دے دے گا۔ اللہ وسائی تیس بتیس سال کی بھرپور عورت تھی۔ جو صورت سے زیادہ اپنے جسم سے دوسرے کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی تھی۔ شکل بھی بری نہ تھی رنگ کیسا بھی کیوں نہ ہو۔ گول چہرے کو کون کافر برا کہہ سکتا ہے۔ اسلم نے اسے دو چار مرتبہ ایک آدھ نظر دیکھا۔ اور بس اس سے زیادہ کی اس میں ہمت ہی نہ تھی۔

آج دیر ہونے کی وجہ سے وہ جا چکی تھی۔ اور دتو کھانا کھلانے لگا۔ اتنے میں اللہ وسائی نے بچہ بھیج کر دتو کو اپنے کوارٹر میں بلایا۔ وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں مٹھائی کا ایک بڑا خوان تھا جو اس نے اسلم کے سامنے رکھ دیا۔

"یہ کیا لے آئے دتو؟"

"جناب! آج ملک رحمت علی یہ چھوڑ گیا تھا۔"

"کیوں لیا تھا مجھ سے پوچھے بغیر؟" اسلم غصہ میں بولا۔

"حضور مجھے تو پتہ نہیں اللہ وسائی گھر پہ تھی۔ اسی کے پاس چھوڑ گیا ہے۔ اکثر لاتا رہتا ہے حضور ــــ افسروں کا تابعدار ہے۔"

"کیوں لاتا رہتا ہے؟"

"آخر حضور افسر بھی تو مہربانی کرتے ہیں۔ ان کا منوں سامان جاتا ہے۔ کئی دفعہ اوپر تلے ہو جاتا ہے۔ تو ہم نے کبھی پوچھا بھی نہیں۔ اب یہ وڈی تابعداری بھی نہ کرے تو کیا بات ہوئی بھلا۔"

اسلم اب ساری بات سمجھ چکا تھا۔

"کان کھول کر سن لو دتو۔ میں رشوت کھانا حرام سمجھتا ہوں اور ملک رحمت علی سے صاف کہدو کہ مجھ سے کسی مہربانی کی توقع نہ رکھے [illegible] اس کی خدمت کی ضرورت ہے۔"

دتو ایک دم حیران سا ہو کر اسلم کو دیکھنے لگا۔ جیسے وہ کوئی بہت ہی عجیب چیز ہے

"حضور یہ کون سی رشوت ہے سبھی اسٹیشن ماسٹر یہ کرتے آئے ہیں۔ بڑے بڑے داڑھی والے بھی جو پنج وقتی نمازی تھے۔"

"چلو بک بک نہ کرو، میرے داڑھی نہیں ہے اور میں رشوت بھی نہیں لیتا۔ یہ مٹھائی اٹھا کر لے جاؤ۔ اور اسے واپس کر دو۔"

وہ غصہ سے مڑ کر اندر چلا گیا۔ اللہ دتہ کی آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی۔ اور وہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھال اٹھا کر گھر کو چل دیا۔

چند روز تک اسلم کام کا جائزہ لیتا رہا۔ تو اسے معلوم ہوا۔ کہ چھوٹی موٹی بے قاعدگیاں ہوتی رہتی ہیں، مٹی کے تیل، فنائل، کوئلہ وغیرہ کی، غزوں میں بہت کھپت تھی۔ گو اصل استعمال بہت کم نظر آتا تھا۔ اس نے وقتاً فوقتاً پڑتال شروع کر دی اور ملازموں کو ٹوکنے لگا۔

اللہ دتہ اب کچھ دب سا گیا تھا۔ اس کی چرب زبانی بھی نسبتاً کم تھی۔ دوسرے قلیوں اور ملازموں پر بھی رعب قدرے کم ڈانٹا تھا۔ اس شخصیت میں جو انگارے سے دہکتے تھے۔ ان پر ہلکی سی راکھ کی تہہ چڑھ گئی تھی۔

33495

ایک دن اسلم اچھے موڈ میں تھا۔ اتنے میں کہیں سے اللہ دتہ نمودار ہو گیا۔

"ارے دتو پانی تو پلا بھاگ کے۔"

دتو جھٹ سے گلاس لے کر بھاگا ــ لیکن تھوڑی دیر بعد ناکام واپس لوٹا۔ مٹکے سب خالی تھے۔ اور پانی کا نل خراب تھا۔ اس کی مرمت رہی تھی۔

"ارے ستیاناسی! مجھے تو بڑی پیاس لگی ہے ــ اچھا جا بھاگ کر انجن والے سے پانی لے آ۔ گاڑی بھی قسمت سے کھڑی ہے۔"

دتو حیران رہ گیا۔ "جناب وہ تو گرم ہوگا۔"

"تو کیا ہوا، ابھی رکھ دیں گے تو ٹھنڈا ہو جائے گا۔"

"لیکن جناب اگر اجازت ہو تو پھلوں کے کسی ٹوکرے میں سے سنگترے نکال لوں ــ گاڑی جو کھڑی ہے۔"

"ایں؟" اسلم کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ "حرامزادے، مجھے چوری کا مال کھلاتا ہے۔ خبردار جو ایسی بات پھر کی ــ بھاگ یہاں سے رہا کر انجن سے پانی لا۔"

دتو ایک دم غائب ہو گیا۔

چند دن گزر گئے۔ اسلم نئی جگہ جم چکا تھا۔ مقامی لوگوں سے کچھ راہ و رسم ہو گئی تھی۔ اپنے ملازموں کے کام کا بھی اندازہ ہو چکا تھا۔ نئی جگہ

کی اجنبیت بھی ختم ہوگئی تھی۔ اور اب وہ بیوی بچوں کے بغیر کچھ اداسی محسوس کرتا تھا۔ دفتر میں فارغ بیٹھے ہوئے یا رات کو اندھیرے کمرے میں چت لیٹے ہوئے وہ اکثر حساب لگاتا رہتا۔ کہ اس کی لڑکی کے امتحان میں ابھی اتنے دن باقی ہیں۔ وہ فارغ ہو تو فوراً بیوی کو گھر لے آئے۔ تاکہ گھر میں رونق ہو۔ اور اللہ دسائی کی تنخواہ کا بوجھ بھی ہلکا ہو۔

ایک شام پہلی گاڑی آچکی تھی۔ لیکن کراس کرنے والی کچھ لیٹ ہو چکی تھی۔ ڈرائیور اور گارڈ سے وہ کاغذات لے چکا تھا۔ اور دو اِ سے باہر کی خبروں پر تبصرہ کرکے اب قریباً سب موضوع ختم کر چکا تھا۔ گاڑی رکنے کے بعد کی ابتدائی گہما گہمی ختم ہو چکی تھی۔ اور اب بیشتر لوگ کسی جگہ بیٹھ چکے تھے۔ یا کھڑکیوں کے قریب ٹہل رہے تھے۔ بچوں کے ساتھ سفر کرنے والے زنانہ ڈبوں کی کھڑکیوں سے لگے گاڑی چلنے کی دعا کر رہے تھے۔ اکا دکا فقیر ادھر ادھر گھوم کر ایک ایک مسافر سے کئی کئی بار ناگواری کا انکار سن چکے تھے۔ کئی کئی پھیرے لگانے کے بعد خوانچے والوں کی بھی مدھم پڑ گئی تھی۔ اور قلی اپنے پیسے گننے میں مصروف تھے۔ اسلم نے ٹیلیفون پر جاکر پچھلے اسٹیشن سے بات کی۔ تو پتہ چلا کہ ابھی گاڑی کے آنے میں دیر ہے۔ اور وہ پلیٹ فارم پر گھومتا ہوا گاڑی کے آخری سرے تک پہنچ گیا۔ وہاں اسے شک سا ہوا کہ لائن کا کانٹا ٹھیک نہیں بدلا گیا۔ لیکن جاکر دیکھا تو وہ ٹھیک تھا۔ اور وہ واپس مڑا۔

پلیٹ فارم سے ملحق لائن پر گاڑی کھڑی تھی۔ کراس کرنے والی گاڑی دوسری لائن پر آنے والی تھی۔ وہ دوسری گاڑی دیکھنے کے لیے پٹری پر ہولیا۔ اور لکڑی کے سلیپروں پر اچک اچک کر چلتا ہوا، افق میں دھواں ڈھونڈنے لگا۔ اسی طرح وہ آہستہ آہستہ واپس آرہا تھا۔

ایک دم اسلم ٹھٹکا ۔۔۔ گاڑی کے دوسری طرف ایک ڈبے کے پاس پہیوں کے نیچے سے دتو پھل کا ایک ٹوکرا شوکت ماشکی کو دے رہا تھا۔ شوکا اسے پکڑ کر تیزی سے شہر کی طرف بھاگا۔ اسلم نے آواز دی مگر اسی وقت انجن بھاپ چھوڑنے لگا۔ اور اس کی آواز شور میں دب گئی۔ پورا سراغ لگانے کے لیے اسلم فاصلہ دے کر شوکے ماشکی کے پیچھے چلنے لگا۔ تھوڑا تعاقب کرنے پر اس کے خدشات درست نکلے۔ شوکا ماشکی بازار میں دتو کی دکان پر پھل دے گیا تھا۔ اتنے میں گاڑی کی وسل سنائی دی۔ اور اسلم واپس بھاگا۔

اسٹیشن پر پہنچا۔ تو گاڑی رک چکی تھی۔ اس نے بھاگم بھاگ کارروائی پوری کی۔ دونوں گاڑیوں کو چلوایا۔ اگلے اسٹیشنوں پر روانگی کی اطلاع دی اور پھر اطمینان سے دتو کی تلاش کی۔ مگر وہ اور شوکت ماشکی دونوں غائب تھے۔

شام کے کھانے پر اسلم دتو پر برس پڑا۔ "الو کے پٹھے! بدمعاش، حرامی! گاڑی میں سے پھل چراتے شرم نہیں آتی۔ حرکتیں تم کرو اور میرا نام بدنام ہوگا؟"

مگر دتو صاف مکر گیا۔ "کیسا پھل حضور؟ کونسی گاڑی؟"

"شوکا سور کدھر ہے؟" اسلم دھاڑا۔

"وہ تو جو نالب ماتم ہوگیا ہے اُدھر گیا ہے!" دتو سکون سے بولا۔

"کہاں ماتم ہوا ہے؟ ۔۔۔ بلاؤ اسے۔"

"وہ تو صاحب ڈھوک پر گیا ہے ۔۔۔ یہاں سے چار کوس دور!"

اسلم نے طیش میں آکر برتن پھینک دیے۔ دتو کو اپنی زبان میں ہر گالی دے ڈالی۔ اور صبح سویرے پولیس کے حوالے کر دینے کا فیصلہ کر کے اسے باہر نکال دیا۔ پولیس کا نام سن کر دتو گھبرایا۔ مگر کان لپیٹ کر چل دیا۔

رات اسلم چارپائی پر لیٹا تو دیر تک سوچتا رہا۔ کہ دتو کے خلاف کیا کارروائی کرے۔ کہ اس کے ساتھ دوسروں کو بھی نصیحت ہو۔ وہ آج تک جہاں بھی رہا تھا۔ اس نے حسن کارکردگی اور دیانتداری میں بڑا نام پیدا کیا تھا۔ لیکن اب اگر اس کا ماتحت بھلا آدمی سے من مانی کرتا رہا تو خوامخواہ

بدنام ہو جائے گا اس نے سوچا کل سے اللہ وسائی اور دتو کا داخلہ گھر میں بند کر دے۔ اور اپنی بیوی کو تار دے کر بلا لے۔ لڑکی اتنے دن اپنے اموں کے ہاں رہ سکتی ہے۔ اس قسم کے پروگرام بناتا وہ سو گیا۔

دھرتی کے گہرے سینے میں سے کوئی مدھم گونج ابھری۔۔۔ جو۔۔۔ آہستہ۔۔۔ آہستہ۔۔۔ قریب آتی گئی۔ اسلم بیدار ہوا تو وہ دروازے کا لٹا تھا۔ نیند سے بوجھل ہوتی آنکھوں میں چھوٹی سی درز ہوئی تو روشنی کی کرنیں گھومتے ہوئے دماغ سے جا ٹکرائیں اور اسلم نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

۔۔۔ کمرے میں لیمپ کی روشنی تھی۔

اس نے سر اٹھایا تو لیمپ کے پاس اللہ وسائی کا چہرہ نظر آیا۔۔۔۔۔۔ دونوں کوارٹروں کی درمیانی کھڑکی کھلی تھی۔ اس میں اللہ وسائی، لیمپ ہاتھ میں پکڑے کھڑی تھی۔ اسلم کو آنکھیں کھولتے دیکھ کر وہ مسکرائی۔ اور الٹے ہاتھ سے کھڑکی بھیڑ کر آہستہ آہستہ اسلم کی طرف بڑھنے لگی۔ اس کا دوپٹہ غائب تھا۔ گریبان کے بٹن کھلے تھے۔ لیمپ کی روشنی میں جسم کے ابھار بھرپور تھے سر کے بال ڈھیلے ڈھالے تھے۔ چمکتی ہوئی آنکھوں اور مسکراتے ہونٹوں سے وہ آگے قدم بہ قدم آگے بڑھ رہی تھی۔

"کیا بات اللہ وسائی؟" اسلم ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔

وہ آگے آئی۔ آہستگی سے میز پر لیمپ رکھا اور سڈول بازو سینے پر رکھ کر مسکرانے لگی۔

مرد کسی ایسے وقوعے کے لیے ذہنی طور پر تیار نہ ہو اور اسے اچانک سپردگی میں ڈوبی ہوئی عورت کا سامنا کرنا پڑ جائے تو یہ اس کی زندگی کا ایک ایسا لمحہ ہوتا ہے۔ جس میں اس کی خالص شخصیت بے نقاب ہو کر سامنے آتی ہے، اس کا ردعمل سوچ، بناوٹ اور پالیسی سے خالی ہوتا ہے اور اس کے سارے ماضی کا نچوڑ اس ایک لمحے میں ٹپک پڑتا ہے۔ ان معاملات میں ناتجربہ کار سیدھا سادا مرد کسی سحر زدہ کی طرح بھاگ نکلتا ہے۔ مگر اس میدان کا شاطر مزے سے ہاتھ بڑھا لیتا ہے۔ اسلم بھی اللہ وسائی کا مطلب سمجھ گیا۔ اور اس کی شخصیت کے سارے اجزا غیر شعوری طور پر اس صورت حال سے نکلنے کے لیے کلبلانے لگے۔

"اس وقت کیوں آئی ہو؟" اسلم نے ہڑبڑا کر پوچھا۔

"میں نے کہا!" وہ ہنسی۔ "آپ تھک گئے ہوں گے، ذرا پاؤں دبا آؤں۔" اور وہ پائنتی کی طرف بڑھی۔

"نہیں نہیں۔" اسلم چھلانگ لگا کر چارپائی سے کودا۔ "مجھے کوئی ضرورت نہیں، کوئی تھکاوٹ نہیں۔۔۔ تم جاؤ۔"

وہ کونے میں جا کھڑا ہوا۔ اور ہاتھ سے جانے کا اشارہ کرنے لگا۔

اللہ وسائی نے نظر بھر کر اسے دیکھا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے۔ جیسے پتلا بادل رینگتا رینگتا چاند کو ڈھانپ لے۔۔۔ مسکراہٹ غائب ہوئی۔۔۔ آنکھیں بجھ سی گئیں۔۔۔ جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ اور چہرے پر شکست اور مایوسی چھا گئی۔

"بابوجی آپ۔۔۔ دتو کو پولیس کے حوالے نہ کریں۔۔۔ ہمارا تو کاروبار ہی گاڑی سے چلتا ہے۔۔۔ آپ رات کو جب چاہیں۔۔۔۔۔ کھڑکی پر تھاپ دے دیں۔۔۔ میں آ جاؤں گی۔۔۔۔۔ پہلے بھی کئی افسروں کی اسی طرح سیوا کرتی رہی ہوں۔"۔۔۔

مرد کا لمحہ گزر چکا تھا۔ اور اب اسلم میں افسر پیدا ہو گیا تھا۔

"نکل جاؤ یہاں سے۔ تم لوگوں نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے۔۔۔ دفع ہو جا۔ فاحشہ۔۔۔ کتی۔۔۔ خبردار جو اب اس گھر میں قدم رکھا۔ کل صبح میں دیکھتا ہوں تم اس کوارٹر میں کیسے رہتے ہو؟۔۔۔ کمینے۔۔۔ ذلیل۔۔۔۔" اور وہ گالیاں دیتا رہا۔ اللہ وسائی کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے اور وہ ایکدم لیمپ اٹھا کر چلی گئی۔ کھڑکی دھم سے بند ہو گئی۔

گھپ اندھیرے میں اسلم گم سا ہو گیا۔ مٹھائی کے ٹکڑے پر جس طرح چیونٹیاں چہار طرف رینگتی ہیں۔ اسی طرح اس کے ذہن پر احساسات کے تانے بانے ایک دوسرے کو روندتے ہوئے رینگ رہے تھے۔ تھوڑی پشیمانی، کافی حیرت اور قدرے پچھتاوا اس کے لاشعور میں گڈمڈ تھے۔ بظاہر وہ سخت غصہ میں تھا۔ اور اس کی اخلاقی حسیات بری طرح مجروح تھیں۔ کہ اللہ وسائی نے اسے اس قماش کا آدمی کیوں سمجھا۔ ایک دم وہ طیش اٹھا اور کھڑکی پر گھونسہ مار کر چلایا۔

"سور کے بچے دتو۔ کل دس بجے تک یہ کوارٹر خالی کر دو، ورنہ پولیس کے حوالے کر دوں گا۔ اور نوکری سے نکلوا دوں گا"

اسے یقین نہیں تھا کہ دتو وہاں موجود ہے۔

اسلم واپس آکر چارپائی پر لیٹا۔ مگر اسے کافی دیر تک نیند نہ آئی۔ اس کی سابقہ شریفانہ زندگی اور نیک نامی کی شہرت بار بار آکر جھنجھوڑتی۔ اس حرکت کی وجہ سے بدنامی کے تصور سے ہی وہ کانپ اٹھتا۔ اسلم متوسط طبقے کی مضبوط اخلاقی تنظیم کا پروردہ تھا۔ جس کی زندگی میں شادی سے پہلے جنس کی تکمیل کے مواقع اول تو آتے ہی نہیں۔ اور اگر چند ایک امکانات کبھی آتے بھی تو وہ ان سے فائدہ نہ اٹھا سکا تھا۔ اس لیے اس کی اخلاقی یکسانیت میں اس طلاطم سے صدمہ پہنچنا قدرتی تھا۔ وہ دیر تک بستر میں پہلو بدلتا رہا۔ پھر اُٹھ کر ایک گلاس پانی پیا۔ جس سے اعصاب کو کچھ تقویت ہوئی اور پھر وہ آکر لیٹ گیا۔

صبح اسلم ذرا دیر سے بیدار ہوا۔ باورچی خانے سے برتن کھڑکنے کی مخصوص آواز نہیں آرہی تھی۔ اور گھر میں خاموشی تھی۔ اسے بستر پر لیٹے لیٹے پتہ چل گیا کہ آج اللہ وسائی کام پر نہیں آئی۔ گاڑی کے آنے میں ابھی کافی وقت تھا اور وہ آرام سے تیار ہونے لگا۔

"پروا نہیں!" وہ شیو کا برش داڑھی پر زور سے رگڑتے ہوئے بڑبڑایا۔ "چند دن اسٹیشن کی دکانوں سے کام چل جائے گا۔ اور پھر گھر کے سب لوگ آجائیں گے۔"

نہانے کے بعد جسم پر تولیہ رگڑتے ہوئے۔ اس نے سوچا کہ بیوی کو خط لکھ کر جلد از جلد آنے کی تاکید کرے تاکہ یہ سب جھمیلے ختم ہوں۔ کپڑے پہن کر وہ گھر سے ذرا جلدی نکلنے لگا۔ کہ اسٹیشن پر ناشتہ کرے مگر دروازے پر ہی ملک رحمت علی مل گیا۔ اپنی چمکیلی چھڑی اٹھا کر اس نے دونوں ہاتھوں سے ادب سے سلام کیا۔

"آئیے ملک صاحب" اسلم نے خوش خلقی سے کہا۔ "آپ آج سویرے سویرے کدھر گھوم رہے ہیں؟"

"بس جی، ویسے ہی ذرا اسلام کو حاضر ہو گیا تھا" ملک رحمت علی نے قدرے محتاط سا جواب دیا۔ دونوں طرف سے مزاج پرسی ہوئی اور اسلم گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں ذرا اسٹیشن پر جا رہا تھا۔ کوئی کام تو نہیں کیا؟"

"نہیں جناب! کام تو نہیں ــــ آپ کا وقت بھی قیمتی ہے۔ لیکن اگر چند لمحے رک جائیں۔ تو جلدی جلدی ایک چھوٹی سی عرض کروں۔"

"جی فرمائیے۔"

ملک رحمت علی نے چور نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اور بات کرتے کرتے جھجک گیا۔

"کوئی خاص بات ہے کیا؟" اسلم اس کی جھجک دیکھ کر بولا۔

"جی نہیں! خاص تو نہیں .... لیکن ذرا .... اندر چلے چلیں تو مجھے اطمینان رہے گا۔"

اسلم ناگواری سے اسے اندر لے گیا۔

"جی ..... وہ!" اس نے گلا صاف کیا۔ "میں حاضر ہوا تھا کہ دتو کو معافی دے دیں۔ نادان ہے، بے وقوف ہے۔ نوکروں سے غلطیاں ہو ہی جاتی ہیں۔ مالک کا تو کام ہی معافی دینا ہے۔"

اسلم نے تیز آنکھوں سے ملک رحمت علی کو گھورا۔ "دتو آپ کے پاس گیا تھا؟"

"جی وہ تو سویرے سے میرے گھر بیٹھا رو رہا ہے۔ مجھے جگایا بھی اسی نے ہے۔ وہ بڑا نادم ہے۔ دراصل غریب آدمی ہے۔ عرصہ سے پھل کا کاروبار اسی طرح کرتا ہے۔ اس کو دو وقت کی روٹی مل جاتی ہے۔ اور گاؤں والوں کو آسانی سے اچھا پھل مل جاتا ہے ــــ دونوں کا بھلا ہے۔ یہ اسی گاؤں کا رہنے والا ہے۔ میں نے ہی اسے یہاں نوکر کرایا تھا۔ پندرہ برس سے اسی اسٹیشن پر کام کر رہا ہے۔ کبھی کوئی ناخوشگوار بات نہیں ہوئی ــــ دنیا کے کاروبار تو اسی طرح چلتے ہیں۔

اسلم نظر جما کر ملک رحمت علی کی بات سنتا رہا۔ جو چھڑی سے فرش کو کریدتا رہا۔ ایسے دھیمے دھیمے بات کر رہا تھا۔ جیسے گاڑی سے پھل چرا کر بیچنا کوئی غیر معمولی بات ہی نہیں۔

"مگر ملک صاحب میں یہاں کا انچارج ہوں۔ اور جانتے بوجھتے ہوئے پھل چرانے کی اجازت کیسے دے سکتا ہوں؟"

"ہا ہا ہا۔" ملک رحمت علی خوشامد سے ہنسا اور لٹو کی طرح چھڑی گھمانے لگا۔ "آپ بہت سادے اور شریف آدمی ہیں۔ مگر...."

اسلم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وہ تھوڑا آگے جھکا...... "آپ جاننے کی کوشش ہی کیوں کرتے ہیں؟ اگر وہ اپنا ضمیر گندا کر رہا ہے آپ کی بلا سے۔ آپ کیوں اس کیچڑ میں آتے ہیں ــــ آپ نے کون سا ساری عمر یہاں بیٹھے رہنا ہے۔ چھ مہینے سال کی بات ہے پھر کوئی دوسرا افسر آجائے گا۔ آپ یہ چیزیں روک بھی دیں گے۔ تو پھر دوبارہ شروع ہو جائیں گی ــــ میں دتو کو سمجھا دوں گا۔ کہ جب تک آپ یہاں ہیں وہ ذرا احتیاط سے کام لے اور ہاتھ روک کر رکھے۔"

اب اسلم سے برداشت نہ ہو سکا۔ اور وہ کھڑا ہو گیا۔ "دیکھیے ملک صاحب میں آپ کی بہت عزت کرتا ہوں۔ لیکن آپ سے درخواست کروں گا۔ کہ میرے محکمانہ انتظام میں دخل نہ دیں۔ میں دتو کو کہہ چکا ہوں۔ کہ میں اس کے خلاف افسرانِ بالا کو رپورٹ کروں گا۔ اور اگر ضرورت پڑی تو شاید پولیس کو بھی کیس دینا پڑے۔ ابھی اسٹیشن پر جا کر ذرا انکوائری کر لوں تو کچھ فیصلہ کروں گا ــــ بہرحال یہ تو ہوتا رہے گا۔ مگر اسے کوارٹر آج ہی خالی کرنا پڑے گا۔ اس معاملے میں میں کسی کی بات نہیں مان سکتا۔"

ملک رحمت علی بڑی توجہ سے اسلم کی بات سنتا رہا۔ مگر اس کی آنکھوں میں ایک تمسخر چھپا ہوا تھا۔ جو مونچھوں کی ہلکی سی حرکت سے بھی عیاں ہوتا تھا۔ اس نے اسلم کے غصہ کو اور بڑھا دیا۔ اور وہ باہر کی طرف بڑھنے لگا۔ مگر ملک رحمت علی اپنی جگہ سے نہ اٹھا۔ اور اسلم کو رکنا پڑا۔

"جناب مجھے غلط سمجھے۔" ملک رحمت علی آہستگی سے بولا۔ "میرا مقصد ہرگز آپ کے کام میں دخل دینا نہ تھا۔ میں تو ہمیشہ سے افسروں کا تابعدار اور خدمت گزار رہا ہوں۔ آپ آئندہ بھی مجھے اپنا خیر خواہ پائیں گے۔ اور ....۔" اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ "..... میں نہیں چاہتا تھا کہ دتو ــــ لوگوں سے الٹی سیدھی باتیں کرتا پھرے......"

"مجھے کوئی پروا نہیں کہ وہ کیا بکتا ہے۔" اسلم نے جلدی سے بات کاٹی۔

ملک رحمت علی کی آنکھوں میں تمسخر کا ایک ننھا سا شرارا کانپا۔ "ابھی تو بات میرے اور اس کے درمیان ہے اور میں نے اسے سختی سے منع کیا ہے۔ کہ کسی سے ذکر نہ کرے۔ لیکن ..... اگر حالات نہ سدھر سکے .... تو ظاہر ہے ... میں اس کو روک نہیں سکوں گا۔"

"مگر ملک صاحب میں نے آپ سے کب کہا کہ آپ اسے روکیں۔ اسے کہنے دیں جو وہ کہتا ہے۔" اسلم نے ایک دفعہ پھر اٹھنے کی ہلکی سی کوشش کی۔

"جی نہیں آپ نے تو نہیں کہا مگر ہمارا بھی تو کوئی فرض ہے تا کہ آپ کی عزت کا خیال رکھیں۔ میں سچ کہتا ہوں۔ کہ آپ اسے معاف کر دیں تو بات بالکل باہر نہ نکلے گی۔" اس نے معنی خیز نظروں سے اسلم کو دیکھا۔

"بات کون سی چھپی ہے؟" اسلم بولا۔ "میں ابھی جاکر کھلی انکوائری کردوں گا۔ اور سب کو پتہ چل جائے گا کہ وہ چور ہے۔"

"جی نہیں ....." اس نے پھر گلا صاف کیا۔ "میرا مطلب دوسری بات سے ہے۔ وہ ابھی تک میرے سینے میں ہے۔ اور انشاء اللہ راز رہے گی۔ دتّو کا منہ میں خود بند کرلوں گا۔ میرا کہنا وہ ٹال نہیں سکتا۔"

اسلم نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھا۔ تو وہ آنکھیں نیچی کرکے بولا۔ "دتو نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے ..... دیکھئے میں تو یقین نہیں کرتا مگر اس کا کہنا ہے ..... کہ ..... کل سہ پہر کو اس کی بیوی جب باورچی خانہ میں کھانا پکا رہی تھی ..... تو ..... آپ نے ....." (اس نے گلا صاف کیا) "یعنی ..... کچھ زبردستی کی کوشش کی۔"

اسلم ایک دم سُرخ ہوگیا۔

"یہ کیا بکواس ہے ملک صاحب؟"

"جی اب مجھے تو علم نہیں۔" ملک رحمت علی مصنوعی سنجیدگی سے بولا۔ "یہ دتو ہی کہتا ہے!"

"مگر یہ بکواس ہے ـــ بہتان ہے ..... اس کی بیوی فاحشہ ہے، بدمعاش ہے، وہ تو ..... رات کو خود میرے کمرے میں چلی آئی تھی اور میں نے اسے دفع کیا تھا۔" اسلم بے چارگی سے چلّایا۔

"ہاہاہا۔" ملک رحمت علی زور سے طنزیہ ہنسا۔ "آج کل تو یوسف زلیخا کے قصے نہیں ہوتے نا بادشاہو۔"

"مگر آپ نے کیسے یقین کرلیا۔ اس کی بات پر۔" اسلم جزبز ہوکر بولا۔ "وہ جھوٹا ہے ـــ کمینہ ہے ـــ بدکردار ہے۔" اور وہ غصے میں اُٹھ کر کمرے میں چکر کاٹنے لگے۔

ملک رحمت علی آنکھوں میں دھیمی دھیمی مسکراہٹ لیے اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے چھڑی سنبھالی اور آہستہ آہستہ دروازے کی طرف چلا۔ نکلتے نکلتے تھوڑا سا رکا۔ گردن موڑی اور معنی خیز انداز میں بولا۔

"میں آپ کا خیرخواہ ہوں جناب ـــ میری بات مان لیں۔ آپ یہاں نئے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا آپ کس قسم کے آدمی ہیں۔"

اور وہ باہر نکل گیا۔

اسلم کا خون اس دھمکی پر کھولنے لگا۔ "تم سب ذلیل اور کمینے ہو۔ میں تمہیں ٹھیک کردوں گا۔" ہوا میں دروازے کی طرف گھونسے ہلاتا ہوا وہ پکارا اور میز سے فاؤنٹین پن اٹھاکر جیب میں گھسیڑتا ہوا باہر نکل گیا۔

ابھی اسٹیشن سے کچھ دور ہی تھا کہ گھنٹی بجنے لگی۔ گاڑی کا وقت بالکل قریب تھا۔ دیہاتی لوگ اپنی گٹھڑیاں سنبھالے پلیٹ فارم کے کنارے کے قریب کھسک آئے تھے۔ دو چار قلی ادھر ادھر بیکار سے گھوم رہے تھے۔ دو تین بچے نل سے منہ لگاکر پانی پینے کی کوشش کر رہے تھے۔ جو ان کے گریبانوں سے ہوتا ہوا پیٹ پر کرتا تر کر رہا تھا۔

اسلم تیزی سے کمرے کی طرف گیا۔ ٹیلیفون پچھلے اسٹیشن سے ملایا۔ تو گاڑی چل چکی تھی۔ اپنی میز سے اٹھ کر اس نے ٹکٹ بابو کے رجسٹر پر سرسری سی نظر ڈالی۔ ٹکٹ بابو ایک دیہاتی کو یقین دلا رہا تھا۔ کہ کرایہ ایک روپیہ پندرہ آنے ہی ہے۔ مگر دیہاتی کو اصرار تھا کہ وہ ہمیشہ ایک روپیہ بارہ آنے ہی دیتا ہے۔

"اوئے بابا!" اسلم دھاڑا۔ "ٹکٹ لینا ہے تو لے ورنہ چل ہٹ یہاں سے۔"

بوڑھے دیہاتی نے تین آنے رکھ دیے۔ جو اس نے پہلے ہی مٹھی میں رکھ چھوڑے تھے۔ اور بڑبڑایا۔ "توبہ اللہ! کیا زمانہ آگیا ہے!"

"چل بھاگ۔" کھڑکی سے پرے ہٹ کر زمانہ دیکھ۔"

ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اور اسلم ادھر متوجہ ہو گیا۔
گاڑی آ گئی اور اسلم اس کے ہنگامے میں کھو گیا۔ تھوڑی دیر بعد کراس والی دوسری گاڑی بھی پہنچ گئی۔ ٹیلیفون آیا تھا کہ اس کا ایک ڈبہ اتار کر پہلی گاڑی سے لگانا ہے۔ کچھ وقت اس میں لگ گیا۔ دونوں گاڑیاں چلی گئیں۔ تو ایک ریلوے انجینئر ٹھیلہ پر وہاں پہنچ گئے۔ اور اسلم ایک دو گھنٹے ان کے پاس رہا۔ دوپہر کے قریب وہ فارغ ہوا تو سوچنے لگا کہ دِتو کے خلاف کیا کارروائی کی جائے۔ سب سے پہلے اس نے اپنے بکنگ کلرک کو بلایا۔ اور اس سے پوچھا کہ آیا اس نے دِتو کو کل پھل چراتے دیکھا ہے۔ کلرک نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"کبھی پہلے دیکھا ہے؟"

"جی نہیں۔"

"کبھی اس قسم کی شکایت سنی ہے؟"

کلرک خاموش رہا۔ اسلم نے دو چار سوال اس سے کئے۔ اور اسٹیشن کے باقی عملہ سے بھی پوچھا۔ مگر سب کا رویہ اس قسم کا تھا کہ اس موضوع پر بات کرنے سے بچنا چاہتے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد اسلم کو اندازہ ہو گیا۔ کہ دِتو کے خلاف کھل کر بات کرنے کو کوئی بھی تیار نہیں۔ چنانچہ اس نے زیادہ وقت ضائع کرنے کی بجائے ایک رپورٹ لکھی۔ کہ اللہ دتہ کانٹے والا شہر میں پھلوں کی دکان کرتا ہے۔ اور کل میں نے اسے گاڑی میں سے پھل چراتے ہوئے دیکھا ہے۔ اسے فوراً یہاں سے تبدیل کیا جائے۔ کیونکہ اس کاروبار میں یہاں کے بااثر لوگ بھی شامل ہیں۔ رپورٹ لکھ کر اس نے ہیڈ کوارٹر بھجوا دی۔

پھر اس نے دِتو کو بلایا۔ تاکہ اس سے پوچھے کہ کوارٹر خالی ہوا یا نہیں۔ مگر وہ غائب تھا۔ اسلم نے سوچا کہ اب یہ تبدیل تو ہو ہی جائے گا۔ اس لیے بار بار کیا منہ لگائے۔ دو ایک روز پڑا رہنے دو۔ اسی جگہ اسے، پھر خود ہی چلا جائے گا۔

دو تین روز گزر گئے۔ دِتو صرف ڈیوٹی پر آتا اور پھر غائب ہو جاتا۔ اسلم قریب قریب سارا دن اسٹیشن پر گزارتا۔ تاکہ دِتو یا اللہ وسائی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ ان دنوں میں اس نے لوگوں کے رویہ میں نمایاں تبدیلی محسوس کی۔ گاڑی کے وقت سے کچھ پہلے اور کچھ بعد میں اس کے پاس آ کر بیٹھنے والے درباری قسم کے لوگ غائب ہو گئے تھے۔ بازار میں کوشش سے سلام کرنے والے راہ گیر اب ہاتھ اٹھانے کی بجائے اسے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھتے۔ عورتیں اسے سڑک پر آتا دیکھتیں تو گویا کسی گلی میں مڑ جاتیں۔ یا سڑک کے دوسرے کنارے ہو جاتیں۔ جن لوگوں کا اس کا سرکاری طور پر واسطہ پڑتا تھا۔ وہ کچھ عجیب سے محتاط نظر آتے۔

اسلم جانتا تھا۔ اس کا سبب کیا ہے۔ دِتو ضرور لوگوں میں کوئی افواہ پھیلا رہا ہے، مگر وہ کیا ہے اس کا اسے علم نہ تھا۔ نہ معلوم وہی بات تھی جو ملک رحمت علی نے اسے کہی تھی۔ یا کوئی اور؟ بہرحال وہ پوچھنا نہ چاہتا تھا۔ کیونکہ اس طرح بات پھیلنے کا زیادہ احتمال نہ تھا۔ تین دن وہ اسی الجھن میں پڑا رہا۔ اور اُدھیڑ بن کی وجہ سے فیصلہ نہ کر سکا کہ دِتو کو کوارٹر سے باہر نکالے یا نہیں۔

چوتھے روز جب گاڑی آ کر رکی تو۔ اُس میں سے عثمان اترا۔ اسے ریلوے بورڈ نے انکوائری کے لیے بھیجا تھا۔ اس کے پاس اسلم کی بھیجی ہوئی رپورٹ تھی۔ اس کے علاوہ گاؤں کے کئی لوگوں کے دستخطوں سے ایک لمبی عرضی تھی جس میں اسلم کے خلاف شکایت تھی۔ کہ اس نے زبردستی اللہ وسائی کو ناجائز تعلقات پر مجبور کیا۔ اور دِتو کو اس سلسلے میں تنگ کرنے کے لیے کوارٹر خالی کرنے کی دھمکی دیتا ہے۔ عرضی پر ملک رحمت علی کے دستخط نہ تھے۔ مگر اس کے مختار خاص، منشی اور ملازموں کے تھے۔ ساتھ ہی دِتو، شو کا ماشکی اور شہر کے چند اور لوگوں کے بھی دستخط تھے جنہوں نے اسلامی اخلاق کے نام پر حکومت سے نیک افسر بھرتی کرنے کی استدعا کی تھی۔

دوسرے دن انکوائری شروع ہوئی۔ عثمان نے دِتو کے بیان لیے، اللہ وسائی کے بیان لیے، عرضی پر جن لوگوں کے دستخط تھے ان

کو بھی بلا کر پوچھا۔ ملک رحمت علی سے بھی طویل بات چیت کی۔ اور بعد ازاں سارا معاملہ اسلم کے ساتھ بھی زیر بحث آیا۔ یہ سارا سلسلہ تین دن چلتا رہا۔

اس اثنا میں یہ بات شہر میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ دتو، شوکا اور ملک رحمت علی ہر جگہ لوگوں کو اپنی کہانی سناتے۔ جو انہوں نے اپنی عرضی میں لکھی تھی۔ اور بڑے فخر سے کہتے کہ انکوائری انہوں نے کرائی ہے۔ اور اب چند دن بعد اسٹیشن ماسٹر تبدیل ہو جائے گا۔ چھوٹے سے قصبے میں اتنی بڑی بات پر خاموشی کیسے رہتی۔ لوگوں کے فقرے کندھے اچک اچک کر ایک سے دوسرے تک گئے۔ اور عورتوں کی بظاہر معصوم کھسر پھسر کے ذریعے سات سات خانوں میں چھپی ہوئی کنواریوں تک کو اصل قصہ سے بہت زیادہ باتیں معلوم ہو گئیں۔ اللہ وسائی شہر میں نکلتی تو مرد اسے نفرت سے دیکھتے جہاں لڑکوں کے منہ میں پانی بھر آتا۔ اور عورتیں "دفع۔ دفان" کرنے کے باوجود آنکھوں کے کونوں اور پلو کی آڑ سے اسے دور تک دیکھتی رہتیں۔

اسٹیشن ماسٹر اتنے دن باہر نہ نکلا۔ وہ زیادہ تر اپنے کوارٹر میں رہتا۔ جہاں عثمان اس کے پاس ٹھہرا تھا۔ اور اس بات پر خوش تھا کہ اس کی رپورٹ پر دتو کے خلاف انکوائری ہو رہی ہے۔ اب دتو کو کوارٹر سے نکالنا بیکار تھا۔ کیونکہ انکوائری میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔ اور پھر دتو خود ہی تبدیل ہو کر چلا جائے گا۔ گو ملک رحمت علی ڈنکے کی چوٹ پر کہتا تھا۔ کہ وہ دتو کے ساتھ ہے اور کوئی مائی کا لال اسے تبدیل نہیں کر سکے گا۔ وہ شہر کے لوگوں سے بھی بار بار کہتا کہ سرکاری نوکر باہر کے لوگ ہوتے ہیں۔ آج یہاں کل وہاں، مگر ہم سب کو تو یہاں رہنا ہے۔ اس لیے سب دتو کی حمایت کریں۔ خوامخواہ کیوں باہر والوں کی وجہ سے آپس میں ناچاقی ہو۔

انکوائری ختم ہو گئی۔ عثمان چلا گیا۔ لوگوں میں چہ میگوئیاں مدھم پڑنے لگیں۔ ایک ہفتہ بعد اوپر سے آرڈر آ گیا۔ انکوائری میں اسلم بے قصور ثابت ہوا تھا۔ اور دتو کو فہمائش کی گئی تھی۔ کہ اگر اب اس کے خلاف پھل چرانے کی شکایت آئی۔ تو اسے برطرف کر دیا جائے گا۔

اسلم کو تھوڑا ملال ضرور ہوا۔ کہ دتو کا تبادلہ کیوں نہیں ہوا۔ مگر پھر بھی وہ خوش تھا۔ کہ وہ بے قصور ثابت ہو گیا ہے۔ کرسی کی پشت پر پھیلتے ہوئے اس نے زوردار انگڑائی لی اور بڑبڑایا "بالآخر حق کی فتح ہوتی ہے" اس نے آرڈر کی کئی ایک نقول کرا کر اسٹاف کو بانٹ دیں۔ اسٹیشن پر مختلف جگہوں پر چسپاں کر دیں اور شہر کے معتبر لوگوں کو بھجوا دیں۔ ایک نقل بذریعہ ڈاک ملک رحمت علی کو بھجوا دی اور بڑے سکون سے گھر واپس آ گیا۔

اب اسلم شہر میں نکلتا تو خوامخواہ لوگوں سے بات کرنے ٹھہر جاتا۔ اور بات کو ہیر پھیر کر انکوائری کی طرف لاتا۔ پھر بتاتا کہ وہ خود بے قصور ثابت ہو گیا ہے۔ اور یہ سب دتو اور ملک رحمت علی کی شرارت تھی۔ وہ یہ سب کچھ بڑے فخر سے بتایا کرتا۔ کیونکہ پچھلے کئی سال سے پھل کی چوری ہوتی تھی۔ اور دوسرے قواعد کی خلاف ورزی ہو رہی تھی۔ اور یہ سب اس نے آ کر روک دیا تھا۔ مگر لوگوں کے ردعمل سے اسے صحیح اندازہ نہ ہوتا تھا کہ آیا وہ اسے بے قصور سمجھتے ہیں یا ابھی تک اللہ وسائی کا عاشق خیال کرتے ہیں۔ کچھ دن بعد اسے عجیب سی بے چینی ہونے لگی۔ کیونکہ وہ محسوس کرتا تھا۔ کہ لوگوں کے سلاموں میں اب اس کے لیے وہ احترام نہیں تھا۔ جو پہلے تھا اور ملنے والوں کی بے تکلفی میں بھی ایک پردہ سا تھا۔

چند روز بعد اسلم ڈیوٹی پر تھا، صبح کی ٹرین فلیٹ فارم میں داخل ہو رہی تھی۔ کہ اسے گارڈ کے ڈبے میں رشید نظر آیا۔ یہ اس کا اسکول کا دوست تھا۔ اور اب ریلوے میں کام کرتا تھا۔ گاڑی رکتے ہی اسلم دوڑا گیا اور جا کر رشید کے گلے لگ گیا۔

"ارے ظالم! بڑے دن بعد نظر آئے۔ کہاں گم رہتے ہو؟" اسلم نے اسے تھپکی دی۔

"میاں تمہاری شہرت کے غبار تلے چھپا تھا۔ ہم غریبوں کو کون جانتا ہے"

"کیسی شہرت؟" اسلم نے پوچھا۔

"اچھا اتنے بڑے بڑے معرکے بھی مارتے ہو اور ہم سے ہی پوچھتے ہو؟"

"چلو بکواس نہ کرو اور آکر چائے پیو۔"

"چائے پینے کون آیا ہے؟ ہم تو تمہارا حرم دیکھنے آئے ہیں۔"

دونوں ہنسنے لگے۔ اسلم بھی مذاق کا جواب مذاق سے دیتے ہوئے بولا۔ "تم جیسے نامحرم ہمارے حرم میں نہیں آسکتے۔"

"ارے واہ!" رشید اس کی پیٹھ پر دھپ مار کر بولا۔ "انکوائری افسر تو نامحرم نہیں ہیں اور ہم نامحرم ہیں؟؟ — ایں؟؟"

اسلم جھینپ گیا۔ اور رشید قہقہہ مارنے لگا۔ وہ کمرے کے پاس پہنچ چکے تھے۔ اور اندر جا کر چائے پینے لگے۔

رشید نے چائے کی لمبی چسکی لی۔ اسٹول گھسیٹ کر ٹانگیں اس پر رکھیں۔ کرسی کی ٹیک پر سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں اور گھونٹ نگل کر بولا۔ "بڑی عمدہ چائے ہے یار — سچ بتانا اس نے بنا کر بھیجی ہے؟"

"کیا بکواس کر رہے ہو؟" اسلم مصنوعی غصے سے بولا۔ "اس نے کس نے؟"

"اللہ قسم عثمان بڑی تعریف کر رہا تھا اس کی، کہتا تھا کیا ہاتھ مارا ہے ظالم نے — سچ مانو وہ تو ابھی تک نشے میں ہے۔"

اسلم "فضول بات" کہہ کر چائے پینے لگا۔

"ایک بات بتاؤ اسلم!" رشید پیالی رکھ کر بولا۔ "اسکول کے زمانے میں تو تم بڑے مولوی، صوفی، پرہیزگار، عبادت گزار اور نہ معلوم کیا کیا تھے۔ مگر بھئی اب کے تو تم نے کمال کر دیا۔"

"میں تو اب بھی صوفی ہوں!"

"ہاں ہاں ضرور ہو۔ مگر.....!" رشید انگلی سے میز بجاتا ہوا گانے لگا۔

مجھ سے پہلی سی عبادت مرے اللہ نہ مانگ

اسلم بھی ہنسنے لگا۔ رشید کافی دیر تک اسی قسم کی چھیڑ چھاڑ کرتا رہا۔ اسلم اسے تو پہلے خالص مذاق سمجھتا رہا۔ مگر بعد میں رشید نے اسے سنجیدگی سے بتایا کہ ہیڈکوارٹر پر عام لوگوں کا خیال ہے کہ چونکہ عثمان خود بھی ان معاملوں میں تیز ہے۔ اس لیے اسلم نے اللہ وسائی سے عثمان کو بھی مستفید کرا دیا ہے۔ جس کی وجہ سے اس نے اپنی رپورٹ میں اسلم کو بے قصور بتا دیا ہے

اسلم کے تن سے ایک دم جان سی نکل گئی۔ اس کی آنکھیں پیالی میں گڑی رہیں۔ رنگ سرخ ہو گیا اور دماغ میں بلبلے سے اٹھنے لگے۔ اس نے ایک دم چائے کا بڑا سا گھونٹ نگلا۔ گرم سا گولہ دیواروں کو دھکیلتا ہوا نیچے کو سرک گیا۔ اور وہ آنکھیں جھپک کر رشید کی غلط فہمی دور کرنے لگا۔ دونوں کافی دیر تک سنجیدگی سے بات کرتے رہے رشید تو قائل ہو گیا۔ مگر اس کا خیال تھا کہ محکمے کے عام لوگوں کے دل سے یہ خیال نکالنا قریباً قریباً ناممکن تھا۔ کیونکہ ساری انکوائری کے باوجود ابھی تک اللہ دتہ وہیں تھا۔

"وہ تو ملک رحمت علی کے رسوخ کی وجہ سے ہے۔" اسلم بولا۔

"اب کسی کو کیا معلوم کہ وہ تمہارا رسوخ ہے یا ملک رحمت علی کا۔"

اسلم بے بسی سے خاموش ہو کر سر جھکا لیا۔

"یار تم نرے ہونق ہو!" رشید بولا۔ "کیوں خواہ مخواہ فکر کرتے ہو، لوگ جو کچھ کہتے ہیں کہنے دو۔ اگر بالفرض تم نے کچھ کیا بھی ہے تو کیا برا کیا ہے؟ سبھی یہ کچھ کرتے ہیں۔ جو پکڑے گئے مجرم ٹھہرے، جو چھپے رہے وہ نیک رہے — تم کیوں پروا کرتے ہو۔ بس یہ ہے کہ آئندہ محتاط رہو۔"

اسلم سارا دن رشید سے بات چیت کرتا رہا۔ مگر اس کا دماغ ماؤف سا تھا۔ جیسے وہ صرف اوپر کی سطح سے سوچ رہا تھا۔

اور نیچے سب کچھ شن ہے۔

شام کی گاڑی سے رشید چلا گیا۔ اسلم نے بڑی بے دلی سے کاغذات مکمل کیے، ضابطے کی باقی چیزوں سے فراغت حاصل کی۔ اور پھر من من بھر کے قدم گھسیٹتا اپنے کوارٹر کو چلا۔ پلیٹ فارم کے آخری سرے پر تھا تو بکنگ کلرک نے پیچھے سے آواز دی۔ اسلم نے مڑ کر دیکھا تو وہ ایک خط دکھا رہا تھا۔

"یہیں لے آؤ!" اسلم نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔ اور ڈھیلا سا کھڑا ہو گیا۔

کلرک خط لایا۔ اسلم نے دیکھے بغیر لفافہ جیب میں ڈال لیا۔ اس کا دل کسی کام پر آمادہ نہ تھا۔

کمرے میں جا کر اس نے لیمپ روشن کیا۔ اور کپڑے تبدیل کیے بغیر دھم سے چارپائی پر بیٹھ گیا۔ میز پر کہنیاں ٹکا کر دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر وہ سوچنے لگا۔ رشید کے مذاق، محکمہ کے لوگوں کے اندازے، شہر کے لوگوں میں احترام کی کمی، دتو کا پھل چرانا، اللہ وسائی کا آدھی رات کو کمرے میں آنا۔ یہ سب خیالات اس کے ذہن پر یوں باری باری سر ابھار رہے تھے۔ جیسے تیز بارش میں کچے فرش پر بلبلے ادھر سے ادھر نمودار ہوتے ہیں۔ تھوڑا تیرتے ہیں اور غائب ہو جاتے ہیں۔

وہ سوچنے لگا۔ سوسائٹی کیا ہے؟ میں کیا ہوں؟ کردار کیا ہے؟ یہ میرا طرزِ عمل ہے یا میرے متعلق لوگوں کا تاثر ہے؟ ۔ یں بدی خود کرتا ہوں۔ یا سوسائٹی مجھ سے کراتی ہے؟ ــــ نہ معلوم کتنے ہی سوال آندھی کے بگولوں کی طرح اس کے دماغ میں آئے اور ان کو دوسرے بگولے دھکیل کر لے گئے۔ کہیں سے اللہ وسائی کے جسم کے ابھار چپکے سے سر اٹھاتے اور ایک ہلکا سا پچھتاوا اس کے دماغ کی دیواروں پر لرزنے لگتا۔ کہ جب لوگ اس کے بارے میں یہ خیال کرتے ہیں۔ تو اس نے خود یہ موقع کیوں گنوایا؟ اور اگر وہ دنیا کی نظروں میں بدکردار ہے تو اس کی اپنی نیکی کس کام کی؟

کافی دیر تک وہ ایسے ہی بیٹھا رہا۔ لیمپ کی روشنی میں اس کے چہرے پر جا بجا تاریکی کے گڑھے پڑے تھے اور وہ بت کی مانند بے جان بیٹھا تھا۔ مگا اسے خط کا خیال آیا ــــ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا ــــ نکال کر لفافہ چاک کیا ــــ کڑکڑاتا ہوا کاغذ کھولا۔ تو اس کی بیوی کی تحریر آنکھوں کے سامنے ناچنے لگی۔

"میرے سرتاج سلامت رہو!

کل میں عثمان کی بیوی سکینہ سے ملی تھی۔ اس نے بتایا کہ عثمان صاحب کسی انکوائری کے سلسلے میں تمہارے پاس آئے تھے۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آتا کہ تمہارے خلاف بھی ایسے الزام ہو سکتے ہیں۔ سکینہ کہہ رہی تھی کہ عثمان نے اسے بتایا تھا کہ تمہارے کانٹے والے کی بیوی سے ناجائز تعلقات ہیں۔ یہ انکوائری میں ثابت ہو گیا تھا۔ مگر عثمان نے صرف تمہیں بچانے کی خاطر یہ رپورٹ دی کہ الزام غلط ہے۔ حالانکہ اسے انکوائری میں یقین ہو گیا تھا کہ تمہارے اس عورت ...."

"عورت" کا لفظ پھولنے لگا ــــ سطریں ہوا سے تیرنے لگیں ــــ الفاظ ایک جھٹکے سے درہم برہم ہو گئے۔ اور آنسوؤں کے قطرے اس کی پلکوں پر لرزنے لگے۔

خط میز پر رکھا تھا۔ سامنے لیمپ تھا۔ خط کے دونوں طرف اسلم کی کہنیاں ٹکی تھیں۔ ہاتھوں میں سر تھاما ہوا تھا اور شیشے کے سے شفاف

و لیمپ کی روشنی میں ٹوٹتے ہوئے تاروں کی طرح چمکتے ہوئے ٹپ ٹپ خط پر گر رہے تھے۔

نہ معلوم اسلم کتنی دیر تک اسی طرح بیٹھا رہا ــــ لیمپ کے شعلے نے دو تین بے چین سی انگڑائیاں لیں ــ ایک دو ہچکیے لیے

پ کر بجھ گیا۔

کمرے کی تاریکی میں ٹپ ٹپ کی آواز ٹھہر ٹھہر کر اُبھرتی ــــ پھر وقفہ زیادہ ہوتا گیا اور پھر یہ آواز بند ہو گئی۔

کافی دیر گزر گئی۔

...... اندھیرے میں کچھ سرسراہٹ ہوئی ــــ چارپائی چرچرائی ــــ جیسے کوئی اٹھا ہے ــ پاؤں کی گھسٹتی ہوئی چاپ کھسکی۔

ر ٹٹولنے کی آہٹ ہوئی ــــ ایک ہاتھ کھڑکی سے ٹکرایا ــــ دو تین لمحے خاموشی رہی ــ اور ــــ پھر کھڑکی پر تھاپ کی آواز

بجنے لگی ــــ

فرصت کے لمحات کا بہترین ساتھی

ماہنامہ **نقش** کراچی

نقش آپ کو اردو ادب کی رفتار سے آشنا رکھتا ہے۔

نقش ہر ماہ پاک و ہند کے معیاری رسائل سے منتخب افسانے، غزلیں، نظمیں،

طنزیے اور مضامین پیش کرتا ہے۔

نقش کو پاک و ہند کے ادبی رسائل اور تمام ادیبوں کا تعاون حاصل ہے۔

نقش کا ہر شمارہ خاص نمبر کی اہمیت رکھتا ہے۔

نقش ادب کی خدمت کرتا ہے آپ نقش کی سرپرستی کیجئے۔

نقش کی ایجنسیاں پاکستان کے تمام بڑے اور چھوٹے شہروں میں قائم ہیں۔

نقش کا تازہ شمارہ مغربی و مشرقی پاکستان میں ہر ریلوے بک اسٹال سے طلب کیا جاسکتا ہے۔

نقش خریدیئے۔ نقش میں اشتہار دیجئے۔

فکرِ نو کا ترجمان

سہ ماہی

سیپ

کراچی

کا

چوتھا شمارہ

شائع ہو گیا ہے

سیپ کا چوتھا شمارہ ایک بار پھر اپنے ساتھ نئے نام لایا ہے جو نئی نسل کے نمائندہ ادیبوں پر مشتمل ہیں — ان ادیبوں کے پہلو بہ پہلو اردو کے اُن مشاہیر ادیبوں کی تحریریں بھی سیپ کے ذہنی وسعت اور کشادگی کی نشاندہی کرتی ہیں۔ جن کی ذات ادب اور فن کے اعلیٰ معیار کی ضمانت ہے۔

صفحات: ۳۶۲ .... قیمت ۳ روپے

اپنے یہاں کے تاجر کتب، نیوز ایجنٹ اور ریلوے بک اسٹال سے طلب فرمایئے

مینیجر سہ ماہی سیپ، بلاک ڈی، شیر شاہ کالونی۔ کراچی ۲۹

نقش کراچی

جامِ نو۔ کراچی

عفت موہانی

چاند سے داغِ جگر مانگا

قبرستان میں ہولناک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ہوائیں بند تھیں۔ درختوں پر سرمئی شام گہری تاریکی میں بدلنے لگی تھی۔ سیاہ بادلوں نے ماحول کو اور زیادہ وحشت خیز بنا دیا تھا۔ شہر کے ہنگامے یہاں سے دور تھے۔ یہاں تو ابدی نیند سونے والوں کی خواب گاہیں تھیں۔ حسرت نصیب کہانیاں تھیں اور زندگی کے وہ المیے تھے جو مٹی کے اس گھر تک آکر ختم ہو گئے تھے۔

اس کے سامنے بھی مٹی کا ایک ڈھیر تھا۔ سنگ مرمر کی طرح تربت خاموش روشنی میں کپکپا رہی تھی۔ موم بتی کی لو بجھنے کے قریب تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ قبر پر رکھ دیا۔ اور پھر خیالوں کی دنیا میں گم ہو گئی۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ ہنستے ہنستے یوں رونا پڑے گا۔ شام و سحر کے ان لمحوں کو جو اس کے تبسم کے گواہ تھے اپنے آنسوؤں کا حساب دینا پڑے گا۔ شہنشاہ کی موت اس کے لئے ناگہانی تھی۔ خواب میں بھی اس نے اپنے شوہر کو مرحوم نہ سوچا تھا۔ وہ اسے ابدی سمجھی تھی۔ رنج و غم جس کے سائے سے کتراتے تھے۔ لیکن آج ستم انگیز حقیقت اس کے سامنے تھی۔ منوں مٹی کے نیچے اس کا شہنشاہ خوابیدہ تھا۔ وہ سوچتی کوئی بھیانک خواب دیکھ رہی ہے۔ شہنشاہ اسے ستانے کے لئے کہیں چھپ گیا ہے۔ جب وہ زیادہ چڑ جائے گی وہ ہنستا مسکراتا سامنے آکھڑا ہوگا! کیا قدرت اسے دوبارہ زندگی نہیں دے سکتی۔ کیا قدرت محدود ہے۔ یک بیک وہ زیادہ مضطرب ہونے لگی۔

شہنشاہ . . . شہنشاہ . . . .

اور اس کی تپش و اضطراب نے شہنشاہ کو سامنے لا کھڑا کیا۔

"شہنشاہ . . . .!" ہلکی سی چیخ کے ساتھ وہ اس سے لپٹ گئی۔

"آپ پھر یہاں چلی آئیں بھابی!" کوئی مدہم آواز میں کہہ رہا تھا۔ "موسم بہت سرد ہے۔ آپ نے کوئی گرم لباس بھی نہیں پہنا۔ بھابی ہوش میں آیئے چلئے!"

"تاجدار" اس نے تھکی تھکی سانسیں لے کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ اسے سہارا دے کر کار تک لایا۔ گھر تک خاموشی رہی۔ سلمیٰ ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔ تاجدار نے اپنا گرم کوٹ اتارا اور آہستہ سے اس کے کاندھوں پر ڈال دیا۔ وہ تب بھی خاموش رہی۔

وہ سلمیٰ کو اس کی خواب گاہ میں پہنچا کر فون کی طرف مڑا۔!

"نہیں تاج!" سلمیٰ نے بھرائی ہوئی آواز میں اس کو مخاطب کیا۔

"آپ بہت کمزور ہو رہی ہیں ڈاکٹر آپ کو دیکھ تو لے۔"

"تم میرے لئے پریشان نہ ہو!" اس نے تاجدار کے چہرے سے نگاہیں ہٹالیں۔ دل دھڑکنے لگا۔ تاجدار اپنے بھائی سے بہت مشابہ تھا۔ وہی بلند و بالا جسم چمکتی ہوئی پیشانی، پیچھے لوٹتے ہوئے بال مضبوط اور متبسم لب، مہربان انداز اور جانی پہچانی شخصیت میں رچی بسی مخصوص خوشبو۔!

وہ اس کے پاس آکر بیٹھ گیا۔

"بھابی میری طرف دیکھئے۔ یہ آپ نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے۔ کتنا میں نے آپ کو منع کیا مگر آپ پھر بھائی جان کی قبر پر چلی گئیں۔ اس طرح تو آپ انہیں اور صدمہ پہنچاتی ہیں۔"

"پھر میں کیا کروں۔ کہاں جاؤں؟"

بھابی بھائی جان کی ناگہانی موت مجھے بھی پاگل کر دیتی ہے، آہ جب میں امریکہ جارہا تھا تو وہ ہار پھول لئے ہوئے ایرو ڈرم پر آئے تھے۔ اور پھر جب میں چار سال بعد اسی بندرگاہ پر اترا تو وہاں کوئی نہ تھا۔ صرف وہ تار میرے سینے سے لگا ہوا تھا جس میں ان کی موت کی خبر تھی۔ میں بھی بہت رویا ہوں مگر اس طرح کیا وہ واپس آگئے۔"

"دل نہیں مانتا تاج! مجھے ایسا لگتا ہے جیسے وہ کہیں گئے ہیں۔ ابھی ابھی آجائیں گے۔ پھر دل کہتا ہے کہ نہیں وہ ایسی جگہ گئے ہیں جہاں سے کبھی لوٹ کر نہیں آئیں گے۔"

کمرے میں تکلیف دہ خاموشی طاری رہی۔ تاجدار کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو بھر آئے۔ سلمیٰ سسک سسک کر روتی رہی۔ "بھابی نہ روئیے جو ہونا تھا وہ ہو چکا آپ مجھ پر بھروسہ رکھئے، جہاں آپ کا کوئی نہیں ہے۔ بھائی میں آپ کا ہوں آپ ہی کا رہوں گا۔"

وہ چپ رہی۔

"آپ اس طرح اپنی بھی طبیعت خراب کرلیں گی۔ لیجئے پانی پی لیجئے۔ لائیے میں آپ کا چہرہ دھلادوں!"

سلمیٰ نے نظریں اٹھائیں۔ وہی لب وہی لہجہ۔ وہی قیافہ۔ گہری گھٹی شیروانی میں حسین چہرہ اور پرکشش ہوگیا تھا۔ سلمیٰ نے اس کے ہاتھ سے گلاس لے لیا۔

"مجھے تو رات بھر اس خیال سے نیند نہیں آتی کہ کہیں آپ رو نہ رہی ہوں! آپ نہیں جانتیں، آپ کی زندگی میرے لئے کتنی قیمتی ہے۔"

وہ ہولے سے مسکرائی۔ "یہ بیکار زندگی۔"

پھر اس نے جلدی سے بات کا رخ موڑ دیا۔

"تاج تم میرے لئے بہت محنت کرتے ہو کہیں ایسا نہ ہو کہ تم بیمار پڑ جاؤ۔"

"میں بیمار پڑ جاؤں گا!" وہ ہنسا۔ فکر نہ کیجئے۔ آپ کی خدمت کے لئے میں ہمیشہ صحت مند رہوں گا۔"

اس نے خواب گاہ کا مدھم بلب آن کر دیا۔ ہلکی نیلگوں خواب آفریں روشنی کمرے میں پھیل گئی۔ تاجدار نے سلمیٰ کے شانے تھام لئے۔

"وعدہ کیجئے آپ آرام سے سو جائیں گی۔"

"اچھا۔" وہ پھر کانپنے لگی۔

"شب بخیر بھابی۔"

ایسا لگا جیسے کسی آہ کو بمشکل اس نے ضبط کیا ہو اور پھر پردہ ہٹا کر باہر نکل گیا!!۔

اپنی ہستی اور آسودہ زندگی کا اسے بخوبی احساس تھا۔ وہ دنیا میں بالکل اکیلی تھی۔ اتنی بڑی کوٹھی میں تنہا تاجدار کے ساتھ رہتی تھی۔ اسے پتہ تھا جب غم کے بادل چھٹ جائیں گے۔ جب لوگ اس کے دکھ درد کا ساتھ دیتے دیتے تھک جائیں گے۔ تب پھر یہی غمگساری اور دلسوزی پراسرار سرگوشیوں میں بدل جائیگی۔ وہ کیسے گوارا کرے گی شہنشاہ کے ساتھ ہی وہ بھی کیوں نہ مرگئی۔

نکھرے سنورے دن اس کی زندگی سے نکل گئے تھے. شہنشاہ کی موجودگی میں یہی کوٹھی ہنگاموں سے گونجا کرتی. اور دوستوں کا تانتا بندھا رہتا تھا. آئے نئے پروگرام بنتے. پکنکیں منائی جاتیں. وہ ہنسنے ہنسانے کا بے حد شائق تھا. اس کی زندگی کے ۲۵ سال پلک جھپکتے گزر گئے تھے. یوں لگتا جیسے اب اس کی ں یاد ہی نہ ہوں. بس اس کی حادثاتی موت یاد ہو. جب بھی یہی تاجدار تھا کم آمیز اور سنجیدہ. تو کسی پروگرام میں شریک ہوتا. نہ ہی ان کی محفلوں میں آتا. وہ اسے بقراط ن کہہ کر چڑاتی. ہلکی سی بزرگانہ مسکراہٹ تاجدار کے ہونٹوں پہ بکھر جاتی. لیکن وہ اس کا کہا بھی نہ ٹالتا. یہی سلوک اب تک تھا. وہ راتوں کو اٹھ کر بے چینی سے ٹہلا کرتا. لمنے کے نئے نئے طریقے تلاش کرتا لیکن وہ زرد زرد مرجھاتی گئی. وہ بھی دیکھ ہی رہا تھا. ہنس مکھ اور شگفتہ سلمیٰ خزاں دیدہ پھول بن کر رہ گئی تھی. خوبصورت بں سوگوار پژمردہ باتیں. انداز ایسے جیسے جینے سے گھبراتی ہو. پہروں کھڑکی میں کھڑی سونی سونی سڑکوں اور دور بہنے والے دریا کا چمکتا کنارہ دیکھا کرتی۔

ڈاکٹر نے اس سے کہا تھا. اگر وہ یوں غموں کے طوفان کو گلے لگائے رہی تو بہت جلد دنیا چھوڑ دے گی. تاجدار سہم گیا تھا. اور اس صبح وہ اداس سلمیٰ کو دیکھ کر وہ مسکرا دیا. غمگین اور اداس سلمیٰ صبح کے ملگجے اندھیرے میں چنبیلی کا زرد پھول لگ رہی تھی۔!

"تسلیم بھابی!"

"جیتے رہو!" اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

وہ ہنس دیا۔ "آپ مجھے بچہ سمجھتی ہیں. بھابی. شاید میں آپ سے چھ سات سال بڑا ہوں۔"

"رشتہ تو چھوٹا ہے!"

"رشتہ تو ٹوٹ چکا" اچانک اس کے منہ سے نکل گیا. اور وہ سراسیمہ ہو کر اسے تکنے لگا. وہ بے خبر سی گل عباس کے مرجھائے ہوئے سرخ سرخ پھولوں بکھیر رہی تھی. مغموم حسن. سفید لباس میں لپٹی. کلائیاں، ہاتھ اور گلا. زیوروں سے محروم. تاجدار کو یاد آیا. اس کے بھائی کے زندگی میں وہ کتنی سجیلی ی بنی رہتی تھی. تاجدار کا دل دکھ گیا۔

"تم کچھ سوچنے لگے!"

"جی۔ ہاں" وہ چونک گیا. ہاں. میں سوچ رہا تھا کہ اگر آپ تھوڑے دنوں کے لئے کہیں باہر چلی جائیے اس طرح اس ماحول سے بھی نجات مل جائے گی۔"

"نہیں تاج! یوں نہ سوچو... میں اس ماحول سے نجات کب چاہتی ہوں. پھر میں زندہ کیسے رہوں گی؟"

"آپ کی صحت کے لئے یہ ضروری ہے!"

"تمہیں میری صحت کی بہت فکر ہے!" وہ ہنسنے لگی۔

"بہت" وہ اس کے ہنسنے پر تعجب سے اسے دیکھنے لگا.

"مگر مجھے کوئی فکر نہیں ہے. میں تو یہی چاہتی ہوں کہ جلد از جلد شہنشاہ کے پاس پہنچ جاؤں!"

"خدا نہ کرے۔ ایسا بے رحم فیصلہ کرتے ہوئے آپ کو میرا خیال بالکل نہیں آتا؟"

"تمہارا خیال" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ اور تاجدار پھر بدحواس ہونے لگا. اُف... ظالم اور سنگدل موت نے اس حسین وجمیل صورت پر مردگی اور سوگواری کی دھند اڑا دی ورنہ — اب بھی یہ کسی کی زندگی بن سکتی ہے... اگر یہ ہمیشہ ہنستی رہے. لبوں پر اگر مسکراہٹوں کی زندگی چھا جائے۔ ۔۔ وہ اسے تکتا ہی رہ گیا...

"میں آنے والے دنوں کے خیال سے کانپ اٹھتی ہوں" وہ کہہ رہی تھی "میرا کیا حشر ہوگا؟ ابھی تو سب یہی سمجھتے ہیں کہ میں سوگوار ہوں پر میرے دل احالت کا اندازہ کوئی نہیں کرے گا. پھر۔ سب اسے مکاری اور ڈھونگ کہنے لگیں گے. میں لوگوں کو کیوں کر سمجھاؤں گی. میں چلتی پھرتی لاش ہوں. زندگی تو رازوں اور امنگوں سے عبارت ہے نا تاج؟ — اور جس کا دل ہی مر گیا ہو کیا وہ بھی زندہ کہلائے گا؟"

"کہلا سکتا ہے اگر وہ چاہے! بہت سے لوگ خود اپنے لئے جیتے ہیں۔ اور بہتوں کو جینا پڑتا ہے دوسروں کے لئے۔"

"میرا اب کون ہے؟" سلمیٰ نے ہولے سے آہ بھر کر ہار سنگھار کے پیڑ سے سر ٹیک دیا۔

"تاج! تم شہنشاہ کی محبت کا اندازہ ہی نہیں لگا سکتے۔ ان کے بعد یہ دنیا مجھے بیکار گورکھ دھندا معلوم ہوتی ہے۔ جہاں کا مقصد فنا ہے صرف فنا... پھر زندہ رہنے کی اتنی بے تابی اور بے چینی کاہے کی؟ چاہے لاکھ برس بھی جئیں مگر مرنا تو ہے ہی!"

اگر آپ کی طرح سب سوچنے لگیں تو گھر بار چھوڑ چھاڑ کر جنگلوں میں جا بسیں۔ زندگی خدا کا عطیہ ہے۔ کسی کے عطیے کو سنبھال کر رکھنا چاہئے۔ دینے والے کا دل نہ دکھے۔ اور مرنا تو صرف اس لئے ہے کہ دوسروں کو زندگی کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ ہو جائے۔"

اور پھر وہ اسے اپنے مخصوص مدھم انداز میں سمجھانے لگا۔ امریکہ کے رہن سہن کے بارے میں بتایا۔ دنیا کی بے ثباتی پر لکچر دیا۔ لیکن بے سود۔ وہ پتھر ہو چکی تھی۔ نہ تو اس میں زندگی کی امنگ تھی۔ نہ موت کا وہم۔!!۔

کتنے شب و روز بے کیف و بے مزا گذر گئے... اکثر اس کی سہیلیاں آ نکلتیں۔ وہ ان سے بھی پچھلی زندگی کا نوحہ لے بیٹھتی، وہ بور ہو کر چلی جاتیں۔ گھنٹوں شہنشاہ کی تصویروں کی جگہ بدلا کرتی۔ اس کے لباس دھوپ میں ڈالتی۔ جیسے وہ اب پہنے گا۔ پہروں اس کے پچھلے خط نکال کر اس میں گم ہو جاتی۔

بڑی دشواریوں سے وہ اسے یادوں کے انبار تلے سے نکال پاتا... اس دن وہ تاج کا کہنا ٹال کر تصویروں کے نئے فریم بدلوانے کے لئے جا رہی تھی۔ اس نے اسے گیٹ پر روک لیا۔

"چلئے کہیں گھوم آئیں۔ موسم بہت سہانا ہو گیا ہے۔"

"پھر کبھی۔ آج میں ذرا مصروف....."

"تو آپ میری بات کبھی نہ مانیں گی؟"

"سیر و تفریح میں میرا دل نہیں لگتا۔"

"بہت اچھا تشریف لے جائیے۔"

"تم تو خفا ہو جاتے ہو۔"

۔وہ اسے مجبور کر کے اپنے ساتھ لے گیا۔ کوٹھی کے آس پاس جنگل سا سماں تھا۔ دور دور تک جنگلی پھولوں نے فضا مہکا رکھی تھی۔ آگ سی لگی تھی۔ کونوں کھدروں سے چڑیوں کی چہکاریں گونج رہی تھیں۔ چھوٹی سی پگڈنڈی پر دونوں شانہ بشانہ آگے بڑھ رہے تھے۔ دور پر دریا کا کنارہ دھوپ میں چاندی کی طرح چمک رہا تھا۔

ایک گوشے میں گرے ہوئے سنکیسر کے پھولوں نے سرخ سرخ سیج سی بچھا رکھی تھی۔

سلمیٰ سمٹی سمٹائی سی ڈھیر پر بیٹھ گئی۔ چلتے چلتے اس کی سانسیں پھولنے لگی تھیں۔ پتہ نہیں کے کہنے سے وہ بھی لمبی لمبی سانسیں لے رہی تھی۔ اور تاجدار سوچ رہا تھا اگر یہ سیج بھی گل ہو گئی تو کیا ہو گا؟"

بڑی دیر تک دونوں خاموش رہے۔

تاجدار کے ہیجان انگیز قرب سے وہ پریشان ہو رہی تھی۔ اس کی خواہش سلمیٰ سے چھپی نہ تھی۔ ڈھکے چھپے وہ اپنا مدعا کہہ گزرا تھا۔ وہ اس کا اچھا پشت پناہ ثابت ہوتا۔ اور پھر یہ کوئی معیوب بات بھی نہ تھی۔ لیکن جس ماحول میں اس نے آنکھیں کھولی تھیں، وہاں شوہر کے مرنے کے بعد دوسرے مرد کا تصور تک گھناؤنا تھا۔ وہ انتہائی پاکیزہ نفس تھی۔ جس کے دل میں گناہ آمیز خیال کا آنا تک محال تھا۔ لیکن وہ اپنے آس پاس کی دنیا سے خائف تھی۔ بیواؤں کی زندگی جہاں ملوث سمجھی جاتی ہے۔ اور یہاں تو تاجدار خود اس کے گھر میں رہتا تھا۔ تکلیف دہ خیالات نے اسے سہما دیا۔ اور اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ شہنشاہ کے

ساتھ وہ اسی کنج میں بارہا آئی تھی، جب اس کی دنیا جوان تھی معاشرے کے الزام سے بڑی ہنسی خوشی بھرپور جہاں جی چاہے جائے کوئی انگلی اٹھانے والا نہ تھا۔ لیکن کسی غیر کا ساتھ کتنا شبہ انگیز ہوتا ہے۔

نہیں تاجدار کی خواہش کسی طرح پوری نہیں ہوسکتی۔ اگر پھر یہ دنیا۔۔؟" اس کا دل پھر خلش آمیز طریق پر دھڑکنے لگا۔ دفعتاً تاجدار نے اپنی سروس کا تذکرہ چھیڑ دیا۔

"میں نے سوچ لیا ہے میں اپنی سروس کو خیرباد کہہ دوں گا۔ اگر میں گھر پر نہ رہوں گا تو مجھے یقین ہے آپ تنہائی میں سوچا کریں گی۔۔۔ اور آنسو بہائیں گی۔"

"کوئی کب تک کسی کا ساتھ دے سکتا ہے۔"

"اگر آپ چاہیں تو زندگی کی آخری گھڑیوں تک۔" تاجدار نے بہت سوچ بچار کے بعد کہہ دیا۔ اور سلمیٰ کا دل حلق میں آگیا۔ وہ پھر پریشان ہوگئی۔ یکایک ایک سرخ رنگ کی چڑیا سامنے کھلے ہوئے پھول پر آ بیٹھی۔ دیر تک پھول کے گرد پھرتی رہی اور پھر چہچہاتی ہوئی اڑ گئی۔۔۔ رس پی کر اڑ گئی۔ سلمیٰ کی نگاہیں دور تک۔ اڑتی ہوئی چڑیا کا تعاقب کرتی رہیں۔ "کتنی خود غرض ہے!!"

"پھول کا مصرف یہی ہے۔ وہ کسی کی پیاس بجھانے کے کام آسے؟" سلمیٰ کا لہجہ ناگوار تھا۔ "تم لوگ اس چیز کے سوا کوئی بات سوچ ہی نہیں سکتے!"

"پھول کھلا کھلا مرجھا جاتا۔ اچھا ہی تو ہوا۔ وہ کسی کو کچھ دے سکا! پھول کی سرشت یہی ہے۔"

"یہ احساس برتری ہے۔ کسی سے چھیننے بھی بن پڑے۔ کچھ وصول کرلو۔ دینے کا خیال کسی کو نہیں آتا!!"

"جو خود کو دوسروں کے رحم و کرم کا محتاج سمجھتا ہو، وہ اپنی برتری کیسے جتا سکتا ہے۔ کسے خبر، وہ اس طرح اپنی محبوب ہستی کا قرب چاہتا ہو!"

"قرب۔" وہ پھر دھک سے رہ گئی!

"جائز آرزو ہر قسم کے گناہوں سے پاک ہوتی ہے؟"

"نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔" وہ گھبرا رہی تھی!!

"کوئی کتنا بلند خیال کیوں نہ ہو لوگوں کے خیالات کو نہیں بدل سکتا۔ رسوائی سے بچنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے۔ میں آپ سے جدا ہو جاؤں لیکن میں جیتے جی جدا نہیں ہوسکتا۔ اس طرح تو میں مر جاؤں گا اگر آپ کو امتحان مقصود ہو تو۔ میں اس پر بھی تیار ہوں۔"

"مجھے مت ڈراؤ تاج! تم نے میرا سکوت غارت کردیا۔ دنیا کیا کہے گی۔ یہ عورت اتنی بے صبر نکلی، اپنے شوہر کے چھوٹے بھائی سے شادی کرلی۔ خدا کی پناہ!"

"تو پھر چلئے یہاں سے کہیں اور چلیں۔ جہاں ہم دونوں کسی اور حیثیت سے زندگی گزاریں۔ میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہاں تو بدنامی ہے۔ لوگ سرگوشیاں کریں گے۔ انگلیاں اٹھائیں گے۔ زندگی تلخ کر دیں گے۔"

سلمیٰ کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ موہوم اور پرشور آوازیں قہقہے لگانے لگیں۔ اس نے وحشت زدہ ہوکر تاجدار کا بازو تھام لیا۔

"تمہارا کیا مطلب ہے؟ تم تو میری دلدہی کرتے تھے۔ آج تم نے کیسی باتیں شروع کردیں۔ کیا میرا کہیں ٹھکانہ نہیں ہے؟"

"آپ اس قدر کیوں گھبرا رہی ہیں۔ ہم کوئی گناہ تو نہیں کریں گے۔"

"میں اسے گناہ سمجھتی ہوں، اگر میری زندگی چاہتے ہو تو اب کی بار نہ کہنا!"

وہ خاموش ہوگیا!۔

وہاں دنیا بھر کی رعنائیاں اکٹھا تھیں۔ جہاں دونوں تھے۔ پھولوں کی مہک۔ لہروں کا ترنم۔ ماہی گیروں کی کھنکتی ہوئی زندگی سے بھرپور ہنسی۔۔۔ لیکن

دونوں کی دنیا اداس تھی تاجدار اپنی جسارت پر پریشان اور سلمیٰ اس کی جسارت پر متحیر۔!!

واپسی پر تاجدار بغیر کچھ کہے سنے الگ ہوگیا۔ اس کے سلوک سے سلمیٰ کے دل کو ٹھیس لگی۔ کیا آدمی اپنی غرض کے لئے اس قدر خودغرض بن سکتا ہے؟"

وہ تھکے تھکے قدموں سے اپنے کمرے میں پہنچی۔ میز پر کسی کا تار رکھا تھا۔ روبینہ شام کی ٹرین سے آرہی تھی۔!! وہ نہ آتی تو اچھا تھا۔ گھر کا ماحول سازگار کہاں تھا۔ ہر طرف افسردگی، اداسی .... اور روبینہ خود بھی تو بہت سارے دکھوں کو گلے لگائے جی رہی تھی! سلمیٰ کی بڑی بہن کی لڑکی جس نے ماں کے مرنے کے بعد سوائے غموں اور دکھوں کے کچھ بھی نہ دیکھا تھا۔ شام سے پہلے ہی روبینہ آگئی۔ سلمیٰ کے انداز میں کوئی گرم جوشی نہ تھی۔ لیکن روبینہ اس سے لپٹ گئی:

"آنٹی۔ آنٹی۔ آپ کتنی بدل گئی ہیں۔ تنہائی اور فکروں نے آپ کو آدھا کر دیا ہے۔"

وہ چپ چاپ اسے سہلانے لگی .... گھر کا چارج روبینہ نے لے لیا۔ اب وہ گوشہ نشین ہوجائے گی ناشتہ، لنچ، اور ڈنر کب تک تیار ہوجاتے ہیں۔ اور تاجدار کے پسندیدہ کھانے کون کون سے ہیں"۔

"تاج بھائی آپ کے ساتھ رہتے ہیں۔!! اس نے پوچھا۔

"ہاں کم و بیش چار پانچ ماہ ہوئے"۔

"وہ اپنا سر دس پر نہیں جاتے؟ روبینہ نے پھر پوچھا۔

"نہیں۔ ان کی وجہ سے دل بہلا رہتا ہے۔ ورنہ تم سوچو۔ تنہائی مجھے ڈس لیتی۔

"اور کیا آنٹی غم اور اکیلا پن زندگی کے ناسور ہیں۔ رات کے کھانے پر وہ روبینہ سے مل سکا۔ اور جان بوجھ کر خاموش نوالے اٹھاتا رہا۔

"یہ روبینہ ہے تاج! میری بھانجی" سلمیٰ نے کہا

"جی!" اس نے زیر لب کہا اور گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگالیا!

ابھی وہ دونوں میز پر تھیں لیکن اس نے اتنا سا کھانا کھایا اور جلدی سے باہر نکل گیا!"

"تو اب بھائی نے اپنی سوسائٹی ڈھونڈلی .... وہ اندھیرے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ ذہن میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ وفا کا بدلہ یہ بے رخی ہے؟.. یہاں انسان کسے اپنا سمجھے۔ قریبی عزیز رقیب عزیز بن جاتے ہیں! اُف وہ بے خبری میں اس کا ذہن اٹھا جا رہا تھا۔ آن کی آن میں اس نے ہزاروں بدگمانیاں باندھ لیں۔

دفعتاً کمرہ جگمگا گیا۔

"کیوں تاج۔ اندھیرے میں کیوں بیٹھے ہو گئے۔ اس کی آواز حلق میں گڈمڈ ہوگئی۔

"تم جانے کیا سوچ رہے ہو؟... خفا ہو مجھ سے؟"

"جی نہیں!"

"ادھر دیکھو!" دیکھنے کے بجائے تاجدار نے اور بھی سر جھکا لیا۔ یک لخت اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ سلمیٰ نے اس کا چہرہ اوپر اٹھایا اور آنسو دیکھ کر مضطرب ہوگئی۔

"تم رو رہے تھے؟"

"آنسوؤں پر آپ کا حق ہے میرا نہیں!!"

سلمیٰ نے محسوس کیا وہ اسے بھابی کہہ کر مخاطب نہیں کر رہا تھا۔

"مجھے بتاؤ تم کیا سوچ رہے تھے"۔

"اب کچھ سوچنے کو باقی نہیں رہا... کیا سوچوں گا؟"

"میری تقدیر۔" سلمٰی نے مایوسی کے انداز سے کہا اور پھر وہ بھی کچھ سوچنے لگی

"میں اسی ہفتہ باہر جا رہا ہوں.... آپ کی تنہائی تو کسی نہ کسی طرح دور ہو جائے گی۔ اور پھر یہاں میرا کام بھی کیا ہے؟"

"مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے؟" ہونٹوں تک بات آکر رک گئی۔ جب وہ اتنی بے مروتی برت رہا ہے تو سلمٰی کیوں اس کی رفاقت کی التجا کرے۔ اس کا دعویٰ محبت صرف اسی قدر تھا۔ اپنائیت اور یگانگت کے لئے بس اتنی ہی سی قسمیں کھائی تھیں۔ کسی کا دکھ بانٹنا آسان نہیں ہے۔ پہلے ویسا ہی زخم اپنے دل پر لگانا پڑتا ہے۔ تب کہیں تڑپ ہوتی ہے۔ زبانی دعویٰ تو ہر ایک کر سکتا ہے"۔

امید و بیم کی کیفیت میں تاجدار سلمٰی کا چہرہ تک رہا تھا۔ اگر وہ بھولے سے بھی اس کی رفاقت منظور کر لے تو وہ تن من کی بازی لگا دے۔ لیکن وہ خاموش رہی۔ تاجدار کے دل میں کانٹا سا ٹوٹ گیا اور خلش اسے بے چین کرنے لگی۔

"روکنے سے تم رکتے تو میں تمہیں کبھی اجازت نہ دیتی۔ مگر تم نے تو بہت پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ رشتے ٹوٹ چکے!" سلمٰی نے مدھم لہجے میں کہا۔ اور پھر اندر چل دی۔

شام ہی کو وہ اس کے لئے چند دوائیں لایا تھا۔ لیکن وہ تو اس سے ناراض تھی۔ پیکٹوں کو اس نے ملازم کے ہاتھ بھجوا دیا۔ وہ جوں کے توں واپس آگئے۔ اس نے کچھ اور سوچا تھا۔ جلد بازی اسی کی تھی۔ ڈرتے ڈرتے اس نے سلمٰی کی خواب گاہ میں قدم رکھے۔ روبینہ اس کے سرہانے بیٹھی کچھ کہہ رہی تھی۔ سلمٰی کی سسکیاں سن کر وہ مضطرب ہو گیا۔

پہلی بار گہری نظروں سے روبینہ نے اسے دیکھا۔ وہ خود کچھ شرمندہ سا ہو گیا۔ اس کی حماقت کا حال روبینہ کو معلوم ہو گا؟

"آپ نے ٹانک واپس کیوں کر دیئے"۔ وہ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر جھکا۔

"اپنے ساتھ انہیں بھی لے جاؤ"۔ سلمٰی نے کہا اور اٹھ کر کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔

"اپنا دل صاف کر لیجئے۔ مجھے اپنی حماقت پر شرمندگی ہے۔ میں کہیں نہیں جا رہا ہوں!"

"مجھے اس کا کوئی شکوہ نہیں تاج.... جہاں جی چاہے چلے جاؤ"۔

"وہ پھر سوچوں گا پہلے آپ یہ قبول کر لیجئے ـــ زندہ رہئے۔ اور دوسروں کو بھی زندگی دیجئے۔ آپ کو میری قسم"

"میری قسم!" دفعتاً وہ اس دنیا میں چلی گئی۔ جہاں شہنشاہ مسکرا رہا تھا۔ اس کے روٹھنے پر خفا ہو جانے پر کتنی بار وہ اپنی قسمیں دیتا تھا اور جھوٹ موٹ کی خفگی پر بھی اسے وہی کرنا ہوتا جو شہنشاہ کی مرضی ہوتی"۔ وہ ان گنت یادوں کے بھنور میں چکر لگانے لگی۔ اور بھول ہی گئی کہ تاجدار ابھی تک پیکٹ ہاتھوں میں لئے کھڑا تھا

"آنٹی ہوا سرد ہے یہاں آجائیے"۔ روبینہ بولی۔ دھیرے دھیرے وہ اپنے خیالات پر قابو پا سکی۔

"میں یہ سب کچھ اپنے ہی لئے کرتا ہوں آپ کی زندگی میری زندگی ہے۔ مجھے اپنی فکر نہیں ہے۔ لیکن وہ شمع جو بھائی جان کے لئے روشنی دے رہی تھی وہ گل نہ ہونے پائے۔ اگر آپ کو خدانخواستہ کچھ ہو گیا تو گھٹا ٹوپ اندھیرے میں میں کیا کروں گا۔

اتنا رسیا خود غرضی"۔ روبینہ صرف یہی سوچ سکی!

"وعدہ کیجئے آپ اپنا طرز بدل ڈالیں گی آپ کو بھائی جان کی قسم آپ خود کو میرے لئے خوش رکھیں گی"۔

"تمہارے لئے"۔ وہ پھر دھک سے رہ گئی"۔

اس نے کھڑکی کی چوکھٹ سے سر ٹیک دیا اور گرد و پیش سے بے خبر ہو گئی!

کیا کہے کیا نہ کہے۔ ایک طرف اپنی آن کا خیال دوسری طرف تاجدار کی محبت کا جنون؟ وہ خود بھی پاگل ہو رہی تھی۔ اگر وہ سامنے آجاتا تو جی چاہتا جلدی سے چلا جائے۔ اگر اسے نہ دیکھتی تو دل اس کا متلاشی ہوتا!

اور ان دنوں دل کی گہرائیوں سے وہ اپنی موت کی دعائیں مانگ رہی تھی!

اور پھر طوعاً و کرہاً وہ اپنا ماضی بھولنے لگی۔ دن رات میں اب بھی اس کے لئے کوئی رعنائی نہ تھی۔ وہ یکسر بدل گئی تھی۔ جب بھی تاجدار اندر آتا تو وہ اسے نماز پڑھتے یا تلاوت کرتی ہوئی ملتی۔ اکثر کھانے پر وہ اور روبینہ تنہا ہوتے۔ دو گونگے بہرے مسافر۔ صرف دید کے شناسا۔ نہ تاجدار اسے مخاطب کرتا اور نہ روبینہ کو خود سے پہل کرنا پسند تھا۔

پہلے پہل اپنے کمرے میں اسے دیکھ کر تاجدار متحیر رہ گیا۔ وہ خاموشی سے میز پر چائے کا سامان رکھ رہی تھی۔ چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔

"ملازم کہاں ہے؟" اس نے درشت لہجے میں پوچھا

"جی۔ مجھے پتہ نہیں۔" جھکی جھکی پلکیں اس کے کرخت انداز پر سہم کر اٹھیں اور پھر جھک گئیں۔

"آپ کی آنٹی کیا کر رہی ہیں؟"

"نماز پڑھ رہی ہیں۔"

روبینہ چلی گئی۔ "تو اب بھابی اسے جدا ہی کرنے پر تل گئی ہیں۔" وہ پیچ و تاب کھاتا رہا۔ چائے پڑے پڑے برف ہوگئی۔ صبح وہ غسل کر کے باہر نکلا۔ روبینہ ناشتے کے لئے منتظر تھی۔

"آپ کیوں میرے لئے تکلیف کر رہی ہیں۔"

"جی... وہ آنٹی نے کہا ہے کہ ان کی نماز اور تلاوت کی وجہ سے آپ کے ناشتے میں دیر ہو جاتی ہے۔ اس لئے میں آپ کو یہاں دے جاؤں۔"

"کیا وہ اب بھی نماز پڑھ رہی ہیں۔ دن کے سات بجے۔"

"جی۔ اب تو تلاوت کر رہی ہیں۔"

"اچھا تو آپ یہ ناشتہ لے جائیے۔ قرآن شریف مجھے بھی اٹھا دیجئے اور کہہ دیجئے گا کہ میں بھی تلاوت کر رہا ہوں۔"

"جی اچھا۔" اور وہ بیچ پر ناشتہ سمیٹ کر جلدی جلدی سے گئی۔ ایک انتظار کے بعد سلمیٰ اندر آئی۔ چہرے پر سنجیدگی اور تقدس طاری تھی۔

"تم نے ناشتہ بھجوا دیا۔ کیا کچھ طبیعت خراب ہے۔" وہ پاس آکر بیٹھ گئی۔

"جی نہیں۔"

"تو پھر تم نے معصوم بچی کا دل کیوں دکھا دیا۔"

وہ چپ چاپ سر جھکائے قالین کے نقش و نگار دیکھتا رہا۔

"تمہاری تکلیف مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔ میری وجہ سے تمہیں دیر ہوتی ہے۔ اس لئے میں نے چاہا کہ۔۔!"

"آپ نے یہی چاہا کہ مجھے اپنی سوسائٹی سے الگ کر دیجئے۔"

"تاجدار تم نے مجھے بھابی کہہ کر پکارنا کیوں چھوڑ دیا ہے۔"

"اب آپ میری بھابی کہاں ہیں۔" وہ ہکا بکا اس کی صورت دیکھنے لگی۔

"آپ نے خود ہی اس پر مجبور کیا ہے۔ پہلے آپ اور میں صرف دو ساتھی تھے۔ ایک دوسرے کے دکھ سکھ کے۔ اب آپ نے دوسروں میں اپنی دلچسپی ڈھونڈلی مجھ سے کوئی واسطہ ہی نہ رکھا۔!"

"پاگل کہیں کے" وہ ہنسنے لگی۔ "تم روبینہ کو کہتے ہو؟ ارے وہ تو خود میری شناگی ہے۔ تاج بھائی کے پیچھے آپ مجھے بھی بھول گئی ہیں۔ اچھا۔ اب صرف یہی علاج رہ گیا ہے کہ میں بیچ میں سے ہٹ جاؤں۔ تم دونوں آپس میں بنٹ لوگے۔"

"قطعی نہیں۔ ہرگز نہیں!"

"روبینہ بھی تو میری بھانجی ہے!" اسے اس کا بوجھ بڑا لگا۔

"میری تو کوئی نہیں ہیں!"

"تم اگر چاہو تو تمہاری بھی بن سکتی ہے؟" سلمیٰ نے کہدیا۔

"محبت کے سودے میں میرا دل عورتوں کا سا دغا شعار ہے۔ بیگم شہنشاہ! اگر ایک کا نہیں تو پھر کسی کا نہیں!"

بیگم شہنشاہ! سلمیٰ اس جزئیت پر دنگ رہ گئی!

محبت میں ہار کر کہیں اور پناہ ڈھونڈنا جذبات کا افلاس ہے! کیا انسان اپنے دکھ کو سینے سے لگائے ہوئے نہیں جی سکتا؟"

ابھی تک تمہارا وہم دور نہیں ہوا۔"

"وہم؟.... وہ ہنسا۔" محبت صرف مرد اور عورت کے درمیان ہی نہیں ہوتی۔ محبت ان دیکھی چیزوں سے بھی ہو جاتی ہے۔ اتنی بالا و برتر ہستی سے بھی ہو سکتی ہے جس تک انسان نہ پہنچے۔ اپنی محبت پر میرا حق ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت مجھے اپنے تخیلات سے جدا نہیں کر سکتی۔ میں نے اپنا پاگل پن نہیں چھوڑا۔ مجھے آپ اس پر مجبور بھی نہیں کر سکتیں۔ میں آپ کا دل کبھی نہیں دکھاؤں گا۔ آپ کا دل میرا معبد ہے۔ کیا کوئی اپنا معبد اپنے ہی ہاتھوں برباد کر سکتا ہے؟ سنگ آستاں سے سوائے داغوں کے کچھ نہیں ملتا۔ سر ٹکرانے والوں کو یہ داغ ہی پیارے لگتے ہیں!"

اس کا سارا جسم پسینے میں بھیگ رہا تھا۔ دل کی دھڑکن اسے پھر مضطرب کرنے لگی۔ تاجدار نے اپنا دیوانہ پن نہیں چھوڑا۔ کیا وہ اتنی ظالم ہے۔ اپنی آن اور ضد پر ایک مجبور انسان کی آرزوؤں کا خون کر رہی ہے۔!"

وہ پھر مجبور ہونے لگی۔ سارا زہد خاک بسر ہونے لگا۔ اور یکایک آنکھوں سے موتی ٹوٹنے لگے۔

وہ دریچے میں کھڑا دور خلاؤں میں گھورنے لگا۔

روبینہ کو آتے دیکھ کر وہ اندر چلی گئی۔ روبینہ نے بڑے مخلص لہجے میں اسے مخاطب کیا "کیا آپ کے سر میں درد ہے؟"

وہ خاموش سوچتا رہا۔

"آپ کی چائے میں لے آؤں؟"

"شکریہ! آپ مجھ میں چشمہ مت تلاش کیجئے!"

"مجھے چشمے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ تاج بھیا۔! جس کے لئے آپ چشمہ بن رہے ہیں وہ سیراب ہو چکا ہے۔!!"

اچانک ہی تاجدار سناٹے میں رہ گیا۔! اُف یہ خاموش اور سادہ سی لڑکی۔!

رات آگئی۔ خوشبوؤں سے مہکی رات خواب کے آہنوں میں لپٹی .... شیلی اور حسین!!

کیا پتہ روبینہ نے اس کے ناگوار لب و لہجے کی شکایت کی ہو .... سلمیٰ بھی ادھر نہیں آئی۔ ذرا ذرا سی بات اس کے لئے پہاڑ بن جاتی تھی۔ احساس کی شدت نے پاگل بنا رکھا تھا۔

اور سلمیٰ اپنی ہی الگ تھلگ دنیا میں ہچکولے کھا رہی تھی۔ تاجدار کو روبینہ سے کوئی النسبت نہیں۔ خواہ مخواہ اسے اس کے تنفر سے خوشی ہونے لگی۔ جیسے کسی انجانے شے کے حصول کے لئے دعا مانگے۔ اور دل ہی دل میں اس کے نامقبول ہونے کا متمنی ہو۔ روبینہ کے لئے اس نے تاحد سے خفگی مول لی تھی۔ اس کے اپنے دل میں روبینہ کی خلش ضرور تھی پر تاجدار کا دل صاف تھا۔ اس نے کبھی روبینہ کو نظر بھر کر دیکھا تک نہ تھا۔

رات گزرنے لگی۔ وہ دریچے میں کھڑی رہی۔ دفعتاً اس کی نگاہ بلگجے اندھیرے میں مردانہ ہیولے پر پڑیں۔ اس کا دل پھر ہوش و خرد سے بیگانہ بننے لگا۔ آہستہ سے اس نے دریچے کا پردہ پھیلا دیا۔ اور خود کو سنبھالنے لگی۔ ابھی تو شہنشاہ کی یاد تازہ ہے پھر یہ دل میں سارے سے کیوں ٹوٹنے لگے ہیں۔

پل پل رات ڈھلنے لگی۔۔ ۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ بار بار وہ باغ میں جھانکتی۔ اور تاجدار کو روش پر ٹہلتے دیکھ کر بے چین ہونے لگتی۔ دھیرے دھیرے بلند و بالا سرو و شمشاد کی چوٹیاں پچھے ہوئے نور سے دمکنے لگیں۔ وہ اب بھی ٹہل رہا تھا۔ اکا دکا ستارے پلکیں جھپکانے لگے۔ درختوں میں خوشنوا چڑیوں نے صبح کے ترانے چھیڑ دیئے“

”تاجدار اب بھی ٹہل رہا تھا!

”اللہ۔۔ اللہ۔۔ اس سے آخری نظر تاجدار پر ڈالی۔ اور بستر پہ آگری۔۔۔ اس پاگل پن کا علاج کہیں نہیں ہے، کہیں نہیں ہے۔

گھر کی فضا مکدر ہوگئی۔

رات کی ساری ٹھنڈک تاجدار کی نس نس میں سما گئی تھی۔ بخار اور جلن سے پریشان وہ بار بار سر مسہری کی پٹی پر پٹخ رہا تھا جلتی جلتی آنکھیں پھاڑ کر دروازے کو دیکھتا۔ دروازہ کھلا ہی رہا۔ اور اس کے قدم اس تک نہ آئے۔

بڑی دیر بعد اس نے نندا سی پلکیں کھولیں روبینہ سرہانے بیٹھی اودی کولون کی پٹیاں پیشانی پر رکھ رہی تھی۔

”آپ کی آنٹی کہاں ہیں؟“

”جب میں یہاں آئی تھی وہ عصر کی نماز پڑھ رہی تھیں۔“

”اللہ اللہ“۔ اس کی آواز ندھ گئی۔

”یوں نہ گھبرائیے۔ آپ جلدی اچھے ہو جائیں گے“۔ اس نے تسلی دی۔

”خدا کرے مجھ پر دنیا بھر کی بیماریاں ٹوٹ پڑیں۔ خدا مجھے موت کیوں نہیں دیتا“۔ اس نے اپنا سر پیٹ لیا۔ روبینہ نے بڑی مشکل سے اس کے ہاتھ پکڑے!

”آپ رو رہے ہیں“۔ وہ سکتہ زدہ رہ گئی۔۔۔

”ہاں میں رو رہا ہوں“۔ اس کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی“۔ اس مفلس بچے کی طرح جو جانتے بوجھتے کسی قیمتی کھلونے کے لئے مچلتا ہے! میں خواہ مخواہ پاگل ہوتا رہا۔۔۔ اپنے دل کو کیسے سمجھاؤں! میں نے یہ سب کیوں چاہا، کیوں چاہا۔۔۔!“

”جس چیز کے لئے ہم مچلتے ہیں کیا پتہ ہم اس چیز کے سزاوار نہ ہوں“۔ روبینہ بولی۔ اگر دل لاپرواہ ہو جائے تو پھر نہ سکھ کی چاندنی کی آرزو ہوتی ہے نہ غم کی دھوپ کا اثر!!

”اچھا میں آپ کے لئے سوپ لے آؤں“۔

سوپ میز پر پڑے پڑے پالا ہو گیا۔ بہت دیر بعد مخصوص قدموں کی چاپ سنکر آنکھیں کھولیں!!

”ابھی تو میں زندہ ہوں“۔ بڑی جلدی آئیں آپ“۔ وہ خاموشی سے اسٹو پر سوپ گرم کرنے لگی۔

”تم رات بھر باغ میں کیا کرتے رہے“؟

"پردے کے پیچھے آپ کھڑی تھیں آپ کو دیکھتا رہا۔ تاجدار نے صاف صاف کہا۔ اور سلمٰی گنگ ہوگئی۔ وقت اور ماحول نے اسے پھر بے ضبط کر دیا۔ پتہ نہیں کیا کچھ کہتا رہا۔

"مجھے سوچنے دو۔" سلمٰی نے کہا اور اٹھ کر چلی آئی۔ نئی زندگی کے سہانے خوابوں نے اسے دوسرے ہی دن صحت مند کر دیا۔۔۔ وہ اندر آیا صحن میں روبینہ ملی ہار سنگھار کے پھول اکٹھا کر رہی تھی۔

"آپ کی آنٹی کہاں ہیں۔۔؟"

"تلاوت کر رہی ہیں۔"

"ان کا دکھ آپ بھی نہ بٹا سکیں۔" دفعتاً وہ بولا۔

"دکھ کوئی بوجھ تو نہیں ہے جو ہر ایک بٹا سکے۔"

جانے کیا کچھ سوچ کر آپ ہی آپ گھلی جا رہی ہیں۔" اس کے جواب سے وہ جھنا گیا۔

"ہاں سوچوں کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔" وہ مسکرائی اور پھولوں سے بھرا دامن اچھال دیا۔ سفید سفید پھول تاجدار پر بکھر رہے گئے۔

"دل کو دل سے راہ ہو تو انسان دوسرے کی آرزوئیں بھی اپنا لیتا ہے۔" اس نے ہنس کر تاجدار کو دیکھا اور کچن میں مڑ گئی۔

دھیرے سے تاجدار نے نماز کے کمرے میں قدم رکھا۔ سلمٰی قرآن پاک الماری پر رکھنے لگی تھی۔ اسے اپنے سامنے دیکھ کر دل کی جگہ یکدم خالی ہو گئی۔ سینے میں ہوا سائیں سائیں کرنے لگی۔

"روبینہ نے میری آنکھیں کھول دیں۔" وہ کہہ رہا تھا۔ سلمٰی کا رنگ زرد تھا ہونٹوں پر خشکی چھا گئی تھی۔ رات کے فیصلے نے اسے ایکدم بدل کر رکھ دیا تھا جیسے کسی کے لئے انسان اپنا سارا خون دے کر موت سے سمجھوتہ کر لے!

"اگر آپ کہئے تو کل ہی۔"

"چپ رہو مذراویر چپ رہو۔" اس نے خوفزدہ آواز میں کہا۔

تاجدار آئندہ زندگی کے دلکش پروگرام مرتب کر رہا تھا۔ وہ ہاتھ ملنے لگی دفعتاً اس کی نگاہ اپنی انگلی پر پڑی۔ شادی کی پہلی سالگرہ پر ہیرے کی انگشتری شہنشاہ نے اپنے ہاتھ سے اسے پہنائی تھی۔

"یہ میری نشانی ہے سلمٰی۔ ہمیشہ تمہاری رفاقت کا حق ادا کرتی رہے گی۔" اس نے کہا تھا۔

عجیب سے احساس سے وہ مسکرائی "میں نے پہلے ہی نہیں سوچا میری نجات کا راستہ موت میں بھی پنہاں ہے۔ خواہ مخواہ پریشان ہوتی رہی۔" تاجدار سے اس نے وعدہ کیوں کیا۔ ذہنی کشمکش نے اسے پاگل بنا دیا تھا۔ کیا ہوتا اگر وہ اپنے ارادے پر اٹل رہتی کیا وہ شہنشاہ کو فراموش کر دے گی۔ یہ جسم جو کبھی شہنشاہ کا تھا وہ تاجدار کے حوالے کر دے گی۔ کیا زندہ رہنے کے لئے شوہر کا ہی ضروری ہے۔ اسے کس شے کی کمی ہے؟ اگر شوہر نہ ہو تو کیا وہ مر جائے گی!

کل کیا ہوگا؟ اس کی شادی؟۔۔۔ اُف وہ دلہن بن کر تاجدار کا استقبال کرے گی۔ اس کے ساتھ رہ سکے گی؟ کتنا مکروہ اور گھناؤنا خیال تھا جان بوجھ کر وہ ہیرے کی انگوٹھی سے نظر بچا رہی تھی۔ اس کی موت اس کی مٹھی میں تھی۔

چاندنی تیز تر ہوگئی۔ سناٹا گہرا ہوگیا۔ ابھی ابھی روبینہ اس سے رخصت ہو کر گئی تھی۔ دوسرے لمحے تاجدار نے پردہ ہٹایا۔ اس کے ہاتھ میں چند ایک مخملی کیس تھے اس کے سامنے کیس رکھ کر اس نے ڈھکنے کھولے۔ مرصع کنگن۔ جھل مل کرتے ہار اس کا منہ چڑانے لگے۔

"اگر آپ کو پسند ہوں تو ابھی آپ کی نذر ہیں۔ کل کا انتظار بہت صبر آزما ہے۔" وہ کہہ رہا تھا۔

وہ ہانپتی رہی۔

"زندگی سامنے ہو تو موت کا وہم نہ کیجئے۔ میں آپ کو پہلے سے زیادہ خوش رکھوں گا!

"تاج مجھے معاف کر دو... مجھے معاف کر دو... میں وعدہ جھوٹا کیا تھا۔ جھوٹا عہد کیا تھا۔" وہ بول ہی پڑی۔ اور تاجدار کو خاموشی نے نگل لیا۔ بڑی دیر بعد وہ بولا تو اس کی آواز کسی اندھے کنوئیں سے آتی معلوم دی۔

اگرچہ یہ کہنا بڑی بے شرمی ہے۔ مگر آپ سے کہہ دوں.... دنیا کی نظروں میں ہم میاں بیوی رہیں گے اور اپنی اپنی جگہ ہماری وہی حیثیت رہے گی جو اب ہے۔ اور پھر۔" اس نے بڑے دکھ سے اعتراف کیا۔" میرا جی چاہتا ہے .. آپ کی زندگی برباد نہ ہو... آپ کی سونی کلائیوں میں کنگن مسکرائیں۔ آپ کی اجڑی مانگ میں افشاں چمکے خوشنما لباس آپ پر سج جائیں!! مگر اب ۔ اب ۔ وہ چپ ہو گیا۔

"آپ کی مرضی نہیں ہے نہ سہی۔ ورنہ آپ کے وعدے نے مجھے جلا دیا تھا۔" شب بخیر! خدا آپ کو سکون و آرام عطا کرے! اپنی تمام آرزوؤں اور رنگ برنگی خواہشات کی لاش اس نے سلمیٰ کی چوکھٹ پر ڈال دی اور تھکے تھکے قدموں سے باہر مڑ گیا۔

رات کا ڈھلتا پہر تھا! وہ بے خواب اپنے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔

"تاج بھائی.. تاج بھائی .. روبینہ چلا رہی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا مبہوت اور بدحواس روبینہ کہہ رہی تھی۔

"جلدی چلئے۔ آنٹی نے ہیرا نگل لیا۔"

کئی ایک ڈاکٹر اپنی سی کوشش کر کے سدھار چکے تھے۔ اور اب اس کے دونوں پہلوؤں پر روبینہ اور تاجدار بیٹھے تھے۔ شمع گل ہونے کو تھی۔ سحر قریب تھی!! سلمیٰ نے جانے کیا سوچ کر اپنی شادی کا لباس پہنا تھا۔ تاجدار کے لائے ہوئے زیور اس کے جسم پر تھے!! تاجدار! اچانک سلمیٰ کے لب کانپے! وہ اس پر جھک گیا۔ اسی پیار اور اسی گرم جوشی کے ساتھ!! جیسے سلمیٰ کے انکار نے اسے ذرہ برابر نہ بدلا تھا۔

"تم رو رہے ہو پاگل!" وہ ہنسی! "تاج نہ رو۔ خوش ہو... میں نے تمہارے بھائی کی رفاقت کا حق ادا کر دیا۔

"آپ نے یہ کیا کیا.. یہ کیا کر دیا؟" تاجدار کہہ رہا تھا۔ لرزتے کانپتے تاجدار کے ہاتھوں کے ہالے میں سلمیٰ کا چاند سا چہرہ دمک رہا تھا۔

تاجدار۔ ایک سنگین قلعہ فتح کرنا آسان ہے۔ لیکن اپنے نفس کا۔ آہنی ناقابل تسخیر قلعہ فتح کرنا مشکل ہے۔ بہت مشکل۔ اُف فوہ۔ یہ مجھے کیا ہو رہا ہے تاج... تم مجھے بے شرم نہ کہنا کئی بار۔ میں نے۔ خود کو۔ تمہارے آگے بے بس پایا۔ آہ۔ میرا دل چاہا۔ میں اپنے کو تمہارے حوالے کر دوں! میں بہت بُری ہوں۔ اس کی سزا یہی تھی کہ۔ میں اپنے ہاتھوں اپنا گلا گھونٹ لیتی... تاج... کل کا انتظار۔ مرگ آسا ہو گیا۔ وہ ہانپنے لگی۔

"آنٹی... آنٹی..." روبینہ سسکنے لگی۔

"جب میں نے تم سے تمہاری ہو جانے کا وعدہ کیا تھا۔" وہ پھر کہنے لگی۔ "شہنشاہ میرے سامنے آ گئے۔ کہہ رہے تھے۔ سلمیٰ جو کچھ تم نے مجھے سونپا تھا کیا وہی میرے بھائی کو بھی سونپ دو گی۔ اگر۔ اگر تم گھبرا گئی ہو تو..... میرے پاس آ جاؤ۔"

نگ نکلی ہوئی انگشتری کا خاردار دائرہ تاجدار کے ہاتھوں میں چبھنے لگا۔ اس نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں جکڑ لئے۔

"تمہاری خواہش تھی۔ میں پھر سے ۔ دلہن بن جاؤں۔ مرگ آسا تبسم نے اسے بھیانک بنا دیا۔" یہ عروسی لباس ۔ یہ زیور ۔ اب تو ۔ تمہاری۔ آرزو۔ پوری ہو گئی ۔ تاج... ایک بار صرف ایک بار۔ مجھے بھابی کہہ کر آواز دو۔!!"

ڈوبتا ابھرتا سینہ ہمیشہ کے لئے ڈوب گیا۔

سرد اور ساکت سلمیٰ کے سینے پر سر رکھ کر تاجدار بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"واپس آئیے۔ بھابی... واپس آئیے..."

بشیشر پردیپ
بیسویں صدی۔ دہلی۔

ترکِ محبّت

میں سوچا کرتا تھا کہ اگر سیما کہیں نظر آگئی تو میں کترا جاؤں گا۔ لیکن اس وقت اسے دیکھنے کے بعد اچانک میرے دل میں خواہش پیدا ہو رہی تھی اس سے ملنے کی۔ اس کے پاس بیٹھ کر اس سے باتیں کرنے کی ـــ لیکن ـــ لیکن کیسے ـــ؟ ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے وہ کوئی اجنبی عورت ہو۔ اور اس سے بغیر کسی وجہ کے بات کرنا بھی معیوب ہو۔ اور پھر جیسے جیسے یہ اجنبی پن کا احساس بڑھا اس سے بات کرنے کا اشتیاق بھی بڑھتا گیا۔ کتنی عجیب بات تھی۔ کہ جو عورت پورے دو سال تک میری بیوی کی حیثیت سے میرے ساتھ رہ چکی تھی اب اس سے بات کرنا بھی میرے لئے مشکل ہو رہا تھا۔

میں جے پور اپنے دفتر کے کام کے سلسلہ میں آیا ہوا تھا۔ ہوٹل کے کمرے میں سامان لگانے کے بعد کمرے سے باہر نکل کر دروازہ بند کر رہا تھا۔۔ کہ میری نظریں ساتھ کا دروازہ بند کرتی ہوئی ایک عورت پر پڑیں۔ اور میں ٹھٹک گیا۔ وہ سیما تھی۔ سیما نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ اس کا چہرہ بھی سرخ ہو گیا تھا دروازہ بند کرنے کے بعد جو میں نے پھر اُس طرف دیکھا تو وہ بھی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اپنے اپنے دروازوں کے پاس کھڑے ہم ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ اور پھر جیسے ہم دونوں ہی نے اپنے آپ پر قابو پا لیا ہو۔ میں زینے کی طرف چل دیا۔ اور وہ سامنے ریلنگ کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ وہ بھی تیار ہو کر کہیں جانے والی تھی۔ لیکن اس وقت رک گئی تھی۔ کہ میں باہر جاؤں تو وہ بھی زینے کی طرف جائے۔

مجھے سیما کو طلاق دیے چار سال ہو چکے تھے۔ ویسے اُس سے الگ رہتے ہوئے اس سے بھی دو سال زیادہ ـــ طلاق کے معاملے میں ہم دونوں کی خواہش کو برابر کا دخل تھا۔ جب ہم نے یہ فیصلہ کر لیا کہ ہماری آپس میں نہیں بن سکتی۔ تو وہ ایک رات چپکے سے چل دی۔ جاتے ہوئے اپنے ساتھ ایک چھوٹے سے اٹیچی کیس میں صرف وہی سامان لے گئی۔ جو اسے تھوڑے عرصے تک کافی ہو سکتا تھا۔ اور زیورات میں سے بھی وہی زیور لے گئی۔ جو اس نے اس وقت پہن رکھے تھے۔ بلکہ ان میں سے بھی وہ چوڑیاں جو اس کے میکے کی نہیں تھیں اتار کر سنگار میز پہ رکھ گئی۔ جب میں صبح اٹھا تو مجھے میز پر اس کا خط ملا۔

"میں جا رہی ہوں۔ طلاق لینا اس لئے ضروری ہو گا کہ آپ دوسری شادی کر سکیں۔"

"آپ دوسری شادی کر سکیں۔" تو کیا وہ خود دوسری شادی نہیں کرنا چاہتی ـــ مجھ سے الگ ہو جانے کے بعد اکیلی رہنا چاہتی ہے ـــ؟ میں خط ہاتھ میں لیے کتنی دیر تک سوچتا رہا۔

ہندو طلاق بل نیا نیا پاس ہوا تھا ـــ اور اس وقت ہماری شادی کو ڈیڑھ ہی برس ہوا تھا ہم میں اکثر جھڑپ ہو جاتی تھی۔ اور ہم دونوں ہی نے اپنی اپنی جگہ یہ محسوس کر لیا تھا۔ کہ ہمیں ایک دوسرے سے الگ ہونا پڑے گا۔ جب بل پاس ہوا۔ اور چھپ گیا۔ تو میں اس کی ایک جلد خرید لا۔ ہم نے اس کا

مطالعہ کیا۔ اور پھر ساتھ بیٹھ کر بل کی ہر دفعہ پہ بحث کی۔ اور اس بات پر سوچ بچار کیا کہ طلاق حاصل کرنے کے لیے کونسا طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے؟
ہم اس طرح بحث کرتے جیسے ہم وکیل ہوں اور کسی دوسرے جوڑے کا معاملہ ہمارے سامنے ہو۔ اور بل کی کسی دفعہ کے مطابق ہمیں اس جوڑے کو، طلاق لینے کا مناسب طریقہ بتانا ہو۔

آخر یہ طے پایا کہ سب سے پہلے سیما مجھے ایک ظالم شوہر ٹھہرائے گی۔ اور مجھ سے "جوڈیشل سیپریشن" (Judicial separation) لے لیگی۔
اور پھر قانون کے مطابق میں دو سال کے بعد طلاق کے لیے درخواست دے دوں گا۔ وہ مقدمہ نہیں لڑے گی۔ اور نہ اپنے لیے ماہوار خرچہ ہی مانگے گی اس طرح طلاق مل جائے گی ــــ اور ایسا ہی کیا گیا۔

طلاق کے مقدمہ کے دوران جج صاحب جناب آر۔ ڈی۔ سنہا نے بہت کوشش کی کہ ہم ایک دوسرے سے الگ نہ ہوں۔ انہوں نے ہم دونوں کو الگ الگ اپنے چیمبر میں بلا کر سمجھانے کی کوشش کی۔ لیکن ہم دونوں ہی نے صاف انکار کر دیا ــــ ہماری نہیں بن سکتی۔ کبھی نہیں بن سکتی۔ اور ایک ناخوشگوار زندگی گزارنے سے بہتر ہے ہم الگ ہو جائیں۔"

مجھے یاد ہے۔ جب جج صاحب نے سیما سے پوچھا تھا۔
"کیا آپ دوسری شادی کرنا چاہتی ہیں؟"
تو سیما نے نہایت اطمینان کے ساتھ جواب دیا تھا۔
"جی نہیں۔"

اور جج صاحب اُسے تعریف بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے خاموش ہو گئے تھے۔ اور جب یہی سوال انہوں نے مجھ سے پوچھا تھا ــــ تو میں نے تلخ نظروں سے سیما کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ دیا تھا ــــ "جی ہاں!"
لیکن جب جج صاحب نے اپنی اس کوشش میں کہ ہم ایک دوسرے سے الگ نہ ہوں یہ حکم سنا دینا چاہا ــــ
"ان دونوں کو ایک بار پھر تین ماہ کے لیے ساتھ رہنا ہوگا۔ اور اس کے بعد رپورٹ کرنی ہوگی۔ اگر اس وقت بھی دیکھا گیا کہ ان کی آپس میں نہیں بن سکتی تو طلاق کی درخواست پر غور کیا جائے گا۔"
تو سیما نے اس حکم کے خلاف احتجاج کرنے میں پہل کی۔ جھٹ بولی۔
"جناب یہ میرے ساتھ ظلم ہوگا ــــ یہ میرے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ اس وقت تو میرے کوئی بچہ نہیں ہے اور میں آزاد ہوں۔ جس طرح چاہوں زندگی گزار سکتی ہوں۔ اگر ہمیں کچھ عرصے کے لیے ساتھ رہنے پہ مجبور کیا گیا تو ہو سکتا ہے میں ــــ میں ماں بن جاؤں۔ اور اس وقت ....."
اور وہ خاموش ہو گئی۔
اور جج صاحب بھی چپ رہ گئے۔
وہ اس دلیل سے قائل ہو گئے تھے۔

طلاق کے مقدمہ کے دوران میں نے سیما کو تین چار بار دیکھا تھا۔ لیکن صرف کچہری ہی میں۔ جب وہ گھر کے کسی آدمی کے ساتھ آتی تھی۔ کچہری میں ان تین چار ملاقاتوں میں مجھ سے اس کی کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔ اور نہ میں نے بات کرنے کی خواہش ہی محسوس کی۔ طلاق کے بعد چار سال تک میں نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ اور اب اتفاق سے وہ اسی ہوٹل میں میرے بغل والے کمرے میں ٹھہری تھی۔

پہلے دن دفتر کا کام صرف ایک گھنٹے کا تھا۔ اور اس کے بعد میرا پروگرام اس تاریخی شہر کو دیکھنے کا تھا۔ لیکن دل پہ ایک عجیب اداسی چھائی تھی اور میں کھویا کھویا سا محسوس کر رہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا۔ جلدی سے ہوٹل واپس جاؤں اور سیما کو ایک بار پھر دیکھوں۔ لیکن اس وقت وہ ہوٹل

میں کہاں بیٹھی ہوگی ۔۔ ؟

چھوٹی چوپٹ، بڑی چوپٹ۔ ہوا محل اور گووندجی کا مندر دیکھنے کے بعد میں شیش محل دیکھنے کے لیے میں آمیر چلا گیا۔ لیکن جہاں بھی گیا سیا میرے احساس پر چھائی رہی۔ کبھی سفید ساڑی میں کبھی آسمانی رنگ کی ساڑی میں، کبھی ہلکے سبز رنگ کی ساڑی میں ۔۔۔ ہر اس پوشاک میں جس میں وہ کبھی میرے ساتھ گھوما کرتی تھی۔

شام کو تقریباً سات بجے میں واپس ہوٹل آیا۔ اس کا کمرہ بند تھا۔ میں نے جھانک کر دیکھا۔ اندر سامان پڑا تھا۔ پھر بھی یہ یقین کرنے کے لیے کہ ابھی تک سیا ہی اس کمرے میں ٹھہری ہوئی ہے۔ میں نے چائے لانے والے ملازم سے پوچھا۔

"یہ ساتھ والا کمرہ خالی ہوگیا کیا؟"

جی نہیں! اس میں تو آگرہ کی ناری کلا مندر کی ایک ورکر ٹھہری ہوئی ہیں۔ شاید کل چلی جائیں۔ کمپنی باغ میں عجائب گھر کے پاس جو نمائش لگی ہوئی ہے اس میں ان لوگوں کا اسٹال ہے۔ بہت اچھی نمائش ہے صاحب۔ دیکھ آئیے گا۔ بس دو دن اور ہے!

میرے ایک سوال کے جواب میں ملازم نے بہت کچھ بتا دیا تھا۔ مجھے کچھ عرصہ پہلے معلوم ہوا تھا سیا نے عورتوں کے ایک ادارے ۔ ناری کلا مندر میں ملازمت کرلی ہے۔ لیکن میں نے اس طرف کوئی دھیان نہیں دیا تھا۔ ویسے اب بہت عرصے سے مجھے اس کی یاد بھی نہیں آئی تھی۔ پہلے ایک ڈیڑھ سال تک وہ کبھی کبھی مجھے یاد آجاتی تھی۔ اس کے ساتھ گزارے ہوئے دن یاد آجاتے تھے لیکن ہمیشہ ایک ناخوش گوار اثر چھوڑ جاتے۔ میں نے دوسری شادی کے لئے بھی کوئی خاص کوشش نہ کی تھی۔ دو تین رشتے آئے ضرور لیکن مجھے پسند نہ آئے۔ میں نے اپنے آپ کو کام میں مصروف رکھا یا پھر گھومنے پھرنے میں ۔۔۔ اور اب اتنے عرصے کے بعد میں نے اچانک اسے دیکھا تھا۔

رات کو تقریباً نو بجے اس کی آواز سنائی دی۔ وہ کسی عورت کے ساتھ آرہی تھی۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ میں نے اپنے کمرے کا پردہ اٹھا رکھا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ ہنستی کھنکتی نظر آئی۔ دونوں ہنسی مذاق کرتی میرے کمرے کے سامنے سے گزر گئیں۔ میرے کمرے کے سامنے سے گزرتے وقت اس کی باتوں میں ذرا بھی لغزش نہ تھی۔ اس کی چال میں ذرا بھی فرق نہ تھا۔ اور میرا دل برابر دھڑک رہا تھا ۔۔ یا تو اس نے اپنے اوپر اس حد تک قابو پالیا تھا۔ یا پھر وہ میری موجودگی سے بالکل بے پروا تھی ۔۔ کتنی ہی دیر تک ان دونوں کی باتیں سنائی دیتی رہیں۔ اور پھر دوسری عورت اس سے رخصت ہوگئی۔ اور اس نے دروازہ بند کرلیا۔

یہ شروع نومبر کے دن تھے ۔۔ لیکن رات کو کافی ٹھنڈ ہوگئی تھی ۔۔۔ میں پلنگ پر کمبل اوڑھے لیٹا سیا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کتنی خوبصورت ہوگئی ہے سیا ۔۔! خوبصورت تو پہلے ہی تھی۔ لیکن اب اس کی شخصیت اور بھی جاذب نظر ہوگئی ہے ۔۔ رنگ بھی نکھر آیا ہے ۔۔ اگر طلاق نہ ہوگئی ہوتی تو اس وقت وہ میرے ساتھ اس کمرے میں ہوتی، لیکن اب ۔۔ اب وہ میرے بغل کے کمرے میں سوئی ہوئی ہے۔ لیکن مجھ سے کتنی دور ہے ۔۔ میں اسے اپنے پاس نہیں بلا سکتا۔ وہی سیا جو میرے پاس ہی نہیں رہی تھی۔ جس سے میں نے پیار بھی کیا تھا۔ اب مجھ سے دور تھی ۔۔ بہت دور ۔۔۔ اس وقت مجھ میں اچانک ۔۔ اس کی قربت، اسے پیار کرنے کی خواہش بیدار ہوگئی تھی۔ اور یہ خواہش، اتنی شدت اختیار کرگئی کہ میں رات بھر سو نہ سکا۔ دو تین بار کمرے کا دروازہ کھول کر باہر آیا ۔ باہر برآمدے میں بے چینی کے عالم میں ٹہلتا رہا ۔۔ ایک بار دبے پاؤں اس کے دروازے کے پاس بھی گیا۔ لیکن اس کے کمرے کی ہر چیز محو خواب تھی ۔ اور سیا گہری نیند آرام سے سوئی ہوئی تھی۔

دوسرے دن صبح ناشتہ کرنے کے بعد اپنے دروازے کے پاس آرام کرسی ڈال کر اخبار پڑھنے کے بہانے بیٹھ گیا۔ اس طرح کہ اگر سیا کسی وقت باہر نکلے تو مجھے نظر آجائے! ۔۔۔ کبھی میں سوچتا ۔ اگر وہ پاس سے گزری تو میں آواز دے کر بلا لوں گا۔ یا کچھ دیر کے بعد ملازم کے ذریعے اسے بلوا بھیجوں گا۔ یا خود اس کے کمرے میں چلا جاؤں گا ۔۔۔ چند منٹ باتیں کرنے کے لئے ۔ اس سے معلوم کرنے کے لیے کہ وہ کیسی زندگی گزار رہی ہے ۔۔۔ اور

حرج ہی کیا ہے ــــ؟ لیکن ــ لیکن ضرورت بھی کیا ہے ــــ وہ کیا سمجھے گی، میں ان ہی خیالات میں ڈوبا دروازے کے پاس اخبار لے کر بیٹھا رہا ــ تھوڑی دیر کے بعد سیما اپنے دروازے سے باہر نکلی۔ اور سامنے ریلنگ کے پاس چلی گئی۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ اور پھر منہ پھیر کر نیچے بازار کی طرف دیکھنے لگی۔ اس نے سفید ساڑی پہن رکھی تھی ــــ وہ ہلکے رنگ پسند کرتی تھی۔ لیکن سفید کپڑوں سے تو اُسے عشق تھا۔ اور سفید پوشاک اس کے گورے رنگ پر کھلتی بھی خوب تھی۔ بالوں کو وہ جوڑے یا چوٹی کی شکل میں نہیں باندھتی تھی۔ اوپر سے دو تین بل دے کر نیچے بال کھلے چھوڑ دیتی تھی۔ اس وقت بھی اس نے اسی طرح بال باندھ رکھے تھے۔ اسے احساس تھا۔ کہ میں پیچھے دروازے کے پاس بیٹھا ہوں۔ اُس سے صرف دو گز کے فاصلے پر ــــ لیکن پھر بھی وہ اطمینان سے کھڑی تھی۔ دو تین منٹ کے بعد وہ پیچھے مڑی۔ اور میری طرف دیکھے بغیر نگاہیں نیچی کیے اپنے کمرے کی طرف جانے لگی۔ معاً میری نظر اس کے بالوں پر پڑی اور میں چونک اٹھا۔

اُس کی مانگ میں سیندور تھا ــــ! یعنی ــ یعنی اس کی شادی ہو چکی تھی ــ اس نے دوسری شادی کر لی تھی۔ تو یہ بات ہے!! جب ہی نہایت مطمئن ہے۔ میں نے کل رات یہ بات نوٹ نہ کی۔ ورنہ میں ساری رات یوں بے چین نہ رہتا۔

میں دروازے کے پاس سے اُٹھ کر اندر چلا آیا۔

اُس کی دوسری شادی کے متعلق جان کر مجھے اطمینان سا ہو گیا تھا۔ میں خود کو اس سے لاتعلق محسوس کرنے لگا تھا۔ عجیب بات تھی کہ طلاق کے بعد بھی میرے لاشعور میں اس سے تعلق باقی تھا۔

سیما اسی دن دوپہر کو چلی گئی ــــ لیکن اس کی ساتھی عورت ابھی وہیں تھی۔ اسے میں نے دو تین بار ہوٹل میں دیکھا تھا۔ سیما کا یوں اچانک اتنے عرصے کے بعد نظر آنا۔ اور پھر یکدم چلا جانا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ صرف یہ بتلانے آئی ہو کہ اس نے دوسری شادی کر لی ہے۔

میں شام کو نمائش دیکھنے گیا ــــ ناری کلا مندر کا اسٹال گیٹ کے بالکل سامنے تھا۔ دوسرے اسٹال دیکھتا ہوا میں اس اسٹال تک پہنچا تو ایک کاؤنٹر پر سیما کی وہی ساتھی عورت نظر آئی۔ اس نے بھی مجھے پہچان لیا۔ اس کے سامنے رکھے ہوئے ایک میز پوش کو دیکھتے ہوئے میں نے اس سے بلا تکلف پوچھا ــــ "آپ کی ــــ آپ کی ــــ دوسری ساتھی تو شاید چلی گئیں ــــ؟"

"جی ہاں!"

"میں نے انھیں پہلے بھی کہیں دیکھا ہے ــــ کیا نام ہے ان کے شوہر کا؟"

میں نے سوچنے کے انداز میں اس سے پوچھا ــ جانے مجھے کیسے یقین ہو گیا۔ کہ سیما نے اس عورت سے میرے بارے میں کوئی بات نہ کہی ہوگی یہ نہیں بتایا ہوگا۔ کہ میں اس کا پہلا شوہر ہوں۔

"اُسے تو....." وہ چند سیکنڈ کے لیے رک گئی ــ "اُسے تو طلاق ہو چکی ہے چار سال پہلے۔"

"لیکن دوسری شادی کر لی ہو گی انہوں نے۔"

"جی نہیں ــ اوہو! شاید آپ اس کی مانگ میں سیندور دیکھ کر کہہ رہے ہوں گے!" وہ مسکرا دی۔ اور پھر ذرا شرماتے ہوئے بولی۔

"جانے کیا بات ہے ــــ طلاق کے بعد بھی وہ مانگ میں سیندور لگاتی ہیں ــــ؟"

"ہیں ــــ!؟ ــــ کیا ــــ کیا کہا ــــ؟؟"

اور میرا دل پھر اسی طرح دھڑکنے لگا۔ جیسا اس وقت دھڑکا تھا جب میں نے اتنے عرصے کے بعد، سیما کو پہلی بار دیکھا تھا۔

سید ذوالفقار انور		سنگ میل۔ کراچی

دل ہے ایک سنگریزہ

رات اپنے ساتھ اندھیرا لے کر نازل ہوگئی... !

مجھے سردی کا احساس اس وقت ہوا جب ڈیک پر کوئی نہیں رہا تھا.... میں نے اوپر دیکھا، آسمان پر چاند ہنستا ہوا جہاز کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہا تھا............ کبھی بادلوں کی اوٹ میں چھپ جاتا اور پھر خود ہی بادلوں کی اوٹ سے نکل آتا. ستارے خاموشی سے چاند کو کھیلتا ہوا دیکھ رہے تھے. مجھے خیال آیا اُداس اور افسردہ ستارے چاند کی خوبصورتی پر ضرور رشک کرتے ہوں گے.

کسی نے قریب آکر کہا "سر! کافی" مجھے یاد آگیا. میں نے اسٹورڈ سے کافی ڈیک پر لانے کے لئے کہا تھا.... میں نے خاموشی سے پیالی اپنے ہاتھ میں لے لی.

چاند اور چاندنی.... خنک ہوا اور سمندر...... کافی اور میں.... میں کھو گیا، بہک گیا، کالے آکاش میں زرد چاند کی زرد بیمار پھیکی چاندنی میں جسم میں پھیلتے ہوئے کافی کے سرور نے مجھ سے کہا "تو اکیلا" "ہے تو اکیلا ہے"

مجھے تنہائی کا احساس ہوا. اور پھر میری سوچ نے میرے احساس تنہائی کو اور بھی چمکا دیا.

رسیلے جرائم کی خوشبو
مرے ذہن میں آرہی ہے
رسیلے جرائم کی خوشبو
مجھے جدا احساس سے دور لے جارہی ہے
مرے دل کو بہکا رہی ہے
مرے ذہن میں آرہی ہے
رسیلے جرائم کی خوشبو

اور میں اس رات کالے آکاش تلے کالے سمندر کے سفید جھاگ میں بہتے ہوئے جہاز پر کسی ان دیکھی جل پری کا انتظار کرنے لگا. ... بہت رات بیت گئی، کسی بھی جل پری نے سمندر کی لہروں سے نکل کر میرے ذہن میں آنے والی اور میرے دل کو بہکانے والی، رسیلے جرائم کی خوشبو کی تکمیل نہیں کی...... نیند آگئی.... جل پری نہیں آئی.

جب نیند میرے بیحد قریب آگئی اب میں مدہوش سا اٹھا اور نیچے اپنے کیبن میں چلا آیا۔ شب خوابی کا لباس پہنتے ہوئے میں نے گھڑی دیکھی، ایک بج چکا تھا۔ میں برتھ پر لیٹ گیا۔ نیند کے سمندر میں تیرنے والی جل پری نے مجھے کب ہم آغوش کیا۔ مجھے نہیں معلوم!

میں دیر تک سمندر کی لہروں سے کھیلتا رہا۔ کبھی پانی کی سطح پہ بھاگتا۔ کبھی دونوں ہاتھوں میں پانی لے کر اُسے اچھالتا۔ اور جب تھک جاتا تو لیٹ جاتا۔ . . . پھر کتنی ہی جل پریاں آگئیں۔ خوبصورت اور دلفریب ہم آنکھ مچولی کھیلنے لگے۔ چاند اپنی چاندنی سمیت ہمارے قریب اتر آیا تھا کہ یکایک مشرق کی جانب سے اک شور سا اٹھا۔ ہم سب نے گھبرا کر اُس طرف دیکھا، اُفق کے قریب ہر طرف خون بکھرا پڑا تھا. . . . . . سب جل پریوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ چاند بھی اپنی چاندنی سمیت بھاگ کھڑا ہوا۔ مجھے ایک بھاگتی ہوئی جل پری نے جلدی جلدی بتایا "یہ خون جل پریوں کا ہے جو افق کے قریب رہتی ہیں۔ اور جب ظالم سورج دیوتا کی سواری نکلتی ہے تو وہ ہر اس چیز کو نیست و نابود کر دیتا ہے جو ذرا بھی غفلت سے اس کے راستے میں حائل ہو جائے۔ شاید یہ جل پریاں کھیل میں بری طرح مشغول ہوں گی. . . . . میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ ہر طرف شور مچ رہا تھا. . . . . . . سورج دیوتا آگیا. . . . . صبح ہو گئی. . . . . بھاگو. . . . . " چیخیں شدت اختیار کر گئیں۔ گھبرا کر میری آنکھ کھل گئی۔

واقعی صبح ہر طرف پھیل چکی تھی اور ایک ننھی سی صاف شفاف کرن میرے چہرے پہ سوئیاں سی چبھونے لگی۔ میں نے مسکراتے ہوئے سوچا یہ مجھ سے بھی جل پریوں ایسا برتاؤ کرنا چاہتی ہے پاگل!

کمزور جل پریاں اور ظالم سورج اور کمزور جل پریاں" خواب بھی ہے اور حقیقت بھی ہے۔

کیبن کا دروازہ آہستہ سے کھلا. . . سویپر اندر داخل ہوا اور دھیرے دھیرے کیبن صاف کرنے لگا پھر لوگوں کی ہلکی ہلکی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ بھاری پتلی، لفنگی و پیاری. . . پھر بریک فاسٹ کی گھنٹی بجی. . . آوازوں کا بڑھتا طوفان دھیرے دھیرے تھمتا چلا گیا۔ میں اٹھ کر باتھ روم چلا گیا۔ میرے واپس آتے آتے سویپر جا چکا تھا۔ اور کیبن اپنی صفائی کا اظہار کر رہا تھا۔

میں ڈائننگ ہال میں جانے کے لئے جب کوریڈور میں دائیں طرف مڑا۔ تو اچانک کسی سے ٹکر ہوتے ہوتے بچی۔ میں نے اپنے خیال سے چونک کر اُسے دیکھا. . . . . . وہ ایک مشرقی لڑکی تھی. . . . . اس نے جلدی سے "سوری" کہا اور چلی گئی. . . . . رسیلے جرائم کی خوشبو آہستہ آہستہ میرے ذہن میں اُبھر آئی۔ اور میرے دل کو بہکانے لگی۔ میں نے کہا "شاید تری جل پری مشرق کے سمندر کی لہروں سے نکل آئی ہے"! اور مجھے خوشی کے جال نے جکڑ لیا۔ یورپ کے سمندروں میں کسی مشرقی لڑکی کے قریب ہونے کا احساس بڑا دلفریب ہوتا ہے۔

جب میں ڈائننگ ہال میں داخل ہوا تو کئی اجنبی نظروں نے اٹھ کر مجھے دیکھا۔ میں گھبرا کر دروازے کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا. . . . . ناشتہ آگیا. . . میں چائے کی پیالی اپنے ہونٹوں سے لگانے ہی والا تھا کہ. . . اچانک میری نظر ہال کے بالکل اُس طرف چلی گئی، میری پیالی واپس پرچ میں آگئی. . . . . سامنے وہی لڑکی بیٹھی تھی ہلکے نیلے رنگ کا فراک پہنے. . . سمندر کی نیلی لہروں سے ایک جل پری ابھر رہی تھی۔ وہ اکیلی نہیں تھی۔ میز کے اردگرد اس کے ساتھ کچھ اور لوگ بیٹھے تھے۔ ایک کم سن لڑکا اور ایک ادھیڑ عمر کا جوڑا۔ میں نے سوچا غالباً یہ اس کے والدین ہیں وہ تمام وقت اُسی بچے سے محو گفتگو رہی پھر وہ سب اٹھ کر سامنے والے دروازے سے باہر چلے گئے۔ اس لڑکی نے شاید مجھے نہیں دیکھا تھا۔

میں نے جلدی سے ناشتہ ختم کیا اور اسی دروازے سے باہر آگیا۔ وہ لوگ مجھے کہیں دکھائی نہیں دیئے۔ میں نے سگریٹ سلگایا۔ اور ریلنگ کے ساتھ جا کھڑا ہوا. . . . سامنے دور تک نیلا پانی کسی نیلگوں لاش کی مانند خاموش پڑا تھا میں بھی خاموشی سے اُسے تکنے لگا مجھے خیال آیا ہماری زندگی بھی بالکل اسی سمندر کی طرح ہے۔ اور ہمیں بھی اس جہاز کی مانند منزل مقصود تک پہنچنا ہے۔ راستے میں طوفان بھی آتے ہیں۔ پانی کی تہہ میں چھپی ہوئی چٹانیں بھی ملتی ہیں۔ اور. . . یکایک میری انگلیوں کو تیز آنچ محسوس ہوئی۔ گھبرا کر میں نے اپنی انگلیاں پھیلا دیں۔ سگریٹ تیزی سے نیچے سمندر کی ڈوبتی ابھرتی لہروں میں جا گرا۔ میں جھک کر اُسی سگریٹ کو دیکھنے لگا۔ پھر ایک دم مجھے خیال آیا کہ

یہ ریلنگ ٹوٹ جائے تو؟ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ اور میں گھبرا کر ڈر کر پیچھے ہٹ گیا۔ اور تیز تیز دھڑکتے دل کے ساتھ لائبریری کی طرف چل دیا۔

... وہ لائبریری میں تھی..... اُس نے نگاہ اٹھائی مجھے دیکھا اور پھر بے پروائی سے کوئی تازہ شمارہ دیکھنے میں مشغول ہوگئی۔ میں اُس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔ اور ریڈرز ڈائجسٹ کا پرانا شمارہ دیکھنے لگا۔ میرا تمام تر خیال اسی لڑکی کی طرف تھا۔ میں نے کئی دفعہ چور آنکھوں سے اُسے دیکھا۔ لیکن وہ رسالہ دیکھنے ہی میں مصروف رہی۔ مجھے خیال آیا۔ بڑی خود پسند اور بد دماغ لڑکی ہے۔ اور میں نے اٹھنے کا ارادہ کرلیا۔ لیکن جب میں اٹھنے ہی لگا تھا۔ تو میں نے پھر چور آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اور سامنے دو گھبرائی گھبرائی چور نظریں جلدی سے پھر رسالے پر پلٹ گئیں۔

... امید کی ایک لہر، ساحل پر بڑھتی ہوئی اور پھیلتی ہوئی لہروں کی طرح دل کے وسیع ساحل کی طرف سرکنے لگی ... لیکن وہ جلدی ہی اٹھ کر چل دی۔ اس کی چوری جو پکڑی جا چکی تھی۔

شام کو میں اپنے کیبن سے نکل کر اُسے تلاش کرتا رہا۔ لیکن وہ مجھے کہیں نظر نہ آئی۔ رات کو ڈائننگ ہال میں بھی وہ نظر نہ آئی۔ دوسرے دن مجھے سی سکنس (SEA SICKNESS) شروع ہوگئی۔ پھر آہستہ آہستہ میری طبیعت سنبھلنے لگی۔ میں اس دوران بالکل اکیلا تھا۔ میں لڑکی کے خیالوں کے بجرے میں بیٹھ کر، بہتی ہوئی میرے دل کے افسردہ ساحل پر اتر آتی۔ مجھ سے باتیں کرتی۔ میرا دل بہلاتی۔ کتنے ہی دن میرے کیبن کی ویران اور اُداس خاموشی میں ڈوب گئے۔ میں اپنے کیبن سے باہر نہ نکلا تھا۔ نیلے سمندر اور سفید جھاگ کو میری آنکھوں نے نہیں دیکھا تھا۔ اور میری نگاہوں نے تو بلند نیلے اور صاف شفاف آسمان کو بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ تو ایک چھوٹے سے کیبن میں قید ہو کر رہ گئی تھیں۔ اور قید خانہ کس قدر برا ہوتا ہے!... میری نگاہیں آزاد ہونے کے لئے بے حد بے قرار تھیں۔ وہ پرواز چاہتی تھیں۔ آسمان کی وسعتوں میں بجلی کی سی تیزی سے اڑنا چاہتی تھیں۔ میں نے کہا۔ ٹھہرو میری نگاہو! ابھی مجھ میں طاقت نہیں ہے۔

ایک روز جب میں اپنے آپ کو پہلا سا تندرست محسوس کرنے لگا۔ تو میں سوئمنگ پول کی طرف چل دیا۔ ڈریسنگ روم سے بیدنگ کوسٹیوم پہن کر باہر نکلا تو دیکھا وہی ننھا بچہ جو اس لڑکی کے ساتھ رہتا تھا۔ تالاب کے کنارے کھڑا ہے اور اپنے سے بڑی عمر کے بچوں کو تیرتے ہوئے بڑی حسرت سے تک رہا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا "کیا تم تیرنا نہیں جانتے" اس نے حیرانی سے میری طرف دیکھا۔ اور انکار میں سر ہلا دیا۔ میں نے کہا "آؤ میں تمہیں سکھاؤں" وہ فوراً تیار ہوگیا۔ جب وہ تھک گیا تو ہم تالاب سے متصل بار میں چلے گئے۔ وہاں میں نے اُس لڑکی سے متعلق تھوڑی بہت معلومات حاصل کرلیں۔ وہ بچہ جس کا نام راجندر شیام تھا اس لڑکی کا چچیرا بھائی تھا۔ اور وہ ادھیڑ عمر کا جوڑا راجندر کے والدین تھے۔ راجندر نے مجھے بتایا تھا کہ اُس لڑکی کا نام نرملا ہے نرملا کے والدین نہیں تھے.......... ان لوگوں کو بمبئی تک جانا تھا.......... اس کی بڑی بڑی آنکھیں اداس رہتی تھیں..... افسردگی اور ویرانی اس پر پیپل کی چھاؤں کی طرح پھیلی رہتی۔ یہ افسردگی اس میں چہچہاہٹ کا جذبہ لے آئی تھی یا نفرت کا یا وقار کا؟ میں نہیں سمجھ سکا!

کتنی ہی دفعہ یہ سوال میرے دماغ کے ریگستان میں ایک طوفانی ہوا کی طرح آیا۔ نرملا۔ اتنی اداس کیوں رہتی ہے؟ لیکن میں ہر دفعہ اس کا جواب دینے سے قاصر رہتا ہے۔

رسیلے جرائم کی جنون انگیز سرگوشیوں سے تنگ آکر آخر میں نے سوچ ہی لیا کہ آج میں اس سے ضرور اپنے دل کا حال بیان کروں گا میں اس سے کہوں گا کہ میں تمہاری ویران اور اداس آنکھوں کے ریگستانوں کو ایک خوب صورت نخلستان میں بدل دینا چاہتا ہوں تمہارے جسم کے مرجھائے ہوئے خطوط کے پھولوں میں زندگی کا گرم خون دوڑا دینا چاہتا ہوں۔

لائبریری کے سامنے کوریڈور میں وہ تیزی سے آرہی تھی۔ لیکن اس کی اُداسی جو شاید چڑچڑاہٹ کا جذبہ لے آئی تھی یا نفرت یا وقار کا میرا راستہ روک رہی تھی۔ لیکن جب وہ میرے بے حد قریب آگئی تو میں نے ہمت کر کے کہہ ہی دیا "ذرا سنئیے مس زملا" وہ ذرا چونکی۔ اس نے اپنی ویران خوبصورت نگاہیں اٹھائیں اور مجھے ایک نظر دیکھا۔ اور ایک لمحہ کچھ سوچنے کے بعد یہ کہہ کر بے رُخی سے گزر گئی "معاف کیجئے گا، مجھے ضروری کام ہے۔ انکل میرا انتظار کر رہے ہیں"

یہ جملہ اس نے خالص گجراتی لہجے میں کہا تھا۔ مجھے بہت بُرا محسوس ہوا۔ یہ یقیناً مجھ میں بسنے والے خوددار انسان کی بے عزتی تھی۔ ..... مجھے بڑی مایوسی ہوئی ...... میں نے فوراً ایک فیصلہ کیا..... اور پھر میں نے رفتہ رفتہ اُس میں دلچسپی لینا کم کر دی۔ اور میں خوابی سحر سے باہر نکلتا گیا۔

ان دنوں جہاز سوئیز سے پاس ہو رہا تھا..... میں ریلنگ سے ٹیک لگائے کلوپیٹرا کے ملک کو دیکھ رہا تھا.... کلوپیٹرا اور حُسن..... اور میری آنکھیں حُسن کی متلاشی تھیں۔ لیکن مجھے ویران اور اداس کھجوروں کے درختوں کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا "حُسن کہاں ہے؟"..... کلوپیٹرا کا حسن کہاں ہے؟..... "ٹھہرو۔ میں تمہیں بتاتا ہوں!" اس آواز نے مجھے چونکا دیا۔ یہ آواز ایک لمبے درخت کی آواز تھی۔ کلوپیٹرا کا حُسن!.... خون جیسے سُرخ چہروں والے خونی لوگ اُس کے حُسن کا ایک ایک قطرہ تک نچوڑ کر لے گئے ہیں۔ اب یہاں صرف نڈھال اور نیم مردہ، کلوپیٹرا ہے جس کا سارا حُسن جس کی ساری دولت جس کی بھرپور جوانی ختم ہو چکی ہے۔ جس کا پہلا محبوب بے وفا نکلا جس نے اپنے مقاصد کے لئے اپنے محبوب کی ساری جوانی بیچ دی۔ سارا حسن بیچ ڈالا...... اب وہ دوسرے باوفا محبوب کا انتظار کر رہی ہے شاید وہ آگیا ہے...... انٹونی!..... کسی ناصر کے روپ میں۔ پھر وہ درخت خاموش ہو گیا... ... مجھے اپنے سوال کا جواب مل چکا تھا۔ مجھے اُس کے بے فا محبوب سے نفرت ہو گئی.... میں نے کہا "کلوپیٹرا کی یہ ویرانی اور اُداسی مجھ سے نہیں دیکھی جاتی۔ میں نہیں دیکھوں گا" اور میں اپنے کیبن میں چلا آیا۔ برتھ پر لیٹتے ہی میری آنکھ لگ گئی۔

شام کے وقت میں ڈیک پر چلا آیا۔ ڈیک پر کافی چہل پہل تھی۔ جہاز نہر کی تنگ فضا سے سمندر کی بیکراں وسعت میں کود چکا تھا۔

میں سب سے الگ کھڑا اپنے سگریٹ کے ہوا میں تحلیل ہونے ہوئے دھوئیں میں سے شام کے ڈوبتے سورج کو دیکھ رہا تھا۔ کہ اتنے میں کوئی میرے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ میں نے گھوم کر دیکھا۔ کوئی اینگلو انڈین معلوم ہوا۔ پھر اُس نے مسکراتے ہوئے مجھ سے ماچس کا تقاضا کیا۔ میں نے اپنا سگریٹ لائٹر آگے بڑھا دیا۔ اُس نے سگریٹ سلگاتے ہوئے اپنا تعارف کرایا "مجھے ولیم گرے کہتے ہیں۔ بومبے تک جا رہا ہوں۔

میں نے کہا "میرا نام شاہد ہے مجھے کراچی جانا ہے۔ مجھے آپ سے مل کر بڑی مسرت ہوئی"

"شکریہ، شکریہ"

وہ جلدی ہی مجھ سے بے تکلف ہو گیا۔ اور پھر بڑے مزے سے اپنا رومان سنانے لگا۔

اتنے میں رات کے کھانے کی بیل بجی، میں نے کہا "میں ابھی اپنے کیبن سے ہو کر آتا ہوں۔ وہ مسکراتے ہوئے چلا گیا۔

جب میں ڈائننگ ہال میں پہنچا۔ تو کھانا شروع ہو چکا تھا۔ ولیم سامنے ہی میز پر بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ دل کش اور بھرے بھرے گداز جسم والی لڑکی بیٹھی کھانا کھا رہی تھی۔ میں نے سوچا "بڑی مزیدار بیوی پائی ہے" ولیم نے مجھے دیکھتے ہی اپنی ٹیبل پر مجھے بلا لیا۔ اور میرا تعارف اُس دل کش لڑکی سے کروایا "یہ ہیں میری بہن ریٹا گرے.... ان سے ملو یہ ہیں شاہد۔ میرے اچھے دوست" ریٹا نے

بڑے پُر تکلف انداز میں اپنی خوبصورت گردن میں ہلکا سا خم پیدا کیا اور کہنے لگی "مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی" میں نے کہا "مجھے بھی بے انتہا خوشی حاصل ہوئی"........ کھانا پھر شروع ہو گیا۔

تو یہ صاحبہ ان کی بہن ہیں" میں نے سوچا........ ریٹا بالکل اپنے بھائی کی طرح بے تکلف ثابت ہوئی پُر لطف باتیں ہونے لگیں....

اچانک میری نظر بائیں جانب اٹھ گئی، ہم سے تھوڑی دور، نرملا بیٹھی تھی۔ وہ ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔ اپنی اداس آنکھوں کے ساتھ۔ میں نے اور بھی بے تکلفی کے ساتھ ریٹا سے باتیں شروع کر دیں..... ہم جب ڈائننگ ہال سے باہر نکل رہے تھے، تب بھی وہ ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔

..... اس رات مجھے ریٹا کے خواب آتے رہے اس کے خوبصورت جسم، اور دل کش بالوں اور دلفریب اداؤں کے خواب آتے رہے۔ اس کے شہ پاش لبوں اور جنوں انگیز آنکھوں کے خواب آتے رہے.....

اب میں زیادہ سے زیادہ دیر کے لئے ریٹا کے قریب رہنے کی کوشش کرنے لگا۔ ہم تینوں بریک فاسٹ کے بعد کچھ دیر باتیں کرتے پھر سوئمنگ پول چلے جاتے۔ جب تھک جاتے تو متصل بار میں ڈرنکس سے لطف اٹھاتے۔ لنچ کے بعد تھوڑا آرام کرتے۔ پھر شام کی چائے پیتے اور رات گئے تک اکٹھے رہتے۔ دن گزر جاتا۔ اور رات آجاتی قہقہوں اور خوشبوؤں کے درمیان۔

پھر مجھے محسوس ہونے لگا۔ ریٹا مجھ میں کچھ دلچسپی لینے لگی ہے۔ وہ ہر بات میں میری طرف داری کرتی۔ اس کی اداؤں میں ایک بلاوا سا ہوتا۔ اس کے سرخ بھرے بھرے ہونٹ ہر وقت تھرکتے سے نظر آتے۔ ایسا محسوس ہوتا۔ وہ ہونٹ بے چین ہیں، اور پریشان ہیں۔ جیسے وہ سکون چاہتے ہوں۔

ایک رات کھانے کے درمیان ولیم نے کہا "آج ہم ڈیک پر چاندنی کا لطف نہیں اٹھا سکیں گے۔ کیونکہ میری طبیعت کچھ ناساز ہے۔"

"تم کو آرام کرنا چاہیئے۔ ولیم" میں نے جواب دیا۔ کھانے کے بعد میں اوپر ڈیک پر چلا آیا۔ اکیلا۔ تنہا۔ ریٹا اپنے بھائی کے ساتھ چلی گئی۔

اوپر ڈیک پر آج خلاف معمول چاندنی کمزور تھی۔ اور چاند سفید تھا۔ ہوا تیز تھی۔ اور میں تنہا تھا۔ تنہائی کے سناٹے میں میرا دم گھٹنے لگا۔ میں نے سوچا "کاش۔ ریٹا آجاتی" کافی دیر بعد جب میں جانے کے لئے مڑا ہی تھا۔ کہ میں نے دیکھا۔ ریٹا آرہی ہے۔ وہ اکیلی تھی۔ اس کی چال میں کچھ ہلکی ہلکی سی لڑکھڑاہٹ تھی۔ میرے قدم رک گئے۔ وہ میرے بے حد قریب آگئی۔

"دیکھو میں آگئی ہوں، تم اکیلے جو تھے نا" اس کی زبان میں لڑکھڑاہٹ تھی۔

"تم بہت اچھی ہو"

"سچ"

"میں سچ کہہ رہا ہوں ریٹا..... پھر خاموشی چھا گئی۔ وہ میرے اور قریب آگئی۔ ہوا تیز تھی۔ چاندنی کمزور تھی۔ اور ہم خاموش تھے۔

"شاہد" جذبات سے بھرپور ایک بہت ہلکی آواز تھرائی.....!

"ہاں" دوسری آواز نے جواب دیا۔ بہت آہستہ..... "مجھے کیا ہو گیا ہے"؟ ایک سرگوشی ابھری

"مجھے کیا ہو گیا ہے"؟ ایک سرگوشی ابھری

میں نے بڑھ کر اس کے ابلتے ہوئے جسم کو سہارا دیا۔

"میں تمہیں بے حد، بے حد چاہتا ہوں ریٹا" میں نے سرگوشی کی....."

شاید ہوا رک گئی۔ اور شاید چاندنی چلی گئی۔ اور خاموشی گہری ہو گئی.....!

میں بستر پر لیٹا تھا۔ اور نیند مجھ سے کوسوں دور تھی۔ بہت رات جا چکی تھی۔ لیکن مجھے اس کے جسم کی حدت اور جلتے ہوئے ہونٹوں کی

تپش ابھی تک محسوس ہو رہی تھی۔

میرے بازو مدہوش تھے۔ اور میرے لب مدہوش تھے۔ اور میرا تمام جسم مدہوش سا تھا۔ میں نے سوچا کہ ریٹا کے بے قرار لبوں کو سکون مل چکا ہوگا۔ شاید وہ سو چکی ہوگی۔ پھر اچانک نرملا کا خیال ابھرا اور پھر ڈوب گیا۔

نرملا صحرا تھی، ویرانہ تھی۔ اور افسردگی تھی۔ لیکن ریٹا نخلستان تھی، پیاس بجھانے والا جھرنا تھی۔ اور مسرت تھی۔ اور میں ریٹا کے حسین اور گداز اور مدہوش کر دینے والے خیال کو سینے سے لگا کر سو گیا۔

دوسرے دن ابھی میری آنکھ بھی نہیں کھلی تھی کہ ریٹا آ گئی۔ اپنے ساتھ خوشبوؤں اور اداؤں کا طوفان لے کر میں نے کہا "ولیم کہاں ہے؟"

"ولیم کی طبیعت خراب ہے۔ اور اس نے اپنا ناشتہ کیبن ہی میں منگوا لیا ہے۔ میں نے ابھی ناشتہ نہیں کیا ہے۔ تمہیں لینے آئی ہوں۔"

ریٹا نے جواب دیا۔

ڈائننگ ہال میں آج بڑی اداس آنکھوں والی ...... افسردہ نرملا نہ تھی۔ دم بھر کے لئے میں نے سوچا اُسے کیا ہوا ..... لیکن میرے ساتھ دل کش ریٹا تھی۔ اور مجھ کسی دوسرے کے متعلق سوچنے کی فرصت نہیں تھی۔

جب ہم لائبریری میں چلے گئے۔ وہاں نرملا ایک کرسی پر بیٹھی۔ اپنی آنکھوں کو زمین پر گرائے کچھ سوچ رہی تھی۔ میں نے ریٹا کی بات پر قہقہہ لگایا۔ نرملا چونکی اُس نے ایک بہت ہی اداس نظر مجھ پر ڈالی۔ اور ہم گذر گئے۔

اس طرح وہ مجھے کئی بار نظر آئی۔ اس کی ویران اور اداس آنکھیں ایک لمحے کے لئے اٹھتیں۔ جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ اور پھر جھک جائیں۔ ریٹا اور میرے قہقہے دیر تک اس کا پیچھا کرتے۔ اور اس کے چہرے پر ایک کرب کے آثار جھلکنے لگتے۔" اونہہ بڑا نخرہ دکھاتی تھی" میں سوچتا۔

جیسے جیسے ریٹا میرے قریب آتی جا رہی تھی۔ ویسے ہی میرا ساحل بھی قریب آتا جا رہا تھا۔ اور میں سوچتا...... کاش میرا ساحل کبھی نہ آئے۔ اور ریٹا اور میں اسی طرح پانی کی نیلی سطح پر ایک دوسرے سے بے حد قریب بہتے رہیں....... بہتے رہیں۔ اور پھر زندگی ختم ہو جائے مجھے معلوم تھا۔ کراچی کا ساحل ضرور آئے گا۔ میری زندگی میری خواہش کے مطابق ختم نہیں ہوگی۔ لیکن میں پھر بھی اسی طرح سوچتا......

اور میرے سوچتے سوچتے میرا ساحل آ گیا۔ اس روز جہاز کو شام چار بجے کے قریب بندرگاہ میں داخل ہونا تھا۔ اسی روز میں تمام دن اپنا سامان وغیرہ ٹھیک کرتا رہا سوٹ کیس میں کپڑے کو ترتیب سے رکھتے وقت مجھے ایک میلا سا لفافہ نظر آیا۔ میں نے لفافہ اٹھایا۔ تحریر دیکھتے ہی پہچان گیا۔ ارے یہ تو پروین ہے۔ میرا دل ایک دم خوشی سے بھر گیا۔ میری پروین نہ جانے اب وہ کتنی بدل گئی ہوگی۔ میں نے جلدی سے خط نکالا۔

> صرف میرے شاہد!..... دیکھو نا میں ہر روز تمہارا انتظار کرتی ہوں۔ لیکن تم نہیں آئے۔ آج کل یہاں چاندراتیں پورے جوبن پر ہیں۔ لیکن میرا دل اداس ہے۔ جب تم آ جاؤ گے تو اندھیری راتیں بھی میرے لئے چاند راتوں سے کم حسین نہ ہوں گی۔ تمہارا انتظار کتنا طویل ہے، لیکن مجھے کتنا عزیز ہے، دیکھو اب زیادہ نہ ترساؤ.....
>
> تمہاری... تمہاری ... پروین

مجھے یاد آ گیا۔ پروین کا یہ خط مجھے کوئی پانچ ماہ پہلے ملا تھا۔ جب میں لندن میں تھا۔ اپنی تعلیم ختم کر کے یورپ کی سیاحت کرتا ہوا واپس لوٹ رہا تھا۔ اس وقت میں نے اس خط کو زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ دراصل لندن کی بھیگی ہوئی خوبصورت اور سرد شامیں، نرم اور گداز مدہوش کر دینے والی، گرم آغوشیں، سات سمندر پار سے آنے والی آواز کو سننے نہیں دیتیں۔ میں مجبور تھا۔ میں کیا کرتا.....

جن دنوں میں وہاں تھا۔ وہ شامیں بھی بھیگی ہوئی تھیں۔ اور سرد تھیں۔ اور کئی نرم اور گداز آغوشیں وا تھیں سات سمندر پار سے آنے والی

از مدھم پڑھتے پڑھتے خاموش ہوگئی تھی...... اور آج جب کہ میں واپس آرہا ہوں۔ اُسی خطِ استوا کے قریب جہاں دن طویل گرم اور خشک
تے ہیں۔ اور راتیں بالکل اداس اور ویران، جہاں سائے کی تلاش میں بھاگنا پڑتا ہے۔ میں اب بھی مجبور ہوں۔ میں نے سوچا مجھے پروین
زلفوں کا سایہ چاہیئے۔ کیونکہ خطِ استوا کے قریب دن بڑے گرم اور خشک ہوتے ہیں...... اور اب وہ مجھے اپنی ننھی سی دنیا میں سمانے کے لئے
را انتظار کر رہی ہے۔ مجھے خوشی کیوں نہ محسوس ہو......

اتنے میں ریٹا اور ولیم آگئے۔ میں نے وہ خط اپنی جیب میں ڈال لیا۔ ریٹا میرے ساتھ سامان وغیرہ ٹھیک کروانے میں مدد کرنے لگی۔
میں دیکھ رہا تھا ریٹا اُس دن اداس تھی۔ بہت اداس، میرا خیال پروین کی طرف تھا۔ اور نظریں ریٹا کو اداس دیکھ کر دل کو اداس
رہی تھیں۔ کتنے دن اچھے گذارے تھے۔ میں نے ریٹا کے ساتھ۔ میں نے سوچا۔

پھر آخری بار، ہم نے اُسی میز کے گرد بیٹھ کر دوپہر کا کھانا کھایا۔ جہاں ریٹا مجھے ملی تھی۔ ہم سب اداس تھے...
ہم سے کچھ دور نرملا بھی بیٹھی تھی۔ میں نے محسوس کیا اس کی نظریں بار بار میری طرف دوڑ اٹھتی ہیں۔ میں نے سوچا آج میں جا رہا ہوں
وداع ہی کہہ دوں۔ لیکن مجھے اُس کی بے رخی اب تک یاد تھی۔ اور مجھ میں بسنے والے خود دار شاہد نے کہا "نہیں"
جب ہم ڈائننگ ہال سے اٹھ کر باہر آئے تو مجھے راجندر ملا۔ میں نے اُسے بتایا کہ میرا ساحل آگیا ہے۔ راجندر جب بھی مجھ سے ملتا تھا۔ میں
سے ٹافی دے کر دیا تھا۔ بڑا پیارا بچہ تھا!

کوئی چار بجے کے قریب جہاز کراچی پورٹ میں داخل ہوگیا۔ میرا دل پروین کو دیکھنے کے لئے بے چین تھا۔ جہاز کو برتھ نمبر ۱۴ پر لگنا تھا۔
ب جہاز قریب آگیا تو میں نے دوربین سے دیکھ لیا۔ ڈیڈی، بے بی نشاط، احسن اور پروین سب جہاز کی طرف دیکھ رہے تھے، پروین کی بے
ین اور منتظر نگاہیں مجھے پالینا چاہتی تھیں۔

مجھے ایک ناول کا اختتام یاد آگیا۔

سمندر کی رحم دل لہریں اس کو آہستہ آہستہ اُس ساحل کی طرف کھینچ لائیں جہاں اس کی محبوبہ، جس کی آنکھیں پتھرا
گئی تھیں، برسوں سے اُس کا انتظار کر رہی تھی، ساحلی لہروں نے کہا "تمہارا محبوب آگیا...... تمہارا محبوب آگیا" اور
اس کے منجمد جسم میں حرکت پیدا ہوگئی۔ اور وہ اپنے محبوب سے ایک چیخ کے ساتھ لپٹ گئی......

محبوب کی آنکھوں میں آنسو آگئے...... ....

میں نے سوچا مجھے بھی سمندر کی لہریں اسی ساحل کی طرف لے آئی ہیں۔ جہاں میری محبوبہ میرا انتظار کر رہی ہے۔

لیکن میری آنکھوں میں آنسو کیوں نہیں آئے؟

جہاز برتھ کے ساتھ لگ گیا۔ ان لوگوں کی بے چین نگاہوں نے مجھے ڈھونڈ لیا۔ وہ سب خوشی سے بے اختیار ہوگئے۔ اور ان کے
چہرے مسکرا اُٹھے۔ وہ زور زور سے ہاتھ ہلانے لگے۔ میرا ہاتھ بھی بے اختیار ہوا میں لہرا اُٹھا "میں آگیا ہوں پروین میں آگیا ہوں" میرے
دل نے کہا۔

گینگ وے لگ گیا، میں نے ولیم اور ریٹا سے ہاتھ ملایا۔ ریٹا کے ہاتھ کانپ رہے تھے مجھے بھی اُس سے بچھڑنے کا افسوس
تھا۔ میں نے کہا "میں تم لوگوں کو کبھی نہیں بھول سکتا"۔ میرا دل واقعی ایک دم اداس ہوگیا۔

ریٹا نے کہا "میں تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گی"

ولیم نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا "لیکن میں تمہیں جلد ہی بھول جاؤں گا"

ہم تینوں زبردستی مسکرا دیئے۔

پھر میں دوبارہ ہاتھ ملا کر گینگ وے کی طرف چل پڑا..... گینگ وے کے قریب نرملا کھڑی تھی۔ میرے قدم رک گئے۔ لیکن جب میں اس کے قریب سے گزرنے لگا۔ تو اس نے بالکل اچانک کہا "آپ جا رہے ہیں"؟

"شریمتی جی آپ کو کوئی اعتراض؟" میں نے بے رخی سے کہا.....!

"کیا آپ تھوڑی دیر کے لئے رک سکتے ہیں۔ ایک لمحے کے لئے"

معاف کیجئے گا میری منگیتر نیچے بے تابی سے میرا انتظار کر رہی ہے۔ اس نے اداس اور مرجھائی ہوئی نظروں سے۔ بہت ہی گہری نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں نیچے چلا آیا۔

ڈیڈی، اور احسن وغیرہ سے بغل گیر ہونے کے بعد میں پروین کی طرف بڑھا جو ان سب سے پیچھے کھڑی تھی۔ میں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ اس نے بھی شرماتے، لجاتے ہاتھ بڑھا دیا۔ ہاتھ ملاتے ہوئے میں نے آہستہ سے کہا "اُف کس قدر خوبصورت ہو گئی ہو"

جائیے بھی!... وہ حیا سے سرخ ہو گئی۔

جب ہم سب لوگ کار میں بیٹھ گئے تو میں نے آخری بار جہاز پر نگاہ دوڑائی۔ جہاں ولیم اور ریٹا کھڑے تھے انہوں نے ہاتھ ہوا میں لہرا کر مجھے الوداع کہا۔ پھر میری نظر خود بخود گینگ وے کے قریب چلی گئی...... وہاں نرملا اب تک کھڑی تھی۔ ہماری نظریں ٹکرائیں...... مجھے بے حد شدت سے محسوس ہوا۔ اس کی آنکھوں میں ایک پیام تھا۔ ایک محبت تھی ایک بلاوا تھا...... اور آنسو۔

کار ایک جھٹکے کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔

اور پھر میں نے اس پیام کو۔ اس محبت کو اس بلاوے کو سمیٹ کر تیز دوڑتی ہوئی کار کی کھڑکی سے باہر پھینک دیا کیونکہ میری پروین میرے ساتھ تھی...... اور دُور پیچھے...... شاید چند آنسو سمندر کے نمکین اور گہرے پانی میں گر کر کھو گئے ہوں گے۔

فکر و تجسس، رنگ و آہنگ اور اظہار و بیان کی ایک عمدہ مثال

ناصر شہزاد کی منوہر غزلوں اور مدھر گیتوں کا مجموعہ

چاندی کی پتیاں

جدید اُردو ٹائپ میں خوبصورت اور موٹے کاغذ پر ـــــ قیمت پانچ روپے۔

مکتبہ ادب جدید۔ ۱۵۔ پٹیالہ گراؤنڈ۔ میکلوڈ روڈ۔ لاہور

مانک ٹالہ

شمع ـــــ دہلی

؟

شانتا گدر سے اپنی بوڑھی ماں کے ساتھ کھولی نمبر پندرہ میں آکر رہنے لگی تو ایک خاموش طوفان نے ساری چال کو اپنی لپیٹ میں لے لیا
شانتا ایک فلم ایکسٹرا تھی۔ تیکھے نین نقش۔ بڑی بڑی بادام سی آنکھیں، بھرا بھرا گداز جسم، شہابی رنگت اور کمر کو چھوتی ہوئی ابریشمی سنہری زلفیں۔
اس قدر خوبصورت ہونے کے باوجود اس نے اپنے حُسن کی نمائش کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ فلم ایکٹرسوں والی کوئی ادا اس میں نہ تھی۔ گھر سے باہر قدم رکھتی تو اپنے سارے وجود کو ساڑھی میں سمیٹ کر زمین پر نظریں گاڑ کر چلتی۔ لیکن جہاں سے گزر جاتی وہاں ایسا لگتا جیسے اچانک پھول ہی پھول مہک اٹھے ہوں۔
چال کے مردوں کے رنگ ڈھنگ تیزی سے بدلنے لگے ـــ میاں شریف الدین بخاری کی فرنچ کٹ داڑھی کے بال آہستہ آہستہ گھٹنے لگے۔ انہوں نے اپنی اکلوتی آنکھ کو نظر بد سے بچانے کے لئے گاگلز لگا لئے تھے۔ اور شانتا کے آنے کے چند روز بعد پتھر کی آنکھ بھی چشمہ حوالی تاکہ ان کی اکلوتی آنکھ کو نظر بد کا کھٹکا ہی نہ رہے، سردار لہنا سنگھ کرتار پور کا ترکھان تھا اور بمبئی میں لکڑی کے فرنیچر پر رندہ مارتے مارتے قسمت کے رندے کا رگڑا کھا کر لہنا سنگھ اینڈ کمپنی، فرنیچر مارٹ کا مالک بن جانے کے باوجود دھاری دار کپڑے کا پاجامہ پہن کر اپنی "فرنیچر مارٹ" پر جاتا تھا۔ شانتا کے آنے کے بعد اس نے بھی کھدّر زین کی پتلون پہننا شروع کر دی۔ پتلون کے حلقے میں پھنسا ہوا بڑا سا پیٹ یوں نظر آتا جیسے کسی نے دونوں بازوؤں کے درمیان ایک بڑا سا تربوز جکڑ رکھا ہو۔
دتّو دارو والا جو گرٹ برانڈ دارو (شراب) کا دھندا کرتا تھا، اور لال باغ میں کالا چوکی تھانے کے سارے علاقے کا دادا تھا۔ اور جس کے ہاں سے خریدی ہوئی دارو کی بوتل خریدار سرعام لے کر گزر سکتا تھا۔ کیونکہ اس نے پولیس کا ہفتہ باندھ رکھا تھا، اور جو گلے میں ریشمی رومال، دھوتی کے اندر چھرا اور کان کے پیچھے آدھ جلی بیڑی رکھ کر چلتا تھا، اور جس کی آنکھوں سے شکاری کتے کی سی خون خواری ٹپکتی تھی ـــ اس نے بھی گلے میں رومال باندھنا اور کان کے نیچے بیڑا رکھنا چھوڑ دیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خونخواری کی بجائے ملائمت سمٹ آئی تھی اور اس نے دارو کا دھندا چھوڑ کر موٹریں مرمت کرنے کا کام شروع کر دیا تھا۔
رام ناتھ بھاٹیہ میری کھولی کے بالکل سامنے رہتا تھا۔ وہ شادی شدہ تھا۔ عمر ابھی کم تھی۔ بہت تندرست و توانا تھا۔ لیکن تھا بے پروا قسم کا انسان، کئی کئی روز داڑھی نہیں بناتا تھا۔ کپڑے بھی بس تن ڈھانپنے کی خاطر پہنتا تھا۔ حالانکہ وہ چاہتا تو اس کا رہن سہن اچھے ڈھنگ کا ہو سکتا تھا۔ کیونکہ وہ ایک ورک شاپ میں میکینک تھا۔ اور اچھا خاصا کما لیتا تھا۔ لیکن اسے گھر اور گھر والی سے قطعاً کوئی اُنس نہیں تھا۔ صبح کا نکلا رات کو دس گیارہ بجے واپس لوٹتا۔ کھانے کے بعد بیوی سے گالی گلوچ کر کے ہاضمہ درست کرتا اور پھر سو جاتا۔ اس کی کمائی کا بہت سا حصہ دوستوں اور سیر و تفریح کی نذر ہو جاتا۔ اس کی بیوی بھی اچھی خاصی صورت کی، اور صحت مند تھی۔ لیکن اس میں بھی سلیقہ اور صفائی کا فقدان تھا۔ بات بات پر بچوں کی مرمت کر ڈالتی تھی۔ کئی کئی روز نہ کپڑے بدلتی۔ نہ بالوں میں کنگھی کرتی۔ چہرے اور لباس پر کوئلے اور راکھ کے داغ لگے رہتے۔ کھولی میں بھی سامان بے ترتیب بکھرا پڑا رہتا۔

شانتا کے آجانے کے بعد رام ناتھ بھاٹیہ کی وضع قطع میں بھی انقلاب آنے لگا۔ چہرہ ہر روز گلبن شگفتہ ہونے لگا۔ کپڑوں میں صفائی اور نفاست آجانے سے اس کا رنگ روپ اور جوانی اور بھی زیادہ نکھر آئے۔ اب تو گھر سے دیر سے روانہ ہوتا اور ورک شاپ سے چھٹی ہوتے ہی سیدھا گھر لوٹ آتا۔

اور تو اور محبت کے معاملے میں وہ باقی سب کا گرو نکلا۔ دوسروں نے تو سیدھا شانتا کی نظروں میں اترنے کی کوشش کی تھی اور شانتا کو ملتفت کرنے کے لئے طرح طرح کے پاپڑ بیل رہے تھے۔ لیکن اس نے شانتا کے دل میں اترنے کے لئے اس کی بوڑھی ماں سے میل جول بڑھانا شروع کر دیا تھا کبھی نل سے ان کے لئے پانی بھر لاتا۔ کبھی بازار سے سودا سلف لا دیتا، بڑھیا کو "ماں جی ماں جی" کہتے اس کی زبان نہ سوکھتی۔ میٹھی میٹھی باتوں سے اس نے ماں جی کا من موہ لیا تھا۔ ایک دو باتیں شانتا سے بھی ہو جاتی تھیں۔

شانتا کے حسن نے میرے دل کے تاروں کو بھی جھنجھنا دیا تھا۔ میں کنوارا بھی تھا اور جوان بھی۔ صورت شکل بھی دوسروں سے بہتر ہی تھی۔ لیکن میں ٹھہرا سدا کا احدی پسند، عشق بازی کے بکھیڑے مجھ سے کہاں ہوتے۔ بننے سنورنے اور بن سنور کر شانتا کے انتظار میں چال کے اندر اور باہر بے مقصد گھومنے اور عشقیہ شعر گنگنانے اور سرد آہیں بھرنے کے بکھیڑے کون کرتا؟

رام ناتھ بھاٹیہ چونکہ میری کھولی کے عین سامنے رہتا تھا، اس لئے اس نے میرے ساتھ بھی تھوڑی بہت بے تکلفی پیدا کر لی تھی۔ مجھے احساس ہونے لگا کہ آہستہ آہستہ شانتا میں اس کی دلچسپی بڑھنے لگی ہے۔ آخر ایک روز اس نے اعلان کر دیا کہ وہ اب شانتا کے بغیر ایک پل بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ ماں بیٹی پر اپنی شرافت اور ہمدردی کا سکہ وہ جما ہی چکا تھا۔ اب شانتا کے دل میں محبت کی جوت جلانا باقی تھا اور شاید یہی مرحلہ سب سے مشکل تھا۔

ایک روز وہ بہت خوش خوش میرے پاس آیا۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد اس نے بتایا کہ شانتا نے اگلے منگل کو اس سے "دالگا" میں ملنے کا وعدہ کیا ہے۔

"نشتر صاحب! اب تو منزل قریب ہے دعا کیجئے کہ کامیاب ہو جاؤں۔"

"بھاٹیہ صاحب! اس درویش کی تو ہر وقت یہی دعا رہتی ہے کہ خدا آپ کی ہر مراد پوری کرے۔ بس اب ذرا پھونک پھونک کر قدم اٹھائیے۔ ایسا نہ ہو کہ دو چار ہاتھ پہلے ہی کمند ٹوٹ جائے۔" میں نے جواب دیا۔

"جی ہاں۔ جی ہاں۔ بس یہی فکر ہے۔" پھر اس نے اپنے لہجے میں انکساری اور نیازمندی پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "نشتر صاحب بس تھوڑی سی تکلیف میری خاطر کر دیجئے۔ زندگی بھر شکر گزار رہوں گا۔"

"فرمائیے، فرمائیے۔ یہ ناچیز حاضر ہے۔"

"نشتر صاحب! بس آپ سے یہی درخواست ہے کہ آٹھ دس لائن کا ایک پھڑکتا ہوا ڈائیلاگ لکھ دیجئے، جس میں چاہت کی مہک ہو، محبت کی چاشنی ہو، بس کچھ ایسی باتیں ہوں کہ سیدھا اس کے دل میں اتر جاؤں۔ آپ نے تو اپنی کہانیوں میں اس قسم کے سینکڑوں مکالمے لکھے ہوں گے۔ جن سے ہیروئن ایک دم ہیرو پر مرمٹتی ہے۔ بس ایسی ہی کوئی پھڑکتی سی چیز لکھ دیجئے کہ اِدھر میں مکالمہ بولوں اُدھر میری محبت کا تیر شانتا کے دل میں ترازو ہو جائے۔"

قہر درویش برجان درویش! رام ناتھ بھاٹیہ کی خاطر مجھے ایک پھڑکتا ہوا مکالمہ لکھنا ہی پڑا۔ دو ایک روز میں میں نے ایک خوبصورت سی محبت بھری تحریر لکھ کر دی، جسے سن کر شانتا تو کیا آکاش کی اپسرا بھی ہوتی تو وہ زندگی بھر کے لئے اس کی باندی بن جاتی۔ بھاٹیہ کی بھی یہی رائے تھی۔

وہ تحریر اس نے ازبر یاد کی۔ کئی مرتبہ ریہرسل کی۔ لیکن اُسے تسلی نہ ہوئی۔ کہنے لگا "نشتر صاحب! میں نے زندگی بھر کسی لڑکی سے محبت کی گفتگو نہیں کی۔ حتیٰ کہ اپنی بیوی سے بھی نہیں۔ اگر شانتا کے سامنے نروس ہو گیا تو سب بیڑا غرق ہو جائے گا۔ نشتر صاحب اگر کسی لڑکی کے سامنے یہ مکالمہ دہرا لیا جائے تو مجھے تسلی ہو سکتی ہے۔" پھر اس نے اپنے چہرے پر ایسا عجز و انکسار پیدا کیا کہ اس کے چہرے پر بھکاری کے کشکول کا گمان ہونے لگا۔

"نشتر صاحب! کہیں سے کوئی لڑکی پیدا کیجئے۔ جس کے سامنے ایک مرتبہ ـــ صرف ایک مرتبہ اس مکالمے کی ریہرسل کر سکوں۔ نشتر صاحب سچ مانئے زندگی بھر آپ کے جوتے سیدھے کروں گا۔"

میں نے کئی تجویزیں پیش کیں، لیکن بھاٹیہ صاحب کے دل کو ایک نہ جچی۔ کافی سر پٹخنے کے بعد میں نے ایک بے تکی سی تجویز اس کے سامنے رکھی
نے کہا کیوں نہ اپنی بیوی ہی کو سامنے بٹھا کر اس کے سامنے یہ مکالمہ بول کر ری ہرسل کر لی جائے۔ اب بغیر ضرورت تو ملنے سے رہی اس مقصد کے لئے۔
یہ تجویز سنکر وہ اچھل پڑا، اور ہاتھ ملا کر بولا۔ "بہت اچھی سوجھی نشتر صاحب بس اب سمجھئے کہ اپنا کام ہو گیا۔ مکالمہ میں آپ نے کون سا کسی کا نام دیا
ہے۔ بیوی کو مخاطب کر کے مکالمہ بول دوں گا۔ جاہل اور پھوہڑسی تو ہے۔ اس کے پلے کیا پڑے گا جو شک کرے گی؟ ـــ اور اگر شک کر بھی لے تو کیا ہے میرا
ابگاڑ لے گی؟"

یہ واقعہ سوموار کی شام کا تھا۔ اگلے روز اسے شانتا سے ملاقات کرنی تھی۔ اگلے روز اچانک میری طبیعت خراب ہو گئی۔ اس لئے اس روز میں گھر
ہی رہا۔

دوپہر کے تین بجے کا عمل ہوگا۔ میں اپنے بستر پر نیم دراز کسی کتاب کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ مسز بھاٹیہ غسل خانے سے نکل کر اپنی کھولی میں
داخل ہوئی۔ غسل کر کے اور بال دھو کر نکلی تھی۔ کمر تک لہراتے ہوئے گھنے سیاہ گیسوؤں میں پانی کے قطرے چاہت کی کنواری آشاؤں کی طرح چمک رہے تھے۔
شاید زندگی میں پہلی مرتبہ صابن مل مل کر نہائی تھی۔ چہرے کی رنگت زعفران کی پتی کی طرح نکھری ہوئی تھی۔ اس نے دل فریب انداز میں کمر کو خم دے کر دائیں کے
حصے کو آگے کی طرف جھکا کر اپنے لمبے بالوں کو جھٹک جھٹک کر ان سے پانی نکالا۔ پھر تولئے سے رگڑ رگڑ کر انہیں خشک کیا، اور پھر بالوں میں کھوپرے کا تیل ڈال کر کنگھی
کرنے کے لئے دروازے کی دہلیز میں، ٹوٹے ہوئے آئینے کا ٹیڑھا سا ٹکڑا سامنے رکھ کر بیٹھ گئی۔
آج تو اس پر عجیب نکھار تھا۔ اتنے روز سے میں اسے دیکھتا چلا آ رہا تھا۔ لیکن آج جو دزدیدہ نگاہوں سے اسے دیکھا تو بس دیکھتا ہی چلا گیا۔ کسی طرح
وہ تین بچوں کی ماں نہیں معلوم ہوتی تھی۔ میں نے اپنی توجہ کتاب کے الفاظ کی بھول بھلیوں میں بھٹکانے کی کوشش کی لیکن اس کا سراپا پہاڑیوں میں آوارہ گونج
کی طرح میرا تعاقب کرتا رہا۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ آج گوری کس کی خاطر سولہ سنگھار کر رہی تھی۔ اس کا رسیا تو شانتا کے پہلو میں بیٹھا پیار محبت کی میٹھی میٹھی باتوں
میں محو ہوگا۔

ساڑھے پانچ بجے کے قریب کیا دیکھتا ہوں کہ بھاٹیہ صاحب خراماں خراماں تشریف لا رہے ہیں۔ شانتا سے ملاقات کا وقت تھا۔ یہ معمہ کیا ہے۔ میری
سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ کہیں شانتا سے جھگڑا نہ ہو گیا ہو۔ یا شاید شانتا کسی فلم میں مصروفیت کے باعث نہ آسکی ہو یا... یا... کئی وسوسے میرے دماغ کے کھنڈروں
میں سنپولیوں کی طرح سر اٹھانے لگے۔
وہ اپنی کھولی کے اندر گیا۔ اور پھر چند لمحوں کے بعد وہ میرے ہاں آوارد ہوا۔ "سلام عرض ہے نشتر صاحب!" اس نے میری اکلوتی شکستہ کرسی پر
بیٹھتے ہوئے کہا۔
"آئیے آئیے بھاٹیہ صاحب۔ تشریف رکھئے۔۔ کہئے کیسے آنا ہوا۔۔۔ ابھی آپ یہیں گھوم رہے ہیں۔ یہ تو آپ کی شانتا سے ملاقات کا وقت تھا ـــ
کیا بھول گئے؟"
"اجی گولی ماریئے نشتر صاحب! کم بخت شانتا کو ـــ" بھاٹیہ صاحب کے منہ سے یہ جملے سنکر حیرت کے مارے میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔
"اپنی بیوی لاکھوں سے کہیں ہے۔ لاکھوں میں ایک ہے۔ گھر کا ہیرا چھوڑ کر راستے کا کنکر گلے سے لگا رہا تھا۔ میرا جیسا گدھا بھی کون ہوگا؟"
"بے شک۔ بے شک۔ لیکن حضرت یہ انقلاب کیسے آگیا۔ کیا شانتا سے کوئی جھگڑا ہو گیا ہے۔ یا خدانخواستہ اس کی والدہ ـــ"
اس نے میری بات کاٹتے ہوئے جواب دیا۔ "اجی نہیں نشتر صاحب، اپنا ہی دماغ ٹھکانے لگ گیا ہے۔"
"خدا کا شکر ہے! لیکن کچھ تفصیل ہمیں بھی تو معلوم ہو۔" میں سراپا اشتیاق بن گیا تھا۔
"اجی تفصیل کاہے کی! وہ اپنی بیوی لاہے نا ـــ آپ ہی نے تو مشورہ دیا تھا کہ اس کے سامنے مکالمہ کی ری ہرسل کر لوں۔"

"جی ہاں۔ جی ہاں۔ پھر کیا ہوا۔"

"ایسی ہونا کیا تھا خاک ـــ کل رات جو میں نے اسے سامنے بٹھا کر ری ہرسل شروع کی تو وہ سمجھی میں اس سے پیار محبت کی باتیں کر رہا ہوں۔ وہ شرمائی لجائی۔ لاجونتی کے بوٹے کی طرح چھوئی موئی سی بن گئی۔ اس کے چہرے پر یکایک یہ تبدیلی دیکھ کر میں نے اس کی آنکھوں میں جو جھانک کر دیکھا تو بیر بہوٹی کی طرح اس کے سارے چہرے پر سرخی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اور کیا بتاؤں نشتر صاحب، بھگوان قسم اس وقت وہ مجھے ایسی سندر لگی کہ جی چاہا اس کی پوجا کرنے لگوں۔ میں بھی ایسا احمق تھا کہ گھر کی جنّت چھوڑ کر باہر دوزخ میں جنّت کی کھوج کر رہا تھا۔"

"میں نے اس کی گھنی سیاہ زلفوں میں انگلیاں پھیریں تو نشتر صاحب سچ کہتا ہوں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میری انگلیاں ریشم کے تاروں میں الجھ گئی ہیں میں نے اُسے سب کچھ بتا دیا اور قسم کھائی کہ اب سوائے اُس کے کسی دوسری عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھوں گا۔"

وہ کچھ رکا اور بولا "اور ہاں نشتر صاحب! آج ہم دونوں اس وقت میرین ڈرائیو جا رہے ہیں۔ چاٹ پانی کے لئے بمبئی جانے کا ارادہ ہے۔ دو تین گھنٹے کا پروگرام رہے گا۔ اور ہاں نشتر صاحب ـــ معاف کیجئے گا ـــ اگر ناگوار خاطر نہ ہو تو ـــ میرا مطلب ہے دو تین گھنٹے کے لئے میرے تینوں بچے آپ کے پاس رہیں گے۔ میں ان کے کان کھینچ جاؤں گا۔ آپ کو ذرا بھی تنگ نہیں کریں گے۔ اگر کریں گے تو ان کی کھال اُدھیڑ کر رکھ دوں گا واپسی پر ـــ سرلا تیار ہو گئی ہوگی۔ بس اب چلتا ہوں۔ بچّوں کو لے کر آتا ہوں۔ تکلیف معاف ـــ"

اُردو کے مایۂ ناز شاعر عبدالعزیز خالد کی

تخلیقات

سرودِ رفتہ	یونانِ قدیم کی شاعرہ سیفو کے نغمے	چار روپے۔
غزل الغزلات	عہد نامۂ عتیق کا نغمۂ سلیمان	ایک روپیہ،پیسے
دکانِ شیشہ گر	منظوم ڈرامے	تین روپے
برگِ خزاں	〃 〃 〃	چار روپے
ورقِ ناخواندہ	〃 〃 〃	تین روپے
سلوٰی	دوسرا ایڈیشن معہ اضافۂ ترگوم	تین روپے ۵۰ پیسے
گلِ نغمہ	ٹیگور کی گیتا نجلی اُردو شعر میں	چار روپے
زنجیرِ رمِ آہو	طویل و مختصر نظمیں	دو روپے
کلکِ موج	ذکارِ تازہ، نظمیں، غزلیں	سات روپے ۵۰ پیسے
ماتمِ یک شہرِ آرزو	دلی کے ڈیڑھ سو نوحے (نیا ایڈیشن)	(زیرِ طبع)
زرِ داغِ دل	طویل نظمیں (نیا ایڈیشن)	〃
کفِ دریا	نظمیں، غزلیں	〃
فارقلیط (آدم جی انعام یافتہ)	نامِ ختمِ رسل انجیل میں ہے فارقلیط	آٹھ روپے

پریم بھٹناگر

سرتیا - دہلی

ایک ہی راہ

ٹھیک ساڑھے دس بجے پولیس سپرنٹنڈنٹ مان سنگھ کی کار آفس کے احاطے میں آکر رکی۔ اردلی نے دوڑ کر کار کا پھاٹک کھولا۔ بابوؤں نے جھک کر سلام کیا۔ چپراسی نے چق اٹھائی اور صاحب آفس میں داخل ہوئے۔

سامنے ٹیبل پر ڈاک پڑی ہوئی تھی۔ مان سنگھ نے سگریٹ جلا کر ایک لمبا کش لیا۔ پھر سگریٹ کو دونوں انگلیوں کے درمیان دبا کر ہوا میں دھوئیں کے چھلے اڑاتے ہوئے ڈاک دیکھنے لگے۔ ابھی پہلا ہی خط کھولا تھا کہ انہیں ایسا لگا۔ جیسے ان پر بجلی گری ہو۔ شریانوں میں خون کا دوران جیسے جم گیا ہو۔ انہیں زمین پیروں تلے سے کھسکتی دکھائی دی۔

خط میں لکھا تھا۔

چونکہ مہیش پور کی پولیس بدنام ڈاکو رویا سنگھ کا خاتمہ کرنے میں ناکام رہی ہے۔ لہٰذا بلاس پور کی پولیس کو بھی یہی کام سونپا جاتا ہے۔ آئندہ دونوں ہی پولیس چوکیاں ایک دوسرے کا تعاون کریں گی۔

مان سنگھ مہیش پور کے پولیس سپرنٹنڈنٹ تھے۔ ابھی انہیں آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ اُن کا سکہ چاروں طرف جم گیا۔ آتے ہی انہوں نے خاص تیوہاروں پر آنے والی ڈالیاں بند کروا دیں، چپراسیوں کو صاحب کے گھریلو کاموں سے چھٹکارا مل گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو چپراسی مہینوں آفس کی صورت نہیں دیکھتے تھے، وہ اب آفس میں ہی رہنے لگے۔

پھر ایک دن سبھی طرف یہی ذکر ہو رہا تھا کہ کس طرح انہوں نے بھرشٹاچار کے الزام میں ایک کلرک اور چپراسی کو نوکری سے الگ کرتے ہوئے کہا تھا۔

"یہ پولیس کا محکمہ ہے، چور بازاری کا اڈا نہیں۔ اگر ہم بھرشٹاچار مٹانے والے ہی ایسا کریں تو اس سے زیادہ شرم و حیا کی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔"

کئی اداروں کو وہ باقاعدہ چندہ دیتے تھے۔ کئی طالب علموں کو اُن سے وظیفے ملتے تھے۔ اس لئے کچھ ہی مدت میں ان کا ذکر چاروں طرف ہونے لگا۔

لیکن اس پر شکوہ محل کی بنیادیں کھوکھلی تھیں۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایسے اعلیٰ کردار اور پرخلوص شخص، بھرشٹاچار کے کٹر مخالف اور آدرش کے اوتار مان سنگھ ڈاکوؤں سے ملے ہوئے ہوں گے۔ لیکن حقیقت یہی تھی۔ مان سنگھ جی بدنام ڈاکو رویا سنگھ سے ملے ہوئے تھے۔ اور لوٹ میں اُن کا ساجھا تھا۔ انسان کی فطرت ہے کہ اپنی اندرونی خامی کو چھپانے کے لئے باہری طریقے سے اتنی ہی ٹیپ ٹاپ کرتا ہے۔ اس لئے یہ فطری ہی تھا کہ مان سنگھ خود کو بھرشٹاچار کا کٹر مخالف ثابت کرتے، جس سے اپنوں میں بھی کوئی ان پر شک نہ کر سکے۔

ابھی تک گاڑی انہیں پٹڑیوں پر چل رہی تھی، لیکن یکایک انہیں ایسا احساس ہوا جیسے اُن کے بدرنگ چہرے سے یہ نقلی چہرہ کھسکنا چاہتا ہو۔ اگر ڈاکو بلاس پور پولیس کے ہاتھ لگ گئے اور مخبر بن گئے تو کیا ہوگا؟ اس گمان سے ہی ان کا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ اور آگے کچھ سوچنے کی ہمت ہی نہ ہوئی۔ دانس کا وقت ختم ہوا تو وہ کھوٹے کھوٹے سے کار میں جا بیٹھے۔ اسٹیرنگ گھما کر کار سیدھی کی اور جیت سنگھ کے تھانے کی طرف موڑ دی۔

جیت سنگھ مقامی تھانے دار تھا۔ اور مان سنگھ کا دور کے رشتے میں سالا لگتا تھا۔ وہ مان سنگھ کے لئے قابل اعتماد شخص تھا۔ اپنی انوکھی سوجھ سے وہ ان کا منظورِ نظر بن گیا تھا۔ سارا کام اس کے ذریعے ہوتا تھا اور لوٹ میں اُس کا مقررہ حصہ رہتا تھا۔

جیت سنگھ لان میں آرام کرسی پر ٹانگیں پھیلائے اس وقت پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو سے دماغ معطر کر رہا تھا۔ کار کے ہارن نے اُسے چونکا دیا۔ دیکھا تو سامنے صاحب کی کار کھڑی تھی۔

لپک کر سیلوٹ مارا، اور پوچھا "حضور نے کیسے تکلیف فرمائی؟ مجھے بلوا لیا ہوتا۔"

مان سنگھ نے بات پر دھیان دیئے بغیر ہی کہا "کچھ ایسا ہی کام ہے۔ [illegible]"

جیت سنگھ حیرت میں پڑ گیا۔ کچھ پوچھنا چاہتا تھا تو آواز کا بھرم [illegible]

مان سنگھ نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک [illegible] جب جیت سنگھ [illegible]

"کیا ہے؟" جیت سنگھ چونکا۔ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔

"یہ ہے موت کی دعوت، خودکشی کا پیغام!" مان سنگھ نے جیت سنگھ کو الجھاتے ہوئے کہا۔

جیت سنگھ کی کھوپڑی سے جیسے بھیجا غائب ہو گیا، وہ اداس سا ٹکر ٹکر تاکنے لگا۔

اب مان سنگھ نے الجھن کی چادر ہٹاتے ہوئے کہا "جیت سنگھ، اب بلاس پور کی پولیس [illegible] بس اُچھل اُچھل کے پھانسی کا پھندا ہمارے گلے میں پڑا۔ اب تو سمجھ گئے نا!"

جیت سنگھ اصل معاملہ سمجھ گیا لیکن اس کے دماغ میں ذرا سی بھی تبدیلی نہیں ہوئی۔ [illegible] چہرے پر نہیں ابھری۔ اطمینان سے بولا "حضور، یہ خوف بیکار ہے۔"

"بیکار! کیا کہتے ہو جیت سنگھ؟" وہ جیت سنگھ کو اس طرح دیکھنے لگے جیسے وہ [illegible]

لیکن جیت سنگھ نے اُسی لہجہ میں پھر کہا "حضور، پہلے تو ڈاکوؤں کا زندہ پکڑے جانا ہی ٹیڑھی کھیر ہے، پھر پکڑے گئے تو مخبر نہیں ہوں گے۔"

"اور ہو گئے تو؟"

"تب بھی کوئی خوف نہیں۔" جیت سنگھ نے مستقل مزاجی سے کہا۔ "پولیس اور ڈاکوؤں میں دشمنی نئی نہیں ہے۔ [illegible] پھر ان کے پاس ثبوت ہی کیا ہے؟ ہمارے پاس تو [illegible] کسی کی مہر نہیں ہوتی۔"

"ارے واہ، بہت اونچی سوجھی!" مان سنگھ نے طنز کیا "جیت سنگھ، اتنے نادان نہ بنو۔ [illegible] اس میں چھپے اشاروں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ [illegible] ایک ایک [illegible] کے ڈھیر سے [illegible] سکتی ہے!" پھر کچھ دیر رک کر بولے "نہیں کوئی [illegible] ہوگا۔"

[illegible] بیٹھے رہے۔ اچانک ایک خیال ان کے ذہن میں بجلی کی طرح کوند گیا۔ وہ اچھل پڑے۔ ان کا پژمردہ چہرہ کھل اٹھا۔

خود بخود اُن کے منہ سے نکلا "بس یہی ہوگا، یہی ایک راستہ ہے!"

ایک بار پھر جیت سنگھ اداس سا مان سنگھ کا منہ تکنے لگا۔

"یہ تو معلوم ہی ہے۔ وہ بھی کہ وہ کہاں ڈاکہ پڑنے والا ہے؟" مان سنگھ نے پوچھا۔

"جی ہاں! ہر دن نہیں حضور۔ ان دنوں میں ہمیں رات کا انتظار تھا ہی...."

مان سنگھ نے بغیر دھیان دیئے جوش سے کہا "اور یہ بھی معلوم ہے کہ ڈاکو اس وقت کہاں چھپے ہیں؟"

اب جیت سنگھ کچھ نہیں بولا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ ان ڈاکوؤں سے بیٹے کا کیا تعلق تھا؟ وہ صرف باپ کا منہ تاک رہا تھا۔

مان سنگھ نے ترکیب بتائی "مجھ کو مخبر خبر لائے گا کہ ڈاکو فلاں مقام پر ہیں۔ بس، پھر کیا ہتھیار بند پولیس وقت پر پہنچ کر ڈاکوؤں کا.. اب بھی نہیں سمجھے؟"

"واہ حضور... واہ" جیت سنگھ اچھل پڑا۔ "نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔"

وہ ان کی اونچی سوچ کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ پھر تھوڑا ادھر ادھر کی باتیں کر کے جیت سنگھ نے رخصت لی۔

تبھی مان سنگھ کی بیوی گائتری ہاتھ میں چائے لئے داخل ہوئیں۔ ٹرے کو ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولیں "کس الجھن میں ہیں؟ کیا کوئی..."

"نہیں، کچھ بھی تو نہیں۔"

"پھر یہ کھوئے کھوئے سے کیسے ہو؟ کوئی بات ضرور ہے، جو مجھ سے چھپا رہے ہو!"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ میں کام سے تھک سا گیا ہوں۔" پھر موضوع بدلتے ہوئے بولے "ارے، چائے بناؤ نا؟"

گائتری نے چائے بناتے ہوئے کہا "دیکھئے، مجھ سے چھپانے کی بے کار کوشش نہ کیجئے۔ میں دیوار کی اوٹ سے سب سن چکی ہوں۔"

"سن چکی ہو؟" مان سنگھ سن رہ گئے۔ "جب سن چکی ہو تو پوچھا کیا ہے؟"

"پوچھنا نہیں، کہنا ہے۔" گائتری نے کپ میں چائے انڈیلتے ہوئے کہا "میں کہہ دیتی ہوں کہ میں ایسا کبھی نہ کرنے دوں گی۔ یہ دھوکا ہے، وشواس گھات ہے۔ اور ایسا گناہ ہے جس کی کوئی تلافی نہیں۔"

"دھوکا، وشواس گھات! کیا کہتی ہو؟ ڈاکوؤں کو مارنا پولیس کا فرض ہے؟"

"ڈاکوؤں کو مارنا پولیس کا فرض ہے۔ لیکن ڈاکے ڈلوانا، لوٹ میں ساجھا رکھنا، دولت مندوں کے لڑکوں کو اغوا کرنا۔ کیا یہ بھی پولیس کا فرض ہے؟ ایسا تو میں نہیں سمجھتی۔ میں پھر کہے دیتی ہوں، ایسی کمینگی میں کبھی نہیں کرنے دوں گی۔" گائتری نے سختی سے کہا۔

ایک ہی بار میں مان سنگھ کے چہرے پر جیسے کسی نے سیاہی پوت دی۔ چہرہ فق ہو گیا لیکن انہوں نے بحث کی بجائے عقل سے کام لیا۔ بولے "گائتری، جذباتی نہ بنو۔ جذباتی ہونا برا نہیں۔ لیکن جذبات کے امڈتے دریا میں ضمیر کی ناؤ ڈبو دینا کوئی عقلمندی نہیں۔ ڈاکو آج نہیں تو کل ضرور پولیس کی گولی کے شکار ہوں گے، یا پھانسی پر لٹکیں گے۔ لیکن اگر وہ مخبر ہو گئے تو کیا ہوگا، جانتی ہو؟"

گائتری کچھ نہ بولی صرف سنتی رہی۔

مان سنگھ پھر کہنے لگے "اگر ڈاکو مخبر ہو گئے تو جو ہتھکڑی ہم دوسروں کو پہناتے ہیں۔ وہ خود ہمیں پہننی ہوگی۔ ساری عزت مٹی میں مل جائے گی، لوگ نہ صرف میرے، بلکہ ساری پولیس کے نام پر تھوکیں گے۔ پھر چاہے پولیس کتنی نیک دلی سے کام کرے کوئی اس پر اعتبار نہیں کرے گا۔ ہمارے بچوں پر انگلیاں اٹھائی جائیں گی۔ جس سے وہ سماج میں جی بھی نہ سکیں گے۔ پھر میرے لئے تو خودکشی کے علاوہ صورت ہی کیا رہے گی! کیا تم یہ سب دیکھ سکو گی؟"

پھر کچھ دیر بعد بولے "بھلائی اسی میں ہے کہ دھواں اٹھنے سے پہلے آگ راکھ میں دبا دی جائے۔"

گائتری نے کوئی بحث نہیں کی۔ ان دلیلوں سے وہ کہاں تک متاثر ہوئی۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا۔

منصوبے پر کارروائی ہوئی، مقررہ دن، مقررہ وقت پر مخبر خبر لایا کہ رام گڑھ پر ڈاکہ پڑنے والا ہے۔ اور ڈاکو فلاں گھاٹیوں میں چھپے ہوئے ہیں۔ بس پھر کیا تھا۔ پولیس چل پڑی۔ ڈاکوؤں سے مڈبھیڑ کرنے۔ کئی ٹیڑھی میڑھی راہیں پار کر جیپ کاریں گھاٹی کے قریب پہنچیں۔ ابھی گھاٹی کچھ ہی دور تھی کہ پولیس پارٹی

جیپ سے اتر کر بڑی ہوشیاری اور چوکسی سے پیدل ہی آگے بڑھنے لگی۔ دیکھتے دیکھتے پولیس نے گھاٹی کو گھیر لیا۔

ڈاکو اس وقت کھانے کی تیاری کر رہے تھے۔ بیچ میں ایک بڑی سی دیگ رکھی تھی، جس میں گوشت تھا، کیونکہ تازہ بھیڑ کی کھال پاس ہی ٹنگی ہوئی تھی۔

"خبردار جو ہلنے کی کوشش کی! گولی سے اڑا دیئے جاؤ گے!"

ڈاکوؤں کے کانوں میں کسی نے گرم گرم سیسہ انڈیل دیا، ایک ہی ساتھ سب کو جیسے لقوہ مار گیا بڑی مشکل سے روپا سنگھ کی آواز پھوٹی۔

"سپرنٹنڈنٹ صاحب، آپ؟"

"ہاں، میں مان سنگھ۔" مان سنگھ نے کڑک کر کہا۔ "اب تمہارا فائدہ اسی میں ہے کہ خود کو سپرد کر دو۔"

لیکن مان سنگھ کا تو ڈاکوؤں کو زندہ پکڑنے کا ارادہ تھا ہی نہیں، لہٰذا آخری لفظوں کے ساتھ ہی ایک گولی روپا سنگھ کی چھاتی میں اتر گئی۔

"دھوکا، وشواس گھات!" روپا سنگھ چیخا۔ "رام سنگھ لالا تو میری بندوق۔"

ابھی بات پوری بھی نہ ہو پائی تھی کہ دوسری گولی پیشانی پر لگی۔ وہ کٹے ہوئے پیڑ کی طرح گر پڑا، اور ٹھنڈا ہو گیا۔

ڈاکوؤں میں بھگدڑ مچ گئی۔ کیا ہونے والا تھا، یہ جانتے دیر نہ لگی۔

گھاٹی کا خاموش ماحول تھوڑی دیر کے لیے دونوں طرف کی گولیوں کی آوازوں اور گھائلوں کی چیخوں سے گونج اٹھا۔ لیکن نتیجہ تو ظاہر تھا دیکھتے ہی دیکھتے سبھی ڈاکو مارے گئے۔ پولیس کے دو سپاہی بھی شدید زخمی ہوئے۔

دوسرے دن سبھی خاص خاص اخباروں کے اگلے صفحوں پر چھپا تھا۔

"پولیس کا ڈاکوؤں پر چھاپا... پولیس اور ڈاکوؤں میں مسلح مڈبھیڑ ہوئی... ڈاکو روپا سنگھ اپنے ساتھیوں کے ساتھ مارا گیا... پولیس سپرنٹنڈنٹ مان سنگھ کی شاندار فتح..."

ساتھ ہی پولیس پارٹی اور لاشوں کے بیچ کھڑے ہوئے مان سنگھ کا فوٹو چھپا تھا۔

گھر کے ہر فرد کے لیے

دنیا بھر کی معلومات اور دلچسپیوں کا مرقع

عالمی ڈائجسٹ

انشا

قیمت ایک روپیہ پچیس پیسے

ماہنامہ "عالمی ڈائجسٹ انشا"۔ گارڈن ایسٹ۔ کراچی ۳

ادھیڑی

شاعرہ - بمبئی

لے خیام

ہارلیم میں ٹریجڈی

مسز فنک نچلی منزل پر مقیم مسز کیڈی کے فلیٹ میں داخل ہوئی۔ "دیکھو آج خوب زور آزمائی ہوئی ہے" مسز کیڈی بولی۔ اور اس نے فخر سے اپنا چہرہ اپنی سہیلی مسز فنک کی طرف گھما دیا۔ ایک آنکھ بند سی تھی۔ اس کے اردگرد ایک زردی مائل سبز خراش تھی۔ اُس کا ہونٹ کٹا ہوا تھا۔ اور اس سے خون رس رہا تھا۔ اس کی گردن کے دونوں طرف انگلیوں کے سرخ نشان تھے۔

"میرے شوہر تو ایسا کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔" مسز فنک نے کسی قدر اشک چھپاتے ہوئے کہا۔

مسز کیڈی نے اعلانیہ لہجے میں کہا: "مجھے تو ایسا شوہر چاہئے۔ جو ہفتہ میں ایک بار تو ضرور ہی مجھے مارے پیٹے۔ وہ دکھا دے کہ وہ میرا کتنا خیال رکھتا ہے مگر جیک نے جو آخری خوراک پلائی۔ وہ کوئی ہومیو پیتھک دوا نہ تھی۔ پھر ہفتہ کے باقی دن اُس سے بڑھ کر شہر بھر میں دوسرا کیا ہوگا۔ اس آنکھ کے بدلے کم از کم تھیٹر کے ٹکٹ اور بلاؤز تو ملیں گے ہی۔"

"بھئی مسٹر فنک تو اتنے اچھے ہیں کہ کبھی مجھ پر ہاتھ نہیں اٹھاتے۔" مسز فنک اطمینان سے بولی۔

مسز کیڈی مرہم لگاتے ہوئے بولی۔ "چلو ہٹو! تم تو جلتی ہو۔ تمہارا مرد تو اتنا سست اور کاہل ہے کہ تمہیں ایک تھپڑ بھی رسید نہیں کر سکتا۔ گھر میں قدم رکھا نہیں کہ اخبار سے ہی کشتی شروع ہو گئی، کیوں؟ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟"

مسز فنک نے اثبات میں سر ہلایا۔ "اس میں تو کوئی شک نہیں۔ کہ مسٹر فنک گھر آتے ہی اخبار میں سر کھپانے لگتے ہیں۔ مگر یہ جان لو کہ میرا بھرتا بنا کر خود کو خوش نہیں کرتے۔"

مسز کیڈی ایک خوش اور مطمئن گھریلو عورت کی طرح ہنسی اور اپنے ہیروں کی نمائش کرتی ہوئی ملکہ کی طرح اُس نے اپنے چہرے کا کالر ہٹا کر ایک پوشیدہ خراش کو ظاہر کیا۔ ایسی خراش جس کا رنگ سُرخ گہرا تھا اور خراش اب ٹھیک ہو چلی تھی۔ مگر جس کے کرب اور میٹھی کی لذت اب تک بھلی لگتی تھی۔

مسز فنک نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اس کی آنکھوں میں رشک و حسد کی جھلک صاف انگڑائیاں لیتی دکھائی دیتی تھی۔ ایک سال پہلے تک، شادی سے قبل وہ دونوں کاغذ کی فیکٹری میں ایک ساتھ کام کرتی تھیں۔ اور گہری سہیلیاں تھیں۔ اب وہ اپنے شوہر کے ساتھ میں اور اس کے شوہر اوپر والے فلیٹ میں رہتے تھے۔ اس لئے وہ میمی کے سامنے بننے کی کوشش نہیں کرتی تھی۔

"وہ جب پیٹتا ہے۔ تو تمہیں چوٹ نہیں لگتی؟" مسز فنک نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

مسز کیڈی خوشی سے تقریباً چلا پڑی۔ "چوٹ؟ کیا تم پر کبھی مکان گرا ہے؟ بالکل ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ملبے سے کھود کر مجھے نکال رہا ہو۔ جیک کے بائیں ہاتھ کے عوض ایک جوڑا نئے سینڈل اور دو پکچر۔ اور دائیں ہاتھ کے بدلے میں کونی آئی کی سیر اور چھ جوڑے ریشمی ڈورے بنائی کے لئے مل جاتے ہیں۔"

"لیکن وہ تمہیں پیٹتا کیوں ہے؟" مسز فنک کے لہجے میں اور زیادہ حیرت تھی۔

مسز کیڈی نے جواب دیا۔ "اس لئے کہ وہ نشے میں چور رہتا ہے۔ یہ عام طور پر سنیچر کی رات کو ہوتا ہے۔"

"مگر تم اس کا موقع کیسے فراہم کرتی ہو؟" اُس نے پھر استعجابیہ لہجے میں پوچھا۔

"اے لو، میں اُس کی بیوی نہیں ہوں کیا! دیکھو جیک تو آتا ہے نشے میں چور، اور میں ہوتی ہوں یہاں براجمان۔ بھلا میرے سوا اسے اور کس کو مارنے پیٹنے کا حق پہنچتا ہے، کسی اور کو پیٹے تو سہی۔ کبھی وجہ بھی ہوتی ہے۔ "کھانا تیار کیوں نہیں ہوا؟" اور کبھی "کھانا تیار کیوں ہے؟" جیک وجہ کو تلاش نہیں کرتا۔ وہ اس وقت تک پیتا رہتا ہے جب تک اُسے یاد نہ آجائے کہ وہ شادی شدہ ہے اور تب گھر کی سمت دوڑتا ہے۔ آتے ہی میری پٹائی شروع کر دیتا ہے۔ سنیچر کی رات کو میں نوکیلے قسم کے فرنیچر راستے سے ہٹا دیتی ہوں۔ تاکہ جب وہ اپنا کام شروع کرے تو میرا سر وغیرہ نہ پھٹ جائے۔ اس کے بائیں وار سے لذت آمیز کپکپی سی طاری ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی تو میں پہلے ہی دور میں حساب لگا لیتی ہوں، مگر جب ہفتہ بھر گھر کے خرچے اٹھانے ہوتے ہیں۔ اور ملبوسات وغیرہ کی کمی ہو جاتی ہے۔ تو دوبارہ مار کھانے کے لئے اُس کے سامنے جانا پڑتا ہے۔ اور کل رات میں نے یہی کیا۔ جیک جانتا ہے کہ ایک ماہ سے میری خواہش کالے رنگ کی ایک ریشمی باڈی پہننے کی تھی۔ اور میں جانتی تھی۔ کہ ایک آنکھ زخمی کرا لینے سے یہ نہیں آئے گی۔ اور میں تم سے عرض کروں۔ وہ آج کی رات آئس کریم بھی ضرور لائے گا۔" مسز فنک گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

"اُس نے کبھی مار پیٹ نہیں کی۔" وہ بول اٹھی۔ "جیسا کہ تم جانتی ہو۔ وہ اُداس اور خاموش گھر لوٹتا ہے۔ ایک لفظ بھی اُس کے منہ سے نہیں پھوٹتا وہ کبھی باہر بھی نہیں لے جاتا سوائے اس کے کہ گھر میں کرسیاں گرماتا رہتا ہے، ضروری اشیا تو خرید کر دیتا ہے۔ مگر اتنا خاموش رہتا ہے کہ مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا۔" مسز کیڈی نے اپنی سہیلی کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔ "بے چاری!" وہ بولی۔ "لیکن ہر ایک کو جیک جیسا شوہر تھوڑا ہی ملتا ہے۔ اگر سبھوں کو ان جیسی ہی ازدواجی زندگی میسر ہو تو طلاق وغیرہ کا قصہ ہی پاک ہو جائے۔ تم آئے دن جو غیر مطمئن بیویوں کے بارے میں سنتی رہتی ہو، میں بتاؤں۔ کہ انھیں ایسا مرد چاہیئے جو ہفتہ بھر میں ایک بار گھر آتے ہی ان کی ہڈی پسلی ایک کر دے۔ اور پھر بوسوں، دو چار کلیٹوں سے منالے۔ اس سے ان کی زندگی میں دلچسپیاں پیدا ہوں گی۔ ابھی میں تو کہتی ہوں آدمی ایسا ہی ہو کہ جب نشہ میں چور ہو تو بھرتا بنا کر رکھ دے اور جب نہ ہو تو گلے لگا لے۔ جس شخص میں اس قسم کے جذبے نہیں اُس سے خدا محفوظ رکھے۔"

مسز فنک نے ایک سرد آہ بھری۔ تبھی صحن میں کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ مسٹر کیڈی کی ٹھوکر سے دروازہ کھلا۔ وہ بنڈلوں سے لدا پھندا کھڑا تھا۔ مسز کیڈی اُٹھ کر گئی۔ اور اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر جھول گئی۔ اُس کی آنکھوں میں پیار کا خمار چھا گیا تھا۔

"ہیلو! میری جان!" مسٹر کیڈی چلایا۔ اُس نے بنڈل پھینک دیئے اور اپنی آغوش میں بھر کر اُسے زمین سے اوپر اٹھا لیا۔ "میں تھیٹر کے ٹکٹ لے آیا ہوں۔ اس بنڈل کو کھولنا، تمہاری خواہش کے مطابق ریشمی باڈی بھی لایا ہوں۔ اخاہ! گڈ ایوننگ مسز فنک، میں نے تو آپ کو دیکھا ہی نہیں۔ کہیئے، ہمارے مارٹ کا کیا حال ہے؟"

"وہ ٹھیک ہیں مسٹر کیڈی۔ شکریہ!" مسز فنک بولی۔ "اب میں چلوں۔ مارٹ کھانے کے لئے آتے ہوں گے۔ اور تمہیں مسز کیڈی، جو نمونہ چاہیئے تھا وہ کل لا دوں گی۔"

مسز فنک جب اوپر اپنے فلیٹ میں پہنچی تو اُس کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ ایک بے معنی اور واہیات سی چیخ۔ ایسی چیخ جس کے بارے میں صرف عورتیں ہی جان سکتی ہیں، غم کا خزانہ جس کے لئے کوئی جگہ مقرر نہیں۔

مارٹ اُسے کیوں نہیں مارتا پیٹتا؟ وہ بھی تو جیک کینیڈی کی طرح لمبا تڑنگا ہے۔ ... کی بات پرواہ نہیں کرتا۔ اُس نے کبھی جھگڑا نہیں کیا۔ وہ گھر آتا ہے اور خاموش و اداس ٹہلتا ہے یا پھر پڑا رہتا ہے۔ وہ رسوائی کا انتقام تو کر دیتا ہے۔

مسز فنک کے خیالوں کا ..... الٹا ہوا۔ اچھا ہوا ساکن ہو گیا تو کاش ... کا جھانسہ کچھ ڈال ... اور ... اس پہ ترکس بنتا یا یوں کہیں کہ وہ اپنے کئے بازی سیکھنے والے ساتھی سے چوٹ کھائے بغیر ہتھیار ڈال دینے کو تیار تھی۔ ... وقفے کے لئے مسز کینیڈی سے ... مسز کینیڈی اور اس کے زخموں، خراشوں، تحائف اور بوسوں کی داستان اور ... وحشی شوہر کے ساتھ ازدواجی زندگی سے نفرت ہو گئی۔

مسٹر فنک سات بجے گھر پہنچا۔ گھر لوٹنے کی عاجزی اُس کی رگ رگ سے پھوٹی پڑتی تھی۔ اپنے ... کے باہر وہ ... ہی نہ رکھتا تھا وہ اُس اژدہے کی مانند تھا جس نے اپنا شکار نگل لیا ہو یا پھر اس ٹوٹے ہوئے درخت کی طرح جس پر بگولا ... پڑا ہو۔

"کھانا اچھا لگا مارٹ؟" مسز فنک نے، جس نے کھانا بڑی محنت سے تیار کیا تھا، پوچھا۔ مسٹر فنک اور تیزی سے ... نے حلق سے کچھ عجیب سی آواز نکلی جو شاید اس بات کی علامت تھی کہ کھانا اُسے پسند آیا۔ کھانے کے بعد اُس نے اخبار اُٹھا لیا اور پڑھنے بیٹھ گیا۔

اگلے روز مئی کے مہینے کا کوئی خاص جشن تھا۔ مسٹر کینیڈی اور فنک تعطیل منا رہے تھے۔ مزدوروں کی پریڈ اور کھیل کود وغیرہ کی دلچسپیاں تھیں۔ مسز فنک علی الصباح مسز کینیڈی کے پاس حسب وعدہ نمونے کر پہنچ گئی۔ جو اپنی نئی ریشمی چولی میں سجی بیٹھی تھی۔ اُس کی زخمی آنکھ میں مسرت کی چمک تھی۔ جیک نے اُس کا کفارہ ادا کر دیا تھا۔ پارک میں پکنک کا دن بھر کا پروگرام تھا۔

مسز فنک اپنے فلیٹ میں واپس آئی تو حسد کا بھوت اس پر سوار تھا۔ مسز کینیڈی اپنے "زخموں اور مرہم" میں کتنی شادماں ہے۔ لیکن کیا ساری خوشیوں پر مسز کینیڈی کی اجارہ داری ہے؟ مارٹ فنک بھی جیک کینیڈی سے کسی طرح کم نہیں۔ پھر کیا اُس کی بیوی بغیر مار پیٹ کے رہ جائے گی۔ اچانک مسز فنک کے دماغ میں ایک ترکیب بجلی کی طرح کوند گئی۔ وہ دکھا دے گی کہ جیک جیسے اور بھی مرد ہیں۔ جو پہلے مار پیٹ کر پھر پیار کر سکتے ہیں۔

فنک کی ازدواجی زندگی میں تعطیل کا کوئی خاص مصرف نہیں تھا۔ رات سے ہی دھلنے والے کپڑوں سے ٹب بھر رکھا تھا۔ مسٹر فنک اخبار پڑھنے میں محو تھے۔ اس طرح جشن کی اختتام کی طرف سرکتا جا رہا تھا۔ مسز فنک کے دل میں حسد کی آگ بھڑک چکی تھی۔ اور اس سے بھی زیادہ کچھ کر گزرنے کی خواہش اس کے دل میں چٹکیاں لے رہی تھی۔ مسٹر فنک نے سوچا کہ اگر وہ اپنی ازدواجی زندگی میں دلچسپیاں پیدا نہیں کرتا۔ تب اُسے اپنے کرداروں کی تلافی ہی ہوگی۔

مسٹر فنک نے اپنا پائپ سلگا لیا۔ اور پرسکون انداز میں ایک پیر کے پنجے سے دوسرے پیر کی ایڑی کو رگڑا۔ وہ اپنی ازدواجی زندگی سے اسی قدر مطمئن تھا۔ جیسے پڈنگ میں بغیر ملا ہوا چربی کا لوندا۔ وہ اپنی آرام گاہ میں پاؤں پھیلائے بیٹھا ہوا، بیوی کے ذریعے اچھالی گئی چھینٹوں اور کھانے کی کشش انگیز خوشبو وغیرہ کے درمیان مطالعہ میں منہمک تھا۔ اپنی بیوی کو مارنے پیٹنے کا خیال اُس کے ذہن سے کوسوں دور تھا۔

مسز فنک نے ٹب میں گرم پانی انڈیل دیا۔ جھاگ اُٹھنے لگے۔ نیچے والے فلیٹ سے مسز کینیڈی کی ہنسی کی آواز آ رہی تھی۔ اُسے محسوس ہوا کہ اُس پر طنز کیا جا رہا ہے، یا آوازے کسے جا رہے ہیں۔

اب مسز فنک کی باری تھی۔ مطالعے میں منہمک اپنے شوہر پر جھلا پڑی "او کاہل!" وہ چیخی۔ "کیا تم جیسے احمق کے لئے سارا دن کام میں جان گھلاتی رہوں؟ تم آدمی ہو یا رسوئی کے کتے؟"

مسٹر فنک جیسے سکتہ میں آگیا۔ اخبار اس کے ہاتھ سے گر پڑا۔ مسز فنک سمجھ گئی کہ اتنی سی اکساہٹ کافی نہیں۔ کیونکہ اُس پر اس قسم کا کوئی رد عمل نہیں تھا کہ وہ حملہ آور ہوگا۔ وہ اپنی جگہ سے اچھلی اور اس کے چہرے پر ایک بھرپور گھونسا جڑ دیا۔ اُسی لمحہ اس کے دل میں ایسا پیار اُمڈ آیا جیسا آج تک نہیں اُمڈا تھا۔

جاگو مارٹ فنک، اپنا فرض نبھاؤ! کاش وہ دوچار تھپڑ ہی جڑ دیتا تاکہ اُسے یقین ہو جاتا۔ کہ وہ اس کی پروا کرتا ہے۔

مسٹر فنک اچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔ مسز فنک نے پھر اس کے ایک گھونسہ رسید کر دیا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اور مار کھانے کا انتظار کرنے لگی، جس کی وہ بھوکی تھی۔

نچلی منزل والے فلیٹ میں مسٹر کیڈی بڑی ہمدردی سے اپنی بیوی کی آنکھ پر لیپ چڑھا رہا تھا۔ اور دونوں پکنک منانے کی تیاری میں مصروف تھے۔ انھیں اوپر والے فلیٹ میں عورت کی اونچی آواز، دھماکے، لڑکھڑانے اور کرسیوں کے اُلٹنے کی آوازیں سُنائی دیں۔ ظاہر ہے انھوں نے اندازہ لگایا ہوگا۔ کہ جھگڑا ہو رہا ہے۔

”مارٹ اور اس کی بیوی میں ہاتھا پائی ہو رہی ہے“ مسٹر کیڈی بولا۔ ”مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ یہ لوگ یہ شوق فرماتے ہیں۔ کیا اُوپر جاؤں؟ شاید انھیں مرہم پٹی کی ضرورت پڑے۔“

مسز کیڈی کی ایک آنکھ میں ہیرے کی سی چمک نمودار ہوئی۔ ”اُف!“ وہ بڑبڑائی ”شاید — شاید، ذرا ٹھہرو جیک! میں جا کر دریافت کرتی ہوں۔“

وہ اُوپر بھاگی۔ اُس نے دہلیز پر قدم رکھا ہی تھا۔ کہ اپنے باورچی خانے کے دروازے سے مسز فنک نمودار ہوئی اور اس پر جھپٹی۔

”او مسز فنک!“ وہ چیخی ”کیا اُس نے ..... ؟“ مسز فنک نے دوڑ کر اپنا منہ اپنی سہیلی کے کندھوں پر رکھ دیا اور زور سے سسکنے لگی۔ مسز کیڈی نے اُس کا چہرا اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر اُوپر اُٹھایا۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ مگر اس پر مسٹر فنک کے بزدل گھونسے کا کہیں نشان، خراش یا نوچ کھسوٹ کا معمولی سا زخم تک نہ تھا۔

”سچ سچ بتاؤ ڈارلنگ!“ مسز کیڈی نے منت کی۔ ”ورنہ میں خود جا کر دریافت کر لوں گی۔ کیا ہوا؟ کیا اُس نے مارپیٹ کی؟ کیا کیا اُس نے؟“

مسز فنک نے سسکتے ہوئے اپنا چہرہ اپنی سہیلی کے سینے میں چھپا لیا۔

”خدا کے لئے دروازہ نہ کھولنا پیاری“ اُس نے سسکتے ہوئے التجا کی ”اور کسی سے نہ کہنا، اسے راز ہی رکھنا، انھوں نے مجھے چھوا تک نہیں اے میرے خدا، وہ کپڑے دھونے لگ گئے ہیں ..... وہ کپڑے دھو رہے ہیں۔“

ناشر — شمس زبیری

سرورق — اختر ہلال زبیری۔

کتابت — چراغ الہ آبادی

طباعت — انٹرنیشنل پریس۔ کراچی۔

اشاعت — فروری ۱۹۶۵ء

مقام اشاعت

کاشانۂ اردو۔ ۲/۲۔ اکبر روڈ۔ کراچی ۳

نئی کراچی
یدہ رضوی

نروان

جب رات کو زرد اُداس چاندنی میں ماحول پر موت کا سکوت و کرب چھا جاتا ہے۔ آکاش پہ ستارے تھکے تھکے پلکیں جھپکتے سوگواری سے
یا کو دیکھتے گزرتے ہیں۔ ہوائیں چپ میں سسکتی ہوئی سرسراتی ہیں۔ چاندنی میں درختوں کے بجھے بجھے سائے پُراسرار سے معلوم ہوتے ہیں تو چاند
ں کی کھڑکی تک پہنچ جاتا ہے اور اندر جھانکتا ہے۔ وہ ہولے ہولے آنکھیں کھولتی ہے۔ اقلیم جنوں کے بے ہنگم شور پہ غور کرتی ہے۔ کچھ نہ سمجھتے
ئے آنکھیں پھاڑ کر جلدی جلدی کھڑکی سے باہر پھیلی ہوئی چاندنی کو دیکھتی ہے اور پھر۔ چاندنی کو دیکھتے دیکھتے خدا جانے کون سی لہر اس کے شعور کے پردہ
گزر جاتی ہے اور وہ چیخ مار کر پلنگ سے نیچے کود پڑتی ہے اور اس کی یہ چیخ پاگل خانے کی ہراس آلود فضا میں یوں ارتعاش پیدا کر دیتی ہے۔ جیسے
ئی روح کچل گئی ہو اور کائنات دہل جائے۔

اب تو وہ سب ہی اقلیم جنوں میں، لیکن وہ تو جنم جنم کی پیار و محبت کی پیاسی خود کو پاگل ہی سمجھتی تھی۔ ایک کھوکھلا پن۔ ایک بیزاری۔ ایک ازلی
اداسی جو اس کی آتما کی گہرائیوں میں رچ بس گئی تھی۔ زندگی ایک سنسان صحرا ہے۔ میں اکیلی ہوں۔ میں اداس ہوں۔ وہ یوں سوچتی چارپائی پر لیٹی چندا
ماموں کو حسرت سے تاکا کرتی۔ چندا ماموں جا تنے پیارے ہیں، اتنے بلند ہیں۔ لیکن۔ یہ نہیں بتاتے کہ وہ اکیلی کیوں ہے؟ ممی کس دنیا میں رہتی ہیں؟
کیوں اس سے پیار نہیں کرتیں وہ کس کے لئے جیتی ہیں؟ ۔ اور یہ ڈیڈی۔ یہ بھی تو تمام دن تجارت کے کاموں میں سر کھپاتے رہتے ہیں۔ کبھی گھر
میں نہیں جلد نکلتے۔ جیسے یہ ان کا اپنا گھر نہ ہو جیسے وہ اجنبی ہوں۔ وہ کبھی ممی سے بھی نہیں بولتے اگر اتفاقاً کبھی مڈبھیڑ ہو بھی جائے تو جانے ممی کیوں
حقارت سے منہ بناتی ہیں۔ ڈیڈی اداسی سے انہیں تکتے ہوئے باہر چلے جاتے ہیں اور ممی بڑبڑاتی ہیں۔ بوڑھے چغد کے ساتھ ہونہہ۔
پھر وہ آئینہ کے سامنے کھڑی ہو کر پراسرار انداز میں مسکراتی ہیں اور وہ بھی سوچنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ ارے واقعی ڈیڈی آپ تو بوڑھے ہو گئے۔
اور ممی۔ ممی تو اتنی جوان اتنی حسین ہیں کہ شاید میں ان کی لڑکی بھی معلوم نہیں ہوتی۔ وہ ممی کو حسرت سے دیکھتی رہتی۔ اور ممی۔ آئینہ دیکھتے دیکھتے لاپرواہی
سے کندھے جھٹک کر باہر چل دیتیں اور وہ سوچتی رہ جاتی کہ اس کا وجود کتنا غیر اہم ہے۔ تو چندا ماموں سنی میری کہانی؟ پھر سہمی سہمی آواز میں کہتی تو بھی
ممی کہاں ہیں؟ پھر وہ سامنے بچھے ہوئے انا کے پلنگ کی طرف دیکھتی اور سوچتی رہ جاتی۔ یہ ممی کو نیند تو آتی ہو گی پھر۔ پھر۔ وہ گھوم کر پیار سے انا کے
بوڑھے چہرے کو دیکھتی۔ اس کی دنیا اور اس کی خوشیاں تو بس انا کی ذات پر مرکوز تھیں۔ انا مجھے گلے لگا لو۔ وہ اس سے چمٹ جاتی۔ اس کی زندگی میں یہ
معمول ہو گیا تھا وہ رات گئے تک چندا ماموں کو اپنا دکھ سناتی، نیند کی وادیوں میں کھو جاتی۔

رات گئے جب بیگم حکیم کلب سے واپس آتیں تو انہیں کبھی احساس بھی نہ ہوتا کہ ایک معصوم روح ان کی التفات کی محتاج تڑپتی رہتی ہے۔ وہ تو

بعض اوقات یوں بے حال ہو جاتیں کہ انہیں کپڑے بدلنے کا بھی ہوش نہ ہوتا۔ قیمتی نفیس ساڑیوں میں ہی سو جاتیں اور صبح کو جب ان کا خمار اترتا تو دن کا ایک پہر گزر چکا ہوتا۔ وہ کیا کرتیں، بھلا اتنی حسین اور تعلیم یافتہ عورت اب بال بچوں کے بکھیڑوں میں زندگی گزارے — نان سینس — پھر ایک دن کھانے کی میز پر بیٹھے بیٹھے ایک دم انہیں اپنی مادرانہ ذمہ داریوں کا احساس ہو گیا۔ چنانچہ انہوں نے بے بی کو غور سے دیکھا۔ بھئی یہ بے بی کس تیزی سے بڑھ رہی ہے انہوں نے پریشانی سے سوچا۔ اور پھر اس احساس ذمہ داری کا یہ نتیجہ نکلا کہ بے بی دوسرے دن اسکول میں داخل کر دی گئی اور بس ذمہ داری ختم — وہ حسب معمول سوشل ویلفیر کے پروگراموں میں جتی رہتیں۔ رات گئے کلب سے واپس آتیں۔ دن چڑھے تک سوتیں اور دن بھر دوستوں کے گھر گھومتیں اور ڈیڈی تجارتی آفس میں مصروف رہا کرتے۔

اسکول جا کر وہ کچھ بہتر ہو گئی۔ لیکن جس وقت لڑکیاں ماؤں کے لاڈ اور باپوں کی شفقتوں کا تذکرہ کرتیں تو اس کی حیران آنکھیں مزید حیران ہو جاتیں۔ اور وہ کہتی — "مجھے تو کبھی ڈیڈی نے پیار نہیں کیا، کبھی ممی نے گلے سے نہیں لگایا۔ اور اسکول سے واپسی پر میرا حال تک نہ پوچھا۔"

لڑکیاں اس کی بیوقوفی پر ہنسی سے دوہری ہو جاتیں۔ "جھوٹ!!"

"اونہہ مجھے تو ممی اتنا پیار کرتی ہیں۔ اور میں تو اب تک ممی پاس سوتی ہوں، اگر کہیں چلی جائیں تو میں اتنا روتی ہوں — وہ کبھی اکیلے نہیں جاتیں ہاں۔" اول تا شہ فرزانہ تو تلا کر کہتی۔

میری ممی تو روز چلی جاتی ہیں۔ میں رو رو کر تھک جاتی ہوں انہوں نے کبھی نہیں پوچھا" تم تالی میں تو آتی ہو اول اول لوج لوج اچھی اچھی فلاکیں پہنتی ہو — ہم تو بس تلنگے میں آتے ہیں —" فراکیں — کار — تو کیا فراکیں اور کار ممی کا پیار ہو سکتی ہیں؟ — وہ اپنے ننھے سے دماغ پر زور دیتی۔

اپنے حالات کے باعث وہ وقت سے پہلے ہی کتنی سنجیدہ ہو گئی تھی۔ سہیلیوں اور ہم عمروں کے درمیان اس کو اپنی زندگی کیسی المیہ سی معلوم ہوتی — یہ کاریں — یہ پارٹیاں یہ زندگی کی لامتناہی یکسانیت اسے کتنی اذیت ناک معلوم ہوتی — یہ ممی اور ڈیڈی کی ملاقات بھی کتنی حیران کن ہوتی۔ اس کی ضرورت بھی اس وقت پیش آتی جب ممی کو کسی فنکشن کے لئے یا کسی جلسے سے خطاب کرنے کے لئے نئی ساڑیوں اور نئے فیشن کے زیورات کی ضرورت پیش آتی۔ وہ بیزاری سے مسٹر حلیم سے روپیہ طلب کرتیں۔ وہ ٹھنڈی سانس بھر کے چیک کاٹتے وہ حقارت اور غرور سے سر جھٹک کر باہر چلی جاتیں، وہ سب کچھ دیکھتی اور حیران رہ جاتی۔ ممی کی کلب کی مصروفیات وہسکی کی بوتلوں، سوشل پارٹیوں، تقریبات اور جلسوں میں پناہ، دفتر کے بہی کھاتوں اور درآمد برآمد میں فرار — بس اسے تو حیرانی ہی قسمت سے ملی تھی۔

جب شام نیچے جھک آتی اور درختوں اور عمارتوں کے سائے لمبے ہو جاتے۔ اداسی گہری ہو کر پھیل جاتی تو وہ اپنے باغ میں کھلنے والی کھڑکی پر سر رکھ کر سوچتی — کاش ممی اسے کسی کام کا حکم دیں نہ ماننے پر جھڑکیاں — کسی چیز کے دینے سے ممی انکار کر دیں اور وہ مچل جائے — وہ سسکی لیتی، دو ننھے آنسو مل کر جدا ہو جاتے۔ درختوں میں سرسراتی پروائی سہم کر ساکت ہو جاتی اور وہ خلا میں تکتی رہتی۔

پھر ایک دن بیگم حلیم ہلکے نیلے رنگ کی ساڑھی باندھے میک اپ کئے ناخنوں پر نیل پالش کا شیڈ لگا رہی تھیں کہ آنا ڈریسنگ ٹیبل صاف کرتے ہوئے خود سے کچھ کھوئی کھوئی سی بولی — "بے بی نے رات بھی کھانا نہیں کھایا۔ اب بھی ناشتہ کو کہتی ہے نہیں کروں گی — زبردستی چائے ہی پلا دوں —؟"

"بے بی اسکول کیوں نہیں گئی۔" انہوں نے تیوری چڑھا کر بے تعلقی سے پوچھا

"اسے سخت بخار ہے —!"

"ہونہہ" تیار ہو کر انہوں نے آئینے میں اپنا آخری جائزہ لیا اور فخر سے سوچا — میں ابھی تک کتنی حسین ہوں۔ سبھی درست کہتے ہیں — یو آر سو رِچ — ہونہہ بھلا میرا اور مسٹر حلیم جیسے کھوسٹ کا کیا جوڑ — جاوید — مسٹر حلیم نے دولت ہی سے تو جاوید کو شکست دی تھی۔ حسین اور جاذب جاوید — بیچارے کو گھاٹا ہی کیا ہے۔ مجھے اس سے کون سی افلاطونی محبت تھی — اب تو مجھے سب کچھ حاصل ہے دولت بھی اور — کاش یہ بے بی نہ ہوتی۔ تو مسٹر حلیم کے بعد — بے بی کے وجود کے احساس سے ان کے قدم بوجھل ہو گئے — باہر جاتے ہوئے وہ لمحہ بھر کو بے بی کے کمرے میں آئیں۔ بے بی چت لیٹی

ں. بجا سے اس کی چمپئی رنگت جھلک رہی تھی. گال تمتمائے ہوئے تھے اور کروٹیں بدلنے سے بال بکھر کر پیشانی پر پھیل گئے تھے. انہوں نے جھک کر
ے دیکھا اور پریشان ہوگئیں. بے بی اب بے بی نہیں رہ گئی تھی. اتنی بڑی عمر ہی میں بھی وہ سہانی رہی تھی. اور چہرہ پر شباب کا حسن صاف ظاہر تھا تو یہ جوان
ہوگئی — اس کا مطلب ہے میری جوانی ردھل چلی. مجھے زندگی سے شکست کھانی پڑے گی — دکھ کی تیز لہر نے انہیں لرزا دیا پھر تو میک اپ میں چھپی جھریاں بھی
یں منہ چڑھاتی معلوم ہوئیں — اس دن سے میک اپ پر ان کی توجہ گہری ہوگئی — میک اپ کے اخراجات نت نئی ساڑیوں اور سامان آرائش کے لئے مسٹر
لیم کی تجوریوں کا منہ کھل گیا — ان کے میک اپ کی تہیں دبیز سے دبیز تر ہوتی گئی — کیونکہ — کیونکہ بے بی اب رضوانہ حلیم بن کر کالج میں پہنچ چکی تھی اور بیگم
لیم کی جھریوں میں اضافہ ہو رہا تھا — ان کی جوانی رو ٹھ رہی تھی اور ان کی حریف کا وجود ان کے لئے شکست کا اعلان تھا — لیکن وہ شکست تسلیم نہیں کر سکتی
تھیں — اور — وہ ان ٹھوس حقیقتوں کو ٹھکرا کر وقت کو منجمد کر لینا چاہتی تھیں. ان حسین لمحوں کو مقید کر لینا چاہتی تھیں جو بھاگے جا رہے تھے — نابید ہونے
کے لئے تیار تھے.

ایک شام رضوانہ حلیم کالج سے آکر کپڑے تبدیل کر رہی تھی کہ ممی کا پیغام پہنچا — آج شام کوئی اہم مہمان آنے والا ہے — مہمان اور میزبان کیا
نامعقولیت ہے؟ وہ جل کر رہ گئی. امتحان سر پر آگیا ہے اور یہ مہمان صاحب خدا جانے کیوں نازل ہو رہے ہیں اور پھر وہ بھی اسے بور کرنے کے لئے وہ
مہمان کا استقبال کرنے بالکل نہ آئی — رات کو بادل نخواستہ اسے کھانے کی میز پہ جانا پڑا. میز کے گرد ممی کے ساتھ ایک نوجوان بیٹھا ہوا تھا. اس نے سرسری
نظروں سے دیکھا اور لاتعلقی سے بیٹھ گئی.

"یہ تمہارے کزن ہیں ڈاکٹر ناظم — اور یہ ہیں رضوانہ حلیم" بیگم نے ناظم کی رضوانہ پر گڑی ہوئی نگاہوں کو دیکھ کر مرے ہوئے لہجہ میں تعارف کروایا۔
ڈاکٹر ناظم اسے مسلسل گھور رہے تھے. پھر ہنس کر بولے —

"بہت خوبصورت ہیں رضوانہ صاحبہ"

اور وہ کھوئی ہوئی سوچ رہی تھی تو یہ اس کے کزن ہیں — کزن، ہونہہ کس قدر واہیات لفظ ہے — یہ اللہ مارے کزن ہوتے بھی بڑے عجیب
ہیں جو برساتی مینڈکوں کی طرح راتوں رات پیدا ہو جاتے ہیں اس رشتہ میں — رشتہ داری — وقت — سرزمین کسی چیز کی قید نہیں. پھر اسے اپنی بیچارگی
پہ بیجان سی ہنسی آگئی.

اور ڈاکٹر ناظم نے بڑے رومانوی انداز میں گھسا پٹا جملہ دہرایا "پہلے ہی کیا کم حسین تھیں کہ ہنس کر اور فتنہ جگا دیا" اور وہ اس گھٹیا انداز
پر جل گئی. ڈاکٹر ناظم کے آتے ہی جانے کیوں بیگم حلیم کے مشاغل میں ایک دم سے فرق آگیا تھا. نہ ویلفیر سوسائٹی کی تقریب نہ کوئی پارٹی. نہ سیر تفریح — وہ
ڈاکٹر ناظم پہ مہربان تھیں. کہیں سر دبا رہی ہیں کہیں اداس ہیں. تو دل بہلا رہی ہیں. پھر ان کا درد بھی سر ابہاری تھا. اور وہ میزبان تھیں یہ تو ان کا فرض تھا —
رضوانہ کڑھتی رہتی.

اور پھر سدا کی سرخ و سفید ممی بیمار پڑ گئیں. ڈاکٹر ناظم تمام دن ان کے کمرے میں بیٹھے ان کے علاج کی تجویزیں کرتے — مسٹر حلیم کا رہا سہا تعلق بھی
گھر سے ختم ہو چکا تھا وہ یہی کھاتوں اور کاروبار میں شدت سے معروف ہو گئے تھے — کاش یہ دولت نہ ہوتی تو مجھے اور ڈیڈی کو اس ذہنی عذاب سے
نروان حاصل ہو جاتا — وہ بے بسی سے سوچتی۔

اور یہ ناظم جب دیکھو سر پر سوار — اس کی عجیب و غریب نظروں سے خوفناک اضطراب جھلکتا اس کے چہرے کے تاثرات سے ایک بھوک
ظاہر ہوتی اور رضوانہ سہم کر رہ جاتی — وہ اس کے خوف کو دیکھ کر ہنستا — تم ڈرتی کیوں ہو؟ — میں تم سے محبت کرتا ہوں.

محبت — محبت اسے یہ لفظ بڑا مضحکہ خیز اور بے معنی لگتا — کیسی محبت؟ — کیسا پیار — کون کس سے محبت کرتا ہے. محبت صرف ماں باپ کرتے ہیں اور
جب وہ ہی نہیں کرتے تو کوئی نہیں کر سکتا — میں خوب سمجھتی ہوں یہ سب حیلہ ہے کہ محبت ایک سودا ہے کچھ دے کر کچھ لینا اور میں انہیں کچھ نہیں دے سکتی. کچھ بھی نہیں

بے مجھے فریب نہ دو ۔۔ وہ نفرت سے منہ پھیر کر کتابیں سنبھالتی اور کالج چلی جاتی ۔

امتحان شروع ہونے میں صرف ایک ماہ باقی تھا اور گھر کا ماحول سخت ناگوار ۔۔ وہ اکتا کر انکل کے کمرے میں چلی گئی ۔۔ انا مجھے چھپا لو ۔۔ مجھے بچا لو ۔ وہ اس سے لپٹ گئی اور جب انکل نے اپنا بھرے انداز میں اسے بھینچ لیا اور تھپکیاں دیں تو اس کے دکھی من میں جیسے ارمانوں کے سارے دیپ بھڑک اٹھے ۔ اور مدھر نین چھم چھم برس پڑے ۔ کاش ممی میری زخمی پیاسی آتما کی کراہ سن سکتیں تو اسے کیسا شانتی کا احساس ہوتا ۔ بیگم حلیم ماں تھیں اور انہیں اپنی ذمہ داری کا پورا احساس تھا ۔ اسی لئے انہوں نے ایک دن رضوانہ کو بلا کر یہ خوشخبری سنائی کہ ۔۔ میں تمہاری شادی ڈاکٹر ناظم سے کر رہی ہوں بات پکی ہے بس بی ۔ اے کا اس سال امتحان دے لو تو شادی ہوگی ۔

اس نے تڑپ کر احتجاجی نظروں سے انہیں دیکھا ۔ لیکن انہوں نے نظریں نہ ملائیں ۔۔ مسٹر حلیم اپنی بیگم کے فیصلے سے انکار کی بھلا کیا جرأت رکھتے تھے پھر جب یہ معلوم ہو کہ رضوانہ کو بھی یہ رشتہ پسند ہے ۔۔ وہ اس ماحول سے اس گھر سے تنگ آ کر فرار چاہتی تھی ۔ اب تو اسے ہر چیز کا شعور ہو گیا تھا ہر راز اس گھر کا اس پر عیاں ہو گیا تھا تب ہی تو اس کی چمپئی رنگت پیلی پڑ گئی تھی اور بڑی بڑی حیران آنکھوں میں جنم جنم کی اداسیوں نے بسیرا کر لیا تھا ۔۔ ڈیڈی البتہ اب اس سے قریب آ گئے تھے ۔ اکثر بلا کر پاس بٹھاتے باتیں کرتے وہ بیحد بوڑھے اور کمزور ہو گئے تھے ۔ رضوانہ انہیں دیکھ کر پھوٹ پڑتی ۔ دونوں کی نگاہیں ملتیں اور ایک دوسرے سے وہ سب کچھ کہہ جاتیں ۔ جو زبانی کہنے کی سکت نہ رکھتے تھے ۔۔ ڈیڈی ہی کے مشورے سے وہ امتحان کی تیاری کے لئے ہوسٹل چلی گئی ۔ وہاں بھی پڑھنے کے بجائے آدھی آدھی رات تک وہ دریچے پر سر ٹیکے خلا میں گھورتی اپنے بھیانک مستقبل کے متعلق سوچتی ۔۔ ڈاکٹر ناظم سے شادی ۔۔ اف کیسی بھیانک واقعیت ۔ ناظم جو کہ ۔۔

اسے تاریکی سے پیار سا ہو گیا تھا ۔ زندگی بھی تو ایک تاریک صحرا ہے ۔ جس میں ہم کسی کا بھی اصلی روپ نہیں دیکھ سکتے ۔ بس آوازوں کے سہارے اچھے یا برے نظریات قائم کر لیتے ہیں ۔ اور حقیقت کی ننھی سی کرن بھی کسی طرف سے آ جائے ۔ اور ہم شکلوں کے حقیقی بھیانک روپ دیکھ لیں تو کیسی تلخی اور نفرت کا احساس ہوتا ہے ۔۔ بس تاریکی اور فریب کی دھند رہے تو اچھا ہے ۔ وہ لوگوں کو دیکھ کر سوچا کرتی ۔۔ لڑکیاں اس کی گم سم شخصیت کو دیکھ کر کہتیں کہ وہ زیادہ خوبصورت نظر آنے کے لئے ایکٹنگ کرتی ہے ۔ لیکن اس دن اس کی روم میٹ کو اس کے ساتھ واقعی ہمدردی ہو گئی ۔۔ دن کو مس ، سائیکالوجی میں کامپلیکس پہ لیکچر دے رہی تھیں ۔ بات ایڈیپس کامپلیکس اور فرائڈ تک پہنچی ۔ رات کو وہ چونک پڑی کامپلیکس کامپلیکس ۔۔ جب ہماری زندگی محض کامپلیکس سے عبارت ہے ۔ یہ زندگی اتنی بے معنی ہے تو ہم جیتے کیوں ہیں : یہ برگساں ۔۔ یہ شوپن ہائر یہ نیطشے یہ آئن سٹائن ہمیں سمجھاتے کیوں نہیں ۔۔ اس نے کتاب اٹھا کر میز پر دے ماری اور شکست خوردہ سی تکیہ پہ سر رکھ کر سسکنے لگی ۔۔ وہ خود کس کامپلیکس کا شکار ہے ؟ یہ میں ہوں شہر کے سب سے بڑے رئیس کی اکلوتی لڑکی ۔

امتحان دے کر گھر واپس لوٹی تو اسے ماحول اور بھی گھٹا ہوا اور پر اسرار معلوم ہونے لگا پھر یکایک انا کو نمونیہ ہو گیا ۔ وہ چل بسی ۔ ڈاکٹر ناظم ممی کے علاج میں مصروف تھے ۔ وہ اب انا کا علاج کیسے کرتے ۔۔ وہ خود کوشش کے باوجود اسے نہ بچا سکی ۔۔ انا کی تکفین و تدفین کے بعد اسے محسوس ہوا جیسے اس جیون کے لمبے رستوں پر انا اسے بھٹکنے کے لئے چھوڑ گئی ہے ۔۔ ساری رات پھر وہ یوں محسوس کرتی رہی ، جیسے انا چکر لگا رہی ہے ۔ گھبرا کر اس نے کمرے کی کھڑکی کھولی ۔ ماحول پر موت کا سا سکوت طاری تھا ۔ کیلے کے پتوں میں سے گذرتی ہوا کی سنسناہٹ اسے اچھی لگی چاندنی میں درختوں کے سائے پر اسرار معلوم ہو رہے تھے ۔ وہ دیکھتی رہی ۔۔ پھر اس نے غور کیا ۔ کیلے کے درختوں کی قطار کے پار شفاف چاندنی میں اسے دو متحرک سائے نظر آئے ۔ اسے پہچاننے میں ذرا بھی وقت نہ ہوئی ۔۔ پھر دبی دبی ہنسی اور پھر ۔۔ اور پھر ۔۔ وہ چکرا کر رہ گئی ۔ اسے بالکل یوں لگا جیسے تاریکی میں روشنی کی کرن نے راز فاش کر دیا ہو ۔۔ پھر دونوں سائے ہاتھوں میں ہاتھ دیئے کھڑکی کے سامنے سے گذر کر واپس اندر آ گئے ۔۔ اور پھر کچھ دیر بعد ایک تیسرا سایہ بھی لڑکھڑاتا اندر داخل ہو گیا ۔ تو یہ بات ہے ۔۔ اسی لئے اسے ذرا بھی تو حیرت نہیں ہوئی جب اس دن اس کی ممی نے زندگی میں پہلی بار اس طرح چلائیں وہ سکی

کی پانچ بوتلیں چڑھالیں۔ پھر ان کا یہ معمول ہی ہوگیا۔ وقت گھسٹ رہا تھا۔ ایک رات وہ خیالات کی یورش سے پریشان ہوکر ڈیڈی کے کمرے میں چلی گئی۔ پورے کمرے میں وسکی کی بوتلیں بکھری پڑی تھیں وہ خود صوفے پر عجیب بے بسی سے اوندھے پڑے تھے۔ ان کی آنکھیں کھلی ہوئی پتھرا گئی تھیں۔ تو ڈیڈی بھی ساتھ چھوڑ گئے۔ سامنے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی، اس کی نگاہیں لاش سے اٹھ کر کھڑکی سے باہر گئیں۔ باہر شفاف چاندنی میں دھلے ذاد عیش دے رہے تھے اس نے گھبرا کر دوبارہ لاش کو دیکھا پھر جلدی جلدی لاش کو اور باہر کا منظر دیکھنے کے بعد وہ باہر دیکھتی ہی چلی گئی۔ ہر چیز ساکت ہوگئی، وقت منجمد ہوگیا۔ چاندنی اس کے لاشعور میں ابد تک کے لئے بس گئی۔ اور وہ خود۔ اس دنیا سے ہمیشہ کے لئے بے نیاز ہوگئی، اسے سچ مچ نروان حاصل ہوگیا تھا۔ اور جب صبح کو ڈاکٹر ناظم اس کمرے میں داخل ہوئے تو اس نے ان پر گلدان کھینچ مارا، شور سن کر ممی آئیں تو اس نے تپائی اٹھا کر انہیں نشانہ بنایا، لیکن وہ بچ گئیں۔ پھر جو چیز ہاتھ آئی توڑ پھوڑ ڈالی اور بڑی مشکل سے قابو میں آئی۔ جب سے وہ اقلیم جنوں کی اس تاریکی میں پڑی صرف یہ سوچتی رہتی ہے کہ یہ چاندنی راتیں مجھے بے چین کیوں کر دیتی ہیں، اور ایسے میں یہ کیوں دل چاہتا ہے کہ ہر چیز تباہ کر دوں۔ اور جب اتوار کو ایک نوجوان جس کے ماتھے پر زخم کا نشان ہے اپنی خوبصورت ادھیڑ عمر بیوی کے ساتھ آتا ہے، اور عورت ڈاکٹر سے پوچھتی ہے کہ "ڈاکٹر میری بہن کا کیا حال ہے؟" تو ڈاکٹر مایوسی سے سر ہلا دیتا ہے۔ وہ دونوں ہی مریضہ کا سامنا کرنے سے ہچکچاتے ہیں، کیونکہ انہیں دیکھتے ہی وہ ہسٹریائی انداز میں چیخ پڑتی ہے۔

یوں ہی چاندنی راتوں میں جب ہر چیز ساکت ساکت اور خاموش و سوگوار ہو جاتی ہے۔ ہوائیں سسکتی معلوم ہوتی ہیں تو اس کے شعور پہ ایک لہر ایک رو یہ کہتی گذر جاتی ہے۔ "تمہیں تو نروان حاصل ہوگیا۔ اس لعنتی دنیا سے فرار ایک ابدی شانتی اور سکوت۔" اور پھر اس کی دلدوز چیخ فضا میں دکھ بکھیر دیتی ہے جو ازل سے انسانی روح کو ڈستا رہا ہے۔

جدید شاعری کا
عہد آفریں شاعر
اختر الایمان
کا
نیا شعری مجموعہ
بنت لمحات
(زیر طبع)
۲۷، ریلوے روڈ۔ باندرہ بمبئی ۵۰

سعیدہ افضل
افق۔ کراچی

شوبھا رانی

" شوبھا رانی! شوبھا رانی! شوبھا رانی!"

" بھئی یہ کیا شور مچا رکھا ہے"۔ تم جھاڑی سے نمودار ہوتیں۔

" کیسا شور۔" میں خود ہی انجان بن جاتی۔

" یہ شوبھا رانی۔ شوبھا رانی۔" تم برا سا منہ بناتیں۔

" یہ میں تو نہ تھی۔!"

" تو پھر کون تھا۔" تم خفا ہونے لگتیں۔

چمپا کے پھول۔ موگرے کے پھول۔ کہتے تھے۔ شوبھا رانی کا گزر ابھی تک ادھر سے نہیں ہوا۔ شبنم انتظار میں رو دی۔ اب ہم انتظار میں تھکے جاتے ہیں۔

" چل ہٹ۔" تم پلکیں جھکائے ہی مسکرا دیتیں۔ بہت سارے پھول اپنے دامن میں بھر تم مندر کی سمت چل دیتیں۔

" اور یہ جو رہ گئے ہیں بیچارے ڈال پر۔" تم ایک بار یوں ہی مسکراتیں۔

" ہائے بیچارے"۔ بھیّا ایک لمبی آہ بھرتے۔ ہر روز کی طرح کہیں نہ کہیں سے درمیان میں کود پڑتے۔ تم بھیّا سے بہت کتراتی تھیں۔ کیونکہ وہ خوب تمہیں تنگ کرتے۔ اور مجھے تو اچھا خاصا رلا کر چھوڑتے۔

تم کہتیں "بھیا بہت شریر ہیں۔ ہم کل سے تمہارے پھول لینے نہیں آئیں گے۔"

" اوئی لڑکی یہ تو باؤلی ہوئی ہے۔ کیوں شوبھا بیٹی، کل سے کیوں نہ آؤ گی۔ سے پھول نہ ہوئے موئے ہیرے ہو گئے"۔ دادی اماں جا نماز پر بیٹھے بیٹھے اپنی فراخدلی کا ثبوت بھی فراخ دلی سے ہی دینے کی کوشش کرتیں۔

یہ لو دادی جان کی آواز سنتے ہی بھیّا تو غائب۔ بیچ میں میری شامت۔

مگر یہ تو تمہارا معمول تھا۔ مندر جانے سے پہلے دادی اماں کو پرنام کرنا۔ بہت سے پھول بھگوان کے چرنوں کے لئے۔ اور باقی کے تم گجرے بنا لیتیں۔ تمہارے دیئے ہوئے گجرے اب بھی میرے پاس بہ حفاظت رکھے ہیں۔ گو وہ بہت مرجھا چکے ہیں۔ مگر تمہاری محبت کی مہک اب تک ان میں رچی ہوئی ہے۔ وہ ہماری معصوم محبتوں کے شاہد ہیں اور آج بھی نہیں مرجھائے ہیں۔ محبت تو وقت کی قید سے آزاد ہے شوبھا۔

موگرے اور چمپا کے پھول تو اب بھی کھلتے ہی ہوں گے شو بھا۔ بیلے کی کلیاں تو اب بھی یونہی چاندنی راتوں میں چٹکا کرتی ہوں گی۔ مگر شو بھا کیا اب بھی تم کسی بیلے کے آنگن میں چاندنی راتوں میں آنکھ مچولی کھیلنے جاتی ہو گی۔

یاد ہے تمہیں تم، ہم ربی اور بھیا آنکھ مچولی کھیلنے میں کس طرح لڑا کرتے تھے!

"دیدی ہم آپ کے ساتھ چھپیں گے"۔ ربی ٹھنک جاتا۔

"پر تم چلانا مت"۔ تم ننھے ربی سے وچن لیتیں۔ مگر ہر بار تمہاری ہار ربی ہی کی وجہ سے ہوتی۔ چاندنی راتوں کے یہ کھیل، بچپن کے یہ معصوم سنہرے دن بھی چاندنی راتوں کی طرح بیت جانے والے تھے۔ بھلا دائمی کیونکر ہو سکتے تھے۔

مگر ان کی یادیں تو دائمی ہو گئی ہیں۔ کبھی کبھی میں سوچتی ہوں شو بھا۔ گو ہمارے مذہب الگ الگ تھے۔ پر دل تو ایک تھے جس میں برسوں کا پیار بسا ہوا تھا۔

تم کہا کرتیں بھیا "سب سے بڑا مذہب تو محبت ہے۔ ماتا جی کی بات کا برا نہ مانو"۔ تمہاری نگاہیں التجا کرتیں۔ اب لگتا ہے شو بھا تم واقعی نہ ہندو تھیں۔ نہ مسلمان۔ مگر محبت تھیں۔

ہم، تم اور بھیا۔ بچپن میں کیسی کیسی شرارتیں کیا کرتے تھے۔ تمہیں یاد نہ ہو شاید۔ پر شو بھا۔ مجھے تو وہ سب یوں یاد ہے جیسے یہ کل ہی کی بات ہو۔ اور جب تم ہمیں لے کر اپنی ماتا جی کے پوجا کے کمرے میں گھس جایا کرتیں تو ماتا جی چھڑی سے ہماری خوب خبر لیتیں۔ تم سہم کر مورتی سے لگ کر کھڑی ہو جاتیں۔ اور میں اور بھیا روشن دان میں سے آسمان کی طرف دیکھنے لگتے۔ اب وہ چھڑی یاد آتی ہے۔ تو جی چاہتا ہے کوئی وہ عمریں۔ وہ پل۔ پل بھر پھر سے لوٹا دے۔

اور پھر پوجا کے کمرے کو پوتر کرنے کے لئے تمہاری ماتا جی کو کیا کیا جتن نہ کرنے پڑتے۔

جب بھی مجھے وہ باغ یاد آتا ہے۔ تو بے اختیار ہنسی آ جاتی ہے۔ ایسی کہ میری آنکھوں میں خود بخود موتی سے چمک اٹھتے ہیں۔ وہ باغ جو ہم تینوں کا تھا۔ اور وہ جو کسی کا بھی نہ تھا۔

تم کہتیں "گلابوں والا حصہ میرا"۔ "اور آموں والا میرا"۔ بھیا ہنس پڑتے۔ "باقی جو بچا سب میرا۔" باغ بہت بڑا تھا۔ "واہ، یہ کیوں؟ ابھی ہم نے پورا حصہ کب کیا ہے۔" تم غصہ میں پاؤں پٹکتیں۔ "اچھا سب تم دونوں آپس میں بانٹ لو۔ صرف سامنے کی جالی میری۔" بھیا ہم سے ذرا بڑے تھے اس لئے اپنی دانست میں قدرے چالاکی سے کام لیتے۔

"صرف سامنے کی جالی میری"۔ وہ جالی پر چڑھی چمپا کی بیل کی طرف اشارہ کرتے۔ اچھا! ہم دونوں خوشی سے سمجھوتہ کر لیتیں۔

"یاد رکھنا شو بھا۔ پوجا کے لئے ایک پھول نہ ملے گا"۔ بھیا جتاتے۔ اور تمہیں چمپا کے سفید پھول بے حد پسند تھے۔ "واہ کیوں نہیں ملیں گے"۔ تمہاری آنکھوں میں آنسو بڑی جلدی چھلکنے لگتے تھے۔ بھیا تمہارے آنسوؤں سے بہت ڈرتے تھے۔ گو تمہیں ستاتے تھے۔ پر رلاتے نہ تھے۔ اور میں دل ہی دل میں تمہاری اس فوقیت پہ جلا کرتی تھی کیونکہ ہمیشہ بھیا مجھے رلا کر اپنی بہادری کا خراج وصول کیا کرتے تھے۔

اچھا شو بھا۔ تمہیں تھوڑے سے پھول ملیں گے۔ اور اس "چیں بیں" کو ایک بھی نہیں۔ میں دل میں جل کر کباب ہو جاتی۔ بھیا مجھے "چیں بیں" کہہ کر چڑایا کرتے۔ اور اس لفظ سے میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔

میں ایک آم تمہیں نہیں دوں گی۔ میں بھی انہیں آموں سے یکسر محروم کر دیتی۔

اور ہاں تمہاری ماتا جی کو ایک بھی پھول نہیں ملے گا شو بھا۔ بھیا اپنا آخری فیصلہ اپنی ملکیت کے بارے میں سنا دیتے۔

اور تب پجاری کے قدموں کی چاپ سن کر ہم سب اپنی ملکیت سے دست بردار ہو کر بھاگ کھڑے ہوتے۔

آج جب مجھے وہ دن یاد آتے ہیں تو یوں لگتا ہے۔ جیسے زندگی کوئی تتلی تھی۔ جو ہمارے ذہن میں اپنے پروں کا رنگ چھوڑ کر جانے کن ویرانوں کی سمت اُڑ گئی۔

ہائی اسکول کی چار دیواری میں قدم رکھا۔ تو وہاں بھی مسرتوں نے ہمارا ایک ساتھ خیر مقدم کیا۔

تمہیں یاد ہے۔ وہ بلند قامت کیکر کی چھاؤں تلے سنگ مرمر کا حوض جس کے کنارے بیٹھ کر تم مجھے شعر سنایا کرتی تھیں۔ اور آج بھی وہ شعریت میرے ذہن میں مٹھاس گھول رہی ہے۔ اور جب ہم بوجھل کتابوں سے تھک جایا کرتے تو تم کہتیں۔

"چلو سیما۔ کہاں۔" وہیں اپنے پیراڈائز پوائنٹ، تم اسے پیراڈائز لوائنٹ کہا کرتی تھیں۔ حوض کے کنارے بیٹھ کر ہم کیکر کے درخت میں اس کی ٹھنڈی چھاؤں تلے پیلے پھولوں کو اپنی کتابوں میں جمع کرتے جاتے جو درخت سے چک پھیریاں کھاتے ہمارے اوپر گرا کرتے تھے۔

تم کہتیں۔ کل دیوالی ہے۔ تم بھی دیئے جلانا۔

بھیا مٹھائی مانگ رہے تھے شوبھا۔ میں تمہیں بھیا کا سندیسا سناتی۔ پھر تم ماتھے پر سرخ بندی لگائے بالکل داسیوں کی طرح ہاتھ میں تھال لئے آتیں۔ دھیرے دھیرے۔ جیسے کوئی وہم سے بھی نازک سا وجود ہو۔ بھیا بے دھیانی سے تمہارے منتظر ہوتے۔ وہ اب تم سے زیادہ بات نہیں کرتے تھے۔ مگر کبھی کبھی مجھ سے کہتے۔ شوبھا سے کہنا۔ "چنپا کی بیل ہماری ہے" اور تم یونہی سا مسکرا دیتی۔

تم آتیں۔ تو چپکے سے۔ دھیرے دھیرے اور یوں لگتا۔ جیسے تم ابھی نہیں آئی ہو۔ بلکہ یہاں پہلے سے ہی موجود تھیں۔ پہلے مبہم سی تھیں۔ اب واضح ہو گئی ہو۔ آج پورنماشی ہے۔ تم مٹھائی بھیا کی میز پر رکھ جائیں۔ بھیا آتے تو کہتے۔ سیا کیا آج پورنماشی کی رانی کا گزر تو یہاں سے نہیں ہوا۔

"ہاں بھیا" میں بے اختیار ہنس پڑتی۔

مہندی لگاؤں گی۔ تمہارے لہجے کی خوشی میری روح کو بھی مسرت کی حسین وادیوں کے سپرد کر آتی۔ کیوں رانی جی۔ کیا راجہ جی تمہارے دوار آئے ہیں۔ میں تمہیں چھیڑتی۔ ہائے تمہیں ذرا لاج نہیں آتی سیا! تم خشمگیں نگاہوں سے مجھے گھورتیں۔ واہ! کیا کل میلہ نہیں ہے۔ تمہارے لہجہ کی معصومیت میرے دل کی خوشی کو اور بھی دوبالا کر دیتی۔

"بھیا نے تمہیں عیدی دی۔ ہماری عیدی لاؤ۔" تم شرارت پر اتر آئیں۔

"تم خود جا کر لے لو۔" میں تمہیں ستانے کو جھوٹ موٹ بھیا کو آواز دینے لگی۔

"ہائے رام"۔ تم گھبرا جاتیں۔

"ہائے تمہیں لاج نہیں آتی"۔ بھیا پیچھے سے تمہاری جیسی آواز بنا کر کہتے۔

"ہائے رام"۔ تم سٹ پٹا جاتیں۔ تمہارا چہرہ گلاب ہو جاتا۔

"میں تو لجا سے جل جل ہو گئی"۔ بھیا شرم سے پانی پانی ہونے کا ترجمہ خالص ہندی میں کرتے۔

تم خفا ہو جاتیں۔ بھئی میں تمہارے گھر اب نہیں آؤں گی۔ تم مڑنے لگتیں۔

"ائے وا۔ یہ لڑکی تو باؤلی ہوئی ہے"۔ جانے کیوں دادی اماں تمہارے یہ الفاظ ضرور سن لیتیں۔

"شوبھا بیٹی! کیا اس نے پھر تجھے کچھ کہا ہے"۔ دادی اماں اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے مجھے اپنی پوری کوشش سے گھورتیں۔ اور پنکھا گھما کر تخت پوش پر دے مارتیں۔

یا الٰہی۔ یہ شیطان کی طرح بھیا ہر جگہ حاضر اور پھر چھلاوے کی طرح غائب ہیں۔ بھیا کی اس عادت سے میں جل ہی تو جاتی۔ آخر وہ دادی اماں کو نظر

ماتا جی۔ اپنے بھگوان کی مورتی کے آگے سر نہوڑائے بیٹھی تھیں۔ آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑی لگ رہی تھی۔

میرے قدم رک گئے۔ بھیا کے قدم رک گئے۔ دادی جان کے قدم رک گئے۔ ماتا جی اٹھیں۔ آہستہ آہستہ۔ ایک مقدس روح کی طرح۔ میں نے بنا چاہا۔ ماتا جی نے روک دیا۔ نہیں بیٹی۔ تمہی تو کول لتا ہی ہے۔ میں اپنے کمرے کو پھر پوتر کر لوں گی۔ ہم سب اندر آ گئے۔ انہوں نے اندر سے کنڈی چڑھا دی۔ کھانا لائیں۔ تم نے چاہا ہم تھوڑا سا کھا لیں۔ مگر ہم نہ کھا سکے۔ آنسوؤں نے اتنی مہلت ہی نہ دی۔

باہر شور اور دھماکوں کی مہیب آوازیں مسلسل دل ہلا رہی تھیں۔ تمہارے بھائیوں نے ہمارے گھر کو چند اور لوگوں کے ساتھ مل کر آگ لگا دی تھی۔ اور شعلے روشن دان سے صاف نظر آ رہے تھے۔ اف یہ منظر کتنا مہیب تھا۔ ہمارا گھر جل رہا تھا۔ ہمارا سامان جل رہا تھا۔ اور چمپا کی بیل جل رہی تھی۔

چمپا کی بیل جل رہی ہے شوبھا! بھیا نے بڑے دکھ سے سوچا تھا۔

تمہاری خاموش نگاہیں۔ آگ کے ان سرخ اور ظالم شعلوں میں چمپا کی کلیاں پانے کی جستجو میں لگی ہوئی تھیں۔

تیسرے پہر گہرا سناٹا چھا گیا۔ اور تم نے میری بندی کو اور بھی گہرا کر دیا۔

پھر تم ہمیں رات کی تاریکی میں دور تک چھوڑنے آئیں۔ راستے میں باغ نے ہمیں رخصت کیا۔ آموں کے پیڑ نے ہمیں خدا حافظ کہا اور کیکر کے نازک بوٹے نے ہمیں الوداع کہا۔ تم ہمارے ساتھ آئیں۔ یہاں تک کہ حفاظتی دستے نے ہمیں اپنی تحویل میں لے لیا۔

ماتا جی نے دادی اماں کو تھام رکھا تھا۔ روبی اب بھی تمہارے پاس تھا۔ بھیا یوں چل رہے تھے جیسے کوئی بے جان سنے یا ایک چھا سرد سی کردے۔

پھر ہم تم سے رخصت ہوئے۔ ماتا جی سے رخصت ہوئے۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔

جاتے جاتے تم مڑیں اور جو کچھ تمہاری نگاہوں نے کہا میرے دل پر نقش ہو گیا۔ تمہاری نگاہوں نے کہا۔

"یہاں سب سے بڑا مذہب "محبت" ہے۔ سب سے عظیم۔ سب سے بلند تر۔ تمہاری نگاہوں نے بھیا سے کہا۔

الوداع۔ چمپا کی کلیاں تمہیں یاد کریں گی۔ چمپا کی کلیاں "آگ" میں نہیں جل سکیں۔ وہ تو میرے دل کی مقدس زمین پر مہکتی رہیں گی۔

تمہاری نگاہوں نے دادی جان سے کہا۔

پریوں کی کہانیوں کا فغانی کیف اور آپ کی شفقت کا تاثر اس ایک سرحد کو پار کرنے سے نہیں ایسی ہزاروں سرحدوں کو پار کرنے کے بعد بھی کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ کبھی بھلایا نہیں جا سکتا۔

اور شوبھا رانی۔ گو یہ بات پرانی ہو چکی ہے۔ مگر آج بھی دلوں میں نئی ہے۔ اب بھی جب کبھی باہر چھم چھم بارش ہوتی ہے تو مجھے چمپا کی کلیاں بے اختیار یاد جاتی ہیں۔ جن کی سفیدی بارش میں اور بھی نکھر اٹھتی ہے۔ اور جن کا روپ تمہارے من کی طرح اجلا ہے۔

وہ برساتیں جن کی گود میں ہمارے بچپن نے خوشیوں کے چھینٹے اڑائے۔ شاید آج ان کی تمام تر ٹھنڈک بھیا کی آہ میں خنکی بن کر سما گئی ہے۔

شوبھا رانی۔ بعض یادیں ایسی ہوتی ہیں۔ جو آنکھوں میں دیپک جلا جاتی ہیں۔

نقش ادب کی خدمت کرتا ہے۔ آپ نقش کی سرپرستی کیجئے۔

فرصت کے لمحات کا بہترین ساتھی

ماہنامہ نقش کراچی

ایس۔ ایم۔ شاہنواز
نیا دور۔ لکھنؤ

یہ لوگ

"کیسی ہو؟" مرد نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔
"ٹھیک ہوں۔" عورت کی آواز اس سے بھی زیادہ غمناک تھی۔
"اور تم؟" عورت رو دینے رہی تھی۔
"میں بھی۔"
"ہوں!"
"کبھی کبھی تم پر بہت غصہ آتا ہے۔ تمہاری ذرا سی ضد نے کتنی بڑی سزا دی ہے ہم دونوں کو۔ اب چاہے سب کچھ برداشت کر رہی ہو، مگر پچھتاوے وہ لمحات واپس نہیں لا سکتے۔ تم نے اپنی کیا حالت بنا ڈالی ہے!"
"اور تمہاری؟"
"میں بالکل بھلا چنگا ہوں... ہنستا کھیلتا۔" پھیکی ہنسی۔
"میں سب جانتی ہوں۔ اب کیوں دھوکہ دے رہے ہو۔ خود کو بھی اور مجھے بھی؟ تمہارے دل کی حالت مجھ سے کیسے چھپی رہ سکتی ہے۔ آج ہم کتنے برسوں بعد ملے ہیں! ایسا لگتا ہے جیسے کل ہی کی بات ہو۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا۔ تم بھی وہی ہو۔ میں بھی وہی ہوں۔ یہ پارک، یہ عمارت، یہ سڑک اس پر چلتے ہوئے لوگ۔ سب کچھ وہی ہے، مگر پھر بھی بہت کچھ بدل چکا ہے، ہمارے راستے بدل چکے ہیں۔ ہم دونوں کی زندگی یکسر بدل چکی ہے۔"

عورت خاموش ہو چکی تھی۔

تانگہ جھٹکے کھاتا لہراتا چلا جا رہا تھا۔ وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی عورت اور مرد کی گفتگو بڑے غور سے سن رہا تھا۔ وہ اگلی سیٹ پر تھا اور اس کے برابر ایک اور شخص بورے کی طرح موٹا کمبل اوڑھے بیٹھا تھا۔ وہ گھڑی گھڑی اپنی لہراتی ہوئی داڑھی کھجا رہا تھا اور گہری سوچ میں تھا۔ وہ شاید عہد رفتہ کو آواز دے رہا تھا یا پھر اپنے گاؤں میں کھیت پر بیٹھی اپنی بڑھیا کے قریب پہنچ چکا تھا۔ تانگے والے کی چونکا دینے والی آواز کبھی کبھی اچانک بلند ہوتی اور گھوڑا خوف سے جھٹکا کھا کر دو چار قدم تیز دوڑنے لگتا، اور تھوڑی دیر بعد پھر اپنی ٹٹو والی چال پر آ جاتا۔

وہ اسٹیشن ہی سے پیچھے بیٹھے ہوئے مرد اور عورت کی گفتگو بڑی خاموشی سے سن رہا تھا۔ شاید دو محبت کے متوالے آج برسوں بعد ملے

ہیں۔ دونوں میں شدید پیار ہوگا۔ آپس کی بات چیت سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے۔ اس نے سوچا۔ ایک روز دونوں نے ایک ساتھ رہنے کے عہد و پیمان کئے ہوں گے۔ ایک ساتھ جینے کے، ایک ساتھ مرنے کے، اور پھر زمانے کی فضا ان کے پیار کو راس نہ آئی ہوگی۔ کوئی ایسا حادثہ پیش آیا ہوگا کہ یہ دونوں مرادیں نہ پاسکے اور پیار گھٹ گیا۔ شاید لڑکے کے باپ نے اس لڑکی کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کر دیا ہو، یا لڑکے کی ماں نے زہر کھا لینے کی دھمکی دی ہو، یا پھر لڑکی کے باپ نے کسی دباؤ یا لالچ میں آکر لڑکی کی دوسری جگہ شادی کر دی ہو۔ نہ جانے ان مظلوموں کے درمیان کون سی دیوار حائل ہوگئی۔ — پیسے کی یا مذہب کی یہی دو چیزیں ہیں جن سے دنیا کے تمام جھگڑے جنم لیتے ہیں۔ ہر معاملے میں یہی دونوں چیزیں چھا ندپڑتی ہیں۔ جو بھی نیا ہنگامہ یا شوشہ کھڑا ہوتا ہے اس کی بنیاد یہی ہیں۔ ان سے بچ کر آخر انسان کہاں جائے؟ کیا کرے؟؟ کتنے دکھی معلوم ہوتے ہیں یہ زمانے کے سلوک سے! اپنی محبت کے مٹ جانے سے! بے چارے! اس کے دل نے کہا۔ اسے ان سے ہمدردی ہوگئی تھی اور آئندہ ہونے والی گفتگو سے دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔ مگر وہ دونوں خاموش تھے۔ شاید ان کا دل رو رہا ہو۔ اس کے دل سے بے اختیار ایک آہ نکل گئی۔ لوگ اتنے دکھی کیوں ہوتے ہیں! اتنے بڑے غم ننھے سے دل پر کیسے برداشت کر لیتے ہیں اور اُف تک نہیں کرتے۔ وہ تو ذرا سا غم برداشت نہیں کر سکتا۔ ہر حال میں خوش رہتا آیا ہے۔ وہ دعائیں مانگا کرتا تھا۔ "ہے بھگوان، تو میری جان بھی ہنستے ہنستے نکالیو۔ جب میں مروں تو میرے من پر کوئی بوجھ نہ ہو، کوئی کلیش نہ ہو، بلکہ شانتی ہو میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہو جب میرا دم نکلے"۔

وہ تو اس وقت بھی نہیں رویا تھا جب اس کی ماں مری تھی۔ ایک آنسو آنکھ سے نہیں ٹپکا۔ نہ وہ دکھی ہوا۔ ایک لمحہ کے لئے اسے محسوس ہوا جیسے کوئی قیمتی شے کھو گئی ہو۔ مگر فوراً ہی ایک جھٹکے سے اس نے اپنے خیالات کو بدل ڈالا۔ اپنے ذہن سے ماں کے غم کو کھرچ پھینکا۔ لوگوں کو اس کی حالت پر تعجب ہوتا تھا۔ ماں کے غم میں اس کا چھوٹا بھائی روتے روتے بے حال ہوا جا رہا تھا۔ وہ مہینوں اداس رہا۔ تنہائی میں بیٹھے بیٹھے خود بخود اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگتے۔ وہ اسے دیکھتا اور مسکرا کر رہ جاتا۔ یہ بات نہیں کہ ماں سے اس کی لڑائی رہتی، یا وہ اُسے کم پیار کرتی تھی۔ اس کے برعکس ماں کو اس سے بے انتہا پیار تھا۔ وہ سب سے زیادہ اسی کو چاہتی تھی۔ اگر شام کو وہ دیر سے گھر آتا تو بے چین ہو اٹھتی۔ پیار سے اُسے ڈانٹتی اور سمجھاتی۔ "بیٹا تو اتنی دیر سے گھر نہ آیا کر تجھے دیر ہو جاتی ہے تو میرا کلیجہ دھک دھک کرنے لگتا ہے"۔ خود اس کی بھی یہی حالت تھی۔ وہ ماں کو چاہتا تھا۔ اس سے بے حد پیار کرتا تھا۔ مگر اس کی موت پر دکھی نہ ہوا۔ اسے کوئی رنج نہ تھا۔ وہ کہتا فکر یا غم کسی مسئلے کا حل بھی تو نہیں۔ صرف انسان کی صحت کے دشمن ہیں، اور اُسے اپنی صحت سب سے زیادہ عزیز تھی۔ بچپن ہی سے وہ صبح دھرندو استاد کے اکھاڑے میں کسرت کے لئے جاتا اور جب واپس آتا تو ماں بادام اور دودھ اس کے لئے تیار رکھتی تھی۔ وہ دودھ پیتا رہتا اور ماں اس کے جسم اور اٹھان کو دیکھتی رہتی۔ دل ہی دل میں خوش ہوتی اپنے لاڈلے بیٹے کے خوبصورت جسم کو دیکھ دیکھ کر۔ اس کا جسم تھا بھی خوبصورت ۔۔ مضبوط، گٹھا ہوا، گورا گورا۔ ماں اس کی بلائیں لے کر کہا کرتی "میں واری جاؤں اپنے چاند کے"۔ تو اس کے بازوؤں کی مچھلیاں پھڑک اٹھتیں، گردن تن جاتی۔

اس ماں کی موت پر بھی اس کا دل نہ پسیجا۔ وہ دکھی نہ ہوا۔ مگر آج دو محبت کے ماروں کی باتیں سن کر اس کا سخت دل تڑپ اٹھا۔ وہ بے چین ہو گیا۔ کاش وہ ان کے لئے کچھ کر سکتا! ان کی جھولی مسرت کے پھولوں سے بھر سکتا۔

تانگہ اب اونچائی پر چڑھ رہا تھا۔ اس لئے گھوڑے کی رفتار اور بھی سست ہوگئی۔ تانگے والے کی بے ہنگم آوازیں تیز ہو رہی تھیں اور وہ چاروں خاموش تھے۔ اس کے کان پیچھے بیٹھے ہوئے مرد عورت کی باتیں سننے کے لئے بے چین تھے اور دل میں ان کے لئے ہمدردی کا بہتا ہوا دریا۔ وہ دونوں خاموش نہ جانے کہاں کھوئے ہوئے تھے۔ اس کا گھر قریب آتا جا رہا تھا۔ آٹھ بجلی کے کھمبوں کے بعد وہ اس تانگے سے اتر جائے گا اور ان کے متعلق کچھ بھی نہ جان سکے گا۔ ان سے پتہ پوچھ لے، یا انہیں اپنا گھر دکھا دے کہ کسی بھی مصیبت کے وقت وہ اس کا دروازہ کھٹکھٹا دیں۔ مگر نہیں۔ وہ اپنے دل میں کیا سوچیں گے۔ اس کا دل چاہا تانگہ میں بیٹھا رہے اور دیکھے یہ کہاں جاتے ہیں۔ مگر وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ آج پورے ایک برس بعد گھر جا رہا تھا۔ ان لوگ

گڈی کو پیار کرنے کی چاہ بڑھتی جا رہی تھی۔ بیوی اور بچے اس کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ اس نے خط کے ذریعے گھر پہنچنے کے وقت سے انہیں پہلے ہی مطلع کر دیا تھا۔ ایک برس تک وہ گھر سے سینکڑوں میل دور ملازمت پر تھا۔ اس نے اپنی کمپنی کے مالک کو کئی بار چھٹی کے لئے درخواست دی۔ اپنی بیوی کی بیماری کا بہانہ کیا اور مالک کو بتایا کہ اس کا گھر پہنچنا بہت ضروری ہے۔ مالک نے اس سے ہمدردی ظاہر کی۔ اسے گھر بھیجنے کے لئے رقم بھی دی، مگر چھٹی نہ مل سکی۔ کمپنی نے کئی لاکھ روپے کی لاگت سے تیار ہونے والی ایک عمارت کا ٹھیکہ لے رکھا تھا۔ کام بہت پھیلا ہوا تھا۔ اور مالک کو اس سے زیادہ معتبر کوئی آدمی نہیں مل رہا تھا جو اس کی غیر موجودگی میں کام سنبھال سکتا۔ مالک نے کہہ رکھا تھا جب بھی یہ کام ختم ہو جائے وہ گھر جا سکتا ہے۔

اب کہیں جا کر عمارت مکمل ہوئی تو وہ ایک برس بعد بیوی اور بچوں کے پاس جا رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا اس کے پر لگ جائیں اور اڑ کر گھر پہنچ جائے۔ اسے اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا کہ وہ اس مریل ٹٹو کے تانگے میں کیوں بیٹھ گیا۔ اب تک تو وہ پیدل چل کر بھی گھر پہنچ جاتا۔ پیچھے بیٹھے ہوئے مرد کی ٹھنڈی سانس اسے صاف سنائی دی۔ گھر والوں کا خیال دل سے یک لخت نکل گیا۔ ذہن سے سب کچھ جھٹک کر اس نے سانس روک لیا۔ شاید پھر بات چیت کریں۔ انہیں گفتگو کرنی چاہئے ورنہ ان کے دل پھٹ جائیں گے۔ اس کی ماں کہا کرتی تھی "من کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے کچھ بات کرنا بہت ضروری ہے"۔ یہ تو خاموش بیٹھے ہیں۔ بولتے کیوں نہیں۔ اپنے من کو کیوں جلا رہے ہیں؟ ہمدردی کے ساتھ ہی اسے دونوں پر غصہ بھی آ رہا تھا۔

"رجنی!" مرد جیسے دور سے بول رہا ہو۔

"ہوں۔" عورت نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

"تم اداس ہو؟"

"نہیں۔"

"نہیں! پھر تمہاری آنکھوں میں یہ آنسو کیوں ہیں؟ پگلی، کیا ہوا جو ہم دونوں بچھڑ گئے۔ اتنی دور رہتے ہوئے ہمارے دل تو قریب ہیں۔ ہمارے ذہنوں میں تو کوئی فاصلہ نہیں۔ اپنے جی کو اداس نہ کرو۔ گھٹ گھٹ کر خود کو کیوں مٹا رہی ہو ——؟ دیکھو۔ میری طرف دیکھو۔ کیا میں خوش ہوا تھا اپنی محبت کا گلا گھٹتے دیکھ کر؟ مگر اب ہر وقت آنسو بہانے سے بھی تو کوئی نتیجہ نہیں۔ تمہارا پتی ہے، بچے ہیں۔ ان کی خاطر اپنی محبت کی خاطر زندہ رہو۔ ورنہ ——"

تانگہ ایک جھٹکے سے رک گیا۔ دونوں خاموش ہو چکے تھے اور اس کا دل رو رہا تھا۔ جی چاہا دونوں کو اپنے سینے سے لگا لے اور چیخ چیخ کر رو دے۔

"بابو، گھسیاری منڈی آ گئی۔ آپ کو یہیں اترنا ہے نا!" تانگہ والا اسے گم سم بیٹھا دیکھ کر اسے کچھ یاد دلانا چاہتا تھا۔ اس کے جی میں آئی کہہ دے "نہیں آگے چلو"۔ وہ ان دونوں کے متعلق اب زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتا تھا۔ ان کے دکھ کے چھینٹوں سے وہ خود کو نہ بچا سکا تھا۔ وہ ان دونوں کی خوشی کے لئے ہر طرح کی بازی لگانے کو تیار تھا۔ مگر اچانک ہی بچوں کے مسکراتے چہرے اس کی آنکھوں میں گھوم گئے اور وہ کٹھ پتلی کی طرح تانگے سے اتر گیا۔ تانگے والے کو پیسے دیتے ہوئے اس نے جوڑے پر نظر ڈالی۔ عورت کے نقوش بڑے تیکھے تھے اور آنکھوں میں غم کی گہری پرچھائیاں۔ اس کے بائیں گال پر بھورا تل تھا۔ مرد بھاری بھرکم جسم کا خوب صورت جوان تھا۔ چوڑی پیشانی اور روکھے گھونگھریلے بال، چہرہ بجھا ہوا۔

تانگہ چل دیا اور وہ وہیں کھڑا انہیں دیکھتا رہا۔ اس کی نظریں دور تک تانگے کا تعاقب کرتی رہیں اور پھر ایک موڑ پر وہ اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا اس کا دل ڈوبتا چلا گیا۔

وہ جیسے ہی گھر میں داخل ہوا خوشی کا ایک طوفان آ گیا۔ بیوی کا چہرہ کھل اٹھا اور بچے ڈیڈی ڈیڈی کا شور مچا کر اس سے لپٹ گئے۔ اس نے بچوں کو خوب پیار کیا۔ بیوی سے بہت ساری باتیں کیں —— اپنی، اپنے مالک کی، اپنی کمپنی کی، اپنے دوستوں کی باتیں مگر اس کے دل پر ایک بوجھ تھا۔ اندر ہی اندر جیسے کوئی دل کو کسی تیز دھار دار چیز سے کھرچ رہا ہو۔ وہ پورے ایک برس بعد گھر آیا تھا۔ کتنے جاں گسل انتظار کے بعد یہ سال بیتا تھا! گھر آنے کا کتنا ارمان تھا دل میں! بچوں کو پیار کرنے اور بیوی سے باتیں کرنے کے لئے وہ بیتاب تھا۔ ٹرین میں بیٹھا ہوا وہ تمام راستے گھر، بیوی، بچوں اور دوستوں کے بارے میں سوچتا

رہا تھا۔ ایک ایک کی صورت نگاہوں میں گھوم رہی تھی۔ جلد سے جلد گھر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ جب وہ اسٹیشن کی عمارت سے باہر نکلا تو اسے ایک تانگہ نظر آیا۔ جو اسی کے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ تانگہ میں تین سواریاں تھیں۔ اگلی سیٹ پر ایک آدمی کی جگہ خالی تھی اور تانگے والا چیخ چیخ کر سواریوں کو اپنی طرف متوجہ کر رہا تھا۔ وہ سوٹ کیس اور باسکٹ ہاتھ میں لئے تانگہ میں جا بیٹھا۔ تانگے والے کو اس نے تاکید کی تھی کہ جلدی چلے۔ اسے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ گھسیاری منڈی اترے گا۔ تانگہ چل پڑا اور وہ کتنا خوش تھا۔ جیسے زمانے بھر کی خوشیاں اس کے دامن میں سمٹ آئی ہوں! مگر جب پیچھے بیٹھے ہوئے مرد اور عورت نے اپنی ناکام محبت کے فسانے چھیڑے تو اس کی ساری خوشی اور گھر پہنچنے کا جوش نہ جانے کہاں گم ہو گیا۔ سارے وجود میں غم کی ایک شدید لہر دوڑ گئی۔ آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ اس کا دل کسی کے لئے نہیں دکھا۔ آج یہ کیسا طوفان اٹھا جس نے سارے بند توڑ دیئے تھے، پتھر میں دراڑیں ڈال دی تھیں!

اسے گھر آئے تیسرا دن تھا۔ بیوی نے اس کی فکرمندی اور اداسی کو محسوس کر لیا تھا۔ اسے اپنے پتی کی یہ حالت دیکھ کر تعجب ہو رہا تھا۔ ایک سال پہلے تو اتنا اداس کبھی نہیں دیکھا۔ یہ کیا ہو گیا انہیں! بچوں کی جدائی کا اثر تو نہیں۔ جب سے آئے ہیں، بجھے بجھے سے ہیں۔ ہاں، ایک سال کے انتظار نے دل پر اثر ڈالا ہوگا!

اس کی بیوی نے کئی بار اس سے کچھ پوچھنا چاہا، مگر اس نے ہنس کر ٹال دیا۔ وہ کسی کو کیسے بتائے کہ وہ غمگین تھا۔ زندگی میں پہلی بار، اور وہ بھی اپنے لئے نہیں دو اجنبیوں کے لئے۔ جن کے ساتھ دنیا نے ناانصافی کی تھی۔ ان کی محبت، ان کی زندگی، ان کے خوابوں کو مٹا دیا تھا۔ جو بھی یہ بات سنے گا اسے ہنسی آئیگی۔ اس کی دلی کیفیت جان کر ہر ایک اس کا مذاق اڑائے گا۔ اسی لئے اس نے کسی کو کچھ نہ بتایا۔ بیوی سے کچھ بہانہ کیا تو دوستوں سے کچھ اور ۔۔۔ وہ دن بھر گھر میں اداس پڑا رہتا۔ ان دونوں کی باتیں اس کے کانوں میں گونجتی رہتیں اور غمگین صورتیں نگاہوں میں ابھرا کرتیں۔

دوپہر ہی سے اس کا دوست رحمان ضد کر رہا تھا کہ تھیٹر دیکھنے چلو۔ ایگزیبیشن گراؤنڈ میں مشہور ڈرامہ نگار ندیم بالی کا ڈرامہ "یہ لوگ" اسٹیج کیا جا رہا تھا۔ دہلی سے بھارتی تھیٹر کمپنی شہر میں آئی ہوئی تھی۔ اس ڈرامہ نے سارے ملک میں تہلکہ مچا رکھا تھا۔ جہاں بھی یہ ڈرامہ کھیلا گیا لوگوں نے اسے بے حد پسند کیا۔ یہ ملک کی مشہور تھیٹر کمپنی تھی کئی شاہکار ڈرامے پیش کرنے کی وجہ سے اس کی بڑی دھوم تھی۔ اس کا دوست اس سے اصرار کر رہا تھا کہ وہ ڈرامہ دیکھنے ضرور چلے۔ اگر وہ نہیں گیا تو اسے بہت افسوس ہوگا۔ اس کا دل کہیں بھی جانے کو نہیں چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا۔ چپ چاپ گھر میں لیٹا رہے۔ اس نے بہت بہانے کئے۔ رحمان کو ٹالنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر اس کی ضد کے آگے اس کی ایک نہ چلی اور اسے تیار ہونا ہی پڑا۔

ایگزیبیشن گراؤنڈ میں بہت بھیڑ تھی۔ لوگ ڈرامہ دیکھنے کے لئے ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ وہ دونوں وہاں کچھ دیر سے پہنچے۔ شو شروع ہو چکا تھا۔ رحمان نے دو ٹکٹ پہلے ہی ریزرو کرا لئے تھے۔ وہ ہال میں داخل ہوئے۔ اور اپنی اپنی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ ہال میں اندھیرا تھا اور اسٹیج پر روشنیوں کا سیلاب! ۔۔۔ ایک پارک کا سین تھا۔ کونے میں بنچ پر ایک عورت سفید ساری میں ملبوس بیٹھی تھی اور اس کے قریب دھوتی اور بند گلے کا کوٹ پہنے ایک مرد اپنے گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھے بیٹھا تھا۔ اس نے اپنی ٹانگوں کو ہاتھوں کی گرفت میں لے رکھا تھا۔ پس منظر میں وائلن کی ایک دردناک دھن بج رہی تھی۔ عورت رندھے ہوئے لہجے میں مرد سے کہہ رہی تھی:

"آج ہم کتنے برسوں بعد ملے ہیں! ایسا لگتا ہے جیسے کل ہی کی بات ہے۔ کچھ بھی نہیں بدلا۔ تم بھی وہی ہو۔ میں بھی وہی ہوں۔ یہ پارک، یہ عمارت، یہ سڑک، اس پر چلتے ہوئے لوگ ۔۔۔ سب کچھ تو وہی ہے۔ مگر پھر بھی بہت کچھ بدل چکا ہے۔ ہمارے راستے بدل چکے ہیں۔ ہم دونوں کی زندگی یکسر بدل چکی ہے۔"

آواز جانی پہچانی تھی۔ وہ چونک پڑا۔ یہ تو وہی آواز ہے جس نے اس کی خوشی، اس کا سکون، اس کے دل کا قرار چھین رکھا ہے۔ یہ سب کیا ہے؟ اس نے ہال پر نظر ڈالی۔ کہیں وہ خواب تو نہیں دیکھ رہا ہے؟ یہ لوگ اس کے دل، اس کے جذبات کا مذاق تو نہیں اڑا رہے ہیں؟

اور پھر اس کی نگاہوں میں تانگہ کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے مرد اور عورت کی اداس صورتیں گھوم گئیں۔ دونوں کی گفتگو کانوں میں گونجنے لگی۔

مرد کہہ رہا تھا "اپنے جی کو اداس نہ کرو۔ گھٹ گھٹ کر خود کو کیوں سلگائے دے رہی ہو ۔۔۔؟ دیکھو میری طرف دیکھو!"

اس نے غور سے دیکھا، مرد کے سوکھے گھونگھریلے بال تھے اور چوڑی پیشانی، عورت کے نقوش وہی تھے جو اس نے گھر کے قریب تلنگے سے اترتے ہوئے دیکھے تھے۔ اس کے بائیں گال پر تل بھی تھا۔ اس کے ذہن کو بجلی کا سا ایک شاک لگا۔ تو یہ وہی تھے جن کے لئے وہ زندگی میں پہلی بار غمگین ہوا تھا جن کے دکھ میں وہ شریک ہونا چاہتا تھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے پہاڑ کی چوٹی سے اسے کسی گہرے کھڈ میں پھینک دیا گیا ہو۔ اس کا دل پھٹا جا رہا تھا۔ وہ سیٹ سے اٹھا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

بین الاقوامی اعزاز یافتہ اردو کے عہد آفریں شاعر

فیض احمد فیض

کے شایانِ شان

افکار

کا

فیض نمبر

اپریل ۶۵ء میں شائع ہو رہا ہے

جوشؔ نمبر سے فیض نمبر تک

ایک تاریخ ساز ادب ——— ایک ادب ساز تاریخ

صفحات: ۵۰۰ سے زائد، نادر و یادگار تصاویر

قیمت: دس روپے

ایجنٹ حضرات:- براہ کرم پہلی فرصت میں ہمیں فیض نمبر کی تعداد مطلوبہ سے مطلع فرمائیں۔

نئے سالانہ خریدار:- ۱۸ روپے ۵۰ پیسے فقط منی آرڈر بھیجکر ایک سال تک افکار کے علاوہ فیض نمبر بھی حاصل کر سکتے ہیں

مکتبہ افکار۔ رابسن روڈ۔ کراچی

کتاب۔ لکھنؤ۔

عبدالمجیب سہالوی

خالی مولیا

کھانے پینے کے باوجود سوکھتا چلا جا رہا ہوں۔ ڈاکٹر کو دکھایا، حکیموں سے مشورہ کیا۔ ویدوں کی رائے لی۔ سب کہتے ہیں کوئی مرض نہیں۔ سب سے مایوس ہو کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔

دیکھئے جناب! وہ زمانہ گیا جب کسی اچھے حکیم سے پوچھا حال بتایئے تو وہ ڈنڈا لے کر دوڑتا تھا کہ کیا مجھے کوئی عطائی سمجھا ہے جو حال لے کر بیٹھ گیا۔ مگر اب وہ نہ حکیم ہیں اور نہ وہ مریض اور مرض بھی بھانت بھانت کے پیدا ہو گئے ہیں جن کا سراغ بغیر مریض کی نشاندہی کے ناممکن ہے۔

ارے صاحب! آپ نشان دہی کہتے ہیں، یہاں ڈاکٹروں نے تو تھوک اور خون سے لے کر پیشاب، پاخانہ تک کنگھال ڈالا، سینہ ٹھوک ٹھوک کر ساری پسلیاں نرم کر دیں، لمبا سانس لیتے لیتے میرا دم پھولنے لگا۔ آپ سے کیا کہوں ان ڈاکٹروں نے میری کیسی درگت بنائی۔ میں نے آج تک غسل خانے میں بھی بغیر تہبند باندھے غسل نہیں کیا، لیکن مرض کی تلاش میں ڈاکٹروں نے میرا انگ انگ ٹٹول ڈالا۔ اور میں اف کئے بغیر بے حیا بنا کھڑا رہا۔ یہی نہیں، اسکریننگ اور ایکس رے کے نام سے نیم برہنہ لٹایا اور کھڑا کیا۔ لیکن اس ننگی جانچ پڑتال کے بعد بھی اصلی مرض کا پتہ نہ چلنا تھا نہ چلا۔ سب نے یہ کہہ کر ٹال دیا آپ کو بلڈ پریشر کی شکایت ہے احتیاط کیجئے!

اب یہ حال ہے کہ کسی پہنچے ہوئے حکیم یا ڈاکٹر کی تلاش میں دن رات سائن بورڈ پڑھتا، سڑکوں اور گلی کوچوں کی خاک چھانتا پھرتا ہوں کہ کوئی حکیم نابینا جیسا دانا حکیم مل جائے جو بغیر دیکھے مرض کا پتہ لگا لے۔ آپ کے سائن بورڈ پر نظر پڑی تو چونک پڑا۔ "بے ڈگری کا ڈاکٹر، بے دوا کا علاج، بے فیس کا مشورہ"۔ سائن بورڈ پڑھتے ہی آدھا مرض دور اور دل باغ باغ ہو گیا۔ اور ایسا محسوس ہوا کہ اندھیری گھٹا ٹوپ رات میں جہاں ہاتھ کو ہاتھ نہ دکھائی پڑتا ہو کسی نے بھک سے گیس جلا دی ہو۔ اور اسی روشنی کے سہارے میں آپ کے مطب میں پہنچ گیا۔

جناب! میں اتفاق سے نابینا تو نہیں، لیکن اگر آپ کی یہی خواہش ہے کہ میں بغیر دیکھے آپ کے مرض کا پتہ لگا دوں تو لیجئے میں آنکھیں بند کئے لیتا ہوں۔ اگر آپ کو شبہ ہو تو آپ میری آنکھوں پر رومال باندھ کر اپنا اطمینان کر سکتے ہیں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ مرض میں بتاؤں گا اور حال آپ بتائیں گے۔ میرا تجربہ ہے اور دنیا کے تمام لال بجھکڑوں کی یہی رائے ہے کہ مرض جسم نہیں حالات پیدا کرتے ہیں۔ اسی لئے میں مریض کے شریر کو ہاتھ لگانا پاپ سمجھتا ہوں۔ خطا کس کی اور جھنجھوڑا کون جائے۔ کہاں کا انصاف ہے اور کیسا طریقہ علاج؟ میں تو صاحب حالات کے کان پکڑ کر مرض کی تلاش میں نکلتا ہوں۔ اور جب تک مرض برآمد نہیں ہو جاتا ہاتھ کی گرفت ڈھیلی نہیں کرتا۔

گستاخی معاف! دیکھئے آپ آنکھیں بند کئے ہوئے ہیں ایسی حالت میں اگر آپ نے ٹٹول کر کان پکڑنے کی کوشش کی تو میری عینک جس کی کمانیاں میری

ہڈی پسلی کی طرح ڈھیلی ہو چکی ہیں گر کر ٹوٹ جائے گی۔ اس لئے یا تو آپ آنکھیں کھول کر احتیاط سے کان پکڑیئے یا مجھے عینک اتارنے کی اجازت دیجئے۔ لیکن عینک اتارنے میں، ایک دقت یہ بھی ہے کہ پھر آپ کو کان چھوڑ کر میرا ہاتھ پکڑ کر لگانا ہوگا۔ اور اگر آپ آنکھیں کھولے دیتے ہیں تو پھر آپ بھی دوسرے ڈاکٹروں کی طرح دیدہ و دانستہ مجھے اندھا سمجھ کر میرا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھانے کے بجائے میری جیب کاٹنے کی فکر شروع کر دیں گے اور پھر مرض [illegible] مشکل ہو جائے گا۔

اجی جناب! آپ بھی خوب آدمی ہیں میں تو حالات کے کان پکڑنے کو کہہ رہا ہوں اور آپ مارے ڈر کے اپنے کان کھڑے کر رہے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے حالات بہت پیچیدہ ہیں جن سے آپ کا دماغ شبہ کا شکار ہو گیا ہے۔ خدا خیر کرے آپ کے حالات معلوم کرنا اور آپ کو مشورہ دینا بڑا مشکل ہوگا۔ اس لئے کہ آپ کا شبہ پیچھے پر ہاتھ ہی نہ رکھنے دے گا۔ تو آپ حال کیا بتائیں گے۔ اور میں آپ کو مشورہ کیا دوں گا۔ حضور میں ایک مرتبہ پھر [illegible] کہ میں بے دوا علاج کرتا ہوں۔ اور مریض کی جیب کاٹنے کے بجائے حالات کے کان پکڑنے کی کوشش کرتا ہوں، [illegible] بغیر جیب کاٹے بھی لوگ راہ بے لذت ہی ہوتا ہے۔ اچھا اب حال بتائیے! آخر آپ کرتے کیا ہیں؟

معاف کیجئے گا۔ میں آپ کے پاس علاج کے لئے آیا ہوں کسی رشتہ کے خیال سے نہیں، اس لئے اس قسم کے سوال سے کیا نتیجہ؟

حضور! میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ میں مرض اور مریض کا رشتہ حالات ہی کی ڈوری پکڑ کر معلوم کر سکتا ہوں۔ اس لئے اگر آپ حالات نہیں بتا سکتے تو میں آپ کا مرض نہیں بتا سکتا۔

تو سنئے! میرا پیشہ بذات خود ایک مرض ہے یعنی اخبار نویسی جس میں آدمی دنیا کے غم میں اس طرح گھلا کرتا ہے جس طرح قاضی شہر کے اندیشے میں۔ لیکن آپ جانتے ہیں شہر کا اندیشہ بڑھتا جا رہا ہے اور قاضی کم ہوتے جا رہے ہیں۔ اسی طرح اخبار نویسوں کا [illegible] بڑھتا جا رہا [illegible] گرانی کی وجہ سے ان کی تنخواہ کا دامن تنگ ہوتا جا رہا ہے۔

تو یہ کہیئے! کہ آپ اخبار میں کام کرتے ہیں، اس کے بعد اگر آپ اندرونی معاملات میں بیرونی مداخلت برداشت کر سکتے ہوں تو میں یہ دریافت کرنے کی جرأت کروں گا کہ آپ شادی کے سلسلہ میں کس منزل پر ہیں؟

منزل سے آپ کی کیا مراد۔

مطلب یہ ہے کہ ابھی آپ ضرورت رشتہ کے اشتہارات شائع کرانے اور اپنی ہونے والی گھر والیوں کی تصویریں منگا کر گھر کی زینت بڑھانے کی منزل میں ہیں۔ یا شادی خانہ آبادی کے بعد آپ دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی میں اضافے کے نیک کام میں مستعدی سے مشغول ہیں۔ یا پھر صحافت کی زلف گرہ گیر میں پھنس کر آپ نے شادی کا خیال ہی ترک کر دیا۔ آپ کی شکل سے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے آخری یعنی سب سے زیادہ معقول شکل اختیار نہیں کی، اور پہلی منزل آپ عرصہ ہوا پار کر چکے ہیں اور اب آپ اس درمیانی منزل میں ہیں جس کو زندگی کا برزخ کہا جا سکتا ہے۔ اب بتلائیے کہ ماشاءاللہ کتنے بچے ہیں؟

(ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے، تیم [illegible] کہ بوا ایسے ہو چکے ہیں۔ خود موجود ہیں اور ایک کی آمد آمد ہے۔

فیس نہ لینے کے باوجود تنخواہ پوچھنے پر آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں؟ بات یہ ہے کہ تنخواہ اور تندرستی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ بغیر تنخواہ معلوم کئے آپ کا مرض معلوم کرنا مشکل ہوگا۔ شرمائیے نہیں قومی تعمیر کا کام کرنے والوں کی تنخواہوں میں ثواب آخرت بھی شامل ہوتا ہے اس لئے ان کی تنخواہ زیادہ نہیں رکھی جاتی۔

تو پھر سمجھ لیجئے تین سو ساڑھے تین سو کے بیچ میں۔

جی ہاں میں نے عرض کیا تھا کہ آپ زندگی کے برزخ میں ہیں۔ نہ چھوٹوں میں نہ بڑوں میں بلکہ چھٹ بھیّوں میں ہیں۔ یعنی تنخواہ چھوٹی اور مزاج بڑوں کا۔ سب سے ملنے جلنے پر مجبور، لیکن گھر میں کسی کو بٹھانے کی گنجائش نہیں۔ مطلب یہ کہ چھوٹا گھر بڑا سمدھیانہ۔

تعلیم کے متعلق پوچھنا ہی بیکار ہے۔ صحافت میں ہونے کی وجہ سے ماشاءاللہ تعلیم یافتہ بھی ہوں گے اور بچوں کو تعلیم دینے کا بھی خبط ہوگا۔

جی ہاں، ایک لڑکی یونیورسٹی میں ہے، دو کالج میں، ایک لڑکا ہائی اسکول میں ایک آٹھویں میں باقی پرائمری میں ہیں۔

تو یہ کہیئے غم عشق کے علاوہ آپ کو ہر قسم کا غم گھر بیٹھے حاصل ہے۔ اس لئے اگر آپ میرا مشورہ مانیں تو آپ لگے ہاتھوں غم عشق بھی مول لے لیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ پہلے غم عشق مفت مل جاتا تھا۔ لیکن غلّہ کی گرانی کا اثر اس پر بھی پڑ گیا ہے۔ اس لئے وہ بھی آج کل کافی گراں پڑتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ اگر غم عشق مفت مل جاتا تو شاید علاج بالمثل کی کوئی شکل نکل آتی۔ لیکن غم عشق کی گرانی علاج بالمثل میں حائل ہے اس لئے میں علاج اللہ پر چھوڑ کر آپ کے مرض کی تشخیص کی کوشش کرتا ہوں میرا خیال ہے کہ آپ کو نہ تو خون کے دباؤ میں زیادتی کی شکایت ہے اور نہ کمی کی، بلکہ آپ تنخواہ کی کمی اور احساس کی زیادتی میں مبتلا ہیں۔ جس نے آپ کے دل و دماغ کو متاثر کر کے آپ کو مالی خولیا نہیں، یہ تو مالدار لوگوں کو ہوتا ہے، خالی مولیا کا شکار بنا دیا ہے۔ اور اس موذی مرض سے آپ کا پیچھا اس وقت تک نہیں چھوٹ سکتا جب تک آمدنی میں کافی اضافہ اور قیمتوں میں خاطر خواہ کمی نہ ہو۔

• عورت کی زندگی

• عورت کی فطرت

اور عورت کی ذہنی کش مکش کے

بہترین عکاس جناب کشمیری لال ذاکر کا نیا ناول۔

میں اُسے پہچانتی ہوں

جس میں عورت کے دل کی دھڑکنوں کے ساتھ ساتھ اُس کی اپنے خیال کے مرد کی تلاش نے نئے نئے رنگوں میں عجیب عجیب تصویریں لے بھارتی ہیں

پڑھیے۔

اور آپ بھی اُسے پہچانیے جیسے نیما، (ناول کی ہیروئن) نے پہچانا۔ اس افسانہ نگار کے پرستار انکی کتابوں کے لیے ہمیں لکھیں۔

تین مورتی پبلیکیشنز۔ پوسٹ بکس ۱۷۳۔ نئی دھلی

جوشؔ ملیح آبادی

افکار۔ کراچی

رہِ ابدیّت

نہ مضطرب ہو، مجھے یہ خبر ہے اے دمساز
کہ زیرِ سطح مسطح بھی ہے نشیب و فراز

چٹخ رہی ہیں چٹانیں، دڑک رہے ہیں پہاڑ
زہے تجلّیِ نفاذِ فکرِ آئینہ ساز

زہے جلالتِ خدّامِ عارفانِ جدید
بہر نگاہِ کرامت، بہر نفس اعجاز

زہے عروج کہ سلمائے فکرِ اوج شکار
بنا رہی ہے مہ و خور کو فرشِ پا انداز

دھڑک رہا ہے دلِ آسمانِ شعلہ مزاج
اُٹھا رہی ہے زمیں دیدۂ قدر انداز

اُڑی ہوئی ہے تب و تابِ خسروِ خاور
ہوا ہے ذرّہ کچھ اس طرح مائلِ پرواز

بہت غرور نہ فرمائیں ثابت و سیّار
کہ خاک پر حرکت کا ہوا ہے اب آغاز

رواں ہیں جانبِ انساں نقاب اُٹھائے ہوئے
فضا کے بھید، زمیں کے رموز، چرخ کے راز

گدائے راہ کی جانب مُڑی ہے گردنِ شاہ
سرِ نیاز کی جانب بڑھا ہے افسرِ ناز

وہ پا چکا ہے فروغ انکسارِ پروانہ
کہ شمع بھول گئی ہے غرور کے انداز

فقیہِ شہر سے کوئی پکار کر کہہ دے
کہ اب ہے فرش کا حامی دماغِ عرش نواز

فلک پہ دنگ ہے زہرہ، زمین پر داؤد
حریمِ ذہنِ بشر میں چھڑے ہوئے ہیں وہ ساز

ترانہ ریز ہیں کچھ یوں مغنّیانِ زمیں
کہ مطربانِ سماوی ہیں گوش بر آواز

برہمنوں نے بغاوت پہ باندھ لی ہے کمر
لرز رہے ہیں بتانِ عظیم و سرافراز

بقصدِ شکوہ چلے گا جو آبِ حیواں میں
بنا رہی ہے تمنائے زندگی وہ جہاز

مری رہِ ابدیّت پہ چل نہ پائے گا
مسیح و خضر کا یہ اختصارِ عمر دراز

جبینِ جوشؔ ہے اس آرزو میں زانو پر
کہ بے پناہ خموشی سے کھینچ لے آواز

سردار جعفری | افکار کراچی

پیاس کی آگ

میں کہ ہوں پیاس کے دریا کی تڑپتی ہوئی موج
پی چکا ہوں میں سمندر کا سمندر پھر بھی
ایک اک قطرۂ شبنم کو ترس جاتا ہوں
قطرۂ شبنم اشک
قطرۂ شبنم دل، خون جگر
قطرۂ نیم نظر
یا ملاقات کے لمحوں کے سنہرے قطرے
جو نگاہوں کی حرارت سے ٹپک پڑتے ہیں
اور پھر لمس کا نور
اور پھر بات کی خوشبو میں بدل جاتے ہیں
مجھ کو یہ قطرۂ شاداب بھی چکھ لینے دو
دل میں یہ گوہر نایاب بھی رکھ لینے دو
ہونٹ ہیں خشک مرے، خشک زباں ہے میری
خشک ہے درد کا، نغمے کا گلو
میں اگر پی نہ سکا وقت کا یہ آب حیات
پیاس کی آگ میں ڈرتا ہوں کہ جل جاؤں گا

مخدوم محی الدین | صبا حیدرآباد

سب کا خواب

وہ شب ہے وہ شب مہتاب میری ہی نہ تھی
وہ تو سب کا خواب تھا
وہ جو میرا خواب کہلاتا تھا، میرا ہی نہ تھا
وہ تو سب کا خواب تھا
سایۂ گیسو میں بس جانے کے ارماں دل میں تھے
میرے دل میں ہی نہ تھے
وہ تو سب کا خواب تھا

لاکھ دل ہوتے تھے، لیکن
جب دھڑکتے تھے تو اک دل کی طرح
جب مچلتے تھے تو اک دل کی طرح
جب اچھلتے تھے تو اک دل کی طرح
جب مہک اٹھتے تو دنیا کا مہک اٹھتا تھا دل
اور گنگا کا، یانگسی کا، نیل کا، گنگا کا دل
آپ میں اک گرمیٔ احساس ہوتی تھی
نہیں معلوم وہ کیا ہو گئی
چاندنی سی میرے دل کے پاس ہوتی تھی
نہیں معلوم وہ کیا ہو گئی

منیب الرحمٰن — افکار، کراچی

شامِ غریباں

سوادِ شہر تاریکی میں ابھرے

یکایک جل اٹھا ہر داغِ ہجراں

وہی مبہم تمناؤں کے سائے

وہی مدھم امیدوں کا چراغاں

وہی زخموں کی پراسرار خوشبو

وہی یادوں کے گلہائے پریشاں

دریچے کھل گئے تنہائیوں کے

جدھر دیکھو وہی سنسان گلیاں

گیا تھا تیری بزمِ رنگ و بو میں

کہاں لے آئی یہ شامِ غریباں

خلیل الرحمٰن اعظمی — محور، دہلی

تنہائی سے آگے

اور یہ سب بحثیں جو گھس پٹ کے پرانی ہو جائیں
جب کوئی رس نہ ہو دہرائی ہوئی باتوں میں
مضمحل روحیں خموشی کا سہارا ڈھونڈیں
جب کوئی لطف نہ رہ جائے ملاقاتوں میں
جب نہ محسوس ہو کچھ گرمیِ آداب و سلام
جی نہ چاہے کہ کبھی پرسشِ احوال کرو
دور تک پھیلی ہوئی دھند ہوں سناٹے ہوں
تھکے سب بیٹھے ہوں اور کوئی نہ ہو، کچھ بھی نہ ہو
ان خلاؤں سے نکل کر کہیں پرواز کریں!
آؤ اب سیر کریں ذہن کی پہنائی میں!
کیوں نہ دریافت کریں ایسی گزرگاہوں کو
بات کرتی ہوں مسافر سے جو تنہائی میں
جان پہچان کے کچھ لوگ وہاں نکلیں گے
کوئی ایسا کہ جسے دیکھ کے ہم یہ سوچیں
یہ خد و خال یہ چہرہ تو ہے مانوس بہت
نام اب یاد نہیں، اس سے یہ کیسے پوچھیں
یا کبھی حافظہ دہرانے لگا ایسا اک نام!
دل کہے گا کہ یہ تھا اپنا ہی ملنے والا
اس کی صورت مگر اب ٹھیک سے کچھ یاد نہیں
سوچتے ہی رہیں وہ کیسا تھا: وہ کیسا تھا

شارؔ صدیقی

وقفہ

پھر کوئی کلی چٹکی!
پھر کوئی کرن پھوٹی!
پھر کہیں صبا بہکی!

سب فریبِ نومیدی
سب نگاہ کا دھوکا
سب نشاطِ محرومی!

زخم ہی کی خوشبو ہے
ہر طرف ہواؤں میں،
درد ہی کی تابش ہے
روح کی فضاؤں میں
جیسے ایک آنسو ہے۔
آسماں کی پلکوں پر،
صبح کا ستارا بھی،
کس قدر ہے بے معنی
اب یہ استعارا بھی

جیسے بے سبب ٹھہرے
دشتِ وقت میں آکر
قافلہ خیالوں کا۔
فکر ہے اندھیروں کی،
دھیان ہے اجالوں کا!

روزنوں سے آنکھ لگائے
آس کا چراغ جلائے
دردِ ہجر کے مارو
جاگتے رہو ۔۔۔ یارو
اب وہ صبح دور نہیں
انتظار میں جس کے
لمحے پا بجولاں ہیں!
رات سر بہ زانو ہے!

اثر لکھنوی — نیا دور. کراچی

اپنا چمن نہیں تو خزاں کیا بہار کیا
بلبل ہو نغمہ سنج سرِ شاخسار کیا

منت پذیرِ شوق، نہ مانوسِ اضطراب
تجھ کو قرار آئے دلِ بے قرار کیا

غفلت کا ہے یہ حال کہ ابتک خبر نہیں
اس انجمن میں کیا ہے نہاں آشکار کیا

ناآشنائے راز ہیں سرگشتگانِ ہوش
پوچھے کوئی خزاں سے الگ ہے بہار کیا

اِک محویت ہے سلسلہ پردازِ محویت
اس سے زیادہ کوئی کرے انتظار کیا

دوڑا دے نبضِ خاک میں بھی روحِ زندگی
کیسی نشاط اور غمِ روزگار کیا؟

دل انتظارِ کشتہ و جاں صرفِ اضطراب
کس وقت آئے تم پہ کریں اب نثار کیا

وہ دل کہاں کہ ناز تھا جس کو شکیب پہ
ٹوٹا پڑا ہے "آئینۂ اعتبار" کیا

برپا ہو ایک حشرِ جو سن لے کوئی اثرؔ
تم کہہ رہے ہو شوق میں یہ بار بار کیا

قمر جلالوی — خرام. چٹاگام

کسی کا نام لو بے نام افسانے بہت سے ہیں
نہ جانے کس کو تم کہتے ہو دیوانے بہت سے ہیں

جفاؤں کے گلے تم سے خدا جانے بہت سے ہیں
مگر محشر کا دن ہے اپنے بیگانے بہت سے ہیں

تمہیں کس نے بلایا میکشوں سے یہ نہ کہہ ساقی
طبیعت مل گئی ہے ورنہ میخانے بہت سے ہیں

بنائے دے رہی ہیں اجنبی ناداریاں مجھ کو
تری محفل میں ورنہ جانے پہچانے بہت سے ہیں

لکھی ہے خاک اڑانی ہی اگر میرے مقدر میں
اسی بستی پہ کیا موقوف ویرانے بہت سے ہیں

نہ رو لے شمع موجودہ پتنگوں کی مصیبت پر
ابھی محفل سے باہر تیرے پروانے بہت سے ہیں

رکھی رہ جائے گی پابندیٔ زنداں جواب چھیڑا
یہ دربانوں کو سمجھا دو کہ دیوانے بہت سے ہیں

قمرؔ اللہ ساتھ ایمان کے منزل پہ پہنچا دے
حرم کی راہ میں سنتے ہیں بت خانے بہت سے ہیں

وزیر آغا　　سیپ کراچی　　شاعر لکھنوی　　خرام چگام

تمہیں خبر بھی نہ تھی اور ہم شکستہ خیال
تمہارے قدموں کی آندھی میں ہو گئے پامال

ترے بدن کی مہک نے سلا دیا تھا مگر
ہوا کا اندھا مسافر چلا انوکھی چال

وہ ایک نور کا سیلاب تھا کہ اس کی نظر
وہ ایک نقطۂ موہوم تھا کہ یہ بدحال

عجیب رنگ میں وارد ہوئی خزاں اب کے
دہکتے ہونٹ، سلگتی نظر، دہکتے گال!

ترے کرم کی تو ہر سو مہکتی برکھا تھی
ہمیں تھے جن کو ہوا، بھیگا پیرہن بھی وبال

کسی نے راز یہ کھولا نہ آگہی کے سوا
کہ زندگی میں سبھی کچھ ہے زندگی کے سوا

جو اُس نے پیار سے دیکھا تو دل میں پھول کھلے
بہار کیا ہے نظر کی شگفتگی کے سوا

مرے دیارِ تمنا میں روشنی کو نہ ڈھونڈ
کہ اس دیار میں سب کچھ ہے روشنی کے سوا

ہزار ساغر و مینا چھلک گئے لیکن
ملا ہے کیا ہمیں ساقی سے تشنگی کے سوا

کہیں یہ حیرتِ جلوہ کہیں شکستِ نگاہ
نظر کے اور بھی پہلو ہیں روشنی کے سوا

ہزار وہ ہمیں اپنا کہیں مگر شاعرؔ
ہم اُن کی بزم میں کیا ہیں اب اجنبی کے سوا

نقش کراچی

احمد ہمدانی

ہر طرف آپ کے گھر کی سی فضا ہو جیسے
ہر ہوا آپ کے کوچے کی ہوا ہو جیسے

کچھ تو حق اور بھی چاہت کا ادا ہو جاتا
دل بہت آج دکھا پر نہ دکھا ہو جیسے

خاک اڑنے پہ بھی اک رنگ ہمارے گھر میں
مدتوں آ کے یہاں کوئی رہا ہو جیسے

اپنے ہی دل کا دھواں دیکھ کے حیران ہیں ہم
یہ دھواں دور کسی گھر سے اٹھا ہو جیسے

اک بہت گہرے سمندر کی تہوں میں ہلچل
دیکھ کے ہم کو کوئی لوٹ گیا ہو جیسے

اس کی آواز سے ملتی ہوئی آواز ہے ساتھ
خود کو وہ دل میں مرے چھوڑ گیا ہو جیسے

سیپ کراچی

دکھوں کے ذکر بہت دور تک گئے ہوتے
ہماری طرح جو کچھ اور دل دکھے ہوتے

چمکنے والے ستارے تو ڈوب جاتے ہیں
یہ بات سوچ کے پہلے ہی سو گئے ہوتے

کسی کی یاد بھی دل میں نہیں ہے آج تو ہم
کسی کے گھر سے بہت دور رو لئے ہوتے

ہوا کے جھونکوں میں رہتی ہے ایک خوشبو بھی
ہوا کے ساتھ تو ہم عمر بھر چلے ہوتے

پھر اُن سے پوچھتے، کہتے ہیں کس کو میٹھی نیند
ہماری طرح جو وہ شام سے بجھے ہوتے

ہم ایسے لوگ تمازت سے دھوپ کی بچ کر
گھنے درختوں کے سائے میں بھی جلے ہوتے

رفیق خاور جسکانی　　محمود۔ دہلی　　افضل منہاس　　سیپ کراچی

روکش صبح مرا دیدۂ تر ہو جیسے!
آج کی شب مرے اشکوں سے سحر ہو جیسے

چاندسی صورتیں دیکھی ہیں سرِ بزمِ خیال
دل وارفتہ کوئی آئینہ گر ہو جیسے

اُس کے اشک آج بھی سینے پہ سلگ اٹھتے ہیں
مرے شانے پہ وہی جنبشِ سر ہو جیسے

دل کو پھر اُس کی پشیماں نگہی یاد آئی!
میرے بازو پہ وہی شعلۂ تر ہو جیسے

اشکِ لرزاں کا وہ آنکھوں سے ڈھلکنے کا سماں
بے زباں ہم سا کوئی شہر بدر ہو جیسے

چاند بھی سینۂ آفاق کا دل لگتا ہے!
سونا سونا کوئی کرنوں کا نگر ہو جیسے

تیرتے رہتے ہیں یادوں کے سفینے ایسے
چاندنی رات بھی دریا کا سفر ہو جیسے

اُس کی آنکھوں میں کچھ اس طرح اثر ڈھونڈتا ہوں
اس کو میرے غمِ پنہاں کی خبر ہو جیسے

روزِ ازل سے خاک بسر پھر رہا ہوں میں
کیا جانیے کہ دہر میں کیا ڈھونڈتا ہوں میں

کوئی نہیں کہ آکے سہارا ابھی دے سکے
تنہائیوں کا ساتھ ہے اور گر پڑا ہوں میں

ویرانۂ حیات ابھی طے نہیں ہوا،
راہوں کے پیچ و خم میں کہیں کھو گیا ہوں میں

احساس کی تپش سے سلگتا رہا دماغ،
ہر شب چراغِ شام سے پہلے جلا ہوں میں

آنکھوں میں اشک دل میں تمنا کے زخم ہیں
کچھ اور چاہتا ہوں تو کیا چاہتا ہوں میں

شاید اسی طرف کوئی آئینہ رو ملے
اُڑتے ہوئے غبار کی جانب چلا ہوں میں

دنیا تو مجھ کو خار سمجھتی رہی مگر،
اک پھول کی طرح ترے دل میں کھلا ہوں میں

افضل غمِ حیات کی یورش کے باوجود
میں جی رہا ہوں آج بھی کیا جانے کیا ہوں میں

مولانا ابوالکلام آزاد

نادر خاں شوخی

مرزا غالب کے آخری عہد کے ایک شاگرد نادر شاہ خاں شوخی رام پور کے باشندے کلکتہ میں رہتے تھے۔ میری تیرہ چودہ برس کی عمر تھی۔ کہ شاعری کا خبط ہوا اور اس خبط نے ان سے ملایا یہ ۱۹۰۱ء اور ۱۹۰۲ء کی بات ہے۔ دہلی کے ایک جوہری سید اخلاق حسین ا جو کاروبار کے سلسلے میں کلکتہ آتے رہتے تھے۔ ان کے شاگرد تھے۔ انھوں نے میرے اشعار شوخی کو سنائے اور کہا۔ تیرہ برس کی عمر میں قلم برداشتہ غزلیں لکھتے ہیں۔ انھیں بہت ہی استغراب ہوا۔ جامع مسجد کے نیچے مولوی ضیاء الرحمٰن عمرپوری (برادر مولوی عبدالجبار عمرپوری) امام مسجد اہل حدیث نے کتابوں کی دکان کر رکھی تھی جس کے بعد گاہ گاہ وہاں نئی کتابوں کے شوق میں چلا جایا کرتا تھا۔

شعر گوئی کا امتحان

ایک دن دکان میں بیٹھا تھا کہ نادر شاہ آ گئے اور مجھ سے کہنے لگے۔ صاحبزادے میاں! آپ کی شاعری کی تو بڑی دھوم ہے لیکن لوگ کہتے ہیں یہ حضرت مولانا کا کلام ہوگا (یعنی والد مرحوم کا) میں نے کہا شاید آپ کو معلوم نہیں کہ حضرت شاعری نہیں کرتے اور اگر انہیں معلوم ہو جائے کہ مجھے یہ خبط ہوا ہے تو سخت ناراض ہوں۔ کہنے لگے میاں برا نہ ماننا میں اس وقت ایک طرح دیتا ہوں۔ دو شعر کہہ کر سنا دو۔ عمر بھر دعائیں دیتا رہوں گا۔ میں نے غالب جیسے استاد کی آنکھیں دیکھی ہیں۔ میری دعائیں لوگے تو خوش رہوگے۔ میں نے کہا فرمایئے۔ انھوں نے ایک شعر "یاد نہ ہو، شاد نہ ہو" سنایا میں نے اسی وقت پانچ چھ شعروں کی پوری غزل لکھ کر دے دی۔

وعدہ وصل بھی کچھ طرفہ تماشے کی ہے بات
میں تو بھولوں نہ کبھی ان کو کبھی یاد نہ ہو

تحسین کا ہنگامہ

کہہ نہیں سکتا کہ انھوں نے غزل سن کر کیا تماشا دیکھا یا سند پائی کا بازار شام کا وقت تھا کاندھے سے کاندھا چھل رہا تھا راہگیروں نے جو یہ عالم دیکھا تو ٹھٹھ کا ٹھٹھ لگ گیا۔ پہلے بیٹھے بیٹھے تحسین کی پھر اٹھ کھڑے ہوئے اور پکار پکار کر داد دینے لگے اور اس طرح جھوم جھوم کر کہ لوگوں نے سمجھا کوئی دیوانہ رقص کر رہا ہے۔!

اس کے بعد ان کا دستور ہو گیا۔ ہفتے میں دو ایک مرتبہ میرے یہاں خود آتے۔

گوہر جان اور ملکہ جان

یہ بھی عجیب شخص تھے۔ رات دن گوہر جان کے مکان میں پڑے رہتے۔ یہ گوہر کے کمال عروج و شہرت کا زمانہ تھا۔ نواب امیر حسن خاں سے تعلق تھا۔ مشہور تھا کہ امیر حسن خاں نے انہیں رقیبوں سے پاسبانی کے لیے متعین کر رکھا ہے۔ یہ خود بھی گوہر کی ماں ملکہ کے خانہ ساز آشناؤں میں رہ چکے تھے۔ لکھنؤ کے تماش بینوں کی اصطلاح میں "خانہ ساز آشنا" اسے کہتے ہیں جسے

طوائفیں اپنے جی کے الگاؤ کے لئے لگا رکھتی ہیں۔

ملکہ جان کا مکان جامع مسجد سے بالکل متصل تھا۔ اس کے غلام قدوس عطار کی دکان کے اوپر مرزا داغ آکر ٹھہرے تھے جس کا ذکر انھوں نے اپنی مثنوی میں کیا ہے!

سامنے ناخدا کی مسجد تھی　　ناخدا کیا خدا کی مسجد تھی

مکان کے پھاٹک کے اندر ایک کرسی بچھی رہتی تھی اور سہ پہر کو نادر شاہ خان اسی پہ بیٹھے ہوئے بازار کی سیر دیکھا کرتے تھے۔ جو بھلا آدمی ان سے ملنا چاہے وہیں جائے اور ملاقات کرے۔

شعر پڑھنے کا طریقہ

مشاعرہ میں غزل عجیب انداز سے پڑھتے تھے۔ ایک اچھا خاصہ ہنگامہ بپا ہو جاتا تھا۔ جونہی شمع سامنے آتی تھی آس پاس سے لوگ ہٹ کر دور جا بیٹھتے، کیوں کہ جانتے تھے، اب پاس والوں کی خیر نہیں۔ دلبر سے، بستر سے، کی طرح پر انہوں نے غزل پڑھی۔

ہوئی شوخی اجو حجت وصل میں اس ماہ پیکر سے
گواہی ہم نے دلوادی شکن آلودہ بستر سے

دوسرا مصرعہ پڑھتے ہوئے اس طرح فرشِ مجلس کو مٹھیوں میں بھینچ بھینچ کر شکن آلود کرنے کی کوشش کی کہ ساری مجلس نے محسوس کیا ان کے نیچے سے فرش نکل سا رہا ہے، کئی آدمی فرش کے ساتھ کھنچ کر گھٹنوں سے باہر نکل آئے۔ بہت سے مضطرب ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے کہ معاملہ آ

غدر کے چشم دید واقعات

.... غالب کے شاگرد تھے اور ان کے قیام رامپور کے حالات بڑی دلچسپی کے ساتھ بیان کرتے تھے۔ مر تذکرہ چھوڑ دینے کی دیر تھی، پھر ایک پوری داستان شروع ہو جاتی۔ غدر کے حالات بیان کرنے سا بھی انھیں بڑا تھا۔ بریلی کے معرکوں کے چشم دید شاہد تھے، افسوس ہے کہ پچھلی نسل کے ساتھ غدر کے یہ تمام افسانے بھی مدفون ہو گئے۔ اگر قلم بند ہوتے تو تاریخ کے لئے قیمتی سرمایہ ہوتے۔

غالب کا سفر رامپور

کہتے تھے جب مرزا غالب پہلی دفعہ رام پور آئے تو میں بڑے جوشِ عقیدت سے خدمت میں حاضر ہوا اور تلمذ کے لئے خواہش ہوا لیکن مرزا صاحب نے صاف انکار کر دیا۔ فرمایا "تم جانتے ہو میں نواب صاحب کا بلایا ہوا حاضر ہوا ہوں۔ انہوں نے فن شعر کی خدمت میرے سپرد کی ہے۔ بغیر ان کے حکم و اجازت کے یہاں اور کسی کے کلام پر اصلاح نہیں دے سکتا۔ بڑی مایوسی ہوئی۔ لیکن صبح شام برابر حاضری دیتا رہا۔ رام پور میں ان کا معمول تھا کہ جس دن نواب صاحب کے یہاں جاتے، سہ پہر کا دیوان خانہ ملتوی رہتا۔ ورنہ سہ پہر کو عام طور پر لوگ سے ملاقات کرتے۔ ریاست میں جس قدر اہل علم و فن تھے، مرزا کی موجودگی کو مغتنم تصور کرتے اور بالالتزام آیا کرتے۔ شب کو صحبت خاص ہوتی تھی کیونکہ یہ ان کے کیف و سرور کا وقت ہوتا تھا۔ صرف انہی لوگوں کو حاضری کا موقع دیتے جن سے کسی قسم کا تکلف نہ ہوتا۔

شراب کی ضرورت

اتفاق سے ایک معاملہ ایسا پیش آگیا جس نے مجھے خدمت گذاری کا ایک خاص موقع دے دیا۔ مرزا صاحب دہلی سے چلے تو انہوں نے اپنے ساتھ عرق نوشی کا اتنا سامان لے لیا تھا کہ مہینے بھر کے لئے کفایت کرے۔ انہیں خیال تھا کہ اس سے زیادہ قیام نہ ہوگا لیکن قیام زیادہ روز ہوا جب آخری بوتل کی نوبت آگئی تو بہت متردد ہوئے رام پور میں انگریزی شراب کی کوئی دکان نہ تھی۔ بریلی اور مراد آباد سے مل سکتی تھی۔ لیکن جو نوکر ساتھ تھے انہیں اس متاع کے لئے شناسا نہیں سمجھتے تھے۔ حیران تھے کہ کس شخص سے کام لیں۔ ایک دن حاضر ہوا تو مجھ سے حال بیان فرمایا۔ میں نے عرض کیا آپ کا حکم ہو تو میں شراب اپنے حلق انڈیل لوں۔ خرید کر لانا کون سی بڑی بات ہے! مجھے نام قسم اور قیمت بتا دیجئے جا کر بریلی کے ایک ایک شراب خانے پر دستک دوں گا۔ فرمایا "نہیں میاں ایک قطرہ بھی نہ پینا۔ اگر پینے پر آجاؤ گے تو مجھے کیا لا کر دو گے۔ ہاں جبر!

میں بتلا دوں اس طرح یہ کام پورا کر دوں۔ بہرحال انہوں نے شراب کا نام بتلایا، میں نے کہا اس کی خالی بوتل دکھلا دیجئے۔ زیرِ استعمال بوتل دکھا کر رنگ و شکل سے آشنا کیا پھر صرف ایک بوتل لانے کا حکم ہوا۔ اگر حسبِ منشا، تو دوبارہ بھیج کر مزید منگوائیں گے۔ قیمت کے علاوہ مجھے دو روپے اور عنایت فرماتے تھے۔ کہ خرچ کے لئے رکھ لو۔ لیکن میں نے بہ ہزار منت والتجا اس سے باز رکھا اور عرض کیا مجھے پہلے وہاں سے ہو آنے دیجئے پھر جو کچھ مطلوب ہوگا عرض کر دوں گا۔

خدمت گذاری میرے والد فوج میں رسالدار تھے۔ منتیں کر کے ان سے روپیہ لیا اور بریلی روانہ ہو گیا۔ مرزا صاحب نے صرف ایک کے لئے فرمایا تھا۔ میں نے پانچ بوتلیں خریدیں اور لا کر سامنے رکھ دیں۔ یہ ٹھیک ان کی فرمائش کے مطابق تھیں۔ نہایت درجہ خوش ہوئے۔ فرمانے لگے! میاں! کہتے ہیں شراب پینے والے کی دعا مستجاب نہیں ہوتی اب میں دعا نہیں دوں تو اور کیا دوں؟ میں نے عرض کیا! حضور! انہیں بوتلوں کی شراب نوشِ جان فرما کر میرے لئے دعا کیجئے۔ میرا ایمان ہے۔ کہ انہی دعاؤں سے میرا عقدہ حل ہوگا۔

غزل کی اصلاح بہت اصرار فرمایا کہ روپے لے لو مگر میں ارادہ کر چکا تھا کہ کبھی نہ لوں گا۔ دوسرے دن حاضر ہوا تو فرمایا! وہ تمہاری غزل کہاں ہے جو اس دن لائے تھے؟ وہ تو ہر وقت میری جیب میں رہتی تھی۔ میں نے پیش کر دی۔ اسے دیکھ کر جا بجا اصلاح دی۔ اصلاح دیتے جاتے تھے۔ اور ساتھ ساتھ ہدایت و افادات کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ بس اس دن سے ان کی شاگردی کی سعادت ہاتھ آگئی پھر دہلی گیا اور کئی ماہ تک ان کی خدمت میں رہا۔

ضرورت مندوں کا ہجوم دہلی میں ایک دن کہنے لگے! تمہارے رام پور کے تعلق نے مجھے موت سے بچا لیا مگر زندگی بھی اجیرن ہو گئی اصل حال خلقت کو معلوم نہیں۔ اتنی بات سن لی ہے کہ رئیس رام پور کے استاد ہیں بس ہر شخص اپنے رویئے قیاس کے مطابق میری دولت کا حساب لگاتا ہے اور جو چے پھیلاتا ہے۔ عزیز و اقارب تک باور نہیں کرتے کہ وہاں کے صرف سو روپیوں پر جی رہا ہوں۔ اہلِ حاجت آتے ہیں اور اپنی اپنی بربادیوں کی کہانیاں سناتے رہتے ہیں سا ایسا دل کہاں سے لاؤں کہ خشک جواب دے دوں؟ قرض دام لے کر بھی ان کی حاجت روائی کرنی پڑتی ہے۔

اصلاح شدہ قطعہ نادر شاہ خاں نے مجھے اپنا ایک قطعہ بھی دکھایا تھا، جس پر مرزا غالب کے قلم کی اصلاح تھی۔ ایک موٹے مقوے پر لگا کر دعملی کی طرح اسے محفوظ رکھا تھا۔ میں ہمیشہ ان سے کہتا تھا کہ مجھے دے دیجئے مگر ہاں ہاں کر کے ٹال دیتے تھے۔ نہیں معلوم اس کا کیا حشر ہوا۔ میں پھر بمبئی چلا گیا واپس آیا تو ان کا انتقال ہو چکا تھا۔

(نقشِ آزاد سے اقتباس۔ مرتبہ غلام رسول مہر)۔

ذوقی الہ آبادی

کا منتخب شعری مجموعہ

"قرطاسِ جنوں"

(زیرِ طبع)

مکتبہ [illegible] ۱۰۔ بی۔ لطیف آباد۔ حیدر آباد۔

اکیڈمی لائبریری سیریز کی نئی کتابیں!

مسدس: — حالیؔ افق مشرق کے ادبی آفتاب کی ایسی کرن تھے جس نے اردو نظم ونثر دونوں کو جگمگا دیا۔ ڈاکٹر بجنوری "دیوان غالب" کو "ویدوں" کے بعد ہندوستان کی دوسری الہامی کتاب کہتے ہیں۔ لیکن غالبؔ کے اس شاگرد رشید نے مسدس لکھ کر بتا دیا کہ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔ مسدس کا صدی ایڈیشن صحت کے التزام کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ قیمت دو روپیہ پچیس پیسے۔

ترکی حور: — اُردو میں تمثیل نگاری کا نقش اول امانت کی اندر سبھا ہو۔ یا کوئی اور کتاب۔ لیکن اب تو آغا حشر کا نام اردو ڈرامہ سے منسلک ہو کر رہ گیا ہے۔ اور ان کے ڈرامے آج بھی اتنے ہی مقبول ہیں جتنے اپنے عروج دور میں ہوں گے۔ "ترکی حور" آغا حشر کا ایک کامیاب ڈرامہ ہے۔ جو افادۂ عامہ کے خیال سے سستے ایڈیشن میں شائع کیا گیا ہے۔ قیمت۔ ایک روپیہ پچاس پیسے

"سحرالبیان" مثنوی نے جس طرح عالمی ادب میں اردو کو ایک امتیاز بخشا ہے۔ اسی طرح اردو مثنوی کے تصور کے ساتھ میر حسن کا نام زبان پر آجاتا ہے۔ بلاشبہ "سحرالبیان" زبان وبیان کا ایک معجزہ ہے اور سلاست وصفائی کے لحاظ سے اردو کی کوئی مثنوی اس کے پایہ کو نہیں پہنچتی۔ "میر انیس" کے دادا کا یہ ادب پارہ سستے ایڈیشن میں شائع کیا گیا ہے
قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے۔

مختصر تاریخ اُردو ادب — اُردو ادب کی تاریخ ہندوستان کی تمدنی اور انقلابی تاریخ کے ساتھ چلتی ہے جس پر ملک کے اکثر اہل قلم نے قلم اٹھایا ہے۔ اور اُردو میں کئی مکمل اور جامع تاریخیں موجود ہیں۔ لیکن ڈاکٹر اعجاز حسین نے جس اختصار کے ساتھ یہ تاریخ مرتب کی ہے وہ اپنی افادیت کے لحاظ سے طلبا اور اہل ذوق دونوں کیلیے یکساں طور پر اہم ہے۔ اور اسی لیے اساتذہ کرام، اس کے مطالعہ کی سفارش کرتے ہیں۔ چند سو صفحات میں سموئی ہوئی زبان اُردو کی سرگزشت میں تقسیم کے بعد کا دور بھی شامل کر دیا گیا ہے۔ اور حال دامنی کا یہ آئینہ ضروری صحت کے بعد بار دیگر پیش کیا جا رہا ہے۔ قیمت صرف پانچ روپیہ۔

آپ نے ووٹ کسی کو بھی دیا ہو۔ مگر انتخابی سیاسیات کا جاننا اس سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ بیسک ڈیموکریٹس کے انتخاب ہو جانے کے بعد صدارتی، قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کے وقت۔

امریکی انتخابات۔ ایک سیاسی جائزہ ایک معلومات آفریں کتاب ہے۔ امریکہ اور پاکستان کے نظام مدن اور اصول انتخابات کی مماثلت نے کتاب کی اہمیت کو بہت بڑھا دیا ہے۔ اس کتاب میں تمام ضروری معلومات، مثلاً ووٹر کے حقوق، امیدوار انتخاب کیسے ہوں؟ نامزدگیاں، سیاسی اداروں کی کشمکش، امیدوار صدارت، صدارتی انتخاب کی مہم اور صدارتی انتخاب کیسے کیا جاتا ہے؟ سب درج ہے۔ کراچی یونیورسٹی کے تین استادوں نے اُردو میں منتقل کیا۔ اکیڈمی لائبریری اُردو میں اس موضوع پر پہلی کتاب پیش کر رہی ہے۔ قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے

اپنے علاقے کے بک اسٹال سے خریدیے یا براہ راست منگائیے۔

اُردو اکیڈمی سندھ — کراچی — لاہور — حیدرآباد

ابوسلمان الہندی

قومی زبان۔ کراچی

مولانا آزاد اور اُن کا فلسفۂ تعلیم

یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ مولانا آزاد نہ صرف اردو کے بہت بڑے ادیب فارسی کے رمز شناس اور عربی لغت و ادب پر عبور رکھتے تھے بلکہ وہ انگریزی اور فرانسیسی زبان کے بھی بہت بڑے ماہر تھے۔ اور وہ قدیم و جدید اور تمام کلاسیکل لٹریچر پر ناقدانہ نظر رکھتے تھے۔ یہ دعویٰ محض خوش عقیدگی پر مبنی نہیں بلکہ پنڈت جواہر لعل نہرو، مہادیو ڈیسائی، مولانا محمد اسمعیل ذبیح، شورش کاشمیری، مرزا محمد عسکری وغیرہ نے بڑے کھلے دل سے اعتراف کیا ہے اقوام متحدہ کے ذیلی ادارہ یونسکو کی مجالس میں انگریزی میں تقاریر کر کے انھوں نے ہر کہ دمہ سے انگریزی زبان پر انتہائی عبور کو منوالیا ہے۔ اس مسئلہ پر ہم نے تفصیل کے ساتھ اپنی کتاب "امام الہند" (تعبیر افکار) میں بحث کی ہے۔ یہاں اس قدر تشریح ضروری ہے کہ جہاں اس مضمون کے حوالوں میں "آزاد کی تقریریں انگریزی" لکھا ہے اس سے مراد "SPEECHES OF AZAD" ہے اس کتاب میں جتنی بھی تقریریں ہیں، چونکہ وہ انگریزی میں کی گئی تھیں۔ اس لئے انگریزی ہی میں ان کو ایڈٹ کیا گیا۔

—————— (ابوسلمان الہندی)

اس حقیقت سے بہت کم لوگ واقف ہوں گے کہ مولانا ابوالکلام صرف ایک عالم دین اور بہت بڑے سیاس ہی نہیں تھے بلکہ وہ ایک عظیم ماہر تعلیم بھی تھے اپنی زندگی میں عموماً اور خصوصاً اس دور میں جب کہ وہ ہندوستان کی مرکزی حکومت میں وزارت تعلیم کے منصب پر فائز تھے تعلیم، فلسفۂ تعلیم نظریۂ تعلیم اور نظام تعلیم کے متعلق انہوں نے تحریر و تقریر کے ذریعہ بار ہا اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

ہمارے اس خیال کی مشکل ہی سے تردید کی جاسکے گی کہ مولانا آزاد کے فلسفۂ تعلیم میں جو وسعت اور ہمہ گیری پائی جاتی ہے وہ کسی دوسری جگہ نظر نہیں آتی اس اعتبار سے مولانا آزاد دنیا کی ان چند عظیم شخصیتوں میں سے ہیں جنہوں نے تعلیم کو ملکی اور قومی ضروریات اور تقاضوں سے نکال کر اس امن اور سلامتی کی بنیاد رکھی۔ وہ خود کی تعلیم و تربیت کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔ لیکن اس کے اثرات و نتائج کی آخری حد وہ ملک اور قوم قرار نہیں دیتے۔ ان کے فلسفۂ تعلیم کا ایک آفاقی تصور ہے اور اس کا مقصد ساری انسانیت کو مہذب بنانا ہے۔

تعلیم کے بارے میں مولانا آزاد کے نظریات و خیالات کو کسی قوم کے نظام تعلیم کی اساس اور بنیاد قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہ ایک وسیع موضوع ہے اور اس باب میں بہت کچھ تحقیق و تفتیش کی جاسکتی ہے۔ پیش نظر مقالہ میں ہمارا مقصد ان افکار و نظریات پر تحقیق کرنا نہیں۔ ہم صرف ان کے افکار کو قارئین کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ ساتھ ہی قوم و ملک کے جدید معماروں سے گزارش ہے کہ وہ اس باب میں سیاسی اختلافات اور

رنجشوں کو درمیان میں نہ لائیں اور مولانائے مرحوم کے فلسفۂ تعلیم سے استفادہ کرنے میں بخل نہ کریں۔

تعلیم مقصد ہے یا ذریعہ؟

یہ سوال مشرق و مغرب کے درمیان ہمیشہ سے موضوع بحث رہا ہے کہ تعلیم مقصد ہے یا ذریعہ؟ مولانا کے لئے بھی ناگزیر تھا کہ وہ اس بحث میں حصہ لیں۔ اس لئے کہ تعلیم کے باب میں اس سوال کا جواب وہ بنیادی اینٹ ہے۔ جس پر تعلیم کی پوری عمارت تعمیر ہوتی ہے۔ نیز اس باب کا اختلاف صرف ایک نظریاتی اور فطری اختلاف ہی نہیں رہتا بلکہ اس کا اثر نظام تعلیم پر پڑتا ہے۔ یہ اختلاف نصب العین اور منزل کے تعین کا تھا اور ضروری تھا کہ سفر شروع کرنے اور قدم اٹھانے سے پہلے طے کر لیا جائے کہ ہمارا نصب العین اور ہماری منزل کیا ہے۔

مولانا آزاد نے اس سلسلے میں مشرقی نظریۂ تعلیم کی حمایت کی ہے اور بڑی خوبی کے ساتھ اس کو ثابت کیا ہے مولانا فرماتے ہیں۔

> "یہ سوال اکثر پیدا ہوتا ہے کہ آیا تعلیم مقصد ہے یا ذریعہ؟ میں اس سلسلے میں یہ عرض کروں گا کہ مغرب نے تعلیم کو ایک ذریعہ ایک وسیلہ اور ایک واسطے کی حیثیت دی ہے۔ جبکہ مشرق اسے مقصد قرار دیتا ہے (مغرب معاشرتی سود و بہبود کو مقصد سمجھتا رہا ہے حالانکہ یہ معاشرتی سود و بہبود کا مسئلہ کچھ اس نوعیت کا ہے کہ اس کی مختلف تعبیرات کی گئی ہیں۔ بہرحال تعلیم کو ذریعہ قرار دینے کے میلان نے تعلیم کی قدر و قیمت کا معیار گرا دیا ہے...... لیکن .... جب ہم تعلیم کو مقصد قرار دیتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ہمارے نزدیک علم انتہائی قدر و قیمت لئے ہوئے ہے۔ میرے خیال میں کوئی مغربی مفکر علم کی اہمیت سے انکار نہیں کرے گا لیکن تاوقتیکہ ہم تعلیم کو مقصد قرار نہ دیں علم کا مقام متعین نہیں ہو سکتا..... اس نقطۂ نظر سے ہمیں چاہئے کہ ہم تعلیم کو ذریعہ نہیں بلکہ مقصد قرار دیں" (آزاد کی تقریریں۔ انگریزی)

ایک جگہ تعلیم کی حقیقت کے متعلق تحریر فرماتے ہیں۔

> "تعلیم اس خارجی ترقی کا نام نہیں جو انشا و لغت و ادبیات کی سطحی معلومات پر قائم ہو۔ اصل میں تعلیم ان مخفی قوتوں کے اظہار کا نام ہے جو فطرت نے انسانی طبیعت میں ودیعت کی ہیں۔"
>
> "اور تعلیم کی بنیاد یہ ہے کہ تعدد و اختیار و توسیع معلومات کے ذریعہ انسانی قویٰ کو ترقی دی جائے۔"
>
> (مضامین ابوالکلام)

ان کے نزدیک اس سے زیادہ تعلیم کی کوئی غرض نہیں کہ اس کے ذریعے لوگوں کو اشیاء کی اصلی حقیقت معلوم ہو جائے۔ ہر چیز کو ویسا ہی دیکھیں جیسی وہ ہے اور اس درجے میں رکھیں جس درجے میں اسے ہونا چاہئے۔ اس کے ذریعے افراد کو ترقی یافتہ اور مہذب بنایا جائے۔ مولانا کے نزدیک یہ حقیقی تعلیم ہے اور یہی مقصد مولانا کے نزدیک فرد کی تکمیل و تہذیب سے قبل معاشرتی سود و بہبود کا نظریہ بے معنی ہے اگر افراد نے تکمیلی مدارج طے نہ کئے ہوں تو ان سے نہ کوئی اچھی جماعت وجود میں آسکتی ہے نہ معاشرہ میں ہم آہنگی ہو سکتی ہے۔ پس ضروری ہے کہ افراد کو ترقی یافتہ اور مہذب بنایا جائے۔ اس کے بعد معاشرتی سود و بہبود کے سامان خود فراہم ہو جائیں گے۔

ایک مقام پر مولانا فرماتے ہیں کہ

"آج سائنس کی بدولت مشرق و مغرب ایک دوسرے کے بہت قریب آگئے ہیں۔ لہذا ضروری ہے کہ فرد یا جماعت سے متعلق جو متعصبانہ میلانات پائے جاتے ہیں ان کی اصلاح ہونی چاہئے۔ اور ایک ایسے نظام تعلیم کو رواج دینا چاہئے۔ جس میں فرد اور جماعت کی قدریں ملحوظ خاطر رکھی گئی ہوں۔ موجودہ دنیا میں تعلیم کی اہمیت کا راز اسی حقیقت میں مضمر ہے۔ تجربے نے ثابت کیا ہے کہ تعلیم نہ صرف افراد کی ترقی پر اثر انداز ہوتی ہے بلکہ جماعتیں بھی اس کے اثرات کی زد سے نہیں بچ سکتیں۔

اگر فرد کی شخصیت نے تکمیلی مدارج طے نہیں کئے ہیں تو جماعت یا معاشرہ میں ہم آہنگی پیدا نہیں ہو سکتی۔ لہذا موجودہ دنیا میں تعلیم کا مقصد اور منشاء یہ ہونا چاہئے کہ افراد کی شخصیتیں بھی تکمیل پذیر ہوں اور جماعتیں بھی تکمیل کا اعلیٰ معیار حاصل کر سکیں۔

مشرق و مغرب دونوں کو اس ارتقاء میں حصہ لینا چاہئے۔" (آزاد کی تقریریں۔ انگریزی)

مولانا کے نزدیک کسی معاشرہ کی حیثیت عرفی کی تعیین اس کے افراد کی نوعیت و خصوصیت سے ہوتی ہے اور افراد کی حقیقت نیت کا آئینہ دار وہ نظام ہے جس کے سانچوں میں ... عادات و خصائل ڈھلتے ہیں۔ پس اگر تعلیم کی بنیاد حریت و انسانیت کے اصولوں پر نہ ہو تو قوم و ملک خوشحال اور ترقی کی راہ پر گامزن نہیں ...... ہو سکتا اور اس طرح امید افزا مستقبل کے روشن چراغ گل ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

"اس مسلم الثبوت حقیقت سے کسی کو جرأت انکار نہیں کہ قومی تعلیم کا نظام اور اس کے پیش رفت حکومت کی بنیاد دو فلسفوں پر ہے۔ اگر کسی معاشرہ کی حیثیت عرفی اور ہیئت ترکیبی کی تعیین و تشخیص اس کے افراد کی نوعیت و خصوصیت ہوتی ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس کے مستقبل کا جائزہ بھی اسی روشنی میں لیا جا سکتا ہے، اور کسی فرد کی حقیقت، واقفیت کا آئینہ دار وہ نظام تعلیم ہے جس کے سانچے میں اس کی عادات و خصائل ڈھلتے ہیں۔ اگر تعلیم کی بنیاد حریت و انسانیت کے ہمہ گیر و ہمہ باز اصولوں پر استوار ہو تو اس کی بدولت عوام کے زاویۂ نگاہ میں نہ صرف تبدیلی آسکتی ہے بلکہ قوم کو خوشحال و ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہونے کے مواقع میسر آسکتے ہیں۔

اس کے برعکس تعلیم کے وہ انداز جو کسی غور و فکر کا نتیجہ نہیں ہیں ان سے امید افزا مستقبل کے چراغ گل ہو سکتے ہیں جنہیں علمبرداران حریت ہر دور میں روشن رکھتے آئے ہیں۔" (آزاد کی تقریریں انگریزی)

جب ہم مولانا آزاد کے فلسفۂ تعلیم کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ محض ملکی اور قومی ضرورتوں ہی کے پیش نظر نظریۂ تعلیم اور [illegible] تعلیم میں کسی تبدیلی کے متمنی نہیں۔ بلکہ وہ مسئلہ تعلیم کو ملکی اور قومی اقتضاءات کے محدود دائرے سے نکال کر عالمی بنیادوں پر ایک انقلاب لانا چاہتے [illegible] ان کا خیال ہے کہ آج دنیا کی فضا میں جو کشیدگی، شکوک، خوف اور نفرت پائی جاتی ہے اس کی بنیاد محض قومی اور سیاسی ہی نہیں بلکہ کسی حد تک خیالات کے اوہام پر ہے بس اس فضا کی تخلیق میں جہاں دوستی اور برابری کی سطح پر مختلف کیمپ نظر آئیں تعلیم اور صرف تعلیم کی معجز نمائیوں کو دخل ہے۔ اس مقصد [illegible] حاصل کرنے کے لئے مولانا کی تجویز ہے کہ۔

"اس کے لئے ضروری ہے کہ تاریخ و جغرافیہ کی تعلیم کے موجودہ نظام کو بدلا جائے۔ اس طرح (اشتراکی اور سرمایہ دارانہ) دونوں نظاموں [illegible] قریبی مناسبت پیدا ہو جائے گی۔" اس تبدیلی کے بغیر عالمی امن کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔" مولانا آزاد نے جون [illegible] میں بمقام پیرس (یونیسکو کا نصب العین" کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ

"گذشتہ تیس سال سے میں یہ سوچ رہا ہوں کہ جب تک ہم تاریخ و جغرافیہ کی تعلیمی قدریں نہیں تبدیل کریں گے دنیا میں عالمی امن کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکے گا۔ آج کل اسکولوں اور کالجوں میں تاریخ جغرافیہ کی تعلیم کا جو انداز ہے اس سے اختلافات و نزعات میں اضافہ ہوتا ہے۔ تاریخ بالعموم مفافر کی داستان اور کہیں کہیں اس میں کسی قوم کے حالات بڑھا چڑھا کر بیان کئے جاتے ہیں۔ رہا جغرافیہ کا معاملہ اس میں عالمی وحدت کی بنیادیں استوار نہیں ہوتیں۔ بلکہ اس کے برعکس اختلافات و نزاعات کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ ہم صرف ملکی حدبندیوں پر قناعت نہیں کرتے بلکہ اپنی جانب سے کچھ اور حدود قائم کر دیتے ہیں۔ ہر ملک نقشہ میں جہاں دکھایا گیا ہے۔ اسے نیا رنگ چڑھا ہوا ہے۔ اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ بچپن ہی میں ہمارے بچوں کے ذہن میں اختلافات کا بیج پڑ جاتا ہے۔ جب تک بچوں کی تعلیم و تربیت کا انداز نہیں بدلے گا اور ان کے ذہن میں یہ بات نہیں بٹھائی جائے گی کہ وہ عالمی وحدت اور آفاقی شہریت سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہم بین الاقوامی سطح پر مفاہمت کی خوشگوار و خوش آئند فضا کیسے پیدا کر سکتے ہیں۔"

(ہفت روزہ چٹان ۱۸ر فروری ۱۹۵۸ء)

یہی بات وہ مارچ ۱۹۵۱ء میں یونیسکو کے ڈائریکٹر جنرل کی آمد پر دہلی میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ پیش کر چکے تھے۔ مولانا نے کہا کہ :

"آپ شاید اس بارے میں مجھ سے اتفاق کریں گے کہ نئی پود کے مرد و زن کی تربیت ایک ایسے علیحدہ پسند ماحول میں ہوئی ہے کہ ان سے عالمی اتحاد اور آفاقی شہریت کی توقعات وابستہ نہیں کی جا سکتیں۔ انھیں ایسے خطوط پر غور و فکر کی تربیت دی گئی ہے۔ جن پر نسلی، طبقاتی یا قومی امتیازات کا خول چڑھا ہوا ہے اگر ہمارے پیش نظر عالمی اتحاد کا حصول ہے۔ اور اس چیز پر سب متفق ہیں کہ ایسے اتحاد کے بغیر انسان کا مستقبل تاریک رہتا ہے تو ہماری تمام تر کوششیں آفاقی شہریت کی خاطر، نئی پود کی تعلیم و تربیت پر مرکوز ہونی چاہئیں۔ اگر ابتدائی ایام ہی سے آج کے بچوں کی تربیت، اتحاد و اخوت کی بنیادوں پر کی جائے تو بڑی عمر میں ان کا شعور اتنا بالغ فہم اتنا پختہ ہو جائے گا کہ موجودہ نزلات ان کی نظر میں بے وقعت اور بے حقیقت ٹھہریں گے۔

اس مقصد کے حصول کے لئے مدارس میں تاریخ و جغرافیہ کی تعلیم کا پورا ڈھانچہ تبدیل کرنا ہوگا۔ تاوقتیکہ اس مقصد کی تکمیل نہ ہو اقوام عالم کے جسم میں اتحاد و اتفاق کی روح نہیں پھونکی جا سکتی۔ اور یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جب تک اسی قسم کا اتحاد بروئے کار نہیں آئے گا۔ آفاقی شہریت کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ تاریخ جغرافیہ کی تعلیم کا جو طریقہ رائج ہے وہ نہ صرف مقصد کی تکمیل میں خلل انداز ہوتا ہے بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ اس کی بنیاد ہی حقائق پر نہیں ہے یہ کرۂ ارض جو باعتبار تخلیق ایک ہی ہے ہم نے اسے اپنے ذاتی مفاد اور شخصی منفعت سے مختلف حصص پر منقسم کر دیا ہے اسی پر بس نہیں کی بلکہ ہم نے یہ ستم ظریفی بھی کی ہے کہ اس مشترک دنیا کے نقشے میں نت نئے رنگ بھر دئے پھر یہ تقسیمیں کچھ اس انداز سے کی گئی ہیں کہ اس پر رسم در رسم کے خول بھی چڑھا دیئے گئے ہیں۔ کسی کا ایشیا نام پڑا تو کسی کا یورپ، کسی نے امریکہ نام لیا تو کسی نے افریقہ۔ جب ہم کسی بچے کو جغرافیہ کی تعلیم دیتے ہیں تو ہم شروع میں یہ حقیقت اس کے ذہن نشین نہیں کرتے کہ وہ پوری دنیا کا شہری اور پورے عالم کا باشندہ ہے۔ اس کے برعکس ہم اس کے ذہن میں یہ بات بٹھاتے ہیں کہ اس کا تعلق دہلی سے ہے اور دہلی ہندوستان میں ہے اور ہندوستان ایشیا میں ہے۔ ایشیا مشرقی کرۂ ارض میں۔

یہ تمام منازل و مدارج عبور کرنے کے بعد آخر میں ہم اس پر یہ واضح کرتے ہیں کہ وہ دنیا کا باشندہ ہے۔ اس پر عالمی شہریت کے حقوق عائد ہوتے ہیں۔ مگر ایسے ماحول میں پلا ہوا بچہ اپنے آپ کو کسی خطہ سے متعلق سمجھتا ہے،

خواہ وہ دہلی ہو یا پیرس، پیکنگ ہو یا نیویارک تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ زیادہ سے زیادہ وہ صوبائی اور قومی حدود سے تجاوز کر سکتا ہے کہ میں ایشیائی ہوں یا یوروپی، افریقی ہوں یا امریکی رہا نسل انسانی سے اس کی رگنیت کا نظریہ۔ اس کی حیثیت وہی یا نمایاں رہ جاتی ہے۔

ابتدائی درجات میں بچوں کے لئے ایسے نئے نقشوں کی ضرورت ہے۔ جس میں دنیا کا ایک رنگ دکھایا گیا ہو۔ ہمیں بچے کو یہ تعلیم دینی چاہئے کہ وہ دنیا کا ایک اچھا شہری ہے پھر اس پر یہ حقیقت واضح کرنی چاہئے کہ جس طرح سہولت کی خاطر کسی حصہ کو مختلف وارڈوں میں تقسیم سے محلے کی وحدت میں فرق نہیں آتا اسی طرح دنیا مختلف منطقوں پر منقسم ہے جیساکہ ایشیاء امریکہ، افریقہ اور یوروپ لیکن ان تقسیمات سے عالمی وحدت میں فرق نہیں آتا۔ ٹھیک جس طرح وارڈ چھوٹے چھوٹے محلوں اور گلیوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ اسی طرح براعظم چھوٹے چھوٹے وارڈوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ان وارڈوں کو ہم ممالک سے تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن یہ ممالک ایک ہی عالم کے اجزائے غیر منفک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بچپن میں جغرافیہ کی تعلیم اگر اس انداز سے دی گئی تو بچوں کے ذہن میں یہ نقش بیٹھ جائے گا۔ کہ ان کا تعلق ایک عالم سے ہے۔

جغرافیہ کی تعلیم کے پہلو بہ پہلو تاریخ کی غلط تعلیم نے بھی نسل انسانی کو مختلف شاخوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ مروجہ کتب تاریخ میں بتایا گیا ہے کہ متفرق و مختلف شعوب و قبائل کی تاریخ میں خانہ جنگیوں کے تذکرے اس کثرت سے ملتے ہیں کہ ہم یہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ وہ اشخاص جن کا تعلق مختلف شعوب و قبائل سے ہوتا ہے، آپس میں ایک دوسرے سے نفرت و حقارت کا برتاؤ رکھتے رہے ہیں۔

تاریخ کی تعلیم کا یہ انداز القیاس طبع اور تنگ نظری کے جراثیم فضا میں نشر کرتا ہے۔ بچہ کی افتادِ طبع کچھ ایسی ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو دنیا سے الگ تھلگ سمجھنے لگتا ہے .... پس جس طرح عالمی وحدت کے استحکام کے لئے جغرافیہ کی تعلیم میں تجدید و تغیر کی ضرورت ہے اسی طرح وحدتِ انسانی کے قیام و بقا کی خاطر تاریخ کی تعلیم کا انداز بھی نئے قالب میں ڈھلنا چاہئے جب تک ہم تاریخ و جغرافیہ کی قدریں نہیں بدلیں گے انسان کے ذہنی میلانات میں تبدیلی نہیں آسکتی"۔

تعلیم کے کسی مرحلے میں "معلم" کی شخصیت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا خصوصاً ابتدائی تعلیم کے استاد کو کہ وہ بچہ پر سب سے زیادہ اثر ڈالنے والی شخصیت ہوتی ہے۔ اعلیٰ درجات کے طالب علم چونکہ وہ عقل و شعور کی ایک حد تک پہنچ چکے ہوتے ہیں۔ اپنے استاد کا اتنا اثر قبول نہیں کرتے لیکن ابتدائی درجات کے طلبار کا معاملہ اس سے بالکل برعکس ہوتا ہے وہ اپنے استاد سے بہت زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ اور استاد ہی کے اخلاق و کردار اور سیرت کے سانچے میں ڈھلتے چلے جاتے ہیں مولانا کے نزدیک ضروری ہے کہ معلم وہ لوگ ہوں جو صفائی، سچائی اور دیانت داری کا مکمل نمونہ ہوں اور خود غرضی اور سیاسی مفاد کے بندے نہ ہوں۔ خود غرض اور حقیر دنیاوی مقاصد پر حق کو قربان کرنے والے معلمین کے ذریعے نہ صرف تعلیم کی غرض و غایت حاصل نہیں ہو سکتی بلکہ یہ لوگ ملک و قوم کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں۔

"تعلیم کی غرض صرف انہیں معلمین کے ذریعے حاصل ہو سکتی ہے جو خود بے غرض ہیں حق کی تعلیم صرف اس لئے دیتے ہیں کہ وہ حق ہے اور حق کو پوری سچائی، صفائی اور دیانت سے ظاہر کرتے ہیں۔ خود غرض معلم، سیاسی اغراض کے بندے اور حقیر و دنیاوی مقاصد پر حق کو قربان کرنے والے لوگ ہرگز "معلم" نہیں ہو سکتے۔ ایسے معلم قوم کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہیں۔ اور ان دجالوں سے قوم کے بچوں کی حفاظت و حمایت ہر محب وطن کا اولین فرض ہے۔ ہمیں ان کی

جڑ کاٹ دینی چاہیئے اور قوم کو ہمیشہ کے لئے نجات دیدینی چاہیئے۔"

(الہلال بحوالہ ہفت روزہ چٹان لاہور ۲۵ / اگست ۱۹۵۸ء)

ایک دوسرے مقام پر تعلیم کی اصلی غرض و غایت حاصل کرنے کے لئے ضروری قرار دیئے ہیں کہ پہلے۔

(۱) درس دینے والوں کو نمونۂ تہذیب بنایا جائے تاکہ وہ اپنے فرائض نہایت کامیابی سے ادا کر سکیں۔

(۲) معلمین اور متعلمین کے مابین جو بزرگانہ تعلقات ہوں ان کی عمارت اس داغ بیل پر ہونی چاہیئے جس کی بنیاد دراصل تعلیم رسالت میں ڈالی تھی کہ

"تم میں جو بڑے ہوں ان کی بزرگ داشت کی جائے اور جو چھوٹے ہوں ان کے ساتھ رحمت و مہربانی کا برتاؤ ہو"

(حدیث۔ مضامین ابوالکلام)

تعلیم کے بارے میں اساتذہ اور خصوصاً ابتدائی درجات کے اساتذہ کا مسئلہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے جسے نہ صرف نظر کیا جا سکتا ہے نہ اس کے بغیر کسی پائیدار اور دیرپا تعمیر کا وجود ممکن ہے۔ مولانا آزاد فرماتے ہیں۔

"تعلیمی نقطۂ نظر سے اس نوعیت کی ترقی بنیادی تعلیم کو لازم قرار دیتی ہے۔ اگر بنیادیں استوار نہیں کی جاتی ہیں تو کسی پائیدار اور دیرپا تعمیر کا وجود ممکن نہیں۔ تعمیر و تمدن کی پوری عمارت کی نیو ابتدائی درجات کی تعلیم اور مدرسین پر ہے۔"

یہ تو مدرسین کی شخصیت، مقام اور ان کے فرائض کے متعلق مولانا آزاد کے خیالات و افکار تھے۔ آج جو مدرسین کی حالت ہے اور ان کو جس نظر سے دیکھا جاتا ہے وہ بھی ان کی نظروں سے پوشیدہ نہیں اس کے باوجود کہ انھیں اپنی تعلیم کے دوران اس قسم کے استادوں سے سابقہ پڑا نہ وہ زندگی میں ایک لمحہ کے لئے ان حالات سے دوچار ہوئے جن سے مدرسین کو اور خصوصاً ابتدائی جماعتوں کے مدرسین کو دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ان کی قسمت میں روز ازل ہی سے وزارت تعلیم کا منصب جلیل لکھا جا چکا تھا لیکن انھوں نے مدرسین کی حالت کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ کتنا صحیح ہے۔ اور اس بات میں ان کے خیالات کتنے بلند ہیں۔ فرماتے ہیں۔

"ملک کی قدیم روایات کے برعکس اساتذہ کو قدر و منزلت کی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا۔ ان کا پیشہ افسوسناک حد تک ذلیل ہو چکا ہے۔ ماضی میں ایک استاد کا مقام بہت بلند تھا اگر مالی حیثیت سے کوئی استاد خوشحال نہ بھی ہوتا تو اس کا اسے ملال نہ تھا۔ اور اس لئے کہ سماج میں جو ان سے مرتبہ اور وقار حاصل ہوتا تھا اس سے کافی حد تک اس کی بیزاری کا کفارہ ہو جاتا تھا۔ اس دور میں شومئی قسمت سے زمانہ کا نقشہ ہی بدل گیا۔ آج خصوصیت کے ساتھ ابتدائی درجات کے اساتذہ کی وہ مٹی پلید ہو رہی ہے کہ ان کے ساتھ نوکروں جیسا سلوک کیا جاتا ہے۔"

(آزاد کی تقریریں انگریزی)

نظام تعلیم کی تجدید و احیاء کی مہم شروع کرتے وقت ہمارا فرض یہ ہونا چاہئے کہ ہم اساتذہ کا معاشرتی معیار بلند کریں۔ اس اعتبار سے غور کیا جائے تو ہمارے ملک (پاکستان)، کے اساتذہ کی حالت بھی اس سے قطعی جدا نہیں۔ ہمارے معاشرہ میں یقیناً معلمین کو وہ حیثیت نہیں دی گئی جس کے وہ واقعی مستحق تھے۔ نہ کھلے دل سے ان کے بلند مقام کا اعتراف کیا گیا۔ یہ شکایت اب بھی باقی ہے۔ کہ ان کے ساتھ کچھ بہتر سلوک نہیں کیا جا رہا ہے۔ ہم حضرت مولانا آزادؒ ہی کے الفاظ میں جدید معماران قوم سے گذارش کرتے ہیں کہ۔

"نظام تعلیم کی تجدید و احیاء کی مہم شروع کرتے وقت ہمارا اولین فرض یہ ہونا چاہیئے کہ ہم اساتذہ کا معاشرتی معیار بلند کریں۔"

منظور شدہ محکمۂ تعلیمات کراچی بموجب سرکلر نمبر ڈی۔ای/جی۔ دی/۵۸۰۳۔۵۱۰۰۲/۶۰ء مورخہ ۲۶ ستمبر ۶۰ء

اردو ادب کا ڈائجسٹ

نقش کراچی

۳ — ۶۵

ادارہ

شاہد احمد دہلوی۔ شمس زبیری

قیمت	سالانہ
ایک روپیہ	بارہ روپے

کاشانۂ اردو۔ پوسٹ بکس ۷۳۰۲۔ کراچی ۳

فون ۵۶۱۔۷۰

ترتیب

افسانے

طنز و مزاح

تبصرہ نگاری

منظومات

مضامین

ہمارے سب سے بڑے قومی مسئلے پر ایک فکر انگیز کتاب

پاکستانی کلچر

قومی کلچر کی تشکیل کا مسئلہ

جمیل جالبی

• یہ تصنیف اپنے موضوع کی اہمیت، اپنی معنوی خوبی اور فاضل مصنف کی خوش دلانہ کاوش کے لحاظ سے بڑی قابل قدر تصنیف ہے اس کی زبان اس کا اسلوب بیان اس قدر شگفتہ، سلیس و دلکش ہے کہ وہ ایک دلچسپ داستان معلوم ہوتی ہے۔"

علامہ نیاز فتحپوری

• اس کتاب میں بے شمار مسائل ہیں جو توجہ طلب ہیں۔ خدا کرے کہ یہ کتاب تعلیم یافتہ لوگوں کو بیدار کر دے۔"

ڈاکٹر سید عبداللہ

• پہلی مرتبہ اس ملک کے ایک دانشور کو یہ سعادت نصیب ہوئی۔ کہ وہ اس مشکل مسئلہ پر ایسی مدلل اور تفصیلی بحث کرے۔ یہ کتاب خیال و اظہار کی آزادی کی قابل تعریف مثال پیش کرتی ہے۔"

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری

جمیل جالبی صاحب نے جس طرح مسئلہ کی پیچیدگیوں کا تذکرہ کیا ہے وہ اپنی جگہ نہایت سنجیدہ اور ہوشمندانہ ہے

محمد حسن عسکری

اس دور کی ایک بہترین کتاب جسے ۶۵-۱۹۶۴ء
کا داؤد ادبی انعام بھی ملا

قیمت آٹھ روپے

ناشر:- مشتاق بک ڈپو۔ شیلڈن روڈ۔ نزد اردو کالج کراچی

کرشن چندر

منشور۔ کراچی

روح کی ساتھی

پریم کمار نے پریم تو بہت کیے تھے۔ لیکن شادی آج تک کسی سے نہیں کی تھی۔ مگر وہ بے وفا نہیں تھا۔ ہر بار جب اُس نے کسی لڑکی سے پریم کیا سچا پریم سمجھ کر ہی کیا۔ یہ بات الگ ہے کہ اپنی چالیس برس کی زندگی میں اس نے اتنی بار سچا پریم کیا تھا۔ کہ اب وہ ان کی گنتی بھی بھول چکا تھا۔ لیکن یہ سچا پریم ہر بار جھوٹا پریم ثابت ہوا۔ اس میں غلطی نہ پریم کمار کی تھی۔ نہ لڑکی کی۔ مگر ہر بار پریم کمار کو کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے جسم سے جسم تو ملے۔ لیکن روح سدا پیاسی رہی۔ کچھ ایسا لگا جیسے روح سے روح نہیں ملی، آتما آتما کی ساتھی نہیں بن سکی (کوئی اس بھلے مانس سے پوچھے۔ کہ جب روح سے روح نہیں ملی تو جسم سے جسم ملانے کا کیا حق تھا۔) لیکن پریم کمار ایک کامیاب ہیرو تھا۔ ہر سال لاکھوں روپے کماتا تھا۔ اور کروڑوں لوگوں کے دلوں کا دیوتا تھا۔ ایسے دیوتا سے کوئی پوچھے کہ اے مسٹر پریم کمار تم جو ہر سال دس لڑکیوں سے پریم کرتے ہو۔ اور ہر موسم کے بدلنے پر اپنی لڑکی کو بدل دیتے ہو۔ اور لڑکی کا دل یوں توڑ دیتے ہو۔ جیسے عمدہ ڈنر کھانے کے بعد لکڑی کا خلال توڑ دیا جاتا ہے۔ تو صاحب یہ تمہاری محبت ہے کہ ہوس؟ مگر دیوتاؤں سے اور فلم ایکٹروں سے اور دھن والوں سے ایسی باتیں کون پوچھ سکتا ہے۔

اس لیے چالیس سال تک پریم کمار سچا عشق کرتا رہا۔ اور لڑکیاں بدلتا رہا۔ اور کامیابی کے زینے پر چڑھتا رہا۔ اور فلموں میں کام کرتا رہا سچا عشق کرتا رہا۔ اور عشق کرتے کرتے چالیس برس کا ہو گیا۔ لیکن کہیں اسے اپنی پسند کی لڑکی نہیں ملی۔ ایسی لڑکی جس کی روح اس کی روح سے میل کھاتی ہو۔ ہاں اسے جسم بہت ملے، درجنوں بلکہ سینکڑوں جسم، نوجوان اور خوبصورت جسم، بھولی مسکراہٹوں اور البڑ اداؤں والے جسم من موہنے، حسین، دلکش جسم، اور اس کی کوئی شب، جسم کے بغیر خالی نہ گئی۔ مگر اس کی روح سدا پیاسی اور خالی رہی۔ اور وہ اپنے ساتھی کی تلاش میں ڈھونڈتا، ڈھونڈتا چالیس برس کا ہو گیا۔ لیکن اسے اپنی روح کا ساتھی نہ ملا۔ لوگ اسے خوش قسمت سمجھتے تھے۔ لیکن اس کا دل ہی جانتا تھا۔ کہ وہ کتنا بدنصیب ہے۔ بینک میں تیس لاکھ رکھنے کے بعد بھی کتنا بدنصیب ہے۔ ہر روز ایک نئی لڑکی کے ساتھ سونے کے باوجود کتنا بدنصیب ہے؛ بعض لوگ بڑے بدنصیب ہوتے ہیں۔ پریم کمار کو دیکھ کر مجھے اکثر اس پہ بڑا رحم آیا ہے۔ اور اس پہ ترس کھا کر کئی بار میں نے سوچا ہے۔ کاش پریم کمار کی بدنصیبی مجھے مل جاتی۔ اور میری خوش قسمتی اسے۔ مگر یہ کیسے ممکن ہے؟ میں پریم کمار کا دوست ہوں۔ مگر ایک دوست بھی اپنی زندگی دوسرے کو نہیں دے سکتا۔ حالانکہ ایک دن میں نے اس کا ارادہ بھی کر لیا تھا اور اپنی خوش قسمتی اور اس کی بدنصیبی کا خیال کرتے ہوئے اس سے کہہ ڈالا تھا۔ "دوست۔ اگر تم چاہو تو تم میری زندگی لے سکتے ہو۔ میری جھنگی بیوی اور اس کے ساتھ بچے لے سکتے ہو۔ میری کھولی،

میرہ دو ٹوٹی ہوئی چارپائیوں، تین بستر اور دو رنگ آلود ڈرم لے سکتے ہو۔ ساڑھے پانچ ہزار کا قرض جو مجھ پر واجب ہے وہ بھی لے سکتے ہو اور تھرڈ کلاس لوکل ریلوے کا پاس بھی جو میں ہر ماہ بنواتا ہوں۔ اور جس کے سہارے میں فٹ بورڈ پر لٹکے لٹکے باندرہ سے چرچ گیٹ تک جاتا ہوں تم وہ بھی لے سکتے ہو۔ دوست مگر مجھ سے تمہاری بدنصیبی دیکھی نہیں جاتی۔ روز رات کو وہسکی کی بوتل کھول کر تم بلک بلک کر عورت کی روح کے لیے روتے ہو وہ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا۔ تم بتاؤ میں کیا کروں؟ جو کچھ میرے پاس ہے وہ سب تم لے سکتے ہو۔"

پریم کمار نے میری فراخ دلی سے متاثر ہو کر فوراً مجھے گلے سے لگا لیا۔ اور سسک سسک کر بولا۔

"دوست ہو تو ایسا! تمہارا لاکھ لاکھ شکریہ مگر دوست کون کسی کے نصیب سے اپنا نصیب بدل سکا ہے؟ جس روح کی مجھے تلاش ہے۔ وہ اگر خود سے مجھے نہیں مل سکی تو تمہارے سہارے سے کیا مل سکے گی۔ اور جہاں تک تمہاری عورت کا تعلق ہے۔ میں اپنی بھابی کی بہت عزت کرتا ہوں لیکن اس بے چاری کے منہ میں دانت تو ہے نہیں روح کیا رہی ہو۔

میں تمہارے بچے بھی تم سے نہیں چھین سکتا۔ کیونکہ مجھے معلوم ہے۔ تمہیں اپنے بچوں سے کتنا عشق ہے۔ تمہاری کھولی بھی میں تم سے نہیں چھینوں گا۔ ورنہ تمہیں فٹ پاتھ پر رہنے سے بڑی تکلیف ہوگی۔ اور میں اپنے کسی دوست کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔ تمہارا قرضہ میں بھی میں نہیں لوں گا۔ ورنہ تم اور قرضہ چڑھاؤ گے اور یہ تم سے دوستی نہیں دشمنی ہوگی۔ تمہارا تھرڈ کلاس کا پاس بھی نہ لوں گا۔ ورنہ تم بلا ٹکٹ پکڑے جاؤ گے۔ غرضیکہ دوست کسی طرح سے ہم دونوں اپنی زندگیاں نہیں بدل سکتے۔ مگر تم زیادہ غم نہ کرو میں اب چالیس برس کا ہو چکا ہوں۔ اب میں زیادہ دیر اپنی بدنصیبی کی صلیب اکیلے نہ اٹھا سکوں گا۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ اب میں بہت جلد شادی کر لوں گا۔ یہ میں نے طے کر لیا ہے۔"

"کس سے؟"

"یہ تو طے نہیں کیا ہے؟"

"پھر بھی نظر میں تو کوئی ہوگی۔"

"فی الحال میری نظر میں دو لڑکیاں ہیں اور دونوں میری دو مختلف فلموں میں ہیروئن کا کام کر رہی ہیں۔ اور فی الحال میں دونوں سے محبت کر رہا ہوں۔"

دونوں سے، وہ کیوں؟"

وہ اس لیے کہ کیا معلوم ان دونوں میں سے کس کی آتما میری آتما سے مل جائے، اس لیے احتیاطاً دونوں سے محبت کر رہا ہوں۔ اور اب میں سمجھتا ہوں کہ مجھے اب اپنی زندگی میں زیادہ دیر تک بھٹکنا نہیں پڑے گا۔ اور اب میری تلاش ان دونوں لڑکیوں تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ یقیناً ان دونوں لڑکیوں میں سے ایک لڑکی ضرور ایسی ہوگی۔ جو میری روح کی ساتھی ہوگی۔

ہولی کے دن اس نے بہت سے فلمی ستاروں کو پارلے ہل کی اپنی شاندار کوٹھی میں مدعو کیا تھا۔ دلیپ کمار، راج کپور، شمی کپور، راجندر کمار، بھارت بھوشن، دیو آنند، سادھنا، آشا پاریکھ، سائرہ بانو، جبیں جلیل، وحیدہ رحمان، جے راج، ڈیوڈ، کے این سنگھ، پران۔ اوم پرکاش، جانی واکر، سبھی فلمی ستارے اس نے بلا لیے تھے۔ کئی سال سے یہ روایت بن چکی تھی۔ کہ ہولی کے دن سب لوگ اس کے گھر اکٹھے ہوتے تھے۔ کیونکہ اس کی کوٹھی کا Swimming pool بہت شاندار تھا۔ بہت بڑا تھا اور بہر آب رنگا رنگ

روشنیوں سے اس طرح جھلملاتا تھا۔ کہ معلوم ہوتا تھا کہ سوئمنگ پول کے پانی میں دھنک کے ساتوں رنگ بکھر گئے۔ اس طرح سوئمنگ پول میں خفیہ ٹونٹیاں لگوائی گئی تھیں۔ جن سے بوقت ضرورت طرح طرح کے رنگ دار پانی تالاب میں چھوڑے جا سکتے تھے۔ گلابی، سبز، نیلا، پیلا جامنی، نارنجی رنگوں کے پانی چاروں سمتوں سے اندر کی ٹونٹیوں سے فوارے کی طرح زور سے نکل کر جب تالاب میں آگرتے تو رنگوں کی کہکشاں سی بن جاتی۔ ہولی کے دن اس تالاب میں سب کو نہلایا جاتا۔ اور جو نہانے پر تیار نہیں ہوتے تھے۔ ان کو زبردستی تالاب میں پھینک دیا جاتا تھا۔ پھر بڑے زور کا قہقہہ بلند ہوتا۔ تالیاں بجتیں، ڈھول پیٹے جاتے اور آئی ایس جوہر، کمری اور اوم پرکاش مل کر بھنگڑا شروع کرتے جس میں ہولے ہولے سارے فلم سٹار شامل ہو جاتے۔

آج ہولی کی تقریب میں پریم کمار نے آرتی بالا اور آزاد رضا دونوں کو بلایا تھا۔ آج کل وہ ان دونوں سے محبت کر رہا تھا اور اس کا ارادہ تھا۔ کہ وہ ان دونوں میں سے کسی ایک شادی کرے گا۔ مگر ابھی وہ ذہنی طور پر کوئی فیصلہ نہیں کر سکا تھا۔ کہ کس سے شادی کرے ___؟

کبھی تو اسے آرتی بالا بہت پسند آتی۔ کیونکہ آرتی بالا بہت ہی ہنس مکھ، شوخ اور چنچل لڑکی تھی۔ بہت باتونی، ہر دم مذاق کرنے والی قہقہے لگانے والی، اور خوش رہنے والی اور چھیڑ چھاڑ کرنے والی، وہ کبھی خاموش نہیں بیٹھتی تھی۔ اگر شوٹنگ نہیں ہے تو سیر ہے، پکنک ہے، سینما ہے، دعوت ہے کسی کے ہاں کھانا ہے یا کسی کو اپنے ہاں کھلانا ہے یا کوئی دوسرا پروگرام ہے۔ قوالی ہے یا تھیٹر ہے۔ اسے ہر دم کوئی نہ کوئی مشغولیت چاہیے وہ چپ چاپ رہنے والے بور لوگوں کو قطعی پسند نہیں کرتی تھی۔ اگر پریم کمار کبھی سنجیدہ اور خاموش نظر آتا۔ تو وہ اسے فوراً گدگدانے لگتی۔ اس پر تکیہ، تاش، جوتا، قلم، جراب، کتاب جو سامنے آجائے پھینکنا شروع کرتی۔ یا تو اسے ہنسا دیتی یا خفا کر دیتی اور خفا کر کے تو بہت خوش ہوتی۔ کیونکہ جھگڑنے میں اسے بڑا مزا آتا تھا۔ . . . . جھگڑا کر کے وہ بہت سی انٹ شنٹ باتیں . . . . . . سنا دیتی تھی۔ روٹھ جاتی تھی۔ روتی تھی اور بڑی مشکل سے منائی جاتی تھی۔ اسے روٹھ کر من جانے میں بڑا لطف آتا تھا۔ وہ تین لاکھ کی ایکٹریس تھی۔ حالانکہ اس کی عمر صرف بائیس سال کی تھی۔

لیکن پریم کمار کو آزاد رضا بھی بہت پسند تھی۔ ایک تو اس کی عمر بھی کم تھی مشکل سے سترہ اٹھارہ برس کی ہوگی۔ مگر اٹھارہ برس کی عمر میں بھی جوانی گھٹا بن کر آزاد رضا پر برسی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے جوانی سے آزاد رضا کا انگ انگ ٹوٹا جا رہا ہو، پریم کمار کو ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ اگر اس نے آزاد رضا کو ہاتھ لگایا تو وہ ٹوٹ کر بکھر جائے گی۔ اس کی جوانی اس کے سنبھالے نہیں سنبھلتی تھی۔ وہ زیادہ بات تو نہیں کرتی تھی۔ لیکن اس کا جسم بہت بولتا تھا۔ اور اس کی آنکھیں بہت بولتی تھیں۔ اور اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ میں انگاروں کی سی آنچ تھی۔ آزاد رضا بولتی کم تھی مگر کھینچتی زیادہ تھی۔ اس کی کشش ایک مقناطیس کی طرح تھی اور جب پریم کمار اس کے ساتھ سیٹ پہ کام کرتا۔ تو ساری دنیا کو بھول جاتا۔ اسے معلوم ہوتا اس کی باہوں میں کوئی عورت نہیں ہے سلگتا ہوا ایک انگارہ ہے۔ جس سے اس کا سارا بدن جل جائے گا۔

پریم کمار، آزاد رضا اور آرتی ان دونوں کے بیچ میں لٹک رہا تھا۔ اور یہ فیصلہ نہ کر سکتا تھا کہ ... کس سے شادی کرے دونوں لڑکیاں ہیروئن تھیں۔ اٹھتی ہوئی اور شہرت کی اونچی منزلوں کی جانب رواں دواں خود پریم کمار کی عمر چالیس سے تجاوز کر گئی تھی۔ اس لیے اب وہ یہ محسوس کر رہا تھا۔ کہ اب اسے اپنے مستقبل کی خاطر کسی نوجوان ہیروئن سے جلد شادی کر لینی چاہیے۔ اب وہ اس انڈسٹری میں تین چار سال سے زیادہ نہیں چل سکے گا۔ اس لیے گھر میں کوئی تو ہو جو اس کے بجائے فلم انڈسٹری میں چل سکے۔ ورنہ گھر کیسے چلے گا؟ اس طرح کے خیال اب اسے ستانے لگے تھے۔ اگر وہ چاہتا تو کسی پکی عمر کی پکے ہوئے پھل کی طرح رسدار ہیروئن سے شادی

کرسکتا تھا، مگر وہ بھی دو چار سال چل کر رہ جائے گی۔ اس لیے زیادہ صحیح یہ ہوگا کہ وہ کسی نو عمر ہیروئن سے شادی کرے۔ جسے فلم انڈسٹری سے باہر جاتے ہوئے کم از کم بارہ سال تو لگیں۔ اس سے آگے کی بھگوان جانے۔

اس لیے پریم کمار آزاد حنا اور آرتی بالا کے بیچ میں لٹک رہا تھا۔ اور اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اسے کس سے سچی محبت ہے آزاد حنا سے یا آرتی بالا سے؟ — مگر اب وہ اپنی عمر کی اس خطرناک منزل پر پہنچ گیا تھا۔ جہاں اسے بہت جلد اپنی محبت کا فیصلہ کر دینا ہوگا۔ اور ان دونوں میں سے کسی ایک سے شادی کر لینی ہوگی۔ آج ہولی کے دن اس نے دل ہی دل میں یہ فیصلہ کر لینے کا پختہ ارادہ کر لیا تھا۔

سوئمنگ پول کے چاروں طرف بے حد شور تھا۔ کچھ لوگ بھنگ پی کر لان پر مدہوش تھے۔

پریم کمار کہہ رہا تھا۔ "میں ایک سو روپے کی بلائنڈ چلتا ہوں۔"

کے این سنگھ بولا۔ "میں اپنی دونوں آنکھوں سے بلائنڈ چلتا ہوں۔"

مکری نے کہا۔ "میں ایک آنہ کی بلائنڈ چلتا ہوں۔"

اوم پرکاش نے پوچھا۔ "ایک آنہ ایک سو روپے کے برابر ہو سکتا ہے!"

مکری بولا۔ "ہو سکتا ہے اگر ہم سب لوگ ایمانداری سے ٹیکس دینے لگیں تو ایک آنہ ایک سو روپے کے برابر ہو سکتا ہے!"

اس پر ششی کپور نے وحیدہ رحمان اور سادھنا کو پانی میں غوطہ دے دیا۔ اور سوئمنگ پول کے کنارے راکی اینڈ ہائز کا بینڈ زور زور سے بجنے لگا۔ یہ روایت تھی کہ جب کبھی کوئی فلم ہیروئن پانی میں گرائی جاتی تھی۔ کنارے پر بینڈ زور زور سے بجتا تھا۔ اور لوگ پانی میں تیرتی ہوئی ہیروئن کی طرف پھول گجرے اور ہار پھینکتے تھے۔ پھر پران نے جبین اور سنیتا کو پانی میں دھکا دے دیا۔ اور بینڈ زور زور سے بجنے لگا۔

چند منٹ میں بیشتر فلمی ستارے پانی میں کود گئے۔ اور سوئمنگ پول کی ٹونٹیوں سے طرح طرح کے رنگ دار پانیوں کے فوارے چھوٹنے لگے اور وہ لوگ جھلملاتی ہوئی رنگین روشنیوں میں نہاتے ہوئے۔ ایک دوسرے پر پانی پھینکتے ہوئے ہنستے ہوئے قہقہے لگاتے ہوئے ہولی کی بہاروں میں کھو گئے۔

اتنے میں لوگوں نے دیکھا کہ ڈائیونگ بورڈ پر پریم کمار آرتی بالا کو لیے کھڑا ہے۔ اور ہاتھ کے اشارے سے بینڈ کو دھن چھیڑنے کے لیے کہہ رہا ہے۔

آرتی بالا نے ایک لمحہ کے لیے کسی طرح کی حجت نہیں کی۔ وہ مسکراتے ہوئے پریم کمار کے شانے پر ہاتھ رکھے ہوئے ڈائیونگ بورڈ پر آئی۔ اس نے ہلکے جامنی رنگ کا ایک پھولدار بکنی سوٹ پہن رکھا تھا اور وہ بار بار اپنی کمر کو لچکاتے ہوئے اٹھلا رہی تھی۔ باتیں کرتے کرتے پریم کمار نے اسے دھکا دیا۔ اور لوگوں کے شور کے درمیان آرتی بالا ایک ابابیل کی طرح بازو پھیلائے ہوا میں اڑتی نظر آئی۔ اور دوسرے لمحے میں دھم سے پانی میں کود گئی۔

چند منٹ کے بعد پریم کمار ڈائیونگ بورڈ سے غائب ہو گیا۔ حالانکہ پانی کی سطح سے ہاتھ پھیلا پھیلا کر آرتی بالا اسے نیچے ڈائیو کرنے کو کہہ رہی تھی۔ گویا اسے اپنی آغوش میں اترنے کو کہہ رہی تھی۔ مگر پریم کمار اور آزاد حنا کو پانی میں گرانے کی فکر میں تھا۔ اور سوئمنگ پول چھوڑ کر آزاد حنا کو ڈھونڈنے کے لیے چلا گیا تھا۔ اسے دیکھ کر آزاد حنا اسی کے گھر کے ایک کمرے میں چھپ گئی تھی۔ کیونکہ وہ سوئمنگ پول میں نہانا نہیں چاہتی تھی۔ بڑی مشکل سے پریم کمار نے اسے ڈھونڈا۔ مگر آزاد حنا کسی طرح تیار نہ ہوئی۔

"گھبراتی کیوں ہو؟" پریم کمار نے کہا۔ "تمہارا جسم تو سب سے خوبصورت ہے۔ چلو سوئمنگ پول میں مرد دیکھتے ہی مر جائیں گے۔ عورتیں جل جائیں گی۔"

"نہیں مجھے شرم آتی ہے!" آرادھنا گھبرا کر بولی۔

"ہولی کے دن شرم کیسی؟" پریم کمار نے پوچھا۔

"مجھے تیرنا نہیں آتا۔" آرادھنا نے دوسرا بہانہ کیا۔

"میں تمہیں پانی میں سنبھالے رہوں گا۔" پریم کمار نے وعدہ کیا۔

"نہیں۔"

"چلو۔" پریم کمار آرادھنا کو سوئمنگ پول کی طرف گھسیٹنے لگا۔

"نہیں نہیں۔" آرادھنا برابر ناں کرتی رہی اور پریم کمار اسے زبردستی سوئمنگ پول کی طرف لے جاتا رہا۔ اسی کش مکش میں آرادھنا کا بلاؤز پھٹ گیا اور اس کا جوڑا کھل گیا اور وہ سسک سسک کر رونے لگی۔

یکایک پریم کمار کو اس پر رحم آ گیا۔ اس نے یکایک اپنا ہاتھ روک لیا۔ آرادھنا کو چھوڑ دیا۔ آرادھنا سکڑی سمٹی، بھائی خوفزدہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اور رک رک کر بولی۔ "جانے کیوں مجھے لاج آتی ہے۔ پریم مجھے وہاں مت لے جاؤ۔"

پریم نے اسے اپنے دونوں بازوؤں میں لے کر پیار کیا۔ اس کے آنسو پونچھے۔ پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے ڈرائینگ بورڈ پر لے گیا اور چلا کر کہنے لگا۔

"لیڈیز اینڈ جنٹلمین! میٹ مائی وائف!" (Meet my wife)

چند لمحے تو حیرت کا مکمل سکوت رہا۔ پھر سوئمنگ میں اس غضب کا طوفان آیا۔ گویا سوئمنگ پول کا سارا پانی اچھل کر تالاب سے باہر آ جائے گا۔

جب میں نے رات کو پریم سے پوچھا۔ "یہ تم نے یہ فیصلہ کیسے کر لیا؟"

تو وہ بولا۔ "آرادھنا اور آرتی بالا میں سے آرادھنا کی روح زیادہ شرمیلی ہے۔ وہ فلم سٹار ہو کر بھی لوگوں کی نظروں سے بچنا چاہتی ہے۔ اس کی روح کے اندر ایک شریف عورت کی پاکیزگی ہے۔ یقیناً آرادھنا ہی میری سچی محبت کے لائق ہے۔ میں اس سے شادی کر رہا ہوں۔"

اسی رات آرادھنا نے اپنے بھائی سے جو دراصل اس کا شوہر تھا کہا۔ "میں پریم کمار سے شادی کر رہی ہوں۔ تمہیں ایک لاکھ دے کر الگ کر رہی ہوں۔ تم شادی کے بعد فوراً یہاں سے چلے جاؤ گے۔ اور پھر کبھی یہاں نہیں آؤ گے۔"

"ایک لاکھ دے دو میری رانی، میں تو کل ہی چلا جاتا ہوں!"

"کل نہیں، شادی کے بعد!"

"شادی کے بعد میری کیا ضرورت ہے؟"

"واہ! شادی کے دن بھائی کی ضرورت ہوگی۔ ماں باپ تو ہیں نہیں میرے۔ تم میرے بھائی بن کر میرا کنیادان نہیں کرو گے تو مجھے بڑی لاج آئے گی!"

عنایت اللہ

ماہِ نو۔ کراچی

جب سوزِ عشق جاگا!

نور چاچا گاؤں کی آبرو کا رکھوالا تھا۔

یوں تو بڑے شاہ جی مرحوم کے مزار نے بھی گاؤں پہ سایہ کر رکھا تھا اور اُن کی گدّی پر "چن چراغ شاہ" بیٹھے تھے۔ جن کی دعا و برکت سے گاؤں شر شرار، بھوت پریت، جن، چڑیل، پکّا سایہ اور ہر بلا سے محفوظ تھا۔ اور دشمن کا سر جھکا رہتا تھا۔ لیکن گاؤں کے دشمن چن چراغ شاہ سے کم اور نور چاچا سے زیادہ بدکتے تھے۔ نور چاچا کی کرامات ہی ایسی تھی۔

گاؤں کے دشمن کہیں دور دراز تو نہیں رہتے تھے۔ سامنے دو ہاتھ پہ اُن کا گاؤں نظر آتا تھا۔ یہی کوئی پون کوس کا فاصلہ ہوگا۔ نور چاچا کے گاؤں اور اُس گاؤں کے کھیتوں کے مینڈھ سانجھے تھے، دونوں گاؤں کے درمیان بہتا سرکاری کھڈ بھی سانجھا تھا۔ ہری کھیتوں کی آغوش میں شیشم کے پیڑوں تلے قبرستان بھی سانجھا تھا۔ اُدھر کی بیٹیاں اِدھر اور اِدھر کی بیٹیاں اُدھر بیاہی ہوئی تھیں۔ ڈیڑھ کوس پرے چھوٹا سا ریلوے اسٹیشن بھی سانجھا تھا۔ دونوں گاؤں کے فوجی جوان اسی اسٹیشن پر اُترتے تھے۔ اور اپنے اپنے گاؤں میں چھٹی کاٹ کر اسی اسٹیشن سے رات کی گاڑی سے کالے کوسوں پردیس چلے جاتے۔ ڈھور ڈنگر چرتے چگتے اور بچے کدکڑے لگاتے اس گاؤں سے اُس گاؤں تک جا پہنچتے تھے۔ لیکن دلوں میں جو فاصلے حائل ہوگئے تھے وہ بڑی کٹھن مسافت تھی۔ جسے نہ اُس گاؤں کے گبھرو پاٹ سکے نہ اس گاؤں کے جیالوں نے طے کرنے کی ہمت کی۔

کرتے بھی کیسے؟ صرف سرکاری کھڈ ہوتا تو وہ کود کے پار کر جاتے۔ لیکن درمیان میں ناک حائل ہوگئی تھی۔ ناک پر پاؤں رکھ کر گزرنا ممکن نہ تھا۔ حالانکہ اسی ناک پہ پاؤں رکھ کر دونوں گاؤں کے بیسیوں آدمی جیل جا چکے تھے۔ کئی عمر قید بھگت رہے تھے۔ اور کئی نعرے لگاتے ہوئے پھانسی چڑھ گئے۔ جو قتل ہوگئے تھے اُن کے بھی اور جو پھانسی چڑھ گئے تھے اُن کے بھی، جنازے دونوں گاؤں نے مل کر پڑھے تھے اور قاتلوں اور مقتولوں کی قبریں بھی پہلو بہ پہلو کھدی تھیں۔ یہ سلسلہ ایک مدت سے جاری تھا۔ اور طویل مدت تک جاری رہنے کے امکانات بھی روشن تھے۔ باراتیں آتی تھیں۔ ڈولیاں جاتی تھیں۔ اور جنازے بھی اُٹھتے تھے۔ رشتے ناتے جو گر مشکر سے طے ہوتے تھے، ڈھولک کی تھاپ پر کنوارے گیتوں پر پروان چڑھتے۔ بینڈ باجے بجتے تھے، گولے چلتے تھے۔ پھر میکے اور سسرال کے تین چار پھیروں میں کوئی بات پیدا ہو ہی جاتی تھی۔ اور سہاگن جو ڈولی پہ جاتی تھی طلاق لے کر پا پیادہ لوٹ آتی تھی۔ اور اس کے جواب میں کوئی ایک دو بچوں کی ماں سسکیاں لیتی اُسی آنگن میں جا بیٹھتی تھی جہاں سے برسوں پہلے اُس کی ڈولی اُٹھی تھی!

نور چاچا نے رشتوں ناتوں کا سلسلہ ہی توڑ دیا تھا۔ اُس کی عمر آج پچاس برس ہو چلی تھی۔ لیکن اسے وہ واردات کل کی بات کی طرح

یاد تھی جب وہ دس گیارہ برس کا بچہ تھا، تو اُس کا باپ اُس کی آنکھوں کے سامنے قتل ہو گیا تھا۔ آج نصف صدی گزرنے والی تھی۔ لیکن باپ کی لاش ابھی تک اُس کی نظروں تلے تڑپ رہی تھی۔ جوہڑ کے قریب لڑائی ہوئی تھی۔ یہ جوہڑ پیپل تلے دونوں گاؤں کے درمیان تھا۔ دونوں گاؤں کی بھینسیں اس میں بیٹھا کرتی تھیں۔ اور دونوں گاؤں کے بچے اس میں تیرا کرتے تھے۔ نور چاچا جو اس وقت نادان تھا، نور تھا اور چاچا نہیں بنا تھا اپنے باپ کے ساتھ تھا۔ بات اتنی سی ہوئی تھی کہ ان کی بھینس پار والوں کی ایک بھینس سے لڑ پڑی نور کے باپ نے دوسری بھینس کو لاٹھی دے ماری تھی۔ اُس گاؤں کے دو آدمی قریب ہی کھیتوں میں پانی لگا رہے تھے۔ وہ کرالیں لیے نور چاچا کے باپ پہ ٹوٹ پڑے تھے۔ دو آدمی ادھر سے بھی پہنچ گئے تھے۔

نور چاچا کو آج صرف اسی قدر یاد رہ گیا تھا کہ اُس کے باپ کا سر کھل گیا تھا۔ اور وہ جیٹھ کی جھلستی دوپہر میں دہکتی دھرتی پر تڑپ رہا تھا۔

لڑائی تو بظاہر بھینسوں پر ہوئی تھی۔ لیکن اس کے پس منظر میں نصف صدی کی سیاست تھی جو اب روایت بن گئی تھی۔ اور جیسے بڑے بوڑھے ورثے کے طور پر گاؤں میں چھوڑ گئے تھے۔ چار ہی سال بعد نور چاچا کی ماں بھی مر گئی اور وہ تپتے خلاؤں میں بھٹکنے کے لیے اکیلا رہ گیا تھا۔ باپ کی زمین اچھی تھی۔ ننھیال والوں نے اُسے گود لے لیا۔ اور گاؤں والوں نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ تاکہ یتیم بچے کی کھیتیاں ویران نہ ہونے دیں۔ مگر بچے سے جو پیار چھن گیا تھا وہ اُسے کوئی نہ دے سکا۔

شفقت اور پیار کی محرومی نے نور چاچا کے ذہن میں باپ کی تڑپتی لاش کے تصور کو اور زیادہ اجاگر کر دیا تھا۔ اور انتقام کا زہر اُس کی سوچ، اُس کی فکر پہ چھاتا چلا گیا۔ وہ ابھی چھوٹا تھا۔ بڑوں کی طرح سوچ سکتا تھا نہ لڑ سکتا تھا۔ لیکن وہ جلد اور بہت ہی جلد انتقام لینے کے لیے تڑپ رہا تھا۔ وہ ہمجولیوں میں کم اور بڑوں کی اُن چنڈال چوکڑیوں میں زیادہ اُٹھتا بیٹھتا تھا، جہاں پار والے گاؤں کے خلاف نت نئی سازشیں تخلیق ہوتی رہتی تھیں۔ وہاں اُن کے مویشی چوری کرانے، کھلیان جلا دینے، کسی لڑکی کو اُٹھا لانے، پانی کی باری پر دنگا فساد کرنے کے منصوبے بنا کرتے تھے۔ یہ تخریبی باتیں نور چاچا کے نو عمر ذہن میں قندیلیں روشن کرتی جا رہی تھیں۔ اس کی نفسیاتی خلش اور جذباتی ہیجان کو ان ہی باتوں سے تسکین ملتی تھی۔ وہ جب بڑوں کی محفل سے اُٹھتا تھا تو تنہائی میں کتنی ہی دیر تصوروں میں انتقام کے منصوبے بناتا رہتا تھا۔ اُس کے ذہن میں نفرت، حقارت اور انتقامی جذبات کے سوا کچھ نہ تھا۔

لڑکپن میں وہ بڑوں کی سی پختہ باتیں کرنے لگا تھا۔ اور جب لڑکپن جوانی میں مدغم ہو گیا، تو اُس کے چہرے پر مردوں کی پختگی کا پرکشش روپ چڑھ گیا۔ اُس کا خوبرو تصور گاؤں کی گوریوں کو کنواری تنہائیوں میں گدگدانے لگا۔ لیکن نور چاچا کی تنہائیوں کو باپ کی لاش تلخ بنائے رکھتی تھی۔

بیس برس کی عمر میں ننھیال والوں نے اُس کے باپ کی تمام زمین اُس کے نام منتقل کرا دی۔ اور نور چاچا جو چہرے سے خوبرو اور جسم و جثہ کا دلنشین گبھرو تھا اُن تمام والدین کو پیارا لگنے لگا جن کی بیٹی شادی کی عمر کو پہنچ گئی تھی۔ وہ اب گاؤں کا راجہ تھا۔ اور بے شمار بے چین نگاہوں اور پرشباب آہوں کا مرکز۔ لیکن نور چاچا کی نگاہیں کنٹھے کے پار اُس گاؤں پہ جمی ہوئی تھیں جنھوں نے دس برس گزرے اُس کے باپ کو قتل کر دیا تھا۔ اور قاتل بری بھی ہو گئے تھے۔ وہ چاہتا تو پانی کی باری پہ یا جوہڑ پہ ڈھور ڈنگروں سے ہی کوئی بات پیدا کر کے لڑائی کر سکتا تھا۔ اب تو اُس کے بازوؤں میں بے پناہ قوت تھی اور دماغ صرف لڑنے مرنے کی ہی سوچتا تھا۔ لیکن اس کے دل میں بیٹھ گئی تھی کہ قتل کروں گا، بدلہ لوں گا۔ اور بدلہ لیتا ہی رہوں گا۔ اور ہر روز تماشا دیکھا کروں گا۔

"نور بیٹا!" ایک روز بڈھے چوہدری نے اُسے پیار سے کہا۔ "اب گھر بسا لو، جوانی یوں اکیلے نہیں کٹتی۔ گاؤں والے انگلیاں اُٹھاتے ہیں۔"

"چاچا جی!" نور نے پُراسرار سی مسکراہٹ سے کہا۔ "شادی اپنے گاؤں میں نہیں کروں گا۔ نہ میری برات جائے گی، نہ میں کہیں سے ڈولی لاؤں گا۔ پار والے چوہدری کرم دین کی بیٹی، زینت، جوان ہو گئی ہے، اُسے اُٹھا لاؤں گا۔ اپنے گاؤں کے بیچ بیٹھ کر نکاح پڑھاؤں گا۔ اور ایک مہینہ بعد طلاق دے دوں گا۔" نور نے متانت سے کہا۔ "پھر اسی گاؤں کی ایک اور لڑکی اُٹھا لاؤں گا اور زبردستی نکاح کر کے

تھوڑے دنوں بعد طلاق دے کر گاؤں سے نکال دوں گا۔"

چوہدری نے چونک کر نور کو دیکھا۔ لیکن وہ خراماں خراماں کھیتوں کی طرف جا رہا تھا۔ رُت جیت جیسا کہ کی تھی۔ گندم کے خوشے پک کے سنہرے ہو چلے تھے اور جیسا کہ کی پُر کیف تپش نے جوان سینوں میں ہل چل مچا رکھی تھی۔ خوشے تن کے جھوم رہے تھے۔ اور الھڑ جوانیاں گھوم رہی تھیں۔ دل بے طرح دھڑک رہے تھے۔ دلوں کی باتیں زیرِ لب تبسّم اور آنکھوں کی بے چینی میں رچی نظر آتیں۔

"نور!" اُسے یوں آواز سنائی دی جیسے اُسے گندم کے کسی خوشے نے سرگوشی کر کے بلایا ہو۔ وہ رک گیا۔ "کہاں چلے نور!" ــــــ اُس نے دیکھا۔ دو کھیتوں کے درمیان مینڈھ پر مہران بیٹھی تھی۔ ــ وہ کہیں جا رہی تھی۔ لیکن نور کو دیکھ کر بیٹھ گئی تھی۔ وہ گاؤں کی حسین لڑکی تھی۔

"کیوں مہرآں!" نور نے مسکرا کر پوچھا۔ "یہاں کیوں بیٹھ گئی؟"

"کوئی دیکھ نہ لے۔" مہرآں نے ایسے لہجے میں کہا جیسے مسکراتی ہوئی آ رہی ہو۔ بولی۔ "تم کہاں چلے؟ ...... بیٹھ جاؤ نا۔"

"کیوں؟"

"کوئی دیکھ نہ لے!"

"پگلی مہراں۔" اُس نے کہا۔ اور اُس کے سر پہ ہاتھ رکھ کر آگے بڑھنے لگا۔

مہرآں نے اس کا راستہ روک لیا تو نور بھی رُک گیا۔ لیکن مہرآں نے راستہ چھوڑ دیا۔ اور نور نے سنجیدہ سے لہجے میں کہا۔

"مہرآں میں گاؤں کی آبرو کا رکھوالا ہوں۔ اور تم گاؤں کی بیٹی ہو۔"

"میں بے آبرو تو نہیں، نور!" مہرآں نے دھیمے مگر باوقار لہجے میں کہا۔ "میں گاؤں کی آبرو ہوں۔ اور اپنی رکھوالی بھی کر سکتی ہوں، پر فرق اتنا سا ہے کہ تم مرد ہو میں عورت ہوں۔" اُس نے آہ کی سسکی سی لے کر بولی۔ "جا نور! پھر کبھی تیری راہ نہ روکوں گی۔"

نور کے جی میں جانے کیوں آئی کہ مہرآن کے پاس بیٹھ جائے۔ لیکن مہران آنچل سے آنسو پونچھتی اُٹھ بیٹھی تھی۔ نور کو دھچکا سا لگا۔ بولا۔ "بُرا مان گئی مہرآں؟ میں تو گاؤں کی ہر لڑکی کو اپنی بہن ہی سمجھتا ہوں۔"

"اونہہ!" مہران گردن کو پیارا سا خم دے کر بڑی سادگی سے بولی۔ "ہر لڑکی کو بہن سمجھتا ہے تو بیاہ کس سے کرے گا؟"

"پار والے چوہدری کرم دین کی بیٹی زینت سے۔"

"ہائیں!" مہران چونک اُٹھی۔ "اپنے باپ کے قاتلوں سے جا رشتہ جوڑے گا۔۔؟"

"نہیں۔" نور نے سنجیدہ سی مسکراہٹ سے کہا۔ "اُٹھا لاؤں گا۔" اور وہ چلا گیا۔

اُس رات نور بہت دیر بعد گھر آیا۔ سارا گاؤں گہری نیند سو گیا تھا۔ اگلی صبح پڑوسیوں نے پوچھا تو وہ مسکرا کر بات گول کر گیا۔ اور کسی کو پتہ نہ چلنے دیا کہ وہ شام کے بعد باپ کے قاتلوں کے گاؤں کے گرد گھومتا رہا ہے۔ اور چوہدری کرم دین کے گھر کا جائزہ لیتا رہا ہے۔

پھر نور اکثر غائب رہنے لگا۔ اور رات بہت دیر سے گھر آنے لگا۔ فصل کٹ کے کھلیانوں میں ڈھیر ہو گئی۔ کھلیانوں میں پکی گندم کی پہاڑیاں سی کھڑی ہو گئیں۔ اور دھوپ میں سوکھنے لگیں۔ ایک رات نور چاچا کے گاؤں والوں کو پار والے گاؤں کے کھلیانوں سے مہیب شعلے نکلتے نظر آئے۔ تاریک رات سرخ ہو رہی تھی۔ کھلیان جل رہے تھے۔ دوسری صبح نور کے گاؤں میں خوشیاں ناچ رہی تھیں۔ ہر کوئی ہر کسی سے فاتحانہ لہجے میں پوچھ رہا تھا ــــ "کس نے لگائی تھی؟" لیکن ہر کوئی سر ہلا کے چپ ہو رہتا تھا۔ گاؤں والے اُس مرد کا منہ چوم لینا

چاہتے تھے، پر وان کے دشمنوں کی فصل جلا آیا تھا۔ صرف نور تھا جو ابھی جاگا ہی نہیں تھا۔ دن کا پچھلا پہر گزر چکا تھا۔ جب نور آنکھیں ملتا باہر نکلا تو تین چار آدمیوں نے اُسے گھیر لیا۔ پوچھا۔ "نور! سنا تو نے بھی رات پار والوں کا ایک کھلیان جل گیا ہے؟"

"ایک کھلیان؟" نور کے چہرے کا تاثر یوں بدل گیا جیسے اُسے دکھ ہوا ہو۔

"کیوں؟" ایک آدمی نے طنز آلود لہجے میں کہا۔ "تمھیں رنج ہوا ہے کہ تیرے باپ کے قاتلوں کا کھلیان جل گیا ہے؟"

"بہت رنج ہوا ہے بھائیو!" نور نے کہا۔ میں نے تو ان کے دو کھلیانوں میں انگارے رکھے تھے۔ اور آگ بھڑکنے سے پہلے بھاگ آیا تھا۔"

"ارے دونوں جل گئے ہیں۔" ایک نے اُس سے بغلگیر ہوتے ہوئے کہا۔ "تو نے انتقام لے لیا نور!" اور نور کے چہرے پر رونق آگئی۔ بولا:۔ "ابھی نہیں، انتقام تو میں تمام عمر لیتا رہوں گا۔ یہ تو بسم اللہ کی ہے۔"

عین اُس وقت پار والے گاؤں کے بیس پچیس آدمی لاٹھیاں اور کلہاڑیاں لیے کنٹے پہ آ کھڑے ہوئے۔ اور للکار للکار کر نور کے گاؤں والوں کو گالیاں دیں۔ وہ جانتے تھے کہ اُن کے سوا ان کے کھلیانوں کو اور کوئی آگ لگانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اس گاؤں کے چھوٹے بڑے چھریاں اور کلہاڑیاں لے کے نکل آئے۔ لیکن نور نے راہ روک لی اور بولا۔ "سر کھل جائیں گے مَردو! بچوں کو یتیم نہ کرو بچوں کی ماؤں کو بیوہ نہ کرو۔ اِن گالیوں کا جواب اب نور دے گا۔ اب ڈانگ سوٹا نہیں چلے گا۔ تم اپنے کھلیانوں پہ پہرے بٹھا دو۔ باقی میں سنبھال لوں گا۔"

لیکن نور کے گاؤں کے مرد اُس کی ایک بھی سننے پہ آمادہ نہ تھے۔ اُدھر سے گالیاں پتھروں کی طرح گر رہی تھیں۔ اِدھر نور اپنے گاؤں والوں کی راہ روکے کھڑا تھا۔ بول بول کر اُس کے منہ سے جھاگ نکل رہی تھی۔ آخر یہ جھاگ ضایع نہ گئی۔ اور اُس نے خون خرابہ ہوتے ہوتے بچا لیا۔

دو ہی روز بعد نور نے گالیوں کا انتقام لے لیا وہ اس طرح کہ ایک رات وہ پھر گھر بہت دیر سے آیا۔ اور دوسری صبح پتہ چلا کہ پار والے چوہدری کرم دین کے دو بیل اور چوہدری رب نواز کی ایک بھینس مر گئی ہے۔ پھر خبر ملی کہ کسی نے چارے میں زہر ملا دیا تھا۔۔۔ یہ مویشی گرمیوں کی وجہ سے باہر کی کھُرلی پہ بندھے تھے۔ اور نور گاؤں کے چوکیدار اور باہر سوئے ہوئے آدمیوں سے بچتا کھُرلی میں زہر کی پُڑیا بکھیر آیا تھا۔ نور بے حد مسرور تھا۔ اور اُس کے چہرے پر انوکھی سی رونق آگئی تھی۔

دوسرے روز پار والے گاؤں کے تین آدمی نور کے گاؤں کے دو آدمیوں سے اُلجھ پڑے۔ جوہڑ کا کنارا میدانِ جنگ بن گیا۔ اتفاق کی بات کہ کوئی قتل نہ ہُوا۔ نور چن چراغ شاہ کے پاس گیا اور عرض کی کہ دونوں گاؤں کا راضی نامہ کرا دیں۔ دونوں گاؤں شاہ جی کی مریدی میں تھے۔ اُن کا کہنا حکم کی حیثیت رکھتا تھا۔ انھوں نے دونوں گاؤں کے پنچوں کو بلا کر دونوں گاؤں کی تاریخ میں ایک اور راضی نامے کا اضافہ کر دیا۔ اور بات تھانے تک نہ پہنچنے پائی۔۔۔ نور کا مقصد ہی یہی تھا۔

کھلیانوں سے دانے گھروں میں آ گئے تھے۔ اور جن کے کھلیان جل گئے تھے وہ سینے کی آگ کو ٹھنڈی آہوں سے بجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ جہاں ایک مہینہ پہلے کھڑی فصلوں کی لہریں تھیں وہاں اب دُور دُور تک پھیلا ہوا میدان تھا۔

راضی نامے کو دس روز گزر گئے تھے۔ جمعرات کا دن تھا۔ دونوں گاؤں کے بوڑھے، بچے، مرد، عورتیں کھیتوں کے میدان میں آ کر جمع ہو گئی تھیں۔ ارد گرد کے دیہات کے لوگوں نے بھی اسی میدان میں آ کر ہجوم کیا۔ اور میلے کا سا سماں بندھ گیا۔ دونوں گاؤں کے میراثی ڈھول پیٹ رہے تھے۔ اور دس بارہ بیل گاڑیاں میدان میں گھوم رہی تھیں۔ گاڑیوں سے جتے بیلوں کو صابن سے نہلایا گیا تھا۔ گردنوں میں گھنگھرو

اور چونیوں کے ہار اور ٹانگوں سے بندھے گھنگرو سُر تال میں چھنک رہے تھے۔ بعض نے بیلوں کے سینگوں سے ریشمی رومال باندھ رکھے تھے۔ اور اُن کی پیٹھوں پر رنگ برنگے دوپٹے پھیلا کر باندھ دیے تھے۔

نور کا گڈا بھی دوڑ میں شامل تھا۔ اُس نے اپنے کالے بیل کو دولھا کی طرح سجا رکھا تھا۔ اور گڈے اور بیلوں کے سینگوں کو کڑوا تیل مل کر چمکایا ہوا تھا۔ نور نے چارخانہ کا لاچہ "دو گھوڑے" کی بوسکی کا لمبا کرتہ اور سر پر فیروزی رنگ کا صافہ باندھ رکھا تھا۔ اُس کا کلف سے اکڑا ہوا شملہ سب سے زیادہ اونچا تھا۔ وہ فاتحانہ انداز سے گڈے کو میدان میں چکر دے رہا تھا۔ اور پار والے گاؤں کے بچے بچے کو ماتھے پہ ہاتھ رکھ کر، ہنس ہنس کر، سلام کر رہا تھا۔

پار والے گاؤں کا ایک گڈا اُس کے قریب آکر رُکا۔ نور نے گھوم کر دیکھا۔ وہ پار والے مہدی حسین کا گڈا تھا۔ مہدی حسین نور کا ہم عمر تھا۔ اور اسی کی طرح گبھرو اور خوبرو۔ نور کے باپ کو مہدی حسین کے باپ نے ہی قتل کیا تھا۔ لیکن وہ عدم ثبوت کی بنا پر بری ہو گیا تھا۔ اور اب بڑھاپے نے اُس کی کمر دوہری کر دی تھی۔ مہدی حسین کو اُس نے دشمنوں کے سامنے کبھی نہ جھکنے کے سبق دیے تھے۔ اور اُسے لٹھ بازی میں طاق کر دیا تھا۔ گاؤں والے کہا کرتے تھے کہ مہدی حسین کی لاٹھی ستر گز تک مارتی ہے۔

اُس نے اپنا بیل اور گڈا نور کی طرح سجا رکھا تھا۔ نور کے قریب گڈا روک کر اُس نے نور کو مسرت اور اپنائیت سے سلام کیا۔ نور اپنے گڈے سے اُس کے گڈے میں کود گیا۔ اور اس قدر زور سے بغل گیر ہوا کہ مہدی حسین کا چہرہ لال ہو گیا اور اس کی ہنسی نکل گئی۔ میدان میں بکھرے ہوئے ہجوم میں سرگوشیاں سنائی دینے لگیں، جو سمٹ سمٹا کر ایک قہر آلود طعنے میں سمٹ آئیں ۔۔۔ "بے غیرت، باپ کے قاتل کے بیٹے کو سینے سے لگا رہا ہے"۔ نور کے گاؤں والے اُسے نفرت بھری نظروں سے دیکھنے لگے۔

پنچ میدان میں آگئے۔ ڈھول یکبارگی بج اُٹھے، بکھرے ہوئے ہجوم میں کھلبلی مچ گئی۔ اور میدان خالی ہو گیا۔ گڈے ایک طرف چل پڑے اور دُور ایک صف میں جا کھڑے ہوئے۔ تماشائی میدان کے دونوں طرف دیواروں کی طرح کھڑے ہو گئے۔ دونوں گاؤں سے چھ چھ گڈے دوڑ کے لیے آئے تھے۔ چوہدری کرم دین میدان کے وسط میں ہاتھ میں چادر لیے کھڑا تھا۔ گڈوں کے بیل صف میں کھڑے بے تابی سے کھُر مار رہے تھے۔ سواروں کے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ اور وہ ایک دوسرے کو کنکھیوں سے دیکھنے لگے۔

نور نے اپنا گڈا درمیان میں رکھا۔ دو گڈے بائیں مہدی حسین کا گڈا تھا۔ نور بار بار مہدی حسین کو دیکھ کر مسکراتا تھا۔ اور مہدی کی پر شباب مسکراہٹ اور زیادہ کھِل گئی تھی۔ نور کے گاؤں والے نور کو قہر آلود نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ اور ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے ۔۔ "کم عقل کو اتنا بھی پتہ نہیں کہ راضی نامے تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ لیکن راضی نامے کا یہ مطلب تو نہیں کہ دشمنوں کو یوں ہنس ہنس کر سلام کرتے پھریں"۔

میدان کے وسط میں کھڑے چوہدری کرم دین نے چادر اونچی کر لی۔ ڈھول یکبارگی خاموش ہو گئے۔ تماشائیوں کے ہجوم پر سناٹا چھا گیا۔ سواروں نے بیلوں کی رسیاں تان لیں اور چابک لہرانے لگے۔ چوہدری کرم دین نے چادر لہرا کر جھٹکے سے نیچے کی اور بھاگ کر میدان سے نکل گیا۔ کائنات پہ چھایا ہوا سکوت "ہلا بیلے ...... اللہ بیلی تھے ...... اللہ ای اللہ" اور بیلوں کے گھنگھروؤں، گھنٹیوں اور قدموں کی بے ہنگم آوازوں اور مہیب جھنکار، ہجوم کی "ہلا شیری" اور نعروں، ڈھولوں کے شور سے قیامت کا ہنگامہ برپا ہو گیا۔

سامنے پون کوس کھلا میدان تھا۔ راہ میں اونچی نیچی مینڈھیں اور کہیں کہیں درخت بھی تھے۔ کنٹھے کا موڑ بھی تھا۔ اور گڈوں کو پون کوس کی یہ ناہموار مسافت چشم زدن میں طے کر کے سبز جھنڈے تک پہنچنا تھا، جو ویران سے ریلوے اسٹیشن سے ڈیڑھ دو سو گز اس طرف نصب کیا گیا تھا۔ ہجوم گڈوں کے ساتھ ساتھ بھاگ پڑا۔ اور گڈے سو ڈیڑھ سو گز تک جس طرح ایک صف میں بھاگے تھے، ابھی تک ایک ہی صف میں

بھاگ رہے تھے۔ تازہ دم بیل جیسے سمجھ گئے تھے کہ یہ اُن کے گاؤں کی عزت اور ناک کی دوڑ ہے۔ اگر پیچھے رہ گئے تو نہ کوئی انھیں صابن سے نہلائے گا، نہ سینگوں پر تیل چپڑے گا، نہ لیوں چھیتی کے رنگ رنگیلے دوپٹوں سے سجائے گا۔ بیل عزت و ناموس کے نام پر ہوا سے باتیں کر رہے تھے۔ گڈے ناہموار کھیتوں میں فٹ فٹ بھر اُچھلتے تھے اور ان کے پہیے اچھل اچھل کر گھوم رہے تھے۔

آگے جاکر گڈوں کی ترتیب بکھرنے لگی۔ نور نے اپنے بیل کی رسّی کو بائیں طرف جنبش دی تو اُس کا گڈا مہدی حسین کے قریب چلا گیا۔ مہدی کے پیچھے اُسی کے گاؤں کا گڈا تھا، جس کا سوار مہدی اور نور کی طرح گٹھا ہوا جوان تھا۔ یہ دونوں پار والے گاؤں کی آبرو اور لاج کے رکھوالے تھے۔ ذرا آگے جاکر مہدی اور نور کے گڈے پہلو بہ پہلو ہو گئے۔ دونوں سینہ پھاڑ کر نعرے لگا رہے تھے۔ دونوں گڈے باقیوں سے آگے نکل گئے تھے۔ مہدی حسین سے پیچھے والے سوار کو آگے بڑھنے کی راہ نہیں مل رہی تھی۔ اُس نے اپنے بیل کی رسّی کھینچ کر گڈا نور کے پہلو میں کرنا چاہا۔ لیکن نور نے دیکھ لیا۔ اور اُس نے گڈا دائیں کرکے اُس کا راستہ روک لیا۔ پھر اُس نے گڈا نور اور مہدی حسین کے درمیان سے نکالنا چاہا تو نور نے اپنے بیل کو مہدی کے قریب کر لیا۔ مگر تیسرا گڈا مہدی کے پیچھے ہی رہا۔

گرد کے بادل اور نعرے آسمان تک جا پہنچے تھے۔ ہجوم بھاگ بھاگ کر پسینہ پسینہ ہونے لگا۔ سب کی نظریں اب نور اور مہدی حسین پر تھیں۔ باقی گڈے بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ اگلی مینڈھ زیادہ اونچی تھی۔ تینوں گڈے بڑے زور سے اُچھلے۔ نور مشکل سے سنبھلا۔ مہدی حسین گڈے میں گر پڑا۔ لیکن اُٹھ بیٹھا۔ اُس کا بیل جانفشانی سے اُس کا ساتھ دے رہا تھا۔ مہدی کے گاؤں کا دوسرا گڈا جو اُس کے پیچھے چلا آ رہا تھا مہدی کے بائیں پہلو میں ہونے لگا۔ مگر نور نے اپنا گڈا مہدی کے پہلو میں دبا کر اُسے بائیں ہو جانے پر مجبور کر دیا۔ اور تیسرا گڈا مہدی حسین کے پیچھے ہی رہا ۔۔۔ یہ نور کا کمال تھا۔

میدان آدھا طے ہو گیا تھا۔ اور تماشائیوں کا ہجوم تھک کر تتر بتر ہو گیا تھا۔ صرف وہی ساتھ دے رہے تھے جو گھوڑوں پر سوار تھے۔ نور نے اچانک اپنا گڈا دائیں کو کر لیا۔ اور مہدی حسین کے گڈے سے آٹھ دس قدم پرے چلا گیا۔ نور کا پرے ہٹنا تھا کہ مہدی حسین کے گڈے کا ایک پہیہ کسی گڑھے میں دھنس گیا۔ پھر گڈا کئی فٹ ہوا میں اُچھلا۔ مہدی گیند کی طرح اُچھل کر بیل کے آگے جا پڑا اور اُس کا گڈا اور بیل لڑھکی کھا کر مہدی کے اوپر جا پڑے۔ پیچھے اُسی کے گاؤں کا دوسرا گڈا اُسی کے ساتھ لگا چلا آ رہا تھا۔ ایک دو گز کا ہی فاصلہ تھا۔ گڈا روکنے کا وقت ہی نہ تھا۔ یہ گڈا بھی اُچھلا اور مہدی کے اوندھے پڑے گڈے سے دھماکے سے ٹکرایا۔ اور اس کا سوار اس تصادم میں پس گیا۔

گرد ایک گھٹا کی طرح اُٹھی۔ اور اُس سے صرف نور کا گڈا بدستور بھاگتا باہر نکلا۔ دوسرے دونوں گڈوں کو گرد نے چھپا لیا تھا۔ تھکا ہارا ہجوم تیزی سے بھاگا۔ پچھلے گڈوں نے رُخ موڑ لیے، اور رک گئے۔ ان کے سوار کود کر بھاگے، گھوڑے سواروں نے باگیں موڑ لیں اور یہ سارا انبوہ گرد پہ ٹوٹ پڑا۔ دیکھا مہدی حسین اور اُس کے گاؤں کا دوسرا سوار مر چکے تھے۔

ایک بیل کی گردن اور دوسرے کی کمر کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ وہ آخری سانسیں لے رہے تھے۔ مہدی حسین اور اُس کے ساتھی کی لاشیں خون میں لت پت تھیں۔ نور گڈے سے اُتر کر بھاگ کر آیا۔ اور اُس نے اپنا شملے دار صافہ سر سے اتار کر چہرے پہ رکھ لیا۔ جیسے سسکیاں لے لے کے رو رہا ہو۔

سب نے دیکھا کہ وہاں ایک گہرا گڑھا تھا۔ جس میں مہدی حسین کے گڈے کا پہیہ آ گیا تھا۔ مہدی کے گاؤں کے لوگوں نے نور کو قہر آلود نگاہوں سے دیکھا اور ایک نے لرزتے ہونٹوں کو دانتوں تلے دبا کر کہا ۔۔۔ "نور، تو مہدی کے ساتھ ساتھ بھاگتے ہوئے گڈا پرے کیوں لے گیا تھا؟" ۔۔۔ ایک اور آواز آئی ۔۔۔ "نورے، یہ خون تمھیں ہضم نہیں ہوگا۔ تجھے معلوم تھا کہ یہاں گڑھا ہے۔"

"جو اللہ کو منظور تھا، بھائیو۔" نور نے اداس اور ملتجی لہجے میں کہا۔ "میرا بیل بے قابو ہو کر پرے چلا گیا تھا۔ اپنی اپنی

مقدر ہے بھائیو! کہو تو میں بھی اپنے گڑھے تلے آکر مرجاؤں"

اس میدان میں جہاں نعرے گونج رہے تھے۔ اور ڈھول بج رہے تھے۔ مردوں کی ہچکیاں اور عورتوں کے بین گونجنے لگے۔ بیلوں کی گھنٹیوں گھنگھروؤں کی اداس اداس جھنکار نوحہ کرنے لگی۔ شام کو دونوں گاؤں نے مل کر مہدی حسین اور اس کے ساتھ مرنے والے کا جنازہ پڑھا۔ قبرستان میں ایک اور آواز سنائی دی — "نورے مرد اس طرح بدلہ نہیں لیا کرتے۔ تجھے معلوم تھا وہاں گڑھا ہے۔ ورنہ تم گڈا پرے کرتے، اور مہدی کو بھی خبردار کردیتے"

"نورے ٹھیک اور دشمن سی آواز آئی۔" تو نے باپ کے خون کا بدلہ لے لیا ہے۔ اب ہماری باری ہے"

نورے نے پیر چراغ شاہ کے مرحوم باپ کے روضے کی قسم کھا کر کہہ دیا۔ "مجھے معلوم نہ تھا وہاں گڑھا ہے۔ میں نے انتقام نہیں لیا۔ جس انتقام لوں گا للکار کر لوں گا"

لیکن نورے نے جھوٹی قسم کھائی تھی۔ اُس نے انتقام لے لیا تھا۔ وہ جس روز پار والے گاؤں میں گڈوں کی دوڑ کا دن مقرر کرکے آیا تھا، اس رات جب سارا گاؤں سو گیا تھا، کدال لیے میدان میں چلا گیا تھا۔ اور اس نے اطمینان سے یہ گڑھا کھودا تھا۔ اس میں سوکھی جھاڑیاں رکھ کر کاریگری سے اوپر مٹی بچھائی تھی۔ اور مٹی ادھر ادھر بکھیر کر گندم کے خشک پودے اور جھاڑیاں رکھ دی تھیں۔ دوڑ میں ابھی تین روز باقی تھے۔ ان تین دنوں سورج نے تازہ مٹی کو خشک کرکے کھیتوں کے رنگ سے ملا دیا۔ دوڑ کے دوران نورے نے بڑی ہوشیاری سے اپنا گڈا مہدی حسین کے قریب رکھا تھا۔ اور مہدی سے پیچھے والے کو اسی کے پیچھے ہی رہنے دیا تھا۔ اس گڑھے پر نشانی رکھی ہوئی تھی۔ جو قریب آئی تو نورے نے اپنا گڈا ایک طرف کر لیا تھا۔ اُس نے اپنے باپ کے خون کا انتقام قاتل کے بیٹے سے لے لیا تھا۔

استادی سے دو آدمی قتل کر دینے کے باوجود نورے کی نظروں تلے اس کے باپ کی لاش تڑپتی رہی۔ اس کے سینے میں جو آگ بھڑک رہی وہ ٹھنڈی نہ ہوئی۔ بچپن کی جو خون آلود یادیں ذہن میں جم گئی تھیں۔ وہ دو خون کرکے بھی نہ دھل سکیں۔ اس سے پہلے وہ دشمنوں کے دو بیل اور بھینس زہر دے کر مار چکا تھا۔ ان کے کھلیان جلا چکا تھا۔ پھر بھی وہ بے چین تھا۔ وہ شفقت اور پیار کی محرومی میں پل کر جوان ہوا تھا۔ اور اس ذہن میں پیار کی جگہ باپ کی خون آلود لاش کا بسیرا تھا۔

وقت گزرتا چلا گیا۔ دونوں گاؤں کی دشمنی اور گہری ہو گئی۔ رشتے ناتے ٹوٹ گئے۔ اب نہ ادھر سے بارات جاتی تھی اور نہ اُدھر سے آتی تھی۔ گاؤں کی شادیاں گاؤں ہی میں ہو جاتی تھیں۔ دونوں گاؤں میں اب دو دو چار واردات ہو جاتی تھی۔

نور شام کے بعد گاؤں سے غائب رہنے لگا۔ کسی کو معلوم نہ تھا۔ وہ کہاں جاتا ہے لیکن سب کو اطمینان تھا کہ وہ پار والے گاؤں کے چوہدری کرم دین کی بیٹی، زینت کو اٹھا لانے کی فکر میں ہے۔

اس دوران مہراں نے کئی بار اس کی راہ روکی۔ اور ایک بار نور کو کہہ ہی دیا۔ "نور! بیاہ کروں گی تو تیرے ساتھ کروں گی۔ کسی اور کے نام سے رجسٹر پہ انگوٹھا نہیں لگاؤں گی۔ اور جس روز تیری بارات جائے گی۔ سمجھ لے اس روز میرا جنازہ اٹھے گا۔" اور یہ کہتے ہوئے مہراں کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ اس نے جذبات سے بے قابو ہو کر نور کا گریبان پکڑ لیا۔ اور مٹھیاں بھینچ کر بولی۔ "سچ بتا نورے! تیرے سینے میں دل ہے یا پتھر؟"

"جو کچھ تھا دے آیا ہوں!" نور نے متانت سے کہا۔

"کس چڑیل کو؟" مہراں نے اس کا گریبان چھوڑ کر یوں پوچھا۔ جیسے صدمے سے ہانپ رہی ہو۔

"مہراں! وہ چڑیل ہی ہے؟" نور نے دکھی ہوئی سی آہ لے کر کہا۔ "دیکھتا ہوں وہ مجھے کھاتی ہے یا میں اُسے کھاتا ہوں!" مہراں کا سر جھک

یار نور نے اس کی ٹھوڑی تھام کر کہا۔ "چند روز اور انتظار کر۔ نظر تو یہی آتا ہے کہ میرا گھر تو ہی بسائے گی۔" اور نور مہراں کے دل میں ایک ہمہمہ ڈال کھیتے کی طرف چل دیا۔

ایک سال گزر گیا۔ پار والے گاؤں سے اب راتوں کو ڈھولک کی تھاپ پر لڑکیوں کے گیت سنائی دینے لگے۔ اور فورسے پر خاموشی چھائی مل گئی۔ پھر ایک روز اس گاؤں سے گولے کے دھماکے اور ڈھولوں کے ساتھ باجے بھی بجتے سنائی دیئے۔ نور جو شام کو غائب ہو جایا کرتا تھا اس شام کھانا کھائے بغیر لیٹ گیا اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ پار والے چوہدری کرم دین کی بیٹی زینت کی شادی اس گاؤں کے ایک آدمی ہو گئی تھی۔ اسی زینت کو نور اٹھا لانا چاہتا تھا۔ اور اس سے شادی کر کے چند روز بعد طلاق دے دینا چاہتا تھا

ایک وہ وقت تھا کہ مہراں نور کی راہ روکا کرتی تھی۔ اور اب یہ وقت آیا کہ نور نے مہراں کو راہ میں روک لیا۔ اور اداس سی مسکراہٹ سے کہا۔ "مہراں! چڑیل نہ مجھے کھا سکی نہ میں اُسے کھا سکا۔۔۔۔۔ کہو تو تیرے ماں باپ سے بات کروں؟"

اور اسی چاند کی سترہویں رات مہراں کی ڈولی نور کے آنگن میں آن اتری۔ وہ رات بڑی حسین تھی۔ سارا گھر ان کا اپنا تھا۔ مہراں کی نہ ساس تھی نہ سسر، نہ جھانی نہ نند۔ بس اللہ کا نام تھا۔ اور مہراں نور کی پوجا کر رہی تھی۔

یہ پچیس برس گزر گئے نور اور مہراں اکیلے ہی رہے۔ نہ بچی نہ بچہ۔

یہ پچیس برس ۔۔۔ نور کی جوانی اب گئے وقت کا قصہ کہانی بن گئی تھی۔ نور آج وہ گبھرو نور نہیں ۔۔۔ نور چاچا بن گیا تھا۔ سر اور مونچھوں کے بال کھچڑی ہو گئے تھے۔ چہرے پر جوانی کی جو رونق تھی۔ اس پر باریک باریک لکیروں کا جال بچھ گیا تھا۔ اور یہ لکیریں گہری ہوتی جا رہی تھیں۔ مہراں نے جوانی نور چاچا کی خدمت میں گزاری یا خانقاہوں اور مزاروں پر اولاد کے لیے نذر نیاز دیتے گذر گئی۔ پر مہراں کی گود ہری نہ ہوئی لیکن نور چاچا کو چنداں افسوس بھی نہ تھا۔ گاؤں کا ہر بچہ اس کا اپنا ہی بچہ تھا۔ اور بوڑھا ہو کر گاؤں کے بچوں میں گھل مل گیا تھا۔ اور انہیں اپنی جوانی کے قصے سنایا کرتا تھا۔ وہ بچوں میں وہی زہر گھول رہا تھا۔ جو برسے اس کے سینے میں بھر گئے تھے۔ لیکن نور چاچا ان بزرگوں سے مختلف تھا۔ وہ نوجوانوں کو دشمن کے آمنے سامنے آ کر لڑتے سے ۔ [illegible] کہا کرتا تھا۔ اور کہا کرتا تھا کہ دشمن کو اُستادی سے مارو ورنہ آپ بھی مرو جاؤ گے۔ اور لاٹھی کبھی نہ ٹوٹے گی۔

[illegible] کے [illegible] قتل کے بعد اُس نے زندگی کے پچیس برس پار والوں پر [illegible] دو زمانوں میں گزار دیئے تھے۔ اس نے مہراں تک [illegible] قریب کے ایک [illegible] آدمی جو موڑ کے قریب سیدھے پاسرار طریقے سے قتل ہو گیا تھا کہ مہینہ [illegible] تو مجبوراً شہادت [illegible] کے پار والے گاؤں کے ایک بے گناہ آدمی کو پکڑوا کر عمر قید دلوا دی تھی۔ [illegible] اور دانشمند [illegible]

[illegible] گاؤں میں داخل ہوا۔ ہر سو اندھیرا سکوت تھا۔ اسے ایک آدمی کا سایہ نظر آیا۔ جو دبے پاؤں [illegible] دیکھنے کے لیے رک گیا پھر دبے پاؤں اس کے تعاقب میں چل پڑا گرمیوں کا موسم تھا۔ [illegible] وہ آدمی ایک [illegible] کی طرف بڑھا۔ تو نور چاچا کو اپنی جوانی کی ایک بات یاد آ گئی۔ [illegible] ایک کھرلی میں زہر کی پڑیا بکھیر آیا تھا۔

[illegible] سے کر بازو کا شکنجہ دبا دیا۔ اُس آدمی کے ہاتھ سے کوئی چیز زمین [illegible] سے گھٹنے مارے۔ ذرا دیر بعد [illegible] وہ مر چکا تھا۔ نور چاچا نے دیکھا کہ اس کے

ہاتھ سے جو چیز گری تھی۔ وہ ایک پڑیا تھی۔ ویسی ہی پڑیا جیسی وہ برسوں گزرے، پار والے گاؤں کی ایک کھُرلی میں ڈال آیا تھا۔

وہ آدمی پار والے گاؤں سے آیا تھا۔ نورچاچا نے اُس کی لاش کو کندھے پہ ڈالا اور گاؤں سے باہر نکل گیا۔ رات کی گاڑی گزرنے میں ابھی کچھ دیر باقی تھی۔ ریلوے لائن کوس بھر دور تھی۔ نورچاچا لاش اٹھائے تیزی سے چلا جا رہا تھا۔ دوسری صبح ریلوے لائن پر لوگوں کا ہجوم جمع تھا اور ہر سو یہ خبر پھیل گئی۔ کہ پار والے گاؤں کا ایک آدمی گاڑی تلے آکر کٹ گیا ہے۔

اب عمر کے پچاسویں برس، نورچاچا یہ قصے گاؤں کے بچوں کو سنایا کرتا تھا۔ اس کی فتح کا قابلِ داد پہلو تو یہ تھا کہ اُس نے ڈھور ڈنگر بھی مارے تھے۔ کھلیان بھی جلائے تھے۔ قتل بھی کیے تھے۔ اور پار والوں کو رہ رہ کر ایسے ڈنک مارے تھے۔ کہ وہ رو پیٹ کے چپ ہو رہے تھے لیکن پولیس میں رپورٹ درج کرانے کا کوئی ثبوت پیش کر سکتے نہ پنچوں میں بیٹھ کے کوئی جواز پیش کر سکتے تھے۔

چن چراغ شاہ کے باپ کے مزار اور دونوں گاؤں کے مشترک قبرستان کے درمیان پیڑوں کا گھنا جھرمٹ تھا۔ جھرمٹ تلے جھاڑیاں اور گھاس تھی۔ قبرستان سے مزار کی طرف جاؤ تو جھرمٹ کا چکر کاٹ کے جانا پڑتا تھا۔ اندر سے گزرنا آسان نہ تھا۔ ایک روز نورچاچا وہاں سے گزر رہا تھا۔ تو وہ ٹھٹھک کے ایک پیڑ کے تنے کی اُوٹ میں چھپ گیا۔ اُسے جو منظر دکھائی دیا۔ اُس سے اس کا پسینہ نکل آیا۔ اُسے یوں لگا جیسے پار والے اس کی لاش پہ ڈھول بجا رہے ہیں۔ اور اس کی ناک کتے چاٹ رہے ہیں۔

اُس نے دیکھا کہ پیڑوں کے جھرمٹ تلے، جھاڑیوں کی اوٹ میں اُس کے گاؤں کی ایک کنواری لڑکی رضیہ پار والے گاؤں کے ایک جوان سال آدمی کے ساتھ نظر آئی۔ رضیہ کا باپ فوج میں جمعدار تھا۔ وہ اپنے باپ کے ساتھ چند مہینے کراچی بھی رہ آئی تھی۔ اور وہ آدمی بھی کہیں افسر لگا ہوا تھا۔ اور ان دنوں چھٹی آیا ہوا تھا۔ نورچاچا کو چکر سا آیا۔ اور اس نے معاً سوچا کہ پہلے جا کر رضیہ کے باپ کو قتل کر دے۔ جس نے لڑکی کو شہر کی ہوا لگا کر اس قدر بے حیا بنا دیا تھا۔

نورچاچا کے ہاتھ میں بڑی خوبصورت چمکدار کلہاڑی تھی۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ گاؤں کی جس آبرو کا رکھوالا تھا۔ وہ دشمنوں کے پاس اس طرح چلی گئی تھی۔ وہ آگے بڑھا اور وہ دونوں اس کی موجودگی سے بے خبر رہے۔ نورچاچا اس آدمی کو خوب جانتا تھا۔ اس کا نام انور تھا۔ پچیس چھبیس برس کا وہ خوبصورت نوجوان چوہدری کرم دین کی اسی لڑکی کا بیٹا تھا۔ جسے نورچاچا جوانی میں اغوا کرنا چاہتا تھا۔ لیکن نور جو آسمان سے تارے بھی توڑ لاتا تھا۔ اسے اغوا نہ کر سکا تھا۔ آج وہ بھی پچاس برس کی بڑھیا ہو چکی تھی۔ اور اس کا بیٹا انور جوان!

نورچاچا — انور اور رضیہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کہ اچانک رک گیا۔ اس کا سر آپ ہی آپ جھک گیا۔ اور طویل آہ بھر کر دبے پاؤں پیچھے کی طرف چل پڑا۔ وہ اسی طرح سر جھکائے گاؤں میں داخل ہوا۔ گھر گیا اور لیٹ گیا۔ وہ چھت کو گھور رہا تھا۔ اس پر ایسی تاریکی کبھی طاری نہیں ہوئی تھی اس کا سر کبھی یوں نہیں جھکا تھا۔ مہراں نے بہت پوچھا۔ لیکن اُس نے اداس سی مسکراہٹ سے اسے ٹال دیا۔ صرف ایک بار کہا " مہراں! بڈھا ہو گیا ہوں۔ اب تھک جاتا ہوں۔"

وہ بے چینی سے کروٹیں بدلنے لگا۔ اُسے خیال آیا کہ اُس نے دونوں کو قتل کیوں نہ کر دیا۔ لیکن یہ خیال بھی آگیا کہ اچھا ہوا وہ وہاں سے کھسک آیا۔ اور انہیں قتل نہ کر بیٹھا۔ وہ مطمئن بھی تھا، بے قرار بھی، اور اطمینان اور بیقراری کا تصادم اسے بے حال کر رہا تھا۔

اُسی رات کے دوسرے پہر نورچاچا کے دروازے پہ دستک ہوئی۔ اُس نے باہر آکر دروازہ کھولا۔ باہر پھٹے پرانے کمبل میں لپٹا ہوا ایک آدمی کھڑا تھا۔ وہ بغیر سلام کیے اندر آگیا۔ اور بولا "پردیسی ہوں، بڑی دور سے آیا ہوں۔ صبح چلا جاؤں گا۔"

نورچاچا اُسے اندر لے آیا۔ جب اُس نے لالٹین جلائی تو اس آدمی نے کمبل اتار پھینکا اور بولا — " نورچاچا! چاہو تو مجھے بھی قتل کر دو — خالی ہاتھ تمہارے گاؤں آیا ہوں۔"

وہ پار والے گاؤں کا انور تھا۔ نور چاچا نے لپک کر دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ مہراں بھی جاگ اٹھی تھی۔ اور حیرت زدہ نظروں سے دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

"ایک بات کرنے آیا ہوں چاچا۔"

نور چاچا نے اُسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اور گہری سانس لے کر آہستہ سے بولا۔ "بیٹھ جاؤ۔"

"میں جانتا ہوں ہمارے گاؤں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں۔" انور نے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اور میں جانتا ہوں کہ تمہارے گاؤں میں یوں چوروں کی طرح آکر زندہ نکل جانا ممکن نہیں۔ لیکن مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ گاؤں میں تم واحد آدمی ہو جو صحیح معنوں میں مرد ہو۔ تمہارا دل گردہ دور دور تک مشہور ہے۔ اور نور چاچا جو مرد ہو گھر آئے مہمان کو بے آبرو نہیں کرتا۔"

نور چاچا عجیب طرح ہنس دیا۔ "خالی خالی لہجے میں بولا۔" ہیں تم لوگ اس قدر وحشی سمجھتے ہو۔"

"مہدی حسین اور افضل کو تم نے قتل کیا تھا چاچا۔" انور نے مسکرا کر کہا۔ "شباب خاں کا گلا گھونٹ کر ریلوے لائن پر تم نے پھینکا تھا..."

"تم تو اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے، انور!" نور چاچا نے اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا، "تمہیں کہانیاں سنانے والے شاید یہ نہیں بتایا کہ مجھے مہدی کے باپ نے اس وقت یتیم کیا تھا۔ جس وقت میں ذرا سا بچہ تھا.... خیر یہ قصے بڑے لمبے ہیں بیٹا!" اس نے گھر آئے دشمن کو سر سے پاؤں تک گھورتے ہوئے پوچھا۔ "کہو تم میرے گھر کیوں آئے ہو؟"

"میں تمہیں طعنے دینے نہیں آیا چاچا!" انور نے کہا۔ "تم وحشی ہو تو ہمارے گاؤں والے بھی درندے ہیں۔ خونخوار، وہ تم سے اچھے تو نہیں میں اپنے گاؤں کو ہمیشہ کے لئے چھوڑے جا رہا ہوں۔ صرف اتنا کہنے آیا ہوں کہ ہمارے گاؤں کے رشتے ناتے کلہاڑیوں برچھیوں اور لاٹھیوں سے کٹ گئے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ ایک وہ زمانہ تھا۔ جب دونوں گاؤں سے براتیں اور ڈولیاں آتی جاتی تھیں۔"

"خون خرابے اس وقت بھی ہوتے تھے۔" مہراں بول اٹھی۔ "سہاگنوں کے سہاگ اجڑ جاتے تھے۔ اور...."

نور چاچا نے ہاتھ کے اشارے سے مہراں کو چپ کرا دیا۔ اور بولا۔ "تم بات کیے جاؤ بیٹا۔ لیکن ایک بات بتا دوں۔ میں راضی نامہ کی بات نہیں سنوں گا۔ راضی نامے بہت ہو چکے۔ اب نہیں ہوں گے۔ تم پڑھ لکھ کر عزت غیرت شہروں میں ڈبو آئے ہو۔ لیکن ہم لوگ اب یہاں ناک کی قدر خوب جانتے ہیں۔"

"نہیں نہیں چاچا!" انور نے کہا۔ "میں تم پر یہ الزام دھرنے آیا ہوں نہ اپنے بزرگوں کی وکالت کروں گا۔ میں کہہ رہا تھا کہ.... وہ کہتے کہتے رک گیا۔ اور مہراں کی طرف دیکھ کر ملتجی لہجے میں بولا۔ "چاچی جی! اگر تم دوسرے کمرے میں چلی جاؤ تو..." نور چاچا نے مہراں کو دوسرے میں بھیج دیا۔ تو انور نے آہ بھر کر کہا۔ "ہمارے رشتے ناتے تو ٹوٹ چکے ہیں، نور چاچا! لیکن دلوں کے رشتے ٹوکوں سے نہیں کاٹے جاتے..." اس کے لہجے میں جذباتیت کا رنگ نکھر آیا۔ اور اس نے رنجیدہ سی آہ بھر کر کہا۔ "میں تم سے بھیک مانگنے آیا ہوں چاچا... پتہ نہیں تم نے جوانی میں کسی کو دل دیا تھا یا نہیں۔ پتہ نہیں تم نے کسی سوہنی کو اپنی ماں کے تلے بھون کر کھلائے تھے یا نہیں ......؟ معلوم نہیں چاچا، تم نے جوگی بن کے اس کان کبھی چھدوائے تھے یا نہیں اور در در پہ یہ صدائیں لگائی تھیں یا نہیں ... تیرا دل مرجھا گیا ہے نور چاچا۔ تجھے شاید دل کی دھڑکنیں یاد نہیں رہیں۔"

"میں نے وہ سوہنی دیکھی تھی، انور!" نور چاچا یوں بولا۔ جیسے خواب میں بڑبڑا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بڑی دور جھانک رہی تھیں۔ "وہ چناب کی لہروں پہ نہیں جلتے کھلیانوں اور خون کے بہتے دریا میں تیر کے ملنے آیا کرتی تھی..." نور چاچا کی آواز دب گئی۔

آج ایک اور سوہنی بھڑکتے شعلوں میں تیر کے میرے پاس آئی ہے نور چاچا" انور نے جذباتی لہجے میں کہا۔ "اور آج رات میں ان شعلوں میں کود کر آیا ہوں۔ انگ انگ جل رہا ہے چاچا!"

نور چاچا کے چہرے کا تاثر یکبارگی بدل گیا تھا۔ اور اس کی آنکھیں پھٹی پھٹی سی نظر آنے لگی تھیں۔ جیسے کوئی اسے سوتے سے اٹھا کر انور کی عمر میں لے گیا ہو۔

"انور! نور چاچا نے اپنی حیرت سے کہا "تمہیں رضیہ کا رشتہ نہیں ملے گا"

"تم نے کیسے جانا کہ میں رضیہ کا رشتہ مانگنے آیا ہوں؟"

"میں کیا نہیں جانتا بیٹے!" نور چاچا نے کہا۔ "لیکن میرے گاؤں کا رشتہ تیرے گاؤں نہیں جائے گا۔ کوئی صورت ہی نہیں"

"تم چاہو تو اس کے ماں باپ راضی ہو جائیں گے" انور نے کہا۔

"نہیں!" نور چاچا نے سر ہلا کر کہا۔ "میں اس گاؤں کا ذمہ دار ہوں میں کس طرح کہہ دوں کہ اپنی بیٹی دشمن کے حوالے کر دو۔ میں ہاں کروں!"

"رضیہ میرے ساتھ نکل جانے کو تیار ہے" انور نے کہہ تو دیا۔ لیکن وہ لرز اٹھا۔ اسے معلوم تھا کہ نور چاچا اپنی ناک پر اتنی غلیظ مکھی بیٹھنے دے گا۔

"تو نکال لے جاؤ" نور چاچا نے مسکرا کر کہا۔

"لیکن تمہارے گاؤں سے ایک تنکا بھی اٹھائے جانا آسان تو نہیں" انور نے کہا۔ "اگر رضیہ کو نکال لے جانا آسان ہوتا تو تمہارے پاس آتا ہی کیوں؟ مجھے اپنا ڈر نہیں چاچا! پکڑے گئے تو تم رضیہ کی بوٹی بوٹی کر دو گے اور تم اپنا بڑھاپا میرے خاندان کا بچہ بچہ کے نیچے پیچھے آ کر ختم کرنے میں گزار دو گے"

"تم نے زینت سے بات کی ہے" نور چاچا نے پوچھا۔

"زینت؟" انور نے پوچھا "یعنی اپنی ماں سے؟"

"ہاں، ہاں" نور چاچا بولا "تم زینت کے بیٹے ہو نا!"

"ہاں چاچا!" انور نے کہا "میری ماں میری رازداں ہے۔ سچی بات بتاؤں چاچا! مجھ سے ماں نے ہی کہا تھا کہ چوری چھپے نور چاچا پاس چلے جاؤ۔ وہ نہ مانے تو اسے کہنا کہ زینت نے کہا ہے یہ کام ضرور کرنا ہے"

نور چاچا کا سر جھک گیا۔ وہ آہستہ سے اٹھا۔ دروازے تک گیا۔ اور سر جھکائے لوٹ آیا۔ پھر آہستہ آہستہ کمرے میں ٹہلنے لگا۔ جب گھڑی کی ٹک ٹک بند ہوئی تو کتے یکبارگی چونک اٹھے۔ نور چاچا کے جسم نے جھرجھری لی۔ اور سر تا پا کانپ اٹھا۔ دھیمی سی آواز میں بولا "آؤ چلیں"

تھوڑی دیر بعد مہراں اس کمرے میں آئی تو کمرہ خالی تھا۔ اس نے آہ بھری اور زیر لب بولی۔ "آہ یہ خون بھی نور سے رنگ دیا" وہ جانتی تھی کہ نور نے پار والے کسی انسان کو کبھی نہیں بخشا۔

بہت دیر بعد نور چاچا آ گیا۔ مہراں نے فوراً پوچھا۔ "لاش کہاں پھینک آئے؟"

نور چاچا چپ چاپ کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اور افسردہ لہجے میں بولا۔ "نہیں مہراں، میں اسے گھاٹ سے پار چھوڑ آیا ہوں..... وہ میرے ہاتھ سے زندہ نکل گیا ہے۔ میں اسے خود ہی چھوڑ آیا ہوں...." نور چاچا رنجیدہ تھا۔ اور ہنس بھی دیا۔ سوگوار سی ہنسی۔ حیرت زدہ مہراں کو چاہ بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا "تم حیران ہو رہی ہو مہراں! جب تم نے جوانی میں مجھے راہ میں روکا تھا۔ تو میں نے کہا تھا۔ کہ میں

مرول۔ زینت کو قسم دی تھی۔ وہ پوری کر دکھاؤں ۔۔۔۔ کہو مہراں میرا ساتھ دو گی ؟"

میں نے کب تمہارا ساتھ نہیں دیا، نور !" مہراں نے آنچل سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "مرنا جینا تیرے ساتھ ہے۔ بتاؤ میں کیا کروں :"

"بس یہی کہ میں جو کچھ کروں اسے راز سمجھ کر اپنے سینے میں لے کر مر جانا :"

نور چاچا پہ خاموشی طاری ہو گئی۔ رات گزر گئی پھر سات روز گذر گئے اور نور چاچا پہ خاموشی طاری رہی اس نے دو چار مرتبہ ارادہ کیا کہ رضیہ کے ماں باپ سے کہے۔ کہ رضیہ کا رشتہ انور کو دے دیں۔ لیکن دونوں گاؤں کے رشتے اسی نے خود توڑے تھے۔ اب اپنی ناک کی بے عزتی گوارا نہ تھی۔

آٹھویں رات نور چاچا گھر سے غائب ہو گیا۔ مہراں بہت بے چین تھی۔ اور بے تابی سے نور کی واپسی کا انتظار کر رہی تھی۔ لیکن نور چاچا آج کی رات لوٹ آنے کے لیے نہیں گیا تھا۔ مہراں کے سینے میں ایک زہریلا راز ڈنک مار رہا تھا۔

دروازے پہ دستک ہوئی۔ مہراں نے بھاگ کر دروازہ کھولا لیکن نور نہیں تھا رضیہ کا باپ تھا۔ اس نے نور چاچا کے متعلق پوچھا۔ تو مہراں نے کہا کسی کام سے نکلا تھا ابھی لوٹا نہیں بس آ ہی رہا ہو گا۔

رضیہ کا باپ اندر آ گیا۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ مہراں اس کے دل کا حال جانتی تھی۔ لیکن انجان بن کر بولی۔ "کیوں بھائی جی کوئی خاص بات ہے ؟"

"رضیہ کا کچھ پتا نہیں :" باپ نے کہا۔ "ہر جگہ تلاش کر آئے ہیں۔ شام کو کہہ گئی تھی مزار پہ دیا جلانے جا رہی ہوں پھر واپس نہیں آئی :" بوڑھے باپ کے آنسو نکل آئے۔

رضیہ کا مہراں کے سوا کسی کو پتہ نہ تھا۔ نور چاچا کے بنائے ہوئے پروگرام کے مطابق رضیہ شام کو ہی اس کے گھر آ چھپی تھی۔ اور تھوڑی ہی دیر پہلے نور چاچا اسے کمبل میں لپیٹ کر ساتھ لے گیا تھا۔ ادھر سے انور سوا کوس دور ریلوے اسٹیشن کی طرف پہنچ گیا تھا۔ اس نے گھر والوں کو اتنا ہی بتایا تھا کہ شہر جا رہا ہوں۔ اور رات دیر سے لوٹوں گا۔ اس کی چھٹی ختم ہونے میں ابھی کچھ روز باقی تھے۔ وہ بہت دیر سے ریلوے اسٹیشن کے اندھیرے میں کھڑا نور چاچا اور رضیہ کا انتظار کر رہا تھا۔ آدھی رات کو ایک مسافر گاڑی ایک آدھ منٹ کے لیے رکتی تھی۔ انور کو یقین نہیں تھا کہ نور چاچا جیسا زہری آدمی اپنے گاؤں کی بیٹی کو اس کے لئے اغوا کر کے لائے گا۔ اسے خدشہ نظر آ رہا تھا کہ نور چاچا اکیلا آئے گا۔ اور اسے قتل کر کے لاش ریلوے لائن پہ پھینک دے گا۔ اس خدشے کے پیش نظر اس نے اپنا پستول ساتھ لے لیا تھا۔

مسافر گاڑی آنے ہی والی تھی۔ اور ریلوے اسٹیشن کا ایک ہی قلی تھا۔ جو اونگھتے ہوئے اسٹیشن ماسٹر کے پاس کھڑا تھا۔ انور کو اندھیرے میں قدموں کی آہٹ سنائی دی تو اس نے پستول کے دستے کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ لیکن نور چاچا نے کمبل میں لپٹی ہوئی رضیہ اس کے سامنے لا کھڑی کی۔

"انور !" نور چاچا نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔ "میں اپنی عزت اور غیرت تیرے قدموں میں ڈالے جا رہا ہوں۔ اب اپنا وعدہ نبھانا کہ تم یہ راز اپنے سینے میں لے کر مر جاؤ گے اور یہ بھی کہ تم اپنے گاؤں کبھی نہیں آؤ گے !"

"نور چاچا !" انور نے اس کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں دبایا۔ اور اس کے ہاتھ کو بوسہ دے کر کہا۔

"میں نے اس روز بھی قسم کھا کر کہا تھا۔ کہ رضیہ مل جائے تو ساری عمر گاؤں نہیں آؤں گا۔ اس گاؤں میں آ کر، کروں گا بھی کیا۔ یہاں انسانوں کے روپ میں بدروحیں بستی ہیں۔ اور ایک دوسری کو لہو لہان کرتی رہتی ہیں :"

"نور چاچا !" رضیہ بول پڑی۔ "پیر چراغ شاہ کی ڈیوڑھی کی قسم، مر جاؤں گی پر تیری ناک پہ مکھی نہیں بیٹھنے دوں گی :"

اپی

گاڑی ابھی دور تھی۔ لیکن انجن کی مدھم سی بتی دکھائی دے رہی تھی۔ نورچانے انور اور رضیہ کے سروں پر ہاتھ پھیرا۔ اور بولا "سنبھل کے
ے میں گاڑی پر بیٹھ جانا " اور اس کی آواز حلق میں اٹک گئی۔

نورچاچا تیزی سے چل پڑا۔ اور اندھیرے میں غائب ہوگیا۔ لیکن وہ گاؤں کی طرف نہیں جا رہا تھا۔ وہ ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ
مت کو جا رہا تھا۔ جس سمت گاڑی کو جانا تھا۔۔۔ وہ مسرور تھا کہ انور کی ماں سے اس نے قسم کھا کر جو وعدہ کیا تھا آج پچیس برس بعد وہ
نبھا رہا تھا۔ لیکن اسے خیال آگیا کہ وہ گاؤں کی آبرو دشمنوں کی اولاد کے قدموں میں ڈال آیا ہے، وہ تو اس آبرو کا رکھوالا تھا۔ اس کے
ین بچھو ڈنک مارنے لگے۔ وہ تڑپ اٹھا اور رک گیا۔

اس نے گھوم کر دیکھا۔ گاڑی ریلوے اسٹیشن پر رکتے ہی چلنے کی وسلیں دے رہی تھی۔ نورچاچا بہت دور نکل گیا تھا۔ اس نے چاہا کہ
کر رضیہ کو انور سے چھین لائے۔ اور انور کا گلا گھونٹ کر ریلوے لائن پر پھینک دے۔ اس نے مٹھیاں بھینچ لیں۔ خون آنکھوں میں چڑھ آیا
وہ ریلوے اسٹیشن کی طرف چل پڑا۔ لیکن اس کے سامنے انور کا بھرا بھرا خوبصورت چہرہ آگیا۔ اور اسے آواز سنائی دی۔ "نورچاچا! تو نے
سوہنی کو کبھی اپنی ران کے قتلے بھون کے کھلائے ہیں۔؟"

وہ رک گیا۔ اور اندھیرے میں سے ایک سنجیدہ سی آواز ابھری۔

"نور ہماری منزلیں جدا ہو گئی ہیں۔ آؤ قسم کھائیں کہ ہمارے بیٹے بیٹیاں ....."

ایک آواز کل پرسوں ہی اُس نے سنی تھی۔ اور دوسری آواز پچیس چھبیس برس پرانی تھی۔ لیکن دونوں آوازیں کتنی قریب آگئی تھیں
چاچا رک گیا۔ اور اس کی نظروں کے سامنے انور کا تصور اور زیادہ نکھر آیا۔ جب تصور نکھرا تو انور کی آنکھوں سے زینت جھانکنے لگی۔ زینت
رس بھرے ہونٹ ہلنے لگے۔ جیسے کہہ رہے ہوں۔ "نور! انور میرے جگر کا ٹکڑا ہے۔ اسی جگر میں تیرے پیار کو چھپا رکھا ہے نور!"

اور نور سر جھکائے ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چل پڑا۔ تصورات اسے درختوں کے جھنڈ میں لے گئے۔ پچیس برس گزرے
۔ بیتے لمحوں کا قافلہ ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ لوٹ آیا۔ اور نور زینت کو گھٹے ہوئے بازوؤں کے گھیرے میں لے کر اونگھنے لگا وہ
چلتا چلا گیا جیسے خوابوں کی دنیا میں چل رہا ہو۔ زینت کے بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیر کر اسے زینت یاد آگئی۔

گاڑی چل پڑی تھی۔ نورچاچا کو قریب ہی انجن کی وسل سنائی دی۔ تصوروں کا طلسم ٹوٹ گیا۔ گاڑی اس کے قریب آگئی تھی۔ انجن
کا چھک چھکا چھک سے شب کی تیرگی لرز رہی تھی۔ گاڑی کے شور نے نورچاچا کو جھنجھوڑ کر یاد دلا دیا۔ کہ اس گاڑی میں انور اور رضیہ
جا رہے ہیں۔ اس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ آگئی۔ "انور! میری زینت کا بیٹا!" اس نے زیر لب کہا۔ "میں نے مردوں کی طرح
پنا وعدہ پورا کر دیا ہے۔"

جب انجن قریب آیا تو ہیبت ناک گڑگڑاہٹ سے نورچاچا کا سینہ دہلنے لگا۔ اور اس بھیانک شور سے اسے برسوں پرانی گڈوال
کی دوڑ یاد آگئی۔ پھر اسے مہدی حسین یاد آگیا۔ اور یہ بھی یاد آیا کہ مہدی حسین اس کے باپ کے قاتل کا بیٹا تھا۔ اور اسے یہ بھی یاد آگیا
کہ وہ اپنے گاؤں کی بیٹی کا ہاتھ اپنے باپ کے قاتلوں کے گاؤں کے لڑکے کے ہاتھ میں دے آیا ہے۔ اس حال میں کہ وہ تو خود گاؤں
کی آبرو کا رکھوالا ہے۔

انجن اور قریب آگیا۔ نورچاچا کا سینہ بڑے زور سے کپکپایا۔ اس نے بے تاب ہو کر چاہا کہ گاڑی کو روک لے۔ اور اپنے
گاؤں کی بیٹی کو اتار لے۔ وہ رک گیا اور تیزی سے آتی ہوئی گاڑی کو قہر آلود نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ خون آنکھوں میں امڈ آیا۔ نورچاچا

نے جست لگائی۔ اور لالٹن پر لیٹ گیا۔ انجن نے ہولناک چیخ ماری۔

گاڑی کی رفتار اور تیز ہو گئی۔ اور نور چاچا کے جسم کے کئی ٹکڑے کرتی، بل کھاتی انور اور رضیہ کو اپنی آغوش میں لیے، اندھیرے میں گم ہو گئی۔
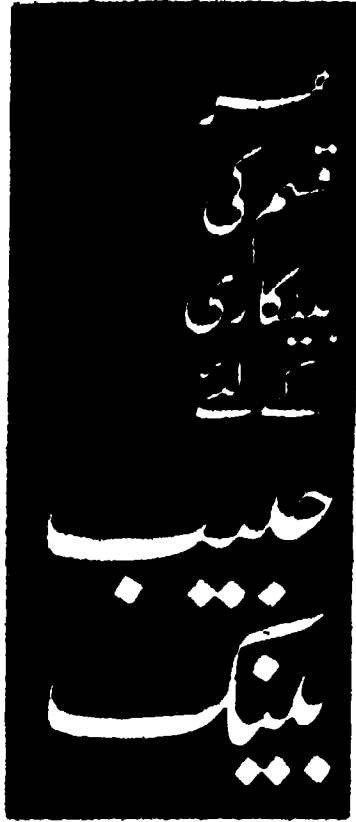
سے

ناول نگاروں اور ناشروں

جناب علی عباس حسینی کی کتاب

اردو ناول کی تاریخ و تنقید

کا

نیا ایڈیشن نظرِ ثانی اور اضافے کے بعد شائع ہونے والا ہے
یہ کتاب ۱۹۴۴ء میں لکھی گئی تھی۔ اس لیے اس کے بعد بیس
سال کے ناولوں کا جائزہ لینا ضروری ہے

ناشرین اور مصنفین

سے التماس ہے کہ وہ اس مدت میں شائع شدہ ناولوں کی ایک ایک
کاپی مصنف موصوف کے مندرجہ ذیل پتے پر ارسال کر دیں
• ناشرین ۱۹۴۴ء کے بعد مطبوعہ ناولوں کی مکمل فہرست
بھی ارسال کر سکتے ہیں۔ پتہ یہ ہے۔

جناب علی عباس حسینی
۱۰۵۔ غوث گنج۔ وزیر گنج۔ لکھنؤ۔ یو۔ پی۔

نقش ادب کی خدمت
کرتا ہے
آپ نقش کی سرپرستی کیجیے
نقش خریدیے •
نقش میں اشتہار دیجیے
فرصت کے لمحات کا ساتھی
ماہنامہ نقش کراچی

جمیلہ ہاشمی

نیا دَور کراچی

کیسری

ہوا آج بھی گرم اور جھلسا دینے والی ہے تیزی سے چلتی ہوئی گرد۔ طوفان کو اپنے پیچھے اٹھائے ایسے عورت کی طرح کانپ رہی ہے جس نے ضرورت سے زیادہ بوجھ اٹھا رکھا ہو اور جس کا کوئی بچہ اس کی مدد کرنے کے لئے زندہ باقی نہ رہا ہو۔ میں بوجھل دل سے ہولے ہولے قدم اٹھاتا عدالت کے کمرے سے اٹھ کر موٹر تک جانے کی کوشش کر رہا ہوں جہاں میرا شوفر میرا منتظر ہے۔ مگر یوں لگتا ہے جیسے میں کبھی اس تک نہیں پہنچ پاؤں گا۔ میرے قدم پاتال کی طرف اٹھ رہے ہیں۔ میں نیچے گر رہا ہوں اور زمین کے اندر کی ساری آتشیں میرا سواگت کرنے کو موت کے کئی روپ بن کر میری طرف آ رہی ہیں۔ یہ گرمی کا اثر ہے۔

کیسری کی حیرت سے کھلی آنکھیں ہر گھڑی میری راہ میں آتی ہیں۔ میری طرف غور سے دیکھتی ہوئی مگر ان آنکھوں میں رحم کی التجا نہیں ہے۔ خوف نہیں ہے، افسوس نہیں ہے، صرف حیرت ہے جیسے کھیتوں سے آتے ہوئے کسی موڑ پر اسے روپ سنگھ نے پکارا ہو وہ پکار جس سے مایوس ہو کر اس نے روپ سنگھ کو مار دیا تھا۔

گوندوال سے شہر جانے والے راہ پر آج بھی وہی رونق ہوگی۔ ہوا کے ساتھ پتے اڑ رہے ہوں گے۔ نہر کا پانی اسی طرح لہروں کے بل کھاتا آگے ہی آگے جا رہا ہوگا۔ نہر کی پٹڑی پر عورتیں چنے پلوؤں میں باندھے بچوں کو اٹھائے ننگے پاؤں تیز تیز گاؤں کی طرف آ رہی ہوں گی۔ سائیکل سوار سروں کو دھوپ سے بچانے کے لئے صافے لپیٹے ٹانگیں چلاتے اترتے جاتے ہوں گے سبھی کچھ وہی ہوگا پر کیسری نہ ہوگی۔ کیسری جس کی اپیل کا فیصلہ سناتے ہوئے آج میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں وہ حیرت تھی جیسے اسے اپنے کانوں پر اعتبار نہ ہو۔

کیسری کی کہانی وہی عام کہانی تھی جو اس دنیا میں لاکھوں بار دہرائی گئی ہے۔ عورت نے اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنا سب کچھ پریم کی چوکھٹ پر تج دیا۔ اور جب اس معاملے اسے دھتکار ملا تو بدلے میں اس نے اس مندر کو ہی اجاڑ دیا۔ مورتی بنانے والے ہاتھوں نے فیصلے کی گھڑی میں مورتی کو اس سے گرا دیا۔ زندگی کی کہانی عجیب ہے۔ کیونکہ ہر آدمی اس کو اپنے خیال کے مطابق ڈھال لیتا ہے۔ کوئی ایسا بندھا ٹکا اصول نہیں جو اس کو ترتیب دے سکے۔ جانے کتنی صدیوں سے یہ دنیا آباد ہے۔ اور پھر بھی ہر کوئی دنیا میں پہلی بار آتا ہے۔ دنیا کے نئے پن سے حیران ہوتا ہے اور اپنے خون سے اس کہانی کا انجام لکھتا ہے اور چپکے سے مندر میں اپنے دل کی بھینٹ چڑھاتا ہے۔ تب ہی تو ایسی ایسی باتیں جن کو اچھا یا برا نہیں کہا جا سکتا دشمنی کا سبب بن جاتی ہیں۔ ذرا ذرا سی رقابتیں چھوٹی چھوٹی خواہشیں موٹے موٹے تناور درختوں کی طرح زندگی کی راہ پر چھا جاتی ہیں۔ تو کیسری بھی دنیا میں آئی تو دیوی بنا کر مندر کو سجاتی رہی اور یہاں سے ہی اس کی کہانی عام کہانیوں سے ذرا مختلف ہے۔ کم از کم مجھے تو وہ ایسی ہی لگی تھی کیونکہ میں کیسری کو بچپن سے

جاتا تھا۔

گوردوارے کے گیان جی کی بیٹیاں میری بہن رکمن کے ساتھ جب آنگن میں کھیلنے آتیں اور پینگ پر جھولتی ہوئی گیت گاتیں تو کیسری اپنی دیوار پر سے ہمارے آنگن میں جھانکتی۔ وہ ان دنوں ذرا سی بچی تھی یہی کوئی چھ سات سال کی ہوگی۔ رکمن یوں بھی اس سے بڑی تھی اور جوان ہوتی ہوئی لڑکیاں برابر لڑکیوں کو کب اپنے ساتھ کھلاتی ہیں۔ میں ان دنوں اسکول میں پڑھتا تھا۔ اور لڑکیوں کی طرف بہت حقارت سے دیکھتا۔ جب میری بہنیں کہہ کر مجھے اپنا کوئی کام کہتیں تو میں بہت منتیں کروانے کے بعد بھی ان کا کام کر کے نہ دیتا۔ رکمن کی سہیلیاں گلی کی لڑکیاں سب مل کر آنگن میں خوب شور مچاتیں۔ کیسری کو میں دیکھتا کہ اس کی بڑی بڑی آنکھیں دیوار کے پار سے جھکتیں۔ جیسے بلی اپنے شکار کی گھات میں ہو۔ پھر اس کی ماں آواز دیتی۔ اور وہ یوں غائب ہو جاتی جیسے کسی نے نہر کے بہتے ہوئے پانی میں ڈبکی لگائی ہو۔ ہوا میں بلبلے سے پھوٹنے لگتے اور دیوار کا وہ ٹکڑا سات رنگوں میں نہا جاتا جیسے آکاش سے پینگ کے رنگ دھرتی پر آن براجے ہوں۔

مجھے کیسری کی ان دنوں کی صورت یاد کرنے پر بھی یاد نہیں آتی۔ صرف نیم کے پتوں میں جھولتے جھونکے یاد ہیں۔ اور گیانی جی کی وہ بیٹیاں، رکمن کے پیچھے پیچھے بیاہی گئیں اور جب بچوں کے ساتھ رکمن سے ملنے ہمارے گھر آتی ہیں تو عورتیں لگتی تھیں۔ میں نے اسکول ختم کیا تو باپو نے مجھے کالج میں پڑھنے امرتسر بھیج دیا۔ گووندوال میرے لئے ایک ایسا ماضی بن گیا جس کو فارغ گھڑیوں میں رات کو بستر میں گھس کر پاگنوں کے رس کی باس کو سونگھ کر کیا جا سکے۔ اور میں بہت ہی معروف رہا ہوں۔ آج تک مجھے کیسری کو یاد کرنے کی فرصت کب ملی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ جب کبھی میں چھٹیوں میں گاؤں جاتا وہاں میرا دل ہی کب لگتا تھا۔ میرے ماما کا گھر شہر میں تھا اور میں اکثر چھٹیاں شہر میں گزارتا پڑھنے میں لگا رہتا۔ اور میڈیکل کالج کی لڑکیوں کو پریاں سمجھتا جو نہیں آسکیں۔ اوہ پر بات تو کیسری کی ہو رہی ہے۔ جب میں مقابلے کی امتحان کی تیاری کر رہا تھا اور بڑا بننے کے سپنے دیکھنے تک کی فرصت نہ تھی ابھی باپو کی چٹھی ملی کہ ماں بہت بیمار ہے اور میں گھر آؤں۔ گاڑی جنتی پور کے اسٹیشن پر رکی ہے تو شام کا دھندلکا گنوں کے کھیتوں پر نیلا ہو رہا تھا۔ اور گاؤں تک چلنا مجھے بہت مشکل لگ رہا تھا۔ پھر ان سارے سالوں جو میں ماں سے دور رہا تھا مجھے دکھ ہو رہا تھا اور مجھے ماں بہت یاد آ رہی تھی، گھر یاد آ رہا تھا۔ جانے کیوں میں اتنا جذباتی ہو رہا تھا۔ میں نے باہر نکل کر دیکھا شاید کوئی سواری باپو نے بھیجی ہو، مگر کوئی نہیں تھا۔ اور اسٹیشن کی عمارت سے پرے کھیتوں پر رات ہولے ہولے اتر رہی تھی، ہوا میں تازہ رس کی باس تھی۔ اور گڑ کی مہک تھی، پانی کی بھیگی ہوئی ہوا کے جھونکے میرے سر پر سے گزر رہے تھے، جانے کیوں مجھے راہ پر اجنبیوں کی طرح بھاگ رہا تھا۔ وہ آنگن جس میں نیم کا درخت تھا مجھے بہت ہی پیارا لگ رہا تھا۔

پھر لال رنگ کے بادلوں سے پرے سورج کا گول تھال سرک گیا۔ اور درختوں پر چڑیاں زور زور سے بولنے لگیں۔ میرے سر پر سے کوے اور بگلے قطار سے باندھے گزر گئے۔ شام کی ہوا چلی۔ عورتیں سروں پر چارے کے گٹھے لئے راہ کی بستیوں میں گم ہو گئیں۔ اور گڑ کے کڑھاؤ کے نیچے جلنے آگ زیادہ روشن ہو گئی۔ نہر کی پٹڑی پر چڑھا ہوں تو پانی اندھیرے میں چمکنے لگا اور لہریں ہولے ہولے مجھے سوتی ہوئی لگیں۔ رام باغ کے پاس مجھے ہنہنانے کی آواز سنائی دی اور پھر لگام ہاتھ میں پکڑے ویر وال سے اپنے گاؤں کی طرف مڑنے والے راہ پر میں نے کیسری کو دیکھا۔

مجھے دیکھ کر آج کی طرح اس کی بڑی بڑی آنکھیں حیرت سے کھل گئیں۔

"ویر تم کہاں سے آ رہے ہو؟" اس نے اپنے سر پر پلو کو درست کرتے ہوئے کہا۔

"شہر سے۔" میں نے اس کے برابر چلتے ہوئے کہا۔ "ماں کا کیا حال ہے؟ مجھے تو آج ہی باپو کی چٹھی ملی تھی کہ ماں بہت بیمار ہے۔"

"چاچی اب تو اچھی ہے۔ پرسوں اس کا جی بہت خراب ہو گیا تھا۔ رکمن بھی آئی ہوئی ہے۔" اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی لگام گھوڑی پر ڈال دی۔ گھوڑی سر جھکائے آگے آگے چل رہی تھی۔ میرے جی پر سے ماں کے اچھے ہونے کا سن کر بوجھ ذرا ہلکا ہوا تو میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ اکا دکا تارے گلی میں کھیلنے بچوں کی طرح آکاش پر اکٹھا ہو رہے تھے۔ اور حویلیوں میں دیئے ٹمٹا رہے تھے۔ اور کیسری کی آنکھوں میں جوت بہت گہری تھی۔ جیسے اس کے اندر کہیں دیوا

بھر ہی ہو۔ اپنے پاس چلتے ہوئے میں نے ایک عجیب سی سوگند اس میں پائی جو نہ کھیتوں کی تھی نہ مٹھاس کی نہ شام کی ہوا کی تھی اور نہ پانی کی تھی۔ اس کی میٹھی سی باس کچھ نہ تھی اور گوردوارے میں جلنے والی بتیوں سے بھی نہیں تھی۔ اکیلی نرالی انوکھی سی۔

میرا دل اس باس کے ساتھ ساتھ بھٹک رہا تھا اور ہم دونوں گھوڑی کے پیچھے چل رہے تھے۔ باتیں کر رہے تھے۔ ساری چاچیوں، ماسیوں اور بہنوں کی باتیں۔ میں دل ہی دل میں حیران تھا کیسری کا بیاہ اب تک کیوں نہیں ہوا۔ اس کے ساتھ کی ساری کنواریاں بیاہی جا چکی تھیں۔ ہمارے آنگن میں نیم تلے ہوئے ہوئے نئی جوان ہوتی ہوئی لڑکیوں نے رکمن کی سہیلیوں کی جگہ اپنا ڈیرا جما لیا تھا۔

جب گوندوال دکھائی دینے لگا تو میں نے پوچھا۔ "تم کہاں سے آ رہی تھیں۔ ویروال کس کام سے گئی تھیں؟"

مدھم پڑتی روشنی میں جو اجالے سے زیادہ اندھیرا لگتی ہے پر جس میں چیزوں کی شبیہ مٹ نہیں سکتی۔ میں نے نیلاہٹ کی پرچھائیں میں جو رات اور شام کچھ نہ تھی کیسری کی طرف دیکھا۔ اس کا منہ تپ گیا تھا اور لمبی لمبی پلکیں ان بڑی بڑی آنکھوں پر یوں جھکی تھیں جیسے وہ نئی دلہن ہو۔ اس نے میری طرف دیکھے بنا جواب دیا۔ "روپ سنگھ ولایت جا رہا ہے۔"

"کون روپ سنگھ؟" میں نے کچھ یاد کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"لمبڑوں کا پوت۔" اس نے یوں جھنجھلا کر جواب دیا جیسے اسے میرے بھول جانے کی کوشش پر غصہ آ رہا ہو۔

"اچھا ویروال والے لمبڑوں کا روپ سنگھ۔ اس نے اسکول ختم کر لیا ہے۔" میں نے اپنے یاد کرنے کی قوت پر خوش ہوتے ہوئے سر ہلا کر کہا۔ "وہ ولایت کیوں جا رہا ہے اس کا باپو تو پڑھنے والے لوگوں کے خلاف ہے۔ وہ روپ سنگھ کو کیسے اتنی دور بھیج رہا ہے۔"

میں نے ایک سانس میں اتنی ساری باتیں کہہ دیں۔

"روپ سنگھ کہتا ہے ولایت سے آ کر وہ اپنے باپ کی زمینوں سے بے فکر ہو جائے گا۔ اپنے پیروں پر آپ کھڑا ہو جائے گا۔" کیسری نے بہت دھیرے سے یوں کہا جیسے وہ رس کے گھونٹ پی رہی ہو اور مٹھاس سے اس کے ہونٹ چپک رہے ہوں۔ شام کی ہوا میں میں نے اس کی لمبی چوٹی کو اس کے پیچھے لہراتے دیکھا۔ جب وہ اپنی حویلی کی طرف جانے کے لئے گھوڑی کی باگ پکڑ کر مڑ گئی ہے۔ میں وہیں کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ رکمن سے نکلتے ہوئے قد کی جیسے درخت کی ٹہنی میں سے نئی پھوٹی ہوئی لمبی شاخ ہو۔ سرخ پتوں سے بھری ہوئی اور زندگی کے رس سے چمکتی ہوئی۔

آج بھی جب وہ عدالت میں کھڑی تھی۔ زندگی کا رس اس کے انگوں سے چھلکتا تھا۔ سیدھی نئی نویلی شاخ کی طرح چمکتی ہوئی وہی کیسری جو اس شام گوندوال کی گلیوں میں لمبڑوں کے روپ سنگھ کا سوچتی ہوئی گھوڑی کی باگ پکڑے ہولے ہولے جا رہی تھی اور جس کے ہونٹ ایک نام کی مٹھاس سے چپک رہے تھے۔

میں حیران ہوں اور سوچ نہیں سکتا کہ مٹھاس زہر بھی بن سکتی ہے؟

گوندوال میں میں بہت کم ٹھہرا۔ ماں کا جی اچھا تھا۔ وہ میرے آنے سے بہت خوش ہوئی۔ رکمن کے آدھ درجن بچوں نے شور مچا کر میرا سر کھا لیا۔ ملنے والوں نے مجھے پریشان کر دیا اور آنے والے مقابلے کے امتحان کی یاد نے میرا دو دن وہاں ٹھہرنا مشکل کر دیا۔ تیسرے دن جب میں شہر آ رہا تھا تو منڈی پور تک باپو مجھے چھوڑنے آیا۔ گاڑی آنے تک وہ مجھ سے گھر، کھیتوں، محصول اور لوگوں کی باتیں کرتا رہا۔ پھر دبی زبان سے اس نے لمبڑوں کا ذکر کیا جو چاہتے تھے کہ اپنی بیٹی مجھے دیں مگر جو بات خود کہنا نہ چاہتے تھے۔ تب اس گھڑی مجھے کیسری یاد آئی اور میں نے باپو سے پوچھا۔ "میں نے سنا ہے روپ سنگھ ولایت جا رہا ہے؟"

"ہم نے تو آج تک یہ بات نہیں سنی۔" باپو نے حیران ہو کر پوچھا۔ "تجھے کون یہ بات بتا گیا ہے؟"

تب میں نے یوں ہی کسی وفا کی خاطر نہیں بس ایسے ہی کیسری کا نام لینے کی ضرورت نہ سمجھی اور باپو سے کہا۔ "مجھے ملنے والوں میں سے کسی نے بتایا ہے۔" باپو نے ہولے سے کہا۔ "ہمارے گاؤں میں سے تو کسی کو معلوم نہیں۔ شاید جیت سنگھ کے گھر سے بات نکلی ہو۔ تمہیں نہیں پتہ لوگ کیسری اور روپ سنگھ

کے لئے کیا کیا کہتے ہیں؟"

میں پھر بھی چپ رہا تو ماں نے کہا۔ "ایک طرح سے تو اچھا ہی ہے۔ وہ ولایت چلا جائے گا تو کیسری کے جادو سے نکل جائے گا وہاں اس کا دل کسی اور میں لگے گا۔ واہ گرو کسی کو ایسی لڑکی نہ دے۔ کیسری تو ڈائن ہے۔ گاؤں میں کسی کی پروا نہیں کرتی۔ پھر کانوں کو ہاتھ لگا کر کہنے لگا۔ "توبہ توبہ میں بھی بیٹیوں والا ہوں کسی کی باتیں کیوں کروں۔ ہو سکتا ہے لوگ جھوٹ کہتے ہوں۔ کیسری ذرا دلیر سی لڑکی ہے"۔ اور تب مجھے وہ آنکھیں یاد آئیں جو ہمارے آنگن میں دیوار کے اوپر سے جھانکتی تھیں۔ جیسے بلی اپنے شکار کی گھات میں ہو۔

گوندوال بہت پیچھے چھوٹ گیا۔ میں مقابلے کے امتحان میں اول آیا اور اکیڈمی میں ٹریننگ کے لئے چلا گیا۔ ایک سال کے بعد جہاں میری پوسٹنگ ہوئی ماں بھی وہیں پر آگئی۔ اصل میں وہ مجھ سے میری شادی کی بات کرنے آئی تھی۔ پرانے دنوں میں گورداسپور کے بشن سنگھ کے گھر میں بہت آتا جاتا تھا اور اس کی بیچ کورسے جو نشی کہلاتی تھی۔ انگریزی تیزی سے بولتی تھی۔ اور ولایتی میموں کے سے بال بناتی تھی۔ زبردستی عشق کر رہا تھا۔ ویر والی اور ٹھاکروں کا قصہ میرے لئے پرانا ہو چکا تھا۔ میرے طور طریقے دیکھ کر میری بہت ہی دھیرج والی ماں نے شادی کی بات نہ کی۔ جب شام کو ہم سب کھانا کھانے کے لئے بیٹھے تو وہ گاؤں اور ہمسایوں کی باتیں کرتی رہیں۔

میں نے پوچھا۔ "ماں کیسری کا بیاہ ہو گیا کیا؟"

اور ماں نے بہت ہی دکھی دل سے ٹھنڈی سانس کھینچ کر کہا۔ "کہاں اس کا بیاہ ہوگا۔ وہ کسی کو پسند بھی کرے۔ اس نے جیت سنگھ سے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ جب تک روپ سنگھ نہ آئے گا وہ انتظار کرے گی؟ بتاؤ تو۔ تم تو لمبڑوں کی لڑکی سے بیاہ نہیں کرنا چاہتے اور نمی کے پیچھے پھرتے ہو وہ جو ولایت گیا ہے بھلا آ کر اس کو پوچھے گا بھی؟ پھر بہت آہستہ سے کہنے لگی۔ یوں بھی اب کون اس کو قبول کرے گا وہ کسی سے کوئی بات چھپاتی تھوڑا ہے۔ جانے کس مٹی سے بنی ہے۔ اتنی بے شرم لڑکی میں نے کبھی نہیں دیکھی۔ واہ گرو کرے اسے تو موت آ جائے۔ اس کی ماں نے تو اب طعنوں کے ڈر سے گلی محلے میں آنا جانا بھی چھوڑ دیا ہے"۔

جب ماں نے بات ختم کر لی تو میں نے کہا۔ "ماں تجھ سے کس نے کہا ہے۔ میں نمی کے پیچھے پھرتا ہوں۔ وہ تو بشن سنگھ کمشنر ہے نا۔ اور آدمی کو اپنی آئندہ ترقی کے لئے کسی نہ کسی سے بنا کر رکھنی پڑتی ہے۔ تو جہاں بھی میرا بیاہ کرے مجھے منظور ہوگا۔ بھلا میں اب ایسا بھی کیا نالائق ہوں کہ تیری بات نہ مانوں گا۔ میں کوئی کیسری ہوں"۔

ماں نے خوش ہو کر میرا منہ چوم لیا۔ میرے سر کو پیار کیا اور بولی۔ "بس بیٹا تو نے میرا دل خوش کر دیا۔ لمبڑوں کی جگجیت بڑی سندر اور کم زبان ہے تو ایک ہی تو میرا پوت ہے۔ میں بھی چاہتی ہوں ایسی بہو آئے جو کم از کم میرے ساتھ تو مل کر تو رہ سکے"۔

اپنے بیاہ پر میں نے کیسری کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں جوت ویسی ہی تھی جیسے اندر دیئے جل رہے ہوں۔ وہ لڑکیوں کے جھرمٹ میں بیٹھی سب سے الگ جان پڑتی تھی۔ اور اس کی آواز سب سے اونچی اور میٹھی تھی۔ تیج وہ دیوار کے پار سے ہمارے گھر آگئی تھی اور دلہن کے ساتھ کام کرتی سوٹ کپڑے پہنے گھوم گھوم کرتی پھرتی تھی۔ جہاں اور لڑکیاں باتیں کرتی اور ہنستی پھر رہی تھیں۔ وہ دیوار کے ساتھ کھڑی ہوئی جگجیت کو دیکھ رہی تھی جو ہاتھ بھر کا گھونگھٹ کاڑھے گیتوں کے درمیان اٹھتی جاتی تھی۔ کیسری کے چہرے پر ایک سایہ سا تھا جیسے دیوں کی لو کے اوپر سے کوئی گذر رہا ہو۔ اس کی آنکھوں پر نہیں پلکوں پر میں نے یادوں اور بیتی گھڑیوں راہ دیکھتے رہنے کی تھکن کو دیکھا مگر وہ ہنس رہی تھی اور نہال ہو رہی تھی۔

جگجیت کو شہر لے جانے سے ایک دن پہلے میں یونہی شام کو کھیتوں کی طرف نکل گیا۔ سردیوں کی شام گاؤں کو ذرا جلدی آ لیتی ہے۔ دور تک آکاش اور زمین کھیتوں کے اوپر سے ملنے کے لئے جھکے اور سمٹتے چلے جاتے ہیں۔ گلیاں سرخی ہو جاتی ہیں۔ آوارہ کتے چوں چوں کرتے بھٹیوں کی راکھ میں سر چھپانے کو ایک دوسرے سے لڑتے ہیں۔ گائیں، بھینسیں تھانوں پر بندھی اپنے گلے میں پڑی گھنٹیوں کو سر کی حرکت سے بجاتی ہیں۔ گھروں کے اندر دیئے

جلتے ہیں۔ ایلوں کی آگ بجھ سکتی نہیں بس جلتی ہے۔ کوٹھریوں میں بیٹھ کر تل شکر کھاتے ہیں، عورتیں چرخے کاتتی ہیں اور جوان لڑکیاں گیت کے بول اٹھاتی ہیں۔ بند دروازوں کے پیچھے کھیتوں اور فصلوں کی باتیں کرتے ہیں۔ کسان اپنے لڑکوں کو موسم کی باتیں بتاتے ہیں، کہانیاں نیلے دھوئیں کے دھندلکے میں سہانی لگتی ہیں اور دیئے کی لَو ہولے ہولے اندھیرے کی طرف بڑھتی رہتی ہے۔ حویلیوں میں گھوڑیاں ہنہناتی ہیں اور شراب پی کر مدہوش ہوتے۔ جوان اپنے اپنے عشق کے قصے کہتے ہیں۔ پرانی بہنوں کی باتیں کرتے ہیں، اور گنے گیت گاتے ہیں۔

وہ رات چاندنی تھی اور روشنی میں گندم کے کھیت لہلہاتے ہوئے بھلے لگتے ہوئے، میں دل میں سوچ رہا تھا، نمی کیا کہے گی۔ کیا وہ اسی طرح میرے ہاتھ میں ہاتھ دیئے کلب میں گھومے گی۔ کیا وہ اسی دلجمعی کے ساتھ ٹینس کھیلے گی۔ اس نے آج تک مجھے یہ نہیں بتایا تھا کہ اُسے میں کتنا عزیز ہوں مگر دوسروں کو چھوڑ کر میرے ساتھ پھرنے اور ہر مجمع میں میرے ساتھ دیکھے جانے کی آخر کوئی تو تسلی ہوگی۔ میں نے بشن سنگھ کو بتایا تھا کہ کسی کام سے گاؤں جا رہا ہوں۔ اب جب کہ اُسے پتہ چل چکا ہوگا وہ کیا کہے گا اس کی لڑکی؟ مگر جگجیت کی آنکھوں میں کاجل کی دھار بہت تیز تھی۔ اس کے جسم کی سوگندھ نے مجھے پاگل کر دیا تھا۔ میں جیت کی سادگی پر فدا ہو گیا تھا اس پر صرف میرا حق تھا۔ وہ صرف میری تھی۔ نمی اس رات سے پہلے مجھے کبھی یاد بھی نہ آئی تھی۔

پھر میں نے کیسری کو دیکھا۔

اس نے بنا کچھ کہے مجھ سے پوچھا "دیر کیا ولایت کی عورتیں مجھ سے زیادہ خوبصورت ہوتی ہیں؟ وہ میرے سامنے راہ پر کھڑی تھی اور چاند کی کرنوں کی دھار اس کی آنکھوں اور پلکوں پر کانپ رہا تھا۔ میں نے پاؤں سے سر تک اسے دیکھا خاموشی سے جیسے میں اس کی خوبصورتی کا جائزہ لے رہا ہوں، اسے پیمانے میں ناپ رہا ہوں، اسے ترازو میں تول رہا ہوں۔ اس کی آنکھوں کی اداسی اس کے چہرے کی موہنی جیسے موتی کی چمک ہو۔ وہ میرے سامنے سانس روکے کھڑی تھی اور میرے جواب کا انتظار کر رہی تھی۔

میں نے اس رات پہلی بار دیکھا کہ کیسری کا حسن اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ اس کی سادگی کا مقابلہ دنیا میں کوئی شے نہ کر سکتی تھی۔ وہ دنیا کی ساری عورتوں سے اونچی تھی۔ آج تک جتنی کہانیاں میں نے کتابوں میں پڑھی تھیں۔ جتنی عورتوں کی اسندرتا کو میں نے محسوس کیا تھا وہ سب کچھ اس کے سامنے دھول تھا۔ کیسری جیسا آج تک بھگوان نے کوئی پیدا نہ کیا تھا۔ اس کی آن بان رانیوں سے بڑھ کر تھی۔ ان آنکھوں میں کاجل نہیں تھا۔ ان ہاتھوں میں چوڑیاں نہ تھیں۔ مگر پھر بھی اس کا سنگار گندی .... کی عورتوں سے بڑھ چڑھ کر تھا۔ کنواریپنے کی نرمی اس اداسی کو جانے کیا بتا رہی تھی۔ مگر میں چپ تھا۔

کیسری نے پھر کہا "کیوں ویر کچھ کہتے کیوں نہیں ہو۔ میں گوندوال کی لڑکی ہوں جانے روپ سنگھ کو پسند بھی آؤں یا نہیں؟"

میں نے کہا "کیسری ایسی رات میں یوں گھومنا اچھا نہیں واپس جاؤ۔ اور یقین کر سکتی ہو تو کر لو کہ دنیا نے ایسا ہیرا پیدا نہیں کیا جو آب تک تمہارے مقابلے پر رکھا جا سکے۔ وہ میرے قدموں میں بیٹھ گئی اور بولی "ویر یہاں پر کوئی ایسا نہیں جو میری بات سمجھ سکے۔ میں نے کوئی پاپ نہیں کیا پر کیا کروں ٹھیروں کا لڑکا جانے کیوں اچھا لگتا ہے۔ اور میں ساری عمر اس کا انتظار کر سکتی ہوں۔ کیونکہ اس نے کہا تھا کہ میں اس کی راہ دیکھوں۔ تم مجھے بتاؤ ولایت کیسا دیس ہے؟"

شک اور بے یقینی سے اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا۔

میں نے اس سے بہت سی اچھی اچھی باتیں کیں۔ اگلے دن میں جگجیت کو لے کر گاؤں سے چلا آیا اور پھر بشن سنگھ نے میرا تبادلہ بہت دور کروا دیا۔ نوکری کا بھی ایک جادو ہے، طاقت کا ایک نشہ ہے اور پھر زندگی غیر معلوم طور پر روز کے چکر میں چلتی ہے۔ تو وقت کا پتہ نہیں چلتا پانچ سال کے بعد میرا تبادلہ پھر امرتسر کا ہو گیا۔

نمی ایک شام مجھے کلب میں مل گئی۔ ان پانچ سالوں میں وہ بہت بدل گئی تھی۔ اس کی شادی میری غیر حاضری میں ایک کپتان سے ہو گئی تھی۔

شراب پی کر اسے مارتا اور بہک کر پنجابی گیت انگریزی دھنوں میں گانے کی کوشش کرتا تھا۔ رشن سنگھ کی پنشن ہو چکی تھی اور وہ نہر کے کنارے اپنی بہت بڑی کوٹھی میں رہتا تھا جس کی چوکیداری بھی وہ خود ہی کرتا تھا۔ کتوں، کبوتروں کا چڑیا گھر سا اس نے بنا رکھا تھا اور دنیا سے اپنے حالوں نمٹ کر وہ اپنی اس بنائی ہوئی جنت میں خوش تھا اور کسی کے دکھ کی بات سننے کو تیار نہ تھا۔ نمی کی حالت پر وہ اکثر کہتا تھا کہ اس نے وہی کیا ہے جو اس نے چاہا ہے۔ کپتان کو گالیاں دیتا اور نمی کو اپنے گھر آنے نہ دیتا۔ میں کلب کے ایک کونے میں بہت دیر تک نمی سے باتیں کرتا رہتا۔ اس کا تیز انگریزی بولنے کا لہجہ اب بدل گیا تھا۔ میدان میں بسنے والی ندی کی طرح کی روانی اور ٹھہراؤ اس میں پیدا ہو گیا تھا۔ وہ کپتان سے چھٹکارا پانے کے لئے پرانے دوستوں کو ملنے کبھی کبھار کلب چلی آتی تھی۔ جہاں وہ شراب پیتی اور اپنی حالت پر روتی رہتی تھی۔ میں اس سے مل کر بہت اداس ہو گیا۔ مجھے بیتے دن بری طرح یاد آئے۔ نمی کا باپ اگر کوشش کرتا تو اس شرابی کپتان سے اچھا کوئی آدمی اس کی بیٹی سے شادی کر لیتا۔ مگر کوشش سے نصیب بدل سکتے ہیں بھلا؟

گھر لوٹا ہوں تو جگجیت اور بچے گھر کو سجا رہے تھے۔ روپ سنگھ کا خط آیا تھا۔ وہ کل واپس آنے والا تھا۔ بچے پہلی بار اپنے ماما کو دیکھنے والے تھے۔ جیت کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ وہ بار بار مجھ سے کہتی۔

"جب دیر گیا ہے تو میرا بیاہ نہیں ہوا تھا۔ اب آ کر بچوں کو دیکھے گا تو کیا کہے گا، اسے کیسا لگے گا"۔ وہ خوشی سے سرخ ہو رہی تھی۔ شام تک اس کا باپو بھی آ گیا اور گھر یوں جگ مگ کرنے لگا جیسے دیوالی ہو۔

میں اس ساری تیاری کو دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ جگجیت کا لمبڑ باپ مستقل باتیں کر رہا تھا کہ وہ کس طرح روپ سنگھ کو کسی بہت اچھے گھر میں بیاہے گا اور اتنی خوشی کرے گا کہ ساری پچھلی خوشیاں لوگوں کو بھول جائیں۔ اس شام بہت سالوں کے بعد مجھے کیسری یاد آئی۔ اور گوندوال یاد آیا۔ میرا جی چاہا میں گاؤں جاؤں اور اس سے ملوں۔ ولایت کی عورتوں کے حسن کا چرچا اب تو جھوٹا لگنے لگا تھا۔ میں دل ہی دل میں لمبڑ کی باتیں سن کر ہنس رہا تھا۔ بھلا روپ سنگھ کیسری کو بھول سکتا ہے۔ کیسری بھولنے کی چیز نہیں تھی۔

دو چار ماہ کی مصروفیت میٹنگیں اور کانفرنسیں مجھے پھر اپنے ساتھ بہا کر لے گئیں۔ مگر گاؤں جا کر کیسری اور روپ سنگھ کے حالات معلوم کرنے کی خواہش برابر دل کے ساتھ رہی میں انتظار کرتا رہا کہ کب چھٹیاں ہوں عدالتیں بند ہوں اور میں گوندوال جاؤں۔ جیت اور اس کا باپو تو روز روپ سنگھ کے لئے نئی لڑکیاں دیکھنے کی اسکیمیں بناتے تھے اور خوش ہوتے تھے۔

جنتی پور کے اسٹیشن پر کوئی سواری نہ تھی کیونکہ میں بنا اطلاع کئے آیا تھا۔ شام کو چلتے ہوئے گھر تک جانا اور ماں کو حیران کرنا مجھے سوچ کر ہی بھلا معلوم دیا۔ میں بہت پہلے کی ایک شام کو یاد کر رہا تھا۔ جب دیر وال سے گوندوال کی طرف آنے والی راہ پر میں نے کیسری کو دیکھا تھا۔ میرا ذہن خالی بھی تھا اور ہلکا بھی۔ جیسے خوشی کا سرور نشے کی طرح ابھی سے چھایا جا رہا ہو۔ اماوس کے لئے نہانے جانے والوں کی ٹولیاں کھیتوں کی منڈیروں اور پگڈنڈیوں پر سے شور مچاتی گزر رہی تھیں۔ شراب پی کر بہکے ہوئے دیہاتی گالیاں بکتے بھاگتے جاتے تھے۔ اونچی آوازیں ماہیا گاتے ہوئے چور ڈاکو گھوڑیاں دوڑاتے ہوئے ایک میلہ سا کھیتوں کے کناروں سے تالاب کی طرف جا رہا تھا۔

دیر وال سے لوگ شام ہو جانے کے باوجود آ رہے تھے ان کے ہاتھوں میں شام چڑھی لاٹھیاں تھیں اور داڑھیوں کے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ عورتیں روتے بچوں کو اپنے ساتھ گھسیٹتی لاتی تھیں۔ اور نہانے کے شوق میں اپنے جوڑوں سے بھرے سر کھجا رہی تھی۔ میں ناقابل یقین کشش محسوس کر رہا تھا۔ یوں جیسے اگر زمین کے بازو ہوں اور وہ مجھے اپنے ساتھ لگانا چاہے تو میں اس کے سینے سے لگ کر ایک ٹھنڈک محسوس کروں گا۔

روپ سنگھ کی شادی کی باتیں جو جگجیت اور اس کا باپو کرتے رہے تھے اور پھر روپ سنگھ کا ان پڑھ لڑکیوں کے ذکر سے ہی چکرانا مجھے یاد آ رہا تھا اصل میں میں کیسری کا انجام دیکھنے کے لئے گاؤں جا رہا تھا۔

لوگ تالاب کی طرف چلے گئے۔ راستہ سنسان ہو گیا۔ اور دور ہوتے ہوئے گیتوں کے بول مجھے شمشان میں گائے جانے والے منتروں کی جاپ کی

لرح لگنے لگے۔ اور تاروں کے جھرمٹ اندھیری رات میں ڈرتے ہوئے بچوں کی طرح ٹولیاں سی بنا کر آکاش پر تننے لگے۔ ہر شے تاریکی میں چھپی ہوئی تھی۔ جھڑوں کے چرچرانے کی آواز ایک کبھی نہ ختم ہونے والے شُر کی طرح درختوں اور راہوں، ٹہنیوں اور پتوں، کھیتوں اور پگڈنڈیوں پر سے بہتی جاتی تھی۔

پھر میں نے تیز بھاگتے گھوڑے کی ٹاپوں کو سنا اور وہ شور قریب آتا گیا اور قریب آتا گیا۔ اب میں اس موڑ پر تھا۔ جہاں سے نہر دوسری طرف مڑتی ہے۔ اور گوندوال کا راہ نیچے اترجاتا ہے۔ سرکنڈوں سے بنے اونچے نالے کے کنارے کو اندھیرے نے ڈراؤنا بنا دیا تھا۔ اماوس کی رات کو قتل ہوتے ہیں اور پھر ایسے واقعات جس کا کوئی کھوج کبھی نہیں مل سکتا۔ میں ڈر نہیں رہا تھا۔ پھر آنے والا اس کالی رات میں گھوڑا دوڑاتا ہوا کون ہو سکتا ہے۔ میرے پاس تھیلے میں ٹارچ تھی میں نے اسے نکال کر ہاتھ میں لیا اور خود سرکنڈوں والے کنارے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔

روشنی گھوڑی کی آنکھوں پر پڑی ہے تو وہ الف ہو گئی اور ہنہنا کر اس نے سوار کو جو اس معیبت کے لئے تیار نہیں تھا گرا دیا۔ میں بھاگ کر آگے آیا اور سوار کو اٹھانے کے لئے جھکا ہوں تو وہ کیسری تھی۔

"روپ سنگھ واپس آگیا ہے کیسری۔" میں نے اسے اٹھاتے ہوئے کہا۔ تم ویر وال سے اسے مل کر آرہی ہو؟"

"ہاں ویر میں اسے مل کر آرہی ہوں۔ روز روز ملنے کے لئے جانے کی مجھے بہت تکلیف ہوتی تھی۔ اس لئے میں اسے اپنے ساتھ ہی لے آئی ہوں۔" اور اس نے پاس کھڑی گھوڑی کی باگ کھینچ کر تھیلے پر ہاتھ رکھا جو کاٹھی کے ساتھ لٹک رہا تھا۔

"مگر وہ ہے کہاں مجھے تو دکھائی نہیں دیتا۔" میں نے ٹارچ جلا کر روشنی ادھر ادھر پھینکی۔

"یہاں۔" اس نے تھیلے پر ہاتھ مارا۔ "یہاں۔"

میں نے کہا "مذاق مت کرو تم کو معلوم ہے میں صرف یہی جاننے گاؤں آیا ہوں۔ تم روپ سنگھ کے ساتھ بیاہ کرو۔ اس کو تمہاری پرواہ ہے کہ نہیں مجھے تو وہ بہت بدلا ہوا لگتا تھا تمہارے ساتھ تو وہ نہیں بدلا۔"

"نہیں وہ نہیں بدل سکتا تھا میں اسے بدلنے کب دیتی بھلا۔ اب وہ بدل ہی نہیں سکتا ویر۔" اور وہ زور زور ہنسنے لگی۔

مجھے خون رگوں میں جمتا ہوا لگا۔ یہ کیسری تھی کیا۔ جو دھیرج سے بات کرتی تھی۔ میں نے اسے بازو سے پکڑ لیا اور سختی سے پوچھا "تم ہنس کیوں رہی ہو آخر اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے۔ میں نے تم سے ہمیشہ ہمدردی کی ہے اور اب جب کہ تم خوش ہو مجھے بتانا بھی نہیں چاہتیں۔"

وہ ایک دم خاموش ہو گئی اور اسی دھیرج سے بولی۔ "ویر زیادہ خوشی آدمی کو پاگل بنا دیتی۔ مگر تم میرے ویر ہو۔ اور تم کو نہ بتاؤں گی تو کسے بتاؤں گی بھلا۔" پھر وہ تھیلے کی ڈوریاں کھولنے لگی۔

"ویر ذرا بتی تو جلاؤ۔ مگر پہلے چادر سے پردہ کر لو۔ کوئی اور نہ دیکھ لے۔"

میں ایک جادو کے اثر میں آئے انسان کی طرح چادر لے کر ہاتھ سے اوٹ کرنے لگا اور جب میں نے چادر کا کونا پکڑے پکڑے دوسرے ہاتھ سے بتی جلائی ہے تو کیسری روپ سنگھ کا سر تھیلے سے نکالے بیٹھی تھی اور ان آنکھوں میں یوں جھانک رہی تھی جیسے پاگل ہو گئی ہو۔

"کیسری تم نے یہ کیا کیا ہے۔" میں نے کانپتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں ویر کچھ نہیں۔ اس کی آواز کی سردی مجھے اپنی کپکپاہٹ کے مقابلے میں بہت عجیب لگی۔ اور پھر سر کو واپس تھیلے میں رکھتے ہوئے بولی۔ "اب میں جاؤں کوئی دیکھ نہ لے۔"

"مگر اسے ساتھ لئے کیوں پھرتی ہو۔" میں نے مستقبل کے خوف کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

اس نے گھوڑی کی باگ ہاتھ میں لی۔ اور تھیلے کو کاٹھی کے ساتھ لٹکاتے ہوئے بولی۔ "اسی کو ساتھ لئے پھرنے کے لئے تو میں نے آج تک گھڑیاں گن گن کر گزاری ہیں ویر اب اسے کیوں پھینک دوں۔"

"مگر کیسری تم پاگل ہوگئی ہو کیا؟" میں نے یونہی کہنے کے لئے کہا۔

"ویر بھلا میں پاگل ہو سکتی ہوں۔ میں کئی دنوں سے سوچ رہی تھی کہ روپ سے کیسے ملا جائے۔ میں نے ان ٹھنڈی راتوں میں نہر کے کنارے اس درخت کے نیچے پوری پوری رات اس کا انتظار کیا ہے۔ اور اب مہینوں کے بعد جب وہ یہ کہنے کے لئے آیا تھا کہ وہ مجھ سے بیاہ نہیں کر سکتا اور میں اسے تنگ نہ کروں۔ میں بھلا اسے واپس کیسے جانے دیتی۔ اب میں اسے دیکھ تو سکوں گی۔ ویرمال کے راستے اب تک مجھے برداشت کرتے رہے تھے۔ اب کیوں میں ساری عمر ان راہوں کے چکر کروں؟"

میں نے اسے بہت کہا "کیسری یہ سر کہیں چھپا دو۔ اس بات کا کسی کو پتہ نہیں ہے تم موت سے بچ جاؤ گی۔ تمہیں قانون کا پتہ نہیں ہے۔ کیا بننے والا ہے؟" مگر اس نے کہا تو صرف یہ کہ "میں قانون سے نہیں ڈرتی۔ اور تم فکر کیوں کرتے ہو۔ میں اسے اتنا چھپا کر رکھوں گی کہ کسی کو کبھی پتہ بھی نہ چل سکے گا۔ لیٹروں کے پوت نے پاگلوں کی طرح جھانک کر اور بہکا کر کے مجھے اپنا دیوانہ بنایا۔ اب میں اسے چھپا کر رکھوں گی اور اکیلے میں دیکھا کروں گی۔"

میں نے روشنی بجھا دی اور خاموش کھڑا رہا۔

وہ پھر بولی "تمہیں پتہ نہیں ویر یہ آنکھیں مجھے کتنی پیاری تھیں۔ یہ ہونٹ کہ میٹھے تھے۔ دانت تو موتیوں کی لڑیاں ہیں۔ ان نگاہوں نے مجھے کتنی کہانیاں سنائی ہیں۔ تمہیں معلوم نہیں ویر مجھے روپ سنگھ کے بنا زندگی کتنی سونی لگتی۔ کیا میں اس کے بغیر جی لیتی؟ اگر اسے دوسری عورت کا بننا پڑتا تو مجھے رنج ہوتا۔ اگر وہاں سے کوئی میم لے آتا تو میں کیا کر لیتی۔ مگر وہ میم نہیں لایا۔ یہاں اس کو لوگوں نے بدل دیا تھا۔ دو مہینوں سے میں اس کی راہوں میں بیٹھی اسے ملنا چاہتی رہی ہوں مگر وہ مجھ سے نہیں ملا۔"

"پھر آج وہ کیسے قابو آیا؟"

"آج" اس نے دھیرے سے کہا۔ "آج اماوس کی رات تھی اور میں نے اس کے پرانے یار کو بھیجا تھا کہ اسے بلا لائے۔"

وہ چپ ہوگئی تو میں نے کہا "کیا اس آدمی نے اسے ساتھ لانے میں تمہاری مدد کی تھی؟" میں نے اپنے اندر کے افسر کو جاگتے ہوئے محسوس کیا۔

وہ ہنس کر بولی "روپ سنگھ جب تک مجھے دیکھ نہیں لیتا تھا اسے چین نہیں آتا تھا اور آج میں نے اسے کہا تھا کہ تمہیں دیکھے بنا میں نہیں جی سکتی۔"

پھر وہ گوندوال کے راہ پر آگے چلی گئی اور آگے چلی گئی۔

آج اس کی اپیل کا فیصلہ تھا۔ میرے سامنے ججمنٹ تھی اور اس کا بایو تھا۔ انصاف تھا اور وہی ترازو تھا جس میں میں نے اس چاندنی رات میں کیسری کے حسن کو تولا تھا۔ اس کے چہرے کی موہنی اور آنکھوں کی اداسی کو جانچا تھا۔ وہ مجھے ویر کہتی تھی اور مجھ پر دوشواش رکھتی تھی۔ اور پھر عدالت میں میری وہ کرسی تھی۔

روپ سنگھ کے بنا کیسری جی نہیں سکتی۔ اور میں اسے تکلیف دینا نہیں چاہتا تھا۔ ان ہونٹوں کی مٹھاس زہر بن گئی۔ اور اس رات روپ سنگھ کی حیرت سے کھلی آنکھوں کی طرح آج کیسری کی آنکھیں بھی حیرت سے فیصلہ سننے کے بعد کھلی ہوئی میری طرف تکتی رہی تھیں۔ اسے اپنے کانوں پر اعتبار نہیں آیا۔ مگر میرے قدم پاتال کی طرف کیوں اٹھ رہے ہیں۔ مگر گر کیوں رہا ہوں اور میرے قدموں میں بار بار وہ نگاہیں کیوں آ رہی ہیں۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ شاید یہ گرمی کا اثر ہے۔

شاہد احمد دہلوی کے لکھے ہوئے خاکے
گنجینۂ گوہر
قیمت ۶ روپے
مشتاق بک ڈپو۔ کراچی

کوثر چاندپوری — ہمدرد صحت۔ کراچی

اے دلِ ناشاد

آندھرا پردیش کے ایک گھنے جنگل میں جاوید فارسٹ کنٹریکٹر کے کیمپ میں بڑی چہل پہل تھی۔ ساگون اور ساج کے اونچے درختوں کے درمیان ایک پرفضا مقام پر جاوید کا خیمہ نصب تھا۔ اس سے ذرا فاصلے پر مزدوروں کی جھونپڑیاں تھیں۔ جن کے سامنے چولھے سلگ رہے تھے کالے رنگ کی عورتیں میلی اور پھٹی ہوئی ساڑیاں باندھے ہنڈیا روٹی کرنے میں مصروف تھیں آس پاس ننگ دھڑنگ بچے کھیل رہے تھے۔ ذرا دور پر پیٹرومیکس کی روشنی میں کوئلے کی بھٹیاں کھولی جارہی تھیں اور بہت سے مزدور کوئلہ ٹرک میں بھر رہے تھے۔ آگے پیچھے کئی ٹرک کھڑے ہوئے تھے بعض بھرے جاچکے تھے۔ گرمی کا زمانہ تھا۔ جون شروع ہوچکا تھا۔ جاوید کوشش کررہا تھا کہ زیادہ سے زیادہ عمارتی اور سوختنی لکڑی جنگل سے نکال کر اسٹیشن پہنچادی جائے۔ اور کوئلہ کا پورا اسٹاک جلد سے جلد نکال لیا جائے۔ جو بھٹیاں ٹھنڈی ہوچکی تھیں انہیں کھول لیا گیا تھا اور جو ابھی اندر ہی اندر دہک رہی تھی۔ وہ بدستور ڈھکی ہوئی تھیں۔ ان سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ ہر طرف سرگرمی اور مصروفیت کا دلچسپ منظر تھا۔
جاوید اپنے کمرے میں بیٹھا حساب کتاب لکھنے میں مشغول تھا۔ کچھ مزدور کوئلے کی کالک میں اَٹے اُس کے قریب بیٹھے بیڑیاں پی رہے تھے جاوید ان سے باتیں بھی کررہا تھا۔ اور رجسٹروں میں کچھ لکھتا بھی جارہا تھا۔ قریب ہی بیٹری سے چلنے والا ریڈیو رکھا تھا۔ جو کئی دن سے بیٹری ڈسچارج ہوجانے کی وجہ سے بند پڑا تھا۔ رام بھروسے میٹ نے اس کی طرف اشارہ کرکے کہا۔

"بابوجی! یہ بولتا کیوں نہیں۔ باجا گاتا بجاتا رہے تو ذرا سندر لگتا ہے۔"

"بیٹری ختم ہوگئی ہے۔ شہر جاکر ری چارج کرائیں گے، پھر یہ خوب گانے لگے گا۔"

"بجتا رہتا ہے تو عورتوں اور بچوں کا جی لگا رہتا ہے۔"

جاوید چپ ہوگیا اور سر جھکا کر لکھنے لگا۔ لکھتے لکھتے دفعتہً اسے ایک ہچکی آئی اور پھر دوسری اور تیسری۔ جاوید نے کوئی دھیان نہ دیا۔ رام بھروسے بول اٹھا۔

"بابوجی! کوئی یاد کررہا ہے۔"

جاوید کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی جیسے رام بھروسے کی بات کو اس نے کوئی اہمیت نہ دی ہو۔ ہچکیاں بند ہوئیں۔ اور آتی ہی چلی گئیں۔ تو جاوید نے رجسٹر بند کردیا۔ اور عینک اتار دی۔ اور اپنی نوکرانی کو پکارا۔

"رام کلی!"

رام کلی اس کی بہت پرانی اور وفادار خادمہ تھی۔ دس سال سے ویران اور غیر آباد مقامات پر اس کا ساتھ دے رہی تھی۔ مدھیہ پردیش کے دیہات کی رہنے والی تھی۔ جاوید کے آرام کا بہت خیال رکھتی تھی۔

"کیا ہے بابو جی؟" — ایک کرخت مگر خلوص بھری آواز گونجی۔

"پانی لاؤ!"

"اور کھانا نہیں؟"

"پہلے پانی پیوں گا!"

وہ گھونٹ گھونٹ پانی پیتا رہا۔ پانی کا ٹھنڈا گھونٹ حلق سے اترتا تو ذرا دیر کو ہچکیاں بند ہو جاتیں۔ مگر پھر آنے لگتیں ـــ رام بھروسے کی بات شعور میں الجھی ہوئی تھی۔

"بابو جی! کوئی یاد کر رہا ہے!"

اور پھر ایک پرانا شعر اسے یاد آگیا۔ جو نہ جانے کب سے لاشعور میں دبا پڑا تھا ـــ

ہچکیاں آتی ہیں کیوں اے دلِ ناشاد مجھے — شاید اس شوخ نے بھولے سے کیا یاد مجھے

اُسے ان شاعرانہ باتوں پر بالکل یقین نہ تھا۔ وہ سائنس کا گریجویٹ تھا۔ ایسی روایات پر بالکل دھیان نہ دیتا تھا۔ زمرد سے سانپ کے اندھا ہو جانے اور ماہتاب کی روشنی میں کتان کے کپڑے کے چاک چاک ہو جانے کی باتیں بھی تو انھیں شاعروں کی بنائی ہوئی ہیں۔ مگر سائنس اور تجربہ دونوں سے ان کی تائید نہیں ہوتی۔ پھر دنیا میں کوئی ایسا شوخ موجود نہ تھا۔ جس کی یاد کے پیغامات ہچکیوں کی شکل میں آتے اور بے تحاشا آتے ہی رہتے۔ رومانس سے اگر کوئی لگاؤ اسے کبھی رہا بھی تھا۔ تو اب باقی نہ تھا۔ جنگلوں کی اس خاموش دنیا میں جہاں انسانی حسن کی جگہ قدرت اپنے حسین روپ میں دکھائی دیتی تھی۔ وہ گوشت و پوست کے اُن تمام مجسموں کو بھول گیا تھا۔ جنہیں دیکھ کر کبھی اس کے جذبات میں رنگین قسم کی گرمیاں پیدا ہو جاتی تھیں۔ سائنٹفک نظریات اور کاروباری زندگی نے ایسی تمام رعنائیوں کو ذہن سے دور دھکیل دیا تھا۔

ہچکیاں لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی گئیں۔ وہ پریشان ہو گیا۔ پورے کیمپ میں سنسنی پھیل گئی۔ مزدوروں کی سرگرمی کم ہو گئی۔ عورتوں کے گیت بے رس ہو گئے۔ اور بچوں کی چیخ پکار مدھم ہو گئی۔ مزدوروں کے ساتھ جاوید کا سلوک بہت اچھا تھا۔ کیمپ میں جتنے لوگ تھے۔ وہ سب ایک کنبہ کی سی زندگی گزار رہے تھے۔ اس کنبہ کا ایک ممبر جاوید تھا۔ جو دوسرے ممبروں کے دکھ درد اور خوشی میں برابر کا شریک تھا۔ تہواروں میں مزدوروں کے ساتھ ناچتا، گاتا، اچھلتا اور کودتا۔ کوئی بیمار ہو جاتا تو اس کی پوری دیکھ بھال کرتا۔ کوئلے کی گرد میں اٹے ہوئے مزدور گھنٹوں اس کے پاس بیٹھ کر باتیں کرتے۔ وہ انھیں ریڈیو پر گانے سناتا۔ بیڑیاں اور سگریٹ پلاتا۔ کسی کو ٹھنڈ لگ جاتی تو چائے اور کافی پلاتا۔ ان کے بچوں کو بھنے ہوئے چنے اور مونگ پھلی تقسیم کرتا۔ اسی وجہ سے مزدور بڑی خوشی سے اس کے ساتھ گرمی اور سردی کے تکلیف دہ موسم گزارتے اور برسات ختم ہوتے ہی ڈلیاں اور کلہاڑیاں لیے اس کے گرد جمع ہو جاتے۔ ساگون کے پتوں کے چھت کے نیچے انھیں بڑا آرام ملتا تھا۔ محبت اور عزت کے لمحات سب ہی کو عزیز ہوتے ہیں۔ خاص طور پر وہ لوگ جو صدیوں پہلے انسانیت کی سطح پر سے دھکیل دیے گئے ہیں۔ اس قسم کے برتاؤ میں زیادہ مٹھاس محسوس کرتے ہیں۔ جاوید کی بیماری نے کنبہ بھر کو اداس بنا دیا۔ عورتوں نے اس دن چکیاں نہ چلائیں۔ اور بچوں نے رات کے دلچسپ کھیلوں کا پروگرام ملتوی کر دیا۔ خیمہ کے اندر بہت سے مزدور جمع ہو گئے۔ انھوں نے مل کر دیہاتی گیت گائے۔ عورتیں ڈھولک بجاتی رہیں دیر تک ناچ بھی ہوا۔ لیکن جاوید کی ہچکیاں بند نہ ہوئیں۔ اگلی صبح تک وہ بالکل نڈھال ہو گیا۔ اور پھر یہ طے ہوا کہ اسے ٹرک میں بٹھا کر پربھنی،

کے اسپتال میں پہنچا دیا جائے۔ سارے کام ایک دم بند ہو گئے۔ کوئلے کی بھٹیاں ضرور اندر ہی اندر سلگتی اور بھبکتی رہیں۔ جو ٹرک کوئلہ بھرنے گئے تھے وہ اسی طرح کھڑے رہے۔ ان میں سے کوئی پورا بھر چکا تھا کوئی آدھا کسی میں سو پچاس ڈلیاں بھی ڈالی گئی تھیں۔ جلدی جلدی ایک ٹرک خالی کر کے اس میں چارپائی ڈالی گئی۔ اور بستر بچھا کر آرام سے جاوید کو لٹا دیا گیا۔ روانگی کے وقت عورتوں کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ بچوں کے چہرے اترے ہوئے تھے۔ ٹرک چلنے لگا۔ تو ایک لڑکے نے ماں کی ساڑی کو جھٹک کر پوچھا۔

"ممی جی! بابو کہاں جا رہے ہیں؟"

"اسپتال" اس نے بہت غمگین آواز میں کہا۔

"کب آئیں گے؟"

"جب بھگوان کی اچھا مرضی ہوگی!"

جاوید نے کیمپ چھوڑ دیا۔ ایک منشی اور چند مزدور اس کے ساتھ گئے۔ ہچکیاں راستے میں بھی آتی رہیں۔ وہ بار بار تھرماس میں سے چائے کا ایک ایک گھونٹ پیتا رہا۔ تین گھنٹے بعد یہ قافلہ شہر پہنچ گیا۔ جاوید نے پہلے ایک ہوٹل میں قیام کیا۔ اور وہیں ڈاکٹر نے اسے دیکھ کر دوا پلائی۔ اور ایک انجکشن بھی لگا دیا۔ جاوید دیر تک سوتا رہا۔ اور جب بیدار ہوا تو ہچکیوں کی وہی کیفیت تھی۔ اس درمیان میں پرائیوٹ وارڈ کا انتظام ہو چکا تھا۔ جاوید کو ٹیکسی میں بٹھا کر اسپتال پہنچا دیا گیا۔ اس نے وارڈ کے دروازے پہ کھڑے ہو کر ماحول پر ایک سرسری نظر ڈالی۔ اور پھر باہر لان میں جا کھڑا ہوا۔

"میں ذرا دیر یہیں کھڑا ہوں، جب تک تم لوگ سب چیزیں ٹھیک طور پہ جما دو۔"

جاوید دھیرے دھیرے ٹہلتا رہا۔ ہچکیاں آتی رہیں۔ اسی حالت میں میں کبھی کبھی وہ شعر کو گنگنانے لگتا۔ ٹہلتے ٹہلتے جاوید جنرل وارڈ کی طرف چلا گیا۔ وہاں کا عالم بہت عجیب تھا۔ بہت سے بیمار زمین پہ پڑے ایڑیاں رگڑ رہے تھے، بعض پلنگ چھوڑ کر باہر نکل آئے تھے کسی کے سر پہ پٹی بندھی ہوئی تھی۔ کوئی اسپویٹ سامنے رکھے کھانس رہا تھا ایک شخص کی فیمرل بون ٹوٹ گئی تھی۔ ہڈی کو ریڈیوس کرنے کے لیے اس کے پاؤں میں کئی پونڈ کا وزن باندھا گیا۔ جس میں کئی دن سے روزانہ اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ بری طرح سے چیخ رہا تھا۔ نرسیں اپنا مخصوص سفید لباس پہنے ادھر سے ادھر گھوم رہی تھیں، کبھی کوئی ڈاکٹر بڑا رانہ گزرتا گزر رہا تھا۔ ذرا فاصلہ پہ آپریشن تھیٹر کے سامنے کئی آدمی حیران و پریشان کھڑے تھے۔ ایک طرف ایک لاش پوسٹ مارٹم کے لیے رکی ہوئی تھی۔ جاوید بڑے غور سے ان دردناک مناظر کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے احساس میں جگہ جگہ ہمدردی کی گدگدی اٹھ رہی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا۔ کہ ان میں سے ہر مریض کو اتنے پیسے دے ڈالے۔ کہ وہ سب پرائیوٹ وارڈ میں داخل ہو جائیں۔ ہچکیوں کی آواز دور تک جانے لگی تھی۔ ایک دم ایک لڑکا جس کے پورے ہاتھ پہ پلاسٹر چڑھا ہوا تھا، اس کے قریب آیا اور دھیمی آواز میں بولا۔

"بھائی جان"

جاوید نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔ اور غور کرنے لگا۔ یہ کون ہو سکتا ہے۔

"بھائی جان!" وہ پھر بولا۔ "آپ نے مجھے پہچانا نہیں، میرا نام رشید احمد ہے۔ مجھے معلوم تھا آپ اسی ضلع میں ہیں۔ آپ کی تصویر چند روز پہلے میں نے بھابی سلمہ کے پاس دیکھی تھی۔ نہ بھی دیکھتا تو بھی آپ کو ضرور پہچان لیتا۔"

"اوہ! رشید تم کتنے بدل گئے۔ اور تم یہاں کہاں؟"

ٹوٹ گئیں۔ اور ہنسلی کی ہڈی میں کریک آگیا۔ جب سے یہاں آیا ہوں۔ برابر آپ کو یاد کرکے رونا رہا ہوں۔ مگر پتہ بھول گیا تھا۔ آپ کو بلا نہ سکا۔ آپ خود ہی آگئے۔ میں کتنا خوش نصیب ہوں۔"

جاوید نے آگے بڑھ کر رشید کو گلے لگالیا۔ اس کی حالت دیکھ کر وہ بہت متاثر ہوا۔ دل پگھل کر پانی ہوگیا۔ رشید اس کا ماموں زاد بھائی تھا جاوید اس کی ذہانت کے باعث اُسے کافی عزیز رکھتا تھا۔ اب تو کئی سال سے دیکھا ہی نہ تھا۔

"تم نے مجھے اطلاع کیوں نہیں دی۔"

"بھائی جان میں کہہ رہا ہوں۔ پتہ بالکل یاد نہ تھا۔ گھر بھی کسی کو خبر نہیں کر سکا۔ میں لکھ ہی نہیں سکتا۔"

"آؤ میرے ساتھ!"

"ڈاکٹر سے پوچھ لوں۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔"

جاوید تیزی سے اپنے وارڈ کی طرف چلا۔ رشید اس کے ساتھ تھا۔ اور جب وہ وارڈ کے سامنے پہنچا ہے، اسے خیال آیا۔ اب ہچکیاں نہیں آرہیں۔ کیا بند ہوگئیں،

"رام بھروسے! مجھے آرام ہوگیا۔ ہچکیاں آپ ہی آپ بند ہوگئیں۔ اب یہاں رشید رہیں گے۔"

رام بھروسے نے جاوید پر ایک بھرپور نظر ڈالی۔ ہچکیوں کی آواز پر کان لگائے، اُسے کچھ سنائی نہ دیا۔

"مولا داد۔ بابو جی تو بھلے چنگے ہیں!"

مولا داد ننگے پاؤں اپنی چگی داڑھی کو کھجاتا ہوا دوڑا۔

"سچ تو کہہ رہے ہو رام بھروسے!"

جاوید نے رشید کو اپنے بستر پر لٹا دیا۔ رشید کا زخمی ہاتھ جو بالکل سن تھا۔ اب وہ اس میں چیونٹیاں سی رینگتی محسوس کرنے لگا۔ ہڈی تو اتنی دیر میں جُڑ نہیں سکتی۔ البتہ خون ضرور دوڑ رہا تھا۔ یا پھر جاوید کی برادرانہ محبت "قوتِ بازو" بن کر رگوں میں مچل رہی تھی۔

ناشر .. .. شمس زبیری

سرورق .. .. اختر ہلال زبیری

کتابت .. .. محی الدین صابر

طباعت .. .. انٹرنیشنل پریس کراچی

اشاعت مارچ سنہ ۱۹۶۵ء

مقامِ اشاعت:

کاشانۂ اردو ۲/۱۰۔ اکبر روڈ۔ صدر کراچی ۳

ش کراچی

شش کمار شاد

شمع دہلی۔

دلیوی

شہاب جب ہسپتال سے نکلا تو سب سے پہلا خیال اسے یہ آیا کہ پہلے بیوی سے ملنے دوسرے ہسپتال میں جائے جہاں وہ زچہ خانے
اس کا انتظار کر رہی ہوگی یا اس مہربان دوست سے ملے جس نے اپنی سفارش سے اس کو ہسپتال میں داخل کرایا تھا۔ اپنڈکس کا آپریشن کامیاب
تھا۔ مگر شہاب کا صرف جسم صحت یاب ہوا تھا۔ دل و دماغ کا عالم وہی تھا۔ اپنڈکس کے آپریشن وغیرہ کے چکر میں بھلا وہ کہاں پڑنے والا تھا یہ
ونود کی ضد اور مہربانی تھی جس نے اسے ہسپتال تک پہنچا دیا تھا۔

شہاب اور ڈاکٹر ونود کا یوں کوئی جوڑ بھی نہ تھا۔ کہاں شہاب، ایک شاعر جو اپنے جلو میں اردو شاعری کی جملہ روایات لئے پھرتا تھا اور جو غیر شاعر
اج لے لئے گویا اجنبی تھا، اور کہاں ونود جو میڈیکل کالج میں لکچرر تھا۔ ایک کا پیشہ شاعری اور دوسرے کا پیشہ ڈاکٹری۔ ایک غریب اور دوسرا امیر۔ پھر یہ کہ ونود کو
ر شاعری سے بھی کوئی شغف نہ تھا۔ بس پچھلے کچھ دنوں سے اس نے شعر و ادب سے نمائشی ذوق پیدا کر لیا تھا۔ وہ بھی اس لئے کہ شہر میں ایک کامیاب
شاعرہ ہوا تھا جس میں ڈاکٹر ونود کو مہمان خصوصی اس لئے بنایا گیا تھا کہ بیرونی شعراء کے نذرانوں کی رقم کے لئے فنڈ جمع کرنے کی ذمہ داری اس نے اپنے
ر لے لی تھی۔ اسے کتنے نے نہیں کاٹا تھا کہ ایسی خواہ مخواہ کی ذمہ داریاں لیتا پھرتا۔ دراصل ایک میڈیکل اسٹوڈنٹ، اوشا دیوی کے ایک ادنیٰ سے اشارے
ونود کو اس جنجال میں ڈالا تھا۔ اور اوشا دیوی وہ ہستی تھی جس کے اشارے پر ڈاکٹر ونود مال تو کیا جان بھی دے سکتا تھا۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اوشا
اہتی تھی کہ جب ونود کو کسی پری رخ عورت سے دلچسپی ہے تو اس کو شاعری سے بھی دلچسپی ہونی چاہئے۔ کیونکہ شاعری ہی وہ چیز ہے جو مرد کے اندر عورت
بھرپور شعور پیدا کرتی ہے۔

ڈاکٹر ونود نے مشاعرے میں بڑھ چڑھ کے دلچسپی لی۔ اسی مشاعرے میں ایک مقامی شاعر شہاب نے بھی ایک طنزیہ نظم پڑھی۔ نظم کا ہر شعر ایک نشتر
ا۔ خوب خوب داد ملی۔ ڈاکٹر ونود کے دل پر بھی اس کا سکہ بیٹھ گیا۔ اس نے شہاب کو ایک اہم آدمی سمجھ کر فوراً اپنی کوٹھی پر مدعو کر لیا۔ کیونکہ اس کو ایک خیال یہ بھی
۔ راکہ کسی اہم آدمی کو مدعو کرنے سے اپنی اہمیت بھی بڑھے گی۔

اس طرح دونوں میں ایک رسمی تعلق سا پیدا ہو گیا۔ یہ تعلق زیادہ تر تو دُور دُور کے سلام تک ہی رہا۔ مگر شہاب کو چونکہ فرصت زیادہ رہتی تھی
ں لئے وہ گاہے گاہے کچھ دیر کے لئے اپنے اس نوگرفتار مداح کے گھر بھی چلا جاتا۔ موقعہ پاکر کچھ اشعار بھی سناتا جس کی خوب داد ملتی۔ کوئی کوئی شعر ڈاکٹر
نود کے حسب حال ہوتا تو اسے وہ اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیتا اور اوشا دیوی کو سنایا کرتا۔ شہاب کو اوشا دیوی کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ کیوں کہ ڈاکٹر ونود
نے بڑی سختی سے اپنی پرستاری کو صیغۂ راز میں رکھ چھوڑا تھا۔

اسی آمد و رفت کے دوران میں ایک دن ڈاکٹر ونود پر شہاب کے اپینڈکس کا انکشاف ہوا تو اس نے کہہ سنکر آپریشن کے لئے شہاب کو ہسپتال
ں داخل کرا دیا۔ اور آج وہ ہسپتال سے ڈسچارج ہوکر باہر نکلا تھا۔ چونکہ ڈاکٹر ونود کی ہمدردی اور خوش اخلاقی سے وہ بہت متاثر تھا اس لئے دل نے
صلہ کیا کہ سب سے پہلے چل کے اسی کا شکریہ ادا کیا جائے، یوں بھی بیوی کے پاس فوراً پہنچنا کچھ ضروری نہیں تھا۔ کیونکہ شاعری کی برکت سے بیوی
رکھوالی کا زیادہ تر بار اس کے میکے والوں ہی کے سر تھا۔

ڈاکٹر ونود کے گھر سے شہاب کو واپس لوٹنا پڑا۔ معلوم ہوا کہ وہ کچھ دنوں کے لئے کہیں باہر چلا گیا تھا۔ اس سے زیادہ نہ شہاب نے پوچھا اور
اس کی ضرورت سمجھی۔ گرمیوں کا آغاز تھا کچھ دیر پنکھے کی ہوا کھاتا رہا، پھر اٹھ کے چلا آیا۔ بیوی سے ملنے گیا تو وہ نہایت خوش و خرم تھی۔ اسے اس بات کا
ئی شکوہ نہ تھا کہ اس کی غیر حاضری میں اسے زچہ خانے کا رخ کرنا پڑا تھا۔ وہ بڑے خلوص سے اپنے آپا اور بھیا کے گن گاتی رہی، اور جب وہ چلنے لگا
بیوی نے تکیہ کے نیچے سے دس روپے کا ایک نوٹ نکال کر اس کی جیب میں رکھ دیا۔ جسے اس نے شکریہ کے ساتھ قبول کر لیا۔

شہاب نے ڈرتے ڈرتے پوچھا "کسی رسالے کا کوئی منی آرڈر یا خط؟"

"ایک خط آیا ہے، ایک منی آرڈر بھی، مگر کسی رسالے والے کا نہیں۔ رسالے والوں کا نام نہ لیا کیجئے میرے سامنے۔ ان کے تو خط ہی آتے دیکھے ہیں،
بھی کوئی منی آرڈر آتا بھی ہو تو آپ ڈاک خانے پہنچ کے وصول کر لیتے ہوں گے۔" بیوی نے اپنی پرانی شکایت کا اعادہ کیا کہ اس کے شوہر کو خانہ خراب بنانے
ں رسالے والوں ہی کا زیادہ ہاتھ تھا۔

منی آرڈر کی بات سنکر شہاب کے چہرے پر چمک سی آگئی۔ ہسپتال سے نکلنے کے بعد اس کے چہرے پر صحت کی یہ پہلی علامت ظاہر ہوئی۔ اس نے
ن ان سنی کر کے اپنے مطلب کی بات پوچھی۔

"کتنے کا منی آرڈر ہے؟"

"ہے نہیں، تھا۔"

"کیا مطلب۔ واپس کر دیا گیا؟" شہاب نے بے چین ہوکر پوچھا۔

"اپنے گھر سے ملک الموت تو واپس جا سکتا ہے۔ مگر منی آرڈر کبھی واپس نہیں جا سکتا۔ میرا مطلب ہے پورے سو کا منی آرڈر تھا۔ پچاس تو خرچ ہو گئے،
قی پچاس کی بھی خیر نہیں۔ بس یہاں سے چلنے کی دیر ہے۔"

ایک سو روپے کا منی آرڈر زندگی میں پہلی بار شہاب کے نام آیا تھا۔ اسے اس بات کا غم نہیں ہوا کہ پچاس روپے بیوی نے خرچ کر دیئے تھے، بلکہ خوشی
ں بات کی ہوئی کہ پچاس روپے باقی تھے۔ اور مزید خوشی اس بات کی کہ سو روپے کے منی آرڈر نے بیوی کی نظروں میں کچھ تو اس کی اہمیت بڑھا دی۔

مگر وہ فرشتہ رحمت ہے کون؟ شہاب نے اشتیاق ظاہر کیا۔

"کوئی ڈاکٹر ونود ہے۔ نینی تال بلایا ہے آپ کو۔ کسی ہوٹل کا پتہ دیا ہے۔"

"خط کہاں رکھا ہے؟"

"الگ سے کوئی خط نہیں۔ منی آرڈر فارم کے کوپن پر بس دو ڈھائی سطریں لکھی ہیں۔"

شہاب کا دل ممنونیت کے بوجھ تلے دب گیا۔

شہاب نینی تال پہنچا تو ہوٹل میں ڈاکٹر ونود تنہا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ اوشا دیوی بھی تھی، جس کو وہ جانتا پہچانتا نہیں تھا۔ دونوں بڑے ہشاش
بشاش موڈ میں شغل کر رہے تھے۔ شہاب کو پہلی بار معلوم ہوا کہ ڈاکٹر ونود کو شراب سے بھی دلچسپی تھی۔

سکا تھا۔"

"کوئی بات نہیں۔" شہاب نے کہا، "یہی کیا کم ہے جو آپ نے یاد رکھا اور نینی تال تک نوازنے کی عنایت کی۔"

پھر ڈاکٹر ونود نے تعارف کرایا۔ "یہ ہیں اپنے شہاب صاحب۔ بہت اچھے شاعر۔"

33495
15.6.76

"جانتی ہوں، مشاعروں میں دو تین بار انہیں سن چکی ہوں۔"

"شکریہ۔" شہاب کے مونہہ سے نکلا۔

"اور یہ ہیں اوشا دیوی۔ میڈیکل اسٹوڈنٹ۔ بس آگے نہ پوچھئے۔"

شہاب نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھانا چاہا۔ مگر اوشا دیوی نے ہاتھ جوڑنے ہی پر اکتفا کیا۔ اوشا دیوی نے کسی اشتیاق کا اظہار نہیں کیا۔ ذرا دیر کی رسمی گفتگو کے بعد شہاب نے شغل میں ساتھ دیتے ہوئے ڈاکٹر ونود سے پوچھا۔ "گرل فرینڈ ہیں یا منگیتر؟"

ونود اور اوشا دونوں کی نگاہیں ایک ساتھ شہاب کے چہرے پر اٹھیں۔ ونود کی نظر میں برا مان جانے والی کیفیت تھی اور اوشا کی آنکھوں میں چمک۔

ونود نے جواب دیئے بغیر اپنے گلاس کے آخری دو تین گھونٹ لئے۔ اور پھر فلسفیانہ سنجیدگی سے کہنے لگا۔ "شہاب صاحب، آپ کے سوال سے مجھے دکھ پہنچا۔ مگر آپ پر کوئی الزام نہیں آتا۔ کیوں کہ آپ کو میرے اور ان کے تعلقات کا کوئی علم نہیں۔ در اصل کسی لڑکی کو ساتھ دیکھ کر آپ کے ذہن میں گرل فرینڈ یا منگیتر کے سوا کچھ اور آ ہی نہیں سکتا۔ جب کہ میرے اور ان کے تعلقات کی بنیاد ہی پاکیزگی پر ہے۔ میں ان کو دیوی سمجھتا ہوں۔ ان کی پوجا کرتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ دیوی اور پجاری کے درمیان جسم یا جسمانی باتوں کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں ڈاکٹر ہوں۔ جسم میں میرے لئے کوئی کشش نہیں۔ میں جسم کو لاش سے علاوہ کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ اور لاشوں سے میں رات دن کھیلتا رہتا ہوں۔ میں تو جسم کے اندر چھپی ہوئی اس شے کا پرستار ہوں جس کو میری انگلیاں چھو نہیں سکتیں۔"

شہاب کی نگاہیں ونود کے چہرے پر اور اوشا کی نگاہیں شہاب کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ ونود ان دونوں کی نگاہوں سے بے خبر کہتا رہا "گرل فرینڈ یا منگیتر کا تعلق جسمانی ہے۔ ہم دونوں اس سے بلند ہیں۔ اور اسی بنیاد پر ہم نے سمجھوتہ بھی کرلیا ہے۔ آپ کو یہاں آنے کی زحمت میں نے اس لئے دی ہے کہ آپ ہم دونوں پر ایک شاہکار نظم لکھ دیں، پجاری پر کم دیوی پر زیادہ۔" یہ کہتے ہوئے ونود نے اوشا پر نظر ڈالی اور اوشا نے مسکرانے کی ناکام کوشش کی۔ ونود کی باتیں جاری رہیں۔ "میں اپنی بات تو یوں ہی کہہ رہا ہوں، در اصل میری خواہش ہے کہ آپ ان کو شعر کے قالب میں ڈھال دیں۔ آپ انہیں دیکھ لیں، سمجھ لیں۔ پرکھ لیں۔"

بے چارہ شہاب بت بنا اس کی باتیں بھی سن رہا تھا اور یہ بھی سوچتا جاتا تھا کہ دنیا آج بھی ایسے رشیوں منیوں سے خالی نہیں جن کی خالص روحانیت کو شراب اور عورت کی یکجائی بھی متاثر نہیں کرسکتی۔ شہاب کی نظر میں ان دونوں کے لئے ایک مقدس احترام پیدا ہو چلا تھا۔

ونود نے ذرا توقف کرکے کہا۔ "دیکھنا یہ ہے کہ آپ کی نظم ان سے بڑھ جاتی ہے یا یہ آپ کی نظم پر بھاری رہتی ہیں۔"

اب تو شہاب کو بولنا ہی پڑا۔ "آپ آزمائش میں نہ ڈالئے، میرا فن جتنا عظیم ہے، میں خود اتنا ہی حقیر ہوں۔ میں تو صرف یہ کہنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ شاعری نے عورت سے جنم لیا ہے، عورت نے شاعری سے نہیں۔"

ونود پھڑک اٹھا۔ "جی چاہتا ہے مونہہ چوم لوں آپ کا۔ میری طرف سے ایک بات اور بڑھا دیجئے کہ جس عورت سے شاعری جنم لیتی ہے وہ دیوی بن جاتی ہے۔ یہ وہی دیوی ہیں۔"

شہاب نے اوشا کو دیکھا تو وہ واقعی مندر میں رکھی ہوئی سجی سجائی مورتی نظر آرہی تھی، پتھر کی مورتی۔ دیوی۔ ونود نے گھڑی دیکھ کر تینوں گلاسوں میں

آخری پیگ ڈھالتے ہوئے معذرت خواہی کے انداز میں کہا "میں آپ دونوں سے معافی چاہتے ہوئے کچھ دیر کے لئے اجازت چاہتا ہوں۔ مجھے اپنے ایک بیمار رشتہ دار سے ملنے جانا ہے۔ بے چارے انتظار کر رہے ہوں گے۔ ایک گھنٹے تک آجاؤں گا۔ اس وقت تک آپ دونوں باتیں کریں۔ چاہیں تو کچھ اور منگا لیں۔"

اوشا اور شہاب اس طرح خاموش رہے جیسے انہیں اس سلسلے میں کچھ کہنا نہ ہو۔ ذرا سی تلچھٹ بوتل میں رہ گئی تھی۔ اوشا نے اسے بھی اپنے گلاس میں انڈیل لیا۔ اس موڈ اور ماحول کے باوجود اوشا دیوی کے چہرے پر فرشتوں کی سی معصومیت اس کے دل اور جذبات کی پاکیزگی کا پتہ دے رہی تھی۔

دلنود کے جانے کے بعد شہاب کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اوشا دیوی سے کیا بات کرے۔ اوشا کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی اس طرح چپ چاپ بیٹھے رہنا شہاب کو کچھ عجیب سا لگا۔ اس نے یوں ہی ایک بات چھیڑی "اوشا دیوی، آپ واقعی دیوی ہیں۔ آپ جیسی دیویاں قابل قدر ہیں۔" اوشا نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھیں جل تھل ہوگئیں۔ شہاب کو کچھ حیرت اور کچھ الجھن ہوئی۔ "ارے آپ تو رو پڑیں، آخر ایسی کیا بات ہوئی؟"

اوشا بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگی۔ "روؤں نہیں تو کیا کروں۔ ڈاکٹر دلنود تو مجھے دیوی سمجھتے ہی ہیں، آپ بھی مجھے دیوی ہی سمجھنے لگے۔ حالانکہ میں عورت ہوں۔ دیوی تو مٹی اور پتھر کی بے جان مورت کو کہتے ہیں۔ جو مندروں میں رکھی ہوتی ہے۔ جب کہ میں گوشت پوست والا دھڑکتا ہوا جسم ہوں اور اس جسم کے مطالبے بھی ہوتے ہیں۔ میں ڈاکٹر دلنود کو نینی تال اس لئے لائی تھی کہ شاید وہ میرے اندر چھپی ہوئی عورت کو پہچان سکے۔ مگر وہ یہاں بھی مجھے دیوی ہی سمجھ رہا ہے۔ ایک عورت کی اس سے بڑی بدنصیبی کیا ہو سکتی ہے!"

شہاب کو اس پر ترس آگیا۔ "مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔" "میں چاہتی ہوں کہ آپ ایک ایسی نظم لکھ دیجیے جو مجھے دیوی سے عورت بنا دینے میں اپنی پوجا کرانا نہیں چاہتی۔ میں چاہتی ہوں کہ ...."

شہاب نے اس کی بات کاٹ دی۔ "میں سمجھ گیا کہ آپ کیا چاہتی ہیں۔"

اوشا دونوں ہاتھوں میں مونہہ چھپا کر رو پڑی۔

ذکرِ سعید

سوانح عمری جناب مولوی سعید احمد صاحب زبیری

بانی :- شعیب محمدیہ کالج۔ صغریٰ فاطمہ نسواں اسکول
مدرسہ محمدیہ۔ انجمن محمدیہ وغیرہ آگرہ۔

مصنف :- امرائے ہنود • آثار اکبری • مرقع اکبرآباد وغیرہ

مولفہ :- محمد حسین خان زبیری۔ قیمت ۲ روپے

ملنے کا پتہ :- مشتاق بک ڈپو شلٹان روڈ۔ کراچی

آصفہ مجیب
جامعہ دہلی

نقشِ ناتمام

کہتے ہیں انسان سب کچھ بھول جاتا ہے۔ اگر یہ صفت نہ ہوتی تو زندگی اجیرن ہو جاتی۔ آئے دن ہزاروں باتیں پیش آتی ہیں۔ دل شکن واقعات اور حادثات گزر جاتے ہیں۔ ایک دلِ ناتواں اتنا بوجھ کیسے سہارے، سینہ ہی شق ہو جائے۔ بڑے بڑے زخم کاری بھی آہستہ آہستہ مندمل ہونے لگتے ہیں جیسے معلوم ہوتا ہے کچھ ہوا ہی نہیں۔

مگر کہاں؟ بھول جانا کوئی آسان کام ہے؟ دل کا خون ہوتا ہے، داغ پڑ جاتے ہیں، گہرے غار اور لکیریں، وہ کون جانے گزرے ہوئے واقعات اپنا ان مٹ نقش چھوڑ جاتے ہیں۔ نوعیت الگ الگ ہوتی ہے کچھ سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ کسی کی یاد متاعِ عزیز کی طرح سینہ سے لگائے رکھتا ہے، گویا وہی زندگی کا سہارا ہے۔ اور اسی میں روح کی تسکین کا ساز و سامان ہے اور کچھ ایسے کہ بھلانا چاہیے پر نہیں بھولتا۔ تیر نیم کش کی سی خلش ہوتی ہی رہتی ہے۔

گھر میں ایک تقریب کی گھماگھمی میں ان دونوں کی ملاقات ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں نہ معلوم کونسا جادو تھا کہ فرزانہ بے اختیار ادھر کھنچ گئی۔ نکہت کا رنگ کندن کی طرح دمک رہا تھا۔ ہونٹوں پر دلفریب مسکراہٹ، لانبے گھنے بال، آواز میں ساز کے تاروں کی سی جھنکار، دونوں ذرا دیر میں گھل مل گئیں۔

نکہت نانی کے، سامنے اپنے ماموں کے یہاں تعلیم کی غرض سے آئی ہوئی تھی۔ ان کا گھر بالکل قریب تھا۔ بس ایک گلی بیچ۔ کچھ دور کی رشتہ داری بھی تھی۔ مگر جیسے لڑکیوں پر بڑی بوڑھیوں کی کڑی نظر رہتی تھی۔ یہ نہیں کہ اونٹ کی طرح گردن اٹھائی اور جہاں جی چاہا چل دیں۔ نکہت کبھی فرزانہ کے گھر آتی تو نانی۔ خالہ یا ممانی ضرور ساتھ ہوتیں۔ کچھ خاندانی روایات تھیں میل جول کے خاص قاعدے اور آداب مقرر تھے۔ جن سے قدم اٹھانا کفر تھا۔ کہیں جانا ہوتا تو بڑوں سے اجازت لینا ضروری تھا۔ لڑکیاں تو درکنار بڑے اپنے بڑوں سے اجازت طلب کرتے ہیں۔ اور بغیر مشورہ کے کچھ نہ کرتے وہ زمانے ہی لد گئے۔ کبھی فرزانہ کی دعوت نکہت کے یہاں ہوتی یا تقریب ہو ... مگر فرزانہ کو نکہت بہت پسند تھی۔ کبھی وہ اس کی صورت کو چاند سے تشبیہ دیتی۔ کبھی زلف آبدار پر لوٹ پوٹ ہو جاتی۔ اس سے گانا سنا کرتی۔

ایک دن سب سہیلیوں نے مل کر ایک ڈرامہ کیا۔ نکہت ساڑی باندھے۔ بال کھولے اسٹیج پر آئی اور گانا شروع کیا۔

نہ کچھ شوخی چلی بادِ صبا کی   بگڑنے میں بھی زلف اُسکی بنا کی

یوں تو لڑکوں کو وہاں آنے کی اجازت نہیں تھی۔ لڑکیاں سمجھ رہی تھیں یہاں پرندہ پر نہیں مار سکتا۔ مگر اس وقت فرزانہ کے بھائی جمّو میاں خدا جانے کیسے پہنچ گئے۔ کچھ کھلبلی سی پڑ گئی۔ فرزانہ نے کہا۔ "اللہ بھیا آپ، چلے جائیے۔ یہ لوگ کہیں گی میں نے ہی بلایا۔"

ان کی نظریں دلچسپ سین پر جم گئیں مسکرا کر بولے۔

"مجھے کیا خبر تھی۔ کہ یہاں یہ سوانگ رچایا جا رہا ہے۔ آخر ہمارے دیکھنے میں ہرج کیا ہے ہم کیوں نہ دیکھیں؟"

کسی نے حجت نہیں کی، سب ہی ان کو مانتی تھیں، بھیا بھیا کہتی تھیں۔ سین جاری رہا۔ جمّو میاں لڑکیوں کی نظروں میں اپنا بھرم قائم رکھنے اور پاس وضع سے ذرا ہی سی دیر ٹھہرے۔ تحسین آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے سر ہلا کر داد دی۔ اور چلے گئے۔ بعد میں تعریف کر کے سب کی بے حد ہمت افزائی کی۔ ایکٹنگ کو سراہا۔ کبھی چاندنی رات میں دریا کے کنارے یا کسی باغ میں سیر و تفریح کا پروگرام بنتا۔ بیت بازی کی محفل جمتی۔

موسم خوشگوار تھا۔ شام کا وقت، دھوپ نے سر سبز سونا بکھیر دیا تھا۔ پت جھڑ کے بعد سرس اور بکائن میں نئی نئی، ہری ہری کونپلیں پھوٹ آئی تھیں۔ سرسبز شاخوں پر سنہری کرنوں کا رقص تھا۔ موتیا اور نواڑیہ کی تازہ کلیاں چٹک کر عطر کے قرابے لنڈھا رہی تھیں۔ وہ دونوں سبزوں پر بے تکلفی سے میٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ دلوں میں نئی اور پاکیزہ امنگوں کا ایک سیل آتش رواں اور دواں تھا۔ فرزانہ نے سنا کہ نکہت کا کہیں سے پیغام آیا ہے، اس نے بھید رازداری سے پوچھا۔ "اے نکہت۔ ایک بات پوچھوں ..... تم نے انھیں دیکھا بھی ہے ..... کیا تم کو پسند ہیں؟"

نکہت کا چہرہ شرم سے لالہ گوں ہو گیا۔ اُس نے منہ چھپا لیا۔ پھر فرزانہ کے پیچھے پڑنے سے وہ بڑے فلسفیانہ انداز سے بولی! "اونہہ، میری پسند نا پسند کیا۔ تم بھی کیا باتیں کرتی ہو..... فرزانہ! اس میں ماں باپ زیادہ بہتر سمجھتے ہیں۔ لڑکی کی طبیعت اور پسند کا بھی تو ان کو اندازہ ہوتا ہے ...!" فرزانہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور غور کرتے ہوئے کہا۔

"تم تو بڑی عالمانہ گفتگو کرنے لگی ہو..... مگر میں سمجھتی ہوں کہ دونوں میں محبت ضروری ہے۔ ورنہ زندگی کا مزہ نہیں۔ ذرا دیکھ بھال کے اس کوچہ میں قدم رکھنا چاہیے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ دونوں لیلیٰ اور مجنوں ہو جائیں۔"

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "ہاں اور کیا..."

پھر اس موضوع پر تبادلۂ خیالات شروع ہوا۔ آنے والی زندگی کا ایک نہایت حسین دلکش خاکہ مرتب کیا گیا۔ نقشہ میں اپنی اپنی پسند سے رنگ بھرا جانے لگا۔ جس میں رہائش، مکان کی آرائش، لباس، زیب و زینت، یہاں تک کہ غذا، سیر و سیاحت سبھی کچھ شامل تھا۔ دبی زبان سے در پردہ کچھ بچوں کا ذکر خیر بھی آ گیا۔ جو بہت حسین، خوشگفتہ پھول کی طرح ہونے چاہئیں، ذہین ہوں، مناسب تعداد کا لحاظ بے حد ضروری تھا۔ بیکار آبادی میں اضافے سے تو کوئی فائدہ نہیں، بات اور آگے بڑھی تو سہیلیوں نے چھیڑ چھاڑ میں ان کے خیالی منصوبوں میں اور حاشیہ لگایا۔ ان دونوں بچوں میں سے ایک ایک کی منگنی بھی ٹھہرا دی۔ اور دوستی کی گویا مہر لگا دی۔ سمدھن کا رشتہ قائم کیا گیا۔ اور خوب ہنسی قہقہوں کا جوش خروش رہا۔

ایک دن نکہت کالج سے واپسی پر خلاف معمول رکشا فرزانہ کے یہاں روک کر اتر پڑی۔ اس کی آنکھیں سوجی سی تھیں۔

اور لال۔ معلوم ہوتا تھا۔ کہ روئی ہے۔ وہ سیدھی فرزانہ کے کمرے میں چلی گئی۔ فرزانہ بڑے انہماک سے امتحان کی تیاری میں مصروف تھی۔ پڑھائی میں محو۔ نکہت نے اپنی کتابیں ایک طرف بے دلی سے ڈالتے ہوئے روہانسی آواز میں کہا۔

"اور کچھ سنا فرّو ..... ماموں جان کا تبادلہ ہوگیا ہے ..... اب نانی اماں۔ خالہ جان اور میں گھر چلی جاؤں گی۔ صرف ماموں جان، ممانی جان اور بچّے وہاں جائیں گے۔

فرزانہ کو ایسا معلوم ہوا کہ بم کا گولہ پھٹ گیا۔ ہڑبڑا کر کتاب جو ہاتھ میں تھی دور پٹخ دی۔ اور نکہت کے پاس آگئی۔ جو آنچل سے آنسو پونچھ رہی تھی۔ اس نے سسکی بھر کر کہا۔

"میں تم سے چھوٹ جاؤں گی ..... اور میری تعلیم کا کیا ہوگا؟"

فرزانہ نے گلے میں باہیں ڈال دیں، آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ وہ نکہت کے آنسو پونچھتے ہوئے بہت متفکرانہ انداز سے بولی۔

"سچ بات یہ ہے نکّو، مجھ سے تو تمہارے بغیر نہیں رہا جائے گا یہاں ....."

"میں تو تمہیں اپنے گھر لے چلتی۔ مگر گاؤں میں تم کیسے رہ سکتی ہو؟ عجیب گھٹا ہوا ماحول ہے۔ پردے کی قید الگ۔ تمہارا جی نہیں لگے گا۔ اور یہاں اتنے دن رہنے کے بعد تو اب مجھ سے بھی نہیں رہا جائے گا۔ مگر مجبوری کا نام صبر ہے اگر تم بھی ہوتیں تو جنگل میں منگل کا مزہ آجاتا۔ یہ بھی نہیں ہوسکتا۔

فرزانہ نے جوش سے کہا۔ "یہ اسکیم بالکل غلط ہے۔ تم کو یہاں سے بالکل ہرگز نہیں جانا چاہیے، پڑھائی برباد ہو جائے گی سب کو یہ سوچنا چاہیئے۔ اس سے تو اچھا ہے کہ تم میرے یہاں رہ جاؤ۔ اپنی تعلیم پوری کرلو۔ یہ کیا اندھیر ہے کہ سب چھوڑ چھاڑ کر گاؤں میں جا پڑو۔"

"بس یہی کرسکتی ہوں کہ پرائیویٹ امتحان دوں اور کیا صورت ہے۔"

"نہیں تم پریشان نہ ہو۔ میں کوشش کروں گی۔ کہ تمہیں میرے ساتھ رکھا جائے پھر دیکھا جائے گا۔"

فرزانہ نے تعلیم کی غرض سے نکہت کو اپنے پاس رکھنے کی بہت زوردار اپیل کی۔ ماں کے پیچھے پڑی کہ نکہت کے گھر والوں کو سمجھائیں اسے نہ لے جائیں۔ کیونکہ وہاں اس کی پڑھائی ختم ہو جائے گی۔ اور پھر ایسا سنہرا موقعہ نہ ملے گا۔ موجودہ زمانہ میں، لڑکیوں کی تعلیم کی بہت اہمیت ہے۔ شادی کے بعد وقت پڑے تو کچھ کام کرسکتی ہیں۔ اپنے پیروں پر کھڑی ہوسکتی ہیں۔" ساری مصلحتیں، اونچ نیچ بتا دیا۔ مگر نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔ وہ کہہ کر تھک گئی۔ ہار گئی۔ غم اور غصّہ سے حالت تباہ کرلی۔ جانے کی تیاریاں زور شور سے ہو رہی تھیں۔ نکہت ان دنوں بہت دلیر، منہ پھٹ اور زبان دراز ہوگئی تھی وقت بے وقت، بے اجازت فرزانہ کے گھر پہنچ جاتی۔ کوئی ٹوکتا تو جھنجھلا جاتی۔ اب چار دن تو جانے میں رہ گئے ہیں۔ اب بھی نہ جاؤں۔" بوڑھی نانی کو بھی ترکی بہ ترکی جواب دیتی۔ دونوں سر جوڑے گھنٹوں باتیں کیا کرتیں۔ زمین اور آسمان کے قلابے ملاتیں خط ہر حال ضرور لکھنا ہے۔ فرزانہ نے وعدہ کیا۔ کہ آنے والی چھٹی میں سب پروگرام برطرف کر کے صرف اس کے پاس آکر رہے گی اور اس نے مسکرا کر کہا۔

"وہاں جنگل میں منگل منائیں گے نہ؟ جمّو بھیا کو بھی ساتھ لاؤں گی۔"

نکہت اس تصور ہی سے کھلکھلا پڑی۔

"فرود ..... انشاء اللہ ..... وہاں تالاب کے کنارے ..... آم کے باغوں کے گنج میں پکنک ہو تو بڑا مزہ آئیگا۔"
آخر وقت تک منصوبے گٹھا کئے۔

نکہت کو گئے چند دن ہی ہوئے تھے۔ کہ فرزانہ کے والد کا تبادلہ بمبئی ہو گیا۔ عہدہ بھی بڑھ گیا۔ بمبئی کی ہنگامہ خیز زندگی نئی اور انوکھی ہزاروں دلچسپیاں، دل بہلانے کے سو بہانے، غیر محسوس طور پہ نکہت کے چھوٹنے کا غم غلط ہونے لگا۔ سنیما دعوتیں پارٹیاں، سیر و تفریح، ہزاروں مشاغل تھے۔ ملاقات کا دائرہ وسیع تر اور زیادہ بلند ہو گیا۔ فرزانہ بالکل محو ہو گئی۔ آہستہ آہستہ اس کے آئینۂ خیال میں نکہت کی یاد کا عکس دھندلا پڑنے لگا خط پر خط چلے آرہے تھے۔ وہ پریشان ہو جاتی۔ جواب دینے کی فرصت کہاں تھی۔ اس سے بھی زیادہ ضروری کام تھے، ان کو کیسے پس پشت ڈال سکتی ہے۔ ایک دن اس کا خط آنے پر مسکرائی۔ سوچ رہی تھی نکہت کو کچھ پتہ نہیں کہ اس کا وقت کتنا قیمتی ہو گیا ہے۔ اس کا اندازہ کیسے ہو۔ یہ سوچ کر اب کی یہاں کی دلفریبیوں کا ایک نقشہ کھینچ کر اسے بتایا، نئے ملاقاتیوں کا کچھ حال، ان کی سیرت کا کچھ عکس۔ نئی سہیلیوں کے اعداد و شمار، ان کی وضع قطع ضمناً جو ناپسند تھے۔ ان کا ذکر بھی آ گیا۔ ان سے کیسے پیچھا چھڑایا۔ اس نے بڑا وقت صرف کیا۔ بہت دنوں کی شکایت آج دور کر نا تھی۔ خط کیا ایک داستان تھی، عجیب و غریب۔ پڑھتے پڑھتے نکہت کے پسینہ چھوٹنے لگا۔ جذبات میں ایک تلاطم تھا۔ اسے ایسا معلوم ہوا کہ وہ مینڈک کی طرح ایک ہی تالاب میں پڑی دنیا سے بے خبر سڑے پانی میں ڈبکی لگا رہی ہے۔ اور وہاں ... فرزانہ کے گرد ایک جیتی جاگتی دنیا آباد ہے جہاں تک اس کی اپنی رسائی ناممکن ہے۔ اسے کتنا رشک آیا تھا۔ اور ایک شعلہ سا دل میں اُٹھ رہا تھا۔ جواب میں اپنی بے کیف زندگی اور خاص کر اس سے دوری کا رونا رونے میں اس لیے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ فرزانہ متاثر بھی ہوئی اور یہ بھی سوچا کہ یہ دکھڑا کہاں تک سنے۔ اُس نے آہ بھری آخر وہ کیا کرے۔ اب کی اس نے صاف صاف لکھا کہ کاغذی گھوڑے دوڑانے سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ تم خود یہاں چلی آؤ۔ تمہاری جیسی لڑکی کو یہاں کی سوسائٹی سر آنکھوں پر جگہ دے گی۔ دنیا دیکھو گی۔ اور اپنی دنیا آپ بنا سکتی ہو۔ بہتر سے بہتر مواقع چشم براہ ہیں۔ میں تو موجود ہی ہوں، میں تمہاری ہر طرح مدد کروں گی۔ تم کہتی ہو کہ بوڑھی نانی کا تم ہی سہارا ہو۔ اور انھیں چھوڑ کر ہٹ نہیں سکتی ہو۔ اس کا میرے پاس کیا علاج ہے اماں بیمار ہیں۔ وہ تو خیر کچھ دنوں میں اچھی ہو جائیں گی۔ فکر کی بات نہیں۔ خط و کتابت میں ڈھیل سی پڑ گئی۔ مہینوں بعد نکہت کا خط نئے مضمون کا ملا۔ عنقریب اس کی شادی ہونے والی ہے۔ اس نے لکھا۔ رشتہ جو ہو رہا ہے۔ مصلحتاً صرف ماں اور نانی کی وجہ سے قبول کر کے میں نے اپنے ایثار اور قربانی کا ثبوت دیا ہے۔ ان کی سب سے بڑی آرزو اور مصلحتوں کو کیسے رد کر سکتی ہوں۔

فرزانہ کے سر سے پیر تک آگ لگ گئی۔ جل بھن کر اس نے خط بے پروائی سے دور پھینک دیا۔ اور پیر زمین پٹختی ہوئی دھم سے صوفے پر گر گئی۔ بے اختیار اس کی زبان سے نکلا۔

"افسوس۔ جو ڈوب رہا ہو اسے میں کیسے بچا سکتی ہوں۔"

پھر یہ تکلیف دہ خیال دل سے نکالنے کی کوشش کی۔ اور سوچنا چھوڑ دیا۔ اور سوچنے کی مہلت بھی نہیں تھی۔ اب وہ خود ایک نئی رنگین زندگی میں قدم رکھنے والی تھی۔ سب کچھ اپنی پسند کے مطابق تھا۔ منتہائے نظر تک، شادی کے موقع پر اس کو نکہت بہت یاد آرہی تھی۔ بلایا بھی، کوئی جواب نہیں آیا۔ شاید پتہ بدل گیا ہو۔ مدتوں سے اس نے کچھ لکھا ہی نہیں۔ فرزانہ نے انتظار کرنا چھوڑ دیا۔ مہینے گزرتے رہے۔ سال بہ سال، دونوں کو ایک دوسرے کی خبر نہیں تھی۔ زندگی میں نئے نئے موڑ آئے

تیز دھارے۔ جو سمتیں بالکل الگ الگ رہیں۔ سوا اس کے کہ مشکل سے کوئی اڑتی پڑتی خبر کانوں میں پڑ جاتی۔ شادی ہو گئی، بچے ہیں، شوہر کا تبادلہ ہو گیا، یا بیمار تھی۔ اب اچھی ہے۔

ایک روز فرزانہ کو نکہت کے گھر والوں کی ایک بوڑھی کہیں اتفاق سے مل گئیں۔ انہوں نے بتایا کہ ایک مرتبہ جب وہ ملی تھی۔ تو انہوں نے اندازہ کیا کہ وہ اپنی نئی زندگی سے زیادہ مطمئن نہیں ہے۔ فرزانہ کا دل دکھ سے بھر گیا۔ خیال کہاں کہاں سے پہنچ گیا۔ اسے وہ دن یاد آیا جب وہ دونوں زندگی کے کئی نقشے بناتی تھیں۔ کیا پتہ تھا کیا ہوگا۔

زندگی کی دھوپ چھاؤں میں پچھلے دنوں کی یاد بھی اکثر اپنا سایہ ڈالتی رہی۔ نہ معلوم کیا بات تھی کہ اتنے نئے لوگ ملے۔ ان میں اچھے بھی تھے، دوستی کا دم بھرتے تھے۔ سہیلیاں ہم مذاق پر لطف صحبتیں گرم رہتیں۔ مگر نکہت کے ساتھ جو کیفیت تھی وہ پھر کسی سے پیدا نہیں۔ وہ خلوص وہ سادگی نہیں دیکھی، وہی شاید تعلقات کی جان تھی۔ اور وہ اسے بالکل بھول نہیں سکی۔ ایک عمر بیت گئی۔ کبھی ایک دوسرے کی رمق یا تصور بھی باقی نہیں رہا پچھلے تعلق کا۔

سیاسی اور خاندانی بڑے بڑے انقلاب رونما ہوئے۔ بہت دن ہوئے دونوں کے خاندانوں کا شیرازہ بکھر گیا۔ زمانہ نے کتنے نئے نئے رنگ بدلے۔ فرزانہ کے والد اور والدہ کا انتقال ہو گیا۔ پے در پے حادثات نے اس کے دل و دماغ پر بہت اثر ڈالا۔ اس کی صحت اور دل بہلانے کے خیال سے بڑے بھائی نے اسے کراچی بلا لیا۔ وہ یہاں ایک بڑے عہدے پر فائز تھے۔

نکہت کو کہیں سے خبر ملی کہ فرزانہ یہاں آئی ہوئی ہے۔ جدائی کے بعد یہ پہلا اتفاق تھا۔ دونوں ستارے گردش کر کے ایک ہی برج میں آ گئے وہ تڑپ اٹھی۔ خوابیدہ آرزوئیں جاگ پڑیں۔ اتنی عمر جس آرزو میں گزری وہ اب پوری کر لے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اسے ایسا لگا کہ فرزانہ اب اس کے لیے وہ فرزانہ نہیں رہی۔ غیریت کی ایک دیوار بیچ میں حائل ہو چکی۔ اتنی زندگی گزر گئی۔ کبھی صورت بھی نہیں دیکھی۔ کیا معلوم اس کے دل میں یاد باقی بھی ہے یا نہیں۔ وہ اس سے کیا کہہ کرے گی۔ تقدیر کے بھی کیا کھیل ہیں؟ ایک وہ زمانہ تھا۔ ایک یہ، کہ ٹوٹتے تاروں کو جوڑنے اور بنانے سے پیروہی مدتیں نعیم اور رسیلے شعر نکل سکتے ہیں۔ حیثیت میں وہ اس سے کہیں زیادہ بلند ہو گئی ہے۔ اس سے دوستی کا دعوٰی؟ رہیں جھونپڑوں میں خواب دیکھیں محلوں کے۔ یہی کہنے کو ہوگا۔ وہ کشاکش میں پڑی تھی۔ دل تھا کہ مانتا ہی نہیں تھا۔ گھر والوں میں سے کوئی بھی فرزانہ کے عزیزوں اور دل سے واقف نہیں تھا۔ سوار تو اپنے پاس نہیں، جائے کیسے؟ قسمت سے ایک دن کسی کی موٹر ذرا سی دیر کے لیے مانگے مل گئی۔ اور وہ فوراً روانہ ہو گئی۔ ایک نظر دیکھ تو آئے۔

ٹھیک دوپہر کا وقت تھا۔ گرمی کے دن۔ گرم ہوا کا پورا زور چل رہا تھا۔ اس کی موٹر دندناتی ہوئی فرزانہ کے عالیشان مکان کے احاطے میں داخل ہوئی۔ نکہت اپنی خوابوں کی دنیا بسائے ہوئے یادوں کو احتیاط سے دامن میں سمیٹے اتر پڑی۔ تیتی چلچلاتی دھوپ کی تڑپ سے سیاہ بالوں میں سفید بال چاندی کی طرح چمک رہے تھے۔ رخساروں پر شکستہ دیوار کی سی لکیریں زیادہ گہری ہو گئی تھیں۔ کوئی نظر نہیں آیا۔ ایک دم وہ جھجک اٹھی۔ بے وقت، بے اطلاع اتنے بڑے گھر میں کیسے آ گئی۔ ادھر ادھر گھبرا کر دیکھنے لگی۔ جی چاہتا تھا کوئی شناسا لپک کر پاس آ جاتا۔ ہاتھوں ہاتھ لیتا۔ تو دل کتنا بڑھ جاتا۔ خوشی کے بند سوتے پھوٹ نکلتے۔ جو کچھ بھی کا دل، کشش چہرہ تخیل کے پردوں پر ابھر آیا۔ مگر وہاں سناٹا تھا۔ ایک صورت دکھائی بھی دی تو انجانی۔ اس کے قدم من من بھر کے ہو گئے اتنا نہ سہی۔ کوئی جانے نہ جانے اپنی فرزانہ تو ہوگی۔ اور کیا چاہیے۔

کچھ بچے برآمدے میں دوڑ دھوپ کر رہے تھے۔ اس نے ایک کے پاس جا کر کہا "اے بھیا منو۔ فرزانہ بیگم ہیں..... میں ان سے ملنا چاہتی ہوں۔"

اس نے مشکل سے توجہ ادھر منتقل کی۔ "جی وہ..... جی ہاں..... وہ ہیں۔"
وہ لجاجت سے بولی۔ "اچھا مجھے ان کے پاس لے چلو۔"
بچہ پاس والے کمرے میں لے آیا۔ جہاں فرزانہ کی چھوٹی بہاوج ثریا، بچے کو گود میں بہلا رہی تھی۔ نکہت نے کسی قدر بے قراری کے لہجہ میں پوچھا۔
"فرزانہ کہاں ہیں..... کیا میں ذرا دیر کے لیے ان سے مل سکتی ہوں؟"
ثریا نے سر سے پیر تک غور سے دیکھا۔
"تشریف رکھیے..... میں انھیں اطلاع کرتی ہوں۔"
فرزانہ ابھی اپنے کمرے میں آرام کرنے کے لیے لیٹی تھی۔ کتاب ہاتھ میں تھی۔ نیند کا پہلا جھونکا آنے ہی والا تھا۔ کہ ثریا نے اطلاع دی ـــــ
"آپا جان اٹھیے..... کوئی بیوی آپ سے ملنے آئی ہیں۔"
وہ چونک پڑی اور تعجب سے کہا۔
"اوہ! اتنی دوپہر میں کون آگیا۔ کمال ہے۔"
ثریا ٹھنکتے بچوں کو چمکار کر بولی۔ "شاید آپ کی سسرال کی ہیں۔ یہ منو تو مجھے ڈھنگ سے کسی سے بات ہی نہیں کرنے دیتا۔ پھوپھی اماں سو رہی ہیں۔ وہ بے چاری اکیلی بیٹھی ہیں۔
فرزانہ دل میں ہنسی سسرال تو شاید ساری امڈ کر کراچی آگئی ہے۔ باوا آدم کے وقت کے پرانے رشتے نکلتے ہی آتے ہیں اس وقت اُسے اٹھنا کھل گیا۔ طوعاً و کرہاً اُٹھ کر بال ذرا ہاتھوں سے برابر کیے اور پاس والے کمرے میں پہنچی۔
نکہت تصور میں غرق پلنگ کی پائنتی تکلف کے انداز سے بیٹھی تھی۔ دیکھتے ہی اُٹھ پڑی۔ ہمہ شوق، ذرا جھجکتے ہوئے گلے ملی۔ اور مسکرا کر پوچھا۔
"کہو اچھی رہیں؟"
وہ ایسی نظروں سے فرزانہ کو دیکھ رہی تھی۔ جیسے نیلے آکاش میں ان گنت تارے جھلملا رہے ہوں اور فرزانہ..... خاموش منہ تکنے لگی۔ اُس نے سوچتے ہوئے پیشانی پر ہاتھ پھیرا۔ کب یہ صورت دیکھی..... کہاں دیکھی..... شاید کبھی نہیں..... یہ نگاہیں یہ لہجہ..... کتنی جاذبیت ہے ان میں جیسے کہ خوب جانتی ہیں۔ وہ دماغ پر زور دے رہی تھی۔ دریچوں سے اندر جھانک رہی تھی جیسے رعشہ سے گھپ اندھیرے میں کچھ ٹٹول رہی ہو۔ مگر تقریباً پچیس برس پرانے بوسیدہ پردوں کی موٹی موٹی تہوں نے یادوں کے دلآویز نقوش کو ڈھانپ لیے تھے۔ کہ نظر ناکام واپس آئی۔ اس کے کچھ بھی نہ ہاتھ لگا۔ وہ شکست خوردگی پر بھی تیار نہیں تھی۔ کوئی اپنے اس طرح الگ کر کے ملے تو منہ پر کیسے پھٹ سے کہدے کہ نہیں پہچانتی۔ اس میں دل شکنی بھی اور شرمندگی الگ۔ وہ خیالات میں کھوئی ہوئی دوسرے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ اور اخلاق کے طور پر کہا۔
"اچھی طرح بیٹھیں۔ تکلیف سے بیٹھی ہیں..... ہاں جب سے یہاں آئی ہوں میری طبیعت بہت اچھی ہے۔ سب سے مل کر جی بہل گیا۔ بہت دنوں بعد آئی ہوں اب کی۔"
نکہت ذرا کسمسا کر اور کھسک گئی۔

"جب سے سنا ہے کہ تم آئی ہو بڑا دیکھنے کو جی چاہ رہا تھا۔ جب ہی سے آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر اس میں کئی دن لگ گئے دور بہت ہے۔ سواری کی دقت ۔۔۔۔ آج بڑی مشکل سے موٹر مانگ کر آئی ہوں۔"

فرزانہ کے خیالات ایک نووارد مسافر کی طرح ادھر ادھر بھٹک رہے تھے۔ وہ بات بناتے ہوئے بولی۔ "ہاں اور کیا۔ غضب کے فاصلے ہیں یہاں ۔۔۔ ایک سرا یہ تو ایک سرا وہ ۔۔۔ بس راستہ ناپا کرے کوئی ۔۔۔ بڑی مشکل ہے۔"

وہ موضوع گفتگو تلاش کرنے لگی۔

"صحت کا کیا حال رہتا ہے ۔۔ ٹھیک رہتی ہے؟"

"ہاں ٹھیک ہی ہے آج کل تو۔"

"اور بچے ۔۔۔۔ بچے اچھے ہیں؟"

یہ کہتے ہوئے اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ کوئی ہو جو ذرا سی اس کی مدد کرے۔ اشارہ ہی سے بتا دے کہ کون ہیں۔ ثریا بدستور بچے میں منہمک تھی۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر۔ ایک ضعیف بیوی ذرا فاصلہ پر پلنگ پر غنودگی کی حالت میں پڑی نیم وا آنکھوں سے کبھی دیکھ لیتیں۔ عدم وجود برابر تھا۔ فرزانہ کا دم گھٹنے سا لگا۔ دل بھی اکھڑا اکھڑا تھا۔ باتیں بھی اوپری اوپری۔

نکہت نے پست آواز میں جواب دیا۔

"ہاں خدا کا شکر ہے۔ بچے سب اچھی طرح ہیں۔"

یہ کہہ کر اس نے سر تھام لیا۔ دماغ تپنے لگا۔ آہ فرزانہ اسے بھول چکی ہے۔ بیتی باتوں کا اسے کچھ بھی دھیان نہیں ہے اب تک وہ دھوکے میں تھی۔ سراب کو حقیقت سمجھ کر تشنہ لب یہاں دوڑ آئی۔ یہاں کیا دھرا ہے۔ خشک ویران کھنڈر۔ سب کچھ خواب ہو گیا۔ خوابوں کی دنیا درہم برہم لگ رہی تھی۔ کیا وہ اپنے کو بتلائے کہ کون ہے۔ بھولا ہوا افسانہ پھر سے دہرائے بھولی بسری باتوں کو نئے کے بیٹھے ۔۔۔۔ اور پھر بھی نہ یاد آئے تو ۔۔۔۔ اب کچھ کہنا سننا بیکار ہے جو ہونا تھا ہو گیا ۔۔۔ دل کی عجیب کیفیت ہونے لگی۔ وہ کھوئی ہوئی سی کھڑی ہو گئی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کچھ گنوا دیا ہو۔

"اب جا رہی ہوں ۔۔۔۔ اتنی ہی دیر کے لیے موٹر ملی تھی جنہوں نے دی ان کو کہیں جانا ہے اس وقت۔"

فرزانہ نے دیکھا اس کی آنکھوں میں جو کرنیں سی تھوڑی دیر پہلے چمک رہی تھیں ۔۔ وہ غائب ہو چکی تھیں وہ گھبرا کر اس کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔

"ارے ابھی سے ۔۔۔۔ اتنی جلدی ۔۔۔۔"

وہ بہت جلدی میں تھی۔ تیزی سے جا کر موٹر میں بیٹھ گئی۔ چلتے وقت گھر کے کچھ لوگ آئے بھی تو کوئی بات چیت نہ ہو سکی فرزانہ کا بے اختیار جی چاہا۔ کہ اس کا دامن پکڑ کے کھینچ لے۔ صاف صاف پوچھے۔ کچھ بتائے۔ وہ عجیب مخمصہ میں کھڑی رہ گئی۔ نکہت ہوا ہو گئی۔ فرزانہ کو ایسا معلوم ہوا کہ بادل ایک دم گھر کر آئے اور رم جھم برس کر نکل گئے۔ یا نسیم بہار کا کوئی جھونکا آیا۔ فضا خوشبو سے اب تک معطر ہے۔ وہ حیران تھی۔ کوئی شعلہ ہو یا بجلی آئی بھی اور گئی بھی۔ اس کا دل بھاری تھا۔ نکہت کے جانے کے بعد اس نے ایک ایک سے کہنا شروع کیا۔ "بھئی یہ کون تھیں۔ میں نے آخر وقت تک انھیں نہیں پہچانا۔ دماغ پر بہت زور ڈالا کچھ پتے نہیں پڑا۔ ثریا ہنس کر بولی۔

"لیجیے میں تو سمجھی آپ جانتی ہیں۔ کوئی خاص عزیز ہیں آپ کی۔"

آپس میں خوب چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ تب پتہ چلا کہ یہ نکہت تھی۔

فرزانہ کا دل دھک سے ہوگیا۔ اس وقت عجیب حالت تھی۔ ایک دم سر پکڑ کے بیٹھ گئی۔

ہائے یہ نکہت تھی۔۔۔۔۔ اس کی نکہت جس کی یاد کبھی دل سے محو نہیں ہو سکی۔ آنا کرکے آئی اور اس نے پہچانا نہیں۔ اندھیرہو گیا۔ دنیا تاریک لگ رہی۔ زمین اور آسمان اس کے گرد چکر لگا رہے تھے۔ کتنی گذری باتیں اس کے ذہن میں ایک ایک کرکے نیش زنی کر رہی تھی۔ کچھ کے دسے رہی تھیں۔ پہچانتی تو کیسے ملتی۔ پلکیں فرش راہ کرتی۔ خوب خوب گلے شکوے کرتی ـــــ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ ـــــ

عقل پر کیسے پتھر پڑ گئے تھے۔ وہ دماغ جیسے ماؤف ہوگیا ہے۔ جی کیسا لوٹ گیا ہوگا۔ جب ہی کچھ نہ کہا سنا، کیا ستم ہے زمانہ نے اس نوبہار ناز مجسم رعنائی کو آج پامال حالت میں دکھایا۔ اب وہ کیا کرے، وہ ضرور اسے ڈھونڈے گی۔ ضرور ملے گی ـــــ

وہ بہت کچھ سوچ رہی تھی۔ نکہت کے دل میں اب تک اس کی یاد باقی ہے۔ سالہا سال گزر گئے۔ محبت امر ہے وہ کبھی فنا نہیں ہوتی۔ اس پر ایک روحانی کیف چھا گیا۔ وہ زمان و مکان کی قید سے آزاد خود کو ایک اعلیٰ اور بلند مقام پر محسوس کر رہی تھی۔ جو روحانیت سے معمور اور منور تھا جہاں وہ اور نکہت تھی۔

اس نے اب کوئی کوشش اس سے ملنے کی اٹھا نہ رکھی۔ پتہ پوچھا۔ ادھر ادھر بھاگی پھری۔ لیکن حسرت ہی رہی ــ نکہت نہ مل سکی ـــ

اتنی بڑی دولت پاکر بھی وہ تہی دست اور محروم تھی۔

ترقی پسند ادب سے جدیدیت پسند ادب تک
گذشتہ تیس سالہ تخلیقات کا انتخاب
نئے قدریں حیدرآباد
کا
فکر جدید نمبر
* پیش کر رہا ہے * اس نمبر میں اس دور کی
ہر منفرد شخصیت کا جائزہ لیا جائے گا۔ بہت جلد شائع ہو رہا ہے
منیجر "نئے قدریں" پوسٹ بکس ۸۵ حیدرآباد (پاک)

نقش کراچی

مسز پدما پڑوار

محور۔ دہلی۔

موڑ
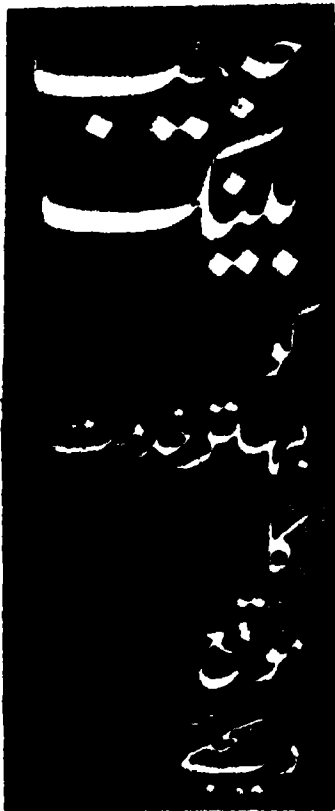
گوبندا آج میرے سامنے اُسی روپ میں تھا جس میں آج سے بیس سال پہلے میں نے اُسے دیکھا تھا۔ جھکی جھکی آنکھیں۔ منہ کے اندر گرتی ہوئی مونچھیں۔ جھکے ہوئے کندھے اور مرجھایا ہوا چہرہ۔ فرق تھا صرف اتنا کہ اُس وقت گوبندا اکیس سال کا نوجوان گبرو تھا۔ مگر اب وہ اکتالیس سال کی ڈھلتی عمر میں داخل ہو رہا تھا۔ میں نے گوبندا کی زندگی کے ان درمیانی بیس سالوں کو ایک طوفانی دریا کی صورت میں دیکھا تھا۔ اُس کی اکیس سال کی عمر اور اب اکتالیس سال کی عمر جیسے اُس کی طوفانی زندگی کے دو پرسکون کنارے تھے۔ ان دو کناروں کے بیچ میں اس کی زندگی کا دریا بہت ہی تیز بہتا رہا تھا۔ مگر اب وہ زندگی کے اس کنارے پر کھڑا اتنا ہی سست اور تابعدار نظر آ رہا تھا۔ جتنا وہ پچھلے کنارے پر نظر آ رہا تھا۔ یہ نئی لہر کب اس کی زندگی میں آئی۔ جس نے اُسے منجدھار سے کنارے پہنچا دیا۔ یہ جاننے کے لیے میرا بے چین ہونا قدرتی امر تھا۔ میں نے اسٹیشن کی طرف بڑھتے ہوئے گوبندا سے پوچھا۔

"گوبندا۔ کیا بات ہے؟ آج تم چپ چپ کیوں ہو؟"

ایک لمحہ کے لئے اُس نے اداس آنکھیں اوپر اٹھائیں اور بولا۔ "کچھ نہیں بڑے بابوجی! ذرا صاحب سے ملنے جا رہا ہوں۔"

بے شک گوبندا مجھے کچھ نہیں بتا سکا۔ مگر اس کی آنکھیں اس کے دل کی بات کہہ گئیں۔ میں نے اُسے زیادہ کریدنا مناسب نہ سمجھا کیونکہ وہ ایک تیز کنارہ بھی تھا۔ دوسرے اس کا تمام راز خود بخود تھوڑی دیر بعد میرے سامنے کھلنے والا تھا۔ کیونکہ میں بھی صاحب سے ملنے جا رہا تھا۔

ریٹائرمنٹ کے تین سال بعد بھی ابھی تک میری کئی رقوم محکمہ کے ذمہ باقی تھیں۔ جن کے متعلق مجھے صاحب سے شکایت کرنی تھی۔ گاڑی چلنے میں پانچ منٹ باقی تھے۔ ان ہی پانچ منٹوں میں میں نے اور گوبندا نے اپنا اپنا رونا رو یا تھا۔

جوں ہی میں پلیٹ فارم پر پہنچا۔ صاحب کو اپنی او۔ سی۔ (آفیسرز کوچ) میں بند پایا۔ میں نے چپراسی کے ہاتھ صاحب کے پاس اپنی چٹ اندر بھجوائی۔ صاحب نے مجھے جلد ہی اندر بلوا لیا۔ گوبندا باہر کھڑا انتظار کرتا رہا۔ شاید وہ صاحب سے تنہائی میں بات کرنا چاہتا تھا۔ جب گاڑی نے وسل دی۔ اور میں نہیں اترا تو وہ بھی لپک کر او۔ سی۔ میں آ گیا۔ میں نے اگلے اسٹیشن تک صاحب سے بات کرتے ہوئے جانا تھا۔ اور وہاں سے واپس لیما میں آنا تھا۔ شاید یہی پروگرام بنا کر گوبندا بھی اندر آ گیا۔ جب میں اپنی کہہ چکا تو گوبندا بولا۔

"صاحب بہادر۔ ایک عرض میری بھی ہے!"

"ہاں ہاں کہو گوبندا۔ کیا بات ہے؟" صاحب نے اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔
پہلے گوبندا نے میری طرف دیکھا۔ ایک منٹ کے لئے اُس نے نظریں اٹھائیں۔ جھپکائیں۔ اور پھر جھپکا کر رک رک کر کہنے لگا۔
"صاحب! میں تبدیلی چاہتا ہوں۔"
"تبدیلی؟" مجھے چھ حروف کا یہ لفظ ایسے لگا۔ جیسے گوبندا نے تبدیلی نہیں کہا، کسی سجائی خوبصورت ادبی میں بم پھینک دیا ہے۔
میں نے حیران و ششدر ڈویژنل آفیسر کی موجودگی سے بے خبر ہو کر پوچھا۔
"گوبندا! کیا کہا؟ تبدیلی؟"
صاحب نے بھی حیران ہو کر پوچھا۔ "تبدیلی؟ کیا بات ہے گوبندا؟"
گوبندا تھوڑی دیر چپ رہا۔ جیسے اب رو دے گا۔ پھر فرش پر دیکھتے ہوئے بولا۔ "صاحب مجھے بدل دیجئے، کہیں بھی۔ کسی جگہ بھی۔ جہاں آپ کا جی چاہے۔"

اس سے آگے گوبندا نے صاحب سے کیا کہا۔ صاحب نے کیا جواب دیا۔ میں کچھ بھی نہیں سن سکا۔ میرے دماغ کے پردے پر گوبندا کی زندگی کے بیچ کے طوفان ماہ و سال ایک فلم کی طرح آنے لگے۔ کب اگلا اسٹیشن آیا۔ کب میں اترا۔ کب گھر پہنچا۔ مجھے کچھ یاد نہیں۔ بس میرے سامنے گوبندا ہی گوبندا تھا۔ اکیس سے اکتالیس سال کا گوبندا۔

آج سے پورے بیس سال پہلے جب میں اس اسٹیشن پر بطور اسٹیشن ماسٹر کام کر رہا تھا۔ گوبندا میرے پاس پانی والا ہو کر آیا تھا۔ جھکی جھکی آنکھیں منہ کے اندر گرتی ہوئی مونچھیں، جھکے ہوئے کندھے اور گھبرایا ہوا چہرہ۔ اُس نے بڑے دفتر کا تعیناتی خط میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا تھا۔
"بڑے بابو جی! میں آپ کا بچہ ہوں۔ جو سیوا کہو گے، دل و جان سے کروں گا۔"
اور واقعی اس نے میری سیوا دل و جان سے کی تھی۔ ویسے بھی اسٹیشن ماسٹر ان دنوں اسٹیشن کی دنیا کا خدا سمجھا جاتا تھا۔ گوبندا کے علاوہ بھی میرے ماتحت کافی عملہ تھا۔ کانٹے والے، ٹکٹ لگانے والے، جمعدار، شنٹر، خلاصی۔ پانی والے دو بابوؤں میں تار بابو، بکنگ بابو، مال بابو اور گاڑی بابو، بابوؤں کے علاوہ نیچے والے عملہ میں سے ہر ایک کو باری باری میرے گھر کام کرنا پڑتا تھا۔ یہی بھینس کو چارہ ڈالنا، کٹی کرنا۔ آٹا پیسوا لانا۔ کوئلہ پیسنا، لکڑیاں چیرنا اور میری بیوی کے دوسرے گھریلو کاموں میں ہاتھ بٹانا۔ یہ سب کام وہ لوگ اس لیے کرتے تھے۔ کیونکہ ان کا سیاہ و سفید سب کچھ میرے ہاتھوں میں تھا۔ جسے چاہوں رکھوں، جسے چاہوں کھڑے کھڑے باہر نکال باہر کروں۔ میری خدمت میں ان کا فائدہ ہی فائدہ تھا۔ مفت کی دودھ، مفت کا تیل میرے گھر کی روٹی، کوارٹر کا آرام اور وقت بے وقت چھٹی یا تنخواہ۔ اور میرے حکم سے ذرا ادھر جانے میں ان تمام سہولیات سے محرومی؛ اور بعض اوقات نوکری سے بھی جواب۔ پھر بھلا کوئی کیوں میرے سامنے دم مارتا۔ گوبندا میرے گھر کے سب کام کرتا تھا۔ ویسے گوبندا بادیانتا کافی شریف اور فرمانبردار انسان تھا۔ مگر ایک دن اچانک میں نے اس کی زندگی میں عجیب و غریب موڑ دیکھا۔ میرے گھر میں کچھ دوستوں کی دعوت تھی۔ گوبندا میری بیوی کے ساتھ گھر کا تمام کام سنبھال رہا تھا۔ میز پر شراب کی بوتل کھلی ہوئی تھی۔ گوبندا رات کے گیارہ بجے تک ہماری خدمت کرتا رہا۔ اس کا ہاتھ بٹانے کے لئے ایک پانی والا بھی اسٹیشن سے منگوا لیا تھا۔ جب سب چلے گئے۔ تو میں نے گوبندا سے کہا۔ "گوبندا ایرن میٹ لیٹ"
گوبندا وہیں کھڑا رہا۔ اپنی جگہ سے بلا تک نہیں۔ میں نے غصے بھرے لہجے میں کہا۔ "ارے سنا نہیں۔ برتن اٹھا لے۔"
"بابو جی، برہمن ہو کر گوشت والے برتن میں نہیں اٹھاؤں گا۔"
یہ گوبندا کی پہلی حکم عدولی تھی۔ میں غصے سے کانپنے لگا۔ میں گالیاں بکتا ہوا اٹھا اور ایک تھپڑ اس کے منہ پر جانا ہی چاہتا تھا۔ کہ وہ بیٹھ گیا اور میرا ہاتھ ٹیبل لیمپ پر جا لگا جو نیچے گر کر چکنا چور ہو گیا۔ میرا غصہ اور بھڑک اٹھا۔ اور میں پھر اس کی طرف بڑھا اور چلایا۔

"بھوتنی کے، تیری کیا یہ مجال۔ میری حکم عدولی کرتا ہے۔"

میرا یہ وار بھی خالی گیا۔ کیونکہ وہ باہر جا چکا تھا۔ اور میں شراب کے نشے میں دھت چارپائی پر جا گرا۔

دوسرے دن صبح جب میں دفتر پہنچا تو میرے دفتر کے باہر گوبندا بتیاں صاف کر رہا تھا۔ رات کا تمام واقعہ میری آنکھوں کے آگے گھوم گیا۔

میں نے گرج کر کہا: "نکل جا یہاں سے۔"

وہ بتیاں چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ گیا نہیں، اسے کھڑا دیکھ کر میرا پارہ اور چڑھ گیا۔

"الو کے پٹھے، حرامزادے، جاتا ہے کہ نہیں۔"

"گالیاں مت دو، بڑے بابوجی! میں چلا جاؤں گا۔"

"ابے جا بھی! حرام خور کے بچے، کمینے، میرا منہ کیا دیکھتا ہے۔ ورنہ دھکے دے کر باہر نکال دوں گا۔"

گالیاں سن کر وہ جاتے جاتے رک گیا۔ الفاظ کو غصے تلے دبا کر وہ بولا: "بابوجی گالیاں مت دو۔"

اس سے پہلے کہ وہ آگے کچھ کہے، میں نے تڑاخ سے ایک تھپڑ اس کے گالوں پر جڑ دیا۔ مگر دوسرے لمحہ وہ میری ٹانگوں میں گھس چکا تھا اور میں اس کے کندھوں پر اٹھ کر میز پر پٹکا جا چکا تھا۔ دواتیں دور لڑھک گئی تھیں۔ کاغذات اتھل پتھل ہو گئے تھے۔ ٹوپی دور جا گری تھی۔ میرا تمام غصہ اسپرٹ کی طرح اڑ گیا تھا۔ دوسرے لمحہ میں پاؤں پر کھڑا کانپ رہا تھا۔ سامنے گوبندا کھڑا تھا۔ جس کی چھاتی مجھے پہلے سے دوگنی چوڑی نظر آ رہی تھی۔ مونچھیں بچھو کے ڈنک کی طرح اٹھی معلوم ہو رہی تھیں۔ شرمیلی اور جھکی رہنے والی آنکھوں میں انگارے بھرے نظر آ رہے تھے۔ میں نے ٹوپی اٹھائی، کپڑے جھاڑے، دواتوں کو قلمدان میں جمایا۔ کاغذات کو ٹھیک کیا۔ اور سوچوں کی اتھاہ گہرائیوں میں گم کرسی پر بیٹھ گیا۔ گوبندا باہر جا کھڑا ہوا۔ دفتر میں اس وقت صرف میں اور گوبندا تھے۔ یہی غنیمت تھا کہ مجھے اس طرح مار کھاتے کسی اور نے نہیں دیکھا۔ ورنہ تمام عزت مٹی میں مل جاتی۔ تھوڑی دیر بعد میں نے گوبندا کو اندر بلایا۔ اور پھر کچھ دیر بعد میرا اس سے سمجھوتہ ہو گیا۔ یہی کہ جو ہوا تھا ہو گیا۔ اب وہ یہ سب باتیں اوروں کو نہ بتائے۔ اسی میں میری اور اس کی بھلائی تھی۔ مگر بعد میں یہ سمجھوتا اس کے لئے زیادہ مفید ثابت ہوا۔ کیونکہ دوسرے دن وہ ایک بدلا ہوا انسان بن چکا تھا۔ اس کی گری ہوئی مونچھیں اب مروڑی اور چڑھی جانے لگی تھیں۔ جھکی جھکی رہنے والی آنکھیں اب آنکھوں میں گڑ کر بات کرتی تھیں۔ اس نے میرے گھر پر کام کرنا بند کر دیا تھا۔ میں اپنی عزت کی خاطر اب اسے دبانے یا اس سے کام لینے سے ڈرتا رہتا تھا۔ مگر میری کمزوری نے اسے منہ زور بنا دیا تھا۔ ایک دن اس نے باہر کے سینما کے بدمعاش کو بھی پیٹ دیا۔ وہ بدمعاش اس سینما کے بدمعاشوں کا سردار تھا۔ جب گوبندا نے لائن کے ادھر ٹکٹ لینے کی کوشش کی، تو ان میں جھڑپ ہو گئی۔ بدمعاش بااصول غنڈہ تھا۔ اس نے گوبندا سے لڑتے ہوئے، اپنے دوسرے بدمعاشوں کو منع کر دیا۔ کہ وہ اس کی مدد کو ہرگز نہ آئیں۔ وہ خود ہی اس سے نپٹ لے گا۔ مگر جب وہ گوبندا سے بھرے بازار میں پٹ گیا تو اس نے یہ علاقہ چھوڑ دیا۔

اب باقی غنڈوں کا سردار گوبندا تھا۔ سینما کی ٹکٹوں کی بلیک کا سارا روپیہ پہلے گوبندا کی ہتھیلی پر آتا۔ اور پھر تقسیم ہوتا تھا۔ اس سے گوبندا کو اچھی آمدنی بھی ہونے لگی۔ وہاں اس کی علاقے اور اسٹاف میں بھی دھاک بندھ گئی۔ ایک دن ایک بہت ہی اچھی پکچر کے جب ریلوے کے ٹریفک انسپکٹر کو ٹکٹ نہیں مل رہے تھے۔ جسے دیکھنے کے لئے وہ خاص طور سے اپنے ہیڈکوارٹر سے بال بچوں سمیت آیا تھا۔ گوبندا نے اسے ٹکٹوں کی بجائے فری پاس لا دیئے۔ اس کے بعد جب بھی کوئی افسر، انچارج یا انسپکٹر وغیرہ کسی نئی فلم کا پہلے دن ٹکٹ لینا چاہتا۔ اور اسے کسی قسم کی تنگی محسوس ہوتی، تو یہ تکلیف گوبندا فوراً دور کر دیتا۔ دوسرے کاموں میں گوبندا جہاں بھی ہاتھ ڈالتا۔ کامیابی اس کے قدم چومتی۔ شہر کے دوسرے بدمعاش بھی کئی دوسری لائنوں میں اس کی کئی مشکلیں آسان کر دیتے۔ ایک ڈویژنل افسر کو اس نے اس کی پرانی ماڈل کی موٹر کا پرزہ جانے کہاں سے لا دیا تھا۔ جو کہ موٹر مارکیٹ میں ایک عرصہ سے نایاب تھا۔ جس کی وجہ سے صاحب کی موٹر ایک عرصہ سے خراب پڑی تھی۔ ہوتے ہوتے گوبندا دوسرے بڑے افسروں

کا منظورِ نظر بن گیا۔ ایک دفعہ ایک افسر جو ذرا زیادہ سخت قسم کا واقع ہوا تھا۔ اور جس نے گوبندا کو یہاں سے تبدیل کرنا چاہا۔ تو دوسرے ہی دن گوبندا نے چند بدمعاش اس کے پیچھے لگا دیئے۔ جنہوں نے موقعہ پاتے ہی اسے اکیلے گھر میں گھیر کر ننگے چاقوؤں کے وہ چھکے دیئے۔ کہ دوسرے ہی دن اس نے گوبندا کی تبدیلی کے احکامات روک دیئے۔ افسروں کی مدد۔ فرمانبرداری، اطاعت گزاری۔ اور اچھے کام نے بھی اس کی جگہ افسروں کے دل میں بنادی اور ترقی کرتے کرتے وہ پانی والا سے شنٹر بن گیا۔ اپنے محکمہ ٹریفک کے علاوہ بھی وہ دوسری برانچوں میں مقبول ہو گیا۔ وہ ساتھیوں، دوستوں، اور افسروں کی بروقت مدد سے فائدہ اٹھاتا۔ اور اگر یہ باتیں کہیں فیل ہو جاتیں تو پھر ڈنڈے سے اپنا الو سیدھا کر لیتا۔ اس لئے حکام بھی اس سے کنّی کاٹنے لگے تھے۔

گوبندا میرے کام میں ہاتھ بٹانے لگا تھا۔ نیچے والے تمام اسٹاف کی حاضری لگانا۔ انھیں چھٹی دینا۔ اُن کی بیماری اور دکھ سکھ کے وقت کام کا دیکھنا میرے لئے ایک بہت بڑی مدد تھی۔ اس لئے ریلیف کا تمام کام میں نے خود ہی اس کے حوالے کر دیا تھا۔ میرے گھر کے کام کے لئے وہ بڑی باقاعدگی سے اسٹاف کی باری باری ڈیوٹی لگاتا اور مجھے کبھی شکایت کا موقعہ نہ دیتا تھا۔ پاؤں پھیلاتے ہوئے اس نے گارڈ رننگ روم کے ایک پرانے غسل خانے میں جو ایک عرصہ سے استعمال میں نہیں آ رہا تھا۔ جوئے کی چوکڑی جمانی شروع کر دی۔ مجھے برا تو بہت لگا۔ مگر جب گارڈوں کی طرف سے کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ تو میں نے چپ رہنا ٹھیک سمجھا۔ مگر جب ایک دن گوبندا اور میں دفتر میں بیٹھے تھے۔ تو ایک نیا گارڈ شکایت لیکر آیا۔ کہ وہاں کچھ بدمعاش جوا کھیل رہے تھے۔ جب اُس نے انھیں ٹوکا تو ان میں سے ایک نے اسے گالی دی۔ اور مارنا بھی چاہا۔ مگر وہ وہاں سے کھسک آیا ورنہ وہ غنڈے اس کا کچومر نکال دیتے۔ میری بجائے گوبندا بولا۔ "بابو جی وہ لوگ بدمعاش ہیں۔ آپ جیسے شریف آدمی کو ان سے الجھنے میں کوئی فائدہ نہیں۔ آپ انھیں ٹوکا نہ کیجئے۔"

گارڈ بولا۔ "بدمعاش ہیں تو ہوتے رہیں۔ پولیس مر تو نہیں گئی۔"

گوبندا نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "بابو جی پولیس تو زندہ ہے مگر اسے باقاعدہ حصہ ملتا ہے۔ وہ آپ کا ساتھ کیوں دینے لگی۔"

"نہ سہی، مگر ان کو پھر بھی شریف آدمیوں کی پگڑی یوں نہیں اچھالنی چاہئے۔" گارڈ جیسے لاجواب ہو کر بولا۔

"تمہارے بچے جیتے رہیں۔ یہ کہی نا تم نے کام کی بات!" گوبندا نے چپڑاسی کو بلایا۔ اور کہا۔ "او جبرئیل۔ ببجو سے جا کر کہو۔ تمہیں گوبندا بلاتا ہے۔"

تھوڑی دیر بعد ہی بدمعاش دفتر میں گوبندا کے سامنے کھڑا تھا۔ سب کے سامنے گوبندا نے اس کی طبیعت صاف کر دی۔ اُس نے سب کے سامنے گارڈ سے معافی مانگی۔ اس واقعہ کے ساتھ لوگ اور زیادہ گوبندا کی عزت کرنے لگے۔ اور وہ اور زیادہ کھل کر کھیلنے لگا۔ اس نے کہہ سن کر دو بونوں کا کوارٹر اپنے نام الاٹ کروا لیا۔ محکمہ بجلی سے بجلی لگوائی گئی۔ انجنیئرنگ والوں نے پانی کا نل لگوا دیا۔ ٹریفک اسٹاف میں سے ایک آدمی میرے گھر کے ساتھ ساتھ اس کے گھر پر بھی کام کرنے لگا۔

اپنی ڈیوٹی ٹھوک بجا کر دینے کے بعد گوبندا سینما کے ٹکٹوں کی بلیک مارکیٹ کرتا، رننگ روم میں جوا کھلواتا۔ یارڈ میں مسافروں سے گاڑی میں جگہ دلوانے کے دام وصول کرتا۔ پارسل والوں سے اپنا حصہ اینٹھتا اور رات رات بھر گھر سے غائب رہتا۔ اس کی بیوی اس سے جھگڑتی۔ کہ وہ رات کو گھر سے باہر نہ رہا کرے۔ وہ کوشش بھی کرتا کہ اس کی بیوی کو شکایت کا موقعہ نہ ملے مگر وہ پھر بھی کبھی کبھی لیٹ ہو ہی جاتا۔ جس سے اس کی بیوی اسے شکوک بھری نظروں سے دیکھتی۔ وہ کہتا۔

"بھلی لوک، مجھ میں ہزار برائیاں سہی۔ مگر میں بدچلن نہیں ہوں۔ بس یہی ایک گن ہے مجھ میں۔"

مگر اس کی بیوی کے دماغ سے شک کی پرچھائیں دھندلی نہ پڑتی اور وہ اکثر اسے کچھ نہ کچھ سنگاتی رہتی۔ اپنی بیوی کی شکی طبیعت سے چڑ کر

کبھی کبھی وہ رات رات بھر غائب بھی ہو جاتا، یا مانا رجسن میں گانے وغیرہ کی محفل میں جا بیٹھتا۔ مگر پھر بھی اپنی بیوی کی امانت میں خیانت کرنے کا خیال اُسے کبھی نہ آتا۔ مگر اس کی شکی مزاج بیوی اور زیادہ وہمی ہوتی گئی۔ وہ لڑتی جھگڑتی، مار کھاتی، مگر ٹوکنے سے باز نہ آتی۔ چونکہ گوبندا کو راہِ راست پر لانے کا طریقہ غلط تھا۔ اس لئے مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ گوبندا، اڑیل ٹٹو بن گیا۔ اور اس کی بیوی اور زیادہ شکی مزاج ہوتی گئی۔ آخر ایک دن وہ روٹھ کر میکے چلی گئی۔ گوبندا نے اسے ایک ہفتہ بعد خط لکھا کہ فوراً واپس چلی آؤ۔ ورنہ زندگی بھر پچھتاؤ گی۔ مگر جب ادھر سے کوئی جواب نہیں آیا تو گوبندا نے ایک مہینے بعد خط بھیجا۔ اب تمہارے آنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تمہاری جگہ اب کسی اور کو دے دی گئی ہے۔ ساتھ میں گوبندا نے کسی عورت کی تصویر بھی بھیجدی۔ مگر جب اس کی یہ چال بھی ناکام رہی اور ادھر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ تو دو ماہ کے انتظار کے بعد وہ واقعی کسی عورت کو گھر لے آیا۔ اس کے بعد تو بس دونوں طرف سے تعلقات ہی جیسے کٹ گئے۔ کوئی آٹھ مہینے کے بعد گوبندا کو پہلی بیوی سے تار موصول ہوا کہ اس کے ہاں ایک لڑکی نے جنم لیا ہے تو وہ کچھ دیر کے لئے ڈگمگایا پھر دوسری بیوی کا منہ دیکھ کر تمام بات پی گیا۔ اس کے بعد ادھر سے بھی خاموشی ہو گئی۔

وقت گزرتا گیا، مہینے سال بنتے گئے۔ گوبندا مونچھیں اکڑائے چھاتی پھیلائے، زمانے کے سینے پر دندناتا پھرتا رہا۔ ایک دن اچانک کئی سالوں بعد اسے اپنی ساس کا ایک خط ملا۔ کہ وہ آکر اپنی امانت اپنی بیٹی کو سنبھال لے۔ کیونکہ اس کی ساس اب زندگی کی آخری سانسیں گن رہی تھی۔ اور اب اس کی لڑکی کا اور کوئی سہارا نہیں تھا۔ جہاں وہ اپنی باقی زندگی رہ سکے یا شادی کر سکے۔ جب اس خط کا بھی گوبندا کی طرف سے کوئی جواب نہیں گیا۔ تو کچھ دن بعد اس کی لڑکی خود اس کے پاس آئی۔ کیونکہ اس کی نانی اب اس جہاں سے دور چلی گئی تھی۔ آنکھوں سے آنکھیں ملیں۔ خون نے جوش مارا۔ لڑکی باپ کے پاس رہنے لگی۔ کبھی کبھی چودہ پندرہ سالہ شانتی اور اس کی سوتیلی ماں میں ٹھن جاتی۔ بات گوبندا تک پہنچتی۔ تو وہ ایک ایماندار منصف کی طرح دونوں کی باتیں بڑے غور سے سنتا۔ اور تقریباً ہر دفعہ بیوی کو قصور وار پاکر اس کی مرمت بھی کرتا۔ آخر وہ بھی تین سال تک پٹنے کے بعد اُسے چھوڑ کر بھاگ گئی۔ اب گھر میں گوبندا اور اس کی بیٹی شانتی رہنے لگے۔ میں اسی دوران ریٹائر ہو کر دریا پار کی ایک کالونی میں بس گیا۔ اس لئے مجھے گوبندا کی اگلی زندگی کا کچھ بھی علم نہیں ہو سکا۔

آج میں نے جب گوبندا کی زندگی میں یہ نیا موڑ دیکھا۔ تو حیران رہ گیا۔ وہ گوبندا جو کسی بھی حالت میں یہ شہر نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ جہاں اس کی عزت تھی۔ رعب تھا۔ دبدبہ تھا۔ تنخواہ کے ساتھ شہری الاؤنس کے علاوہ سینکڑوں روپے کی بالائی آمدنی تھی۔ اب اچانک کیوں تبدیل ہونے پر تیار ہو گیا۔ یہ جاننے کے لئے میری بے چینی قدرتی تھی۔ دوسرے دن جب رام سنگھ جمعدار نے مجھے بتایا۔ کہ گوبندا کی نوجوان لڑکی اس کے ہی بدمعاش دوست بجے سے پریم کی پینگیں بڑھا رہی ہے تو ساری بات میری سمجھ میں آگئی۔ گوبندا ایک لڑکی کا باپ ہے اور لڑکی کا باپ چاہے بادشاہ ہی کیوں نہ ہو اسے کبھی نہ کبھی، کسی نہ کسی کے آگے جھکنا پڑتا ہے۔ وہ جھکتا ہے مگر جگہ دیکھ کر۔ اسی مناسب جگہ کے لئے گوبندا یہ شہر چھوڑ رہا ہے۔ وطن، دولت اور عزت چھوڑ رہا ہے۔ وہ جواری سہی، بدمعاشوں کا سردار سہی، سینما کی ٹکٹوں کا بلیک مارکٹیا سہی، مگر ان سب باتوں سے اوپر کچھ اور بھی ہے۔ وہ ایک نوجوان لڑکی کا باپ ہے۔ بس یہی اس کی زندگی کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ یہی اس کی مونچھوں کو نیچا کرنے والی بات ہے۔ یہی اس کا جھکاؤ ہے۔ یہی اس کی زندگی کا سب سے بڑا موڑ ہے۔

ذوقی کا شعری مجموعہ
قرطاسِ جنوں
• دلکش کتابت • دیدہ زیب فوٹو آفسٹ طباعت •
قیمت صرف ۲/۵۰ روپے
• مکتبۂ چراغ۔ لطیف آباد۔ حیدر آباد

امر سنگھ

فنون۔ لاہور

پانگلی

پانگلی یکلخت اٹھی اور میری ٹانگوں سے ٹانگیں بھڑاتی ہوئی تیزی سے باہر چلی گئی۔ میں حیران رہ گیا۔ کیونکہ فلم کافی دلچسپ تھا۔ اور پانگلی کے اس بیچ اٹھ کر چلے جانے کی بظاہر کوئی وجہ نظر نہیں آتی تھی۔ ویسے بھی وہ کبھی اس طرح اٹھ کر نہیں گئی تھی۔ میں نے سوچا کہیں طبیعت ہی خراب نہ ہو گئی ہو۔ اس وقت مجھے یہ بھی خیال آیا کہ پانگلی جب باہر جا رہی تھی۔ تو اُس نے منہ پر رومال رکھا ہوا تھا۔ یہ خیال آتے ہی میں بھی اُٹھ کر باہر چلا گیا۔

جب میں دروازے سے باہر نکلا تو وہ ٹیرس میں میرے آگے آگے جا رہی تھی۔ میرے قدموں کی آواز سن کر وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ ماول میں پہنچ کر اُس نے مڑ کر دیکھا۔ مجھے دیکھتے ہی اُس نے منہ میں ٹھونسا ہوا رومال ہٹا لیا اور زور زور سے ہنسنے لگی۔ اُسے ہنستے دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا، اور میں بھی مسکرانے لگا۔

"آخر بات کیا ہے جو اس طرح ہنس رہی ہو؟" میں نے خود بھی ہنستے ہوئے کہا۔ "میں تو سمجھا شاید طبیعت خراب ہو گئی ہے۔"

"بات یہ ہے!" وہ پھر ہنسنے لگی۔ "بات یہ ہے میری داہنی طرف جو آدمی بیٹھا ہوا ہے وہ مجھ سے محبت کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔"

"وہ کیسے؟" میں نے محظوظ ہونے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

"وہ میرے جسم سے۔ میرا تمام حسن ——" حسن کہہ کر وہ پھر ہنسی سے بے تاب ہو گئی۔ "وہ میرا تمام حسن سمیٹ لینا چاہتا ہے۔"

اس پر میں بھی زور زور سے ہنسنے لگا۔ "میرا حسن" اور پانگلی کی زبان سے۔ یہ لفظ کیا ایسے تھے کہ جنہیں سن سن کر ہنستے ہنستے انسان کے پیٹ میں بل پڑنے لگیں۔

"تو بھئی تم اپنے حسن کو سنبھال کر رکھنا۔" میں نے جھوٹ موٹ کی سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے اس لہجے میں کہا جیسے کہہ رہا ہوں۔ "بھئی جیب پاکٹ کا خیال رکھنا۔"

وہ پھر ہنسنے لگی اور میں بھی

"ہونہہ۔ تو تم اپنے حسن کو بچانے کے لئے ہی بھاگ آئی ہو۔" میں نے مزاحاً کہا۔ "اور اسی خوشی میں ہنس رہی ہو؟"

"بات یہ ہے کہ انٹرول ہونے والا ہے۔" وہ ہنستے ہنستے سنجیدگی اختیار کر کے بولی۔ "اور میں نہیں چاہتی کہ میرے حسن کی بجلی اُس پر فلم ختم ہونے سے پہلے ہی گر پڑے۔"

"حسن کی بجلی!" میں پھر ہنس دیا۔ "بھئی بہت خوب، ترکیب بہت موزوں ہے۔"

"اور کیا!" وہ بولی۔

"خوب، خوب!" میں نے توصیف کی نقالی کرتے ہوئے کہا۔ "تم یہ چاہتی ہو کہ وہ تارک الدنیا ہو جائے فلم دیکھنے کے بعد ہی۔"

اور ہم دونوں زور زور سے قہقہے لگا کر ہنسنے لگے۔

"بھئی تم تو ہنسے جا رہی ہو۔" وہ اپنی ہنسی پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

سینما کے گیٹ کیپر اور ویٹنگ روم کے دیگر لوگ ہمیں گھور گھور کر دیکھ رہے تھے۔

"آؤ انٹرول ہو گیا۔ وہ کہیں باہر نہ آ جائے۔" اور وہ میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی۔ مجھے باہر لے گئی۔

فلم دوبارہ شروع ہوا اور ہال میں اندھیرا ہو گیا۔ تو ہم بھی اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گئے۔ کھیل کے دوران پانگلی مجھے دکھاتی رہی اور میں دیکھتا رہا۔ کہ کس طرح اُس کے دائیں ہاتھ بیٹھے ہوئے نوجوان کے ہاتھ پانگلی کی کلائیوں، اُس کے بازوؤں اور اس کی رانوں پر سے اس کا حسن سمیٹنے کی کوشش کرتے رہے کس طرح اُس کے ہاتھ رینگ رینگ کر اُس کے بازوؤں سے اُس کے پہلو میں سرکتے رہے۔ اور پھر کس طرح پانگلی اُس کے ہاتھوں کی جسارت کا خیر مقدم کرتی رہی۔

فلم خاتمے کے قریب پہنچ رہا تھا۔ پانگلی اپنا کھیل کھیلنے میں مصروف تھی۔ نوجوان پردے پر ہونے والے کھیل کو بھول چکا تھا اور اس کا ہاتھ پانگلی کے پیٹ پر پہنچ چکا تھا۔ پانگلی نے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں بڑے پیار کے ساتھ تھام لیا۔ وہ اس کے ہاتھ کو سہلا رہی تھی۔ اور نوجوان کا سر آہستہ آہستہ پانگلی کے کندھے کی طرف جھکتا جا رہا تھا۔

اچانک فلم ختم ہو گیا۔ اور ہال میں روشنی ہو گئی۔ پانگلی اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ اور اپنا چہرہ اُس نوجوان کی طرف کر کے ایک بھرپور اور محبت بھری نظر اس پر ڈالی۔ نوجوان پر جیسے بجلی ٹوٹ پڑی۔ اُس نے اپنا ہاتھ اس طرح کھینچ لیا۔ جیسے نادانستہ بجلی کے تاروں سے چھو گیا ہو۔ اس کا رنگ فق ہو گیا۔ اور جلدی سے مڑ کر اس نے باہر کا رخ کیا۔ پانگلی نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ اور میری بغل میں ٹہوکا دے کر دوسرے دروازے سے باہر نکلنے کا اشارہ کیا باہر جب وہ پھر اُس نوجوان کے قریب جا کر اس کے کندھے سے کندھا بھڑا کر چلنے لگی۔ تو پہلے تو وہ کچھ گھبرایا لیکن جلد ہی اُس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ بے حد حقارت کے ساتھ پانگلی کی طرف دیکھا۔ اور پھر زور سے زمین پر تھوک کر وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

پانگلی نے پھر ایک زبردست قہقہہ لگایا۔ اردگرد کے لوگ چونک کر اس کی طرف تکنے لگے۔ پانگلی کا قہقہہ ایک غیر معمولی قہقہہ تھا۔ اس کی آواز بلاشک باریک تھی۔ مگر اس میں ایک مردانہ قہقہے کی بے باکی تھی۔ جو سامعین کے لئے ایک اجنبی چیز تھی۔ مگر جو کوئی بھی اس کی طرف دیکھتا، نفرت سے ناک منہ چڑھا کر رُخ دوسری طرف پھیر لیتا۔

حقیقت یہ تھی کہ پانگلی نہایت ہی بدصورت تھی۔ اس کی بدصورتی کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب اس کی شادی ہوئی تو اس کے شوہر نے اس کی صورت دیکھتے ہی بغیر کوئی بات چیت کئے اسے چھوڑ دیا تھا۔ پھر دو تین برس کی دوڑ دھوپ کے بعد اُس کے والدین نے اُس کی دوبارہ شادی کر دی تو کچھ دنوں کے بعد اُس کے دوسرے شوہر نے بھی اُسے گھر سے نکال دیا۔ مایوس ہو کر پانگلی نے تعلیم کی طرف رجوع کیا۔ اور ایم بی بی ایس کی ڈگری لے کر پریکٹس شروع کر دی۔ تعلیم اور تربیت کے دوران میں اس نے ایک دو بار محبت کرنے کی کوشش کی۔ مگر ہر بار ناکامی کا سخت جھٹکا سامنا کرنا پڑا۔

پانگلی سے میری اولین ملاقات ایک حادثے کے سلسلہ میں ہوئی تھی۔ میں ان دنوں نیا نیا دہلی آیا تھا۔ جنگ کے دن تھے۔ مکانوں کی شدید قلت تھی

مجھے کوئی مکان نہ ملا تھا۔ اور میں اپنے والد صاحب کے ایک دوست پوری صاحب کے ہاں مقیم تھا۔ پوری صاحب کی عمر اٹھاون پچاس برس کی تھی۔ ان کے دو لڑکے اور تین لڑکیاں تھیں۔ جن میں سے ایک لڑکا اور دو لڑکیاں شادی شدہ تھیں۔ پوری صاحب کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ وہ اگر چاہتے تو اپنی دولت کے بوتے پر کافی خوبصورت اور جوان بیوی حاصل کر سکتے تھے۔ لیکن نہ معلوم کس خیال کے پیش نظر انہوں نے دوسری شادی نہیں کی تھی۔

پوری صاحب کے ہاں رہتے ہوئے مجھے دو مہینے ہو گئے تھے۔ ایک دن پوری کی بہو پاؤں اوچھا پڑنے کی وجہ سے دو تین سیڑھیاں پھسل کر گر پڑی وہ حاملہ تھی۔ اس لئے چوٹ کچھ زیادہ ہی آ گئی۔ اور اسقاط کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ گھر میں اس وقت میرے سوا اور کوئی مددگار نہیں تھا۔ اس لئے پوری صاحب کی بڑی لڑکی نے مجھے ڈاکٹر پانگلی کا پتہ دے کر اس کو بلا لانے کے لئے کہا۔

ظاہر ہے کہ اس وقت میرے ذہن میں پانگلی کا ناک نقشہ اگر ایک بہت خوبصورت لڑکی کا نہیں تو کم از کم ایک عام قبول صورت عورت کے پیکر میں ضرور موجود تھا۔ لیکن جب میں نے اس کی صورت دیکھی تو ایک دھچکا میرے دل کو لگا۔ اگر آداب شہریت اور خوش اطواری کا تقاضا نہ ہوتا اور مجھے اس کو اپنے ساتھ لے جانا مقصود نہ ہوتا۔ تو اس اچانک نفرت کے زیر اثر جو میرے دل میں پیدا ہو گئی تھی نہ جانے میں کیا حرکت کر بیٹھتا پھر جب وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔ تو اس کی آواز نے میرے احساس کو ایک جھٹکا سا دیا۔ عورت چاہے کتنی ہی بدصورت کیوں نہ ہو، ہمارا احساس اس کی آواز اور اس کے طرز تخاطب میں نسائیت کی توقع ضرور رکھتا ہے۔ مگر پانگلی کی آواز، اس کے طرز ادا، اس کے لب و لہجہ میں نسائیت قطعی مفقود تھی۔ اس کی حرکات و سکنات بات چیت اور بولنے کے انداز میں ایک مردانہ کرختگی تھی، جو اس کے لمبے، اونچے، سخت اور مردانہ قسم کے جسم کے ساتھ مل کر نہایت نفرت انگیز بن جاتی تھی۔

کار میں وہ میرے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔ اور باتیں کرنی شروع کر دیں۔ مجھے اس کے ساتھ باتیں کرنا ناگوار محسوس ہو رہا تھا۔ مگر وہ باتیں کئے گئی۔ اور مجھے بھی اخلاقاً اس کا ساتھ دینا پڑا۔

جب اس نے بات چیت شروع کی تھی تو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ کہ مجھے اس سے کچھ فائدہ بھی پہنچ سکتا ہے لیکن مجھے اس سے وہ چیز مل گئی جس کی اس وقت مجھے اشد ضرورت تھی۔ باتوں باتوں میں اس نے پوچھا کہ میں پوری صاحب کا کون ہوتا ہوں۔ جواب میں جب میں نے اسے بتایا کہ میں پوری صاحب کے دوست کا بیٹا ہوں۔ مجھے یہاں آئے دو مہینے ہونے لگے ہیں۔ اور مکان نہ مل سکنے کی وجہ سے میں پوری صاحب کے ہاں پڑا ہوں تو اس نے مجھے بتایا کہ اس کے پاس دو فلیٹ ہیں۔ ایک میں وہ خود رہتی ہے۔ دوسرے میں پہلے اس کا بھائی اور بھاوج رہا کرتے تھے۔ مگر اس کے بھائی کی تبدیلی ہو گئی ہے اس لئے دوسرا اب خالی ہے میں اگر چاہوں تو وہ کرائے پر لے سکتا ہوں۔

پانگلی کی پیش کش میرے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ تھی۔ ایک ثانیہ کے لئے میں بھول گیا کہ پانگلی میرے پہلو میں بیٹھی ہے اور یہ پیشکش اسی کی طرف سے ہے میں نے خوشی سے تقریباً اچھل کر اس کی طرف دیکھا۔ اس پہ نظر پڑتے ہی مجھے احساس ہوا۔ کہ وہ فلیٹ پانگلی کے فلیٹ سے کچھ اس طرح متصل ہے کہ بیشک کتنا ہی پانگلی سے الگ رہنے کی کوشش کروں۔ مگر دن میں دو چار بار اس کا سامنا ہو جانا ناگزیر ہو گا۔ پانگلی کا قرب —! میں کچھ ہچکچایا۔ اتنے میں پوری صاحب کا گھر آ گیا۔ اور میں کوئی واضح جواب دینے سے بچ گیا۔

پوری صاحب کی بہو کو دیکھنے کے بعد پانگلی وہیں ہم سے باتیں کرنے لگی۔ پوری صاحب اس دوران میں گھر پہنچ چکے تھے۔ باتوں باتوں میں میرے رہنے مکان کا تذکرہ آ گیا۔ اس وقت پانگلی نے اپنی پیش کش دہرائی اور ساتھ ہی کرائے کا بھی ذکر کر دیا۔ کرایہ بیشک زیادہ تھا۔ مگر اس سے زیادہ نہیں تھا جو میں ادا کرنے کے لئے تیار تھا۔ میں نے پانگلی کی طرف دیکھا۔ اور کچھ ہچکچانے لگا۔ میری ہچکچاہٹ دیکھ کر پوری صاحب نے کچھ ایسی نظروں سے دیکھا۔ کہ میں دل ہی دل میں کانپ اٹھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ پوری صاحب یہ خیال کر رہے ہیں کہ میں اس قدر کرایہ دینے سے ہچکچا رہا ہوں اور اس طرح مزید کچھ عرصے کے لئے ان پر بار بنا رہنا چاہتا ہوں۔

پوری صاحب کی نگاہیں اور ان کے محسوسات کافی ہتک آمیز تھے۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کر لیا۔ کہ پانگلی کا فلیٹ کرایہ پر لے ہی لوں گا۔

فلیٹ نہایت اچھا صاف ستھرا اور ہوادار تھا۔ اگر مجھے کسی اور جگہ ایسا فلیٹ ملتا تو میری مسرت کا ٹھکانا نہ رہتا۔ مگر اُس وقت مجھے اپنے دل پر بوجھ محسوس ہو رہا تھا۔ چنانچہ جس وقت میں اپنا سامان اُس میں رکھوا رہا تھا۔ تو دل ہی دل میں میں نے پختہ ارادہ کر لیا تھا۔ کہ جلد از جلد کوئی اور مکان تلاش کر کے اُس میں اُٹھ جاؤں گا۔ سامان کی ترتیب اور کمروں کی آرائش میں پانگلی بذاتِ خود میرا ہاتھ بٹا رہی تھی۔ بغیر میری خواہش اور استدعا کے وہ مجھے مشورے دے رہی تھی۔ یہاں تک کہ میں اگر کوئی چیز کسی ایک جگہ پر رکھتا تو وہ اسے کسی اور جگہ اور مختلف انداز سے رکھنے کو کہتی۔ نہ صرف کہتی بلکہ اٹھا کر یا اٹھوا کر رکھ بھی دیتی۔ اس بات سے مجھے انکار نہیں تھا۔ کہ گھر کی آرائش میں اسے مجھ سے کہیں زیادہ سلیقہ ہے۔ پھر بھی، اس کے اس طرح خواہ مخواہ دخل دینے سے دل ہی دل میں جھنجھلا رہا تھا۔ لیکن اس کے خلوص کے مدِنظر اس کی بات رد کر دینے کی ہمت مجھ میں نہ تھی اگر کسی جگہ میں اُس سے اختلاف ظاہر کرتا۔ تو وہ اپنی بات پر زور دے کر اُسے صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرتی۔ اور میں اس خیال سے خاموش ہو جاتا کہ اگر میں بحث میں الجھنے لگا۔ تو اس کے اور میرے قرب کا عرصہ طویل ہو جائے گا۔

جب سب سامان قرینے سے لگ گیا تو پانگلی چلی گئی۔ اور میں نے سکھ کا سانس لیا۔ اس وقت رات کافی جا چکی تھی۔ اور میں کمرے کے وسط میں اکیلا کھڑا سوچنے لگا کہ اگر پانگلی کی نوازشات مجھ پر اسی طرح جاری رہیں تو مجھے ایک مستقل ذہنی عذاب میں مبتلا رہنا پڑے گا۔ پوری صاحب کے ہاں میں خود کو اُن پر بوجھ سمجھتا تھا۔ اور اس بات کا بوجھ ہر وقت میرے دل پر رہتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اپنا مکان مل جانے پر مجھے اس بوجھ سے نجات مل جائے گی۔ مگر بجائے نجات کے میں ایک عجیب ذہنی کوفت میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اگر پانگلی کی آمد و رفت میرے ہاں ہوتی رہی جو کہ ناگزیر نظر آتی ہے تو مجھے کسی وقت بھی سکون نصیب نہ ہو گا۔

میری بیٹھک کا ایک دروازہ پانگلی کے فلیٹ میں کھلتا تھا۔ میں نے اسے مضبوطی سے بند کر دیا۔ اور چھوٹا صوفہ کھینچ کر اُس کے آگے کر دیا تاکہ اس طرف سے پانگلی کی آمد و رفت کا خدشہ مٹ جائے۔

اگلی صبح میں نہا دھو کر دفتر جانے کے ارادے سے نکل ہی رہا تھا۔ کہ پانگلی کی خادمہ چائے لے کر اندر آ گئی۔ اس کے پیچھے پیچھے پانگلی کا نزول بھی ہوا۔ جب اُس کی نظر صوفے پر پڑی۔ تو خفا ہو کر اس نے صوفہ دروازے میں سے اٹھوا دیا اور جھٹ اپنی خادمہ کو ساتھ لے کر باہر نکل گئی۔ میں ابھی خجالت اور پشیمانی کے احساسات کی رسہ کشی میں ہی مبتلا تھا۔ کہ وہ ایک الماری اٹھوائے اندر آ گئی۔ اور دروازے کے آگے رکھوا کر بولی: "یہاں پر یہ زیادہ موزوں رہے گی۔" اور جب میں نے یہ پوچھا کہ یہ خالی کیوں کر موزوں معلوم ہو گی تو اس نے اپنی خادمہ سے کہا۔ کہ وہ میری کتابیں اس میں سجا دے۔ ملازمہ ریک پر سے کتابیں اٹھا کر الماری میں رکھنے لگی۔ اور وہ خود چائے بنانے لگی۔ چائے بناتے بناتے اس نے مجھ سے کہا۔

"آپ میرے سے کچھ بد کتے ہیں؟"

"نہیں تو!" میں خفیف ہو رہا تھا۔ کہ اس نے میرے خیالات کو پڑھ لیا ہے۔

"خیر کوئی بات نہیں" وہ بڑے اطمینان سے بولی: "چند دنوں میں سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔"

پانگلی کا خیال درست ثابت ہوا۔ دنوں کے ساتھ میری ہچکچاہٹ بھی گزرتی گئی۔ پانگلی کے قرب سے میرے دل پر جو بوجھ محسوس ہوتا تھا وہ بتدریج کم ہوتا گیا۔ میں اُس کے مردانہ لب و لہجے اور اس کے انداز کا عادی ہوتا گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ پانگلی میں جو کرختگی مجھے اوّل اوّل، محسوس ہوئی تھی۔ وہ اصل میں اس کی کرختگی کا محض ایک سایہ تھی۔ پانگلی اس سے کہیں زیادہ کرخت اور مردانہ تھی۔ یہاں تک کہ اس کے ساتھ باتیں کرتے وقت بعض اوقات یوں محسوس ہوتا۔ کہ میرا مدِمقابل کوئی عورت نہیں بلکہ مرد ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کی بدصورتی جو ناگوار معلوم ہوتی تھی وہ ناگوار نہ گزرتی۔ اور بالکل معمول کے مطابق معلوم ہونے لگی۔

[illegible] کے باوجود میں محسوس کرنے لگا۔ کہ مجھے اس کے ہاں ایک ایسی ہمدردی اور اپنائیت محسوس ہو رہی ہے

"اچھا، اچھا" وہ ہنستے ہنستے بولی۔ اور گاڑی پھر سڑک پر ڈال لی۔ ایک بار اس نے میری آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔ اور مجھے سنجیدہ دیکھ کر وہ خاموش ہوگئی۔

اس کے قہقہے بند ہوگئے تھے۔ ہم دونوں خاموش بیٹھے تھے۔ میرے ذہن میں پانگلی کے قہقہے کا کپکپا دینے والا اثر تازہ ہو رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے کوئی کار کے نیچے آکر کچلا گیا ہے اور خون کے چھینٹے چاروں طرف اڑ رہے ہیں۔ ایک جھرجھری میرے ذہن میں دوڑ گئی۔ ہوا کا ایک غیر معمولی اور سرد جھونکا میرے چہرے سے ٹکرایا۔ اور مجھے محسوس ہوا کہ کار کی رفتار ایک دم بہت تیز ہوگئی ہے۔ میں نے گھبرا کر انڈیکیٹر پر نظر ڈالی سوئی ستر سے اوپر جا رہی تھی۔ پانگلی کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ گہری سنجیدگی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں، سڑک کے بیچ گڑی ہوئی تھیں۔ پانگلی کو میری کسی بات سے صدمہ تو نہیں پہنچا۔ مجھ پر خوف طاری تھا۔ اب تشویش بھی ہونے لگی۔ اب میں کوشش کرنے لگا کہ کسی طرح اُسے خوش کروں۔

"ڈاکٹر۔"

"ہوں۔" اُس نے نگاہیں سڑک میں گاڑے گاڑے ہی جواب میں کہا۔

"کبھی ذرا خیال رکھنا۔ میں اپنے ماں باپ کا پہلوٹھی کا بیٹا ہوں اور میرے والدین اور پانچ بہنوں کی مجھ سے بہت سی امنگیں وابستہ ہیں۔"

میرا خیال تھا کہ وہ ضرور ہنس دے گی۔ مگر وہ جیسے چونک پڑی۔ ڈیش بورڈ کی طرف دیکھا۔ اور پھر نہایت سنجیدگی کے ساتھ تھوڑا سا مسکا کر رفتار دھیمی کردی۔

گھر پہنچ کر پانگلی خلاف معمول سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اُس نے میرے کمرے میں کھلنے والا دروازہ بند کردیا۔ جب وہ دروازہ بند کر رہی تھی تو میں نے دیکھا اُس کی آنکھیں یوں ہو رہی تھیں۔ جیسے اب برسیں کہ اب برسیں۔ میں نے اسے آواز دینی چاہی مگر اس نے جلدی سے دروازہ بند کرلیا۔

میں سونے کے لئے بستر پر دراز ہوا تو مجھے نیند نہ آ رہی تھی۔ پانگلی کی ڈبڈبائی آنکھیں بار بار میری بند آنکھوں کے سامنے گھومنے لگیں اور پھر اس کی ہر خاصیت ایک ایک کرکے میرے ذہن میں چکر لگانے لگی۔ اُس کی آواز اس کا مردانہ لہجہ، اُس کے کرخت انداز، اُس کے فحش مذاق، اُس کی گندی گالیاں — کیا یہ پانگلی ہے؟ پانگلی کیا یہی کچھ ہے؟ پانگلی ایسی ہو سکتی ہے؟ کیا ایک عورت ایسی ہو سکتی ہے اور کیوں؟ پانگلی — پانگلی — اور میرا دم گھٹنے لگا۔ جیسے کسی نے میرے دل کو مٹھی میں دبا کر اس کی حرکت روک دی ہو۔ میں نے لحاف سرکا کر سینہ ننگا کر دیا۔

پانگلی کا ایک دوسرا رُخ بھی ہے۔ کتنا اچھا؟ اس سے ملنے سے پیشتر میری زندگی کس قدر اداس تھی۔ بالکل بنجر اور ویران کس قدر تنہا تھا میں اس قدر بڑے شہر میں۔ میرا کوئی دوست نہیں تھا۔ پوری صاف بات ہے، لڑکے اور لڑکیوں سے بھی مجھے کبھی دوستی اور خلوص نہیں ملا تھا۔ رسمی سے تعلقات اور تکلفات برتاؤ اور بس۔ لیکن پانگلی نے میری زندگی میں دلچسپی پیدا کر دی تھی۔ اس کی اداسی اور ویرانی میں پھول کھلائے تھے۔ میری تنہائی کو اپنے قہقہوں اور شگفتہ باتوں سے جگمگا دیا تھا۔ اُس نے مجھے ہمدردی دی تھی۔ خلوص دیا تھا۔ بارہا میرے چھوٹے موٹے کام بھی سنوارے تھے۔ اگر میں اکیلا اتنی دیر میں رہتا تو یہ کمرے شاید مدت تک ہنسی مسکراہٹ سے آشنا نہ ہو پاتے۔ مگر اب ساری فضا پانگلی کے قہقہوں سے مہک رہی تھی۔ پانگلی ایک بہترین ساتھی ثابت ہوئی تھی۔ اس نے اپنی باتوں سے میری ہر طرح کی ذہنی بھوک مٹائی تھی۔ اس کے ساتھ رہتے ہوئے میں اپنے بہترین اور عزیز ترین دوستوں کی جدائی کا غم بھول گیا تھا۔

لیکن پانگلی خود اداس تھی۔ اس کی اپنی زندگی ویران تھی۔ اُس نے میری تنہائیوں میں رونق پیدا کی تھی۔ مگر وہ خود تنہا تھی بے حد تنہا۔ کیا اس کی تنہائی دور نہیں ہو سکتی؟ ہو سکتی ہے۔ اگر میں چاہوں تو — ہاں، اگر میں اُس کے ساتھ شادی کر لوں — میں اپنی سوچ کی روش پر خود ہی چونک اٹھا لیکن مجھے چونکنا نہیں چاہیے۔ پانگلی نے میرے لئے کیا کچھ نہیں کیا؟ کیا میں اُس کے لئے کچھ نہیں کر سکتا؟ پانگلی بہترین دوست ثابت ہوئی ہے۔ کیا وہ

اچھی بیوی ثابت نہ ہوگی۔"

مگر پانگلی تو بدصورت ہے! اور میری آنکھوں کے سامنے پانگلی کا کریہہ المنظر چہرہ آگیا۔ میرا جی چاہا لحاف کے نیچے گڑ جاؤں اور میں نے لحاف سر کا کر اپنے سینے تک تان لیا۔

پانگلی سے شادی ــــ کیا میرا دماغ بہی ہے؟ میرے دل میں یہ خیال آیا ہی کیسے؟ میں نے پچھلے کئی برسوں سے ایک خوبصورت لڑکی کے خواب دیکھے ہیں، سرخ و سفید اور نرم و نازک جسم کو آغوش میں لینے کی تمنا کی ہے، شفق سے رخساروں، غنچہ سے ہونٹوں کو چومنے کی آرزو کی ہے، اِن سب آرزوؤں ان تمام تمناؤں اور ان سارے خوابوں کی تعبیر کیا یہ پانگلی ہوگی۔ یہ آبنوسی رنگ یہ سوکھے ہوئے پیڑ کا سا جسم، یہ پچکے ہوئے گال، یہ چھوٹی چھوٹی اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں، یہ طباق جیسا دہانہ، کیا میں ان سب کو قبول کر سکوں گا؟ ــ ان سے پیار کر سکوں گا؟ کیا میں پانگلی کے کھلے ہوئے جامن ایسے ہونٹوں کو چوم سکوں گا؟ اور جب میں اُس سے محبت ہی نہ کر سکوں گا۔ تو اس کے ساتھ شادی کر کے میں اس حقیقی ازدواجی زندگی سے کیوں کر ہمکنار ہو سکوں گا۔ جو جسمانی اور دماغی صحت کے لئے نہایت ضروری ہے۔ اور ایک خوشگوار ازدواجی زندگی کے بغیر تو پانگلی کو بھی شادی سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکے گا۔ یوں تو شادی کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔

بالفرض میری شادی کسی گوری چٹی خوبصورت اور خوش اندام لڑکی سے ہو جائے۔ ایسا ہونا کوئی مشکل نہیں۔ میرے پاس وہ تمام لوازم اور شخصی خوبیاں موجود ہیں جن کے ہوتے ہوئے میرے ماحول میں پیدا ہونے والے نوجوان کے لئے خوبصورت لڑکیوں کی کمی نہیں ہو سکتی ــــ لیکن حسین لڑکی اگر اچھی بیوی ثابت نہ ہوئی تو ــــ پانگلی اچھی بیوی تو بن سکتی ہے ــ

پانگلی ــــ پانگلی ــــ اور پانگلی کی صورت پھر میرے ذہن پہ حاوی ہونے لگی۔ اس کے ہونٹ میرے ہونٹوں کے قریب ہونے لگے، پانگلی کے ہونٹ کھلے ہوئے جامن ایسے! میرے سارے جسم میں ایک کپکپی دوڑ گئی۔ میں نے لحاف سے منہ ڈھانپ لیا ــــ میں پانگلی سے شادی نہیں کر سکتا۔

صبح پانگلی میرے کمرے میں آئی۔ اُس کی حالت رات ایسی مضطرب نہیں تھی۔ لیکن ایک خلاف معمول سنجیدگی اس پر ضرور طاری تھی۔ میں اس ذہنی کش مکش کو بھول چکا تھا۔ جو گذشتہ رات کو مجھے پریشان کرتی رہی تھی۔ جب میں نے اسے بالکل خاموش بیٹھے دیکھا تو یکلخت میرے ذہن میں یہی بات آئی کہ میں اس کے ساتھ شادی کرنے کے متعلق سوچتا رہا ہوں۔ مجھے تجویز کرنا چاہیئے۔

"ڈاکٹر! میں نے کہا۔" ایک بات کہوں؟"

"کہو!" اس نے بغیر میری طرف دیکھے کہا۔

"میں۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

اُس نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا۔ اور پھر بغیر کچھ کہے اُٹھی اور میری آنکھ کا پردہ اُٹھا کر دیکھنے لگی۔

"یہ کیا؟" میں نے جھنجھلا کر اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"میں دیکھ رہی ہوں تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا" اور وہ زور زور سے ہنسنے لگی۔

"میں مذاق نہیں کر رہا ڈاکٹر! میں نے ملتجی انداز میں کہا۔" اور میرا دماغ بالکل صحیح ہے۔"

اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ تیزی سے اُٹھی اور پیشتر اس کے کہ میں کچھ سوچ سکوں۔ اس نے ٹھنڈے پانی کا گلاس میرے سر پر انڈیل دیا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ سر میں گرمی چڑھ گئی ہے۔"

اور وہ قہقہے لگانے لگی۔

"یہ کیا بے ہودگی ہے؟" میں نے جھنجھلا کر کہا۔ اور پھر نرم لہجے میں بولا۔ "میں سچ کہہ رہا ہوں ڈاکٹر، آئی ایم ڈیڈلی سیریس۔"

"تم کیا بات کر رہے ہو نرلیش!" وہ حیرت کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔ "کیا مرد بھی مردوں سے شادی کرتے ہیں؟"

"کیا کہہ رہی ہو تم؟"

"میں تمہیں کئی بار بتا چکی ہوں کہ میں عورت نہیں ہوں۔ میرا خمیر مرد کی مٹی سے اٹھایا گیا ہے۔ مگر نہ جانے قدرت کی کس غلطی کی وجہ سے میرا ہیولہ عورت کا بن گیا ہے۔ ویسے میرے اندر عورتوں والی کوئی خاصیت نہیں ہے۔ مگر افسوس کہ تم اس احساس کو دور نہیں کر سکتے۔ کہ میں عورت ہوں اگر تمہارا یہ احساس دور ہو جائے تو ہم اور بھی زیادہ بہتر دوست بن جائیں۔"

"لیکن اپنے عورت ہونے کے احساس سے تو تم خود بھی بری نہیں ہو۔" میں نے تلملا کر کہا۔ "یہ تمہارا زنانہ لباس، تمہارا بال گوندھنے کا انداز اور یہ تمہارے نام کا ساتھ لیبل۔ یہ سب تمہارے اس احساس ہی کی چغلی کھاتے ہیں۔"

"تو یہ بات ہے!" اس نے دانت بھینچے۔ اور مزید کوئی لفظ بولے بغیر اٹھ کر تیزی سے باہر چلی گئی۔

اگلے دن وہ شام کو میرے کمرے میں آئی۔ تو اسے دیکھ کر میں ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گیا۔ اس نے مردانہ لباس پہن رکھا تھا اور سر پہ پگڑی باندھ رکھی تھی۔

"واہ وا۔ بہت خوب۔ بھئی بہت بھلی معلوم ہوتی ہو!" میں پھر ہنسنے لگا۔

"خبردار!" وہ ڈپٹ کر بولی۔ "یوں کہو۔ بھلے معلوم ہوتے ہو۔"

"تو آج سے پانگلی کے بجائے تمہیں پانگلا کہا کروں گا۔" میں پھر ہنس دیا۔ اس پہ وہ بھی ہنسنے لگی۔

ان دنوں پانگلی اور میرے تعلقات کے متعلق نہایت گھناؤنی افواہیں پھیلنے لگیں۔ میرے اور اس کے واقف کاروں میں چرچے ہونے لگے اور مجھے یہ اطلاع بھی ملی کہ یہ افواہیں میرے گھر تک بھی جا پہنچی تھیں۔ لیکن میں نے ان کو کوئی پروا نہ کی۔ اس کے باوجود ہمارے متعلق افواہیں پھیلتی رہیں، پھیلتی رہیں۔ اور پھر خود بخود ختم بھی ہو گئیں۔

ایک خوشگوار شام تھی۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ کتاب تو محض بہانہ تھی۔ دراصل میں پانگلی کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے پوری صاحب کے گھر سے بلوا گیا تھا۔ اور اسے گئے کافی دیر ہو گئی تھی۔ سورج غروب ہونے کے قریب تھا اور فضا میں ایک گلابی رنگت گھل گئی تھی۔

پانگلی آئی اور میرے پہلو میں پڑے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئی۔ کتاب کا باب قریب الختم تھا۔ لہٰذا میں اس سے معذرت کر کے پھر پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ چند لمحے وہ بیٹھی رہی۔ اور پھر اپنی پگڑی اتار کر میرے دیوان پر پھینک دی۔ اور گنگناتی ہوئی ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔

کتاب کا باب ختم ہو گیا۔ کتاب بند کر کے میں نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ پانگلی آئینے کے سامنے بیٹھی اپنے بالوں میں پشت کی طرف کنگھی کر رہی تھی اس کی حرکات اور انداز خلاف معمول نظر آ رہے تھے۔ اس کے چہرے پہ ایک عجیب رونق تھی۔ ہونٹوں پر ایسی ہلکی ہلکی مسکراہٹ تھی جو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ ایک نسائی لچک، ایک نزاکت آمیز لوچ اس کے سراپا میں رچ گیا تھا۔ میں اس کے قریب چلا گیا اور بولا۔

"ڈاکٹر۔ آج کچھ بدلی بدلی نظر آتی ہو۔ کیا بات ہے؟"

"نہیں تو۔" اس نے مڑ کر میری آنکھوں میں دیکھا۔ اور پھر شرما کر منہ دوسری طرف کر لیا اور پھر مسکراتے ہوئے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا لیا

"کیا بات ہے ڈاکٹر!"

"کچھ بھی تو نہیں!"

"نہیں ڈاکٹر۔ بات تو کچھ ضرور ہے۔" میں نے ضد کی۔ "میں نے ایسی خوشی۔ ایسی رونق پہلے کبھی تمہارے چہرے پر نہیں دیکھی۔"

"تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟" وہ بناوٹی خفگی سے بولی اور پھر تیزی سے چلی گئی۔
میں اس کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔
"ڈاکٹر تم کچھ چھپا رہی ہو" میں نے اصرار کیا۔ "بتاؤ نا کیا بات ہے؟"
"کچھ بھی تو نہیں" وہ بے زاری ظاہر کرتے ہوئے بولی۔ "عجیب مصیبت ہو تم بھی" اور پھر وہ اندر چلی گئی۔
"دیکھو بھئی ڈاکٹر، مجھے یقین ہے کہ تم کچھ چھپا رہی ہو۔ آج یہ پہلی بار ہے کہ تم مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو" میں نے گلہ کیا۔ "آج تک۔ تم نے کوئی بات مجھ سے نہیں چھپائی۔ اور نہ کبھی میں نے تم سے چھپائی ہے۔ اور پھر تم مجھے اپنا دوست کہتی ہو۔ یہ اچھی بات نہیں۔"
"مگر کوئی بات ہو بھی۔"
"بات تو ضرور کچھ ہے۔" میں نے آخری حربہ استعمال کیا۔ "تمہیں میری قسم جو نہ بتاؤ تو۔" میں نے اسے دونوں کندھوں سے تھام اپنے سامنے کھڑا کر لیا۔
"بات یہ ہے۔" وہ جھجکتی، شرماتی ہوئی بولی۔ "بات یہ ہے کہ وہ پوری صاحب ہیں نا ـــــ"
"ہاں!"
"وہ ـــ" میرے ہاتھوں کے نیچے وہ یوں لچک گئی جیسے عشق پیچاں کی بیل ٹھنڈی ہوا کے جھونکے سے جھوم جاتی ہے۔ "وہ ـــ میرے ساتھ شادی کرنے والے ہیں۔"
"ہوں۔ ــ اور ابھی کہتی ہو کوئی بات ہی نہیں۔"
"اور انہوں نے آج ـــ" اس نے نگاہ اٹھا کر میری آنکھوں میں جھانکا۔ "آج ـــ" اس نے ہونٹوں کو ذرا سی جنبش دی۔ اور ایک دم میرے ہاتھوں کے نیچے سے کھسک کر جھجکتی، لجاتی، مسکراتی، شرماتی، چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپائے اپنے کمرے میں بھاگ گئی۔

میں نے خوشی سے چلا کر آواز دی۔ "ڈاکٹر ـــ ڈاکٹر ـــ!"
مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور تیزی سے اپنا دروازہ بند کر لیا۔ اس کے کمرے سے دھب کی آواز آئی۔ جیسے اس نے اپنے آپ کو پلنگ پر گرا لیا ہے۔

دُنیا بھر کی معلومات اور دلچسپیوں کا ذخیرہ

عالمی ڈائجسٹ

آپ کے پورے خاندان کے لیے

انشا

قیمت صرف ایک روپیہ اور پچیس پیسے

عالمی ڈائجسٹ۔ انشاء گارڈن ایسٹ کراچی۔

بیسویں صدی دہلی

م ۔ ک ۔ مہتاب

غزل

جیسے تتلیوں کے جھرمٹ میں بھونرے کے آجانے سے کھلبلی مچ گئی ہو۔ سدرشن کے کلب میں آنے کے پہلے ہی دن کئی لڑکیاں ایک دوسری کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھتی رہ گئیں۔

"ویری گلیڈ ٹو میٹ یو مسٹر سدرشن! اِٹ وِل یو لائک ٹو ہیو؟"
کلب کے سکریٹری کی آواز کے ساتھ ہی سنہا کا رخ لان کی اُس جانب پھر گیا جدھر سے آواز آئی تھی۔ جہاں سفید چلیکی پتلون اور زرد بوسکی کی قمیص میں ملبوس ایک بلند قامت خوبرو نوجوان کھڑا تھا۔ سنہا نے سدرشن کو دیکھا اور دیکھتی ہی رہ گئی۔ جیسے کلب کی تمام روشنیوں کا رخ اس شخص کے پروقار چہرے کی طرف گھوم گیا ہو۔ جیسے اُس کے اردگرد بیٹھے تمام افراد کی شخصیت ماند پڑ گئی ہو۔

"سٹرائک سنہا!" شانتا کی آواز نے سدرشن کے نظارے میں متوجہ سنہا کو چونکا دیا۔ لیکن وہ کیرم بورڈ پر سے سٹرائکر اٹھا کر سٹرائک کرنے کی بجائے اپنے پہلو میں بیٹھی شیلا شرما سے کہنے لگی۔

"یہ کون صاحب ہیں شیلا؟"

"لو ابھی پتہ کرتی ہوں" یہ شیلا لپک کر ٹینس کورٹ کی جانب بڑھی اور کیرم بورڈ کے گرد بیٹھی سنہا، شانتا اور سدھا مدھو کر کھلکھلا کر ہنسنے لگیں۔

"عجیب ہے یہ شیلا بھی۔ کلب میں کوئی نیا ممبر آئے تو سب سے پہلے ملاقات کا شرف اسے ہی حاصل ہوگا۔ اور اگر ممبر جوان ہو تو بس ایک دو دن وہ اس کے وارے نیارے رہتے ہیں۔ نہ جانے قدرت نے نوجوانوں سے ملنے کا یہ کیا کمپلکس اس میں پیدا کر دیا ہے" سدھا نے ہنستے ہوئے کہا۔

"میں بتاؤں سدھا، گو بظاہر شیلا سپرنٹنڈنگ انجنیئر کی تیسری بیوی ہے۔ لیکن ایک دن کہہ رہی تھی۔ تم مجھے شریمتی شرما نہیں مس شرما کہا کرو۔ مجھے اُس کی یہ عمر اور ایسی بات سن کر بہت ہنسی آئی اور میں نے کہا۔ "تیسری بیوی صاحبہ! شرما صاحب روز تمہارا ہاتھ تھامے ہوئے کلب میں آتے ہیں۔ یہ دیکھتے ہوئے میں کیسے تمہیں مس کہہ کر پکار سکتی ہوں۔" شیلا بولی۔ "تم سمجھتی ہو شادی صرف جسموں کے ملاپ ہی کا نام ہے۔ جب تک میری روح تشنہ ہے نہ جانے کیوں مجھے مس کہلانے میں لطف آتا ہے۔""

شانتا نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔

"ٹھیک بھی تو ہے۔ ماں باپ بھی تو بعض اوقات اپنی نام نہاد عزت اور وقار کے لیے اولاد پر کتنا ظلم کرتے ہیں۔ رشتہ جوڑ کا

ہونا چاہیے بہ شیلا کیسی نازک بدن بیل سی تھی ۔ اور اب کیا مٹس ہو رہی ہے ۔ بھلا شرما صاحب اس کا کوئی جوڑ ہیں ۔ اپنی پسند کا شوہر تو کسی قسمت والی ہی کو ملتا ہے ۔" سدھا نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا ۔

سہا کے کان کھڑے ہو گئے ۔ اُس نے سدھا کی طرف غور سے دیکھا ۔ جیسے سدھا نے براہِ راست اُس پر چوٹ کی ہو ۔ وہ جواب دینے کی بجائے خاموش رہی اور سٹرا کو دانتوں تلے دبائے سوچنے لگی ۔ اُس کے والدین نے بھی کیا سوچا تھا ۔ لڑکا ایس ۔ ڈی ۔ او تو ہے ۔ چاہے وہ سر سے گنجا ہے آنکھوں پر منفی چار کے شیشے چڑھا رکھے ہیں ۔ اور قد ایسا کہ ساتھ چلتے ہوئے شرم آتی ہے ۔ جیسے ہاتھ میں لالٹین پکڑ رکھی ہو ۔ لیکن .... لیکن خود اُس نے بھی تو پسند پر اسٹیٹس کو ترجیح دی تھی ۔ پسند کو کون پوچھتا ہے ۔ رشتہ دار ملنے والے ، دوست ، سہیلیاں تو سب شادی کے دعوت نامے دیکھ کر ہی ریجھ جاتے ہیں ۔ اُن کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے کیا یہ مضمون کافی نہ تھا ۔

سہا مہرہ — ویڈز ایل ۔ آر ۔ ابرول ایم ۔ ایس ۔ سی انجنیئرنگ (آکسفورڈ) ایس ۔ ڈی ۔ او پی ۔ ڈبلیو ۔ ڈی — ایک بار تو عبارت پڑھتے ہی آنکھیں پھیل جاتی ہیں اور پڑھنے والے کی نظر میں لڑکی والوں کا خاندان آسمان پہ اترتا دکھائی دیتا ہے ۔ مگر .... ہوں .... نام بڑے اور درشن چھوٹے ۔ کیا کبھی میرا دل نہیں چاہتا کہ کوئی میرے ساتھ ہاتھ ملا کر ایک بار پھر کہے " ہاؤ ڈو یو ڈو مس سہا ۔"

"لیجے سویٹ ایڈیشن ٹو آور کلب " (یعنی ہمارے کلب میں ایک حسین اضافہ) شیلا شرما مسکراتی ہوئی آئی اور کرسی میں دھڑام سے دھنس گئی ۔ اور کہنے لگی ۔ لاجواب شخصیت ہے ۔ مسز روشن سیٹھی ۔ ایس ۔ ڈی ۔ او ۔ تنگل سے ڈیپوٹیشن پر آیا ہے ۔ کیا سلیقہ ہے ۔ کیا پرسنیلٹی ہے ۔ بات کرتا ہے تو منہ سے پھول جھڑتے ہیں ! پھر ابھی سنگل ہی ہے ۔ بس مزا آجایا کرے گا اس کی کمپنی میں ۔ ایسے مردوں سے بات چیت میں کچھ اور ہی لطف آتا ہے ۔ سہا دیکھا ، ایک یہ بھی ایس ۔ ڈی ۔ او ہے ۔ اور ایک تمہارے بھی صاحب گول مٹول یعنی ایل ۔ سی ۔ ابرول !" شیلا کی بات پر سب ہنسنے لگیں ۔ سہا کو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے زور کا گھونسا اُس کے سینے میں دے مارا ہو ۔ اور وہ وار بچاتے ہوئے بولی ۔ "تمہارا بھی جواب نہیں مسز شرما ۔"

"شیلا آنٹی ابھی تمہارا بچپنا نہیں گیا ۔ آؤ گیم شروع کریں ۔ سدھا سٹرا کو ہٹ کرتے ہوئے بولی ۔

"ہاں سدھا ! تمہارے لیے بہت اچھا موقع ہے ۔ ہزاروں میں انتخاب ہے ۔ پھانس لو اگر ہو سکے تو ۔"

"آپ بھی کیا بات کرتی ہیں آنٹی !" سدھا مدھوکر بورڈ پر پھیلے پاوڈر میں انگلی سے بے ہنگم لکیریں کھینچتے ہوئے بولی ۔

"زندگی کا نچوڑ بتا رہی ہوں بچو ! مدھوکر صاحب پر بات چھوڑ دی تو ہماری طرح روؤ گی ۔ زمانہ بدل گیا ہے پہلے مرد حرم کے لیے لونڈیاں خریدتے تھے ۔ تب عورت گھر کی زینت تھی آج وہ نمائش کی چیز یعنی شو پیس بن گئی ہے ۔ آج تو مردوں کو وہ شے چاہیے جس پر زمانے بھر کی نظریں گڑ جائیں ۔ چاہے اُس کی اپنی شخصیت مقابلے میں صفر ہی کیوں نہ ہو ۔ بس دو چار بار اپنی چمک دمک کا مظاہرہ کرو ۔ اور معاملہ گول ہے ۔ مچھی کو تو جال میں ایک دن پھنسنا ہی ہے پھر کیوں نہ کسی سنہرے جال میں پھنسا جائے ۔ زندگی کے کچھ دن تو سنہرے ہو جائیں اُس میں بھی تمہاری طرح ....." اور شیلا رومال سے پسینہ پونچھنے لگی ۔

"شیلا جی ! آپ بھی بہت شریر ہیں ۔ آپ کے شرما صاحب وہ بیٹھے برج کھیل رہے ہیں ۔ اگر سن لیں تو ؟" شانتا سکسینہ نے ہنستے ہوئے کہا ۔

"تو کیا ہوا یہ ذاتی آزادی کا دور ہے ۔ اُن سے میری شادی ہوئی ہے پھر بھی روح تو آزاد ہے ۔ اور اسے بہلانے کیلیے میں جو بھی چاہوں کروں کسی کو اس سے کیا غرض ؟"

اور سہا کو شیلا کی بات سن کر ایسا محسوس ہونے لگا جیسے اس کی روح کا پرندہ بھی تو شادی کے بعد زیرِ دام آگیا تھا ،

یلا کر اوپر اٹھنے لگا ہو۔ اس کے اندر کنوارپن پھر انگڑائیاں لینے لگا ہو۔ اس نے گھوم کر دیکھا سدرشن کلب کے سکریٹری کے ساتھ ان کے قریب آگیا تھا۔

وہ چاروں ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہوگئیں، سدرشن نے آگے بڑھ کر سب سے ہاتھ ملائے۔ سکریٹری نروتم سہگل تعارف کراتا تھا ۔۔۔ یہ ہیں ہمارے سپرنٹنڈنگ انجینیر شری سکھ چین داس شرما کی اہلیہ مسز شیلا شرما۔ ہر دلعزیز شیلا شرما۔ ہمارے کلب کی ساری رونق انھیں کے دم سے ہے۔ یہ ہیں شریمتی شانتا سکسینہ۔ سب جج سکسینہ کی بیوی۔ یہ ہیں سدھا مدھوکر ہمارے ایگزیکیٹو مدھوکر کی لڑکی۔ بیڈمنٹن اور ٹیبل ٹینس کی کلاس ون کھلاڑی۔ اور یہ ہیں ابرول صاحب کی اہلیہ محترمہ مسز سہنا ابرول جو نے کولیگ ہیں۔

سدرشن نے بھرپور بدن کی دراز قامت صندلی سہنا کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اور ایک بار پھر وہ اُس سے ہاتھ ملا کر آگے بڑھ گئے۔

سہنا اپنے ہاتھ کو دباتے ہوئے اس گرم گرم بھاری اجنبی ہاتھ کا لمس محسوس کرتی رہی۔ ایک سحر تھا جو اُس پر چھا گیا جس میں اس بھول گیا۔ اُسے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ہاتھ ملاتے ملاتے اُس کا دل ہاتھ سے نکل گیا ہو۔ اور ایک کانٹا اُس کی روح میں اُتر د۔

وہ کلب سے ایک عجیب بے کلی لے کر لوٹی۔ کار میں ابرول صاحب کے پہلو میں بیٹھے ہوئے اُسے نفرت ہو رہی تھی۔ اور رات وہی سپنے دیکھتی رہی کیا یہ وہی مرد تو نہیں جس کے وہ کبھی سپنے دیکھا کرتی تھی۔ جس کے بغیر اس کی زندگی ادھوری تھی۔ کیا وہ اس کے آسکے گا؟ کیا وہ اس کی نامکمل شخصیت کی تکمیل کرے گا؟ کیا ابرول کی موجودگی میں وہ اُس سے تعلقات بڑھا سکے گی؟ صبح یہی سوالات ۔۔۔ یہی خیالات اُسے گھیرے ہوئے تھے۔ اُٹھتے بیٹھتے سدرشن کی تصویر ہی اُس کے خیالوں پر چھائی رہی۔ اور اُسے وقت تک چین نہ آیا جب تک اُس نے رات کو کلب میں سدرشن کو دیکھ نہ لیا۔

شیلا شرما دو ہی چار دن میں سدرشن سے گھل مل گئی۔ اور یہ تعلق سہنا کے لیے اچھا ذریعہ ثابت ہوا۔ وہ بھی اُس کے قریب بیڈمنٹن اور ٹیبل ٹینس دونوں کے پسندیدہ کھیل تھے۔ اور سہنا نے کھیل ہی کھیل میں اپنی دلکشی کا دام پھیلانا چاہا۔ شیلا سدرشن کو رمی اور برج پر لے آئی۔ لیکن سہنا وہاں بھی موجود رہتی۔ سہنا کا سدرشن کی جانب یہ جھکاؤ دیکھ کر ایک رات نے اُس سے کہہ ہی دیا۔

"سہنا ان انگاروں سے ذرا بچ کر کھیلو، ناحق انگلیاں جلا بیٹھو گی!"

"دوسروں کو نصیحت اور خود میاں فضیحت!" سہنا نے جوابی چوٹ کی۔

"تم درست کہتی ہو سہنا! بے شک کلب میں مردوں سے ملنے کے موقعے بہت ملتے ہیں۔ بلکہ غیر مردوں اور عورتوں کا راہ و رسم یا یہاں کے آداب میں شمار ہوتا ہے۔ لیکن ایک خاص حد سے آگے اب بھی اسے عیب سمجھا جاتا ہے۔ میں تو بدنام ہوں ہی۔ شرما صاحب اس قسم کے طعن و تشنیع کو اب درگزر کر دیتے ہیں۔ لیکن تم نے اچھی بھلی لڑکی ہو کر کیوں بدنام ہونے کی ٹھانی ہے۔ جانتی ہو مرد کی آنکھ یا چاہے جو ہو۔ لیکن وہ دیکھ کر کبھی نہیں نکلتا۔ تم یہ بھی جانتی ہو سدرشن تمھارے ابرول صاحب ہی کے دفتر میں ہے۔ اور ایک یا سی بات اُسے سارے اسٹاف میں بدنام کر سکتی ہے۔ اس کا ردِ عمل تمھاری ازدواجی زندگی پر کیا ہوگا۔ یہ تم مجھ سے بہتر سکتی ہو!"

"لیکن شیلا بہن! میں اس کے بغیر اپنے آپ کو نامکمل سا محسوس کرنے لگی ہوں۔" سنہا شدتِ جذبات میں بات پوری نہ کر سکی
"اچھی بات ہے، تم اپنی زندگی کی تکمیل کر لو۔ اپنی تو دل لگی ہے۔ کہیں بھی ہو سکتی ہے۔ ہاں یہ دیکھ لینا اُس پر کچھ اثر بھی ہے
یا نہیں۔ مفت بدنام ہونا اچھا نہیں۔"

اور سچ مچ شیلا اب کسی اور پر مہربان ہو گئی۔ سنہا اور کھل کھیلی۔ اب وہ شیلا شانتا کے ساتھ برج یا کیرم کی بجائے سدرشن کے
ساتھ ٹیبل ٹینس میں زیادہ محو رہتی۔ ابرول صاحب اپنی بیوی کی مہارت پر پھولے نہ سماتے۔ اور جب سدرشن سنہا سے مات کھا کر
ابرول سے ہاتھ ملاتا ہوا کہتا "ہاؤ لکی یو آر ٹو ہیو ویمن ڈیم!" تو ابرول صاحب کا دماغ آسمان پر جا پہنچتا۔ لیکن سنہا دل مسوس کر
رہ جاتی۔

"ابرول! اب تم ایک گیم سنہا سے کھیل کر دکھاؤ۔" سدرشن قہقہہ لگا کر کہتا۔ اور ابرول کو اپنے جسمانی بھدے پن کا
احساس لے ڈوبتا۔ اور وہ اکثر یہی کہہ دیتا "ابھی شادی ہو جانے دو پھر تمہاری بیوی کے ساتھ کھیلا کروں گا۔"
اور ابرول کی اونچی ناک کے نیچے یہ کھیل کھیلا جاتا رہا۔

دسمبر کی آخری شب کلب کا ڈنر تھا۔ ہال اور لان جگمگا رہے تھے۔ درختوں میں جگنوؤں کی مانند ننھی ننھی بتیاں روشن تھیں۔
ہر مرد اور عورت اپنے بہترین لباس اور میک اپ میں تھی۔ سدرشن ڈنر سوٹ میں کسی مغربی ملک کا باشندہ معلوم ہوتا تھا
سنہا نے گرین رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی جس پر جا بجا سرخ زرد اور سیاہ رنگ کے چھینٹے اڑ رہے تھے۔ بالوں میں پانی کی لہروں
سا ابھار چڑھاؤ تھا اور یہ سیاہ آبشار عریاں کندھوں اور پشت پر گر کر ایسی بھینی بھینی خوشبو بھری پھوار اڑا رہا تھا جو قریب آنے
والوں کو از خود رفتہ کیے دیتی تھی۔ سب ممبران چھوٹے چھوٹے بلوریں پیالوں میں لائٹ ڈرنکس لیے لان میں گھوم رہے تھے۔ ہر شخص
خوش اخلاقی کا نمونہ بننے کی سعی کر رہا تھا۔

سنہا مسٹر ابرول کے ساتھ اور کبھی اکیلی ہی اپنے دوستوں اور سہیلیوں سے ملتی رہی۔ اُس نے سدرشن کو دیکھا اور اُس کی طرف نہیں گئی
وہ سدرشن پر اپنا جادو آزمانا چاہتی تھی۔ اور یہ چال کارگر رہی۔ جب سدرشن اکیلی پا کر خود ہی اُس کے قریب آ گیا۔ اور آم کے ایک پیڑ کے نیچے اُس
کا ہاتھ تھام لیا۔ سنہا اُسے کچھ نہ کہہ سکی۔ بس مد بھری آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھتی رہی۔ جیسے اُسے اپنی تکمیل کی دعوت دے رہی ہو۔

"سنہا! کیا تم آج کے پروگرام میں کچھ سناؤ گی!" سدرشن نے حسن کے سحر کو توڑتے ہوئے کہا۔

"ہاں ایک غزل! سنا ہے آپ نے بھی خوب گلا پایا ہے۔"

"یونہی، کبھی کبھی باتھ روم میں گنگنا لیتا ہوں۔ آؤ چلیں سب لوگ اندر جا رہے ہیں۔"

محفل قہقہوں اور تالیوں سے گونجنے لگی۔ سنہا کی پر وقار شخصیت سے متاثر ہو کر ہی سامعین تالیاں بجانے لگے۔ لیکن جب اُس نے غزل
پیش کی تو یہ جادو اترنے لگا۔ وہ خلافِ توقع جم نہ سکی۔ سامعین ناک منہ سکوڑتے رہے۔ نہ سوز نہ گداز نہ ترنم نہ ادا۔"

سدرشن مدعو کر کے جنگلوں کے بعد سدرشن سٹیج ڈائس پر آئے۔ اور جب اُنھوں نے ایک غزل کا مطلع ؎

دل میں محبوب کا گھر ہو تو غزل ہوتی ہے   زندگی خاک بسر ہو تو غزل ہوتی ہے

ترنم میں پڑھا تو ساری محفل جھوم اُٹھی۔ واہ واہ! مکرر مکرر!! کی آوازوں کا شور بلند ہوا۔ تو سنہا کو ایسا محسوس ہوا جیسے سدرشن ایک ہی شعر میں

اُسے مات دے گیا ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ سوچنے لگی کہ یہ غزل کہیں سدرشن کے دل کی آواز تو نہیں ؟ کیا اُس نے مجھے اپنے دل میں جگہ دے دی ہے یا اس مقصد کا پیام دے رہا ہے ـــــ

نغمہ ہوتا ہے مرتب شکستِ دل سے ۔۔۔ آنکھ جب خون سے تر ہو تو غزل ہوتی ہے

اہلِ محفل وجد میں جھومنے لگے ۔

اور جب گیت سنگیت کے بعد ڈنر پلیٹیں اُٹھائے سب ممبران خورد و نوش میں مصروف تھے تو سنہا سدرشن کو مبارک باد دینے کیلیے ہال کے ایک کونے میں جا پہنچی۔

"سوئیٹ یو آر سدرشن جی ! کیا غزل تھی ! ایمان سے قربان ہو جانے کو جی چاہتا ہے !"

سدرشن مسکراتے ہوئے بولا ۔ "لیکن تم سے بڑھ کر نہیں ! سنہا تم خود ہی غزل ہو ۔ کیوں ، مستی میں ڈوبی ہوئی غزل !"

سنہا جواب میں کچھ نہ کہہ سکی ۔ اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مسکراتی ہوئی آگے بڑھ گئی ۔ جیسے اُس کی پیاسی روح کو ساحل مل گیا ہو ۔

چوری چھپے کے یہ اشارے ، یہ ملاقاتیں کلب اور آفیسرز بنگلوں میں جاری رہیں ۔

"سنہا تم حد سے تجاوز کرتی جا رہی ہو ۔ جانتی ہو یہ مشرق ہے ۔ یہاں مغربی طور و طریق کو دیکھ کر خوش تو ہوا جاتا ہے ، اپنایا نہیں جاتا ۔" شیلا نے ایک رات سنہا سے کہہ ہی دیا ۔

"میری تسکین سے شاید تمھیں حسد ہو رہا ہے ۔ لیکن اس کے لیے میں کسی بھی حد تک جانے کو تیار ہوں ۔" اور شیلا کو پھر بات کرنے کا حوصلہ نہ ہوا ۔

مسٹر ابرول کچھ دنوں کے لیے ڈیوٹی پر بھاکڑہ گئے ہوئے تھے ۔ وہاں اُن کی طبیعت ناساز ہو گئی ۔ اُنھوں نے سدرشن کو فون کیا ۔ کہ وہ سنہا سے کہے کہ وہ ننگل آ جائے ۔ سدرشن پیغام پہنچانے کے لیے سنہا کے یہاں گیا ۔ سنہا باغیچے میں مولسری کے پیڑ کے نیچے کرسی پر بیٹھی کتاب دیکھ رہی تھی ۔ وہ ابھی ابھی نہا کر آئی تھی ۔ اُس کے بالوں میں سے پانی کے قطرے اُس کے کندھوں اور سینے پر سفید اطلسی قمیص میں سے ہوتے ہوئے اُس کے جسم کے دریچے کھولتے جا رہے تھے ۔

سدرشن کے پیغام سے وہ اس کی توقع کے خلاف پریشان نہیں ہوئی ۔

"آپ کیا پئیں گے سدرشن جی ! چائے یا کولڈ ڈرنک ؟ میرے خیال میں آپ کو روح افزا پلایا جائے ۔ لیجیے ، کرسی لیجیے ۔ میں ابھی آئی ۔"

اور وہ بالوں کو لپیٹتی ہوئی اندر چلی گئی ۔ سدرشن بیٹھا سوچتا رہا ۔ عجیب لڑکی ہے ۔ اسے اپنے شوہر کی بیماری سے کچھ تشویش نہیں ۔ کیا اسے اپنے شوہر سے کوئی ہمدردی نہیں ؟ اگر ہے ، تو کیا وہ اس کی وفاداری کا دم نہیں بھرتی ۔ اگر بھرتی ہے تو وہ سب جھوٹ اور فریب ہوگا ۔ اگر اُسے ابرول سے ہمدردی نہیں تو وہ اُس کی وفادار بیوی ہونے کا ڈھونگ کیوں رچائے ہوئے ہے ۔ صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتی کہ ہمارے راستے الگ الگ ہیں ۔

اتنے میں سنہا سرخ شربت کے دو گلاس سفید ٹرے میں رکھ کر آئی اور تپائی پر رکھتے ہوئے بولی "شاعر صاحب ! بتائیے یہ ساتھ ساتھ رکھے گلاس کیسے معلوم ہوتے ہیں ؟

"جیسے کسی غنچہ دہن کے لب !"

"[illegible] سنہا [illegible] مسکرا اٹھی ۔

" جیسے کسی کے لب کسی کے لبوں کے قریب آ گئے ہوں !" سہنا سر جھکاتے ہوئے بولی ۔ " لیجیے ، گرم ہو جائے گا ۔
"کیا خوبصورت تشبیہ ہے سہنا ! جواب نہیں تمھارے ذہنِ رسا کا ۔ ایمان سے تم غزل ہو سرتا پا کیف !" سدرشن نے اُٹھ
لکھنوی انداز میں آداب عرض کرتے ہوئے کہا ۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ چونک اُٹھا کہ وہ تو خود ہی بہک گیا ہے ۔ وہ کہنے کیا آیا
اور کھو کہاں گیا ہے ؟
مسٹر ابرول نے کتنی پر درد آواز میں التجا کی تھی ۔ مجھے بہت تکلیف ہے ۔ سہنا کو بھیج دو ! اس لیے وہ ایک ہی سانس میں شربت
آدھا گلاس حلق میں اُنڈیلتے ہوئے بولا ۔ " پھر آپ کب جا رہی ہیں ؟ ابرول صاحب کی طبیعت زیادہ ناساز معلوم ہوتی تھی "
" لیکن میری تو ٹھیک ہے ۔ اتنی جلدی کیا ہے ۔ ذرا سوچنے تو دیجیے ۔ کیوں ، شربت پسند آیا ؟" سہنا نے پھر بات کا رُخ بدلنا چاہا
" آپ بنائیں اور پسند نہ آئے ۔ لیکن آپ کون سی بس سے جا رہی ہیں ؟
" میں یہی سوچ رہی ہوں ۔ کیا آپ مجھے چھوڑنے نہیں جا سکتے ۔ آپ کی کار میں ہم تین گھنٹے میں وہاں پہنچ جائیں گے ۔ میرے خیال
میں آپ انکار نہ کریں گے ـــــ پلیز ڈو اِٹ فار می ۔ بہت اچھا سفر رہے گا ۔ آپ آئیے ، میں تیار ہوئی جاتی ہوں "
سدرشن گلاس خالی کر کے اُٹھ کھڑا ہوا ۔ دونوں ہاتھ پشت کی جانب باندھے سوچتا ہوا اپنے بنگلے کی طرف چلنے لگا کہ وہ کیوں
مکڑی کے جال میں پھنستا چلا جا رہا ہے ۔ وہ کیوں اُس کے حسن سے اتنا مرعوب ہو جاتا ہے ۔ وہ اُسے کیوں نہیں کہہ سکتا کہ یہ راستہ اچھا نہ
دوست سے وشواس گھات ہے ! لیکن سہنا ایک فروزاں شمع ہے جس کے قریب جا کر وہ بھول جاتا ہے کہ اس کی قربت خودکشی ہے
اپنے آپ پر اعتماد کیوں نہیں رہا ۔ اُس نے سہنا کو کار پر لے جانا کیوں منظور کر لیا ۔ کیا وہ اس سے کہہ نہیں سکتا تھا کہ کار بگڑی ہوئی
وہ گاڑی یا بس سے چلی جائے ۔
ان خیالات کے باوجود وہ کچھ دیر بعد گاڑی لیے سہنا کے دروازے پر آ گیا ۔
" آئی ڈارلنگ ...." کار کا ہارن سنتے ہی سہنا کے منہ سے بے اختیار نکل گیا ۔ سدرشن نے دیکھا ، سہنا ہاتھ میں اٹیچی کیس
باریک آہنی ایڑیوں کے سینڈل سے فرش پر نغمے بکھیرتی اندر سے چلی آ رہی تھی ۔ وہ اُسے دیکھ کر بھونچکا سا رہ گیا ۔
کیا سہنا بیمار شوہر کی تیمارداری کے لیے جا رہی ہے یا پکنک کے لیے ؟ اُس کے بہکتے ہوئے گیسو ، حسین چہرے کی آرائش خوشبو
میں بسا ہوا پرکشش لباس ۔ اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا تیز خوشبو کے ایک جھونکے نے اُس کے ذہن کو مفلوج کر دیا ۔
سہنا خود ہی اگلی سیٹ کا دروازہ کھول کر اُس کے قریب بیٹھ گئی ۔ سہنا اُس کے قریب ہوتے ہوئے بولے چلی جا رہی تھی
گھبرایا ہوا کار چلاتا رہا ۔ کئی بار تو وہ بھی بہک جاتا ۔ ہوشیار پور کے بعد شوالک کی حسین پہاڑیوں میں بل کھاتی ہوئی سڑک شروع ہو گئی ۔
کئی بار کار اتنی تیز ہو جاتی کہ خطرناک موڑوں پر جان لبوں پر آتی نظر آنے لگتی ۔ سہنا پہاڑوں کی ہوا سے از خود رفتہ ہو کر ایک گیت
گنگنانے لگی ۔
" سہنا آج تمھیں کیا ہو رہا ہے ؟
" سدرشن کچھ نہیں ، پیاما جو مدتوں سے پیاسا ہے دریا کے کنارے آ کر سارے دریا کو پی جانا چاہتا ہے "
" لیکن جانتی ہو اس کا نتیجہ کیا ہوگا ؟ دریا پیاسے کو ساتھ ہی بہا لے جائے گا !" سدرشن نے ایک خطرناک موڑ کاٹتے ہوئے کہا
" اچھا ہے ۔ کم از کم پیاس کی سلگتی ہوئی آگ تو شانت ہو جائے گی ۔ روح کی جلن تو مٹے گی "
" تو آؤ پیاس بجھا لی جائے " سدرشن نے کار روکتے ہوئے کہا ۔ سہنا گھبرا کر چاروں طرف دیکھنے لگی ۔ " آؤ نا ، دیکھو اس چٹان

کیسا پانی پھوٹ رہا ہے۔ گاڑی چلاتے چلاتے حلق سوکھ گیا ہے۔" اور سدرشن نے پہاڑی دیوار سے پھوٹتی ہوئی دھار کے آگے اوک لگا دی۔

"شربت کہیں کے!" سنہا دوپٹے کو ہوا میں لہراتے ہوئے بولی۔ پھر اوک سے پانی پینے لگی۔ اور وہاں سے کار کے قریب آکر شیشے میں اپنی لپ سٹک کی نلی سے ہونٹوں کے خطوط درست کرتے ہوئے بولی۔ "سدرشن یہ رومانی گھڑیاں ٹھہر نہیں سکتیں۔ کیا یہ بلندیاں، یہ گھاٹیاں، یہ ٹھنڈی ہوائیں، یہ سبز درختوں پر دھوئیں کے بادل، یہ پہاڑیوں کے سیاہ دامن، یہ چٹانیں، یہ ساتھی، یہ عمر، یہ جوانی سب ہمیشہ کے لیے رُک نہیں سکتے ـــــ میں چاہتی ہوں ....." اتنے میں پہاڑ کی اوٹ سے کسی بس کا ہارن ہوا جو راستہ چھوڑنے کا سگنل تھا۔

"نہیں سنہا اس دنیا میں کسی چیز کو قرار نہیں۔ نہ نفرت کو نہ محبت کو، نہ اس حسین موسم کو، نہ اِن نشیلی ہواؤں کو۔ بیٹھو نکل چلیں۔ شام ہو رہی ہے۔ لیٹ ہو گئے تو شاید بھاکرہ نہ جا سکیں۔ کیونکہ ہو سکتا ہے ابرول وہیں ہو۔"

اور سدرشن کی فیئٹ کار ہواؤں سے اٹھکیلیاں کرتی ڈھلوانوں کی طرف بڑھنے لگی۔ ننگل پہنچتے پہنچتے شام ڈھل گئی تھی۔ سنہا کی طبیعت سفر کے باعث اچھی نہیں رہی تھی۔ ریسٹ ہاؤس سے فون کرنے پر معلوم ہوا کہ ابرول کو اس کا ایک دوست روپڑ لے گیا ہے۔

"چلو رات ہونے سے پہلے پہلے ہم روپڑ پہنچ جائیں۔" سدرشن نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میری طبیعت اچھی نہیں ہے۔ میں تو کچھ دیر آرام کروں گی۔" سنہا اندر کمرے میں بچھے پلنگ پر جا کر لیٹ گئی۔

سدرشن خود اس جذباتی کشمکش کے شعلوں سے لڑتے لڑتے نڈھال ہو رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کہیں سے وِسکی پی کر سو جائے۔ وہ لان میں رکھی ہوئی ایک بنچ پر بیٹھا اس حسین لیکن پرخطر کھیل کے نتائج پر غور کرتا رہا۔ پھر اُٹھ کر ننگل ڈیم پر آفیسرز کلب میں چلا گیا۔

رات ہو چلی تھی۔ خوشبو اور ستلج کے پانی کی پھوار سے لدی ہوا کلب کے سبزہ زار کو گوشۂ جنت بنائے ہوئے تھی۔ سدرشن نیلی بتیوں کے رومانی دھندلکے میں کونے میں رکھی ہوئی ایک میز پر بیٹھا وہسکی کے ہلکے ہلکے گھونٹ پی کر کچھ گہری یادوں کو فراموش کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ سنہا بھی اُس کے پاس آگئی۔

"ہیلو! تم کہاں!!" سدرشن گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

"اور آپ کہاں! کیا اسی طرح ساتھ دیا کرتے ہیں ـــ؟"

"معاف کرنا میری طبیعت بہت خراب ہو رہی تھی۔"

"اور میری تو آپ سے بھی زیادہ خراب تھی۔ چوکیدار سے آپ کو پوچھا۔ اور میں بھی یہیں چلی آئی۔"

"اچھا کیا پیئیں گی۔ شیری یا بیر؟"

اور دونوں ہاتھوں میں بلوریں گلاس پکڑے ٹہلنے لگے۔ دریا کی جانب پانی کے ٹکراؤ سے اُٹھتی ہوئی پھوار اور بتیوں کی روشنی سے اُن میں پیدا ہوتی ہوئی قوسِ قزح، نیچے ننگل چینل میں بہتے ہوئے سبزی مائل پانی پر سفید جھاگ، لہروں کے مدھر نغمے، معطر ہوا۔ اور پرکیف فضا۔ وہ دونوں کھڑے دریا کے پار نئے ننگل کی روشنیوں کو دیکھ رہے تھے۔

"زندگی یہی چند گھڑیاں ہیں سنہا!"

"بشرطیکہ یہ اپنی ہوں!" سنہا قہقہہ مار کر ہنسنے لگی۔

سدرشن نے مزید ڈرنکس اور مچھلی کے کٹلس کا آرڈر دیا۔ وہ دونوں کبھی میز کے گرد بیٹھتے کبھی لان میں گھومتے۔ کلب کی باتوں،

شعر و شاعری، فلموں کے رومان میں اُلجھے رہے۔
شمال مشرق کی پہاڑیوں کے پیچھے سے چاند اُبھر آیا۔ سہنا کی آنکھوں کے پردے بوجھل ہوگئے۔
"چلو واپس ریسٹ ہاؤس چلیں۔ تم کہیں لڑکھڑانے نہ لگو۔"
"میں ٹھیک ہوں میرے دوست! مجھے نیند آرہی ہے۔ کتنی لطیف ہوا ہے۔ جیسے ستلج کی پھوار اس میں نشہ بھرتی جارہی ہو۔ وہ غالب کا کیا شعر سنایا تھا آپ نے! ؎ بادہ نوشی ہے باد پیمائی
"آؤ ریسٹ ہاؤس چلیں" سہنا نے اپنا گرم ہاتھ سدرشن کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا۔
سدرشن بہت احتیاط سے سہنا کو سیڑھیوں سے اتار کر نیچے کار میں لے گیا۔ چاند پوری تابانی سے نیلے آسمان پر چمک رہا تھا نیچے ننگل نہر کے مچلتے پانی کی گود چاندنی سے بھر گئی تھی۔ سڑک سنسان ہو رہی تھی۔ کار آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔
"سدرشن اندر میرا دم گھٹنے لگا ہے۔ آؤ نہر کے کنارے بیٹھ کر کوئی گیت گائیں" اور سہنا نے فٹ بریک پر پیر رکھ دیا۔ وہ دونوں اتر کر نہر کے کنارے آ کھڑے ہوئے۔
"تم اس چاندنی کو پکڑ سکتے ہو؟" سہنا سدرشن کے بازو پکڑتے ہوئے بولی۔
"اوں ہوں!"
"تو کیا تم لہروں کی گود میں کھیلتے ہوئے چاند کو پکڑ سکتے ہو؟" سہنا اُس کے کندھے پر جھک گئی۔
"چلو ریسٹ ہاؤس چلیں، تمہاری طبیعت اچھی نہیں ہے۔ اور صبح سویرے ہمیں روپڑ بھی جانا ہے" سدرشن نے سہنا سے الگ ہوتے ہوئے کہا۔
"تم اتنے بے حس، اتنے جذبات سے خالی اور سرد کیوں ہو رہے، سدرشن! کیا تمہاری روح تمہیں کچھ نہیں کہتی؟"
سدرشن کوئی جواب دینے کی بجائے ایک پتھر پر پاؤں ٹکا کر چاند اور لہروں کی آنکھ مچولی دیکھتے ہوئے کسی سوچ میں پڑ گیا۔
"تم کیا سوچ رہے ہو فلاسفر؟ روپڑ جانا ہوگا۔ نہیں ہم وہاں نہیں جائیں گے۔ آؤ لوٹ چلیں۔ شوالک کی پہاڑیوں کے جنگلوں میں کہیں کھو جائیں۔ طوفانی ناؤں کے گیتوں میں اپنی آواز کو گم کر دیں ــــ تمہیں کیا ہو رہا ہے سدرشن! کیوں زندگی کا گلا گھونٹ رہے ہو؟ تم مجھے کس نام سے پکارتے ہو میرے محبوب!"
"غزل!" سدرشن نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔
"تو کیا تمہیں اب یہ غزل پسند نہیں؟ میرے خوابوں کے شہزادے کیا سوچتے ہو ــ؟"
"پسند ہے۔ لیکن میں سوچتا ہوں کہ اگر کل میں نے کوئی اس سے اچھی غزل سن لی، تو اس غزل کا کیا ہوگا؟

ماہنامہ
نگارش کا "افسانہ نمبر"
جون ۱۹۶۵ء میں شائع ہو رہا ہے

امّ عمارہ منشور کراچی

بیچاری منّی

گرمیوں کا دم ٹوٹ رہا تھا، جاڑا اپنے سارے لوازمات کے ساتھ پر پھیلائے بڑی تیزی سے چلا آرہا تھا۔ ہم لوگوں نے اب آنگن یا اُسارے میں سونے کی بجائے کمروں میں سونا شروع کر دیا تھا۔ بڑے بڑے کاٹھ کے صندوق کھل گئے تھے۔ اور توشک لحاف نکال رہے تھے۔ گرم کپڑوں کو دھوپ دکھا دکھا کے کھلے بکسوں میں استعمال کے لیے رکھا جا رہا تھا۔ دن کو دھوپ تو اب بھی ویسی ہی جان لیوا تھی۔ لیکن راتیں سرد ہو چلی تھیں۔ کمرے میں سونے کے باوجود جسم پر ایک چادر ڈالنی پڑتی تھی۔

انھیں دنوں ہمارے ہاں بڑی آپا اپنے نصف درجن بچوں کے ساتھ براجمان ہوئیں۔ گرمیاں ہوتیں تو شاید اتنی دقت نہیں ہوتی۔ یہ بڑی کھلی چھت دو دو لمبے چوڑے اُسارے اور چٹان جیسا آنگن تھا۔ لیکن اس زمانے میں ڈیڑھ درجن آدمیوں کا گزر چار کمروں میں ایک ایسا پرابلم نظر آرہا تھا جس کا کوئی حل نہ ہو۔ سارے کمرے اکٹے ہوئے ہماری جان کو روتے رہتے۔ ایک طرف ابھی صاف ستھرا کر کے دوسری طرف نظر اٹھائی تو دیکھا بڑے مزے سے کاٹھ کباڑ پھیلا ہوا ہمیں کام کی دعوت دے رہا ہے۔ تمام دن ایک نہ ایک کام جان میں روگ کی طرح لگ کر رہ گیا تھا۔ اور اوپر سے آپا کا ڈر الگ جو ذرا کی ذرا میں خفا ہو جاتی تھیں۔ ہم تو خیر تھے ہی کولھو کے بیل، خالہ ہونے کے ناتے بیچاری منّی کو بھی ان کے بچوں کا مان رکھنا پڑتا تھا۔ اب یہ بات الگ تھی کہ آپا کے منّے چنّے اور بے بی ہی منّی کے ماموں خالہ لگتے تھے۔ نہ صرف عمر میں بلکہ قد اور کاٹھ میں بھی وہ اس کے ڈیوڑھے تھے۔ پھر بھی وہ بچّہ تھے اور بیچاری منّی بڑی

ابھی ذرا کے ذرا اُس نے کیلے والے سے دو کیلے لیے ہیں کہ بے بی آدھمکیں۔

"منّی خالہ مجھے بھی کیلا۔"

"منّی خالہ ایک ہم کو!" منّے چلّائے جو بھیّا کا لمبا کرتا پہنے ہونے والے ڈرامے میں مولانا کا پارٹ ادا کرنے کے لیے ریہرسل کر رہے تھے۔

"مجھے بھی دیجیے۔" جناب چنّے صاحب روشنائی سے مونچھیں بنائے تشریف لائے۔

اُس نے غصّے سے اُن کی طرف دیکھا جو بڑی عزت سے اس کا نام لے رہے تھے۔ کم ظرف، خود غرض۔ یوں تو وہ منّی تھی اور

کبھی کبھی تو منیا کہنے سے بھی نہیں چوکتے ہیں۔ اور اب اُس نے چڑ کے منّے کی طرف دیکھا۔ جو بھیّا کے لمبے کرتے میں مولانا سے زیادہ بھک منگے نظر آرہے تھے۔

"تم اپنی ماں سے پیسے مانگ لو۔ وہ بیٹھا ہے دروازے پر کیلے والا" اُس نے سہم کر کیلوں کو فراک کے دامن میں چھپالیا۔ اور خوفزدہ نظروں سے منّے کو دیکھنے لگی، جو روشنائی کی کڑی کڑی مونچھیں بنائے بہرام ڈاکو کا پارٹ کر رہا تھا۔ وہ اس وقت اُسے سچ مچ کا ڈاکو دکھائی دے رہا تھا۔ جو اُس کے دل پسند کیلوں پر چھاپا مارنے کے لیے تیار تھا۔

"دیتی ہو سیدھی طرح کیلا یا میں کہوں نانی اماں سے" چھنّے نے دھمکی دی۔

"کہدو، میں کچھ ڈرتی تھوڑی ہوں" منی نے تن کے کہا۔

"اماں، اے نانی اماں" چھنّے چلاتا ہوا آنگن کی طرف دوڑا۔

اور پھر اماں شروع ہو گئیں۔

"دیدو منّی کیلا۔ تم تو بڑی اچھی بیٹی ہو۔ اے بیٹے یہ منّے چھنّے تو تمھارے بیٹے ہیں۔"

"مجھے نہیں چاہئیں ایسے ہوتق بیٹے" اُس نے جل کے دل ہی دل میں سوچا۔ اور خاموشی سے کیلا چھیل کر کھانے لگی۔

"اللہ۔ امّی۔ نانی اماں۔ ہائے کیلا۔ ہم کو کیلا" منّے چھنّے گلا پھاڑ کر چلائے۔ اور بے بی نے رونا شروع کر دیا۔

"منّی!" اماں چیخیں اور منہ کی طرف بڑھتا ہوا ہاتھ ایک دم گر پڑا۔ دو سموچے اور ایک ادھ چھلا کیلا زمین پر آرہے۔ اور بڑی آپا کے لاڈلے مربھکوں کی طرح اُن پر ٹوٹ پڑے جیسے کبھی کیلا میسر ہی نہ ہو۔

"ندیدے بے تمیز" منی نے حقارت سے اُن کی طرف دیکھا۔ اور فراک کا دامن جھاڑتی ہوئی دروازے سے باہر نکل گئی۔

جب سے بڑی آپا آئی تھیں۔ کوئی بھی اُس کا خیال نہ کرتا تھا۔ باجی، اچھے بھیا، اماں، سب کے سب آپا کے لاڈلوں کو ڈھوئے پھرتے۔ کہیں ان لوگوں کو لیمن چوس دے رہے ہیں تو اچھے بھیا اُن کے لیے شریفے لا رہے ہیں۔ باجی کالج سے اُن کے لیے کبھی امرود تو کبھی کیلا اور نہیں تو مٹّی کے رنگ برنگ کھلونے۔

آپا کے آنے سے پہلے وہ سب کی لاڈلی تھی۔ آپا کے بچوں کے سامنے تو وہ ایک دم بڑی ہو کر رہ گئی تھی۔ کبھی کبھار بھولے بھٹکے کہیں بھیّا اُسے گود میں اُٹھا لیتے تو بے بی صاحبہ جو خیر سے اُن کی ہم عمر تھیں گلا پھاڑنے لگتیں۔ ابھی اسی دن کی بات ہے کہ بھیا باہر سے آئے تو وہ دروازے پر بیٹھی بڑی مایوسی سے سڑک کی طرف دیکھ رہی تھی کہ بھیا نے اُسے گود میں اٹھا لیا۔

"نہیں۔ آں۔ چھوڑیئے" وہ مچل گئی۔ وہ انھیں بتا دینا چاہتی تھی کہ ان سے خفا ہے۔ لیکن بھیا نے اُسے مضبوط باہوں میں بھر لیا۔ اور کاندھے پر اُٹھائے ایک ہاتھ میں ٹافیوں کا لفافہ جھلاتے ہوئے آنگن کی طرف آئے۔ سامنے آنگن میں چھنّے منّے، بے بی اُس کے ازلی بیری لٹّو نچانے میں مصروف تھے کہ بے بی کی نظر اُس پر پڑ گئی اور منی نے لفافے میں سے ٹافیاں مٹھی میں بھرتے ہوئے بے بی کا منہ چڑا دیا۔

"ارے ماموں جی" چھنّے چلایا۔ اور آنگن میں بھگدڑ مچ گئی۔ منّے، چھنّے، بے بی، ننھی سب کے سب بھیا کے گرد جمع ہو گئے۔ کوئی اُن کی ٹانگ سے لپٹ گیا۔ کوئی باہیں پکڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ اور ڈینا پھیلائے بے بی اُسے کسی کچن سے کم نہیں نظر آئی۔ بھیا نے منّی کو گود سے اتار دیا۔ اور بے بی اپنے گرد آلود ہاتھ پاؤں سے بھیا کے برف جیسے کرتے پاجامے پر گل بوٹے بناتے ہوئے اُن کی باہوں میں جھول گئی۔ اور منّے چھنّے ٹافی کے لفافے کے لیے چھین جھپٹ کرنے لگے۔

منّی نے لفافہ اُن کی زد سے بچانے کی کوشش کرتے ہوئے بھیّا کو احتجاجی نظروں سے دیکھا۔
"دیکھو بھئی منّے چھنّے۔" بھیّا ابھی اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ اماں آگئیں۔
"کیا ہو رہا ہے منّی، دید و ٹافی بچوں کو
"نہیں دیتی ۔" منّی نے لفافے پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے کہا۔
"بچوں کو" جیسے وہ تو سدا کی بڑھیا تھی۔ اُس نے غصہ سے اماں کو دیکھا۔ اور آنگن سے جانے کے لیے مڑی۔
"نانی اماں ۔ ایں ۔ نانی اماں ٹافی ۔ ہائے آں۔" چھنّے نے ہاتھ آئے ہوئے مال کو یوں نکلتے ہوئے دیکھ کر فریاد کی۔
"منّی بیٹی ۔" اماں نے بڑے میٹھے لہجے میں پکارا۔ لیکن منّی نے پلٹ کر دیکھنے کی زحمت تک گوارا نہیں کی۔ اور بڑی تیزی سے کمرے کی طرف مڑی۔ وہ اماں کے میٹھے لہجہ کا مطلب اچھی طرح جانتی تھی۔ اور کسی قیمت پر بھی ہاتھ آئی ٹافیاں ان ندیدوں کو دینے کے لیے تیار نہ تھی۔ لیکن اماں کی مسلسل پکار اُس کے قدموں میں زنجیر بن کے لپٹ گئی۔ اور وہ آہستہ آہستہ مری ہوئی چال سے اماں کے قریب آکر کھڑی ہو گئی۔
"بیٹی اتنی ساری ٹافیاں ہیں۔ ان میں سے بے بی اور ننھی اور منّے چھنّے کو بھی دیدو۔ یہ سب تمھارے بھانجے بھانجیاں ہیں نا۔ اور پھر کھانے سے راجہ کے گھر بیاہ ہوتا ہے۔ راجہ گھر جائے گی میری بیٹی، رانی کہلائے گی۔" اماں نے بہلا دیا۔
"نہیں جاتی راجہ کے گھر۔ نہیں بنتی رانی۔" منّی نے جلبلا کے ٹافی کا لفافہ پھینک دیا۔ اور زمین پر پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی۔
اماں نے اُس کی حالتِ زار کی پروا نہ کرتے ہوئے ٹافی گن گن کر چھنّے منّے اور دوسروں کو دیں۔ اور اُس کے حصّہ کی ٹافیاں اُس کے آگے ڈال کر باورچی خانے کی طرف چلی گئیں۔ منّی نے ٹافیوں کو اُٹھا کر دور پھینک دیا۔ اور زار و قطار رونے لگی۔ "اللہ کرے مجھے موت آجائے۔ دوسروں کی آئی مجھے آجائے۔" ابھی کل بڑی آپا اپنی موت کی دعا مانگ رہی تھیں تو اس نے سنا تھا۔
"میں مر ہی جاؤں اللہ میاں۔" مارے صدمے کے منّی کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔
"ارے تم مرنا چاہتی ہو منّی۔" منّے نے زمین پر بکھری ہوئی اس کے حصّے کی ٹافیاں اپنے قبضے میں کرتے ہوئے کہا۔
"ہاں۔ اور کیا۔" منّی نے سوں سوں کرتے ہوئے کہا۔
"بڑی اچھی بات ہے کل کو مرتی آج ہی مر جاؤ۔" منّے بڑے مزے لے لے کے اُس کی ٹافیاں کھا رہا تھا۔ اور جیسے کسی نے منّی کا کلیجہ چٹکیوں سے مسل دیا۔
"کیوں مر جاؤں بھلا؟" منّی بلّی کی طرح غرّائی۔
"ارے تم مرو گی تو میلاد ہو گا، مٹھائیاں کھانے کو ملیں گی، چالیسی میں پلاؤ بیٹھا ٹکڑا پکے گا۔ اور ہم مزے سے کھائیں گے۔ جیسے دادی بی کی چالیسی میں کھایا تھا۔" چھنّو نے لٹو پر ستی لپیٹتے ہوئے کہا۔
"پھر اللہ کرے تم سب مر جاؤ۔ منّے، بے بی، ننھی۔ تم سب کے سب تاکہ مجھے ڈھیر ساری مٹھائی ملیں۔ اللہ کرے تم لوگ مر ہی جاؤ۔ لے کے میری ساری ٹافیاں ....."
"کیا بک بک لگا رکھی ہے ۔۔؟" بڑی آپا سر پر کھڑی اُسے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہی تھیں۔ وہ سہم گئی۔
"ہمارے مرنے کی دعائیں مانگ رہی تھیں منّی خالا۔" ننھی نے آگ لگائی۔ یہاں چھوٹے بڑے سب ہی اس کے بیری تھے۔

ننھی کا یہ کہنا تھا کہ بڑی آپا نے آفت ڈھا دی۔ اور جب تک اماں نے دو چار طمانچے منّی کو نہیں لگائے چپ نہیں ہوئیں۔ اماں کی تھپڑیں کھا کے پناہ کے لیے بھیّا کی طرف بھاگی تو وہاں بے بی پہلے ہی سے براجمان تھی۔ بھیّا میز پر جھکے کچھ لکھ رہے تھے اور بے بی دوسری کرسی پر بیٹھی ان کا دماغ کھا رہی تھی۔

"آج ان کی پٹائی ہوئی ہے۔" بے بی نے منّی کی طرف دیکھتے ہوئے اترا کے بھیّا کا بال کھینچا۔

اُس نے بے بی کی بات کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا۔ بس چپ چاپ میز کے پائے سے لگی مڑ مڑ بھیّا کا منھ دیکھے جا رہی تھی کہ شاید بھیّا کو پیار آ جائے۔ لیکن بھیّا نے کوئی نوٹس نہیں لی۔ خاموشی سے قلم چلاتے رہے۔ ادھر بے بی اتراتی رہی وہاں سے چڑ کے وہ اماں کے کمرے میں جا کر بستر کھوندنے لگی۔ انتقاماً سارا بستر، توشک، لحاف، چادریں سب ایک ایک کر کے رکھ دیں۔ اور پھر تکیے پر سر رکھ کے بیٹھ گئی۔

"اگر میں ذرا بھی بڑی ہوتی تو منّے چنّے، بے بی، سب کو اتنا مارتی، اتنا مارتی کہ بس۔" منّی نے پاس پڑے تکیے کو سہلانا شروع کر دیا۔

"اللہ میاں، اے اللہ میاں، مجھے جلدی سے بڑا کر دو۔ بس ابھی بڑا کر دو۔" وہ بلک بلک کر گڑگڑانے لگی۔ اُس نے دادی جی سے سنا تھا کہ وہ دعائیں جو گڑگڑا کر مانگی جاتی ہیں قبول ہو جاتی ہیں۔

وہ بلکتی رہی اور تکیے پر ہاتھ پھیرتی رہی۔ پھر اُس نے محسوس کیا جیسے وہ بڑھ گئی ہے۔ یہ بڑے بڑے ہاتھ پیر ہو گئے ہیں اس کے لانبا قد باجی سے بھی آگے نکل گیا ہے۔ اور انگلی بھر کا بال بڑھ کے گھٹنوں کو چھو رہا ہے۔ بالکل بڑی آپا کی طرح۔ وہ مارے خوشی کے جھوم اُٹھی۔

"واہ! اب آئیں یہ منّے چنّے بتاتی ہوں ان کو۔"

وہ بڑے اطمینان سے اپنی لمبی چوڑی جسامت دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی تھی کہ سامنے سے منّے چنّے بے بی اور ننھی لڑتے جھگڑتے چیختے ہوئے آتے دکھائی دیے انھیں دیکھ کر اُسے اپنی ایک ایک مصیبت یاد آنے لگی۔ وہ بڑی تیزی سے اُن پر جھپٹی اور دے دھول دھول انھیں پیٹ کر رکھ دیا۔ ابھی وہ اُسے جی بھر کے پیٹ بھی نہ پائی تھی کہ اُس کا جوڑا کھل گیا۔ اور وہ اپنے گز بھر لمبے بال میں لپٹ کر گر پڑی۔ اُس نے جھپٹ کر چنّے کو پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو وہ اُس کی زد سے باہر تھا۔ دور کھڑی بے بی اپنی ناک سے بہتے ہوئے خون کو خاک آلود دامن سے پونچھ رہی تھی۔

"ٹھہر تو جا چنّے کے بچے!" اُس نے منّے کا سر دیوار سے ٹکرا دیا۔ ساتھ ہی اُسے اپنے سر میں تکلیف سی محسوس ہوئی۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا تو وہ زمین پر پڑی تکیہ کو دونوں ہاتھوں سے اور اماں کی چادر اُس کے گرد لپٹی ہوئی تھی۔

"کیا مصیبت ہے اماں!"

اُس نے چونک کر دیکھا۔ پاس کھڑی بڑی آپا ڈکرا رہی تھیں۔ "سوتے میں بھی اس کے ذہن پر یہ ہی بچے سوار رہتے ہیں۔ میرے بچے نہ ہوئے —" آپا کو آنکھیں نکالتے دیکھ کر اُسے فوراً یاد آ گیا کہ وہ بھی تو آپا کے اتنی بڑی ہو گئی ہے۔ اب اُسے کس چیز کا ڈر اور وہ بڑی پھرتی سے لپٹی ہوئی چادر اور تکیہ پھینک کر بڑی آپا کے مقابل کھڑی ہو گئی۔ اُس کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ اس کا قد بڑی آپا کی کمر کو چھو رہا تھا ننھی پتلی پتلی ٹانگیں اور وہی گرد خوردہ فراک۔ اُس نے جلدی سے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ گز گز بھر کے بال کی بجائے مشکل سے بالشت برابر بالی ربن میں بندھے ہوئے تھے۔ اُس نے بڑی حسرت سے آپا کو دیکھا۔ آنگن میں منّے چنّے بے بی اور ننھی کی شکل میں اس کی مصیبتیں کھیل رہی تھیں اُس نے مایوسی سے ادھر اُدھر دیکھا۔ سامنے اُسارے میں اماں بڑی آپا کے ننھے کو گود میں لیے بہلا رہی تھیں۔ مجھے کوئی نہیں پوچھتا اُس نے اداس ہو کر اماں کو دیکھا اور اپنی بے چارگی پر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

یمنا دت وشنو اشوک

سریتا۔ دہلی

بَن کٹیا کے بھوت

جب آخری موڑ سے بھی بہاری لال نہیں اترا تو گردھر سنگھ کو شبہ ہوا کہیں پہاڑی راستہ پر کوئی حادثہ نہ ہوگیا ہو۔ تین دن پہلے بہاری کا تار آیا تھا کہ وہ سوموار کو پہلی موٹر سے ہمانی پہنچ کر چارج لے لے گا، اور اُس کے بال بچے بھی ساتھ آرہے ہیں۔ گردھر اپنا شک۔ دور کرنے کے لیے موٹر اسٹیشن کے دفتر جارہا تھا۔ اُسے اپنے کوارٹر کی چڑھائی پر محکمہ جنگلات کی ہری پگڑی پہنے ہوئے ایک شخص قلی کے پیچھے جاتا ہوا دکھائی دیا۔

قریب آنے پر ہری پگڑی والے کو پہچان کر گردھر سنگھ نے کہا ۔ "ارے دیو سنگھ تم کیسے آگئے ؟ اس گاڑی سے تو بہاری لال آنے والے تھے ۔"

دیو سنگھ نے گردھر کو نمستے کرتے ہوئے کہا۔ "بہاری لال تو آج پہلی بس سے آنے والے تھے لیکن کالسی سے ابھی ابھی واپس لوٹ گئے ہیں ۔"

"لوٹ گئے ہیں ؟" گردھر نے حیرت سے پوچھا۔ "میں تو آج ہی انھیں چارج دے کر جانے والا تھا۔ میرا سامان بندھا رکھا ہے بس چارج رپورٹ پر دستخط کرکے گھنٹے آدھ گھنٹے میں چلا جاؤں گا۔"

دیو سنگھ نے کہا۔ "بہاری لال کا تبادلہ شہنشاہ نے رد کر دیا ہے۔"

"شہنشاہ نے ۔؟" گردھر نے پوچھا۔ "کون سے شہنشاہ نے ؟"

"بہت پہلے کوئی غیر ملکی بادشاہ ان جنگلوں میں شکار کھیلنے آئے تھے ۔ اور محکمہ جنگلات کے افسروں کو بہت سے انعامات گئے تھے۔ گردھر نے سوچا، شاید ایسا ہی کوئی غیر ملکی حکمران بہاری لال پر عنایت کر گیا ہوگا۔

دیو سنگھ نے کہا۔ "شہنشاہ ہی تو کہتے ہیں صاحب اُس بابا کو۔ وہی بابا جن کے ہمارے ڈی ایف او صاحب تک بھگت ہیں۔ بہاری لال کو جب معلوم ہوا کہ بابا کالسی میں ٹھہرے ہوئے ہیں تو بال بچوں سمیت اُن کے قدموں میں گر کر رو دئے کہ ہمانی جیسے پر فیلے بن میں اُن کے بال بچے بھوکوں مر جائیں گے۔ وہاں ایک بار کام شروع کرنے پر تین سال تک تبادلے کا نمبر نہیں آسکے گا۔ اُن کا رونا دیکھ کر شہنشاہ نے کہہ دیا۔ "بچہ جا تیرا تبادلہ منسوخ کر دیا جائے گا۔"

"بابا نے اسی وقت ڈی ایف او صاحب کو فون کیا اور میں اُن کا یہ نیا حکم لے کر آرہا ہوں۔ راستے میں اس کی ایک کاپی بہا

کو دے آیا ہوں۔ اس حکم کو پاتے ہی بہاری لال اپنے بال بچوں کو لیکر لوٹ گئے۔"

"تو کیا تم مجھ سے چارج لینے آئے ہو؟" گردھر نے پوچھا۔

وہ محکمۂ جنگلات کے ہمانی رینج کا رینج افسر تھا۔ تین برس اس سرد مقام پر کام کرنے کے بعد۔ اب اُس کی ترقی ہوئی تھی۔ دیو سنگھ پہلے بھی ایک بار گردھر کا معاون رینجر رہ چکا تھا۔

دیو سنگھ نے کہا۔ "نہیں صاحب، میں تو ڈپٹی رینجر ہوں، ابھی ترقی نہیں ملی ہے۔"

گردھر نے 'بہت ضروری' عنوان والے لفافے کو کھول کر پڑھا۔ لکھا تھا۔ "مجھے افسوس ہے کہ آپ کی ترقی کا حکم ابھی کچھ دن کے لیے منسوخ کیا جا رہا ہے۔ ہمانی رینج میں آپ کی جگہ بہاری لال کے تقرر کو بھی منسوخ کیا جا رہا ہے۔ میں کسی دوسرے رینجر کو آپ کی جگہ بھیجنے والا تھا کہ میشور گھاٹ سے ابھی ابھی ایک حادثے کی خبر ملی ہے۔ وہاں لکڑی بہانے والے مزدور یکایک کام چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں۔ رپورٹ آئی ہے کہ وہ بھوت پریت کے ڈر سے وہاں کام کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

ریلوے سے معاہدہ کے تحت ہمیں چیڑ کے تین لاکھ شہتیر اور چار لاکھ سلیپر اس مہینے کے آخر تک میناگر پہنچانے ہیں۔ اگر وہ لکڑیاں آگے نہ بڑھ سکیں تو ہم سمجھوتہ پر عمل نہ کرنے کے لیے ذمّے دار ہوں گے۔ آپ جیسے تجربہ کار اور محنتی افسر ہی محکمۂ جنگلات کو اس مصیبت سے چھٹکارا دلا سکتے ہیں۔ آپ کی مدد کے لیے میں سپاہیوں اور معاون رینجر دیو سنگھ کو بھیج رہا ہوں۔ آپ لوگ جلد سے جلد میشور گھاٹ پہنچ کر لکڑی بہانا شروع کیجیے۔"

تین برس کی محنت کے بعد ترقی اور تبادلہ کا حکم گردھر کو آڑے وقت کام آنے والی گاڑھے پسینے کی کمائی کی طرح لگ رہا تھا۔ لیکن اس نئے غیر متوقع حکم نے اُس کے خیالات کو منتشر کر دیا۔ اُسے منسٹر کے رویّے پر بڑا غصہ آیا۔ اُس کے مخلصانہ برتاؤ سے جہاں ایک کا بھلا ہوتا تھا۔ وہاں بہت سے بے قصور اور فرض شناس لوگ دکھ بھی پاتے تھے۔ لیکن اس حکم میں خوشی کی بات یہی تھی کہ اُسے دیو سنگھ جیسا ہنس مکھ اور بہادر مددگار ملا تھا۔ پہلے بھی ٹونس ندی کی گھاٹی میں سلیپر بہانے میں وہ اُس کے ساتھ کام کر چکا تھا۔ اُسے یاد تھا کہ پانی کی تیز دھار میں بلیوں کے بیڑوں کو دیو سنگھ کس پھرتی سے کود کود کر بہایا کرتا تھا۔ اس بار وہ اپنا پسندیدہ کام پاکر بہت خوش تھا۔

گردھر اُسی روز دیو سنگھ کو ساتھ لے کر میشور گھاٹ روانہ ہو گیا۔ آٹھ میل تک پہاڑی راستہ طے کرنے کے بعد وادی کی گہرائی میں کالی ندی کا نیلا پانی دکھائی دینے لگا۔ دونوں طرف پہاڑیاں اونچائی میں کم ہوتے ہوتے چھوٹے چھوٹے ٹیلوں میں تبدیل ہو کر سارے جنگل میں گھل مل گئی تھیں۔ ندی کے کنارے پر بکھرے شہتیر بے ترتیبی سے بکھری ہوئی دیا سلائی کی تیلیوں کی طرح نظر آرہے تھے۔ مغرب کی طرف ایک نالہ آکر ندی میں ملتا تھا اور ندی نالے کے سنگم کے پاس دھوئیں کی پتلی سی لکیر آسمان میں اُٹھ رہی تھی۔

اس طرف اشارہ کرکے گردھر نے کہا۔ "وہ سنگم گاؤں والوں کا تیرتھ اور مرگھٹ ہے۔ شاید مزدور اسی مرگھٹ کے خوف سے کام چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں۔"

دیو سنگھ نے کہا۔ "لیکن لکڑیاں ہمارے بالکل نیچے تک اٹکی پڑی ہیں۔ وہ اس مرگھٹ تک نہیں پہنچائی گئی ہیں۔"

اس اونچی جگہ سے انھوں نے دیکھا کہ جہاں سے لکڑیاں بہانا بند کیا گیا تھا، وہاں ندی کے اس پار ایک ٹیلے کے بعد بڑا سا میدان تھا۔ میدان کے آگے جنگل کی چوکی اور بن کنیا کا ڈاک بنگلہ ایک گھروندے کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ اُن کے آگے جتے ہوئے کھیت اور گاؤں کی جھونپڑیاں تھیں۔

وہ مہیشور گھاٹ نہ جا کر سیدھے ندی کی طرف اُتر آئے تاکہ شام کے جھٹ پٹے سے پہلے گاؤں میں مزدوروں کو تلاش کر سکیں اور فارسٹ گارڈ اور چوکی کے منشی سے رابطہ قائم کرلیں۔

دس منٹ بعد وہ ندی کے کنارے پہنچ گئے۔

پانی کبھی شہتیروں کے ڈھیر کے نیچے اور کبھی اوپر چھلانگیں مارتا ہوا بہہ رہا تھا۔ ندی کے اس طرف انھیں مزدوروں کی چھوڑی ہوئی ہوا بھری مشکیں مل گئیں۔ جو ایک ایک آدمی کے لیے کشتی کا کام دیتی تھیں۔ مشکوں کی مدد سے ندی کا پار کر کے وہ دوسرے کنارے پر پہنچ گئے۔ ادھر کنکریلے میدان اور جھاڑیوں کے بعد کچھ اونچائی پر ایک کھنڈر تھا۔ ان کے سرکاری نقشے میں یہ جگہ درگاہ کے نام سے دکھائی گئی تھی۔ پہاڑی کی اونچائی پر پیڑوں اور جھاڑیوں کے بیچ چھپی ہوئی درگاہ کی چار دیواری اور قبریں انھیں دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ لیکن اب اُنھوں نے دیکھا کہ برسات کے پانی نے درگاہ کی دیواروں اور پرانی قبروں کو جگہ جگہ سے توڑ دیا تھا۔ کچھ ہڈیاں ندی کے کنارے پڑی ہوئی تھیں اور کچھ پانی میں تیر رہی تھیں۔ قبروں کے بڑے بڑے تختے محکمۂ جنگلات کے شہتیروں میں چلے گئے تھے۔

"میں سمجھ گیا!" گردھر نے کہا۔ "انھیں گڑے بھوتوں کو اچانک رات کے وقت مزدور دیکھ کر خوفزدہ ہو گئے ہوں گے۔"

درگاہ پار کر کے وہ لوگ ٹیلے کی طرف بڑھے۔ لیکن ادھر کوئی راستہ نہیں ملا۔ وہاں جھڑبیری، جھاؤ اور بابڑ گھاس کی گھنی جھاڑیاں تھیں۔ درمیان آگے بڑھنے کی ناکام کوشش کرنے کے لیے دونوں الگ الگ سمتوں سے سیدھا راستہ تلاش کرنے لگے۔ گردھر نے دیکھا کہ جنگل اور بھی گھنا ہے۔ بابڑ گھاس کی لمبی پتیاں تلوار کی طرح کھڑی ہیں۔

دیو سنگھ نے کہا۔ "آگے دلدل ہے۔ اس میں پاؤں چلا گیا تو دھنستا ہی چلا جائے گا۔"

دونوں ہمت ہار کر ندی کے کنارے مہیشور گھاٹ کے مرگھٹ کی طرف نالے کی تلاش میں گئے جس کے قریب محکمۂ جنگلات کی آئی ہوئی سڑک نقشے میں دکھائی گئی تھی۔

مہیشور گھاٹ پہنچتے پہنچتے دن ڈوب گیا۔ حالانکہ گھاٹ کے پاس ندی نالے کے سنگم کے قریب خوب چوڑا پاٹ تھا۔ لیکن آئی ہوئی لاشیں پانی کم ہونے کی وجہ سے ندی کی تلیٹی میں بکھری پڑی تھیں۔ لاشوں کو ڈبونے کے کام میں لائے گئے گھڑے اور بانس اُن کے کنارے ہوا سے ہلتے لال پیلے میلے چیتھڑے ماحول کو اور زیادہ پُراسرار بنا رہے تھے۔

نالے کے کنارے کنارے تیز قدم رکھتے ہوئے وہ ٹیلے کی طرف بڑھے۔ تقریباً تین میل کا چکر لگا کر وہ میدان میں پہنچے درگاہ کی سیدھ میں صرف آدھے میل کے فاصلے پر تھا۔ وہ شام انھوں نے بن کٹیا کے نزدیک گاؤں میں گزاری۔ دوسرے سویرے فارسٹ گارڈ اور منشی کو قریب کے دیہات سے پچاس مزدور بھرتی کرنے کا کام سونپ کر وہ لوگ درگاہ کے پاس آ گئے۔

وہ اپنے ساتھ دس مزدور لائے تھے۔ وہاں آٹھ دس دن رہنے کا انتظام کیا گیا۔ شام تک گارڈ کے سپاہی بھی پہنچ گئے۔ جھاڑیوں میں کام کرنے کے لیے ساٹھ مزدوروں کا انتظام ہو گیا۔ بن کٹیا سے رسد اور ضرورت کی دوسری چیزیں آنے لگیں۔

اگلے روز دوپہر کو ٹیلے کی طرف دھواں دیکھ کر گردھر کو شک ہوا کہیں کسی مزدور کی غلطی سے جنگل میں آگ نہ لگ گئی ہو۔ اُس نے کچھ آدمیوں کو اُدھر بھیجا۔ تھوڑی دیر بعد پترول نے آکر بتایا کہ ٹیلے میں ایک سادھو آیا ہوا ہے دُھواں اُسی کی دھونی سے اُٹھ رہا ہے۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ سادھو نے اُسے دیکھتے ہی کہا۔ "ارے اُدھر ندی کے کنارے رینجر گردھر اور اُس کا ساتھی دیو سنگھ ہیں

ان دونوں سے کہہ دینا کہ شہنشاہ نے اُنھیں یاد کیا ہے۔ شام کو رامائن کا پاٹھ ہوگا وہ دونوں ضرور شامل ہوں "۔

گردھر کو حیرت زدہ دیکھ کر دیو سنگھ نے کہا۔ "اپنے بھگتوں کو حیرت میں ڈالنے کے لیے شہنشاہ کبھی اچانک دُور دراز مقام پر پہنچ جاتا ہے۔ پھر وہاں بھگتوں کی بھاری بھیڑ جمع کر لیتا ہے۔ اب دیکھیے گا اس جنگل میں اُس کے بھگتوں کی موٹریں دوڑنے لگیں گی۔ کوئی امرتسر کا رئیس ہوگا تو کوئی کلکتے کا سیٹھ۔ بڑے بڑے سرکاری افسر تک اُس کے بھگتوں میں ان کی تعداد سب سے زیادہ ہے"۔

"گردھر نے پوچھا۔ "اُسے ہم دونوں کے نام کا پتہ کیسے چلا ۔؟ کیا کرشمہ ہے بھئی !"

دیو سنگھ نے کہا ۔" اس میں کرشمے کی کیا بات ہے ! ڈی الیف او صاحب کا حکم اُس نے بہاری لال کے پاس دیکھ لیا ہوگا"۔

شام کی پاری میں مزدوروں کو کام سونپ کر وہ دونوں مرگھٹ کی طرف سے گھومتے ہوئے ٹیلے پر پہنچے۔ گردھر نے طے کیا تھا کہ وہ شہنشاہ کو کھری کھوٹی سنا کر گھنٹے بھر میں واپس آجائے گا۔ دیو سنگھ کا جانے کا ارادہ نہیں تھا۔ لیکن گردھر کے اصرار کرنے پر وہ اس کے ساتھ چل دیا۔

بابا چالیس پچاس بھگتوں کے درمیان پالتی مارے بیٹھے تھے۔ اُن کا سر گھٹا ہوا تھا۔ داڑھی گھٹی ہوئی تھی۔ لمبی گھنی کالی مونچھیں ہونٹوں کو ڈھکے ہوئے تھیں۔ اُنھوں نے سفید تہمد باندھ رکھا تھا۔ اور تو ندیل جسم پر ایک پیلا شال لپٹا ہوا تھا۔

شہنشاہ نے انھیں ایک پنڈت کے قریب بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پنڈت ایک موٹی سی رامائن پڑھ رہا تھا۔

رامائن کے پاٹھ کے دوران شہنشاہ نے کہا۔ "بچہ! مہیشور گھاٹ کے آس پاس کی جگہ بھوتوں کا اڈا ہے۔ ایک تو وہ مرگھٹ بھرد کا ہے۔ دوسرے اس سال قبرستان کے مُردے کالی ندی کا پانی پینے کے لیے نکل پڑے ہیں۔ میں تمھارے افسروں سے کہہ دوں گا کہ تم کسی مصیبت میں گرفتار ہو۔ تم لوگ روزانہ ہنومان چالیسا کا پاٹھ کیا کرو۔ ہنومان جی اپنے بھگتوں کی رکشا کرتے ہیں"۔

گردھر بولا۔ "سوامی جی، ہنومان تو رام چندر جی کے بھگت تھے۔ ہم لوگ بھگت کی بجائے اُن کے سوامی رام چندر جی کی پوجا کریں تو زیادہ بہتر ہوگا"۔

"کیوں نہیں، کیوں نہیں" شہنشاہ نے کڑوے لہجے میں کہا۔ میں خود ہنومان جی کا بھگت ہوں مگر پاٹھ رامائن کا کر رہا ہوں"۔

گردھر شہنشاہ کو چڑانے کے لیے بولا "سوامی جی، رام چندر جی تو ایشور کے اوتار تھے۔ ہم لوگ بس ایشور کی عبادت کریں تو اور بھی اچھا ہوگا"۔

ایک معمولی شخص اس طرح شہنشاہ کے منھ لگ رہا تھا۔ یہ دیکھ کر حاضرین تعجب میں پڑ گئے۔

لیکن شہنشاہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ "بچہ، تو بڑا باتونی ہے۔ اگر ایشور پر تیرا اعتقاد ہے تو ٹھیک ہے انھیں کی پوجا کیا کر"۔

لیکن گردھر تو بابا کو چڑانے پر تلا ہوا تھا۔ "میں ایشور تک نہیں اس سے بھی آگے جانا چاہتا ہوں۔ آپ جیسے پرشوں کا کہنا ہے اہم برہما سمی' میں ہی ایشور ہوں"۔ اگر یہ بات سچ ہے تو کیوں نہ اپنی پوجا کروں"۔؟

شہنشاہ نے کہا۔ "تیرے سارے افسر دھرماتما ہیں۔ لیکن تو ناستک ہے۔ بچہ ناستک کی اس سنسار سے مکتی نہیں ہوتی"۔

گردھر نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اس مرگھٹ میں تو بہت سے لوگ مکتی پا چکے ہیں۔ مگر میں اپنی مکتی ابھی نہیں چاہتا"۔

شہنشاہ بولا۔ "کیسی بے دھرمی کی باتیں کر رہا ہے۔ اس طرح کام نہیں چلے گا۔ بجرنگ بلی کا بھجن کیے بنا اس مرگھٹ میں تو ایک دن بھی نہیں ٹک سکتا ! اگر میں رامائن کا کھنڈ پاٹھ نہ کرتا تو بچہ، بھوت پریت تجھے کچا چبا ڈالتے۔ تیرے مزدور پہلے کی طرح کب کے بھاگ گئے ہوتے"۔

"اوہ!" گردھر نے سوامی جی کو چڑاتے ہوئے کہا۔ "میں دو راتیں وہاں گزار چکا ہوں مجھے تو کوئی بھوت پریت نہیں دکھائی دیا۔"
شہنشاہ نے کھسیانے لہجے میں کہا۔ "ارے، سمجھاؤ اس نا سمجھ کو۔!"
گردھر نے جوش میں آکر کہا۔ "مہاراج سارے پڑھے لکھے لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ بھوت پریت کچھ نہیں ہیں سب وہم ہے۔"
"ارے ان بندوق والے سپاہیوں کے درمیان رہتا ہے اسی لیے بہادری کی ڈینگ ہانک رہا ہے۔"
گردھر نے غصّے سے کہا۔ "سوامی جی، رہنے دیجیے اپنی پوجا کو۔ اگر وہاں بھوت پریت ہیں تو انھیں آنے دیجیے۔ میں ان سے نبٹ لوں گا۔"
شہنشاہ نے کچھ سوچ کر کہا۔ "دیکھ بچہ! تیرا بھوتوں کو نہ ماننا بے وقوفی ہے۔ میں نے بھوت کو تو بس میں نہیں کیا ہے مگر تیری خواہش پوری کر سکتا ہوں۔ لیکن بھوت کا سامنا کرنے پر تو پچھتائے گا۔"
گردھر نے ہنستے ہوئے کہا۔ "میں انھیں سے نپٹنے آیا ہوں۔ مجھے اُن پر یقین نہیں ہے۔ آپ کو بھی نہیں ہے۔ مگر آپ اس سچائی سے کترا رہے ہیں۔"
شہنشاہ بولا۔ "اچھا پرسوں شام کو چار بجے آنا۔ تب تمھیں دکھاؤں گا کہ بھوت پریت ہیں یا نہیں۔"
گردھر نے کہا۔ "اچھا یہی سہی۔ اب میں چلتا ہوں۔
شہنشاہ بولا۔ "لیکن میرا ایک کام کرتا جا۔ اپنے اس معاون کو بن کٹیا کے بنگلے تک بھیج دے۔ تیرا چوکیدار بنگلے سے ٹیلیفون نہیں کرنے دے رہا ہے۔ دو ایک بھگتوں کو اطلاع دینی ہے۔"
رات کی باری میں کام کرنے والے مزدور پھرتی سے شہتیر بہا رہے تھے۔ اچانک ایک کالا سایہ نمودار ہوا۔ وہ ٹیلے کی طرف بانس کی گھنی جھاڑیوں کے اوپر آسمان میں اُٹھتا چلا گیا۔ دو منٹ بعد ایک اور کالا سایہ اوپر اُٹھا اور درختوں سے اونچا اُٹھ کر تھرکنے لگا۔ یہ دیکھ کر مزدور کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ چار پانچ سکینڈ بعد ایک اور ہیولیٰ پہلے دو سایوں کے قریب اُبھرا۔ اور ناچنے لگا۔ یہ سفید بادل کی طرح تھا۔ اسے دیکھ کر ڈونگی والے مزدور کی چیخ نکل گئی۔
گردھر اپنے تنبو کے اندر سویا پڑا تھا۔ گارد کے ایک سپاہی نے اُسے جگایا۔ وہ بڑبڑاتا ہوا باہر نکلا ہی تھا کہ دور سے آتی ہوئی ایک گرج اُسے سنائی دی "جے بجرنگ بلی۔ بس ہے تال۔ بس رہنے دے۔"
سپاہی نے اسے مشرق کی طرف دیکھنے کے لیے کہا۔ لیکن اُسے کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ دیو سنگھ نے اُسے بتایا کہ گرج کے ساتھ ہی تین ہیولے نمودار ہو گئے تھے۔ گردھر سوچنے لگا کہ یہاں سب کا وہم تھا یا حقیقت میں کوئی ایسی بات تھی۔ سب ہی مزدور ان ہیولوں کے نمودار ہونے کے بارے میں ذکر کرتے تھے۔
ڈونگی والے مزدور کے علاوہ ایک گورکھا سپاہی بھی اس صورت حال کو دیکھ کر پاگل کی طرح ناچنے اور بڑبڑانے لگا۔ باقی مزدور ڈرتے کانپتے کام کرتے رہے۔ گردھر سویرا ہونے تک جاگتا رہا۔ اور مزدوروں کی ٹولیوں میں جا کر اُن کا حوصلہ بڑھاتا رہا۔
وہ بار بار یہی سوچ رہا تھا کہ یہ محض ان کا وہم تھا۔ اگر واقعی کوئی بھوت پریت تھا تو وہ دوبارہ ظاہر کیوں نہیں ہوا؟
سورج نکل آیا تھا۔ گردھر نے چائے پی کر دیو سنگھ کو مزدوروں کے پاس چھوڑ کر اُس طرف جانے کا فیصلہ کیا جہاں رات ہیولے نمودار ہوئے تھے۔ وہ ہمیشور گھاٹ کی طرف جاتے ہوئے جنگل کی طرف مڑا۔ بڑے نالے کے بعد جھڑ بیری کی گھنی جھاڑیاں پار کر کے اُس نے

ایک اور چھوٹے نالے کو پار کیا۔ لیکن دلدل کی وجہ سے آگے بڑھنا آسان نہیں تھا۔

وہ دوپہر تک یہی سوچتا ہوا لوٹ آیا کہ شاید وہ دلدل سے نکلنے والی میتھین گیس ہو گی۔ جسے انگریزی میں دِلودی دسپ کہتے ہیں۔ اُس نے سوچا کہ اگر یہ درست ہے تو وہ رات کو جاگ کر ان ہیولوں کے ظاہر ہونے پر مزدوروں کی ہمت بڑھائے گا۔ اور انھیں بتائے گا کہ گیس کے اُٹھنے کی معمولی سی بات پر اُنھیں گھبرانا نہیں چاہیے

اس رات گردھر ٹارچ لیے مزدوروں کے ساتھ کام کرتا رہا۔ کام میں ذرا سی ڈھیل دیکھ کر وہ فوراً لکڑی کے انبار پر کھڑا ہو جاتا تھوڑی دیر ان کو چپ چاپ دیکھتا۔ اور پھر مزدوروں کو مستعدی کے ساتھ کام کرنے کی ہدایت دیتا۔ مزدوروں کے کان مشرق میں افق کی طرف لگے ہوئے تھے۔ وہ سہمے ہوئے سے کام کر رہے تھے۔

بارہ بج گئے لیکن ہیولے ظاہر نہ ہوئے۔ دیو سنگھ کچھ دیر نیند کا بہانہ کیے اُس طرف کان لگائے بستر پر پڑا رہا۔ پھر گہری نیند سو گیا۔ ایک بج گیا۔ لیکن مشرق میں آسمان پرسکون رہا۔ چاند ڈوبنے لگا لیکن وہ ہیولے نمودار نہ ہوئے۔ شام کو ڈیوٹی سنبھالنے والے مزدور مشعل لے کر کام شروع کرنے والے تھے کہ اسی لمحہ پٹاخے چھوٹنے کی آواز آئی۔ پھر ایک منٹ بعد مشرق کی طرف کالی، لال اور سفید تین شکلیں جنگل کے اوپر ناچنے لگیں۔ گردھر آنکھیں پھاڑ کر دیکھتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر یہ گیس ہے تو یہ رنگ کیسے ہیں؟

یکایک ایک گرجدار آواز سنائی دی۔ "بے بحر رنگ پلی — بس بے تال بس! رہنے دے بس!" اور فوراً تینوں ہیولے غائب ہو گئے۔

تیسری پالی کے مزدوروں نے کام کرنے سے انکار کر دیا۔ پچھلی رات کے دونوں بیمار مزدور بڑبڑانے لگے۔ اُنھیں مشکل سے قابو میں لایا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ندی میں بہتے ہوئے پانی کے شور کے علاوہ ہر چیز ساکت ہو گئی۔ رات کے اندھیرے میں مزدوروں کو سانس لینے میں بھی خوف محسوس ہونے لگا۔ گردھر کبھی تنبو کے اندر اور کبھی اُس کے باہر ٹہلتا ہوا مشرق کی سمت دیکھتا رہا۔ لیکن وہ شکلیں دن نکلنے تک دوبارہ ظاہر نہیں ہوئیں۔ صبح سورج چڑھ آنے کے بعد کچھ مزدور کام کرنے کے لیے رضامند ہوئے۔ مگر گردھر نے انھیں سمجھایا کہ وہ دھماکہ دلدل سے نکلنے والی گیس سے پیدا ہوتا ہے اور اُسے بھوت ظاہر کرنے کے لیے شہنشاہ نعرہ لگاتا ہے۔

لیکن دو ایک نے پوچھا کہ پہلے یہ شکلیں کیوں نہیں دکھائی دیں۔ گردھر نے سمجھایا کہ شکلیں نمودار ہوتی ہوں گی۔ لیکن لوگوں نے کام میں مشغول ہونے کے باعث اس طرف توجہ نہیں دی۔ شہنشاہ یہاں نہیں تھا اس لیے کسی نے گیس سے اُٹھتی ہوئی لکیروں سے ڈرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ ہو سکتا ہے کہ انھیں ہیولوں کو دیکھ کر پچھلے مزدور کام چھوڑ کر بھاگ گئے ہوں۔

اُس دن کام پر آنے والے مزدوروں کی تعداد آٹھ تھی۔ گومکھے کام چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ گارد کے سپاہی اپنے بیمار ساتھی کو لیکر شہر لوٹ گئے تھے۔ شام تک نئی گارد آنے کی امید تھی۔ شہتیروں کے وہ ڈھیر جو قبرستان کے پاس تھے، بہائے جا چکے تھے۔ دریا کے داہنی طرف کچھ ڈھیر ابھی بچا ہوا تھا۔

سپتمی کا دن تھا۔ شہنشاہ نے اُسے شام کے چار بجے آنے کے لیے کہا تھا۔ وہ تذبذب کے عالم میں تھا کہ اسے وہاں جانا چاہیے یا نہیں۔ پھر یہ سوچ کر کہ اُس کے چلے جانے پر یہ آٹھ مزدور بھی کام کرنا چھوڑ دیں گے۔ اس نے دیو سنگھ سے کہا کہ وہ کیوں نہ شہنشاہ کے پاس ہو آئے۔

دو راتوں کے جاگنے سے دیو سنگھ کا منہ لٹک گیا تھا۔ لیکن اُس کا حوصلہ اب بھی بڑھا ہوا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر شہنشاہ کے چکر میں نہ پڑا جائے اور یہی آٹھ دس مزدور کام کرتے رہیں تو چار پانچ دن میں وہ ساری لکڑی ہیشور گھاٹ سے آگے پہنچانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

اُسے "میں جاؤں یا نہ جاؤں" کرتے دیکھ کر گردھر نے کہا۔ "جب شہنشاہ کو چیلنج کیا ہے تو اُسے نبھانا بھی پڑے گا۔ بھوتوں کا معاملہ حقیقت میں کیا ہے۔ اس کا پتہ لگانا ضروری ہے۔ کون جانے آج رات اور زیادہ گڑبڑ ہو جائے۔ اور رہے سہے مزدور بھی بھاگ جائیں۔ تم نہ جانا چاہو تو میں جاتا ہوں۔ تم گارڈ کے آنے تک یہیں رہنا۔"

لیکن دیوسنگھ نے کہا۔ "نہیں، میں جاتا ہوں۔ آپ کا یہیں رہنا مناسب ہے۔" اتنا کہہ کر وہ تیزی سے چل دیا۔

ٹیلے پر پہنچ کر دیوسنگھ نے دیکھا کہ وہاں شہنشاہ کے بھگتوں کا میلا لگا ہوا ہے۔ کٹیا کے چاروں طرف قناتیں لگی ہوئی ہیں۔ پنڈت جی کی چوکی پر خوبصورت شامیانہ لگا ہوا ہے۔ بھگتوں کے بیٹھنے کے لیے دری اور قالین بچھے ہیں۔ مردوں کے درمیان بہت سی عورتیں، عقیدت مندانہ جذبے کے ساتھ شہنشاہ کی قدم بوسی کے لیے بیٹھی ہیں۔ اُس نے سوچا، صرف دو ہی دن میں اتنا شاندار انتظام شہنشاہ کی مقبولیت اور بھگتوں کی عقیدت کے باعث ہی ہو سکتا ہے۔ ایسے بااثر سنت کو دھمکی دینا کہاں تک درست ہوگا۔ یہ سوال دیوسنگھ کے ذہن میں بار بار اُٹھ رہا تھا۔

اُس نے شامیانے کے نیچے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ شہنشاہ کا جٹا جوٹ کہیں نہ دکھائی دیا۔ اُس نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی۔ چار بج چکے تھے۔ وہ پوچھنے ہی والا تھا کہ شہنشاہ کہاں ہیں کہ کوٹ پتلون میں ملبوس ایک شخص کے کندھے پر ہاتھ رکھے، دوسرے ہاتھ سے اپنی زرد شال سنبھالے شہنشاہ تنبو سے نکلے۔ اُن کے پیچھے سُرخ رنگ کا زری دار چوغہ اور پگڑی پر سنہرا بلا باندھے ایک چپراسی تھا۔ چپراسی کو دیکھ کر دیوسنگھ سمجھ گیا کہ کوٹ پتلون والے صاحب سکریٹریٹ کے کوئی بڑے افسر ہیں۔

دیوسنگھ کو اپنی طرف آتے دیکھ کر شہنشاہ کی بھنویں تن گئیں۔ لیکن ہونٹوں پر نرم مسکراہٹ لا کر انھوں نے کہا۔ "آ گیا بچہ؟ مگر رینجر کہاں ہے؟"

"گردھر صاحب نہیں آ سکے۔" دیوسنگھ نے کہا۔ "اُنھوں نے مجھے بھیجا ہے۔"

پتلون والے صاحب کو مخاطب کر کے شہنشاہ نے کہا۔ "سین، یہ ہے دیوسنگھ محکمہ جنگلات کا معاون رینجر۔ بہت دلیر اور کام کا آدمی ہے۔" پھر دیوسنگھ کی طرف مڑ کر کہا۔ "کنزرویٹر سردار سنگھ سے کہہ کر میں تجھے ضرور ترقی دلاؤں گا بچہ۔"

دیوسنگھ بابا کی ٹالنے والی بات سن کر دل ہی دل میں مسکرایا۔ اُس نے کہا۔ "سوامی جی، اس وقت میں آپ کے حکم کی تعمیل کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ آپ نے اُس دن کہا تھا کہ سپتمی کے دن چار بجے شام کو آنا۔"

شہنشاہ کے چہرے سے ظاہر تھا کہ وہ ایسا روکھا جواب سننے کے لیے تیار نہ تھا۔ لیکن دھیرے سے ہنستے ہوئے بولا۔۔۔ "ہے تجھ میں اتنا دم؟"

دیوسنگھ بابا کی گفتگو کے انداز سے متاثر ہوتے ہوئے بولا۔ "کیوں نہیں، اسی کام کے لیے تو میں یہاں آیا ہوں۔"

شہنشاہ نے کہا۔ "سوچ لے جا سکے گا رات کو شمشان میں؟ بھوت پریت سے مقابلہ ہوگا۔!"

دیوسنگھ بولا ضرور جاؤں گا۔ آج کل شمشان ہی کے قریب رہتا ہوں۔"

"اچھا، تھوڑی دیر سستا لے۔ پھر بتاؤں گا کہ تجھے کیا کرنا ہے۔"

سین نامی بھگت کی طرف مڑ کر شہنشاہ بولا۔ "تو آپ جانا ہی چاہتے ہیں سین صاحب، تھوڑی دیر رُک جائیے۔ سہائے آپ سے ملنے آ رہا ہے۔ گھنٹے آدھ گھنٹے میں آ جائے گا۔"

شہنشاہ کے بھگت اُن کے پوشیدہ کرتوتوں سے مرعوب تھے۔ کب کون بھگت اُن سے ملنے چل پڑا ہے، شہنشاہ یہ

بتا دیتے تھے۔ اور جب یہ سچ ثابت ہوتا تو بھگت حیرت میں پڑ جاتے۔

لیکن سین صاحب کو جلدی تھی۔ اس لیے بولے۔ "مجھے اجازت دیجیے!"

شہنشاہ ابھی شامیانے کے اندر ہی تھے۔ وہیں رک گئے اور بولے۔ "تو میں کنزرویٹر سردار سنگھ کی بات کر رہا تھا۔ وہ ابھی آرہا ہے سین صاحب۔ وہ جس موڑ سے آرہا ہے اُس سے آپ واپس جا سکتے ہیں۔ اتنا وقت تو آپ کا یہ بچ جائے گا۔ اب دس پندرہ منٹ اور رُک جائیے۔"

سین یہ سوچتے سوچتے کہ شہنشاہ کے خیال پر یقین کیا جائے یا نہیں، شامیانے کی پھاٹک کی طرف بڑھے۔ شہنشاہ بھی ان کے کندھے پر ہاتھ رکھے ہوئے باہر نکلا اور بولا۔ "چلیے، میں آپ کو اپنے نئے مندر کی جگہ دکھا دوں۔ آپ کے سپرنٹنڈنٹ انجنیر نے مندر کا نقشہ بنا کر بھیج دیا ہے۔ بہت ایماندار آدمی ہے۔ اور نیک بھی۔ اس کے کہنے پر ٹھیکیدار بن کٹیا کے ڈاک بنگلے سے یہاں تک پکی سڑک بنا دے گا۔"

شہنشاہ بھگت کو لے کر ٹیلے کے نیچے مندر کی جگہ دکھانے والے تھے کہ میدان کے کنارے جنگل کی دوسری طرف اُڑتی ہوئی دھول دیکھ کر بولے۔ "ارے، اُدھر دیکھو دو گھوڑے، سہلے اور سردار سنگھ آپہنچے۔ سین صاحب کے ساتھ شہنشاہ کے پیچھے کھڑے بھگتوں نے دو گھڑسواروں کو آتے دیکھا۔ لیکن اتنے فاصلے سے کوئی انھیں پہچان نہ سکا۔

ٹیلے کے نیچے اتر کر سواروں کو پہچان لینے کے بعد سین صاحب نے کہا۔ "آپ نے کمال کر دیا۔ سوامی جی۔ آپ یہ کیسے معلوم کر لیتے ہیں کہ کون شخص آپ سے ملنے آرہا ہے؟" اور بھگت بول اُٹھے۔ "شہنشاہ تو بھگت کا چہرہ دیکھ کر بتا دیتے ہیں کہ وہ کس پریشانی میں مبتلا ہے۔"

"بدھائی ہو، بدھائی ہو" کے نعروں کے درمیان دیو سنگھ کا خیال اور گہرا ہو گیا۔ صرف وہی جانتا تھا کہ پرسوں محکمہ جنگلات کے ٹیلیفون سے بابا کے چیلے نے دامودر لال سے فون پر کہا تھا کہ وہ سہلے صاحب اور سردار سنگھ سے کہہ دے کہ منگل کی شام کو ٹھیک سوا چار بجے ملنے آجائیں۔ نہ اس کے پہلے نہ اس کے بعد۔ گھوڑے آگے بھیج کر جہاں تک موٹر آسکے موٹر سے آئیں۔

شہنشاہ نے دیو سنگھ کو پیچھے کھڑے دیکھ کر پاس بلایا اور سب کے سامنے کہا۔ "ارے بچّہ! میری تعریف سن کر تجھے برا کیوں لگ رہا ہے، اچھا بتا دے سب کو کہ تجھے بُرا لگا یا نہیں؟"

دیو سنگھ سٹ پٹا گیا، پھر سنبھل کر بولا۔ "سوامی جی، بات یہ تھی کہ اُس دن ...."

"بس بس بچّہ"، چالاک شہنشاہ قہقہہ لگا کر بولا۔ "اب پوری کیفیت بتانے سے کیا فائدہ؟ تو نے مان لیا کہ تجھے برا لگا تھا۔ میں تیری سچائی سے خوش ہوں۔"

دونوں گھڑسوار گھوڑے ٹیلے کے نیچے چھوڑ کر پیدل اوپر چڑھے۔ سردار سنگھ نے شہنشاہ کے پاؤں پر سر رکھ کر سلام کیا اور سہلے نے اُن کے قدموں کی دُھول ماتھے پر لگائی۔

آشیرواد دیتے ہوئے سردار سنگھ کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے شہنشاہ نے کہا۔ "سردار سنگھ تیرے ہی محکمے کے اس ملازم کی سچائی کا تذکرہ ہو رہا تھا۔ یہ بے چارہ درگاہ کی بدروحوں سے جنگل کی حفاظت کرنے کے لیے پریشان ہے۔

اپنے ملازم کو دیکھ کر بلی کی سی آنکھوں والے سردار سنگھ کے جھرّیوں والے چہرے پر اور شکنیں پڑ گئیں۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ جب کہ وہ شہنشاہ کے دربار میں حاضر تھے انھیں ایک ادنیٰ آدمی کا یہاں موجود رہنا گراں گزرا۔ وہ کہنا ہی چاہتے تھے کہ وہ اپنا کام چھوڑ کر یہاں کیا کر رہا ہے کہ شہنشاہ نے اُن کی چھڑی اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ "بچّہ، آج رات کے لیے یہ چھڑی مجھے چاہیے۔"

پھر جواب کا انتظار کیے بغیر ہی دیوسنگھ کی طرف رخ کرکے شہنشاہ بولے۔ "دیوسنگھ! اس چھڑی کو تمھیں آج رات شمشان کی کسی تازہ چتا میں گاڑ دینا ہوگا۔ دو منٹ کے اندر اندر ہی وہ ہیولے تمھیں ڈرانے لگیں گے۔ تم ڈرنا نہیں۔ بجرنگ بلی کا نام لے کر کھڑے رہنا۔ بھوت بھگانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ تم نڈر ہو کر اُن کا سامنا کرو۔ کچھ دیر بعد ہی وہ ہیولے تمھارے حکم کی تعمیل کرنے لگیں گے۔ تم اُن سے کہنا کہ وہ اس چھڑی سمیت تمھیں میرے پاس لے چلیں۔ پھر دیکھو گے کہ پانچ منٹ کے اندر یہ چھڑی یہاں آ جائے گی۔ تین چار میل کے فاصلے کو وہ پانچ منٹ میں طے کرا دیں گے۔ کیوں، ہو اس کام کے لیے تیار؟"

اس یکا یک حکم کو سن کر دیوسنگھ کے پاؤں میں کپکپی ہونے لگی۔ اُس نے خود کو سنبھالتے ہوئے ہمت کے ساتھ کہا۔ "ہاں ہاں" اور چھڑی کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ وہ دل ہی دل میں خوفزدہ ہوا کہ کہیں یہ ہدایت سچ نہ ہو۔ پرانے بزرگوں کی طرح بابا یہ ہدایت اُس کا امتحان لینے کے لیے مذاق کے طور پر تو نہیں دے رہا ہے۔

شہنشاہ نے کہا۔ "چھڑی ابھی نہیں رات کو ملے گی۔ کتنی دیر لگے گی تمھیں یہاں سے شمشان جانے میں۔؟"

"تقریباً پون گھنٹہ۔" دیوسنگھ نے سوچتے ہوئے کہا۔

شہنشاہ چھڑی سہلاتے ہوئے بولا۔ "تو تم چاند ڈوب جانے پر یہاں آ جانا۔ اُسی وقت میں تمھیں یہ چھڑی دے دوں گا۔ بھوتوں کے لیے گھبراہٹ نقصان دہ ہے۔ گھبرانا نہیں۔ ہمت سے کام لیتے ہوئے قدم آگے بڑھانا۔ کامیابی یقینی ہے۔"

دیوسنگھ نے افسر کو سلام کیا اور چل دیا۔

اُس کے جانے کے بعد شہنشاہ نے کہا۔ "میری یہی خواہش ہے کہ یہ بچہ اپنے ارادے میں کامیاب ہو۔"

کنزرویٹر بولا۔ سوامی جی، میں تو یہی سمجھا تھا کہ ساری بات صرف افواہ اور وہم پر مبنی ہے۔ لیکن آج پولیس کمشنر صاحب سے معلوم ہوا کہ دو سپاہی اسی خوف سے بے ہوش پڑے ہیں۔ بھوت پریت پر یقین تو نہیں ہوتا۔ لیکن جو بات اتنے لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔ وہ سچ ہی ہوگی۔

شہنشاہ نے کہا۔ "بدروحیں تو ہیں ہی اور شمشان ان کا گھر ہے۔ میں نے آپ کے افسروں سے کہا تھا کہ وہ اپنا کام کرتے رہیں اور بھوتوں کو بھی اپنا کام کرنے دیں۔ اور اُن کی طرف بالکل دھیان نہ دیں۔"

کنزرویٹر نے کچھ دیر خاموش رہ کر کہا۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ یہاں دُور دُور سے لائی ہوئی قیمتی لکڑی جمع ہے۔ ان بارہ پندرہ لاکھ سلیپروں کو اسی مہینے ریلوے کو سپلائی کرنا ہے۔ اگر دیر ہوگئی تو دریا میں پانی کم ہو جائے گا اور لکڑیاں یہیں پڑی رہ جائیں گی۔ اور اگر اسی طرح بدروحوں کا ناچ ہوتا رہا تو مزدور کام نہیں کریں گے اور ہمارے کام میں خلل پڑ جائے گا۔"

"تو پھر اگر بجرنگ بلی نے چاہا تو آج رات ہی یہ بھوت ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں گے۔ سب کچھ اسی آدمی کی ہمت پر منحصر ہے۔ اگر وہ پست ہمت ثابت ہوا تو اسے میدان چھوڑ کر بھاگنا پڑے گا۔ خیر اب آرتی کا وقت ہو گیا ہے۔ پہلے سین صاحب کو رخصت کر دیں۔"

تین قدم نیچے اتر کر شہنشاہ نے کہا۔ "ارے سین، ایک بات سنو، تم سہائے کا تبادلہ ضلع میں کیوں کر رہے ہو؟ روز روز کے دورے اور پانچ کلکٹروں کا کام اُس کے بس کی بات نہیں ہے۔ اسے اپنے پاس دفتر میں کیوں نہیں بلا لیتے؟ لکھنے پڑھنے میں تو یہ کافی تیز ہے۔"

سین نہیں چاہتے تھے کہ دوبارہ سہائے کو سکریٹریٹ میں بلایا جائے۔

شہنشاہ نے دوبارہ کہا "سوچ کیا رہے ہو؟ اس کی جگہ مانڈے کو ضلع کا حاکم بنا کر بھیج دینا۔ وہ کہتا ہے کہ دفتر میں بیٹھ کر

بتا دیتے تھے۔ اور جب یہ سچ ثابت ہوتا تو بھگت حیرت میں پڑ جاتے۔

لیکن سین صاحب کو جلدی تھی۔ اس لیے بولے۔ "مجھے اجازت دیجیے!"

شہنشاہ ابھی شامیانے کے اندر ہی تھے۔ وہیں رک گئے اور بولے۔ "آپ کے کنزرویٹر سردار سنگھ کی بات کر رہا تھا۔ وہ ابھی آ رہا ہے سین صاحب۔ وہ جس موڑ سے آ رہا ہے اس سے آپ واپس جا سکتے ہیں۔ اتنا وقت تو آپ کا یہ بچ جائے گا۔ اب دس پندرہ منٹ اور رک جائیے۔"

سین یہ سوچتے سوچتے کہ شہنشاہ کے خیال پر یقین کیا جائے یا نہیں، شامیانے کی پھاٹک کی طرف بڑھے۔ شہنشاہ بھی ان کے کندھے پر ہاتھ رکھے ہوئے باہر نکلا اور بولا۔ "چلیے، میں آپ کو اپنے نئے مندر کی جگہ دکھا دوں۔ آپ کے سپرنٹنڈنٹ انجینئر نے مندر کا نقشہ بنا کر بھیج دیا ہے۔ بہت ایماندار آدمی ہے۔ اور نیک بھی۔ اس کے کہنے پر ٹھیکیدار بن کٹیا کے ڈاک بنگلے سے یہاں تک پکی سڑک بنا دے گا۔"

شہنشاہ بھگت کو لے کر ٹیلے کے نیچے مندر کی جگہ دکھانے والے تھے کہ میدان کے کنارے جنگل کی دوسری طرف اڑتی ہوئی دھول دیکھ کر بولے۔ "ارے، ادھر دیکھو دو گھوڑے، سہلے اور سردار سنگھ آ پہنچے۔ سین صاحب کے ساتھ شہنشاہ کے پیچھے کھڑے بھگتوں نے دو گھڑ سواروں کو آتے دیکھا۔ لیکن اتنے فاصلے سے کوئی انھیں پہچان نہ سکا۔

ٹیلے کے نیچے اتر کر سواروں کو پہچان لینے کے بعد سین صاحب نے کہا۔ "آپ نے کمال کر دیا سوامی جی۔ آپ یہ کیسے معلوم کر لیتے ہیں کہ کون شخص آپ سے ملنے آ رہا ہے؟" اور بھگت بول اٹھے۔ "شہنشاہ تو بھگت کا چہرہ دیکھ کر بتا دیتے ہیں کہ وہ کس پریشانی میں مبتلا ہے۔"

"بدھائی ہو، بدھائی ہو" کے نعروں کے درمیان دیو سنگھ کا خیال اور گہرا ہو گیا۔ صرف وہی جانتا تھا کہ پرسوں محکمہ جنگلات کے ٹیلیفون سے بابا کے چیلے نے دامودر لال سے فون پر کہا تھا کہ وہ سہلے صاحب اور سردار سنگھ سے کہہ دے کہ جنگل کی شام کو ٹھیک سوا چار بجے ملنے آ جائیں۔ نہ اس کے پہلے نہ اس کے بعد۔ گھوڑے آگے بھیج کر جہاں تک موٹر آ سکے موٹر سے آئیں۔

شہنشاہ نے دیو سنگھ کو پیچھے کھڑے دیکھ کر پاس بلایا اور سب کے سامنے کہا۔ "ارے بچّے! میری تعریف سن کر تجھے برا کیوں لگ رہا ہے، اچھا بتا دے سب کو کہ تجھے برا لگا یا نہیں؟"

دیو سنگھ سٹپٹا گیا، پھر سنبھل کر بولا۔ "سوامی جی، بات یہ تھی کہ اس دن ...."

"بس بس بچّے" چالاک شہنشاہ قہقہہ لگا کر بولا۔ "اب پوری کیفیت بتانے سے کیا فائدہ؟ تو نے مان لیا کہ تجھے برا لگا تھا۔ میں تیری سچائی سے خوش ہوں۔"

دونوں گھڑ سوار گھوڑے ٹیلے کے نیچے چھوڑ کر پیدل اوپر چڑھے۔ سردار سنگھ نے شہنشاہ کے پاؤں پر سر رکھ کر سلام کیا اور سہلے نے ان کے قدموں کی دھول ماتھے پر لگائی۔

آشیرواد دیتے ہوئے سردار سنگھ کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے شہنشاہ نے کہا۔ "سردار سنگھ تیرے ہی محکمے کے اس ملازم کی سچائی کا تذکرہ ہو رہا تھا۔ یہ بے چارہ درگاہ کی بدروحوں سے جنگل کی حفاظت کرنے کے لیے پریشان ہے۔

اپنے ملازم کو دیکھ کر بلی کی سی آنکھوں والے سردار سنگھ کے جھرّیوں والے چہرے پر اور شکنیں پڑ گئیں۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ جب کہ وہ شہنشاہ کے دربار میں حاضر تھے انھیں ایک ادنیٰ آدمی کا یہاں موجود رہنا گراں گزرا۔ وہ کہنا ہی چاہتے تھے کہ وہ اپنا کام چھوڑ کر یہاں کیا کر رہا ہے کہ شہنشاہ نے ان کی چھڑی اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ "بچّے، آج رات کے لیے یہ چھڑی مجھے چاہیے۔"

پھر جواب کا انتظار کیے بغیر ہی دیو سنگھ کی طرف رخ کر کے شہنشاہ بولے۔ "دیو سنگھ! اس چھڑی کو تمھیں آج رات شمشان کی کسی تازہ چِتا میں گاڑ دینا ہوگا۔ دو منٹ کے اندر اندر ہی وہ ہیولے تمھیں ڈرانے لگیں گے۔ تم ڈرنا نہیں۔ بجرنگ بلی کا نام لے کر کھڑے رہنا۔ بھوت بھگانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ تم نڈر ہو کر اُن کا سامنا کرو۔ کچھ دیر بعد ہی وہ ہیولے تمھارے حکم کی تعمیل کرنے لگیں گے۔ تم اُن سے کہنا کہ وہ اس چھڑی سمیت تمھیں میرے پاس لے چلیں۔ پھر دیکھو گے کہ پانچ منٹ کے اندر یہ چھڑی یہاں آ جائے گی۔ تین چار میل کے فاصلے کو وہ پانچ منٹ میں طے کرا دیں گے۔ کیوں، ہو اس کام کے لیے تیار؟"

اس یکایک حکم کو سن کر دیو سنگھ کے پاؤں میں کپکپی ہونے لگی۔ اُس نے خود کو سنبھالتے ہوئے ہمت کے ساتھ کہا "ہاں ہاں!" اور چھڑی کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ وہ دل ہی دل میں خوفزدہ ہوا کہ کہیں یہ ہدایت سچ نہ ہو۔ پرانے بزرگوں کی طرح بابا یہ ہدایت اُس کا امتحان لینے کے لیے مذاق کے طور پر تو نہیں دے رہا ہے۔

شہنشاہ نے کہا۔ "چھڑی ابھی نہیں رات کو ملے گی۔ کتنی دیر لگے گی تمھیں یہاں سے شمشان جانے میں۔؟"

"تقریباً پون گھنٹہ۔" دیو سنگھ نے سوچتے ہوئے کہا۔

شہنشاہ چھڑی سہلاتے ہوئے بولا۔ "تو تم چاند ڈوب جانے پر یہاں آ جانا۔ اُسی وقت میں تمھیں یہ چھڑی دے دوں گا۔ بھوتوں کے لیے گھبراہٹ نقصان دہ ہے۔ گھبرانا نہیں۔ ہمت سے کام لیتے ہوئے قدم آگے بڑھانا۔ کامیابی یقینی ہے۔"

دیو سنگھ نے افسر کو سلام کیا اور چل دیا۔

اُس کے جانے کے بعد شہنشاہ نے کہا۔ "میری یہی خواہش ہے کہ یہ بچّہ اپنے ارادے میں کامیاب ہو۔"

کنزرویٹر بولا۔ سوامی جی، میں تو یہی سمجھا تھا کہ ساری بات صرف افواہ اور وہم پر مبنی ہے۔ لیکن آج پولیس کمشنر صاحب سے معلوم ہوا کہ دو سپاہی اسی خوف سے بے ہوش پڑے ہیں۔ بھوت پریت پر یقین تو نہیں ہوتا۔ لیکن جو بات اتنے لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔ وہ سچ ہی ہوگی۔

شہنشاہ نے کہا۔ "بدروحیں تو ہیں ہی اور شمشان ان کا گھر ہے۔ میں نے آپ کے افسروں سے کہا تھا کہ وہ اپنا کام کرتے رہیں اور بھوتوں کو بھی اپنا کام کرنے دیں۔ اور اُن کی طرف بالکل دھیان نہ دیں۔"

کنزرویٹر نے کچھ دیر خاموش رہ کر کہا۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ یہاں دُور دُور سے لائی ہوئی قیمتی لکڑی جمع ہے۔ ان بارہ پندرہ لاکھ سلیپروں کو اسی مہینے ریلوے کو سپلائی کرنا ہے۔ اگر دیر ہو گئی تو دریا میں پانی کم ہو جائے گا اور لکڑیاں یہیں پڑی رہ جائیں گی۔ اور اگر اسی طرح بدروحوں کا ناچ ہوتا رہا تو مزدور کام نہیں کریں گے اور ہمارے کام میں خلل پڑ جائے گا۔"

"تو پھر اگر بجرنگ بلی نے چاہا تو آج رات ہی یہ بھوت ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں گے۔ سب کچھ اسی آدمی کی ہمت پر منحصر ہے۔ اگر وہ پست ہمت ثابت ہوا تو اسے میدان چھوڑ کر بھاگنا پڑے گا۔ خیر اب آرتی کا وقت ہو گیا ہے۔ پہلے سین صاحب کو رخصت کر دیں۔"

تین قدم نیچے اتر کر شہنشاہ نے کہا۔ "ارے سین، ایک بات سنو۔ تم سہائے کا تبادلہ ضلع میں کیوں کر رہے ہو۔ روز روز کے دورے اور پانچ کلکٹروں کا کام اُس کے بس کی بات نہیں ہے۔ اسے اپنے پاس دفتر میں کیوں نہیں بلا لیتے؟ لکھنے پڑھنے میں تو یہ کافی تیز ہے۔"

سین نہیں چاہتے تھے کہ دوبارہ سہائے کو سکریٹریٹ میں بلایا جائے۔

شہنشاہ نے دوبارہ کہا "سوچ کیا رہے ہو؟ اس کی جگہ پانڈے کو ضلع کا حاکم بنا کر بھیج دینا۔ وہ کہتا ہے کہ دفتر میں بیٹھ کر

کام کرنے سے اُس کا ہاضمہ خراب ہو گیا ہے۔"

شہنشاہ کی طرف دیکھ کر بہت آہستگی سے سین نے کہا۔ "سوامی جی اس وقت کسی قسم کی تبدیلی ممکن نہیں ہے۔"

شہنشاہ زیر لب مسکرایا۔ پھر آہستہ سے بولا۔ "مقررہ وقت پر تبدیلیاں کر گئے ہی، کیا میں نہیں جانتا! اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ ایسے آدمیوں پر مہربانی کرنا۔ سہائے اسی لیے تو آیا ہے۔"

سین کو چپ چاپ کھڑا دیکھ کر شہنشاہ نے دوبارہ کہا۔ "سین مجھے اُدھیڑ بن میں نہ رکھنا۔ صاف صاف بتاؤ۔ ان کا کام کر دو گے نا؟"

جس کام کے لیے مہینوں لکھا پڑھی ہوتی، کئی بار درخواست دینے پر دو منٹ کی ملاقات کا موقع ملتا۔ اور پھر بھی کام بننے کی امید نظر نہ آتی۔ وہ کام شہنشاہ نے آدھے منٹ میں کر دیا۔ سین نے وعدہ کر لیا۔

ڈیرے پر پہنچ کر دیو سنگھ نے گردھر کو شہنشاہ کی پھڑی لے کر آدھی رات میں شمشان میں جلتی ہوئی چتا کے پاس جانے کی ہدایت کے بارے میں بتایا۔ اچانک کوئی سخت دھات سر میں لگ جانے سے جو چکر آتا ہے، ویسی ہی حالت گردھر کی اس انوکھی ہدایت کو سن کر ہو گئی۔ اُس نے خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ شہنشاہ اتنا سنگدل ہو سکتا ہے۔ لمحہ بھر کے لیے اُس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ گارد کے سپاہی ابھی تک نہیں آئے تھے۔ شام کو اور چار فرد اپنا حساب لے کر چلے گئے۔

چند لمحے خاموش رہ کر اُس نے اپنی حالت بحال کرتے ہوئے دیو سنگھ کی طرف دیکھا۔ اُسے خوفزدہ نہ پا کر اُس کے دل میں نا اُمیدی کے درمیان امید کی جو کرن جاگی تھی وہ اور بھی تیز ہو گئی۔

پُر امید ہو کر اُس نے کہا۔ "جب ہمارے لیے دو ہی راستے ہیں، ایک یہ کہ ہم شہنشاہ کے پاس جا کر کہیں کہ یہ کام ہم سے نہیں ہوگا۔ آپ ہی بھوت پریتوں سے ہمیں محفوظ رکھیے دوسری بات یہ کہ بھوت پریتوں پر اپنے عدم یقین کو اور مضبوط کرنے کے لیے ہم شہنشاہ کی بات مان لیں اور شمشان جا کر دیکھیں کہ حقیقت کیا ہے۔ میں اب بھی یہی سمجھتا ہوں کہ بد روحوں کے ان ہیولوں کے پس منظر میں شہنشاہ کی کوئی شرارت ہے۔ آج ہمیں پتہ چلا ہے کہ وہی ان ہیولوں کو نچاتا ہے۔ 'بس بے تال' اور 'پیر نگ بلی' کا نعرہ وہی لگاتا ہے۔"

دریا کے کنارے آتے ہوئے دو بندوق بردار سپاہیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دیو سنگھ نے کہا۔ "نئی گارد تو یہ آ رہی ہے۔"

گردھر نے کہا۔ "بہت اچھا ہوا۔ اب رات کو ہمارے چلے جانے کے بعد یہ پریشانی بھی نہیں رہے گی کہ یہاں کون رہے گا۔ شمشان تک میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔ ہم لوگ تو روز شام کو لکڑیاں بہانے اس کنارے تک جاتے ہیں۔ جب تک تم پھڑی لے کر نہیں لوٹو گے، میں وہیں تمہارا انتظار کروں گا۔ اس دوران میں یہ بھی دیکھ بھال کر لوں گا کہ شہنشاہ ہمارے ساتھ کیا چال چل رہا ہے!"

دیو سنگھ تھوڑی دیر چپ رہا۔ پھر تنبو کے باہر دیکھ کر بولا۔ "جب ہمارے افسران ہی شہنشاہ کی ہاں میں ہاں ملا رہے ہیں تو ہم اکیلے کیوں اس کی مخالفت کریں۔ اُس کی بات چیت سے پتہ چلتا ہے کہ دھمکی دے کر ہم نے اچھا نہیں کیا۔ ہم بھی اُس کے پاؤں دباتے تعریف کرتے تو وہ ہماری بھی [illegible] کر دیتا۔"

گردھر نے کہا۔ "ایک اول درجے کے جھوٹے اور شریر آدمی کے آگے سر جھکانا، بغیر کام کیے ترقی کی امید رکھنا یا انعام مانگنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ کیا ہم ہمیشہ ایسی ہی غلط اور گھٹی ہوئی فضا میں رہیں گے۔ اگر ہم بد روحوں کے اس ناچ کی پول کھولنے میں کامیاب ہو گئے تو ہمارے افسران کی بھی آنکھیں کھل جائیں گی۔ بس آج ذرا سی ہمت کریں اور بھانڈا پھوڑ دیں۔ کیا تمہیں ڈر لگتا ہے۔؟"

شہنشاہ کو ایک موٹی سی گالی دے کر دیو سنگھ نے دعا نہیں، آپ ساتھ رہیں گے تو ڈر کس کا؟

گارڈ کے جن سپاہیوں نے ساتھ چلنے کے لیے کہا تھا وہ رات دس بجے تک بھی تیار نہیں ہو سکے۔ آخر میں حوالدار نے کہلا بھیجا کہ انھیں لکڑیوں کی حفاظت کے لیے بھیجا گیا ہے، بھوتوں سے لڑنے کے لیے نہیں۔ کسی اور ساتھی کو بھی شریک کرنے میں ناکام رہ کر رات کے دس بجے گردھر دیو سنگھ کو ساتھ لے کر شمشان کی جانب چل کھڑا ہوا۔ دیو سنگھ نے گورکھا چوکیدار کی کھوکھری اپنی کمر سے لٹکائی اور گردھر نے اپنا بھرا ہوا ریوالور جیب میں ڈال لیا۔ دیو سنگھ پر یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ وہ خوفزدہ نہیں ہے گردھر آگے آگے چلتا رہا۔ اُس نے دیکھا کہ دیو سنگھ خوف سے مسلسل کانپ رہا ہے۔ شاید یہ کپکپی سردی کی شدت کے باعث ہو۔ یہ سوچ کر اُس نے کچھ نہیں کہا۔

پتلی سی پگڈنڈی پر گردھر ٹارچ سے روشنی پھینکتا جا رہا تھا۔ شمشان قریب آجانے پر گردھر نے پگڈنڈی چھوڑ دی اور ریت پر چلنے لگا۔ چبھنے والے پتھروں اور کوئلوں کے ٹکڑوں سے بچ کر چلتا ہوا وہ جلتے ہوئے انگاروں کو دیکھ کر رُک گیا۔ اُسی وقت ایک سیاہ سایہ تیزی سے اُس کا راستہ کاٹ گیا۔ گردھر نے ٹارچ کی روشنی اُدھر ڈال کر کہا "یہ تو لومڑی ہے۔"
اس لمحہ ایک اور لومڑی پانی میں سے کچھ اٹھا کر بھاگ گئی۔ اس کی سُرخ آنکھیں ٹارچ کی روشنی میں تھوڑی دیر تک چمکتی رہیں۔
سایے کی طرح نظر آنے والی لومڑی کو دیکھ کر دیو سنگھ کا دل ڈوبنے لگا تھا۔ لیکن اب دوسری لومڑی کو دیکھ کر اُسے قدرے اطمینان ہوا۔

جلتے ہوئے انگاروں پر ایک پتھر پھینک کر ڈرا دینے ماحول کو ختم کرنے کے لیے گردھر نے کہا۔ "یہی تازہ چتا ہے جو مُردے کو جلا رہی ہے۔ یہیں تمھیں چھڑی گاڑنی ہوگی۔ ابھی کچھ گڑبڑ نہیں ہے۔ اب میں سنبھل کے اس بڑے پیڑ کے نیچے تمھارا انتظار کروں گا۔ اور دیکھتا رہوں گا کہ اس دوران یہاں کون آتا ہے۔"
دونوں ساتھی لوٹ کر نالے کی طرف بڑھے۔ پیڑ کے نیچے ٹارچ کی روشنی پھینک کر گردھر نے کہا۔ "اب راستہ صاف ہے۔ میں تمھیں یہیں پر ملوں گا۔ کیا تمھیں ڈر لگ رہا ہے؟"
"بالکل نہیں۔" دیو سنگھ بولا۔ "اب میں کھوکھری نکال کر چلتا ہوں۔ دیکھتا ہوں میرے مقابلے پر کون آتا ہے؟"
دیو سنگھ کے راستے پر گردھر نے دُور تک روشنی پھینکی۔ گھاس کے تنکے کہیں کہیں جنگل کی طرف ایک سیدھ میں مڑے ہوئے تھے۔

گردھر نے کہا۔ "ادھر یقیناً کوئی گیا ہے۔ نشان تازے ہیں۔ میں نے کہا تھا نا کہ اس دو ڈھائی میل کے راستے کو پانچ منٹ میں چھڑی لے کر کون پار کر سکتا ہے۔ اس پگڈنڈی پر ٹیلے تک سائکل آسانی سے چل سکتی ہے۔ اچھا، تم جاؤ۔ میں یہاں کے حالات دیکھ لوں گا۔"

مڑے ہوئے تنکوں کا معائنہ کرتا ہوا ابھی گردھر جنگل کی طرف پچاس قدم ہی بڑھا ہوگا کہ اُسے لکڑی کا ایک سلیپر پڑا ہوا ملا۔ اُس نے دیکھا جنگل کے درمیان تختے اور شہتیر بچھا کر پتلی سی خشک شاہ راہ بنا دی گئی ہے۔ آگے بھی تختے کہیں دوہرے اور کہیں اکہرے تھے۔ کہیں خالی سوکھی زمین تھی۔ ان پر احتیاط سے پیر رکھتا ہوا گردھر بانس کی گھنی جھاڑی کے پاس سے نکل رہا تھا کہ اچانک دو چمکیلے انگارے دکھائی دیے۔ کوئی جنگلی جانور ہے۔ یہ سوچتے ہی گردھر کا ہاتھ جیب میں رکھے ہوئے ریوالور پر پڑا۔

تبھی اُس کی طرف ایک سفید سی چیز اُڑتی ہوئی آئی۔ وہ اُس کے حملے سے بچنے کے لیے کچھ جھکا۔ لیکن اُس کی بائیں بھوں اور ناک کو چھوتی ہوئی وہ چیز نیچے گر پڑی اُس نے دیکھا کہ وہ ایک سوکھی ہڈّی تھی۔ وہ کھسک کر جھاڑی کی آڑ میں ہو گیا۔ اور ٹارچ سے اُس طرف روشنی پھینکی۔ وہاں ہڈیوں کے ڈھیر کے درمیان دو آنکھیں چمک رہی تھیں۔ وہ چہرا کچھ جانا پہچانا سا لگا۔ کوئی آدمی ہی تھا، ہاتھ اور پاؤں بھی تھے۔

خبردار اب اور کوئی حرکت کی تو گولی مار دوں گا" گردھر نے کہا۔

گردھر کی آنکھ سے بہتا ہوا گرم خون نیچے ٹپک رہا تھا۔ اپنی چوٹ کی پروا کیے بغیر وہ اُچھل کر بدلو پر جھپٹا۔ یہ دیکھ کر کہ بھوت پریت سے نہیں۔ بلکہ انسان سے مقابلہ ہے۔ اُس کی ساری گھبراہٹ ختم ہو گئی۔

بدلو اس ٹھیکیدار کا آدمی تھا جس نے جنگل میں پڑی ہوئی جانوروں کی ہڈیوں کا کسی ہڈّی کی مل کی طرف سے ٹھیکہ لیا تھا۔

تھر تھر کانپتا ہوا بدلو بولا۔ "افسر صاحب' میں نے آپ کو پہچانا نہیں تھا۔ نہیں تو ایسا ہرگز نہیں کرتا۔"

"اچھا ہوا میں نے جنگلی جانور سمجھ کر تم پر گولی نہیں چلا دی۔ اس رات کے وقت تم اس جنگل میں کیا کرنے آئے تھے، یہ بعد میں معلوم کروں گا۔ پہلے تم چپ چاپ اپنے ہاتھ اوپر اُٹھا لو۔"

ایک ہاتھ سے اُس کی طرف ریوالور تانے ہوئے گردھر ایک ایک قدم چلتا ہوا بدلو کے پاس پہنچ گیا۔ اُس نے اُس کے ہاتھ پشت پر باندھ دیے۔ اُس نے اپنی آنکھیں بند کر کے منھ کے اوپر بہتا ہوا خون پونچھا۔ زخمی آنکھ کو کھول کر دیکھا کہ اُس سے دکھائی دیتا ہے' یا وہ پھوٹ گئی ہے۔ یہ معلوم کر کے کہ اس سے ٹھیک دکھائی دے رہا ہے اُسے خوشی ہوئی کہ چوٹ معمولی ہے۔ ناک پاس ہاتھ لگانے سے اُسے پتہ چلا کہ اوپر کا ہونٹ چھل گیا ہے۔ خون کی دھار بہ رہی تھی۔ وہ اپنی قوت کو یکجا کر کے سوچنے لگا۔ "میں بے ہوش نہیں ہوں گا۔ ابھی نہیں ہوں گا۔ وہ بدلو کی پیٹھ پر ریوالور کی نالی گڑا کر بیٹھ گیا۔

سردی سے کانپتے بدلو نے ایک سگریٹ کی فرمائش کی، اور باتوں باتوں میں بتایا کہ نالے کے پار اُس کا ساتھی رتن چھپا بیٹھا ہے۔ تختوں کے ذریعہ بنایا گیا راستہ بہت مختصر ہے اور اس کے ذریعہ صرف پانچ منٹ ہی میں شہنشاہ کی کٹیا تک پہنچا جا سکتا ہے۔ نالے کے پار ساکھو کے پیڑوں پر بانس کے تین اونچے اونچے ڈنڈے کھڑے کرنے کا انتظام ہے۔ ان ڈنڈوں پر پھرکنیاں لگی ہوئی ہیں۔ شہنشاہ جب پٹاخہ چھوڑتا ہے تو ان پھرکنیوں پر بندھی رسیوں کے کمبل اور چادریں جھنڈوں کی طرح آسمان میں چڑھا دی جاتی ہیں۔ شہنشاہ کے "بس بے تال بس" کہنے پر ان جھنڈوں کو نیچے اتار دیا جاتا ہے۔ سویرا ہونے تک بانس اتار کر نیچے چھپا دیے جاتے ہیں۔

گردھر نے پوچھا۔ "تم یہاں ہڈیوں کے ڈھیر کے پاس کیا کر رہے تھے؟"

بدلو کو نہیں معلوم تھا کہ بھوت پریت کے اس ناٹک سے گردھر کا بھی تعلق ہے، وہ بولا "شہنشاہ نے کسی کے ساتھ شرط بدی ہے کہ وہ اُسے بھوت پریت دکھائیں گے۔ آپ کو شاید یہ نہیں معلوم کہ آج شہنشاہ چاند ڈوب جانے پر اپنے ایک آدمی کو بھیجیں گے۔ اُس کے آنے سے پہلے میں گلے میں ہڈیوں کی مالا پہن کر اور برقع اوڑھ کر پتھر کے پیچھے چھپا رہوں گا۔ جیسے ہی وہ چھڑی چتا کے پاس لے جائے گا۔ میں ہڈّی مار کر چھڑی اُس سے چھین لوں گا۔ پھر اس چھوٹے راستے سے بھاگتا ہوا چھڑی اُنھیں سونپ کر اُلٹے پاؤں لوٹ جاؤں گا۔ یہ ہے آج کی میری وردی" کہہ کر بدلو نے پیروں کے پاس پڑے ہوئے برقعے اور ہڈّیوں کی مالا کی طرف اشارہ کیا۔

گردھر بدلو کے ساتھی رتن کو قیدی بنانے کی ترکیب سوچ رہا تھا۔ ہڈیوں کی طرف ہاتھ بڑھا کر اُنھیں اُس نے اپنی جانب کھینچ لیا۔ انھیں ٹٹول کر اُس نے اُس پر ہاتھ پھیرا۔ بدلو کو باتوں میں لگا کر اُس نے آہستہ آہستہ اُس پر سے ہڈیوں کو علیحدہ کر دیا۔

کبھی جوتوں اور کبھی بائیں ہاتھ کا سہارا دے کر اس نے اُس کو آہستہ آہستہ سمیٹتے ہوئے بدلو سے پوچھا۔ تم کب سے بابا کی نوکری

کرنے لگے، بدلو!"

بدلو نے بتایا کہ وہ نوکری تو اپنے ٹھیکیدار کی کرتا ہے۔ اُس کے پاس مینا نگر گیا تھا۔ "بات یہ ہے" بدلو کچھ آہستہ لہجے میں بولا۔ "یہیں پہاڑ سے آئی ہوئی اس لکڑی کو مینا گھاٹ تک جلدی پہنچ جانے سے روکنا ہے۔ اس مہینے کے آخر تک اگر یہ رُک جائے تو ہمارے ٹھیکیدار کے پچھلے سال کے سلیپر بک جائیں گے۔ اگر یہ چیڑ کی اچھی لکڑی وہاں پہلے پہنچ گئی تو ہمارے ٹھیکیدار کے سلیپر سوختے کے بھاؤ بھی نہ بکیں گے۔ اُسے دس بارہ لاکھ کا نقصان ہو جائے گا۔ لکڑی رک گئی تو جو منافع ہوگا، اُس میں ایک پیسے کی پتی مجھے بھی ملے گی۔ رتن نے بھی ایک پیسے کی پتّی کر لی ہے۔"

رسّی کا ٹکڑا سلجھ گیا تھا۔ وہ پانچ چھ ہاتھ لمبا اور کافی مضبوط تھا۔ گردھر نے کہا۔ "بدلو، اب تم میرے آگے آگے چل کر رتن کے پاس چلو۔ اگر میں گارد کے سپاہیوں کو اُسے پکڑنے کے لیے بلاتا ہوں تو گڑبڑ ہو سکتی ہے۔ اور گولی بھی چل سکتی ہے۔ اس لیے نالے کے پاس جا کر اُسے چپ چاپ بلا لینا۔ میں اُسے پکڑ کر سپاہیوں کے پاس لے چلوں گا۔ اُس سے کہہ دینا کہ ذرا بھی کوئی حرکت کی تو میں اُس پر گولی چلا دوں گا۔ چلو میں تمہارے پیچھے پیچھے بھرا ہوا ریوالور لے کر چلتا ہوں۔"

گردھر کے زخموں سے اب خون بہنا بند ہو گیا تھا۔ لیکن جسم کانپ رہا تھا۔ کبھی کبھی زخموں میں اتنی شدید تکلیف اور کسک ہوتی تھی اُسے دانت پیس کر تکلیف برداشت کرنا پڑتی کہ کہیں بدلو پیچھے مڑ کر اُس کے چہرے سے خون بہتا ہوا نہ دیکھ لے۔ بدلو کہیں یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ وہ اس قدر گھائل اور کمزور ہو گیا ہے کہ وہ اُس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ اور پھر وہ مقابلے پر آجائے گا۔ یہ سوچ کر گردھر بدلو سے کہنے لگا۔ "بدلو، تم سیدھے چلتے رہو۔ ذرا بھی پیچھے مڑے یا رُکے تو گولی چلا دوں گا۔ تم جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔"

"نہیں سرکار!" وہ بولا۔ "یہ ہی کتنا دُور۔ آپ ٹارچ روشن کر لیں۔ میں اُسے یہیں بلاتا ہوں!"

پکارنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ بات چیت کی آواز اور ٹارچ کی روشنی دیکھ کر رتن نے پکارا۔ "بدلو، کیا بات ہے؟"

بدلو چلایا۔ "جلدی آجاؤ، گردھر صاحب بلا رہے ہیں۔"

"کہاں بلا رہے ہیں؟" رتن نے کہا۔

"یہیں تو کھڑے ہیں، جلدی آؤ۔"

نالے کو ایک ہی چھلانگ میں پھاند کر رتن چلا آیا۔ گردھر نے بدلو کی اوٹ میں کھڑے ہو کر کہا۔ "اب تم گرفتار ہو دونوں ہاتھ اوپر اُٹھا کر پاس آجاؤ، نہیں تو گولی چلا دوں گا!"

اچانک ریوالور خود بخود چل گیا۔ لیکن کسی کے گولی نہیں لگی۔ گولی کی آواز سن کر رتن ساکت کھڑا رہ گیا۔ گردھر نے جھپٹ کر رتن کو پکڑ لیا اور ہاتھ لشپت پر کرنے کا حکم دے کر بدلو کے برابر کھڑا کر دیا۔ اُس نے اُس کے ہاتھوں سے رسّی لپیٹ کر اُسی رسّی سے دونوں کو باندھ دیا۔

رتن نے کہا۔ "سرکار، ہم بھاگیں گے نہیں۔ آپ کے نوکر ہیں۔"

گردھر نے کہا۔ "اب تم شمشان کی طرف آگے آگے چلو۔ مجھے اس آدمی کو دیکھنا ہے جو چھڑی لے کر آنے والا تھا۔"

رتن اور بدلو کو یہ نہیں معلوم تھا کہ دیو سنگھ گردھر کا آدمی تھا۔ دیو سنگھ اس جنگل میں کبھی رہا بھی نہیں تھا۔

رتن نے کہا۔ "سرکار، آپ پریشان نہ ہوں۔ اُسے ہم پکڑ لیں گے۔ اُس وقت بس آپ میرے ہاتھ کھول دیجیے گا۔"

اُنھیں آگے کر کے گردھر سینبل کے پیڑ کے پاس پہنچ گیا۔ چاند سامنے کی پہاڑیوں کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ شمشان کی طرف بالکل

خاموشی اور سکوت تھا۔ وہ تین میل دُور شہنشاہ کی کٹیا میں جمع بھیڑ کا شور ہوا کی لہروں کے ساتھ کبھی کبھی اُن کے کانوں سے ٹکرا جاتا۔
رسّی کے سرے کو ایک بڑی ڈال سے پھنسا کر گردھر نے اپنی دائیں ہتھیلی کو تین چار بار کھولا اور بند کیا، وہ سستانے لگا۔ کچھ دیر بعد دیو سنگھ ہانپتا ہوا آیا، وہ ایک ہاتھ میں ننگی کھوکھری اور دوسرے میں چھڑی گھما رہا تھا۔ "کون ہے، بدمعاش سامنے آئے!" وہ چلّا رہا تھا۔

گردھر نے اُسے پکار کر کہا۔ "دیو سنگھ سنو، یہاں آؤ۔"

دیو سنگھ نے کچھ نہیں سنا۔ وہ بدستور چلاتا رہا۔ گردھر نے دیکھا اُس کی آنکھیں چڑھی ہوئی ہیں۔ منھ سے جھاگ نکل رہے ہیں۔

گردھر نے ٹارچ کی روشنی اُس کی طرف پھینک کر کہا۔ "دیو سنگھ، میں یہاں ہوں۔"
گردھر کو دیکھ کر دیو سنگھ گالی دیتا ہوا اُس کی طرف جھپٹا اور کھوکھری کا وار گردھر پر کرنا چاہا۔ اپنی ساری تکلیف بھول کر گردھر ایک طرف چھپ گیا۔ اُس نے کہا۔ "دیو سنگھ ہوش میں آؤ۔ میں افسر جنگلات گردھر سنگھ ہوں۔"
لیکن دیو سنگھ کو ہوش نہیں آیا۔ گردھر نے ایک لمحہ توقف کیے بغیر دیو سنگھ کے اوورکوٹ کو بجلی کی سی تیزی سے جھٹک کر اُسے گرا دیا۔ اور اُس کی کھوکھری دُور پھینک دی۔ اور اُس کے گالوں پر زور زور سے طمانچے لگائے۔
ایں، ایں، کرتے ہوئے دیو سنگھ آنکھیں ملنے لگا۔ ناک سے بہتا ہوا خون پونچھتے ہوئے بولا۔ "گردھر صاحب گردھر صاحب مارو اس شہنشاہ کو!"

گردھر نے پھر کہا۔ دیکھتا نہیں، میں ہوں، گردھر سنگھ۔ یہ شہنشاہ کے بھوت پریت میں نے باندھ کر رکھ لیے ہیں۔"
"باپ رنے" دیو سنگھ ہوش میں آ کر بولا۔ "ہائے رام، کیا میرے ہاتھ سے آپ کو چوٹ لگی ہے۔؟"
گردھر نے فوراً اوٹ میں ہو کر کہا۔ "روشنی سے میری آنکھ کو تکلیف پہنچ رہی ہے۔ میری طرف ٹارچ کی روشنی نہ پھینکو چوٹ تو ان لوگوں کو پکڑنے میں لگی ہے۔ لیکن خیر گہری نہیں ہے۔"
دونوں قیدیوں کو گارد کے حوالے کرنے اور زخموں کی مرہم پٹی کرنے میں سویرا ہو گیا۔
شہنشاہ کی کٹیا میں موجود بھیڑ کے کچھ لوگ دیو سنگھ کی تلاش میں دریا کے کنارے ڈیروں تک پہنچ گئے۔ اُن سے پتہ چلا کہ رات دیو سنگھ کو جھڑی دینے کے بعد دھماکا کی آواز سن کر شہنشاہ ضروریات سے فارغ ہونے کا بہانہ کر کے جنگل کی طرف چلے گئے تھے۔ پھر لوٹ کر ہی نہیں آئے۔ دیر تک جب اُن کی واپسی نہ ہوئی تو وہ لوگ ان کی تلاش میں نکلے
چمکیلی اور نرم دھوپ میں چائے پیتے ہوئے دیو سنگھ کے چہرے پر اُبھرے اپنی انگلیوں کے نشان دیکھ کر گردھر نے کہا "مجھے معاف کرنا دیو سنگھ تمھیں ہوش میں لانے کے لیے مجھے ایسا کرنا پڑا۔"
دیو سنگھ نے کہا۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ گردھر صاحب، آپ نے اپنی غیر معمولی ہمت اپنے ان طمانچوں کے ذریعہ میرے اندر بھی پیدا کر دی۔ آپ نے نہ صرف میری گھبراہٹ دُور کی ہے۔ بلکہ اس بدمعاش شہنشاہ کے کارناموں کا بھانڈا بھی پھوڑ دیا۔

"فن کار" نمبر شائع ہو گیا۔ ہر چھوٹے بڑے بک اسٹال سے ۷۵ پیسے میں خریدیے

دیش چتر کار

آجکل۔ دہلی۔

یہ رشتے یہ ناتے

پہلی تاریخ!

آج مہینے کی پہلی تاریخ تھی۔ متوسط درجے کے لوگوں، سرکاری دفاتر کے ملازموں بلکہ ملک کی آبادی کے بیشتر حصّہ کے لوگوں کے لیے ہر مہینے یہ دن ان کی زندگی میں کچھ دیر کے لیے تازگی بھر دیتا ہے۔ اگرچہ یہ خوشی یہ مسرت، اس کے لیے چند دنوں کی مہمان بن کر آتی ہے۔ کیونکہ گاڑھے پسینے کی کمائی گھر پہنچتے ہی گھریلو اخراجات میں اسی طرح منقسم ہو جاتی ہے۔ کہ اکثر کمانے والے کو آہٹ تک نہیں ہوتی کہ تنخواہ کب آئی اور کب ہوا ہو گئی۔

جیوتی بھی جب آج صبح بستر سے بیدار ہوئی تو معاً یہ خیال کہ آج پہلی تاریخ ہے۔ ہوا کے ایک خوشگوار جھونکے کی طرح اس کے جسم کو جھنجھوڑ سا گیا۔ وہ کوئی نوکری نہ کرتی تھی۔ اور نہ ہی کوئی اس کا نزدیکی رشتہ دار تھا جس سے کہ ماہانہ پانے کی امید ہو سکتی تھی۔ قدرت نے نہ جانے اس سے کب کا بدلہ لیا تھا۔ کہ بھری جوانی میں بیوہ ہو گئی۔ غریب ماں باپ کی چوتھی لڑکی کا فقط ایک سہارا اس کا خاوند ہی تھا۔ جس کی یاد اب اس کے لیے زمانۂ ماضی کا ایک کرب ناک خواب بن کر رہ گیا تھا۔

اپنے مرحوم خاوند کی یاد آتے ہی اکثر اس کی خزاں رسیدہ زندگی میں چند لمحات کے لیے موسم بہار کی سی تازگی آجاتی۔ کتنی اچھی صحت اور فراخدلانہ طبیعت پائی تھی دیپک نے! کندن سا رنگ ایسا کہ یورپین لوگوں کی رنگت بھی شرما جائے۔ اور جسم کے ہر عضو کی بناوٹ ایسی کہ جو بھی دیکھے۔ رشک کرنے لگے۔ اور جس دن وہ اسے بیاہ کر لایا تھا۔ تو دنیا دنگ رہ گئی تھی۔ جیوتی کی خوش قسمتی پر! ہر کسی کی زبان پر یہی الفاظ تھے۔ کہ اگر قسمت ہو تو جیوتی جیسی، جسے دیپک جیسا خاوند نصیب ہوا ہے۔ معقول تنخواہ، با مذاق طبیعت اور برتاؤ میں ایسی جاذبیت کہ جس سے سامنا ہو، وہ اسی کا ہو کر رہ جائے۔

لیکن جیوتی کی زندگی کا یہ سنہرا دور دیرپا ثابت نہ ہو سکا۔ ایک دن دیپک اسکوٹر پر دفتر کے لیے ایسا نکلا کہ جب شام کو دفتر سے اس کے واپس آنے کا وقت ہوا۔ تو جس دیپک کو لوگ گھر پہنچانے آئے۔ وہ دیپک پہلے جیسا دیپک نہ تھا۔ گھر لوٹتے ہوئے ایک شدید حادثے نے دیپک کے جیون دیپک کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بجھا دیا تھا۔

اور اس جہانِ فانی سے دیپک کیا اُٹھ گیا۔ جیوتی کی زندگی اندھیر ہو گئی۔ اس گھور اندھیرے میں اگر جیوتی کے لیے روشنی کی کوئی کرن،

باقی تھی۔ تو وہ تھی دیپک کی فقط ایک نشانی۔ کم سن بچّہ، جسے جیوتی آج بھی کسی غریب کی پونجی کی طرح سینے سے لگائے ہوئے تھی۔

جیوتی کی بدبختی کی انتہا یہی نہ تھی۔ سسرال والوں نے اس بے چاری پہ منحوس ہونے کی تہمت لگا کر اس سے کنارہ کشی کر لی تھی۔ دیپک کے والدین کے ذہن میں یہ بات ایک زہر بن کر سما گئی تھی۔ کہ وہ جیوتی کو کیا بیاہ کر لائے ہیں۔ کہیں سے کسی چڑیل کو بیاہ لائے ہیں۔ ڈائن آتے ہی ان کے ہونہار لڑکے کو نگل گئی۔

دیپک کی موت کے بعد جب جیوتی دنیا میں بالکل اکیلی اور بے یار و مددگار رہ گئی۔ تبھی سے وہ اسی گلی میں کرایے کے پرانے مکان میں اپنے بیٹے کے ساتھ رہ رہی تھی۔ چپ چاپ دنیا کے شور و ہنگامے سے الگ۔ اگر کوئی سہارا تھا۔ تو وہ تھا فقط نیلی چھت والے کی بھیجی ہوئی غیبی امداد کا۔ نہ جانے کون سخی یا داتا ایسا تھا جو کہ بڑے کمرے کی گلی میں کھلنے والی کھڑکی کے پاس رکھی ہوئی میز کی دراز میں ہر ماہ پہلی تاریخ کو ایک لفافے میں بند اڑھائی سو روپے کی کرنسی نوٹ نہایت ہی پراسرار ڈھنگ سے رکھ جاتا تھا۔ یہ عمل پچھلے پانچ برس سے جاری تھا۔ اور یہی تھی اس کی ماہانہ آمدنی۔ جس پر دونوں ماں بیٹے کی بسر اوقات کا انحصار تھا۔

نہ معلوم کتنی ہی بار جیوتی کے دل میں یہ تجسس پیدا ہوا کہ جیسے بھی ہو۔ وہ اپنے اس محسن کا پتہ لگا سکے اور یہ بات وہ ناممکن نہیں سمجھتی تھی۔ لیکن پھر جانے کیوں، وہ اس بات کو راز ہی رہنے دینے کے لیے اپنے دل کو رضامند کر لیتی۔ اور من ہی من میں اپنے محسن کے قدموں پر عقیدت کے چند پھول چڑھا کر مطمئن ہو جاتی۔ اسے اس بات کا خدشہ تھا کہیں اپنے محسن سے سامنا ہونے پر وہ اپنی بے بسی کے خلاف بغاوت کر دینے پر آمادہ نہ ہو جائے۔ اور محسن کے پاک جذبات کا شیشہ چکنا چور نہ ہو جائے۔ آخر کوئی بات ایسی ہے، کوئی راز ہے جس کے زیر اثر وہ فرشتہ سیرت انسان اپنے آپ کو چھپا کر بھی ان ماں بیٹے کی جیون ڈور کو سنبھالے ہوئے ہے۔

ان ہی خیالات میں ڈوبی ہوئی وہ آج پھر اس بڑے کمرے میں پہونچ گئی۔ مشین کے پرزے کی طرح خود بخود اس کے ہاتھوں نے گلی میں کھلنے والی کھڑکی کے پاس پڑی میز کے دراز کو کھولا۔ حسب معمول سامنے پڑے قدرے وزنی لفافے کو دیکھتے ہی اس کی آنکھیں تشکر سے جھک اٹھیں۔ آج پہلی تاریخ تھی۔ اور اڑھائی سو روپے کی رقم اس لفافے میں آج بھی موجود تھی۔

جیوتی نے لفافے کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ خود بخود اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ اپنے محسن کے تئیں چاہے وہ کوئی بھی تھا شکرگذاری کے بوجھ سے بوجھل اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چند قطرے بہہ نکلے۔

جیوتی پہ یہ کیفیت نہ جانے کتنی دیر تک طاری رہی کہ اچانک باہر کھڑکی کے پاس کھڑے ننھے پپّو کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔ "ممی! — ممی!" بچے کی آواز میں استعجاب آمیز سرگوشی تھی۔ "دیکھو تو رامو دادا کے مکان کے سامنے بہت سے لوگ کھڑے کچھ باتیں کر رہے ہیں۔"

اور جیسے ہی جیوتی نے کھڑکی کی سلاخوں کے پیچھے سے جھانک کر گلی کے نکڑ کی طرف دیکھا تو سچ مچ رامو دادا کے مکان کے سامنے بھیڑ لگی تھی۔ پھر اُسے ایسا محسوس ہوا کہ سامنے گلی میں کھڑے دو چار پڑوسی کچھ باتیں کر رہے ہیں۔ اور جیوتی کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب اس نے دیکھا کہ ان میں سے لگ بھگ سبھی کی نگاہیں اس کے مکان کی جانب اُٹھ کر رامو دادا کے مکان پر جا رکتی ہیں اس نے اُن کے درمیان ہونے والی گفتگو کی طرف دھیان دیا۔ تو کچھ اس طرح کے الفاظ سنائی دیئے۔

"واقعی ہم اسے سچی انسانی ہمدردی یا ایک انوکھے قسم کا اُنس کہہ سکتے ہیں۔"

"اجی صاحب! کون جانتا تھا۔ کہ دین و دنیا سے بالکل الگ رہنے والے اس بزرگ کے دل میں ایک عظیم جذبۂ ایثار بھی پل رہا ہے۔"

مین اسی وقت جیوتی کو اس کا استعجاب اپنی محفوظ حدود کو پار کرتا ہوا محسوس ہوا۔ جبکہ اس نے دیکھا کہ رامو دادا کے مکان کے سامنے کھڑے لوگوں کے ہجوم کا بیشتر حصہ خود اس کی طرف بڑھتا چلا آرہا ہے۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ ہجوم کی پیش قدمی ایک تھانیدار کر رہا ہے۔

کچھ ہی منٹوں کے بعد وہ ہجوم جیوتی کے مکان کے دروازے پر کھڑا تھا پھر اس کے ساتھ ہی دروازے پر ایک ہلکی سی دستک ہوئی۔ جیوتی نے دروازہ کھولا تو سامنے تھانیدار کو دیکھ کر اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

"معاف کیجئے گا محترمہ!" تھانیدار نہایت ہی مودبانہ انداز سے کہا۔ "ہم آپ کے لیے نہایت ہی منحوس خبر لے کر آئے ہیں۔"

جیوتی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ دہشت کے مارے زبان گنگ ہو چکی تھی۔

"کیا آپ گلی کے نکڑ پر رہنے والے رامو دادا کو جانتی ہیں؟" تھانیدار نے پوچھا۔

"گھبراؤ نہیں، جیوتی بہن!" تب اچانک ہی ایک پڑوسی نے آگے بڑھ کر تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔۔۔۔"

اس پڑوسی کے الفاظ نے جیسے جیوتی کی ہمت بندھا دی۔ بولی۔

"جی جی۔۔۔۔۔ نہیں تو۔۔۔"

"عجیب بات ہے!" تھانیدار بولا۔

"ہاں! ہاں! تھانے دار صاحب!" ایک دوسرے پڑوسی نے کہا۔ "ہم نے مرحوم رامو دادا کو محلے میں کبھی کسی سے بات تک کرتے نہیں دیکھا۔"

اور اس کے ساتھ ہی سامنے کھڑے دوسرے سبھی پڑوسیوں نے گردن ہلا ہلا کر اس بات کی تائید کر دی۔

اور جیسے ہی جیوتی نے رامو دادا کے نام کے ساتھ ملحق لفظ "مرحوم" کو سنا تو اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں لیکن نہ جانے شاید اس کی معصومیت نے اُسے اور زیادہ دلیر بنا دیا تھا۔ نہ دوسرے لمحہ ہی سنبھل گئی۔ اور بیشتر اس کے کہ تھانیدار کچھ کہتا وہ اپنے آپ پر پوری طرح سے قابو پا چکی تھی۔

"آپ کو شاید معلوم ہوگا کہ آپ رامو دادا آج صبح اپنے مکان میں مردہ پائے گئے۔" تھانے دار نے اپنی آمد کے مقصد کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "ان کا جیب اور لکھنے کی میز سے ہم نے دو خط برآمد کیے ہیں۔ ایک خط سے ان کی موت قدرتی واقع ہوئی ثابت ہوتی ہے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھیں اپنی موت کی آمد کی شاید پہلے سے ہی اطلاع ہو چکی تھی۔ اور اسی خط میں رامو دادا نے اپنی تمام جائداد آپ کے نام کر دینے کی وصیت کی ہے اور آخر میں ایک دوسرے خط کو جو آپ کے نام ہے اُسے آپ تک پہنچا دینے کی تاکید کی گئی ہے! لیجیے!"

جیوتی نے جھجکتے اور کانپتے ہاتھوں سے لفافہ لے لیا۔ پھر بھی نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے سبھی کی موجودگی میں لفافہ چاک کر دیا۔ لکھا ہوا تھا۔۔۔

"پیاری بہن، جیوتی!

کتنی عجیب بات ہے کہ ایک عرصے سے تمہارے ساتھ اپنے جس رشتے کا اظہار کرنے سے گریز کرتا رہا ہوں۔ ایسا کرنے کی آج اس وقت جسارت کر رہا ہوں۔ جبکہ اس جہان فانی سے کوچ کرنے کو تیار بیٹھا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ جس وقت میرا خط تمہارے ہاتھوں میں ہوگا۔ میری روح اس قفس عنصری سے پرواز کر چکی ہوگی۔

بہت کم لوگوں کو اس کا علم ہے اور وہ اس لیے کہ جب سے میں نے یہاں سکونت اختیار کی تھی۔ لوگوں سے الگ تھلگ ہی رہا میرے جیسے بظاہر ہر لحاظ سے پر قناعت زندگی بسر کرنے والے انسان کا دل ہمیشہ بدنصیبی کی آگ میں جلتا رہا۔ ایک اچھے گھرانے کے چشم و چراغ کو سب سے پہلے جس صدمے کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ تھا زندگی میں جوانی کی سیڑھی پہ قدم رکھتے ہی ماں باپ کا سایہ اٹھ جانا۔ اب میری دنیا فقط اپنی چھوٹی بہن شاردا تک ہی محدود رہ گئی۔ شاردا جو عمر میں مجھ سے کافی چھوٹی تھی۔ اور جانے کیوں مجھے جان سے عزیز تھی۔ انھیں دنوں میری زندگی کو ایک اور شدید جھٹکا لگا۔ میں دل کے دورے کی نامراد مرض کے چنگل میں پھنس گیا۔ بہتیرا علاج کرنے کے باوجود بھی اس موذی مرض نے میرا دامن نہ چھوڑا۔ یہ صدمہ میرے لیے پہلے صدمے سے کہیں زیادہ خطرناک ثابت ہوا۔ مجھے یہ خدشہ ستانے لگا کہ اس مرض کے ہاتھوں اگر میرا چراغِ زندگی کہیں وقت سے پہلے بجھ گیا۔ تو میرے بعد میری بہن شاردا کا کیا ہوگا؟ اس امکانی خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے میں اپنی صحت کے بارے نہایت محتاط رہنے لگا۔ یہاں تک کہ میں نے اس وقت تک ازدواجی زندگی کو نہ اپنانے کی قسم کھائی۔ جب تک کہ شاردا کے ہاتھ پیلے نہ کرلوں اور اُسے سکھی سکھی اپنا گھر بساتے نہ دیکھ لوں۔ لیکن قدرت کو شاید یہ سب کچھ منظور نہ تھا۔

ایک دن میری تمام تر کوششوں کے باوجود اس بدبخت بھائی کے ہاتھوں سے بے رحم موت اس کی جان۔ میری بھی پیاری بہن کو چھین لیا۔ میری جذباتی زندگی پہ یہ سب سے زیادہ کاری چوٹ تھی۔ میری تاریک زندگی میں فقط روشنی کی ایک کرن تھی جو بجھ گئی۔ ایک تمنا تھی جو ٹوٹ گئی۔ ایک آرزو تھی جو ختم ہوگئی۔ انھیں صدموں سے بیزار میں وہ شہر چھوڑ کر یہاں چلا آیا۔ مایوس، غم زدہ اور خود زندگی سے بیزار!

پھر ایک دن اچانک نہ جانے کہاں سے ایک بار پھر میری تاریک زندگی میں امید کی کرن پھوٹ نکلی۔ محلے میں دیپک تمہیں بیاہ کر کیا لایا، مانو میری بہن شاردا کو دوبارہ زندگی مل گئی ہو۔ وہی ناک نقشہ، وہی رنگ روپ، وہی قد و قامت، وہی چال ڈھال اور وہی جسم کی بناوٹ غرضیکہ تمہیں دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہونے لگا۔ جیسے شاردا پھر سے زندہ ہوگئی ہو۔ جیسے مجھے پھر سے زندگی کا مقصد مل گیا ہو۔ تمہاری صورت میں مجھے شاردا کی صورت نظر آئی۔ تمہاری سیرت میں مجھے شاردا کی سیرت نظر آئی۔ یا یوں کہو دنیا کے لیے جہاں تم جیوتی تھیں۔ میرے لیے میری ننھی بہن شاردا ہی تو تھیں۔ میری کھوئی ہوئی مسرت مجھے پھر سے مل گئی۔

لیکن جیسا کہ میرے ساتھ ہوتا آیا ہے، میری یہ خوشی یہ مسرت بھی دیرپا ثابت نہ ہوئی۔ دیپک کی اچانک موت نے میرے دل پہ جو اثر کیا۔ وہ میں ہی جانتا ہوں۔ کیونکہ فطری طور پہ اگر دنیا میں مجھے کسی سے اُنس رہا ہے تو وہ تھی میری چھوٹی بہن شاردا۔ اور شاردا کا عکس پھر تم۔ مجھے دنیا میں سب سے مقدس چیز لگی تھی، اگر اس دن موت کا فرشتہ دیپک کے بدلے مجھے اس دنیا سے لے جانے کو کہتا۔ تو میں بخوشی اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیتا کیونکہ مجھے اپنی چھوٹی بہن کا دکھ کسی بھی اور کسی حالت میں بھی قابلِ برداشت نہیں ہو سکتا تھا۔

دیپک کی موت کے بعد میں نے تمہارے رشتہ داروں کے ناروا سلوک اور تمہاری، نہیں نہیں اپنی چھوٹی بہن کی اقتصادی حالت کا بڑے قریب سے جائزہ لیا۔ اور تبھی سے تمہارے لئے اڑھائی سو روپے ماہانہ کی مدد دینا، میرا ایک مقدس فرض بن گیا۔ یہ فرض میں نے کس طرح پورا کیا۔ ایک راز ہے جو میرے سینے میں محفوظ ہے اور اسے اپنے سینے میں چھپا کر لے جاؤں گا۔ دنیا مجھے تمہارا محسن تصور کرے یہ مجھے کسی حالت میں بھی منظور نہیں تھا۔ میرے لیے یہ کیفیت بھی ناقابلِ برداشت ہوتی کہ تم خود مجھے اپنا محسن خیال کرو۔ اس کے علاوہ میں نہیں چاہتا کہ ہم دونوں بہن بھائی ایک چھت کے نیچے رہیں اور میری دل کی دیرینہ بیماری تمہارے لیے پریشانی کا باعث ہے۔

ایسا دکھائی دیتا ہے کہ میری خواہشات اور میرے تمام تر اصول اب زیادہ تر میرا ساتھ دینے کے قابل نہیں رہے۔ اب عمر اور بیماری کا مجھ سے ہر دم یہی تقاضا رہتا ہے۔ کہ نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے زندگی کے سفر کو جلد از جلد ختم کر دوں۔ مجھے اپنا انت اب صاف اور قریب نظر آ رہا ہے۔۔ اسی لیے چاہتا ہوں کہ تم پر جن امور کا اظہار جیتے جی نہ کر سکا۔ انھیں موت کے بعد، اس خط کے ذریعے سے واضح کر دوں ـــــ بیشتر اس کے کہ موت کے آہنی پنجے مجھے آکر دبوچ لیں۔ میں نے اپنی تمام تر جائداد، اور جو کچھ بھی میری ملکیت میں شامل ہے۔ اسے میں نے ایک وصیت کے ذریعہ اپنی چھوٹی بہن شاردا ـــــ نہیں نہیں جیوتی کو ایک حقیر تحفہ کے روپ میں ارپن کر دیا ہے۔ اس وقف سے متعلق تمام قانونی دستاویزات میرے وکیل کے پاس محفوظ ہیں میری موت کی خبر پاتے ہی وہ تمام قانونی کارروائی مکمل کر دے گا۔ اس کام کے لیے اسے خاطر خواہ رقم بطور فیس پیشگی ادا کی جا چکی ہے ـــــ

اب اجازت دو بہن! موت کا فرشتہ مجھے اس آخری تحریر کو ختم کر دینے کے لیے مجبور کر رہا ہے۔ موت کی آخری گھڑی میں بھی میرے منہ سے بہن اور اس کے ننھے بچے کی درازیٔ عمر کے لیے دعائیں نکل رہی ہیں۔ بھگوان کرے تم دونوں خوش و خرم رہو۔

تمہارا بدنصیب بھائی

ہری رام "

خط پڑھ لینے کے بعد جیسے ہی جیوتی نے اپنی آنسوؤں سے بھیگی آنکھیں اوپر اٹھائیں تو دیکھا سامنے تھانے دار کے ہمراہ پڑوسیوں کا ہجوم بالکل ساکت کھڑا ہے۔ عین اسی وقت ہجوم میں سے کسی کی دھیمی آواز سنائی دی۔ میری رائے میں مرحوم کے انتم سنسکار میں اب زیادہ تاخیر نہیں ہونی چاہیے"

"جی میرا بھی یہی خیال ہے" اس سے آگے جیوتی کچھ نہ بول سکی۔ اس کے الفاظ شدتِ غم اور آنسوؤں کی طغیانی میں ڈوب کر رہ گئے۔

"افکار" کا
فیض نمبر
اپریل ۱۹۶۵ء
میں شائع ہو رہا ہے
صفحات ۵۰۰ سے زائد
قیمت صرف دس روپے
مکتبۂ افکار۔ رابسن روڈ۔ کراچی

رستم علیخاں ساقی۔ کراچی

اِنسانیت مَرتی نہیں

تاریخ اور مہینہ یاد نہیں البتہ اتنا یاد ہے کہ ۱۹۴۷ء اور شام کا وقت تھا، اُس شام کلانور کے چند لوگوں نے بھوانی سے دلّی جانے والی ٹرک کو لکڑ ڈال کر روک لیا۔ سڑک روکنے کا مقصد یہ تھا۔ کہ جو ہندو مسافر اُس سڑک سے گزرے اُسے تہ تیغ کر دیا جائے۔ سڑک روکنے والے لے بیحد مشتعل تھے۔ انھیں انتقامی جذبہ نے دیوانہ بنا دیا تھا۔ اُس وقت اتفاقاً جمعدار راؤ امداد خاں صاحب وہاں جا پہنچے، انہوں نے نا بپھرے ہوئے لوگوں سے دریافت کیا۔ کہ اس ارادۂ ظلم کی تہ میں اصل معاملہ کیا ہے؟ ان لوگوں میں سے ایک شخص نے بتایا کہ آج صبح دہلی ے کلانور آتے ہوئے سانپلہ کے قریب راؤ عبدالحکیم خاں کو ہندوؤں نے قتل کر دیا ہے۔ اور دوسرا اشتعال انگیز واقعہ یہ ہے کہ راؤ محمد ادریس ل فوج سے کلانور دس یوم کی رخصت پر آرہا تھا۔ اصطل ابوہر کے اسٹیشن پر چند ہندو بلوائی اُن کے درجے میں داخل ہوئے۔ اور جب ریل ڑی چلی تو محمد ادریس خاں پر حملہ کر دیا۔ اور راؤ ادریس خاں نے بھی بلوائیوں کا بڑی جوانمردی سے مقابلہ کیا اور اس اکیلے نے کئی ہندوؤں کو بُری ح زخمی کر دیا۔ بالآخر ہندوؤں نے مجبوراً اسے دھکا دے کر چلتی گاڑی سے گرانا چاہا۔ لیکن محمد ادریس گرتا گرتا ایک ہندو کو بھی اپنے ساتھ ، گرا۔ جب وہ دونوں گرے اس وقت ہندو نیچے تھا اور محمد ادریس اُس کے اُوپر گرا، اُسی دم زنجیر کھینچی گئی۔ کچھ دور جا کر گاڑی رکی۔ اور گاڑی ، اتر کر لوگوں نے دیکھا۔ تو سر پھٹنے کی وجہ سے وہ ہندو مرا پڑا تھا۔ لیکن محمد ادریس وہاں نہ تھا۔ پھر وہ بلوائی محمد ادریس کی تلاش میں جنگل میں گھس گئے رگاڑی چل پڑی۔ خیال ہے کہ بلوائیوں نے محمد ادریس خاں کو تلاش کرکے ہلاک کر دیا ہوگا۔

یہ تمام رُوداد کلانور کے ایک بنئے نے سنائی ہے۔ وہ بنیا بھی اُسی درجے میں تھا۔ جس درجے میں محمد ادریس خاں سفر کر رہا تھا۔ اور وہ بنیا بخت رتھے۔ کیونکہ وہ کمزور آدمی غیظ و غضب میں بھرے ہوئے بلوائیوں کا بھلا کیا کر سکتا تھا، جمعدار امداد خاں یہ حقائق سن کر بے حد رنجیدہ ہوئے جلد ہی انہوں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ اور پھر اُن بپھرے ہوئے لوگوں سے کہا۔

"مجھے یہ حقیقت سن کر بڑا دکھ ہوتا ہے۔ لیکن اس دکھ کا مداوا یہ نہیں ہے۔ کہ تم راستہ روک کر بے گناہ راہ گیروں کو ہلاک کرنا شروع کر دو۔ ہیں۔ دُنیا کا کوئی مذہب یہ نہیں سکھاتا۔ کہ زید کے بدلے تم بکر کو قتل کر دو۔ سانپلہ اور اصطل ابوہر یہاں سے کم از کم چالیس میل کے فاصلے ہیں اور یہ پتہ نہیں کہ وہ کون لوگ ہیں۔ جن لوگوں نے ہمارے آدمیوں کو شہید کیا ہے۔ مزہ تو تب ہے کہ ہم ان لوگوں کو معلوم کریں اور پھر ہیں قتل کرکے اپنے دل کی پیاس بجھائیں۔ ورنہ بلاوجہ کسی کو مسافر سمجھ کر قتل کرنا مذہب اسلام میں روا نہیں ہے۔ یاد رکھو ایک مسافر کے دل میں بڑی بڑی

حسرتیں اور ارمان ہوتے ہیں، محض مذہب کے نام پر ان کے ارمانوں کو کچلنا کہاں کی شرافت ہے؟ دوسرے محمد ادریس خاں جمعدار راؤ شیر جنگ کا لڑکا ہے۔ شیر جنگ خاں بہت غیور اور بڑا بہادر آدمی ہے۔ میں جانتا ہوں وہ یہ کبھی نہیں چاہے گا۔ کہ اس کے بیٹے کے بدلے کسی انجانے کو ہلاک کر دیا جائے۔ یہ ٹھیک ہے کہ آج کی سیاست بس یہ سکھاتی ہے کہ جو سامنے آ جائے دھرم کے نام پر اُسے ہلاک کر دو، لیکن یہ بزدلی ہے۔ انسان اسے کبھی نہ پسند کرے گا۔ راؤ امداد خاں صاحب کی اس تقریر سے وہ لوگ بہت متاثر ہوئے اور اپنا ارادہ بدل کر وہ اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ اُسی رات محمد ادریس خاں بھی اپنے گھر آ گیا۔ اُس کے بازو اور ٹانگ میں سخت چوٹ آئی تھی۔ اس کے باوجود وہ بلوائیوں سے بچتا بچاتا آدھ میل چل کر روہتک آیا۔ اور پھر روہتک سے موٹر میں سوار ہو کر کلانور آ گیا۔

اِنسان جس قدر بہادر ہوتا ہے اُتنا ہی رحم دل بھی ہوتا ہے۔ راؤ امداد خاں صاحب کی بیٹھک جوہڑ کے کنارے جنگل میں تھی۔ وہ اکیلے اپنی بیٹھک میں رہتے تھے۔ مجال نہیں تھی۔ جو اُن کی بیٹھک کے سامنے سے کوئی ننگے سر یا کوئی مشتبہ قسم کا شخص گزر جائے۔ رات کی تاریکی ایک مرتبہ ان کا مقابلہ ڈاکوؤں سے ہوا، دونوں طرف سے بڑی دیر تک گولیوں کا تبادلہ ہوتا رہا، اس کے مقابلے کے نتیجہ ان کے ہاتھ سے ایک مر گیا۔ اُس ڈاکو کے ساتھی اپنے ہمراہی کی لاش اٹھا کر فرار ہو گئے۔ بعد میں ان ڈاکوؤں کی طرف سے انہیں انتقامی دھمکی دی گئی۔ کہ آپ اس دنیا میں آپ کو بس چند روز کا مہمان سمجھیں۔ لوگوں نے کہا کہ آپ کا بڑھاپا ہے، آپ جنگل چھوڑ کر قصبے میں آ جائیں۔ لیکن راؤ امداد خاں صاحب نے ان کی دھمکیوں کی کوئی پرواہ نہ کی اور لوگوں سے صاف کہا ڈاکو مجرم ہوتے ہوئے وہ اپنی جان پر کھیل کر مجھے مارنے آئیں گے۔ اور میں کہیں چھپ جاؤں تو پھر بتاؤ کہ ایسی حالت میں مجھے اس دنیا میں زندہ رہنے کا کیا حق ہے۔ یہ جواب سن کر قصبے سے چند مسلح نوجوان رات کو ان کی مدد کے لئے گئے مگر انہوں نے یہ الفاظ کہہ کر انھیں لوٹا دیا۔ کہ یہ دو چار یوم کا معاملہ نہیں ہے جو تم لوگ میری مدد کو آئے ہو۔ کیونکہ میرا تو یہاں مکان ہے اور ایسے جھگڑے تو برسوں چلتے رہتے ہیں۔ سوچو میں تمہاری امداد کے سہارے کب تک زندہ رہ سکوں گا۔ پھر ڈاکوؤں نے کئی برس اُن کا تعاقب کیا۔ لیکن وہ ان پر قابو نہ پا سکے۔ وہ دن میں سوتے اور تمام رات بندوق لئے ڈاکوؤں کے مقابلے کے لئے چوکنے بیٹھے رہتے۔ ان پر کئی مرتبہ گولیاں چلیں۔ لیکن وہ بچ نکلے ثابت ہوئیں۔ ان کا بہت چوڑا سینہ اور بڑھاپے میں بھی شیر کی مانند چہرہ تھا۔ ان کی چوڑی کلائیوں کے مقابلے میں اپنی کلائیاں دیکھ کر نوجوانوں کو بے حد ندامت ہوتی تھی۔ اس قدر مضبوط جسم تھا ان کا دل بھی مضبوط اور صاف شفاف تھا وہ اپنی زندگی سے قطعاً بے پرواہ تھے۔ لیکن کمزوروں اور راہ گیروں پر ظلم زیادتی دیکھ کر کانپ اُٹھتے تھے۔ اسی قبیل کا ایک قصہ اور سنیئے :-

۴ر نومبر ۱۹۴۷ء کو میں اپنے سیونگ بنک کے حساب سے رقم برآمد کرانے روہتک پہنچا۔ ڈاکخانہ گیا تو وہاں اس وقت پوسٹ آفس کے اندر ایک ضعیف العمر مسلمان بزرگ کھڑے تھے اور ان کے پاس کھڑا ہوا ایک ادھیڑ عمر سکھ شدید غصے کے انداز میں پوسٹ ماسٹر صاحب سے جھگڑ رہا تھا۔ اس وقت پوسٹ ماسٹر صاحب کچھ گھبرائے ہوئے تھے۔ پھر گھبراہٹ کے عالم میں پوسٹ ماسٹر نے کچھ کرنسی نوٹ گن کر ان بزرگ کو دیئے۔ نوٹ دینے کے بعد اُس ادھیڑ عمر سکھ اور پوسٹ ماسٹر کے درمیان جو جھگڑا تھا وہ ختم ہو گیا۔ پھر وہ مسلمان اور سکھ دونوں ساتھ ساتھ پوسٹ آفس سے باہر چلے گئے۔ ان دونوں کے جانے کے بعد جب میں اپنے کام سے فارغ ہو کر پوسٹ آفس سے باہر نکلا تو اس وقت وہ سکھ ڈاکخانے کے سامنے کھڑا تھا۔ میں نے اس سے دریافت کیا۔ کہ آپ کے اور پوسٹ ماسٹر صاحب کے درمیان کیا جھگڑا تھا؟ مجھے اس ادھیڑ سکھ نے بتایا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے ایک مسلمان بزرگ کو دیکھا جو آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے پوسٹ آفس سے باہر نکل رہے تھے۔ اُن بزرگ نے پوسٹ آفس پر ایک نفرت انگیز نگاہ ڈال کر بلند آواز سے کہا:- اے ظالمو! یہ پاپ کا گھڑا جو تم لوگ بھر رہے ہو، کبھی نہ کبھی انشاء اللہ ضرور پھوٹے گا۔ میں نے اُن بزرگ سے پوچھا:- بابا کیا بات ہے۔ آپ اس قسم کے الفاظ اس دفتر کے متعلق استعمال کر رہے ہیں؟

کی وجہ سے مجھے پانچ صد روپے کم دے کر پوسٹ آفس سے باہر نکال دیا۔"

میں نے کہا: "بابا میرے ساتھ آئیے، کم از کم پوسٹ ماسٹر سے بات تو کریں کہ آپ کو بڑھاپے میں یہ سزا کیوں دی گئی ہے؟"

"بیٹا، یہ کوئی دریافت طلب بات ہے؟ فقط میرا جرم یہ ہے کہ میں مسلمان ہوں۔"

میں نے ان بزرگ کے ساتھ جاکر پوسٹ ماسٹر سے کہا کہ "جناب اگر آپ کو بھیڑیا بن کر خون پینا ہی تھا۔ تو پھر کوئی موٹا تازہ آدمی تلاش کرتے آپ نے ان بزرگ کے ساتھ جو ناروا سلوک کیا ہے وہ قطعاً غیر مناسب ہے۔ یہ آپ کو زیب نہیں دیتا۔ کہ آپ غنڈوں اور لفنگوں کا سا کام کریں۔"

"یہ بوڑھا آپ کا باپ لگتا ہے؟ آئے حمایتی بن کر، شرم نہیں آتی۔ ابھی مسلمانوں نے مار مار کر مغربی پنجاب سے نکالا ہے۔ اب بھگوڑا، نہیں سانپوں کا ہمدرد بنتا ہے۔"

"اپنے حواس درست کیجئے۔ یہ سب بیکار دھمکیاں ہیں۔ میں ان دھمکیوں میں آنے والا نہیں۔ یا تو سیدھی طرح ان بزرگ کے روپے گن دو۔ ورنہ میں تمہارے خلاف سخت کارروائی کرتا ہوں۔"

اس کے بعد میرے اور پوسٹ ماسٹر کے درمیان جو تلخ کلامی ہوئی وہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ البتہ جب لڑائی جھگڑے تک نوبت پہنچی تو پھر وہ پیسے پوسٹ ماسٹر نے ان بزرگ کو واپس کر دیئے۔ اب میں سوچ رہا تھا۔ انگریز سامراج کے جاتے ہی ہمارے ملک میں انسان اور بھیڑیئے کی زندگی کے درمیان کوئی فاصلہ نہ رہا۔ بلکہ آج سفاکی اور بربریت میں انسان بھیڑیئے سے بہت آگے نکل چکا ہے۔ میرا خیال ہے ۱۹۴۷ء کے خونی ہنگامے نے انسان کو جو درندگی بخشی ہے۔ وہ آئندہ کبھی انسانیت کا روپ نہ دھار سکے گی۔ جو بدسلوکی آج ہندو، سکھ اور مسلمان کے ساتھ کر رہا ہے وہ بدسلوکی ہندو سکھ آئندہ ہندو سکھ کے ساتھ بھی ضرور کرے گا۔ اور جو آج برا سلوک مسلمان نے ہندو سکھ کے ساتھ کیا ہے۔ وہ ناروا سلوک آئندہ مسلمان مسلمان کے ساتھ لازمی کرے گا۔ کیونکہ موجودہ ہنگاموں اور لوٹ مار نے ہمیں اس قدر خود غرض بنا دیا ہے کہ ہم اپنی ذات سے ہٹ کر کسی دوسرے کے لئے سوچ ہی نہیں سکتے۔ دوسرے کے لئے کیا بلکہ ہم اپنے ماں باپ اور حقیقی بھائی اور اپنے نئے آزاد ملک کے لئے بھی نہ سوچ سکیں گے۔ کیونکہ آدمیت مر چکی ہے اور انسانیت کا جنازہ نکل چکا ہے اور ہمارے دلوں میں جو زہریلا عناد پیدا ہو چکا ہے آئندہ یہ عناد بلا تفریق مذہب خود اپنے ہی گھر کو بھسم کر کے رکھ دے گا۔ رشوت خوری، چور بازاری، ریاکاری اور منافقت کے بادل چھا جائیں گے۔ خوشامدی اور چاپلوس لوگ سسکتی ہوئی انسانیت کے سینے پر دندناتے پھریں گے۔ یہ وعظ سن کر میں نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"آپ نے مستقبل کے بارے میں جو کچھ بیان کیا ہے یہ سب تخریبی پہلو ہے، اب کوئی اصلاحی پہلو بیان کیجئے۔ تاکہ ناکامی اور مایوسی کی فضا بدلے یہ جو کچھ خون خرابہ ہوا ہے۔ جب راج بدلتے ہیں تو اکثر انقلاب میں ایسا ہوتا ہی ہے۔"

"میرے بھائی میں معذرت خواہ ہوں، کیونکہ اس وقت میرے ذہن میں مستقبل کے لئے کوئی تعمیری پہلو نہیں ہے، خدا کرے مستقبل کے لئے میرا یہ خیال غلط ثابت ہو۔ اور دونوں ملکوں میں انسانیت پھلے پھولے، میں کوئی ولی نہیں ہوں۔ جو غیب کی بات بتا سکوں۔ اصل میں بات یہ ہے کہ میں ایک مذہبی آدمی ہوں۔ میں نے ہر مذہب کا مطالعہ ہے۔ میں یہ کبھی خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا۔ کہ اپنے آپ کو ہندو سکھ اور مسلمان کہلانے والے لوگ اس قدر خود غرض، ظالم اور سفاک ہو سکتے ہیں۔ کہ وہ اپنے ننھے بچوں اور معصوم عورتوں کا بھی احترام نہیں کر سکتے۔ اور میرے بھائی مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سامراج نے جاتے وقت انسان نہیں بلکہ خونخوار بھیڑیئے آزاد کر دیئے ہیں۔ جو اب اپنے ہی آپ کو چیر پھاڑ رہے ہیں۔ آج ان غیر انسانی باتوں کو دیکھ کر خدا کی وحدانیت سے منکر، لامذہب اور دہریئے بھی لرز اٹھے ہوں گے۔ میں جانتا ہوں میری یہ بے ربط باتیں آپ کو ناپسند ہیں۔ لیکن مستقبل میں میری یہ باتیں آپ ضرور یاد کریں گے۔ معاف کیجئے چند واقعات سے میرا دل جلا ہوا ہے اور دل جلا آدمی ہمیشہ بہکی باتیں کرتا ہے۔"

میں نے ان کی بات کاٹتے ہوئے پھر کہا۔ "آپ وہ غیر معمولی واقعات مجھے ضرور سنائیں۔ جن المناک واقعات نے آپ کے نازک دل میں

پھپھولے ڈال دیئے ہیں:

"میں مغربی پنجاب کے ایک چھوٹے سے گاؤں کا باشندہ ہوں۔ ملک میں خونریز فسادات کے باوجود ہمارے گاؤں میں سکھ اور مسلمان امن اور شانتی سے رہتے تھے۔ میں اخبارات میں انسان کے خون کی ارزانی کے لرزہ خیز واقعات روزانہ پڑھتا تھا لیکن اپنی نظر سے میں نے غارت گری کا کوئی منظر نہ دیکھا تھا۔ میں نے ۳۰ اکتوبر ۴۷ء کو جب اپنا وطن چھوڑا تو ٹرینوں میں مارکاٹ ختم ہو چکی تھی۔ اور دونوں فرقوں کے لوگ بخیریت آ جا رہے تھے۔ ہماری ٹرین لاہور پہنچی تو سُنا کہ کل یہاں ایک مسلمان نے ایک ہندو مسافر کو چھرا گھونپ دیا ہے ذاتی طور پر اس خبر سے مجھے بے حد رنج پہنچا اور جب ہماری ٹرین امرتسر پہنچی۔ تو وہاں سنا کہ کل لاہور میں جب ہندو کو چھرا گھونپا گیا تھا آج امرتسر میں ایک مسلمان مسافر کو قتل کر کے اس ہندو کا بدلہ لے لیا گیا ہے۔ اندھے انتقام کی اس خبر نے میرے جسم میں کپکپی سی ڈال دی۔ ساتھ ہی اخبار کی وہ خبر میرے ذہن میں اُبھری جب امرتسر میں ہندو سکھوں نے مسلمان مہاجرین کی ٹرین ختم کی تھی۔ اور پھر لاہور میں مسلمانوں نے ہندو سکھ شرنارتھیوں کی ٹرین تہ تیغ کر کے بدلہ لے لیا تھا بیساختہ میرے منہ سے نکلا، اوہ! اب دونوں ملکوں کا اللہ ہی نگہبان ہے اور پھر میں سوچ میں پڑ گیا۔ دیس کے وہ صوبے جہاں ہندو مسلم اقلیت کو یرغمال کے طور پر رکھنے کا فیصلہ ہو چکا تھا میرے خیالات کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ دیس کی تقسیم نے ہندو مسلم اقتدار کا تو فیصلہ کر دیا۔ لیکن افسوس، یہ تقسیم تمام اقلیت کے دکھوں کا مداوا نہ بن سکی۔ کروڑوں کی تعداد میں ہندو مسلم اقلیت محض مذہبی تفریق کی بنا پر سسکتی رہے گی میں ان ہی خیالات کی اُدھیڑ بُن میں رہا کہ رات کو ہماری ٹرین دلی جا پہنچی۔ دوسرے روز صبح دہلی ریلوے جنکشن کے قریب اچانک شور و غل اُٹھا۔ میں دوڑ کر وہاں پہنچا۔ تو دیکھا کہ ایک دس گیارہ سالہ لڑکا خون میں لت پت زمین پر پڑا تڑپ رہا ہے اور وہیں پولیس تماشائی بنی کھڑی ہے۔ میں نے معلوم کیا تو پتہ چلا۔ کہ یہ کسی غریب مسلمان کا بچہ ہے۔ اسٹیشن پر بوٹ پالش کیا کرتا تھا۔ ابھی ایک سکھ نے کرپان مار کر زخمی کر دیا۔ اور پولیس کے سامنے مسکراتا ہوا وہ سکھ یہاں سے جا چکا ہے۔ میں اس زخمی لڑکے کو فوراً ہسپتال لے گیا۔ ہندو ڈاکٹر نے مرہم پٹی کے بعد مجھے بتایا کہ معمولی زخم ہے آپ فکر نہ کریں لڑکا بچ جائے گا۔ میں نے ڈاکٹر سے کہا۔ آپ اس لڑکے کا خیال رکھیے کیونکہ لڑکا مسلمان ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی متعصب ہندو سکھ ہسپتال میں لڑکے کو ہلاک کر دے۔ ڈاکٹر نے کہا۔ آپ بے فکر رہیں، میں اس لڑکے کا پورا پورا خیال رکھوں گا۔ وہ زخمی لڑکا میری اور ڈاکٹر کی یہ گفتگو سُن کر اپنی آنکھوں میں آنسو بھر لایا۔ ساتھ ہی میری آنکھیں بھی آنسوؤں میں ڈوب گئیں۔ مجھے روتا ہوا دیکھ کر ڈاکٹر نے دریافت کیا۔ "آپ کیوں روتے ہیں؟ کیا موجودہ فسادات میں آپ کا کوئی آدمی قتل کر دیا گیا ہے؟"

میں نے ڈاکٹر سے کہا۔ "انفرادی طور پر میرے خاندان کا کوئی آدمی ہلاک نہیں ہوا۔ میں اس بچے کی حالت زار پر رو رہا ہوں، اور انسانیت کے ناتے سے یہ میرا اپنا بچہ ہے۔ اور میں اُن تمام ہندو مسلمان اور سکھوں کو جو موجودہ ہنگاموں میں ہلاک کر دیئے گئے، اپنے خاندان کے افراد، تصور کرتا ہوں۔ افسوس ہم خود اپنے ہی ہاتھ سے اپنے پھول سے بچوں اور کڑیل جوانوں کو ذبح کر رہے ہیں۔ اور ہماری اس درندگی پر سامراج کھڑا ہنس رہا ہے۔ اُف یہ نام نہاد آزادی ہمیں کتنی مہنگی پڑی۔ اس بربریت اور سفاکی سے ہم نے یورپ والوں کے اس قول کو ثابت کر دیا۔ کہ واقعی ہم بھیڑیئے ہیں۔ اور آزاد ہونے پر خود اپنے ہی آپ کو چیر پھاڑ رہے ہیں۔ اور ہم بھیڑیوں کی نگری میں یہ سلسلہ ہمیشہ ہی جاری رہے گا۔"

وہ کچھ اور کہہ رہے تھے۔ کہ میرا نام لے کر کسی نے چیخ کر پکارا۔ میں نے مڑ کر دیکھا، میرا جاٹ دوست دریا سنگھ تھا۔ میں سامنے سڑک پر دریا سنگھ کے پاس پہنچا۔ وہ مجھ پر بہت ناراض ہوا۔ کہ "آپ اس برے وقت میں ایک چوٹ کھائے ہوئے سکھ شرنارتھی سے کیوں گفتگو کرتے ہیں" میں نے دریا سنگھ سے کہا کہ "اس سکھ شرنارتھی کے دل میں درد مند دل ہے اور یہ بہت شریف انسان ہے۔" میرے یہ الفاظ سن کر دریا سنگھ چلّا کر بولا۔ "تم غلط کہتے ہو۔ آج ہمارے دیس میں شریف اور رذیل کو پرکھنے کی کوئی کسوٹی نہیں ہے، میں آپ کے گہرے دوست کا حقیقی بھائی ہوں اگر تم اپنے دوست پر اور مجھ پر یعنی دریا سنگھ پر بھی اعتماد کرتے ہو تو یہ بھی ایک بہت بڑا دھوکہ ہے نہ جانے ہم کب محبت کو پاؤں تلے روند کر درندوں کا

سروپ دعا لیں۔

بعد میں میں اور دریا سنگھ روہتک سے ٹانگہ میں بیٹھ کر کلانور کی طرف روانہ ہوئے۔ جب راستہ میں دریا سنگھ کا گاؤں آیا۔ تو دریا سنگھ نے تانگے سے نیچے اتر کر کہا۔ " بھائی رستم! اب میں اور بھائی صاحب ۱۲ نومبر کو کلانور آئیں گے۔ کیا یہ یقینی بات ہے کہ آپ لوگ ۱۲ نومبر ۱۹۴۸ء کو پاکستان کی جانب روانہ ہوں گے ؟"

"ہاں بھائی دریا سنگھ، اب اس بات میں کوئی شک نہیں ہے " یہ الفاظ کہتے ہوئے میں نے آبدیدہ نگاہوں سے دریا سنگھ کی طرف دیکھا اُس وقت دریا سنگھ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔

تانگہ اس روح فرسا منظر کو چھوڑ کر آگے بڑھا۔ میں جس وقت کلانور پہنچا تو بہت سے آدمی جمعدار شیر جنگ کی بیٹھک کی طرف سے بازار کی طرف آرہے تھے۔ میں نے اُن آدمیوں سے پوچھا۔ کہ کیا معاملہ ہے ؟ ۔ نتھو سنگھ گوجر بولا۔ کہ تھانیدار راؤ شیر جنگ خاں سے لائسنس کی بندوق لینے آیا تھا۔ بڑی دیر تو تو میں میں ہوتی رہی، مگر شیر جنگ خاں نے بندوق نہیں دی۔ صاف کہہ دیا کہ آؤ میرے ساتھ مقابلہ کرو۔ کیونکہ آج بندوق سے زیادہ دوست انسان کا اور کوئی نہیں ہے۔ اور بندوق پاکستان کی طرف ہجرت کرنے سے پہلے میری لاش پر ہی سے اٹھا کر لے جائی جا سکتی ہے "

ادب کا اعلیٰ معیار ہمارا معیار ہے

اور

نیا دَور کا نام اس معیار کی ضمانت ہے،

نیا دَور کراچی

کا تازہ شمارہ ۳۵-۳۶ شائع ہو گیا ہے

قیمت تین روپے

- اس میں پاکستان اور ہندوستان کے بہترین لکھنے والے اپنی معیاری اور اعلیٰ تخلیقات کے ساتھ شریک ہیں۔
- اپنے کسی قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیے یا براہ راست ہمیں لکھیے!

منیجر، نیا دَور کراچی ۵

شنکر پنتا بیکر

سرِ یتا دہلی

چور دروازہ

مکان میں ایک چور دروازہ ضرور ہونا چاہئے۔ اس کے بہت سے فائدے ہیں۔ بچپن ہی سے میں چور دروازے کی اہمیت کا قائل ہوں۔ جب سکنڈ شو دیکھ کر سینما سے لوٹتا تھا تو چور دروازے ہی سے گھر میں داخل ہوتا تھا۔ اس طرح میرے گھر میں داخل ہونے کا علم ماں کے علاوہ کسی اور کو نہ ہو پاتا تھا۔ آج کتنی ہی بار میں دوستوں کی درد سری سے بچنے کے لئے چور دروازے سے بھاگ نکلتا ہوں۔ لینڈ لارڈ سے بچنے کے لئے چور دروازے جیسا اور کوئی راستہ ہے ہی نہیں۔

عورتوں کے لئے تو چور دروازہ ایک نعمت ہے۔

باہر بیٹھک سے منّے کے ہاتھ پیغام آتا ہے۔ "چار کپ چائے فوراً بھیجو۔"

ایسے بے وقت چائے! گھر میں دودھ کی ایک بوند نہیں ہے۔ اگر مکان کا چور دروازہ ہے تو دودھ کیا، کسی چیز کی بھی کمی نہیں۔ ذرا سوچئے، اگلے دروازے سے منگوانا اچھا لگتا ہے؟ آئے ہوئے مہمان کیا سوچیں گے۔ ان کے گھر میں دودھ تک نہیں ہے! سچی بات یہ ہے کہ چور دروازہ گھر کی عزت بنائے رکھنے میں بڑا مددگار ثابت ہوتا ہے۔

آج کے دور میں تو چور دروازے کی بڑی اہمیت اور بول بالا ہے۔ آپ اگلے دروازے سے داخل ہونے کے قابل نہیں ہیں تو چور دروازے سے کوشش کیجئے ضرور کامیاب ہوں گے۔ جو اہل ہیں اور اگلے دروازے سے داخل ہو سکتے ہیں، وہ آپ کے پیچھے سے گھس آنے پر چلتے بنیں گے۔ آج کل ایسی کوئی جگہ نہیں، جہاں چور دروازے کا وجود نہ ہو۔ اگلا دروازہ اگر سب کے لئے ہوتا ہے تو پچھلا دروازہ خاص خاص لوگوں کے لئے۔

اگلے دروازے سے ہونے والی بڑی پریشانی کیو سسٹم ہے۔ ہر کام کے لئے لائن میں کھڑے رہئے۔ بچے کو پرائمری اسکول میں داخل کرانا ہے، سینما کے ٹکٹ خریدنے ہیں۔ کارڈ پر شکر لینی ہے، قطار میں آ جائیے۔ کسی بھی کیو سے بچنے کا آسان طریقہ ہے چور دروازہ۔ آپ اس دروازے سے داخل ہوں تو پہلے ہی ایک دفعہ کیو میں کھڑے ہونے والے کا کام رہ جائے۔ البتہ آپ کا کام ضرور بن جائے گا۔

آپ ہمیشہ چور دروازے کا آسرا لیجئے۔ اگر آپ اچھے کھلاڑی نہیں ہیں، پھر بھی ٹیم کے لئے منتخب کر لئے جائیں گے۔ کسی انٹرویو میں بلائے گئے ہیں تو سمجھئے نوکری آپ ہی کو ملے گی۔ چاہے کتنے ہی آپ سے زیادہ قابل امیدوار میدان میں کیوں نہ ہوں۔

اگر مجھ نے منہ چناؤ میں ہار گئے ہیں تو گھبراہٹ کی صورت میں چور دروازہ آپ کے لئے موجود ہے۔ ودھان سبھا یا لوک سبھا کے چناؤ میں ہار گئے ہیں تو راجیہ پریشد یا راجیہ سبھا کے پچھلے دروازے سے ٹھاٹھ کے ساتھ گھس جائیے اور عیش کیجئے۔

پچھلے دروازوں سے ان دنوں کیا کیا کام نہیں ہوتے۔ آپ کے پرچے خراب ہوئے ہیں، لیکن امتحان میں تو آپ پاس ہونا چاہتے ہیں۔ بس چور دروازے سے کوشش کیجئے۔ ادھر سے کی ہوئی آپ کی کوشش اتنی کامیاب ہو سکتی ہے کہ خوب تیاری کے بعد امتحان میں بیٹھنے والا امیدوار پہلے ہی فیل ہو جائے، لیکن آپ اعلیٰ درجے میں پاس ضرور ہو جائیں گے!

اگلے دروازے سے داخل ہونے والے شدید بیمار کو تو اسپتال کے برآمدے کے کسی کونے میں جگہ ملے گی اور وہ بغیر علاج کے پڑا رہے گا لیکن اگر آپ چور دروازے سے داخل ہوں تو آپ کے لئے اسپیشل وارڈ کا انتظام ہو جائے گا، اچھی سے اچھی دواؤں اور کھانے پینے کی چیزوں کا بھی انتظام ہو جائے گا، خواہ آپ کی بیماری معمولی ہی کیوں نہ ہو۔

کسی دفتر میں آپ کی فائل کہاں جاتی ہے، ہزار کوشش کے باوجود آپ کو معلوم نہیں ہو پاتا۔ آپ حیران اور پریشان ہیں، لیکن غلطی آپ ہی کی ہے۔ ذرا پچھلے دروازے سے کوشش کیجئے، پھر دیکھئے کہ آپ کا کام دیکھتے ہی دیکھتے ہو جاتا ہے یا نہیں۔ پھر آپ کو دفتر کے کارکنوں کے ارد گرد نہیں گھومنا پڑے گا۔ وہ خود آپ کے ارد گرد گھومیں گے۔

آپ ادیب ہیں، لیکن آپ کی تخلیقات اخبارات اور رسائل میں شائع نہیں ہو پاتیں۔ ٹھیک ہے، یہاں بھی چور دروازہ کھٹکھٹایئے۔ آپ دیکھیں گے کہ پھر آپ کی معمولی سے معمولی تخلیقات بھی خاص نمبروں میں شائع ہوں گی۔

دنیا میں کامیاب لوگ وہی ہیں جو چور دروازہ کھٹکھٹانے میں زیادہ سے زیادہ ماہر ہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے کوئی کام بھی ناممکن نہیں ہے۔ وہ بھیڑ یا کیوں کے آدمی نہیں ہوتے، وہ کامیابی کو اتفاق پر نہیں چھوڑتے، بلکہ جال ڈال کر اسے اپنے بس میں کر لیتے ہیں۔ ان کے خواب — خواہ سرکاری خرچ پر امریکہ کی سیر کے ہی کیوں نہ ہوں — پورے ہو کر ہی رہتے ہیں۔

میں چور دروازے کو طلسمی دروازہ سمجھتا ہوں۔ اگلے دروازے سے داخل ہونے والا، گدھے کا گدھا یا گھوڑے کا گھوڑا ہی رہتا ہے۔ لیکن پچھلے دروازے سے داخل ہونے والا گدھا بھی گھوڑا بن جاتا ہے۔ ویسے بھی چور دروازہ ہوتا ہے گدھوں کے لئے۔ اصل میں وہ گھوڑے ہی گدھے ہوتے ہیں جو اگلے دروازے سے گھسنا چاہتے ہیں۔ پچھلا دروازہ ایسا جادوگر ہوتا ہے کہ پیادے کو فرزین بنا دیتا ہے۔

آج کل قابل ہونا سب سے بڑی نااہلی ہے۔ آپ قابل ہیں، اس لئے اسی کے بل بوتے پر کامیاب ہونے کی کوشش کرتے ہیں مگر قابلیت اور کامیابی کا تعلق؟ کبھی آپ نے قابل کہے جانے والوں کو کامیاب ہوتے دیکھا ہے! اگر آپ سچ مچ ہی کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو خود کو نااہل بنا لیجئے۔ جب تک آپ خود کو نااہل نہیں بنائیں گے، کامیابی حاصل کرنا آپ کے لئے مشکل ہے۔ یہ کوشش لازمی طور پر آپ کو چور دروازہ کھٹکھٹانے پر مجبور کرے گی۔ آپ بے دھڑک دروازہ کھٹکھٹایئے، کیونکہ داخل وہی شخص ہو سکے گا، جو پچھلے دروازے کی طرف سے آیا ہو۔

ہاں ایک بات ذہن نشین کر لیجئے۔ چور دروازے خود بخود نہیں کھلا کرتے۔ انہیں کھلوانا پڑتا ہے۔ آپ کو جن کے پاس پہنچنا ہے، یہ دیکھئے کہ کیا وہ آپ کے رشتے دار یا جان پہچان کے تو نہیں ہیں۔ اگر ہیں تو پھر کیا کہنا! سمجھ لیجئے کہ آپ کا استقبال ہوگا۔ اور اگر ایسا نہیں ہوتا تو ان کے رشتہ داروں سے جان پہچان نکالئے اور اسی بنا پر جدوجہد کیجئے۔ اُن کے ساتھ جایئے یا اُن سے سفارشی خط لیجئے۔ یہ سفارشی خط تو چور دروازے سے داخل ہونے کا نگہبان اور اجازت نامے کی حیثیت رکھتا ہے۔

ایک بار میرے ایک دوست کو پچھلا اونچا دروازہ کھلوانے کے لئے طرح طرح کے اداروں کے دس بارہ دروازے کھٹکھٹانے پڑے تھے۔ وہ اوپر سے تعلقات کا پتہ لگاتے لگاتے نیچے اس سیڑھی تک آ پہنچے، جس سے وہ خوب واقف تھے۔ تب انہوں نے اس سیڑھی سے چڑھنا شروع کیا۔ غرض یہ کہ اس سیڑھی سے وہ ان سے اوپر والے جان پہچان کے لوگوں کے لئے خط لے کر اور اوپر والوں سے اُن سے اوپر والوں کے نام خط لیتے ہوئے سیڑھی در سیڑھی منزل تک پہنچ ہی گئے۔

قابلیت اور ہوشیاری میں یہی تو فرق ہے۔ قابلیت رکھنے والے، اگلے دروازے کی جانب مڑتے ہیں۔ مگر ہوشیار پچھلے دروازے کی جانب۔ ہوشیار آدمی اگلے دروازے کا استعمال داخل ہونے کے لئے نہیں، اپنی عزت کرانے کے لئے کرتا ہے۔ چور دروازے سے آنے والا صدر دروازے پر آکر کھڑا ہوتا ہے۔ تو لوگ اُسے مبارک باد دیتے ہیں۔

پچھلا دروازہ کھٹکھٹاتے وقت بھول کر بھی یہ محسوس نہ کیجئے کہ آپ کوئی بُرا کام کر رہے ہیں۔ آپ کو یہ کہتے ہوئے شرم محسوس نہیں ہونی چاہئے کہ آپ کو کامیابی پچھلے دروازے کی بدولت ہی حاصل ہو سکی ہے۔ یہ بات آپ کی نااہلی کو ظاہر نہیں کرے گی، بلکہ اس سے ظاہر ہوگا کہ آپ کی شخصیت کس قدر پُر اہم ہے اور آپ کے تعلقات کتنے وسیع ہیں۔

چور دروازہ کھلوانے کی ضرورت پڑنے پر اگر آپ کا اپنا بھلا چاہنے والوں سے لائسنس حاصل نہ ہو سکے تو آخری طریقہ ہے۔ دان دکشنا۔ یہ طریقہ بھی آج کل بہت چل رہا ہے۔ اور تیر بہدف سمجھا جاتا ہے۔

پچھلا دروازہ صرف داخل ہونے کے لئے نہیں ہے، یہ آمدنی کا بھی خاص ذریعہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ اگلے دروازے سے بھی کملتے ہیں۔ آمدنی اصل میں وہ ہے۔ جس میں پچھلے دروازے سے بھی جیب بھرتی رہے۔ اگلی آمدنی پر تو انکم ٹیکس اور دیگر کئی طرح کی کٹوتیاں ہوتی ہیں۔ لیکن پچھلی آمدنی ان سب باتوں سے بچی رہتی ہے۔

اُردو کے مایہ ناز شاعر عبدالعزیز خالد کی

تخلیقات

سرودِ رفتہ	یونانِ قدیم کی شاعرہ سیفو کے نغمے	۴ روپے
غزل الغزلات	عہد نامۂ عتیق کا نغمۂ سلیمان	ایک روپیہ ۵۰ پیسے
دکانِ شیشہ گر	منظوم ڈرامے	۳ روپے
برگِ خزاں	" " " دوسرا ایڈیشن	چھ روپے
ورقِ ناخواندہ	" " "	۳ روپے
سلومی	دوسرا ایڈیشن مع اضافہ ترگوم	۲/۵۰ روپے
گل نغمہ	ٹیگور کی گیتانجلی	۴ روپے
زنجیرِ رمِ آہو	طویل و مختصر نظمیں (دوسرا ایڈیشن)	(زیرِ طبع)
ماتمِ یک شہرِ آرزو	نوحے (نیا ایڈیشن)	(زیرِ طبع)
زہرِ داغِ دل	طویل نظمیں "	"
کفِ دریا	نیا مجموعہ کلام	"
فارقلیط (آدم جی انعام یافتہ)	نامِ ختمِ رسل انجیل میں ہے فارقلیط ــ ذکر و فکرِ رسول	آٹھ روپے

مشتاق بک ڈپو ـ کراچی ۱

چند اہم کتابیں

مقدماتِ عبدالحق:- بابائے اُردو کی خدمتِ ادب کا روشن پہلو کسی کی نظر میں کچھ بھی ہو۔ لیکن مرزا محمد بیگ کا کہنا ہے کہ دوسروں کے کام کو اجا
کرنا بابائے اُردو کا کارنامہ ہے اور ڈاکٹر عبادت بریلوی کا قول ہے کہ بابائے اُردو کی صحیح شخصیت دوسروں کی شخصیتیں ابھار۔
ہی میں نمایاں ہوتی ہے۔ اور ان کا یہ احسان فن سے زیادہ فن کاروں پر ہے جن کی قلم کاری کے جوہر "مقدمات عبدالحق" سے روشنی میں
یہ مقدمات عرصہ ہوا دکن میں شائع ہوئے تھے۔ جن کو خود بابائے اُردو کی ترمیم و اضافہ کے بعد ڈاکٹر عبادت بریلوی نے از سرِ نو تر
دیا ہے اور یہ بیش قیمت مجموعہ اس دمکتے ہوئے آفتاب کے مترادف ہے جو اپنے دامن میں ان گنت ستاروں کی روشنی کے
ہے اور اپنی چمک سے ستاروں کی روشنی کم کرنے کے بجائے بڑھا رہا ہے۔ علمی ہمہ گیری اور ادبی جامعیت کی ایک عظیم تالیف ا
ادب کا ایک شاہکار ——— قیمت مجلّد ۱۷ روپے ——— پیپر بیک ——— ۵۰ — ۱۲ روپے۔

تاریخ اسلام:- عرب فنِ تاریخ کے موجد کہے جاتے ہیں۔ لیکن یہ بھی ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ عربوں کی تاریخی اساس روایات پ
رکھی ہوئی ہیں جن میں مشرق و مغرب کا اختلاف ہے۔ اسی لیے سید امیر علی نے جب "History of Sarasens" لکھنا شرو
کی تو مستشرقین کے ساتھ ساتھ یورپ کے مورخین کی رایوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ اور ہزاروں صفحات پر پھیلے ہوئے واقعات کو
پانچ چھ سو صفحات میں سمیٹ دیا۔ تاریخ دانوں کا اتفاق ہے کہ اسلام کی مختصر تاریخ اب تک اس سے اچھی نہیں لکھی گئی۔ جو زاویہ نگاہ
کے اعتبار سے کسی مکتبہ خیال کی پابند نہیں۔ بہر صورت ایک غیر جانبدارانہ تحقیق ہے۔ اس تاریخ کے کئی ترجمے اس سے قبل شائ
ہو چکے ہیں۔ لیکن وہ سب ناپید ہیں۔ زیرِ نظر ترجمہ وحشیؔ محمود آبادی نے ایک نئی ترتیب کے ساتھ پیش کیا ہے۔ جس سے واقع
کو سمجھنا آسان ہو گیا ہے۔
قیمت :- نو روپے

مختصر تاریخ ادبِ اُردو:- اُردو ادب کی تاریخ، ہندوستان کی تمدنی اور انقلابی تاریخ کے ساتھ چلتی ہے۔ جس پر ملک کے اکثر اہلِ قلم
نے قلم اٹھایا ہے اور اُردو میں کئی مکمل اور جامع تاریخیں موجود ہیں۔ لیکن ڈاکٹر اعجاز حسین نے جس اختصار کے ساتھ یہ تاریخ مرتب
کی ہے وہ اپنی افادیت کے لحاظ سے طلبار اور اہلِ ذوق دونوں کے لیے یکساں طور پر اہم ہے اور اسی لیے اساتذہ کرام اس کے مطالع
کی سفارش کرتے ہیں۔ چند سو صفحات میں سموئی ہوئی زبانِ اُردو کی سرگزشت میں تقسیم کے بعد کا دور بھی شامل کر دیا گیا ہے اور حال و
ماضی کا یہ آئینہ ضروری صحت کے بعد بار دگر پیش کیا جا رہا ہے۔
قیمت مجلد ۷ روپے۔

ترکی حور:- اُردو میں تمثیل نگاری کا نقشِ اوّل امانت کی اندر سبھا ہو یا کوئی اور کتاب، لیکن اب تو آغا حشر کا نام اُردو ڈرامہ سے
منسلک ہو کر رہ گیا ہے۔ اور ان کے ڈرامے آج بھی اتنے ہی مقبول ہیں جتنے اپنے عروج کے دور میں ہوں گے۔ "ترکی حور" آغا حشر کا
ایک کامیاب ڈرامہ ہے جو افادۂ عامہ کے خیال سے سستے ایڈیشن میں شائع کیا گیا ہے۔ قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے

مسدس:- حالیؔ افقِ مشرق کے ادبی آفتاب کی ایسی کرن تھے۔ جس نے اُردو نظم و نثر دونوں کو جگمگا دیا۔ ڈاکٹر بجنوری "دیوانِ غالب"
کو "ویدوں" کے بعد ہندوستان کی دوسری الہامی کتاب کہتے ہیں لیکن غالب کے اس شاگردِ رشید نے مسدس لکھ کر بتا دیا کہ ستاروں
سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔ مسدس کا صدی ایڈیشن صحت کے التزام کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ قیمت ۲ روپے پچاس پیسے

اُردو اکیڈمی سندھ —— کراچی — حیدرآباد — لاہور

جوش ملسیانی

آج کل دہلی

یوں ملاقات ہو تو لطفِ ملاقات ہے کیا
آپ تو بات بھی کرتے نہیں یہ بات ہے کیا

وہ یہ کہتے ہیں ذرا صبر سے روداد کہو
کہتے کہتے یہ ہر اک بات پہ ہیہات ہے کیا

دل کے داغوں کی چمک بھی ہے شبِ غم میں فروغ
جس میں تارے نظر آتے نہیں وہ رات ہے کیا

کچھ تو ہے بات کہ چھوڑی ہے خموشی تم نے
ورنہ یہ سلسلۂ حرف و حکایات ہے کیا

اپنے دل اپنے کلیجے میں جگہ دوں ان کو
اس سے بڑھ کر ترے تیروں کی مدارات ہے کیا

آج کیوں چشمِ عنایت ہوئی مجھ پر مبذول
پردۂ لطف و کرم میں بھی کوئی گھات ہے کیا

حسن والوں کا تغافل تو ہے مانی ہوئی بات
آپ کا حسن بھی پابندِ روایات ہے کیا

ایک سے ایک کی صورت ہی نہیں جب ملتی
اہلِ دانش کو پھر امیدِ مساوات ہے کیا

زہد و تقویٰ کے مضامیں نہ سنا ذرا اے جوش
صحبتِ پیرِ مغاں میں یہ خرافات ہے کیا

روشؔ صدیقی

آج کل دہلی

چارۂ دردِ کائنات کرو
جھوم اُٹھے زندگی وہ بات کرو

خمِ زلفِ بتاں کے دیوانو!
فکرِ آرائشِ حیات کرو

ہے یہی حسن وضعداری کا!
احترامِ تغیرات کرو

بڑھ گئی دل کی تنگ دامانی
اور تسخیرِ کائنات کرو!

دھن اگر ہے کسی سے ملنے کی
شام کو صبح دن کو رات کرو

شکوہ سنجِ سکوتِ لب نہ بنو
بول اُٹھیں خود صنم وہ بات کرو

ہے تکلف اگر توجۂ کرم!
بر بنائے تکلفات کرو!

ہم ازل سے ہیں گوش بر آواز
کبھی ہم سے بھی کوئی بات کرو

کوئی راز آشنا ملے تو روشؔ
بتِ ناآشنا کی بات کرو!

منظور حسین شور — فکر و خیال کراچی

شایانِ غمِ دوست نہ دنیا ہے نہ دیں ہے
منزل تری اے عشق کہیں ہے کہ نہیں ہے

ہر نقشِ قدم لائقِ سجدہ تو نہیں ہے
اے بیخودیِ شوق یہ توہینِ جبیں ہے

میں اور ہو کعبہ و بتخانہ کا سجدہ؟
سجدے کی سزاوار تو خود میری جبیں ہے

اک بات ہے آغوشِ گل و لالہ میں شبنم
پھر پھول کہیں، شبنم آوارہ کہیں ہے!

یہ کونسی منزل ہے بتا اے غمِ کونین
محسوس یہ ہوتا ہے فلک ہے نہ زمیں ہے

ہر شاخ پہ لہرا کے بھی گرتی نہیں بجلی
یہ فتنۂ غم اس قدر آساں بھی نہیں ہے

میرے ہی لیے درد ہے کیوں سارے جہاں کا
کیا درد کے قابل کوئی دل اور نہیں ہے

دل ہے کہ بدلتا ہی رہا درد سے پہلو
اک دل کی خلش ہے کہ جہاں تھی سو وہیں ہے

میں خانہ خرابِ غمِ جاناں تھا مگر شور
شاید غمِ جاناں بھی مجھے راس نہیں ہے

نشور واحدی — خاتون دکن حیدرآباد

وقت کا قافلہ آتا ہے گزر جاتا ہے
آدمی اپنی ہی منزل پہ ٹھہر جاتا ہے

ایک بگڑی ہوئی قسمت پہ نہ ہنس اے دوست
جانے کس وقت یہ انسان سنور جاتا ہے

ذوقِ مے عشق میں تبدیل ہوا ہے اکثر
شعلۂ جام بھی سینے میں اتر جاتا ہے

جام و صہبا کی مجھے فکر نہیں اے غمِ دوست
میرا پیمانہ تو اشکوں ہی سے بھر جاتا ہے

اس طرف عشق کی شمعیں تو اُدھر دل کے چراغ
دیکھنا یہ ہے کہ پروانہ کدھر جاتا ہے

ایک رشتہ بھی محبت کا اگر ٹوٹ گیا
دیکھتے دیکھتے شیرازہ بکھر جاتا ہے

وعدۂ دوست ہے یا گردشِ دوراں کا فریب
وہ اِدھر آتے ہیں اور وقت اُدھر جاتا ہے

شاید آغازِ طلب کی کوئی منزل ہے نشور
اس طرف قافلۂ اہلِ نظر جاتا ہے

صبا اکبر آبادی
منشور کراچی

عشق کا پوچھتا ہے وقت مزاج
زندگی لے رہی ہے دل سے خراج
کیا زمانے میں وہ نگاہ نہیں
عشق ہے جس نگاہ کا محتاج!
ہر نفس انقلاب ساماں ہے
حال جو کل تھا وہ نہیں ہے آج
یہ بھی ممکن نہے زورِ دستِ گدا
چھین لے سر سے بادشاہ کے تاج
دل کے داغوں کی تازگی نہ گئی
بارہا یہ چمن ہوا!.... تاراج
یہ دلِ عندلیب سے پوچھو
گلِ رنگیں ہے کتنا شعلہ مزاج
آنسوؤں سے بجھا کے دل کی پیاس
غم سے کرتا ہوں اپنے غم کا علاج
وہ ترے حسن کی پذیرائی!
وہ مرے عشق کی شبِ معراج
دل کو مایوسیاں عطا کر کے،
پوچھنے آئے ہو صبا کا مزاج

سلطان زبیری
سفینہ کراچی

پھول پر تتلی قیامت دل پہ ڈھائے جائے ہے
دورِ آغازِ جوانی یاد آئے جائے ہے
دھیان کی راہوں پہ رقصاں ہے کوئی مستِ شباب
میری رگ رگ میں جوانی گنگنائے جائے ہے
کھل گئی تھی ایک دن شانوں پہ وہ زلفِ رسا
اِک مہک اب تک ہوا میں سرسرائے جائے ہے
دل نہیں غنچہ، نگاہِ شوخ سے شاید کھلے
صبح کی پہلی کرن کیوں گدگدائے جائے ہے
کانپتی پلکوں پہ یہ جلتے دیے، بجھتے دیے
شام ہی سے شبنمستاں جھلملائے جلئے ہے
صبحِ غربت کی ضیا نورِ نظر تو ہے مگر
روح میں شامِ وطن ہی رسمسائے جائے ہے
گیت میں ڈوبی ہوئی ہے ساکت وصامت فضا
خامشی نازک لبوں پہ چھپائے جائے ہے
یاس کی تاریکیوں میں آس کا جگنو نہ ہو!
آندھیوں میں ایک دیپک ٹمٹمائے جائے ہے
کچھ غمِ جاناں بھی ہے سلطاں غمِ دوراں کے ساتھ
بحرِ غم میں دل کی کشتی ڈگمگائے جائے ہے

جبریل صدیقی

منزل کو جذبِ شوق سے آساں کرے کوئی
شمعیں قدم قدم پہ فروزاں کرے کوئی
یہ زندگی تو عشق کے ہمراہ چل پڑی
پیدا نئی حیات کے امکاں کرے کوئی
ہو دیکھنے کی چیز تو غم کا ہو تجزیہ
اشکوں کے زاویے سے نمایاں کرے کوئی
دل میں ابھی ہزار وفاؤں کے نقش ہیں
دیکھے اگر کوئی تو پشیماں کرے کوئی!
یہ حکم ہے کہ اپنی تمنّا بجبرِ عشق
پنہاں کرے کوئی نہ نمایاں کرے کوئی
اک شاہدِ سرود و ترنم کے واسطے
جذبے کو سازِ دل پہ غزلخواں کرے کوئی
ہاں لے ہوائے تند کے جھونکے معاف کر
میں زلف تو نہیں کہ پریشاں کرے کوئی
ہو جائے ان کے سارے حجابوں کا سدِّباب
اے جوشِ آرزو تجھے طوفاں کرے کوئی
جبریل اس جہاں میں پیمبر کی قدر کیا!
پیغام دے کے خود کو پشیماں کرے کوئی

جامِ نو۔ کراچی — کیلاش ماہر

سنائے ہیں گوش پہ آواز ذرا آہستہ
مونسو! آج کی شب ذکرِ وفا آہستہ

چاند کے پاؤں رُکے، تھم گئے اڑتے بادل
ذکر کس عارض و گیسو کا چلا آہستہ

کتنے "دن" آئے کفن اوڑھے ہوئے خوابوں کا
شب نے کھولی تری یادوں کی قبا آہستہ

کیا خبر اگلے برس اجنبی ہو جائیں ہم!
ٹوٹتے جاتے ہیں پیمانِ وفا آہستہ

آج پھر زخمِ تمنّا سے مہک اٹھتی ہے
کوئی پیغام لیے آئی صبا آہستہ

آنکھ نے دیکھا نہ ہو، دل تو مگر جانے ہے
کون دیتا ہے دریچوں پہ صدا آہستہ

سیپ کرا

بشر نواز — بلٹز، بمبئی

جب چھائی گھٹا لہرائی دھنک اک حسن مکمل یاد آیا
اُن ہاتھوں کی مہندی یاد آئی اُن آنکھوں کا کاجل یاد آیا

سو طرح سے خود کو بہلا کر، ہم جس کو بھلائے بیٹھے تھے
کل رات اچانک جانے کیوں وہ ہم کو مسلسل یاد آیا

تنہائی کے سائے بزم میں بھی پہلو سے جُدا جب ہو نہ سکے
جو عمر کسی کے ساتھ کٹی اس عمر کا پل پل یاد آیا

صحرا ہو کہ گلشن ہو کوئی بستی ہو کہ بَن پھر جی نہ لگا
جب نین رسیلے، روپ سجیلا تن وہ کومل یاد آیا

جو زیست کے تپتے صحرا پہ بھولے سے کبھی برسا بھی نہیں
ہر موڑ پہ، ہر اک منزل پر پھر کیوں وہی بادل یاد آیا

ہم زود فراموشی کیلئے بدنام بہت ہیں پھر بھی بشرؔ
جب جب بھی چلی مدماتی پون اڑتا ہوا آنچل یاد آیا

چراغؔ الہ آبادی — نئی قدریں حیدرآباد

جو حادثات کے سائے میں آ کے پلتا ہے
چراغ بن کے وہی آندھیوں میں جلتا ہے

قدم سنبھالے جو وہ خوش خرام چلتا ہے
تو نظمِ کون و مکاں کروٹیں بدلتا ہے

جو دل مچلنے پہ آئے تو یوں مچلتا ہے
سنبھالو لاکھ سنبھالے نہیں سنبھلتا ہے

ہمارا کھیل ہے طوفان و موجہ و گرداب
یہ بازیاں نہ ہوں تو جی کہاں بہلتا ہے

جو آشیاں پہ گری ہے وہ "برق" غیر نہیں
خود اپنی آگ میں ہر ایک "پھول" جلتا ہے

بتوں کے سامنے نالوں کے ہم نہیں قائل
خموش "آہ" سے پتھر کا دل پگھلتا ہے

چراغؔ عظمتِ جاوید ہوں زمانے میں،
کہ میری "لو" سے دلوں کا چراغ جلتا ہے

عرش صدیقی

سیپ کراچی

آبِ گُم کا سفر

غروبِ آفتاب اور سائے ڈھلتی شام کے
لہکتے گاتے کھیت شب کے خوف سے فسردہ رو
رَوِش رَوِش سے لمحہ لمحہ واپسی حیات کی
خموشیوں کے دشت میں مویشیوں کے قافلے
فسردہ دل تھکے ہوئے!
اور ان کے پیچھے چند سادہ نوجوان
تمام دن کی سختیوں کی دھول میں اَٹے ہوئے!
طیور نغمہ بار کے حیات بخش چہچہے
افق سے اُٹھنے والی تیرگی میں گُم!
طلوعِ آفتاب اور پھر وہ کل سا بانکپن
حیات کا حسیں چلن!
طلوعِ آفتاب اور غروبِ آفتاب اور طلوعِ آفتاب پھر،
مرا یہ سلسلہ نہیں
مری حیاتِ مختصر
ہے آبِ گُم کا اک سفر
مرے سفر کی اک سحر
مرے سفر کی ایک شام
اور اس کے بعد مستقل
زمیں کی گود میں ابد کی تیرگی
پرانے مقبروں کی گہری خامشی!!

محمود سعیدی

نیا دور کراچی

نوید

بدلتے موسم کا اوّلیں خوش نوا مغنّی
یہ ننھّا منّا سا اک پرندہ
جو اک پرانے درخت کے نو دمیدہ پتوں کی چلمنوں میں
چھپا ہوا چہچہا رہا ہے
ہوا کے بربط پہ جشنِ نوروز کا ترانہ سنا رہا ہے
نوائے رنگیں کے زیر و بم سے
فضا کے خاموش سرد سینے میں ایک ہلچل مچا رہا ہے
نئی تمازت سے مہرباں آفتاب کو ہمکنار پا کر
ٹھٹھرتی بے برگ ڈالیوں میں قرینۂ برگ و بار پا کر
شگفتہ لمحوں کی تتلیوں کو چمن میں واپس بلا رہا ہے
طرب کی دُھن میں یہ سرمدی گیت گا رہا ہے
کہ رنگ و نکہت کے آبشارو
گل و سمن کے حسین نظارو
خزاں کے ڈر سے چمن سے نکلی ہوئی بہارو
عدم کی یخ بستہ وادیوں میں پھروگی خانہ بدوش کب تک
رہوگی یوں برف پوش کب تک
نمو کی دنیا لیے نظر میں
پلٹ کے آجاؤ اپنے گھر میں
خزاں کا عفریت مر چکا ہے
تمہاری خانہ بدوشیوں کا اجاڑ موسم گزر چکا ہے

سحر انصاری
افکار - کراچی

قابیل کا سایہ

خدا کے خوف سے، اپنے گناہوں پر خجل ہو کر
وہ پیہم گریہ کرتا تھا
وہ اپنے بھائی کے لاشے پہ پیہم گریہ کرتا تھا
لہو آواز دیتا تھا زمیں کی خاکِ رسوا سے
خدا کا عرش کانپ اُٹھتا تھا اس فریاد کو سن کر
برادر کُش سزا پاتے تھے، پتھر بن کے جیتے تھے
اور اُن کے دل کی دھڑکن بند ہو جاتی تھی سینوں میں
اور ان کا خون اُن کی سرد شریانوں پہ ہنستا تھا

مگر اس دور میں کوئی خدا ایسا نہیں کرتا
کہ اب شہروں کی حالت اگلے صحراؤں سے بہتر ہے
کہ اب شہروں میں مارو اژدر و کرگس نہیں ملتے
کتب خانوں میں افکار و عقائد جلوہ فرما ہیں

ہزاروں درس گاہیں دائمی اقدارِ انساں ہیں
سیہ سڑکوں پہ کاریں ہیں فضاؤں میں ہیں طیارے
عماراتِ بلند اپنے فلک پیما دریچوں سے
مکوڑوں کی طرح چلتے ہوئے جسموں کو تکتی ہیں۔
ہمارے شہر مامن ہیں، ہمارے شہر گلشن ہیں
اب ان شہروں میں فرسودہ خدا کی کیا ضرورت ہے

خدا خاموش ہے اور خوف و غم سے نیم جاں انساں
ہوا کی لہر کو بھی موت کی آہٹ سمجھتے ہیں
کسی کو کچھ نظر آتا نہیں لیکن کوئی جذبہ
یہ چپکے چپکے کہتا ہے کہ اے ہابیل! اے ہابیل
ہلاکت کے نئے سامان سے آراستہ ہو کر
گلی کوچوں میں آ پہنچا ہے پھر قابیل کا سایہ

شہریار

خاموشی

سر برہنہ ہواؤں کی تاکید پر
شام دامن سمیٹے تری راہ پر
خشک پتوں کو شبنم کی پوشاک سے
پھر سجائے ہوئے ہے تری چاہ میں

لڑکھڑاتے دریچوں کے آغوش سے
زرد پردے نکلنے کو بے تاب ہیں
چاند کی نرم کرنوں کی فریاد سے
کتنے پتھر پگھلنے کو بے تاب ہیں

کس شفق کے تبسم کی اُمید پر
تیری سانسوں کی تنہائی خاموش ہے
تیری باہوں کی انگڑائی خاموش ہے

افکار۔ کراچی

شبی فاروقی

سیپ۔ کراچی

مرگ تمنا

مرے تعاقب میں آنے والو حسین لمحو مجھے نہ ڈھونڈو
میں آرزوؤں کی تنگ و تاریک قبر میں تھک کے سو گیا ہوں

مری رگوں میں مرے ارادوں کا خون اب سرد ہو چکا ہے
شکستِ فانوسِ قلب و جاں سے ہے روشنی طبع کی پریدہ
کہ شعلۂ یک نفس سے چراغِ حیات کا زرد ہو چکا ہے

نہ جانے کیا کیا جراحتوں کے گلاب مہکا گئے وہ دن جب
میں عرصہ گاہِ شب و سحر میں گئی بہاروں کا ہم سفر تھا
وفا کے ہونٹوں پہ نوحہ خواں ہے تبسم مرگ عہد پیماں
شعور، گم کردۂ تمنا، مآلِ فردا سے بے خبر تھا

متاعِ فکر و نظر ملی تو، غبارِ خاطر میں کھو گیا ہوں
مجھے مرے جذبۂ محبت نے حسرتوں کا کفن دیا ہے
میں آرزوؤں کی تنگ و تاریک قبر میں تھک کے سو گیا ہوں

مرے تعاقب میں آنے والو حسین لمحو مجھے نہ ڈھونڈو
مرے تعاقب میں آنے والو حسین لمحو مجھے نہ ڈھونڈو

واہی

تبصرہ نگاری

وہ جو ہوٹل میں چکھ رہے ہیں کباب
سامنے رکھ کے اک دبیز کتاب
آئیے میں بتاؤں کیا ہیں آپ
ماہرِ فنِ تبصرہ ہیں آپ
ایک گھنٹے میں دس کتابوں پر
آپ لکھتے ہیں تبصرے فر فر
ادب و فلسفہ و علم کلام
سارے موضوع آپ کے ہیں غلام
لاکھ موٹی سہی کتاب مگر
ڈالتے ہیں یہ سرِ ورق پہ نظر!
آپ کا خامۂ گہر افشاں
ہونے لگتا ہے دفعتاً جولاں!
بلکہ اکثر ہوا ہے ایسا بھی،
کہ کتابوں کی دور سے سونگھی
اور جھٹ سے نکال کر خامہ
فکر کو فن کا دے دیا جامہ
یہ بھی مشہور ہے کہ آپ کا فن!
ان کتابوں پہ بھی ہے خامہ زن
طبع ہونے کی بات... دور رہی
طبعِ فن کار میں جو گم ہیں ابھی

میں نے اِک روز اُن سے یہ پوچھا
میرے حضرت، بتائیے تو ذرا،
آپ ہر قسم کی کتابوں پر!
لکھتے رہتے ہیں تبصرہ کیوں کر
وقت اتنا کہاں سے لاتے ہیں
جوہرِ فن جو یوں دکھاتے ہیں
کرتے ہیں کب مطالعہ حضرت
کیسے ملتی ہے اِس قدر فرصت
ہنس کے بولے مطالعہ کیسا؟
پڑھ کے لکھا تو تبصرہ کیسا؟
فنِ تجرید کا یہ فیضاں ہے
کارِ مشکل جو سہل و آساں ہے
زورِ ابہام کا بڑھا جب سے
میرے فن کو ملی جِلا تب سے
اب تو ہر آرٹ کا ہے یہ دستور
بات جس درجہ بھی ہو فہم سے دور
ہوگی مقبولِ خاص و عام وہی
سر دھنیں گے اُسی پہ آپ سبھی
آئیے میں بتاؤں گُر کی بات
تاکہ واضح ہوں آپ پر حالات

کسی موضوع پر ہو کوئی کتاب
نظم ہو، نثر ہو کہ علمِ حساب
تبصرے کے لیے جب آتی ہے
میری تخئیل رنگ لاتی ہے!
فنِ تجرید کا دکھا کے کمال
مبہم الفاظ کا بچھا کر جال
کچھ خیالات مثبت و منفی
کچھ اشارات منجلی و خفی!
مغربی ناقدوں کے کچھ فقرے
چند اقوال سربراہوں کے
کچھ اِدھر کچھ اُدھر سے لیتا ہوں
اور مضموں گھسیٹ دیتا ہوں!!
اصل میں، تبصرہ نگاری کا،
فن بھی اِک کھیل ہے مداری کا
تھی ابھی اُن کی گفتگو جاری
اور مجھ پر تھی محویت طاری
اتنے میں سامنے سے اک لڑکا
گنگناتا ہوا یہ شعر گیا،
"نہ محقق بود نہ دانشمند
چارپائے بر او کتابے چند"
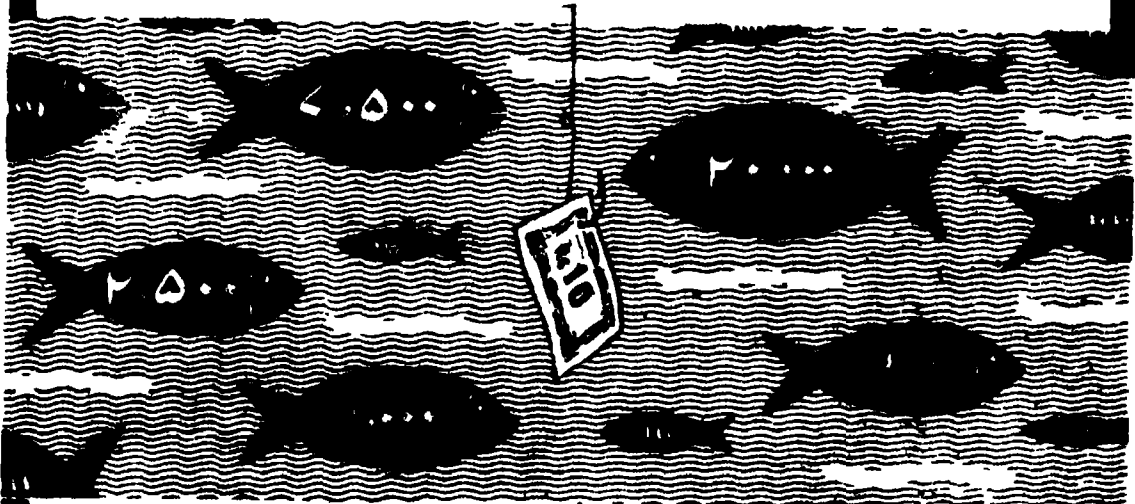
بیس ہزار روپے کا انعام حاصل کرنے کے لئے
آج ہی دس روپے کا انعامی بونڈ خرید لیجئے

ہر ۱۰ روپے والے انعامی بونڈ پر ہر سہ ماہی ۵۰،۰۰۰ روپے
کے ۱۳۶ مختلف انعامات تقسیم کئے جاتے ہیں۔ جیتنے والے
انعامی بونڈ آئندہ قرعہ اندازیوں میں بھی شامل رہتے ہیں۔

ہر سلسلہ کے جس قدر بونڈ چاہیں خریدیں۔ بھنائے ہوئے بونڈ
دوبارہ فروخت کر دیئے جاتے ہیں۔ تاکہ آپ اُن پر بھی انعام حاصل کر سکیں۔

انعامی بونڈ ہر منظور شدہ بینک، ڈاکخانوں و ذیلی
ڈاکخانوں سے دستیاب ہیں۔

انعامی بونڈ

کنبہ کے لئے بچایئے — قوم کے لئے بچایئے

جمیل جالبی

محور۔ دہلی

نئے ادب کا مسئلہ

جب میں عہد حاضر کے اردو ادب اور ادیبوں کا خیال کرتا ہوں تو معاً مجھے اس ربڑ کے غبارے کا دھیان آتا ہے جس کی ہوا نکل گئی ہو اور وہ میلی کچیلی دھجی کے مانند کسی بچے کے ہاتھ میں لٹک رہا ہو۔ اب اس غبارے کا استعمال صرف یہ ہے کہ بچے اپنے منہ سے چھوٹے چھوٹے غبارے بنائیں اور ہاتھ پر رکھ کر پٹاخ سے پھوڑیں۔ تاکہ گھر والے چونک جائیں اور بچے مزا لیں۔ گذشتہ چار پانچ سال سے اردو ادب کے ادیب یہی کھیل کھیل رہے ہیں۔ اردو ادب کو دیکھیے تو فقرہ بازی کی ہوا سے ننھے ننھے غبارے بنا کر پٹاخ پٹاخ کی آوازوں سے سنسنی پھیلائی جا رہی ہے اور اس عمل کو نئے ادب کا نام دیا جا رہا ہے۔ ادب سے سنجیدگی غائب ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ اردو ..... ادیبوں کے سامنے فکر و ادب کا کوئی سنجیدہ مسئلہ باقی نہیں رہا ہے۔ ادیب کو آج یہ معلوم نہیں ہے کہ وہ کس کیلئے لکھ رہا ہے اور کیا لکھ رہا ہے۔ زیادہ سے زیادہ اب ان کے سامنے وہ دوسرے لکھنے والے ہیں جو ہم پیشہ ہونے کی وجہ سے اس کی تحریریں پڑھتے اور ردعمل بہم پہنچاتے ہیں۔ اسی لیے ادب سے متعلق جتنی تحریریں نظر آتی ہیں۔ ان میں ایک ادیب دوسرے ادیب سے مخاطب ہے اور سنجیدہ مسائل کی جگہ ادبی سیاست نے لے لی ہے۔ ایسی فرودت باتیں جو صرف قہوہ خانوں میں کی جاتی تھیں عام طور پر ادبی رسالوں میں نظر آ رہی ہیں۔ شہرت کی خاطر عہد حاضر کے ادیب نئی نئی شکلیں لے کر سامنے آ رہے ہیں۔ تاکہ ان کی عجیب و غریب شکلوں کو دیکھ کر لوگ ان کی طرف متوجہ ہو سکیں۔ وہ کام جو پہلے سڑک کے کنارے مجمع لگا کر لے مداری کرتے تھے۔ اب ڈگڈگی بجا کر ہمارے ادیب کر رہے ہیں۔ اسی کو دیکھ کر کچھ سنجیدہ ادیب، ادب کی موت کا اعلان کر کے خاموش ہو گئے ہیں۔ آخر جب یہی چیز ادب ٹھہرے تو ادب کے علاوہ کوئی اور مفید کام کیوں نہ کیا جائے۔ ادب پڑھنے کے بجائے کرکٹ میچ کی کومنٹری کیوں نہ سنی جائے، جاسوسی، فلمی رسالے کیوں نہ پڑھے جائیں اور تاش کے کھیل سے فرصت کا وقت کیوں نہ گزارا جائے۔ پہلے ادب اس لیے پڑھا جاتا تھا کہ معاشرہ ادب کے ذریعے خود کو تلاش کرتا تھا۔ اور فرد ادب کے ذریعے خود کو تخلیق کرنے کا کام لیتا تھا۔ اسی لیے کتابیں خریدنا، کتابیں پڑھنا خوش مذاقی کی بات تھی۔ جب ادب انسانی فکر و شعور کو کچھ نہ دے رہا ہو تو آخر ادب کیوں پڑھا جائے۔ اب تک ادب کا کام شعوری طور سے بھی اور غیر شعوری طور سے بھی یہی رہا ہے کہ وہ زندگی سے خام مواد لے کر ایک ایسی دنیا تخلیق کرے جس کے معنی و اقدار ایک طرف ادیب کے ذاتی تجربے کو مدام تخلیقی اور دوسری طرف زندگی میں خیر کا اضافہ کر کے خود زندگی کو توانا دم کر دے۔ لیکن یہ کام اسی وقت ہو سکتا ہے جب ادیب ادب سے سنجیدہ ہو۔ اور زندگی سے اس کا پورا تعلق ہو۔ جو کچھ معاشرے میں ہو رہا ہے۔ جو کچھ معاشرے پر گزر رہی ہے جو کچھ

چھپی ہوئی خواہشات فرد کے اندر موجود ہیں نہ صرف ادیب ان سے واقف ہو۔ بلکہ وہ یہ بھی جانتا ہو یا کم از کم جاننے کے لیے بے چین ہو کہ آخر معاشرہ نے زیادہ مقدار میں نیسندکی گولیاں کیوں کھالی ہیں۔ آگاہی اور بصیرت کے اسی عمل کے ذریعے ادیبوں نے ہمیشہ احساس، جذبے اور فکر کو ایک ایسی شکل میں ترتیب کے ساتھ پیش کیا ہے۔ جو شکل اور ترتیب خود فطرت کے پاس بھی موجود نہیں تھی۔ سچا ادب ہمیشہ معاشرے کے ساتھ بھی چلا ہے اور اسے ساتھ لے کر بھی چلا ہے۔ اس کا اظہار بھی کیا ہے۔ اور اسے بدلا بھی ہے۔ اب اس زاویے سے اس دور کے ادب کو دیکھیے تو یوں محسوس ہوگا کہ آگاہی و بصیرت کا عمل ہمارے ہاں بند ہو گیا ہے اور وہی ادب کامیاب ہے جو کثیر الاشاعت اخباروں کے مقبول کالموں کے معیار پر پورا اترتا ہو۔ حیات و کائنات کے مسائل کا علاج صرف و محض فقرے بازی کے تعویذ گنڈوں سے کیا جارہا ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اب ہمارے پاس سوچنے اور کہنے کے لیے کچھ باقی نہیں رہا۔ ذہنی طور پر اس بیکاری محض کے اس ڈھادینے والے احساس کو دیکھ کر یوں لگتا ہے۔ کہ ہماری نسل اس نسل کی جو زندہ تھی، صرف بھوت ہے۔

اس صورت حال کا شعور حاصل کرکے آپ مجھ سے یہ سوال پوچھنے میں یقیناً حق بجانب ہوں گے۔ کہ آخر ایسا کیوں ہے؟ اس سوال کا جواب دراصل جدید ادب کا بنیادی مسئلہ ہے۔ لیکن ادب کا بنیادی مسئلہ ہونے کے باوجود اس کا جواب ادب میں تلاش کرنا گمراہی کا عمل ہے جو ہمیں کہیں نہ پہنچا سکے گا۔ ایک ایسے دور میں جب ادب شعور انسانی کو کچھ نہ دے رہا ہو اور اس کی حیثیت صرف بھوسی چوکی سی ہو کر گئی ہو تخلیقی مسائل کو ادب میں تلاش کرنے کے بجائے خود زندگی اور معاشرتی نظام خیال و اقدار میں تلاش کرنا چاہیے جن سے ہماری زندگی عبارت ہے۔ غور کیجیے کہ کیا ہمارے لیے زندگی میں اور زندگی کے کوئی معنی باقی رہ گئے ہیں؟ جب زندگی خود اس طور پر بے معنویت کا شکار ہو گئی ہو؟ جب زندگی میں کوئی جہت اور کوئی مقصد باقی نہ رہا ہو تو آخر ادب میں کہاں اور کیسے معنی نظر آئیں گے۔ زندگی کی یہ بے معنویت ہماری نسل کو تخلیقی سطح پر اندھی انگوں کی طرح کھارہی ہے اور ہماری نسل کے ادیب برف کے تودوں کے پل بنا کر اپنی تخلیقی زندگی کا راستہ طے کر رہے ہیں۔ کیا یہ صورت بذات خود تشویشناک نہیں ہے؟

اگر ادب اور زندگی کے تعلق پر ہم ایمان رکھتے ہیں۔ تو یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ اگر معاشرہ زوال پذیر ہے، اگر معاشرہ کے پاس اقدار و خیال کا صحت مند نظام باقی نہیں رہا ہے۔ تو اس معاشرے کا ادب بھی بے جان ہوگا۔ اس لیے کہ ایک صحت مند معاشرے میں زندگی کی ہر سطح پر ادیب کے پاس کچھ نہ کچھ کہنے کے لیے ضرور ہوتا ہے۔ ہمارا اپنا معاشرہ قدم قدم پر تضاد کے بحران میں مبتلا ہے خیال اور عمل میں کسی قسم کا ربط نہیں ہے۔ مروجہ اقدار اور تصور حقیقت پر ہم ایمان نہیں رکھتے۔ ہمارا نظام خیال اتنا کھوکھلا ہو چکا ہے کہ اب وہ تخلیقی عمل میں کسی قسم کا ساتھ نہیں دے رہا ہے۔ آج تہذیبی اور معاشرتی سطح پر اقدار و اخلاق کا کوئی ایسا زندہ نظام ہمارے پاس نہیں ہے جس پر ہم مثبت طریقہ سے زندگی کا کوئی نیا قلعہ تعمیر کرسکیں اسی وجہ سے سارا معاشرہ منتشر ہے۔ چیزوں کے رشتے بکھر گئے ہیں۔ جبھی جانی اقدار ٹوٹ پھوٹ کر ایک ڈھیر کی صورت اختیار کر گئی ہیں۔ خیالات اور عقائد کا وہ نظام، جس پر صدیوں سے ہم یقین رکھتے چلے آئے تھے اور جو ایک تہذیبی اکائی کی حیثیت سے ہمارے شعور میں زندہ تھا اب بے معنی اور از کار رفتہ نظر آنے لگا ہے۔ سارے معاشرے میں اب کوئی چیز اپنی اصلی شکل میں نظر نہیں آتی۔ جو کچھ نظر آتا ہے وہ اصل نہیں ہے۔ اور جو چیز اصل ہے وہ نظر نہیں آتی۔ تضاد نے ساری زندگی کو گھیر لیا ہے۔ اور عدم تحفظ کے احساس کو شدید تر بنا کر زندگی سے کام کرنے کی گرمجوشی ہی کو ختم کر دیا ہے۔

اب سوال یہ سامنے آتا ہے کہ جب معاشرہ اس درجہ بدحال ہو اور خود زندگی میں اہم واقعات پیش نہ آرہے ہوں تو آخر ادب میں کہاں سے آمتی گھے یہی وجہ ہے کہ ہماری نسل کے ادیب صرف خود کو دہرانے اور گلی سڑی ہڈیوں کو چوس چوس کر مزے کا احساس دلانے کا کام کر رہے ہیں۔ زندگی کی ہر سطح پر تخلیق کی آگ سرد پڑ گئی ہے۔ اور خیال کا ارتقاء بند ہو گیا ہے۔ جب صورت حال یہ ہو اور معاشرتی و تہذیبی اقدار

وقت کے ساتھ چلنے یا وقت کو ساتھ لے کر چلنے کی صلاحیت کھو بیٹھی ہوں تو ادب میں معنی کہاں سے آئیں گے، آج کے ادب اور ادیب کا بنیادی مسئلہ ہے۔

جب میں سوچتے سوچتے یہاں تک پہنچا تو ایک سوال میرے ضمیر میں کانٹے کی طرح کھٹکا کہ جب ادب کے زوال اور تخلیق کی آگ سرد پڑ جانے کے اسباب ہم معاشرے میں تلاش کر رہے ہیں، تو آخر میر و سودا کا معاشرہ بھی تو زوال پذیر معاشرہ تھا۔ اس دور میں یہ کیسے ممکن ہوا کہ اُردو شاعری نے عظمت کی انتہائی بلندیوں کو چھو لیا۔ اگر معاشرے کی زوال پذیری ہمارے دور کے ادب کو بے جان اور بے معنی بنائے ہوئے ہے تو میر و سودا کے زوال پذیر معاشرے نے اپنے دور کے ادب کو بے جان کیوں نہیں بنایا؟ یہ یقیناً ایک اہم سوال ہے لیکن اس کا جواب اتنا دشوار نہیں ہے جتنا بادی النظر میں دکھائی دیتا ہے۔ میر و سودا کے دور میں ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف فتنے چاروں طرف سے سر اٹھا رہے ہیں لیکن ان کا اثر کلچر کی بنیادوں اور تہذیبی اداروں کو شدت کے ساتھ متاثر نہیں کر رہا ہے۔ کلچر کا خارجی ڈھانچہ اور مروجہ اقدار پر معاشرے کا ایمان اسی طرح باقی ہے۔ ایک شہر اجڑتا ہے۔ دوسرا شہر بستا ہے لیکن کلچر کا خارجی اور داخلی ڈھانچہ بنیادی طور پر وہی رہتا ہے۔ تصورِ حقیقت کے اعتبار سے کلچر کا اندرونی استحکام اسی طرح باقی ہے اور بیرونی حملوں اور اندرونی فتنوں کے باوجود انقلاب کا کوئی گہرا تہذیبی اثر نہیں ہے۔ میر و سودا کا یہ دور تہذیبی اور معاشرتی اعتبار سے انقلابی دور ہرگز نہیں ہے۔ اس کی پشت پر صدیوں پرانے تہذیبی ادارے اسی استحکام کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ سارا معاشرہ ان پر ایمان رکھتا ہے اور بحران کے باوجود معاشرہ ان اداروں کو بدلنے یا خود بدل جانے کے امکان پر نہیں سوچ رہا ہے۔ اس لیے کہ ایک ایسے معاشرے میں جہاں تہذیبی سطح پر انقلاب آ رہا ہو، جہاں نظامِ اقدار پر سے ایمان اٹھ رہا ہو اور ساتھ ساتھ معاشرہ اندر سے بدل کر اپنے تصورِ حقیقت کو بدلنے کی سوچ رہا ہو، عظیم ادب کی پیدائش مشکل ہو جاتی ہے اور ادب سے صرف روں روں کی آواز آنے لگتی ہے۔

اس بات کی مزید وضاحت کے لیے یورپ کے کلاسیکی ادب کی مثال لیجیے۔ دانتے کی شاعری میں نشاۃ الثانیہ کے آثار نظر آتے ہیں یا ورجل کی شاعری میں ایک بہتر دنیا کی خواہش کا احساس ملتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہم نہ دانتے کو اور نہ ورجل کو انقلابی شاعر کہہ سکتے ہیں۔ وہ قرآن، تہذیبی اداروں پر یقین کامل رکھتے ہوئے ادب تخلیق کر رہے ہیں، جنہیں صدیوں سے وہ اور ان کی قوم کے افراد جانتے ہیں۔ ان ادوار میں سلطنتِ روما اور کیتھولک چرچ کا معاشرتی نظام، جس نے ان ادوار کو تصورِ حقیقت کا ایک زندہ نظام دیا تھا۔ زوال آمادہ فرسودہ ہے۔ لیکن اس زوال آمادگی کے باوجود ان دونوں شاعروں کی فکر کی نوعیت یہ ہے کہ وہ انہیں پورے طور پر ایک تہذیبی اکائی کی حیثیت سے قبول کیے ہوئے ہیں۔ اگر ان کے شعور میں تہذیبی اکائی کے تعلق سے یہ استحکام باقی نہ رہتا اور ان کا ایمان ان اداروں اور اقدار پر سے اُٹھ جاتا اور وہ ایک ایسے دور میں زندہ ہوتے جسے جدید اصطلاح میں انقلاب کا نام دیا جاتا ہے، تو وہ تخلیقی سطح پر یہ کام انجام نہیں دے سکتے تھے، جو انہوں نے اپنے اپنے دور میں دیا۔ ایک ایسے دور میں جب شدید قسم کا انقلاب معاشرے کو منتشر کر رہا ہو، اس کے تہذیبی اداروں کو بدل رہا ہو، مروجہ نظامِ خیال اپنے معنی کھو رہا ہو۔ تو ادیب کے لیے کوئی کارنامہ انجام دینا ایک دشوار ترامر بن جاتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے میر و سودا کے دور کو دیکھیے تو حیرانی دور ہو جاتی ہے۔ اس معاشرے میں انقلاب کا تصور ذہنی طور پر سطحی بحران تک محدود ہے۔ سارے تہذیبی ادارے اسی طرح جوں کے توں برقرار ہیں تاریخی عمل بنیادی طور پر معاشرے کے اندر وہ انقلاب پیدا نہیں کر رہا ہے۔ جو تہذیبی اداروں کو اکھاڑ پھینکتا ہے۔ اور نتیجے کے طور پر تخلیقی عمل کو مجروح کرتا ہے۔ تخلیق کی آگ کے لیے معاشرتی و تہذیبی سطح پر بنیادی اداروں پر ایمان کا سالم و قائم ہونا ازبس ضروری ہے۔ میر و سودا کا اپنے معاشرے، اس کی اقدار اور نظامِ خیال سے زندہ اور مربوط رشتہ باقی ہے اور اسی لیے تہذیبی زوال کے آثار کے باوجود وہ تخلیقی سطح پر وہ کام انجام دے رہے ہیں۔ جو ہمارے اپنے دور میں ممکن نہیں ہے۔

ہمارے اپنے معاشرے کا معاملہ میر و سودا کے دور سے بالکل مختلف ہے۔ ہمارے تہذیبی ادارے اب دم توڑ رہے ہیں۔ اقدار اور

نظامِ خیال، یہاں تک کہ عقائد بھی اب ہمارے لیے وہ معنی نہیں رکھتے جو آج سے پندرہ بیس سال پہلے تک رکھتے تھے۔ مادی و صنعتی ترقی طویل المیعاد تصورِ تہذیب کو بدل رہی ہے۔ سائنس کے اثرات ذہنِ انسانی کو انتہائی تیزی کے ساتھ بدل رہے ہیں۔ آج ہم تہذیبی سطح پر اندر سے ٹوٹ سے گئے ہیں اب ایسے میں جب زندگی کی ہر سطح پر انقلاب ہمارے عقائد خیال، احساس اور سجے سجائے نظام کو ڈھا رہے ہوں۔ تو اچھے اور بڑے ادب کی خواہش اس بچے کی خواہش سے کم نہیں ہے جو اس بات پر ضد کر رہا ہے کہ مجھے چندا ماموں لا دو۔

میں اکثر سوچتا ہوں کہ ہماری نسل ذہانت کے اعتبار سے اپنے اسلاف سے ایک درجہ کم ہے۔ سنجیدہ ادیبوں میں محنت، توجہ اور لگن کے ساتھ کام کرنے کی خواہش بھی موجود ہے۔ ہم نے پڑھنے لکھنے کو اپنے اسلاف کی طرح اوڑھنا بچھونا بھی بنایا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہم ادب میں وہ کارنامے انجام نہیں دے رہے ہیں۔ جو ہمارے اسلاف نے دیے تھے۔ اس کی وجہ اگر تلاش کی جائے تو صرف یہ ہے کہ ہماری نسل تاریخ کی بے رحمی کا شکار ہے ہم تاریخ کے ایک ایسے دور میں پیدا ہوئے ہیں۔ جہاں بہت کوشش کے باوجود ہم بہت کچھ نہیں کر سکتے۔ ہمارے دور کی تاریخ نے اندرونی انقلاب کی قوتوں کو اتنا تیز کر دیا ہے کہ وہ ہمیں تنکے کی طرح بہا دیتی ہیں۔ یہ ہماری نسل کا مقدر ہے اور اسے قبول کر کے ہمیں کچھ کرنا ہوگا۔ اکثر مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ ہماری نسل اپنے مقدر کو قبول کر کے زیادہ سے زیادہ یہ کام کر سکتی ہے کہ وہ آنے والی نسل کے لیے خام مواد بن جائے۔ جس پر کوئی میر، کوئی انیس، کوئی غالب، کوئی اقبال، اپنی عظمت کی بنیاد قائم کر سکے۔ اسی بات کو محسوس کر کے ایڈمنڈ ولسن نے کہا تھا کہ اس ادیب کو جو طویل عرصے تک زندہ رہنے والا ادب تخلیق کرنا چاہتا ہے اپنے سعد ستاروں کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ اگر اس وقت کوئی شدید قسم کا انقلاب اس کے اپنے ملک اور اپنے دور میں نہیں آ رہا ہے۔ اگر معاشرہ تغیرِ عظیم سے بکھر رہا ہے تو شاید وہ لکھنے کے قابل ہی نہیں رہے گا۔

برخلاف اس کے وہ شخص جو معاشرتی اور تہذیبی تاریخ کے ایک ایسے دور میں پیدا ہوا ہو جہاں معاشرتی و تاریخی رجحان ایک ایسے نقطے پر جمع ہو گئے ہوں کہ کوئی شخص آئے اور ان کو ترتیب دے کر ایک شکل میں پیش کر دے، جینئس کہلاتا ہے اسی لیے ہربرٹ اسپنسر کا کہنا ہے کہ اس سے قبل عظیم لوگ معاشرے کی تشکیل کریں، ضروری ہے کہ معاشرہ ان کی تشکیل کر چکا ہو۔ تخلیقی سطح پر کوئی کارنامہ دراصل تہذیبی عناصر کے ایک نئے کیمیاوی امتزاج کا نام ہے یا پھر موجودہ کلچر میں نئے عناصر کی جذب پذیری کا نام ہے۔ اس بات سے یہ نتیجہ نکلا کہ کوئی ایجاد، انکشاف یا ادب و فن کا کوئی کارنامہ اس وقت تک وجود میں نہیں آ سکتا۔ جب تک کلچر نے خیال و مواد کے سارے عناصر کو اس قابل نہ کر دیا ہو کہ ان کا کیمیاوی امتزاج ممکن ہو سکے۔ پتھر کے دور میں ایٹم انجن کی ایجاد ہرگز ممکن نہیں تھی۔ اگر وہ سارے عناصر جو بارش کا سبب بنتے ہیں یکجا ہو سکے ہیں تو بارش ضرور ہوگی۔ ہر چیز اس وقت تک تخلیقی سطح پر زندہ رہتی ہے جب تک معاشرہ اور اس کا نظامِ خیال زندہ اور صحت مند رہتا ہے۔ اگر معاشرہ صحت مند نہیں ہے۔ تو اس معاشرے کا ادب نہ صرف ادب بلکہ ہر تخلیقی سرگرمی زوال پذیر ہوگی۔ اس لیے اگر ہمارے ادب کے پودے مرجھا گئے ہیں تو اس کے اسباب کی تلاش ہمیں اپنے معاشرے اور اپنے نظامِ خیال میں کرنا ہوگی۔

اب ایسے میں ایک امکانی صورت یہ ہے کہ کوئی ایسا دیو قامت، مفکر ادیب، پیدا ہو جو اپنی مختصر سی زندگی میں دو بڑے ادیبوں کا کام انجام دے۔ ایک کام یہ کہ وہ نئے اقدار و معانی کے پودے اپنے معاشرے کی سرزمین میں لگائے۔ اور دوسرا یہ کہ انہیں اتنا پروان چڑھا دے کہ وہ پھل دینے لگیں اور معاشرہ ان پیڑوں پر لگے ہوئے پھلوں کا ذائقہ چکھ سکے۔ جب تک یہ نہ ہوگا۔ تخلیقی قوت صرف ہیجان کی شکل میں زندہ رہے گی۔ اور سارا معاشرہ اسی ہیجان سے اپنی ذہنی بھوک آسودہ کر کے سستی کے ڈھیلوں کو ادب کا نام دیتا رہے گا۔

تخلیق کی سطح پر یہ صورتِ حال بہت تشویشناک ہے لیکن جہاں ادیبوں نے سوچنے کا کام بند کر دیا ہو۔ جہاں ادیب خود اندھے اور بہرے ہو گئے ہوں۔ جہاں ادیب مسائل سے زیادہ مصلحتوں میں دلچسپی لینے لگے ہوں۔ جہاں ذہنی بزدلی اور سمجھوتوں نے فکر کے سوتے خشک کر دیے ہوں۔ وہاں ہماری نسل خام مواد بن جانے کا کام بھی انجام نہیں دے سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری نسل کے ادب [illegible]

بن کر نازل ہوئی ہے۔ ہماری آرزوئیں گونگی ہیں۔ وصل میں رنگ اڑ گیا ہے۔ اور آج ہم تنہائی کو بھی منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے ہیں۔ اور ہم اس دنیا میں تنہا نظر آتے ہیں۔ کیا ہم یہ نہیں کر سکتے کہ جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں اسے معاشرے کو بھی دکھا دیں۔ جو کچھ محسوس کر رہے ہیں اسے معاشرے کو بھی محسوس کرا دیں ـــ آج اردو ادب کو ہرکاروں اور گورکنوں کے بجائے جری سورماؤں کی ضرورت ہے۔ ایسے جری سورما جو زندہ رہ کر موت کا تجربہ کرنا جانتے ہوں۔ جو میر یا اقبال کی ڈیڑھ درجن خصوصیات گنوانے، روایتی انداز میں غزلیں نظمیں کہنے یا گھسے پٹے موضوعات پر افسانے، ناول لکھنے کے بجائے عہد حاضر کے مسائل پر سوچنے کا حوصلہ رکھتے ہوں جو عہد حاضر کے طوفانی دھاروں اور ہلکی ہلکی پھوار دونوں سے باخبر ہوں جو روایت کو اپنا کر روایت کو توڑنے کی قوت بھی رکھتے ہوں۔ جو معاشرے کو فکری مسائل میں شریک کر کے اسے تبدیلی کا نیا شعور دینے کا حوصلہ بھی رکھتے ہوں اور شاید عہد حاضر کے اردو ادب اور ادیبوں کا یہی سب سے اہم اور بنیادی مسئلہ ہے۔

نقش ادب کی خدمت کرتا ہے آپ **نقش** کی سرپرستی کیجیے

نقش خریدیے • **نقش** میں اشتہار دیجیے

فرصت کے لمحات کا بہترین ساتھی، ماہنامہ "**نقش**" کراچی

اہم سرکاری مطبوعات

۱۔ اسٹیٹ ڈیوٹی مینول	قیمت فی کاپی	۳/۲۵
۲۔ سیٹلمنٹ معمول قانون اور طریقۂ کار	"	۱۴/۲۵
۳۔ آئینی دستاویزات جلد چہارم (ب)	"	۳۲/۶۲
۴۔ آئینی دستاویزات جلد چہارم (الف)	"	۳۰/۶۲
۵۔ خوراک و زراعت کمیشن کی رپورٹ کا اردو ترجمہ	"	۵/۷۵
۶۔ تیسرے پنجسالہ منصوبہ کا اقتباس		۳/-

ملنے کا پتہ

۱۔ منیجر آف پبلیکیشنز، حکومت پاکستان، بلاک ۴۲ شاہراہ عراق کراچی

۲۔ مغربی پاکستان کے تمام منظور شدہ ایجنٹ۔

اسلوب احمد انصاری

ہماری زبان علیگڑھ

ادب کی نئی ذمہ داریاں

ادب کی بحث کے سلسلہ میں یہ بات ہزاروں دفعہ کہی گئی ہے کہ اس کا تعلق انسان کی زندگی اور اس کے تجربات سے بہت گہرا اور قریبی تعلق ہے۔ انسان نے اپنی لمبی تاریخ کے دوران میں اب تک جو کچھ سوچا ہے، جو کچھ پایا ہے، جیسے جیسے خواب دیکھے ہیں، فطرت کو اپنے مقاصد کے مطابق ڈھالنے کے لئے جو جدوجہد کی ہے، سماج کے ڈھانچے میں رفتہ رفتہ جو تبدیلیاں آئی ہیں، ان کے ذریعہ آپس کے رشتوں اور ناطوں میں جو الجھاؤ پیدا ہوئے ہیں، اندرونی شر اور بیرونی شر پر فتح پانے کی جو کوشش انسان نے کی ہے۔ اس تمام کوشش اور عمل کے دوران میں جو انسانی قدریں ابھری ہیں، اور جن میں اس کا یقین جس حد تک برقرار رہا ہے یا بعض دفعہ متزلزل ہو گیا ہے، ان سب کا عکس ہمیں ادب کے اندر نظر آتا ہے۔ اس لئے یہ کہنا شاید غلط نہ ہو کہ ادب ایک ہی وقت میں انسان کے تجربے اور عمل، اور اس کے عزائم اور آدرشوں کے سامنے ایک آئینہ رکھ دیتا ہے۔ انسان نے اب تک جو کچھ حاصل کیا ہے، یا آج اس طرح وہ جو کچھ پانے کے جتن میں لگا ہوا ہے یا ماضی اور حال کے سرمایہ کو لگا کر مستقبل میں اپنانے کے لئے تگ و دو کرے گا ان سب کی ایک ٹھہری ہوئی، ترشی ہوئی اور حواس اور روح کو آسودہ کرنے والی تصویر ہمیں ادب کے جھروکے میں نظر آتی ہے۔ انگریزی کے ایک بہت بڑے شاعر ولیم بلیک نے اپنی ایک نظم میں شاعر کے متعلق کہا ہے کہ وہ بیک وقت حال، ماضی اور مستقبل میں بصیرت رکھتا ہے۔ جو بات شاعر کے بارے میں کہی گئی ہے وہ پورے ادب پر بھی صادق آتی ہے۔ یونان کے مشہور حکیم ارسطو نے کہا تھا کہ شاعری، تاریخ کے مقابلے میں زیادہ گہرا اور فلسفیانہ عمل ہے۔ تاریخ کے بہت سے عالم آج ارسطو کی اس بات کو شاید نہ مانیں، کیونکہ یونانیوں کا تاریخ کا تصور محدود تھا، وہ تاریخ کو ایک نامی حقیقت سمجھنے کی بجائے اسے گزرے ہوئے واقعات کی ایک بے روح کھتونی سمجھتے تھے، اور نہ ان اسباب پر نظر رکھتے تھے جو تاریخ کی تہہ میں کارفرما ہوتے ہیں اور نہ تاریخی عمل و دوسرے عام نتائج نکال کر مستقبل کے متعلق پیشین گوئی کرنے کی طرف مائل تھے، آج ان مسائل پر غور کرنے والے تاریخ کو مختلف زاویۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ ادب کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کسی قوم کا حافظہ بھی ہوتا ہے۔ اس کے عمل کا پیمانہ بھی، اور اس کے خوابوں کا عکس بھی۔ ہم کسی قوم کے ادب کے مطالعے سے اس قوم کی تاریخ تک بھی پہنچ سکتے ہیں۔ یہ بھی محسوس کر سکتے ہیں کہ وہ آج تہذیب اور ترقی کی کس منزل پہ کھڑی ہے، اور یہ بھی قیاس کر سکتے ہیں کہ اس کی حیات و کائنات کی آئندہ سمت و رفتار کیا ہوگی؟

ادب کے بارے میں ابھی جو کچھ بھی کہا گیا، وہ ایک آئیڈیل کی حیثیت رکھتا ہے اور ایک زندہ قوم کے ادب کے سلسلے میں یقیناً صحیح ہے لیکن قوموں کی زندگی میں ایسے بھی دور آتے ہیں، جب وہ سیاسی اور اسی لئے یا اس کے علاوہ ذہنی اور روحانی ابتری اور خلفشار میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ ایسی حالت میں زندگی کے سوتے خشک ہو جاتے ہیں، ماضی کی روایات کی طرف تحقیر اور تضحیک کا رویہ پیدا ہو جاتا ہے، حال اور مستقبل کو بنانے اور سنوارنے کے لئے جس حوصلے، بالغ نظری، عزم اور گہرے اور سچے جذبے کی ضرورت ہوتی ہے وہ سرد پڑ جاتا ہے۔ اعلیٰ انسانی اقدار میں یقین کمزور ہو جاتا ہے، اور اسی لئے جب زندگی خوشگوار یادوں عمل کی

توانائیوں اور خوابوں کی لطافت اور سرپرستی سے محروم ہو جاتی ہے تو ادب پر بھی مردنی چھا جاتی ہے۔ پھر ادب کسی قوم کا حافظہ اور ضمیر نہیں رہتا، محض مستی، عیش پسندی کا آلۂ کار بن جاتا ہے۔ انسانی تجربات، احساسات اور آرزوؤں سے زیادہ اس میں مافوق الفطرت قوتوں کا عمل دخل ہو جاتا ہے۔ اس میں مادی تعلق حقیقتوں سے، تخیل کا قوت فیصلہ سے اور خوابوں کا اقدار سے ٹوٹ جاتا ہے۔ اس میں زبان کا وظیفہ لفظی بازیگری سمجھا جانے لگتا ہے، عام فہم اشارے محض اور پراسرار اشاروں میں بدل جاتے ہیں۔ اور ادب فن کار کے لئے صرف اپنے آپ کو نمایاں کرنے، اپنی خیالی جنت میں آباد رہنے اور زبان کو صرف آرائشِ بیان کے لئے استعمال کرنے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ زندگی اور ادب کے کسی بھی ایسے دور کو ہم بحرانی دور کہہ سکتے ہیں۔ جس میں فرد، جماعت سے الگ ہو کر اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنا لیتا ہے، اور اپنے یا اپنے اردگرد کے چھوٹے سے حلقے کے لئے لکھ کر یہ سمجھتا ہے کہ بہ حیثیت فنکار اس کا فرض پورا ہو گیا۔

ہمارے ملک اور ادب میں بھی یہی صورت حال عرصے تک رہی ہے۔ کیونکہ برطانیہ کی غلامی کا جُوا مدت تک ہندوستان کے کندھوں پر رکھا رہا اس لئے ذہن میں پراگندگی پیدا ہوئی، عمل کی قوتیں شل ہو گئیں۔ پرانی قدریں اور روایتیں حقیر نظر آتی رہیں، زبان و بیان کے سلیقے ایسے مقرر ہوئے کہ ان سے سرمو انحراف بھی ناروا سمجھا گیا۔ ہمارے ادب میں انحطاط پسندی، افسردگی اور پست ہمتی کی جو زیریں لہر ہے، وہ براہ راست سیاسی انتشار اور زندگی کی ناگفتگی سے پیدا ہوئی۔ اسی انحطاط پسندی کی وجہ سے یہ خیال بھی عام ہوا کہ ادب تمام تر فردی کا معاملہ ہے اور تمام تر وجدان ہی کی پیداوار ہے۔ لیکن ۱۹۴۷ء میں آزادی کے حصول کے بعد، ظاہر ہے کہ زندگی کا نقشہ بدلا۔ سیاسی خود مختاری نے اس بیرونی چوکھٹے کو تبدیل کر دیا جس سے ادب کی تصویر جڑی جاتی ہے۔ زندگی کے ہیولے کی یہ تبدیلی اس بات کا مطالبہ کرتی ہے کہ ادب اور ادیب کی نئی ذمہ داریوں پر سنجیدگی کے ساتھ غور کیا جائے۔

نئے علوم کی دریافت نے اس خیال کا پرچار کیا کہ ادب ایک سماجی عمل ہے، گو یہ دوسرے سماجی اعمال کی نسبت لطیف تر، نازک تر اور پیچیدہ تر عمل ہے۔ ادب میں فنکار کی شخصیت اور اس کے نقطۂ نظر کا پرتو جھلکنا ضروری ہے لیکن یہ شخصیت اور نقطۂ نظر خلا میں وجود نہیں رکھتے بلکہ پوری سماجی ہیئت سے بے شمار معکوس پر ارتباط رکھتے ہیں۔ آج ہم اپنے اس بڑے ملک میں ایک نئی معاشرت کی تعمیر کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ یہ تعمیر کچھ ماضی کی روایات کی بنیاد پر ہو گی، اور کچھ حال اور مستقبل کی ضروریات کے شعور پر۔ اس کے لئے ایک طرف ہمیں ماضی کے ورثہ کو کھنگال کر اس کے مفید اور جاندار عناصر کو اپنے اندر جذب کرنے کی ضرورت ہے اور دوسری طرف موجودہ دَور کے تقاضوں کو سامنے رکھنے کی۔ اب دنیا کے مختلف ممالک بھی اس طرح ایک دوسرے سے الگ تھلگ نہیں ہیں جیسا کہ پہلے تھے اس طرح مشرق اور مغرب کا پورا تہذیبی سرمایہ دنیا کے ایک ایک ملک کے کام آ سکتا ہے، تہذیب کی دولت میں لین دین کا یہ اصول ہمیشہ کارفرما رہا ہے اور آج بھی ہے۔ اس لئے ہمارے ادیب ان تجربات سے بے نیاز نہیں رہ سکتے جو دوسری زبانوں میں کئے جا رہے ہیں۔

ہر زبان کے ادب کا ایک آفاقی ضمیر ہوتا ہے اور ایک مقامی۔ اگر ادب زندگی کا واقعی اور سچا عکس ہے تو ادیبوں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ جس ادب کی تخلیق کر رہے اور اسے پروان چڑھا رہے ہیں اس میں ہندوستان کی تاریخی اور تہذیبی روایات اور زندگی کو ایک نئے منصوبے کے متعلق تشکیل دینے کے ولولے کا عکس دکھا سکیں۔ ہمارے دیس کی مختلف زبانوں میں جو ناول اور افسانے جو نظمیں اور ڈرامے لکھے جائیں انہیں پڑھ کر یہ اندازہ لگایا جا سکے کہ اس وقت ہندوستان کے دیہاتوں اور شہروں میں انسان کیسی زندگی گزار رہے ہیں، سماج کی شیرازہ بندی کس انداز سے کی جا رہی ہے، مادی اور ذہنی ضروریات کی فراہمی کے لئے کس قسم کی جدوجہد کی جا رہی ہے۔ عام طور پر لوگ کن قدروں میں یقین رکھتے ہیں اور تعلیم کو عام کرنے، جمہوری اداروں کو فروغ دینے، سائنس اور ٹیکنالوجی کی مدد سے زندگی کو مہذب اور آرام دہ بنانے اور زبان، رہن سہن اور عام معاشرت میں طبقہ داری امتیازات کو ختم کرنے کے لئے کیا کیا جا رہا ہے۔ یہ سب مسائل لکھنے والوں پر ایک بھاری ذمہ داری ڈالتے ہیں۔

ادب میں وعظ اور تلقین نہیں ہوتی، اس کے باوجود ادب کا اثر گہرا اور اس کا وار بھرپور ہوتا ہے۔ ادب، سیاست اور اخلاق کا بدل نہیں ہوتا، لیکن ان سے بے نیاز بھی نہیں رہ سکتا۔ نئے ادب کے معماروں کو یہ صاف [illegible] محسوس کر لینا چاہئے کہ وہ محض چند لوگوں کے لئے نہیں لکھ رہے ہیں اور نہ محض کسی ایسی جنتا کا چہرہ ابھارنا چاہتے ہیں جو ٹھوس حقائق کی دنیا سے کوئی واسطہ نہیں رکھتی۔ زندہ قوموں کے ادب میں زندہ انسانوں کی تصویر ملتی ہے اور ان کے اعمال اور

تجربات سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ بحیثیت مجموعی پوری سماجی تہذیب یا ورترقی کی دوڑ میں کس منزل تک پہنچ چکی ہے۔ لیکن ادب محض ٹھہری ہوئی حقیقتوں کا نہیں ہوتا۔ بلکہ امکانات کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے، وہ محض زندگی کی ترجمانی نہیں کرتا۔ بلکہ اس کی توضیح بھی کرتا ہے اور اپنے مخصوص طریقہ کار کے ذریعہ سمجھنے، برتنے، محسوس کرنے کے پیمانوں میں تبدیلی بھی پیدا کرتا ہے۔ ہندوستان کے مرکب سماج میں آج جو تبدیلیاں ہو رہی ہیں اور وہ جس منزل کی طرف لے جا رہی ہیں اس منزل کو پانے کے لئے جس جذباتی اور ذہنی ہم آہنگی اور اشتراک کی ضرورت ہے، ان کی عکاسی اور ان کی طرف ترغیب دلانا آج کے ادیب کے لئے خواہ وہ ہند کی کسی زبان میں لکھ رہا ہو، ایک مقدس ذمہ داری ہے۔ عام شہری اور فنکار دونوں اپنے اپنے طریقے پر ایک ہی نصب العین کے خادم ہیں یعنی زندگی کو حسن اور خیر و برکت کی طرف بڑھانا اور اس کی نعمتوں کو زیادہ سے زیادہ عام کرنا۔

روپیہ
بچایئے
کل
کام آئے گا
حبیب
بینک

نقش ادب کی خدمت کرتا ہے
آپ نقش کی سرپرستی کیجیے
نقش خریدیے نقش میں اشتہار دیجیے
فرصت کے لمحات کا بہترین ساتھی
ماہنامہ نقش کراچی

فنکار

ادب، زندگی اور فن کا روشن مینار

قلمکار

* ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں • جواہر لال نہرو
* فراق گورکھپوری • اختر الایمان * ذوقی
* خمار بارہ بنکوی * سلام مچھلی شہری * ممتاز حسین
* حضور احمد سلیم * حجاب امتیاز علی • فارغ بخاری
* باقر مہدی * سیدہ اختر * شفیقہ فرحت
* مہدی پرتاب گڈھی • اختر ہوشیار پوری *
* پیکر واسطی • خالد علیگ * زبیر رضوی
* جبریل صدیقی * نکہت بریلوی • چراغ الہ آبادی
* وحیدہ نسیم • سنتوش دیاس * سریش اپادھیائے
• عاقلہ نہاں اور فنا پروین

۷۵ پیسے
میں اپنے شہر کے قریبی بک اسٹال سے
طلب کیجیے۔

مرتبین
چراغ الہ آبادی
نظر کامرانی

یکے از مطبوعات
مکتبۂ چراغ۔ لطیف آباد حیدرآباد

منظور شدہ محکمہ تعلیمات کراچی بموجب سرکلر نمبر ڈی۔ ای / جی ڈی / ۵۸۰۳-۲-۵۱۰۰۲ / ۶۰ مورخہ ۲۶ ستمبر ۱۹۶۰ء

اردو ادب کا ڈائجسٹ

۴-۵ / ۶۵

ادارہ

شاہد احمد دہلوی - شمس زبیری

سالانہ	قیمت
بارہ روپے	ایک روپیہ

کاشانۂ اردو - پوسٹ بکس ۷۳۰۲ - کراچی ۳

فون نمبر ۷۰۱۵۶

ترتیب

افسانے

منظومات

طنز و مزاح

مضمون

33495
15·6·76

ہمارے سب سے بڑے قومی مسئلے پر فکر انگیز کتاب

پاکستانی کلچر

قومی کلچر کی تشکیل کا مسئلہ

جمیل جالبی

• یہ تصنیف اپنے موضوع کی اہمیت، اپنی معنوی خوبی، اور فاضل مصنف کی خوش دلانہ کاوش کے لحاظ سے بڑی قابل قدر تصنیف ہے اس کی زبان اس کا اسلوب بیان اس قدر شگفتہ، سلیس و دلکش ہے۔ کہ وہ ایک دلچسپ داستان معلوم ہوتی ہے۔"
"علامہ نیاز فتحپوری"

• اس کتاب میں بے شمار مسائل ہیں جو توجہ طلب ہیں۔ خدا کرے کہ یہ کتاب تعلیم یافتہ لوگوں کو بیدار کردے۔"
"ڈاکٹر سید عبداللہ"

• پہلی مرتبہ اس ملک کے ایک دانشور کو یہ سعادت نصیب ہوئی کہ وہ اس مشکل مسئلہ پر ایسی مدلل اور تفصیلی بحث کرے۔ یہ کتاب خیال و اظہار کی آزادی کی قابل تعریف مثال پیش کرتی ہے۔
"ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری"

جمیل جالبی صاحب نے جس طرح مسئلہ کی پیچیدگیوں کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ اپنی جگہ نہایت سنجیدہ اور ہوشمندانہ ہے
"محمد حسن عسکری"

اس دور کی ایک بہترین کتاب جسے ۶۵-۱۹۶۴ء کا داؤد ادبی انعام بھی ملا۔

قیمت آٹھ روپے

ناشر:۔ مشتاق بک ڈپو۔ شیلڈن روڈ۔ نزد اردو کالج۔ کراچی

کرشن چندر
شاعر، بمبئی

جامن کا پیڑ

رات کو بڑے زور کا جھکڑ چلا۔ سیکریٹریٹ کے لان میں جامن کا ایک درخت گر پڑا۔ صبح جب مالی نے دیکھا تو اُسے معلوم ہوا کہ درخت کے نیچے ایک آدمی دبا پڑا ہے۔

مالی دوڑا دوڑا چپراسی کے پاس گیا۔ چپراسی دوڑا دوڑا کلرک کے پاس گیا۔ کلرک دوڑا دوڑا سپرنٹنڈنٹ کے پاس گیا۔ سپرنٹنڈنٹ دوڑا دوڑا باہر لان میں آیا۔ منٹوں میں درخت کے نیچے دبے ہوئے آدمی کے گرد مجمع اکٹھا ہو گیا۔

"بے چارا ! جامن کا پیڑ! کتنا پھلدار تھا۔" ایک کلرک بولا۔

"اور اس کی جامنیں کتنی رسیلی ہوتی تھیں۔" دوسرا کلرک یاد کرتے ہوئے بولا۔

"میں پھلوں کے موسم میں جھولی بھر کے لے جاتا تھا۔ میرے بچے اس کی جامنیں کتنی خوشی سے کھاتے تھے۔" تیسرا کلرک تقریباً آبدیدہ ہو کر بولا ـــ

"مگر یہ آدمی ؟" مالی نے دبے ہوئے آدمی کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں، یہ آدمی ـــ !" سپرنٹنڈنٹ سوچ میں پڑ گیا۔

"پتا نہیں ! زندہ ہے یا مر گیا!" ایک چپراسی نے پوچھا۔

"مر گیا ہوگا، اتنا بھاری تنا جس کی پیٹھ پر گرے۔ وہ بچ کیسے سکتا ہے ؟" دوسرا چپراسی بولا۔

"نہیں میں زندہ ہوں !" دبے ہوئے آدمی نے بمشکل کراہتے ہوئے کہا۔

"درخت کو ہٹا کر اسے جلدی سے نکال لینا چاہیے !" مالی نے مشورہ دیا۔

"مشکل معلوم ہوتا ہے۔ ایک کاہل اور موٹا چپراسی بولا۔" درخت کا تنا بہت بھاری اور وزنی ہے۔

"کیا مشکل ہے۔" مالی بولا۔ اگر سپرنٹنڈنٹ صاحب حکم دیں تو ابھی پندرہ بیس مالی، چپراسی اور کلرک لگا کر درخت کے نیچے سے دبے ہوئے آدمی کو نکالا جا سکتا ہے !"

"مالی ٹھیک کہتا ہے !" بہت سے کلرک ایکدم بول پڑے۔ "لگاؤ زور۔ ہم تیار ہیں !"

اک دم بہت سے لوگ درخت کو اُٹھانے پر تیار ہو گئے۔

"ٹھہرو!" سپرنٹنڈنٹ بولا۔ "میں انڈر سیکریٹری سے مشورہ کر لوں۔"

سپرنٹنڈنٹ انڈر سیکریٹری کے پاس گیا۔ انڈر سیکریٹری، ڈپٹی سیکریٹری کے پاس گیا۔ ڈپٹی سیکریٹری جائنٹ سیکریٹری کے پاس گیا، جو سیکریٹری چیف سیکریٹری کے پاس گیا۔ چیف سیکریٹری منسٹر کے پاس گیا۔ منسٹر نے چیف سیکریٹری سے کہا۔ چیف سیکریٹری نے جوائنٹ سیکریٹری سے کچھ کہا۔ جوائنٹ سیکریٹری نے ڈپٹی سیکریٹری سے کہا۔ ڈپٹی سیکریٹری نے انڈر سیکریٹری سے کہا۔ فائل چلتی رہی۔ اسی میں آدھا دن گزر گیا۔

دوپہر کے کھانے پر دبے ہوئے آدمی کے گرد بہت بھیڑ ہو گئی تھی۔ لوگ طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے۔ کچھ من چلے کلرکوں نے معاملے کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہا۔ وہ حکومت کے فیصلے کا انتظار کیے بغیر درخت کو خود سے ہٹانے کا تہیہ کر رہے تھے۔ کہ اتنے میں سپرنٹنڈنٹ فائل بھاگتا بھاگتا آیا اور بولا۔

"ہم لوگ خود سے اس درخت کو یہاں سے نہیں ہٹا سکتے۔ ہم لوگ محکمۂ تجارت سے متعلق ہیں۔ اور یہ درخت کا معاملہ ہے، محکمۂ زراعت کی تحویل میں ہے۔ اس لیے میں اس فائل کو ارجنٹ مارک کر کے محکمۂ زراعت میں بھیج رہا ہوں۔ وہاں سے جواب آتے ہی اس درخت کو ہٹوا دیا جائے گا۔"

دوسرے دن محکمۂ زراعت سے جواب آیا۔ کہ درخت محکمۂ تجارت کے لان میں لگا ہے اس لیے اس درخت کو ہٹوانے یا نہ ہٹوانے کی ذمہ داری محکمۂ تجارت پر عائد ہوتی ہے۔ یہ جواب پڑھ کر محکمۂ تجارت کو غصہ آ گیا۔

انھوں نے فوراً لکھا کہ پیڑوں کو ہٹوانے یا نہ ہٹوانے کی ذمہ داری محکمۂ زراعت پر عائد ہوتی ہے۔ محکمۂ تجارت کا اس معاملے میں کوئی تعلق نہیں ہے۔

دوسرے دن بھی فائل چلتی رہی۔ شام کو جواب آ گیا۔ "ہم اس معاملہ کو ہارٹی کلچرل ڈیپارٹمنٹ کے سپرد کر رہے ہیں۔ کیونکہ یہ ایک پھلدار درخت کا معاملہ ہے۔ اور ایگریکلچرل ڈیپارٹمنٹ صرف اناج اور کھیتی باڑی کے معاملوں میں فیصلہ کرنے کا مجاز ہے۔ جامن کا پیڑ ایک پھلدار پیڑ ہے۔ اس لیے یہ پیڑ ہارٹی کلچرل ڈیپارٹمنٹ کے دائرہ اختیار میں آتا ہے۔"

رات کو مالی نے دبے ہوئے آدمی کو دال بھات کھلایا۔ حالانکہ لان کے چاروں طرف پولیس کا پہرہ تھا کہ کہیں لوگ قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کے درخت کو خود سے ہٹوانے کی کوشش نہ کریں۔ مگر ایک پولیس کانسٹیبل کو رحم آ گیا۔ اور اُس نے مالی کو دبے ہوئے آدمی کو کھانا کھلانے کی اجازت دے دی۔

مالی نے دبے ہوئے آدمی سے کہا۔ "تمہاری فائل چل رہی ہے، امید ہے کہ کل تک یہ فیصلہ ہو جائے گا۔"

دبا ہوا آدمی کچھ نہیں بولا۔

مالی نے پھر کہا۔ "تمہارا یہاں کوئی وارث ہے تو اس کا اتا پتا بتاؤ۔ میں انھیں خبر دینے کی کوشش کروں گا!"

"میں لاوارث ہوں۔" دبے ہوئے آدمی نے بڑی مشکل سے کہا۔

مالی افسوس ظاہر کرتا ہوا وہاں سے ہٹ گیا۔

تیسرے دن ہارٹی کلچرل ڈیپارٹمنٹ سے جواب آ گیا۔ بڑا کڑا جواب تھا۔ اور طنز آمیز۔ ہارٹی کلچرل ڈیپارٹمنٹ کا سیکریٹری، ادبی مزاج کا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے لکھا تھا۔ "حیرت ہے! اس سمے میں جب ہم "درخت اگاؤ" اسکیم بڑے پیمانے پر چلا رہے ہیں۔ ہمارے

ملک میں ایسے سرکاری افسر موجود ہیں جو درختوں کو کاٹنے کا مشورہ دیتے ہیں اور وہ بھی ایک پھلدار درخت کا۔ اور وہ بھی جامن کے درخت کو جس کے پھل عوام بڑی رغبت سے کھاتے ہیں!

ہمارا محکمہ کسی حالت میں اس پھلدار درخت کو کاٹنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔

"اب کیا کیا جائے؟ — ایک من چلے نے کہا۔ "اگر درخت کاٹا نہیں جا سکتا۔ تو اس آدمی کو کاٹ کر نکال لیا جائے:

"یہ دیکھیے!" اُس آدمی نے اشارہ سے بتایا۔ "اگر اس آدمی کو عین بیچ میں سے یعنی دھڑ کے مقام سے کاٹا جائے تو آدھا آدمی ادھر سے نکل آئے گا۔ آدھا آدمی اُدھر سے باہر آ جائے گا۔ اور درخت وہیں کا وہیں رہے گا۔"

"مگر اس طرح سے تو میں مر جاؤں گا!" دبے ہوئے آدمی نے احتجاج کیا۔

"یہ بھی ٹھیک کہتا ہے!" ایک کلرک بولا۔

آدمی کو کاٹنے والی تجویز پیش کرنے والے نے پرزور احتجاج کیا۔

"آپ جانتے نہیں ہیں آج کل پلاسٹک سرجری کتنی ترقی کر چکی ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں اگر اس آدمی کو بیچ میں سے کاٹ کر نکال لیا جائے تو پلاسٹک سرجری کے ذریعے دھڑ کے مقام پر اس آدمی کو پھر سے جوڑا جا سکتا ہے۔"

اب کے فائل کو میڈیکل ڈیپارٹمنٹ میں بھیج دیا گیا۔ میڈیکل ڈپارٹمنٹ نے فوراً اس پر ایکشن لیا۔ اور جس دن فائل ان کے محکمے میں پہنچی۔ اُس کے دوسرے ہی دن اپنے محکمے کا سب سے قابل پلاسٹک سرجن تحقیقات کے لیے بھیج دیا۔ سرجن نے دبے ہوئے آدمی کو اچھی طرح ٹٹول کر، اس کی صحت دیکھ کر، خون کا دباؤ، سانس کی آمد و رفت، دل اور پھیپھڑوں کی جانچ کر کے رپورٹ بھیج دی کہ اس آدمی کا پلاسٹک آپریشن تو ہو سکتا ہے اور آپریشن کامیاب ہو جائے گا۔ مگر آدمی مر جائے گا۔

لہٰذا یہ تجویز بھی رد کر دی گئی۔

رات کو مالی نے دبے ہوئے آدمی کے منہ میں کھچڑی کے لقمے ڈالتے ہوئے اُسے بتایا: "اب معاملہ اوپر چلا گیا ہے — سنا ہے کہ سیکرٹریٹ کے سارے سیکریٹریوں کی میٹنگ ہو گی۔ اُس میں تمہارا کیس رکھا جائے گا۔ اُمید ہے سب کام ٹھیک ہو جائے گا۔"

دبا ہوا آدمی ایک آہ بھر کے آہستہ سے بولا ؎

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

مالی نے اچنبھے سے منہ میں انگلی دبائی حیرت سے بولا۔ "کیا تم شاعر ہو؟"

دبے ہوئے آدمی نے آہستہ سے سر ہلا دیا۔

دوسرے دن مالی نے چپراسی کو بتایا۔ چپراسی نے کلرک کو۔ کلرک نے ہیڈ کلرک کو۔ تھوڑے ہی عرصے میں سیکریٹریٹ میں یہ افواہ پھیل گئی کہ دبا ہوا آدمی شاعر ہے۔ بس پھر کیا تھا۔ لوگ جوق در جوق شاعر کو دیکھنے کے لیے آنے لگے۔ اس کی خبر شہر میں بھی پھیل گئی۔ اور شام تک محلے محلے سے شاعر جمع ہونا شروع ہو گئے۔ سیکریٹریٹ کا لان بھانت بھانت کے شاعروں سے بھر گیا۔ اور دبے ہوئے آدمی کے گرد مشاعرہ بپا ہو گیا۔ سیکریٹریٹ کے کئی کلرک اور انڈر سیکریٹری تک جنھیں ادب اور شعر سے لگاؤ تھا۔ رُک گئے۔ کچھ شاعر دبے ہوئے آدمی کو غزلیں اور نظمیں سنانے لگے۔ کئی کلرک اُس سے اپنی غزلوں پر اصلاح لینے کے لیے مصر ہونے لگے۔

جب یہ پتا چلا کہ دبا ہوا آدمی ایک شاعر ہے تو سیکریٹریٹ کی سب کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ چونکہ دبا ہوا آدمی ایک شاعر ہے لہٰذا اس

فائل کا تعلق نہ ایگری کلچرل ڈیپارٹمنٹ سے ہے، نہ ہارٹی کلچرل ڈیپارٹمنٹ سے، بلکہ صرف کلچرل ڈیپارٹمنٹ سے۔ کلچرل ڈپارٹمنٹ سے استدعا کی گئی۔ کہ جلد سے جلد اس معاملے کا فیصلہ کر کے بدنصیب شاعر کو اس شجر سایہ دار سے رہائی دلائی جائے۔

فائل کلچرل ڈپارٹمنٹ کے مختلف شعبوں سے گزرتی ہوئی ادبی اکاڈمی کے سیکریٹری کے پاس پہنچی۔ بے چارہ سیکریٹری اسی وقت اپنی گاڑی میں سوار ہو کر سیکریٹریٹ پہنچا۔ اور دبے ہوئے آدمی سے انٹرویو لینے لگا۔

"تم شاعر ہو؟" اُس نے پوچھا۔

"جی ہاں! دَبے ہوئے آدمی نے جواب دیا۔

"کیا تخلص کرتے ہو؟"

"اوس!"

"اوس؟! سیکریٹری زور سے چیخا!" کیا تم وہی اوس ہو، جس کا مجموعۂ کلام" اوس کے پھول" حال ہی میں شائع ہوا ہے؟"

دَبے ہوئے شاعر نے اثبات میں سر ہلایا۔

"کیا تم ہماری اکاڈمی کے ممبر ہو؟" سیکریٹری نے پوچھا۔

"نہیں!"

"حیرت ہے!"

سیکریٹری زور سے چیخا: "اتنا بڑا شاعر" اوس کے پھول" کا مصنف اور ہماری اکاڈمی کا ممبر نہیں ہے۔ اُف! اُف! کیسی غلطی ہوگئی ہم سے، کتنا بڑا شاعر اور کیسے گوشۂ گمنامی میں دبا پڑا ہے!"

"گمنامی میں نہیں! ایک درخت کے نیچے دبا ہوں۔ براہِ کرم مجھے اس درخت کے نیچے سے نکالیے!

"ابھی بندوبست کرتا ہوں" سیکریٹری فوراً بولا۔ اور فوراً جا کر اُس نے اپنے محکمے میں رپورٹ کی۔

دوسرے دن سیکریٹری بھاگا بھاگا شاعر کے پاس آیا اور بولا۔ "مبارک ہو! مٹھائی کھلاؤ۔ ہماری سرکاری اکاڈمی نے تمہیں اپنی مرکزی کمیٹی کا ممبر چن لیا ہے۔ یہ لو پروانۂ انتخاب!"

"مگر مجھے اس درخت کے نیچے سے تو نکالو۔" دبے ہوئے آدمی نے کراہ کر کہا۔

اُس کی سانس بڑی مشکل سے چل رہی تھی۔ اور اس کی آنکھوں سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ شدید تشنج اور کرب میں مبتلا ہے۔

"یہ ہم نہیں کر سکتے!" سیکریٹری نے کہا: "اور جو ہم کر سکتے تھے، وہ ہم نے کر دیا ہے۔ بلکہ ہم تو یہاں تک کر سکتے ہیں۔ کہ اگر تم مر جاؤ تو تمہاری بیوی کو وظیفہ دے سکتے ہیں۔ اگر تم درخواست دو تو ہم وہ بھی کر سکتے ہیں۔"

"میں ابھی زندہ ہوں!" شاعر رک رک کر بولا۔ "مجھے زندہ رکھو!"

"مصیبت یہ ہے" سرکاری ادبی اکاڈمی کا سیکریٹری ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔ کہ "ہمارا محکمہ صرف کلچر سے متعلق ہے۔ درخت کاٹنے کا معاملہ قلم دوات سے نہیں آری کلہاڑی سے متعلق ہے۔ اس کے لیے ہم نے فارسٹ ڈیپارٹمنٹ کو لکھ دیا ہے اور ارجنٹ لکھا ہے۔"

شام کو مالی نے آ کر دبے ہوئے آدمی کو بتایا۔ "کل فارسٹ ڈپارٹمنٹ کے آدمی آ کر اس درخت کو کاٹ دیں گے۔ اور تمہاری جان بچ جائے گی۔

مالی بہت خوش تھا۔ دبے ہوئے آدمی کی صحت جواب دے رہی تھی۔ مگر وہ کسی نہ کسی طرح اپنی زندگی کے لیے لڑے جا رہا تھا۔ کل تک

صبح تک .... کسی نہ کسی طرح اسے زندہ رہنا ہے۔

دوسرے دن جب فاریسٹ ڈپارٹمنٹ کے آدمی، آری، کلہاڑی لے کر پہنچے۔ تو ان کو درخت کاٹنے سے روک دیا گیا۔ معلوم ہوا۔ محکمۂ خارجہ سے حکم آیا تھا۔ کہ اس درخت کو نہ کاٹا جائے۔ وجہ یہ تھی کہ اس درخت کو دس سال پہلے حکومت پی ٹونیا کے وزیراعظم نے سیکریٹریٹ کے لان میں لگایا تھا۔ اب اگر یہ درخت کاٹا گیا۔ تو اس امر کا شدید اندیشہ تھا۔ کہ حکومت پی ٹونیا سے ہمارے تعلقات ہمیشہ کے لیے بگڑ جائیں گے۔

"مگر ایک آدمی کی جان کا سوال ہے"! ایک کلرک غصے سے چلایا۔

"دوسری طرف دو حکومتوں کے تعلقات کا سوال ہے" دوسرے کلرک نے پہلے کلرک کو سمجھایا۔ "اور یہ بھی تو سمجھو کہ حکومت پی ٹونیا ہماری حکومت کو کتنی امداد دیتی ہے۔ کیا ہم اُن کی دوستی کی خاطر ایک آدمی کی زندگی کو بھی قربان نہیں کر سکتے؟"

"شاعر کو مر جانا چاہیے!"

"بلا شبہ!"

انڈر سیکریٹری نے سپرنٹنڈنٹ کو بتایا: "آج صبح وزیراعظم دورے سے واپس آ گئے ہیں۔ آج چار بجے محکمۂ خارجہ اس درخت کی فائل اُن کے سامنے پیش کرے گا۔ جو وہ فیصلہ دیں گے وہی سب کو منظور ہوگا۔"

شام کے پانچ بجے خود سپرنٹنڈنٹ شاعر کی فائل لے کر اُس کے پاس آیا۔ "سنتے ہو؟"
آتے ہی وہ خوشی سے فائل کو ہلاتے ہوئے چلایا۔ "وزیراعظم نے اس درخت کو کاٹنے کا حکم دیا ہے۔ اس واقعے کی ساری بین الاقوامی ذمہ داری اپنے سر لے لی ہے کل یہ درخت کاٹ دیا جائے گا۔ اور تم اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرو گے۔
"سنتے ہو؟ آج تمہاری فائل مکمل ہو گئی" سپرنٹنڈنٹ نے شاعر کے بازو کو ہلا کر کہا۔
مگر شاعر کا ہاتھ سرد تھا۔ آنکھوں کی پتلیاں بے جان۔ اور چیونٹیوں کی ایک لمبی قطار اُس کے منہ میں جا رہی تھی....؟
اُس کی زندگی کی فائل بھی مکمل ہو چکی تھی۔

بیدار ادب کا نقیب

ماہنامہ "زاویے" حیدرآباد

زیرِ ادارت:- حسن ظہیر • عبداللطیف آبد

ماہ جون سے شائع ہو رہا ہے

ملنے کا پتہ ...

لکھنؤ

علی عباس حسینی

وراثت

نصیر اور نسرین کی ملاقات چوبیس برس بعد پالم کے ہوائی اڈے پر ہوئی
نصیر اک طویل مدت کے بعد ہندوستان پلٹا تھا۔ وہ وطن سے بھاگا تھا، اسی نسرین کو بھلانے کے لیے۔ وہ نہ جانے کتنے ملکوں م
ارا پھرا، اس نے ان گنت تکلیفیں اٹھائیں، سختیاں جھیلیں اسی نسرین کے ہجر میں۔ اسی غم میں وہ دوسری جنگ عظیم میں ایک معمولی سپاہی کی طرح
ہو گیا۔ سینکڑوں بار گولیوں کی بوچھاڑ سے گزرا، کئی بار زخمی ہوا، مرتے مرتے بچا۔ جب آخری بار پاؤں کی ہڈی ٹوٹنے سے ہلکا سا لنگ صحت
ہونے پر بھی باقی رہ گیا، تو اسے فوج سے فارغ خطی مل گئی۔ پھر وہ اپنے طور پر ایشیا، افریقہ، جنوبی و شمالی امریکہ، الاسکا، کناڈا، آسٹریلیا، نیوز
انڈونیشیا، ملیشیا میں سیر کرتا رہا۔ کہیں کہیں چھوٹی چھوٹی تجارتیں بھی کیں، کہیں اپنے فرم کی شاخیں بھی کھولیں۔ کہیں کہیں اپنے کارخانوں کے بنے
مال کے لیے نئے نئے معاہدے بھی کئے۔ اس لئے کہ نصیر حقیقتاً ہندوستان کے بڑے پونجی پتیوں میں سے تھا۔ بمبئی اور احمدآباد میں اس کی کاٹن ملز
کانپور میں ایک ٹینری تھی۔ گورکھپور میں ایک شکر مل، بعد میں دہلی میں قالینوں کا کاروبار اور کلکتہ میں جوٹ مل۔ اس کی ایک ٹی اسٹیٹ آسام میں تھی او
کرالا میں۔ اس کی غیر حاضری میں یہ سارا کاروبار اس کے اعزا اور اس کے معتمد ملازمین بڑے سلیقے سے چلاتے رہے۔ اس کے پاس بے انتہا دولت
اس کے پاس بہت سے کام تھے۔ اس کے پاس دل بہلانے اور غموں کے بھول جانے کے بڑے ذرائع تھے۔ لیکن اس نے لاکھ چاہا کہ نسرین کا خیا
سے نکال دے، پر وہ نہ نکلا، نہ نکلا۔ ایک نہ نکلنے والے کانٹے کی طرح رگِ جاں میں گھسا وہ ہمیشہ کھٹکتا رہا۔

نسرین اس کی محبوبہ و معشوقہ نہ تھی، اس کی سچی عاشق بیوی تھی۔ کیسے پیار اور محبت کے تین مہینے دونوں نے ساتھ گزارے تھے! سچ مچ
تھے۔ اور راتیں شب برات۔ جو دیکھتا یہی کہتا کیسا اچھا جوڑا ہے۔ دونوں ایک دوسرے پر فدا۔ دونوں حسین، دونوں پڑھے لکھے، مہذب ا
دونوں دولت مند۔ نصیر احمدآباد کے سب سے بڑے تاجر کا اکلوتا بیٹا اور نسرین سیٹھ عبدالکریم کروڑپتی کی واحد چشم و چراغ۔ مگر بے عیب ذات
کی۔ نصیر میں ایک بہت بڑی کمزوری تھی۔ وہ شراب پیتا تھا۔ اور وہ بھی اس انوکھے طور پر کہ یا تو مہینوں ایک قطرہ نہیں یا جب پینے پر آیا تو پانچ سا
دن سوائے شراب کے اور کچھ نہیں۔ وہی کھانا، وہی پینا، وہی اوڑھنا، وہی بچھونا، وہی زمین، وہی آسمان، وہی عزیز وہی دوست، وہی معشوق،
بیوی! پلنگ اور اس کے اردگرد کا حصہ ہر طرح کی آلائش سے پر۔ ڈاکٹر گھر رہے ہیں۔ نرسیں نگرانی کر رہی ہیں۔ مگر اس دوران میں کوئی چیز سوائے
شراب کے حلق سے اترتی ہی نہیں۔ اسے لوگ کہتے تھے "برسٹ" ہونا یعنی شراب نوشی کے خلاف سارے بندھن ٹوٹ جاتے تھے اور مستی و بے خو
کے اس سیلاب میں نصیر کی غیرت، حمیت، شرافت انسانیت، محبت تک بہہ جاتی تھی۔ اور وہ ایسی ایسی حرکتیں کر بیٹھتا تھا جن کا اس جیسے آدمی کے با

میں وہم وگمان بھی نہ ہو سکتا تھا۔

نہ نسرین اس کمزوری سے واقف تھی اور نہ نصیر کے سسر سیٹھ کریم کو اس کی خبر تھی۔ نصیر کے ہوا خواہوں نے انہیں اس کی ہوا تک نہ لگنے دی تھی۔ سیٹھ پابند مذہب و حاجی ہی نہ تھے بلکہ نئے ڈھنگ کے "بزنس مین" ہونے پر بھی حد درجہ پرانے ڈھنگ کے آدمی۔ وہ بھلا ایسے شرابی کو اپنا داماد کیسے بناتے۔ خود نسرین کو شراب سے "الرجی" تھی۔ اسے اس کی بو سے قے آتی تھی۔ دور سے دیکھ لینا ہی اس کے درد سر کے لئے کافی بہانہ ہوتا تھا۔ کسی مے خانے یا بار کے سامنے سے گزر جانا ہی اس کو مضمحل بنا دیتا تھا۔

ایسی نازک مزاج بیوی پر نصیر نے اچانک "برسٹ" کی آفت ڈھائی۔ وہ ایک شب میں ایک دوست کے ہاں دعوت میں اکیلا ہی گیا۔ نسرین کی ادھر پندرہ بیس دن سے کچھ طبیعت ماندی تھی۔ لیمو چاٹنے، کھٹی چیز کھانے کا شوق بڑھ گیا تھا۔ اس رات میں گرانی سر کی وجہ سے شوہر کے ساتھ نہ جا سکی تھی نو ہی بجے سے بستر پہ لیٹی نیند بلاتی رہی تھی۔ وہ بڑے ناز نخرے سے آئی۔ سر تین مہینے سے کسی کے بازو اور سینے کو تکیہ بنانے کا عادی ہو گیا تھا۔ وہ شادی کے بعد اس شب پہلی دفعہ پہلو میں نہ تھا۔ غرض بڑی دقتوں سے گیارہ بجے کے قریب نیند کی دلہن بڑی منتوں، سماجتوں کے بعد خراماں آئی۔ اور اب دفت تھا بارہ کا کہ دفعتاً نسرین کو محسوس ہوا کہ پورا سنڈاس کسی نے منہ پر انڈیل دیا۔ وہ تڑپ کر جاگی۔ دیکھا تو نصیر شراب میں نہایا دو بوتلیں ہاتھ میں لئے اس پر پیار کرنے کو جھکا ہے، محسوس ہوا شوہر نہیں گندگی سے تر اور کوئی "بنڈیلا" ہے۔ وہ پھڑک کر نصیر کے پھیلے ہوئے ہاتھوں کی گرفت سے نکلی اور لڑکھڑاتی باتھ روم میں بھاگی۔ نصیر نے لڑکھڑاتے ہوئے پیچھا کیا۔ نسرین "بیسن" میں منہ کی تلخیاں اگل رہی تھی کہ نصیر نے پیچھے سے آکر اسے دبوچنا چاہا۔

"اب کہاں جائے گی، میری ذری!" نصیر نے نشے میں چور آواز سے کہا۔

نسرین باز کے چنگل میں پھنسی ہوئی کبوتری کی طرح پھڑکی۔ اور اس نے میاں کو پوری قوت سے ڈھکیل دیا۔

نصیر لڑکھڑاتا ہوا دیوار سے ٹکرایا اور زمین پر گر پڑا۔

وہ بولا "اشا، ام سے لڑنا مانگتا ہے، تو پھر یہ لے! یہ لے!" اور اس نے نسرین کی ٹانگ، اس زور سے کھینچی کہ منہ کے بل حمام کے مرمریں فرش پر گرتے ہی اس نے چوٹ لگنے پر ہائے کی تھی کہ "یہ لے" کی ہر لے کے ساتھ منہ پر طمانچے پر طمانچے پڑے۔ پہلے تو وہ تڑپ رہی تھی۔ لیکن طمانچے نے اسے بت کی طرح ساکت اور بے حرکت بنا دیا۔

نصیر شراب کے نشے میں سمجھا دشمن کو زیر کر لیا۔ وہ ہاتھ اور جھاڑ کر گالی دے کر بولا "ام سے لڑتی ہے۔۔۔! نکل جا اس گھر سے! نکل ابھی نکل!"

نسرین خاموشی سے اٹھی اور اس نے بڈ روم میں جا کر باہر نکلنے والے کپڑے پہن لئے، وہ اپنا پرس اٹھا کر جا ہی رہی تھی کہ نصیر منہ سے بوتل لگائے باتھ روم سے جھومتا نکلا۔ نسرین کی تیاری دیکھ کر دھاڑا۔

"اشا جا رہی ہے، تو جا! ہمیشہ کے لئے جا! میں نے تجھے طلاق دی!"

اور جب وہ اس پر حسرت بھری نظر ڈال کر چلی گئی تو نصیر آدھی بوتل ایک سانس میں خالی کر کے بولا۔ "سالی گئی، سالی گئی!" اور ہنستے ہنستے رونے لگا اور بوتل پر بوتل خالی کرتا رہا۔ یہاں تک کہ بے ہوش ہو گیا۔

نسرین نے پالم کے ایئر ڈروم پر جب نصیر کو ٹیکسی سے اترتے دیکھا تو وہ اسے مشکل سے پہچان سکی تھی۔ بیس برس کا جوان رعنا اب چالیس برس کے ایک سوکھے سے بوڑھے میں تبدیل ہو گیا تھا، گورا رنگ جھلس گیا تھا کنپٹیوں کے پاس کے بال سفید ہو گئے تھے اور وہ جس کا ہر قدم مضبوط پڑتا تھا۔ اب ہلکا سا لنگڑانے لگا تھا چہرے پر گہرے نشانات تھے اور اس کی بڑی بڑی مست آنکھیں پھیکی اور بے آب تھیں۔

چوبیس برس کا زمانہ ایک عمر ہوتا ہے۔ کم سے کم نسرین کو تو وہ ایک جگ محسوس ہوا۔ وہ سترہویں میں تھی کہ اس کی شادی ہوئی تھی۔ صرف تین مہینے اس نے خوشی، عیش اور محبت کے دیکھے۔ پھر چوبیس برس کا بے آب وگیاہ صحرا شروع ہو گیا اور دل کی پیاس بجھانے والی ایک بوند بھی نہ ملی۔

یہ پیاس کیسے بجھتی اس لئے کہ نسرین ان بیویوں میں سے تھی جو زندگی بھر ایک ہی جام سے پی سکتی تھیں۔ اور وہ پیالہ ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا تھا، ٹوٹ گیا تھا۔ اسے اب بھی نصیر سے بے پناہ محبت تھی۔ وہ اسی رات احمد آباد سے بمبئی چلی گئی تھی اور اس نے سیٹھ عبدالکریم کی کوٹھی میں پہنچتے ہی غصہ اور غم کے زیر اثر باپ سے ساری روداد سنا دی تھی۔ انہوں نے دوسرے ہی دن ایک وکیل کے ذریعہ نصیر کو نسرین کے مہر کا نوٹس بھیج دیا تھا۔ نصیر نے بے عذر ڈیڑھ لاکھ کا دین مہر کا چک بھیج دیا تھا اور ڈاکٹروں کی اجازت ملتے ہی وہ یورپ چلا گیا تھا۔ اور جہاں تک نسرین کو علم تھا آج وہ پہلی بار وطن کی پاک زمین پر دکھائی دے رہا تھا۔

نسرین کے دل میں جو غم و غصہ کا طوفان اس رات کے واقعہ سے اٹھا تھا وہ کب کا ختم ہو چکا تھا، بس ایک آندھی تھی جس نے تھوڑی دیر رنجشوں کی گرد اڑائی پھر آنسوؤں کا چھینٹا پڑتے ہی غبار چھٹ گیا۔ دل کا مطلع صاف ہو گیا تھا۔ اس صفائی کا باعث مہر کی بے عذر ادائیگی ہی نہ تھی۔ بلکہ اس میں سب سے بڑا ہاتھ دونوں کی محبت کے پھل منیر کی پیدائش کا تھا۔

نصیر کو یہ معلوم نہ تھا کہ وہ اپنی نشانی نسرین کے ہاں چھوڑ گیا تھا اور نہ سوائے چند لوگوں کے سیٹھ نے اس کی کسی کو کانوں کان خبر ہونے دی۔ طلاق کے چھٹے مہینے جب منیر پیدا ہوا تو نانا نے گویا اولاد نرینہ پالی تھی۔ اسے آنکھوں کا تارا سمجھا۔ وہی اس کے باپ اور اس کی ماں بلکہ سارے خونی رشتوں کا ذخیرہ بن بیٹھے۔ کسی کو منیر کی پرورش و پرداخت کے سلسلہ میں ایک پیسہ خرچ کرنے کی اجازت نہ دی۔ نسرین تک کو وہ اس معاملے میں رقیبانہ نظر سے دیکھتے تھے وہ اس کے روادار نہ تھے کہ نسرین اپنے پیسے سے منیر کے لئے کوئی قمیص، کوئی نیکر، دودھ کا ڈبہ، کوئی کھلونا یا کسی طرح کی کوئی چیز خرید سکے۔ ایسے میں بھلا وہ اس کی کیسے اجازت دیتے کہ پاجی نصیر کو اس کی اطلاع مل جائے کہ سیٹھ جی کی کوٹھی میں اب بھی کوئی ایسی شے ہے جس پر اس شرابی کا بھی کوئی حق ہے۔ جسے وہ شرعاً اور قانوناً اپنا سکتا ہے اور سیٹھ جی سے چھین لے جا سکتا ہے۔ انہوں نے نواسے کی جگہ اسے اپنا ہی بیٹا کہہ کر لوگوں سے اس کا تعارف کرایا اور نسرین کو بھی "ممی" اور "امی" کی جگہ منیر سے "آپا" ہی کہلوایا۔

خود منیر کو بھی چودھویں سال تک اپنے حقیقی باپ کا نام نہیں معلوم تھا اتفاقاً اسے اس سال جونیر کیمبرج کا امتحان کا فارم بھرنا تھا۔ سیٹھ جی کو مجبوراً منیر کو اس کے باپ کا نام بتانا پڑا۔ مگر نصیر کا نام جس تمہید کے ساتھ انہوں نے منیر پر ظاہر کیا اس نے منیر کے دل میں نصیر کی طرف سے ہمیشہ کے لئے نہ دور ہونے والی نفرت بھر دی۔ سیٹھ جی نے بیٹی اور نواسے کو بڑے اہتمام سے کرسیوں پر بٹھایا۔ پھر منیر کو ایک گمنام شرابی کی کہانی سنائی جو اپنی بیوی پر طرح طرح کے ظلم کرتا تھا۔ اور جس نے آخر ایک رات کو بارہ بجے شراب کے نشے میں اسے خوب پیٹا اور طلاق دے کر گھر سے نکال دیا اور ایسی حالت میں اسے گھر سے نکالا جب بے چاری کے بطن میں اس پاجی کا تین مہینے کا بچہ بھی تھا۔ پوری کہانی اس ڈرامائی انداز میں کہی گئی اور شوہر کے کردار کی اتنی تاریک تصویر پیش کی گئی کہ چودہ سالہ منیر غصے سے بوٹیاں نوچنے لگا۔

جب اس کی یہ حالت دیکھی تو سیٹھ نے عجیب طرح مسکرا کر کہا "یہ ہیں تمہارے باپ کے کرتوت! اس کا نام ہے نصیر!"

منیر چیخ پڑا۔ "نہیں! نہیں! وہ میرا باپ نہیں! میں ایسے سؤر آدمی کو اپنا باپ نہیں مان سکتا!" اور وہ نانا کی گود میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

نسرین کے دل پر دو طرح کی چوٹیں لگیں۔ ایک تو یہ کہ اس کے منہ پر اس کے چہیتے میاں کی ذلت کی گئی۔ نصیر اتنا تو برا ہرگز نہ تھا جتنا بھیانک بنا کر سیٹھ جی نے اسے پیش کیا تھا۔ دوسرے یہ کہ منیر بجائے اس کے کہ ماں کی گود میں سر ڈال کر سسکتا۔ نانا کے زانو سے لپٹا رو رہا تھا۔ اس کا بے اختیار جی چاہ رہا تھا کہ وہ منیر کو سیٹھ کی گود سے کھینچ کر دو طمانچے مارے کہ تیرا باپ اتنا گرا ہوا نہیں ہے تو اسے "سؤر" کہے اور پھر بیٹے کو چھاتی سے لگا کر اس کے اور اپنے آنسوؤں سے ساری دنیا کو جل تھل بنا دے۔ مگر اس نے چودہ سال ۔۔۔ وہ ہمت کھو دی تھی جس سے وہ منیر کو اپنے باپ سے چھینتی یا شوہر کے متعلق اسے جھٹلاتی۔ عورت ہمیشہ مرد کی پشت پناہی کی طالب ہوتی ہے، یہ اس کی فطرت ۔۔۔ ہے۔ نسرین کے زندگی کے دو مردوں میں سے ایک نصیر تھا اور دوسرا سیٹھ۔ نصیر جس کی محبت دل سے نکالے نہ نکلتی تھی۔ اس کی زندگی سے اس طرح غائب ہوا تھا جیسے جلتے توے سے ٹھنڈے پانی کی بوند۔ اب جو کچھ سہارا تھا وہ سیٹھ کا تھا۔

اس لئے کہ وہ اس رسی کو مضبوط پکڑے تھی۔ اگر یہ بھی ہاتھ سے چھوٹ گئی تو نہ جانے کس کھڈ میں جا کر گر پڑے۔ اس لئے وہ نعیر کی برائی خاموشی سے سنتی رہی اور بیٹے کے دل میں باپ کی طرف سے حقارت و نفرت کے بیج کو سرسبز ہوتے، پودے سے درخت بنتے اور اس میں شاخیں اور پھول نکلتے دیکھتی رہی۔ بے بس عورت! شوہر سزا دے چکا تھا۔ اب اپنا ہی باپ، اپنا ہی بیٹا، اس کے چست وکیل بن کر اسے سزا دے رہے تھے۔

سیٹھ کے انتقال کے بعد جب اکیسویں سال منیر نے نانا کے کارخانے اور ان کی دولت پر مالکانہ تصرف شروع کیا تو نسرین کو زیادہ خوشی نہ ہوئی۔ وہ دل میں اس پر کڑھتی رہی کہ منیر اس سے بھی زیادہ جائداد اور دولت کا صحیح طور پر حقدار ہونے کے باوجود اس کا دعویدار بننے کے لئے تیار نہ تھا۔ وہ اپنے وجود میں باپ کی شرکت نہ چاہتا تھا۔ گویا وہ بن باپ ہی کے پیدا ہو گیا تھا۔ نسرین نے دو ایک بار بیٹے کے دل سے باپ کی نفرت نکالنے کی کوشش کی۔ لیکن اس پر تو نعیر کے ذکر سے ہی جیسے بھوت سا سوار ہو جاتا تھا۔ اب کے البتہ جب وہ بیمار ہوئی اور اسے اپنی موت کا یقین ہو گیا تھا تو اس نے بیٹے کا دل باپ کی طرف سے نرم کرنے میں کچھ کامیابی حاصل کی تھی۔ اسے بے کم و کاست سچے سچے واقعات سنا دیئے تھے اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ یہ اسی شرابی کی یاد تھی جس نے سیٹھ کے مرنے کے باوجود اسے دوسرے نکاح پر آمادہ نہ ہونے دیا۔ ماں کی زبان سے چند مہینوں کی خوشی و غم سے لبریز زندگی کا حال سن کر منیر کے ہاں تھوڑی دیر کے لئے ایک غیر شعوری نرمی ضرور پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اب چودہ برس کے لڑکے کی جگہ تیئیس برس کا تعلیم یافتہ جوان تھا۔ وہ انسانی کمزوریوں سے واقف ہو گیا تھا اور ں میں ایک طرح کی رواداری سی آگئی تھی۔ پھر بھی باپ سے نفرت نانا نے اس کے خمیر میں ڈال دی تھی۔ اسے اس نفرت سے محبت تھی۔ پہلی ہی کوشش ں اس نفرت کا دل سے نکل جانا آسان نہ تھا۔ اس لئے گو ماں کی خاطر باہری سطح ٹھنڈی پڑ گئی تھی۔ مگر ہانڈی کے اندر وہی کھولن باقی رہی جو سیٹھ جی کے مانے میں تھی۔

نسرین بمبئی سے صحت یاب ہو کر اپنے مخصوص ماہر قلبی علاج کو دکھانے دلی آئی تھی۔ آج وہ اس کے سینی ٹوریم سے بالکل ہی تندرست ہو کر نکلی تھی ر ہوائی جہاز سے بمبئی واپس جا رہی تھی۔ وہ یہی سوچ رہی تھی کہ ایسے موقع پر اگر نعیر آ جاتا تو باپ بیٹے میں بہ آسانی وہ صلح کرا دیتی۔ اور شاید اس کی اجاڑ ندگی پھر سے آباد ہو جاتی۔ اس نے نئی تعلیم یافتہ ہونے پر بھی سیٹھ جی کی خاطر سے برقعہ نہ چھوڑا تھا اس لئے گو اس نے نعیر کو پہچان لیا، لیکن وہ اسے پہچان سکا۔ نقاب نے اس چہرے پر پردہ ڈال رکھا تھا جس کی تصویر دل کے پردوں میں کھنچی ہوئی تھی۔ نعیر نے اسباب قلی کے حوالے کیا اور خود اپنی نشست لئے جگہ ڈھونڈنے لگا۔ سبھی صوفے اور کرسیاں بھری تھیں۔ صرف برقعہ پوش نسرین کی بغل میں ایک کرسی خالی دکھائی دی۔ وہ اس پر ایک تھکے ہوئے ر جیسی لمبی سانس لے کر بیٹھ گیا۔

وہ آج ہی صبح کلکتہ سے دلی آیا تھا۔ دن بھر اس نے نئے بھارت کی نئی راجدھانی کے دیکھنے میں اپنا وقت صرف کیا تھا۔ چوبیس برس پہلے کی دلی پہچانی نی تھی۔ وطن کے یوسف، جواہر لال نہرو نے اس زلیخا کو پھر سے جوانی بخش دی تھی۔ بڑھاپے کے جو آثار کہیں کہیں باقی رہ گئے تھے وہ اس نکھار کو بڑھاتے انہیں میں وہ قطب مینار بھی تھا جسے اس نے آخری بار نسرین کے ساتھ دیکھا تھا۔ اس سے ایک خاص یاد وابستہ تھی۔ جو نسرین کی کمزوری کی صورت اہر ہو کر اس کے لئے بہت ہی شیریں بن گئی تھی۔ وہ نعیر کے ساتھ ہنستی بولتی قطب کے سب سے اونچے حصے تک چڑھ گئی تھی۔ لیکن جیسے ہی اس نے سے جھانک کر نیچے دیکھا تھا وہ کانپنے لگی تھی۔ خوف نے اس میں اس بلا کی کمزوری پیدا کر دی تھی کہ وہ تقریباً سات بار مختلف جگہوں پر رکتی ہوئی نعیر اسے سے نیچے اتری تھی۔ نعیر نے اس وقت بار بار یہی سوچا تھا کہ قطب مینار کو باقاعدہ تفریح و سیرگاہ بنانے کے لئے اس میں اسی طرح کی لفٹ کیوں ی جائے اور اسی طرح ریستوران کیوں نہ کھول دیا جائے جیسا کہ پیرس کی آئفل مینار میں ہے۔ اگر سرکار اس خرچ کے لئے تیار نہ ہو تو ایک پرائیویٹ ذریعہ یہ ضروری کام کیوں نہ انجام دے دیا جائے۔ لیکن پونا پہنچتے ہی اس کے "بریسٹ" ہونے نے زندگی ہی تہ و بالا کر دی تھی۔

وہ انہیں خیالات میں ڈوبا برقعہ پوش نسرین کی بغل میں آ کر بیٹھ گیا۔ بیٹھتے ہی اسے اس مخصوص سنٹ کی خوشبو محسوس ہوئی جو نسرین کا دل پسند تھا اس نے رین کی طرف دیکھا۔ برقعہ میں لپٹی لپٹائی ایک سکڑائی خاتون نظر آئی۔ وہ اپنے خیالات و جذبات سے پریشان ہو کر کرسی سے اٹھ کر لونج کو میدان

سے جدا کرنے والی ریلنگ کے پاس جاکر کھڑا ہوگیا۔ اور مختلف طرح کی یادوں میں کھو گیا۔

نسرین کے دل میں پنکھے لگے تھے۔ جب نصیر پنڈال میں آکر بیٹھا تھا تو وہ کانپنے لگی تھی۔ اب جب کہ نصیر اٹھ کر ریلنگ کے پاس جاکر کھڑا ہوگیا تو اس سے ضبط نہ ہوسکا۔ وہ آہستہ آہستہ چل کر نصیر کے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔ اور اس سے گفتگو کا بہانہ ڈھونڈھنے لگی۔ نصیر جو ستاروں سے آنکھیں لڑائے ان کی متحرک چمک میں نسرین کی آنکھوں کے ڈبڈبائے آنسو دیکھ رہا تھا، پھر اسی محبوب خوشبو سے چونکا۔ اس نے پلٹ کر برقعہ پوش کو دیکھا۔ نسرین نے کانپتے ہاتھ سے نقاب الٹ دی۔ وہی پیارا چہرہ، مگر چوبیس سال کا غم زدہ۔ وہی غزالی آنکھیں۔ مگر مستی کی جگہ درد بھرے دو کٹورے، وہی برگِ گل ہونٹ مگر اب خزاں دیدہ مرجھائی ہوئی پنکھڑیاں۔

نصیر کے جسم میں زلزلہ سا آگیا۔ بوٹی بوٹی کانپی۔ مشکل سے منہ سے آواز نکلی۔ "نسرین!"

اس نے گھٹی آواز میں جواب دیا۔ "ہاں، وہی تمہاری لونڈی!"

نصیر بمشکل اپنے کو قابو میں رکھ سکا۔ اس نے ریلنگ دونوں ہاتھوں سے زور سے پکڑلی اور میدان کی طرف رخ کرکے کہا۔ "بس یہی ایک آرزو تھی کہ تم سے ایک بار معافی مانگنے کا موقع مل جائے۔ اسی امید میں آج بھی جا رہا تھا۔ اسی کا اقرار کرنے چوبیس برس بعد وطن آیا ہوں کہ میں نے تمہیں دھوکہ دیا۔ اپنی شراب نوشی چھپائی، اور نشے کی حالت میں تم پر بڑے بڑے ظلم کئے۔ میں نے اپنے جرموں کی پاداش میں اپنے کو خود کافی سزا دی ہے۔ ہندوستان سے جاتے ہی چھ مہینے آسٹریلیا کے ایک کلینک میں پڑا رہا۔ شراب کی لت پر فتح پاکر ہی وہاں سے نکلا۔ اس رات کے بعد سے آج تک ایک بوند حلق سے نہیں۔ . . . اتاری۔ کتنا دکھ ہوتا ہے ان نشوں کے چھوڑنے میں اس کا تم اندازہ نہیں لگا سکتیں۔ لیکن میں نے ان تکلیفوں کو اپنے جرم کی سزا سمجھ کر مردانہ وار برداشت کیا۔ پھر بھی زندگی بے کار سی معلوم ہوئی۔ میں فوج میں بھرتی ہوگیا۔ نہ جانے کتنی بار گولیوں کی بوچھاڑ سے گزرا۔ سوائے ٹانگ ٹوٹنے کے حسب خواہش سزا نہ ملی۔ پر کچھ سے موت کا وقت معین ہے!"

نسرین نے اس کے ہاتھ کو اپنے نازک ہاتھ سے تھپک تھپک کر کہا۔ "شراب ترک کرنے کے بعد کاش تم نے مجھے اطلاع دے دی ہوتی! پھر ہماری زندگیاں اس طرح اجاڑ نہ گزرتیں!"

نصیر نے تعجب سے پوچھا۔ "کیا تمہیں مجھ سے نفرت نہیں ؟"

اس نے نظریں نیچے کرکے کہا۔ "محبت میں نفرت کی گنجائش نہیں۔"

نصیر نے اسے اور بھی گھبرا کر دیکھا۔ "ارے کیا سیٹھ جی نے تمہاری دوسری شادی نہیں کردی ؟"

نسرین نے غرور سے سر اونچا کرکے کہا۔ "انہوں نے شروع میں تو زور دیا۔ مگر جب ہمارا منیر پیدا ہوگیا تو پھر ہم دونوں اسی کی خدمت و پرورش میں لگ گئے۔"

اس نے کانپتے ہونٹوں سے پوچھا۔ "یہ منیر کون ؟"

وہ آہستہ سے بولی۔ "تمہارا بیٹا! وہ تین مہینے کا پیٹ میں تھا جب میں گھر سے نکالی گئی۔"

نصیر نے "اُف اُف!" کہہ کر اپنے ہاتھوں سے منہ چھپا لیا۔ "ارے میرا بیٹا تمہاری امانت میں اور مجھے کچھ خبر نہیں۔ مجھ سے یہ بات چھپا کر سیٹھ جی نے مجھ کو سب سے بڑی سزا دی!"

نسرین نے کہا۔ "انہیں یقین تھا تم اسے ان سے چھین لے جاؤ گے اور اپنا ہی جیسا بنا دو گے۔"

وہ بولا۔ "غلط نہ تھا ان کا یہ اندیشہ۔ اگر یہی بچہ شاید میری زندگی یوں برباد ہونے سے بچا لیتا۔ وارث کے نہ ہونے سے ہر مرد ہدو رحبہ بے پرواہ ہوجاتا ہے۔ نہ کسی پر اس کی ذمہ داری اور نہ اس پر کسی کی ذمہ داری۔ مجھے ہر وقت محسوس ہوتا رہا کہ میں ایک بے سود سی زندگی بسر کر رہا ہوں . . . . مگر

اپنا بیٹا، اپنا وارث!..." اللہ دہ بڑی بے چینی سے پوچھنے لگا۔"اب تو وہ جوان ہو گیا ہوگا؟ شکل صورت کیسی ہے؟"

وہ مسکرا کر بولی۔"ہو بہو باپ کی جوانی کی تصویر!"

وہ آبدیدہ ہو کر بولا۔"خدا نہ کرے کہ باپ جیسی سیرت بھی ہو!"

وہ فخر سے سر اٹھا کر بولی۔"کون کہہ سکتا ہے اس کے باپ کی سیرت کو بُرا؟"

اتنے میں ہوائی جہاز کے چھوٹنے کا اعلان ہوا۔ اندر جانے کے لئے پھاٹک کھول دیا گیا۔ دونوں جہاز میں دو پاس پاس کی سیٹوں پر بیٹھ گئے شکوے بھی ہوئے اور میٹھی میٹھی پیار کی باتیں بھی کئی گھنٹے کا راستہ آنکھ جھپکتے میں کٹ گیا۔ آپس میں طے ہو گیا کہ وہ ہفتہ عشرہ بمبئی میں ضرور ٹھہرے گا اور بیٹے کو اپنے سے مانوس کرنے کی آہستہ آہستہ کوشش کرے گا۔ پھر نسرین کسی مناسب موقع پر باپ بیٹے میں میل کرا دے گی۔

سینٹا کروز میں اترے تو منیر ماں کو لینے نہ آیا تھا۔ گاڑی لئے غفور ڈرائیور موجود تھا۔ وہ سیٹھ جی کا پرانا ملازم تھا اور نصیر کو بھی پہچانتا تھا۔ اس نے جو دولہا میاں کو "بیٹا" کے ساتھ دیکھا تو باغ باغ ہو گیا۔ نسرین نے اس سے پوچھا "منیر کیوں نہیں آیا؟"

وہ کچھ سٹ پٹا کر بولا۔"کسی دعوت میں گئے ہیں مجھے حکم دیا میں جا کر آپ کو لے آؤں۔" اس نے نسرین کا اسباب ڈکی میں رکھوایا پھر نسرین کے خاموش اشارے پر نصیر کا اسباب بھی وہیں رکھوا دیا۔ نصیر نے ہوٹل میں قیام کا نام لیا اور موٹر میں سوار ہونے سے عذر کرنا چاہا تو نسرین بولی۔"کوٹھی میرے ہی نام ہے۔ اب وہ میرا گھر ہے یا تمہارے بیٹے کا۔ ہمارے گھر میں ٹھہرنے میں عذر کا کون سا پہلو ہے؟" اسے خاموش ہو کر نسرین کے ساتھ بیٹھ جانا ہی پڑا۔ اس کا دل بھی تو یہی چاہتا تھا۔

موٹر اسی جانی پہچانی سہ منزلہ عمارت کے سامنے پورٹیکو میں رکی جہاں آتے جاتے، سیٹھ جی کی موجودگی میں بھی اسے ہمیشہ مسرت ہوتی تھی۔ نئی نئی قلعی اور مرمت ہوئی تھی اور اس کے پرانے پن میں ایک خاص طرح کا حُسن تھا۔ نسرین اسے اپنے ساتھ ڈرائنگ روم میں لے گئی۔ دروازے کے بالکل مقابل ہی سیٹھ جی کی قد آدم تصویر لگی تھی۔ نصیر کو محسوس ہوا جیسے سیٹھ جی کھڑے اسے بڑی نفرت اور حقارت سے دیکھ رہے ہیں۔ جیسے تصویر کے بے جان لب ہل رہے ہیں اور ان سے آواز آ رہی ہے۔"بے شرم بے غیرت شرابی! تو پھر اس گھر میں اسے برباد کرنے آیا!" اور نصیر دروازے ہی پر ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔

نسرین اپنے عزت دار شوہر کے رگ رگ سے واقف تھی۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر کھینچتی ہوئی بولی۔"اندر آؤ اب ڈیڈی ہمارے درمیان نہیں آ سکتے!"

نصیر پشت کی جانب جو کھڑکی تھی وہاں جا کر کھڑا ہو گیا۔ ادھر ایک چھوٹا سا چمن تھا۔ اس میں چھٹکی چاندنی بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ اس چمن کی بہاریں ہی کئی بار نسرین کے ساتھ لوٹی تھیں اور ان کی آپس کی چھیڑ چھاڑ پر وہاں کے اکثر پھول مسکرائے اور ہنسے تھے۔ شیریں یادوں کا یہ سلسلہ غفور کے دروازہ کھولنے اور اندر چلے آنے نے توڑا۔ اس نے پوچھا۔"بیٹا، دولہا میاں کا سوٹ کیس کس کمرے میں رکھ دوں؟"

نسرین نے کچھ شرما کر، کچھ سٹ پٹا کر کہا۔"مہمان والے کمرے میں!"

جب غفور دروازہ بھیڑ کر چلا گیا تو وہ نصیر سے اپنی صفائی میں بولی۔"میں چاہتی ہوں کہ منیر تم سے آہستہ آہستہ ہل مل جائے تو اسے تمہارا نام بتاؤں۔"

نصیر نے پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔"ہاں نہ جانے کتنا بس سیٹھ جی نے اس کے دل میں میری طرف سے بھر دیا ہوگا... مگر اپنے لئے کوئی نیا ابھی سوچ لینا پڑے گا!..." وہ بڑی تلخی سے مسکرایا۔

اتنے میں ایک موٹر زور زور سے ہارن دیتی پورٹیکو کی طرف بڑھتی سنائی دی۔ پھر ایسی آواز آئی جیسے دو موٹروں میں ہلکی سی ٹکر ہوئی اور شیشوں کے ٹوٹنے کی جھنکار سنائی دی اور غفور کی ہلکی سی چیخ۔

نسرین "اسے کیا ہوا؟" کہتی کمرے کے باہر لپکی۔ نصیر نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ منیر ٹکر مارنے والی موٹر سے دھاڑتا ہوا نکلا۔"یو ڈیم فول! ام ارٹ پر

ہالن پر بجاتا ہے۔ تم ہیرا راستہ کیوں نہیں دیتا!"

غفور جو دونوں موٹروں کے درمیان کچھ دبا سا کھڑا تھا بولا "بھیا میں ڈکی سے بیٹیا اور دولہا میاں کے اسباب اتار رہا تھا میں موٹر کیسے ہٹاتا؟"

منیر بولا۔ "بیٹیا، بیٹیا، بیٹیا ہا ہا، ام ہمارا آپا!"

نسرین نے قریب آکر پوچھا "ارے کیا ہوا غفور؟"

منیر اس کی طرف لڑکھڑاتا ہوا بڑھا "تم آگیا آپا! ہمارا پیارا آپا!"

لیکن جیسے ہی وہ نسرین کے قریب آیا، وہ غصے سے بھڑک کر بولی "ارے تو نے شراب پی ہے! تھو! بے غیرت! بے شرم! تھو! تھو..."

وہ ہنس کر بولا۔ "بہت نہیں پی آپا! بس تمہاری صحت کے... تین جام! ڈیئر آپا! ڈارلنگ آپا!"

نسرین منہ پر رومال رکھ کر ابکائی لیتی ہوئی بولی "ارے باپ کی وراثت مل گئی تجھ کو! ہائے اللہ! باپ کا خون رنگ لا کر ہی رہا!"

اور وہ او، او، تھو تھو کرتی قریب ترین باتھ روم کی طرف بھاگی۔

شراب کے نشے نے منیر کے سچے جذبات زبان سے کہلوا دیئے، وہ ماں کے پیچھے لپکتا ہوا بولا "میرے شوفر باپ کا نام تم نے کیوں لیا آپا؟ اس کی وراثت! اس شوفر کا خون۔ نہیں۔۔۔! ہرگز نہیں، آخر تو ہر مہذب... نوجوان... تھوڑی بہت پیتا ہے! یہ تہذیب کا ورثہ!"

اور دفعتہً اس نے باتھ روم کے قریب رکھے ہوئے گملوں میں سے ایک سے ٹھوکر کھائی اور منہ کے بل آرہا۔

غفور اپنی چوٹ بھول کر اسے اٹھانے دوڑا، مگر نسرین نے باتھ روم کا دروازہ دھڑاکے سے بند کر لیا۔۔۔ اور منیر رومال سے چہرہ پونچھتا ہوا سب کی نظریں بچا کر تیزی سے کوٹھی کے باہر نکل گیا۔

ناول نگاروں اور ناشروں سے

جناب علی عباس حسینی کی کتاب

اُردو ناول کی تاریخ و تنقید

کا نیا ایڈیشن نظر ثانی اور اضافے کے بعد شائع ہونے والا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۴۳ء میں لکھی گئی تھی۔ اس لیے اس کے بعد بیس سال کے ناولوں کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

ناشرین اور مصنفین سے التماس ہے کہ وہ اس مدت میں شائع شدہ ناولوں کی ایک ایک کاپی مصنف موصوف کے مندرجہ ذیل پتے پر ارسال کردیں:۔

جناب "علی عباس حسینی" ۱۵ ا، غوث گنج۔ لکھنؤ۔ یوپی

سید قاسم محمود

الشجاعہ۔ کراچی۔

۱۲ر جولائی

۱۲ر جولائی ۱۹۶۴ء

آج کا دن میری زندگی کا اہم ترین دن ہے — چونکہ واقعات غیر معمولی ہیں۔ اور ذہن میں تازہ بہ تازہ ہیں، اس لئے میں انہیں یادداشت کے طور پر لکھ لینا چاہتا ہوں، اور سچ پوچھئے تو میں اس وقت زندگی اور موت کی جس کشمکش میں گرفتار ہوں، اس سے چھٹکارا پانے کے لئے خود بخود یہ سطور لکھنے بیٹھ گیا ہوں، حالانکہ میں لکھنے کا بہت چور رہوں۔

میں شروع ہی میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ میرا نام تفضل حسین ہے۔ میری عمر چالیس سال ہے۔ لوگ مجھے خوبصورت کہتے ہیں۔ اور اتنا تو خیر میں بھی جانتا ہوں کہ میں قابل رشک حد تک صحت مند ہوں۔

پیشے کے لحاظ سے آرٹسٹ ہوں، گو اتنا کامیاب نہیں۔ لیکن اپنے آرٹ سے اتنا کچھ ضرور کما لیتا ہوں کہ اپنی ضروریات و خواہشات پوری کر سکوں۔

آج صبح میری آنکھ کھلی تو منڈیر پر ایک گدھ بیٹھا ہوا تھا۔ یہ ایک غیر معمولی واقعہ تھا۔ مجھے بہت ڈر لگا، پھر جب میں چائے پینے بیٹھا تو دیکھا دس بجے ہوئے ہیں۔ یہ بھی ایک غیر معمولی واقعہ تھا۔ کیونکہ میں تو آٹھ بجے کام شروع کر دینے کا عادی ہوں۔ جب چائے کا پہلا گھونٹ بھرنے لگا تو پیالی میں ایک غوطہ خور مکھی نظر آئی — میں نے دل ہی دل میں کہا۔ آج کا دن تو بڑا منحوس ہے۔ ابھی یہ اچھی طرح سوچنے بھی نہ پایا تھا کہ ایک اور غیر معمولی واقعہ پیش آیا۔ آج کے اخبار میں میاں چنوں کے ایک شخص کی ایک تصویر دیکھی جو حجامت بنوا رہا ہے، مسکرا رہا ہے، اور اسی حالت میں ہمیشہ کے لئے چل بسا ہے۔

میں نے بھی مسکرا کر اخبار ایک طرف رکھ دیا۔ اور سگریٹ سلگا کر جسم و ذہن کو موضوع کی تلاش میں ڈھیلا چھوڑ دیا۔ روشن دان اور کھڑکیاں کھلی ہونے کے باوجود کمرہ کافی گرم تھا۔ میں نے غیر معمولی گرمی اور حبس سے بچنے کے لئے گول باغ میں جانے کا ارادہ کر لیا۔ سارے شہر میں وہی ایک گوشۂ عافیت معلوم ہوا۔ اب سوچتا ہوں تو گول باغ میرے ذہن میں اس لئے بھی آیا تھا کہ سامنے ہی عدالت کا منظر ہے۔ جس کی موجودگی میرے موضوع کو اور بھی واضح کر سکتی تھی۔

وہاں میں نے بڑے سکون سے تصویر بنانی شروع کر دی اور اپنے کام میں اس قدر منہمک ہو گیا کہ دوپہر کے کھانے کا بھی ہوش نہ رہا البتہ ایک دفعہ میاں چنوں کا وہ شخص ضرور یاد آیا تھا اور اس کی یاد آنے پر پنسل خود بخود رک گئی تھی اور میں سوچنے لگا تھا۔ جب وہ گھر سے

حجام کی طرف چلا ہوگا تو کیا راستہ میں اسے محسوس ہوا ہوگا کہ میں مرنے جا رہا ہوں۔ اس احساس کے دل میں پیدا ہوتے ہی میں لرز گیا اور پھر تصویر میں منہمک ہو گیا۔

جب میں نے تصویر پر آخری مغرور نگاہ ڈالی تو وہ مجھے اپنے سابقہ تمام شاہکاروں سے بھی اچھی اور خوبصورت نظر آئی۔ جانے کیوں۔

تصویر میں ایک بے گناہ شخص کو ملزم کے کٹہرے میں کھڑا دکھایا گیا تھا۔ اس نے اپنی موٹی موٹی بھدی انگلیوں سے کٹہرے کو پکڑ رکھا تھا۔ اور سامنے خلاء میں بے جان آنکھوں سے گھور رہا تھا۔ اس کے چہرے پر خوف کی بجائے جاں بلب انسان کے سے تاثرات تھے۔ نہایت موٹا بھدا تھا۔ اس کی ٹھوڑی کے نیچے گلے پر گوشت کی کئی تہیں ایک دوسرے پر چڑھی ہوئی تھیں۔ اس کی مونچھیں اوپر کے ہونٹ پر چھجے کی طرح جھکی ہوئی تھیں۔ وہ گنجا تھا بس کنپٹیوں پر بالوں کی ایک پتلی سی لکیر تھی۔ اس میں جینے کی کوئی تمنا اور خواہش نظر نہ آ رہی تھی۔ وہ تن بہ تقدیر کی مکمل تفسیر نظر آ رہا تھا۔ جیسے اگر عدالت اسے ہی قاتل کہہ دے گی تو وہ بے گناہ ہونے کے باوجود بے چون و چرا پھانسی پر چڑھ جائے گا۔

میں نے تصویر کو تہ کر کے نہ جانے کیوں تھیلے میں رکھنے کی بجائے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ اور پھر خوشی و انبساط کی کیفیت کے ساتھ جو ہر آرٹسٹ اپنا فن پارہ مکمل کرنے کے بعد محسوس کرتا ہے، اپنے گھر کو چل دیا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے، جب میں نیلا گنبد عبور کر کے میڈیکل کالج کی طرف بڑھ رہا تھا تو اس وقت میرے ذہن میں اپنے ایک دوست سے ملنے کا پروگرام تھا لیکن اس کے بعد مجھے کچھ یاد نہیں۔ خدا جانے بے دھیانی میں کہاں کہاں گھومتا رہا۔ مبہم سے سائے ذہن میں ابھرتے تو ہیں لیکن سرِ دست میں انہیں کوئی واضح شکل نہیں دے سکتا۔ ایک تو یہ یاد ہے کہ میں کتاب مرکز اس لالچ سے گیا تھا کہ اس کا مالک کسی نئی کتاب کا سرورق بنانے کے لئے کہے۔ مگر وہ کم بخت دکان پر موجود ہی نہ تھا۔ یا شاید ملا تو تھا مگر سرورق کی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ ایک یہ یاد ہے کہ میں اس رسالے کی طرف بھی جا رہا تھا جس کے ٹائٹل پر میری آج کی تصویر شائع ہوئی ہے اب یہ پتہ نہیں کہ میں گیا یا نہیں۔ بہرحال میں سارا دن بے خیالی میں چلتا ہی گیا۔ جیسے مسحور کر دیا گیا ہوں۔ صرف ایک چیز کا علم تھا، اور وہ تھی غیر معمولی گرمی اور آج کے دن کی فضا میں رچی ہوئی نحوست کی کیفیت۔

ایک ذرا سی بات یہ بھی یاد ہے کہ میں اس وقت دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ آسمان پر دور ایک دائرے کی شکل میں نظر آنے والے بادل آج برس پڑیں تو بہت اچھا ہو۔ کہ ایک چھوٹے سے لڑکے نے مجھ سے وقت پوچھ کر میرے حواس جھنجھوڑ ڈالے۔ اس وقت شام کے سات بجنے میں بیس منٹ باقی تھے۔ میں نسبت روڈ کے ایک بس اسٹاپ پر، گلبرگ جانے والی بس کا انتظار کرنے والے ہجوم میں کھڑا تھا۔ دماغ پر بوجھ ڈالا تو واقعے کی یہ شکل نظر آئی کہ میں کوئی ایک گھنٹہ پہلے سینما دیکھنے کے ارادے سے اس سڑک پر گزر رہا تھا کہ شربت پینے کے لئے ٹھہر گیا۔ شربت پیتے پیتے اپنے گلبرگ والے دوست سے ملنے کی کوئی لہر آئی ہوگی، جبھی تو میں اس ہجوم میں شامل ہو گیا۔ ورنہ اور تو کوئی جواز نہ تھا۔ میں تو کبھی بس کا سفر نہیں کرتا۔ میں سوچنے لگا کہ آج چھوٹے چھوٹے واقعات میں بھی کس غضب کا غیر معمولی پن ہے۔ یہ سوچتے سوچتے میں نے اپنے ارد گرد کا جائزہ لیا تو بس اسٹاپ کے بالکل ساتھ ایک کوٹھی سی تھی جس کے دروازے سے اندر جاتی ہوئی روش کے دونوں طرف، جلائی کی تپتی ہوئی پیاسی زمین پر رنگ رنگ کے پھول اور پودے اُگے ہوئے تھے جو دن بھر کی گرمی سہ کر مرجھا سے گئے تھے۔ دروازے پر ایک سنگ مرمر کی تختی پر یہ الفاظ کندہ تھے

ڈاکٹر محمد شفیق ۔ دندان ساز

میں نے سوچا کہ گلبرگ والے دوست سے تو پھر کبھی مل لوں گا۔ اب ذرا ڈاکٹر شفیق کو اپنا دانت دکھا لیتا ہوں۔ عرصہ دراز سے ایک بیماری

میں مبتلا ہوں۔ سنتا ہوں کہ یہ بیماری میرے والد میں بھی تھی۔ تیسرے چوتھے مہینے اوپر کی ڈاڑھ میں شدید درد ہوتا ہے۔ سارا منہ سوجھ جاتا ہے اور آٹھ دس روز کے لئے بستر پر پڑا بلکتا رہتا ہوں۔ کئی لوگوں نے مشورہ دیا تھا کہ ڈاکٹر شفیق کو دکھانا چاہئے۔ وہ لندن پلٹ ہے۔ اور یوں بھی روزانہ اخباروں میں اس کا اشتہار چھپتا ہے کہ دانت کا ہر مرض بارہ گھنٹے کے اندر اندر دور کیا جاتا ہے۔ اس وقت اتفاق سے میری جیب میں اتنے پیسے بھی تھے کہ ڈاکٹر شفیق کی منہ مانگی فیس دے سکتا تھا۔

اتنی ساری باتوں نے یکجا ہو کر مجھے کوٹھی میں داخل ہونے پر مجبور کر دیا۔ روش پر تھوڑی دور آگے چلا تھا کہ ایک شخص میری طرف پشت کئے، پتھر کے ٹکڑے پر کھدائی کرنے میں مصروف تھا۔ قدموں کی آہٹ سنکر اس نے اپنا کام بند کر دیا اور گردن گھما کر میری طرف دیکھنے لگا اور مسکرانے لگا۔ میں اب تک نہیں سمجھ سکا کہ میں کیوں خود بخود اس کی طرف کھنچتا چلا گیا۔ وہ برابر میری طرف دیکھ رہا تھا اور میں حیران و پریشان اس کے سامنے کھڑا تھا۔ یہ وہی شخص تھا جس کی تصویر میری جیب میں موجود تھی۔ وہ اتنا ہی موٹا اور بھدا تھا۔ اس کی ٹھوڑی کے نیچے گلے پر اسی طرح گوشت کی تہیں چڑھی ہوئی تھیں۔ مونچھیں ویسی ہی چھجہ سی، وہ گنجا بھی تھا۔ اور بار بار پسینہ پونچھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ بھی ویسا ہی تھا۔ بس فرق یہ تھا کہ تاثرات مختلف تھے، اور اگر اسے ملزم کے کٹہرے میں کھڑا کر دیا جائے تو مجھے یقین ہے کہ تاثرات بھی بالکل ویسے ہی ہو جائیں گے۔

اس نے اٹھ کر بڑی گرم جوشی کے ساتھ مصافحہ کیا۔ کسی پرانے جگری دوست کی طرح مجھے مسکراتے ہوئے خوش آمدید کہی اور بیٹھنے کے لئے کرسی اٹھا کر لایا۔

میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے معذرت کے انداز میں کہا "میں ڈاکٹر شفیق سے ملنے آیا تھا"

اس نے جواب دیا "یہ تو مجھے نہیں معلوم کہ آپ کس سے ملنے آئے تھے۔ میں تو اتنا جانتا ہوں کہ آج زبردست گرمی ہے۔ اور جہنم کی سی"

میں نے سنگ مرمر کے ٹکڑے پر اس کی کھدائی دیکھ کر کہا "بہت نفیس اور خوبصورت ہے"

بولا "ہاں ایک لحاظ سے آپ کہہ سکتے ہیں سطحی طور پر دیکھیں تو یہ دنیا کی حسین ترین چیزوں سے بھی پیارا ہے۔ مگر اس کی تہہ میں ایک بہت بڑی کمزوری ہے ــــ لیکن اسے تلاش کر لینا تمہارے بس کا روگ نہیں ــــ ہر تخلیق کسی نہ کسی کمزوری یا محرومی کا شاخسانہ ہوتی ہے"ــ

میں نے پوچھا "آپ یہ کس لئے بنا رہے ہیں"

اس نے زور کا قہقہہ لگایا۔ "آرٹسٹ لوگ اپنی چیزوں کی نمائش کیا کرتے ہیں۔ بلکہ آج کل تو کنجڑے اور قصائی تک اس میدان میں پیچھے نہیں ہیں۔ میں بھی ان چھوٹے چھوٹے نفیس اور حسین کتبوں کی ایک نمائش کرنا چاہتا ہوں ــــ چالیس برس کی شبانہ روز ریاضت کا حاصل!"

پھر اس نے پتھروں کی باتیں شروع کر دیں۔ ان کی کتنی قسمیں ہوتی ہیں۔ موسم کے تغیر و تبدل کا ان پر کیا اثر ہوتا ہے۔ کس پتھر پر کس موسم میں اچھی کھدائی ہوتی ہے۔

وہ ہر منٹ کے بعد اپنی چھینی پھینک دیتا، لال ریشمی رومال نکالتا اور اپنے چمکتے ہوئے گنجے سر سے پسینہ پونچھ کر گرمی کی شدت پر لعنت بھیجتا۔

میں اوپر سے پرسکون اور مطمئن تھا، لیکن اندر سے سخت بے چین اور پارہ صفت۔ مجھے تو اس عجیب و غریب اتفاق پر بے انتہا حیرت ہو رہی تھی۔ میرا ذہن اس گتھی کو سلجھانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ اس آدمی سے اچانک ملاقات، مجھے بڑی پراسرار اور غیر قدرتی سی لگ رہی تھی۔ میں حیران تھا کہ میرے تصور کی تخلیق نے ایک جیتے جاگتے، گوشت پوست کے انسان کا روپ کیسے اختیار کر لیا

پہلے پہل تو میں نے خود کو بہلانے کی کوشش کی کہ میں نے اسے کہیں دیکھا ہوگا۔ اس کی شکل و صورت میرے شعور سے محو ہو کر لاشعور کے کسی تاریک خانے میں جا سوئی ہوگی۔ اور جب میں تصویر بنانے لگا تو اس نے میرے لاشعور کی قید سے آزاد ہونے کے لئے میری پنسل کا راستہ

چن لیا ہوگا. مگر مجھے یقین تھا کہ میں خود کو ایک خوش آئند دھوکہ دینے کی کوشش کر رہا ہوں، ورنہ حقیقت اس سے بالکل مختلف تھی حقیقت ہی ناقابل فہم تھی.

میں نے اس سے پوچھا. "آپ کا نام کیا ہے؟"

عجب انداز میں مسکرا کر کہنے لگا. "نام میں کیا رکھا ہے. ڈاکٹر شفیق میر الملک ہے، اکلوتا لڑکا."

پھر اس نے سنگ مرمر کے ٹکڑے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بڑے غرور اور تمکنت سے کہا. "آپ کا میرے اس کتبے کے متعلق کیا خیال ہے؟"

میں نے پہلی مرتبہ پتھر پر نگاہ ڈالی.......اس پر نہایت خوبصورت لفظوں میں لکھا ہوا تھا:

"مرقد تفضل حسین

تاریخ پیدائش: ۱۴ر فروری ۱۹۲۱ء

تاریخ وفات: ۱۲ر جولائی ۱۹۶۴ء"

یہ پڑھتے ہی مجھے ریڑھ کی ہڈی میں خوف کی ایک سرد لہر دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی. بڑی مشکل سے میں نے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا "یہ نام آپ نے کہاں سے سنا تھا؟"

اس نے جواب دیا. "میں نے کبھی نہیں سنا. یہ کتبہ کسی کی فرمائش پر نہیں بنایا گیا. میں از خود لفظ کھودنے کا ایک تجربہ کر رہا ہوں. اور مجھے ایک نام کی ضرورت تھی. جو نام میرے ذہن میں آیا، لکھ ڈالا. مگر آپ ایسے اچنبھے سے کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

میں نے کہا. "اچنبھے کی بات ہی ہے. یہ میرا نام ہے."

"اوہ." اس نے سیٹی بجانے کے انداز میں لمبی سی آواز نکالی. "کیا تاریخیں بھی صحیح ہیں؟"

میں نے جواب دیا. "صرف ایک کے متعلق بتا سکتا ہوں. میری تاریخ پیدائش ۱۴ر فروری ۱۹۲۱ء ہے."

"تعجب ہے. کیا آپ کا نام تفضل حسین ہے."

میں نے کہا. "ہاں جناب میرا نام تفضل حسین ہی ہے."

یہ سنکر وہ سخت حیران ہوا لیکن حیران ہونے کے لئے اس کے پاس ابھی بہت کم مواد تھا، اور میں بھی زیادہ حیران نہیں ہونا چاہتا تھا کیونکہ اس وقت تو پریشانی حیرانی سے کہیں زیادہ جان لیوا تھی. اسی لئے میں نے جلدی سے صبح کی بنائی ہوئی تصویر اپنی جیب سے نکالی اور اس کے آگے پھیلا دی. جونہی اس نے تصویر پر نظر دوڑائی. اس کے چہرے کے تاثرات بدلنے شروع ہو گئے. بدلتے گئے اور بالکل وہی صورت اختیار کر گئے جو میں نے تصویر میں بنائے تھے.

حیرت میں ڈوبے ڈوبے، سر جھکائے، اس نے کہا. "میں کل ہی اپنی بیوی سے ذکر کر رہا تھا کہ جن بھوت کا کوئی وجود نہیں ہے. بڑی حیرت انگیز بات ہے. ایسا عجیب اتفاق! یہ کیسے ممکن ہے؟"

میں نے کہا. "شاید آپ نے میرا نام کہیں سنا ہو!"

اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا. "آپ نے ضرور مجھے کہیں نہ کہیں دیکھا ہوگا. اور بعد میں بھول گئے ہوں گے. کیا آپ پچھلے سال ایبٹ آباد نہیں گئے تھے؟"

میں نے جواب دیا. "میں تو کبھی ایبٹ آباد نہیں گیا."

چند منٹ تک بوجھل اور منحوس سی خاموشی چھائی رہی. ہم دونوں کی نظریں ایک ہی چیز پر جمی ہوئی تھیں، اور وہ تھا کتبہ — میرا نام صحیح

ہے، تاریخ پیدائش صحیح ہے ۔۔ اور تاریخ وفات تک آتے آتے میرا رواں رواں لرز جاتا۔ اور لرزے کے عالم میں مجھے میاں چنوں کے اس شخص کی تصویر نظر آتی۔

اس نے مجھے یوں کھویا کھویا اور پریشان دیکھ کر کہا: "آؤ اندر چلیں۔ کھانا کھائیں گے اور گپ شپ کریں گے۔"

کھانا کھاتے وقت ہم دونوں نے ایک دوسرے سے بات کرنے کی خواہش اور کوشش کی، اور کبھی کبھی ہم کامیاب بھی ہو گئے۔ لیکن زیادہ تر فضا پر وہی بوجھل اور منحوس خاموشی چھائی رہی۔ کھانے کے بعد ہم وہاں ایک منٹ بھی نہ بیٹھ سکے اور پھر باہر نکل آئے۔ ڈاکٹر شفیق اب تک اپنے مریضوں کے دانت دیکھنے اور نکالنے میں مصروف تھا، اور اس کا باپ اس کتبے کے سامنے بیٹھا پائپ پی رہا تھا۔

میں نے سگریٹ سلگایا اور اس سے پوچھا۔ "گستاخی معاف۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کبھی آپ نے کوئی ایسا کام بھی کیا ہے جس کی بنا پر آپ پر مقدمہ چلایا گیا ہو یا چلایا جانے والا ہو۔"

اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "نہیں جناب، میں ذہنی یا مالی طور پر مفلس یا دیوالیہ نہیں ہوں کہ مجھ پر مقدمہ چلایا جائے۔ اپنا فقط ایک جرم یاد ہے۔ پچھلے سال شفیق کے لئے اپنے پتھروں کی کمائی سے یہ کار خریدی تھی جو سامنے کھڑی ہے۔ جب گھر میں کار آگئی تو میں نے بھی یونہی کبھی کبھی چلانی شروع کر دی۔ ڈرائیونگ کے معاملے میں بالکل اناڑی ہوں، کیونکہ سیکھی کسی سے نہیں۔ چنانچہ جی۔ پی او کے سامنے سپاہی کا اشارہ کاٹ گیا۔ وہ بغیر لائسنس کے گاڑی چلانے پر چالان کاٹنے لگا تو میں نے اسے پانچ روپے کی رشوت دی۔ بس یہ ایک رشوت کا جرم ہے جس پر مقدمہ چلایا جا سکتا ہے۔ اب تک تو چلا نہیں۔ آئندہ کا پتہ نہیں۔" یہ کہتے ہوئے وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔ ایک ٹین کا فوارہ لیا اور اپنے پودوں کو پانی دینا شروع کر دیا۔ کہنے لگا۔ "پتھروں کے بعد مجھے پھولوں سے عشق ہے گرمیوں میں دو دفعہ روزانہ پانی دیتا ہوں۔ اگر میں روزانہ پانی نہ دوں تو یہ مرجھا جاتے ہیں ۔۔ ہاں آپ رہتے کہاں ہیں؟" اس نے یک لخت سوال کیا۔

میں نے اسے بتایا کہ جہاں گپت روڈ انارکلی سے آکر ملتی ہے۔ وہیں میرا مکان ہے۔ اور پھر یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ "اب مجھے جانا چاہئے۔ ابھی آج کا دن ختم ہونے میں ایک گھنٹہ باقی ہے۔ میں اپنے آپ کو اپنے بیوی بچوں کو بہ حفاظت لوٹانا چاہتا ہوں۔" اتنا کہتے ہی میری ہنسی نکل گئی۔

اس نے کہا۔ "یہ ہنسنے کا مقام نہیں ہے۔ میں بڑا وہمی آدمی ہوں۔ آپ اب گھر جا رہے ہیں۔ رات کا وقت ہے اور کسی حادثے کا امکان ہے۔ ممکن ہے..... کیلے کے چھلکے پر پاؤں پھسل جائے اور آپ... یا بجلی کا تار ٹوٹ کر آپ پر آن گرے... یا... دنیا میں سب کچھ ممکن ہے۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ کم از کم بارہ بجے تک یہیں رہیں۔ آپ یہاں زیادہ محفوظ ہیں۔"

اس نے ان ممکنات کا ذکر اتنی سنجیدگی سے کیا کہ میں نے اندھیرے میں اوپر دیکھا۔ اور یوں لگا کہ جیسے موت آرہی ہے اور مجھے اپنی رگوں میں خون جمتا ہوا محسوس ہوا۔ عام حالات میں تو میں ایسی بکواس کو قہقہوں میں اڑا دیتا، مگر آج، صرف آج میں ان ممکنات سے بری طرح ڈر گیا تھا۔

اس نے اپنی بات پر اصرار کرتے ہوئے کہا۔ "چلو اٹھو۔ میں تمہیں نہیں جانے دوں گا۔ اوپر کمرے میں بیٹھ کر بڑے آرام سے پائپ پیتے ہیں۔ اور آپ کہیں گے تو چائے بھی پی لیں گے۔ اس وقت نوکر کو اٹھانا مناسب نہیں۔ ہم دونوں مل کر بنائیں گے۔ اگر آپ کہیں تو اپنی بڑھیا کو اٹھاؤں؟"

میں نے کہا: "نہیں، تکلیف نہ کیجئے۔" اور میں ایک بے جان شخص کی طرح اس کے ساتھ گھسٹتا ہوا اوپر چلا گیا۔

ہم یہاں ایک کمرے میں بیٹھے ہیں۔ بجلی کا پنکھا گھر گھر چل رہا ہے۔ وہ اپنی چھینیاں پتھر پر رگڑ رگڑ کر تیز کر رہا ہے اور ساتھ ہی پائپ بھی پی رہا ہے۔ میں کھڑکی کے پاس ایک میز پر بیٹھا یہ سطور لکھ رہا ہوں۔ میں زندگی اور موت کی جس کشمکش میں گرفتار ہوں، اس سے چھٹکارا پانے کے لئے خود بخود لکھنے بیٹھ گیا ہوں۔ حالانکہ میں لکھنے کا بہت چور ہوں۔

گیارہ بج کر دس منٹ ہو گئے ہیں۔ اور میرے میزبان نے اونگھنا شروع کر دیا ہے۔ یقیناً ایسے وقت میں کسی کو نیند نہیں آسکتی۔ شاید اسے

میری وجہ سے کوفت ہو رہی ہے۔ شاید وہ جلدی سونے کا عادی ہے۔ میں بھی عجیب آدمی ہوں۔ اپنی موت کے موہوم ڈر سے اس بیچارے کی تکلیف کا باعث بن گیا ہوں۔ کیا یہ میری بزدلی نہیں کہ ایک معمولی سے وسوسے کے پیش نظر یہاں پڑا ہوا ہوں، جبکہ بیوی بچے صبح سے میرے منتظر ہوں گے۔ تصورات حقیقت کا روپ نہیں دھار سکتے۔ نہیں نہیں، میری موت واقع نہیں ہوسکتی۔ میں مروں گا نہیں۔ اور اگر مروں گا بھی تو آج نہیں بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ میں یوں ہی خوف زدہ ہوں۔ شام سے اپنے ساتھ اس شریف آدمی کو بھی بلاوجہ تنگ کر رہا ہوں۔ میں اپنی فطرت کے اعتبار سے ہرگز بزدل نہیں ہوں۔ بارہ بجنے میں ابھی پون گھنٹہ باقی ہے۔ اب میں یہاں نہیں ٹھہروں گا۔ پون گھنٹے میں تو میں گھر پہنچ کر آرام سے لیٹ بھی جاؤں گا۔"

یہاں تک لکھنے کے بعد اس نے کاغذ کو تہ کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ اب خوف کی جگہ حوصلے نے لینی شروع کر دی تھی۔ وہ اپنے میزبان کو غنودگی میں دیکھ کر جلدی جلدی اٹھا اور چپکے سے باہر نکل گیا۔ وہ چلا جا رہا تھا۔ معمولی سے کھٹکے سے بھی اس کا دل لرزنے لگتا۔ مگر پھر کڑا کر لیتا۔ پھر موت کا بھوت اس پر حاوی ہو جاتا اور ہڈیوں میں رانگ سی پگھلتی ہوئی محسوس کرتا۔

اس کا میزبان یکایک غنودگی سے چونکا تو یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ اس کا مہمان اپنی جگہ پر نہیں ہے۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا اور گھر بھر میں اس کی تلاش شروع کر دی۔ وہ کہیں بھی نہ تھا۔

وہ سمجھ گیا کہ وہ اسے اونگھتا دیکھ کر چلا گیا ہے، اور یہی چیز وہ نہیں چاہتا تھا۔ اسے اس پر غصہ بھی آیا اور کچھ متفکر بھی ہوا۔ اسے یہ خوف تھا کہ کہیں واقعی وہ مر نہ جائے۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے اپنے آپ پر لعنت ملامت کی۔ کوتاہی اس کی اپنی تھی کہ اُسے بارہ بجے سے پہلے جانے دیا۔ اس نے سوچا، اور اگر خدانخواستہ وہ مر گیا تو ایک طرح سے میں اس کا ذمہ دار ہوں گا۔

اس خیال کے آتے ہی وہ کار کی طرف لپکا، گاڑی سڑک پر نکالی اور پوری رفتار سے چھوڑ دی۔ اس نے رفتار کچھ اور بڑھا دی۔ ایک آنکھ گاڑی کی رفتار پر تھی اور دوسری آنکھ گھڑی پر۔ وہ جلد از جلد اس تک پہنچ جانا چاہتا تھا، کیونکہ وہ اسے کم سے کم بارہ بجے تک اپنی آنکھوں کے سامنے رکھنا چاہتا تھا۔ گویا بارہ بجے تک وہ اس کے پاس خدا کی امانت تھی۔ اس نے رفتار اور بڑھا دی۔

وہ اسپتال روڈ والے موڑ سے طوفان کی سی تیزی سے مڑ رہا تھا کہ لمبے انسانی سائے کو بالکل گاڑی کی زد میں دیکھ کر اوسان خطا کر بیٹھا۔ اس نے ایک دم پوری طاقت سے بریکیں لگائیں۔ مگر ایک تیز لمبی انسانی چیخ بلند ہو کر مٹ بھی چکی تھی۔ اس کی کار کا شکار ہونے والا اس کا نیا نیا دوست تفضل حسین مصور تھا۔

وہ اسے موت کے چنگل سے نکالنے کے لئے گھر سے نکلا تھا۔ مگر خود اس کی موت کا باعث بن گیا تھا۔

قانون کی نظر اس دلیل پر نہ تھی، نہ ہو سکتی تھی۔ چنانچہ وہ اگلے دن ملزم کے کٹہرے پر اپنی موٹی موٹی بھدی انگلیاں رکھے کھڑا تھا۔ اور سامنے خلا میں بے جان آنکھوں سے گھور رہا تھا۔

نقش ادب کی خدمت کرتا ہے • آپ نقش کی سرپرستی کیجیے
نقش خریدیے • نقش میں اشتہار دیجیے
فرصت کے لمحات کا بہترین ساتھی ماہنامہ "نقش" کراچی

کشمیری لال ذاکر

بیسویں صدی دہلی

پھول اور داغ

میناکشی، سدھا اور میں بی اے فائنل میں ساتھ پڑھتے تھے. میں اپنے کھدر کے کرتے پاجامے، الجھے ہوئے بالوں اور اپنی کویتاؤں کی وجہ سے جنہیں میں ترنم سے پڑھتا تھا، ہر دلعزیز تھا. اور اسی وجہ سے کالج کے سبھی لڑکے لڑکیاں مجھے جانتے تھے. کالج کی کلچرل ایسوسی ایشن کا سکریٹری مجھے چنا گیا تھا. جوائنٹ سکریٹری سدھا کو. میناکشی ایک اچھی ایڈیٹر تھی اس لئے ہمارے ساتھ رہتی تھی. ہم تینوں کی ٹولی اکثر ساتھ ہی دیکھی جاتی تھی.

ایک بار جب پرنسپل سے جھگڑا ہو جانے پر کالج میں ہڑتال ہوئی تو میناکشی اور سدھا نے گیٹ پر کھڑے ہو کر کسی لڑکے کو کالج کے اندر داخل نہ ہونے دیا. ہڑتال کئی روز تک جاری رہی اور آخر پرنسپل کو ہم سے سمجھوتہ کرنا پڑا. سدھا کو میں جبھی سے جانتا ہوں. بڑے پختہ ارادے کی لڑکی تھی وہ. امتحان سے پہلے پریپریٹری کی چھٹیوں میں ہم دو ہی ایک بار مل سکے پھر پیپرز شروع ہو گئے اور کچھ دنوں کے بعد ختم بھی ہو گئے. جس دن امتحان ختم ہوا اسی شام میناکشی، سدھا اور میں، تینوں نے گارڈنز میں ساتھ چائے پی اور پھر ایک دوسرے سے خط و کتابت جاری رکھنے کا وعدہ کر کے جدا ہو گئے. کچھ دنوں کے بعد میناکشی کے خط آنے بند ہو گئے. معلوم ہوا اس کا بیاہ ہو گیا. اور وہ بھوپال چلی گئی. سدھا نے چنڈی گڑھ میں پوسٹ گریجویٹ ٹریننگ کالج میں داخلہ لے لیا. اس کے بعد سدھا سے چنڈی گڑھ میں دو ایک بار ملاقات ہوئی. ایک بار تو جب پنڈت نہرو چنڈی گڑھ گئے تھے. اور دوسری بار ایک نیوز پیپر ایڈیٹرز کانفرنس میں. دونوں ہی بار سدھا کا وقت میرے ساتھ گزرا تھا. اور ہم ایک دوسرے کے زیادہ قریب ہو گئے تھے.

جھیل کے کنارے کھڑی چھوٹی چھوٹی کشتیوں کو پانی میں تیرتے ہوئے دیکھ کر سدھا نے پوچھا تھا.

"اس جھیل میں، اور ڈل جھیل میں کیا فرق ہے؟"

"وہی جو تصنع اور حقیقت میں."

"کیسے؟"

"یہ بتانا مشکل ہے."

"لیکن اپنی بات تو سمجھاؤ."

"اس جھیل کو باندھ لگا کر بنایا گیا ہے لیکن ڈل نے اپنے پھیلاؤ کو وسیع کرنے کے لئے باندھ توڑے ہیں." میں نے جواب دیا.

"تو تم باندھ توڑنے ہی میں وشواس رکھتے ہو؟"

"نہیں باندھنے میں بھی."

"اگر کوئی بندھنا نہ چاہے؟" سدھا نے پوچھا۔

"تو ٹوٹ سکتا ہے۔"

اشاروں میں کہی گئی باتیں سدھا بھی سمجھ رہی تھی اور میں بھی۔ اور جب میں دو دن چنڈی گڑھ کی کشادہ سڑکوں پر سدھا کے ساتھ گھوم کر، بائیس کی بھیڑ کا جشن دیکھ کر دہلی واپس آگیا تو سدھا نے لکھا۔

"تمہارے جانے کے بعد میں نے جھیل پر جانا چھوڑ دیا ہے۔ کبھی موقع ملا تو تمہارے ساتھ ڈل دیکھنے چلوں گی۔ جب تک باندھ باندھتے جاؤ، میرا سہوگ ساتھ رہے گا۔"

میں دس نئے پیسے کے اس لفافے کو کئی دن تک پتلون کی جیب میں ڈالے گھومتا رہا۔ جب کپڑے بدلتا، لفافے کو پتلون کی جیب سے نکال کر دھلی ہو پتلون کی جیب میں ڈال لیتا۔

دوسری بار جب میں چنڈی گڑھ گیا تو سدھا کے پیپرز ہو رہے تھے۔ میں نے اُسے ڈسٹرب نہیں کیا۔ صرف ایک ہی بار اُس سے ملنے گیا، کچھ ہی لمحے ایک ساتھ رہے۔ زیادہ باتیں نہ ہو سکیں۔

"امتحان کے بعد کہاں جا رہی ہو؟"

"گھر واپس جاؤں گی۔"

"گھر جا کر کیا کرو گی؟"

"سروس کروں گی۔"

"تم یہاں جرنلزم کا ڈپلوما کیوں نہیں کر لیتیں؟"

"مجھے جرنلزم بہت پسند ہے۔ لیکن میرے پتا اس پر راضی نہیں ـــ سدھا نے کہا۔

"تم انہیں منانے کی کوشش کرو۔"

"اس کی کیا ضرورت ہے! تم جرنلزم کر ہی رہے ہو۔ بس تمہاری شاگردی اختیار کر لوں گی۔"

"میری شاگردی کر کے پاس نہ ہو سکو گی۔"

اتنے میں اُس کی ایک کلاس میٹ آگئی اور بات کا رخ بدل گیا۔ اور پھر وہ مجھے ہاسٹل کے گیٹ تک چھوڑنے آئی۔ واپس جانے سے پہلے اُس نے کہا۔

"ہم دونوں مل کر ایک اخبار نکالیں گے۔"

"لیکن میرے پاس روپے نہیں ہیں۔"

"اُس کا انتظام بھی ہو جائے گا۔" اُس نے جواب دیا۔

"تو چنڈی گڑھ سے واپس جا کر اپنے بارے میں مجھے ضرور لکھنا۔" میں نے کہا۔

"لکھوں گی۔"

اور پھر سدھا نے بہت تپاک سے ہاتھ ملایا اور دو ایک بار مڑ کر مجھے دیکھتے ہوئے ہاسٹل کے اندر چلی گئی۔

میں ایڈیٹرز کانفرنس میں شامل ہونے کے بعد واپس آگیا اور اخباروں کے لئے خبریں تلاش کرنے کے لئے دہلی کی گلیوں میں، بازاروں میں اور دوسری جگہوں میں گھومتا رہا۔ خبریں جمع کرنا کتنا مشکل کام ہے، یہ مجھے جب معلوم ہوا۔ کندھے سے کیمرہ لٹکائے، جیب میں نوٹ بک لئے، میں دہلی کی سڑکیں ناپتا رہتا۔ چنا ماکے سگریٹ پیتا اور کڑوی کسیلی کافی کے گھونٹ لے لیکر دماغ کھپاتا رہتا۔ جب کسی کالم میں میری بھیجی ہوئی خبر چھپتی تو دل بہت خوش ہوتا۔ جہاں

کہیں کوئی اچھی تصویر یا اچھا آرٹیکل چھپا ہوا نظر آتا تو میں اس کی کٹنگ سدھا کو بھیج دیتا۔

کچھ دن سُدھا گھر میں بیٹھی رزلٹ کا انتظار کرتی رہی اور جس دن رزلٹ کا اعلان ہوا میں نے اُسے مبارک باد کا تار دیا۔ کچھ دنوں کے بعد سدھا نے اطلاع دی کہ وہ ہائر سیکنڈری اسکول میں کام کرنے لگی ہے۔ اور جب اسے تنخواہ ملی تو اس نے مجھے بلایا۔ وہ مجھے اسٹیشن پر لینے آئی اور میرے انکار کرنے پر بھی وہ مجھے اپنے گھر لے گئی جو دو دن میں نے سدھا کے گھر گزارے، وہ مجھے ہمیشہ یاد رہیں گے۔ اس نے میرے اعزاز میں ایک بہت بڑی پارٹی کی، اپنی کئی سہیلیوں کو بلایا اور مجھ سے کویتائیں سُنیں۔ دو دن کے بعد جب وہ مجھے بس پر چھوڑنے آئی تو ایک بنڈل میری طرف بڑھاتے ہوئے اس نے کہا۔

"اگلی بار جب آؤ تو یہ سوٹ سلوا کر آنا۔ ٹائی اپنی مرضی کی لینا۔ اس لئے کہ میں تم پر اپنی پسند ٹھونسنا نہیں چاہتی۔"

"لیکن اس کی سلائی کے لئے پیسے کہاں سے آئیں گے؟"

"بل میرے پاس بھیج دینا۔" اُس نے کہا۔

اور پھر ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور اس کے سنہرے بال اُس کے چہرے پر لہرا گئے۔ اور پھر بس کا ہارن ہوا اور میں بس میں بیٹھ گیا۔

وہ سڑک پر ایک سایہ دار درخت کی طرح کھڑی اپنے آنچل کی چھاؤں دور تک پھیلاتی رہی۔

یوتھ فیسٹیول دیکھنے سُدھا دہلی آئی۔ ٹھہری تو وہ اپنے کسی رشتہ دار کے یہاں تھی لیکن اس کا بیشتر وقت میرے ساتھ ہی گزرتا تھا۔ میں اُسے اپنے ساتھ پریس کا پاس جیب میں ڈالے تال کٹورہ گارڈنز لے گیا اور دیش کے مختلف حصوں سے آئے ہوئے طلباء اور طالبات سے ملاتا رہا۔ سُدھا بہت خوش تھی۔ اس کی ہلکے سبز رنگ کی ساڑی کا پلّو ہوا میں لہراتا تو اُس کا دراز قد اور بھی خوبصورت معلوم ہوتا۔ اُس کے گورے ماتھے پر بکھرے ہوئے بال اُسے اور خوبصورت بنا دیتے۔ اُس کی آنکھوں میں کاجل کی لکیر اور ہونٹوں پر لگی لپ اسٹک کا شیڈ بہت پیارا معلوم ہوتا۔ کھدر کے پاجامے کرتے اور چپل میں دیکھ کر اُس نے مجھے ٹوک دیا۔

"جنہیں کھنڈروں میں رہنے کی عادت پڑ جائے وہ محلوں میں نہیں رہ سکتے۔"

"ٹھیک ہی کہتا ہوں۔"

"اور نہیں تو کیا؟ اچھا بھلا سوٹ سلوایا ہے لیکن پہنو گے وہی چار آنے گز والا کھدر۔"

اور میں نے اُسے فیض کا یہ شعر سنایا ؎

نہ آج لطف کر اتنا کہ کل گزر نہ سکے وہ رات جو کہ ترے گیسوؤں کی رات نہیں

یوں گھومتے پھرتے ہم کناٹ پلیس پہنچے اور لا بوہیم کے نیم اندھیرے کونے میں بیٹھے گرم گرم کافی کے ہلکے ہلکے سپ لیتے رہے۔

"تو کب آ رہے ہو مجھ سے ملنے؟"

"اب شاید جلد نہ آ سکوں۔"

"کیوں؟"

"تمہارے گھر والوں سے ڈر لگتا ہے۔"

"میں سمجھتی تھی مجھ سے ڈر لگتا ہے۔"

"وہ وقت ابھی نہیں آیا۔"

"تم نے ابھی تک مجھے وہ کمرہ تو دکھایا ہی نہیں جہاں تم رہتے ہو؟" اُس نے اچانک ہی موضوع بدل دیا۔

"چلو دکھا دوں۔"

پھر سدھا لالو ہیم کے رومانٹک ماحول سے نکل کر پہاڑ گنج کی ایک گھٹیا سی بستی میں میرا گھر دیکھنے چلی آئی۔ کمرے کے اندر قدم رکھتے ہی اُس نے کہا۔

"تو تم یہاں رہتے ہو؟" پل بھر کو رک کر وہ پھر بولی۔ "اس ماحول میں رہ کر ایسی ہی باتیں کی جا سکتی ہیں، جیسی تم کرتے ہو۔"

"یہ لوگ جو آس پاس کی جھونپڑیوں میں رہتے ہیں، مجھے کتنا پیار کرتے ہیں، اس کا اندازہ تم نہیں کر سکتیں۔"

"کیوں شیخی بگھارتے ہو۔ میں جانتی ہوں جتنے تیس مار خاں ہو تم!"

"وہ تو میں بھی جانتا ہوں۔" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

"پانی پلا سکتے ہو؟"

میں نے کمرے کے اندر ادھر اُدھر دیکھا۔ نہ صراحی تھی نہ گلاس۔

"ٹھہرو میں ابھی لاتا ہوں پانی۔"

"بس رہنے دو۔ حال تو تمہارا یہ ہے اور خواب دیکھتے ہو شہزادیوں کے۔" اور سدھا نے اپنا ہاتھ میرے کندھے پر رکھ کر مجھے اور قریب کر لیا مجھے محسوس ہوا جیسے واقعی کسی شہزادی نے مجھے اپنے آنچل میں باندھ لیا ہو۔

اُسی دن رات کی گاڑی سے سدھا واپس چلی گئی۔

لگ بھگ ایک سال گذر گیا۔

اس دوران میں دو ایک ملاقاتیں ہوئیں اور ہم دھیرے دھیرے اپنے احساسات کے باندھ باندھنے لگے، جن میں پیار کا ساگر ہلکورے لے رہا تھا ہم ایک باہمی سمجھوتے پر پہنچ گئے تھے، اسی لئے اب رسمی باتیں نہیں ہوتی تھیں۔ ایک دن اچانک مینا کشی سے ملاقات ہو گئی۔ وہ اپنے بھائی کے ساتھ شانتی گھاٹ جا رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر ٹھٹکی، پل بھر کو پہچانا اور پھر خوشی سے کھل اٹھی۔

"اب تو آپ پورے لیڈر بن گئے ہیں۔ یہ میرا بھائی دیریندر ہے۔ اندور کے میڈیکل کالج میں پڑھ رہا ہے۔ ہم دونوں مسکرا دیئے۔ ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا اور پھر ہم تینوں شانتی گھاٹ چلے گئے۔ سب نے نہرو جی کی سمادھی پر پھول چڑھائے اور کچھ لمحے خاموش رہ کر انہیں شردھانجلی پیش کی اور پھر واپس ہوئے۔ میں نے مینا کشی اور دیریندر کو رات کے کھانے کی دعوت دی۔ وانگا میں کھانے کی میز پر بیٹھتے ہوئے مینا کشی نے کہا۔

"آپ کو میں بہت دنوں سے تلاش کر رہی تھی۔ سدھا کہاں ہے آج کل ـــ کبھی ملاقات ہوئی ہے؟"

"دو ایک بار ملا ہوں۔"

"بہت ہی پیاری لڑکی ہے۔"

"جی!" میں نے جواب دیا۔

"دیدی نے اُس کی تعریفیں کر کر کے مجھے دیوانہ بنا ڈالا ہے۔" دیریندر مسکراتے ہوئے بولا۔ "بس ایک جھلک دکھا دو اُس کی۔" وہ میناکشی سے مخاطب ہوا۔

"بڑے اتاولے ہو رہے ہو۔" اس نے پیار بھری جھڑکی دی۔ دیریندر چپ ہو گیا۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔

"پردیپ صاحب چلو سدھا سے مل آئیں۔ میں چاہتی ہوں سدھا کو اپنی بنا لوں۔"

میں نے میناکشی کی بات سنی اور ٹھنڈی آئسکریم کو زبان پر پھیرتے ہوئے سوچنے لگا، اسے کیا جواب دوں۔ اس سے یہ کہنا کہ سدھا اور میں اپنے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کر چکے ہیں، اچھا نہ معلوم ہوا۔ میں کیوں کہوں اس سلسلے میں کچھ؟ دونوں بہن بھائی کو لے چلتا ہوں۔ سدھا کے گھر۔ خود ہی جان جائیں گے ساری بات۔

اگلی صبح پہلی بس سے چلنے کا فیصلہ ہوا۔ اس رات میں پہاڑ گنج کی گھٹیا سی بستی میں اپنے چھوٹے سے اندھیرے کمرے میں لیٹا تاج محل بنانے کے خواب دیکھتا رہا۔ دوسرے دن دوپہر کو ہم سدھا کے گھر پہنچ گئے۔ میں بیان نہیں کر سکتا۔ سُدھا کتنی خوبصورت معلوم ہو رہی تھی۔ جب وہ اور میناکشی گلے ملیں تو تین برس پہلے کے زمانے نظروں میں گھوم گئے۔ میناکشی کو میں نے اُس وقت دھیان سے دیکھا اور جانا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔

کئی گھنٹے گزر گئے۔ لیکن ہم باتیں کرتے کرتے تھکے ہی نہیں۔ سُدھا مجھ سے بہت محبت سے پیش آ رہی تھی مجھے میری بے پروائی پر جھڑک رہی تھی۔ وہ اپنا خیال رکھنے کو کہہ رہی تھی۔ اس نے جی بھر میری تعریفیں کیں اور مجھ سے تازہ کویتائیں سنیں۔ لیکن میں پریشان تھا۔ میں چاہتا تھا کہ سُدھا کو ذرا الگ لے جا کر کہہ دوں کہ میناکشی کس لئے آئی ہے تاکہ وہ اُسے ایک ہی بار جواب دے کر سارا جھگڑا ختم کر دے۔ لیکن موقع ہی نہ ملا۔ سُدھا کی ماں بھی بہت خوش تھی۔ اُس نے ہمیں بہت اچھا کھانا کھلایا، کریم کافی پلائی اور میناکشی کے ماتا پتا اور پتی کے بارے میں پوچھتی رہی۔ ویریندر تو واقعی دیوانہ ہو رہا تھا۔ ٹکٹکی باندھے دیکھے جا رہا تھا سدھا کو جیسے اس کی تصویر من میں بسا رہا ہو۔ میناکشی کی حالت دوسری تھی۔ اس نے شاید محسوس کر لیا تھا کہ سدھا اپنے بارے میں فیصلہ کر چکی ہے اور اب ویریندر کے بارے میں بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس لئے اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ویریندر کے بارے میں کوئی بات کئے بغیر ہی واپس چلی جائے گی۔

سدھا شام کو ہمیں سیر کرانے لے گئی۔ شہر کی کئی جگہیں دکھائیں، جن میں ایک مندر بھی تھا جس کی مورتیاں بہت خوبصورت تھیں۔ مجھے اب بھی کبھی کبھی اُن مورتیوں کی یاد آ جاتی ہے۔ سدھا کا زیادہ وقت میرے ہی بارے میں باتیں کرتے گزرا۔ اُس نے میرے بھیجے ہوئے کئی تراشوں کی تعریف کی، حالانکہ پچھلے چھ مہینوں سے میری اس سے ملاقات نہ ہوئی تھی۔ خط و کتابت کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا تھا۔

رات کو ہم دیر تک جاگتے رہے اور تاش کھیلتے رہے۔ مجھے کئی بار ایسا محسوس ہوا کہ ویریندر اشاروں ہی اشاروں میں میناکشی کو سدھا کی ماں سے بات کرنے کو کہتا تھا۔ لیکن وہ ہر بار ٹال جاتی تھی۔ ویریندر کی عجیب حالت تھی۔ وہ تاش میں ہار رہا تھا۔ اور ذہنی طور پر اتنا الجھا ہوا تھا کہ بُری کھیلے ہوئے اُس نے کئی بار جوکر ہی پھینک دیئے۔ سونے سے پہلے میناکشی نے سدھا سے کہا۔

"کبھی بھوپال آؤ۔ بہت اچھی جگہ ہے۔"

"اندور اُس سے بھی اچھی جگہ ہے۔" ویریندر بولا۔

"بھوپال گئی تو اندور ضرور آؤں گی۔" سدھا نے جواب دیا اور مسکرا دی اور اس کی آنکھوں کے چراغ اور بھی روشن ہو گئے۔

"آپ بھی آیئے گا پردیپ صاحب۔ آپ کے آنے پر ایک کوی سمّیلن کا بھی انتظام کریں گے۔" ویریندر بولا۔

"ضرور آؤں گا۔"

اور پھر رات نے اپنی سیاہ چادر تان کر سب کو خاموش کر دیا۔ سب سو گئے۔ میں بھی سونے کی کوشش میں آدھی رات تک جاگتا رہا۔ اور میری نگاہوں کے سامنے وہ باندھ بندھتے گئے۔ جن میں ڈل کی لہروں میں جھومتے ہوئے کنول لہلہا رہے تھے۔

اگلی صبح ہمیں پہلی بس سے دہلی جانا تھا۔ جلدی سے نہا دھو کر ناشتہ کیا اور بس اسٹینڈ کی طرف چل دیئے۔ میناکشی، ویریندر، سُدھا اور میں۔ ویریندر میناکشی کے ساتھ چل رہا تھا اور دھیرے دھیرے اس سے کچھ کہہ بھی رہا تھا۔

"ویریندر بھیّا تمہارے کان میں کیا کہہ رہے ہیں؟" سُدھا نے بڑی چنچلتا سے پوچھا۔

"کچھ نہیں، ویسے ہی بات کر رہا ہے۔"

"تم نے بہت دنوں سے کوئی کٹنگ نہیں بھیجی۔" سدھا مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "اب کی جا کر ضرور بھیجنا۔"

"بھیجوں گا۔" میں نے جواب دیا اور پل بھر کو سدھا کی طرف دیکھا۔

اُس کے مسکراتے ہوئے ہونٹ کتنے پیارے معلوم ہو رہے تھے۔

بس اسٹینڈ پر پہنچ کر میں بس کے ٹکٹ لینے لگا۔ سدھا اپنی ماں سے بات کرنے لگی اور دیریندر میناکشی سے۔

"نہیں رہنے دو مینا۔" میناکشی دیریندر سے کہہ رہی تھی۔

"کیا بات ہے بیٹی؟" سدھا کی ماں نے میناکشی سے پوچھا۔

"کچھ نہیں ماں جی!"

"نہیں وہ کچھ کہنا چاہتا ہے اور تم اُسے روک رہی ہو۔ کہو بیٹا کیا بات ہے؟" سدھا کی ماں میناکشی سے بات کر چکنے کے بعد دیریندر سے مخاطب ہوئی۔ دیریندر کا چہرہ ایکدم سُرخ ہو گیا۔

میناکشی نے میری طرف دیکھا جیسے میرا مشورہ چاہتی ہو۔

"ہاں بات کر لو، کیا ہرج ہے؟" میں نے کہا اور سوچا میناکشی جب اتنی دور سے آئی ہے تو بات بھی کر لے۔ کسی کے دل میں غلط فہمی نہ رہے

میناکشی سُدھا کی ماں کو ایک طرف لے جا کر بات کرنے لگی۔ میں اور سُدھا آمنے سامنے کھڑے ایک دوسرے کو تک رہے تھے۔

"آپ بھی آجایئے پردیپ صاحب۔" میناکشی نے مجھے اشارہ کیا۔

"آپ انہی سے پوچھ لیں دیریندر کے بارے میں۔" میرے نزدیک آجانے پر اُس نے سدھا کی ماں سے کہا۔

"نہیں اِس میں پوچھنے کی کیا بات ہے؟" ماں نے جواب دیا۔

"سدھا اور میں پرانی دوست ہیں۔ میں اسے اپنی بھابی بنا کر سدا کے لئے اپنے پاس لے جانا چاہتی ہوں۔" میناکشی کہہ رہی تھی۔

"لیکن تم نے دیر کر دی بیٹی۔ میں تو سدھا کی بات پکی کر چکی ہوں۔" ماں کی بات سنکر میناکشی نے میری طرف یوں دیکھا جیسے میں بہت بڑا مجرم ہوں۔

"کہاں کی ہے بات؟" میناکشی نے پوچھا۔

میں نے دیکھا اس لمحہ دیریندر سدھا کے قریب ہو کر اُس سے کچھ کہہ رہا تھا۔

"ایک انجینئر ہے۔ ابھی ابھی امریکہ سے ہو کر آیا ہے۔" سُدھا کی ماں نے بہت فخر سے یہ بات کہی۔ اس کا لہجہ اونچا اور وزنی تھا۔ اور مجھے محسوس ہوا کہ آج، میں نے جتنے باندھ بنائے تھے وہ سب ایکدم ٹوٹ گئے اور ڈوں کا بے شمار پانی میری طرف بڑھتا چلا آرہا ہے اور ایک اونچی چوٹی پر سُدھا کھڑی ہے۔ ایکدم محفوظ! اور باندھ کے بچے ہوئے حصّے کی مٹی اپنے پاؤں سے کُرید کُرید کر نیچے بہتے ہوئے پانی میں گرائے جا رہی ہے اور اُس کی نظر پانی میں دھنسے اپنے پاؤں کے انگوٹھے پر جمی ہیں۔

اسی لمحہ بس کا ہارن ہوا اور میں نے ایک آخری کانپتی ہوئی نظر سُدھا پر ڈالی۔ اُس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ میناکشی، دیریندر اور میں بس میں بیٹھ گئے۔ لیکن سدھا پھر پلکیں اُوپر نہ اٹھا سکی۔

بس اسٹارٹ ہو گئی۔ میناکشی اور دیریندر پچھلی سیٹ پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ میناکشی کے لہجے میں تلخی اور دیریندر کی آواز میں بے بسی تھی۔ اور میں اُن سے اگلی سیٹ پر بیٹھا کھڑکی کے ساتھ کہنی ٹکائے یہ محسوس کر رہا تھا جیسے مجھ پر فالج گر گیا ہو۔ اور مجھے اپنے ایک جرنلسٹ دوست نردتم کے الفاظ یاد آرہے تھے۔

"تم کسی عورت کو اپنی کویتاؤں کے رنگوں اور کلپنا کی سُندرتا سے نہیں جیت سکتے۔ عورت کے سامنے جب زندگی گزارنے کا سوال آتا ہے تو وہ تاج محل کی تخلیق کر سکنے والے ایک مہان کلاکار کی نسبت اُس معمولی سے آدمی کو ترجیح دیتی ہے جس کے پاس سو گز مے ہیں۔ اور جن پر مٹی ڈھو کر وہ شام کو کھنکتے ہوئے سکّے اُس کے قدموں میں ڈال سکتا ہے۔"

لیکن کیا سُدھا بھی ایسی ہی ایک عورت ہے؟

یہاں پہنچ کر میری سوچ رُک گئی!!

نیا دَور. کراچی

نہ ابوالحسن

من کا موتی

آج پھر آسمان ابر آلود تھا اور صبح کے آثار دُور دُور تک مفقود۔
لیمپ کی مدھم روشنی میں دیوار پر رقصاں پرچھائیاں والہانہ، بے تابانہ شدت کی مظہر۔
شیام نے برساتی اوڑھ لی اور کیبن سے باہر نکل گیا۔

جب وہ پہلے پہل یہاں آیا تو اس اجاڑ بے رونق قصبے کی خاموشی اور سکوت سے بے حد خائف تھا مگر گزرتے ہوئے دنوں نے اسے
[illegible] بسنے والوں اور یہاں کی ویرانیوں سے بڑی حد تک مانوس کر دیا۔ یہاں جو کچھ بھی تھا اب شیام کی زندگی کا ایک حصہ بن چکا تھا۔ نھی منی
[illegible] کاریاں فصل کے بوتے پہ پلنے والے کسان۔ محنت کش لوگ۔ ہفتے میں ایک بار بھرنے والا پُر رونق بازار، کنوئیں۔ کھیت، مویشی اور وہ ریلوے
[illegible] جس کی بدولت وہ یہاں آیا۔

اس لائن پہ عموماً مال گاڑیاں گزرا کرتیں۔ ایکسپریس ادھر کبھی نہ آتی۔ البتہ چوبیس گھنٹوں میں دو پسنجر ٹرینیں گذرتیں کسی سست کاہل وجود
[illegible] رح اور شیام کے لئے اس ٹرین کی آمد کا وقفہ بہرحال زندگی کا ہوتا۔ تھوڑی دیر کے لئے قصبے کی سنسان فضا میں گہما گہمی جاگ پڑتی۔ نئے
[illegible] ے، نئے لوگ۔ اپنی شخصیتوں میں دنیا بھر کے تضادات سمیٹے۔ پھر جب ٹرین چلی جاتی پہلے سے چوگنی اداسی اور سناٹا فضا پر محیط ہو جاتا۔
[illegible] نے اسٹیشن پر راجو کی مسکراہٹ بکھری رہ جاتی۔ اور شیام اس مسکراہٹ سے قوت پانے کی بجائے چڑ کر سوچتا۔

ایک انسان ہر وقت کس طرح مسکرا سکتا ہے۔ لیکن راجو کو تو جیسے مسکرانے کا مرض تھا۔ اس وقت بھی جب وہ مشقت طلب کام
[illegible] تا ہوتا جب کوئی اس کی تعریف کر رہا ہوتا اور اس وقت بھی جب اسے گالیاں اور ڈانٹ پھٹکار مل رہی ہوتی۔

مسکراہٹ راجو کے وجود کا ایک اہم حصہ تھی اور شیام نہیں جان سکا تھا اس مسکراہٹ کے پیچھے اصل میں ہے کیا۔ کامیابیوں کی شدت
[illegible] دل کی محرومی یا حالات سے سمجھوتے کا گہرا ناگزیر احساس۔

بہرحال اس نے کبھی راجو کو ضرورت سے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ کبھی اسے اپنے دل کی باتیں نہیں بتائیں۔ کبھی خود اس کے دل کی باتیں
[illegible] ہیں۔ البتہ یہ کوشش ضرور کی کہ قصبے کی تین چار سو مکانات پر مشتمل آبادی میں سے کچھ دوست اپنے لئے چن لے۔ مگر مزاجوں کے اختلافات
[illegible] ے دُور دھکیل دیا۔ اور اس نے اس خواہش کو بالکل ہی دل سے نکال کر رنگوں اور کتابوں سے دوستی کر لی۔

جب برش اس کے ہاتھ میں ہوتا یا کتاب آنکھوں کے آگے تو وقت کا کچھ پتہ ہی نہ چلتا۔ حتیٰ کہ پورٹر راجو اسے یاد دلاتا

" صاحب گاڑی آنے کا ٹائم ہو رہا ہے" یا "صاحب کھانا سوکھ رہا ہے۔ چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے"۔

وہ چونک کر راجو کی طرف متوجہ ہو جاتا۔ اگرچہ کہ وہ راجو کی ان باتوں کا عادی ہو چکا تھا مگر۔ چونکنا اس کی مستقل عادت بن چکی تھی۔ عادت کا رشتہ سردی کی اُس ابر آلود صبح سے ملتا تھا اور جب ابھی پو پھٹی نہ تھی۔ بادلوں کا رنگ گہرا گلابی تھا۔ اور پسنجر ٹرین کچھوے کی طرح اسٹیشن کی حدود میں داخل ہوئی تھی وہ حسب دستور جھنڈی ہلا رہا تھا کہ اچانک چونک پڑا۔

کسی ناقابل یقین واقعے کی اچانک ظہور پذیر حادثے کی طرح ایک لہر سر تا پا قدم اسے جھنجوڑ گئی۔ اُس نے آنکھیں مل کر دیکھا۔ وہ جا تو پھر ایسا غیر معمولی حسن، ایسا پر کشش وجود۔۔؟؟

لڑکی ڈبے سے اتر کر ویٹنگ روم میں داخل ہوئی۔ اور شیام نے مضطربانہ دیکھا۔ آرام کرسی میں دراز سفر کی تکان کے باوجود وہ ا کی طرح حسین اور رنظر نواز تھی جو اپنے دیکھنے والے کو بھرپور سچائی اور رقوت کا احساس بخشے۔

" شیام۔۔؟" دل نے اسے پکارا۔" اسے روک لے۔ اُسے روک لے۔" مگر سارا عرصہ ایک اندوہناک کش مکش میں گذر گیا اور ڈبے میں جا بیٹھی۔ ٹرین اپنے پیچھے پھیلی ہوئی پٹڑی چھوڑ کر گھنے پیچ دار جنگل میں گم ہو گئی اور وہ اپنی جگہ ساکت کھڑا دیکھتا رہ گیا۔ اب کیا ہو سکتا۔ کیا ہو سکتا ہے۔۔!! جب وہ گھر بار ماں باپ، دوست احباب اور شہر کی رنگین قیامت خیز زندگی چھوڑ کر اس دور افتادہ قصبے میں آیا تھا۔ تب اس کی آنکھوں میں نہیں آئے تھے۔ مگر اب۔۔؟ اس لمحے۔۔؟؟

جانے پھر یہ گھڑی آئے کہ نہیں۔۔! زندگی کی یہ بیش بہا خوبصورت ساعت!! ساعتیں جو ذرا سی غفلت پر مچھلیوں کی طرح گرفت سے نکل کر وقت کے گہرے سمندر میں کھو جاتی ہیں۔ اور آدمی ساحل پر کھڑا انہیں ڈھونڈتا رہ جاتا ہے۔۔!!!

اُسے اپنی کم ہمتی پر غصہ آنے لگا۔

اتنی دیر۔ ایسے اہم فیصلے میں اتنی دیر۔۔؟؟۔ آنسو اس کی ہستی میں جذب ہوتے رہے اور صبر کے گہرے غار تلے امید کی ڈور تھامے قدم بڑھتا رہا۔

شاید ایک دن یہ لمحہ پھر آ جائے۔

یہ قیمتی ساعت۔۔ اور شکست، ہمت بن کر اس کے وجود میں سما گئی۔ انتظار۔! انتظار۔! انتظار۔۔!!!

زندگی کے ان بے چین ترین دنوں میں بڑی خواہش اور محنت سے اس نے ایک تصویر بنائی۔ ایک ایک خط۔ ایک ایک نقش۔ ایک ایک طرح ابھر آئی کہ راجو گھبرا کر بولا۔

" معلوم ہوتا ہے صاحب یہ تصویر ابھی بول پڑے گی"۔ پھر راجو نے بڑے رازدارانہ انداز میں شیام سے کہا۔ "صاحب میری اماں کہتی تھی۔ حسین عورت کی طرف کبھی نظر نہ اٹھانا اس کے بھیس میں بھوت پریت اور چڑیلیں رہ سکتی ہیں"۔

" پاگل"۔ شیام نے اُسے گھور کر دیکھا تھا۔ اُسے وہ وقت گذرے ہوئے کل کی طرح یاد تھا جب یہی چہرہ، یہی جسم اس سے چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ زندہ اور متحرک۔ تب سے اب تک گرمی ہو یا برسات یا کڑکتا جاڑا وہ پسنجر ٹرین کا اسی طرح استقبال کرتا جیسے کوئی مفلس کسی بخشش دینے والی حیثیت پر تپاک شخصیت کا۔

" رادھے۔ رادھے"۔ اس نے من ہی من میں کئی بار اُسے پکارا تھا۔ جانے تیرا اصلی نام کیا ہو۔ تیرا اتا پتہ کیا۔"

اور زندگی کے لہلہاتے بیس برس آناً فاناً آگے بڑھ گئے تھے۔ تندرو بگولوں کی طرح اور راجو اُسے یاد دلاتا رہا تھا۔" بابو صاحب۔ بابو صا لیکن شیام کو یقین تھا وہ ضرور لوٹے گی۔

رات کتنی ہی کالی سہی، کتنی ہی بھیانک ڈراؤنی سہی، صبح کا ہونا یقینی تھا۔ اور مدتوں بعد آج پھر آسمان ابر آلود تھا، بادلوں کا رنگ گلابی اور صبح بے حد عجیب اور مبہم۔ سپر ٹرین آنے میں کل پچیس منٹ۔۔۔!!

شیام نے یہ پچیس منٹ پچیس گھنٹوں، پچیس سالوں کی طرح کاٹے۔ پھر جب ٹرین تھم گئی تو اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں۔ صبح مسکرا رہی تھی۔ وہ دوڑ کر ڈبے سے اترتی ہوئی لڑکی کے پاس چلا گیا۔ اچانک ہی ہمت کر کے اس نے لڑکی کی کلائی تھام لی۔ رادھے۔؟

لڑکی نے گھوم کر اسے دیکھا پھر ایک ہلکی سی چیخ مار کر خوفزدہ سی دوبارہ ڈبے کی طرف بھاگی۔ لڑکی کی کلائی کا گداز اس کی کھردری ہتھیلی میں کی طرح سرسراتا رہ گیا۔ شیام نے اپنا ہاتھ دیکھا اور دفعتاً اس نے محسوس کیا وہ بوڑھا ہو چکا ہے۔ قابل غور حد تک بوڑھا۔

اس کے سخت کھردرے ہاتھ پر نیلی رگیں ابھر آئی تھیں۔ شکنوں بھری جلد مرجھا چکی۔ اور مضبوط سڈول انگلیاں عمر کی ضربوں سے گٹھوں طرح سخت اور گٹھیلی ہو گئی تھیں۔

بڑی ندامت بڑی شرمساری سے اس نے مجرموں کی طرح نظر اٹھائی۔ لڑکی ایک عورت کے سینے سے لپٹی کانپ رہی تھی۔ شیام کی نظریں ۔۔ کر رہ گئیں۔

"نہیں نہیں۔" اس نے آنکھیں مل کر دیکھا۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ لیکن دو بعینہ ایک جیسی شکلیں چند قدم کے فاصلے پر اس کے سامنے تھیں۔ ایک وہ شکل جو بیس سال قبل شیام نے دیکھی اور اب تک جوں کی توں دنیا سے بچا کر اپنے حافظے میں محفوظ رکھی اور ایک وہ جس پر سے ۔۔اس کی اپنی طرح تھم تھم گزر چکا تھا۔ جلد یا بدیر، اب وہ کسے پکارے۔ کسے آواز دے؟؟ حسن کو، شباب کو یا اس چہرے اس جذبے کو جس بیس سال تک مسلسل پرستش کرنے عمر کے ایک ایک پل ایک ایک لمحے اپنی جان کی طرح حفاظت کرنے کا وہ خود ذمہ دار تھا۔

بیس سال تک محض ایک چہرے کی حفاظت کرنا کوئی معمولی بات تو نہیں شیام۔۔؟ اس نے خود کو ٹٹولا۔ دنیا کی لذتوں سے خود کو بچا کر گزرنے کا اب بتا تو کیا چاہتا ہے۔؟ اس نے اپنے کانپتے وجود کو دیوار سے ٹک کر سہارا دیا۔ اسی وقت وہ دونوں آہستہ آہستہ چلتی ہوئیں اس کے پاس سے گزر گئیں۔

راجو انہیں کیبن میں لے گیا۔

راجو نے دھڑکتے ہوئے دل سے دیکھا، تصویر کو پھر لڑکی پھر بوڑھی عورت کو اور آواز اس کے حلق میں اٹک گئی۔

"چائے۔ مکھن۔ ٹوسٹ میم صاحب" جیسے اس نے خود سے کہا خود سنا اور الٹے قدموں باہر نکل گیا۔ ایسی غیر معمولی مماثلت؟؟

لڑکی نے حیرت سے تصویر کی طرف دیکھا۔

"ممی میری تصویر؟" پھر اس نے میز پر چڑھ کر تصویر اتار لی۔

بوڑھی عورت مسکرائی۔

"یہ تمہاری نہیں میری تصویر ہے بیٹی"۔ بیس سال پہلے جب میں اس قصبے سے گزری تو دلہن تھی۔ میں نے چند منٹ یہاں کے ۔۔روم میں گزارے تھے۔"

"اوہ ممی" لڑکی نے مسرت سے کہا۔ "کیا وہ مصور اس وقت بھی یہاں موجود ہو گا؟"

"پتہ نہیں۔" عورت نے کھڑکی سے باہر ہلکی زرد دھوپ میں کھیتوں کو چپ چاپ شبنم کے آنسو پیتے دیکھا۔ پھر بولی۔

"اور بیٹی۔"

"ممی"؟

"آج مجھے محسوس ہو رہا ہے جیسے . . ."

"جیسے ممی ؟؟"

"جیسے زندگی ایک سلسلہ ہے رواں دواں اور جاودان رہنے کا۔ جیسے میں۔ میرے بعد تم۔ تمہارے بعد کوئی تصویر بہ تصویر۔"

"ونڈر فل ممی" لڑکی نے مالک کے گلے میں باہیں حمائل کر دیں۔ ٹھیک اسی وقت ایک زوردار دھماکہ ہوا اور ہر طرف بھاگ

"بابو صاحب ۔ بابو صاحب" راجو بڑی زور سے بڑبڑایا۔ پچیس برس بعد آج آپ نے ایک ہی پٹری پر دو گاڑیوں کو دے دیا۔ ؟؟"

مگر راجو کے زخمی وجود سے بے پرواہ شیام ۔ میز پر پڑی ہوئی تصویر سے پرانی تاریخ کھرچ کر تازہ تاریخ تحریر کرتا مسکراتی ہوئی بھری بھری آنکھوں کے ساتھ جیسے بقیہ تمام احساس ختم ہو گئے ہوں !!

فکرِ نو کا ترجمان

سہ ماہی سیپ کراچی

بہت جلد اپنی منفرد خوبیوں کے ساتھ

شمارہ ۵۱

پیش کر رہا ہے

ایڈیٹر:۔ نسیم درانی

سہ ماہی "سیپ"۔ بلاک ڈی بشیر شاہ کالونی کراچی ۲۵

رضیہ فصیح احمد

نقوش۔ لاہور

پچھتاوا

اس ریسٹ ہاؤس کے چاروں طرف لمبے لمبے اچھی اچھی قسم کے یوکلپٹس کے درختوں کا جھُنڈ تھا۔ تنے سفید، سڈول اور چکنے جیسے
بیلے ڈانسرز کی ٹانگیں۔ اس کے اندر بہت بڑا باغ تھا۔ جس میں تین سیٹ کی ریسٹ ہاؤس کی خوبصورت عمارت تھی۔ وہ ابھی دریا اور
بیراج کی سیر سے لوٹا تھا۔ دریا کے بیچوں بیچ دور تک ایک چوڑی سی دیوار بنائی گئی تھی جس نے ایک حصّے میں پانی کو یوں لبالب بھر دیا
تھا جیسے کسی بلا نوش کا جام۔ دوسرے حصّے سے تھوڑا تھوڑا پانی رس کر بیراج کے دوسری طرف نکل گیا تھا۔ بیراج پر پکی سڑک تھی۔ دونوں
طرف کے منظر میں بلا کا تضاد تھا۔ ایک طرف پانی ہی پانی دوسری طرف ریت ہی ریت۔ جس میں پانی کی پتلی پتلی لہریں بہہ رہی تھیں۔ یہ
پانی کا نہیں ریت کا دریا معلوم ہوتا تھا۔ جس کے کنارے پر بنے ہوئے مٹی کے غار منہ پھاڑے جیسے دوسری طرف کے حصّے سے
شکوہ سنج تھے۔

مگر کیا معلوم کہ یہ سمندر کتنی نہروں کا پیٹ بھر کر کتنے ہزار ایکڑ زمین کو سیراب کر رہا ہے۔ اس وقت بھی جبکہ وہ باغ میں چکر لگا رہا
تھا۔ بیراج کے پانی کی آواز اسے سنائی دے رہی تھی۔ یوکلپٹس کی شاخوں میں سے چاند جھانک رہا تھا۔ اس نے یہ عجیب بات نوٹ
کی۔ کہ تمام درخت کوئی اسی فیٹ تک سیدھے چلے گئے تھے۔ پھر ان کی دو شاخیں ہو گئی تھیں اور اس کے بعد اور بہت سی شاخیں ـــ اس
تمام علاقے میں ایک خاص قسم کا رکھ رکھاؤ اور حسن تھا۔ وہ باغ کی خوبصورتی سے بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ شاید ہی کوئی پھول ہو جو اس
باغ میں نہ ہو۔ کارنیشن، نسٹرشیم اور ڈیلیا کے انوکھے رنگ اس نے اسی باغ میں دیکھے۔ بہت سے ایسے پھول دکھائی دیئے جو اس سے
پہلے اس کی نظر سے نہیں گزرے تھے۔ ایک خوبصورت درخت کی جھکی جھکی سبز ریشے دار شاخیں، جو آگے سے پانچ چھ انچ تک سُرخ تھیں
دور سے بہت حسین نظر آتی تھیں۔ کیکٹس اور بیلی کی اتنی بہت سی قسمیں دیکھ کر وہ حیران ہو گیا۔ وہ باری باری سب پھولوں کو دیکھتا چلا جاتا
تھا۔ کہ ایک جگہ سبز گھاس کے قطعے کے درمیان اسے گلاب کی کیاریاں نظر آئیں۔ اور اس کی نظر ایک گلاب پر جم گئی۔ جو ہلکے شربتی رنگ کا
تھا اور اتنا بڑا کہ دونوں ہاتھوں کے کٹوروں میں مشکل سے سما سکتا تھا۔ اتنا نازک، اتنا خوبصورت جیسے یوکلپٹس کے پتوں سے جھانکتا
ہوا چاند ـــ عدنان کو بے اختیار شہلا یاد آ گئی۔ اس کی رنگت بھی تو اس گلاب کی طرح شربتی تھی۔ جب وہ شربتی رنگ کی ساری پہن کر
اسی رنگ کی ناخن پالش لگا کر اور شربتی چپل پہن کر نکلتی تھی تو یہی گلاب نظر آتی تھی۔ ہوبہو یہی رنگت، یہی نزاکت، یہی تازگی ـــ اس نے

جھک کر احتیاط سے اس گلاب کو توڑ لیا۔ اور اسے لیے کمرے میں آ گیا۔

اب اس نے حساب لگایا کہ کراچی یہاں سے تقریباً تین سو میل دور ہے۔ سندھ کے علاقے کی ساری گرمی اس گلاب پر گزرے گی تب کہیں وہ اسے شہلا کو پیش کر سکے گا۔ اس نے اپنے بیگ سے شیشے کا گلاس نکالا۔ تازہ پانی بھرا۔ ایک اسپرو کی ٹکیہ اس میں گھولی۔ سنا تھا کہ اس سے پھول زیادہ دیر تازہ رہتے ہیں۔ اور اس پھول کی ڈنڈی کو پانی میں ڈال دیا۔ اتنا بڑا طباق سا پھول نازک سے شیشے کے گلاس میں اور بھی حسین معلوم ہونے لگا۔ اس نے محبت بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے ایک ٹھنڈا سانس لیا۔ اور کہا۔ "کاش یہ پھول ایسا ہی رہے"۔

دوسرے دن صبح جب وہ چلا۔ تو اس نے گلاس کو بہت سے کپڑوں کے درمیان ٹکا کر پچھلی سیٹ پر رکھ دیا۔ تاکہ اسے ہوا لگتی رہے۔ یہاں سے سکھر تک سڑک بہت پتلی ہے اور دونوں کنارے پھٹے ہیں۔ وہ احتیاط سے گاڑی چلاتا رہا۔ مبادا گلاس گر جائے۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا، دھوپ کی تیزی اور ہوا کی حدت بڑھتی رہی۔ وہ کہیں سایہ دیکھ کر گاڑی روک لیتا، پانی پیتا، سگریٹ سلگاتا۔ اور گلاب کے پھول کو دیکھتا ہوا جاگتے میں خواب دیکھنے لگتا۔

جس وقت وہ روہڑی کے نزدیک پہنچا، گرمی شباب پر پہنچ چکی تھی۔ سڑک تپ رہی تھی۔ ریت کے بگولے اڑ رہے تھے۔ ٹرک اور چھکڑے دھول اور ڈیزل کا دھواں اڑاتے یوں گزرتے تھے۔ کہ سڑک چھپ جاتی تھی۔ اگر گاڑیوں کی بتیاں روشن نہ کی جاتیں تو حادثے یقینی تھے۔ سکھر بیراج کو پار کر کے وہ سکھر پہنچ گیا۔ یہاں پانی اور سبزہ دیکھ کر جان میں جان آئی۔ یہاں کے خوبصورت گدوہاؤس میں پہنچ کر جو سب سے پہلی چیز اتار کر اس نے اندر کی خنک فضا میں رکھی۔ وہ یہی گلاب کا پھول تھا۔ سرخ قالین اور سرخ پردوں والے سجے ہوئے ڈرائنگ روم میں یہ شربتی پھول اور کھل اٹھا۔ عدنان خود پسینہ میں شرابور، گرمی اور دھوپ سے پیاسے کوّے کی طرح بوکھلایا ہوا تھا۔ اس کی پلکیں اور بال گرد سے اٹے ہوئے تھے۔ مگر اسے خوشی اس بات کی تھی۔ کہ پھول جوں کا توں تر و تازہ تھا۔

رات کا کھانا کھا کر وہ جلد سو گیا۔ تاکہ صبح سویرے ہی روانہ ہو سکے۔ جلد چلنے کا فیصلہ اس نے گلاب کے پھول کے خیال سے کیا تھا۔ وہ دیر سے سو کر اٹھنے کا عادی تھا۔ مگر وہ نہیں چاہتا تھا۔ کہ شربتی گلاب دھوپ کی تمازت سے کمہلائے۔ اگر آج پھر قیامت کی گرمی اس پر گزری تو وہ یہ پھول شہلا کو پیش نہ کر سکے گا۔ چلنے سے پہلے اس نے گلاس کا پانی بدلا۔ اس میں اسپرو کی ٹکیہ ڈالی۔ اور اسے اپنے سامنے کی شیلف پر بہت سی چیزوں کا سہارا دے کر رکھ دیا۔ اس پھول کے ساتھ عجیب سی رفاقت کا احساس ہو رہا تھا اسے،

جس وقت اس نے سکھر چھوڑا۔ صبح کاذب کا وقت تھا۔ ہوا ٹھنڈی اور خوشگوار تھی۔ ہر طرف اندھیرا اور سناٹا تھا۔ دریائے سندھ، بیراج کی روشنیوں اور صبح کے ملگجے اندھیرے میں خاموشی اور سکون سے بہہ رہا تھا۔ اور وہ اس سناٹے سے فائدہ اٹھا کر کار کو خوب تیز چلا رہا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا اس کے چہرے اور گردن پر ہلکی گدگدی کر رہی تھی۔ اور گلاب کے پھول کی پنکھڑیاں ہولے ہولے ہل رہی تھیں۔

آہستہ آہستہ اجالا ہونے لگا۔ تارے ڈوب گئے۔ مگر صبح کا ستارا اسی طرح جھلملاتا رہا۔ صبح کاذب، صبح صادق میں تبدیل ہو گئی۔ دھیرے دھیرے صبح کا ستارا بھی غائب ہو گیا۔ مشرق سے سورج نمودار ہوا۔ نارنجی رنگ کا طباق سا چہرہ جیسے چودھویں رات کا ابھرتا چاند، پھر جلد ہی وہ سفیدی میں تبدیل ہو گیا۔ اس کی کرنیں تیز اور گستاخ ہوتی گئیں۔ زمین پر سبزہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ اور اجاڑ علاقہ شروع ہو گیا تھا۔ حیدرآباد میں اس نے کھانا کھایا۔ اور ذرا دیر آرام کرنے کے بعد پھر چل کھڑا ہوا۔ حیدرآباد سے ٹھٹھہ تک بے حد پیاری سڑک ہے۔ پہاڑیوں پر کالے رنگ کی سڑک یوں اترتی چڑھتی چلی جاتی ہے جیسے کوئی ربن بچھا ہوا ہو۔ کم ٹریفک اور عمدہ سڑک دیکھ کر

عدنان نے کار کو نتھیا گلی سے چلایا۔ گو ہوا تیز تھی اور بار بار کار میں لگے ہوئے پردوں میں بھر جاتی تھی۔ لیکن ڈرائیونگ کا صحیح لطف عدنان کو یہیں آیا۔ وہ بہت جلد ٹھٹھہ پہنچ گیا تھا۔ یہاں سے کراچی زیادہ دور نہیں تھا۔ پھول اب بھی تر و تازہ تھا۔ اس لیے وہ ٹھٹھہ کی سیر کے لیے اتر گیا۔ اپنے ساتھ اس نے گلاب کو بھی لے لیا۔ کیونکہ جب وہ اسے اٹھاتا تو یوں محسوس ہوتا جیسے وہ شہلا کو ہاتھ تھام کر کار سے اتار رہا ہے۔ جب وہ اسے حفاظت سے رکھتا تو یوں معلوم ہوتا جیسے وہ شہلا کو آرام سے کشنوں کے سہارے بٹھا رہا ہے۔ اس نے شاہجہانی مسجد اور مغل سرداروں کے مقبروں میں اس پھول کو رکھ کر تصویریں کھینچیں، کبھی کبھی وہ کیمرے کو اسٹینڈ پر رکھ کر آٹومیٹک فٹ کر دیتا اور خود بھی پھول کے پاس آکر بیٹھ جاتا۔ تقریباً تمام آثار قدیمہ کی حالت خستہ تھی۔ اور ان کی مرمت ہو رہی تھی۔ شاہجہانی مسجد کی دیواریں نئی بن رہی تھیں۔ ان پر پرانا ڈیزائن نئے سرے سے پینٹ کیا اور بنایا جا رہا تھا۔ مقبروں پر بھی کام ہو رہا تھا۔ مرمت طلب حصوں پر ویسے ہی پتھر، وہی ڈیزائن بنا کر لگائے جا رہے تھے۔ ان پتھروں پر جودھپور اور گوجرانوالہ کے کاریگر کام کر رہے تھے۔

"اگر ان آثار کی یونہی مرمت ہوتی رہی تو کہیں وہ وقت نہ آجائے۔ جب اصل آثار قدیمہ کا ایک پتھر، ذرہ بھی باقی نہ رہے اور سارے آثار قدیمہ آثار جدیدہ میں بدل جائیں۔" اس نے پھول سے مخاطب ہو کر کہا۔ اور یوں لگا۔ جیسے پھول کھلکھلا کر ہنس پڑا ہو۔

ایک گھنٹے کی سیر کے بعد وہ آگے روانہ ہو گیا۔ کراچی پندرہ میل رہا تو لانڈھی کی آبادی شروع ہو گئی۔ اور عدنان کا دل یک میٹھے میٹھے درد سے بھرنے لگا۔ کراچی پہنچ کر نہا دھو کر تیار ہونے کے بعد پہلا کام اس نے یہ کیا۔ کہ شربتی رنگ کی وہ ساری نکالی جو وہ اپنے شہر سے شہلا کے لیے لے کر چلا تھا۔ پھر الفنسٹن اسٹریٹ سے اسی رنگ کا ایک قیمتی پرس خریدا۔ ساری کے اوپر پرس اور پرس کے اوپر وہ پھول رکھ کر شہلا کو پیش کیا۔ جو اب اس کے خوابوں کی رانی ہی نہیں، منگیتر بھی تھی۔

"ہائے کتنی پیاری ساری ہے اور کتنا خوبصورت پرس۔" شہلا نے مارے خوشی کے دونوں چیزیں جھپٹ لیں۔ ساری کا رڈر اور پلّو جھٹک جھٹک کر دیکھا، پرس کھول کر ملاحظہ کیا۔ اور اس کا شربتی رنگ مسرت سے گلابی ہو گیا۔

اس ہڑبڑاہٹ میں گلاب کا پھول نیچے گر پڑا۔ بہت دیر بعد جب وہ پھول شہلا کی نظر پڑا۔ تو اس نے بے پروائی سے "اے یہ پھول بھی تم لائے ہو عدنی؟ کتنا اچھا ہے، پلاسٹک کا ہے نا؟"

"نہیں، اصلی ہے۔" عدنان نے اپنی بات کے ثبوت میں پھول کی ساری پتیاں نوچ کر قالین پر پھیلا دیں۔

پھول کے اصلی ہونے کا تو شہلا کو یقین ہو گیا۔ مگر عدنان خود جہاں بیٹھا تھا، وہاں نہ تھا۔ وہ جس راستے سے شہلا تک پہنچا تھا اس راستے سے واپس اُس پودے تک جا پہنچا۔ جس سے پھول توڑا تھا۔ اور پھر اس کے بعد اس سے بھی دور نکل گیا۔ اتنا دور کہ ندامت کے شدید احساس نے اس کا ساتھ بڑی دور تک دیا۔

33495
15.6.76

نقش ادب کی خدمت کرتا ہے۔ آپ نقش کی سرپرستی کیجیے۔
نقش خریدیے۔ نقش میں اشتہار دیجیے۔
فرصت کے لمحات کا بہترین ساتھی ماہنامہ "نقش" کراچی

اقبال متین — آج کل۔ دہلی

جھوٹی سچائی

دوراہے پر پہنچ کر اس کا جی چاہا سیدھے راستے پر چل پڑے اس کے باوجود بھی کہ وہ طویل تھا۔ لیکن اس نے خود کو لعنت ملامت کی۔ بزدل ــ موت بھی کوئی ڈرنے کی چیز ہے۔ جس کا آنا یقینی ہے اور جس وقت اس کو آنا ہے وہ آکر رہے گی۔ پھر وہ سوچنے لگا۔ یہ بھی کوئی ضروری نہیں ہے۔ اس کو ٹالا بھی جا سکتا ہے۔ وہ چند سے توقف بھی کر سکتی ہے۔ انسان کے بس میں کیا نہیں ہے۔

لیکن اس کی سائیکل سیدھے راستے پر دور تک نکل گئی۔

اس نے سوچا اب بھی واپس لوٹ کر پھر اس راستے پر چل پڑے جو اس کی منزل کو قریب تر کر دیتا تھا۔ لیکن اس کے ذہن میں ایک اور منطقی استدلال ابھر آیا۔ اور وہ سوچنے لگا کہ اس طرح واپس لوٹنا بھی اس بات کی دلیل ہے کہ میں اس خیال کو اہمیت دے رہا ہوں جو میرے دل و دماغ پر آہستہ آہستہ حاوی ہو رہا ہے۔

"اب جبکہ یہاں تک چلے آئے ہیں تو چلو یہی راستہ سہی"۔

واپسی میں تو ادھر سے آسکتے ہو۔

دل نے جیسے چوری پکڑ لی۔

اس نے خوف کی پرچھائیوں کو پیچھے چھوڑنے کے لئے آنا رپر سائیکل تیز کر دی اور ہواؤں میں تتلی کی طرح ڈولنے لگا۔ اس طرح خود اپنے آپ کو یہ احساس دلانے کی کوشش کی کہ وہ ترنگ میں ہے۔ اور کوئی خوف اس کا پیچھا نہیں کر رہا ہے۔

واپسی میں ــ یقیناً ادھر ہی سے آؤں گا۔ اس نے دل ہی دل میں اس طرح طے کیا جیسے عزم کر رہا ہو ــ اور سیٹی بجا کر سائیکل پر ہواؤں میں ڈولتے ہوئے اس نے خود کو زندگی کی گود میں ہمکتا ہوا محسوس کیا۔

دفتر سے واپسی پر جب اس کی سائیکل اس کمان کے پاس پہنچ گئی جس میں داخل ہو جانے سے وہ راستہ شروع ہو جاتا تھا جس پر سے ہو کر گزرنے سے اس کا گھر نسبتاً بہت قریب پڑتا تھا تو بادل ناخواستہ اس راستے پر مڑ گیا۔

کاش مجھے یاد نہ آتا کہ میں نے اس راستے واپسی کا عزم کیا ہے ــ یہ خواہش اس کے دل میں تھی لیکن وہ اس خواہش کو مان لینے کے لئے تیار ہی نہ تھا۔ اس لئے کہ ایک خوف سا اس کے دل و دماغ کو آہستہ آہستہ اپنی گرفت میں لیتا جا رہا تھا جس کے آگے سپر ڈال دینا اسے گوارا نہ تھا۔ اگر وہ اپنی شکست تسلیم کر لیتا تو پھر یہ راستہ اس پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہو جاتا۔

اس کی نظر میں اس راستے کے مسدود ہو جانے کی کوئی اہمیت نہ تھی۔

فرض کیجئے کہ بیچ راستے پر حکومت کوئی بلڈنگ کھڑی کر دینا چاہے اور اس طرح یہ راستہ بالکل بند ہو جائے جو اس کے گھر اور دفتر کے درمیان خطِ مستقیم بنا ہوا تھا تو اس کو حکومت پر کوئی اعتراض نہ ہوتا۔

کوئی باغی کسان سیمنٹ روڈ اکھیڑ کر اس پر ہل چلا دے اور اس طرح بیچ سڑک پر کھیتی لہلہانے لگے تو بھی اس کو کوئی اعتراض نہ تھا۔

سچ پوچھئے تو ایسی کوئی تبدیلی اس کے لئے ایک چھپی ہوئی مسرت کا باعث تھی۔ جس کو وہ علی الاعلان مان لینے کے لئے بھی آمادہ نہ تھا۔

جب اس کی سائیکل قبرستان کے روبرو سنگ تراش کی دوکان کے برابر پہنچ گئی تو اس نے سوچا کہ میں سنگ تراش کی دوکان کی جانب نگاہ کئے بغیر ہی کیوں نہ گزر جاؤں۔ پھر خود ہی اس نے اس خیال کی تردید کی کہ یوں چوروں کی طرح نظر اٹھائے بغیر گزر جانا کسی خوف کی نشاندہی کرتا ہے جسے میں جھٹلا رہا ہوں۔

اس کے ذہن میں ایک جھنجھلاہٹ سی آگئی۔ اتنا سارا راستہ میں نے یہ سوچے بغیر کہ میرے جوانب میں کیا ہے طے کر دیا۔ اِدھر اُدھر نظر اٹھائی بھی تو کوئی شے نظروں میں کھب کر تو نہیں رہ گئی اور نہ یوں ہوا کہ کسی خوف سے نظریں جھکی جھکی رہ گئی ہوں۔ لیکن سنگ تراش کی اس دوکان سے گزرتے وقت آخر مجھے کیا ہو جاتا ہے۔ آج کتنے دن سے میں اس خیال سے لڑ رہا ہوں کہ واہمہ زندگی کو گھن کی طرح کھا جاتا ہے۔ کتنی ہی بار گھر سے چلتے وقت میں نے طے کیا ہے کہ آج سنگ تراش کی اس دوکان سے اس طرح گزر جاؤں گا جیسے مسافر راستے سے گزر جاتے ہیں۔ لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے اس خیال نے جھنجھوڑ دیا کہ سنگ تراش کی دوکان سے گزرنے کے لئے قبل از قبل ذہن کو ہموار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ مسافر اس راستے سے اس طرح تو نہیں گزرتے بس گزر جاتے ہیں۔ یہ قبل از قبل سوچ بچار اسی خوف کی بنیاد ہیں جو میرے دل میں جاگزیں ہو رہا ہے۔

لیکن ــــ لیکن میں اس خوف کو اپنے دل سے نکال پھینکوں گا۔ اور اس نے اپنے جوان ارادوں کی شہ پا کر بڑی بے اعتنائی سے سنگ تراش کی دوکان کی جانب نظریں اٹھائیں تو ترشا ترشایا قبر کا تعویذ جوں کا توں دھرا تھا۔ اس کے دل پر ایک دھچکا سا لگا۔ لیکن اس نے اس دھچکے کو اس طرح محسوس کرنے کی کوشش کی جیسے کسی میلے میں وہ کسی دوشیزہ سے ٹکرا گیا ہو لیکن قبر کا تعویذ بہرحال دوشیزہ نہ بن سکا۔

اس نے قبر کے اس تعویذ سے آنکھیں چرا کر سنگ تراش کی دوکان کا جائزہ لیا۔ قبروں کی بندش کے لئے بلا تراشے ہوئے پتھر اور قریب قریب ایک سائز کی کٹی ہوئی چھوٹی اور بڑی پتھر کی کڑیاں اس دوکان کے احاطے میں چو طرف ڈھیروں سے بکھری ہوئی تھیں اور انہیں میں ترشا ترشایا مردانی قبر کا بھاری بھرکم تعویذ، زنانی قبر کے تعویذ کے برابر ہی نمایاں طور پر رکھا گیا تھا کہ آسانی سے راہ گیروں کی نظر پڑ سکے۔ لیکن اس کے باوجود بھی کتنے ہی مسافر اس تعویذ کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے۔ اس بے اعتنائی میں ان مسافروں کا کوئی دوش نہ تھا۔ زندگی انہیں فرصت ہی کہاں دیتی تھی کہ وہ لمحہ بھر کے لئے موت کی طرف توجہ دیتے اور اگر سنگ تراش کی اس دوکان سے گزرتے ہوئے عاقبت کا کوئی مبہم سا تصور اس کے ذہن میں ابھرتا بھی ہوگا تو یہ ایک لمحہ بہتے ہوئے وقت کے سمندر میں مل کر خود اپنی موت آپ مر جاتا ہوگا اور زندگی وقت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر بن کر ہر مسافر کے آگے پھیل جاتی ہوگی۔ جس سے بہرحال اس کو پار اترنا ہے۔

لیکن وہ جب پہلی بار اس راستے سے گزرا تھا کہ سنگ تراش کی دوکان کے احاطے میں دھرے ہوئے اس بھاری بھرکم پتھر کے تعویذ کو دیکھ کر اس کے دل میں اچانک ایک خیال آیا تھا کہ خدا جانے وہ شخص اب کہاں ہوگا اور کون ہوگا جس کی قبر پر یہ تعویذ رکھا جائے گا، پھر اچانک ہی اس خیال نے کچھ اس طرح کروٹ لی تھی کہ وہ شخص اب یہیں ہے اور وہ خود ہے ـــ اور وہ بوکھلا گیا تھا ـــ کیا بکواس ہے۔ کیسی بزدلی ہے یہ ـــ اگر یوں ہوگا تو یوں ہی سہی ـــ لیکن ـــ لیکن یوں ہوگا ہی کیوں ـــ

راہ چلتے ایک خیال تھا جو اس کے ذہن سے یوں گزر گیا جیسے کسی چھوٹے سے ویران پلیٹ فارم سے ایکسپریس ٹرین بغیر ٹھہرے دندناتی گزر جاتی

ہے۔ اور پٹڑیاں کانپتی رہ جاتی ہیں۔ اور اسٹیشن کی بلڈنگ منہ کھولے حیران حیران سی تکتی رہ جاتی ہے۔

اور پھر ٹرین کے گزر جانے پر اس پلیٹ فارم کی کس مپرسی زیادہ ہی محسوس ہوتی ہے، اداسی زیادہ ہی ابھرتی ہے۔

اس کے دل سے بھی دندناتی ایکسپریس ٹرین کی طرح ایک خیال گزرا تھا اور پھر وہی سب کچھ ہوگیا۔ جو اجڑے پلیٹ فارم پر سے ٹرین کے گزر جانے سے ہوتا ہے۔

اب روزانہ کا اس کا معمول یہی تھا کہ دفتر جاتے ہوئے اور دفتر سے لوٹتے ہوئے یا تو وہ خود کو فریب دے کر اس قریبی راستے سے احتراز کرتا جو قبرستان اور سنگ تراش کی دوکان کے درمیان سے گزرتا تھا یا پھر اپنی اندرونی اضطراری کیفیت اور ذہنی الجھن کو دور کرنے کے لئے خود کو آمادہ کرتا اور اسی راستے پر چل پڑتا۔ لیکن سنگ تراش کی دوکان کے پاس پہنچ کر اس کی نظریں اسی الجھن اور بے کلی کے عالم میں سنگ تراش کے احاطے کی جانب اٹھ جاتیں جہاں بھاری بھرکم تعویذ اس طرح دھرا رہتا جیسے اس کے سینے پر دھرا ہو۔ اور وہ سینے پر اس کے بوجھ کو محسوس کرنے لگتا۔

ایک دن گزرتے گزرتے اس نے جھلا کر طے کر لیا تھا کہ میں نہ صرف آج سنگ تراش کے احاطے کی طرف نہیں دیکھوں گا۔ بلکہ مکمل پانچ دن تک ادھر نظر ہی نہ اٹھاؤں گا اور اس طرح بھول جاؤں گا کہ کوئی سنگ تراش کی دوکان راہ میں پڑتی ہے۔ جس کے احاطے میں ایک قبر کا بھاری بھرکم تعویذ دھرا ہے جو کسی نہ کسی مرنے والے کا منتظر ہے ـــ اور وہ مرنے والا ـــ اور وہ مرنے والا ـــ اور وہ مرنے والا ـــ میں ـــ میں ـــ میں ـــ اور وہ نظریں اٹھائے بغیر سنگ تراش کے احاطے کے برابر سے گزر گیا ـــ شام جب وہ دفتر سے لوٹ رہا تھا تو کمان میں مڑتے ہی اسے خیال آگیا کہ اس کو سنگ تراش کے احاطے کی جانب نظریں اٹھائے بنا ہی گزر جانا ہے سو پھر اس نے ایسا ہی کیا۔

اب تو تین روز سے اس کا یہی معمول تھا۔ اس نے روزانہ دو بار کے حساب سے چھ وقت اسی راستے سے گزرنے کے باوجود سنگ تراش کے احاطے کی جانب نظر نہ اٹھائی تھی۔ چوتھے دن اس راہ سے گزرتے ہوئے اس نے ایک عجیب طرح کی بے چینی محسوس کی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اب دزدیدہ نگاہوں سے احاطے کی طرف دیکھ لے ـــ شاید وہ بھاری بھرکم تعویذ نہ رہا ہو ـــ شاید کسی نے کسی بدنصیب کے لئے اسے خرید لیا ہو۔ لیکن پھر وہ اپنے پر قابو پا لیتا۔ یاد کرتا کہ اس نے مکمل پانچ دن اس سمت نظر نہ اٹھانے کا فیصلہ کیا ہے۔ پھر اس کو الجھن سی ہونے لگتی۔ جب وہ فیصلہ کر چکا ہے تو پھر اس کا دل اس احاطے کی طرف مائل ہی کیوں ہے۔ پھر وہ اپنے ہی استعمال کئے ہوئے الفاظ کی اصلاح کرتا ـــ مائل ہونے کا سوال ہی کیا پیدا ہوتا ہے وہ تو خائف ہے اور اسی خوف کے ازالے کے لئے وہ ادھر دیکھنا چاہتا ہے اور اس طرح غیر شعوری طور پر وہ اس بات کا معترف ہو چکا ہے کہ وہ قبر کے اس بھاری بھرکم تعویذ سے خوف کھاتا ہے۔

واپس ہوتے ہوئے اس نے سوچا کہ کل کا ایک دن ہی تو باقی ہے۔ پرسوں میں احاطے کی طرف دیکھوں گا ـــ اور اگر تعویذ جوں کا توں دھرا ہے تو ـــ تو کیا ـــ دھرا رہے گا ـــ میرا کیا لے جائے گا بھلا ـــ میں بھی پھر دس دن تک ادھر نظر نہ اٹھاؤں گا۔ اور وہ نظریں نیچی کئے تیز تیز سائیکل دوڑاتا قبرستان اور سنگ تراش کے احاطے کے درمیان سے گزر گیا۔

پانچواں دن تو گویا اس کے صبر و تحمل کا امتحان لے رہا تھا، دفتر جاتے ہوئے جب وہ اس راستے پر مڑا تو اس کو یقین ہوگیا تھا کہ اب وہ بھاری بھرکم تعویذ نہیں رہا ہوگا ـــ یقین ہو کیا گیا تھا۔ وہ یقین کر لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اتنے بڑے شہر میں روزانہ کتنے ہی لوگ مرتے ہوں گے۔ پھر کسی نہ کسی کے لئے کسی نہ کسی نے یہ پتھر ضرور خرید لیا ہوگا۔

نہیں بھی خرید سکتا ہے ـــ پر ایسا سوچتے ہوئے وہ کچھ اداس سا ہوگیا۔ لیکن اس نے سائیکل پر پیڈل لیتے ہوئے تیز تیز پیڈل مار کر جھوٹی ترنگ اپنے میں اس طرح پیدا کی جیسے کہیں سے مستعار لی ہے۔

شام کو جب وہ دفتر سے لوٹ رہا تھا تو اس کو کسی کام سے اپنے ایک دوست کے ساتھ کہیں اور جانا پڑا اور اس طرح وہ اس راستے سے واپس

نہ ہو سکا۔ لیکن جب وہ گھر پہنچا تو اس کے ذہن میں رہ رہ کر اس بھاری بھرکم تعویذ کا تصور ابھر رہا تھا۔ اس نے گھر والوں سے اِدھر اُدھر کی باتیں کیں۔ اپنے بچّوں کو لیکر سڑک پر گھومنے کے لئے نکل گیا۔ انہیں سوئیٹس دلائے۔ خود بڑھیا سگریٹ خرید کر خط اٹھانے کی کوشش کی۔ لیکن کوئی بہلاوا بھی اس کو اس بھاری بھرکم تعویذ کے خیال سے چھٹکارا نہ دلا سکا۔ ایک ترشا ترشایا بھاری سا پتھر تھا جس کا بوجھ اپنے سینے پر وقفے وقفے سے وہ محسوس کرتا۔

رات اس نے خواب دیکھا کہ سنگ تراش کے احاطے میں ایک چھوٹا سا باغیچہ ہے اور مردوں عورتوں اور بچّوں کی کئی مورتیاں اِدھر اُدھر رکھی گئی ہیں جن کے چہرے مسخ ہیں لیکن پتھروں کے وہ انبار ہیں نہ وہ بھاری بھرکم قبر کے تعویذ۔ اس کو سنگ تراشی کے احاطے کا یہ پراسرار ماحول کچھ اتنا نامانوس اور خائف کن نظر نہ آیا جو وہ پہلے دیکھتا رہا تھا۔ لیکن یکا یک جب اس کی نظر اپنے ہی مجسمے پر پڑی تو وہ ٹھٹھک گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کا مجسمہ بالکل تازہ تازہ تراشا گیا ہے اور اتنا مسخ نہیں ہے جتنے دوسرے مجسمے ہیں۔ کسی نامعلوم خوف سے وہ بیدار ہوگیا۔ آنکھیں کھلیں تو خود کو بستر پر پاکر اسے سکون ہوا۔ لیکن جوں جوں اس خواب کی مبہم تصویریں اس کے ذہن میں اُبھرتی گئیں وہ کچھ مضطرب سا ہوتا گیا اور اسی اضطراب کے عالم میں کئی بار اس نے بھاری بھرکم پتّھر کے تعویذ کو اپنے سینے پر محسوس کیا۔ اسے پھر گہری نیند نہ آئی۔ صبح تک وہ غنودگی، بیداری اور نیم بیداری کے عالم میں کروٹیں لیتا رہا۔ صبح اٹھا تو اس کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ ذہن پر ایک بوجھ سا تھا اور اعضا میں اضمحلال سا۔ اس نے نہا دھو کر کچھ فرحت محسوس کرنے کی کوشش کی لیکن اُسے وہ تازگی نصیب نہ ہوئی جو وہ ہر روز نہا دھو کر محسوس کرتا تھا۔ اس نے چائے کی بجائے کافی خاص طور پر بنوا کر پی۔ روز کی طرح اس سے ناشتہ بھی کیا نہ گیا۔ انڈے والے کی آواز سنکر اس نے اسے بلایا۔ اپنے لئے ایک انڈا خریدا۔ پھر اسے خیال آیا کہ وہ اپنے بچّوں کو چھوڑ کر کس طرح انڈا کھا سکتا ہے۔ اس نے سارے گھر کے لئے ایک ایک انڈا خریدا۔ حالانکہ کئی بار وہ تنہا انڈا کھا چکا تھا۔ نیم برشت انڈے میں بھی اُسے وہ لذّتِ کام و دہن نہ ملی جس سے وہ آشنا تھا۔ وہ انڈے کو دوا کی گولی کی طرح نگل گیا اور گھڑی کی طرف نظر اٹھا کر اس طرح دیکھا جیسے پھر دیکھنے کی تمنا ہو اور بوجھل بوجھل قدم اٹھاتا آنگن میں دھری سائیکل تک پہنچا۔ کمانی دار قفل میں کنجی لگا کر جب اس نے پچھلے پہیے کی زنجیر کھولنی چاہی تو وہ ورا نہ کھلی۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا کہ اگر آج یہ قفل نہ کھلے تو وہ اسی بہانے سے دفتر نہ جائے گا۔ ویسے وہ چاہتا تو دفتر نہ جاتا۔ اسے رخصت کا حق تھا اور بھلا گھر میں اسے کون ٹوک سکتا تھا۔ لیکن وہ تو آج دفتر نہ جانے کے لئے بھی کسی نہ کسی جواز کا متلاشی تھا۔ قفل کھل گیا اور سائیکل باہر نکال کر وہ بادلِ ناخواستہ دفتر کے لئے روانہ ہوگیا۔

آج جانے کیا بات تھی کہ پتّھر کا تعویذ بار بار اس کے تصوّر میں پھر رہا تھا۔ بات کیا ہوگی۔ یہی ہوگی کہ پانچ دن گزر گئے تھے اور آج چھٹا دن تھا اور آج وہ سنگ تراش کے احاطے کی جانب نظر اٹھا کر دیکھنے کا اپنے ہی معاہدہ کی رو سے مجاز تھا۔ وہ جوں جوں سنگ تراش کے احاطے کے قریب ہوتا جاتا۔ سے اپنی نبضیں ڈوبتی ہوئی محسوس ہوتیں۔ اس نے پوری قوت کے ساتھ عقلی دلائل سے اپنے اس واہمے پر بھرپور وار کیا۔ کیا یہ انسانی عقل کا دیوالیہ نہیں ہے کہ ایک پتّھر نے مجھے اتنا خائف اور ہراساں کر دیا ہے۔ کیا یہ رب العزّت اور معبودِ حقیقی کی توہین نہیں ہے کہ میں موت کے ایک متعینہ وقت پر ایقان یمان نہیں رکھتا ہوں۔ یہ کیسی بزدلی ہے جس کا میں شکار ہوگیا ہوں۔ میں اپنے ان توہمات کی داستان بھی تو کسی کو نہیں سنا سکتا۔ میرے ہمدرد خود مجھ پر ہنسیں گے۔ مذاق اڑائیں گے۔ اور اس نے جھرجھری سی لے کر اپنے ذہن کو اس طرح صاف کر دینے کی کوشش کی جیسے سلیٹ پر بھیگا ہوا کپڑا پھیر کر حروف مٹ جاتے ہیں۔ لیکن اس کے دل نے جیسے آگے بڑھ کر ہمدردی کی۔ اپنا دکھ درد لوگوں سے کہہ دو۔ لوگ ہنسیں گے، مذاق اڑائیں گے تو شاید ان کے رویّے سے تمہیں تقویت پہنچ سکے۔ اور یہ بوجھ تمہارے ذہن سے ہٹ سکے۔ یہ پتّھر تمہارے سینے پر سے سرک جائے۔ لیکن اس نے دل کے ہاتھوں شکست نہیں کی مانند ذہن کو نئی دلیلوں سے اس طرح تیار کیا جیسے خود مدافعت کے لئے مسلح ہو رہا ہو۔

جب وہ اس موڑ پر پہنچ گیا جہاں سے سیدھے گزر جانے پر وہ سنگ تراش کے احاطے کو چھو بھی سکتا تھا تو اس کا دل اتنی تیزی سے دھڑک رہا تھا کوئی موٹر سن کرکے اس کے برابر سے گزر گیا ہو اور وہ بال بال اس حادثے سے بچ گیا ہو۔ وہ چاہتا تھا کہ سائیکل پر سے اتر پڑے اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا

ہے۔ اور پٹڑیاں کانپتی رہ جاتی ہیں۔ اور اسٹیشن کی بلڈنگ منہ کھولے حیران حیران سی ٹھٹکی رہ جاتی ہے۔
اور پھر ٹرین کے گزر جانے پر اس پلیٹ فارم کی کس قدر سی زیادہ ہی محسوس ہوتی ہے، اداسی زیادہ ہی ابھرتی ہے۔
اس کے دل سے بھی دندناتی ایکسپریس ٹرین کی طرح ایک خیال گزرا تھا اور پھر وہی سب کچھ ہو گیا۔ جو اجڑے پلیٹ فارم پر سے ٹرین کے گزر جانے سے ہوتا ہے۔

اب روزانہ کا اس کا معمول یہی تھا کہ دفتر جاتے ہوئے اور دفتر سے لوٹتے ہوئے یا تو وہ خود کو فریب دے کر اس قریبی راستے سے احتراز کرتا جو قبرستان اور سنگ تراش کی دوکان کے درمیان سے گزرتا تھا یا پھر اپنی اندرونی اضطراری کیفیت اور ذہنی الجھن کو دور کرنے کے لئے خود کو آمادہ کرتا اور اسی راستے پر چل پڑتا۔ لیکن سنگ تراش کی دوکان کے پاس پہنچ کر اس کی نظریں اسی الجھن اور بے کلی کے عالم میں سنگ تراش کے احاطے کی جانب اٹھ جاتیں جہاں بھاری بھرکم تعویذ اس طرح دھرا رہتا جیسے اس کے سینے پر دھرا ہو۔ اور وہ سینے پر اس کے بوجھ کو محسوس کرنے لگتا۔

ایک دن گزرتے گزرتے اس نے جھلا کر طے کر لیا تھا کہ میں نہ صرف آج سنگ تراش کے احاطے کی طرف نہیں دیکھوں گا۔ بلکہ مکمل پانچ دن تک ادھر نظر ہی نہ اٹھاؤں گا اور اس طرح بھول جاؤں گا کہ کوئی سنگ تراش کی دوکان راہ میں پڑتی ہے۔ جس کے احاطے میں ایک قبر کا بھاری بھرکم تعویذ دھرا ہے جو کسی بھی مرنے والے کا منتظر ہے۔ اور وہ مرنے والا۔ اور وہ مرنے والا۔ اور وہ مرنے والا۔ میں۔ میں۔ میں۔ اور وہ نظریں اٹھائے بغیر سنگ تراش کے احاطے کے برابر سے گزر گیا۔ شام جب وہ دفتر سے لوٹ رہا تھا تو کمان میں مڑتے ہی اسے خیال آگیا کہ اس کو سنگ تراش کے احاطے کی جانب نظریں اٹھائے بنا ہی گزر جانا ہے سو پھر اس نے ایسا ہی کیا۔

اب تو تین روز سے اس کا یہی معمول تھا۔ اس نے روزانہ دو بار کے حساب سے چھ وقت اسی راستے سے گزرنے کے باوجود سنگ تراش کے احاطے کی جانب نظر نہ اٹھائی تھی۔ چوتھے دن اس راہ سے گزرتے ہوئے اس نے ایک عجیب طرح کی بے چینی محسوس کی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اب دزدیدہ نگاہوں سے احاطے کی طرف دیکھ لے۔ شاید وہ بھاری بھرکم تعویذ نہ رہا ہو۔ شاید کسی نے کسی بدنصیب کے لئے اسے خرید لیا ہو۔ لیکن پھر وہ اپنے پر قابو پا لیتا۔ یاد کرتا کہ اس نے مکمل پانچ دن اس سمت نظر نہ اٹھانے کا فیصلہ کیا ہے۔ پھر اس کو الجھن سی ہونے لگتی۔ جب وہ فیصلہ کر چکا ہے تو پھر اس کا دل اس احاطے کی طرف مائل ہی کیوں ہے۔ پھر وہ اپنے ہی استعمال کئے ہوئے الفاظ کی اصلاح کرتا۔ مائل ہونے کا سوال ہی کیا پیدا ہوتا ہے وہ تو خائف ہے اور اسی خوف کے ازالے کے لئے وہ ادھر دیکھنا چاہتا ہے اور اس طرح غیر شعوری طور پر وہ اس بات کا معترف ہو چکا ہے کہ وہ قبر کے اس بھاری بھرکم تعویذ سے خوف کھاتا ہے۔

واپس ہوتے ہوئے اس نے سوچا کہ کل کا ایک دن ہی تو باقی ہے۔ پرسوں میں احاطے کی طرف دیکھوں گا۔ اور اگر تعویذوں کا تعویذ دھرا ہے تو۔ تو کیا۔ دھرا رہے گا۔ میرا کیا لے جائے گا بھلا۔ میں بھی پھر دس دن تک ادھر نظر نہ اٹھاؤں گا۔ اور وہ نظریں نیچی کئے تیز تیز سائیکل دوڑاتا قبرستان اور سنگ تراش کے احاطے کے درمیان سے گزر گیا۔

پانچواں دن تو گویا اس کے صبر و تحمل کا امتحان لے رہا تھا۔ دفتر جاتے ہوئے جب وہ اس راستے پر مڑا تو اس کو یقین ہو گیا تھا کہ اب وہ بھاری بھرکم تعویذ نہیں رہا ہوگا۔ یقین ہو کیا گیا تھا۔ وہ یقین کر لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اتنے بڑے شہر میں روزانہ کتنے ہی لوگ مرتے ہوں گے۔ پھر کسی نہ کسی کے لئے کسی نہ کسی نے یہ پتھر ضرور خرید لیا ہوگا۔
نہیں بھی خرید سکتا ہے۔ پر ایسا سوچتے ہوئے وہ کچھ اداس سا ہو گیا۔ لیکن اس نے سائیکل پر ڈٹے ہوئے تیز تیز پیڈل مار کر جھوٹی ترنگ اپنے میں اس طرح پیدا کی جیسے کہیں سے مستعار لی ہے۔
شام کو جب وہ دفتر سے لوٹ رہا تھا تو اس کو کسی کام سے اپنے ایک دوست کے ساتھ کہیں اور جانا پڑا اور اس طرح وہ اس راستے سے واپس

... سے ذہن میں وہ وزنی بھاری بھرکم تعویذ کا تصور ابھر رہا تھا۔ اس نے گھر والوں سے اِدھر اُدھر کی باتیں کیں اور
بچّوں کو لیکر سڑک پر گھومنے کے لئے نکل گیا۔ انہیں سوئٹس دلائے۔ خود بڑھیا سگریٹ خرید کر خط اٹھانے کی کوشش کی۔ لیکن کوئی بہلاوا بھی اس کو اس
بھاری بھرکم تعویذ کے خیال سے چھٹکارا نہ دلا سکا۔ ایک ترشا ترشایا بھاری سا پتھر تھا جس کا بوجھ اپنے سینے پر وقفے وقفے سے وہ محسوس کرتا۔

رات اس نے خواب دیکھا کہ سنگ تراش کے احاطے میں ایک چھوٹا سا بغیچہ ہے اور مردوں عورتوں اور بچّوں کی کئی مورتیاں اِدھر اُدھر
رکھی گئی ہیں جن کے چہرے مسخ نہیں لیکن پتھروں کے وہ انبار نہیں نہ وہ بھاری بھرکم قبر کے تعویذ۔ اس کو سنگ تراش کے احاطے کا یہ بدلا
ماحول کچھ اتنا نامانوس اور خائف کن نظر نہ آیا جو وہ پہلے دیکھتا رہا تھا۔ لیکن یکایک جب اس کی نظر اپنے ہی مجسمے پر پڑی تو وہ ٹھٹک گیا۔ اس نے محسوس کیا
کہ اس کا مجسمہ بالکل تازہ تازہ تراشا گیا ہے اور اتنا مسخ نہیں ہے جتنے دوسرے مجسمے ہیں۔ کسی نامعلوم خوف سے وہ بیدار ہو گیا۔ آنکھیں کھلیں تو خود
بستر پر پاکر اسے سکون ہوا۔ لیکن جوں جوں اس خواب کی مبہم تصویریں اس کے ذہن میں ابھرتی گئیں وہ کچھ مضطرب سا ہوتا گیا اور اسی اضطراب کے
عالم میں کئی بار اس نے بھاری بھرکم پتھر کے تعویذ کو اپنے سینے پر محسوس کیا۔ اسے پھر گہری نیند نہ آئی۔ صبح تک وہ غنودگی، بیداری اور نیم بیداری
کے عالم میں کروٹیں لیتا رہا۔ صبح اٹھا تو اس کی آنکھیں جل رہی تھیں، ذہن پر ایک بوجھ سا تھا اور اعضا میں اضمحلال سا۔ اس نے نہا دھو کر کچھ فرحت
محسوس کرنے کی کوشش کی لیکن اُسے وہ تازگی نصیب نہ ہوئی جو وہ ہر روز نہا دھو کر محسوس کرتا تھا۔ اس نے چائے کی بجائے کافی خاص طور پر بنوا
لی۔ روز کی طرح اس سے ناشتہ بھی کیا نہ گیا۔ انڈے والے کی آواز سنکر اس نے اسے بلایا۔ اپنے لئے ایک انڈا خریدا۔ پھر اسے خیال آیا کہ وہ
اپنے بچّوں کو چھوڑ کر کس طرح انڈا کھا سکتا ہے۔ اس نے سارے گھر کے لئے ایک ایک انڈا خریدا۔ حالانکہ کئی بار وہ تنہا انڈا کھا چکا تھا نیم برشت انڈے
میں بھی اُسے وہ لذّت کام و دہن نہ ملی جس سے وہ آشنا تھا۔ وہ انڈے کو دوا کی گولی کی طرح نگل گیا اور گھڑی کی طرف نظر اٹھا کر اس طرح دیکھا جیسے
پھر دیکھنے کی تمنا ہو اور بوجھل بوجھل قدم اٹھاتا آنگن میں دھری سائیکل تک پہنچا۔ کمانی دار قفل میں کنجی لگا کر جب اس نے پچھلے پہیے کی زنجیر کھولنی چاہی تو وہ
وراً نہ کھلی۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا کہ اگر آج یہ قفل نہ کھلے تو وہ اسی بہانے سے دفتر نہ جائے گا۔ ویسے وہ چاہتا تو دفتر نہ جاتا۔ اسے رخصت کا حق تھا اور
بھلا گھر میں اسے کون ٹوک سکتا تھا۔ لیکن وہ تو آج دفتر نہ جانے کے لئے بھی کسی نہ کسی جواز کا متلاشی تھا۔ قفل کھل گیا اور سائیکل باہر نکال کر وہ بادلِ
ناخواستہ دفتر کے لئے روانہ ہو گیا۔

آج جانے کیا بات تھی کہ پتھر کا تعویذ بار بار اس کے تصوّر میں پھر رہا تھا۔ بات کیا ہوگی۔ یہی ہوگی کہ پانچ دن گزر گئے تھے اور آج چھٹا دن تھا اور
آج وہ سنگ تراش کے احاطے کی جانب نظر اٹھا کر دیکھنے کا اپنے ہی معاہدہ کی رو سے مجاز تھا۔ وہ جوں جوں سنگ تراش کے احاطے کے قریب ہوتا جاتا۔
اسے اپنی نبضیں ڈوبتی ہوئی محسوس ہوتیں۔ اس نے پوری قوت کے ساتھ عقلی دلائل سے اپنے اس واہمے پر بھرپور وار کیا۔ کیا یہ انسانی عقل کا دیوالیہ نہیں
ہے کہ ایک پتھر نے مجھے اتنا خائف اور ہراساں کر دیا ہے۔ کیا یہ رب العزّت اور معبودِ حقیقی کی توہین نہیں ہے کہ میں موت کے ایک متعینہ وقت پر ایقان
و ایمان نہیں رکھتا ہوں۔ یہ کیسی بزدلی ہے جس کا میں شکار ہو گیا ہوں۔ میں اپنے ان توہمات کی داستان بھی تو کسی کو نہیں سنا سکتا۔ میرے ہمدرد خود مجھ پر
ہنسیں گے۔ مذاق اڑائیں گے۔ اور اس نے پھر جھری سی لے کر اپنے ذہن کو اس طرح صاف کر دینے کی کوشش کی جیسے سلیٹ پر بھیگا ہوا کپڑا پھیر کر حروف
مٹائے جاتے ہیں۔ لیکن اس کے دل نے جیسے آگے بڑھ کر ہمدردی کی۔ اپنا دکھ درد لوگوں سے کہہ دو۔ لوگ ہنسیں گے، مذاق اڑائیں گے تو شاید ان کے
اسی رویّے سے تمہیں تقویت پہنچ سکے۔ اور یہ بوجھ تمہارے ذہن سے ہٹ سکے۔ یہ پتھر تمہارے سینے پر سے سرک جائے۔ لیکن اس نے دل کے ہاتھوں شکست
تسلیم نہیں کی۔ اپنے ذہن کو نئی دلیلوں سے اس طرح تیار کیا جیسے خود مدافعت کے لئے مسلح ہو رہا ہو۔

جب وہ اس موڑ پر پہنچ گیا جہاں سے سیدھے گزر جانے پر وہ سنگ تراش کے احاطے کو چھو بھی سکتا تھا تو اس کا دل اتنی تیزی سے دھڑک رہا تھا
جیسے کوئی موٹر مس کر کے اس کے برابر سے گزر گیا ہو اور وہ بال بال اس حادثے سے بچ گیا ہو۔ وہ چاہتا تھا کہ سائیکل پر سے اُتر پڑے اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا

سنگ تراش کے احاطے اور قبرستان کے درمیانی راستے سے بہت اطمینان اور سنجیدگی سے گزر جانے کی سعی نامشکور کرے۔ لیکن پھر اس کے ا
ہی تردید کی۔

"سارا راستہ کیا پیدل طے کرکے آئے ہو؟"

"نہیں۔"

"تو پھر یہاں یہ خصوصیت کیوں برت رہے ہو۔۔ چلو۔۔ چلتے رہو۔ رکو مت۔" اور وہ سائیکل کے پیڈل گھماتا بڑھتا رہا لیکن اس ا
جانے کیوں سست ہوگئی تھی۔

جب وہ قریب پہنچ گیا تو اس نے ایک عزم کے ساتھ نظر اٹھائی تو قبرستان میں پھیلی ہوئی نئی پرانی قبروں پر دھوپ پھیل رہی تھی۔ اور کتبو
سائے سب لمبے لمبے تھے۔ اور جب دوسری سمت سنگ تراش کے احاطے کی جانب اس نے نظر اٹھانے کی ہمت کی تو مردانی قبر کا بھاری بھرکم تعویذ جو
دھرا تھا لیکن اس کے پہلو سے زنانی قبر کا تعویذ غائب تھا جس کو وہ فوری محسوس بھی نہ کر سکا۔ لیکن پھر اسے خیال آہی گیا کہ یہاں کچھ اور بھی تھا۔

اداسیوں نے جیسے چاروں طرف سے اس پر یلغار کر دیا تھا۔ اس کا عالم یہ تھا جیسے اسے کوئی گلے لگالے تو وہ رو پڑے گا لیکن وہاں ت
بھاری بھرکم تعویذ کے سوا اس کا اپنا تھا بھی کون۔ کسی راہ رو کو اس کی دلی کیفیات اور جذبات سے واقفیت حاصل کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ ا
بغیر روئے ہی ایک بوجھ سا اپنے دل و دماغ پر اٹھائے چپکے سے آفس پہنچ گیا اور اتنا اداس رہا کہ دوپہر کو انٹرول میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ نہ ا
کھانا کھایا نہ بات ہی کی۔ اس نے دل ہی دل میں محسوس کیا کہ پانچ دن تک اس جانب نظر نہ اٹھانے کا تہیہ کرکے اس نے کوئی اچھا کام نہیں کیا۔ ان پانچ دنو
اس نے غیر ارادی اور غیر شعوری طور پر کچھ ایسی امیدیں وابستہ کر لی تھیں کہ چھٹے دن پتھر کے منحوس تعویذ کو نہ دکھلانے کا اس کی آنکھوں نے جیسے ا
معدہ کر رکھا تھا۔ لیکن آج انہیں آنکھوں نے پھر وہی تعویذ دکھلایا تھا۔ اس کو لمحے بھر کے لئے اندھوں کی قسمت پر رشک آیا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے
کو اپنا یہ خیال بڑا مضحکہ خیز معلوم ہوا۔ ساتھ ہی کچھ دیر بعد اس کو یہ خواہش ضرور ہوئی کہ میں نے دنیا تو دیکھ لی ہے، چاند ستارے، سورج، جھاڑ،
آگ، پانی، بادل، ہوا، زمین آسمان، پھول پھل، بیوی، بچے اور اس کے بعد اگر میں اندھا ہو جاتا تو میری بقیہ زندگی قبر کے اس تعویذ کو دیکھے
ہی سکھ چین اور آرام و خوشی سے گزر جاتی اور اس کو اپنے بینا ہونے پر دکھ سا ہوا۔

آفس ختم کرکے جب وہ لوٹنے لگا تو اس نے قریب قریب اپنی شکست تسلیم کر لی تھی۔ وہ اس طرح سوچنے لگا تھا کہ اس کو یک لخت اس
راستے سے آمد و رفت بند کر دینی چاہیئے۔ ایک عجیب سا تنہائی کا احساس اس کے وجود کو دنیا کی چہل پہل سے اس طرح جدا کر رہا تھا جیسے دنیا
نہ ہو ایک وسیع و عریض قبرستان ہو جس میں دھری ہوئی اپنی میت کو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔

ضد نہ کرو۔ اس کا دل اس سے کہہ رہا تھا۔ اس راستے سے گزرنا ہی چھوڑ دو۔ کچھ ہی دن میں تم بھول جاؤگے کہ وہاں کوئی قبرستان ہے ج
کے سامنے ہی سنگ تراش کی دوکان ہے اور اس دوکان کے احاطے میں پتھر کا ایک بھاری بھرکم تعویذ ہے جس نے تمہاری زندگی اجیرن کر دی ہے
لیکن عقل نے پھر دلیلوں کا سہارا لیا۔ تم تو پڑھے لکھے آدمی ہو اور اس بات پر تیار ہو چکے ہو کہ اب تم بزدلوں کی سی زندگی گزارو گے۔ ایک واہمہ جب ذ
میں جاگزیں ہوتا ہے تو ہزار واہمے دامن دل تھام کر ساتھ ساتھ چلنے لگتے ہیں۔ تم نے کاش اتنا علم حاصل نہ کیا ہوتا۔ اپنی ساری کتابیں جلا دو۔۔ علم کی توہ
انسان کی توہین ہے۔ اور انسان رب العزت کا نمائندہ خصوصی ہے اور تم۔۔۔

"چلو میں بھی شہر چل رہا ہوں۔" اس کے دوست نے پیچھے سے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ اور وہ چونک پڑا جیسے سینے پر پتھر کا تعویذ آ لگا ہو۔
منٹ بھر میں اس نے اپنے حواس درست کئے اور دوست کا ساتھ اس کے لئے ہمت اور طاقت بن گیا لیکن یہ طاقت بھی زیادہ اس کی اپنی ہو کر نہ
رہ سکی۔ جب وہ اس موڑ پر پہنچے جہاں گمان میں سے ہو کر انہیں اسی قبروں والے راستے سے گزرنا ہوتا تھا تو اس کے دوست نے اپنی سائیکل اسی سمت رکھتے ہوئے

گھمالیا کہ "آؤ تمہیں ایک قریبی راستے سے لے چلوں۔ شاید تم واقف ہی نہ ہو۔" تو وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا اور خاموشی سے اپنی سائیکل بھی اسی سمت موڑ لی۔

اس کا دوست دنیا بھر کی باتیں کر رہا تھا اور وہ ہوں ہاں کئے جا رہا تھا۔ اگر وہ پوچھ بیٹھتا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں تب بھی وہ اسی طرح ہوں ہاں کرتا جیسے دوست کی کسی بات سے اتفاق کر رہا ہو۔

ایک بار تو اس کا جی چاہا کہ اپنے ساتھی کو روک کر وہ سائیکل سے اتر پڑے اور اس کے سینے پر سر رکھ کر دل کا بوجھ ہلکا کر لے جو اس کی آنکھوں کے راستے بہہ جانے کے لئے تُلا کھڑا تھا اور اس سے کہہ دے کہ آؤ ہم اس تعویذ کو اٹھا کر کسی دریا میں پھینک آئیں تاکہ میں۔ تاکہ میں کچھ اور زندہ رہ سکوں۔ وہ یہی سوچتا ہوا جب سنگ تراش کے احاطے کے قریب پہنچا تو اس کو خبر بھی نہ ہوئی کہ اس نے اتنا راستہ طے کر لیا ہے — وہ اپنے ساتھی سے تو کچھ نہ کہہ سکا۔ خود اپنے آپ سے اس نے اتنا کہا کہ اب میں کبھی اس راستے سے نہ آؤں گا۔ اور جب آخری بار دزدیدہ نگاہوں سے اس نے احاطے کی طرف نظر کی۔

آں — اس کی زبان سے اس طرح نکلا کہ اس کے ساتھی نے بھی اس کی آواز سن لی۔

"کیا بات ہے — ؟" اس کے ساتھی نے پوچھا۔

لیکن کچھ جواب دیئے بغیر بریک لگا کر اضطراری کیفیت میں وہ اپنی سائیکل سے کود پڑا تھا۔

سنگ تراش کے احاطے میں مردانی قبر کا وہ بھاری بھرکم تعویذ موجود نہ تھا۔

"تم جاؤ — میں ذرا یہاں ٹھہروں گا۔ مجھے کچھ کام ہے۔" اس نے اپنی خوشی کو چھپاتے ہوئے اپنے ساتھی سے کہا۔

اس کے ساتھی نے بغور اس کو دیکھا اور کچھ سمجھے بغیر چلا گیا تو اس نے سنگ تراش کے احاطے کا رُخ کیا۔ جب وہ اطمینان سے قدم اٹھاتا ہوا چھوٹی سی پتھریلی حصار کی قریب پہنچا تو اس کے ایک دوست نے باہر نکلتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"خیریت تو ہے ؟"

ہاں بھئی اللہ کا احسان ہے۔ اس نے اس نو وارد کو پہچانتے ہوئے جواب دیا۔ پھر اس کو خیال آیا کہ اسے بھی تو خیر خیریت پوچھنی چاہئے۔ جبکہ اس کا دوست سنگ تراش کے احاطے سے نکل رہا تھا، اور اس نے فوری سوال کیا۔

"کیا بات ہے، سب خیریت سے تو ہیں نا — تم اس احاطے میں کہاں گئے تھے۔

اس کا دوست کچھ کہے سنے بغیر اس کے برابر سے گزرنے لگا تو اس نے اس کی بانہہ پکڑ کر بڑی نرمی سے پوچھا۔

"کچھ تو بتاؤ — تم اتنے دل گیر کیوں ہو ؟"

اس کے دوست نے رک کر نظریں اٹھائیں تو وہ آبدیدہ تھا۔ کچھ دیر توقف کر کے جب وہ اپنے جذبات پر قابو پا سکا تو اس نے کہا۔ ریاضت مر گیا ہے۔"

"کب ؟"

"آج پانچواں دن ہے۔ آج ہم نے اس کی قبر بھی پختہ بنوادی ہے۔"

"کیسا کڑیل جوان تھا یار۔" اس نے افسوس کرتے ہوئے اس طرح کہا جیسے خود اپنی ہی آواز نہیں پہچان رہا ہو۔

اس کے دوست نے کچھ سنبھل کر پھر کہنا شروع کیا۔

"آج فاتحہ ہے۔ میں اس کی قبر پر ہی جا رہا ہوں۔ آج ہم نے اس کی قبر کا تعویذ یہیں سے خریدا تھا۔ اور اب کتبہ دیکھنے کے لئے آیا تھا لیکن کوئی اچھا کتبہ یہاں نہیں ہے۔"

"چلو میں بھی چلتا ہوں۔" اس نے مری ہوئی آواز میں کہا۔
جب وہ قبر پر پہنچے تو کچھ اور لوگ بھی موجود تھے۔
ہاتھ اٹھا کر جب وہ فاتحہ دے رہا تھا تو اس کے سامنے ہی مردانی قبر کا وہ بھاری بھرکم تعویذ پھولوں سے ڈھکا ہوا، آبدیدہ انسانوں کے درمیان دھرا تھا اور اس کے ذہن میں یہ خیال بار بار ابھر رہا تھا کہ وہ آخری بار اس تعویذ کو دیکھ رہا ہے اور اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔
لیکن اس پر کوئی یہ تہمت کیسے لگا سکتا تھا کہ اس کے یہ آنسو صرف غم و اندوہ کا اظہار نہیں ہیں بلکہ کسی ڈھکی چھپی خوشی کا سبب بھی ہیں۔

ادب کا اعلیٰ معیار ہمارا معیار ہے

اور

نیا دور کا نام اس معیار کی ضمانت ہے

نیا دور کراچی

کا تازہ شمارہ ۳۵-۳۶ شائع ہو گیا

اس میں پاکستان اور ہندوستان کے بہترین لکھنے والے اپنی
معیاری اور اعلیٰ تخلیقات کے ساتھ شریک ہیں۔

اپنے قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیے یا براہ راست ہمیں لکھیے

منیجر "نیا دور" کراچی

آثم مرزا
کامران سرگودھا

لاڈلا اور کھلونے

میز کی بلوریں سطح پر مختلف سائز کی کئی تصویریں بکھری ہوئی تھیں۔ اور مقبول چھوٹا سا سر ہلاتے ہوئے ان تصویروں کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ گزرے ہوئے حادثے کے نقوش مٹ چکے تھے اور نئے کھلونے کے حصول کی ترنگ اس کے چھوٹے سے سر کو میکانکی انداز میں ہلا رہی تھی۔ اس کے دائیں طرف سیٹھ منظور بیٹھا اسے شہ دے رہا تھا۔ اور بائیں طرف بیٹھی ہوئی عصمت اسے نئے انتخاب کے لئے ابھار رہی تھی۔ منظور نے ہولے سے اس کا شانہ تھپتھپا کر کہا "ہاں بیٹا۔ بتاؤ بھی نا.... کون سی تصویر پسند ہے۔ ہم اسی کو اپنے بیٹے کے لئے خرید لائیں گے۔ عصمت بڑے پیار سے بولی "تم تو ماشاءاللہ بہت سمجھ دار ہو۔ ایک دو تین چار ہم سب تیرے لئے لے آئیں گے"۔.. مقبول یوں ان تصویروں پر نظریں گھما رہا تھا جیسے یہ تصویریں البم پر چپکی ہوئی رنگین پروں والی تتلیاں ہوں۔ جن کا نقش و نگار تصورات کی پرکیف وادی میں پہنچا دیتا ہے۔

چھ ماہ پہلے بھی اسی طرح منظور نے اپنے بیٹے کے سامنے بہت ساری تصویریں ڈال کر پوچھا تھا "مقبول بیٹا! ان میں سے کون سی تصویر تمہیں پسند ہے؟ اب تم جوان ہو گئے ہو۔ گھر میں ایک اور فرد کا اضافہ ہو جانا چاہئے۔ سمجھ گئے ہو نا؟ اور مقبول اپنا چھوٹا سا سر ہلا کر یوں ہنس پڑا تھا۔ جیسے کھلونے کو چابی بھر کر چھوڑ دیا ہو۔ ایک کھلونا دوسرے کھلونے کو پسند کرنے کا بھلا کیا شعور رکھتا ہے۔ ایسا انتخاب تو ایک باشعور نوجوان کے رومان پرور خوابوں کی معراج ہوتا ہے اور مقبول کو تو یہ تک احساس نہیں تھا کہ اس کی اپنی حیثیت کا دارومدار کن جزئیات کا حامل ہے۔ وہ تو خود دوسروں کے لئے ایک کھلونے سے کم نہ تھا۔ جس کی مضحکہ خیز حرکات سے سنجیدہ سے سنجیدہ آدمی بھی مسکرانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔.. وہ ایک رئیس زادہ تھا۔ مل کے مالک کی پلوٹھی کی اولاد تھا۔ اس لئے لوگ اسے دیکھ کر صرف مسکرا کر رہ جاتے تھے۔ کوئی اس پر پھبتی نہ کستا تھا۔ اپنے تلخ مذاق کا نشانہ نہ بناتا تھا۔ اگر اس کی پیدائش کسی غریب گھر میں ہوئی ہوتی تو آج کوئی پیشہ ور فقیر اسے معقول کمیشن پر حاصل کر چکا ہوتا۔ اور شاہ دولہ کے چوہے کی حیثیت سے وہ ایک نفع بخش سودا سمجھا جاتا۔ وہ شاہ دولہ کا چڑھاوا تو نہ تھا۔ نہ ہی اس کے ماں باپ نے کوئی ایسی منت ہی مانی تھی۔ پھر بھی جب وہ پیدا ہوا تو اس کا سر اتنا چھوٹا تھا کہ لیڈی ڈاکٹر کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔ وہ سیٹھ منظور کا بیٹا تھا۔ اس لئے سب کے لئے قابلِ تحسین تھا۔ اس کی پرورش پر کئی نوکر معمور تھے۔ اس کے ہوش سنبھالنے پر سیٹھ منظور کی دولت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ بونس وغیرہ کی آمدنی کا شمار ہی نہ تھا۔ اور ایسے آدمی کا بیٹا خواہ کیسی ہی شکل و صورت کا ہو قابلِ تعظیم ہوتا ہے۔ لوگ یوں اس کی تعریف کرتے تھے جیسے وہ کوئی الف لیلوی شہزادہ ہو جو کوئی جادوئی مہم سر کر کے دارالخلافہ میں داخل ہوا ہو۔ ماں باپ کا وہ بے حد لاڈلا بیٹا تھا۔ اسے کانونٹ میں داخل کر دیا گیا۔ لیکن وہ کچھ بھی نہ لکھ پڑھ سکا۔

وہ کوئی حرف سمجھنے کے قابل نہ تھا۔ اس کی زبان سے کوئی لفظ صحیح طور پر ادا نہ ہوتا تھا۔ گھر ہی میں اس کی تعلیم کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ نفسیات کے ایک پروفیسر کو اس کا اتالیق مقرر کیا گیا... سب کو یقین تھا کہ مقبول حروف تہجی اب جلد سیکھ لے گا۔ کیونکہ اسے تعلیم کی طرف راغب کرنے کے نئے نئے طریقے آزمائے جا رہے تھے۔ مقبول پہلا قاعدہ کھول کر بیٹھتا تو نہ جانے اس پر کیا جنون سوار ہوتا۔ کہ قاعدے کے دو ٹکڑے کر کے کھلونوں سے کھیلنا شروع کر دیتا تھا۔ پروفیسر کو اس ٹیوشن کے ختم ہونے کا ہر وقت خدشہ لگا رہتا تھا۔ انتہائی کوشش کے باوجود وہ کامیاب نہ ہو سکا تھا آخر ایک دن اس نے اپنی شکست کو تسلیم کر لیا تھا سیٹھ منظور نے اسے کوئی اہمیت نہ دی۔ اس نے صرف اتنا کہا تھا۔ پروفیسر! تم میرے بیٹے کے ٹیوٹر بنے رہو گے تمہیں جواب دے کر میں اپنے وقار کو نہیں گرا سکتا۔ دوسرے بچوں کو بھی تمہاری ضرورت ہے"۔ مقبول جوان ہو رہا تھا۔ لیکن اس کی حرکات و سکنات اب بھی مجذوبانہ تھیں۔ بعض دفعہ تو وہ یوں کھلونوں کے علاوہ آرائش کی چیزوں کو توڑ پھوڑ دیتا تھا۔ جیسے کسی کی دیوانگی انتہا سے بھی گذر گئی ہو۔ اگر پھر بھی کوئی اسے اف تک کہنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ بیگم منظور تو اس کی ایسی حرکات پر نہال ہو ہو جاتی تھی۔ ہر وہ کام جسے کر کے مقبول خوشی سے اچھلنے لگتا تھا۔ بیگم منظور کے لئے مسرت کا باعث بن جاتا تھا۔ خواہ اس میں کتنا ہی نقصان اٹھانا پڑتا۔ اس کی ذرہ بھر پرواہ نہ کی جاتی تھی... اس کے لئے نئے ماڈل کی الگ کار خریدی گئی تھی۔ اپنے ٹیوٹر کے ساتھ جب وہ چمکیلی کار میں بیٹھ کر سیر کو نکلتا تو لوگ اس کی قسمت پر رشک کرنے لگتے۔ کار میں بیٹھے ہوئے جب وہ عجیب انداز میں چھوٹا سا سر ہلانے لگتا تو پروفیسر بھی بڑی مشکل سے ہنسی پر قابو پا سکتا ہے۔ اور دیکھنے والے اسے تماشہ سمجھ کر بھی اس کی امارت کے دبدبہ سے مرعوب ہو کر حقارت کا نشانہ نہ بنا سکتے تھے۔ بیگم منظور نے ماں کے احترام کی خاطر بیٹے کی شادی کا فیصلہ کر لیا کسی نے مشورہ دیا تھا کہ بیوی کا قرب ہو سکتا ہے۔ مقبول کو شعوری طور پر آدمیت کے دائرے میں لے آئے۔ سیٹھ منظور کو بھی اس مشورہ نے مسرور بنا دیا تھا۔ بیٹے کے لئے ایک زندہ کھلونا حاصل کرنا اس کے لئے کوئی دشوار مرحلہ نہ تھا۔ اسے یقین تھا کہ ایک دفعہ اشارہ ہونے پر ہی لڑکیوں کے باپ اس کی کوٹھی کا طواف کرنے لگیں گے۔ وہ جانتا تھا کہ دولت تو ہر معیوب فعل کو بھی نیکی ثابت کر دکھاتی ہے۔ اور کنواری لڑکی کی تو اس دور میں وقعت ہی کچھ نہیں.. خوشامدیوں نے ہر ایک کے کان تک یہ خبر پہنچا دی۔ کسی لڑکی کے باپ نے بھی چھوٹے سر والے بے شعور لڑکے کے متعلق پوچھ گچھ نہ کی۔ سب ہی سیٹھ منظور کی امارت کے گن گانے لگے تھے۔ چھوٹے طبقہ میں تو ان پڑھ لڑکیوں کو مالدار بوڑھوں کے پلے باندھنے کی رسم چلی ہی آ رہی ہے۔ لیکن اونچے طبقہ کی تعلیم یافتہ لڑکیوں کو مقبول جیسے نوجوان لڑکے کا کھلونا بنانے کے لئے لمبی ناک اور اکڑی ہوئی گردنوں کے لوگ ظلم کے مفہوم کو بدل چکے تھے... سیٹھ منظور کو امید سے بڑھ کر کامیابی حاصل ہوئی تھی.. ملنے جلنے والوں کے علاوہ دوسرے باحیثیت لوگوں کے تقاضے بھی بڑھتے جا رہے تھے۔ سیٹھ منظور کسی کو بھی ناراض کرنا نہ چاہتا تھا۔ لیکن مقبول کے لئے دلہن تو ایک چاہئے تھی۔ باقی لڑکیوں کے باپ کیسے خوش رہ سکتے تھے۔ اسے ایک ترکیب سوجھی اس نے سب لڑکیوں کی تصویریں حاصل کر لیں اور انتخاب کا فیصلہ مقبول پر چھوڑ دیا۔ مقبول کو کچھ علم نہ تھا کہ اس کے لئے کیا کیا جا رہا ہے دلہن کون ہوتی ہے۔ اور عورت کا قرب کس جذبہ کا رہین منت ہے۔ اپنے سامنے بکھری ہوئی تصویروں کو دیکھ کر اس نے انہیں بھی کھلونے ہی سمجھا تھا۔ اپنی قسمت کا فیصلہ سننے کے لئے کئی اونچے سر خمیدہ ہو گئے تھے۔ اور کئی لڑکیوں کے نازک سینے دھکتا ہوا لاوا بن گئے تھے۔ سیٹھ منظور اور عصمت کے بار بار شہ دینے پر۔ مقبول نے عجیب انداز سے چھوٹا سا سر ہلا کر ہنسی نکال لی۔ اور پھر میکانکی انداز میں ایک تصویر اٹھا کر ہوا میں اچھال دی۔ عصمت جلدی سے اپنی جگہ سے اٹھی۔ ساڑھی کا پلو اس کے پاؤں میں الجھ گیا۔ اور سیٹھ منظور نے بیگم کو تھامنے کی بجائے تصویر قالین پر سے اٹھائی۔ عصمت کو گرنے سے چوٹ تو آئی تھی۔ لیکن درد کی لہر انبساط کے بوجھ تلے دب کر رہ گئی تھی۔ لڑکی انتہائی خوبصورت اور جاذب نظر تھی۔ تصویر میں چست لباس پہنے وہ یوں بیٹھی تھی۔ جیسے ابھی معطر ہوا کا جھونکا بن کر فضا میں پھیل جائے گی۔ عصمت نے فرحت و مسرت سے جھوم کر نام پڑھا نجمہ ارشاد علی۔ بی۔ اے (آنرز) مشغلے فوٹو گرافی۔ تیراکی۔ اور انگریزی رسائل کا مطالعہ.... اس کے بعد ارشاد علی کا تعارف تھا۔ ارشاد علی مالک فرم۔ ڈبل اے کارپوریشن امپورٹر اینڈ ایکسپورٹر.... ہائی کلاس آرائشی سامان.... نجمہ اور ارشاد علی کے تعارف کی سیٹھ منظور کو

کوئی ضرورت نہیں تھی۔۔۔۔ وہ کوئی بھی ہوتے اس سے سیٹھ منظور کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اسے تو اپنے لاڈلے کے لئے ایک کنواری لڑکی کا رشتہ مطلوب تھا۔ اور اس کا انتخاب مقبول نے خود ہی کر لیا تھا۔ "مبارک ہو بیگم۔ ہمارا لاڈلا کافی سمجھدار بن گیا ہے۔۔" "ہاں تو۔۔۔ دیکھئے نا۔ نجمہ سب لڑکیوں سے زیادہ خوبصورت اور صحت مند ہے۔ میں تو پہلی نظر تصویر پر ڈال کر ہی اسے پسند کر چکی تھی۔" "ہمیں کسی کی دولت سے تو کوئی سروکار نہیں۔ مقبول تو ہمارے گھر میں خوش بختی کا منبع ہے۔ دیکھتی نہیں ہو۔ اس کی پیدائش کے بعد سے کاروبار کتنا عروج کرتا جا رہا ہے۔ اس کی خاطر تو ہم کو آسمان سے تارے توڑ لانے سے بھی دریغ نہیں کرنا چاہئے۔" مقبول کے لئے وہ آسمان کے تارے تو کیا توڑ کر لا سکتے تھے۔ البتہ زمین کا ایک تابندہ ستارہ انہوں نے نوچ لیا تھا۔۔۔ وسیع پیمانہ پر شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ ارشاد علی کو یوں مبارک باد کے پیغام مل رہے تھے۔ جیسے ڈربی کی لاٹری اس کے نام نکل آئی ہو۔ اور وہ لڑکیاں، جو سیٹھ منظور کی دولت کا تصور کر کے مستقبل کو درخشاں بنا رہی تھیں۔ یوں نجمہ کے متعلق سوچنے لگی تھیں جیسے سوت کی جلن کسی عورت کو انتقام کی جوالا بنا دے۔۔ نجمہ سے کسی نے بھی اس رشتہ کے متعلق مشورہ نہ کیا تھا۔ اسے ضروری بھی نہ سمجھا گیا تھا۔ سیٹھ منظور کی حیثیت غیر معروف نہ تھی۔ کہ اس کے متعلق کرید کرید کر حالات معلوم کئے جاتے۔ اور جب سوسائٹی کا یہ معیار رہ گیا ہو کہ عورت کو نئے نئے فیشن کے وافر ذرائع حاصل ہوں۔ تو پھر اسے اور کسی چیز کی حاجت محسوس نہیں ہوتی۔ اس صورت میں ایسی مالدار اسامی کو ہدف تنقید بنانے کی گستاخی کیسے کی جا سکتی ہے۔ نجمہ کو اندھیرے میں نہ رکھا جا سکتا تھا۔ وہ باشعور اور ماحول کو پرکھنے والی لڑکی تھی پس منظر کے بھیانک سائے اس کے ارمانوں کے گرد زہریلے سانپوں کی مانند لپٹ گئے تھے۔ ممی نے ہزار تسلیاں دیں لیکن نجمہ کے جذبات بہل نہ سکے اتنی اونچی اڑان کے باوجود لڑکی اس معاملہ میں ہر طبقہ میں ایک سی حیثیت رکھتی ہے۔ نجمہ کی کوئی پیش نہ چلی۔ اس کے فلسفے کا جواب فلسفہ سے دیا گیا۔ اس کی منطق کو جھٹلانے کے لئے منطق کا سہارا لیا گیا۔ تنقید برائے تنقید کا نتیجہ منفی نکلتا ہے۔ سیٹھ منظور نے ایک مصلحت کے تحت نکاح کی رسم پہلے ادا کروالی تھی۔ اور واقف کار یہ جانتے ہوئے بھی کہ مقبول کی بجائے سیٹھ نے تین بار "منظور" کا لفظ ادا کیا تھا۔ خاموشی سے اس حادثہ کے اثرات کو مٹا رہے تھے۔۔۔ شادی کے موقع پر شہر کے تمام روساء مدعو تھے۔ بارات جس شان سے روانہ ہوئی تھی۔ شہر والوں کے پاس اس کی کوئی بھی مثال نہ تھی۔۔۔ نجمہ دلہن بنی۔۔۔ کار میں سوار ہوئی۔۔۔ سسرال پہنچی۔۔۔۔ لیکن مقبول کو کچھ علم نہ تھا کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے۔ کیوں ہو رہا ہے۔۔۔ اور کس کے لئے ہو رہا ہے۔ کبھی وہ سہرے کے پھولوں سے کھیلنے لگتا۔۔ کبھی اپنے ٹیوٹر کا منہ چڑانے لگتا۔ کوٹھی کو یوں سجایا گیا تھا جیسے جشن فتح کا اہتمام کیا گیا ہو۔۔۔ فروری کا آخر تھا۔۔۔ موسم سرما مڑ مڑ کر دیکھتا جا رہا تھا۔ اس کی منزل قریب الاختتام تھی۔ ایسے سہانے موسم میں عجیب سی آسودگی کا احساس کپکپاہٹ سی بن کر جسم میں مچلنے لگتا ہے۔ اور نجمہ بھی کبھی ایسی ہی لذت آمیز کپکپاہٹ سی محسوس کیا کرتی تھی لیکن اب تو وہ پسینہ میں شرابور تھی۔ گھٹن سے اس کا سانس رک رک کر چل رہا تھا۔ وہ خود کو ایک مقتل میں پا رہی تھی۔ اور تلوار کی ایک تیز چمک موت کا موجد بن کر اس کی آنکھوں میں پھیل رہی تھی۔۔۔ مہمان کچھ چلے گئے تھے۔ کچھ کھانے سے فارغ ہو کر خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ عصمت نے نجمہ کے پاس بیٹھی ہوئی دو تین لڑکیوں کو باہر جانے کا حکم دیا۔ اور اس کے سامنے آبنوسی صوفے پر بیٹھ گئی۔ پہلے بھی وہ یہاں کے کئی چکر لگا گئی تھی۔ نجمہ کو ہنسانے کی خاطر مجسم لطیفہ بن چکی تھی۔ لیکن اتنی فرصت نہ ملی تھی کہ اس کے پاس جم کر بیٹھ سکے۔ اب کوئی رکاوٹ باقی نہ رہی تھی۔ اب رہ گئیں وہ دونوں ہی تھیں۔ ایک بہار کا حسین گیت دوسری خزاں کا دردیلا نوحہ۔ عصمت نے بڑے پیار سے کہا۔ "نجمہ" "بیٹی۔ مجھے تم جیسی عقلمند بہو ہی کی ضرورت تھی۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ آج ہم اپنی مراد کو پہنچ گئے ہیں۔ نجمہ کا سر اور جھک گیا۔ عصمت نے اس پر نظریں مرکوز کر دیں۔ دیکھو نا بیٹی عورت کو جب ہر طرح کی آسائش میسر ہو تو شوہر کے لاابالی پن کو وہ کوئی وقعت نہیں دیتی۔ مقبول دوسروں کی نظروں میں خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، ہمارے جگر کا ٹکڑا ہے۔ وہ اس گھر کا مالک ہے۔ چار بہنوں کا اکیلا بھائی ہے۔ ساری جائداد کا وارث ہے۔ اور اس کا پارٹنر بھی، اپنے پیار کی بدولت وہ حیثیت اختیار کرے گا۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟ نجمہ کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا پھیلنے لگا تھا۔

عصمت نے پہلو بدل کر سنجیدہ لہجہ میں کہا۔ مقبول کچھ بھی ہو اب تمہارا شوہر ہے۔ تمہیں اس کا بہی خواہ بننا ہوگا۔ وہ تمہارے پیار کا محتاج ہے۔ اس کے ہر مذاق کو برداشت کرنا ہوگا۔ اور اس کے عوض تمہیں اتنا کچھ ملے گا کہ تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتیں۔ کسی جاہل کو سمجھانا واقعی دشوار ہوتا ہے۔ لیکن تم جیسی عقلمند لڑکی اپنا مقام خود حاصل کر لیتی ہے... جب وہ جانے لگی تو نجمہ کا جی چاہا کہ اس کا دامن پکڑ کر سسکیاں بھرنے لگے۔ لیکن وہ بت بنی بیٹھی رہی تھی۔ جیسے اس سے زندگی کی آخری رمق بھی چھین لی گئی ہو۔ مقبول اس کے لئے بھربھری مٹی کا ڈھیلا تھا۔ جس سے نہ تو برتن بنایا جا سکتا تھا نہ اس میں بیج ہی اگ سکتے تھے... کمرہ کی معطر ہوا میں وہ مقبول کے ہوتے ہوئے بھی خود کو اکیلا پا رہی تھی۔ جیسے تاریک کھنڈر میں راستہ بھول کر وہ بھٹک رہی ہو۔ اس نے خود کو بہت دلاسا دیا۔ تسلیوں کے نظر فریب کھلونوں سے بہلایا۔ بے شمار دولت کے تصور سے جذبات کو سرد بنانے کی کوشش کی۔ لیکن اسے محسوس ہو رہا تھا کہ ارمانوں کی بے حرمتی کا جرم اسے کہیں کا بھی نہیں رکھے گا۔ پیار بھرے دو بول دنیا کی ساری دولت دے کر بھی حاصل ہو جائیں تو یہ سودا مہنگا نہیں پڑتا۔ اور اب تو وہ جان چکی تھی کہ وہ ساری عمر یہ دو بول حاصل نہیں کر سکے گی۔ تشنگی کی اذیت اس کی روح کو زخمی کرتی رہے گی۔ یہ زخم پھیلتے رہیں گے اس کی ساری کائنات پر محیط ہو جائیں گے... اور وہ اپنی اصلیت کھو بیٹھے گی۔ اتنی لمبی عمر تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد اس نے کیا پایا تھا۔ بہاروں کی سندرتا نے اس کے سینے کی وسعتوں میں خوش رنگ پھولوں کے کئی پودے لگائے تھے۔ اور پھولوں کی مہک سے وہ ہر گوشے کا دامن بھر لینا چاہتی تھی۔ مگر مقبول کے قرب نے سارے پھولوں کو مرجھا دیا تھا۔ سارے نغموں کو چیخوں میں بدل دیا تھا... اب اس کے پاس کچھ بھی نہ رہا تھا۔ اس کی تخلیقی صلاحیت بھی خوف اور دہشت نے چھین لی تھی۔ وہ مقبول کو اپنے قریب یوں محسوس کرتی تھی جیسے وہ کھوہر کا پھول ہو... ان گنت باریک کانٹوں والا پھول جس کے چھو جانے سے انگ انگ زہریلی پھانس بن جاتا ہے۔ وہ اس کے سامنے اپنے جذبات کی گھٹن واضح نہ کر سکتی تھی۔ پیار کی وارفتگی کا مظاہرہ نہ کر سکتی ہے۔ خود سپردگی کے شدید احساس کو دبا کر اس کا دماغ پھٹنے لگتا تھا۔ اور جھنجھلا کر جب وہ مقبول کو دبوچ لیتی تو وہ پاگلوں کی مانند ہنستا ہوا.... کسمسانے لگتا۔ اور پھر نجمہ کے بازو کو دانتوں میں دبا لیتا۔ نجمہ کو اس وقت درد کی بجائے عجیب لذت سی ملتی اور جب مقبول چیخ پڑتا، اور خود کو چھڑا کر اس کے بال نوچ لیتا تو معلوم ہوتا تھا کہ پاگل وہ نہیں بلکہ نجمہ پر کسی آسیب کا سایہ ہے۔ اور وہ حال کھیلتے ہوئے نڈھال ہو گئی ہے... مقبول باہر بھاگ جاتا۔ اور نجمہ عصمت کو اپنے قریب پا کر آنسوؤں کو پینے میں ناکام رہتی تھی۔ عصمت اسے تسلی دیتی۔ تمہارے لئے امریکہ سے جدید قسم کا کیمرہ منگوایا ہے۔ موویز کیمرے کے لئے بھی آرڈر دے دیا ہے۔ تم نے سومنگ پول کے لئے جگہ کا انتخاب تو خوب کیا ہے... نجمہ کے آنسو نہ تھمتے تھے۔ اور عصمت اسے حقائق سے فرار کی راہیں بتاتی رہتی تھی... نجمہ کے لئے زیبائش کی جدید طرز کی ہر چیز مہیا کر دی گئی تھی۔ زیورات اور کپڑوں کا حساب ہی نہ تھا۔ اس کا کمرہ ہر وقت مہکتا رہتا تھا۔ اور یہ سارا سامان اسے جذبات کی بے حرمتی کا طعنہ دیتا تھا۔ ارمانوں میں آگ سی لگ جاتی تھی اور خود پر قابو نہ پاتے ہوئے وہ اپنی سسکیوں سے وقت کے نرم آنچل کو بوجھل بنا دیتی تھی... اسے اکیلے کہیں پر گھومنے کی اجازت نہ تھی۔ وسیع کوٹھی کے علاوہ وہ کہیں بھی اپنی مرضی سے نہ جا سکتی تھی۔ سیٹھ منظور کے وقار کو نجمہ کی سرکشی سے خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ مقبول اور اس کے ٹیوٹر کے ہمراہ البتہ اسے ہر جگہ جانے کی اجازت تھی۔ ور نجمہ کے لئے وہ لمحہ انتہائی اذیت ناک بن جاتا تھا۔ جبکہ اسے مقبول کے ساتھ کہیں جانے کا زبردستی پروگرام بنانا پڑتا تھا۔ اس نے اپنی طرف سے ہر جتن کر کے دیکھ لیا۔ لیکن اس ماحول سے سمجھوتہ کرنے پر وہ اپنے آپ کو آمادہ نہ کر سکی اور اسی کش مکش میں ایک دن چپکے سے اس کی زندگی کے اندھیروں میں ایک کرن داخل ہو گئی۔ مقبول کا ٹیوٹر پروفیسر ضیا اس کی توجہ کا مرکز بنتا گیا اور اس کے اکیلے پن کے سناٹے میں پازیب کی جھنکار سحر کن نغموں کی تخلیق کرنے لگی... پہلے دفعہ سینما ہاؤس کے بکس میں بیٹھے ہوئے ایک جذباتی منظر پر اس کی پلکیں بھیگ گئی تھیں۔ "ہمت سے کام نجمہ۔" ضیا نے اپنا معطر رومال اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا تھا۔ دولت ہی سب کچھ نہیں ہے اس معاملہ میں میں بھی تمہارا ہم خیال ہوں۔ لیکن مجبوری کے تحت ہم دونوں اس راستہ پر قدم اٹھا رہے ہیں۔ ضیا کے لہجہ میں ایسی گھلاوٹ تھی۔ ایسی نغمگی تھی۔ ایسی ہمدردی تھی کہ نجمہ چونک کر

اس کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ نجمہ ان دونوں کے درمیان بیٹھی تھی۔ اور مقبول جانور کی مانند سر ہلا رہا تھا۔ نجمہ کو محسوس ہوا تھا جیسے قحط زدہ زمین کے ہونٹوں پر ساون کی بوندوں کا ٹھنڈا لمس پھیلتا جا رہا ہے۔۔۔ اس کے بعد وہ بغور ضیا کی حرکات و سکنات کا مطالعہ کرنے لگی۔ وہ اگرچہ عمر میں اس سے کئی سال بڑا تھا۔ لیکن تشنگی کی پگڈنڈی پر وہ اس کے ساتھ قدم ملا کر چل رہا تھا۔ نجمہ کی زندگی کی گرتی ہوئی بلوریں محراب کو سنبھالا مل گیا۔

سوئمنگ پول تیار ہو گیا تھا۔ افتتاحی پروگرام بڑا شاندار بنایا گیا تھا۔ نجمہ نے اس شام خود کو یوں سجایا تھا جیسے حسن کی پریڈ میں اول آنے کا اسے بھرپور یقین ہو چکا ہو۔۔۔ یہ سب کچھ مقبول کے لئے نہ تھا۔ بلکہ ضیا کی ضیا پاشیوں میں جذب ہو جانے کا بہانہ تھا۔ اس رات ضیا دیر تک مقبول کے پاس رہا تھا۔ اور نجمہ اس کے شانے پر معطر زلفیں بکھرائے پیار کے پہلے لمس کو امرت بناتی رہی تھی۔ اور پھر ایک دن جب تینوں نے پکنک کا پروگرام بنایا تھا تو کسی کو بھی آنے والے لمحوں میں چھپے ہوئے تیز نشتر کا علم نہ ہو سکا تھا۔ ضیا نے پروگرام کے مطابق ہوائی جہاز میں نشستیں مخصوص کرائی تھیں۔ گھر سے وہ مقبرہ کے لئے روانہ ہوئے تھے۔ وہاں پہنچ کر پہلے وہ ٹیپ ریکارڈ بجاتے رہے۔ پھر کوئی ایک گھنٹہ بعد ضیا نے شوفر سے کہا۔ مقبول کا خیال رکھنا۔ میں ذرا باہر کا ایک چکر لگا کر آتا ہوں۔ نجمہ بھی کھڑی ہو گئی۔ میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گی۔ اس نے بھی شوفر کو مقبول کی حفاظت کی تاکید کی تھی۔۔۔ شوفر بہت دیر تک انتظار کرتا رہا۔ جب ان کے آنے کی امید نظر نہ آئی تو مقبول کو تنہا چھوڑ کر اس نے پہلے اندرونی حصہ کا چکر لگایا۔ پھر باہر نکل کر تلاش کیا۔ لیکن ان کا سراغ نہ مل سکا۔ مقبول کے پاس آ کر اس نے ساری چیزیں سمیٹیں۔ اور مزید انتظار کرنے کی بجائے وہ کوٹھی واپس پہنچنے کے لئے بے چین ہو گیا۔ مقبول وہاں سے جانا نہ چاہتا تھا۔ شوفر نے اسے زبردستی کار میں سوار کیا اور کوٹھی پہنچ کر ہی بریک لگائی۔ کئی دنوں تک ضیا اور نجمہ کا سراغ لگانے میں سیٹھ منظور کاروبار کو نظر انداز کئے رہا۔ لیکن کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ اور ایک بار ہمدردوں نے مشورہ دیا کہ ان کی تلاش فضول ہے۔ ان دونوں نے کوئی پناہ گاہ ڈھونڈھ لی ہے۔ مقبول اپنے ٹیوٹر کے بغیر پریشان نظر آنے لگا تھا۔ نجمہ کے کمرے میں جا کر وہ چپ سا ہو جاتا تھا۔۔۔ دولت کی نظر میں یہ حادثہ کوئی خاص اہمیت کا حامل نہ تھا۔۔۔ اور اب پھر مقبول کے سامنے بلوریں میز پر حسین و جمیل لڑکیوں کی تصویریں پڑی تھیں۔ سیٹھ منظور اور بیگم منظور اسے کسی ایک کے انتخاب کے لئے اکسا رہے تھے اور مقبول پھر کسی کی امنگوں کا خون کرنے کی خاطر چھوٹا سا سر ہلا کر ہنس رہا تھا۔۔۔

ناشر ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ شمس زبیری

سرورق ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ اختر ہلال زبیری

کتابت ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ محی الدین صابر

طباعت ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ انٹرنیشنل پریس کراچی

اشاعت ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ اپریل مئی ۱۹۶۵ء

مقام اشاعت

کاشانۂ اردو — ۲/۷ ۔ اکبر روڈ صدر کراچی

م۔م۔ راجندر

آج کل۔ دہلی

کہکشاں

جس وقت میں نے اسٹیشن سے باہر قدم رکھا، میرا بچپن لوٹ آیا اور میں نے دل میں ایک ان جانی سے تھرک محسوس کی۔ میں اسی چھوٹے سے شہر میں پیدا ہوا تھا اور اسی کی مٹی، گرد و غبار اور ہوا میں میری زندگی کے اٹھارہ سال بیتے تھے۔ تقریباً اتنے ہی برس ہوئے ہم نے اس شہر کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا تھا اور اب اس کے بعد میرا یہاں آنے کا پہلا اتفاق تھا۔ برسوں بچپن کے دوست اور اپنے گلی محلے یاد آتے رہے۔ اور وقت کی سرد مہری اور بے پناہ معروف زندگی نے بھی اس یاد کو نہیں بھلایا۔ بلکہ کبھی کبھی تو یہ یاد آنکھوں میں آنسو لے آتی تھی۔ اور بے اختیار جی چاہتا کہ جاؤں اور دیوانہ وار انہی گلیوں میں گھوموں، ان گھروں اور دیواروں کو دیکھوں جنہیں دل کی آنکھ ابھی تک دیکھتی تھی لیکن جہاں یہ جذباتی لمحے بیت جاتے، معروف زندگی کی چکی پھر چلنے لگتی اور یہاں آنے کی خواہش اس سے پہلے پوری نہ ہو سکی۔ اس بار بھی مجھے ایک کام سے آگے جانا تھا اور چونکہ یہ راستے میں پڑتا تھا، میں یہاں اتر پڑا تھا۔

اگرچہ ایک دو دور پار کے رشتے دار یہاں ابھی تک تھے۔ لیکن میرے لئے ان سے ملنے کی کوئی ایسی کشش نہیں۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ بچپن کے سب ساتھی بھی ادھر ادھر چلے گئے تھے اور شاید ہی کسی دوست سے ملاقات ہو مگر میں تو اپنے در و دیوار اور گلی کوچوں سے ملنے آیا تھا۔ میرا یہ عقیدہ تھا کہ ان کی بھی اپنی ایک ہستی، ایک وجود ہے اور یہ بھی ایک دل رکھتے ہیں۔ ابھی کوئی آٹھ بجے تھے اور میں دوپہر کو ڈھائی بجے تک لوٹ کر تین بجے کی گاڑی سے آگے چلا جانا چاہتا تھا۔ میں نے ادھر ادھر جھانک کر دیکھا، بالکل سب کچھ وہی تھا۔ سب کچھ ویسا ہی۔ میں اپنے جانے پہچانے راستے پر پیدل ہی چل دیا کیونکہ شہر ہی کتنا بڑا تھا۔ اور تانگے پر بیٹھ کر میں ان لمحوں کو تیزی سے گزارنا نہیں چاہتا تھا۔ ایک ٹھنڈی خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ اور میں بچپن کے ذہن اور سبک قدموں کے ساتھ دونوں طرف سب کچھ دیکھتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ کچھ نئے مکان اور دکانیں بن گئی تھیں مگر راستے اور بازار وہی تھے، لوگوں کی بھیڑ نئی تھی۔ مگر اس سے کیا، میں تو انہی راستوں سے ملنے آیا تھا۔

بازاروں اور سڑکوں پر سے ہوتا ہوا، ہر چیز کو دیکھتا اور پہچانتا ہوا میں اپنے محلے میں پہنچ گیا۔ اور ایک ان جانی خوشی اور جوش نے مجھے جکڑ لیا۔ ہاں یہی وہ پل تھا، اور اب بھی اسی طرح ٹوٹا ہوا، جس پر بیٹھ کر اور کھیل کر نہ جانے زندگی کے کتنے پل، کتنی گھڑیاں بیت گئی تھیں۔ وہ سامنے نل، اب بھی وہیں تھا اور آج بھی اسی طرح اس پر برتن ایک لمبی قطار میں رکھے ہوئے تھے۔ اور ویسی ہی بھیڑ تھی۔ مگر میں نے غور سے دیکھا اس بھیڑ میں میں کسی کو نہیں پہچانتا تھا۔ میں ایک انجانے جذبے کے تحت اس پل پر بیٹھ گیا۔ اور میرے تصور میں اس پل پر میرے ساتھ میرے بچپن کے ساتھی رحمو، چندا اور مول چند بیٹھ گئے۔ میں چند منٹ اس پل پر بیٹھا اور پھر اس کے نیچے نالے میں سے ہوتا ہوا باہر نکل آیا۔ جیسا کہ میں بچپن میں اکثر کیا کرتا تھا۔

اس محلے کی ساری گلیاں، مکان وغیرہ ویسے ہی تھے۔ مگر اس میں بسنے والے بدل گئے تھے۔ کچھ پرانے رہنے والے ابھی تھے۔ مگر انہیں بھی وقت کے بے رحم ہاتھوں نے بدل دیا تھا، جو جوان تھے بڈھے ہو گئے تھے۔ جو بڈھے تھے وہ بوڑھے ہو گئے تھے اور کچھ مجھے پہچانتے تھے اور کچھ نہیں پہچانتے تھے۔ انہوں نے بڑی محبت کا اظہار کیا اور مجھے کھلایا پلایا۔ وقت سب کچھ مٹا دیتا ہے۔ مگر محبت کے جذبے کو فنا نہیں کر سکتا اور یہ بات مجھے اپنے محلے میں گھوم پھر کر اور سب سے مل کر زیادہ شدت سے محسوس ہوئی۔ مجھے سب سے مل کر بے حد مسرت ہو رہی تھی مگر دکھ یہ تھا کہ بچپن کے دوست ملازمت اور کام کے سلسلے میں یہاں سے چلے گئے تھے۔ ایک آدمی سے بات چیت کر کے یہ پتہ لگا کہ ہمارا ایک ساتھی بھولا یہاں ہی ہے۔ اور اس نے کوتوالی کے پاس چائے کی دکان کر رکھی ہے۔ بھولا بھی ہمارے بچپن کے ساتھیوں میں سے تھا۔ اور میرے دل میں اس سے ملنے کی خواہش بھڑک اٹھی۔

میں اپنی گلی میں گیا اور دیر تک اپنے مکان کے آگے کھڑا رہا۔ اس مکان میں اب کوئی اور رہتا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر غیر ارادی طور پر اپنا ہاتھ بند دروازے پر رکھ دیا اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے بچپن کی بچھڑی دو روحیں مل گئی ہوں۔ میری آنکھیں نم ناک سی ہو گئیں۔ اور میں نے مڑ کر اپنے اردگرد دیکھا۔ ہمارے سامنے اٹھارہ برس پہلے جو ٹوٹے ہوئے مکان کا کھنڈر تھا جس میں ہم آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے چھپا کرتے تھے، آج بھی موجود تھا۔ میں اس کھنڈر میں سے ہوتا ہوا دوسری گلی میں نکل آیا۔ اور اس میں سے گزر کر پیچھے کی طرف سڑک پر آ گیا۔ یہاں دو دکانیں تھیں جن پر میں اکثر آیا کرتا تھا۔ ایک برجو حلوائی کی، جس سے میں برفی خریدتا تھا اور ایک بالی پرچون والے کی، جس کے گڑ کے شکر پارے بڑے مزے دار ہوتے تھے۔ برجو کی دکان اب وہاں نہیں تھی اور مجھے پتہ لگا کہ وہ مر گیا تھا۔ بالی جواب بوڑھا ہو گیا تھا۔ بدستور بیٹھا تھا اور اس کی دکان بالکل ویسی ہی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر دو آنے کے شکر پارے مانگے اور اس نے بغیر مجھے پہچانے اسی کونے میں سے اور شاید اسی ڈبے میں سے نکال کر دے دیئے۔ میں سوچنے لگا کہ زندگی کہیں جوں کی توں موجود ہے اور کہیں اس طرح مٹ جاتی ہے۔ جیسے برجو کی دکان۔

میں یہاں سے سید ھا کوتوالی کی طرف بھولا سے ملنے چلا گیا۔ بھولا ایک غریب لڑکا تھا اور بچپن میں وہ انگریزوں کی کوٹھیوں میں بوٹ پالش یعنی بوٹ وغیرہ صاف کرنے اور بیرے کی مدد کرنے کا کام کیا کرتا تھا۔ مگر بچپن میں امیری غریبی اور اونچ نیچ کا تصور کسے ہوتا ہے۔ بھولا ہمارے اچھے دوستوں میں سے تھا۔ مجھے اس کی دکان آسانی سے مل گئی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی پہچان گیا اور دوڑ کر اور بچپن کا نام لے کر مجھ سے لپٹ گیا۔ میری مسرت کا ٹھکانہ نہ رہا۔ اور ہم کچھ لمحوں کے لئے ایک دوسرے سے لپٹے رہے۔ کتنی گرمی اور پیار اس ملاپ میں تھا۔ اسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ میں دکان میں بیٹھ گیا اور ہم کافی دیر تک ایک دوسرے سے بات کرتے رہے۔ میں نے اسے دلی آنے کے لئے کہا۔ بچپن کی باتوں اور ساتھیوں کے ذکر نے مجھے ایک اور ہی دنیا میں پہنچا دیا۔

بھولا اپنی دکان بند کرنے لگا اور بضد ہوا کہ میں اس کے ساتھ اس کے گھر چلوں۔ اور کھانا کھاؤں۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر بھولا کے گھر گیا اور کھانا وغیرہ کھایا تو تین بجے کی گاڑی نہ پکڑ سکوں گا، مگر اس کے گھر جانے کی خواہش کی بھی مزاحمت نہ کر سکا۔

بھولا کی بیوی اور بچوں سے مل کر مجھے بیحد خوشی ہوئی۔ میں اس کے گھر کوئی دو گھنٹے رہا اور اس اثنا میں ہم نے اپنے سب دوستوں کی باتیں کیں۔ اب میں چھ بجے کی گاڑی سے ہی جا سکتا تھا، اس لئے کوئی ایسی جلدی بھی نہیں تھی۔ باتوں ہی باتوں میں بھولا نے ایک اور دوست منّا کا ذکر کیا اور بتایا کہ وہ تو اب اس شہر کا ایک بڑا بزنس مین ہے اور بہت امیر ہو گیا ہے۔ میں نے اس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی اور بھولا فوراً میرے ساتھ چل پڑا۔ ہم دونوں منّا کے محل کی طرح لمبے چوڑے مکان میں جھجکتے ہوئے داخل ہوئے۔ منّا موجود تھا اور مجھے دیکھتے ہوئے مجھ سے بغل گیر ہو گیا اس نے بڑی پر تکلف چائے پلائی اور ہم تینوں نے ہنس ہنس کر بچپن کے بہت سے لمحات ایک دفعہ پھر گزار دیئے۔

جس وقت ہم منّا کے مکان سے لوٹ رہے تھے تو ایک بڑے پکے مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بھولا بولا۔

"یہ چندا کا مکان ہے۔ یاد ہے کچھ؟"

"کون چندا؟"

"وہی جیون کی لڑکی۔"

"ارے وہ چندا۔ شادی ہو گئی تھی اس کی؟"

"ہاں اس کے تو اب کئی بچے ہیں اور بر بھی اتنا سندر ملا ہے کہ کسی کو کیا ملے گا۔ یہ مکان انہوں نے ابھی بنوایا ہے۔"

میں وہیں کھڑا ہو گیا۔ چندا ہماری گلی کی لڑکی تھی اور ہم سب اسے جانتے تھے۔ دس برس کی عمر تک تو وہ ہمارے ساتھ ہی کھیلتی رہی تھی پر (قدرت) نے اسے بڑا بدصورت بنایا تھا۔ اور اس کی ایک آنکھ میں بھی نقص تھا۔ اس کے ماں باپ نے اس کی شادی کی بڑی کوشش کی تھی۔ لیکن ہمارے ہوتے ہوئے تو ان کی یہ کوشش کامیاب نہیں ہوئی تھی۔ اگرچہ ان دنوں لڑکی کو دیکھنے دکھلانے کا بھی کوئی خاص رواج نہیں تھا۔ میری نظروں کے سامنے وہ دن گھوم گیا۔ جب چندا اور اس کی ماں ہمارے گھر آئے ہوئے تھے۔ اور میری ماں نے ایک پنڈت کو بلوا رکھا تھا جسے سب عورتیں اپنا ہاتھ دکھا رہی تھیں۔ چندا کی ماں نے چندا کو آگے دھکیل کر اس کا ہاتھ بھی پنڈت جی کے آگے کر دیا۔ اور پنڈت جی نے اس کا ہاتھ دیکھتے ہی کہا۔ "اس کی قسمت کا ستارہ تو بہت اونچا ہے۔" اور پنڈت جی کی بات سنتے ہی ساری عورتیں کھلکھلا کر ہنس پڑی تھیں۔ چندا جیسی بدصورت لڑکی کا جس کے ساتھ کوئی بھی شادی کرنے کو تیار نہیں تھا، قسمت کا ستارہ کیسے اونچا ہو سکتا تھا؟ مگر ان ہنسنے والی عورتوں میں چندا کی ماں شامل نہیں تھی جس نے پنڈت جی کی بات پر یقین سا کر لیا تھا۔ میں نے چندا سے ملنا چاہا۔ اور ہم دونوں آگے بڑھے۔ بھولا نے دروازہ کھٹکھٹایا، جو چندا ہی نے کھولا۔ وہ مجھے فوراً پہچان گئی اور بڑی خوش ہوئی۔ وہ ہمیں اندر لے گئی۔ اور ہمارے منع کرنے پر بھی اس نے چائے کا پانی چڑھا دیا۔ جب وہ ہمارے پاس بیٹھی تو مجھے یہ محسوس کرنے میں دیر نہیں لگی کہ اس کی زندگی واقعی خوشی سے بھرپور تھی۔ اس نے اپنے الھڑ سے انداز میں میرا نام لے کر پوچھا۔

"تمہاری شادی ہو گئی؟"

میں ہنس پڑا اور بولا۔

"ہم سب ایک ہی عمر کے ہیں۔ سب کی شادی ہو گئی تو میری کیسے نہ ہوتی۔ میرے تو اب چار بچے ہیں۔"

وہ مسکرا دی اور بولی۔

"بالکل ویسے ہی لگتے ہو جیسے چھوٹے سے تھے۔ تم بہت کم بدلے ہو۔"

ہم چندا کے یہاں کچھ دیر بیٹھے۔ چندا کے پتی سے میری ملاقات نہ ہو سکی کیونکہ وہ اپنے کام پر گیا ہوا تھا مگر چندا سے مل کر جو خوشی ہوئی تھی وہ بیان نہیں کر سکتا۔ پرماتما نے ایک بدصورت لیکن دل کی نیک لڑکی کو اس کی خوشیاں دے دی تھیں۔

بھولا اور اس کا بھائی مجھے اسٹیشن تک چھوڑنے آئے۔ میری ٹرین روانہ ہوئی تو بھولا دیر تک اپنا رومال ہلاتا رہا اور میں کھڑکی میں سے گردن نکال کر اور ہاتھ ہلا کر اپنے بچپن کو الوداع کہہ رہا تھا۔ میری آنکھیں ایک دفعہ پھر نمناک ہو گئی تھیں اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ زندگی اس ٹرین کی طرح تیزی سے گزرنے اور بہنے والی ہے۔ در و دیوار اور گلی کوچے انسانی زندگی سے زیادہ پائیدار ہیں۔ لیکن محبت اور خلوص کا جذبہ لافانی ہے یہی جذبہ زندگی کی دھند میں چمکنے والا روشن ستارہ ہے اور ایسے ان گنت ستاروں کی کہکشاں اس دھرتی پر بھی جھلملاتی ہے!

• نقش خریدیے • نقش میں اشتہار دیجیے

عفّت موہانی

الشجاع۔ کراچی

اُجالا

سال بھر کے روتے بسورتے شمیم کو چھاتی سے چمٹائے احمد میاں بڑی دیر سے کچھ سوچ رہے تھے۔ شمیم کی سسکی سے سوچ کے تسلسل کی کڑی ٹوٹ جاتی۔ اور پھر اس کی پیٹھ پر تھپکی دے کر وہ خیالوں کی نگری میں بھٹک جاتے۔ اندر سے دوسرے بچوں کے ہنسنے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ انّا انگیٹھی پر کڑھائی چڑھا کے گڑ گھی میں تل تل کر سب کو دے رہی تھی۔ شمو کے رونے کی آواز سن کر بے چین ہو گئی۔ کڑھائی بڑی بہو کو دے کر وہ اندر لپکی۔

احمد میاں کے ہاتھوں سے شمو کو لیتے ہوئے اسے پچھلی باتیں یاد آئیں۔ آنکھیں آنسوؤں میں ڈوبی یوں نظر آنے لگیں۔ جیسے ان چراغوں میں تیل ختم ہونے لگا ہو۔

احمد میاں تھکی تھکی سانسیں لے کر مسہری پر جا لیٹے۔

کل رات سے ان کا ذہن ایک عجیب سی لڑائی لڑ رہا تھا بلکہ وہ ایک زندہ اور مردہ کی لڑائی میں ریفری کا کام انجام دے رہے تھے۔ انہیں دو سال پہلے کے وہ دن وہ راتیں اب بھی اچھی طرح یاد تھیں۔ جب وہ صابرہ کو رخصت کرا کے لا رہے تھے۔ اس کے خیال سے ان کے محسوسات کی نظریں صابرہ کے گداز اور حسین جسم کا لمس محسوس کرنے لگیں۔ اسے پا کر احمد میاں یگانے بیگانوں سب کو بھول گئے۔ شادی کے بعد چھ سات ماہ ایسے گزرے کہ پتہ ہی نہ چلا۔ پھر اچانک بھابی احمد میاں کو مسکرا مسکرا کر دیکھنے لگیں۔ اور صابرہ شرمائی لجائی سب کی نظروں سے بچتی بچاتی ادھر سے ادھر چھپنے لگی! اماں بی کے ہاتھ پسار کر دعائیں مانگنے پر احمد میاں کو پتہ چلا کہ صابرہ کی گود میں پھول کھلنے والا ہے!

مہینے کے مہینے صدقے اترتے۔ پیر پیغمبروں کی نیازیں دی جاتیں۔ اماں بی خیر کی دعائیں مانگتیں۔ اللہ میاں ہنستے کھیلتے فراغت دیں۔ دھان ان بچی ہے۔ کیسے سنبھالے گی۔

وہ بھی دن آیا جب ہاتھوں چھاؤں صابرہ درد کی شدت سے بے جان ہسپتال لے جائی گئی۔ گھر منہ پھاڑے بھائیں بھائیں کرنے لگا۔ ادھر صابرہ کا اسٹریچر آپریشن روم میں گیا اور ادھر اماں جی سجدے میں گر پڑیں۔

”یا اللہ خیر سے چھوٹی بڑی جانوں کی سلامتی دیجیو!“

ان کی دعائیں لبوں پر ہی تھیں کہ ننھا سا پوتا دادی کی گود میں ڈال کر بہو نے جنّت کا راستہ لیا۔

احمد میاں آنکھیں [illegible]

بھائی نے دیا۔

یہ کیا ہوا۔ یا خدا۔ ننھے شمیم کو کلیجے سے بھینچ کر وہ بلک بلک رونے لگے۔

اور پھر انہیں چپ لگ گئی۔ صابی کی یاد انہیں ہر دم بیقرار رکھتی۔ نہ گھر میں جی لگتا نہ باہر۔ بھابی اور اماں بی کے دم سوکھے ہوئے تھے، کہیں ایسا نہ ہو کہیں کی چوٹ دل کی چوٹ بن جائے۔ اور یہ پہاڑ سا سایہ دار درخت غم کی آندھی میں جڑ ہی سے اکھڑ جائے۔

اب اپنے دکھ کے وہ آپ ساجھی تھے۔ البتہ ایک شمیم تھا، جس کے دیکھنے سے ان کے مرجھائے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی پرچھائیں کا شبہ ہوتا۔!

اماں بی کا دم انہیں سے بیٹھا تھا۔ بھابی کو اپنے ریوڑ سے فرصت نہ تھی۔ شمو انّا کی گود میں پل رہا تھا۔ ماں زندہ ہوتی تو ہاتھ پھیلا پھیلا کر سمیٹ لیتی۔ مگر اب ماں تو زمین تلے سو رہی تھی۔ احمد میاں کمپنی چلے جاتے اور شمو بھوک سے بیتاب چلایا کرتا۔ بھابی تو جلد از جلد دیورانی لانے کی فکر میں تھیں۔ شمو کے لئے ایک ماں کی ضرورت اتنی شدت سے محسوس نہیں کی جا رہی تھی۔ جتنی کہ پینتیس برس کے بچے کے لئے ایک کھلونے کی فکر سب کو کھائے جا رہی تھی۔

ڈھکے چھپے بھابی نے کہنا شروع کیا۔ "بچیا ننھی سی جان بن ماں کے کیسے پلے گی۔"

"کہاں سے اٹھا لاؤں اس کی ماں کو۔" احمد میاں کا گلا رندھ گیا۔

"مجھے تو تمہاری تنہائی بھی ستاتی ہے ... اپنی پہاڑ سی زندگی یوں کیسے کاٹو گے؟" بھابی نے ان کے سامنے اداکاری شروع کی۔ "تم کہو تو ہاجرہ کے لئے کہہ دیں۔" اماں بی نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ مگر احمد میاں خاموش ہی رہے۔

اس وقت تو احمد میاں کمپنی چل دیئے۔ لیکن اچانک ہی ہاجرہ کا سراپا سامنے آکھڑا ہوا۔ گداز جسم اور موٹی موٹی غلافی آنکھوں والی ہاجرہ۔ جس کا پیام احمد میاں نے مسترد کر دیا تھا۔ صابرہ اس سے کہیں اچھی تھی۔ مگر اب پھر ہاجرہ — رات کے کھانے پر پھر سب نے تذکرہ چھیڑا۔ اور آخر کار احمد میاں کو بڑی ہوشیاری اور بڑی پرکار معصومیت سے فیصلہ اماں بی اور بھابی پر چھوڑنا پڑا۔ رات بھر ہاجرہ اور صابرہ میں جنگ ہوتی رہی۔ پر مردے اور زندہ کا مقابلہ کیا؟ — صبح ہوتے ہوتے زندگی کی طاقت نے مردے کو دھکیل کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محبت بھرے دل کا گوشہ اپنے مسکن کے لئے خالی کرا لیا۔

اور رات بھر شمو بھی سسکتا رہا۔ شاید اس کی مرحوم ماں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس سے رخصت ہو رہی تھی۔

"نہ رو میرے بچے۔" انّا نے شمو کو چھاتی سے لگا لیا۔ وہ بھی تو احمد میاں کا فیصلہ سن رہی تھی — اب تیری دوسری ماں آئے گی۔ کون جانے کیسی ہوگی۔ اللہ تیرا نصیبہ بلند کرے!"

ہفتہ بھر کے اندر اندر ہاجرہ نئی ماں کے روپ میں اماں بی کے گھر میں آگئی۔

اس رات بار بار شمو نے اپنے اوپر جھکا ہوا انّا کا چہرہ ہٹا دیا۔ وہ اپنے باپ کے ہاتھ سے دودھ پینے کا عادی تھا۔ انّا کا کلیجہ مسوس رہا تھا۔ کیسے جائے کیا کرے۔ کیا سرے سے سب کے کان پٹ ہو گئے۔ یہ پکار آج مہربان کیوں نہیں سنتا! —

انّا جھجکتی ہوئی خوابگاہ تک گئی۔ پھر رک گئی۔ پھر بڑھی۔ کنڈی تک ہاتھ بڑھایا۔ پھر کھینچ لیا۔ کچھ سوچ کر جلدی سے مڑی اور شمو کو اٹھا لائی۔ ایک جھٹکے سے دروازہ کھلا۔

"بھیا یہ میرے ہاتھ سے دودھ نہیں پیتا؟"

"آج کسی طرح پلا دو انّا۔ ان کے سر میں درد ہے۔ یہاں یہ روئے گا تو وہ اور پریشان ہوں گی!"

بانہیں باپ کی طرف پھیلی رہ گئیں۔ اور دروازہ بند ہو گیا۔

انّا کی آنکھوں کی قندیلیں آنسوؤں کے طوفان میں گل ہو گئیں۔

اور پھر شمو اس بوڑھے چہرے سے مانوس ہوتا گیا۔ اس کے بعد پھر کبھی انّا اسے اِدھر نہ لے گئی... انّا کی کوٹھری میں شمیم نے گھٹنوں کے بل چلنا سیکھا۔ انّا ہی کی کوٹھری میں اس کی زبان تتلائی۔ امّاں بی کی زندگی تک باپ دادی اور بڑی چچی کا بھرم تھا۔ اِدھر اماں بی کی آنکھیں بند ہوئیں، اور چالیسویں کے دن ہی چولھے چکی کا بٹوارہ ہوگیا... ایک دل ایک گھر بناتا ہے۔ دو دل ایک گھر نہیں بنا سکتے! بٹوارے میں شمو انّا کے حوالے ہوگیا... جیسے کوئی اُگلا چھپا دفینہ چھاتی سے لگالے۔ انّا نے شمو کو سمیٹ لیا۔

وہ اس کی بانہہ پر سر رکھے ننھی منی باتیں کیا کرتا۔ "اماں... چچی ان کے بچوں کے پاس اچھے اچھے کھلونے ہیں، میرے پاس کیوں نہیں ہیں؟"

"میں اپنے چاند کو کھلونے لے دوں گی!" انّا اس کا منہ چومتی۔

"اماں اسد بھیا کو کوئی نہیں مارتا۔ مجھے امی کیوں مارتی ہیں؟"

انّا اسے بہلا دیتی۔ ماں دوسری کیا ہوئی کہ باپ تیسرا ہوگیا۔ کبھی کبھار جو باپ کی محبت پکارتی اب اس پر ہاجرہ کے بچوں کی محبت نے دبیز پردہ ڈال دیا تھا۔

انّا دودھ پیتی بچی نہ تھی۔ ہاجرہ نے سارے گھر پر راج کی ٹھانی۔ احمد میاں دم بخود تھے۔ اب پچھتانے سے بھی کچھ حاصل نہ تھا۔ جس جادو کو انہوں نے جان بوجھ کر سر چڑھایا تھا۔ وہ سر پر چڑھا بول رہا تھا۔ شکوہ کس سے کرتے؟!

ہاجرہ کے ہاں بچوں کی ریل پیل تھی۔ اب چھٹا بچہ ہونے پر اس کا کام بہت بڑھ گیا تھا۔ اسی شام جب دو تین ماماٸیں اور چھوکرے کام سے گھبرا کر بھاگ گئے تھے تو ہاجرہ شمو کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے آئی۔

انّا دم سادھے دیکھتی رہ گئی۔ سب بچے صحن میں کھیل رہے تھے۔ ان میں شمو بھی تھا۔ گھبرایا گھبرایا سا۔ چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

"غارت کرکے رکھ دیا۔ ناس پیٹی نے"۔ ہاجرہ نے ایسے کہا کہ انّا نے سن لیا۔ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔ "اتنا بڑا لڑکا اور اتنی تمیز نہیں کہ ننھی سی بچی کو گود میں اٹھا سکے!"

اور پھر روز کی یہی بات ہوگئی۔ ذرا ذرا سی بات پہ ہاجرہ اسے دھنک کر رکھ دیتی۔ طاقوں پر سجی دال موٹھ بالائی کے سوکھے دونے، روٹی دھلائے کپڑے سب شمو کے انتظار میں گرد آلود ہو رہے تھے۔ اب اس کی مجال نہ تھی جو وہ انّا کے پاس جاسکتا۔ وہ بھی تو کچھ ایسا پھول سا بچہ مرجھا گیا تھا! جیسے صدہا پریشانیوں اور ہولناک خیالوں نے اس سے بالیدگی چھین لی ہو۔

اور اس ذرا کی ذرا ننھی اس کی گود سے کیا گر پڑی کہ ہاجرہ نے مار مار کر اسے ادھ موا کر دیا۔ پھر جھپک کر انّا لپکی اور اس نے ہاجرہ کو پکڑ لیا۔

"خدا کے غضب سے ڈرو۔ چھوٹی بہو، بن ماں کے بچے کی آہیں لے کر اچھی نہیں رہو گی؟"۔ اس نے شمو کو دبوچ لیا۔ "چپ مردار۔" ہاجرہ نے جھٹکے سے اپنی کلائی چھڑا لی۔

"زبان سنبھالو۔ ہاجرہ بی... تمہاری نوکر نہیں ہوں"۔ انّا کڑکی "کل کی اس گھر میں آئی حکومت چلانے لگیں"۔

آپے سے باہر ہوکر ہاجرہ نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، چھ سات ہاتھ انّا کے رسید کر دئے۔

انّا دہائی دیتی سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ مگر شمو کو نہیں چھوڑا۔

احمد میاں کو کچھ پتہ نہ چلا۔ مگر وہ ہاجرہ کے تیور دیکھ کر بے چین ہو گئے۔

"یا تو مجھے رکھو یا اس لاخیری کو"۔ ہاجرہ نے دہاڑتے ہوئے کہا۔ "انّا ہوگی تمہاری... وہ میری جوتی کی برابری تو کرے"۔

"کیا ہوا۔ کیا ہوا؟"۔ احمد میاں سہم کر پوچھ گئے۔

خوب نمک مرچ لگا کر ہاجرہ نے واقعہ سنایا۔ انا اپنے کمرے میں پڑی ہائے ہائے کر رہی تھی۔ شمو اس کی بیٹھ سے لگا بیٹھا چپکے چپکے آنسو پونچھ رہا تھا۔ احمد میاں کی قیادت میں غیظ و غضب سے بھرا لشکر بڑھیا کی جان پر نازل ہو گیا۔

ہاجرہ نے جھوٹ سچ جڑ دیا، بڑھیا تکتی رہ گئی۔ "بچے میری بھی سن لے ارے۔ میں نے کچھ نہیں کیا" مگر اس کی کون سنتا۔

"ہائے میرے شمیم۔ تیرا اللہ بیلی"۔ انا روتی رہ گئی۔

"ادھر آ بے ناہنجار" احمد میاں کی آواز تیز تلوار تھی کہ بڑھیا کے دل کو چیرتی گزر گئی "چل ہٹ وہاں سے۔ ماما کے کلیجے میں کیوں گھسا ہوا ہے"۔

"اماں۔ اماں" آنے والی مصیبتوں کے خیال سے شمو رونے لگا۔

"اور تم نکل جاؤ یہاں سے۔ آج تم گھر کی مالکن کے سامنے سینہ تان کر کھڑی ہو گئیں، کل میرے مقابلے پر آ جاؤ گی۔"

احمد میاں نے فیصلہ سنایا اور بچے کی انگلی پکڑے اندر مڑ گئے۔

"نہ چھڑاؤ۔ مجھے میرے بچے سے نہ چھڑاؤ۔ مجھے مار و پیٹو۔ میرا گلا کاٹ دو۔ پر مجھے میرے بچے سے جدا نہ کرو"۔

انا ہاجرہ کے قدموں پر گرنے لگی۔

"چل نکل مردار"۔ ہاجرہ نے کہا۔ اور تنتناتی چل دی۔

"اماں، اماں" شمو کی دردناک پکار انا کے کانوں سے ٹکرائی۔ جو ننھے سے بکری کے بچے کی طرح تمام قصائیوں کے درمیان گھٹتا جا رہا تھا۔ اسی رات کو انا روتی بلکتی گھر سے نکلی۔ کچھ دور چلی پھر پلٹی۔ پاؤں رکھتی کہیں۔ پڑتا کہیں تھا۔ بڑی مشکل سے سیڑھیاں چڑھ کر دالان تک پہونچی شمو سسک رہا تھا۔

"ایک دفعہ میری صاحب کے ننھے کو میرے کلیجے سے لگا دو۔ ایک دفعہ"۔

"دور۔ بڑھیا۔ نخرے نہ کر" ہاجرہ نے دروازہ بند کر دیا۔

رات بھر شمو سسکتا رہا۔

"چپ چاپ سو جاؤ۔ کالی بلی کو اٹھا کر دے دوں گی۔ کھا جائے گی"۔ ہاجرہ غرائی۔ اور شمو کی سسکیاں بھی بند ہو گئیں۔ اماں اپنے کمرے میں ہو گی۔ جیسے ہی صبح ہوئی۔ شمو بستر سے اچھل کر سیدھا بھاگا۔

بوسیدہ طاقوں میں لال ہری طشتریاں رکھی تھیں۔ کسی میں بسکٹ تھے کسی میں چاکلیٹ۔ الگ ٹانگ ٹوٹا گھوڑا کھڑا تھا۔ ایک طرف اماں کے کپڑے پڑے تھے۔ مگر اماں نہ تھی۔

"او۔ کلمو ہے۔ اُدھر کہاں؟" ہاجرہ چنگھاڑی۔

"بابا۔ اماں نہیں ہے۔ اماں کہاں گئی۔؟"

"اماں آتی ہوگی۔ تم ادھر آؤ" احمد میاں نے بہلا دیا۔

"اماں۔ اماں" شمو بلک بلک کر رونے لگا۔

اسی وقت تایا ابا آ گئے۔ انھوں نے شمیم کو اٹھا لیا۔ یکا یک ہی چھ سات برس کا بچہ ان کے لئے ایک اہم مسئلہ بن گیا۔ جو کسی کا نہ تھا! اور جس کا کوئی نہ تھا۔۔۔ قدرت ان معصوموں کے سر سے ماں کو کیوں جدا کر دیتی ہے؟

رات کو احمد میاں کمپنی کی طرف سے دورے پر نکل رہے تھے۔ چلتے چلتے یونہی شمو کے سر پر ہاتھ پھیرا اس کا سر جل رہا تھا!

"[illegible] خیال رکھنا" احمد میاں

نے کہا اور باہر نکل گئے۔

ادھر وہ گئے۔ ادھر ہاجرہ نے ننھی کو اسے تھما دیا۔ ننھی سے غفلت پر وہ پورا بدلہ شمیم سے لے لیتی تھی۔ رحم و مروت کا اس کے پاس گزر ہی نہ تھا! — وہ اپنے بچوں کی ماں تھی۔ لیکن اس بچہ کی ماں نہ تھی جو اس کی سوکن کا بچہ تھا۔

دن بھر شمو کراہتا رہا۔ رات پہاڑ بن کر آئی۔ ہونٹوں سے کراہ نکلی کہ ہاجرہ نے ڈانٹ دیا۔ شمو بخار کی غفلت میں مدہوش ہو رہا تھا۔ جانے کیا کچھ اس کے ننھے سے دماغ میں آ رہا تھا۔ کبھی غفلت میں اماں کو پکارتا۔ کبھی باپ کو۔

"ائے ہے۔ ہاجرہ کسی ڈاکٹر کو دکھا دیتیں!" بھابی نے اپنا فرض اتارا۔

"پکا بہلنے باز ہے۔ ڈھونگ کئے پڑا ہے کہ ننھی کو نہ کھلانا پڑے—!" ہاجرہ نے کہا۔

یکایک تایا ابا نے پوچھ لیا۔ "شمو کہاں ہے نظر نہیں آتا۔"

"اسے تو بخار آ رہا ہے — ابا۔" اسد نے کہا۔

اور انہوں نے اندر جا کر دیکھا تو سن سے ان کی جان نکل گئی — سارا بدن جلتا ہوا توا بن کر رہ گیا تھا۔ نہ ہوش تھا نہ احساس — ہونٹ کانپ رہے تھے۔ کان دھر کر سنا۔ بس ایک ہی صدا تھی — اماں — اماں!!

"اُف... ظالمو۔ یہ کیا کیا؟" تایا ابا کی پیشانی پسینے سے بھیگ گئی۔

"شمو۔ آنکھیں کھولو۔ شمو کچھ کھاؤ گے؟" وہ اس پر جھک کر پکارنے لگے۔

"اماں۔ اماں کہاں ہے؟"

وہ ڈاکٹر کو لینے بھاگے۔ ڈاکٹر بھی آئے۔ اپنی سی تدبیر کی مگر شمو کو ہوش نہیں آیا۔

"غضب خدا کا۔ سات برس کا بچہ۔ اور ایک سو پانچ بخار۔

"اس کی ماں کہاں ہے۔ وہ اپنی ماں کو پکار رہا ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔

تایا ابا کا ضبط رخصت ہو گیا۔ ہچکیاں لینے لگے۔ "اس کی ماں نہیں ہے ڈاکٹر صاحب۔ اس کی ماں مر گئی۔"

ہاجرہ ڈر رہی تھی۔ بھابی الگ دم بخود تھیں۔

رات آئی۔ شمو کی حالت اور بگڑ گئی۔ غفلت میں وہ بار بار اماں اماں کی صدا لگاتا اور گردن ڈال دیتا۔

آدھی رات تک بڑے بھیا نے تمام نوکروں کو انا کی تلاش میں دوڑا دیا۔ اور خود شمو کا سر گود میں رکھ کر بیٹھ گئے۔ بھابی اور ہاجرہ دور رہی دور تھیں۔ ان سے نظریں چار کرنے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔ وہ شمو کے لئے فرشتہ رحمت اور سب کے لئے فرشتہ موت بن گئے تھے!

آخر شب ننھی نے سوتے سوتے چیخ ماری۔

"خدایا خیر۔" ہاجرہ نے اسے کلیجے میں بھر لیا۔

فجر کی اذان کے بعد احمد میاں گھر آئے۔ نقشہ ہی بدلا ہوا تھا نہ تو سامنے ہاجرہ پڑی اور نہ بھابی نظر آئیں۔

"شمو کی طبیعت بہت خراب ہے بابو۔" بوڑھے کریم دا نے آہستہ سے کہا اور نظروں کے سامنے سے ہٹ گیا۔

شمو اب بالکل خاموش تھا۔ جو سانس آ رہی تھی، بس وہی آ رہی تھی۔ بڑے بھیا نے قہر آلود لہجے میں کہا "جاؤ۔ جاؤ۔ اب یہاں تمہاری ضرورت نہیں ہے۔ تم نے اپنے بچے کو ان حالوں پر پہونچا دیا۔ سچ کہنا۔ کیا یہ تمہارا ہی بیٹا ہے۔ اگر شمو نہ بچ سکا تو خدا کی بے آواز لاٹھی ایسی پڑے گی کہ پھر نہ اٹھ سکو گے۔ کیا اس نے تم سے کوئی دشمنی باندھی تھی؟ بتاؤ۔ انا کہاں ہے؟"

انّا۔“ احمد میاں سوکھے ہونٹوں سے بولے ۔” بھیّا۔ میں اسے دیکھتا ہوں ۔

یکایک ہاجرہ کی چیخ سنائی دی۔ دوسرے لمحے بھابی حواس باختہ دوڑی آئیں۔ احمد میاں۔ ننھی بستر میں اکڑی پڑی ہے۔ ہاجرہ کہہ رہی تھیں کہ یکایک ڈر کر چیخ ماری تھی!“

بڑے بھیّا نے شمو کے منہ پر منہ رکھ دیا۔ احمد میاں نے ننھی کی لاش دیکھی۔ اور تیورا کر زمین پر بیٹھ گئے۔

ہاجرہ بھیانک طریق پر بین کر رہی تھی۔

یکایک شمو نے آنکھیں کھولیں بڑے بھیا اس پر جھک گئے۔

” تایا بابا۔ اماں نہیں ہے ۔؟“

” میرے بیٹے! اماں ابھی آتی ہے“۔ انہوں نے پیار سے اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرے ۔ بخار اتر رہا تھا۔ گال پسینے میں بھیگ رہے تھے! اور اسی وقت روتی چلاتی انّا نے کمرے میں قدم رکھے۔

تیر کی طرح وہ بڑھی اور بڑے بھیا کی گودی سے شمو کو چھین کر اپنے سینے میں چھپا لیا۔

” اماں ۔ مجھے چھوڑ کر کہاں چلی گئی تھیں۔ اب نہ جانا، اماں۔ اماں !!“

تایا ابّا نے بہتے ہوئے آنسو سب سے چرا کر پونچھے اور آہستہ سے مسہری سے اتر گئے۔

” میرے لال۔ میرے چاند ۔!“ انّا اپنی چادر سے شمیم کے چہرے کا پسینہ پونچھ رہی تھی۔ شمو نے ہنستے مسکراتے آنکھیں کھول دیں!

” اماں ۔ مجھے معاف کر دو۔“ دفعتاً احمد میاں نے بڑھ کر انّا کے سامنے ہاتھ جوڑ دئے ۔” میں نے جو کچھ بھی برا بھلا کہا ہے سب اس کی سزا تھی۔

انّا کی آنکھوں کی قندیلیں پوری تابانی سے روشن تھیں۔

شمو کے آس پاس زندگی کا اجالا ہی اجالا تھا !!

فیض احمد فیض کی زندگی ، شخصیت اور فن پر افکار کی تاریخ ساز پیشکش

اپنے شہر کے ہر بک اسٹال سے خریدیے

[illegible]- غیر مطبوعہ اور نادر و یادگار تخلیقات

[illegible]- شخصیت اور فن پر غیر مطبوعہ مضامین

[illegible]- فیض کی شخصیت پر افسانے اور تکلیتے۔

[illegible]- نایاب اور منفرد تصاویر

[illegible] صفحات • سرورق۔ عزیز کارٹونسٹ

• قیمت بارہ روپے

مکتبۂ افکار۔ رابسن روڈ۔ کراچی (فون ۷۳۹۹۳)

سُدرشن بالی

شمع - دہلی

رشوت

آدھ گھنٹے تک سنگار میز کے سامنے بیٹھ کر پورا میک اپ کرنے کے بعد سروجنی قد آدم شیشے کے سامنے کھڑی ساڑی کی فال درست کر رہی تھی کہ اُس کے خاوند آنند ماتھر نے جلدی سے کمرہ میں گھستے ہوئے اسے تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "آج رات کھنّہ صاحب نے ڈنر پر بلایا ہے۔"

"ارے واہ، کھنّہ صاحب نے ڈنر پر بلایا ہے۔ اور کس کس کو بلایا ہے؟"

اور کسی کا تو مجھے پتہ نہیں، لیکن ہمیں بلایا ہے۔ یہ کہتے ہوئے آنند ماتھر اپنی ہلکی پھلکی نازک سی بیوی کی طرف بڑھا۔ لیکن وہ پیچھے ہٹ گئی۔

"ہٹو بھی، ذرا پوری بات تو سننے دو۔ آپ نے کہا نہیں کہ ڈنر آپ ہمارے ہاں کھائیں۔ باہر سے آئے ہوئے مہمان آپ ہیں۔"

"سب کچھ کہا، لیکن وہ کہنے لگے بھئی ماتھر آپ کا ایک ڈنر ہمارے اوپر فرض ہے۔ آپ لوگ ہمارے ساتھ آج رات سیلون میں کھانا کھائیں۔"

سروجنی چپ رہی۔ وہ اس سلسلہ میں مزید معلومات حاصل کرنا چاہتی تھی۔ آنند نے اس کے چٹکی لیتے ہوئے کہا۔ "اور سنو گی؟ کھنّہ صاحب نے کیا کہا۔"

"کیا کہا؟" سروجنی نے بے تابی سے پوچھا۔

"کہنے لگے ہمارا باورچی اتنے لذیذ کھانے تو نہیں بنا پاتا۔ جتنے لذیذ اور عمدہ کھانے مسز ماتھر بناتی ہے...."

"جانے بھی دیجئے۔ یہ سب آپ اپنی طرف سے کہہ رہے ہیں۔"

"تمہاری قسم۔" آنند نے سروجنی کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "بالکل کھنّہ صاحب کے الفاظ دہرا رہا ہوں۔ اسی لئے تو میں نے اُن سے کہا جب آپ ہمارے غریب خانے پر ہی کھانا تناول فرمائیں۔ لیکن وہ تو بالکل حاکمانہ انداز میں بولے، آج رات آپ ہمارے مہمان، اتنا کہہ کر اپنے سیلون کی طرف بڑھ گئے۔ اور ان کا پی اے پروہت ذرا دیر کے لئے میرے پاس رک گیا۔ جانتی ہو پروہت نے مجھ سے کیا کہا؟"

"کیا کہا؟" اب سروجنی کے لہجے میں بے تابی نہ تھی۔

"پروہت نے اشارے ہی اشارے میں مجھے بتا دیا کہ میری ترقی ہو رہی ہے۔"

"مبارک ہو۔" سروجنی نے محبت پاش نظروں سے شوہر کو دیکھتے ہوئے کہا اور پھر بولی۔ "ارے آپ کے لئے میں چائے لانا بھی بھول گئی۔ بیٹھئے میں چائے لے آؤں۔"

"لاؤ آج، تمہارے ہاتھ سے چائے پی لوں۔ پھر ترقی ہو جانے پر تو بڑے بنگلے میں ہر روز شام کو باہر لان میں بیرا یا آیا چائے لے کر آیا کریں گے۔"

"بڑا صاحب بنتے ہی میرے ہاتھ کی چائے پسند نہیں آئے گی کیا؟" سروجنی چلتے چلتے رک کر بولی۔

"میڈم جب تم بڑے صاحب کی بیوی بن جاؤ گی تو کام کو ہاتھ لگانے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔ اور پھر ہمارے پاس بھی سیلون ہوگا۔ لائن پر دورہ کرنے کے لئے جائیں گے تو لوگ ہماری کیا کیا پُرتکلف دعوتیں کریں گے۔"

"ابھی بڑے صاحب بن تو لیجئے۔ ایسی ترقیوں کی خبریں تو پہلے بھی کئی بار سن چکی ہوں۔"

"لیکن اب کی خبر پکی سمجھو۔ پچھلی بار تو اپنی ترقی اس پاسی کے بچے نے رکوا دی جو منسٹر کی سفارش لے کر آ گیا تھا۔ کھنہ صاحب اور دوسرے بڑے افسروں کے کہنے پر میں نے اپنا احتجاج واپس لے لیا تھا۔ اس بات کا بھی تو افسروں کو ضرور لحاظ ہوگا۔"

تھوڑی دیر بعد جب وہ چائے کی ٹرے اٹھائے ہوئے کمرے میں پہنچی تو آنند وہاں موجود نہ تھا۔ کھڑکی کا پردہ ایک طرف ہٹاتے ہوئے اس نے باہر جھانک کر دیکھا کہ آنند لان میں ایک مونڈھے پر بیٹھا سامنے تپائی پر پاؤں رکھے سگریٹ کا دھواں اڑا رہا ہے۔ وہ خود ہی برآمدے میں سے دو مونڈھے اور تپائی اٹھا کر وہاں لے گیا تھا۔ سروجنی چائے کا ٹرے اٹھائے اس کے پاس پہنچی اور بولی "تو یہ ٹھاٹھ ہیں بڑے صاحب۔ لو آیا چائے لے آئی۔۔۔"

آنند نے جلدی سے ٹرے سروجنی کے ہاتھ سے لے کر تپائی پر رکھتے ہوئے کہا "بیٹھو بیٹھو، میں نے سوچا کمرے کے گھٹے گھٹے ماحول کی بجائے باہر کھلی ہوا میں چائے پی جائے۔"

اور پھر یہ دیکھ کر کہ سروجنی ساڑی بدل کر آئی ہے، آنند نے کہا "وہ ساڑی کیوں بدل دی۔ وہی باندھے رہتیں۔"

"میں نے سوچا کہیں چائے واے گر کر خراب نہ ہو جائے۔ رات کو وہی تو پہننی ہے۔"

"وہی کیوں؟ وہ بڑھیا بنارسی ساڑی کس دن کے لئے اٹھا رکھی ہے۔ اسے کیوں ہوا نہیں لگنے دیتیں؟"

سروجنی نے چائے پیالوں میں انڈیلتے ہوئے کہا "ساڑھے سات سو روپے کی ساڑی باندھ کر جاؤں تو کھنہ صاحب کیا سوچیں گے؟"

"ارے تم تو بے کار ڈرتی ہو۔ بھلا کھنہ صاحب سے کون سی بات چھپی ہوئی ہے۔ نیچے سے لے کر اوپر تک سب لوگ کھلم کھلا رشوت لیتے ہیں۔ پچھلی بار ان ہی کی دعوت پر ہمارا پانچ سو کے قریب روپیہ خرچ ہو گیا۔ سکاچ سے کم تو وہ کوئی وسکی نہیں پیتے۔ پھر انہیں تمہاری ساڑھے سات سو روپے کی ساڑی پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟"

"اچھا بابا باندھ لوں گی وہی ساڑی۔"

چائے کے خالی برتن ٹرے میں رکھ کر جب سروجنی وہاں سے چلی تو اس کی پیٹھ پر لہراتی ہوئی سیاہ بالوں کی لمبی چوٹی پر نظر جاتے ہوئے آنند ماتھر کسی کتاب میں پڑھے ہوئے اس فقرے کو دماغ میں دہرانے لگا کہ خوبصورت بیوی مرد کی ترقی کا بہت بڑا سہارا ہے۔ اور اسے تو اچھی بیوی ہیں خوبصورتی کے علاوہ بھی کئی خوبیوں کا احساس تھا۔ وہ بڑی باسلیقہ تھی۔ گفتگو میں بڑی شائستہ تھی۔ پھر وہ اپنی ترقی کے بارے میں سوچنے لگا۔ کھنہ صاحب کے آنے سے پہلے جتنے بھی افسر آئے انہوں نے آنند ماتھر کے ساتھ ہمدردی بھی جتائی اور اسے ترقی دلانے کا وعدہ بھی کیا۔ لیکن ہیڈکوارٹرز میں واپس پہنچ کر شاید وہ لوگ بالکل بھول جاتے تھے کہ کسی ماتھر نے انہیں دعوت کھلائی تھی، شراب پلائی تھی، ان کے بچوں کے لئے ڈالی دی تھی۔ لیکن کھنہ صاحب نے اس کے ہاں صرف

دعوت کھائی تھی۔ اور شراب پی تھی۔ ڈالی بالکل نہیں لی تھی۔ ان کے پی اے نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ نئے صاحب کچھ لینے دینے کے روادار نہیں۔ دعوت کھا کر انہوں نے ماتھر سے کوئی وعدہ بھی نہیں کیا تھا۔

آج دوپہر میٹنگ کے بعد جب کھنہ صاحب نے کہا "بھئی ماتھر ہمارے اوپر تمہارا ایک ڈنر قرض ہے"۔ تو ماتھر کی سراسیمگی کی کوئی حد نہ رہی۔ وہ ان کے اخلاق کا قائل ہو گیا۔ آج تک بڑے افسروں نے اس کے ہاں ڈنر کھایا تھا، کھلایا نہیں تھا۔ مگر کھنہ صاحب نے اصرار کر کے اسے اور مسز ماتھر کو ڈنر پر مدعو کیا تھا۔ ماتھر نے دل ہی دل میں سوچا کہ کھنہ صاحب میری ترقی کے لئے ضرور کچھ کریں گے۔ وہ دوسرے افسروں سے قطعی مختلف ہیں۔ دوسرے صرف زبان سے کہتے تھے، کیا کچھ نہیں، انہوں نے زبان سے کچھ نہیں کہا، مگر میرے لئے کچھ کریں گے ضرور۔

ریل کی پٹریوں کے دوسری طرف جہاں کھنہ صاحب کا سیلون کھڑا تھا۔ کافی اندھیرا تھا۔ آنند ماتھر نے احتیاطاً ٹارچ ساتھ رکھ لی تھی۔ اس کی روشنی کی مدد سے وہ اپنی بیوی سروجنی کو سہارا دیتے ہوئے آہستہ آہستہ سیلون کی جانب بڑھ رہا تھا۔ سروجنی نے دونوں ہاتھوں سے گھٹنوں کے قریب سے اپنی بڑھیا بنارسی ساڑی کو تھوڑا سا اوپر اٹھا رکھا تھا۔ تاکہ کوئلے ملی مٹی لگنے سے ساڑی کا بارڈر خراب نہ ہو جائے۔ وہ سیلون کے قریب پہنچے تو کھنہ صاحب نے دروازے میں آکر مسکراتے ہوئے گڈ ایوننگ کہا اور پھر مسز سروجنی ماتھر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ کر اسے اوپر چڑھنے میں مدد دی، زندگی میں پہلا موقع تھا جب کسی غیر مرد نے سروجنی کا یوں ہاتھ پکڑا تھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو آنند کا خون کھول اٹھتا۔ سروجنی بھی زور سے ہاتھ جھٹک دیتی۔ لیکن یہ سب کچھ اتنا اچانک ہو گیا تھا کہ سروجنی اور آنند کچھ سوچ ہی نہ پائے۔ انہوں نے اسے معمولی بات سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔ کھنہ صاحب نے ماتھر سے بھی بڑا زوردار مصافحہ کیا۔ پھر تینوں میز کے گرد بیٹھ گئے جس پر خالی گلاس رکھے تھے۔

"آپ کے مزاج تو اچھے ہیں۔ کھنہ صاحب سروجنی سے مخاطب ہوئے۔

"جی آپ کی نوازش ہے"۔

بیرے نے میز پر برف کی ٹرے اور اسکاچ کی بوتل لا کر رکھ دی۔

بوتل کا کارگ اٹھانے کے بعد بیرے نے سب سے پہلے مسز سروجنی ماتھر کے سامنے رکھے ہوئے گلاس میں وہسکی انڈیلنا چاہی تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے منع کیا۔

"تھوڑی سی تو لیجئے۔ میں آپ کے لئے شیری لانا بھول گیا۔ لیکن مجھے یاد ہے آپ نے اپنے ہاں نو اسکاچ پی تھی"۔

"ضرور پی تھی مگر اس روز پی کر مجھے گھر پر سو جانا تھا اور آج یہاں سے چل کر واپس گھر پہنچنا ہے۔ کہیں راستے میں ہی نہ گر پڑوں"۔

"ہو سکتا ہے آج ہم آپ کو گھر واپس ہی نہ جانے دیں"۔

کھنہ صاحب کے اس بیباکانہ فقرہ کو آنند اور سروجنی نے سراسر مذاق سمجھا۔ سروجنی نے کہا۔ "تب تو میں اکیلی ہی پوری بوتل ختم کر جاؤں گی۔ آپ کے حصے میں ایک گھونٹ وہسکی بھی نہیں آئے گی"۔

"بیرا دوسری بوتل لاؤ۔ یہ بوتل میم صاحب کے سامنے رکھ دو"۔ کھنہ صاحب نے حکم دیا۔

اور بیرا سچ مچ بوتل سروجنی ماتھر کے سامنے رکھ کر دوسری بوتل لانے کے لئے مڑا۔

"ارے نہیں نہیں بیرا، دوسری بوتل مت لاؤ"۔ سروجنی نے کہا اور مسٹر کھنہ سے بولی۔ "میں تو مذاق کر رہی تھی"۔

"پوری بوتل تو یہ کبھی بھی نہیں پی سکیں"۔ آنند ماتھر نے بیوی کی مدد کرتے ہوئے کھنہ سے کہا۔ "مگر ہم جتنی پئیں گے اتنی ضرور پئیں گی"۔

تینوں گلاسوں میں برابر برابر شراب انڈیلی گئی۔ ایک دوسرے کی صحت کے لئے گلاس کھنکھنائے گئے۔ قریب ایک گھنٹے تک بادہ نوشی کا چلتا رہا۔ اس کے بعد میز پر مرغ مچھلی وغیرہ کی پلیٹیں لگا دی گئیں۔ سروجنی کی آنکھوں میں غنودگی چھائی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں پوری سکت نہ تھی پھر

بھی وہ چھری کانٹے کی مدد سے مچھلی کے قتلے، کباب کے ٹکڑے مونہہ تک لے جا رہی تھی۔ وہ نہیں سمجھ رہی تھی کہ اتنی زیادہ وہسکی پینے کے لئے وہ خود ذمہ دار ہے یا اس کا خاوند۔

کھانے کے دوران میں آنند کی ترقی کا چرچا بھی ہوا جس کے جواب میں کھنہ صاحب نے بڑی تمکنت سے کہا "میں تو صرف ایک بات جانتا ہوں کہ حق دار کا حق ضرور ملنا چاہئے۔ اگر اس وقت تک ہیڈ کوارٹرز والوں نے کسی وجہ سے تمہاری حق تلفی کی ہے تو یہ بہت بے جا بات ہے جسے میں برداشت نہیں کر سکتا۔" یہ سنکر آنند ماتھر کا دل بلیوں اچھلنے لگا اور اسے کھنہ صاحب ایک دیوتا دکھائی دینے لگے۔ سروجنی بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے تھی۔ اتنی زیادہ وہسکی اس نے زندگی میں پہلے کبھی نہ پی تھی۔

کھانا ختم ہوا تو آنند اپنی بیوی کو سہارا دے کر ورش بیسن تک لے گیا۔ اور اسے دوبارہ اس کی کرسی پر بٹھاتے ہوئے وہ خود جب ورش بیسن پر پہنچا تو ساتھ کے کیبن میں بیٹھے ہوئے پروہت نے ہلکی سی سیٹی بجا کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا پھر ہاتھ کے اشارے سے اسے اپنے قریب آنے کو کہا۔ آنند جلدی سے ہاتھ پونچھتے ہوئے پروہت کے پاس پہنچا۔ پروہت نے کانا پھوسی کے انداز میں کہا۔ "ایک کانفیڈنشل خبر ہے، بہت کانفیڈنشل۔"

"ارے بتا بھی دو نا یار۔" ماتھر نے بے تکلفی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"بتاتا ہوں مگر ایک شرط پر۔"

"اچھا، بولو۔"

"شرط یہ ہے کہ کل صبح تک اسے راز میں رکھنا ہوگا۔"

"ارے بھئی رات رات میں میں کہاں ڈھنڈورہ پیٹنے جاؤں گا۔"

"تو آؤ باہر چل کر بتاتا ہوں۔" سیلون سے نیچے اتر کر پروہت اسے ریل کی پٹڑیوں کے پار لے جانے لگا۔

"ارے ایسی بھی کیا کانفیڈنشل بات ہے۔ یہیں بتا دو نا۔ کون سنتا ہے یہاں۔" راستہ میں آنند نے بے تاب ہو کر کہا۔

"ذرا روشنی میں چل کر کاغذ دکھاتا ہوں۔"

"میری جیب میں ٹارچ ہے۔"

"اچھا تو تم پڑھ لو۔" یہ کہتے ہوئے پروہت نے پتلون کی جیب سے ایک تہہ کیا ہوا کاغذ نکال کر ماتھر کی طرف بڑھا دیا۔ ٹارچ کی روشنی میں ماتھر نے اپنی ترقی کا آرڈر پڑھا اور خوشی یا وہسکی کے نشے میں اس نے پروہت کا مونہہ چوم لیا۔ بہت بہت شکریہ میرے دوست میں تمہارا احسان عمر بھر نہیں بھولوں گا۔"

اب آپ آرام سے گھر جا کر سو جائیے۔ صبح چائے کی پیالی کے ساتھ یہ خط دستخطوں کے لئے کھنہ صاحب کے پاس بھیج دیا جائے گا۔"

"ضرور بھیجنا پروہت ضرور بھیجنا۔ میں صبح سویرے ہی یہ لینے کے لئے آ جاؤں گا۔"

"ہاں صبح سویرے ہی خط اور مسز ماتھر کو لینے کے لئے آپ آ جائیں۔

"کیا؟" ماتھر نے قدرے گرج کر کہا۔

"اب کیا دیانہ کرو بھائی۔ قاعدے کی بات نہیں بناتا ہے۔ ادھر سیلون کی بتی بجھ چکی ہے۔ اب شور مچانے میں بھی تمہاری بدنامی ہے۔ عمر بھر کی بدنامی کی بجائے تو اچھا ہے کہ بڑے صاحب بن کر عزت کی زندگی بسر کرو...." یہ کہتے ہوئے پروہت ماتھر کو سہارا دے کر ریلوے لائن پار کرا کر پلیٹ فارم تک لے آیا جہاں نیون لائٹ کی روشنی میں ماتھر کو اپنا مستقبل بہت روشن دکھائی دینے لگا۔ سکاچ کا نشہ بھی اس وقت تک خوب تیز ہو چکا تھا بھاری بھاری قدموں سے وہ اپنے کوارٹر میں آ کر سو گیا۔

اگلی صبح آنند ماتھر کی ترقی کے آرڈر پر دستخط کرنے کے بعد کھنہ صاحب گہری نیند سو گئے پروہت نے ماتھر کے ہاتھ میں کاغذ دے دیا۔

ماتھر نے سروجنی کو ہاتھ کا سہارا دے کر سیلون سے نیچے اتارنا چاہا، مگر اس نے غصے سے خاوند کا ہاتھ پرے جھٹک دیا، ماتھر اپنی بیوی سے نظر نہ ملا سکا۔ راستہ بھر دونوں خاموش رہے۔

گھر پہنچ کر بھی سروجنی بولی کچھ نہیں۔ بس آنکھوں سے ماتھر پر نفرت کی آگ برساتی رہی۔ پھر وہ دوڑ کر غسل خانے میں چلی گئی۔ اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ بہت دیر گزر جانے پر بھی باہر نہیں نکلی تو آنند ماتھر نے گھبرا کر دروازہ کھٹکھٹانا شروع کیا لیکن اندر سے کوئی آواز نہیں آئی۔ خاموشی ہی خاموشی تھی۔ ماتھر کا دل خوف سے دہل گیا، ایک بڑا سا پتھر اٹھا کر اس نے دروازے پر اس جگہ مار دیا، جہاں دوسری جانب چٹخنی تھی۔ چٹخنی کے اکھڑتے ہی دروازہ کھل گیا۔ اور آنند کے سامنے پڑی تھی سروجنی کی لاش۔ بجلی کا بلب اتار کر اور ہولڈر کے اندر انگلیاں ڈال کر سروجنی نے خودکشی کر لی تھی۔

رشوت لینے میں مہارت رکھنے والا آنند ماتھر یہ بھی جانتا تھا کہ رشوت کیسے دی جاتی ہے۔ پولیس کو رشوت دے کر اس نے اپنی خوبصورت بیوی کی لاش کو پوسٹ مارٹم سے بچا لیا۔

بیوی کے کریا کرم سے فارغ ہو کر آنند نے اپنے نئے عہدے کا چارج سنبھالا۔ اپنی نئی بڑی میز پر بیٹھتے ہوئے اس نے سوچا:

ترقی پانے کے لئے مجھے اتنی پیاری بیوی کو کھونا پڑا۔ اب ترقی پانے کے بعد میں اس سے بھی زیادہ خوب صورت لڑکی سے شادی کر سکتا ہوں۔ لیکن میں اب شادی کے جھنجھٹ میں پھنسوں ہی کیوں؟ میرا پھلا تو پردھنتے سے بھی زیادہ گھاگ ہے۔ اس کی مدد سے میں کھنہ کی روایت ہوات کو کیوں نہ دہراؤں؟

گنجینۂ گوہر

شاہد احمد دہلوی کا اسلوب بیان اور طرزِ ادا دلکش ہے۔ ایسی پیاری زبان اور شوخیت سے اتنا بھرپور اسلوب بیان اُردو کے بہت کم ادیبوں کو نصیب ہوا ہے "گنجینۂ گوہر" میں شاہد احمد دہلوی نے سترہ باکمال فن کاروں کے بارے میں اپنے مشاہدات تجربات اور محسوسات کو دلّی کی ٹکسالی زبان کے جادو میں سمویا۔ تو ان باکمال شخصیتوں کی ایسی متحرک تصویریں جنم پا گئیں۔ جنہیں ہر شخص بے تکلف دیکھ سکتا ہے۔

قیمت چھ روپے

ملنے کا پتا

مشتاق بک ڈپو شیلڈن روڈ۔ کراچی

رفعت نواز
صبا جیلانی آباد

دُودِ چراغِ محفل

پولیس کی دیان گلی کے موڑ پر نظر آتے ہی پوری گلی میں سناٹا چھا گیا۔ گلی میں اکڑتے پھرنے والے بانکے جہاں، جس جھونپڑی اور مکان میں سر سمایا گھس گئے۔ اور کھٹا کھٹ ٹوٹتے ہوئے دروازے بند ہو گئے۔ اور دراڑوں سے سہمی سہمی اور خوفزدہ آنکھیں جھانکنے لگیں۔ پاشو میاں جو گلی کا مانا ہوا لفنگا سمجھا جاتا تھا، نشے میں دھت ابھی تھوڑی دیر پہلے بڑی بے تکلفی سے فتو کی ماں بہن سے اپنا قریبی رشتہ ظاہر کر رہا تھا۔ یہ بھاگم بھاگ دیکھ کر چونک پڑا۔ اس نے مخمور آنکھیں چاروں طرف گھمائیں، سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا۔ پان کی کچی ہوئی چھالیہ بر قی کے کھمبے پر پھینکی اور لنگی کو رانوں تک اٹھا کر اس کا سرا کمر میں ٹھونس لیا اور سرپٹ دوڑتا ہوا گلی کے آخری سرے پر واقع بڑے مکان میں گھس گیا۔

پولیس سب انسپکٹر چار سپاہیوں کے ساتھ بڑے وقار سے دیان سے اترا اور وہ سب گلی میں چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے۔ گلی میں تو ہو کا عالم تھا۔ لوگ باگ گردنیں جھکائے سودا سلف سے بھری تھیلیاں کندھوں پر لادے آ جا رہے تھے دو بوڑھیاں سڑے گلے کیلے، بیر اور جام لیے بیٹھی تھیں، پاشو میاں کی منہ بولی ماں بیمار بھینس کی مالش کر رہی تھی۔ اور گلی کی رونق پاشو میاں کی رنگین زندگی کی پالن ہار نازکی اپنی کوٹھری کی دہلیز میں میلے ٹاٹ کے پردے سے لگی کھڑی تھی۔ اور گلی کا ملنگ صرف ایک لنگوٹی باندھے شکستہ عاشور خانے میں بیٹھا بے ہنگم آواز میں کوئی مرثیہ پڑھ رہا تھا۔

پولیس انسپکٹر سیدھا نازکی کی کوٹھری پر آیا اور بڑے دبدبے سے بولا "باہر آ بد ذات"۔

نازکی بغیر کسی جھجک کے باہر آ گئی اس کے چہرے سے کسی قسم کی فکر یا پریشانی ظاہر نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے سیدھا ہاتھ ذرا سا اٹھا کر "سلام صاحب" کہا اور نیچی نگاہیں کئے کھڑی ہو گئی ـــــ انسپکٹر نے نازکی کے سراپا پر نگاہِ غلط انداز ڈالی اور گلے میں لٹکے پستول کی پٹی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا "وہ بدمعاش پاشو کہاں ہے صبح پھر اس نے دارو پی کر محلے میں دنگا کیا ـــــ وہ حرامی ہے کہاں بتا تو۔"

"پاشو تو کل سے گلی میں نہیں آیا صاحب" اور اس نے تو آج کل مارم ماری، بلوا اور پینا چھوڑ دیا ہے۔ پرسوں تو وہ ملنگ کے قدموں میں پڑا دنیا تجنے کو کہہ رہا تھا۔

"باتیں نہ بنا۔ صاف صاف بتا وہ لفنگا ہے کہاں۔" ایک ادھیڑ عمر کے کانسٹبل نے ڈنڈا زمین پر مارتے ہوئے کہا۔

نازکی نے پھر ایک بار کہا، "صاحب کہہ دیا نا کہ وہ کل سے نہیں آیا معلوم نہیں کہاں ہے؟"

پولیس والے نازکی کی کوٹھری میں گھس گئے۔ کمرے میں کونوں، کھدروں تک میں پاشو کو تلاش کیا گیا۔ پھر انسپکٹر کے حکم پر گلی کے دو چار مشکوک مکانات کی بھی تلاشی ہوئی۔ ناکام ہونے پر انسپکٹر نے اپنی سنہری باریک باریک مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔" ہم سے بچ کر کہاں جائے گا حرامی، آج نہیں تو کل گھیر دوں گا اسے۔"

پولیس کے جانے کے بعد گلی پھر سے جاگ اٹھی۔ شور، پکار، گالی گلوچ، دھول دھپا شروع ہو گیا۔ پاشو میاں بھی آہستہ آہستہ جھومتا ہوا قحبے مکان سے برآمد ہوا۔ وہ نازکی کی کوٹھری کے سامنے والے چبوترے پر آ کر بیٹھ گیا۔ اور بابو کو آواز دی۔ بابو دوڑتا ہوا آیا اور "حکم پاشو استاد" کہہ کر کھڑا ہو گیا۔ بابو ۱۴، ۱۵ سال کا دبلا پتلا لڑکا تھا جس کے ماں باپ کا پتہ نہ تھا۔ پاشو میاں اسے بچپن سے ہی پال رہا تھا۔ پاشو میاں کا خیال تھا کہ بابو ہی اس کا حقیقی جانشین بن سکتا ہے چونکہ اس نے وہ تمام گر پاشو میاں سے سیکھ لئے تھے۔ جو اس پیشے کے لئے ضروری ہیں۔

پاشو نے بابو سے چار زوردار چائے لانے کے لئے کہا اور سگریٹ سلگا کر نیم دراز ہو گیا۔ اس نے نازکی سے پوچھا۔"کیا کہہ رہا تھا وہ بھڑوا پولیس والا۔ سالوں نے ناک میں دم کر دیا ہے۔ روز ایک نیا لفڑا کھڑا کر دیتے ہیں۔" نازکی کوٹھری سے باہر آ گئی اور بڑی بے اعتنائی سے بولی۔" تجھے پوچھ رہا تھا موا۔ میں نے چلا دیا کہ تو، تو کل سے نہیں آیا۔ بڑی دھونس جما رہا تھا، وہ یوں جیسے میں اس کی دھونس میں آ کر تیرا ٹھکانہ بتا دوں گی۔" پھر نازکی نے جماہی لیتے ہوئے مدھم خمار آلود آواز میں کہا" پاشو تھوڑی بچی ہو تو دے جسم ٹوٹ رہا ہے۔"

پاشو نے جواب دیا" ابھی دیتا ہوں سالی مری کیوں جا رہی ہے تیرے لیے تھوڑی بچا رکھی ہے پہلے چائے تو پی لے۔" اتنے میں بابو چائے لے آیا۔ چائے پی کر پاشو یہ کہہ کر اٹھ گیا کہ نازکی تیرے لیے تھوڑی لاتا ہوں۔"

نازکی اکیلی رہ گئی، وہ یوں ہی پردے کو پکڑے کھڑی ٹرک کی طرف دیکھ رہی تھی۔ آج نہ جانے اسے نیند کیوں نہیں آ رہی تھی۔ ورنہ وہ اس وقت تو مزے میں خراٹے لیتی رہتی تھی۔ تھوڑی دیر میں نجھلی بی کا بیٹا ایک بوتل نیفے میں اڑسے آ گیا اور نازکی کی کوٹھری میں گھس کر رازداری سے بولا پاشو میاں نے ...... بھجوائی ہے یہ بوتل تیرے لیے۔ لا میرا انعام دے نازکی۔ نازکی نے ایک چونی اس کی طرف پھینک دی اور وہ خوش خوش چلا گیا۔

نازکی نے بوتل کو غور سے دیکھا اور پھر آنکھیں میچ کر غٹاغٹ پوری بوتل پی گئی۔ پھر اس نے پوری سگریٹ سلگائی اور ٹرک کو گھورنے لگی۔ اب ٹرک پر چلتے ہوئے لوگ اسے دھندلے نظر آ رہے تھے۔ پھر وہ سر پکڑ کر دہلیز میں بیٹھ گئی۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ راہگیر اسے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ بعض منچلے تو بار بار اس کی کوٹھری کے سامنے سے گزرتے اور بنا پلک جھپکے اسے گھورا کرتے۔ ایک نوجوان سائیکل آہستہ آہستہ چلاتا ہوا اس کی کوٹھری کے چبوترے سے لگتا گزر گیا اور آگے جا کر مڑتے ہوئے بولا" جیو پاشا طبیعت خوش ہو گئی تمہیں دیکھ کر۔" نازکی کو اس نوجوان کی حرکت پر ہنسی آ گئی۔ اسے نشہ چڑھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔ اور جسم میں توانائی سی آ گئی تھی۔

مسلسل ٹرک کو گھورنے کی وجہ سے اس کی آنکھیں جلنے لگی تھیں اور سر میں ہلکا ہلکا درد ہو رہا تھا۔ طبیعت خواہ مخواہ ہی اداس ہو رہی تھی مگر پھر بھی وہ ٹرک کو گھورے جا رہی تھی۔ چونکہ نیند اس کی آنکھوں سے دور تھی اور رضائی تو لی بستر پر لوٹتے رہنا اسے اچھا نہ لگتا تھا۔ دور گلی کے موڑ پر اسے ایک جانا پہچانا چہرہ نظر آیا اور اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ جوں جوں وہ مرد آگے بڑھا۔ اس کے دل کی دھڑکن بڑھتی گئی۔ اب تو وہ اس مرد کے چہرے کو گھور کر دیکھ رہی تھی بلا شبہ وہ رگھو نندن تھا۔ اس کے من میں عجیب سی ہلچل مچ گئی تھی۔ رگھو کو دیکھ کر وہ ڈر بھی گئی تھی اور یہ بھی چاہ رہی تھی کہ اس سے باتیں کرے، اسے چھوئے، بیٹھے اور اس کے چوڑے سینے پر سر رکھ کر سو جائے۔

رگھو نندن سر جھکائے آہستہ آہستہ اپنی دھن میں چلا جا رہا تھا۔ نازکی نے جب رگھو کو غور سے پردے کی اوٹ سے دیکھا

تو اسے ایک دھکا سا لگا۔ رگھو کتنا بدل گیا تھا۔ گٹھا ہوا صحت مند کسرتی بدن اب قدرے جھک گیا تھا۔ اس کے بھرے بھرے گال پچک گئے تھے۔ اس کے سر کے بال خشک تھے۔ اور آنکھیں بجھ سی گئی تھیں۔ نازکی نے ایک سرد آہ بھری اور خیال کیا " رگھو کو جیل کی زندگی راس نہیں آئی۔ گھل گھل کر بے چارہ آدھا بھی نہیں رہا۔

اور پھر اس کی آنکھوں میں چار سال پہلے کے شب و روز دھوم مچانے لگے۔ جب وہ حسن پور میں اپنے ماں باپ کے ساتھ ایک چھوٹے سے مکان میں رہتی تھی۔ تب تو اس کا نام پدما تھا، نازکی نہیں تھا۔ اس کا باپ اپنی چھوٹی سی زمین کاشت کرتا تھا۔ ماں بھینس کا دودھ دوہتی اور کھانا پکاتی تھی۔ اور وہ برتن دھوتی اور گوبر کے اپلے تھاپتی تھی۔ اپلے تھاپنے وہ اپنے مکان سے ذرا دور کھلے میدان میں جاتی۔ وہیں رگھو نندن سے اس کی آنکھیں چار ہوئی تھیں۔ رگھو نندن گھوردھن پٹیل کا لڑکا تھا جو شہر سے سات آٹھ کلاس تک تعلیم پا کر آیا تھا۔ اور گاؤں میں پنساری کی دکان کرتا تھا۔ لمبا چوڑا صحت مند پچیس سال کا نوجوان وہ پدما پر فدا تھا۔ اور پدما اس پر جان چھڑکتی تھی۔ ان کی ملاقاتیں چوری چوری ہوا کرتی تھیں۔ چونکہ پدما کے گھرانے اور رگھو کے گھرانے میں ایک عرصے سے لڑائی تھی اور ان لوگوں نے ایک دوسرے کے یہاں آنا جانا اور حقہ پانی بند کر دیا تھا۔ مگر عشق و جوانی بھلا ان اختلافات کی پروا کہاں کرتے ہیں۔ ملاقاتیں بڑھتی گئیں۔ اور جب گاؤں میں ان کے عشق کا چرچا ہوا تو پدما کو اس کے باپ نے خوب دھنکا۔ اور چاقو سے گلا کاٹنے کی دھمکی دی۔ ادھر رگھو کے باپ نے اسے جائداد سے محروم کر دینے اور عاق کرنے کا ڈر دکھلایا۔ عشق میں وہ گرمی نہ رہی۔ شعلہ سی لپک چمک نہ ہو تو کیا ہوا، راکھ کے ڈھیر میں چنگاریاں تو تھیں۔ دو چار دن آڑ وہ ایک دوسرے کو دیکھ کر دل کی پیاس بجھا لیتے۔ اور اس دوری کی وجہ سے تو جنوں کی پیاس کچھ اور سوا ہو گئی تھی۔

ایک دن وہ شام کے جھٹپٹے میں وید کے یہاں ماں کی دوا لینے جا رہی تھی۔ تب مندر کے سنسان موڑ پر رگھو نندن نے اُسے آ لیا تھا رگھو نے اس کا ہاتھ اپنے سخت ہاتھ کی گرفت میں لے کر فیصلہ کن انداز میں پوچھا تھا۔

" پدما آج اور ابھی فیصلہ کر، تجھے میرا ساتھ منظور ہے یا اپنے ماں باپ کا!"

وہ عجیب تذبذب میں پڑ گئی تھی۔ مگر رگھو کے جوان جسم کی قربت اور گرمی نے اس سے اگلوا لیا تھا۔ " مجھے تیرا ساتھ منظور ہے اور اسی وقت انہوں نے طے کر لیا۔ کہ رات میں وہ گاؤں چھوڑ دیں گے۔" اور اپنی چھوٹی سی دنیا الگ بسائیں گے۔

وہ اماوس کی کالی رات تھی، ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ کڑکڑے جاڑوں کا موسم۔ یوں بھی گاؤں کونسا شاد آباد تھا۔ کہ راتوں کو چہل پہل رہتی۔ لوگ شام ہی سے گھروں میں گھس جاتے اور لحافوں اور کمبلوں میں دبکے پڑے رہتے۔ پدما کی ماں کو تیز بخار تھا۔ اور وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں پڑی کراہ رہی تھی۔ باپ تھک کر سو گیا تھا۔ چھوٹا بھائی بھی نیند کے مزے لوٹ رہے تھے۔ اور پدما پھر الجھن میں پڑ گئی تھی۔ ایک طرف تو گھر بار، ماں باپ اور سہیلیاں تھیں اور دوسری طرف صرف رگھو نندن کی محبت مگر اس کے دل نے رگھو نندن ہی کا ساتھ دیا۔ اور پدما نے دو ساڑیاں اور اپنا مختصر سا زیور اور چپل ایک کپڑے میں باندھی اور دبے پاؤں باہر نکل گئی۔ مندر کے پاس راگھو اس کا منتظر تھا۔ راگھو بن ٹھن کر پورا صاحب لگ رہا تھا۔ پدما کو دیکھ کر اس نے دھیرے سے کہا۔ " آ گئی میری چڑیا۔" پھر اس نے پدما کو لپٹا کر چٹاچٹ بوسے لے لیے تھے۔ اور پدما کے دل سے خوف دور ہو گیا تھا۔ کہ وہ راگھو کے سینے سے لگی کھڑی سوچ رہی تھی۔ یہ مرد مجھے ہر مصیبت سے محفوظ رکھے گا۔ بھاگم بھاگ وہ قریبی ریلوے اسٹیشن گئے تھے۔ انہوں نے شہر کا ٹکٹ لیا۔ شہر میں راگھو نے ایک کمرہ لیا۔ اور خوب عیش ہونے لگے۔ تین دن گزر گئے تو پدما محبت کے نشے سے بیدار ہوئی، ماں باپ کی، بھائیوں کی اور سہیلیوں کی یاد آئی اور اپنے کیے پر پچھتاوا سا ہوا۔ رگھو بھی پدما کے جسم سے چلتے پھٹے اُوب گیا۔ وہ دن بھر تو غائب رہا۔ رات گئے لوٹا تو نشے میں چور تھا اور

اول فول بک رہا۔ دوسرے دن بھی وہ ناشتے کے بعد ہی چلا گیا۔ پدما ہوٹل کی زندگی سے تنگ آگئی تھی۔ اور کمرے کی تنہائی اسے ڈرائے جا رہی تھی۔ ہوٹل کا چھوکرا رمیش دو وقت کھانا اور چائے دے جاتا۔ جب رگھو رات کے بارہ بجے تک نہ لوٹا تو پدما کو تشویش ہوئی۔ اس نے کمرے سے باہر نکل کر رمیش کو بلایا۔ وہ آیا تو پدما نے اسے سب قصّہ کہہ سنایا۔ ویسے ان چار دنوں میں پدما نے محسوس کر لیا تھا کہ لڑکا بھلا ہے اور قابلِ بھروسہ ہے۔ رمیش نے پدما کی باتیں غور سے سنیں۔ اور یہ ترکیب بتائی کہ پولیس میں رپورٹ کر دی جائے۔ پدما رگھو پتی پر اتنی ناراض تھی۔ کہ رپورٹ لکھانے پر راضی ہو گئی۔ پھر رمیش نے مشورہ دیا۔ کہ ہوٹل چھوڑ کر وہ اس کے ساتھ اس کی کھولی پر چل کر رہے۔ جہاں اس کی ماں بھی رہتی ہے۔ پدما اتنی غمگین اور خوفزدہ تھی۔ کہ رمیش کی ہر بات اس نے قبول کر لی اور رمیش اسے اپنے ہاں لے آیا۔ صبح پولیس میں رپورٹ لکھانے سے سے پہلے ہی رمیش نے خبر دی کہ رگھو رات کے دو بجے نشہ کی حالت میں ایک رنڈی کے یہاں پکڑا گیا ہے۔ اور اب وہ پولیس تھانے میں ہے۔ تھوڑی دیر بعد پدما تھانے لائی گئی۔ یوں بھی ابتدائی تفتیش میں رگھو قبول کر چکا تھا کہ اس نے پدما کو اغوا کیا ہے اور پولیس کی گھڑکیوں سے مرعوب ہو کر پدما نے بھی اقرار کر لیا۔ پدما کے باپ کی طلبی ہوئی۔ تو اس غیرت دار نے آنے سے صفا انکار کر دیا۔ اور کہلا دیا کہ میرا اس نابکار سے کوئی رشتہ نہیں رہا۔ اور اب وہ پدما کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتا ہے رگھو کے باپ بے چارے نے بیٹے کو بچانے کے لیے بہت بھاگ دوڑ کی مگر سب بیکار ثابت ہوئی۔

بے سہارا پدما ہوٹل والے رمیش کا سہارا غنیمت جانتے ہوئے جو کچھ اس نے کہا وہی کرنے لگی۔ عدالت میں بھی اس نے رگھو کے خلاف بیان دے دیا کہ اس نے پدما کو زبردستی اغوا کیا تھا۔ اور مجسٹریٹ نے کھٹ سے رگھو کو تین سال کی سزا سنا دی۔ رگھو نفرت بھری نگاہوں سے پدما کو دیکھتا ہوا جیل چلا گیا۔

رمیش نے خوب ہاتھ پیر نکالے، پدما کو شہر کی سیر کرائی۔ سینما دکھائے، ساریاں لا کر دیں۔ اور نت نئے شوق لگائے۔ پھر ایک دن رمیش پاشو میاں کو لے آیا۔ پاشو میاں نے ایک پارکھ کی نظر سے پدما کو سر سے پیر تک دیکھا۔ اور باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد رمیش گھبرایا ہوا آیا اور پدما سے بولا۔ "پدما دیدی تمہارے ساتھ رہنے کی وجہ سے پولیس کی نظر مجھ پر ہے۔ ابھی ابھی جمعدار سے نمٹ کر آ رہا ہوں تم پاشو میاں کے ساتھ چلی جاؤ۔ وہ بے چارے بڑے ہمدرد اور غریبوں کے پالن ہار ہیں۔ آٹھ دس دن میں تمہیں کسی اور جگہ منتقل کر دوں گا۔ رمیش کی ماں نے..... بھی کوسنے کے انداز میں کہا۔" ہاں جی کب تک۔ ہم تمہارے لیے پریشان رہیں۔ میرا بیٹا تمہاری فکر میں آدھا بھی نہیں رہا۔ جاؤ پاشو کے ساتھ وہ تمہیں کہیں نہ کہیں کام دلا دے گا۔ بڑا اثر رسوخ والا آدمی ہے وہ۔"

با دلِ ناخواستہ پدما پاشو کے ساتھ رکشہ میں بیٹھ گئی۔ پاشو تین چار دن تو انتہائی سعادت مندی سے اس کی خدمت کرتا رہا۔ اچھا سے اچھا کھلاتا۔ دل بہلائی کے لیے ریڈیو اور دو بوڑھیاں تھیں۔ جو خوب، چٹ پٹی باتیں کیا کرتیں۔ آرام دہ بستر بھی تھا۔ پدما روز پاشو سے پوچھتی۔ بھیا مجھے کب کام لگاؤ گے۔ اور وہ روز کہتا۔ کل تجھے کام پر لگا دوں گا۔ چوتھے دن رات کے گیارہ بجے پاشو اس کے کمرے میں آکر بڑی رازداری سے بولا " پدما زبردست آسامی لایا ہوں تو اسے خوش کر دے گی۔ تو وارے نیارے ہو جائیں گے۔ صبح سو روپے کی پتی جھڑا لینا اس سے۔"

پدما سٹپٹا گئی۔ اس نے حیرت سے پوچھا۔ کیا کرنے کو کہہ رہے ہو تم مجھے۔ زبردست آدمی سے کیا تعلق۔"

تب پاشو نے ایک طمانچہ اسے لگایا۔ اور مخمور لہجے میں بولا۔ "مردار، چار دن سے کیا ماں کی کمائی کھا رہی ہے۔ دھندا نہیں کرے گی تو کھائے گی کیا ؟۔ سب پتہ ہے تو کتنی شریف ہے۔"

پدما کو معلوم ہو گیا اسے کیا کرنا ہو گا۔ وہ کر سکتے میں آگئی۔ یہ بات تو اس نے کبھی سوچی بھی نہ تھی۔ اس نے دھیرے سے سہمے لہجے

کہا۔ "دیکھو پاشو بھائی مجھ سے یہ کام نہ ہو سکے گا۔ مجھے اگر معلوم ہوتا کہ تم مجھ سے یہ کام کراؤ گے تو میں کبھی تمہارے ساتھ نہ آتی۔ لو میں جاتی ہوں۔ تم نے مجھے غلط سمجھا ہے۔"

"میں نے تجھے کیا سمجھا ہے ابھی بتاتا ہوں" کہہ کر پاشو میاں نے گھونسوں کی بارش شروع کر دی۔ "سالی میں تیرے بھلے کی کہہ رہا ہوں۔ صورت شکل کی اچھی ہے بن ٹھن کر کام کرے گی تو خوب کمائے گی۔ اور زندگی بھر ٹھاٹ کرے گی۔ تیرا باپ تجھے لے جانے سے رہا۔ تو جیل میں چکی پیس رہا ہے۔ اب گاؤں گھر گھر ٹکڑے مانگتی پھرے گی۔ اری کمبخت بھیک بھی مانگے گی۔ تو کوئی منچلا ہاتھ کھینچ کر گھر میں ڈال لے گا۔ اور روٹی کا ٹکڑا اور پیسہ بھی نہ دے گا۔ سوچ کرے گا۔ یہاں رہے گی تو حکومت کرے گی" پٹائی کے درمیان پاشو نے کہا۔

روتے روتے پدما کی ہچکی بندھ گئی۔ اور اس کے ہوش کھو گئے۔ نہ جانے کیسے اس نے کہہ دیا۔

"اچھا تو جو کہے گا کروں گی۔" اور پاشو نے خوش ہو کر جھٹ سے اس کا پیار لے لیا۔ اور بولا۔ "اب ہوئی نا سولہ آنے والی بات۔ تو نے پاشو کو نہیں پہچانا بڑا بادشاہ آدمی ہوں رے میں! قسم سے تو میرے کہنے پر عمل کرے گی۔ تو جان لڑا دوں گا۔" کمرے سے نکلتے ہوئے پاشو نے مشورہ دیا۔ "اپنا نام پدما نہیں بلکہ نازکی بتانا۔ اور گاؤں کا نام صفی پور بتانا۔ اور ہاں آنے والے سے لگاوٹ کرنا۔ لڑائی اور ٹنٹے کی نہیں۔ اس دھندے میں جی کو بڑا مارنا پڑتا ہے۔ اگر آسامی کے ساتھ کچھ گڑبڑ کی تو مار مار کر بھرکس نکال دوں گا۔"

ابتدائی دنوں میں تو پدما کو نازکی بننے میں بہت تکلیف ہوئی۔ مگر رفتہ رفتہ وہ اس پیشہ اور ماحول سے مانوس ہو گئی۔ ایک مدت ایسی بھی آئی۔ کہ وہ پدما کو بھول سی گئی۔ اور صرف نازکی ہی رہ گئی۔ اور محلے کی سب سے چالاک، صحت مند اور گاہک مار جانے لگی۔ ہاں یہ ضرور تھا۔ کہ اس نے اپنی صحت کا بہت خیال رکھا۔ اچھا سے اچھا کھاتی۔ صاف ستھری رہتی۔ وقتاً فوقتاً احتیاطاً انجکشن لگوایا کرتی۔ اس لیے تو اس کی مانگ جیسی تین سال پہلے تھی۔ ویسی ہی رہی۔ اس کی زندگی بڑے سکون سے ایک ہی ڈگر پر بغیر کوئی اہم تبدیلی ہوئے بیت رہی تھی۔ مگر آج رگھو نندن کو دیکھ کر اس کی پرسکون زندگی میں تلاطم پیدا ہو گیا تھا۔ اور محبت کا وہ شعلہ جو چنگاری سے راکھ بن چکا تھا۔ بھڑک اٹھا تھا ماں باپ کے یاد دلانے پھر سے ذہن میں انگڑائی لی تھی۔ وہ گاؤں کی سونی سونی جانی پہچانی گلیاں اور سہیلیاں یاد آ گئی تھیں اور پہلی محبت کا پہلا زخم پھر سے ہرا ہو گیا تھا۔

ایک ہی لمحہ میں اس نے فیصلہ کر لیا۔ اب کیا کرنا ہے۔ اس نے بابو کو آواز دی اور اسے رگھو نندن کے پیچھے دوڑایا۔ کہ کسی طرح بھی اچھی باتیں کر کے بہلا پھسلا کر رگھو نندن کو لے آئے۔ اور واقعی بابو رگھو نندن کو لے آیا۔ رگھو کمرے میں آ کر نازکی کو دیکھتا رہ گیا۔ نازکی نے آہستہ سے کہا۔ "آ رگھو بیٹھ تو تجھ سے کتنی باتیں کرنا ہے مجھے۔"

رگھو نے تڑاخ سے ایک طمانچہ نازکی کے رسید کیا۔ اور غصہ میں بولا۔ "ذلیل کتیا تو نے گاؤں کو رسوا کر دیا۔ میں تیرے لیے [illegible] گیا۔ اور تو نے یاروں کے سنگ عیش کیا۔ تیرا میرا اب کوئی رشتہ نہیں رہا۔ جی تو چاہتا ہے کہ تجھے مار ڈالوں۔ مگر تو مرے نہیں [illegible] زندہ رہے۔ اور بری سے بری حالت میں زندہ رہے۔ ٹکڑے ٹکڑے کو محتاج ہو۔ تیرے جسم میں کیڑے کلبلائیں۔ اور تجھے معلوم ہو کہ محبت میں دھوکا دینے کی سزا کیا ہوتی ہے۔ خبردار اب جو میرا نام اپنی ناپاک زبان پر لائی تو" کہہ کر رگھو تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا باہر نکل گیا۔

رگھو کے باہر نکلتے ہی بابو آ گیا۔ اور شوخی سے آنکھ مارتے ہوئے بولا۔ "کتنے جھگڑے ہیں نازکی اس گنوار سے؟"

نازکی کھول رہی تھی۔ جھٹ بول پڑی۔ "تجھے کیا مطلب بھڑوے، تجھے تو اپنے ٹکے سے غرض ہے نا۔ یہ لے تیرا انعام

پھر نازکی نے ایک روپے کا نوٹ بابو کی طرف اچھال دیا۔

اُس دن شام ہی سے وہ اٹوٹی کھٹوٹی لے کر پڑ گئی۔ اور پاشو سے بھی اُس نے سخت بیماری کا بہانہ کر دیا۔ اور اس رات کے کاروبار بند ہو گیا۔ رات بھر نازکی تڑپتی رہی۔ بار بار اسے رگھو کے کہے ہوئے آخری جملے یاد آتے رہے اور اس کی آنکھوں میں گھو کی نفرت بھری آنکھوں کا تصور گھوم گھوم جاتا۔ اُس نے اپنی موجودہ زندگی پر نظر ڈالی۔ تو وہ بھی کچھ کم دردناک نہیں تھی۔ متعین آمدنی، گناہ آلود زندگی ۔۔۔ اپنی مرضی سے جی سکنا نہ مر سکنا۔ غنڈوں کا ڈر، شریفوں کا ڈر، اور پولیس کا ڈر لامتناہی یکساں اور اکتا دینے والے لیل و نہار۔۔۔

چوک کے کلاک ٹاور نے پانچ کے گھنٹے بجائے، تو وہ چونکی کہ صبح ہو رہی ہے۔ ورنہ یہ وقت تو اس کی نیند کا ہوتا تھا۔ گہری، میٹھی خوابوں بھری نیند، سڑک پر اِکا دُکا آدمیوں کے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے رکشا گزرتا تو دیر تک کانوں میں اس کے گھنگھروؤں کی چھن چھن گونجتی رہتی۔ بلدیہ کی جھاڑو لگانے والیاں سڑک صاف کر رہی تھیں۔ نازکی نے باہر نکل کر دیکھا۔ تو اس کے اپنے سب لوگ سوئے پڑے تھے۔۔۔ اُسے ان لوگوں کی بے فکری پر رشک بھی آیا اور چڑ بھی۔ نازکی نے بلدیہ کی ایک جھاڑو والی سے چائے منگوا کر پی۔ اور کمر سیدھی کرنے چارپائی پر لیٹ گئی۔ تھکے ہوئے دماغ اور جسم نے آرام دہ بستر پر پڑتے ہی اسے سلا دیا۔

گیارہ بجے وہ جاگی تو گلی بھی جاگ اٹھی تھی۔ روز کی گہما گہمی تھی۔ وہی چیخ پکار، ہاہو، گالی گلوچ، مار کٹائی۔ اس کے ذہن میں اب بھی رگھو کی باتیں ابھر رہی تھیں۔ پاشو اور بابو نے اس کی بیماری کے متعلق بہت تشویش سے پوچھا۔ تو وہ بڑی بے دلی سے بولی۔ اب ٹھیک ہوں۔ بابو بھاگا بھاگا گیا اور اس کے لئے زوردار ناشتہ لے آیا، آملیٹ، پراٹھے، بالائی کی پلیٹ، بالائی کی موٹی تہ والی چائے اور مصالحہ کا خوشبودار پان، نازکی سے بمشکل ایک پراٹھا کھایا گیا۔ اور وہ بھی ہضم نہ ہو سکا، چھاتی کے اوپر اوپر کھیلتا رہا۔

پاشو نے حسبِ معمول اپنی خوراک لے لی تھی۔ اور اب وہ گلی میں دنگا کر رہا تھا۔ بابو محلے کے جوا خانے میں بیٹھا تھا۔ بھینس والی ماں جی پڑوس والی گوالن کو رونگٹے کھڑے کر دینے والی گالیاں دے رہی تھی اور تانگے پر سینما کا اشتہار شروع ہو گیا تھا لاؤڈ اسپیکر پر فقیر محمد نئی فلم کا پرزور اعلان کر رہا تھا۔ محض اپنی شانتی کو سنانے کے لیے۔

گلی میں شور ہوا کہ پولیس کی گاڑی آگئی اور گلی میں موت کا سناٹا چھا گیا۔۔۔ پاشو بھاگتا بھاگتا اپنی پرانی پناہ گاہ میں جا چھپا۔ پولیس انسپکٹر سپاہیوں کے ساتھ اترا۔ اِدھر اُدھر گلی کے چپہ چپہ مکانوں میں پاشو کی ڈھنڈیا پڑی۔ پھر کل کی طرح انسپکٹر نازکی کی کوٹھڑی پر آیا۔ پولیس والوں کے کچھ کہنے سے پہلے ہی نازکی باہر نکل آئی اور بولی۔

"آئیے انسپکٹر صاحب میں پاشو کا پتہ بتاتی ہوں۔" اور وہ انسپکٹر کو لیے بڑے مکان میں گھس گئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد دو سپاہی پاشو کی گردن میں ہاتھ دیئے۔ دھکیلتے ہوئے اُسے باہر لائے۔ اور اسے گالیاں دیتے ہوئے انسپکٹر نے پرچہ چاک کیا۔

گلی کی بوڑھی نائیکاؤں میں اس کے ہم پیشہ لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ "حرامزادی نے آخر پاشو کو دھوکا دیا۔" ماں جی بولی۔

"کل شاید پاشو تے بھاٹا کم دی حرامزادی کو" سرور نے کہا۔

جیرالڈ کرش
کتاب۔ لکھنؤ
کے۔پی۔ سکسینہ

دھبّے

بدن پسینے سے شرابور۔ ماحول میں ایک عجیب سی گھٹن تھی۔ گرد، دھوپ اور گرم ہوا۔ یوں محسوس ہوتا تھا۔ گویا کندھے پہ ہین کیڑے رینگ رہے ہوں۔

میں ایک مکان کے سامنے رکا اور پانی پینے کی خواہش ظاہر کی۔ جھری دار چہرے والی ایک بوڑھی عورت نے ایک نظر میرے کپڑوں پر ڈالی۔ "آپ کیا پئیں گے؟"

جواب دینے سے پہلے میں نے جان بوجھ کر اپنی جیب میں زور سے ہاتھ ڈالا۔ تاکہ پیسوں کی کھنکھناہٹ وہ سن سکے۔

"کچھ بھی" میں نے کہا۔

میں نے ایک لمحے کے وقفے کے بعد اپنا چاندی کا سگریٹ کیس نکالا۔

"اندر تشریف لے آئیے" ضعیفہ مجھے عزّت سے اندر لے گئی۔

"آپ کا مکان کافی خوبصورت ہے۔ سجا بھی کافی سلیقے سے ہے" میں نے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"میں پچھلے اکتر برسوں سے یہاں رہ رہی ہوں"

"اتنے لمبے عرصے سے؟" میں نے حیرت ظاہر کی۔

"میں یہیں پیدا ہوئی تھی"

"سچ، مادام؟" ــــ

"بالکل سچ، یقین مانیے!

"مگر میں نے تو آپ کی عمر کا اندازہ پچاس پچپن کے قریب لگایا تھا" میں نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

"ہیں میں اکتر سال کی ہو چکی ہوں میرے والد بھی یہیں پیدا ہوئے تھے"

"ناممکن!" میں نے اور زیادہ متحیر ہو کر کہا۔

"اپنی زندگی میں صرف ایک بار یہ مکان چھوڑ کر میں اپنی بہن کے ساتھ رہنے پیرس گئی تھی۔ اس کے بعد کبھی ایک روز کے

بے بھی کہیں نہیں گئی۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"کیا آپ کو آرلس اچھا نہیں لگا؟"

"اس بارے میں میں ہاں یا نا کچھ نہیں کہہ سکتی۔"

پھر وہاں دوبارہ نہ جانے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟"

"وہ دیکھو!" ضعیفہ نے ایک دیوار کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ دیوار کی پتائی تقریباً پچھی ہوئی معلوم ہوتی تھی پلستر کھرچ کر نکال دیا گیا۔ اور اس کی جگہ چونا پتا ہوا تھا۔ پھر بھی چونے کی ہلکی سفید پرت کے نیچے سے اکھڑے ہوئے پلستر کے گڑھے صاف نظر آرہے تھے۔

"فیلکس نے ان دیواروں پر پلستر کرا دینے کا یقین دلایا تھا۔ مگر یہ تیس برس پہلے کی بات ہے۔ اور گڑھے آج بھی ویسے ہی ہیں۔ جیسے آپ دیکھ رہے ہیں۔" اس کی بڑبڑاہٹ میں غصہ جھلک رہا تھا۔

"پھر کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"بہن کے شوہر کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس کی ضد پر مجھے آرلس جانا پڑا۔ یوں جانے سے پہلے میرے ضمیر نے مجھے روکا مگر یہ دل کمبخت نہ مانا، اس کے علاوہ میری بہن کا شوہر ایک کامیاب سوداگر تھا۔ لگ بھگ پندرہ ہزار فرانک میری بہن کے نام چھوڑ گیا تھا۔ بہن نے یقین دلایا کہ مجھے آرلس میں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ میں چلی گئی۔ مگر وہ پندرہ ہزار فرانک میرے لیے خواب بن کر رہ گئے۔ میرے پہنچنے کے چند روز بعد میری بہن نے دوسری شادی کر لی اور میرے پلے بڑی لڑائی جھگڑے کے بعد کل دوسو فرانک ہی پڑے۔

بہن کے گھر جانے سے پہلے گاؤں کی ایک عورت میرے پاس آئی تھی۔ اس عورت سے میں آج تک خفا ہوں۔ اس نے مجھے بتایا کہ پیرس کا ایک مصور یہاں مکان کی جستجو میں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اچھے پیسے دے دے۔ میں اس مصور سے ملنے گئی۔ دبلا پتلا، گندہ، احمق قسم کا آدمی تھا۔ میں گندگی برداشت نہیں کر سکتی۔ مجھے صفائی بے حد پسند ہے۔ میرے سارے کپڑے عطر میں بسے رہتے ہیں۔ آپ خود اس گھر کی ایک ایک چیز دیکھ سکتے ہیں۔ کہیں بھی گندگی کا نام ونشان تک نہیں ملے گا۔ وہ آدمی تھنگنا اور گندہ تھا شاید اس کے دماغ میں کچھ خلل بھی رہا ہو۔ میری طرف عجیب نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ میرے ہاتھوں کو اٹھا کر کہنے لگا کہ خداوند عیسےٰ کو ایسے ہی ہاتھ اچھے لگتے ہیں۔ میں نے اسے ڈانٹ پلائی۔ اس کی اس بدتمیزی پر صاف صاف کہہ دیا کہ اگر میرے مکان میں رہنا چاہتا ہے تو دو ہفتے کے لیے تیس فرانک دینے ہوں گے۔ میں سمجھی تھی کہ بلا ٹلی۔ مگر اس نے اپنی جیب سے پیسے نکالے۔ اور پورے ساٹھ فرانک میرے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ پاگل! احمق کہیں کا۔

میں آرلس چلی گئی۔ مگر جانے سے قبل اپنا سارا قیمتی سامان، تانبے کے برتن، چاندی کے فریم میں جڑی تصویریں۔ اور قیمتی کپڑے الگ ایک کمرے میں بند کر گئی۔ جانے سے پہلے میں نے مصور سے یہ بھی پوچھا کہ آخر یہاں کونسا منظر ہے جسے وہ کینوس پر اتارے گا۔ بولا۔ کیوں؟ یہ سب کچھ کھڑکی کے باہر کھیتوں اور ناہموار راستوں پر نظریں جمائے تھا۔

میں اپنی بہن کے گھر چلی گئی۔ پھر وہ سب ہوا جو آپ کو بتا چکی ہوں۔ دس برس ہوئے بہن کا بھی انتقال ہو چکا ہے۔ پانچ سو فرانک میرے نام چھوڑ گئی۔ اچھا ہی ہوا۔ آپ نے آرلس دیکھا ہے؟ وہاں کے قہوہ گھروں میں مرد و عورتیں ساتھ بیٹھ کر پیتے ہیں اور رات گئے تک گلیوں کے چکر کاٹتے ہیں۔ سڑیل جگہ۔ میں وہاں ایک مہینہ بھی نہیں رہ سکی۔ [illegible]

رہنے کے لائق ہے۔" ضعیفہ نے اتنا کہہ کر ایک چھوٹی سی خوشنما بوتل نکالی اور اس میں ایک پچکاری نما نلی لگا کر اپنے چہرے پر یوڈی کلون چھڑکا، جس کی خوشبو سارے کمرے میں تیر گئی۔ بوتل دراز میں رکھ کر اس نے ادھوری داستان جوڑنا شروع کی۔

"میرا ضمیر بھی مجھے گھر لوٹنے کے لیے ٹہوکے دے رہا تھا۔ ایک انجانا سا شبہ میرے دل و دماغ پر چھا رہا تھا۔ گھر آ کر بات سچ نکلی۔ مکان کے اندر پیر رکھتے ہی مجھے لگا جیسے کچھ گڑبڑ ہے۔ مصور جا چکا تھا۔ مکان خالی تھا۔ فرش گندہ تھا۔ اور دیوار تو آپ دیکھ ہی رہی ہیں۔ آج پینتالیس برس بعد بھی یہ دیوار گندی ہے۔ پلستر نے رنگ کے دھبوں کو گہرائی تک جذب کر لیا ہے۔ اُف! اس دیوار کی خاطر میں کتنا روئی ہوں۔ سینکڑوں بار اسے کھرچ ڈالا ہے۔ آپ خود ہی میرے غصے کا اندازہ لگا ئیں۔ اس مصور نے ساری دیوار پر تصویریں بنائی تھیں۔ میں بوڑھی عورت ہوں پھر بھی آپ کو صاف صاف بتا دوں۔ ایک نیم عریاں عورت کی تصویر جو پستان سے ایک بچہ چپکائے مردوں کے ساتھ کھیتوں میں کام کر رہی ہے۔ اُف! کچھ کالے، ادھ ننگے مزدور اور غلیظ میلے کچیلے بچے کنکروں سے کھیلتے ہوئے گویا کنکر نہ ہوں مخمل کی گڑیاں ہوں۔ اور سنیے! اس ساری غلاظت کے پاس مسکراتے ہوئے کھڑے خداوند یسوع کو دکھایا گیا تھا۔

میں نے تصویروں کو کھرچ دیا۔ مگر پھر بھی دیوار کے دھبے نہ صاف ہو سکے۔ نیا پلستر کافی مہنگا پڑتا ہے۔ میں نے پولیس سے درخواست کی کہ وہ نیلی آنکھوں والے اس غلیظ مصور کو ڈھونڈ نکالے مگر لاکھ کوشش کے باوجود بھی پولیس ناکام رہی۔ میں پوچھتی ہوں قانون کہاں ہے؟ انصاف کہاں ہے؟

اُس مصور کا پتہ نہیں چلا۔ کوئی کہتا تھا کہ اُسے آرلس کی گندی بستی میں دیکھا گیا ہے۔ مر جائے کم بخت۔ آج اڑتالیس برس بعد بھی یہ غلیظ دھبے نہ جانے کیوں میرے ذہن کی گہرائیوں میں سے نکلنے کی بجائے اور گہرے ہوتے جا رہے ہیں۔ ادھ ننگی عورت ... ڈھلکے پستان ... میلے کچیلے مزدور اور ... اور کالے کلوٹے غلیظ بچے، پاس میں کھڑے خداوند یسوع۔ اُف! میرا ذہن پھٹ جائے گا۔ اور ضعیفہ لپک کر دوبارہ دراز سے یوڈی کلون نکال کر تیزی سے چھڑکنے لگی۔

فانی اور اُن کی شاعری

مرتبہ:- ڈاکٹر محمد احسن فاروقی

چند لکھنے والے:-

• ڈاکٹر احسن فاروقی (مقدمہ) • رشید احمد صدیقی • فراق گورکھپوری •
• سید احتشام حسین • ابو اللیث صدیقی • جگر مراد آبادی • ماہر القادری
• آل احمد سرور • سیماب اکبر آبادی • جوش ملیح آبادی • حامد حسن قادری
• خواجہ احمد فاروقی • (معیاری طباعت و کتابت • قیمت ۵۰-۴)

مکتبۂ ماحول۔ ۹۔ بہادر شاہ مارکیٹ کراچی

باقی صدیقی

بانو ۔ نئی دہلی

فجو آپا

فجو آپا کی شادی اس وقت ہوئی تھی، جب پچھلی جنگ عظیم کی ہوش رُبا گرانی عروج پر تھی۔ ان کے والد پوسٹ ماسٹر تھے۔ جنگائی بھتہ ملا کر ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو جو کچھ انہیں ملتا تھا وہ اتنے بڑے کنبے کو چلانے کے لئے بہت کم تھا۔ پھر بھی پوسٹ ماسٹر صاحب کسی نہ کسی طرح کھینچ تان کر سب کا پیٹ پال ہی رہے تھے۔ البتہ فجو آپا کے دفعتاً جوان ہو جانے اور پھر آہستہ آہستہ جوانی ڈھلتے جانے کا احساس اُن کے لئے بڑا جان لیوا تھا۔ قیمتیں ہر چیز کی بے اندازہ بڑھ گئی تھیں اور گہنے زیور، کپڑے لتے دعوتِ طعام سے زیادہ جو چیز گراں تھی وہ تھی کسی شریف خاندان کا برسرِ روزگار لڑکا خواہ وہ معمولی پڑھا لکھا ہی کیوں نہ ہو۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ یا کسی امیر گھرانے کا رشتہ تو پوسٹ ماسٹر صاحب چاہتے بھی نہ تھے۔ لیکن کم از کم ہائی اسکول پاس شدہ کی تلاش انہیں ضرور تھی۔ مگر ایسے لڑکوں کی قیمتیں بھی اونچی تھیں۔ کم از کم سیکڑوں روپے سلامی جہیز میں بائیسکل، گھڑی ریڈیو، لڑکے کو ملازمت دلانے کی ذمہ داری یا بی اے تک پڑھانے کا خرچہ، یہ سب ایسی قیمتیں تھیں جو کم از کم پوسٹ ماسٹر صاحب کی حیثیت سے باہر تھیں۔ آسانی سے دو چار لڑکے جو اچھے خاندان کے مل سکتے تھے ان میں سے بشتر بیڑی بنانے والے، موٹر چلانے والے، پولیس کانسٹبل یا بساط خانے کے معمولی دوکاندار تھے۔ یہ سب پوسٹ ماسٹر صاحب کے رشتے داروں اور احباب کو پسند ضرور تھے، خود پوسٹ ماسٹر صاحب کو بالکل پسند نہ تھے۔ فجو آپا اُن کی پہلی لڑکی تھیں اور بڑی دلاری تھیں۔ وہ اُن کی شادی بڑے حوصلے سے کرنا چاہتے تھے۔ فجو آپا کو انہوں نے خود اردو، فارسی اور حساب گھر پر پڑھایا تھا۔ اور زمانہ کو دیکھتے ہوئے انگریزی اسکول میں آٹھویں کلاس تک انگریزی بھی پڑھوائی تھی مگر پھر اس خیال سے کہ لڑکی کو نوکری تو کرنا نہیں ہے، انہوں نے تعلیم کا مزید سلسلہ بند کر دیا تھا۔ اب آٹھویں درجے تک پڑھی ہوئی فجو آپا جیسی گوری چٹی خوبصورت لڑکی کو وہ کسی معمولی قسم کے لڑکے کے ساتھ تو نہیں بیاہ سکتے تھے۔

پوسٹ ماسٹر صاحب نے ہر طرف دوڑ دھوپ کر رکھی تھی۔ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے اس تگ و دو میں دو تین سال کا زمانہ گزر گیا۔ پوسٹ ماسٹر صاحب لڑکی کی عمر بڑھنے کی نزاکت کا احساس کر رہے تھے اور ساتھ ہی مسلسل ناکامیوں سے تھک کر چڑچڑے، غصہ ور اور شکی بھی ہوتے جا رہے تھے۔

ایک روز شام کا وقت تھا پوسٹ ماسٹر صاحب ڈاک خانے سے لوٹ رہے تھے کہ حکیم انعام خاں سے ان کی ملاقات ہو گئی۔ حکیم صاحب ان کے پرانے یار تھے اور برسوں اُن کے پڑوس میں رہ چکے تھے۔ پھر ادھر آٹھ دس سال سے وہ لاپتہ تھے اور آج اچانک مل گئے تھے۔ بڑی گرم جوشی سے معانقہ ہوا اور پھر گذشتہ آٹھ دس سال پر تبصرہ کرتے ہوئے پوسٹ ماسٹر صاحب حکیم صاحب کو گھر لے آئے اور اپنی اوقات کے

مطابق چائے وغیرہ پلائی۔ اور رات کے کھانے پر بھی روک لیا۔ پوسٹ ماسٹر صاحب جانتے تھے کہ حکیم صاحب نے جب سے مطب چھوڑا ہے "حکیم مٹرک کے بعد حکیم ریل گاڑی" ہوتے ہوئے بہت سے چھوٹے چھوٹے شہروں اور قصبوں میں اپنے کافوری مرہم کے سلسلہ میں آئے گئے تھے۔ ممکن ہے کوئی اچھا لڑکا اور معقول گھرانہ ان کی نظر میں ہو اور آج ان کے کام آئے۔

پوسٹ ماسٹر صاحب اپنے اس اندازے میں سو فی صدی صحیح نکلے۔ حکیم صاحب نے رات کے کھانے کے بعد حقہ کشی کے دوران میں ناک سے دھواں نکال کر اور داڑھی پر ہاتھ پھیرنے کے بعد کہا۔ "بھائی! ایک لڑکا میری نظر میں ہے — محکمۂ جنگلات میں ہے"۔

"فارسٹر ہے"۔ پوسٹ ماسٹر صاحب نے پوچھا۔

"ہوگا — ایسا ہی ہے کچھ شاید۔ حکیم صاحب نے کہا۔

" پوسٹ ماسٹر صاحب اداس ہوگئے۔ "تب وہ میرے لائق نہ ہوگا حکیم صاحب۔ اُس کے نخرے بہت ہوں گے اور آپ تو میری حالت جانتے ہی ہیں"۔

حکیم صاحب نے پان کے چار بیڑوں کو منہ میں رکھکر دو چار بار گال پھلایا، پچکایا پھر ذرا سا منہ چلا کر بولے۔ "ایسی بات نہیں ہے وہ لوگ بڑے شریف ہیں۔ بڑا لڑکا پولیس میں کانسٹبل ہے۔ دوسرا محکمہ جنگلات میں ٹھیکیدار ہے اور تیسرا جو سب سے چھوٹا اور کنوارا ہے، اسی محکمہ میں سرکاری نوکر ہے۔ شاید فارسٹر ہی ہے"۔ پھر اگالدان میں کلی انڈیلنے کے بعد ذرا کھنکار کر بولے "بھئی رنگ تو سانولا ہے، مگر ہے تندرست اور باخلاق۔ گھرانہ بھی بڑا شریف ہے"۔

پوسٹ ماسٹر صاحب اور ان کی بیوی نے لڑکے کے گھرانے کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ پھر بات چیت شروع ہوئی۔ دان جہیز، سلامی اور جوڑے کی شرائط کے بغیر ہی شادی طے ہوگئی۔ پوسٹ ماسٹر صاحب کی بیوی کو صرف یہ شکایت تھی کہ انہوں نے سمدھن کے بارے میں سن رکھا تھا کہ بڑی تیز مزاج کی ہیں۔ لڑکے کے فارسٹر ہونے کی وجہ سے شادی کا طے ہو جانا وہ محال سمجھتی تھیں۔ لیکن اللہ نے یہ مسئلہ تو ایسا سلجھا دیا جیسے پوسٹ ماسٹر صاحب کا صبر اسی دن کے لئے تھا۔

شادی کے اگلے دن جب نجو آپا اپنے میکے لوٹیں اور بڑی بوڑھیوں کی بلائیں دعائیں ہو چکیں تو سہیلیوں اور سکھیوں کی جھرمٹ میں گھِر لی گئیں چہلیں ہونے لگیں۔ لیکن سب نے محسوس کیا کہ آپا کی ہنسی کھوکھلی ہے۔

سب سہیلیوں میں سروری بیگم کو جو قرب آپا سے حاصل تھا کسی دوسرے کو نصیب نہ تھا۔ سروری بیگم اُن کی خلیری بہن تھیں، ہم عمر تھیں اور اسکول میں بھی ساتھ ساتھ پڑھی تھیں۔ اسی لئے شروع سے ہی ایک دوسرے کی ہم راز و جاں نثار تھیں۔ سروری بیگم کی شادی صرف دو سال پہلے ہوئی تھی۔ وہ اپنے ماں باپ کی آخری لڑکی تھیں۔ ان کے والد ریلوے میں گارڈ کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے۔ اسی لئے بڑی لمبی چوڑی رقم یکمشت انہیں ملی تھی۔ چنانچہ بڑی دھوم دھام سے شادی ہوئی تھی۔ لڑکا بھی خاصا پڑھا لکھا تھا اور ریلوے میں ہی ڈی ایس آفس میں ملازم تھا۔ وجیہہ ہونے کے علاوہ اس کے طور طریقوں میں بڑی شائستگی اور وقار تھا۔

سروری بیگم کی شادی کی تاریخ سے آج تک کا دو سال کا جو زمانہ گزرا تھا اس میں صرف دو ہی ایک بار سروری بیگم اپنی سسرال گئی تھیں، ورنہ زیادہ تر میکہ میں ہی رہتی تھیں۔ لڑکا بنارس میں رہتا تھا۔ اور ہفتے میں دو بار ضرور خط بھیجتا تھا، مہینے میں ایک بار خود بھی آیا کرتا تھا۔ خط ایسا رومان پرور اور رنگین ہوا کرتا تھا کہ ایسے زوردار خط کو صرف پڑھ کر رکھ دینا خط کی توہین تھی اس لئے سروری بیگم نے شروع میں تو دو چار خطوں کو بہت چھپا کر رکھا۔ پھر دھیرے دھیرے نجو آپا کو اس سلسلہ میں بھی اپنا ہم راز بنا لیا۔

ان خطوں کو پڑھ پڑھ کر آپا کے دل میں گدگدی ہونے لگتی۔ وہ اس دن کے خواب دیکھنے لگتیں۔ جب اُن کا شوہر بھی اسی طرح ان سے خطاب

کرے گا۔ آپا کی پھیکی ہنسی سے سروری بیگم نے یہی اندازہ لگایا کہ شاید ان کے حسین خواب پورے نہیں ہوئے۔ اس نے علیحدگی میں بہت کرید کرید کر پوچھا تو آپا نے غمگین لہجے میں بتایا "یہ تو میں سُن ہی چکی تھی کہ وہ سانولے ہیں۔ اور قد کے بھی چھوٹے ہیں۔ لیکن میں سمجھتی تھی کہ وہ پڑھے لکھے تو ہوں گے ہی۔"

"تو کیا پڑھے لکھے بغیر ہی فارسٹر ہو جاتے ہیں؟"

"وہ تو نرے جاہل ہیں۔ شین قاف تک درست نہیں۔ مجھے تو ان کے فارسٹر ہونے پر بھی شبہ ہے۔ میرا خون حکیم صاحب کی گردن پر ہوگا۔ انہوں نے ابا کو دھوکا دیا ہے۔" آپا رو پڑیں۔

پھر جتنے دن فارسٹر صاحب رہے، آپا کے دل سے جیسے اترتے گئے۔ اور اسی طرح دور ہوتے ہوتے اپنی چھٹیاں ختم کر کے مرزاپور چلے گئے۔ وہاں سے ان کا پہلی بار جو خط آیا۔ وہ نہ صرف املا کی بے پناہ غلطیوں سے بھرپور تھا۔ بلکہ ایسے بھدّے بھونڈے اور غیر مہذب طریقوں سے اظہار محبت کیا گیا تھا کہ آپا نے خط پڑھ کر پھاڑ ڈالا۔ سروری بیگم نے پرزے جھپٹ لئے۔ لیکن اس کے بعد سے دوسرا کوئی خط سروری بیگم کو دیکھنے کو نہ ملا۔ اور نہ آئندہ سروری بیگم نے اپنے شوہر کا خط ہی آپا کو دکھایا۔ اور پھر رفتہ رفتہ ایسا ہوا کہ آپا کو فارسٹر صاحب سے کم اور سروری بیگم سے زیادہ نفرت ہو گئی۔

پھر ایک دن فارسٹر صاحب آئے اور آپا کو اپنے ساتھ مرزاپور لے گئے۔

شہر کے ہنگاموں سے دور، بہت دور، تہذیبی ترقیوں سے بہت پیچھے، سنسان ماحول میں پہنچ کر نجو آپا کو احساس ہوا کہ قدرت نے ان کے حُسن اور تعلیم یافتہ دماغ کے ساتھ گہرا طنز کیا ہے۔ یہیں پہنچ کر انہیں علم ہوا کہ فارسٹر صاحب واقعی جنگل میں کاٹی جانے والی لکڑیوں اور شہتیروں کا حساب کتاب رکھنے والے معمولی درجے کے منشی سے زیادہ اوقات کے آدمی نہیں ہیں ۔۔۔ سچ مچ کا فارسٹر ان کا بڑا افسر ہے اور پکے سرکاری کوارٹر میں رہتا ہے۔ منشی جی پھونس کے جھونپڑی نما مکان میں رہتے تھے۔ گھر میں جو کچھ اثاثہ موجود تھا پہلے سرے کا معمولی۔ جن کپڑوں کو پہن کر وہ سسرال جایا کرتے تھے۔ وہی ان کے بہترین ملبوسات تھے، جو بڑی احتیاط سے خاص مواقع کے لئے رکھے گئے تھے۔ اور عام زندگی میں ان کا لباس اور بھی گیا گزرا ہوتا تھا۔

نجو آپا کو اپنے شوہر سے نفرت ہو گئی اور وہ کسی طرح بھی اسے اپنے قابل نہ سمجھتی تھیں۔ پوسٹ ماسٹر صاحب سے بھی انہوں نے کھلم کھلا اپنی تقدیر کا رونا روتے ہوئے شوہر کی شکایتیں شروع کر دیں۔ اور ایسے ایسے خط لکھے کہ نہ صرف سسر کی نظر میں داماد کی وقعت کم ہو گئی۔ بلکہ انہیں یہ احساس ہو گیا کہ اگر کسی طرح لڑکی کو واپس بلا کر طلاق نہ لی گئی تو یا تو لڑکی کسی دن خودکشی کر لے گی یا دق کی مریض ہو کر چل بسے گی۔

نجو آپا نے پوسٹ ماسٹر صاحب کو اس سلسلے کا جو آخری خط لکھا اسے پڑھ کر وہ خود بھی آبدیدہ ہو گئے، بچی کا مامتا بھرا دل تو ایسا رویا کہ پوسٹ ماسٹر صاحب نے گھر سے ہی چھٹی کی درخواست بھجوا کر شیروانی پہنی اور مرزاپور کے لئے روانہ ہو گئے۔ راستے میں بہت سوچ بچار کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ داماد سے فی الحال بگاڑ کرنا مناسب نہیں، سب سے پہلے لڑکی کو کسی بہانے سے اس جیل خانہ سے آزادی دلانا ضروری ہے۔ پھر طلاق کا مسئلہ لڑکی کے گھر پہنچ جانے کے بعد چھیڑا جائے گا۔

گھر پہنچ کر نجو آپا کا چہرہ کھل اٹھا۔ ماں نے دوڑ کر بلائیں لیں۔ پاس پڑوس والیوں نے، جو ان کا قصہ سن چکی تھیں، ان کے سوکھ کر کانٹا ہو جانے کا ذکر بار بار کیا۔ آپا اس دن رات گئے تک رو رو کر اپنی بدقسمتی کے ثبوت فراہم کرتی رہیں۔ اور اسی رات متفقہ طور پر یہ بات طے ہو گئی کہ اب آپا کا طلاق ہی لے لینا بہتر ہے۔

اگلی صبح کو معلوم ہوا کہ سروری بیگم بھی بنارس سے واپس آگئی ہیں۔ ان کی حالت بہت خراب ہے۔ شروع شروع میں ہلکا سا بخار رہتا تھا، بڑھ کر دق ہو گئی ہے۔ شوہر نے علاج سے ایسی بے پروائی برتی ہے کہ آج مریں کل دوسرا دن کا عالم ہے۔ مجبوراً جب گھر والوں کو کسی دوسرے زبانی حال معلوم ہوا تو جا کر پتہ لگایا۔ شوہر اس حالت پر بھی انہیں بھیجنے کو تیار نہ تھا۔ مگر بڑے داؤ پیچ سے ان کے بڑے بھائی اس زندہ لاش کو اٹھا لائے۔

فجو آپا کو پہلے تو سروری بیگم کی اس زبوں حالی کا یقین نہ آیا۔ لیکن جب خود ان کی والدہ نے تصدیق کی اور یہ بھی کہا کہ تمہاری پرانی سہیلی ہے جاکر ایک نظر دیکھ آؤ، تو انہیں یقین کرنا پڑا اور مزاج پرسی کے لئے جانے کو بھی تیار ہوگئیں۔

سروری بیگم جیسا کھلا ہوا شاداب پھول واقعی مرجھا کر بستر گیر ہوگیا تھا اور سوکھ جانے میں بس گھڑی دو گھڑی کی دیر تھی۔ فجو آپا کو دیکھکر سروری بیگم کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ فجو آپا بھی ان سے لپٹ گئیں اور اتنا جی کھول کر روئیں کہ دل کا سارا غبار دھل گیا۔ پھر دھیرے دھیرے بات چیت شروع ہوئی۔

"میں تو سمجھی تھی کہ اب تم بنارس میں دولہا بھائی کے ساتھ رہ کر پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت اور تندرست ہوگئی ہوگی۔" فجو آپا نے کہا۔

سروری بیگم ایک ٹھنڈی سانس چھوڑ کر بولیں "فجو وہ دور سے جتنے بھلے لگتے تھے۔ قریب سے ایسے نہ نکلے۔" وہ جتنے صاف ستھرے اور سجیلے باہر سے لگتے تھے، اندر سے اُن کا دل اتنا ہی گندا اور ادارہ نکلا۔ بنارس کی ریلوے کالونی میں جہاں ہمارا کوارٹر ہے، اُس کے قریب ہی رہنے والی ایک آوارہ لڑکی سے آشنائی ہے۔ بازار حسن بھی پہنچ جاتے ہیں کبھی میں نے کچھ کہا تو ڈانٹ پھٹکار، لڑائی جھگڑے تک نوبت آگئی۔ پھر بے شرمی زیادہ بڑھ گئی۔ فجو اور انہوں نے مجھے مارا۔ فجو! سروری بیگم کی آنکھیں بھر آئیں۔

"اب انہوں نے اپنے ہر عیب پر پردہ ڈالنے کے لئے مجھے مارنا پیٹنا شروع کر دیا۔ میرے لئے چپ ہو جانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا میں چپ ہوگئی بالکل خاموش۔ اور وہ آزادی سے رنگ رلیاں مناتے رہے۔ نئی تہذیب اور فیشن کے نام پر روزانہ آدھی آدھی رات تک برج اور فلش کھیلتے رہے۔ اکثر ساری رات گزار کر شراب کے نشہ میں لڑکھڑاتے فجر کے وقت واپس آتے۔ کواڑ کھولنے میں ذرا بھی دیر ہو جاتی تو ایسی اول فول بکتے کہ اللہ کی پناہ۔ لیکن میں کچھ نہ بولتی۔ میں نے سارا غم چپ چاپ ہی پی لیا تھا۔ لیکن فجو یہ زہر مجھے ہضم نہ ہو سکا۔ اُس نے میرے پھیپھڑوں میں سوراخ کر دیا ہے۔ اور میں جیسا کہ تم دیکھ ہی رہی ہو چند گھڑیوں کی مہمان ہوں۔"

اتنا کہتے کہتے سروری بیگم کی آنکھیں خشک ہوگئیں۔ اور ان میں ایک عجیب سی چمک عود کر آئی۔

فجو آپا نے اُن کا سر اٹھا کر اپنے زانوں پر رکھ لیا تھا۔ اور آہستہ آہستہ اُن کے سر پر ہاتھ پھیر رہی تھیں۔ سروری بیگم نے پھر کہنا شروع کیا۔ فجو! تم کتنی خوش قسمت ہو۔ میں اکثر سوچتی ہوں کہ میری دو سالہ ازدواجی زندگی جتنی شاندار گزری تھی، اس سے تم نے مجھے کسی قدر خوش نصیب سمجھا تھا اور اپنے آپ کو صرف اس لئے بدنصیب گردانا تھا، کہ دولہا بھائی تمہارے ادبی اور فارسی آمیز جملوں کا مطلب نہیں سمجھ سکتے تھے۔ وہ شاعرانہ ڈھنگ سے اظہار محبت نہیں کر سکتے تھے وہ تمہیں رنگین اور ولولہ انگیز خطوط نہیں لکھ سکتے تھے، تمہاری زبان میں اُجڈ، جاہل اور گنوار تھے۔ لیکن فجو یہ تو سوچو وہ تمہارے حسن اور تمہاری تعلیم سے مرعوب تو ہیں، اپنی عقل کے مطابق تمہارے آرام اور دلجوئی کا خیال تو رکھتے ہیں تم واقعی خوش نصیب ہو کہ تمہیں کوئی زیادہ پڑھا لکھا اور نئی تہذیب کا آدمی نہ مل سکا۔"

سروری بیگم اپنی نحیف آواز میں نہ جانے اور کیا کیا کہتی رہیں۔ مگر فجو آپا کو اب کچھ سنائی نہ دے رہا تھا۔ وہ خاموش بت کی طرح بیٹھی تھیں۔ ان کا ہاتھ سروری بیگم کے سر پر دھرا تھا اور آنکھیں خلا میں بہت دور نہ جانے کیا ڈھونڈ رہی تھیں۔ وہ نہ جانے کب تک یوں ہی گم سم رہتیں کہ اُن کے چھوٹے بھائی اکرم کی آواز نے انہیں چونکا دیا۔ "آپا! آپا! چلئے اماں نے بلایا ہے — مرزاپور سے دولہا بھائی آئے ہیں۔"

رکشا سے اتر کر فجو آپا جب اندر آئیں تو ان کی والدہ نے کہا۔ "وہ مردار سچ مچ تجھے بیمار سمجھ کر دیکھنے آیا ہے۔ تمہارے ابا اس سے نہیں ملے، کچھ لوگوں کو بلانے گئے ہیں۔ آج تمہارا اس کا فیصلہ ہو جائے گا۔ کون تمہاری عمر ایسی گزر گئی ہے۔ اور اللہ رسول نے بھی کوئی دوسری شادی منع نہیں کی ہے۔

لیکن فجو آپا پاگلوں کی طرح پردہ اٹھا کر مردانہ کمرے میں چلی گئیں۔ اور دنیا و مافیہا سے غافل شوہر کے قدموں سے لپٹ گئیں۔

"مجھے معاف کر دیجئے۔ خدا کے لئے معاف کر دیجئے۔ میں آپ کی خطاوار ہوں۔"

پریم کمار دیوان
بیسویں صدی۔ دہلی

پیاسی رُوح

ٹیکسی رکتے ہی یش نے باہر نگاہ دوڑائی۔ ایک عالیشان کوٹھی تھی۔ اُس کوٹھی کو دیکھ کر ایک بار تو اس کا دل دھڑک کر رہ گیا۔
میٹر دیکھ کر اس نے ٹیکسی کا کرایہ دیا۔ ڈرائیور نے پیچھے سے بستر بند نکال دیا اور کوٹھی کے برآمدے تک پہنچا بھی دیا۔ سوٹ کیس یش خود ہی اٹھا کر برآمدے تک لے گیا۔

پدسا نوڈ جیسی امیر بستی میں وہ کوٹھی اتنی ہی خوبصورت اور کشادہ تھی جتنی ایک رئیس آدمی کی ہوسکتی ہے۔ باہر بڑا سا لان اور اس کے گرد خوبصورت رنگ برنگے پھول، بیلیں اور ہرے بھرے پودے تھے۔ چکنے اور صاف چمکتے ہوئے چپس کے فرش۔ برآمدے میں پڑی ہوئی بانس کی بید والی کرسیاں اور دیوار پر آویزاں سفید فریم میں لگی قدرت کے خوبصورت مناظر کی تصویریں اُس گھر کی شاہانہ رہائش کی شاہد تھیں۔
یش کچھ کچھ احساس کمتری میں کھویا کھڑا تھا کہ اتنے میں سامنے کا دروازہ کھلا۔ اور ایک خوبصورت سی لڑکی دکھائی دی جو کسی کو آواز دیتے دیتے رک گئی۔ اور اُسے دیکھ کر پوچھا۔ "کہئے کس سے ملنا ہے؟"

یش کئی لمحے تک اس خوبصورت لڑکی کو دیکھتا رہا۔ لڑکی اسے اپنی طرف دیکھتے دیکھ کر ذرا تیز آواز میں بولی "کس سے ملنا ہے آپ کو؟"
یش کچھ گھبرا گیا اور یوں ہی پوچھ بیٹھا۔ "یہ شری حکم چند جی کی کوٹھی ہے نا؟"
لڑکی نے تڑاق سے جواب دیا۔ "تو باہر کسی اور نام کی نیم پلیٹ لگی ہے کیا؟"
"جی!" یش لڑکی کے جواب پر شرمندہ ہو گیا اور آہستہ سے بولا۔ مجھے یشپال کہتے ہیں۔ لکھنؤ سے آیا ہوں!"
لڑکی نام سنکر ایکدم سٹپٹا گئی اور بس اتنا ہی کہہ پائی "آپ ___" اور اندر بھاگ گئی۔ یش سمجھ گیا کہ یہی وہ لڑکی ہے جسے وہ دیکھنے آیا ہے۔
تھوڑی ہی دیر میں شری حکم چند جی اور اُن کی پتنی باہر آئے اور اُسے بہت پیار سے اندر لے گئے۔ پھر نوکر آیا اور اُس کا سامان لے گیا۔ لالہ جی تو شاید کسی ضروری کام سے باہر جانے والے تھے، اس لئے معافی مانگ کر چلے گئے۔ اُن کی پتنی نے یش کو صوفے پر بٹھا کر اُس کی ماں کا، گھر کا، شہر کا، نوکری کا اور ادھر اُدھر کا حال پوچھا۔ اُن کا جسم گول مٹول تھا جیسے گدی پر بیٹھنے والے لالوں کا ہوتا ہے۔ رنگ سفید اور کچھ کچھ گلابی تھا۔ آنکھوں پر سنہرے گولڈ کی عینک لگی تھی۔ بار بار انگریزی کے الفاظ استعمال کرنے سے یش سمجھ گیا کہ بڑا گھرانہ ہے اور بالکل ماڈرن! آخر میں انہوں نے کہا۔ "اچھا بیٹا! اب تم نہا لو اور تیار ہو جاؤ۔ پھر ساتھ ہی ناشتہ کریں گے!"
یش باتھ روم میں گیا تو اس پر گھر کے آداب، شاہانہ رہائش اور لڑکی کی خوبصورتی کا کافی رعب پڑ چکا تھا کئی بار اُس کے ہاتھ پیر چلتے چلتے رک گئے اور وہ نئی زندگی کے بارے میں سوچنے لگا جو اپنی ساری رنگا رنگیوں کے ساتھ اُس کے سامنے تھی۔

جب وہ تیار ہو کر ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھا تو مسز حکم چند اسے ڈائننگ روم میں لے چلنے کے لئے آئیں۔ وہاں وہ لڑکی پہلے ہی سے موجود تھی۔ ایک کرسی پر بیٹھتے ہی یش نے پوچھا۔ "ماسی جی اور بچے کہاں ہیں ؟"

"وہ تو تمہارے سامنے ہی گئے تھے۔ چھوٹے بچے صبح ہی اسکول چلے جاتے ہیں۔ ویسے تو یہ بھی کالج جا رہی تھی۔ لیکن میں نے سوچا آج نہیں جائے گی۔" ماسی جی نے جواب دیا۔

یش نے موقع دیکھ کر لڑکی میں دلچسپی لی۔ "کون سے کالج میں پڑھتی ہیں آپ ؟"

لڑکی نے منہ کھولا ہی تھا کہ ماں نے جواب دیا۔ "پاس ہی ایک پرائیویٹ کالج میں پڑھتی ہے۔ بھئی سچ پوچھو تو میں لڑکیوں کی زیادہ تعلیم کے حق میں نہیں ہوں یہ تو بس شغل ہے اس کا۔"

لڑکی چپ رہی لیکن یش کے دل کو یہ بات سُن کر بہت دھکا لگا۔ وہ خود پڑھنے لکھنے کا دلدادہ تھا۔ بی۔ ایس۔ سی میں یونیورسٹی میں تھرڈ پوزیشن آئی تھی۔ اور ایم۔ ایس سی فرسٹ کلاس پاس کیا تھا۔ پھر ایم فل بی ایس کیا اور اب ایک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں بطور سینئر سائنٹفک آفیسر کے کام کر رہا تھا۔ گھر میں پیسہ کافی تھا اس لئے وہ معاشی فکروں سے تو دور رہا تھا لیکن اُسے پڑھنے کا بے حد شوق تھا۔ لیکن ان خیالات کے باوجود وہ خاموش رہا اور کچھ نہ بولا۔

ناشتہ بے حد مزے دار تھا۔ کئی قسم کی پیسٹریاں، کیک، آملیٹ، اُبلے ہوئے انڈے، کارن فلیک، ٹوسٹ، مکھن، جیم، جیلی پھل اور نہ جانے کیا کیا تھا۔ کچھ اُس نے کھایا اور کچھ کو بس چکھ ہی سکا۔

ناشتہ ختم ہونے پر ماسی جی کو ایکدم خیال آیا۔ وہ اپنی لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔ "ارے میں تمہیں ان کے بارے میں بتانا بھول ہی گئی انیتا یش جی کے پتا جی پاکستان میں اُن کے ساتھ بیوپار میں برابر کے ساجھی دار تھے۔ بڑے دیوتا آدمی تھے۔ پاکستان بننے کے کچھ ہی مہینے پہلے چل بسے تھے۔"

ماسی جی اور بھی بہت سی باتیں انیتا کو بتاتی رہیں جسے وہ خاموشی سے سنتا رہا۔

ناشتہ کر کے وہ ڈرائنگ روم میں جا بیٹھا۔ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ اب کیا کیا جائے۔ اتنے میں انیتا آئی اور کہنے لگی۔ "چلئے آپ کو دلی کی سیر کرا لاؤں۔"

انیتا اب کپڑے بدل کر آئی تھی۔ چست قمیص اور چھوٹی موری کی شلوار پہنے ہوئے تھی۔ بالکل گڑیا سی معلوم ہوتی تھی۔ یش کے لئے انکار کرنے کی کوئی وجہ ہی نہ تھی اس لئے وہ فوراً کھڑا ہو گیا۔ دونوں چپ چاپ باہر نکل آئے۔ انیتا نے گیرج سے کار نکالی۔ پھر نوکر کو بلا کر صاف کرائی۔ پیچھے ایک بیدکی ٹوکری میں بہت سے پھل مٹھائیاں اور بسکٹ کے ڈبے وغیرہ بھروا کر رکھوائے۔ پھر دروازہ کھول کر یش کو اندر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اُس نے اندر بیٹھتے ہی پوچھا "کیا آپ ڈرائیو کریں گی ؟"

"ہاں ڈرائیور تو ہمارے گھر میں ہے ہی نہیں۔ پاپا بھی ڈرائیو کر لیتے ہیں اور ممی بھی۔"

راستے میں اس نے پٹرول بھروایا، ہوا چیک کرائی۔ کار چلنے لگی تو یش نے مذاق سے پوچھ لیا۔ "آپ نے کار چلانے کا لائسنس تو لے رکھا ہے نا ؟"

"گھبرائیے نہیں۔ اگر میں آنکھ بند کر کے بھی ڈرائیو کروں تو بھی ٹکر نہیں ہو سکتی !" انیتا نے مسکرا کر جواب دیا۔

وہ سارا دن گھومتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ انیتا بہت مشکل سے میٹرک پاس کرنے کے بعد اب تین سال سے انٹر میں پڑھ رہی تھی۔ اُس کی باتوں میں شوخی زیادہ تھی اور ذہانت کم، فلموں، کار ڈرائیونگ اور بیڈمنٹن کھیلنے کی بے حد شائق تھی۔ ادھر یش بھی اسے اپنے بارے میں، پڑھائی کے اور ریسرچ کے بارے میں بتاتا رہا۔

شام کو جب وہ گھر پہنچے تو سورج ڈوب چکا تھا۔ گاڑی کے سفر اور سارا دن ادھر اُدھر گھومنے سے یش کافی تھک چکا تھا۔ اوپر اپنے کمرے تک پہنچتے پہنچتے اس کا سر درد کرنے لگا۔ آنکھیں بھاری ہو گئیں اور ٹانگیں ایسی بھاری ہو گئیں جیسے لوہے کی بن گئی ہوں۔ اس لئے وہ اپنی کپڑوں اور بوٹوں سمیت پلنگ پر دراز ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد انیتا آئی۔ یش کی طبیعت سست دیکھ کر پوچھا۔ "طبیعت تو ٹھیک ہے نا ؟"

یش نے اپنے آپ کو بشاش ظاہر کرتے ہوئے کہا "کوئی خاص بات نہیں ہے۔ ذرا سر میں درد ہے۔ لیٹنے سے آرام آجائے گا۔ کوئی گھبرانے کی نہیں ہے"۔

"ارے! سر میں درد۔ آپ نے بتایا کیوں نہیں۔ ٹھہرئیے میں ابھی اسپرو کی گولیاں لاتی ہوں ـــ اور آپ کو کچھ زیادہ تکلیف ہو تو ڈاکٹر کو ٹیلیفون کر دوں" اینتا سچ مچ گھبرا گئی۔

"اور آپ بھول گئیں کہ میں خود ڈاکٹر ہوں!"

"اوہ! تو آپ ہی اپنا علاج بتلائیے نا؟"

"بس مجھے صرف آدھ گھنٹہ اس اندھیرے کمرے میں آرام کرنے دیجئے"۔

رات کو کھانے کی میز پر خوب پر لطف باتیں ہوئیں۔ اب تک یش کے بارے میں اینتا ماں باپ کے سامنے بالکل بے جھجک ہو گئی تھی۔ اس نے خوب مزے لے لے کر ماں باپ کے سامنے دن بھر کی رپورٹ سنائی۔

لالہ حکم چند نے بھی یش سے پیار سے پوچھا "دن بھر کی سیر کیسی رہی؟"

یش نے مسکراتے ہوئے بتایا "دلی کی سیر خوب مزے دار رہی۔ اینتا کار بہت اچھی چلاتی ہیں"۔

"ہاں وہ تو ہے۔ وہ تو ہم سے بھی اچھا چلاتی ہے"!

اس بات پر یکایک اینتا نے یش سے پوچھا "آپ کے پاس کون سے میک کی کار ہے؟"

"جی!" اس سوال پر یش کمتری کے احساس سے گھبرا گیا۔ لیکن پھر فوراً شرمندہ سا بولا "میرے پاس کوئی کار نہیں ہے"۔

لیکن اس سوال کی نزاکت کو اینتا کی ماں نے محسوس کر لیا۔ انہوں نے بات ہنسی میں ٹالتے ہوئے کہا "تو بیٹے تجھے کیا فکر پڑ گئی۔ ہم تجھے جہیز میں ایک کار دیں گے ہی۔ تجھے پیدل نہیں چلنا پڑے گا"!

اس پر اینتا شرما گئی، لیکن اور بچے خوب زور زور سے ہنسے۔

دوسرے دن صبح یش کی آنکھ ذرا دیر سے کھلی۔ شاید پچھلے دن کی تھکان کا اثر تھا۔ ورنہ وہ تو صبح سویرے اٹھنے کا عادی تھا۔ لیکن اس نے دیکھا کہ سبھی لوگ قریباً اسی وقت جاگے تھے۔ وہ عادی نہیں تھا لیکن اس کے جاگنے کے فوراً بعد مارننگ ٹی نوکر دے گیا۔ پھر ضروریات سے فارغ ہوا تو اس نے دیکھا کہ وہ چھٹی کا دن تھا۔ اس لئے بچوں نے لان میں بیڈمنٹن کا نیٹ لگا دیا تھا اور اس سے اصرار کرنے لگے کہ وہ بھی ان کے کھیل میں شریک ہو۔ وہ بھی ان کے کھیل میں شریک ہو گیا۔ ایک طرف وہ اور اینتا کی چھوٹی بہن تھے اور دوسری طرف اینتا اور اس کا چھوٹا بھائی۔ کھیل سے زیادہ تفریح ہوتا رہا۔ وہ اور اینتا کی چھوٹی بہن بہت اچھا کھیلے۔ پھر بھی پانچ میں سے تین کھیل ہار گئے۔

صبح کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میں اچھی خاصی ورزش ہو گئی۔ تھکے ہارے ریکٹ گھماتے ہوئے وہ سب برآمدے میں لان چیئرز پر آ بیٹھے اور نوکر نے بیچ میں ایک میز رکھ دی۔ یش کو پیاس لگی تھی۔ اس لئے اس نے ایک گلاس پانی لانے کو کہا۔

اینتا نے جلتے ہوئے نوکر کو بلا کر حکم دیا "پانی نہیں شربت بنا کر لانا۔ سمجھے؟"

نوکر شاید نیا نیا آیا تھا اور تھا بھی چھوٹی عمر کا۔ وہ بڑے لوگوں کے آداب سے ناواقف تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہاتھ میں شربت کا گلاس پکڑے لے آیا۔ مہمان کے سامنے جو یہ بدتمیزی دیکھی تو ڈانٹ کر بولی "گلاس کو پلیٹ میں رکھ کر لاتے ہیں سمجھے؟"

نوکر اس کی ڈانٹ پر سہم گیا اور بولا "جی!"

"جاؤ!" اینتا نے تمکنت سے کہا۔

وہ چلا گیا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد ایک خالی پلیٹ لے آیا۔

"یہ کس لئے لے آیا؟" اینیتا نے پوچھا۔

"جی ابھی آپ بولا تھا۔ گلاس کے ساتھ پلیٹ..."

یش اور بچے تو نوکر کے اِس اچھوتے لطیفے پر خوب زور زور سے، دل کھول کر ہنسے۔ لیکن اینیتا کو شاید نوکر کا یہ بُدھو پن اچھا نہیں معلوم ہوا۔ سختی سے ڈانٹ کر بولی۔ "ایڈیٹ! پتہ نہیں کہاں سے جنگلی آگیا ہے۔ جاؤ بھاگو یہاں سے"۔

اینیتا نے نوکر کو اتنی زور سے ڈانٹا کہ نوکر تو نوکر یش بھی سہم گیا۔ بے خیالی میں ہاتھ جو اِدھر اُدھر ٹہرے تو میز پر رکھا ہوا شربت کا گلاس نیچے فرش پر گر کر ٹوٹ گیا۔ شربت کے چھینٹے سب کے کپڑوں پر گرے۔ لیکن اینیتا کے کپڑوں پر سب سے زیادہ گرے۔

وہ ایک لمحہ تو چپ رہی لیکن پھر زور سے ڈانٹ کر نوکر کو بولی۔ "اب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کیا دیکھ رہا ہے۔ یہ جگہ جلدی صاف کر۔"

نوکر کپڑا لانے کے لئے تیزی سے مڑا تو یش نے دیکھا کہ اُس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔

باقی دن دوپہر کو پکچر دیکھنے اور شام کو کناٹ پیلس کے ایک بہت اچھے ریسٹوران میں ڈنر کرتے گزرا۔ رات کو نو بجے کی گاڑی سے یش کو واپس جانا تھا اس لئے سب لوگ جلد واپس آگئے۔ حکم چند جی نے اُس سے رُکنے کو بہت کہا لیکن اس نے اپنی مجبوری ظاہر کی اور معذرت چاہی۔

رات کو گاڑی میں وہ خیالات میں ڈوبا ہوا بہت دیر تک سوچتا رہا۔ لڑکی خوبصورت تھی، بڑا گھر تھا، عزّت تھی، دولت تھی، شان تھی، ساس سُسر تھے، سب کچھ تھا۔

لیکن روح کی آسودگی کا سامان نہ تھا!

اُس کی روح پیاسی تھی!!

علم، ادب، زندگی اور فن کا روشن مینار

فنکار نمبر ۳

مرتبین
چراغ الہ آبادی
نظر کامرانی

• ڈاکٹر محمد احسن فاروقی • مخدوم محی الدین • ذوقی الہ آبادی
• غلام عباس • وزیر آغا • مجنوں گورکھپوری • مصطفٰے زیدی • حضور احمد سلیم
• جیلانی بانو • اطہر نفیس • جمیل واسطی • حق صدیقی
• صحرائی سانبھری • عارف رئیسی • بخش سیلمی • ریاض چودھری • منظر ایوبی
• محمد سلیم الرحمان • رضا عارفی • اقبال منہاس • قدیر غوری
• درد اسعدی • محسن عارفی • وارث اقبال • فہمیدہ ریاض • باغ حسین کمال
• مسعود زمانی • خیال جعفری • ضیا اکبر آبادی • مجتبٰے زیدی اور بدر ساگری وغیرہ
• ضخامت ۱۳۲ صفحات • سہ رنگا سرورق

ہر چھوٹے بڑے بک اسٹال سے ۷۵ پیسوں میں خریدیے

خط و کتابت کا پتہ: "مکتبۂ چراغ" لطیف آباد۔ حیدرآباد

تنویر نیر
سریتا۔ دہلی

ہم زندہ رہیں گے

اُن دنوں کرسمس کی چھٹیاں تھیں، تمام طلبا، اپنے اپنے گھروں کو جا چکے تھے۔ ہوسٹل ویران ہو کر رہ گیا تھا۔ دسمبر کی آخری تاریخیں تھیں۔ سردی تیز ہو گئی تھی۔ دن بھر اکیلا ہوسٹل میں پڑے رہنے کی وجہ سے میں کچھ اکتا گیا تھا۔ شام ہو چلی تھی۔ میں ہوسٹل سے نکل پڑا۔ راستے میں ہوسٹل کے بوڑھے مالی سے ملاقات ہو گئی۔

"شکیل صاحب!" اس نے ادب سے پوچھا۔ "آپ گھر نہیں جا رہے ہیں؟"

"نہیں بھئی!" میرے لہجے میں دن بھر کی اکتاہٹ اور گھٹن تھی۔ "میں جنوب کا رہنے والا ہوں۔ یہاں سے ہزاروں میل دور میرا گھر ہے۔" وہ سر ہلاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں یونیورسٹی کے بہترین رستوران، پیراڈائز میں داخل ہو رہا تھا۔ رستوران میں ہمیشہ کی طرح اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ کھڑکیاں بند تھیں۔ لیکن اندھیرے میں چمکنے والے ننھے ننھے بجلی کے بلب سحر سازی کر رہے تھے۔ رستوران میں ایک عجیب سا سکون تھا۔ جو حرف کسی الف لیلوی دنیا ہی میں ممکن ہے۔ تبھی مجھے یاد آیا۔ کہ تمام طلبا اپنے اپنے گھروں کو جا چکے ہیں۔

میزوں کے درمیان سے گزرتا کاؤنٹر پہ بیٹھے ہوئے کپور صاحب کو وش کرتا ایک خالی میز پر آ بیٹھا۔ باہر کی سرد ہواؤں نے انگلیوں کو اس قدر بے جان کر دیا تھا۔ کہ ان میں دبی ہوئی سگریٹ کا بھی احساس نہیں ہو رہا تھا۔ گرم کافی کے لیے کہہ کر میں اپنے وطن کی میٹھی یادوں میں کھو گیا۔

"آج تو سردی بہت ہی تیز ہے۔" تبھی کسی کی سُریلی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں اپنے خیالوں سے نکل آیا۔ اور مڑ کر دیکھا۔ وہ شہناز تھی۔ اُس نے سفید رنگ کا لمبا سا کوٹ پہن رکھا تھا۔ کانوں کے گرد ایک سُرخ اسکارف تھا۔ جو اس کے سرخ و سفید چہرے سے میچ کر رہا تھا وہ اپنی میز پہ اکیلی تھی۔

"کیوں تمہارا کیا خیال ہے؟" وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ اور اپنی میز پہ آنے کا اشارہ کیا۔ میں نے اس کی دعوت قبول کر لی۔ لیکن کچھ بولا نہیں۔

"تم شاید مجھ سے ناراض ہو؟"

"بھلا میں تم سے ناراض ہو کر کیا لوں گا؟" میں نے دھیرے سے کہا۔ وہ سمجھ گئی۔

پھر بولی۔ "آخر کوئی وجہ تو ہوگی۔ بلا وجہ آپ مجھ سے ناراض ہیں۔"

پھر وہ خود یہ خود ہنسنے لگی۔ اس کے ہیرے جیسے ترشے ہوئے دانت چمک اُٹھے۔ لیکن میں خاموش ناراضگی کی اداکاری ہی کرتا رہا پچھلی بار جب میں آخری بار اُس سے ملا تھا۔ تو کسی فلم کا پروگرام بنا تھا۔ مگر وہ آخری گھڑی تک ہال میں نہیں پہنچی تھی۔

وہ پھر بولی۔ "شکیل تمہیں تو شاعر ہونا چاہیے تھا۔ تم نے خواہ مخواہ میتھمیٹکس جیسا خشک مضمون لے لیا۔" وہ میری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہونٹ کسی چھلے ہوئے انار کی طرح کھل گئے تھے۔ میں اُس کے اس انداز گفتگو پر کھول رہا تھا۔ وہ پھر میری سمجھ سے باہر ہوگئی تھی۔ کوئی دوسری لڑکی ہوتی تو شاید اپنی غلطی پر معافی مانگ لیتی، پشیمانی کا اظہار کرتی۔ لیکن وہ اس طرح باتیں کر رہی تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔

"لو کافی پیو! غصہ ختم ہو جائے گا۔" اس نے پیالی میری طرف سرکا دی۔ اور بیرے کو کچھ نمکین لانے کے لیے آرڈر دیا۔ پھر مجھ سے بولی "اچھا ہوا تم ادھر آ گئے۔ تم سے ملاقات ہوگئی۔ ورنہ تمہارے ہوسٹل جانا پڑتا۔ میں بھی اکیلی ہی ہوں۔"

"تم گھر کیوں نہیں گئیں۔" اس طرح روٹھ کر رہنا میرے لیے ناممکن ہو رہا تھا۔

"اور تم کیوں نہیں گئے؟" جواب دینے کی بجائے الٹا مجھ سے ہی سوال کیا گیا تھا۔

"میرا گھر بہت دور ہے!"

"میں کل جاؤں گی!" وہ مسکرائی۔ "چلو میرے ہی گھر چلے چلو۔"

"نہیں، شکریہ!" میں نے کہا۔ "مجھے بہت کام کرنا ہے۔"

"اچھی بات ہے!" اس کا چہرہ سپاٹ رہا۔ "پھر کبھی سہی!"

جب اس طرح کی باتیں کرتے ہوئے ہم ریستوران سے باہر نکلے۔ تو ہماری دوستی پھر ہو چکی تھی۔ اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ وہ میرا ہاتھ تھامے ڈگی کی پتلی سڑک پر چھوٹے چھوٹے قدم بڑھا رہی تھی۔ اب ہم دونوں خاموش تھے۔ اس کی خاموشی سے نہ جانے کیوں مجھے کمتری کا احساس ہونے لگتا ہے۔ ایسا ہمیشہ ہوتا تھا۔ وہ جب بھی ملتی تو میں کوشش کرتا۔ کہ وہ خاموش نہ ہونے پائے۔ اس میں ایک خاص بات یہ بھی تھی۔ کہ وہ جب باتیں کرتی تو بالکل کوئی عام جذباتی لڑکی معلوم ہوتی۔ لیکن جب خاموش رہتی۔ تو ایسا لگتا جیسے وہ ایم اے میں پڑھنے والی کوئی طالبہ نہیں، کسی اسٹیٹ کی شہزادی ہو۔

اُس وقت بھی چاندنی کے سائے میں اس کا حسن خاموش ہو گیا تھا۔ اور خواہ مخواہ مجھے احساس کمتری میں مبتلا کر رہا تھا۔ ہم اسی طرح چلتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد اُس کا ہوسٹل آگیا۔ وہ اجازت لیے بغیر ہی گرلز کالج میں داخل ہوگئی۔ میں ایک بار پھر اس کی شخصیت کے بارے میں سوچنے لگا۔

اس سے میری ملاقات تب ہوئی تھی۔ جب میں حیدرآباد سے ایم ایس سی کرنے کے بعد یہاں ریسرچ کرنے آیا تھا۔ اس دن سائیکولاجی ڈیپارٹمنٹ میں امتحانات ہو رہے تھے۔ اور وہ وہاں ایک کونے میں کھڑی بار بار گھڑی دیکھ رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ میرے قریب آئی اور کوئی طالب علم سمجھ کر بولی:

"کیا آپ مجھے اپنے چند لمحات دے سکیں گے؟"

"اُس کے لہجے میں بڑی امیدیں تھیں۔

"فرمائیے!" مجھ سے انکار نہ کرتے بنا۔
"آج میرا پریکٹیکل امتحان ہے" کہتے وقت وہ دوسری طرف دیکھتی رہی۔ "وقت ہو چکا ہے اور اب تک میری وہ سہیلی نہیں آئی جو میری مدد کرتی"
"کس قسم کی مدد؟"
"یہی کہ آپ میرے ساتھ رہیں گے۔ میں آپ پر نفسیاتی تجربہ کروں گی۔ آپ کی حیثیت میرے سبجیکٹ کی ہوگی۔"
میں تیار ہو گیا۔ اس کا امتحان کامیاب رہا۔ لیکن جب بعد میں اُس نے اخلاقاً بھی میرا شکریہ ادا نہیں کیا۔ بلکہ مجھے اس طرح نظر انداز کر گئی۔ جیسے مجھے جانتی ہی نہ ہو۔ تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ میں خاموشی سے لوٹ آیا۔
پھر دھیرے دھیرے مجھے اس کی شخصیت کے بارے میں تمام باتیں معلوم ہوئیں۔ وہ یونیورسٹی میں بہت ہی معقول تھی۔ طلبا سے لے کر اسٹاف تک اس سے واقف تھا۔ لیکن آج تک اسے کسی مرد کے ساتھ نہیں دیکھا گیا تھا۔ اور شاید اس دن وہ مجھ سے بھی بات نہ کرتی۔ جس دن اس کی سہیلی نہیں آئی تھی۔
وہ بہت ہی مغرور تھی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ مردوں سے نفرت کرتی تھی۔ کیوں؟ یہ کسی کو معلوم نہ تھا۔
دوبارہ مجھ سے وہ تب ملی۔ جب اسے معلوم ہوا کہ میں اصل میں کوئی طالب علم نہیں۔ بلکہ ریسرچ اسکالر ہونے کے ساتھ ساتھ اکثر ایم ایس سی کے کلاس بھی لیا کرتا تھا۔ وہ میرے پاس آئی۔ میں ڈپارٹمنٹ ہی میں تھا۔
"آپ کا شکریہ ادا کرنے آئی ہوں" اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ "اور معافی بھی چاہوں گی۔ کیونکہ مجھے معلوم نہ تھا کہ۔۔۔۔"

"کوئی بات نہیں" میں نے اسے بیٹھنے کے لیے اشارہ کیا۔ وہ کرسی پر تمام وقت سمٹی سمٹائی سی بیٹھی رہی۔ اور نیچے دیکھتی رہی۔ میں نے پھر کہا۔
"لیکن مجھے حیرت ہے کہ آپ نے اسی وقت شکریہ ادا کیوں نہیں کیا؟"
وہ میرے اس اچانک سوال پر کچھ پریشان سی ہو گئی۔ اور کہنے لگی۔ "دراصل بات یہ تھی۔۔۔ کہ۔۔۔
بلکہ آپ مردوں کو اس قابل ہی نہیں سمجھتیں کہ ان سے بات کریں۔ ہے نا یہی بات؟ میں نے اس کا جملہ پورا کر دیا۔
لیکن وہ خاموش رہی اور جلد ہی دوبارہ ملنے کا وعدہ کر کے چلی گئی۔ مجھے وہ بہت ہی پسند آئی تھی۔

اس کے بعد ہم کئی بار ملے۔ ساتھ ساتھ فلمیں دیکھیں۔ پیراڈائز، ریویو۔ نشتوں میں شامیں گزاریں، اکثر دودھیا چاندنی میں نقوی پارک میں، بیٹھ کر مختلف موضوعات پر بحثیں بھی کیں۔ مگر ہر بار اس کی شخصیت کچھ زیادہ ہی گہری نظر آئی۔ میں ہر بار اس کے چہرے کی دھوپ چھاؤں کو سمجھنے سے قاصر رہا۔
اور شاید یہ انھی دنوں کی بات ہے۔ جب مجھے احساس ہوا کہ میں اس کے ہر اشارے، ہر حرکت کو پیار کی نظر سے دیکھنے لگا ہوں۔ اور بڑی تیزی سے اس کی محبت میں گرفتار ہوتا چلا جا رہا ہوں
ہوسٹل پہنچنے کے بعد بھی میں اسی کے متعلق سوچتا رہا۔

دوسری صبح جب آنکھ کھلی، تو میں نے اس کی دعوت قبول کر لی تھی۔ میں نے جب اُسے ٹیلی فون کیا۔ کہ میں نے اُس کے گھر جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ تو اُس نے یہ بالکل نہیں پوچھا۔ کہ میرا پروگرام کیسے بن گیا۔ پھر جب میں نے یہ پوچھا کہ میری آمد سے اس کے والدین کو کوئی اعتراض تو نہ ہوگا۔ تو وہ صرف ایک ہلکی سی کھنکتی ہنسی کے ساتھ بولی۔

"شام کو چھ بجے اسٹیشن پہنچ جانا۔ میں انتظار کروں گی۔"

ٹرین میں راستے بھر وہ مجھ سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی۔ اس کی کسی بھی حرکت سے یہ ظاہر نہیں ہو رہا تھا کہ میں آج پہلی بار اس کے گھر جا رہا ہوں۔

دوسری صبح ہم لکھنؤ کے خوبصورت اسٹیشن پر کھڑے تھے۔ وہاں سب سے پہلے جس نے ہمیں سلام کیا۔ وہ سفید وردی میں ملبوس کوئی لمبا تڑنگا نوجوان تھا۔ اس کے سلام کا جواب گردن کی ایک ہلکی سی جنبش سے دے کر شہناز نے اپنے سامان کی طرف اشارہ کیا۔ اور میرا ہاتھ تھام کر اسٹیشن سے باہر چلی آئی۔ میں خاموشی سے اس کے ساتھ گھسٹتا رہا۔ اب پھر وہ شہزادی کا روپ دھار چکی تھی۔ اُس کے چہرے پر ایک وقار رقص کرنے لگا تھا جس سے مجھے اپنی کمتری کا احساس ہوتا۔

باہر نکل کر وہ لمبی سی سیاہ کار کی طرف بڑھی۔ میں ایک لمحے کے لیے ٹھٹھک گیا۔ کار کے نمبر پلیٹ پر کسی ریاست کا نام لکھا ہوا تھا۔ اس نے فوراً ہی مجھے کار کے اندر کھینچ لیا۔ اور دھیرے سے بولی۔

"اب تم اودھ کی ایک بڑی اسٹیٹ کے مہمان ہو۔ خیال رہے کہ تمہاری کسی بات سے بھی ہلکا پن ظاہر نہ ہو۔"

"اچھا۔" میں نے کسی سعادت مند بچے کی طرح کہا۔ اور سوچنے لگا۔ تو وہ واقعی کسی اسٹیٹ کی شہزادی نکلی۔

تھوڑی دیر بعد ہماری کار شہر کی گنجان آبادی سے گزرتی ہوئی گومتی کے کنارے کھڑی ایک شاندار حویلی میں داخل ہو رہی تھی۔ پورچ ہی میں نوکروں کی ایک فوج کے ساتھ شہناز کے والدین نے ہمارا شاندار استقبال کیا۔

شام تک میں سب سے بے تکلف ہو گیا۔ اتنی بڑی حویلی میں اتنے سارے نوکر، شہناز، اس کے والدین اور بہن شاہدہ کے علاوہ دس بارہ قسم کے خونخوار کتے بھی تھے۔ جو پہلے تو بہت ناراضگی کا اظہار کرتے رہے۔ لیکن پھر انہوں نے بھی دوستی کر لی۔ شاہدہ کو انسانوں سے زیادہ کتوں سے پیار تھا۔ اس لیے صرف وہی ایسی تھی۔ جس سے میری دوستی نہ ہو سکی۔ مجھے حیرت بھی تھی۔ کیونکہ اس عرصے میں اُس نے نہ تو مجھ سے کوئی گفتگو کی تھی۔ اور نہ شہناز ہی سے۔ اس کی نگاہوں میں ہمارے لیے ایک عجیب سی حقارت تھی۔ جسے میں کسی طرح بھی نہیں سمجھ سکا۔

اُسی رات میں اپنے کمرے میں لیٹا شہناز کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کی زندگی اب مجھے راز معلوم دے رہی تھی۔ اس کا ہنستے ہنستے ایک دم اُداس ہو جانا۔ اور اداس ہو کر ایک دم قہقہہ لگانا، میری سمجھ سے باہر تھا۔ مجھے اس بات کا بھی احساس تھا۔ کہ وہ مجھے بے پناہ پیار کرتی تھی۔ لیکن میری طرف محبت بھری نگاہوں سے تکتے تکتے اچانک اس کا مایوس اور روہانسا ہو جانا بھی میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اسے کیا تکلیف تھی؟ اُسے کیا غم تھا؟ اور پھر اس سے شاہدہ کا اس طرح نفرت کرنا بھی میرے لیے ایک معمہ بنا ہوا تھا۔ میں کسی بھی طرح برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ کہ میری محبت کی طرف کوئی نفرت آمیز نظروں سے دیکھے۔

بہت دیر بعد میں آہستہ سے اٹھا اور شاہدہ کے کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کا کمرہ میرے کمرے سے دو کمروں کے بعد تھا۔

میں نے دروازے پر دستک دی۔ اُس نے دروازہ کھولا۔ اور حیرت سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میں اجازت لیے بغیر اندر داخل ہو گیا۔ اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ وہ سحر زدہ مجھے دیکھتی رہی۔ پھر اُس کے یاقوتی ہونٹ ہلے۔

"خیریت! اُس نے مسکرا کر پوچھا۔ اس کی خمار آلود آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔

"مجھے تم سے کچھ کہنا تھا"

"اس وقت سب سو رہے ہیں" وہ بولی "رات آدھی ہونے والی ہے۔ یہ میرا بیڈروم ہے اگر کسی نے کوئی غلط رائے قائم کر لی تو؟" لیکن اس کے لہجے میں اس وقت زندگی کی حقیقتوں کا مذاق اڑانے والا انداز شامل تھا۔

"مجھے تم سے کوئی ضروری بات کرنی تھی"

"یہ تم کل صبح بھی تو کر سکتے تھے"

"کر سکتا تھا!" میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "لیکن میں کل صبح واپس جا رہا ہوں"

"کیوں؟" اچانک اس کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

"میں، یہاں ایک لمحہ بھی نہیں ٹھہر سکتا جہاں میری توہین ہو"

"کس نے کی تمہاری توہین؟" وہ سُرخ ہو گئی۔ "کس نے اتنی ہمت کی"

میں تھوڑی دیر تک اس کی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ جہاں غصے کے ساتھ غم کے سائے بھی منڈلا رہے تھے۔ پھر آہستہ سے کہا۔

"کیا یہ میری توہین نہیں کہ شاہدہ تم سے نفرت کرے؟"

"اوہ شکیل!" وہ تڑپ اٹھی۔ ایسا لگا جیسے اُس کے الفاظ میرے سینے میں اتر گئے ہوں۔ "پلیز۔ تم جاؤ، آرام کرو"

"نہیں!" میری آواز تیز ہو گئی۔ "تم بتاؤ، آخر ایسا کیوں ہے؟ کیا وجہ ہے؟ کیا راز ہے اس میں؟"

"خدا کے لیے خاموش ہو جاؤ شکیل!" اُس کی آنکھوں میں تارے جھلملانے لگے۔ "بھول جاؤ ان باتوں کو وہ بچی ہے! نادان ہے"

"مجھے بہلانے کی کوشش نہ کرو۔" میں جھنجھلا گیا۔ "تمہیں آج سب کچھ بتانا ہوگا"

لیکن اُس نے کچھ نہیں بتایا۔ اس کی آنکھیں موتی برساتی رہیں۔ اس کی سسکیاں میرے دل کو چھیدتی رہیں۔ میں آگے بڑھ کر آہستہ سے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اُس کی آنکھیں درد میں ڈوب رہی تھیں۔ ہونٹ کانپ رہے تھے۔ میرے دل و دماغ میں پھر سے آگ لگ گئی۔

"شہناز تمہیں کیا تکلیف ہے۔ مجھے بتاؤ؟" میں تمہارا دوست ہوں۔ ساتھی ہوں تمہیں چاہتا ہوں۔ تمہیں پیار کرتا ہوں۔ مجھے تم سے عشق ہے۔ میں کیسے برداشت کر لوں کہ تم ..."

میری تیز ہوتی ہوئی آواز سن کر اُس نے آنکھیں کھول دیں اور میرے ہونٹوں پہ اپنی سرد انگلیاں رکھ دیں۔ پھر دروازہ کھول کر مجھے باہر دھکیل دیا۔

رات اور سیاہ لگنے لگی۔ اس کے کمرے سے سسکیوں کی آوازیں تیز ہو گئیں۔ میں دیوانوں کی طرح تھکے تھکے قدموں سے اپنے کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔

دوسری صبح ہم جب ناشتے کی میز پر جمع ہوئے۔ تو وہ اسی طرح خوش دلی سے مسکرا کر سب سے باتیں کر رہی تھی۔ اس کے چہرے سے ایسا لگ رہا تھا۔ جیسے کل رات کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ جیسے کل ہزاروں غم اس کی سسکیوں سے ظاہر نہ ہوئے تھے۔ جیسے رات بھر وہ آرام سے سوتی رہی تھی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں اور ناشتے کے درمیان نواب صاحب کی باتوں کا جواب دیتا رہا۔ جو زیادہ تر میرے خاندان اور والدین سے متعلق تھا۔

تھوڑی دیر بعد پروگرام کے مطابق ہم شہر کی تاریخی عمارتیں دیکھتے پھر رہے تھے۔ میں اسی طرح خاموش تھا۔ اور فیصلہ کر لیا تھا کہ اب اس سے کبھی کچھ نہیں پوچھوں گا۔ لیکن وہ ہمیشہ کی طرح ایک ایک چیز سمجھا رہی تھی۔ نہ جانے کیوں اس نے اس کی تاریخ کا اتنا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اسے شاید اس بات کا بھی احساس تھا۔ کہ میں اس سے ناراض ہوں۔ یہی وجہ تھی۔ کہ وہ بات بات پر ہنس پڑتی تھی۔ اور مجھے بھی ہنسنے پر مجبور کرتی تھی۔

شام کو جب ہم گھر لوٹے تو بہت تھک چکے تھے۔ مجھے شہناز نے منا لیا تھا۔ اور اب میں اس کے پلنگ پر بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ شاید باتھ روم میں نہانے چلی گئی تھی۔ وقت گزاری کے لیے میں نے اس کے سرہانے پڑی ہوئی کتابیں دیکھنا شروع کر دی تھیں مجھے اس کی ڈائری مل گئی۔ میں نے اخلاقی جرم کو نظر انداز کرتے ہوئے کئی صفحات الٹ دیئے۔ تحریر کہیں کہیں سے پھیل گئی تھی۔ جیسے لکھتے وقت اُن پر آنسوؤں کے موتی گر کر ٹوٹ گئے ہوں۔
لکھا تھا،

"....آج ابا جان کی لائبریری میں اُن کی ڈائری ملی۔ کاش وہ مجھے نہ ملتی کاش! انہوں نے لکھا ہے کہ میں اُن کی بیٹی نہیں ہوں۔ مگر میں کیسے یقین کروں۔ وہ تو مجھے جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ وہ آگے لکھتے ہیں کہ انہوں نے مجھے ایک رات ایک گندی نالی سے اُٹھایا تھا۔ کاش وہ مجھے وہاں سے نہ اٹھاتے کاش اُن کتوں سے مجھے نہ بچاتے جو مجھے نالی سے نکالنے کے لیے کوشش کر رہے تھے۔ کاش مجھے کتوں نے کھا لیا ہوتا۔ انھوں نے میرا نام شہناز رکھا ہے....."
میں نے کانپتی ہوئی انگلیوں سے کئی اوراق الٹ دیئے۔

"شاہدہ نے میری ڈائری پڑھ لی ہے۔ اُسے معلوم ہو گیا ہے کہ میں اس کی بہن نہیں ہوں۔ وہ مجھ سے اتنا ہی نفرت کرنے لگی ہے جتنا پیار کرتی تھی۔ اس کی نفرت مجھے احساس دلاتی ہے کہ میں دنیا میں ایک غیر طلبیدہ جسم ہے۔ میری زندگی کا کوئی خواہش مند نہیں۔ میری پیدائش ایک گناہ ہے۔ انسانیت کا خون ہے۔ میرا وجود فطرت کا ایک مذاق ہے...."
میرا دل دماغ میں دھڑک رہا تھا۔ اگلے صفحہ پر لکھا تھا۔

"خاندان کے بیشتر لوگوں کو میرا راز معلوم ہو گیا ہے۔ لوگ مجھ سے نفرت کرنے لگے ہیں مجھے بھی اب نفرت ہونے لگی ہے۔ میرا ضمیر مجھے ہر وقت ڈستا رہتا ہے۔ بس ڈر ہے کہ کہیں میں اس آگ میں جل نہ جاؤں۔ میں خودکشی بھی تو نہیں کر سکتی۔ کیونکہ نواب صاحب اور بیگم صاحبہ مجھے شاہدہ سے زیادہ چاہتے ہیں۔ پھر بھی مجھے گھر چھوڑنا پڑے گا...."
اور آگے لکھا تھا۔

"میں یہاں آ گئی ہوں لیکن یہاں یونیورسٹی کی زندگی بھی اچھی نہیں لگ رہی ہے۔ اب تو تنہائی نے بھی اکتا دیا ہے۔ میں سمجھی تھی۔ گھر سے فرار مجھے سکون بخشے گا۔ لیکن یہاں میرا دل، میرا ضمیر، میرا دماغ مجھ سے نفرت کرتے ہیں۔ اب تو میں خود بھی اپنے آپ سے گھن کھانے لگی ہوں۔ مجھے جینے کا کوئی حق نہیں......"

میرا دماغ سن ہوتا جا رہا تھا۔ لیکن میں خود کو آگے پڑھنے سے کسی طرح بھی نہیں روک پا رہا تھا۔ شہناز آئینے کی طرح میرے سامنے ابھر رہی تھی۔

میں اور آگے بڑھا۔ بہت قریب کی تاریخیں تھیں۔

"اب میں سب سے نفرت کرنے لگی ہوں۔ مرد سے اس لیے کہ میرا باپ مرد تھا۔ عورت سے اس لیے کہ میری ماں عورت تھی۔ خود سے اس لیے کہ میں ایک گندگی کا ڈھیر ہوں۔ لیکن ...... لیکن شکیل میں کیا بات ہے۔ اس میں کون سی کشش ہے ؟ کیا اسی کو محبت کہتے ہیں۔ اس کے بغیر اب مجھ کو سکون نصیب نہیں۔ لیکن وہ تو چاند ہے میں اسے کیسے حاصل کر سکوں گی۔۔ ؟" لیکن میں اپنی حرکتوں سے یہی ثابت کرنے کی کوشش کرتی رہوں گی۔ کہ مجھے اس کی قطعی پروا نہیں۔ کاش وہ مجھ سے جلد اکتا جائے۔ لیکن.. لیکن.... کیا میں اس کے بغیر جی سکوں گی؟"

دفعتہً کسی کے ہاتھوں نے ڈائری چھین لی۔

"دوسروں کی ڈائری نہیں پڑھتے۔" شہناز کی آنکھوں میں کرب تھا۔ اس کا چہرہ کسی خزاں رسیدہ پتے کی طرح زرد ہو رہا تھا۔

میں نے انگلیوں سے اپنے چہرے کا پسینہ خشک کیا۔ اور لڑکھڑاتے قدموں سے اپنے کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔

اپنے کمرے میں آ کر میں بے سدھ سا اپنے بستر پر گر پڑا۔ میری آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس شام میری محبت اچانک مر گئی تھی۔ میں ایک ایسے مثلث میں گھر گیا تھا جس کے تین کونوں میں میرے خاندان کی عزت، میری محبت اور وراثت کی لاکھوں کی جائداد تھی۔ اگر میں شہناز کو چھوڑ دیتا تو میری زندگی کی آسائشیں اور راحتیں لٹ جاتیں۔ میں بہت دیر تک کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔

میرے دماغ میں لاوا ابل رہا تھا۔

رات جب ہم کھانے کی میز پر جمع ہوئے۔ تو وہ موجود نہیں تھی۔ مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے پوچھا۔

"شہناز نہیں آئیں؟"

"نہیں بیٹے! اس نے کھانے سے منع کیا ہے۔" بیگم صاحبہ بولیں۔ "اپنے کمرے میں پڑی رو رہی ہے۔ کہہ رہی ہے کہ سر میں شدید درد ہے۔ میں نے ڈاکٹر کے لیے کہا۔ تو انکار کر دیا۔"

ماحول پر ایک عجیب سی اداسی چھا گئی۔ سب لوگ آہستہ آہستہ کھانے لگے۔ مجھ سے بالکل کھایا نہیں جا رہا تھا۔

دفعتہً میں نے کہا۔ "میں آپ سے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں۔ میری نگاہیں نواب صاحب اور بیگم صاحبہ پر تھیں۔ میرے اس تخاطب پر چند لمحوں کے لیے اُن کی آنکھوں میں الجھن کے آثار نظر آئے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے انہوں نے کہا شوق سے کہو بیٹے، اسے اپنا ہی گھر سمجھو۔

میں تھوڑی دیر تک خاموشی سے سوچتا رہا۔ پھر دھیرے سے بولا۔ "اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں ۔۔۔ میں چند لمحوں کے لیے جھجکا پھر جلدی سے کہہ دیا۔ میں شہناز کو اپنی شریکِ حیات بنانا چاہتا ہوں۔"

نواب صاحب اور ان کی بیگم کا چہرہ یکایک سیاہ پڑ گیا۔ انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میری سمجھ میں بات آگئی۔ میں نے پھر کہا آپ فکرمند نہ ہوں۔ اُس نے مجھے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔ لیکن میں پھر بھی تیار ہوں۔"

تبھی ایک چھناکا ہوا۔ شاہدہ کے ہاتھوں سے گلاس چھوٹ کر ٹوٹ گیا تھا۔ وہ میری طرف یوں دیکھ رہی تھی۔ جیسے اُسے میری باتوں کا یقین نہ آرہا ہو۔ پھر وہ مسکرائی۔ اُس کی آنکھوں میں نفرت کے ناگ سر پٹک رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد بیگم صاحبہ شہناز کو لیے ہوئے آئیں۔ وہ ہلکے قدموں سے ان کے ساتھ لگی ہوئی شرمائی شرمائی سی ایسے چل رہی تھی جیسے ڈولی میں بیٹھنے جا رہی ہو۔

مجھے اس کی یہ شرمیلی ادا بڑی اچھی لگی۔

اُردو کے مایہ ناز شاعر عبد العزیز خالد کی

تخلیقات

سرود رفتہ	یونانِ قدیم کی شاعرہ سیفو کے نغمے	چار روپے
غزل الغزلات	عہد نامۂ عتیق کا نغمۂ سلیمان	ایک روپیہ ۵۰ پیسے
دکانِ شیشہ گر	منظوم ڈرامے دوسرا ایڈیشن	پانچ روپے
برگِ خزاں	" " "	چھ (۶) روپے
ورقِ ناخواندہ	" " "	تین (۳) روپے
سلومی	دوسرا ایڈیشن معہ اضافہ ترگوم	تین روپے پچاس پیسے
گل نغمہ	ٹیگور کی گیتانجلی	چار روپے
زنجیرِ رمِ آہو	طویل و مختصر نظمیں (دوسرا ایڈیشن)	(۵) پانچ روپے
ماتمِ یک شہرِ آرزو	نوحے (نیا ایڈیشن)	(زیرِ طبع)
زرِ داغِ دل	طویل نظمیں	"
کفِ دریا	نیا مجموعہ کلام	"
دشتِ شام	نئی نظمیں	"
فارقلیط	(آدم جی انعام یافتہ) نام ختم رسل انجیل میں ہے "فارقلیط"۔ ذکر و فکر رسول۔	آٹھ روپے

مُشتاق بک ڈپو۔ شیلٹن روڈ۔ کراچی

سعیدہ افضل
بانو۔ لاہور

درد کا رشتہ

آج پھر بڑی حویلی کو دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔

آج خوشی کا دن جو تھا، اور پھر آج بھی تو شادیانے بج رہے تھے۔ ایسے ہی جیسے اس روز بجے تھے۔ جب وہ سرخ جوڑا اور سہرا، پلکیں جھکائے سر پر لال دوپٹہ اوڑھے، اپنی سکھیوں کے جھرمٹ میں سجی سجائی، دلہن بنی بیٹھی تھی۔ مگر آج کی شہنائی میں کتنا فرق تھا۔ آج کے اور اس روز کے سہرے میں کتنا تضاد تھا۔

اُس روز تو شہنائی، انجانی خوشیوں کے نغمے الاپ رہی تھی، مگر آج۔ یہ کیسا نغمہ تھا؟

جو ایک درد بن کر اس کے رگ و پے میں اُتر رہا تھا۔

یہ سہرا تو وہی تھا۔ مگر یہ پھول تو جیسے زہریلے ناگ بن گئے تھے۔ یہ تو اب کسی اور کی پیشانی کا سنگھار بن رہے تھے۔

نیچے بارات کی دھوم مچی تھی، اور اوپر۔ لمبے چوڑے برآمدوں میں وہ اداس روحوں کی طرح پھر رہی تھی۔

"آنی۔ یہ پھول تو میرے ہیں آنی! خدارا میری بہاریں لوٹ کر نہ لے جاؤ۔ میری خوشیاں کسی اور کے آنچل میں نہ ڈالو۔ یہ ابھی کل ہی کی تو بات ہے۔ تم مجھے اس حویلی کا سنگھار بنا کر لائے تھے، اور آج۔ آج یہ سنگھار کسی اور کی مانگ کا سیندور بن رہا ہے۔ یہ تم نے کیا کر لیا۔ یہ کیا کر دیا آنی؟" نیم تاریک برآمدے میں پڑی کرسی پر سر جھکائے وہ روتی رہی۔ اور آنی۔ اس کی کمزور صدا سے بہت دور۔ بے شمار روشنیوں کے نیچے دوستوں میں گھرا، دولہا بنا، مسکرا مسکرا کر، مبارک سلامت کی کلیاں سمیٹتا رہا۔

اُسے کیا خبر۔ اس کے دل پر کیا بیت رہی ہے جسے اس نے زخمی کر کے چھوڑ دیا ہے، جس کی ہر دھڑکن پر اس کا نام لکھا ہے۔

"رک جاؤ آنی! خدارا رک جاؤ۔ جس آنچل میں تم نے اپنے پیار کے ستارے ٹانکے تھے اُسے یوں کانٹوں میں الجھا کر نہ جاؤ۔"

اُس نے اپنا دل اس کے قدموں پر رکھ دیا مگر آنی نہ رکا۔ اس کی ہر التجا کا دامن جھٹک کر، اپنے بھاری قدموں سے، اس کے دل پر سے گزرتا، اپنی خوشیوں کی نئی وادیوں میں اتر گیا۔ اور وہ یونہی خلاؤں میں تکتی رہ گئی۔

نیچے نوکر چاکر ادھر اُدھر بھاگتے پھر رہے تھے۔ ڈھولک بج رہی تھی۔ اور وہ اوپر اپنے زخمی دل کو سنبھالے، اپنی لٹتی ہوئی خوشیوں کا ماتم کرنے کے لئے اکیلی رہ گئی تھی۔

اُسے یاد آیا۔ جب اس کے ہاتھوں میں مہندی رچی تھی۔ اور آنی پھولوں میں سجا کر اسے اپنے گھر لایا تھا، تو اس نے گھونگھٹ اُلٹتے ہی اس سے کہا تھا۔

"میرے گھر میں بہار آگئی ہے نسیمہ! آج تو میرے گھر میں چاند اتر آیا ہے، اور دیکھو تو نسیم میری تو سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں اس سندر چاند کا استقبال کیسے کروں۔" اور آج وہی آپی۔ کسی اور کا گھونگھٹ الٹتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "رخسانہ! یہ کیسی حسین رات ہے کہ اس رات چاند نے ہمارے گھر میں بسیرا کیا ہے۔"

"ہاں آپی! مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں۔ ایک چاند چڑھتا ہے تو ایک چاند گہنانا ہی ہے۔ میری تقدیر کا چاند آج گہنا گیا ہے۔

اور اب۔ میری زندگی میں کتنا اندھیرا ہے، تمہیں اس کی کیا خبر۔ تمہیں کیا خبر۔ ؟"

بارات آئی، اتری، شادیانے بجتے رہے، پھر آہستہ آہستہ خاموشی چھا گئی۔ تھکے ماندے حویلی کے مکین بھی آخر کو سو رہے۔ نیچے آنگن میں خاموشی تھی۔ گہرا سکوت۔ بس ایک بولتی ہوئی مہک تھی جو ہواؤں کے دوش پر اوپر آرہی تھی، اور وہ اس مہک کی زبان کو اچھی طرح سمجھتی تھی۔

رات دھیرے دھیرے اپنا سلگتا ہوا وجود لئے اس کے سر سے گزرتی رہی۔ مگر وہ اپنی جگہ سے نہ ہلی۔ شبنم ساری رات اس کے ساتھ مل کر روتی رہی۔ مگر پھر بھی اس کا غم ہلکا نہ ہو سکا۔ یہ غم بھلا کیا ہلکا ہوتا۔

"سوکن کا غم جو عورت کے دل کا سب سے بڑا غم ہوتا ہے۔ اس کے پیار کا سب سے کڑا امتحان۔" اور آج رات تو اسے بہر حال اس امتحان سے گزرنا ہی تھا۔ ہوا چل رہی تھی۔ اور اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ ہوا اس کی زخمی رُوح ہو، جو ننگے سر اندھیروں میں بھٹکتی، کائنات کے ذرّہ ذرّہ سے فریاد کرتی پھر رہی ہو۔

مگر وہاں فریاد سننے والا تھا ہی کون ؟

کیا اس کا سرتاج انور۔۔۔ ؟ جو اب کسی اور کے سر کا تاج بن چکا تھا۔ یا اس کی وہ ساس نندیں، جنہوں نے صرف اس وجہ سے آپی کی دوسری شادی کروائی تھی کہ وہ آپی کے چمن میں کوئی ننھا سا پھول نہ کھلا سکی تھی۔

سب ہی تو نئی خوشیوں میں مگن ہو رہے تھے۔ کوئی بھی تو اس اتنے بڑے گھر میں اس کی غمگساری کو نہ رہا تھا۔

ایک آسمان تھا۔

سو وہ بھی داغ داغ۔ جس پر دھندلی دھندلی چنگاریاں ادھر اُدھر جل بجھ رہی تھیں۔ بھلا وہ کیا اس کا غم گسار بنتا۔

ایک رات تھی۔

سر سے پیر تک آگ میں لپٹی ہوئی رات۔ جس کا ہر ہر پل، ہر ہر لمحہ جلتا ہوا انگارہ بن بن کر اُس کی روح میں چیخ رہا تھا۔ اس کے روئیں روئیں کو داغ رہا تھا۔

کیسا دکھ تھا یہ بھی۔

کاش تم عورت ہوتے انور! تو شاید اس وقت کا ایک لمحہ بھی تم سے برداشت نہ ہوتا۔ اس سے تو یہ بہتر تھا کہ تم مجھے زندہ اپنے ہی ہاتھوں جلتی ہوئی آگ کے دریا میں پھینک دیتے۔

وہ پھوٹ پھوٹ کر روئی، روتی رہی، حتیٰ کہ آسمان پر اس کی لٹی ہوئی رات کی پہلی سحر نمودار ہو گئی۔

آپی اور رخسانہ جب ماہِ غسل منا کر واپس ہوئے تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ بڑی حویلی میں نہیں رہیں گے۔ تاکہ نسیم اپنی خوشیوں کا جلتا ہوا تماشا اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکے۔

"اُسے اور بھی رنج ہو گا امی جان۔" ماں کے اصرار پر آپی نے کہا تھا۔

"شکریہ آئی۔ تمہیں میرا اتنا خیال تو ہے"۔ وہ بڑے ہی دکھ سے ہنسی تھی۔ "مگر یہ تو اور بھی ظلم ہوگا۔ کیا تم مجھ سے یہ حق بھی چھین لینا چاہتے ہو کہ میں تمہیں صرف دیکھ لیا کروں۔ میری نظروں کے سامنے تو رہو۔ اتنے تو بے رحم نہ بنو آئی! تم رخسانہ کے رہو۔ اپنی چھوٹی بیگم کے۔ میں تو اُف بھی نہ کروں گی۔ فریاد بھی نہ کروں گی۔ تم میرے سامنے رہوگے اتنا ہی کیا کم ہوگا۔ اتنا کہا تو مان لو آنور!"

"امی جی، انہیں یہیں رہنے دیجئے۔ الگ گھر میں ان لوگوں کو تکلیف ہوگی اور پھر آپ کا ایک ہی بیٹا تو ہے کیا آپ اسے اپنی آنکھوں سے دُور کر دیں گی۔ یا کیا آپ اس بڑی حویلی کو چھوڑ کر ان کے پاس جا رہیں گی جس میں آپ نے اپنی عمر کے چالیس سال گزارے ہیں بتایئے نا اماں جی" اس نے روتے ہوئے ساس سے کہا۔

"آئی، تو یہیں رہے گا اور چھوٹی بہو بھی۔ بڑی بہو اب اتنی چھوٹے دل کی بھی نہیں، اُس نے تجھے شادی کرنے کی اجازت دے دی تو پھر یہ رونا دھونا کیسا۔ شریفوں کی بیٹیاں آخر شریفوں کی ہوتی ہیں"۔

"کون کہتا ہے میں نے شادی کی اجازت دی ہے۔ کوئی میرے دل سے تو پوچھے آئی!" اُس نے کہنا چاہا پر کہہ نہ سکی۔

وہ اب سوچ سکتی تھی، کہہ نہیں سکتی تھی۔ صرف سہہ سکتی تھی فریاد نہیں کر سکتی تھی۔

جب کبھی۔۔۔ وہ دونوں باہر جاتے تو رات گئے تک وہ انتظار کرتی رہتی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ لوٹ کر آنے والا کبھی اس کی دنیا میں لوٹ کر نہیں آئے گا"۔

"میں کس کا انتظار کر رہی ہوں۔ یہ مجھے نیند کیوں نہیں آتی؟" کبھی کبھی تو وہ خود اپنی محبت سے سوال کرتی۔ مگر کوئی جواب نہ ملتا۔ کہ ایسے سوالوں کا جواب محبت کے نزدیک حماقت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

مگر ان کے کھنکتے قہقہے تو اس تک پہنچ جاتے۔

"رخسانہ! پھول کتنے خوبصورت ہیں"

"ہاں بہت"۔ وہ ہنسی۔

"اور چاند؟"

"وہ بھی"۔

"اور یہ کائنات؟"

"کائنات بھی"۔

"مگر تم سے زیادہ تو نہیں۔ تمہارے بغیر تو نہیں"۔ آئی کہتا۔

پھر وہ دونوں ہی۔۔۔ ہنستے ہوئے اس کے سامنے سے گزر کر خوشی کے راستوں پر نکل جاتے۔

اس دل سے بے خبر، جو چپ چاپ چند خوش کن لمحوں کی یاد میں سلگتا رہتا۔ وہ سب کچھ سنتی۔ مگر یوں جیسے کچھ بھی تو نہ سنا ہو۔ چپ چاپ کام میں مشغول رہتی کبھی کبھی اس کی آنکھ سے کوئی باغی آنسو۔ خود بخود باوجود ضبط کی کوشش کے ٹپک پڑتا۔ تو وہ اسے یوں چھپاتی جیسے یہ بھی اس کے ناکردہ گناہوں میں سے ایک ہو جس کی اسے سزا ملے گی۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو۔۔۔؟

اور جانے کیوں، یہ چھوٹی بہو اس سے کھنچی کھنچی رہتی۔ خوف زدہ سی۔ ایسے جیسے وہ کوئی بھولی ہوئی شے ہے جو کسی لمحے آئی کو یاد آ سکتی ہے۔ تب ہی تو وہ آئی کو کبھی تنہا نہ چھوڑتی۔ میکے میں بھی اگر آئی نہ ٹھہرتا تو وہ بھی اس کے ہمراہ واپس چلی آتی۔

"رخسانہ تم بھی عورت ہو۔ میں بھی عورت ہوں۔ عورت ہو کر تو عورت پر اتنا ظلم نہ کرو"۔ نسیم ٹھنڈی سانس بھر کر رہ جاتی۔ وہ سوچتی۔

"چھوٹی بہو! کس نے پیچھے مڑ کر دیکھا ہے کسے پتہ ہے کل کیا ہوگا۔ کون جانے آج تمہاری راتوں پر چاند چمکتا ہے۔ کل چاندنی ہی نہ رہے۔ کہیں ایسا نہ ہو

یہ چاند ڈھل جائے۔ اور تم بھی میری طرح، یادوں کے ٹوٹے بکھرے موتی چنتی رہ جاؤ۔"
"اماں جی کو آنی کا بیٹا چاہئے۔ اس دولت و امارت کا اس جاگیر و حویلی کا وارث چاہئے۔"
"رخسانہ! جو چیز میرے بس میں نہ تھی تمہارے بس میں کیسے کر ہو سکتی ہے۔۔۔؟"

اور پھر جھکی جھکی آنکھیں لئے، وہ کسی نہ کسی کام میں لگ جاتی۔ ساری حویلی کا انتظام سنبھالتی پھرتی۔ بھاری بھاری پردے جھڑواتی، اور گرم کپڑوں کو دھوپ دکھاتی، اور یونہی نوکروں چاکروں پر حکم چلایا کرتی۔ بڑی بیگم تھیں نا اس گھر کی۔ اور اب تو اماں جی نے سارا مال و متاع، تجوری کی چابیاں گہنے پاتے، سبھی کچھ اس کے حوالے کر دیا تھا۔

شاید اس لئے کہ آنی۔۔۔ اگر ایک دولت چھوٹی بہو کی تحویل میں تھی تو کچھ تو بڑی بیگم کی تحویل میں بھی ہونا چاہئے۔
"آنی! دل ایک دولت ہے، پر دولت دل تو نہیں ہو سکتی۔"
"دل اور دولت میں کیا فرق ہے۔ یہ تو کبھی بھی یہ سمجھی ہے نہ سمجھ سکے گی۔ کیا ساری دنیا کی دولت بھی، ایک ٹوٹے ہوئے دل کا مداوا ہو سکتی ہے کیا پیار کے صرف ایک بول کی بھی قیمت ادا کر سکتی ہے۔ اس بول کی جسے تم کہو، اور میں سنوں۔"
"کبھی نہیں، کبھی نہیں آنی۔"
"محبت کیا ہے؟ اماں جی، یہ تم کیا جانو۔"

گم صم، اسے روحوں کی طرح دھیرے دھیرے چلتے دیکھ کر۔ کبھی کبھی نوآنی بھی اپنی خوشیوں سے چونک پڑتا۔ جیسے اُسے کوئی بھولا بسرا خواب یاد آ گیا ہو۔ اُس کا جی چاہتا، ہاتھ بڑھا کر، ماضی کی کسی خوبصورت سی یاد کو پھر سے اپنے گلے سے لگا لے۔ مگر ہاتھ ہوا میں اٹھا ہوا ہی رہ جاتا۔ اور خواب چھونے سے پہلے بکھر جاتا۔

"نسیم!" کبھی کبھار تنہائی میں وہ خفیف سا کہتا۔
"کہئے؟" وہ اجنبی سی بن جاتی۔
"وہ۔۔۔ وہ کتاب کہاں رکھ دی تم نے۔۔۔" وہ بھولنے لگتا۔
"کونسی؟" وہ دکھی سی ہو جاتی۔ "جو مجھے پسند تھی وہ۔۔۔ یا وہ جو آپ کو پسند تھی؟"
"وہ، جو ہم دونوں کو پسند تھی نسیم!"
"وہ تو کھو گئی!"
"کہاں؟"
"نہ جانے کہاں!"
"کب؟"
"نہ جانے کب۔۔۔ پتہ نہیں۔ یہ نہ پوچھئے۔ اب نہ پوچھئے۔" وہ اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیتی۔ مبادا، وہ ان آنسوؤں کو دیکھ لے جنھیں وہ خود اپنے وجود سے بھی چھپائے چھپائے پھرا کرتی تھی۔

ہر بار وہ کچھ عجیب عجلت میں ہوتا۔ جیسے گاڑی چھوٹی جا رہی ہو، خواہ وہ اس سے یہ سوال کرنے آتا کہ اس کے کپڑے دھوبی لایا یا نہیں، یا یہ کہ کل مہمان آ رہے ہیں یا نہیں۔۔۔ یا یہ کہ نسیم! تمہاری پسند کے کون سے آنے جائیں؟"

اس آواز میں نسیم اس چھپے ہوئے خوف کو اچھی طرح جانتی تھی۔ اس کش مکش کو جو رخسانہ کی غیر موجودگی میں بھی اس کی موجودگی کا احساس بن کر چھائی رہتی۔

آپ ریکارڈ لینے جا رہے ہیں؟ جو آپ لوگ لائیں گے سبھی اچھے تو ہوں گے۔ مجھے سبھی اچھے لگیں گے۔" وہ جواب دیتی۔ گو اس کا جی چاہتا کہ دے "سنو آتی۔ اب دنیا کا کوئی گیت میرے لئے نہیں۔ مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا۔ مجھ سے اب کیا پوچھنے آئے ہو۔ میرا تو ہر گیت کھو گیا ہے ہر خواب جل گیا ہے۔ میرے مقدر کا وہ تو غنہ تو تم نے جلا دیا ہے جس میں میری زندگی کا سب سے خوبصورت گیت درج تھا۔"

مگر اور سب باتوں کی طرح، یہ بات بھی ان کہی رہ جاتی۔

کبھی یوں بھی ہوتا۔

بہت سے موتیے کے گجرے آتے۔ ساری حویلی جن کی خوشبو سے مہک جاتی۔ یہ مہک اس تک آتی، تو وہ بے قرار ہو اٹھتی۔ اس مہک سے اس کا دم گھٹنے لگتا۔

کوئی اسے یہاں سے لے جائے۔ اس مہک کو یہاں سے اڑا کر لے جاؤ، کہیں دور لے جاؤ۔" وہ ہواؤں سے التجا کرتی۔

مگر خوشبو یہ کیا جانے کہ اسے کہاں تک جانا چاہئے۔ کہاں تک نہیں۔ وہ بھلا ان حد بندیوں کو کیا جانے کہ وہ تو جب پھیلتی ہے تو بس چاروں طرف پھیل جاتی ہے چاہے کسی کو اچھے لگے چاہے نہ لگے۔

کچھ گجرے، کچھ پھول، رخسانہ کے بالوں، اس کی کلائیوں سے بچے رہتے۔ اور چھوٹی بیگم کی نظر بچا کر کبھی کبھی آتی کوئی نازک سا، سہما ہوا سا پھول، اس کی طرف بھی پھینک دیتا۔ پھول کہیں اس کے قریب ہی آگرتا۔ اس کا جی چاہتا جھک کر اسے اٹھالے۔ اور اپنے دل کے ایسے تہہ خانوں میں کہیں رکھ دے جہاں چھوٹی بیگم کی نظر بھی نہ پہونچ سکے۔ پھر اس پھول کی یوں پوجا کرے جیسے کوئی اپنے دیوتاؤں کی کرتا ہے۔

تب وہ چھوٹی بیگم سے کہتے۔ چھوٹی بہو۔ جس کے گرد تم محافظ بھونرے کی طرح چکر لگاتی ہو۔ وہ دیوتا، جانتی ہو کہاں ہے؟"

"وہ تو میرے من مندر کی سندرتا ہے بہو رانی۔"

پھر وہ اس پھول کو اٹھانے کو جھک جاتی۔ ہاتھ بڑھاتی تو رخسانہ دیکھ لیتی۔ تب وہ پھول سے نظر پھیر کر زمین پر گری پڑی کوئی اور شے تلاش کرنے لگتی۔ کوئی تنکا، کوئی پتا، کوئی کنکر، پتھر۔

ہوا تیز ہو تو پھر بھلا تنکے کی کیا حقیقت، اور پھر، میری قسمت، تو انہیں سنگ ریزوں سے بنی ہے۔ پھر بھلا، پھولوں تک میرا ہاتھ پہنچ بھی کیسے سکتا ہے چھوٹی بیگم۔

مگر کبھی کبھی تو سچ مچ اس کے اندر کی نادان نسیم، وہی الھڑ سی بے سمجھ لڑکی، الجھ پڑتی۔

"سنو سمجھدار، اور عقلمند صابر بڑی بیگم! میں چھوٹی بہو کی پیشانی سے یہ جھومر نوچ لوں گی۔ میں اس کے گلے سے یہ چمکتی مالا کھینچ کر اس کا ہر موتی بکھیر دوں گی۔"

"نہیں، نہیں، ایسا تو سوچنا بھی وفا کی توہین ہے نسیم!"

کیوں آخر؟ آتی میرا بھی تو ہے۔"

آتی چھوٹی بہو کا بھی تو ہے۔ آتی تو اس کا ہے جس کی پیشانی پر مقدر کا جھومر چمکتا ہے۔"

"مگر نہیں، یہ جھومر میرا ہے، یہ تاج میرا ہے، یہ مالا میری ہے۔"

"کیا وہ میرے سہاگ کی سندرتا نہیں۔"

"نہیں نسیم۔"

"پھر؟"

"جیسے پیا چاہے وہی سہاگن۔"

نسیم پھر بھی نہ مانتی، چیختی چلاتی، شور مچاتی، تو بڑی بیگم اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلتے تو وہ ان آنسوؤں پر اپنے میلا آنچل ڈال دیتی۔

"تم تو مجھے رونے بھی نہیں دیتیں بڑی بیگم۔ تم کتنی ظالم ہو۔ کتنی بے رحم ہو تم۔"

"مت روؤ۔" بڑی بیگم حکم دیتی۔

"یہ ظلم ہے۔" نسیم نہ مانتی۔

"نہیں یہ عظمت ہے۔"

"مجبوری کا نام عظمت تو نہیں۔"

"مشرقی عورت کی توہین نہ کرو۔ شوہر کی خوشی اس کی خوشی ہے، شوہر کا غم اس کا غم ہے۔ ان کی زندگی میں بہار ہے تو کیا تم اس سے خوش نہیں۔ ان کے باغ میں پھول کھلیں گے تو کیا تم اس سے خوش نہ ہوگی، بتاؤ نسیم؟"

"ہاں، ہاں... ہاں۔" نسیم سہم سی جاتی "ہاں تم سچ کہتی ہو بڑی بیگم۔ نسیم تو کب کی مر گئی اب تو بس تم زندہ ہو۔ آتی کی بڑی بیگم۔"

"شوہر کی خوشی اس کی خوشی ہے۔"

"اُن کی زندگی کی بہار، ان کے چمن کے پھول، ہاں، اسے میں خوش تو ہوں۔"

پھر جلدی جلدی وہ آنسو پونچھنے لگتی۔

ان کے سر میں درد ہے۔ اسے پتہ چلا تو وہ بام کی شیشی لئے گھنٹوں پھرا کرتی، بے بس قیدی کی طرح۔ جس کے قفس کا دروازہ کھلا ہو مگر جس کے ہاتھ پیروں میں بندھن پڑے ہوں۔ اس کا جی چاہتا۔ اس بام میں اپنے وجود کو تحلیل کر دے کہ جب چھوٹی بیگم بھی آتی کے ماتھے پر ملیں تو انہیں پتہ بھی نہ چلے کہ نسیم تو آتی کے اندر سمائی جا رہی ہے۔

مگر یوں نہ ہوتا، اور وہ بام جہاں سے اٹھاتی وہیں رکھ دیتی، بے مقصد اس کی طرف یوں دیکھے جاتی جیسے وہ بھی اس کی طرح کوئی دکھی روح ہو جو اس کی ہر بات سمجھتی ہو، ذرا دیر بعد، چھوٹی بہو آتیں اور شیشی اٹھا کر چل دیتیں۔ وہ بیمار پڑ جاتی۔ آتی پوچھتا، تو کہتی۔

"ٹھیک ہوں، کچھ نہیں، ذرا طبیعت ٹھیک نہیں۔"

وہ نہ کہتی، "آتی اس دکھ کی وجہ تو اس حویلی کا ذرہ ذرہ جانتا ہے۔ اگر نہیں جانتے تو بس ایک تم"

"بال تو سنوار لیا کرو۔"

"اچھا" پھر وہ چپ ہو جاتی۔ وہ چلا جاتا، تو وہ یونہی بال بکھرائے کھوئی کھوئی سی پھرتی رہتی۔

"بکھرا رہنے دو۔ انہیں نہ چھیڑو۔" وہ ہواؤں سے کہتی۔ "بھلا انہیں سنواروں بھی تو کس لئے؟"

اور اب تو وہ اس زندگی کی خوگر ہو گئی تھی، جو خود ہی کچھ بکھری بکھری سی تھی یہی وجہ تھی کہ جب آتی کی ایک بار پھر شادی کی بات چلی تو اس نے ذرا بھی چونک کر نہ دیکھا جیسے یہ کوئی بات ہی نہ ہو۔

مگر اماں جی کی بے چینی اب انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ بھلا وہ کیوں نہ چونکتیں۔ برسوں ہی تو چپ چاپ گزر گئے۔ اور اب تو صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہو گیا تھا۔

یہ بڑی بہو تو چلو پھر بھی پہلی بہو تھیں۔ اور پھر ساری حویلی کی کرتا دھرتا، صبر ایسا کہ اماں جی اب تو خود ہی گھڑی گھڑی ایک ٹھنڈی آہ کے ساتھ اعتراف کر بیٹھتیں۔ سگی بیٹی بھی ہوتی تو کاہے کو اتنی عزت، اتنی خدمت کرتی جتنی بڑی بیگم نے کی تھی۔

"اگر اللہ ایک بچہ ہی دے دیتا تو میں کبھی اپنی آنی کی دوسری شادی نہ کرتی"۔ اب وہ اپنی غلطی کا اعتراف کھلے بندوں کرنے لگی تھیں، اور پھر یہ چھوٹی بہو تھیں کس مرض کی دوا، نہ ادب آداب کی، نہ گھر گرہستی کی، زبان ہے سو وہ سو گز لمبی، نہ عزت کریں نہ کروانا جانیں۔ اور پھر سب باتوں کی ایک بات تو یہ تھی کہ گود تو انہوں نے بھی ہری کر کے نہ دی۔ جس کے لئے بڑی بیگم یوں ماری گئیں۔ اور پھر بے چاری پر سوکن کا بھی ظلم ٹوٹا۔ اماں جی کو اس پچھتاوے کا تو بہر حال ازالہ کرنا ہی تھا۔ آنی کے لئے اب پہلے سے بھی زیادہ نوعمر اور حسین لڑکی پسند کر لی گئی۔ پھر یونہی اماں جی اور ان کی چہیتی بیٹیوں میں صلاح و مشورے ہونے لگے جیسے ایک بار پہلے ہو چکے تھے۔

اور انور کا کیا تھا، وہ تو تھا ہی سدا کا کھلنڈرا۔ اور پھر اماں جی کا فرماں بردار۔ کچھ دن تو چھوٹی بہو کی محبت میں، اوں آں۔۔ کرتا رہا، مگر آخر کہاں تک ــ؟

آخر ایک روز ــ بڑی حویلی کے دروازے پر ایک بار پھر نوبت بجنے لگی۔

پہلی بار ــ جب شہنائی نسیم نے سنی تھی، تو اس راگ کی نغمگی اسے اتنی حسین لگی تھی کہ وہ اسے آج تک بھول نہ سکی تھی۔

دوسری بار جب اس نے شہنائی سنی تو اس راگ کا درد اتنا شدید اور اتنا دکھ بھرا تھا کہ وہ تو اسے عمر بھر نہ بھلایا جا سکے گا۔

مگر یہ تیسری بار کا تاثر تو کچھ اس کی سمجھ میں ہی نہ آ رہا تھا۔ جیسے جب دل چوٹ کا خوگر ہو جائے تو پھر غم، غم نہیں رہتا۔

وہ یوں ادھر ادھر کام میں لگی تھی جیسے یہ اس کے آنی کی شادی نہ ہو کسی دور پار کے رشتہ دار کا بیاہ ہو۔

مگر یہ آج چھوٹی بہو کو کیا ہو گیا تھا، جانے وہ آج کون سے گوشے میں جا چھپی تھی۔

نسیم کسی کام کو اوپر کے حصے میں گئی تو اس نے دیکھا۔ نیم تاریک برآمدے میں پڑی، اکیلی کرسی پر، وہ جھکی ہوئی اپنے پہلو میں اٹھتے ہوئے درد سے جنگ میں معروف تھی۔

"یہ درد بڑا جان لیوا ہوتا ہے پر سہنا ہی پڑتا ہے چھوٹی بیگم! میں نے بھی سہا تھا۔ تمہیں بھی سہنا ہوگا"۔

"اٹھو چھوٹی بہو، دل چھوٹا نہ کرو"۔

"آنی میرا ہے، وہ سسک پڑی تھی۔

"وہ میرا بھی تو تھا۔ وہ سب کا ہے پھر بھی کسی کا نہیں، کیونکہ وہ مرد ہے اور مرد کسی کا نہیں ہوتا"۔

"یہ درد مجھ سے سہا نہیں جاتا، بڑی بیگم"۔

"یہ درد صرف تمہارا ہی نہیں، میرا بھی ہے، یہ ہم سب کا مشترکہ درد ہے۔ اب ہم اکیلے نہیں ہیں۔ اب ہم ایک دوسرے کے دشمن بھی نہیں رہے رخسانہ! کیونکہ درد کی راہیں جہاں پر ایک دوسرے کو آ کر کاٹتی ہوئی گزرتی ہیں وہیں پر ہمارا ملاپ ہوتا ہے"۔

"ایک آگ سی میرے دل میں بھڑک رہی ہے بڑی بہو"۔ اس نے کہا۔

"یہ آگ ہی ہمارے ملاپ کا سنگم ہے چھوٹی بہو!" اس نے جواب دیا۔ "اٹھو، مت روؤ، دل چھوٹا نہ کرو، تم اب اکیلی نہیں ہو۔ ہمارے درمیان آگ کی اٹھتی ہوئی دیوار اب گر گئی ہے۔ اور اب ہم نے اس دکھ کو مل کر بانٹ لیا ہے۔ یہ رشتہ بڑا عجیب ہے رخسانہ! یہاں سے ہم ایک دوسرے کے سچے ساتھی بن گئے ہیں"۔

"وہ کبھی سکھی نہیں رہے گا نسیم۔ جس نے ہمیں اس آگ میں جلایا ہے"۔

"خدارا! یوں نہ کہو، محبت یوں نہیں کہتی، وفائیں یوں نہیں کہتی، بیوی یوں نہیں کہتی"۔ اور نسیم نے آگے بڑھ کر چھوٹی بہو کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"وہ ہمارا تو نہیں۔"

"مگر اس کی خوشی ہماری خوشی ہے۔ اس کا غم تو ہمارا غم ہے۔"

"آؤ ہم مل کر اس کے لئے دعا کریں رخسانہ۔"

"خدا ہمارا سہاگ سدا سلامت رکھے۔"

"تم سدا خوش رہو آنی!"

ایک مشرقی عورت نے کہا۔ دوسری نے دُہرایا۔

رخسانہ رو رہی تھی۔ نسیم بھی رو رہی تھی۔

شہنائی کی آواز لمحہ بہ لمحہ تیز ہو رہی تھی۔ اور نسیم کو یوں لگ رہا تھا۔ جیسے وہ "درد" ہو اور رُخسانہ "دل"۔ یا جیسے رخسانہ "درد" ہو اور وہ "دل"۔ اور وہ کچھ بھی تو سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ درد اور دل کا یہ رشتہ کیسا عجیب رشتہ ہے۔"

بیس (۲۰) افسانے • بیس (۲۰) شاہکار

دیواریں

حمید کاشمیری

کے بیس ۲۰ افسانوں کا مجموعہ شائع ہو گیا

• آفسٹ کی چھپائی • تقریباً تین سو صفحات • پانچ روپے

ملنے کا پتہ

مکتبۂ ماحول

بہادر شاہ مارکیٹ بندر روڈ کراچی

ارنسٹ ڈڈلی

ہمدرد صحت۔ کراچی

ٹیکسی

"ڈاکٹر صاحب! دس بج کر پندرہ منٹ ہو چکے ہیں۔ اور دس بج کر چالیس منٹ پر اپریشن ہے!" مس فرل نے ڈاکٹر مورل کے کمرے کا دروازہ کھول کر کہا۔ اس کا ہاتھ اس کے واٹر پروف کوٹ کا بٹن لگانے میں مصروف تھا۔

آج دن بھر بارش ہو چکی تھی۔ اور اس وقت بھی ہو رہی تھی۔ پانی کی بوندیں تیز و تند ہوا کے ساتھ ڈاکٹر مورل کے کمرے کی کھڑکیوں پر پڑ رہی تھیں۔ مس مورل نے دیکھا۔ کہ ڈاکٹر اپنی میز پر جھکے ہوئے ہیں۔ اور کچھ کاغذات کا بغور مطالعہ کر رہے ہیں۔ وہ اس کام میں اس درجہ مصروف اور منہمک تھے۔ کہ ان کو مس فرل کی موجودگی کی خبر نہ ہوئی۔

"ڈاکٹر مورل!" مس فرل نے پھر ڈرتے ڈرتے دوبارہ آواز دی۔

"کیا بات ہے! کیا بات ہے!" ڈاکٹر نے جھنجھلا کر کہا۔

"آپ کو دس بجکر چالیس منٹ پر ہسپتال میں حاضر ہونا ہے اور اس دماغی مریض کے اپریشن کا معائنہ کرنا ہے۔ اب تو سوا دس بجنے والے ہیں"

ڈاکٹر نے مس فرل کو گہری نگاہ سے دیکھا۔ ان کے چہرے پر لیمپ کی روشنی پڑ رہی تھی۔ "ہاں!" انہوں نے کہا۔ "وہی اپریشن جو آج رات ہونے والا ہے۔ اور جس میں ڈاکٹر رڈلی تربائی عمل جراحی کے ذریعے کھوپڑی میں سوراخ کرنے کا ایک نیا طریقہ استعمال کرنے والے ہیں۔ میں نے ڈاکٹر رڈلی کی دعوت قبول کر لی ہے۔ یقیناً یہ ایک نیا اور دلچسپ طریقہ ہوگا۔"

اتنا کہہ کر مورل نے دیوار کی گھڑی پر نظر ڈالی۔ دس بجکر سولہ منٹ ہو چکے۔ اپریشن کا وقت دس چالیس ہے۔ مجھے یاد دلانے میں تم نے اتنی دیر کیوں کی؟"

کرسی سے اٹھ کر ڈاکٹر نے کاغذات کو ایک طرف کر دیا۔ اور مس فرل کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے اس طرح آنکھیں نکال کر نہ دیکھو۔ میری بات کا جواب دو۔"

مس فرل جو ڈاکٹر مورل کی سیکریٹری تھی۔ کچھ تیکھا سا جواب دینا چاہتی تھی۔ مگر یہ سوچ کر کہ اس سے تلخی پیدا ہوگی۔ اس نے ایک ٹھنڈا سانس لے کر خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا

بہتر یہ ہے کہ اپنے چہرے سے کرب و ایثار نفسی کے رنگ کو ہٹا دو۔ اور ایک موٹر ٹیکسی لے آؤ تاکہ میں جلد ہسپتال پہنچ سکوں۔" ڈاکٹر

نے تحکمانہ انداز سے کہا۔

"دیکھتی ہوں شاید کوئی ٹیکسی اس وقت چلتی پھرتی مل جائے۔" مس نے جواب دیا۔

"شکریہ!" ڈاکٹر نے طنز آمیز لہجے میں کہا۔ "چونکہ تم میرا کوٹ اور ہیٹ لانا بھول گئیں۔ اس لیے میں خود لیے لیتا ہوں۔"

مس فریل نے پھر ڈاکٹر موریل پر ایک تیز نظر ڈالی اور تیزی سے چلی گئی۔ چند منٹ بعد جب وہ واپس آئی تو اس نے ڈاکٹر موریل کو چلنے کے لیے تیار پایا۔ انہوں نے اپنی چھڑی بھی بغل میں دبا رکھی تھی۔

"مجھے ایک ٹیکسی مل گئی۔ اس نے ایک فاتحانہ انداز سے کہا۔" دروازے کے باہر کھڑی ہے۔"

"میں نے یہ کب کہا تھا کہ گاڑی کو کمرے کے اندر لے آنا۔" ڈاکٹر موریل نے ایک تلخ تبصرے کے طور پر کہا۔

یہ میری خوش نصیبی تھی۔ کہ اس وقت ٹیکسی مل گئی۔" مس فریل نے جواب دیا۔ "کیسی خراب رات ہے۔ اب تک بارش ہو رہی ہے۔"

ڈاکٹر موریل نے مس فریل کے بھیگے ہوئے اور پانی سے چمکتے ہوئے کوٹ کو دیکھ کر کہا۔ "مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آب پاشی کے ہزار سے تم نے اپنے جسم پر چھڑکاؤ کر لیا ہے۔"

اس کے بعد ڈاکٹر موریل نے دستانے پہنے اور کہا۔ "میرے ساتھ آؤ۔"

مس فریل نے دروازہ بند کیا اور اس دراز قد ڈاکٹر کے پیچھے پیچھے چلی۔ ڈاکٹر موریل نے مس فریل کو اشارے سے کہا۔ کہ ٹیکسی میں بیٹھ جاؤ اور خود آگے بڑھ کر ڈرائیور کو کچھ ہدایات دینے لگے۔ ٹیکسی کے اندر قدم رکھتے ہی مس فریل چیخ پڑی اور الٹے پاؤں باہر نکل آئی۔ قریب تھا کہ وہ پٹری پر گر پڑے۔

"آہ! آہ! ڈاکٹر موریل!"

ڈاکٹر نے اس کا بازو پکڑ کر اسے گرنے سے روک لیا۔ وہ گھبرائی ہوئی آواز میں کراہنے لگی۔ "یا خدا یہ کیا ماجرا ہے!" اس نے سراسیمہ ہو کر پوچھا۔

ٹیکسی کا ڈرائیور بھی پریشان ہو گیا۔ "کیا بات ہے؟ کیا بات ہے؟" اس نے گھبرا کر کہا۔

مس فریل نے ہانپتے ہوئے جواب دیا۔ "گاڑی میں..... کوئی چیز ہے..... کسی کی لاش پڑی ہوئی ہے۔"

"لاش!" ڈاکٹر موریل نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"لاش!" ڈرائیور نے بھی گھبرا کر کہا۔ اور اپنی نشست سے اچھل کر باہر آ گیا۔ "کیا کہا لاش؟!"

"آہ!" مس فریل نے ڈرتے ہوئے اور کراہتے ہوئے کہا۔

"میں۔ میں۔ میرا ہاتھ اس کے چہرے پر پڑ گیا تھا۔" وہ خوف کے مارے سر سے پیر تک کانپ گئی۔

ڈرائیور گاڑی کے اندر کی بتی جلا دو۔ ڈاکٹر نے کہا۔ ڈرائیور نے بجلی کا بٹن دبا دیا۔ گاڑی میں روشنی ہو گئی۔ پھر اس نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ "واقعی لاش ہے۔"

ڈاکٹر نے گاڑی کے اندر قدم رکھ کر لاش کو بغور دیکھا۔ پھر مس فریل کو مخاطب کر کے کہا۔ "مس فریل اگر تم غش کھانا یا بے ہوش ہونا چاہتی ہو تو یہ کام کسی دوسری جگہ کرنا۔ اس وقت صرف ایک ہی بے جان جسم میرے لیے کافی ہے۔"

مس فریل ہانپتی، کانپتی پھر ڈرائیور کی سیٹ کے بغل میں بیٹھ گئی۔ اور دونوں زانوؤں کے اندر سر رکھ کر خاموش ہو گئی۔ بارش اب بھی ہو رہی تھی۔ اور بوندیں مس فریل کی گردن اور بازو پر پڑ رہی تھیں۔

ڈرائیور نے اپنے دانتوں کو دبا کر پست آواز میں کہا۔ "چہرے سے صاف ظاہر ہے۔ کہ یہ شخص مر چکا ہے۔ اس میں اب ذرا بھی جان باقی نہیں ہے۔"

"ہاں" ڈاکٹر نے کہا۔ "کاغذ تراشی چاقو یا ایسی ہی کوئی چیز اس کے قلب میں بھونک دی گئی ہے۔"

"بہت تکلیف دہ منظر ہے!" ڈرائیور نے جواب دیا۔ "اس کی ساری قمیض خون آلود ہے۔ لیکن حیرت ہے یہ میری گاڑی میں کیوں کر داخل ہو گیا۔"

"میری مدد کرو۔ تاکہ ہم اسے اپنے مکان میں لے چلیں۔" ڈاکٹر نے لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"بہت اچھا" ڈرائیور نے جواب دیا۔ اس نے سر پر اپنی ٹوپی درست کی۔ اور گھبرا کر کہا۔ "جناب میں اس کی ٹانگیں گاڑی میں کیوں کر آئی۔ آج جب سے میری ٹیکسی اڈے پر کھڑی تھی۔ مجھے پہلی سواری آپ ہی کی ملی ہے۔ اس سے پہلے آج شام سے کوئی شخص اس گاڑی پر نہیں بیٹھا۔"

"مس فرلی!" ڈاکٹر نے کہا۔ "ہوش میں آؤ اور مکان کا دروازہ کھولو۔ جلدی کرو۔"

مس فرلی نے ایک بے ہوشی کے عالم میں اس حکم کی تعمیل کی۔ ڈرائیور نے کہا۔ "جناب میں اس کی ٹانگیں پکڑتا ہوں۔ آپ سر پکڑیں۔"

دونوں مل کر لاش کو مکان کے اندر لے گئے۔ بارش اب تک ہو رہی تھی۔ اور ہوا بھی تیز تھی۔ تھوڑی دیر میں ڈاکٹر موریل نے لاش کا معائنہ ختم کیا۔ اس کے بعد ایک سگار سلگا کر منہ میں رکھا اور ایک دو لمبے کش لینے کے بعد کچھ سوچنے لگے۔

"ہاں تو" ڈاکٹر نے ڈرائیور کو مخاطب کر کے کہا۔ "تمہاری رائے یہ ہے ڈرائیور کہ جب تم اپنی گاڑی کو جو اسٹینڈ (اڈے) پر تنہا کھڑی تھی چھوڑ کر کچھ دیر کے لیے ہٹے تو کسی نے لاش کو اس کے اندر ... ."

"میں صرف ایک لمحہ کے لیے بغل کے ہوٹل میں گیا تھا۔" ڈرائیور نے بات کاٹ کر کہا۔

"اسی وقت کسی نے غالباً خود قاتل نے اس لاش کو گاڑی میں ڈال دیا۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔ "کیوں ہے نا تمہاری بھی رائے؟"

"ہاں! ہاں!" ڈرائیور نے کہا۔ "یقیناً ایسا ہی ہوا۔ کیوں مس فرلی، آپ کی طبیعت کیسی ہے؟" ڈرائیور مس فرلی سے مخاطب ہوا۔ مس فرلی کے دل سے پہلے صدمہ اور خوف کے اثرات اب کسی قدر زائل ہو چلے تھے۔ وہ اپنی عینکوں کے اندر سے ان دونوں کو بغور دیکھ رہی تھی۔

ڈاکٹر موریل نے کچھ سوچ کر کہا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ حملہ آور یا حملہ آوروں نے شناخت کے تمام ذرائع اس شخص کے جسم سے الگ کر دیے تھے۔ مقتول کی جیبوں میں بھی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس سے کچھ سراغ لگایا جا سکے۔ لیکن صرف ایک چیز ایسی تھی جس پر میں نے غور کیا میں نے دیکھا کہ اس کے کپڑے تو بھیگے ہوئے ہیں۔ لیکن جوتوں کے تلے بالکل خشک ہیں۔ ان میں پانی یا کیچڑ کے کوئی آثار نہیں پائے جاتے۔"

"اوہو" ٹیکسی ڈرائیور نے لاش کی طرف غور سے دیکھ کر کہا۔ "ہاں۔ ہاں۔ اب مجھے یاد آ رہا ہے۔"

"کیا" ڈاکٹر نے گھبرا کر پوچھا۔ "کیا یاد آ رہا ہے؟"

"میں نے اس شخص کو پہلے بھی دیکھا ہے۔" ڈرائیور نے کہا۔ "اس کے چہرے پر جو نشان ہے، اُسے میں پہچانتا ہوں۔ یہ میرے اڈے کے قریب ہی ایک مکان سے نکلا تھا۔"

"تمہارے اڈے کے قریب؟" - مس فرلی نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

"ہاں۔ ہاں" ڈرائیور نے جواب دیا۔ "دو روز ہوئے یہ اس مکان سے نکلا تھا۔ اور میری ٹیکسی پر سوار ہو کر شہر گیا تھا۔ میں اس کے چہرے کے نشان کو اچھی طرح پہچان گیا۔"

"ایسی صورت میں تو سب سے بہتر یہ ہے کہ مجھے فوراً اس مکان تک لے چلو۔" ڈاکٹر موریل نے کہا۔ "اس سے اس کی شناخت میں

آسانی ہوگی۔"

"اچھی بات ہے۔" ڈرائیور نے جواب دیا۔
"آؤ مس فریل تم بھی چلو۔" ڈاکٹر نے کہا۔

تھوڑی دیر میں ٹیکسی ایک اوسط درجے کے مکان کے پاس رکی۔ لیکن دروازہ سے کچھ دور رہی۔ مکان کے دونوں پہلوؤں میں ایک چھوٹا سا باغ تھا۔ جو اس کو دوسرے مکانوں سے الگ کرتا تھا۔ اور دو تین بڑے اور گھنے درخت راہ گیروں کے لیے پردے کا کام کرتے تھے مس فریل اور ڈاکٹر موریل گاڑی سے اترے۔ ڈاکٹر موریل نے ڈرائیور کے کان میں کوئی بات آہستہ سے کہی۔ اس کے بعد ڈاکٹر موریل اور مس فریل مکان کے دروازے کی طرف چلے۔ اب بارش کم ہوگئی تھی۔ لیکن ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔

یکایک ڈاکٹر موریل ٹھہر گئے۔ انہوں نے نچلی منزل کی کھڑکی پر کوئی متحرک چیز دیکھی۔ پھر ایک شخص کے چہرے کی جھلک کھڑکی کے پردے سے باہر معلوم ہوئی۔ مگر پردہ پھر فوراً ہی کھینچ کر برابر کر دیا گیا۔ مس فریل نے یہ باتیں نہیں دیکھی تھیں۔ وہ دروازے کی طرف سیدھی چلی گئی اور سیڑھیوں پر چڑھ کر اس نے گھنٹی کا بٹن دبایا۔ اتنے میں ڈاکٹر موریل بھی اس کے پاس پہنچ گئے۔

"کیا تم نے گھنٹی بجا دی؟" ڈاکٹر موریل نے سوال کیا۔

"نہیں۔ نہیں۔" اس نے سہم کر جواب دیا۔ اور یہ سمجھا کہ گھنٹی بجا کر اس نے ایک بڑی غلطی کی ہے۔

"اگر نہیں بجائی ہے تو اب بجاؤ۔" ڈاکٹر موریل نے کہا۔

مس فریل نے دو مرتبہ پھر زور زور سے گھنٹی کا بٹن دبایا۔ اور اندر سے گھنٹی بجنے کی تیز آوازیں باہر تک آنے لگیں۔ لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ ڈاکٹر موریل نے اپنی چھڑی سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ پھر بھی خاموشی ہی رہی۔ ڈاکٹر موریل نے کچھ سوچا اور ایک لمحے کے بعد دروازے کی سیڑھیوں سے اتر کر پھر اسی کھڑکی کی طرف گئے۔ جہاں انہوں نے ایک پراسرار چہرے کی جھلک دیکھی تھی۔

کھڑکی کی چوکھٹ زمین سے چار پانچ فٹ اونچی تھی۔ وہ تیزی کے ساتھ اس پر چڑھ گئے اور اپنی جیب سے ایک ٹارچ نکال کر اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ یہ کھڑکی معمولی وضع کی تھی۔ یعنی اس کے دونوں پٹ ایک بلی کے ذریعے بیچ میں لگے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر نے شیشے سے یہ بات دیکھ لی۔ اور اطمینان کا ایک سانس لیا۔ پھر ایک چاقو نکال کر اس کا پھل دونوں پٹوں کے درمیان جوڑ میں داخل کر کے اوپر کی طرف اٹھایا۔ بلی فوراً اٹھ گئی اور کھڑکی کھل گئی۔

"کیا کر رہے ہیں ڈاکٹر صاحب؟" اوپر سے مس فریل نے آواز دی۔

"آہستہ بولو۔" ڈاکٹر موریل نے کہا۔ "میں اس کھڑکی سے مکان کے اندر داخل ہونا چاہتا ہوں۔"

"لیکن مکان کے اندر بالکل خاموشی اور تاریکی ہے۔" مس فریل نے زیرِ لب آواز میں جواب دیا۔ "غالباً ٹیکسی ڈرائیور نے غلطی کی ہے یا سچ نہیں کہا ہے..... بہر حال معلوم ہوتا ہے مکان کے اندر کوئی نہیں ہے۔"

ڈاکٹر موریل خاموش رہے، پھر ایک لمحہ تک کچھ سوچ کر بولے۔ "آؤ ہم تم مکان میں داخل ہو جائیں۔" ڈاکٹر موریل نے اپنا ہاتھ بڑھا کر مس فریل کو سہارا دیا۔ اور وہ بھی کھڑکی پر آگئی۔

"میرے پیچھے پیچھے آؤ۔" ڈاکٹر موریل نے کہا۔ اور کھڑکی کا پردہ ایک طرف ہٹا کر کمرے میں اتر گئے۔ ان کے پیچھے مس فریل بھی اتری۔ مگر اس کا سر کھڑکی کے ایک پٹ سے ٹکرا گیا۔ اسے چوٹ بھی لگی۔ اور دھماکے کی ایک آواز بھی کمرے میں گونج اٹھی۔ ڈاکٹر موریل کی تیوری پر بل آگیا۔ پھر

انہوں نے نظر اٹھا کر کمرے کا جائزہ لیا۔ ہلکے رنگ کی دیوار میں ایک سیاہ رنگ کا دروازہ دکھائی دیا۔ وہ اس کے قریب گئے۔ دروازے کے ہم پہلو میں بجلی کی روشنی کا بٹن بھی موجود تھا۔ کمرے میں قالین بچھے ہوئے تھے۔ اور فرنیچر بھی کافی تھا۔ میز پر لکھنے پڑھنے کا سامان رکھا ہوا تھا۔ ڈاکٹر موریل نے یکایک بجلی کا بٹن دبا دیا۔ کمرہ روشن ہو گیا۔ مس فرلی نے خوف زدہ ہو کر کہا۔ "اور اگر پولیس ہمیں پکڑ لے تو کیا ہوگا ؟"

"اس کا خیال تو تمہیں اس مہم میں شریک ہونے سے پہلے ہی کرنا چاہیے تھا۔" ڈاکٹر موریل نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"لیکن مجھے تو آپ ہی نے ساتھ چلنے کے لیے کہا تھا۔" مس فرلی نے جواب دیا۔

ڈاکٹر نے اپنے ہاتھ کے اشارے سے مس فرلی کو خاموش رہنے کے لیے کہا۔ اور آگے بڑھ کر میز کے قریب پہنچا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس پر سے کوئی چیز اٹھائے، مگر یکایک دروازہ کھلا اور ایک شخص دکھائی دیا۔

مس فرلی خوف زدہ ہو کر تھر تھرا اٹھی۔ دروازے پر ایک خانساماں کھڑا ہوا تھا۔ اور اس کے بڑے اور بھدے چہرے سے خفگی اور بدمزاجی عیاں تھی۔

"یہاں کیا کر رہے ہو ؟" اس نے آگے بڑھتے ہوئے ڈاکٹر موریل کو ایک جنگ جویانہ انداز میں مخاطب کیا۔

ڈاکٹر موریل نے میز سے نگاہ اٹھائی۔ اور خانساماں کو اس طرح دیکھا جیسے کوئی غیر معمولی بات ہی نہیں ہے۔ ان کے چہرے سے پوری طمانیت اور سکون ظاہر تھا۔ "میں ڈاکٹر موریل ہوں۔ یہاں کسی شخص نے مجھے طبی امداد کے لیے بلایا ہے۔" یہ کہہ کر ڈاکٹر نے سگریٹ کیس سے ایک سگریٹ نکالا۔ پھر کھڑکی کو دیکھ کر کہا۔ "تم نے دیکھا ہوگا۔ کہ اس مکان میں ہمارے داخلے کا طریقہ کتنا غیر معمولی ہے مگر میں کیا کرتا مس فرلی میری سیکریٹری ہیں۔ انہوں نے چند بار دروازے کی گھنٹی بجائی لیکن کوئی جواب نہ ملا۔"

خانساماں کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ وہ گھبرا رہا تھا کہ آخر یہ کیا ماجرا ہے۔ "میں .... ہاں .... مسٹر ڈیلی نے مجھ سے کبھی نہیں کہا تھا کہ انہوں نے ڈاکٹر کو بلوایا ہے۔" اس نے دبی ہوئی آواز میں کہا۔

ڈاکٹر موریل نے سگریٹ جلا کر اس کا دھواں اڑاتے ہوئے پوچھا۔ "کیا یہ ممکن نہیں کہ کسی دوسرے شخص کو میری طبی امداد کی ضرورت ہوئی ہو ؟ اس مکان میں کیا کوئی اور بھی رہتا ہے ؟"

"ہاں مسٹر لاول تو رہتے ہیں۔ لیکن وہ باہر گئے ہوئے ....."

خانساماں کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی بڑے کمرے سے ایک آواز آئی۔ "کیا بات ہے مادکم ؟ وہاں کون ہے ؟ تم کس سے باتیں کر رہے ہو ؟"

وہ شخص کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے بال بھورے رنگ کے تھے۔ اور قد میانہ تھا۔ ایک ڈبل برسٹ کا بھاری کوٹ اس کے جسم پر تھا اس نے چیں بہ جبیں ہو کر ایک سوالیہ انداز سے خانساماں کی طرف دیکھا۔

"ڈاکٹر صاحب آئے ہیں۔" خانساماں نے ایک غیر یقینی اور مشکوک لہجے میں کہا۔

ڈاکٹر موریل تیزی سے مداخلت کرتے ہوئے بولے۔ "میرا خیال ہے کہ شاید مسٹر لاول نے مجھے بلایا تھا۔ یہ میری سیکریٹری مس فرلی ہیں انہوں نے ٹیلیفون پر پیغام سنا تھا۔" اتنا کہہ کر ڈاکٹر موریل دفعتاً مس فرلی کی طرف مخاطب ہوئے۔ اور نگاہوں سے ایک معنی خیز اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"تمہیں یاد ہے نا ؟ مسٹر لاول ہی جیسا کوئی نام تھا۔"

مس فرلی نے ڈاکٹر کے اشارے کو سمجھ کر مگر کسی قدر ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "ہاں ہاں مجھے یاد آیا۔ ٹیلی فون پر مسٹر لاول یا ناول،

جیسا کوئی نام میں نے سنا تھا۔ اور مکان کا پتہ بھی نوٹ کر لیا تھا۔"

مس فزیل نے اپنے مشکوک جذبات کو چھپانے کے لیے ایک ناکامیاب تبسم کے ساتھ دیکھا۔ خانساماں مارکم خاموش تھا۔ نووارد نے اپنی نگاہ مس فزیل اور مارکم کی طرف سے پھیر کر ڈاکٹر موریل کو دیکھا۔

"میری سمجھ میں یہ معاملہ نہیں آیا۔" نووارد نے کہا۔ "مسٹر لاول یہاں رہتے تو ہیں۔ وہ میرے چچازاد بھائی ہیں۔ مگر وہ ایک جگہ پہنچ گئے تھے۔ اور اب تک واپس نہیں آئے ہیں۔" پھر نووارد نے اپنی بات کی تصدیق کرنے کے لیے خانساماں کو مخاطب کیا۔ "مسٹر لاول اب تک واپس تو نہیں آئے ہیں، مارکم؟"

"نہیں جناب ابھی نہیں آئے۔" مارکم نے جواب دیا۔

"اس لیے میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی ڈاکٹر صاحب کہ انہوں نے آپ کو اس مکان میں آنے کے لیے کیوں ٹیلیفون کیا۔ نووارد نے نرمی اور اخلاق کے ساتھ کہا۔ بہرحال یہ چھوٹا سا معاملہ حل ہو جائے گا۔ ۔ ۔ ۔ اچھی بات ہے مارکم اب تم جا سکتے ہو۔"

"بہتر۔" یہ کہہ کر مارکم نے جانا چاہا۔ مگر اس کی نگاہ یکایک کھلی ہوئی کھڑکی پر پڑی، جس کا پردہ ہوا سے اڑ رہا تھا۔

"کیا اس کھڑکی کو بند کر دوں؟" مارکم نے پوچھا۔ "چونکہ میں نے گھنٹی کی آواز نہیں سنی تھی۔ اس لیے ڈاکٹر صاحب کھڑکی سے اس مکان میں آئے ہیں۔"

مارکم اور اس کے مالک نے ایک دوسرے کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔ ڈاکٹر موریل نے اس مسئلے پر مزید اظہارِ خیال کی ضرورت نہیں سمجھی۔

"ہاں مارکم کھڑکی بند کر دو اور جاؤ اور اگر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مسٹر لاول آ جائیں تو کہہ دینا۔ کہ ڈاکٹر کمرے میں بیٹھے ہیں۔"

مارکم نے کھڑکی بند کر دی اور ان لوگوں پر ایک نگاہ ڈالتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔ نووارد نے ڈاکٹر سے مخاطب ہوتے اور کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "مجھے حیرت ہے ڈاکٹر صاحب کہ اب تک مسٹر لاول نہیں آئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں آپ کو یہ بتانا بھول گیا۔ کہ میرا نام ڈیل ہے۔"

ڈاکٹر موریل نے اپنے سر کو ایک جنبش دی اور گھڑی پر ایک نگاہ ڈالی۔

"ہاں مجھے امید تھی۔ کہ مسٹر لاول اس وقت سے بہت پہلے واپس آ جائیں گے۔" مسٹر ڈیل نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "ممکن ہے کہ بارش یا کوئی اور سبب ان کے لیے رکاوٹ بن گیا ہو۔"

ایک لمحے کے لیے کمرے میں خاموشی طاری ہو گئی۔ مس فزیل نے محسوس کیا کہ اس ماحول میں ایک جذباتی تناؤ سا پیدا ہو رہا ہے اس نے ایک مضطرب نگاہ ڈاکٹر موریل کے چہرے پر ڈالی۔ وہ ایک تصویر کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ جو مسٹر ڈیل کے پیچھے دیوار پر آویزاں تھی۔ اس نے بولنے کی کوئی بات نہ پا کر موسم کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ اور کہا آج دن بھر بارش ہوتی رہی۔ موسم کی اس خرابی سے بہت پریشان کر دیا کیوں؟ لیکن کسی نے اس کی بات نہ سنی۔ یا سن کر جواب نہ دیا۔

یکایک ڈاکٹر موریل نے آگے کی طرف جھک کر سوال کیا۔ "کیا یہ مسٹر لاول کی تصویر ہے؟"

مسٹر ڈیل نے دیوار کی طرف نگاہ اٹھائی۔ اور اس سوال کا جواب اثبات میں دیا۔ "ہاں! لیکن آپ نے یہ کیوں کر معلوم کیا؟ آپ نے پہلے مسٹر لاول کو غالباً کبھی نہیں دیکھا ہے۔"

ڈاکٹر موریل نے اس کا جواب نہ دینا ہی بہتر سمجھا۔ مگر مس فزیل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "تم انہیں پہچانتی ہو مس فزیل! کیوں پہچانتی

ہو نام"

"ہاں مگر صرف اتنا فرق ہے کہ تصویر کے چہرے پر نشان نمایاں نہیں ہیں" مس فرلی نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے" ڈاکٹر نے کہا: "نشان دکھائی نہیں دیتا۔ کیوں مسٹر ڈیل؟"

"ایں: وہ نشان ——— ؟ نہیں وہ اس تصویر میں نہیں معلوم ہوتا" مسٹر ڈیل نے ایک بے کلی سی محسوس کرتے ہوئے جواب دیا۔ اس کی پیشانی پر شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ یکایک دروازہ کھلا اور خانساماں مارکم داخل ہوا۔

"کیا آپ نے گھنٹی بجائی ہے؟" اس نے پوچھا۔ اور مس فرلی نے دیکھا کہ مارکم کے چہرے پر خطرناک علامتیں موجود ہیں۔ خوف سے تھرتھراتے ہوئے اس نے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔ ڈاکٹر موریل ایک حقارت آمیز نگاہ سے مارکم کے چہرے کو گھور رہے تھے۔

انہوں نے کہا: "مجھے معلوم ہوتا ہے جب گھنٹی نہیں بجائی جاتی تو تمہاری سماعت زیادہ تیز ہو جاتی ہے اور جب بجائی جاتی ہے۔ تو تم نہیں سنتے!"

مارکم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور سوالیہ انداز میں مسٹر ڈیل کی طرف دیکھنے لگا۔ دفعتاً ڈاکٹر کی نظر میز کی طرف کھنچ گئی۔ جس پر لکھنے پڑھنے کا سامان رکھا ہوا تھا۔ وہ اس کے قریب گئے۔ اور ایک بھاری دوات کے پاس رکھے ہوئے تین چار لفافوں میں سے ایک لفافہ اٹھا لیا۔

"یہ ایک حیرت انگیز بات ہے" وہ غور کرنے لگے۔ یہ لفافہ اور اس کے ساتھ کے سب لفافے کسی کاغذ تراش چاقو کے ذریعے کھولے ہوئے ہیں۔ لیکن ......" پھر انہوں نے متلاشی نگاہوں سے پوری میز کا جائزہ لیا۔ "یہاں پر کوئی کاغذ تراش چاقو موجود نہیں ہے!"

مسٹر ڈیل اور مارکم دونوں خاموش تھے۔ ڈاکٹر موریل نے اپنا معائنہ جاری رکھا۔ وہ غور کر رہے تھے۔ "ان لفافوں کے کٹے ہوئے کناروں سے یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کاغذ تراش چاقو کافی تیز دھار رکھتا تھا"

"رکھو وہ اس لفافے کو میز پر" ڈیل نے پر زور آواز میں کہا: "آپ کو کیا حق ہے اسے دیکھنے کا۔ آپ کہتے ہیں کہ آپ میرے بھائی کے بلانے پر یہاں آئے ہیں۔ بس اب مجھے اتنا ہی کہنا کافی ہے۔ کہ وہ باہر گئے ہوئے ہیں۔ آپ کے لیے سب سے اچھا کام یہی ہے۔ کہ آپ فوراً یہاں سے جائیں مارکم ان لوگوں کو دروازے کا راستہ دکھاؤ"

"بہت اچھا جناب!" مارکم نے کہا۔

وہ قدم آگے بڑھانے ہی والا تھا۔ کہ یکایک دروازے کی گھنٹی بجنے کی تیز آواز سے کمرہ گونج اٹھا۔

"یہ کون؟" ڈیل نے کچھ کہنا چاہا

"ڈاکٹر موریل نے بات کاٹ کر کہا۔ "ممکن ہے مسٹر لاول واپس آ گئے ہوں۔ اور چابی ان کے پاس نہ ہو؟ پھر خانساماں سے مخاطب ہو کر طنزیہ لہجے میں بولے: "مجھے خوشی ہے کہ اب تمہاری سماعت بالکل درست ہو گئی ہے"

دروازے کی گھنٹی پھر بجنے لگی۔ ڈیل نے تحکمانہ انداز میں مارکم سے کہا، "جاؤ اور دیکھو کون گھنٹی بجا رہا ہے"

ایک لمحے کے اندر مارکم واپس آیا مگر تنہا نہیں۔ اس کے پیچھے ایک پولیس افسر اور دو سپاہی تھے اور ان کے ساتھ ساتھ ٹیکسی کا ڈرائیور بھی تھا

"ہم آ گئے جناب!" ڈرائیور نے ڈاکٹر موریل سے مخاطب ہو کر کہا: "آپ کی ہدایت کے مطابق میں نے بیس منٹ کا وقت دیا۔ اس کے بعد پولیس کو بلا لایا"

مس فرلی کی آنکھیں نو واردوں کی آمد پر حیرت کے باعث کھلی رہ گئیں۔ خانساماں اس طرح کھڑا تھا جیسے وہ کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا ہو۔ مسٹر ڈیل نے ایک مرتبہ کلہ درازی سے کام لینا چاہا اور دھمکی دیتے ہوئے۔ "یہ کیا بات ہے؟ آپ لوگوں کا کیا مطلب ہے؟"

پولیس سارجنٹ نے ڈاکٹر موریل کی طرف دیکھا۔ جو میز سے ٹیک لگائے کھڑے تھے۔ اور بے پروائی کے ساتھ اپنی چھڑی سے جوتے کی نا[illegible] کو ٹھونک رہے تھے۔ سارجنٹ کے سوال پر انہوں نے اپنی نگاہ اٹھائی اور یکایک آگے بڑھ کر اپنی چھڑی کے اوپری حصے کو خانساماں مالکم کے کوٹ پر ملا۔ اس کی اندرونی جیب میں دھات کی کوئی سخت چیز تھی۔ جس سے ایک آواز پیدا ہوئی۔

ڈاکٹر موریل نے پولیس سارجنٹ سے کہا، میرا خیال ہے۔ کہ اس کی جیب میں پستول ہے آپ اپنے کاموں کی ابتدا اس طرح کریں۔ کہ اس کی تلاشی لیں۔ اور اس سے پوچھیں کہ اس کے پاس آتشیں اسلحہ رکھنے کا لائسنس ہے یا نہیں؟"

خانساماں حیرت زدہ ہو کر کچھ بڑبڑانے لگا۔ اور مسٹر ڈیل کو ایسی نگاہ سے دیکھا۔ جیسے کوئی شکار پھنس جانے کے بعد گھبرا اٹھتا ہے۔ ڈیل اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ اور اس کا چہرہ زرد ہو گیا تھا۔

ڈاکٹر موریل نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے پولیس افسر سے کہا۔ "سارجنٹ، خانساماں کی تلاشی لینے کے بعد آپ مسٹر ڈیل سے پوچھیں کہ ان کے چچا زاد بھائی مسٹر لاول کے قتل کے متعلق کیا معلومات ہیں؟ ۔ مسٹر لاول کی لاش اس وقت میرے گھر پر طبی معائنے کے لیے موجود ہے۔"

"یہ شخص پاگل ہو گیا ہے!" ڈیل نے چیخ کر کہا۔ خوف زدگی اور غصے سے اس کے چہرے کے عضلات سکڑ گئے تھے۔ "میں کہتا ہوں، یقیناً یہ پاگل ہے..... بالکل پاگل!"

مس ڈریل حیرت سے ان واقعات کو دیکھ رہی تھی۔ کانسٹیبل نے مالکم کی جیب سے پستول نکال کر اپنی جیب میں رکھ لیا۔ اور خود کسی[illegible] چوکنا ہو کر کھڑا ہو گیا۔

"میں سچ کہتا ہوں کہ میرے بھائی اب تک واپس نہیں آئے ہیں۔" ڈیل نے بلند آواز سے کہا۔ "وہ دن کا کھانا کھانے کے لیے ایک [illegible] میں گئے تھے۔ اور....."

"اور رات کا لباس پہن کر گئے تھے۔ کیوں؟" ڈاکٹر موریل نے طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ "ان کی لاش جب ٹیکسی میں پائی گئی تو ان کے جسم پر رات کا لباس تھا۔ وہ کپڑے دن کو کبھی نہیں پہنے جاتے...... اس لیے تم نے اور تمہارے خانساماں نے کہا کہ وہ لنچ پر گئے ہیں اور واپس نہیں آئے ہیں تو مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ تم لوگ جھوٹ بول رہے ہو...... اگر ہم اس امکان کو تسلیم کر لیں کہ وہ گھر واپس آ کر کپڑے بدل کر پھر نکل گئے اور تم میں سے کسی کو اس کی خبر نہ ہوئی...... تو یہ کسی طرح ممکن نہ تھا۔ کہ وہ اپنے پیروں سے چل کر اس بارش میں جائے اور ان کے جوتے پانی اور کیچڑ سے آلودہ نہ ہوتے۔" ڈاکٹر موریل ایک ڈرامائی انداز سے ٹھہر گئے۔ اس خاموشی میں ایک برقی اثر موجود تھا۔ پھر اپنے الفاظ پر زور دیتے ہوئے۔ "جس وقت مسٹر لاول کی لاش ٹیکسی میں ملی ہے۔ ان کے جوتوں کے تلے بالکل سوکھے ہوئے تھے۔ اس لیے ہم بہت آسانی سے اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں۔ کہ وہ خود اپنے پیروں سے چل کر مکان سے باہر نہیں گئے۔ بلکہ انہیں اٹھا کر یا ڈھو کر لے جایا گیا۔ ایسی حالت میں یہ ناممکن تھا۔ کہ تم لوگوں کو اس کا علم نہ ہوتا۔"

اس موقعہ پر ڈیل نے دفعتاً بھاگ کر دروازے سے نکلنا چاہا۔ کانسٹیبل نے دروازہ روک لیا۔ اور ڈیل کے چہرے پر ایک تھپڑ مار کر اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیں۔ سارجنٹ کے اشارے سے دوسرے کانسٹیبل نے مالکم کو بھی گرفتار کر لیا۔ اور ہتھکڑیاں پہنا دیں۔ مس ڈریل نے ایک ٹھنڈا سانس لیا۔ اور ڈاکٹر موریل نے ٹیکسی ڈرائیور کو مخاطب کر کے کہا۔ "اب ایک اور ٹیکسی لے آؤ۔ یہاں سے ہم لوگ گھر پر چلیں گے۔ جہاں مسٹر لاول کی لاش رکھی ہوئی ہے۔ میرا کام ختم ہو چکا" اور پولیس سارجنٹ سے مخاطب ہو کر "اب آپ اپنا کام شروع کریں۔"

بارش بند ہو چکی تھی۔ چند منٹ میں دوسری ٹیکسی بھی آ گئی۔ اور سب لوگ ڈاکٹر موریل کے مکان کی طرف روانہ ہو گئے۔

آنند نرائن مُلّا — شاعر، بمبئی۔

پستیٔ حوصلۂ عام سے آگے نہ بڑھی
جو نظر حسنِ سرِ بام سے آگے نہ بڑھی

آ گیا پاس تو ساقی کے بفیضِ مے و جام
گفتگو ذکرِ مے و جام سے آگے نہ بڑھی

زیست کے جبر سے کتنے ہی دلوں کی روداد
اشک آلودہ سی اک شام سے آگے نہ بڑھی

یہی کندہ ہے ہر اک تربتِ ناکامی پر
آرزو ولولۂ خام سے آگے نہ بڑھی

زیست دیتی ہی رہی شوق کے عنوان نئے
داستاں کوئی ترے نام سے آگے نہ بڑھی

نئی تنظیمِ چمن غم کا مداوا نہ ہوئی
یہ بھی رسمِ قفس و دام سے آگے نہ بڑھی

اس کو کیا کہہ کے بتاؤں تجھے میرے ہمدم
اِک خلش جو غمِ بے نام سے آگے نہ بڑھی

کرنے بیٹھا تھا ترے جور کا شکوہ او بات
فتنہ انگیزیٔ ایام سے آگے نہ بڑھی

میں نے چاہا تھا بھلا دوں تجھے اے دوست مگر
یہ خطا وہ تھی جو اقدام سے آگے نہ بڑھی

کسی مقصد کی حرارت نہیں شامل تو حیات
مستیٔ رقصِ سُبک گام سے آگے نہ بڑھی

چشمِ آوارۂ مُلّا کی اُڑی تھی تو خبر!
شکر ہے حلقۂ اصنام سے آگے نہ بڑھی!

ماہر القادری — فاران، کراچی

اعجاز صدیقی — شاعر، بمبئی

ترے نام سے جس کو نسبت نہ ہوگی
وہ افسانہ ہوگا حقیقت نہ ہوگی[1]
خزاں کے تصور میں اس طرح گم ہوں
بہار آئے گی مجھ کو وحشت نہ ہوگی
یہ روزِ ازل فیصلہ ہو چکا ہے
خوشی منّتِ کارِ محبت نہ ہوگی
خزاں ہے غنیمت بہار آنہ جائے
نشیمن بنانے کی فرصت نہ ہوگی
بہت شوخ ہیں میری مشتاق نظریں
خطائیں کروں گا ندامت نہ ہوگی
خدا جانے کب تک مرے ناصحوں کو
خدا کی طرف سے ہدایت نہ ہوگی
سلامت رہے میری بزمِ تصور!
وہ آئیں گے اور انکو زحمت نہ ہوگی
بہت کچھ ہے اُن کے ستم کا سہارا
کرم کی بھی شاید ضرورت نہ ہوگی

---

[1] یا — مسرت شریکِ محبت نہ ہوگی

یہ دنیا خالی تو نہیں انسانوں سے
ملتے رہیے اپنوں سے بیگانوں سے
کس کو غرض ہے کون حقائق تک پہنچے
کام تو چل ہی جاتے ہیں افسانوں سے
یہ بھی نکلی جادوں ہی کا ایک سراب
منزل تک آئے تھے کن ارمانوں سے
جاگ گیا ہے شاید ظرفِ بادہ کشاں!
شور یہ اُٹھا ہے کیسا میخانوں سے؟
پاؤں نہیں ہیں ابتک کانٹوں سے فارغ
ہاتھ ابھی تک اُلجھے ہیں دامانوں سے
شمع کو تم سے ربط ہے اپنی تابش تک
کون کہے یہ محفل میں پروانوں سے!
اندر اندر کھول رہی ہے آتشِ گل!
شعلے اور بھی اٹھیں گے گل خانوں سے
قاتل ہیں ایک ایسی زباں کے درپئے قتل
جس نے رشتہ جوڑ دیا انسانوں سے
کچھ ہاتھوں میں پتھر ہیں بیتاب اعجازؔ
جھانک رہی ہیں کچھ آنکھیں ایوانوں سے

مشفق خواجہ — **افکار۔ کراچی**

نقش گذرے ہوئے لمحوں کے ہیں دل پر کیا کیا
مُڑ کے دیکھوں تو نظر آتے ہیں منظر کیا کیا

وقت کٹتا رہا مے خانے کی راتوں کی طرح!
رہے گردش میں یہ دن رات کے ساغر کیا کیا

کتنے چہروں پہ رہے عکس مری حیرت کے
مہرباں مجھ پہ ہوئے آئنہ پیکر کیا کیا

چشمِ خوباں کے اشاروں پہ تھا جینا مرنا!
رُوز بنتے تھے بگڑتے تھے مقدر کیا کیا

پاؤں اُٹھتے تھے اُسی منزلِ وحشت کی طرف
راہ تکتے تھے جہاں راہ کے پتھر کیا کیا

رہ گذر دل کی نہ پل بھر کو بھی سنسان ہوئی
قافلے غم کے گذرتے رہے اکثر کیا کیا

آذرانہ تھے مری وحشتِ دل کے سب رنگ
شام سے صبح تلک ڈھلتے تھے پیکر کیا کیا

اور اب حال ہے یہ خود سے جو ملتا ہوں کبھی!
کھول دیتا ہوں شکایات کے دفتر کیا کیا

احمد ہمدانی — **نیا دور۔ کراچی**

دشت میں دل کو کب آرام ملے تھے ایسے
ہم کدھر آج نکل آئے یہ چلتے چلتے

تجھ سے چھٹنے کا بھی غم ہے مجھے یہ بھی غم ہے
کتنے خوش ہیں ترے چھُٹ جانے سے دنیا والے

لوگ کہتے ہیں ہوئیں چاہتیں ویراں شاید!
سر جھکائے ہوئے کوچہ سے ترے ہم گذرے

صُورتیں رُوز محبت نے تو بدلیں لیکن
بات اُن کو نہ سمجھنی تھی نہ اب تک سمجھے!

اپنے گھر میں بھی کبھی ہو نہ سکے جو آباد
خاک اڑاتے ہوئے وہ آج ترے گھر پہنچے

میٹھی باتوں کی رہی دل میں نہ حسرت کوئی
اکھڑی باتوں میں بھی چاہت کے وہ پہلو دیکھے

نقش کراچی

اطہر نفیس

دم بدم بڑھ رہی ہے یہ کیسی صدا شہر والو سنو
جیسے آئے دبے پاؤں سیلِ بلا شہر والو سنو

خاک اُڑاتی نہ تھی اس طرح تو ہوا، اسکو کیا ہوگیا
دیکھو آواز دیتا ہے اک سانحہ شہر والو سنو

یہ جو راتوں میں پھرتا ہے تنہا بہت ہی اکیلا بہت
ہو سکے تو کبھی اس کا بھی ماجرا شہر والو سنو!

یہ ہیں میں سے ہی اسکے رنج و اَلم اس سے پوچھو کبھی
ہاں سنو! اسکی رُودادِ مہر و وفا شہر والو سنو!

عمر بھر کا سفر جس کا حاصل ہے اک لمحۂ مختصر
کس نے کیا کھو دیا۔ کسنے کیا پا لیا شہر والو سنو!

اس کے جی میں ہے کیا اس سے پوچھو ذرا دیکھیں کہتا ہے کیا
کب لئے اس شخص پر کوہِ غم ڈھا دیا شہر والو سنو!

اسکی بے خواب آنکھوں میں جھانکو کبھی اسکو سمجھو کبھی
اس کو بیدار رکھتا ہے کیا واقعہ شہر والو سنو!

ہماری زبان۔ علیگڈھ

شہریار

بے سبب رات بھر جاگنا چھوڑ دو
اہلِ دل اب یہ رسمِ وفا چھوڑ دو

وقت کے سیل کو رُوکنا چھوڑ دو
دوستو آگ سے کھیلنا چھوڑ دو

وہ بھی انسان ہے وہ بھی مجبُور ہے
اس کی بے مہریوں کا گِلا چھوڑ دو

تم خدا ہو، خدائی کرو، دھر پہ
بُت بنانے کا یہ مشغلہ چھوڑ دو

یہ زمیں بھی تو جنّت سے کچھ کم نہیں
ہاں مگر آسمان دیکھنا چھوڑ دو

پیاس مکروہ ہونے لگی ہے مری
اے سرابو مرا راستا چھوڑ دو

افکار۔ کرا

سردار جعفری

بہت قریب ہو تم!

بہت قریب ہو تم، پھر بھی مجھ سے کتنی دُور!
کہ دل کہیں ہے، نظر ہے کہیں، کہیں تم ہو
وہ جس کو پی نہ سکی میری شعلہ آشامی
وہ کوزۂ شکر و جامِ انگبیں تم ہو!
مرے مزاج میں آشفتگی صبا کی ہے
مِلی کلی کی ادا، گل کی تمکنت تم کو،
صبا کی گود میں پھر بھی صبا سے بیگانہ
تمام حُسن و حقیقت، تمام افسانہ
وفا بھی جس پہ ہے نازاں وہ بے وفا تم ہو
جو کھو گئی ہے مرے دل کی وہ صدا تم ہو
بہت قریب ہو تم، پھر بھی مجھ سے کتنی دور
حجابِ جسم ابھی ہے، حجابِ روح ابھی
ابھی تو منزلِ صد مہر و ماہ باقی ہے
حجابِ فاصلہ ہائے نگاہ باقی ہے
وصالِ یار ابھی تک ہے آرزو کا فریب

اقبال

حریمِ شعر میں جو شمع حالی نے جلائی تھی
اُسے اک روزِ مشرق کا اُجالا کر دیا تو نے
پیامِ "آدمیت احترامِ آدمی"[1] دے کر
ادب میں آدمی کا بول بالا کر دیا تو نے
ترے افکار پہ ایمان لائیں یا نہ لائیں ہم
ترے افکار کی عظمت سے منکر ہو نہیں سکتے
جو دولت فکر کی اذہان کو تو نے عطا کی ہے
نئے اذہان اس دولت سے منکر ہو نہیں سکتے
قمر سے مشتری تک مشتری سے آنسوئے گردوں
کیا اس گرمجوشی سے ستاروں کا سفر تو نے
کہ اپنی فکر سے اس خاک کی تقدیر چمکا دی
کیا ذرّوں کو نورِ آگہی سے باخبر تو نے
ملاقاتیں وہ تیری بحتری سے اور شوقی[2] سے
ترے نغمے سے کھلتا ہے کہ اوجِ زندگی کیا ہے
اگر ہوتا مصنف "کامیڈی" کا اِس زمانے میں
تو اس کو تو یہ سمجھاتا مقامِ آدمی کیا ہے[3]

---

[1] "آدمیت احترامِ آدمی
باخبر شو از مقامِ آدمی" (جاوید نامہ)

[2] [3] اس بند میں دو ایک امور وضاحت طلب ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ دوسرے شعر کا تاثر اقبال کے اس شعر سے پیدا ہوا ہے ۔

ترے افکارِ عالی میں ہے غلطاں دردِ انسانی
ترے نغمات میں اہلِ جہاں کا دل دھڑکتا ہے
تجھے جو ہند سے بیگانہ سمجھیں اُن سے کیا کہیے
کہ تیرے شعر میں ہندوستاں کا دل دھڑکتا ہے
جگایا اس طرح تیری نوا نے ارضِ مشرق کو،
کہ مشرق کا ہر اک اہلِ نوا ممنون ہے تیرا
غلط ہے یہ کہ تو ہے محض ہند و پاک کا محسن
یہ ہند و پاک کیا کل ایشیا ممنون ہے تیرا
ترے افکار کی دنیا کا میں بھی اِک مسافر ہوں
ترے اسرار سے پہنچا ہوں تیری "ارمغاں" تک میں
جو کوئی اس سفر کی داستاں پوچھے تو بتلا دوں
کہ چل کر جاند سے آیا ہوں پھر خاوراں تک میں
ترے افکار کیا ہیں اک نظامِ شمس ہے گویا
سبک فکرِ بشر کے جس کی تابانی سے روشن ہیں
تفکر کی، سخن کی، جذبِ دل کی، سوزِ پنہاں کی!
یہ سب دنیا میں تیرے شعرِ نورانی سے روشن ہیں

اقبال نے یہ شعر نطشے کے بارے میں کہا ہے۔ میں نے اپنے شعر میں دانتے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس کی وضاحت سے قبل ایک اہم بات کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے وہ یہ کہ "جاوید نامہ" میں اقبال رومی کی رہنمائی میں جب فلکِ قمر تک پہنچتے ہیں۔ تو ان کی ملاقات ایک "عارفِ ہندی" سے ہوتی ہے۔ اقبال نے اس "عارفِ ہندی" کے متعلق عنوان میں یہ لکھا ہے کہ "اہلِ ہند اورا جہاں دوست می گویند" مترجمین اور شارحینِ کلامِ اقبال نے جہاں دوست کا بالکل سامنے کا ترجمہ کر کے اس کے معنی "وشوامتر" لکھ دیئے ہیں۔ حالانکہ اس عنوان کے تحت اقبال کا شعر ؎

موی بر سر بستہ و عریاں بدن　　　گرد او مارِ سفیدے حلقہ زن

اور پھر ملاقات کا فلکِ قمر میں ہونا، اس بات کی بہت بڑی دلیلیں ہیں۔ کہ جہاں دوست سے مراد وشوامتر نہیں بلکہ شیوجی مہاراج ہیں۔

خیر، میں کہنا یہ چاہتا ہوں۔ کہ "ڈیوائن کامیڈی" کے مصنف کی عالمِ سیارگان میں عظیم عیسائی شخصیتوں سے اور اقبال کی عظیم غیر مسلم شخصیتوں سے ملاقاتوں میں ایک فرق نظر آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ڈیوائن کامیڈی کے مصنف نے اکثر و بیشتر غیر عیسائیوں کا ذکر توہین آمیز طریقے سے کیا ہے اور جو شخصیت جتنی بڑی نظر آتی ہے اس کا ذکر اتنی ہی نفرت اور حقارت سے کیا ہے اس کے خلاف اقبال نے غیر مسلم اکابر کے ذکر میں اپنی عقیدت اور محبت کے وہ پھول نچھاور کیے ہیں۔ جن کی خوشبو سے عالمِ انسانیت ہمیشہ مہکتا رہے گا۔ ان اکابر میں شیوجی مہاراج اور مہاراجہ بھرتری ہری کے نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

مظہر امام — سیپ کراچی۔

کنگال آدرش

اپنے آدرش کی مفلسی مجھ پہ کیوں تھوپنا چاہتی ہو؟

یہ محبت

جہاں پھول کھلتے نہیں

جہاں چاندنی اپنا جلوہ دکھاتی نہیں

یہ محبت جو چولہے سے بستر کی بھدّی شکن تک ہی محدود ہے

یہ محبت نہیں اجبر ہے

خود غرض، مادرانہ محبت ہے

کسی شام احباب کے ساتھ دریا کنارے نہ جاؤں

کسی شب مئے ناب سے زندگی کو حرارت نہ بخشوں

کسی سہ پہر کو کسی سادہ رو سے نہ اک بار بھی مسکرا کر کہوں

"آج تم اس نئے پیرہن میں بہت خوبصورت نظر آ رہی ہو!"

زبیر رضوی — نیا دور کراچی

پاسِ وفا

مرے محبوب کب تک اعتبارِ وعدۂ فردا
میں اپنی خلوتوں میں گوش بر آواز ہوں کب سے
نہ جانے کب تری آواز کے گھنگرو چھنک اٹھیں
نہ جانے کب تو زنجیرِ درِ دل آ کے کھٹکائے

بہت دن بعد میں شہرِ طرب کی سمت آیا ہوں
ہر اک سے خوش ہے مجھ کو پھر سے اپنے درمیاں پا کر
مرے احباب کو دکھ تھا مری گوشہ نشینی کا!
مجھے سب دیکھ کر مسرور ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں
غمِ دل سے اجازت مل گئی اس سمت آنے کی

چلو گھومیں پھریں، شادابیِ حسن جہاں دیکھیں
کہیں بیٹھیں، پئیں، شعر و ادب کی زلف سلجھائیں
بہت دن بعد دیکھا ہے طلوعِ جام کا منظر
بہت دن بعد آنکھیں نشۂ صہبا میں ڈوبی ہیں
کوئی مئے خوار پیمانہ بکف مجھ سے یہ کہتا ہے
تم اپنی خلوتوں کو کیوں اکیلا چھوڑ آئے ہو
صدائے آشنا دہلیز پہ دستک نہ دیتی ہو
حدودِ شوق میں دیوانگی تنہا نہ بیٹھی ہو

واہی

پونم حیدرآباد دکن

اسمِ اعظم

جو لوگ ہیں مخالفِ رسمِ مشاعرہ
اُن سے ہے میری عرض سُنیں ایک واقعہ

ہوگی مشاعرہ کی عیاں جب افادیت
ہرگز کریں گے پھر نہ وہ اس کی مخالفت

اک میرے دوست جنکو ہے سودائے شاعری
ہے جن کے دم سے شہر میں غوغائے شاعری

رہتے ہیں رات دن جو فدائے مشاعرہ
بس وہ ہیں اور مدح و ثنائے مشاعرہ

اک بار سخت طور سے بیمار جب پڑے
بہرِ علاج آئے معالج بڑے بڑے

ممکن تھا جو علاج وہ فوراً کیا گیا
حد تو یہ ہے کہ آکسیجن بھی دیا گیا

لیکن مرض نے طول وہ کھینچا کہ الاماں
منکا ڈھلا غریب کا ہونٹوں پہ آئی جاں

بس اب وداعِ روح کا ہنگام تھا قریب
پڑھنے لگا تھا سورۂ یاسین ہر طبیب

اتنے میں ایک نبض شناس و محل شناس
آیا قریبِ شاعرِ بیمار و گم حواس

اور جھک کے اس نے کان میں چپکے سے کچھ کہا
بس دیکھتے ہی دیکھتے نقشہ بدل گیا!

نبضِ مریض چلنے لگی اعتدال سے،
جھلکی حیات جسم کے ہر خد و خال سے

انگڑائی لی جناب نے اور آنکھ کھول دی
جیسے کہ کچھ ہوا ہی نہ تھا آپ کو کبھی!

حیرت سی تھی حاضرین کو اس انقلاب پر،
تھی عقل گم، معالجہ کامیاب پر

کچھ لوگ یہ سمجھنے لگے معجزا ہوا!
اور کچھ تو یہ سمجھ ہی نہ پائے کہ کیا ہوا

کچھ دیر بعد میرا تحیّر ہوا جو کم،
اس صاحبِ کمال سے پوچھا کہ محترم!

فرمائیے وہ اسمِ حیات آفریں ہے کیا
جس سے ہمارا شاعرِ بیمار جی اُٹھا

واللہ اس نے موت کو دی ہے شکستِ فاش
ورنہ یہ وقت وہ تھا کہ اُٹھتی یہاں سے لاش

اس مردِ خوش مذاق نے ہنس کر دیا جواب
ترکیب میرے ذہن کو سوجھی یہ لاجواب

شاعر کے کان میں یہی جھک کر کہا فقط
حضرت! مشاعرہ کا ہے آیا کہیں سے خط

"فی الفور بزمِ شعر میں جانا ہے آپ کو
اُٹھیے بھی اب کلام سُنانا ہے آپ کو"

اکیڈمی لائبریری سیریز کی

نئی کتابیں!

مسدس :۔ حالی افقِ مشرق کے ادبی آفتاب کی ایسی کرن تھے جس نے اُردو نظم و نثر دونوں کو جگمگا دیا۔ ڈاکٹر بجنوری "دیوانِ غالب" کو "وید" کے بعد ہندوستان کی دوسری الہامی کتاب کہتے ہیں لیکن غالب کے اس شاگرد رشید نے مسدس لکھ کر بتا دیا کہ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔ "مسدس کا صدی ایڈیشن صحت کے التزام کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ قیمت دو روپیہ پچیس پیسے۔

ترکی حور :۔ اُردو تمثیل نگاری کا نقشِ اول امانت کی اندر سبھا ہو یا کوئی اور کتاب لیکن اب تو آغا حشر کا نام اُردو ڈرامہ سے منسلک ہو کر رہ گیا ہے اور اُنکے ڈرامے آج بھی اتنے ہی مقبول ہیں جتنے اپنے عروجی دور میں ہوں گے۔ "ترکی حور" آغا حشر کا ایک کامیاب ڈرامہ ہے جو افادہ عام کے خیال سے سستے ایڈیشن میں شائع کیا گیا ہے۔ قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے۔

مختصر تاریخ اُردو ادب :۔ اُردو ادب کی تاریخ ہندوستان کی تمدنی اور انقلابی تاریخ کے ساتھ چلتی ہے جس پر ملک کے اکثر اہلِ قلم نے قلم اٹھایا ہے۔ اور اُردو ادب میں کئی مکمل اور جامع تاریخیں موجود ہیں۔ لیکن ڈاکٹر اعجاز حسین نے جس اختصار کے ساتھ یہ تاریخ مرتب کی ہے وہ اپنی افادیت کے لحاظ سے طلبا اور اہلِ ذوق دونوں کے لیے یکساں طور پر اہم ہے۔ اور اسی لیے اساتذہ کرام اس کے مطالعہ کی سفارش کرتے ہیں چند سو صفحات میں سموئی ہوئی زبانِ اُردو کی سرگذشت میں تقسیم کے بعد کا دور بھی شامل کر دیا گیا ہے اور حال و ماضی کا یہ آئینہ ضروری صحت کے بعد بار دیگر پیش کیا جا رہا ہے۔ قیمت صرف پانچ روپیہ۔

سحر البیان :۔ مثنوی نے جس طرح عالمی ادب میں اُردو کو ایک امتیاز بخشا ہے اسی طرح اُردو مثنوی کے تصوّر کے ساتھ میر حسن کا نام زبان پر آجاتا ہے۔ بلاشبہ "سحر البیان" زبان و بیان کا ایک معجزہ ہے اور سلاست و صفائی کے لحاظ سے اُردو کی کوئی مثنوی اس کے پایہ کو نہیں پہنچتی۔" میر انیس کے دادا کا یہ ادب پارہ سستے ایڈیشن میں شائع کیا گیا ہے۔ قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے۔

آپ نے ووٹ کسی کو بھی دیا ہو۔ مگر انتخابی سیاسیات کا جاننا اس سے بھی زیادہ ضرور

امریکی انتخابات، ایک سیاسی جائزہ :۔ ایک معلومات آفرین کتاب ہے امریکہ اور پاکستان کے نظام مدن اور اصولِ انتخاب کی مماثلت نے کتاب کی اہمیت کو بہت بڑھا دیا ہے۔ اس کتاب میں تمام ضروری معلومات، مثلاً ووٹر کے حقوق، امیدوار انتخاب کیسے ہوں نامزدگیاں، سیاسی اداروں کی کش مکش، امیدوار صدارت، صدارتی انتخاب کی مہم اور صدارتی انتخاب کیسے کیا جاتا ہے؟ سب درج ہے۔ کراچی یونیورسٹی کے تین اُستادوں نے اُردو میں منتقل کیا۔ اکیڈمی لائبریری اُردو میں اس موضوع پر پہلی کتاب پیش کر رہی ہے۔ قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے۔

اپنے علاقے کے بک اسٹال سے خرید لیے یا براہ راست منگائیے

اُردو اکیڈمی سندھ

کراچی ــــ لاہور ــــ حیدرآباد

ایس۔ایم۔شاہ نواز

نیا دَور۔لکھنؤ

مثلّث

مراد آباد
۱۲ر جنوری ۱۹۶۴ء

محترم انجان صاحب، تسلیم۔

آپ یہ خط پاکر ضرور حیران ہوں گے، مگر میں آپ کے بلند اخلاق انسان دوستی اور دردمندی سے متاثر ہوکر یہ خط لکھنے پر مجبور ہوگئی ہوں۔ آپ نے میرے چھوٹے بھائی کو اپنے ہفتہ وار اخبار صہبا میں جگہ دے کر ہم دونوں پر بڑا احسان کیا ہے۔ شکریے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ آپ کی اس عنایت کو میں تاحیات نہیں بھلا سکوں گی۔

آپ کو شاکر نے بتایا ہوگا۔ کہ ہم دونوں نے ہوش سنبھالتے ہی بڑے دُکھ جھیلے ہیں۔ کم سن تھے۔ کہ والدین ہمیشہ کے لیے جُدا ہوگئے۔ یہ کتنا بڑا المیہ تھا۔ ہمارے ساتھ! بالکل تن تنہا۔ ماموں نے ہماری پرورش کی۔ حالانکہ اُن کی مالی حالت اچھی نہ تھی۔ پھر بھی انھوں نے ہیں، تھوڑی بہت تعلیم دلائی۔ لیکن اب اُن کے حالات اِس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ آئندہ وہ ہماری مالی امداد کرسکیں۔

یہ آپ کی ہمدردی اور اعلیٰ ظرفی کا ثبوت ہے کہ کوئی تعلیمی ڈگری نہ ہوتے ہوئے بھی شاکر کو اپنے ادارہ میں رکھ لیا۔ آپ کا ہر فعل ہر بات آپ کی عظیم شخصیت کا احساس دلاتی ہے۔ شاکر ہر خط میں آپ کی تعریف کرتا ہے۔ اُس نے مجھے لکھا تھا کہ جب وہ پہلی بار آپ کے پاس آیا تو آپ ہمارے حالات سن کر غمگین ہوگئے۔ آپ نے مجھ سے ہمدردی ظاہر کی اور دوسرے امیدواروں کو نظر انداز کرکے شاکر کو ملازم رکھ لیا اور اسے کچھ پیشگی رقم بھی دی۔ آپ کی کن کن باتوں کو دُہراؤں۔ یقین جانیے، میرے دل میں آپ کے لیے بڑی عقیدت ہے۔ کاش! میں اپنا دل دکھا سکتی۔

ہر لمحہ آپ کے متعلق سوچا کرتی ہوں۔ کہ آپ کیسے ہوں گے۔ جب آپ کا کردار اس قدر بلند ہے تو آپ کی شخصیت کتنی پُرکشش ہوگی؟ مگر میں خیالات کی رو میں بہت دور نکل جاتی ہوں۔ یہ بھی بھول جاتی ہوں کہ میری حیثیت کیا ہے۔ آپ کا اور ہمارا کیا جوڑ! آپ کے دل میں دوسروں کے لیے درد ہے، مجبور اور بے کسوں سے آپ کو پیار ہے۔ صرف ہم لوگوں سے ہی ہمدردی تھوڑی ہوگی۔ یہ تو آپ کی عادت میں شامل ہے ہر ایک آپ کی طرح دیوتا کیسے ہوسکتا ہے۔

کیسے کیسے خیالات میرے ذہن میں ہلچل مچا رہے ہیں۔ میں آپ کو کیا خرافات لکھنے بیٹھ گئی۔ یہ مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے ۔۔۔۔ اُف میرے خدا ۔۔۔؟

آپ سے میری ایک درخواست ہے کہ آپ شاکر کو کہیں اور ملازمت دلا دیجیے۔ تاکہ وہ ہر خط میں آپ کے متعلق نہ لکھا کرے آپ نے ہم لوگوں پر بڑا کرم کیا ہے۔ ایک یہ بھی احسان کر دیجیے۔

مجھے اُمید ہے آپ مجھ دکھیاری پر رحم کھا کر یہ کام جلد از جلد کر دیں گے۔ ورنہ یہ دھیمی دھیمی آگ مجھے خاک کر ڈالے گی۔ آپ بہت عظیم ہیں۔ میں تو آپ کے پیروں کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتی۔

اچھا رخصت　　　　　　　　　　　　بدنصیب　زاہدہ

نئی دہلی

۱۴ر جنوری ۱۹۶۴ء

زاہدہ ۔ خلوص!

ابھی تمہارا جذباتی اور پریشان کن خط ملا۔ کئی کئی بار پڑھا۔ میں نے کیا کیا ہے تم لوگوں کے ساتھ؛ اور جو کچھ کیا وہ تم لوگوں پر کوئی احسان نہیں۔ یہ تو میرا فرض تھا۔ للہ تم لوگ لفظ' احسان' دہرا دہرا کر میرا مذاق نہ اڑاؤ۔ سب انسان اس سماج کا حصہ ہیں۔ اگر ہم ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک نہ ہوئے۔ تو یہ زندگی کس کام کی؟ ہم زندہ کیسے رہ سکیں گے۔ ذرا سوچو! میں نے کوئی نئی بات نہیں کی۔ پھر اس تشکر آمیز لہجے کی ضرورت کیا ہے؟ ـــ میں ایسا ذلیل انسان نہیں ہوں کہ کسی کے ساتھ کچھ کر کے لوگوں پر ظاہر کرتا پھروں یا اپنی بڑائی اور انسانیت پرستی کے راگ الاپوں۔

تم نے خود کو بدنصیب لکھ کر مجھے میرے دل کو سخت اذیت پہنچائی ہے۔ مجھے بڑا صدمہ پہنچا اس بات سے۔ اور تم نے یہ کیا لکھا ہے کہ شاکر کو کسی دوسری جگہ ملازمت دلا دوں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں کتنی بار کہوں کہ میں نے تم لوگوں کے لیے ابھی کیا ہی کیا ہے۔ اس قسم کی باتیں لکھ کر مجھے میرے فرض سے دور نہ لے جاؤ۔ میں عظیم کدھر سے ہو گیا؟ میں تو ایک حقیر انسان ہوں۔ تم مجھے اتنا بڑا اعزاز کیوں دے رہی ہو؟ دراصل تم لوگوں نے اتنی مصیبتیں برداشت کی ہیں کہ تم احساس کمتری کا شکار ہو گئی ہو۔ تمہارا ذہنی توازن ٹھیک نہیں رہا۔ اور تم کسی بات کا فیصلہ کرتے ہوئے ڈرتی ہو۔ میرا اور تم لوگوں کا جوڑ کیوں نہیں؟ مجھ میں ایسی کیا خصوصیت ہے جو تم میں نہیں؟ میں سمجھتا ہوں تم خوب سیرت بھی ہو اور خوب ۔۔۔۔۔۔ میں سوچ نہیں سکتا تھا کہ ایک پردہ نشیں خاتون کے اتنے بلند خیالات ہو سکتے ہیں! کل غلطی سے شاکر میری میز پر اپنا پرس بھول گیا۔ میں نے گستاخی یہ کی کہ اُسے اٹھا کر دیکھ لیا۔ اُس میں ایک حسین اور پر وقار لڑکی کی تصویر تھی۔ میں چونک پڑا۔ سوچا شاکر کی کسی دوست لڑکی کا فوٹو ہوگا۔ لیکن اُس کی پشت پر لکھا تھا۔

" تمہاری پیاری باجی زاہدہ "

میں نے اُسی وقت سے کچھ فیصلے کر لیے ہیں۔ اب تمہارا خط پا کر مجھ میں جرأت ہوئی ہے کہ تمھیں بھی اپنے دل کے حال سے آگاہ کر دوں شاکر تمہارا بھائی ہے۔ میں اُسے دور رکھنے کی بات سوچ بھی نہیں سکتا۔ اُسے دور رکھنے کا مطلب ہے کہ تم سے دور ہو جاؤں اور اب یہ ناممکن ہے ـــ ناممکن!

خط کا جواب جلد دینا، تمہارے خط کے انتظار میں ایک ایک لمحہ میرے لیے قیامت سے کم نہیں ۔　　　　تمہارا "انجان"

مرادآباد

۸ مارچ ۱۹۶۴ء

انجان صاحب!

آپ کا کرم نامہ بہت دن ہوئے مل گیا تھا۔ میں کچھ سوچ بھی نہیں پائی تھی۔ کہ آپ کو کیا جواب دوں کہ بیمار پڑ گئی۔ تنہائی اور بیماری، بیماری طویل ہوتی گئی۔ اور ساتھ ہی ساتھ ذہنی کشمکش بھی بڑھتی چلی گئی۔ ڈاکٹر کو تشویش تھی۔ کہ بظاہر کوئی وجہ نہیں، پھر یہ بیماری طویل کیوں ہوتی جا رہی ہے۔ مگر میں جانتی تھی اس کی وجہ ـــــ آپ کا کردار، آپ کی شخصیت، آپ کا فیصلہ، آپ کا خط رہ رہ کر مجھے بے چین کیے دے رہا تھا۔ کبھی دل ہی دل میں خوش ہوتی اور کبھی خود بخود اداس ہو جاتی۔ کبھی آپ کی تحریر پر یقین نہیں آتا تھا۔ کہ کیا واقعی میری ہستی بھی اس دنیا میں کوئی حیثیت رکھتی ہے اور کوئی میرا اتنا خیال کر سکتا ہے۔ مجھے اپنا سکتا ہے۔ کبھی سوچتی، نہیں نہیں یہ سراب ہے۔ حقیقت بہت تلخ ہوگی۔ اس وقت انجان صاحب کسی وقتی جذبے کے تحت یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔ حقیقی زندگی میں ایک دن ایسا ضرور آئے گا۔ کہ وہ کسما کر، اپنے فیصلے پر نادم ہو کر رہ جائیں گے اور بدنصیب زاہدہ کی قسمت اس کا مذاق اڑاتی رہ جائے گی۔

یہ بدنصیبی نہیں تو اور کیا ہے کہ زندگی کے ہر گام پر مایوسیوں نے اس کا خیر مقدم کیا ہے، ہر لمحے نے اس کی بے بسی کا مذاق اڑایا ہے جس کی زندگی میں غم، مایوسی اور نامرادی ہو، کیا وہ بدنصیب نہیں؟ اسے خوش نصیب کون کہے گا انجان صاحب؟ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچیے! ماشاء اللہ ابھی آپ جوان ہیں۔ صاحب ثروت ہیں۔ لیکن یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ آپ عملی زندگی سے ابھی کوسوں دور ہیں آپ کسی دکھیاری اور مصیبت زدہ کے دل کا اندازہ کیسے لگا سکتے ہیں؟ اس کے درد تک کیسے پہنچ سکتے ہیں؟ ابھی تو صرف جذبات ہیں اور کسی کو اپنانے کی خواہش ایک طرف آسودگی اور خوش حالی ہے اور دوسری طرف کم مائیگی، لاچار جوانی اور پژمردہ دل ہے۔ ریگ زار میں ایک سوکھا اور ٹنڈ منڈ درخت اپنی بے بسی کا ماتم کر رہا ہے۔ نہیں انجان صاحب ایسے فیصلے اتنی جلدی نہ کیجیے، آپ کے لیے نہ ہوں۔ مگر میرے لیے یہ بہت اہم ہیں۔ میری زندگی اور موت کا سوال ہے۔

اپنا کہہ کر اگر آپ نے بیچ منجدھار میں چھوڑ دیا۔ تو میں کہیں کی نہ رہوں گی۔ میری یہی زندگی بھی چھن جائے گی۔ یہ کھوکھلی اور بے جان زندگی، میرے چھوٹے بھائی کی زندگی کے لیے بہت ضروری ہے۔

ہم نے ہر حال میں ہر مصیبت کا سامنا کرتے ہوئے۔ صرف ایک دوسرے کے لیے جینے کی کوشش کی ہے۔ کیونکہ اس لمبی چوڑی دنیا میں ایسا کوئی نہیں جسے ہم اپنا کہہ سکیں۔

انجان صاحب! اس بدنصیب سے اتنا بڑا مذاق نہ کیجیے۔ جسے یہ برداشت نہ کر سکے۔ آپ کا یہ احسان کیا کم ہے کہ آپ نے شاکر کو ملازمت دے دی۔ خدارا آگے نہ بڑھیے۔ اس چھوٹی سی دنیا کو طوفانوں کی زد میں نہ کھینچیے۔ اگر اتنی ہی ہمدردی ہے۔ آپ کے دل میں انسانیت کے لیے اتنا ہی درد ہے، تو شاکر کو کہیں اور ملازمت دلا دیجیے۔ ہم دونوں تا عمر آپ کو دعائیں دیتے رہیں گے۔

اگر میں نے آپ کی شان میں کوئی سخت یا نازیبا جملہ استعمال کر دیا ہو۔ تو مجھے معاف کر دیجیے۔ اس بدنصیب زاہدہ کو معاف کر دیجیے۔ غموں نے اس کا ذہنی توازن بگاڑ دیا ہے۔ سوچنے کی طاقت چھین لی ہے۔ یہ کچھ سوچ نہیں سکتی۔ اپنے دل کا بخار نہیں نکال سکتی کوشش کیجیے کہ آپ مجھے آئندہ خط نہ لکھیں مجھے رہ رہ کر خود پر غصہ آ رہا ہے۔ کہ میں نے آپ کو خط کیوں لکھا تھا۔ اس جرم کی مجھے اتنی لمبی سزا نہیں ملنی چاہیے انجان صاحب!

زاہدہ

نئی دہلی
۳۰ مارچ ۱۹۶۴ء

ڈیر زاہدہ! بے انتہا خلوص

تمہارا خط بہت انتظار کے بعد ملا۔ اسے پڑھ کر میں بے چین ہو اٹھا۔ آخر تمھیں ہو کیا گیا ہے؟ تم اتنی باتیں کیوں سوچتی ہو؟ میں کیا سوچتا ہوں، کیا بات لکھتا ہوں اور تم ہو کہ ہر بات کا غلط مطلب نکالتی ہو۔ ہر فیصلے میں مایوسی کا پہلو ڈھونڈ لیتی ہو۔ میری ہر بات کو دوسرے ڈھنگ سے پرکھتی ہو۔ میں کیسے لکھوں؟ کیسے اپنا دل کھول کر دکھاؤں کہ تمھیں یقین آجائے۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر، ہر پہلو پر غور کر کے فیصلہ کیا ہے۔ کہ ہم دونوں میں کوئی فرق نہیں، ہم ہمیشہ ایک رہیں گے۔ اور تمھاری ضد بھی میرے فیصلے کو نہیں بدل سکتی۔

میں تمھیں کس طرح یقین دلاؤں۔ کہ میں تمھارا مذاق نہیں اڑا رہا ہوں۔ میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔ اس قسم کے اقدام کا مطلب ہے اپنا، اپنی پاکیزہ محبت کا مذاق اڑانا۔ کیا کوئی حسّاس اور خود دار انسان یہ برداشت کر سکے گا؟ ہرگز نہیں!

میری زندگی بھی بالکل سونی اور اجاڑ سی رہی ہے، اُس چاند کی طرح جو بلیے چوڑے آسمانوں میں تنہا بھٹکتا رہتا ہے۔ بے مقصد۔ مگر پھر بھی دوسروں کو اپنی چاندنی کی لطافت بخشتا ہے۔ میں نے بھی کچھ خواب دیکھے ہیں۔ اور ان کے عکس سے اپنی زندگی کو سجانا چاہتا ہوں۔ تم اتنی سنگدل کیوں ہو کہ تمھیں مجھ بدنصیب پر رحم نہیں آتا۔ تم میرے خوابوں کو چکنا چور کرنے کے درپے کیوں ہو؟ کیوں میری مسرتیں مجھ سے چھین لینا چاہتی ہو؟ اپنا دل تمھیں کیسے دکھاؤں۔ کہ تمھیں میری محبت، میرے صادق جذبوں کا احساس ہو جائے۔ میرا کوئی امتحان لینا چاہو تو لے لو ہر وقت حاضر ہوں۔ ہر وہ کام کرنے کے لیے تیار ہوں۔ جو تمہارے دل کا میل دھو دے اور شکوک و شبہات کی خلیج کو پر کر دے۔

میں نے تمہاری کسی بات کا برا نہیں مانا۔ تم نے کوئی بات بھی تو غلط نہیں لکھی۔ اس خط نے میرے دل میں تمھاری محبت کے شعلے بھڑکا دیے ہیں۔ تمہارے لیے عقیدت و احترام مزید بڑھ چکا ہے۔ تمہارے اس خط نے مجھے تمہارے قریب تر کر دیا ہے۔ اتنا قریب کہ ہر لمحہ تمہارے دل کی دھڑکن سن سکتا ہوں۔ ہر پہر میں تمھیں اپنے قریب پاتا ہوں۔ تمہاری گرم گرم سانسیں محسوس کرتا ہوں۔ میری زاہدہ! کیا تم اس ویران دل پر رحم نہ کھاؤ گی۔ جو صرف تمہارے لیے دھڑکتا ہے!

خط فوراً لکھنا، میری قسمت کا فیصلہ سنانے میں دیر نہ لگانا۔ انتظار موت کا دوسرا نام ہے۔ میں انتظار برداشت نہیں کر سکتا۔

اور اب تم مجھے 'آپ' سے مخاطب نہ کیا کرو۔ کیونکہ اس سے تکلف کی بو آتی ہے اور پیار میں تکلف برداشت نہیں کیا جا سکتا۔

ہمیشہ تمھارا

"انجان"

نئی دہلی۔
۲۲۔ مئی ۱۹۶۴ء

پیارے دوست جاوید!

میں تمھارا کس طرح شکریہ ادا کروں۔ کہ بغیر کسی ذاتی تجربے اور ڈگری کے مجھے تمہاری مدد سے ڈیڑھ سو روپے ماہوار کی ملازمت مل گئی۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہر ماہ پچاس روپے تمھیں بھیجنے پڑتے ہیں۔ مگر سو روپے کیا کم ہیں میرے لیے مجھے تو پچاس روپے کی بھی نوکری نہیں مل رہی تھی۔

تم نے انجان پر وہ رنگ چڑھایا ہے۔ کہ بس میری ملازمت اب مستقل ہی سمجھو! ہو سکتا ہے جلد ہی مجھے صہبا کا مدیر بنا دیا جائے اگر

تم اسی دلچسپی سے خط لکھتے رہے تو وہ دن دور نہیں ۔۔۔

پچھلے مہینے تو تم پچیس روپے زیادہ وصول کر چکے ہو تم نے انجان کے خط میں میرے لیے جو پرچہ رکھا تھا وہ اس نے پڑھ لیا اور تم جانتے ہو تمہارے یہ جملے پوری طرح کارگر ہوئے۔

"۔۔۔جن سیٹھ صاحب کے لڑکے کو میں پڑھانے جاتی ہوں۔ انہوں نے مجھے پچاس روپے پیشگی دے دیے تھے۔ مگر اب سوچتی ہوں کہ یہاں ٹیوشن کر کے میں نے سخت غلطی کی۔ دنیا کتنی خود غرض ہے۔ آج جبکہ لوگ خوبصورتی کے پیچھے بھاگ رہے ہیں، میرے لیے یہ خوبصورتی کتنی مصیبت بن گئی ہے۔ سیٹھ صاحب کو اپنے بچے کی پڑھائی سے اتنی دلچسپی نہیں تھی، جتنی مجھ سے اور کل تو وہ دست درازیوں پر آمادہ نظر آتے تھے۔ یہ دیکھ کر میں نے ٹیوشن ختم کر دیا ہے۔ اُن کے پچیس روپے تو واپس کر دیے پچیس ابھی دینے ہیں۔ تم فوراً بھیج دو۔"

اور وہ پچیس روپے تمہارے پاس پہنچ چکے ہیں۔ انجان نے اُسی روز منی آرڈر کر دیا تھا۔ پیارے، عیش کرو عیش! میں ہمیشہ تمہیں دعائیں دیتا رہوں گا۔ اور عشق ہم سب کو دعائیں دیتا رہے گا۔

مگر تم تو خود سمجھدار ہو۔ ابھی جلدی آگے نہ بڑھ جانا۔ ذرا احتیاط سے خط لکھا کرو۔ انجان صاحب اب بے حال ہیں۔ عشق کی آگ میں جلے جا رہے ہیں۔ خط لکھتے وقت یہ بات ضرور ذہن نشین رکھنی چاہیے۔ کہ تمہاری ذرا سی غلطی ہم دونوں کی مستقل آمدنی ختم کر سکتی ہے اور پھر کیا ہوگا، میں کانپ جاتا ہوں اس خیال سے، بھائی وہ وقت نہ آنے دینا۔۔۔ اچھا خدا حافظ

تمہارا دوست

"شاکر"

بقیہ دودِ چراغِ محفل

"میں دیکھوں گا سالی کو۔" بابو نے نالی سے سر باہر نکال کر کہا۔

نازگی پولیس والوں کے ساتھ گلی کے موڑ تک گئی۔ اور جب پاشو کو پولیس والوں نے موٹر میں بٹھا لیا۔ اور انسپکٹر بھی موٹر میں بیٹھنے لگا۔ تب نازکی نے انسپکٹر سے انتہائی ملائم لہجے میں کہا۔ "انسپکٹر صاحب مجھے بھی ناری سدھار گھر پہنچا دیجیے۔ میں اب یہ دھندا نہیں کر سکتی۔ آپ میرا لائسنس کسی دوسری کے نام منتقل کر دیجیے۔"

"دیکھو اس رنڈی کو، یار پکڑا گیا تو کیسے چکر چلا رہی ہے۔"

انسپکٹر نے سگریٹ کا لمبا کش کھینچ کر کہا۔ اور موٹر میں بیٹھ گیا۔۔۔ موٹر دھواں اڑاتی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اور نازکی گلی کے موڑ پر گم سم پتھر بن کر کھڑی رہ گئی۔

فرصت کے لمحات کا بہترین ساتھی ماہنامہ "نقش" کراچی

حیات. نئی دہلی۔

دہلی میں انڈو پاک مشاعرہ

مجھے اس مشاعرے کی تاریخ معلوم نہیں ہے کہ کب سے شروع ہوا۔ لیکن میں چھ سات برس سے تقریباً ہر سال اس میں شرکت کرتا رہا ہوں۔ اس لیے کہ اس مشاعرے میں پاکستان کے شعرا بھی حصہ لیتے ہیں۔ اور ہندوستان کے ممتاز اور مقبول شاعروں کا ایک اچھا خاصا گروہ یہاں موجود ہے۔ اس کے علاوہ اس کی یہ بھی خوبی ہے کہ مشاعرے کا انتظام بہت اچھا ہوتا ہے۔ خوبصورت شامیانہ، بڑی نفاست اور شائستگی سے آراستہ دو تین ہزار کرسیاں لگی ہوتیں۔ اور اگر آپ خوش قسمت ہیں اور اگلی صفوں کی کرسیوں پر آپ کو جگہ ملی ہے تو وہ بڑی آرام دہ بھی ہوتی ہیں اگر کسی شاعر کے کلام سے آپ بور ہوں تو آرام سے ایک نیند بھی لے سکتے ہیں۔ یہ مشاعرہ دہلی کلاتھ مل کے مالکان کرتے ہیں، ہزاروں روپیہ کا خرچ ہوتا ہوگا اس پر، اس لیے کہ دہلی میں دو مشاعرے ہوتے ہیں۔ ایک خاص کے لیے اور دوسرا دہلی کے مل ایریا میں خاص طور پر مل میں کام کرنے والوں کے لیے، اور اسی طرح کے دو مشاعرے لائل پور پاکستان میں بھی ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ وہاں بھی دلّی کے انھیں لالاؤں کی ملیں ہیں۔ (ایک یا دو یا اس سے زیادہ مجھے معلوم نہیں) اور غالباً پاکستان میں اس کے علاوہ کوئی دوسرا ہندستانی سرمایہ دار اب مل مالک نہیں ہے۔ یہ مشاعرہ دلّی کلاتھ مل کے موجودہ مالکان (لالہ بھرت رام اور لالہ چیرت رام) کے چچا یا دادا، آنجہانی لالہ شنکر لال اور لالہ مرلی دھر کی یاد میں منعقد ہوتا ہے۔ یہ دونوں صاحبان، جنھوں نے دہلی کلاتھ مل قائم کیں، اردو شعر و ادب کے بڑے رسیا تھے۔ اور خود صاحب دیوان شاعر تھے۔ اس مشاعرے کی ایک اچھی روایت یہ بھی ہے کہ مشاعرے کا آغاز لالہ مرلی دھر شاد اور لالہ شنکر لال کی غزلوں سے ہوتا ہے۔

لالہ مرلی دھر کی غزل کا ایک شعر آپ بھی سنیے ؎

کھلی جو چشم بصیرت تو دل ہوا روشن　　وہیں وہیں اسے پایا، جہاں جہاں دیکھا

تصوف کس قدر ہمارے ادب میں رس بس گیا ہے۔ ایک ہزار سال سے ہم "ہمہ اوست" کا نعرہ بلند کیے ہوئے ہیں۔ لیکن لالہ شنکر لال کی غزل بالکل داغ کے رنگ میں تھی۔ وہی چٹخارا، وہی شوخی، وہی زبان کا لطف، سنیے ؎

شرم و شوخی سے کام لیتے ہیں　　پھیر کر منہ سلام لیتے ہیں

ہے کوئی اور آپ کا شیدا　　آپ کیوں میرا نام لیتے ہیں

عاشق اور حضرت شنکر　　مفت کا اتہام لیتے ہیں

منظور شدہ محکمہ تعلیمات کراچی بموجب سرکلر نمبر ڈی۔ای/رجی۔دی/۵۸۰۳-۵۱۰۰۲/۶۰ مورخہ ۲۶ ستمبر ۱۹۶۰ء

اُردو ادب کا ڈائجسٹ

نقش کراچی

۷-۶/۶۵

ادارہ

شاہد احمد دہلوی ۔ شمس زبیری

قیمت	سالانہ
ایک روپیہ	بارہ روپے

کاشانۂ اُردو ۔ پوسٹ بکس ۷۳۰۲۔ کراچی ۳

فون: ۵۶۱۵۰

ترتیب

افسانے

مضامین

منظومات

طنز و مزاح

33495
15.6.76

سہ ماہی

سیپ

پانچواں شمارہ

اسی ماہ پیش کر رہا ہے

حسب سابق ہمیں اپنے تمام لکھنے والوں کا تعاون حاصل ہے۔

قیمت:۔ تین روپے

ایجنٹ حضرات اپنے آرڈر سے فوراً مطلع فرمائیں۔

منیجر:۔ سہ ماہی "سیپ" بلاک ڈی شیر شاہ کالونی کراچی

کرشن چندر		سیپ کراچی

کنواری

میگی ایلیٹ اسّی برس کی پُر وقار خاتون ہیں۔ بڑے قاعدے اور قرینے سے سجتی ہیں۔ یعنی اپنی عمر اپنا مرتبہ، اپنا ماحول دیکھ کر سجتی ہیں۔ لبوں پر ہلکی سی لپ اسٹک، بالوں میں دھیمی سی خوشبو، رخساروں پر رُوژ کا شائبہ سا۔ اتنا ہلکا کہ گالوں پر رنگ معلوم نہ ہو۔ کسی اندرونی جذبے کی چمک معلوم ہو۔ ہر شام اُن کی لاغر کلائی کا کنگن بدل جاتا ہے۔ میگی ایلیٹ کے پاس چاندی کے چھ سات کنگن ہیں جنھیں وہ بدل بدل کے پہنتی ہیں۔ کسی مرد کو اپنے قریب دیکھ کر میگی ایلیٹ آج بھی اچانک گھبرا جاتی ہیں۔ پھر رک رک کر کچھ عجیب طرح سے شرما کر مسکراتی ہیں۔ جیسے یہ مسکراہٹ دیکھنے والے سے اپنا بدن چرا رہی ہے۔ اس مسکراہٹ کو دیکھ کر یقین ہو جاتا ہے کہ مس میگی ایلیٹ اپنی طویل عمر کے باوجود ابھی تک کنواری ہیں۔ ان کے تبسم میں ایک عجیب ان چھوئی سی کیفیت ہے۔

میگی ایلیٹ بیرونٹ کریم بھائی کے خاندان میں ستائیس برس کی عمر میں آگئی تھیں۔ وہ کارنوال کی رہنے والی تھیں۔ بیرونٹ کریم بھائی انھیں لندن سے اپنی سکریٹری بنا کے لائے تھے۔ اور میگی ایلیٹ نے بھی بمبئی جانا اس لیے پسند کر لیا کہ وہ انگلینڈ میں اپنی محبت کی بازی ہار چکی تھیں۔ وہ اس تکلیف دہ ماحول سے دُور بھاگ جانا چاہتی تھیں جہاں اُنھیں اپنی محرومی کا احساس کسی پالتو کتے کی طرح ہر دم اپنے پیچھے پیچھے تعاقب کرتا ہوا نظر آتا تھا۔ وہ لندن چھوڑ کر بمبئی آگئیں۔ مگر سکریٹری کی حیثیت سے زیادہ دیر تک نہ چل سکیں۔ کیونکہ ابھی محبت کی محرومی کا احساس نیا نیا تھا۔ اس لیے بیرونٹ کریم بھائی سے ملاقات کرنے کے لیے آنے والے مردوں سے بلا ضرورت تلخی کا سلوک کر بیٹھتیں۔ بیرونٹ کریم بھائی نے انھیں سکریٹری کے عہدے سے الگ کر دیا۔ مگر نرم دل کے آدمی تھے۔ اس لیے انھوں نے میگی ایلیٹ کو مسز کریم بھائی کی سکریٹری بنا دیا۔

کئی برس میگی ایلیٹ مسز کریم بھائی کی سکریٹری رہیں۔ جب مسز کریم بھائی کی وفات ہوگئی تو انھیں مسز کریم بھائی کے بچوں کی گورنس بنا دیا گیا۔ بیرونٹ کریم بھائی مر گئے۔ بچے جوان ہو گئے۔ لڑکیوں کی شادی ہوگئی۔ وہ خاندان سے باہر چلی گئیں۔ مگر میگی ایلیٹ خاندان کے اندر ہی رہیں۔ اب وہ بیرونٹ کریم بھائی کے سب سے بڑے لڑکے ارشاد کریم بھائی کی بیوی سکینہ کو انگریزی پڑھانے اور مغربی آداب سکھانے پر مامور تھیں۔ اور ان دنوں بیرونٹ کریم بھائی کے خاندان کے ساتھ بمبئی سے مسوری آئی ہوئی تھیں۔ کیونکہ گرمیوں میں بیرونٹ مرحوم کا سارا خاندان مسوری

پھر ایک دن اس کی زندگی میں پام آ گئی۔ پامیلا تھوراٹ اس کی بمبئی کی سہیلی تھی۔ پامیلا نے بمبئی کے ایک تاجر سے شادی کی تھی۔ چند سال بمبئی میں رہ کر مسٹر تھوراٹ اور اُن کی بیوی منگلور چلے گئے تھے۔ چند سال خط و کتابت ہوتی رہی۔ پھر خط و کتابت بند ہو گئی۔ اب بیس بائیس برس کے طویل وقفہ کے بعد جب پامیلا تھوراٹ اچانک مسوری میں اُسے نظر آ گئی تو دونوں سہیلیوں کی خوشی دیکھنے کے لائق تھی۔ نہ صرف یہ کہ دونوں نے کئی منٹ تک مصافحہ کیا۔ بلکہ آواز میں لرزش بھی تھی۔ اور آنکھ میں آنسوؤں کا شبہ تک پیدا ہو گیا تھا۔

پام اِس عرصہ میں دو شوہر بھگت چکی تھی۔ وہ بیچارے دونوں مر چکے تھے۔ مگر پام ساٹھ برس کی ہو کر بھی اپنی شوخی و طراری کو ہاتھ سے نہ جانے دیتی تھی۔ اپنی فطرت میں پام میگی سے بالکل الگ تھی۔ میگی دبلی پتلی تھی تو پام موٹی۔ میگی سنجیدہ تھی تو پام بات بے بات قہقہہ لگانے والی۔ میگی ہلکا سا میک اپ کرتی تھی تو پام بالکل گہرا۔ بالکل جوان عورتوں کا سا میک اپ کرتی تھی۔ اُس کی آواز ابھی تک بہت اچھی تھی اور اُسے بہت سے فحش لطیفے یاد تھے۔ اس کی کوئی اولاد نہ تھی۔ پہلے شوہر سے ایک لڑکی ہوئی تھی وہ دو سال کی عمر میں چل بسی۔ دوسرا شوہر ایک اینگلو انڈین تھا۔ وہ ہر وقت شراب میں دھت رہتا تھا۔ اور کبھی کبھی اُسے پیٹتا بھی تھا۔ کبھی کبھی مرد پیٹے تو بڑا مزا آتا ہے۔ پام نے میگی کو سرگوشی میں بتایا۔ کیونکہ اس کے بعد مرد پر پچھتاوے کا ایک شدید دورہ پڑتا ہے۔ اس میں وہ عورت کو بڑی شدت سے منانے پر مجبور ہوتا ہے۔ اس دَورے میں بڑی احمقانہ باتیں کرتا ہے۔ روتا ہے۔ ہاتھ جوڑتا ہے۔ پاؤں پڑتا ہے۔ کبھی کبھی اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر نیا فراک تک سلوا دیتا ہے۔ پام کو جب بھی کسی نئے فراک کی ضرورت ہوتی تھی وہ اپنے شوہر کو کسی نہ کسی طرح پیٹنے پر مجبور کر دیتی تھی۔ شوہر رکھنا عمدہ چیز ہے مگر آہ .....اب تو بڑھاپا آ گیا۔ پام اک آہ بھر کے چپ ہو گئی۔

"تم تو بالکل بچہ ہو۔ بالکل بچہ!" میگی نے بڑی عمر کی بہن کا رشتہ لیا۔ اور پام کی اُلجھی لٹ ٹھیک کرنے لگی۔ "یہ بال کیسے بنا رکھے ہیں....؟ میگی کے لہجے میں ممتا کی لرزش سی آ گئی جسے سن کر پام کچھ اور پھیل گئی۔ اٹھلا کر بولی۔

"اب ہم سے نہیں ہوتا میگی۔"

"تم کہاں ٹھہری ہو؟" میگی نے پام سے پوچھا۔

"پہلے تو کلارکس میں ٹھہری تھی۔ ایک گجراتی فیملی کے ہمراہ احمد آباد سے آئی تھی۔ ان لوگوں کو جلدی واپس جانا پڑ گیا۔ خاندان میں کوئی موت ہو گئی تھی۔ وہ لوگ سب چلے گئے ہیں۔ مگر میں ایسی گرمی میں واپس احمد آباد نہیں جا سکتی۔ اس لیے میں اُن کی ملازمت سے الگ ہو گئی ہوں۔ اور اب مسز ٹریورز کے چھوٹے سے بورڈنگ ہاؤس میں ٹھہری ہوں۔ بڑی کمینی عورت ہے۔ ابھی تک دو روز کی ابلی ہوئی پتیوں کی چائے بیتی ہے۔ جیسے یہ مسوری نہ ہو انگلینڈ ہو۔ اور جنگ ابھی تک جاری ہو۔"

میگی پامیلا کو مسز ٹریورز کے بورڈنگ ہاؤس سے کریم کاٹیج میں اُٹھا لائی۔ اور اس سے ایسی محبت اور شفقت سے پیش آنے لگی، جیسے پام اُس کی برابر کی سہیلی نہ ہو۔ کوئی چھوٹی سی بچی ہو۔ میگی پام کے بال بناتی۔ پام کے کپڑے نکالتی۔ اُس کے کپڑوں پر استری کرتی۔ اُس کو مشورہ دیتی، وہ کون سی چیز کھائے، کون سی چیز نہ کھائے۔ کبھی کبھی اُسے ایک سخت گیر ماں کی طرح ڈانٹ بھی دیتی۔ اور پام میگی کی محبت پا کر بے طرح اٹھلانے لگی تھی۔ اور ساٹھ برس کی ہو کر تیس برس کی خاتون کی سی ادائیں دکھانے لگتی۔ اور جب دیکھتی کہ میگی کی محبت بہت زور مار رہی ہے تو تتلا تتلا کر باتیں کرنے لگتی!

اب میگی پام اور ماسٹر جی (ماسٹر متین احمد) کا ٹگڈم بن گیا تھا۔ تینوں برآمدے کے دوسرے کونے میں الگ جا کر بیٹھتے تھے۔ تاش کھیلتے تھے۔ اپنی بیماریوں اور ان کی دواؤں پر مختلف زاویوں سے بحث کرتے تھے۔ اور ہر وقت تین شریر بچوں کی طرح مسرور اور مگن نظر آتے تھے۔ آپس میں اُن کی کیا باتیں ہوتی تھیں، یہ تو ہم نہیں جان سکے۔ البتہ اتنا ضرور احساس ہونے لگا کہ ان تینوں میں گاڑھی چھن رہی ہے۔ ماسٹر جی جو پہلے

مگی پر اپنی پوری توجہ صرف کرتے تھے۔ اب میگی کے اصرار کرنے پر پام پر بھی کسی قدر اپنی توجہ دینے لگے۔ آہستہ آہستہ یوں ہو گیا کہ تعلقات برابر کے ہو گئے۔ ماسٹر جی اپنی آدھی توجہ میگی اور آدھی توجہ پام کو دیتے تھے۔ اور کسی طرف ڈنڈی نہ مارتے تھے۔ بہت دنوں تک یہ سلسلہ چلا۔ پھر چلتے ہوئے غیر شعوری طور پر پام کی طرف پلڑا جھکتا چلا گیا۔ کیونکہ پام ساٹھ برس کی تھی اور میگی اسی برس کی۔ پام کے چہرے پر جھریاں بہت کم تھیں۔ اور پام کسی قدر زندہ دل بھی۔ اور کیسے عمدہ لطیفے سناتی تھی۔ میگی کی روح بلاشبہ پام سے بہتر معلوم ہوتی ہے۔ اس کے جذبے میں سچائی اور شدت بھی زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ مگر جسم کو جدھر سے دیکھو ہڈیاں سی نکلی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ اور پام تو بالکل گرم پانی کی بھری ہوئی ربر کی بوتل کی طرح آرام دہ معلوم ہوتی ہے۔ اور شریر پام پلڑا اپنی طرف جھکتے دیکھ کر غریب ماسٹر کو اور بھی اکسانے لگی اور اکسانے لگی۔ اور اپنی سہیلی کی ساری خاطر و مدارات بھول کر اُسے جلانے پر تل گئی۔

بے حیا بلی! میگی نے دل ہی دل میں سوچا۔ پہلے تو میگی نے طرح دی۔ اور بار بار وہ طرح دیتی رہی۔ کبھی نگاہیں پھیر لیتی۔ جیسے اُس نے کچھ دیکھا نہ ہو۔ پھر یوں غائب ہو جاتی جیسے اُس نے کچھ سنا نہ ہو۔ پھر جب دل خون ہونے لگتا۔ اُس وقت بھی یوں ہنس دیتی جیسے کچھ ہوا نہ ہو۔ مگر پلڑا جھکتا ہی گیا۔ اور ہم دیکھتے رہے۔ اور ان تینوں سے دُور ہی دُور اپنے برج کی میز سے اس دلچسپ ڈرامے کو دیکھتے رہے جو اب اپنی معراج کو پہنچ رہا تھا۔

ایک مہکتی ہوئی نارنجی شام میں جب ہوا کی خنکی بڑھ گئی تھی اور ہم لوگ جی سی کلب میں جانے کی تیاری کر رہے تھے عائشہ اور میں کالے سنگ مرمر کے شیروں والے چبوترے پر کھڑے سکینہ اور فاضل بھائی کا انتظار کر رہے تھے جو اپنے اپنے کمرے میں کپڑے بدلنے گئے تھے۔ گئی تو عائشہ بھی تھی مگر کمرے سے جلدی نکل آئی تھی۔ کیونکہ اس طرح سے ہم دونوں کو اکیلے میں ساتھ رہنے کے لیے چند منٹ مل جاتے تھے۔ اس وقت عائشہ ایک کالے شیر کی پیٹھ پر بیٹھی ہوئی تنک مزاجی سے بار بار اپنے دائیں پاؤں کا سینڈل ہلا رہی تھی۔ اور قریب کے مرمریں ستون پر چڑھی ہوئی زرد گلاب والی بیل سے پھولوں کی کچی کلیاں توڑ توڑ کر میرے پاؤں پر پھینک رہی تھی۔ ایک کلی میری پتلون کی موہری میں جا اٹکی اور میں اُسے نکالنے کے لیے جو جھکا تو مجھے عائشہ کا سُرخ ہوتا ہوا چہرہ اور اُس کے سینے کے تھرتھراتے ہوئے اُبھار اپنے بہت قریب نظر آئے۔ کیونکہ عائشہ بہت قریب سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے جھکے جھکے اُس کی طرف ایک لمحہ کے لیے دیکھا۔ وہ میرے اس قدر قریب تھی کہ میں نے اُس کے سانس کی آنچ اور اُس کے حسن کی پگھلتی ہوئی لَو اپنے رخساروں پر محسوس کی۔ اُس کے گلابی ہونٹ ذرا سے کھل گئے تھے اور بالکل منتظر تھے۔ ایسے میں میں نے سکینہ کو برآمدے کے اندر کے کمرے سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا۔ میں نے جلدی سے پتلون کی موہری سے زرد گلاب کی کچی کلی کو نکالا اور سیدھا ہو کر اُسے زور سے دُور پھینک دیا۔

"بزدل!" عائشہ ناگن کی طرح پھنکاری۔ پھر سکینہ کو آتے دیکھ کر سنبھل گئی۔

میگی اور پام اور ماسٹر جی بھی تینوں باہر جا رہے تھے۔ مگر کلب کو نہیں۔ نالے پر سیر کرنے کے لیے۔ کچھ دنوں سے یہ اکٹھے سیر کرنے کے لیے نالے کو جاتے تھے۔ آج سردی بڑھتی ہوئی دیکھ کر میگی اپنے دبلے پتلے بدن میں جھرجھری محسوس کر کے کانپ اُٹھی۔ اُس نے پام اور ماسٹر جی دونوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ٹھہرو! میں اندر سے اپنا اونی کوٹ پہن کے آتی ہوں۔۔۔"

"اونی کوٹ موسم گرما کی رُت میں؟" پام نے طنز آمیز انداز میں سوال کیا۔

مگر میگی اُس کے سوال کا کوئی جواب نہ دے کر اندر چلی گئی۔

چند لمحوں تک تو پام چپ رہی اور اپنے دونوں کولہوں پر ہاتھ رکھ کر اِدھر اُدھر ڈولتی رہی۔ پھر اُس کی آنکھوں میں ایک شریر

چمک نمودار ہوئی اور اُس نے سر کے اشارے سے ماسٹر متین احمد کو اپنے پیچھے آنے کے لیے کہا۔

ماسٹر متین احمد نے چند لمحوں کے لیے توقف کیا۔ بہت بے چین نظر آئے۔ اِدھر دیکھا اُدھر دیکھا۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو پام کے پیچھے ہولیے۔ پام نالے کی سمت جا رہی تھی۔ ماسٹر متین احمد کو ساتھ لے کر۔

چند لمحوں میں وہ دونوں نظر سے اوجھل ہو گئے۔ جب نظر سے اوجھل ہوئے تو میں نے دیکھا کہ ماسٹر جی پام کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ پام نے اُن کے بازو کا سہارا لے لیا تھا۔ وہ بازو جو اب تک صرف میگی کے لیے وقف تھا۔ اُن کے جانے کے بعد ہی میگی کچھ گنگناتی ہوئی اپنا ہلکا گیرے اونی کوٹ پہن کر باہر نکل آئی۔ جب اُس نے دیکھا کہ ماسٹر جی اور پام نہیں ہیں تو وہ ایکبارگی ٹھٹھک گئی۔ اُس کے چہرے کا رنگ ایک دم اُس کے کوٹ کی طرح گیرے ہو گیا۔ زیرِ لب ہونٹوں کی گنگناہٹ اک دم رُک گئی۔ اُس نے اِدھر دیکھا اُدھر دیکھا۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو سکینہ سے پوچھا۔

"یہ لوگ کہاں ہیں؟"

"چلے گئے۔" سکینہ نے بے حس لہجے میں کہا۔

میگی کی ڈولتی ہوئی پتلیاں بڑی تیزی سے اِدھر اُدھر گھومیں۔ جیسے کوئی پرندہ اچانک زخمی ہو کر تڑپنے لگے۔ سکینہ ان آنکھوں کی اذیت کی تاب نہ لا سکی۔ بڑے غصے سے بولی۔

"میگی، تمھیں ہوا کیا ہے۔۔۔؟ دیکھتی نہیں ہو، پام تم سے عمر میں کتنی کم ہے!"

میگی نے ایک لمحے کے لیے ٹھٹھک کر سیدھا سکینہ کی آنکھوں میں دیکھا۔ پھر بڑی نخوت سے، ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولی۔

"عمر کم ہے تو کیا ہوا؟۔۔۔ وہ میری طرح کنواری تو نہیں ہے!"

پھر مس میگی، ملیٹ، عمر اسی سال۔ ایک عورت۔ اپنی ایڑی پر گھوم گئی۔ اور ایک ناقابلِ تسخیر غرور سے سر اُٹھائے ہوئے برآمدے میں چلی گئیں ـــــ واپس اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ دروازہ بند ہو گیا۔ ہم دیکھتے ہی رہ گئے ـــ یہ بھی سمجھ میں نہ آیا کہ ہنسیں یا روئیں ـــ؟

سکینہ ایک دم بہت سنجیدہ ہو گئی تھی۔ اُس نے اپنی آنکھیں ہم سے چرالی تھیں اور اب تیز تیز قدموں سے آگے چل رہی تھی۔ اُن کے پیچھے پیچھے فاضل بھائی جلدی جلدی سے قدم بڑھانے لگے۔

عائشہ نے میری طرف بڑے غور سے دیکھا۔

میں نے گلاب کی بیل سے ایک زرد کلی کو توڑ لیا اور اُسے سونگھتے ہوئے بولا۔

"نو بڈ پارٹنر!"

نقش ادب کی خدمت کرتا ہے۔ آپ نقش کی سرپرستی کیجیے

نقش خریدیے • نقش میں اشتہار دیجیے

فرصت کے لمحات کا بہترین ساتھی۔ ماہنامہ نقش کراچی

عصمت چغتائی سیپ کراچی

چٹان

بھابی بیاہ کر آئی تھی تو مشکل سے پندرہ برس کی ہو گی۔ بڑھوار بھی تو پوری نہیں ہوئی تھی۔ بھیا کی صورت سے ایسی لرزتی تھی جیسے قصائی سے بکری۔ مگر سال بھر کے اندر ہی وہ تو جیسے منہ بند کلی سے کھل کر پھول بن گئی۔ جسم بھر گیا۔ بال گھنیرے ہو گئے۔ آنکھوں میں ہرنوں جیسی وحشت دور ہو کر غرور اور شرارت بھر گئی۔

بھابی ذرا آزاد قسم کے خاندان سے تھی۔ کانونٹ میں تعلیم پائی تھی۔ پچھلے سال اُس کی بڑی بہن ایک عیسائی کے ساتھ بھاگ گئی تھی اس لیے اس کے ماں باپ نے ڈر کر اُسے جلدی سے کانونٹ سے اُٹھا لیا۔ اور جھٹ پٹ شادی کر دی۔

بھابی آزاد فضا میں پلی تھی۔ ہرنیوں کی طرح قلانچیں بھرنے کی عادی تھی۔ مگر سسرال اور میکہ دونوں طرف سے اُس پر کڑی نگرانی تھی اور بھیا کی یہی کوشش تھی کہ اگر جلدی سے اسے پکی گرستن نہ بنا دیا گیا تو وہ بھی اپنی بڑی بہن کی طرح کوئی گل کھلائے گی۔ حالانکہ وہ شادی شدہ تھی۔ لہٰذا وہ اسے گرستن بنانے پر جٹ گئے۔

چار پانچ سال کے اندر بھابی کو گھس گھسا کے واقعی سب نے گرستن بنا دیا۔ وہ تین بچوں کی ماں بن کر بھدی اور ٹھس ہو گئی۔ اماں اُسے خوب مرغی کا شوربا، گوند سونٹھ کے لڈو کھلاتیں۔ بھیا ٹانک پلاتے۔ اور ہر بچے کے بعد وہ دس پندرہ پونڈ بڑھ جاتی۔

آہستہ آہستہ اُس نے بننا سنورنا چھوڑ ہی دیا تھا۔ بھیا کو لپ اسٹک سے نفرت تھی۔ آنکھوں میں کاجل اور مسکارا دیکھ کر وہ چڑ جاتے بھیا کو بس گلابی رنگ پسند تھا۔ یا پھر سرخ۔ بھابی زیادہ تر گلابی یا سرخ ہی کپڑے پہنا کرتی تھی۔ گلابی ساڑی پر سرخ بلاؤز۔ یا کبھی گلابی کے ساتھ ہلکا گہرا گلابی۔

شادی کے وقت اُس کے بال کٹے ہوئے تھے۔ مگر دلہن بناتے وقت ایسے تیل چپڑ کر باندھے تھے کہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ پرکٹی میم ہے۔ اب اس کے بال تو بڑھ گئے تھے۔ لیکن پے در پے بچے ہونے کی وجہ سے وہ ذرا گنجی سی ہو گئی تھی۔ ویسے بھی وہ بال کس کر میلی دھجی سے باندھ لیا کرتی تھی۔ اُس کے میاں کو وہ میلی کچیلی ہی بڑی پیاری لگتی تھی۔ اور سسرال والے بھی اس کی سادگی کو دیکھ کر اُس کی ترقی کے گن گاتے تھے۔ بھابی تھی بڑی پیاری سی۔ سیدھی سادی۔ بھولی۔ مگر اس نے اس بڑی بری طرح اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑ دیا تھا کہ خمیری آٹے کی طرح بہہ گئی تھی۔

بھیّا اُس سے نو برس بڑے تھے۔ مگر اُس کے سامنے لونڈے سے لگتے تھے۔ ویسے ہی سڈول کسرتی بدن والے۔ روز ورزش کرتے بڑی احتیاط سے کھانا کھاتے۔ بڑے حساب سے سگریٹ پیتے۔ یونہی کبھی وِسکی بیر چکھ لیتے۔ اُن کے چہرے پر اب بھی لڑکپن تھا۔ تھے بھی تیس اکتیس برس کے۔ مگر چوبیس پچیس برس کے ہی لگتے تھے۔

اُف بھیّا کو جین اور اسکرٹ سے کیسی نفرت تھی۔ اُنھیں یہ نئے فیشن کی بے آستینوں کی بدن پر چپکی ہوئی قمیص سے بھی بڑی گھن آتی تھی۔ تنگ موری کی شلواروں سے تو وہ ایسے جلتے تھے کہ توبہ۔ خیر بھابی بے چاری تو شلوار قمیص کے قابل رہ ہی نہیں گئی تھی۔ وہ تو بس زیادہ تر بلاوز۔ پیٹی کوٹ پر ڈریسنگ گاؤن چڑھائے گھوما کرتی۔ کوئی جان پہچان آجاتا تو بھی بے تکلفی سے وہی اپنا فنشنل ڈریس پہنے رہتی۔ کوئی پر تکلف مہمان آتا تو عموماً وہ اندر ہی بچوں سے سر مارا کرتی۔ جو کبھی باہر آنا پڑتا تو ملگجی سی ساڑی لپیٹ لیتی۔ وہ گھرستن تھی، ماں تھی، بہو تھی اور جیتی تھی۔ اسے رنڈیوں کی طرح بن سنور کر کسی کو لبھانے کی کیا ضرورت تھی۔

اور شاید بھابی یونہی گودڑ بنی ادھیڑ اور پھر بوڑھی ہو جاتی۔ بہوئیں بیاہ کر لاتی جو صبح اُٹھ کر اُسے جھک کر سلام کرتیں گود میں پوتا کھلانے کو دیتیں۔ مگر خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

شام کا وقت تھا۔ ہم سب لان پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ بھابی پاپڑ تلنے باورچی خانہ میں گئی تھی۔ باورچی نے پاپڑ لا کر دیئے۔ بھیّا کو بادامی پاپڑ بھاتے ہیں۔ اُنھوں نے پیار سے بھابی کی طرف دیکھا۔ اور جھٹ سے اُٹھ کر پاپڑ تلنے چلی گئیں۔ ہم لوگ مزے سے چائے پیتے رہے۔ ہائے، بھابی تھی کہ فرشتہ۔ میں تو کالج سے آکر باورچی خانہ میں جانے پر مجبور ہی نہیں کی جاسکتی تھی۔ اور نہ ہی میرا شام کا پر تکلف لباس باورچی خانہ کے لیے موزوں تھا۔ اس کے علاوہ مجھے پاپڑ تلنا ہی کب آتے تھے۔ دوسری بہنیں بھی میری قطار میں کھڑی تھیں۔ فریدہ کا منگیتر آیا تھا۔ وہ اُس کی طرف جٹی ہوئی تھی۔ رضیہ اور شمیم اپنے دوستوں کے ساتھ گپیں لڑانے میں مصروف تھیں وہ کیا پاپڑ تلتیں۔ اور ہم سب تو بابل کے آنگن کی چڑیاں تھیں۔ اور اُڑنے کے لیے پر تول رہی تھیں۔

دھائیں سے فٹ بال آکر عین بھیّا کی پیالی پر پڑی۔ ہم سب اُچھل پڑے۔ بھیّا مارے غصّہ کے بھنّا اُٹھے

"کون پاجی ہے؟" انھوں نے جدھر سے گیند آئی تھی اُدھر دیکھ کر ڈانٹا۔

بکھرے ہوئے بالوں کا گول مول سر اور بڑی بڑی آنکھیں اوپر سے جھانکیں۔ اور ایک زقند میں بھیّا منڈیر پر تھے۔ اور مجرم کے بال اُن کی گرفت میں۔

"اوہ!" ایک چیخ نکلی۔ اور دوسرے لمحے بھیّا ایسے اُچھل کر الگ ہو گئے جیسے انھوں نے بچھو کے ڈنک پر ہاتھ ڈال دیا ہو۔ یا انگارہ پکڑ لیا ہو۔

"سوری۔ آئی ایم ویری سوری۔" وہ ہکلا رہے تھے۔ ہم سب دوڑ کر گئے۔ دیکھا تو منڈیر کے اُس طرف ایک دبلی پتلی ناگن سی لڑکی سفید ڈرین پائپ اور نیبو کے رنگ کا سلیولیس بلاؤز پہنے اپنے میرین منرو کی طرح کٹے ہوئے بالوں میں پتلی پتلی انگلیاں پھیر کر کھسیانی ہنسی ہنس رہی تھی۔ اور پھر ہم سب ہنسنے لگے۔

بھابی پاپڑوں کی پلیٹ لیے اندر سے نکلی۔ اور بغیر پوچھے گچھے یہ سمجھ کر ہنسنے لگی کہ ضرور کوئی ہنسی کی بات ہوگی ہی۔ اُس کا ڈھیلا ڈھالا پیٹ ہنسنے میں پھدکنے لگا۔ اور جب اُسے معلوم ہوا کہ بھیّا نے شبنم کو لونڈا سمجھ کر اُس کے بال پکڑ لیے تو وہ اور بھی زور زور سے قہقہے لگانے لگی۔ کہ کئی پاپڑ کے ٹکڑے گھاس پر بکھر گئے۔ شبنم نے بتایا وہ اسی دن اپنے چچا خالد جمیل کے ہاں آئی ہے۔ اکیلے جی گھبرایا تو فٹ بال ہی لڑھکانے لگی جو قسمت سے بھیّا جی کی پیالی پر آن کودی۔

شبنم بھیّا کو اپنی تیکھی مسکراتی آنکھوں سے گھور رہی تھی۔ بھیّا مسکرا نے میں اُسے تک رہے تھے۔ ایک کرنٹ ان دونوں کے درمیان دوڑ رہا تھا۔ بھابی اس کرنٹ سے کٹی ہوئی جیسے کوسوں دور کھڑی تھی۔ اُس کا پھڑکتا ہوا اپیٹ سہم کر رک گیا۔ ہنسی نے اس کے ہونٹوں پر لڑکھڑا کر دم توڑ دیا۔ اُس کے ہاتھ ڈھیلے ہو گئے۔ پلیٹ ٹیڑھی ہو کر پاپڑ گھاس پر گرنے لگے۔ پھر ایک دم وہ دونوں جاگ پڑے۔ اور خوابوں کی دنیا سے لوٹ آئے۔

شبنم بھاگ کر منڈیر پر چڑھ گئی۔

"آئیے چائے پی لیجیے" میں نے ٹھہری ہوئی فضا کو دھکا دے آگے کھسکایا۔

ایک لچک کے ساتھ شبنم نے اپنے پیر منڈیر کے اُس پار سے اس طرف کر لیے۔ سفید چھوٹے چھوٹے ملائم ہری گھاس پر فاختہ کے جوڑے کی طرح ٹھلکنے لگے۔ شبنم کا رنگ پگھلے ہوئے سونے کی طرح تھا۔ اُس کے بال سیاہ بھونرا تھے۔ مگر آنکھیں جیسے سیاہ کٹوریوں میں کسی نے شہد بھر دیا ہو۔ نیبو کے رنگ کے بلاؤز کا گلا بہت گہرا تھا۔ ہونٹ تربوزی رنگ کے اور اُسی رنگ کی نیل پالش لگائے وہ بالکل کسی امریکی اشتہار کا ماڈل معلوم ہو رہی تھی۔ بھابی سے کوئی فٹ بھر لانبی لگ رہی تھی۔ حالانکہ مشکل سے دو انچ اونچی ہو گی۔ اُس کی ہڈی بڑی نازک تھی۔ اس لیے کر تو ایسی کہ چھلّے میں پرو لو۔

بھیّا کچھ گم سم سے بیٹھے تھے۔ بھابی اُنھیں ایسے تاک رہی تھی جیسے بلّی پر تولتے ہوئے پرندے کو گھورتی ہے کہ جیسے ہی پر پھڑپھڑائے بڑھ کر دبوچ لے۔ اُس کا چہرہ تمتا رہا تھا۔ ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔ نتھنے پھڑپھڑا رہے تھے۔

اتنے میں منّا آ کر اُس کی پیٹھ پر دھم سے کودا۔ وہ ہمیشہ اُس کی پیٹھ پر ایسے کودا کرتا تھا جیسے وہ کوئی گدگدا سا تکیہ ہو۔ بھابی ہمیشہ ہنس دیا کرتی تھی۔ مگر آج اُس نے چٹاخ پٹاخ دو چانٹے جڑ دیے۔

شبنم پریشان ہو گئی۔

"ارے۔ ارے — رو کیے نا" اُس نے بھیّا کا ہاتھ چھو کر کہا۔

"بڑی غصّہ ور ہیں آپ کی ممّی" اُس نے میری طرف منھ پھیر کر کہا۔ انٹروڈکشن ہماری سوسائٹی میں بہت کم ہوا کرتا ہے۔ اور پھر بھابی کا کسی سے انٹروڈکشن کرانا عجیب سا لگتا تھا۔ وہ تو صورت سے ہی گھر کی بہو لگتی تھی۔ شبنم کی بات پر ہم سب قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔ بھابی منّے کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی اندر چل دی۔

"ارے یہ تو ہماری بھابی ہے" میں نے بھابی کو دھم دھم جاتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

"بھابی؟" شبنم حیرت زدہ ہو کر بولی۔

"ان کی بھیّا کی بیوی"

"اوہ —" اُس نے سنجیدگی سے اپنی نظریں جھکا لیں۔ "میں۔ میں سمجھی —" اُس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"بھابی کی عمر تیئیس سال ہے" میں نے وضاحت کی

"مگر..... ڈونٹ بی سلی —" شبنم ہنسی۔ بھیّا بھی اُٹھ کر چل دیے۔

"خدا کی قسم"

"اوہ — جہالت"

"نہیں — بھابی نے مارٹیز سے پندرہ سال کی عمر میں سینیر کیمبرج کیا تھا"

"تمھارا مطلب ہے یہ مجھ سے تین سال چھوٹی ہیں — میں چھبیس سال کی ہوں"

"تب تو قطعی چھوٹی ہیں۔"

"اُف، اور میں سمجھی وہ تمھاری ممّی ہیں۔ دراصل میری آنکھیں ذرا کمزور ہیں۔ مگر مجھے عینک سے نفرت ہے۔ بُرا لگا ہوگا اُنھیں۔"

"نہیں۔ بھابی کو کچھ بُرا نہیں لگتا۔"

"چہ۔ بے چاری۔"

"کون ۔۔ بھابی نا۔" جانے میں نے کیوں کہا۔

"بھیّا اپنی بیوی پر جان دیتے ہیں۔" صفیہ نے بطور وکیل کہا۔

"بیچارے کی بہت بچپن میں شادی کر دی گئی ہوگی۔"

"پچیس چھبیس سال کے تھے۔"

"مگر مجھے تو معلوم بھی نہ تھا کہ بیسویں صدی میں بغیر دیکھے شادیاں ہوتی ہیں۔" شبنم نے حقارت سے مسکرا کر کہا۔

"تمھارا اندازہ غلط نکل رہا ہے۔۔۔ بھیّا نے بھابی کو دیکھ کر بے حد پسند کر لیا تھا۔ تب شادی ہوئی تھی۔ مگر جب وہ کنول کے پھول جیسی نازک اور حسین تھی۔"

"پھر یہ کیا ہو گیا شادی کے بعد؟"

"ہوتا کیا ۔۔۔ بھابی اپنے گھر کی ملکہ ہیں۔ بچوں کی ملکہ ہیں۔ کوئی فلم ایکٹریس تو ہیں نہیں۔ دوسرے بھیّا کو سوکھی ماری لڑکیوں سے گھن آتی ہے۔" میں نے جان کر شبنم پر چوٹ کی۔ وہ بے وقوف نہ تھی۔

"بھئی چاہے مجھ سے کوئی پیار کرے یا نہ کرے۔ میں تو کسی کو خوش کرنے کے لیے ہاتھی کا بچہ کبھی نہ بنوں ۔۔۔ اوہ۔ معاف کرنا تمھاری بھابی کبھی بہت خوبصورت ہوں گی۔ مگر اب تو۔۔۔"

"اُنھ، آپ کا نقطۂ نظر بھیّا سے بالکل مختلف ہے۔" میں نے بات ٹال دی۔ اور جب وہ بل کھاتی سیدھی سڈول ٹانگوں کو آگے پیچھے جھلاتی ننھے ننھے قدم رکھتی منڈیر کی طرف جا رہی تھی۔ بھیّا برآمدے میں کھڑے تھے۔ ان کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ اور بار بار اپنی گدّی سہلا رہے تھے۔ جیسے کسی نے وہاں جلتی آگ رکھ دی ہو۔ چڑیا کی طرح پھدک کر وہ منڈیر پھلانگ گئی۔ پل بھر کو پلٹ کر اُس نے اپنی شریر آنکھوں سے بھیّا کو تولا۔ اور چھلاوہ کی طرح کوٹھی میں غائب ہو گئی۔

بھابی لان پر جھکی ہوئی پیالیاں سمیٹ رہی تھی۔ مگر اُس نے ایک نظر نہ آنے والا تار دیکھ لیا جو بھیّا جی اور شبنم کی نگاہوں کے درمیان دوڑ رہا تھا۔

ایک دن میں نے کھڑکی میں سے دیکھا۔ شبنم پھولا ہوا لال اسکرٹ اور سفید کھلے گلے کا بلاؤز پہنے پپو کے ساتھ سمبا ناچ رہی تھی۔ اس کا ننھا سا بکلنیر کتا ٹانگوں میں اُلجھ رہا تھا۔ وہ اونچے اونچے قہقہے لگا رہی تھی۔ اُس کی سڈول سانولی ٹانگیں ہری ہری گھاس پر تھرک رہی تھیں۔ سیاہ ریشمی بال ہوا میں چھلک رہے تھے۔ پانچ سال کا پپو بندر کی طرح پھدک رہا تھا۔ مگر وہ نشیلی ناگن کی طرح لہرا رہی تھی۔ اُس نے ناچتے ناچتے ناک پر انگوٹھا رکھ کر مجھے چڑایا۔ میں نے جواب میں گھونسا دکھا دیا۔ مگر فوراً ہی مجھے اُس کی نگاہوں کا پیچھا کر کے معلوم ہوا یہ اشارہ وہ میری طرف نہیں کر رہی تھی۔ بھیّا برآمدے میں کھڑے ہاتھوں کی طرح گدّی سہلا رہے تھے۔ اور وہ اُنھیں منھ چڑا کر جلا رہی تھی۔ اُس کی کمر میں بل پڑ رہے تھے۔ کولھے مٹک رہے تھے۔ بانہیں تھرا رہی تھیں۔ ہونٹ ایک دوسرے سے جدا لرز رہے تھے۔ اُس نے سانپ کی طرح لپ سے زبان نکال کر اپنے ہونٹ کو چاٹا۔ بھیّا کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اور وہ کھڑے دانت نکال رہے تھے۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ بھابی گودام میں

اناج تلوا کر باورچی کو دے رہی تھی۔

"شبنم کی بچی ۔" میں نے دل میں سوچا۔ مگر غصہ مجھے بھیا پر بھی آیا۔ انھیں دانت نکالنے کی کیا ضرورت تھی۔ انھیں تو شبنم جیسی لڑکیوں سے نفرت تھی۔ انھیں تو انگریزی ناچوں سے گھن آتی تھی۔ وہ دو کیوں کھڑے اُسے تک رہے تھے۔ اور ایسی بھی کیا بے شُدھی کہ اُن کا جسم سمبا کی تال پر لرز رہا تھا۔ اور انھیں خبر نہ تھی۔

اتنے میں بوا نے چائے کی ٹرے لے کر لان پر آ گیا۔ بھابی نے ہم سب کو آواز دی۔ اور بوا نے سے کہا بھابی کو بھیج دے۔

رسماً شبنم کو بھی بلاوا دینا پڑا۔ میرا تو جی چاہ رہا تھا قطعی اُس کی طرف سے منہ پھیر کر بیٹھ جاؤں۔ مگر جب وہ منے کو پیٹھ پر چڑھائے منڈیر پھلانگ کر آئی تو نہ جانے کیوں مجھے وہ قطعی معصوم لگی۔ منا اُس کا ردے لگاموں کی طرح تھامے ہوئے تھا۔ اور وہ گھوڑے کی چال اُچھلتی ہوئی لان پر دوڑ رہی تھی۔ بھیا نے منے کو اُس کی پیٹھ سے اتارنا چاہا۔ مگر وہ اور چمٹ گیا۔

"ابھی اور گھوڑا چلے آنٹی ۔"

"نہیں بابا ۔ آنٹی میں دم نہیں ۔" شبنم چلائی۔ بھیا نے کس کے منے کو ۔ ۔ اتارا۔ منہ پر ایک چانٹا لگایا۔ ایک دم تڑپ کر شبنم نے اُسے گود اُٹھا لیا۔ اور بھیا کے ہاتھ پر زور کا تھپڑ لگایا۔

"شرم نہیں آتی ۔ اتنے بڑے ہو نٹ کے، اونٹ ذرا سے بچے پر ہاتھ اُٹھاتے ہیں۔" بھابی کو آتا دیکھ کر اُس نے منے کو اُن کی گود میں دے دیا۔ اُس کا چانٹا کھا کر بھیا مسکرا رہے تھے۔

"دیکھیے تو کتنی زور سے تھپڑ مارا ہے۔ میرے منے کو کوئی۔ رتا تو ہاتھ توڑ کر رکھ دیتی۔" اُس نے شرارت سے کٹوریوں میں زہر گھول کر بھیا کو دیکھا۔ "اور پھر ہنس رہے ہیں بے حیا ۔"

"ہوں۔ وہ کہتی ہے ۔ تو ہاتھ توڑ دو گی ۔" بھیا نے اُس کی کلائی مروڑ دی۔ وہ بل کھا اتنی زور سے چیخی کہ بھیا نے لرز کر اُسے چھوڑ دیا۔ اور وہ ہنستے ہنستے زمین پر لوٹ گئی۔ چائے کے درمیان بھی شبنم کی شرارتیں چلتی رہیں۔ وہ بالکل کمسن چھوکریوں کی طرح چہلیں کر رہی تھیں۔ بھابی گم سم بیٹھی تھیں۔ آپ سمجھے ہوں گے شبنم کے وجود سے ڈر کر انھوں نے کچھ اپنی طرف توجہ دینی شروع کر دی ہو گی۔ جی قطعی نہیں۔ وہ تو پہلے سے بھی زیادہ میلی رہنے لگیں۔ پہلے سے بھی زیادہ ڈٹ کر کھاتیں۔ ہم سب تو ہنس رہے تھے مگر وہ سر جھکائے نہایت انہماک سے کیک اُڑانے میں مصروف تھیں۔ چٹنی لگا لگا کر سموسے نگل رہی تھیں۔ سکے ہوئے توس پر ڈھیر سا مکھن اور جیلی تھوپ تھوپ کر کھائے جا رہی تھیں۔

بھیا اور شبنم کو دیکھ دیکھ کر ہم سب ہی پریشان تھے۔ اور شاید بھابی بھی فکرمند ہوں گی۔ مگر وہ اپنی پریشانی کو مرغن کھانوں میں دفن کر رہی تھیں۔ انھیں ہر وقت کھٹی ڈکاریں آیا کرتیں۔ مگر وہ چورن کھا کھا کر پلاؤ قورمہ ہضم کرتیں۔ وہ سہمی سہمی نظروں سے بھیا جی اور شبنم کو ہنستا بولتا دیکھتیں۔ بھیا تو کچھ اور بھی لونڈے سے لگنے لگے تھے۔ شبنم کے ساتھ وہ صبح شام سمندر میں تیرتے۔ بھابی رچھ بھلا تیرنا جانتی۔ مگر بھیا کو سوئمنگ سوٹ پہنے عورتوں سے بہت نفرت تھی۔ ایک دن ہم سب سمندر میں نہا رہے تھے شبنم ننھی ننھی دو دھجیاں پہنے ناگن کی طرح پانی میں بل کھا رہی تھی۔ اتنے میں بھابی جو دیر سے منے کو پکار رہی تھیں آ گئیں۔ بھیا شرارت کے موڈ میں تو تھے ہی۔ دوڑ کر انھیں پکڑ لیا اور ہم سب نے مل کر انھیں پانی میں گھسیٹ لیا۔ جب سے شبنم آئی تھی بھیا بہت شریر ہو گئے تھے۔ ایک دم سے وہ دانت کچکچا کر بھابی کو ہم سب کے سامنے کھینچ لیتے۔ انھیں گود میں اُٹھانے کی کوشش کرتے۔ مگر وہ اُن کے ہاتھوں سے بوتل مچھلی کی طرح پھسل جاتی۔ پھر وہ کھسیا کر رہ جاتے۔ جیسے تخیل میں وہ شبنم ہی کو اُٹھا رہے تھے۔ اور بھابی ہی ہاتھ کی طرح نادم ہو کر فوراً پڈنگ یا کوئی اور مزے دار ڈش تیار کرنے چلی جاتیں۔ اس وقت جو انہیں پانی میں ڈھکیلا گیا تو وہ گٹھری کی طرح لڑھک گئیں۔ اُن کے کپڑے جسم پر چپک گئے۔ اور اُن کے جسم کا سارا بھونڈا پن بھیانک طریقہ پر اُبھر آیا۔ کمر جیسے کسی نے

توشک لپیٹ دی تھی۔ کپڑوں میں وہ اتنی بھیانک نہیں معلوم ہوتی تھیں۔

"اوہ، کتنی موٹی ہو گئی ہو تم۔" بھیّا نے اُن کے کولھے کا بوٹا پکڑ کر کہا۔ "اُف توند تو دیکھو۔ بالکل گاما پہلوان معلوم ہو رہی ہو۔"

"ہنہہ، چار بچے ہونے کے بعد کمر۔۔۔"

"میرے بھی تو چار بچے ہیں۔۔۔ میری کمر تو ڈنلوپلو کا گدا نہیں بنی۔" اُنھوں نے اپنے سڈول جسم کو ٹھوک بجا کر کہا۔ اور بھابی منھ تھوتھائے بھیگی مرغی کی طرح پیر مارتی جھرجھریاں لیتی ریت میں گہرے گہرے گڈھے بناتی منے کو گھسیٹتی چلی گئیں۔ بھیّا بالکل بے توجہ ہو کر شبنم کو پانی میں ڈبکیاں دینے لگے۔ مگر وہ کہاں ہاتھ آنے والی تھی۔ ایسا اڑنگا لگایا کہ فڑاپ سے اوندھے منھ گر پڑے۔

جب نہا کر آئے تو بھابی سر جھکائے خوبانیوں کے مربّے پر کریم کی تہہ جما رہی تھیں۔ اُن کے ہونٹ سفید ہو رہے تھے۔ اور آنکھیں سرخ تھیں گٹا پارچہ کی گڑیا جیسے موٹے موٹے گال کچھ اور سوجے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔

لنچ پر بھابی بے انتہا غمگین تھیں۔ لہٰذا بڑی تیزی سے خوبانیوں کا مربّہ اور کریم کھانے پر جٹی ہوئی تھیں۔ شبنم نے ڈش کی طرف دیکھ کر ایسے پھریری لی جیسے خوبانیاں نہ ہوں سانپ بچھو ہوں۔

"زہر ہے زہر!" اُس نے نفاست سے ککڑی کا ٹکڑا کترتے ہوئے کہا۔ اور بھیّا بھابی کو گھورنے لگے۔ مگر وہ شپاشپ مربّہ اُڑاتی رہیں۔

"مدہے!" انھوں نے نتھنے پھڑکا کر کہا۔

بھابی نے کوئی دھیان نہ دیا۔ اور قریب قریب پوری ڈش پیٹ میں اُنڈیل لی۔ انھیں مربّہ سپوڑتے دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ رشک و حسد کے طوفان کو روکنے کے لیے بند باندھ رہی ہوں۔ یہ کریم چربی کی چٹانوں کی صورت میں اُن کے جسم کے قلعے کو ناقابلِ تسخیر بنا دے گی۔ پھر شاید دل میں یوں ٹیسیں نہ اُٹھیں گی۔ بھیّا جی اور شبنم کی مسکراتی ہوئی آنکھوں کے ٹکراؤ سے بھڑکنے والے شعلے ان پتھریلی دیواروں کو نہ پگھلا سکیں گے۔

"خدا کے لیے بس کرو۔۔۔ ڈاکٹر بھی منع کر چکا ہے۔ ایسا بھی کیا چٹورپن۔" بھیّا نے کہہ ہی دیا۔ موم کی دیوار کی طرح بھابی پگھل گئیں۔ بھیّا کا نشتر چربی کی تہوں کو چیرتا ہوا ٹھیک دل میں اتر گیا۔ موٹے موٹے آنسو بھابی کے پھولے ہوئے گالوں پر پھسل پڑے۔ سسکیوں نے جسم کے ڈھیر میں زلزلہ پیدا کر دیا۔ دبلی پتلی نازک لڑکیاں لطیف اور سہانے انداز میں روتی ہیں۔ مگر بھابی کو روتے دیکھ کر بجائے دکھ کے ہنسی آتی تھی۔ جیسے کوئی روئی کے بھیگے ہوئے ڈھیر کو ڈنڈوں سے پیٹ رہا ہو۔

وہ ناک پونچھتی ہوئی اُٹھنے لگیں۔ مگر ہم لوگوں نے روک لیا۔ اور بھیّا کو ڈانٹا۔ خوشامد کر کے واپس انھیں بٹھا لیا۔ بیچاری ناک سُڑکاتی بیٹھ گئیں۔ مگر جب انھوں نے کافی میں تین چمچے شکر ڈال کر کریم کی طرف ہاتھ بڑھایا تو ایک دم ٹھٹک گئیں۔ سہمی ہوئی نظروں سے شبنم اور بھیّا کی طرف دیکھا۔ شبنم بمشکل اپنی ہنسی روکے ہوئے تھی۔ بھیّا مارے غصّے کے روہانسے ہو رہے تھے۔ وہ ایک دم بھنّا کر اُٹھے۔ اور جا کر برآمدے میں بیٹھ گئے۔ اس کے بعد حالات اور بگڑے۔ بھابی نے کھلم کھلا اعلانِ جنگ کر دیا۔ کسی زمانے میں بھابی کا پٹھانی خون بہت گرم تھا۔ ذرا سی بات پر ہاتھا پائی پر اُتر آیا کرتی تھیں۔ اور بارہا بھیّا سے خفا ہو کر بجائے منھ پھلانے کے وہ خونخوار بلّی کی طرح اُن پر ٹوٹ پڑتیں۔ ان کا منھ کھسوٹ ڈالتیں۔ دانتوں سے گریبان کی دھجیاں اُڑا دیتیں۔ پھر بھیّا اُنھیں اپنی ہی بانہوں میں جکڑ کر بے بس کر دیتے۔ اور وہ اُن کے سینے سے لگ کر پیاسی ڈری ہوئی چڑیا کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتیں۔ پھر ملاپ ہو جاتا۔ اور جھینپتی کھسیاتی وہ بھیّا کے منھ پر لگے ہوئے کھروچوں پر پیار سے ٹنکچر لگا دیتیں۔ ان کے گریبان کو رفو کرتیں اور میٹھی میٹھی شکرگزار آنکھوں سے اُنھیں تکتی رہتیں۔

یہ تب کی بات ہے جب بھابی ہلکی پھلکی تیتری کی طرح طرار تھیں۔ لڑتی ہوئی چھوٹی سی پشّی بلّی معلوم ہوتی تھیں۔ بھیّا کو اُن پر غصّہ آنے کے

بجائے اور شدت سے پیار آتا۔ مگر جب سے اُن پر گوشت نے جماد بول دیا تھا وہ بہت ٹھنڈی پڑ گئی تھیں۔ انھیں اب تو غصہ ہی نہ آتا۔ اور اگر آتا بھی تو فوراً ادھر اُدھر کام میں لگ کر بھول جاتیں۔

اُس دن انھوں نے اپنے بھاری بھرکم ڈیل کو بھول کر بھیا پر حملہ کر دیا۔ بھیا صرف ان کے بوجھ سے دھکا کھا کر دیوار سے جا چپکے روئی کے گٹھر کو یوں لڑھکتے دیکھ کر اُنھیں سخت گھن آئی۔ نہ غصہ ہوئے، نہ بگڑے، شرمندہ اداس سر جھکائے کمرے سے نکل بھاگے۔ بھابی وہیں پسر کر رونے لگیں۔

بات اور بڑھی۔ اور ایک دن بھیا کے سالے آ کر بھابی کو لے گئے۔ طفیل بھابی کے چچا زاد بھائی تھے۔ انھیں دیکھ کر وہ بچوں کی طرح اُن سے لپٹ کر رونے لگیں۔ انھوں نے بھابی کو پانچ سال بعد دیکھا تھا۔ وہ گول گنبد کو دیکھ کر تھوڑی دیر کے لیے سٹ پٹائے۔ پھر انھوں نے بھابی کو ننھی بچی کی طرح سینے سے لگا لیا۔ بھیا اُس وقت شبنم کے ساتھ کرکٹ کا میچ دیکھنے گئے ہوئے تھے۔ طفیل نے شام تک ان کا انتظار کیا۔ وہ نہ آئے تو مجبوراً بھابی اور بچوں کا سامان تیار کیا گیا۔

جانے سے پہلے بھیا گھڑی بھر کو کھڑے کھڑے آئے۔

"دہلی کے مکان میں نے اُن کے مہر میں دیے۔" انھوں نے رکھائی سے طفیل سے کہا۔

"مہر؟" بھابی تھرتھر کانپنے لگی۔

"ہاں ۔۔ طلاق کے کاغذات وکیل کے ذریعہ پہنچ جائیں گے۔

"مگر طلاق ۔۔۔ طلاق کا کیا ذکر ہے؟"

"اسی میں بہتری ہے۔"

"مگر ۔۔۔ بچے ۔۔۔؟"

"یہ چاہیں تو انھیں لے جائیں ۔۔۔ ورنہ میں نے بورڈنگ میں انتظام کر لیا ہے۔"

ایک چیخ مار کر بھابی بھیا پر جھپٹیں ۔۔۔ مگر انھیں کھسوٹنے کی ہمت نہ پڑی۔ سہم کر ٹھٹھک گئیں۔

اور پھر بھابی نے اپنی نسوانیت کی پوری طرح بے آبروئی کر ڈالی۔ وہ بھیا کے پیروں پر لوٹ گئیں۔ ناک رگڑ ڈالی۔

"تم اُس سے شادی کر لو۔ میں کچھ نہ کہوں گی۔ مگر خدا کے لیے مجھے طلاق نہ دو۔ میں یوں ہی زندگی گزار دوں گی۔ مجھے کوئی شکایت نہ ہو گی۔"

مگر بھیا نے نفرت سے بھابی کے تھل تھل کرتے ہوئے جسم کو دیکھا۔ اور منہ موڑ لیا۔

"میں طلاق دے چکا۔ اب ۔ کیا ہو سکتا ہے؟"

مگر بھابی کو کون سمجھاتا۔ وہ بلبلائے چلی گئیں۔

"بے وقوف ۔" طفیل نے ایک ہی جھٹکے میں بھابی کو زمین سے اٹھا لیا۔ "گدھی کہیں کی، چل اُٹھ۔" اور وہ اُسے گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔

کیا دردناک سماں تھا۔ بچے پھوٹ پھوٹ کر رونے میں بھابی کا ساتھ دے رہے تھے۔ اماں خاموش ایک ایک کا منھ تک رہی تھیں۔ ابا کی موت کے بعد اُن کی گھر میں کوئی حیثیت نہیں رہ گئی تھی۔ بھیا تو دمختار تھے۔ بلکہ ہم سب کے سرپرست تھے۔ اماں اُنھیں بہت سمجھا کر ہار چکی تھیں۔ انھیں اس دن کی اچھی طرح خبر تھی۔ مگر کیا کر سکتی تھیں۔

بھابی چلی گئیں ۔۔۔ فضا ایسی خراب ہوگئی تھی کہ بھیا اور شبنم بھی شادی کے بعد ہل اسٹیشن چلے گئے ۔

سات آٹھ سال گزر گئے۔ کچھ کم و بیش ٹھیک یاد نہیں۔ ہم سب اپنے اپنے گھروں کی ہوئیں۔ اماں کا انتقال ہو گیا۔ ابا کے بعد وہ بالکل گم سم ہو کر رہ گئی تھیں۔ انھوں نے بھابی کی طلاق پر بہت رونا پیٹنا مچایا۔ مگر بھیا کے مزاج سے وہ واقف تھیں۔ وہ ابا کی بھی نہیں سنتے تھے۔ کماؤ پوت اپنا آپ مالک ہوتا ہے۔

آشیانہ اُجڑ گیا۔ بھرا پُرا گھر سنسان ہو گیا۔ سب اِدھر اُدھر اُڑ گئے۔ سات آٹھ سال آنکھ جھپکتے نہ جانے کہاں گم ہو گئے۔ کبھی سال دو سال میں بھیا کی کوئی خیر خبر مل جاتی۔ وہ زیادہ تر ہندوستان سے باہر ملکوں کی چک پھیریوں میں اُلجھے رہے۔ مگر اُن کا خط آیا کہ وہ بمبئی آ رہے ہیں تو بھولا بسرا بچپن پھر سے جاگ اُٹھا۔ بھیا جی ٹرین سے اُترے تو ہم دونوں بچوں کی طرح لپٹ گئے۔ شبنم مجھے کہیں نظر نہ آئی۔ اُن کا سامان اُتر رہا تھا۔ جیسے ہی بھیا سے اُس کی خیریت پوچھنے کو مڑی دھپ سے ایک وزنی ہاتھ میری پیٹھ پڑا۔ اور کئی من کا گرم گرم گوشت کا پہاڑ مجھ سے لپٹ گیا۔

"بھابی!" میں نے پلیٹ فارم سے نیچے گرنے سے بچنے کے لیے کھڑکی میں جھول کر کہا۔ زندگی میں میں نے شبنم کو کبھی بھابی نہ کہا تھا۔ وہ لگتی بھی تو شبنم ہی تھی۔ مگر آج میرے منھ سے بے اختیار بھابی نکل گیا۔ شبنم کی پھوار ۔۔۔ اِن چند سالوں میں گوشت اور پوست کا تودا کیسے بن گئی؟ میں نے بھیا کی طرف دیکھا۔ وہ ویسے ہی دراز قد اور چھریرے تھے۔ ایک تولہ گوشت اِدھر نہ اُدھر۔ وہی کمسن لڑکوں جیسے گھنے بال۔ بس دو چار سفید چاندی کے تار کنپٹیوں پر جھانکنے لگے تھے جن سے وہ اور بھی حسین اور باوقار معلوم ہونے لگے تھے۔ وہ کے ویسے چٹان کی طرح جمے ہوئے تھے۔ لہریں تڑپ تڑپ کر چٹان کی اور لپکتی ہیں۔ اپنا سر اُس کے قدموں میں دے مارتی ہیں۔ پاش پاش ہو کر بکھر جاتی ہیں۔ معدوم ہو جاتی ہیں۔ ہار تھک کر واپس ہو جاتی ہیں۔ کچھ وہیں اُس کے قدموں میں دم توڑ دیتی ہیں۔ اور نئی لہریں پھر سر فروشی کے ارادے سمیٹے چٹان کی طرف کھنچی چلی آتی ہیں۔

اور چٹان؟ ۔۔۔ ان سجدوں سے دُور ۔۔۔ طنز سے مسکراتا رہتا ہے۔ اٹل، لاپروا اور بے رحم! جب بھیا نے شبنم سے شادی کی تو ہی نے کہا تھا ۔۔۔ شبنم آزاد لڑکی ہے۔ پکّی عمر کی ہے ۔۔۔ بھابی ۔۔۔ توبہ، میں نے شہناز کو ہمیشہ بھابی ہی کہا ۔۔۔ ہاں تو شہناز بھولی اور کمسن تھی کے قابو میں آگئی۔ یہ ناگن اسے ڈس کر بے سُدھ کر دے گی۔ انھیں مزہ چکھائے گی۔

مگر مزا تو لہروں کو صرف چٹان ہی سکھا سکتا ہے۔

"بچے بورڈنگ میں ہیں۔ چھٹی نہیں تھی اُن کی ۔" شبنم نے کھٹی ڈکاروں بھری سانس میری گردن پر چھوڑ کر کہا۔ اور میں حیرت سے اس گوشت کے ڈھیر میں اس شبنم کی پھوار کو ڈھونڈ رہی تھی جس نے شہناز کے پیار کی آگ کو بجھا کر بھیا کے کلیجے میں نئی آگ بھڑکا دی تھی۔ مگر یہ کیا! بجائے اس آگ میں بھسم ہو جانے کے بھیا تو اور بھی سونے کی طرح تپ کر نکھر آئے تھے۔ آگ خود اپنی تپش میں بھسم ہو کر راکھ کا ڈھیر بن گئی تھی۔ بھابی مکھن کا ڈھیر تھی ۔۔۔ مگر شبنم تو جھلسی ہوئی مٹیالی راکھ تھی۔ اس کا سانولا کندنی رنگ مری ہوئی چھپکلی کے پیٹ کی طرح اور زرد ہو چکا تھا۔ شربت گھلی ہوئی آنکھیں گدلی اور بے رونق ہو گئی تھیں۔ پتلی ناگن جیسی لچکتی ہوئی کمر کا کہیں دُور دُور تک پتہ نہ تھا۔ وہ مستقل طور پر حاملہ معلوم ہوتی تھی۔ وہ نازک نازک لچکیلی شاخوں جیسی بانہیں مگدر کی طرح گاؤ دُم ہو گئی تھیں۔ اس کے چہرے پر پہلے سے زیادہ پوڈر تھپا ہوا تھا۔ آنکھ مسکارہ سے لتھڑی ہوئی تھیں۔ بھنویں شاید غلطی سے زیادہ نُچ گئی تھیں جیسی اتنی گہری پنسل گھسنا پڑی تھی۔

بھیا رٹز میں ٹھہرے۔ رات کو ڈنر پر ہم بھی وہیں پہنچ گئے۔

کیبرے اپنے پورے عروج پر تھا۔ مصری حسینہ اپنے چھاتی جیسے پیٹ کو مروڑیاں دے رہی تھی۔ اُس کے کولھے دائروں میں لچک رہے

۔ سڈول مرمریں بازو ہوا میں تھرتھرا رہے تھے۔ باریک شفان میں سے اُس کی روپہلی ٹانگیں ہاتھی دانت کے تراشے ہوئے ستونوں کی طرح پھڑک رہی تھیں ۔ بھیّا کی بھوکی آنکھیں اُس کے جسم پر کنکھجوروں کی طرح رینگ رہی تھیں ۔ وہ بار بار اپنی گردن پر لگا نیلی چوٹ سہلا رہے تھے بھابی جو کبھی شبنم تھی ۔ مصری رقاصہ کی طرح لہراتی ہوئی بجلی تھی' جو ایک دن بھیّا کے حواس پر گری تھی ر آج ریت کے تودے کی طرح بھسکی بیٹھی تھی۔ اُس کے موٹے موٹے گال خون کی کمی اور مستقل بدہضمی کی وجہ سے ممی کی طرح زردی مائل سبز ہو رہے تھے۔ نیان لائٹس کی روشنی میں اُس کا رنگ دیکھ کر ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کسی اجلے ناگ نے اُسے ڈس لیا ہو۔ مصری رقاصہ کے کولھے طوفان برپا کر رہے تھے۔ اور بھیّا جی کے دل کی ناؤ اِس بھنور میں چک پھیریاں کھا رہی تھی۔ پانچ بچوں کی ماں شبنم ۔ جو اب بھابی بن چکی تھی، سہمی سہمی نظروں سے اُنھیں تک رہی تھی۔ دھیان بٹانے کے لیے وہ تیزی سے بھنا ہوا مرغ ہڑپ کر رہی تھی۔

آرکسٹرا نے ایک بھرپور سانس کھینچی ۔ سانز کراہے ۔ ڈرم کا دل گونج اُٹھا۔ مصری رقاصہ کی کمر نے آخری جھکولے لیے اور نڈھال ہو کر فرش پر پھیل گئی ۔

ہال تالیوں سے گونج رہا تھا ۔ شبنم کی آنکھیں بھیّا جی کو ڈھونڈ رہی تھیں ۔ بیرا تر و تازہ راسبھری اور کریم کا جگ لے آیا۔ بےخیالی میں شبنم نے پیالہ راسبھریوں سے بھر لیا ۔ اُس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ آنکھیں چوٹ کھائی ہرنیوں کی طرح پریشان چوکڑیاں بھر رہی تھیں۔

بھیڑ بھاڑ سے دُور ۔ نیم تاریک بالکنی میں بھیا کھڑے مصری رقاصہ کا سگریٹ سلگا رہے تھے۔ اُن کی پرشوق نگاہیں رقاصہ کی نشیلی آنکھوں سے اُلجھ رہی تھیں۔ شبنم کا رنگ اُڑا ہوا تھا۔ وہ ایک بے ہنگم پہاڑ کی طرح گم سم بیٹھی تھی۔ شبنم کو اپنی طرف تکتا دیکھ کر بھیّا رقاصہ کا بازو تھامے اپنی میز کی طرف لوٹ آئے۔ اور ہمارا تعارف کرایا۔

"میری بہن ۔" انھوں نے میری طرف اشارہ کیا۔ رقاصہ نے لپک کر میرے وجود کو مان لیا۔

"میری بیگم ۔" اُنھوں نے ڈرامائی انداز میں کہا۔ جیسے کوئی میدانِ جنگ میں کھایا ہوا زخم کسی کو دکھا رہا ہو۔ رقاصہ دم بخود رہ گئی۔ جیسے اُس نے اُن کی رفیقۂ حیات کو نہیں خود اُن کی لاش کو خون میں غلطاں دیکھ لیا ہو۔ وہ ہیبت زدہ ہو کر شبنم کو گھورنے لگی۔ پھر اُس نے اپنے کلیجے کی ساری ممتا اپنی آنکھوں میں سمو کر بھیّا کی طرف دیکھا۔ اس ایک نظر میں لاکھوں افسانے پوشیدہ تھے۔ "اُف یہ ہندوستان جہاں جہالت سے کیسی کیسی پیاری ہستیاں رسم و رواج پر قربان کی جاتی ہیں۔ قابلِ پرستش ہیں وہ لوگ اور قابلِ رحم بھی جو ایسی ایسی سزائیں بھگتتے ہیں۔"

شبنم میری بھابی نے رقاصہ کی نگاہوں میں یہ سب کچھ پڑھ لیا۔ اس کے ہاتھ لرزنے لگے۔ پریشانی چھپانے کے لیے اُس نے کریم کا جگ اُٹھا کر رسبھریوں پر انڈیل دیا اور چپ ہو گئی۔

بیچارے بھیّا جی! ہینڈسم اور مظلوم ۔ سورج دیوتا کی طرح حسین اور رومینٹک شہد بھری آنکھوں والے بھیّا جی چٹان کی طرح اٹل ۔ ایک امر شہید کا روپ سجائے بیٹھے مسکرا رہے تھے۔

ایک لہر چور چور اُن کے قدموں میں پڑی دم توڑ رہی تھی

دوسری نئی نویلی لچکتی ہوئی لہر اُن کی پتھریلی بانہوں میں سمانے کے لیے بے چین اور بے قرار تھی۔

فرصت کے لمحات کا بہترین ساتھی۔ ماہنامہ "نقش" کراچی

انور

جنگ۔ کراچی

اُلّو، ٹیکسی اور اِنسان

جب ادب کی خدمت کرتے کرتے ہم بھوک کے مرنے لگے تو میرے دوست نے کہا۔

" یار دیکھو ہم ادب کی فکر میں دبلے ہوئے جا رہے ہیں ہمیں اینیمیا ہو گیا ہے۔ ہمارے جسموں کو خون کی سخت ضرورت ہے۔ اور دیکھو یار ہمارا ادب ہم کو خون نہیں دے گا کیونکہ ہمارا ادب خود اینیمیا میں مبتلا ہے اور شاید یہ بات بھی ہے کہ ہمارے ادب کے خون کی کیٹیگری اور ہمارے خون کی کیٹگری ایک نہیں ہیں اور اگر ایک ہیں بھی تو بھی ادب میں اپنا خون نہیں دے گا۔ بلکہ الٹا ہم سے مانگے گا۔ اس طرح ادب کی خدمت کرتے ہوئے ہمارا رہا سہا خون بھی خشک ہو جائے گا۔ اس لئے میرا مشورہ مانو اور چلو ہم کوئی جوتوں کی دوکان یا پان، بیڑی سگریٹ کا کھوکھا یا ہیر کٹنگ سیلون کھول لیں"۔

میں نے اپنے دوست کا مشورہ نہ مانا اور اپنے خون سے ادب کے پودوں کی آبیاری کرتا رہا۔ جب میں بالکل قریب المرگ ہو گیا تو میں ٹیکسی کی بزنس کرنے پر رضامند ہو گیا۔

ہم نے ایک بنک کو جو عوامی قرضہ جات دیتا ہے۔ قرض کے لئے درخواست دی۔ ہم نے لکھا! جناب والا! ہم نے اپنی زندگیاں عوامی ادب پیدا کرنے کے لئے وقف کر دی ہیں۔ اس لئے ہمیں عوامی قــرضہ جات کی مد میں سے قرضہ دیا جائے۔ ہمارا استدلال اس قدر طاقت ور تھا کہ ہمیں فوراً قرضہ مل گیا۔

چنانچہ ہم نے ایک ٹیکسی خریدی اور انٹرنیشنل ٹیکسی سروس کے نام سے ایک کمپنی قائم کی۔ میں اس کا مینجنگ ڈائریکٹر بنا اور میرا دوست ٹرانسپورٹ افسر۔ کمپنی کے مقاصد میں یہ واضح کر دیا گیا تھا کہ ہم نے تمام عمر سرمایہ داری کے خلاف جنگ کی ہے اب ہم خود سرمایہ دار بن کر یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ سرمایہ داروں کو مزدوروں کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیئے۔

ہم نے اخباروں میں ایک ٹیکسی ڈرائیور کے لئے اشتہار دیا۔ پانچ سو ٹیکسی ڈرائیوروں کی درخواستیں موصول ہوئیں۔ میرے ٹرانسپورٹ افسر نے سب کو انٹرویو کے خط لکھ دیئے اور ایک سوالنامہ تیار کیا۔ سوالنامہ کا آخری سوال بڑا عجیب تھا۔ اس میں پوچھا گیا تھا کہ اُلّو سے بڑا بے وقوف کون ہوتا ہے۔ میرے ٹرانسپورٹ افسر نے کہا کہ اگر ٹیکسی ڈرائیور نے اس سوال کا صحیح جواب دے دیا تو اس کو ملازم رکھ لیا جائے گا۔ ورنہ نہیں۔ جب میں نے پوچھا کہ اس سوال کا صحیح جواب کیا ہے تو میرے ٹرانسپورٹ افسر نے کہا: اس سوال کا صحیح جواب یہ ہے کہ اُلّو سے بڑا بے وقوف وہ ہوتا ہے جو ٹیکسی کو مقررہ رفتار سے زیادہ تیز چلائے۔

انٹرویو کے دن کسی نے اس سوال کا صحیح جواب نہ دیا۔

آخر ایک ٹیکسی ڈرائیور ایسا آیا جس نے اس عجیب سوال کا عجیب جواب دیا۔ وہ بورڈ کے سامنے بے خوف و خطر بیٹھ گیا۔ بورڈ میں ہم دونوں تھے۔

مینجنگ ڈائریکٹر اور ٹرانسپورٹ افسر۔

ٹرانسپورٹ افسر نے تمام سوالوں کے بعد پوچھا۔

" اچھا یہ بتاؤ کہ اُلو سے بڑا بے وقوف کون ہوتا ہے ؟"

ٹیکسی ڈرائیور نے فوراً جواب دیا۔

" دو اُلو۔"

ہم حیران ہوگئے، اور حیران ہو کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

معلوم نہیں مجھے یہ جواب کیوں پسند آیا۔ میں نے اپنے ٹرانسپورٹ افسر کی مخالفت کے باوجود اس ٹیکسی ڈرائیور کو ملازم رکھ لیا۔

دوسرے دن ٹیکسی ڈرائیور ٹیکسی لے کر چلا گیا۔

ہمارا ارادہ پہلے ہی دن سرمایہ دار بننے کا تھا اس لئے ہم شام کو کمپنی کے دفتر میں ٹیکسی کے آنے کا شدت سے انتظار کرنے لگے۔

جب ٹیکسی واپس آئی اور ہم نے ٹیکسی ڈرائیور کے چہرے پر دولت کی روشنی دیکھی تو ہمیں ایسا محسوس ہوا جیسے ہمارے محلے میں کسی بینک کی شاخ کھل گئی ہے۔

ٹرانسپورٹ افسر نے پوچھا۔

" ڈرائیور۔ کتنا روپیہ کمایا ؟"

ڈرائیور نے جواب دیا۔

" آج ہم نے روپیہ نہیں کمایا، ثواب کمایا ہے۔"

ہم دونوں بھنا کر اکٹھے بولے۔

" کیا مطلب ہے تمہارا ؟"

اس کے جواب میں اس نے ہمیں یہ قصہ سنایا۔

" آج صبح ہمارے ٹیکسی اسٹینڈ کے سامنے ایک بس الٹ گئی۔ گیارہ آدمی موقع پر ہی مر گئے۔ بہت سے شدید زخمی ہو گئے۔ اردگرد سے آدمی آ کر جلدی جلدی مُردوں اور زخمیوں کی جیبوں سے نقدی اور کلائیوں سے گھڑیاں اور عورتوں کے زیورات نکالنے لگے۔ چند ایک ایسے بھی تھے جو ان کو ایسا کرنے سے منع کر رہے تھے اور زخمیوں کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ ان میں سے کچھ ہمارے ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف بھاگے اور ٹیکسی ڈرائیوروں کو زخمیوں کی جان بچانے کے لئے ہسپتال لے جانے کی درخواست کی۔ میرے سوا تمام ڈرائیوروں نے یہ کہہ کر ہسپتال جانے سے انکار کر دیا کہ زخمیوں کے خون سے اُن کی ٹیکسیاں خراب ہو جائیں گی۔ میں ایک نئے شادی شدہ جوڑے کو جسے شدید زخم آئے تھے۔ دولہا کے باپ اور دلہن کے بھائی کے ساتھ جن کو معمولی چوٹیں آئی تھیں اپنی ٹیکسی میں سوار کر کے ہسپتال لے گیا۔ لیکن دولہا نے ہسپتال پہنچنے سے پہلے ہی دم توڑ دیا۔ اس لئے میں نے دلہن اور اُس کے بھائی کو ہسپتال میں چھوڑا اور دولہا کی میت اور دولہا کے باپ کو لے کر واپس ان کے گھر کی طرف چل پڑا۔ جب ہم دولہا کے گھر پر پہنچے تو خبر ملی کہ ہسپتال میں دلہن بھی فوت ہو گئی ہے۔ چنانچہ دولہا کا باپ میری ٹیکسی میں پھر ہسپتال آیا اور ہم دلہن کی میت لے کر دولہا کے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ دولہا کے گھر پر پہنچ کر دلہن کی میت کو ایک چارپائی پر دولہا کی میت کے پاس رکھ دیا گیا۔ میں نے اداس نظروں سے دولہا اور دلہن کی میتوں کی طرف دیکھا اور ٹیکسی اسٹارٹ کر دی۔

جونہی ٹیکسی چلی، دولہا کا باپ دس دس روپے کے کئی نوٹ لئے ہوئے میری طرف بھاگا آیا اور بولا۔ ٹھہرو، بیٹا تم نے ابھی کرایہ نہیں لیا۔ میں نے جواب دیا بابا میں کرایہ نہیں لوں گا۔ تمہارا تو سب کچھ لُٹ چکا ہے، تمہارے پاس کرایہ دینے کے لئے کہاں ہے ؟ اللہ تمہیں صبر دے۔"

ٹرانسپورٹ افسر اچھل کر کرسی سے اٹھا اور ٹیکسی ڈرائیور کا گریبان پکڑ کر بولا۔

"او الّو اور بیوقوف تو نے میٹر کا کرایہ وصول نہیں کیا؟"

ڈرائیور نے کہا۔

"نہیں۔"

ٹرانسپورٹ افسر نے چلا کر پوچھا۔

"کیوں نہیں؟"

ڈرائیور نے جواب دیا۔

"کیونکہ میں اُلّو ہوں، بے وقوف ہوں!"

ڈرائیور نے یہ جملے ایسے لہجے میں کہے جس کے معنی یہ تھے کہ اگر تم نے پھر مجھے اُلّو کہا تو یہاں ایک اُلّو نہیں ہوگا۔ دو اُلّو ہوں گے۔

میں نے بیچ میں دخل دیتے ہوئے کہا

"اچھا ڈرائیور، اس وقت تو تم نے کرایہ وصول نہیں کیا اس کے بعد کا حساب دو۔"

ڈرائیور بولا۔

"اس کے بعد بھی میری ٹیکسی دوسرے زخمیوں اور لاشوں کو ٹھکانے لگانے میں مشغول رہی۔ آج میں سارا دن کوئی سواری نہیں لے سکا ہوں!"

ٹرانسپورٹ افسر طیش میں آگیا۔

"ہاں یہ تیرے باپ کی ٹیکسی ہے نا۔ اس میں جو پٹرول خرچ ہوتا ہے وہ مفت آتا ہے۔"

ڈرائیور بھی طیش میں آگیا۔

"صاحب، آپ کا کتنا نقصان ہوا ہے؟"

ٹرانسپورٹ افسر نے کہا۔

"ایک سو روپے سے کم کیا ہوگا۔"

ڈرائیور بولا۔

"تو یہ میری تنخواہ سے کم ہے۔ میری تنخواہ ڈیڑھ سو روپے ہے۔ میری تنخواہ سے کاٹ لیجئے گا۔"

یہ کہہ کر وہ گاڑی کو جس پر جگہ جگہ خون کے دھبے پڑے ہوئے تھے دھونے کے لئے پریشر پمپ پر لے گیا۔ لیکن جب وہ پریشر پمپ سے گاڑی کو دھو کر لایا تو وہ ڈسمس ہو چکا تھا۔

ناشر ... شمس زبیری

سرورق ... ناتھن لال

کتابت ... محی الدین صابر

طباعت ... انٹرنیشنل پریس ـــ کراچی

اشاعت ... جون جولائی ۱۹۶۵ء

مقام اشاعت:- کاشانۂ اردو ۲/۶ - اکبر روڈ صدر کراچی ۳

۵۵۵

کھڑکی میں بیٹھے ہوئے نرملا نے گزرے ہوئے برسوں کی طرف نگاہ ڈالی۔ پندرہ سال پہلے اُس کی عمر صرف پندرہ برس کی تھی اور وہ لاہوری دروازے کے اندر ایک چھوٹے سے مکان میں اپنی ماں کے ساتھ رہتی تھی۔ اُس کا باپ بچپن میں مر چکا تھا۔ صرف ماں زندہ تھی۔ ماں نے اُسے کیسے پالا پوسا تھا؟ اس کے متعلق اُسے کوئی خاص علم نہ تھا۔ اور نرملا نے یہ جاننے کی کوئی خاص کوشش بھی نہ کی۔ پانچویں جماعت تک ماں نے نرملا کو پڑھایا تھا۔ اس کے بعد وہ ناچ سیکھنے لگی تھی۔ چند برسوں میں وہ نرت سے اچھی خاصی واقف ہو گئی۔ جب کبھی وہ کوئی فلمی گانا سن لیتی تو خود بخود اُس کے پاؤں ناچ کی دُھن میں تھرکنے لگتے۔ نہ جانے اُسے ناچ سے اتنا عشق کیوں ہو گیا تھا۔ گھر میں کوئی نہ ناچتا تھا۔ نہ باپ کو اس قسم کے آرٹ سے شغف تھا۔ اور نہ ہی ماں کو۔ اور دُور دراز سے جو رشتے دار ملنے آتے انھیں تو اس پیشے یا آرٹ سے سخت نفرت تھی۔ صرف اُس کی ماں ہی تھی جس نے اُسے ناچنے کے فن میں دلچسپی لینے کی ترغیب دی۔ یوں نرملا کا قد خاصا لمبا تھا۔ سرو قد کہنے میں کوئی مبالغہ نہ ہو گا۔

لمبی لمبی مخروطی انگلیاں، مضبوط اور توانا بانہیں۔ چہرے کا رنگ گندمی نہ تھا۔ بلکہ گندمی رنگ سے زیادہ صاف اور شفاف۔ ماتھا چھوٹا۔ بال گہرے سیاہ۔ آنکھیں موٹی موٹی، چہرا لمبوترا۔ اور پاؤں بے حد حسین تھے۔ اگر کوئی آدمی پہلے نرملا کے پاؤں دیکھ لیتا تو شاید اُس کے چہرے کی طرف نگاہ نہ ڈالتا۔ یوں تو اچھی خاصی ڈیل ڈول کی تھی، جسم کی ہڈیاں دُہری تھیں، وہ نازک اندام سی لڑکی نہ تھی، کہ چھوئی موئی کی طرح بل کھا کر سمٹ ہی جاتی۔ جب سامنے کھڑی ہو جاتی تو اک باوقار سی لڑکی لگتی۔ کبھی کبھار تو یوں احساس ہوتا کہ کسی جاٹ کی لڑکی ہے، جس کے باپ نے کھیتوں میں ہل چلایا ہو گا۔ جبھی تو جسم سے ایک توانائی اور مضبوطی کا احساس ہوتا تھا۔ جو بہت کم لڑکیوں کے جسموں سے جھلکتا ہے۔

نرملا کا مستقبل اتنا روشن نہ تھا۔ ماں کی عمر اُس وقت سینتالیس برس سے اوپر ہی تھی۔ اور اُس کا سرمایۂ حیات صرف نرملا تھی۔ اگر نرملا کی پرورش متوسط طبقے میں نہ ہوتی تو نرملا کب کی بازارِ حسن کی نذر ہو جاتی۔ نرملا کی ماں نے اچھے دن دیکھے تھے۔ اصلی دُودھ اور گھی کھایا تھا۔ اور پنجاب کے کھیتوں کا گیہوں اُس کی رگوں میں جوش مارتا تھا۔ اور اُس نے اپنی جوانی میں نہر کے ٹھنڈے پانی میں ڈبکی لگائی تھی۔ اور آم کے درختوں کے تلے بیٹھ کر شیریں آم چوسے تھے۔ نرملا کی ماں آسانی سے اُس راہ کی طرف راغب نہ ہو سکی اور

نہ ہی نرملا کو اُس راہ پر چلا سکی۔

جب لڑکی حسین ہو، جوان ہو، ماں بوڑھی ہو۔ اور گھر کے اندر گھنگرو کھنکتے ہوں تو خود بخود راہ گیروں اور من چلے نوجوانوں کی نگاہیں اس گھر کی طرف اُٹھیں گی۔ نوجوان آوازے کس کر گزر جاتے۔ چند نرملا کو تاکتے رہتے اور جب کبھی اُس کے قد و قامت کو دیکھتے تو کہتے — "یار اگر اس نے ایک چانٹا مار دیا تو میرے عشق کا بھوت نکل جائے گا۔ اس لیے اس گھر میں قدم رکھنے کے لیے کسی ایسے شخص کی ضرورت تھی جو بے حد چالاک اور سمجھ دار ہو۔ جو بات یوں کہے کہ معلوم ہو کہ محض دوستی اور ہمدردی کا غلاف اوڑھ کر اُس نے اِدھر رُخ کیا ہے۔ اُس کے ذہن پر ریشمی زلفوں کا کوئی سایہ نہیں ہونا چاہیے۔ اُس کا قرادا حسینہ کے پائل کی جھنکار اُس کے دل و دماغ پر کوئی اثر نہ ڈال سکے۔ وہ ہوش و حواس کھو کر اس میخانے کا رُخ نہ کرے تو بات بن سکتی ہے۔"

سیٹھ جواد علی اسی محلہ میں رہتا تھا جس نے اینٹوں کے بزنس میں کافی روپیہ کمایا تھا۔ ابھی تیس پنتیس برس کی عمر تھی پیرت ایک شادی کی تھی تین اور شادیاں کرنے کا ارادہ تھا۔ بے حد باتونی۔ رنگت کالی۔ مگر دل کا بڑا ٹمکینی کلر تھا۔ خوبصورت لڑکی دیکھتا تو آنِ واحد میں فریفتہ ہو جاتا۔ سیمنٹ اور چونے کے بیوپار میں کس کو فائدہ نہیں ہوتا۔ مکانوں میں چونا لگانے کے علاوہ جس کا مکان تیار کرتا اُسے بھی چونا لگا دیتا۔ گو تھا اَن پڑھ، مگر سوجھ بوجھ پڑھے لکھوں سے زیادہ تھی۔ کمبخت اگر ذرا بھی خوش شکل ہوتا تو ڈاکٹر وارڈ کی طرح ایک حرم آباد کر لیتا۔

اس لیے جب کبھی نرملا اس کے قریب سے گزرتی تو اُس کا دل چٹکیاں لینے لگتا۔ سارے جسم میں ایک جھرجھری سی آجاتی — وہ جانتا تھا کہ یہ شے اُس کے لیے ممنوع تھی اور اُس کے پہنچ سے باہر تھی۔ مگر انسان اس نامراد دل سے کیا کہے۔ نرملا کو دیکھ کر اس کی رگوں میں خون کیوں جوش مارنے لگتا ہے۔ وہ لڑکی سے کیا کہے۔ کس سے کہے؟ ماں سے یا بیٹی سے؟ اپنے بدصورت چہرے کو نگاہ میں رکھتے ہوئے۔ اور نرملا کی خوبصورتی کا اندازہ کرتے ہوئے یہی مناسب تھا کہ پہلے ماں سے راہ و رسم بڑھائی جائے۔ عید کے دن وہ مٹھائی کا ایک خوبصورت ڈبہ لے کر نرملا کے گھر وارد ہوا۔ سلام دعا کے بعد اُس نے اپنا تعارف کرایا۔ اور کہا — "ماں جی! میں آپ کے محلے میں رہتا ہوں۔ آج عید ہے۔ اس لیے سوچا اسی بہانے مل لوں"۔ نرملا کی ماں نے جواد علی کو دیکھا۔ بڑا ہی بدصورت آدمی تھا۔ لیکن ڈبہ خوبصورت لایا تھا۔ اُس کی باتوں میں چاشنی اور لطافت تھی۔ بات بات میں ماں جی، ماں جی کہتا رہتا۔ جیسے نرملا سے اُسے دلچسپی نہیں۔ طرزِ تکلم میں خوشامدانہ پہلو زیادہ نمایاں تھا۔ اور خوشامد سے تو خدا بھی راضی ہو جاتا ہے۔ نرملا کی ماں تو محض ایک عورت تھی جو جواد علی کا نام سن چکی تھی۔ اُسے معلوم تھا کہ جواد علی ایک امیر آدمی ہے۔ اس لیے نرملا کی ماں نے خاموشی سے مٹھائی کا ڈبہ لے لیا۔ جواد علی نے اِدھر اُدھر دیکھا ضرور۔ مگر اُسے نرملا نظر نہ آئی۔ بس دل ہی دل میں اُس کا قرادا حسینہ کے حسن کی داد دے کر اور ماں جی کو آداب کہہ کر باہر نکل آیا۔

نرملا گھر پہنچی تو ماں نے جواد علی کا ذکر کیا اور ساتھ ہی مٹھائی کا ڈبہ دکھایا۔

نرملا نے جواد علی کا نام سن رکھا تھا مگر اُس کی شکل و صورت نہ دیکھی تھی۔

"ماں کیسی صورت ہے اُس کی؟"

"بس بیٹی، نہ پوچھو بیٹی — دیکھ کر بس قے آ دے۔ کالا کلوٹا۔ مگر باتیں شہد کی طرح میٹھی اور رسیلی کرتا ہے۔"

"ماں! ایسے انسانوں کے پاس لکشمی کیسے آتی ہے؟"

"شاید لکشمی بھی رنگ روپ نہیں دیکھتی۔ اُنھی کے پاس زیادہ آتی ہے جن کے پاس پہلے ہی سے لکشمی ہوتی ہے۔"

"کیا کہنے آیا تھا؟"

"بس یہ ڈبہ دیا اور چلتا بنا ——" ماں یہ کہہ کر خاموش ہوگئی۔

اِدھر جواد علی نے ایک نظر میں بھانپ لیا کہ چکّر چلایا جاسکتا ہے —— ماں اتنی تنگ نظر نہ تھی کہ وہ اُس محدود سے دائرے میں سما نہ سکتا۔ نرملا کی ماں کو اس کا آنا بُرا لگتا تو وہ مٹھائی کا ڈبہ واپس کرتی۔ اگر ماں نے اُس کے آنے جانے پر کوئی روک تھام نہ لگائی تو بیٹی کو رام کرنا مشکل نہیں۔ جواد علی نے نرملا کے گھر آنا جانا شروع کیا۔ اکثر ماں سے ملاقات ہوتی۔ جب کبھی جواد علی آتا کوئی نہ کوئی چیز ساتھ لاتا۔

بڑے ادب اور سلیقے سے بیٹھتا۔ باتیں ماں سے کرتا اور نگاہیں نرملا کو ڈھونڈتیں۔

"بس ماں جی۔ تازہ خربوزوں کا ٹوکرا کیا آیا کہ میں نے سوچا کہ پہلے ماں جی کے پاس چلوں۔ امید ہے اس غریب کا تحفہ قبول کریں گی۔"

"کیوں شرمندہ کرتے ہو بیٹا۔ ارے تم اس علاقے کی ناک ہو۔"

"نہیں ماں جی۔ میں آپ کی جوتیوں کی خاک ہوں۔ بس آپ سے ملنے چلا آتا ہوں۔ آپ کی نظرِ عنایت چاہیے ماں جی —— دولت نے کس کا ساتھ دیا ہے جو میرا ساتھ دے گی۔ بس مجھے تو صرف اللہ پر بھروسہ ہے۔ خدا عزت سے رزق دیتا رہے یہی میری دلی تمنا ہے۔ اچھا ماں جی۔ مجھے اجازت دیجیے گا۔"

"بیٹا کچھ چائے پانی؟"

"پھر کسی دن ماں جی ——"

یہ کہہ کر جواد علی چلا جاتا —— یہ عجیب وغریب سی بات تھی کہ جب کبھی جواد علی آتا تو نرملا گھر میں نہ ہوتی۔ اور ماں بھی نرملا سے جواد علی کے خلوص، ایثار، انسانی دوستی اور بھائی چارے کا ذکر کرتی۔

"بڑا خوش خلق اور ملنسار آدمی ہے نرملا۔"

"کم بخت کی صورت بڑی بدصورت ہے ماں۔"

"سیرت کا جواب نہیں۔"

"سیرت کس نے دیکھی ماں۔ ظاہری خول سے کیا پتہ چلتا ہے ماں کہ انسان کے اندر کیا ہے؟"

"اندر کی بات تو پرماتما ہی جانتے بیٹی۔"

جواد علی نے ماں کو تحفے دے کر اُس پر جادو سا کر دیا۔ سنجیدہ انداز میں باتیں کر کے اپنی شرافت کا سکہ جما لیا۔ جواد علی اب موقعے کی تاک میں تھا کہ وہ نرملا سے بات چیت کا سلسلہ شروع کرے۔ اور یہ دیکھے کہ اس پری جمال لڑکی نے اُس کی شخصیت سے کیا اثر لیا۔ آتے جاتے جواد علی نے یہ محسوس تو کر لیا کہ ان تلوں میں تیل نہیں۔ کبھی کبھار جب جواد علی ماں سے باتیں کرنے لگتا تو وہ سیدھی اپنے کمرے میں چلی جاتی۔ اور جب تک وہ باتیں کرتا رہتا وہ کمرے سے باہر نہ نکلتی۔ جواد علی نے اس نفرت کو محسوس کر لیا۔ وہ سمجھ گیا کہ اگر کھل کر بات کی تو منہ کی کھانی پڑے گی۔ ایک شادی کے بعد دوسری شادی کیسے ممکن تھی۔ وہ مسلمان تھا اور نرملا ہندو۔ وہ بدصورت تھا اور نرملا خوبصورت۔ وہ نرملا سے عمر میں بھی بڑا تھا۔

بس ایک بات میں وہ نرملا سے بہتر تھا کہ وہ امیر تھا۔ ماں اور بیٹی کی بڑی مشکل سے گزر ہوتی تھی۔ اور جواد علی کو اس بات کا احساس تھا۔ روپیہ بہت کچھ کر سکتا ہے۔ وہ کھوٹے کو کھرا بنا سکتا ہے۔ اور سچے کو جھوٹا۔ ان سکوں کے آگے

بڑے بڑوں نے گھٹنے ٹیک دیے۔ یہ تو محض دو عورتیں تھیں۔ اکیلی۔ بے سہارا۔ بے لبس۔

پھر بھی سوچ سمجھ کر قدم رکھنا چاہیے۔ محض روپیوں کی نمائش کر کے انسان نہیں خریدے جاتے۔ کچھ سلیقہ۔ کچھ طور طریقہ وقت اور حالات کو دیکھ کر آگے بڑھنا چاہیے۔ پہلے نرملا کی ماں سے بات کی جائے۔ بڑھیا کے دل میں ڈوب کر اس انمول موتی کو سیپ سے باہر نکالا جائے۔ بس اسی امید پر جواد علی غوطہ زن ہوا۔ اور جب غوطہ لگا کر اُبھرا تو ہاتھ میں نہ سیپ تھا نہ موتی۔ ایک فقیر کی طرح دونوں ہاتھ خالی تھے۔

ماں نے صاف کہہ دیا۔" میں آپ کو اتنی گندی ذہنیت کا انسان نہ سمجھتی تھی۔ سوچ سمجھ کر تو بات کرتے۔ ہم ٹھہرے ہندو آپ مسلمان۔ پھر آپ کی شادی ہو چکی ہے۔ عمر میں نرملا سے بڑے ہیں آپ۔ کسی طرح بھی یہ بات بنتی نظر نہیں آتی۔ دوبارہ ایسی بات منھ سے نہ نکالیے۔ نہیں تو میں بہت بُری طرح پیش آؤں گی —"

جواد علی اپنا سا منھ لے کر چلا گیا۔ جواب سن کر اُسے ایسا محسوس ہوا کہ دل کی بستی پر کسی نے شب خون مارا تھا۔ اور سارا مال و متاع لے کر چلا گیا۔ جواد علی کا شمار بے وقوف عاشقوں میں نہ ہوتا تھا کہ گریبان چاک کر کے کسی ویرانے کی طرف رُخ کرتے — وہ تو بیسویں صدی کا عاشق تھا۔ سیمنٹ اور چونے کا بیوپاری۔ جس نے گھروں کا تعمیر کرنا سیکھا تھا) اُجاڑنا نہیں۔ ناکامی کے بعد اپنے آپ کو ختم کرنا جاہلوں کا کام ہے۔ یوں وہ ایک بات سے پیچھا نہ چھڑا سکے۔ نرملا کی تصویر ان کے دل و دماغ پر ایسی اُبھری کہ جواد علی نے اُسے مٹانے کی بہت کوشش کی مگر یہ تصویر ایسی اُبھری کہ پُرانے نقوش مٹتے گئے۔ اور ایک البیلی، مستانی، شوخ رنگ کی تصویر قطب مینار کی طرح سامنے تن کر کھڑی ہو گئی۔

پانچ برس اور گزر گئے۔ نرملا اور اُس کی ماں نے لاہور چھوڑ کر بمبئی کا رُخ کیا۔ بمبئی تو روشنیوں کا شہر تھا۔ چاندی کے سکّوں سے جگمگاتا ہوا شہر۔ جہاں حسین لڑکیوں کا خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ جہاں روپیوں کی کمی نہیں۔ اور حسن کے پجاریوں کی بھرمار ہے۔ بس لڑکی حسین، خوبصورت اور پُرکشش ہونی چاہیے۔ یوں صرف لڑکی ہی ہو تب بھی چلے گی۔ اور شہر میں کما کھائے گی۔ بھوکی نہیں مرے گی — اور اگر ذرا گورے رنگ کی ہو۔ جسم گولائیوں، محرابوں سے مرصع ہو۔ آواز میں کھنک اور جادو ہو۔ اور زلف ماتھے پر پریشان ہو، چال البیلی اور مستانی ہو۔ آنکھیں نیلی نیلی کسی گہری جھیل کے پانیوں کی طرح۔ اور جب سیاہ زلفیں پانی میں لہرائیں تو آسمان پر کالی گھٹا چھا جائے تو سمجھو الہ دین کا چراغ آپ کے پاس ہے۔ اور اس سے فائدہ نہ اُٹھانا الگ بات ہے۔

نرملا نے اس شہر میں وارد ہوتے ہی طوفان مچا دیا۔ فلمی جوہریوں نے اس موتی کو پرکھ کر ناچنے والی کا رول دیا۔ نرملا کے پاؤں ایسے تھرکے کہ ہر قدم پر نعرۂ تحسین بلند ہونے لگا۔ دو برس میں نرملا ایک جھونپڑے سے نکل کر ایک اچھے خاصے فلیٹ میں وارد ہو گئی۔ اس کے بعد نرملا کے پرستاروں کی تعداد بڑھنے لگی۔ حسن کے پجاریوں نے آگے بڑھ کر نرملا کا ہاتھ تھامنے کے لیے اپنے آپ کو پیش کیا۔ ماں نے سوچا۔ ابھی تو کشتی کی ابتدا ہوئی ہے۔ ان حالات میں نرملا کا کسی ایک دل پھینک عاشق کے ساتھ وابستہ ہو جانا ایک بہت بڑی غلطی ہو گی۔ اور نرملا بھی تو اپنی ماں کی بیٹی تھی۔ جذبات کی رَو میں بہنا بے وقوفی ہے۔ ابھی ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔ روپے کی بہتات نے عقل پر تالا لگا دیا۔ ایک نئے عاشق جاں باز نے کہا — " سندری! اپنا کل جسم میرے لیے وقف کر دو۔ اور میرے سوا کسی اور کو نہ دیکھو" یہ نیا عاشق ماتھے پر تلک لگاتا تھا اور ریشمی دھوتی پہنتا تھا۔ مرغ اور مچھلی بالکل نہ کھاتا۔ مگر نوعمر لڑکیوں کے پیچھے ایسے بھاگتا جیسے گھوڑا ریس میں بھاگتا ہے۔ اور ہر حالت میں فرسٹ آنے کی کوشش کرتا۔ گو پنڈت ہر چرن عمر رسیدہ تھے۔ سر کے بال تقریباً سفید ہو چکے تھے۔ خضاب لگا کر عالم شباب کے مزے لیتے۔ مگر بڑھاپے میں جوانوں سے

سبقت لینے کی کوشش کرتے۔ جب کسی لڑکی کو دل دے بیٹھتے تو پھر روپے پیسے کی پروا نہ کرتے جس کو محبوبہ کہہ دیا اُس کی ہر مانگ کو پورا کرنا اپنا فرضِ اولین سمجھتے۔ نرملا کو دیکھتے ہی کہنے لگے کہ تمھیں ہیروئن بنا دوں گا۔ اگر تم باقی عاشقوں سے آنکھیں پھیر لو۔ نرملا اور اُس کی ماں مان گئی۔ حسن کے پجاری نے اپنی پوری پونجی ایک فلم بنانے میں لگا دی۔ ماں باپ بیوی بچوں کی پروا نہ کی کہ کل اُن کا کیا ہوگا۔ اجی جہنم میں جائیں سب اپنی خواہش کے آگے۔ باقی سب باتیں بے کار تھیں۔ اس دنیا میں انسان بار بار تھوڑے ہی آتا ہے۔ "پریم کی گنگا بہاتے چلو"۔۔۔ فلم بنی اور لگی، فیل ہو گئی۔ نرملا نے جس نے ہیروئن بننے کے بعد بڑے بڑے خواب دیکھے تھے۔ آن واحد میں ان خوابوں کو چکنا چور ہوتے دیکھا۔ ہر چرن اپنا پورا اثاثہ یہ فلم بنانے میں لٹا چکے تھے۔ دوستوں اور رشتہ داروں نے لعنت ملامت کی۔ مگر ان کا کردار نہ بدلا۔ کہیں سے روپے ملتے تو سیدھے نرملا کے گھر کی طرف رخ کرتے۔ نرملا ہارے ہوئے جواری کی طرف رحم بھری نظروں سے دیکھتی اور ایک دو مسکراہٹیں اور ادائیں دکھا کر نکل جاتی۔ ہارا ہوا جواری ہائی بلڈ پریشر کا مریض تھا۔ اُس کا قرابت کی بے وفائیوں کی تاب نہ لا کر راہیِ ملکِ عدم ہوا۔

اِن تین چار برس میں نرملا کی شکل اور شباب میں کچھ تبدیلیاں سی آگئیں۔ انسان جو کچھ کرتا ہے اُس کا اثر صورت اور جسم پر ضرور پڑتا ہے۔ وہ معصومیت اور پاکیزگی جو اُس کے چہرے سے عیاں تھی۔ رفتہ رفتہ کم ہونے لگی۔ حسن اور شباب کا تیکھا پن غائب ہو گیا۔ اور اُس کی جگہ چہرے پر ایک کرختگی سی آگئی۔ جسم پر گوشت کی ایک تہ کا اضافہ ہو گیا۔ اُس میں وہ رعنائی اور کشش نہ رہی۔ پھر بھی تیور وہی تھے۔ ابھی عمر ہی کیا تھی۔ بمبئی میں بے وقوفوں کی کمی نہیں۔ ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔ نرملا بھی موقعے کی تلاش میں تھی۔ کوئی ایسا حسن کا پجاری مل جائے جو دادِ حسن بھی دے اور پوری قیمت بھی۔ اِدھر جو عاشق آئے وہ باتونی اور گپی نکلے۔ زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے۔ پھر چھ آٹھ مہینے کھلا پلا کر آگے بڑھ جاتے۔ اس لیے وہ تمام آرزوئیں اور تمنائیں جو ابھی تک پروان نہ چڑھی تھیں، ابھی تک نگاہوں کے سامنے ناچ رہی تھیں۔

انھیں دنوں جواد علی پھر آدھمکا۔ یہ کمبخت کہاں سے آن ٹپکا۔ جواد علی کا رنگ اور سیاہ ہو گیا تھا۔ جسم فربہ ہو گیا۔ اُس نے بتایا کہ اُس کا دل لاہور میں نہ لگا۔ اور اُس نے اُن کے چلے جانے کے بعد بمبئی کا رُخ کیا۔ یہاں کی مٹی اُسے خوب راس آئی۔ وہی سیمنٹ اور چونے کا بیوپار "ماں جی، ایسا رنگ جما ہے کہ روپیوں کا انبار لگ گیا۔ آپ کی دعا سے دو اور شادیاں کر لی ہیں۔ یعنی اب کل تین عدد بیویاں ہیں، اور مبلغ آٹھ عدد بچے۔ سب بیویوں کو الگ الگ مکان لے دیے ہیں۔ مزے سے کھاتا ہوں، کار میں سیر کرتا ہوں۔ اور بنک بیلنس دن بدن بڑھ رہا ہے۔ آپ کی دعا سے پہلے بھی کسی بات کی کمی نہ تھی۔ اور اب بھی نہیں۔" جواد علی نے کمرے میں نگاہ ڈال کر کہا۔۔۔ "نرملا کہاں ہے ماں جی؟"

"ذرا طبیعت خراب ہے۔ ڈاکٹر سے ملنے گئی ہے۔" نرملا کی ماں نے جواب دیا۔

شاید نرملا کی کمی تھی جسے جواد علی نے شدید طور پر محسوس کیا تھا۔ پھر جواد علی نے اُٹھتے ہوئے کہا۔۔۔ "ماں جی، کسی چیز کی ضرورت ہو تو کہیے گا۔ بس اپنا بچہ سمجھ کر حکم دیجیے۔ اگر آپ کی فرمایش پوری نہ ہو تو لعنت ہے اپنی کمائی پر۔۔۔"

نرملا کی ماں نے محسوس کیا کہ چند برسوں میں سیٹھ جواد علی کافی ڈھیٹ اور منھ پھٹ ہو گیا تھا۔ روپے کی فراوانی نے اُسے کتنا بد اخلاق اور بے شرم بنا دیا۔۔۔ شاید یہ شہر ہی ایسا ہے۔ جو یہاں آتا ہے بڑی جلدی بے شرم اور بے غیرت ہو جاتا ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔

اس دن نرملا اور اُس کی ماں کار میں بیٹھ کر باہر چلی گئیں۔ واپسی پر جواد علی نے نرملا کو کچھ چیزیں خرید دیں۔ اور جب نرملا گھر میں داخل ہوئی تو اُس کے ہاتھ میں جواد علی کی خریدی ہوئی چیزیں تھیں۔ یہ جواد علی کی پہلی فتح تھی۔

اب ہر دوسرے تیسرے دن جواد علی اپنی کار لے کر آجاتا۔ نرملا کی ماں جو فرمائش کرتی جواد علی پوری کرتا۔ نرملا دل ہی دل میں کڑھتی، لڑتی۔ پھر ماں کے کہنے پر سیٹھ جواد علی کے ساتھ سینما دیکھنے چلی جاتی۔ دونوں جوہو پہ سیر کرنے نکل جاتے۔ میرین ڈرائیو پر کار فراٹے بھرتی ہوئی نکل جاتی۔ نہ جانے اس تمام عرصے میں نرملا میں یہ اچانک تبدیلی کیسے آئی کہ اُسے جواد علی اچھا لگنے لگا۔ جس کالے رنگ کو دیکھ کر وہ منہ پھیر لیتی تھی وہی کالا رنگ اُسے بھا رہا تھا۔ کیا یہ روپیوں کا جادو تھا یا جواد علی کے خوشامدانہ طرزِ گفتگو کا اثر یا آنے والی زندگی سے بچنے کے لیے اُس نے یہ راہ اختیار کی تھی۔ اب زندگی کو سنوارنا ہے تو سنوار لو۔ اِدھر جواد علی پر یہ بات ظاہر ہو رہی تھی کہ رات کی رانی راہ راست پر آرہی ہے۔ جواد علی نے دل کھول کر روپیہ صرف کیا۔ اور ساتھ ساتھ نرملا کو اُس کے مستقبل کے متعلق اشارے کرتا رہا۔ "موقع ہے، اپنی زندگی بنا لو۔ میں تو تیرا پرانا عاشق ہوں۔ جنم جنم کا ساتھی۔ لاہور میں تمھیں پہلی بار دیکھا تھا تو اُس وقت صرف ایک شادی کی تھی۔ تمھارے فراق میں دو شادیاں اور کرلیں۔ لیکن تمھیں پانے کے جذبے میں کوئی فرق نہ آیا۔ میں وہ مجنوں نہیں کہ گریباں پھاڑ کر صحرا صحرا جنگل جنگل گھوموں۔ تمھیں پانے کی تمنا فرو ہے۔ اور جب تک زندہ رہوں گا تمھیں پانے کے لیے میرا دل تڑپتا رہے گا۔ اس بے پایاں محبت کے علاوہ دن رات محنت کرتا ہوں۔ اپنی تین بیویوں کو پالتا ہوں۔ اپنے بچّوں کی پرورش کرتا ہوں۔ دوستوں کی مدد کرتا ہوں۔ غریبوں میں روپے تقسیم کرتا ہوں۔ کافی بزنس بڑھا لیا ہے۔ تم میری چوتھی بیوی ہوگی اور میری آخری بیوی ——— نرملا! بدصورت ضرور ہوں مگر دل کا بڑا خوبصورت اور قسمت کا دھنی ہوں۔ نرملا مجھ سے شادی کرلو۔ زندگی بڑے مزے سے کٹے گی۔ تمھارے بھلے کے لیے کہتا ہوں۔ اب زیادہ نہ تڑپاؤ۔ ہاں کردو تو سب سے پہلے نیا فلیٹ خرید کردوں گا۔ نئے فرنیچر سے ایسا سجادوں گا کہ بمبئی کی تمام عورتیں عش عش کر اُٹھیں۔ ان دو کمروں کے چھوٹے سے فلیٹ سے باہر نکلو اور ایک خوش گوار اور باوقار زندگی گزارنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔

اور نرملا جو آج سے دس سال پہلے سیٹھ کی صورت دیکھنا پسند نہ کرتی تھی آج اُس کی باتیں بڑے غور سے سن رہی تھی۔ سوچ رہی تھی وہ کیا جواب دے۔ آج سے دس سال پہلے اس کے خون کا ایک قطرہ بھی اس شخص سے ہم کلام ہونے کے لیے تیار نہ تھا۔ مگر آج قسمت اُلٹا فیصلہ کر رہی تھی۔ ہاں وہ بازی ہار گئی تھی۔ گاڑی پٹڑی سے اتر گئی تھی۔ کیونکہ جواد علی کے ان تمام فقروں کو سن کر دل نے ملامت نہ کی۔ ذہن نے بغاوت نہ کی بس یہی کچھ ہو رہا تھا۔ شاید درست ہو رہا تھا۔ اس عرصے میں نرملا نے جو فرمائش سیٹھ سے کی جواد علی نے اُسے پورا کیا۔ اور یہ مانگیں اس طرح پوری کیں کہ سیٹھ کی گرفت نرملا پر مضبوط ہوتی گئی۔ وہ سنہرے سپنے، جن کی چھاؤں میں اُسے نیند آنے لگی تھی، وہ سپنے اب ٹوٹ پھوٹ گئے تھے وہ سب کچھ کرے گی۔ وہ اپنا نام تک بدل دے گی۔ مذہب میں کیا رکھا ہے۔ نام بدلنے سے کیا ہوتا ہے۔ وہ مندر کب جاتی ہے کہ اب مسجد میں جائے گی۔ ہاں ایک بہتر زندگی گزارنے کے لیے وہ ہر روایت کو توڑ دے گی۔ اور جو کچھ سیٹھ کہے گا کرے گی۔ وہ بھوکی مرنا نہیں چاہتی۔ وہ ان دو کمروں میں رہنا نہیں چاہتی۔ وہ یوں ٹراموں اور بسوں میں گھومنا نہیں چاہتی۔ اب تو کار کا چسکا بھی پڑ گیا تھا۔ پھر ایک دن وہ چپکے سے مہر النسا بن گئی۔ اور سیٹھ کے نئے فلیٹ میں وارد ہوئی۔ سیٹھ نے واقعی اس مکان پہ اچھی خاصی رقم خرچ کی تھی۔ بہترین فرنیچر سے فلیٹ کو سجایا تھا۔ اب سیٹھ جواد علی مہر النسا کے ساتھ رہنے لگا۔ تقریباً چھ ماہ تو خوب گزرے۔ اس کے بعد لڑائی ہوگئی۔ مہر النسا نے سوچا تھا کہ اُس نے اتنی بڑی قربانی کرکے سیٹھ کو جیت لیا ہے۔ لیکن مسلسل لڑائیوں سے یہ بات مہر النسا پر عیاں ہوگئی کہ سیٹھ بھی مجموعۂ اضداد ہے۔ کمبخت کسی بیوی کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں۔ اُس کے دل میں ہر بیوی کی جگہ ہے۔ وہ آٹھ دن میں دو راتیں اُس کے ہاں گزارتا۔ اور باقی چھ راتیں دوسری بیویوں کے پاس۔ مہر النسا نے ہر حربہ استعمال کرکے دیکھ لیا۔ رات رات جاگ کے دیکھ لیا۔ فاقے کرکے دیکھ لیا۔

خود بھی تو ...... یہ سوچ کر چونکی ۔

اتنے میں نرملا آگئی ۔ اور ماں نے سیٹھ جواد علی کا ذکر کیا ۔

"ماں اُس کا رنگ کیسا ہے ؟"

"اس کا رنگ تو یہاں خوب چمکا ہے ۔ بیٹی ! کار میں گھومتا ہے ۔ نرملا مردوں کی رنگت کوں دیکھتا ہے ۔ اُن کا تو بنک بیلنس دیکھا جاتا ہے ۔"

"سچ کہتی ہو ماں ، پھر بھی مجھے اس شخص سے نہ جانے اتنی نفرت کیوں ہے ؟ ایک بار تم نے صاف جواب دے دیا تھا اب پھر ......"

"بیٹی وہ آتا ہے تو ہم سے کچھ لے کے نہیں جاتا ۔" پھر ماں نے نرملا کی طرف دیکھا ۔ نرملا کی نفرت کو دیکھ کر وہ خاموش سی ہو گئی ۔ جواد علی کافی ضدی تھا ۔ وہ کبھی کبھار چکر ضرور مارتا تاکہ ان کی مالی حالت کا پتا چلتا رہے ۔ ابھی تک مالی حالت اتنی بری نہ تھی کہ جواد علی اپنے دل کی بات کہہ سکتا ۔ اب وہ دل کی بات اُس وقت کہے گا جب اُسے یقین ہو جائے گا کہ معاملہ پٹ جائے گا ۔ ہر بار شکست کا منہ دیکھنا بھی کہاں کی عقلمندی ہے ۔

اس طرح پانچ سال اور گزر گئے ۔ نرملا کی اقتصادی حالت بہتر نہ ہوئی بلکہ دگرگوں ہوتی گئی ۔ عشاق کی ایک لمبی قطار تھی ۔ زیادہ تر عاشق کنگال اور باتونی نکلے ۔ فلمیں بنانے کی اسکیمیں کافی تھیں ۔ روپیہ ندارد ۔ بس گپیں ہانک کر اور چائے پی کر چلے جاتے ۔ نرملا اس بات کی متلاشی تھی کہ کوئی گانٹھ کا پورا اور عقل کا اندھا مل جائے تو مستقبل سنور جائے ۔ اسی دوران میں نیوی کا ایک افسر ملا ۔ شراب پی کر نرملا کے گھر پڑا رہتا ۔ شراب ۔ کھانے پینے کے اخراجات ۔ باہر کی تفریح سنیما کپڑے سبھی کے لیے روپیہ دیتا ۔ مگر ان روپوں سے زندگی تو نہیں بنتی ۔ جب نرملا نے تنگ آ کر شادی کے لیے کہا تو نیوی کا افسر اگلے دن رفوچکر ہو گیا اور پھر نرملا سے ملنے نہ آیا ۔

کچھ اسی قسم کے چکروں میں نرملا نے اپنا حسن و شباب کھو دیا ۔ حسن کو بڑی فراخ دلی سے لٹایا ۔ جس چیز کی لوگ قیمت ادا کرتے ہیں اُسے سنبھال کر نہ رکھا ۔ وہ محرابوں اور قوسوں کا تاج محل ایک کھنڈر کی صورت اختیار کر گیا ۔ اب بھولے بھٹکے مسافر آتے اور کھنڈر کو دیکھ کر کہتے ۔ عمارت ضرور عظیم ہو گی

یہ وہی لمحات تھے جب نرملا نے اپنے دل کی گہرائیوں میں ڈوب کر سوچا کہ زندہ رہنے کا کیا طریقہ ہو سکتا ہے ؟ اب تو سہارے کی ضرورت تھی ۔ اسی دوران میں جواد علی پھر وارد ہوا ۔ اُس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی تو بھانپ لیا کہ اب سب پنچھی اُڑ گئے ہیں ۔ شمع حسن بھی بجھی بجھی سی ہے ۔ جس تمکنت اور رعب داب سے نرملا بات کرتی تھی اُس کی جگہ نرمی اور التجا نے لے لی تھی ۔ جواد علی نے اپنا رویہ نہ بدلا ۔ وہی خوشامدانہ اندازِ گفتگو رہا ۔ دلِ بے تاب کی دھڑکنوں کو اپنے تلک محدود رکھا ۔ یہ پرانا عاشق بڑا ہی ضدی اور خود سر تھا ۔ ظاہری نرمی تلے ـــــ استقامت مضبوطی اور توانائی کی تہ تھی ۔ وہ دل کی بات کہہ کر دوبارہ رسوا نہ ہونا چاہتا تھا ۔ بس ماں جی سے کہتا ـــ "اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو بندہ حاضر ہے ۔ اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے میرا کاروبار خوب چمکا ہے ۔ اگر میں آپ کے کام آ سکوں تو مجھے بڑی خوشی ہو گی ۔ چلیے نا ذرا آپ کو باہر گھما لاؤں ـــ

گھر میں ہنگامہ کر کے دیکھ لیا۔ مگر سیٹھ جواد علی کے رویّے اور سلوک میں کوئی فرق نہ آیا۔ بلکہ سیٹھ نے ایک دن صاف صاف کہہ دیا۔ "تم مجھے قید کرنا چاہتی ہے یہ کبھی نہ ہوگا۔ تمھاری ضد مجھے حیوان نہیں بنا سکتی۔ اب مہرالنسا کو اس بات کا پتہ چل گیا کہ یہ شخص ایک عورت کا ہو کے نہیں رہ سکتا۔ یہ شخص آوارہ اور بدمعاش ہے۔ اس نے اپنے من کی خوشی کے لیے مجھ سے شادی کی تھی، تاکہ اپنی برسوں پرانی خواہش کو عملی جامہ پہنا سکے۔ اور جب اُس کی خواہش کی تکمیل ہو گئی تو سیٹھ نے اصلی روپ دکھایا۔

اب وہ کیا کرے؟ کہاں جائے؟ کس سے گلہ کرے؟ کس سے شکایت کرے؟ یہ کوئی میاں اور بیوی کی زندگی نہ تھی۔ محض آقا اور غلام کا رشتہ تھا۔ وہ دن بھر انتظار کرے! کیوں انتظار کرے؟ محض دو وقت کھانا کھانے کے لیے۔ لوگوں کو ایک سجا ہوا فلیٹ دکھانے کو۔ اور سیٹھ جواد علی کا جہاں جی چاہتا ہے چلا جاتا ہے۔ کئی دن گھر سے غائب رہتا ہے۔ جانے اس وقت کس بیوی کے پاس ہو گا۔ یہ سوچ کر اُس کا خون جوش مارنے لگتا۔ اور وہ بڑبڑانے لگتی۔ اس بار تو سیٹھ پانچ دن کے وقفہ کے بعد نظر آیا۔ بس پھر کیا تھا۔ مہرالنسا نے سیٹھ کو گریبان سے پکڑ لیا۔ سیٹھ نے جوابی حملہ کیا۔ اور دو تین تھپڑ رسید کیے۔ وہ چیخی چلّائی۔ اُس نے دو چار لاتیں جما دیں۔ اُس دن تو مار برداشت کر گئی۔ اس کے بعد تو تقریباً جب کبھی اُس نے کوئی شکایت کی جواد علی فوراً دو چار گندی گالیاں دیتا اور ایک دو تھپڑ رسید کرتا۔ اور ساتھ ہی کہتا ــ "عورت کے مزاج کو ٹھیک کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اُسے ہر روز پیٹا جائے۔" ہائے جواد علی کو کیا ہو گیا۔ بیاہ سے پہلے اس نے کبھی بھڑ کا تک نہ تھا۔ چاپلوسی کرتے کرتے اُس کی زبان تھک جاتی تھی۔ اب تو ایک لفظ بھی سننے کو تیار نہیں۔ اس شخص نے میری کی جوتیاں اُٹھائی تھیں! وہ کیا کرے؟ کہاں جائے؟ اس گھر میں رہی تو وہ پاگل ہو جائے گی۔ یہ مار پیٹ، یہ گندی گالیاں، یہ وحشیانہ سلوک برداشت نہیں کر سکتی۔ یہ شخص اپنے آپ کو سُدھار نہیں سکتا۔ ان حالات میں وہ اُس کے پاس نہیں رہ سکتی۔ دراصل ہم دونوں کا مزاج نہیں ملتا۔ دونوں کی سوچ سمجھ کی راہیں مختلف ہیں۔ یہاں رہنا مشکل ہی نہیں، بلکہ ناممکن ہے۔ اگر چند دن اور ٹھہر گئی تو ماری جائے گی۔ اور پھر ایک دن فیصلہ کر کے وہ اپنی ماں کے پاس واپس چلی آئی کہ دوبارہ جواد علی کے گھر نہ جائے گی۔

وہ اپنی پرانی کھڑکی میں بیٹھی ہوئی تھی۔ ماہ و سال اُس کی نگاہوں کے سامنے گزرنے لگے۔ پرانی یادیں۔ جب وہ صرف سولہ برس کی تھی، تو جواد علی لاہور میں ملا تھا۔ پانچ سال گزرنے کے بعد وہ بمبئی چلی آئی۔ یہیں پر عاشقوں کا ایک قافلہ ملا۔ اسی طرح پانچ برس اور گزر گئے۔ سیٹھ جواد علی پھر آیا۔ اب حالات بدل چکے تھے۔ سیٹھ کے ساتھ شادی کی۔ شادی کے بعد نفرت، بیزاری اور علیحدگی۔ کھڑکی میں بیٹھے ہوئے ۵ ۵ ۵ کے ہندسے اُس کی نگاہوں کے سامنے ناچ رہے تھے۔ کیونکہ اس کی زندگی میں ہر پانچ برس کے بعد ایک اہم تبدیلی ہوتی رہی۔ اور آج وہ اس جگہ پہ پہنچ گئی تھی۔ جہاں سے اُس نے سفر کا آغاز کیا تھا۔

ماہنامہ سیّارہ لاہور اُردو رسائل میں ایک منفرد درجہ رکھتا ہے۔
سیّارہ اب اپنا خاص نمبر پیش کر رہا ہے۔
سیّارہ ـ ۶ بی۔ ذیلدار پارک ـ اچھرہ ـ لاہور

رام لعل

سویرا۔ لاہور

بارش

گیرج سے لوٹتے ہی میں اپنے کمرے میں گیا۔ جلدی جلدی بشرٹ بدلی۔ صبح سے قمیص اور کوٹ میں پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ موسم میں خاصی تبدیلی آ چکی تھی۔ میں نے الماری میں سے بیئر نکالی۔ اسی لمحے صحن میں گھنٹی بج گوکی۔ جانے کون ہے؟ میں نے جگ میں بیئر اُنڈیل دی۔ برآمدے میں ماں کی چاپ سنائی دینے لگی۔ میں اُٹھ کر باہر چلا گیا۔

"کون ہے ماں؟"

"دینا ناتھ اور کرم الٰہی۔ کرما کے سورگ باش ہونے کی اطلاع انھیں آج ہی ملی۔ باہر گئے ہوئے تھے۔ کہتے ہیں ہمیں بڑا صدمہ پہنچا ہے۔ باہر کے کمرے میں بٹھا دیا ہے۔ جا، مل آؤ۔" یہ کہتے کہتے ماں کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ پھر وہ لوٹ گئی۔

میں دہلیز پر بوٹ کی ایڑی سے 'کھٹ کھٹ' کی ہلکی ہلکی سی آواز پیدا کر رہا تھا۔ پلٹ کر میز پر بھرے رکھے ہوئے جگ کی طرف دیکھا۔ پھر اُدھر ہی چلا گیا۔ بیئر جلدی جلدی حلق کے نیچے اُتاری۔ پھر ہونٹ پونچھے۔ اور جیب میں سگریٹ کا پیکٹ تلاش کرتا ہوا ڈرائنگ روم کی طرف چلا آیا۔

کرما کے پورٹریٹ ہر ایک کمرے میں لٹکے ہوئے تھے۔ ان دنوں میری نگاہ بے اختیار اُس طرف اُٹھ جاتی تھی —— کرم الٰہی اور دینا ناتھ جہاں بیٹھے تھے اُن کے پیچھے دیوار پر بھی کرما مسکرا رہی تھی۔ وہ میرے گیرج کے لیے ٹیریاں سپلائی کرتے تھے۔ کرما کی ناوقت موت پر افسوس ظاہر کرنے لگے۔ میرے لیے ان کی باتوں میں کوئی لفظ نیا نہیں تھا۔

پچھلے بیس روز سے ماتم پرسی کو آنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ کرما کی موت کی خبر جنگل میں آگ کی مانند شہر میں پھیل گئی تھی۔ اُسے اتنے لوگ جانتے تھے یا اُس کے اس قدر قریب تھے، اس کا اندازہ مجھے پہلی بار اب ہوا ہے۔ بہت سی جگہوں پر ہم ساتھ ساتھ جاتے تھے۔ پھر بھی اُس کی اپنی بھی ایک شخصیت تھی۔ کلبوں، سوسائٹیوں، انسٹی ٹیوشنوں، اسکولوں، کالجوں کے علاوہ بھی نہ جانے وہ کہاں کہاں آتی اور جاتی تھی۔ حضرت گنج اور امین آباد کے بہت سے دکاندار بھی آئے تھے۔ اُن کے یہاں سے کرما خریداری کرتی رہی تھی۔ اُن کا کوئی حساب باقی نہیں تھا۔ وہ لوگ کرما کے تئیں بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ اب دُکھ کا اظہار کرنا بھی ضروری سمجھتے تھے۔

لیکن غمی کی کیفیت اپنے اوپر ہمیشہ کے لیے طاری کیے رہنا میرے لیے مشکل ہوا جا رہا تھا۔ شروع شروع میں چند روز میں نے

گھر پر گزارے تھے۔ اُس وقت میں شدید طور سے غمگین تھا۔ کرما کے بچھڑ جانے پر رویا بھی تھا۔ ہم ایک دوسرے سے بے حد محبت کرتے تھے۔ لیکن اب اس کے متعلق ہر وقت باتیں کرتے اور سنتے رہنے سے کچھ اُلجھن سی ہونے لگی تھی۔ میں چاہتا تھا کرم الٰہی اور دینا ناتھ جلدی سے رخصت ہو جائیں۔ میں نے اپنے گیرج کی ایکسٹینشن کا ذکر چھیڑ دیا۔ بیوک اور شورلیٹ کے نئے ماڈلوں اور بمبئی پورٹ پر لوڈنگ کی مشکلات کا قصہ بھی بیان کیا۔ ان کا دھیان دوسری طرف منتقل تو ہوا۔ لیکن پھر بھی وہ چہرے لٹکائے ہوئے بیٹھے رہے۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ چلے گئے۔ اُن کے جاتے ہی مجھے تنہائی محسوس ہونے لگی۔ شدید قسم کی تنہائی۔ یہ احساس اچانک ہی ہوا۔ میں نے سگریٹ سلگا کر شام کے پروگرام کے بارے میں سوچا۔ کلب میں ڈنر ہے۔ ماتھر نے خاص طور پر مدعو کر رکھا ہے۔ انھوں نے رچنا کو بھی بلایا ہے۔ رچنا ماتھر کی سالی ہے۔ لوگ کتنے عجیب ہیں۔ موت جس جگہ کو خالی کر دیتی ہے وہ اُسے جلدی سے پُر کر دینا چاہتے ہیں۔ کچھ اور لوگوں نے بھی رجوع کیا ہے۔ لیکن ماتھر سب سے بازی لے جائیں گے۔ دراصل میں نے خود ہی ایک بار رچنا کی تعریف کی تھی۔ تب کرما زندہ تھی۔ کسی پارٹی میں اچانک ہی رچنا سے ملاقات ہو گئی تھی۔ ماتھر اور اُس کی بیوی کو میری کی ہوئی تعریف یاد ہے۔ اس لیے انھوں نے مجھے اور رچنا، دونوں کو مدعو کیا ہے۔ لیکن میں ابھی تک اُداس کیوں ہوں؟ میرے اوپر رچنا سے ملنے کی خوشی کیوں نہیں طاری ہو رہی ہے ——؟

میں سگریٹ پیتا ہوا اپنے کمرے میں لوٹ گیا۔ بیئر کی ایک اور بوتل نکالی۔ کرما کے سامنے کھڑا ہو کر گھونٹ گھونٹ پینے لگا۔ لیکن میری اُداسی بڑھتی گئی۔ میری آنکھیں بھیک بھی گئیں۔ کرما! میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ رچنا تم سے خوبصورت سہی، لیکن تمھارے اندر جو خوبیاں تھیں وہ کسی دوسری عورت میں نہیں ہو سکتیں۔ تم مجھے اپنے قبضے میں لے لیتی تھیں۔ میرا سب کچھ اپنا کر لیتی تھیں۔ میں کتنا بے بس ہو جاتا تھا! تم ایک دلکش جادوگرنی تھیں۔ میری نفسیات جان گئی تھیں۔ مجھے جس چیز کی ضرورت تھی وہ تمھارے پاس موجود تھی۔

باہر کچھ کھٹکا ہوا۔ ماں پھر آ رہی ہے۔ میں باہر چلا گیا۔ اُس نے میری آنکھوں کو غور سے دیکھا، سمجھ گئی۔ میں رو رہا تھا۔ کچھ لمحے خاموش رہی، پھر پوچھنے لگی۔

"گوپال نہیں دکھا بہت دنوں سے۔"

گوپال کا نام سنتے ہی میں اپنے اُداس ہونے کی وجہ سمجھ گیا۔ میں کئی روز سے گوپال ہی کی کمی محسوس کر رہا ہوں!

"پتا نہیں کہاں گیا ہے آج کل! اُس کے دفتر میں کئی بار فون کیا، معلوم ہوا چھٹی پر ہے، لیکن وہ گھر پر بھی نہیں ملا۔"

"تعجب ہے، تمھیں بتا کر بھی نہیں گیا——؟"

"ہاں ماں، واقعی تعجب کی بات ہے۔ پچھلے چار پانچ برسوں میں وہ مجھ سے اس طرح کبھی الگ نہیں رہا——"

میں آہستہ آہستہ چل کر باہر جانے لگا۔ پیچھے سے ماں نے پکار لیا۔

"کہیں جا رہے ہو چندر؟"

پلٹ کر کہا۔ "ہاں —— کچھ کام ہے؟"

"نہیں کام تو نہیں ہے کوئی۔" وہ میرے پاس آ گئی۔ میں نے محسوس کیا، وہ بھی تنہائی محسوس کر رہی ہے۔ اس گھر میں کرما کی وجہ سے بڑی چیخ پکار اور ہنسی گونجتی رہتی تھی۔ وہ سب بھی ماں کو اچھا تو نہیں لگتا تھا۔ لیکن اب وہ اس فضا کو یاد کر کے اُداس ہو جاتی ہے۔ ایسا لگتا ہے۔ کرما اس گھر کے سارے قہقہے ایک کمرے میں بند کر کے کہیں باہر چلی گئی ہے ہم دونوں اُس کے واپس آنے کا انتظار کر رہے ہیں۔

گیلری میں ماں کے ساتھ کتنی دیر تک خاموش کھڑا رہا۔ نیچے سڑک پر میری کار رُکی ہوئی تھی۔ لال بانٹھ کا پورا بلاک ہفتہ وار ناغے کی وجہ سے بند تھا۔ سڑک بھی سنسان تھی۔ نچلے طبقے کے لوگ عورتوں اور بچوں کو لیے عجیب بھڑکیلے رنگوں اور وضع قطع کے کپڑے پہنے سنیما گھر کی طرف جا رہے تھے۔ کھیلوں کا سامان بیچنے والے کارنر پر چاٹ والا اپنی ریڑھی لگائے دو عورتوں کو چاٹ کھلانے میں مصروف تھا۔ ایک بوڑھی سندھی عورت ناک اور کانوں میں سونا اور ڈھیر سارے نگوں سے مڑھے ہوئے زیور پہنے چلی آ رہی تھی۔ سڑک کے درمیان فٹ پاتھ پر دو مزدور سر کے نیچے اپنی اپنی چھلی رکھے لیٹے ہوئے بیڑیاں پی رہے تھے۔ سامنے کے رنجیت بلاک میں انجنیر کی بیوی ٹیرس پر رکھے ہوئے گملوں میں پانی ڈال رہی تھی۔ دور مغرب میں آسمان پر بادل جمع ہو رہے تھے۔

"ماں — میں جاؤں ؟"

ماں نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں دھیرے دھیرے باہر نکل گیا۔ کار اسٹارٹ کی۔ بلا مقصد ہی ایک طرف چل دیا۔ بھوپال کورٹ، نگرہما پالیکا، کونسلرس ایوینیو، پھر سیدھی دلکشا جانے والی سڑک۔

کرما کے مرنے کی اطلاع مجھے گوپال ہی نے آ کر پہنچائی تھی۔ وہ میرے پاس گیرج میں بڑے متوازن انداز سے آیا تھا۔ دو آدمیوں کو میرے ساتھ باتیں کرتا دیکھ کر ایک طرف کرسی پر چپ چاپ بیٹھ گیا تھا۔ جتنی دیر بات چیت جاری رہی وہ سگریٹ پیتا رہا۔ پھر جب میں اکیلا رہ گیا تو اُس نے بہت دھیرے سے کہا — "کرما کا ہارٹ فیل ہو گیا ہے، چلو، گھر چلو !"

اتنی بڑی خبر اور اتنے متین لہجہ میں ! حالانکہ وہ بہت زیادہ جذباتی واقع ہوا تھا۔ بعض اوقات کسی خاص بات کے مظاہرے میں سنجیدگی کی ساری حدیں پھاند جاتا تھا۔

میں چونک کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ مجھے سنبھال کر، بازو سے سہارا دے کر میری کار تک لے گیا تھا۔ اُس نے خود ہی ڈرائیو کیا تھا۔ جب میری سسکی نکل جاتی تو وہ میرے بازو کو اپنے مضبوط ہاتھ کی گرفت میں لے لیتا تھا۔

کرما اپنے پلنگ پر ابدی نیند سو رہی تھی۔ میری ماں زور زور سے رو رہی تھی۔ وہاں اور بھی بہت سے لوگ جمع تھے۔ غیر متوقع حادثہ کی وجہ سے سب کے چہرے جھکے ہوئے، متاسف تھے۔ لوگوں کی بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی۔ میں گوپال کی آواز سن رہا تھا۔ وہ بڑے اطمینان سے ڈرائنگ روم میں متعلقہ لوگوں کو کرما کے انتقال کی اطلاع دے رہا تھا۔

بہت رات گئے تک آنے والوں کا سلسلہ رہا۔ سب نے یہی رائے دی تھی۔ کرما کی لاش کا داہ سنسکار کل صبح کو کیا جائے۔ تب کرما کے والدین بھی الٰہ آباد سے پہنچ سکتے تھے۔ انھیں بھی اطلاع بھجوانے کا کام گوپال نے اپنے آپ کر لیا تھا۔

رات کو کرما کی لاش کے پاس ہم تین تھے — ماں، گوپال اور میں۔ کمرے کے درمیان فرش پر کرما کو چادر سے ڈھک دیا گیا تھا۔ گوپال نے چاروں طرف اگربتیاں سلگا دی تھیں۔ ماں رندھے رندھے گلے سے رام دھن گاتی رہی تھی۔ میں دیوار کے ساتھ بیٹھ لگائے چھت کی طرف تکتا رہا تھا۔ گوپال میرے قریب بیٹھ کر ایک کتاب پڑھتا رہا تھا۔ ہم تینوں نے ساری رات جاگتے ہوئے گزار دی تھی۔ دو ایک بار جذبات سے پاگل ہو کر میں نے کرما کے چہرے پر سے چادر اُلٹ دی تھی۔ اُس کے ساتھ باتیں کرنے کو اور پھر مشغول میں سر دے کر رونے بیٹھ جاتا تھا۔ اُس وقت ماں بھی اپنے اوپر قابو نہیں رکھ سکی تھی۔ وہ بھی بین کرنے لگی تھی۔ لیکن گوپال لاش کا منہ ڈھک کر اور ہمیں تسلی بھری باتیں کہہ کہہ کر خاموش کرانے میں کامیاب ہو جاتا تھا۔

دوسرے دن اُس نے لاش لے جانے والی تین گاڑیاں منگائی تھیں۔ وہ جانتا تھا شمشان تک ساتھ جانے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہو گی۔ بہت سے لوگ تو اپنی گاڑیوں میں گئے تھے۔ گوپال نے اپنے ہاتھوں سے گاڑی کی چھت پر کرما کی لاش

کو رکھا تھا۔ جب وہ اوپر تک لے جائی گئی تھی تو پھر اُس نے کسی دوسرے کی مدد نہیں لی تھی۔ اپنے ہاتھوں سے اُس پر پھول بکھیرے تھے۔
میں شمشان تک نہیں جا سکا تھا۔ مجھے وہاں جانے سے روک دیا گیا تھا۔ کہا گیا تھا جوان شوہر اپنی بیویوں کے داہ سنسکار میں شریک نہیں ہوتے۔ میں گھر میں اکیلا ہی رہ گیا تھا۔ پھر کچھ بوڑھے آ بیٹھے تھے۔ جو کہیں دُور آنے جانے کی سکت نہیں رکھتے تھے۔
گوپال جب لوٹ آیا تب بھی میں نے اُس کے چہرے پر سنجیدگی کی جھلک۔۔ دیکھی تھی۔ اتنی بڑی ذمے داری کو اُس نے اکیلے ہی نبھایا تھا۔ کرما کی استھیاں بھی وہی لے کر ہردوار گیا تھا۔ میں بھی ساتھ جانا چاہتا تھا۔ مگر ماں نے منع کر دیا تھا۔ کہتی تھی "گوپال کوئی غیر نہیں ہے۔ اپنا ہی ہے۔"
ہردوار سے لوٹنے کے بعد وہ مجھے ایک بار ملا تھا۔ بس ایک ہی بار۔ اس کے بعد کہیں چلا گیا تھا۔ نہ جانے کہاں تھا؟ کہیں ٹور پر بھی نہیں گیا تھا۔ کمپنی سے اُس نے ایک مہینے کی رخصت لے لی تھی۔ گھر پر اُس کا تالا پڑا رہتا تھا۔
کرما کی وفات کے بعد کئی روز تک میں اپنے غم پر قابو پانے سے قاصر رہا تھا۔ اُسے میرے قریب رہنا چاہیے تھا۔ وہ میرا بہت ہی اچھا دوست ہے۔ مجھ سے دُور نہیں جا سکتا۔ ماتم پرسی کے لیے آنے والوں نے مجھے بہت پریشان کر رکھا ہے۔ گوپال ہوتا تو میرا غم غلط کرنے کی کوشش کرتا۔ مجھے اس غم سے بھری ہوئی فضا سے نکال کر کہیں دُور لے جاتا۔ مل گیا تو اپنی خفگی دکھاؤں گا۔
میں اپنی سوچوں میں کھویا ہوا سا اُتر بیٹیا کے ڈاک بنگلے تک چلا گیا۔ گھڑی دیکھی۔ ابھی ساڑھے سات تھے۔ کلب پہنچنے میں آدھا گھنٹہ باقی تھا۔ یک بیک مجھے رچنا کا بھی خیال آیا۔ اُس کا خوبصورت متناسب جسم، لمبی گردن — لمبی گردن ہی اُس کے جسم کا سب سے پُرکشش حصّہ تھا۔ لوگ اُس کی گردن دیکھ کر مسحور ہو جاتے تھے۔ وہ اپنے بالوں کو ہمیشہ اوپر کی طرف کنگھی کر کے کھینچتی تھی۔ بال اوپر چلے جانے سے اُس کی گردن کا حسن اور بھی نکھر جاتا تھا۔
جب کار گھمانے لگا ڈاک بنگلے کے اندر روشنی دکھائی پڑی۔ کھڑکی کے شیشے کے عقب میں ایک چہرہ بھی دکھائی دیا۔ میں اُتر پڑا۔ دیکھوں شاید کوئی جان پہچان والا ہو۔ برآمدے میں ایک جانی پہچانی سکوٹر بھی دیکھی۔ لپکا ہوا سا اندر چلا گیا۔ وہ گوپال ہی تھا۔ میں خوشی سے اُچھل پڑا۔ بازو پھیلا کر چلاتا ہوا اُس کی طرف دوڑا۔ "اماں تم یہاں چھپ کر کیوں رہ رہے ہو؟"
میں اس کے ساتھ لپٹ گیا۔ پھر حیران ہو کر الگ بھی ہو گیا۔ اُس کے چہرے پر بڑے بڑے کانٹے اُگ آئے تھے۔ اُس کا چہرہ بہت خوفناک ہوا جا رہا تھا۔ اُس کے سامنے بوتلیں تھیں۔ گلاس تھے۔ سگرٹوں کی کئی خالی ڈبیاں تھیں۔ اور اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔
"یہ سب کیا ہے گوپال؟"
اتنے بڑے کمرے میں وہ تنہا تھا۔ اُس کے ساتھ کوئی بھی نہیں تھا۔ میری آواز سن کر بیرا دروازے تک آ کر لوٹ گیا تھا۔
گوپال نے کوئی جواب نہ دیا۔ گلاس میں بچی ہوئی ہونٹوں سے لگا لی۔ حلق سے نیچے اتار کر سگرٹ کے کئی کش لگا ڈالے۔
"تمھیں میں کئی روز سے ڈھونڈ رہا ہوں۔ ہر روز تمھارا انتظار رہتا ہے۔ ماں بھی یاد کرتی ہے۔ آج میں بہت اُداس تھا۔ جی بہلانے کے لیے یہاں تک چلا آیا۔ یہاں تو میں اتفاق سے آ گیا۔ تم کب سے ہو یہاں؟"
اُس نے میری طرف آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔ پھر بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ "کچھ پیو گے؟"
"پیوں گا۔ پہلے یہ بتاؤ تم نے اپنا یہ کیا حال کر رکھا ہے؟"

اُس نے مجھے کوئی جواب دینے کی بجائے بیرے کو پکارا۔ میرے لیے ایک گلاس منگایا۔ بھر کر میرے سامنے رکھ دیا۔ اُسے خاموش پاکر میں نے بھی کوئی اور سوال نہ پوچھا۔ چپ چاپ پینے لگا۔ میری اُداسی کی کیفیت واپس آنے لگی۔ اُسے دیکھ کر جو خوشی نصیب ہوئی تھی وہ غائب ہو چکی تھی۔ ہم کتنی دیر تک ایک دوسرے کے ساتھ کوئی بات کیے بغیر پیتے رہے۔ میرے اندر ایک اور کیفیت بھی کروٹیں لے رہی تھی۔ غصّے اور نفرت کی کیفیت۔ کسی کسی لمحے میں یہ خیال بجلی کی سی سرعت کے ساتھ کوندجاتا تھا۔ اُسے یہیں مار کر چھوڑ جاؤں۔ دیکھا جائے گا۔ اسے اور پلاؤں۔ اتنی پلادوں کہ ساری سدھ بُدھ بھول جائے۔ اس کے پاس کئی بوتلیں تھیں۔ خالی اور بھری ہوئی بھی۔ اُس کے گلاس کو میں نے کئی بار بھرا۔

میں نینی تال میں اکیلا چلا گیا تھا۔ پچھلے سال۔ دراصل مرادآباد، رام پور، لال کنواں اور الموڑہ سے ہو کر وہاں پہنچا تھا۔ کرما سے کہہ آیا تھا گوپال کو ساتھ لے کر چلی آئے۔ گوپال سے بھی کہہ دیا تھا۔ وہ مجھ سے پہلے وہاں پہنچے ہوئے تھے۔

کرما اور گوپال، دونوں میری زندگی میں ساتھ ساتھ داخل ہوئے تھے۔ ہم تینوں نے ایک ہی ڈبّے میں ساؤتھ کا سفر کیا تھا۔ مجھے وہ بہت ہی فرینک اور دلچسپ معلوم ہوا تھا۔ کلچرڈ بھی۔ کرما سے اُس کی دوستی پرانی تہذیب و تمدّن کے علم اور ذوق کی بنیاد پر استوار ہوئی تھی۔ جیسے پختہ ہونے میں خاصی مدّت لگ گئی تھی۔ مجھے یاد تھا۔ اُنھیں ایک دوسرے کو سمجھنے میں خاصی دقّت پیش آیا کرتی تھی۔ وہ اکثر و بیشتر ایک دوسرے سے اختلاف کرتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔

میں نے گوپال کو کبھی دُور نہیں ہونے دیا۔ وہ اتنا اچھا اور معصوم ہے کہ اُس نے کبھی ایسا کرنے کا موقع بھی نہ دیا۔ چونکہ وہ بھی لکھنؤ میں رہتا تھا۔ اس لیے اکثر و بیشتر ہمارے ساتھ رہنے لگا۔ لوگ ہم تینوں کو اکٹھے ہی دیکھتے۔ ہمارے سوشل حلقے بھی مشترک ہوگئے۔ ماں بھی اُسے بیٹا ہی سمجھتی ہے ــــ میری رگوں میں آگ سی دوڑنے لگی ہے۔ پگھلی ہوئی آگ۔

گوپال اپنے چھوٹے بھائی کی شادی میں کرما کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ کئی روز پہلے۔ میں تو شادی والے دن ہی ماں کو ساتھ لے کر پہنچ سکا تھا ــــ جس بات سے میرا دماغ غصّے سے بھرا جا رہا ہے اس کا میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔

یاد آنے لگا ہے کرما کئی موقعوں پر گوپال کے ساتھ تنہا رہی ہے۔ جب میں ساتھ نہیں رہا ہوں۔ میں نے کبھی محسوس نہیں کیا گوپال کرما کے اس قدر نزدیک بھی پہنچ سکتا ہے! لیکن وہ مجھ سے کہیں زیادہ غمگیں ہے۔ ابھی تک اُسے نہیں بھلا سکا۔ اس کے سوگ میں خود کو بھول بیٹھا ہے۔ کرما مر چکی ہے لیکن اس کا غم بھی میری ملکیت ہے۔ یہ حق کسی اور کو نہیں دے سکتا۔ میں اسے درپردہ عشق کا مزا چکھاؤں گا۔ اسے معلوم نہیں ہے، میں کس قدر غیرت مند ہوں ــــ!

33495

ہم دونوں نے بہت زیادہ پی۔ وہ تب بھی خاموش اور افسردہ ہے۔ میں لڑکھڑاتا ہوا کھڑکی کے پاس چلا گیا۔ کھڑکی کھول دی میں تازہ ہوا چاہتا تھا۔ دم گھٹ رہا تھا۔ بجلی چمک رہی تھی۔ ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ میرے بدن کے اندر ہی جذب ہوگیا۔ ننھی ننھی بوندیں پڑنے لگیں۔ میں کاریڈور، برآمدے کے فرش کے کنارے کنارے اور ڈاک بنگلے کے گیٹ پر بوندوں کو گرتا ہوا دیکھنے لگا۔ کمرے سے نکل کر برآمدے میں چلا گیا۔ بازو بارش میں پھیلا دیے۔ ٹھنڈے ٹھنڈے قطرے میرے ہاتھوں پر جمع ہونے لگے۔ میرا سر گھوم رہا تھا۔ آنکھیں بند کرلیں تو اور بھی تیزی سے گھومنے لگا۔ ایسا لگا پورا ڈاک بنگلہ میرے گرد گھوم رہا ہے۔

مجھے کرما کا اپنے ساتھ لپٹنا یاد آنے لگا۔ مجھے وہ بڑی وارفتگی سے ملتی تھی۔ اُس کے بے پناہ پیار کے سامنے میں بے بس ہو جاتا تھا۔ عمر میں مجھ سے چار سال چھوٹی تھی۔ لیکن محبت کرنے میں کئی سال بڑی۔ بہت ہی پختہ۔ اُس سے دُور رہ کر بھی اُسے بھول نہیں پاتا تھا۔ وہ جا چکی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ بیتایا ہوا ایک ایک لمحہ یاد آرہا تھا۔ اُس کی محبت یاد کر کر کے میرا ٹوٹا ہوا اعتماد پھر مضبوط ہونے لگا۔

دل کو ڈھارس بھی ملی۔ اُس کی محبت سچّی تھی۔ اس میں مکر و فریب نہیں تھے۔ جس طرح خود حسین تھی اُسی طرح اس کی محبت بھی۔ اُسے کبھی گوپال کے دل کی کیفیت بھی معلوم نہیں ہوئی ہوگی۔ اُس کی شخصیت گوپال کے مقابلے میں بہت بڑی تھی۔ میں خود اس کی شخصیت سے مرعوب رہا ہوں۔ گوپال نے اُسے بتائے بغیر ہی بالکل بچوں کی طرح چپکے چپکے محبت کی ہے۔ اُسے منھ پر کبھی کچھ کہنے کی ہمت نہیں کر سکا ہوگا۔

میں برآمدے سے نکل کر باہر کھلے آسمان کے نیچے چلا گیا۔ ٹہلنے لگا۔ ڈاک بنگلے کے کئی چکر لگا ڈالے۔ ایک بار بھی اندر جھانک کر نہ دیکھا۔ گوپال کیا کر رہا ہے۔ لیکن میرے اندر سے غصّے اور حقارت کی کیفیت دور ہو رہی تھی۔ میں گوپال کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔ اگر میں بھول جاؤں کہ رما میری بیوی تھی! رما میری بیوی تھی ہی۔ میری عزیز ترین رفیقہ۔ اُس نے ایک ایسی عورت کی قدر کی ہے، جو صرف میری رہی ہے۔ جسے میں نے بے پناہ پیار کیا۔ اس کے جسم اور روح دونوں کو اپنے اندر جذب کیا۔ اُس نے تو صرف قربت ہی محسوس کی ہے لیکن کبھی قریب نہیں جا سکا۔ دُور کھڑا اس کی حدّت میں سلگتا رہا ہے۔ اس وقت بھی سلگ رہا ہے جس عورت کے جسم کو کبھی چھو تک نہ سکا اُس کے تصوّر میں خود کو گھلا رہا ہے۔ اس کے مقابلے میں میری محبت کی سطح بہت نیچی ہے۔ اس عورت کا سب کچھ پاکر بھی حسد کا شکار ہوا ہوں۔ مجھے بہت ہی ندامت محسوس ہونے لگی۔

میں چلتے چلتے رُک گیا۔ جلدی سے اندر گیا۔ وہ ابھی تک میز کے سامنے خاموش بیٹھا تھا۔ میں نے اُس کے کاندھے کو چھوا تو میرا ہاتھ کانپ گیا۔ "گوپال، مجھے بہت افسوس ہے۔ تمھیں بہت دکھ پہنچا۔ مجھے معلوم نہیں تھا تم رما سے اتنی محبت کرتے ہو۔ میں تمھاری محبت کی قدر کرتا ہوں۔ لیکن تمھیں اتنا دکھی نہیں ہونا چاہیے۔ تم اُسے جانے سے نہیں روک سکتے تھے۔ نہیں نا! جانے والے تو جا کر ہی رہتے ہیں۔ اُسے بھولنے کی کوشش کرو۔ خود کو سنبھالو۔ اُٹھو۔ شیو بناؤ۔ کپڑے بدلو۔ ابھی کلب چلیں گے۔ وہاں تمھارا جی بہل جائے گا۔ میرا خیال ہے تم شادی کر لو۔ کیوں؟"

گوپال نے میری طرف حیرت سے دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں پھر آنسو بھر گئے۔ اُسے آئینے کے سامنے کھڑا کر کے میں پھر کھڑکی کے پاس چلا گیا۔ باہر بڑی تیزی سے بوندیں پڑ رہی تھیں۔ لیکن اُن کی آواز نہیں تھی۔ جہاں تک بتیوں کی شعاعیں پہنچی تھیں بارش کے قطرے گرتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ شاید یہ بارش کبھی نہ رُکے! میرا دل غم کے بوجھ کے اور بھی نیچے چلا گیا تھا۔ ایک عجیب سا اطمینان بھی مل رہا تھا۔ جیسے کوئی شخص غوطے کھا رہا ہو۔ تیرنا نہیں جانتا ہو۔ بار بار ڈوبتا ہو۔ بار بار اُبھرتا ہو۔

ہندوستان کا مشہور و معروف ادبی ماہنامہ

"کتاب" اور تین نئی کتابیں

(تنقیدی مضامین) سید احتشام حسین قیمت ۴ روپے ۵۰ پیسے

برف کی دیوار (ناول) سائل ملیح آبادی 〃 ۴ روپے ۵۰ پیسے

لبِ رخسار 〃 منظر سلیم 〃 ۴ روپے ۵۰ پیسے

ملنے کا پتا:۔ کتاب پبلشرز، چوک لکھنؤ ۳

ش۔ مظفر پوری

ترجمہ: سرِ تیا۔ دہلی

حلالہ

تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ گھر پر ایسا سوگ طاری تھا جیسے کسی کی موت واقع ہو گئی ہو۔ پڑوس میں طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ جو ہونا تھا وہ تو ہوا مگر خاندان کی آبرو مٹی میں مل گئی۔ سات پشتوں میں کبھی ایسا شرمناک سانحہ نہیں گزرا تھا۔

اُس روز گھر میں چولہا تک نہیں جلا۔ چولہا کون جلاتا۔ چولہا جلانے والی تو گھر کے کسی کونے میں اس طرح منہ چھپائے پڑی تھی جیسے سارے زمانے کا کلنک اس کے چہرے پر لگ گیا ہو۔ اپنے کمرے سے باہر نکلنے کی اس میں ہمت نہ تھی۔ رہ رہ کر آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے تھے۔ ایسا ہونے سے تو کہیں اچھا تھا کہ کوئی اس کی گردن مار دیتا۔ گھر کے کسی فرد میں اتنی ہمت بھی تو نہ تھی کہ زینت کو جا کر دلاسا دے۔ گھر پر موت کا سا سکوت طاری تھا۔ حمید صاحب دونوں ہاتھوں سے سر تھامے انگنائی میں ایک پلنگڑی پر بیٹھے اپنے اوپر لعنت بھیج رہے تھے۔ شرم کے مارے کسی سے آنکھیں چار کرنے کا یارا نہ تھا۔ بیٹھے بٹھائے ایسی شامت آئی تھی کہ زندگی کا پورا نظام ہی درہم برہم ہو کر رہ گیا تھا۔ اگر ان کے بس میں ہوتا تو ہمیشہ کے لئے گھر سے منہ کالا کر لیتے۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ وہ اپنی بیوی زینت کو طلاق دے چکے تھے۔ آٹھ سال کی ازدواجی رفاقت کے بعد آج ان پر کچھ ایسا شیطان سوار ہوا کہ بات کی بات میں انہوں نے بیوی کو طلاق دیدی۔ وہ بھی طلاق مطلق۔ اب رجوع کرنے کی بھی کوئی گنجائش نہیں رہ گئی تھی۔ کاش ان کی زبان پر چھالے پڑ گئے ہوتے کہ یہ شرمناک حرکت سرزد نہ ہوئی ہوتی!

زینت کے پانچ سال اور تین سال کے دونوں بچے دہشت زدہ سے اس کے پاس بیٹھے تھے۔ ان کی معصوم صورتیں سوگوار اور مرجھائی مرجھائی سی نظر آ رہی تھیں۔ وہ کچھ ٹھیک ٹھیک تو نہیں سمجھ پائے تھے کہ کون سی قیامت اُن پر ٹوٹی تھی۔ بس ایک مبہم مبہم سا احساس تھا کہ ان کی ماں کو کوئی بہت بڑا دکھ پہنچا تھا۔ ماں کو غمگین اور نڈھال دیکھ کر ان کے معصوم احساسات پر بھی غم کی پرچھائیں پڑ گئی تھی۔ ماں نے دو ایک بار بے اختیار ہو کر اپنے جگر کے ٹکڑوں کو کلیجے سے لگا کر بھینچا تو ان معصوموں کی آنکھیں بھی کسی انجانے دکھ کے اثر سے چھلک چھلک پڑیں۔ اور پانچ سالہ حامد تو بلک بلک کر رونے لگا۔ تین سالہ ساجد اپنی ماں کے بہتے ہوئے آنسوؤں کو پونچھنے لگا۔ دونوں بچے بغیر کچھ کھائے پیئے ماں سے لپٹ کر سو گئے۔

بات مشتہر ہو چکی تھی۔ اب چھپائے چھپنے والی نہیں تھی۔

رات بڑی مشکل سے گذری۔ صبح سورج نکلنے سے پہلے ہی سسر نے بہو کو چپکے سے اس کے میکے بھجوا دیا۔ زینت گھر والوں کی مخالفت کے باوجود دونوں بچوں کو زبردستی ساتھ لے گئی۔ سسرال کی چوکھٹ سے میکے کی دہلیز تک راہیں زینت کے آنسوؤں سے تر ہو گئیں۔ دنیا حیران تھی کہ اتنے اچھے شوہر اور اتنی اچھی بیوی میں طلاق کی نوبت کیسے آ گئی۔

حمید صاحب کے دل میں شادی کے بعد ہی سے ایک چور تھا۔ شادی کے بعد ان کو معلوم ہوا کہ سسرال کے گاؤں میں زینت کا ایک معاشقہ مشہور تھا۔ حالانکہ اس کی حقیقت کچھ بھی نہ تھی۔ جوان لڑکیوں کو تاک جھانک کرنے والوں سے کون بچا سکتا ہے۔ شادی سے پہلے گاؤں کا ایک نوجوان زینت پر بری طرح فریفتہ ہوا تھا، مگر اس میں زینت کا کیا قصور تھا۔ بات یکطرفہ تھی۔ زینت نے کبھی بھوٹی نظر بھی اس کو نہیں دیکھا۔ مگر اس نوجوان نے طرح طرح کی باتیں یوں ہی پھیلادی تھیں۔ ایسی باتوں پر لوگ اکثر یقین کر لیتے ہیں۔ یا کم سے کم اتنا تصور کر لیتے ہیں کہ بات کچھ نہ کچھ ضرور ہوگی۔

یہ بات حمید صاحب کو گھن کی طرح کھاتی رہی۔ زینت کی پچھلی زندگی کے بارے میں ان کے دل سے بدگمانی دور نہ ہو سکی۔ بات اتنی نازک تھی کہ کچھ صاف صاف کہنا سننا مشکل بھی تھا، اور شرافت سے بعید بھی۔ مگر اس شک اور بدگمانی کا زہر حمید صاحب کے برتاؤ میں شامل ہو چکا تھا۔ ڈھکے چھپے وہ زینت کو طرح طرح کے طعنے اور بات بات میں طلاق کی دھمکی دیتے رہتے۔

اتفاق سے حمید صاحب کے ساتھ بھی اسی قسم کی ایک بدنامی لگی ہوئی تھی۔ اور یہ بدنامی جھوٹی نہیں تھی۔ بھانڈا پھوٹ چکا تھا۔ مگر یہ شادی سے پہلے کی بات تھی۔ پھر بھی یہ بات زینت سے چھپی نہ رہ سکی۔ اور جب شادی کے کچھ دنوں بعد زینت نے محسوس کیا کہ اس کی طرف سے حمید صاحب کے آئینے میں بال تھا اور اسی بات کو لے کر وہ بہانے بہانے سے اس کو نشتر چبھوتے رہتے تو اس نے بھی جوابی حملہ شروع کر دیا تھا۔ یہ سلسلہ اندر ہی اندر برسوں سے چل رہا تھا۔ گاہے گاہے تیر و نشتر والی چپقلش چلتی رہتی۔ جو یا تو تلخی اور خاموشی پر ختم ہو جاتیں یا حمید صاحب کی طلاق کی دھمکی پر۔

لیکن کل بات بہت بڑھ گئی۔ معاملہ زینت کے میکے جانے کا تھا جس سے حمید صاحب کو ہمیشہ اختلاف رہتا تھا۔ کئی بار وہ اس کو میکے جانے سے روک چکے تھے۔ مگر اس بار زینت کا بہت اصرار تھا، کیونکہ اس کی ماں سخت بیمار تھی اور عنقریب اس کے بھائی کی شادی بھی ہونے والی تھی۔ اور پھر کئی سال سے زینت نے میکہ کا منہ نہیں دیکھا تھا۔ سسرال کے ماحول سے وہ کچھ اکتائی اکتائی سی بھی تھی۔ وہ ذرا تبدیلی چاہتی تھی۔ مگر حمید صاحب ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے تھے۔ اپنے والدین کی سفارش کو بھی وہ ٹھکرا چکے تھے۔ گھر والے حیران تھے کہ آخر زینت کے میکہ جانے کے معاملے میں حمید صاحب کا رویہ اتنا سخت کیوں ہو گیا تھا۔

میاں بیوی کی بحث اور تکرار میں بات اتنی بڑھی اور حمید صاحب کو ایسا شیطانی طیش آیا کہ انہوں نے ایک دو تین — صاف طلاق دے کر زینت کی زبان کو گنگ اور اس کے جسم کو سُن کر دیا۔ وہ ایک دم ہکا بکا رہ گئی۔ گھر میں کہرام مچ گیا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔

زینت زندہ لاش بنی میکے میں عدّت کے دن گذارتی رہی۔

اِدھر حمید صاحب بچھے بچھے سے ندامت اور اپنے آپ سے نفرت کی زندگی گذارتے رہے۔ طلاق کے بعد اپنے لوگوں میں تو رفتہ رفتہ راز کی بات کھل ہی چکی تھی۔ ایک موقع ایسا بھی آیا کہ وہ شخص جس کے ساتھ زینت کی کچھ ایسی ویسی بات مشہور ہوئی تھی۔ وہ خود حمید صاحب سے ملا اور قرآن پر ہاتھ رکھ کر ان کو یقین دلایا کہ زینت کا دامن پاک تھا اور اس نے اپنی نامرادی کے انتقام میں خواہ مخواہ زینت کے بارے میں من گھڑت باتیں مشہور کر دی تھیں۔

زینت حمید صاحب کے گھر کا ایک ایسا ستون بن چکی تھی کہ جس کے بغیر عمارت کھڑی نہیں رہ سکتی تھی۔ اس کو واپس لانا ہی تھا۔ حمید صاحب کو رجوع کرنا ہی تھا۔ یہ ان کی خواہش بھی تھی اور ضرورت بھی۔ اپنے قصور کی تلافی کئے بغیر ان کی بے چینی اور ضمیر کی ندامت دور نہیں ہو سکتی تھی۔

مگر سوال بڑا نازک تھا۔ زینت کی واپسی کی ایک ہی صورت تھی۔ بالکل کھلی ہوئی بات — حلالہ! غیرت اور ہمت، دونوں کا امتحان۔ مگر زہر کا یہ گھونٹ پیئے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔ زینت کے کان میں جب پہلے پہل یہ بات پہنچی تو وہ شرم اور صدمے کے مارے پسینہ پسینہ ہو گئی اور کئی روز تک اس سے نوالہ نہ اٹھایا گیا۔

آخر بڑے سوچ بچار کے بعد حلالہ کرانے کی بات طے ہو گئی۔ جب حمید صاحب نے خود کو اس تجویز پر آمادہ کر لیا تو انہیں محسوس ہوا جیسے زمانے کی ساری رسوائیوں کو انہوں نے گھول کر زہر کی طرح پی لیا ہو۔ یہ بات بڑی خاموشی اور بڑی احتیاط کے ساتھ دونوں گھروں کے صرف تین چار بزرگوں کے درمیان

چل رہی تھی۔ اب اصل سوال یہ تھا کہ کسی ایسے معقول آدمی کا انتخاب کیا جائے کہ کام بھی بن جائے اور بات بھی نہ کھلے۔

بڑی چھان بین کے بعد دور دراز رہنے والے ایک شخص کو اس کام کے لئے چنا گیا جو زینت کے بھائی کا دوست تھا اور انتہائی شریف آدمی تھا۔ چونکہ وہ شادی شدہ تھا اس لئے اس سے ہر اچھی بات کی توقع کی جا سکتی تھی۔ غیر شادی شدہ یا کمزور کردار کے آدمیوں سے اس قسم کے موقعوں پر طرح طرح کے اندیشے لاحق رہتے ہیں۔ مگر زینت کے بھائی کو پورا اطمینان تھا کہ اس کا دوست مجید نہایت شرافت سے اس رسم کی منشا کو پورا کر سکتا تھا۔

جب زینت کو اس کی بھابی نے فیصلہ کن طور پر اس پروگرام کی اطلاع دی تو وہ کٹ گئی۔

روتے روتے بولی "بھابی، مجھ سے یہ نہ ہو سکے گا۔ میں تو مر جاؤں گی۔ اللہ کے لئے تم لوگ مجھے اب ذلیل و خوار نہ کرو۔ مجھے زہر دے دو کہ سارا قصہ ہی پاک ہو جائے۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں۔ بیوی نہیں رہی تو کیا ہوا۔ چلو، میں صبر کر لوں گی اور ساری زندگی باندی بن کر اپنے بچوں کی خاطر اس گھر میں گزار دوں گی۔ ان سے کہو کہ دوسری کر لائیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ مگر حلالہ والی بات مجھ سے نہ ہو سکے گی۔"

"نہیں، بنّی، تم کیسی باتیں کرتی ہو۔" بھابی نے سمجھایا۔ "اس میں شرم کی کیا بات ہے۔ شریعت کی بات ہے۔ قسمت میں یہ بھی لکھا تھا تو کرنا ہی کیا ہوگا۔ زہر کا گھونٹ پینا ہی ہوگا۔"

"میں تو ڈرتی ہوں کہ شرم سے کہیں مر ہی نہ جاؤں۔" زینت بلبلا اٹھی۔

"تم بے کار اس قدر پریشان ہوتی ہو۔" بھابی نے اس کو ہمت دلائی۔ "بات ایکدم پوشیدہ رہے گی۔ یاد رکھو، خاندان کو جو داغ لگا ہے وہ اسی وقت دھل سکتا ہے جب تم دوبارہ اس گھر میں واپس جاؤ۔ میری بات مانو۔ اپنے بچّوں کی طرف دیکھو۔"

غرض کہ بھابی نے اس کو شیشے میں اتار ہی لیا۔

سینکڑوں میل دور لے جا کر مجید سے زینت کا نکاح پڑھا دیا گیا۔ مجید کی بانجھ بیوی کو سمجھا بجھا کر چند دنوں کے لئے پہلے ہی میکے بھیج دیا گیا تھا۔ یوں بھی وہ جتنے دنوں میکے میں رہتی۔ مجید عافیت ہی محسوس کرتا تھا۔

جس وقت زینت کو مجید کی خلوت گاہ میں پہنچا یا گیا، جاڑے کا موسم ہونے کے باوجود وہ پسینے میں شرابور تھی اور تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس کے قدم من من بھر کے وزنی ہو گئے تھے۔ پلنگ تک پہنچتے پہنچتے وہ غش کھا کر گری مگر مجید نے اسے اپنے بازوؤں میں سنبھال لیا۔

محبت اور احساسات کی موت کی وہ رات زینت پر بڑی بھاری اور بڑی بھیانک تھی۔ وہ ایسا محسوس کرتی رہی کہ پلنگ پر اس کی لاش پڑی ہو اور اس سرد لاش کو دہکتے ہوئے تنور میں رکھ کر کوئی اس میں زندگی کی گرمی پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ ساری رات وہ ایسا محسوس کرتی رہی جیسے اس کے پورے جسم پر بے شمار غلیظ کیڑے رینگ رہے ہوں۔

ایک زندہ اور ایک مردہ جسم نے مل کر شریعت کی منشا پوری کر دی تھی!

صبح ہوئی تو زینت در و دیوار کو دیوانہ وار گھور رہی تھی۔ چہرہ اترا ہوا اور جسم نڈھال۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کا سارا خون نچوڑ لیا گیا ہو۔ منہ کا مزہ زہر زہر ہو رہا تھا اور وہ کسی جان لیوا احساس کے مارے بستر سے اٹھنے کی سکت اپنے اندر نہیں پا رہی تھی۔

زینت کی جاں کنی کی اس رات کے بعد مفاہمت کے مطابق مجید کو طلاق دے دینی تھی مگر اس کے تیور بدلے ہوئے تھے۔ وہ بات کو یہ کہہ کر ٹال گیا کہ حجاب اور اخلاقی احساسات کی شدت کے سبب وہ اپنا فرض پورا کرنے سے قاصر رہ گیا تھا۔ مگر یہ سراسر جھوٹ تھا۔ بات کچھ ایسی نازک تھی کہ نہ کھل کر شک کا اظہار کیا جا سکتا تھا۔ نہ مجید پر دباؤ ڈالا جا سکتا اور نہ شرم و حجاب کی وجہ سے زینت سے اس کی تصدیق کرائی جا سکتی تھی۔

ایک ہفتہ گزر گیا پھر بھی مجید کی طرف سے طلاق کی نوبت نہ آئی۔ اس نے زینت کے بھائی کو یہ کہہ کر چلتا کر دیا کہ وہ تکمیل مقصد کے لئے خود کو حاضر نہیں پا رہا ہے۔ نہ جانے کب تک وہ حلالہ کی بنیادی شرط پوری کرنے سے قاصر رہے۔ جوں ہی بات بن جائے گی وہ زینت کو طلاق دے کر واپس

پہنچادے گا۔

لیکن زینت کے بھائی کو دال میں کچھ کالا نظر آیا، پھر بھی وہ دل پر جبر کئے چلا گیا۔

دن پہ دن گزرتے رہے۔ زینت کے میکے اور سسرال والوں کا اضطراب اور وسوسہ بڑھتا رہا۔ مگر نہ زینت واپس آئی اور نہ کوئی خبر آئی۔ پھر ایک دن ایک عورت حمید صاحب کی چوکھٹ پر آکر بیٹھ گئی۔ عورت کے چہرے پر کچھ غصّہ تھا، کچھ نفرت تھی۔ وہ بھر بھر کر حمید صاحب کی سات پشتوں کو صلواتیں سنانے لگی۔ کچھ دل کا بخار نکلا تو وہ فریادی لہجے میں بین کرتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

یہ عورت مجید کی بیوی تھی۔

وہ کہہ رہی تھی "تم ظالموں کے کالے کرتوت سے میرا سہاگ اجڑ گیا۔ ہائے، میں کہیں کی بھی نہ رہی! وہ مرا کچھ ایسا بھاگا ہے اس چڑیل پر کہ اسے کسی قیمت پر چھوڑنے کو تیار نہیں۔ اب تو وہ بچہ جننے والی ہے۔ دن چڑھ گئے ہیں۔ تمہاری سات پشتوں پر خدا کی پھٹکار۔ اجاڑ کے رکھ دیا مجھے۔"

حمید صاحب کے تو پاؤں تلے سے زمین سرک گئی۔ وہ اپنا سر تھام کے بیٹھ گئے۔ محلے ٹولے کی عورتوں کا ازدحام لگ گیا تھا۔

ایک عورت نے اس کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ "بی بی اب رونے دھونے اور کوسنے سے کیا حاصل۔ کیوں زخموں پہ نمک چھڑکنے آگئی ہو۔ جاؤ اپنا گھر بار دیکھو اور قسمت کے لکھے کو بھگتو۔ یہاں کسی نے تم سے دشمنی نہیں کی۔ جاؤ، اپنے گھر جاؤ۔ اس طرح شریفوں کی آبرو مٹی میں نہ ملاؤ۔"

"اب میں کہاں جاؤں؟" وہ عورت پھر کر بولی "اس بے ایمان نے مجھے طلاق دیدی ہے۔ میں تو اسی چوکھٹ پر اپنی جان دے دوں گی!"

حمید صاحب کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔ وہ دیوانہ وار قہقہے لگاتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

کئی سال گزر گئے۔ حمید صاحب اب بھی قہقہے لگاتے ہوئے دیکھے جاتے ہیں، اور وہ مظلوم عورت آج بھی حمید صاحب کی چوکھٹ پر پڑی اس دن کا انتظار کر رہی ہے جب حمید صاحب قہقہوں کی دنیا سے آنسوؤں کی دنیا میں لوٹ آئیں گے۔

دو دانش آموز کتابیں

کتاب دانش :- مرتبہ طاہرہ کشفی۔

- کتاب دانش اردو میں اقوال اور مقالوں کی پہلی باضابطہ کتاب ہے۔
- کتاب دانش مشرق و مغرب کی فکر کی لازوال محفل ہے۔
- کتاب دانش میں دو سو سے زیادہ موضوعات پر فکر انسانی کا نچوڑ پیش کیا گیا ہے۔

قیمت لائبریری ایڈیشن پانچ روپے پچاس پیسے ۔ پیپر بیک تین روپے

عرب قبل اسلام منشی ذکاء اللہ دہلوی

اردو کے ایک عظیم مصنف اور نامور مورخ کی یہ تحریر پہلی بار کتابی صورت میں شایع کی گئی ہے۔ اسلام کے انقلاب آفریں پیغام کو سمجھنے کے لیے عرب قبل اسلام کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ سید ابوالخیر کشفی نے اپنے طویل مقدمہ میں ذکاء اللہ مرحوم کی زندگی اور فکر کے ہر اہم پہلو کو اجاگر کیا ہے۔ قیمت لائبریری ایڈیشن دو روپے۔ پیپر بیک ایک روپیہ

طاہرہ کتاب گھر ۳۰ موتن بلڈنگ۔ بندر روڈ۔ کراچی

واجدہ تبسم
بانو نئی دہلی

عیدی

میرے گلے میں ایک بے حد خوبصورت لاکٹ جھولتا رہتا ہے۔ دل کی وضع کا سونے کا یہ لاکٹ کتنوں ہی کی توجہ اپنی طرف کھینچ چکا ہے سکھی سہیلیاں مجھ سے چھیڑ سے پوچھتی ہیں "یہ کیا اپنے پریتم کی تصویر اس میں چھپا رکھی ہے جو کبھی گلے سے الگ ہی نہیں کرتی" میں مسکرا کر رہ جاتی ہوں۔ ایک غمناک سی مسکراہٹ۔ کیا لاکٹوں میں صرف پریتم کی تصویریں چھپائی جاتی ہیں؟ یہ کوئی ایسا راز تو نہیں جسے میں زمانے بھر کی نگاہ سے چھپاتی پھروں۔ لیکن میں اکثر یہ سوچ کر رہ گئی ہوں کہ اگر میں نے یہ بتا دیا کہ اس لاکٹ میں میں نے کیا سجا رکھا ہے تو کیا سننے والے واقعی یقین کر لینگے؟

آج عید کا دن ہے۔ پتہ نہیں اس دن میں کیا خاص بات ہوتی ہے کہ بھولے بسرے پرانے چہرے بھی یوں رہ رہ کر یاد آتے ہیں کہ دل کلپ کلپ جاتا ہے۔ میری یادوں کے اُفق پر ایک چہرہ عید کے دن خاص طور سے جگمگاتا ہے۔ یوں جیسے وہ چہرہ نہ ہو، چاند ہو جس کی جگمگاہٹ سے دل کا کونا کونا روشن ہو جاتا ہے۔ یہ میری دادی بی کا چہرہ ہے۔ محبت کی شعاعوں سے دمکتا ہوا، پیار میں ڈوبا ہوا۔

برسوں پہلے کی بات ہے، اُن دنوں کی جب شاید میں چھ سات برس کی ننھی سی معصوم اور نادان بچی تھی، اُس سال عید ہمارے لئے محرّم بن کر آئی تھی۔ اس لئے کہ عید سے چند روز پہلے ہماری امّی چل بسی تھیں۔ عید کے دن جو چہل پہل اور خوشی ہوتی ہے اس کا دور دور پتہ نہ تھا، بس ایسا لگتا تھا ابھی ابھی کوئی میّت اٹھائی گئی ہے۔ نانی امّاں کا اس دن روتے روتے بُرا حال تھا۔ ہمیں نہ عید کے اہتمام میں نئے کپڑے پہنائے گئے، نہ گھر میں اچھے اچھے پکوان پکے۔ جب محلے ٹولے کے سارے بچے رنگ برنگ کے کپڑے پہن کر اِدھر اُدھر اچھل پھاند مچانے لگے، اس وقت اچانک اس جان لیوا حقیقت کا انکشاف ہوا کہ آج ہمارے گھر عید نہیں آئی ہے۔ جب ہم نے ناسمجھی سے ضد کرنی شروع کی۔ "ہم بھی نئے کپڑے پہنیں گے، ہم بھی میٹھا کھانے بیٹھیں گے" تو نانی اماں نے نوکر کو بلا کر ہدایت کی کہ ان بچوں کو راحت بوا کے ہاں چھوڑ آ۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔

نوکر نے ہماری انگلیاں پکڑیں، اور ہمیں ایک صاف ستھرے بے حد چھوٹے سے گھر میں چھوڑ آیا۔ وہیں میں نے پہلی بار محبت سے بھرپور ایک چہرہ دیکھا۔ وہ نانی اماں کی سہیلی راحت بوا تھیں اور ہماری دادی بی۔ انہوں نے ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور گلے سے لگاتے ہی اُن کے منہ سے گھٹی گھٹی چیخیں نکل گئیں "آج اگر تمہاری ماں زندہ ہوتی۔" آنسوؤں نے اُن کا گلا دبوچ لیا اور وہ پھپک پھپک کر رو دینے لگیں۔ ہم حیرت سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ ہماری امّی کے لئے یوں دھاڑوں دھاڑ رونے والی یہ مہربان ہستی کون ہے؟ پھر انہوں نے سنبھل کر ہماری سہمی ہوئی صورتوں کو دیکھا اور بڑے پیار سے غسل خانے میں لے گئیں۔ مونہہ ہاتھ دھلوا کر انہوں نے بے حد پیار سے میرے سر میں تیل ڈالا اور چوٹیاں گوندھنے بیٹھ گئیں۔ جب بھیّا کی اور میری روتی صورتیں بھی سنور گئیں تو انہوں نے بے حد پیار سے دسترخوان بچھایا اور کئی طرح کے کھانے لا کر چن دیئے۔ وہ مونہہ میں نوالے دے دے کر سر پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر ہمیں کھانا کھلاتی رہیں اور جب نیند سے

ری آنکھیں مُندنے لگیں تو انہوں نے کھلے برآمدے میں ہوا کے رُخ پر ایک صاف ستھرا بستر بچھایا اور ہم دونوں بہن بھائیوں کو تھپک تھپک کر سلا دیا۔

کوئی تین چار بجے کے قریب ہم اٹھے۔ انہوں نے پھر سے مونہہ ہاتھ دھلوا کر ہمیں محبت سے سنوارا اور دھوپ ڈھلے جب ہم گھر چلنے کو ہوئے تو انہوں
ے دروازے تک ہمیں لاکر چھوڑا۔ اور جانے سے پہلے اپنی کمر میں اڑسی ہوئی ایک بوسیدہ سی تھیلی نکالی اور بڑے پیار سے ہماری مٹھیاں کھلوا کر اس میں
یک ایک چونّی رکھی اور بولیں۔ "یہ تمہاری عیدی ہے بچو"۔

میں نے بے حد غیر یقینی انداز سے پہلے اپنی مٹھی میں رکھی ہوئی چونّی کی طرف دیکھا اور پھر دادی بی کی طرف پہلی بار شاید میرے ہونٹ کھلے۔ "یہ
، یہ میری ہے ۔۔۔؟"

" ہاں بیٹی بالکل تیری ہے ۔" پھر وہ بے حد پیار سے میرے سر پہ ہاتھ رکھ کر بولیں۔ "اچھا یہ بتا تو اپنی نانی اماں سے تو نہیں کہہ دے گی کہ میں نے
ہ چونّی دی ہے"۔

" بالکل نہیں"۔ میں نے مٹھی کو مضبوطی سے بند کرتے ہوئے کہا۔ دادی بی جانتی تھیں کہ نانی اماں ان معاملوں میں حد درجہ سخت واقع ہوئی
ہ۔ وہ اس بات کی مطلق روادار نہ تھیں کہ ہم کسی سے ایک پائی بھی لیں۔ بھلے سے وہ عیدی کے ناطے ہی کیوں نہ ہو۔ جب دادی بی مطمئن ہو گئیں تو انہوں
ے بڑے رازدارانہ لہجے میں پوچھا۔ "اچھا بی بی یہ بتا تو ان چار آنوں میں کیا کیا خریدے گی"۔

یہ سوال مجھے گڑبڑا گیا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ نانی اماں نوکر کے ہاتھ میں دو آنے دے کر ڈھیروں سودا لانے کو کہا کرتی تھیں۔ اور وہ زمانہ اس
رستے کا زمانہ تھا کہ تھیلا بھر سودا لانے کے باوجود بھی نوکر دو تین پیسے نانی اماں کے ہاتھ میں واپس تھما دیا کرتا تھا۔ چار آنے میں تو ایک دنیا آسکتی تھی۔ اگر
ڑیا کا بیاہ ہی رچانے بیٹھ جاؤں تو ڈھیروں چاول، شکر، گھی، میوے، پھر گوشت، سبزیاں، کیا کیا نہ خرید سکوں گی۔ پوری بارات کھانا کھا کر اٹھ جائے گی۔
ب بھی چیزیں باقی بچ جائیں گی۔ میری سمجھ میں قطعی نہیں آرہا تھا کہ آخر میں اس خزانے کو کس طرح خرچ کرپاؤں گی۔ بس جی چاہ رہا تھا جلد سے جلد دادی بی
ے چنگل سے نکل بھاگوں اور جس طرح بن پڑے اس دولت کو ٹھکانے لگا دوں ۔۔ اس خیال کے آتے ہی پہلے تو میں نے کچھ شک و شبہ سے دادی بی کے
ہرے کو دیکھا اور پھر تیزی سے مٹھی بند کر کے چوکھٹ سے ایک دم باہر بھاگی۔ مجھے اپنے پیچھے دادی بی کی محبت اور ہنسی سے بھری آواز سنائی دی۔ "ڈرتی ہے
کوئی اس کی رقم ہتھیا نہ لے"۔

اور یہ حقیقت بھی تھی۔

گھر آنے پر میں اور نئے نئے وسوسوں میں الجھ گئی۔ آخر میں کس طرح یہ رقم خرچ کر سکتی تھی؟

یوں نہیں ۔۔ میں نے سوچا، گھر سے ملی ہوئی جو دکان ہے وہیں چل کر سوچتے ہیں، اچھی اچھی چیزیں دیکھ کر خود ہی سوجھ جائے گا کہ کیا لیا جائے، کیا
لیا جائے۔

دوسرے دن جب نانی اماں اپنے کاموں میں مصروف تھیں، میں آنکھ بچا کر گھر سے نکلی اور سیدھے کونے والی دکان پر جا پہنچی۔ ایک انگلی دانتوں تلے
بائے میں بڑی دیر تک محویت کے عالم میں دکان کا جائزہ لیتی رہی ۔۔ کئی گاہکوں سے نمٹنے کے بعد آخر دکان دار مجھ سے مخاطب ہوا۔ "تمہیں کیا چاہئے بی بی ۔۔ ؟"

میں ہڑبڑا سی گئی، "وہ ۔۔ وہ کونے میں جو گڑیا ہے وہ چاہئے"۔

دکان دار نے گڑیا نکال کر سامنے رکھ دی اور پھر پوچھا۔ "اور کیا چاہئے"؟

" اور گڑیا کے گلے کے لئے مالا ۔۔ موتیوں والی ۔"

" چلئے یہ قصہ بھی تمام ہوا"۔ دکان دار خوش دلی سے مسکرایا۔

" اب بتائیے"۔

"کاجو۔"

"اور ۔۔؟"

"وہ کھٹی میٹھی گولیاں۔"

"اور ۔۔؟"

میں نے جھجک کر کہا۔"رنگین پنسل۔"

"اور ۔۔؟"

میں نے کچھ غیر یقینی نگاہوں سے سامان کے ڈھیر کو تاکا۔ اتنا کچھ خرید لیا اور یہ دوکاندار ابھی تک اور ۔ اور کہے جا رہا ہے میں نے مطمئن ہو کر کہہ دیا۔"اب بس۔"

دکان دار نے سامان کا بنڈل بنا کر میرے ہاتھوں میں تھمایا اور ساتھ ہی بچے ہوئے چھ پیسے بھی میرے ہاتھ میں رکھ دیئے۔

اب میری سمجھ میں آیا کہ دادی بی کیوں پوچھ رہی تھیں کہ بتا بی بی تو ان چار آنوں میں کیا کیا خریدے گی۔ تو کیا دادی بی نے واقعی اس قدر رقم حوالے کر دی تھی۔؟ ایک دم سے دادی بی مجھے قصے کہانیوں والی مہربان پری لگیں جو خوش ہو کر جو جی میں آتا بخش دیا کرتی۔

میں خوشی سے لدی پھندی گھر لوٹی۔ سامنے ہی نانی اماں کھڑی مرغیوں کو دانہ ڈال رہی تھیں۔ میرے پاؤں ٹھٹک گئے۔ اب تو خوب پٹائی ہوگی لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب سارا قصہ سننے کے بعد نانی اماں کی آنکھیں خود بھی آنسوؤں سے بھر گئیں اور وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولیں"بڑی نیک بخت بی بی ہے۔ خدا دونوں جہاں میں اس کی نیکیوں کا صلہ دے۔ گوشت پوست سے نہیں محبت سے بنی ہوئی عورت ہے راحت بوا۔"

نانی اماں کے ان الفاظ سے میرے دل میں دادی بی کی محبت اور قدر دگنی تگنی ہو گئی۔

اگلی عید پر بھی ہم دادی بی سے ملنے گئے وہ اسی تپاک سے ملیں جیسے سال بھر ملتی رہتی تھیں۔ اور اس عید پر بھی انہوں نے وداع کرتے ہوئے اپنی بوسیدہ سی تھیلی میں سے چونی نکال کر دی اور اسی رازدارانہ لہجے میں پوچھا"بتا بی بی ان چار آنوں میں تو کیا کیا خریدے گی؟"

کتنے سال ایک ایک کر کے یونہی گزر گئے۔ زمانے کے انداز بدلتے رہے۔ مہنگائی بڑھتی رہی۔ پھر جنگیں ہوئیں۔ دنیا کے نقشے بدلے۔ ہندوستان پاکستان آزاد ہوئے۔ ایک نئی دنیا کی داغ بیل پڑی اور ہم بھی اپنے آبائی وطن کو چھوڑ کر پردیس میں آبسے۔ اب تک زندگی میں کوئی لمحہ خوشی کا میسر نہ آیا تھا، وہی غربت۔ وہی تنگی، وہی حالات ۔ سوچا تھا کہ نئی جگہ شاید نیا آب و دانہ بدلے گا۔ لیکن قسمتیں بھی کبھی بدلا کرتی ہیں؟ پردیس آکر مصیبتوں کی داستان اور بھی دردناک اور طویل ہو گئی۔ عید آتی تو اور بھی یاد آتا کہ کس طرح دادی بی چار آنے دیا کرتی تھیں جو ایک مدت کی خوشی کا سامان ہو جاتے تھے۔ پردیس آکر اس دولت سے بھی محروم ہو گئی۔

پھر کچھ سال اور گزرے ۔ اور زمانہ اس تیز رفتاری سے بدلا۔ اور مہنگائی یوں بڑھی کہ چار آنے تو کیا چار روپے بھی حقیر رقم معلوم ہونے لگی۔ بچپن میں سال بھر عید کا انتظار واقعی عید کی طرح رہتا تھا۔ اب عید آئی تو سادے دن کی طرح یونہی گزر جاتی ۔ لیکن یہ ضرور تھا کہ کسی بھی عید کو دادی بی کی یاد نے ساتھ نہ چھوڑا۔

وقت نے ایک اور پھر پلٹا کھایا اور میری شادی ہو گئی۔ گویا زندگی بھر کی تمام کلفتوں، مصیبتوں کا خاتمہ ہو گیا۔ یہ یقین پختہ تر ہو گیا کہ خدا مصیبت کے بعد راحت اور خزاں کے بعد بہار ضرور دیتا ہے۔ میرے شوہر بڑے بزنس مین تھے۔ روپے پیسے کی کوئی قدر ہی نہ تھی۔ جنت کا ہمارے ذہنوں میں یہی تصور ہے نا کہ جس چیز کی تمنا کرو وہ موجود ہوتی ہے۔ تو مجھے جیتے جی گویا جنت مل گئی تھی۔ پھر جب خدا نے اس چمن میں ایک نوشگفتہ کلی اور ایک پھول بھی کھلا دیا تو زندگی سچ مچ ہی بہار اور جنت کا حقیقی روپ ہو گئی۔

دنیا دہی تھی۔ یقیناً دنیا کی مشکلات بھی وہی ہوں گی، لیکن میرا حال تھا کہ کبھی ایک گاڑی ایک سال استعمال کر لی اور اس سے جی بھر گیا تو یوں نئی خرید لی جیسے بیس ہزار کی نہ ہو۔ بیس روپے کی بات ہو۔ شہر اور میدان میں رہتے رہتے جی اوب گیا تو پہاڑوں پر گرمیاں گزارنے چلی گئی، تقریباً ہر ملک میں اپنی ذاتی گھر انہوں نے خرید رکھے تھے اور ویسے بھی رہنے کے لئے بمبئی جیسے شہر میں اتنی بڑی کوٹھی تھی کہ چلتے چلے جاؤ مگر کوٹھی ختم نہ ہو۔ اب عید آتی تو ان ہنگاموں کے ساتھ کہ خریداری شروع ہوتی تو ختم ہونے ہی میں نہ آتی اور گھڑیوں بھر جاتا کہ لگتا کہ دکانیں کی دکانیں گھر میں لا ڈالی ہیں۔

اسی طرح چند سال اور گزر گئے اور پھر اچانک ایک موقع ایسا آیا کہ مجھے برسوں بعد وطن عزیز میں عید منانے کا موقع ملا۔ جب ہم اپنے آبائی مکان میں اُترے تو ایسا لگتا تھا کہ یہ گھر نہیں روحوں کا ویران مسکن ہے۔ محلے ٹولے کے پرانے لوگ جانے کدھر جا بسے تھے لے دے کے گھر میں ایک پرانے وقتوں کا بوڑھا مالی رہ گیا تھا جو سرِ شام ہی ننھا سا میلاد یا جلا کر راہداری والے طاقچے میں رکھ دیتا۔ پرانے دن۔ پرانی باتیں۔ گزری ہوئی گھڑیاں یاد آ آ کر دل کو جیسے مسوسنے لگیں۔ شہر ہوٹلوں اور بڑے بڑے ریسٹورانوں سے بھرا پڑا تھا۔ یہ کیا ضرور تھا کہ ہم اسی مزار جیسی ویران حویلی میں عید مناتے۔ لیکن میں نے سوچا، پرانی یادوں کو تازہ کر لینے میں حرج ہی کیا ہے۔

جب وہ عید کی نماز پڑھ کر لوٹے تو میں سراپا بہار بنی کھڑی تھی۔

"افوہ۔ یہ ٹھاٹ ہیں!" انہوں نے پیار سے چھیڑا۔ "قیامت نظر آ رہی ہو۔ کہاں کی تیاری ہے۔؟"

میں نے ایک نظر اپنے آپ پر ڈالی۔ یہ ساڑی گیارہ سو میں انہوں نے خاص طور سے مجھے عید پر پہننے کے لئے دلائی تھی۔ یوں چمکتی جگمگاتی مالوم ہو رہی ہے۔ کانوں میں ہیرے کے دمکتے ہوئے لانبے لانبے جھمکے۔ ہاتھوں میں ساڑی سے میل کھاتی ہوئی اصلی زمرد کی چوڑیاں۔ گلے میں جڑاؤ ہار۔ ناک میں تارے کی طرح جگ مگ کرتی ننھی سی لونگ۔ انگلیوں میں دلہنوں کی طرح بھرپور انگشتریاں۔ اور پیروں میں نازک نازک چپلیاں جو سونے کے تاروں کی بنی ہوئی تھیں۔

میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا اور ہنس کر بولی۔ "تیاری؟ ہاں تیاری ہے تو سہی اور ایک بہت اہم ہستی سے ملنے کی ہے۔"

"ذرا ہم بھی اس خوش نصیب کا نام سنیں۔" وہ شرارت سے بولے۔

میں بچوں کی سی معصوم خوشی سے بولی "آپ سن بھی لیں تو اس کی اہمیت کو نہ سمجھ پائیں گے۔" پھر میں قدرے رُک کر بولی "وہ میری دادی بی ہیں"

"تمہاری دادی بی۔۔؟" وہ حیرت سے بولے۔ "مگر جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے تمہاری دادی بی کے انتقال کو تو ایک مدت ہو چکی ہے"

"ہاں لیکن یہ دادی بی میری رگِ جاں سے بھی قریب رہی ہیں۔ آپ [illegible] کہئے گا کہ ایسی محبت والی ہستیاں صرف کتابوں میں ملتی ہوں تو ہوں۔ اس دنیا میں تو مثال ناممکن ہے۔"

انہوں نے حیرت سے مجھے دیکھا اور بنا کچھ کہے گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔

ہماری لمبی کار زن سے ایک بوسیدہ سے مکان کے پاس سے گزری اور میں نے ذرا چلا کر کہا "بس بس۔ روک دیجئے۔ یہی میری دادی بی کا گھر ہے۔"

کار ایک نرم سے جھٹکے کے ساتھ رُکی۔ کار کے رُکتے ہی بہت سارے بچے بھی نہ جانے کہاں سے آ کر کھڑے ہو گئے اور حیرت سے گردنیں اونچی کر کے دیکھنے لگے۔

میں جیسے ہی گھر میں داخل ہوئی ایسا لگا کہ کسی محل سے نکل کر ماچس کی ڈبیا میں بند ہو گئی ہوں۔ ایک پُرانی سی بُو نے میرا استقبال کیا اور چلتے چلتے اندھیرے سے جب میری آنکھیں مانوس ہو گئیں تو میں نے دیکھا کہ کونے میں ایک مڑی تڑی گٹھری سی پڑی ہے۔

"کون ہے۔؟" پاؤں کی چاپ سن کر ایک کمزور سی آواز نے سر اٹھایا۔

"ارے یہ تو دادی بی ہیں" میں نے دھڑکتے دل سے سوچا۔ پھر ہمت جمع کر کے میں نے آواز نکالی "دادی بی میں ہوں۔ آپ کی بی بی۔"

یوں جیسے ذہن پر زور ڈال کر انہوں نے کچھ سوچا ہو۔ پھر خوشی سے لرزتی آواز میں انہوں نے اپنے ہاتھ پھیلاتے ہوئے "ارے بی بی تو!

آمنہ بوا کی نواسی ہے نا تو؟" گویا انہوں نے یقین کر لینا چاہا ہو۔

"ہاں دادی بی میں ہوں ــــ آپ مجھے بھول گئیں۔"

شرمندگی کے ہلکے سے غبار میں لپٹی اور دکھ میں ڈوبی آواز میں وہ بولیں "نہیں بی بی تو کوئی بھولنے جیسی چیز ہے۔ مگر برس بھی کتنے گزر گئے ــــ کم بخت آنکھیں بھی تو جاتی رہیں۔"

میرے دل پہ ایک گھونسہ سا پڑا۔ میں سہم کر بولی۔ "دادی بی آپ کو نظر نہیں آتا۔"

"نہیں بی بی ــ بس اب تو آنکھوں کے آگے مستقل رات کا سا منظر ہے۔ اندھیرا ہی اندھیرا۔" وہ ذرا ہنس کر بولیں۔ "اور بی بی اب دنیا میں دیکھنے کے لئے رہ بھی کیا گیا ہے۔ اپنے بیگانے ایک ایک کر کے سارے مر کھپ گئے یا پاکستان چلے گئے ــ مگر اتنے دنوں میں آج دل چاہ رہا ہے کہ آنکھیں ہوتیں تو اپنی بی بی کو ایک نظر دیکھ تو لیتی ــ تیری شادی وادی ہو گئی یا نہیں بی بی۔" وہ محبت سے پوچھ رہی تھیں۔

دکھ اور شرم سے بوجھل آواز سے میں بولی "جی ہاں دادی بی ــ ہو گئی ــ"

"بچے وچے ہیں ــ؟"

"ایک لڑکا ایک لڑکی ہے ــ"

"ساتھ نہیں لائی ــ"

"نہیں دادی بی ــ بمبئی میں گھر پر ہی ہیں۔"

"چلو اچھا ہوا۔" وہ سکھ کی سانس لے کر بولیں۔ "بن ماں کی بچی تھی ٹھکانے سے بیٹھ گئی۔" ایک دم جیسے انہیں کچھ یاد آیا ــــ وہ مجھے ہاتھوں سے ڈھونڈتی ہوئی بولیں۔ "پر میرے لئے تو تو ابھی بھی بچی ہے اب تو کچھ سوجھتا بھی نہیں ورنہ تیری کنگھی چوٹی بھی کر دیتی ــ آج عید کا دن ہے نا ــ ہر عید کو میں تیرے بال سنوارا کرتی تھی یاد ہے نا ــ"

میں نے گردن سے دوپٹہ ہٹا کر بندھے اپنے ترشے ہوئے جوڑے کو محسوس کیا جس میں چمپاکرن کا سونے اور موتیوں کا کلس جگ مگ کر رہا تھا اور سہم کر بولی۔ "دادی بی اب تو میں بہت بڑی ہو چکی ہوں۔"

"ہاں ــ بی بی پر میرے لئے تو تو آج بھی وہی ننھی سی بچی ہے جو میرے ہاتھوں کے بنے نوالے کھا کر میرے بستر میں سو جایا کرتی تھی۔" ایک دم انہوں نے بے بسی سے ادھر ادھر دیکھ کر کسی کو پکارنا شروع کیا۔ "ارے زینو، او زینو ــ کچھ سوئیاں میٹھا ہو تو یہاں دے جا ــ میری بی بی آئی ہے۔" شاید وہ اپنی پڑوسن کو آواز دے رہی تھیں۔

ہائے یہ بڑھاپا اور یہ محبت! میرا دل اندر سے رو اٹھا، میں خود کو سنبھال کر بولی۔ "آپ تکلیف نہ کیجئے دادی بی ــ مجھے بالکل بھوک نہیں ہے۔ بس آپ میٹھی باتیں کیجئے۔ آپ سے ملے اتنے دن ہو گئے کہ جی چاہتا ہے بس آپ سے باتیں کئے جاؤں۔"

"ہاں بی بی ــ" وہ دکھ سے بولیں۔ "اب تو بڑی ہو گئی تو عقل مند بھی ہو گئی ــ کوئی میرے بکارنے پر ملتا نہیں تو تو نے کہہ دیا کہ مجھے بھوک نہیں ــ میں کیسے مان لوں کہ تجھے بھوک نہیں۔"

ماحول میں کچھ ایسا رومانی ہو گیا تھا کہ مجھے اپنے آنسو روکنا دوبھر ہو گئے ــ کتنی ہی دیر خاموشی چھائی رہی مانو جگ بیت گئے ہوں ــ پھر میں خود کو سنبھال کر بولی۔ "دادی بی یہاں تو آپ کی دیکھ ریکھ کرنے والا بھی کوئی نہیں۔ آپ میرے ساتھ میرے گھر بمبئی چلئے نا۔"

وہ درد ناک انداز سے مسکرائیں۔ "بی بی جانے والی ہوتی تو پاکستان نہ چلی گئی ہوتی۔ ایک ایک نے خوشامد کی مگر مجھے میری مٹی عزیز ہے۔ اب تھوڑے دن رہ گئے۔ کہاں جاتی پھروں گی۔ بس تیرا انتظار تھا ــ اسی لئے رکی رہی ہے۔" پھر وہ کچھ یاد کر کے بولیں۔ "تیری نانی تو اچھی ہیں بی بی۔"

"ہاں دادی بی — وہ بھیا کے پاس رہتی ہیں"

جس در و دیوار کے سائے تلے اور جس محبت بھری آغوش میں ہمیشہ میں ایک سکون پایا کرتی تھی آج وہیں مجھے کانٹوں کی سی چبھن محسوس ہو رہی تھی۔ اک درد سا دل میں اُٹھ رہا تھا — جی چاہ رہا تھا چیخ چیخ کر روؤں مگر آنسو بھی جیسے منہ چھپا کر کہیں بیٹھ گئے تھے۔

"اچھا دادی بی اب میں چلوں —" بڑی دیر بعد بڑی ہمت باندھ کر میں اتنا جملہ کہہ سکی —

"اچھا — خدا تیرا نگہبان ہو بی بی —" وہ ٹوٹی ٹوٹی آواز سے بولیں۔ ایک دم انہوں نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے روکا "مگر ذرا ٹھہر — اپنی عیدی تو جا" اتنا کہہ کر انہوں نے ٹٹول ٹٹول کر اپنی بوسیدہ سی تھیلی کمر سے نکالی اور اس کے اندر بہت دیر تک انگلیاں گھنگھولنے کے بعد ایک سکہ نکال کر مجھے تھمانا چاہی —

"دیکھ تو ذرا یہ چوّنی ہی ہے نا —؟"

میں ایک لفظ بھی نہ کہہ سکی — پھر انہوں نے اٹکل سے میرا ہاتھ تھاما اور میری بند ہتھیلی کھول کر چوّنی اس میں رکھ کر پھر سے مٹھی بند کر دی اور بڑے ہی رازدارانہ لہجے میں پوچھنے لگیں۔ "اچھا بی بی یہ تو بتا تو ان چار آنوں میں کیا کیا خریدے گی —؟"

پہلی بار میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ دادی بی کی آنکھیں چلی گئی ہیں، ورنہ اگر دادی بی یہ دیکھ لیتیں کہ میرے جسم پر ہزار بارہ سو کی ساڑی ہے، بدن زیورات سے بوجھل ہے، سر پر سونے کا کلس جگ مگ کر رہا ہے اور میں بڑی سی کوٹھی سے اُٹھ کر اتنی لمبی چوڑی کار میں بیٹھ کر ان سے ملنے آئی ہوں کہ سڑک کا سرا یہاں سے وہاں تک لبالب بھر گئی ہے تو — تو — تو — !

اب ضبط کی ہر حد ختم ہو گئی تھی۔ میں ننھے بچوں کی طرح کھلے دل سے چیخ چیخ کر رونے لگی۔ محبت کا وہ عظیم عطیہ وہ چوّنی جو لاکھ خزانوں پر بھاری تھی میری ہتھیلی پر لرز رہی تھی — میں نے اپنی مٹھی اپنے سینے سے لگا لی۔

دادی بی — میں ان چار آنوں سے کچھ بھی نہیں خریدوں گی، میں ان چار آنوں کو کبھی خرچ نہیں کروں گی — کیونکہ یہ تو وہ عظیم رقم ہے کہ چاہوں تو اس سے ساری دنیا خرید لوں، لیکن میں یہ کیسے گوارہ کر پاؤں گی کہ اس دولت کو خود اپنے ہاتھوں سے کسی اور کو دے دوں — یہ چوّنی کسی دوکان دار کے ہاتھ میں نہیں جائے گی دادی بی — یہ سدا میرے دل میں تعویذ بن کر رہے گی —

میں نے یہ سب کہنا چاہا لیکن آنسوؤں کی تیز بوچھار میں الفاظ ساتھ نہ دے سکے۔

سکھی سہیلیاں مجھے چھیڑ چھیڑ کے پوچھتی ہیں۔ یہ کیا اپنے پریتم کی تصویر اس میں سجا رکھی ہے۔ جو کبھی اس لاکٹ کو گلے سے الگ ہی نہیں کرتی —؟

لیکن میں یہ سوچ کر جواب دیتے دیتے رہ جاتی ہوں کہ اگر میں نے بتا بھی دیا کہ اس لاکٹ میں میں نے کیا سجا رکھا ہے تو سننے والے کیا واقعی یقین کریں گے؟

پاک ہند کی ممتاز افسانہ نگار آمنہ ابوالحسن کے منتخب افسانوں کا مجموعہ

کہانی شایع ہو چکا ہے

ملنے کا پتا:- ۱۰۵۵-۱-۲۳ بسنتی بنگلہ۔ حیدرآباد ۲۔ (اے۔پی)

مشتاق بک ڈپو — شیلڈن روڈ — کراچی نمبر ۱

جوگندر پال

نقوش - لاہور

مٹی کا ادراک

نیچے باغ میں کھانا کھانے کے بعد ہم نے اجنتا کیوز کی پہاڑی کی جانب دیکھا۔

"پہلے ذرا سستا لیا جائے۔" رام ناتھ نے مشورہ دیا۔ "پھر اوپر جا کے کیوز دیکھیں گے۔"

"ہاں بھئی۔" ایرانی نے ڈکار لے کر کہا۔ "بھابی کا کھانا اتنا لذیذ تھا کہ کھا کھا کے اب اپنا بوجھ بھی نہیں اٹھایا جاتا۔"

"آپ لوگ سستاؤ۔" کیپٹن تیجا سنگھ کہنے لگا۔ "آؤ ڈارلنگ، ہم اوپر چلیں۔" اس نے اپنی بیوی کو مخاطب کیا —
اور تم ہیرا —— تم اور مجوبی یہ سارے برتن دھو کر واپس لاری میں چھوڑ آؤ —— آؤ ڈارلنگ!"

ڈارلنگ اپنے کپڑے جھاڑتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ "چلو جی۔"

"چلو تم بھی اٹھو۔" رام ناتھ نے اپنی بیوی سے کہا — "اب فوجی حکم کے آگے کس کی پیش چلے گی۔"

میں نے ایرانی کے ساتھ ساتھ چلنا چاہا۔ لیکن وہ قدم بڑھا کر مسز رام ناتھ کے ساتھ جا کھڑا۔ "بھابی، تمھارا کھانا —"

"اوئے بھائی ایرانی۔" کیپٹن تیجا سنگھ نے گویا یاد آنے پر کہا۔ "آپ نے تو بولا تھا کہ کوئی گائڈ وائڈ آ کے ہمیں لے جائے گا۔"

"میں یہاں ہوں سرکار۔" ایک سفید ریش آدمی قریب ہی ایک بنچ سے اٹھ کر ہمارے پاس آ گیا۔

"تو چلو مولوی صاب، لے چلو ہم سب کو۔" کیپٹن تیجا سنگھ نے گویا اپنی فوج کا جھنڈا اسے سونپ کر آگے چلنے کا حکم دیا۔
"آؤ ڈارلنگ —— اوئے پروفیسر، تو کیوں لیٹا ہوا ہے بھائی، اٹھ نا ——"

"آپ چلیے، ہم آتے ہیں۔" اس نے اپنی نئی نویلی دلھن کی طرف مسکرا مسکرا کر دیکھتے ہوئے کیپٹن تیجا سنگھ کو جواب دیا۔

"اچھا، اچھا، سمجھ گیاں۔" وہ ہنسنے لگا۔ "مجے کرو بھائی —— آؤ ڈارلنگ!"

ہم سب گائڈ کے پیچھے پیچھے پہاڑی کی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔

"یہ کیوز ایک انگریز نے دریافت کیے تھے۔" گائڈ رام ناتھ کو بتا رہا تھا، جو اپنی بیوی کو پیچھے ایرانی کے ساتھ چھوڑ کر اس کے پاس چلا آیا تھا۔ "وہ یہیں کہیں شکار کے لیے آیا ہوا تھا۔ جب وہ اس پہاڑ پر پہنچا۔" وہ رک کر ایک پہاڑی کی چوٹی کی جانب اشارہ کرنے لگا۔ "تو اچانک ادھر دیکھ کر ٹھٹک گیا، اور پھر ——"

"کی ہویا ڈارلنگ ؟" کیپٹن تیجا سنگھ کی بیوی اپنی تین چار سالہ لڑکی کو جھڑکنے کے لیے ٹھہر گئی تو اُس کا شوہر مڑ کر اُس کے پاس چلا آیا۔ "ایویں جھڑکنی ایں ۔" (اسے جھڑکتی ہو) اُس نے اپنی بیٹی کو بائیں بازو پہ بٹھا لیا۔ "تے اونوں جان نال لاکے رکھیا ہویا ای ۔" (مگر اُسے جان سے لگا کے رکھا ہوا ہے) اُس نے اپنی بیوی کے پیٹ کی طرف دیکھ کر کہا۔ اور دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے مونچھیں اوپر اُٹھاتے ہوئے مسکرانے لگا۔

اُس کی بیوی نے پیٹ پر دوپٹہ ڈال لیا۔

"شرم نہیں آوندی ؟" (شرم نہیں آتی)

ہم اوپر چڑھ کر کیونز کے سامنے آ کھڑے ہوئے تو پروفیسر کا سالا مجھ سے پوچھنے لگا۔ "کیا ہم گھنٹہ بھر میں واپس چل پڑیں گے؟"

"ارے بھئی، ابھی تو آئے ہو، جانے کی بھی سوچ لیں گے۔"

"نہیں یہ بات نہیں۔" اُس نے کہا۔ "شام کو سات بجے اورنگ آباد پہنچ کر مجھے دوکان کھولنا ہے۔"

بوڑھا گائیڈ رام ناتھ کے ساتھ ایک غار کے دروازے پر کھڑا ہم سب کا انتظار کرنے لگا۔

"پروفیسر ابھی وہاں سے اُٹھا ہے۔" کیپٹن تیجا سنگھ پہاڑی کے نیچے باغ کی طرف دیکھنے لگا۔ "یا وہیں لیٹا اپنی کتاب پڑھ رہا ہے۔"

"ہم آگئے سردار جی۔" پروفیسر کی آواز سیڑھیوں سے سنائی دی۔

کیپٹن تیجا سنگھ سیڑھیوں کی طرف سر جھکا کر ہنسنے لگا۔ "مجال ہے کبھی اپنی کتاب کو نظر سے پرے ہونے دے۔" پھر وہ ہماری طرف دیکھنے لگا۔ "بھابی کو ہمیشاں اپنے آگے ہی رکھتا ہے۔"

"ہن چلدے کیوں نہیں۔" کیپٹن تیجا سنگھ کی بیوی خفا ہونے لگی۔

"چلو ڈارلنگ —— وہ اپنا مولوی سا، گائیڈ کدھر گیا۔؟"

"آئیے جناب، میں یہاں ہوں۔"

"ہاں چلو ڈار ——" لیکن شاید بوڑھے گائیڈ کی داڑھی دیکھ کر اُس نے اپنا لفظ بھی پورا نہ کیا۔ "یہ سارا کرشمہ ہم کو بڑی اچھی تراں سمجھا دو مولوی ساب، ہماری میم ساب کو ان چیزوں کا بڑا شاوک ہے۔"

ہم بڑے میاں کی رہبری میں غار کے اندر داخل ہو گئے۔

وہاں دیواروں پر، ستونوں پر، چھتوں پہ ہر جگہ زندگی آباد تھی، یوں لگ رہا تھا کہ یہ صورتیں پتھروں کے باطن سے باہر نکل آئی ہیں اور ہمارے دیکھتے دیکھتے اب اپنی جگہ سے نکل کر ہمارے ساتھ آ کھڑی ہوں گی۔

"مٹی کی مورتیں ہیں پر کتنی زندہ ہیں ؟"

"ہاں صاحب۔" بوڑھا گائیڈ ہمیں بتانے لگا۔ "ایک انگریز بہادر یہاں آئے تھے، ایک بات اُنھوں نے بڑے مزے کی کہی تھی، بولوں ؟" بڑے میاں نے اپنے مخصوص حیدرآبادی لہجے میں پوچھا۔

"کوئی ہندوستانی سالا کبھی مزے کی بات نہیں بولتا کیا ؟" رام ناتھ کو غصہ آنے لگا۔ "انگریزی حکومت کو پورے سترہ برس ہو چکے ہیں۔ لیکن اب بھی بات بات میں صرف انگریز کے بول ہی سننے میں آتے ہیں، پارلیمنٹ میں بھی۔" رام ناتھ پارلیمنٹ کا ممبر تھا۔ "اور پارلیمنٹ کے باہر بھی۔"

"ہم ہندوستانی چپ چاپ میں ہی ساری باتیں کر جاتے ہیں۔" پروفیسر نے اپنی بیوی کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا:۔

"اوئے پروفیسرا!" کیپٹن تیجا سنگھ ہنسنے لگا۔ "ہاں مولوی ساب ــــ آپ اپنی بات شروع کرو!"

"میں کہہ رہا تھا جناب، یہ کوئی دھوکا نہیں جو یہ مٹی کی مورتیں زندہ معلوم ہوتی ہیں۔ ہم بھی مٹی کی ہی مورتیں ہیں ــــ ہماری زمین کی ساری زندگی مٹی سے ہی بنتی ہے۔ اس لیے وہ صاحب بہادر ـــ" رام ناتھ کی آنکھوں سے آنکھیں ٹکرا جانے پر بڑا میاں ذرا اکھڑ سا گیا ــــ "اس لیے میرا ایمان ہے کہ ان سب مورتوں میں بھی جان ہے ــــ ادھر آئیے ــــ" وہ ہمیں غار کی بائیں طرف دیوار کی جانب لے آیا جس کے پہلو میں ایک لبستر سنگ پر کئی فٹ کی لمبائی میں مہاتما بدھ کا بت دائیں کروٹ دراز تھا۔ یہاں آئیے ــــ اب دیکھیے ــــ!"

یوں معلوم ہو رہا تھا کہ مہاتما بدھ ابھی مسکراتا ہوا خوابناک فکرمندی کی کیفیت سے باہر آ کر اپنی آنکھیں کھول لے گا۔

"اور اب یہاں آئیے، اِس کونے میں!"

اور اب یوں لگ رہا تھا کہ مہاتما بدھ اپنے جسم میں نہیں ہے، اور چونکہ وہ ابھی ابھی اپنے جسم کے اندر ہی تھا، اس لیے کچھ ایسی کیفیت ہے گویا ابھی ابھی بتی گل ہوئی ہو۔ اندھیرا گویا روشنی کا سایہ بن کے نظر آ رہا ہو، صرف ایک لمحہ کے لیے۔ لیکن یہ لمحہ ابدی ہو گیا ہو ــ!

بیک وقت نہ ہونے اور ہونے کا یہ احساس، موت میں زندگی کی جھلک، سکون میں حرکت!

"واہ ــــ ہ!" میرے منھ سے بے اختیار نکل گیا۔

بڑا میاں میرے قریب سرک آیا۔ "کیوں جناب، مٹی میں جان ہے یا نہیں؟"

"ہاں!" میں نے شدت سے محسوس کیا ـــ "زندگی کی ساری داستان مٹی ہی سے عبارت ہے۔ یہیں زندگی کا سارا سرمایہ دفن ہے۔ مٹی ہی زندگی کی ماں ہے۔ اور اسی کے بطن سے سارے پیکر برآمد ہوتے ہیں۔ ہمارے، جانوروں کے، کیڑے کوڑوں کے، سب کے، مٹی سراپا زندگی ہے۔ اور اپنے سکوت، بہرہ پن اور بے حرکتی کے باوجود بولتی، سنتی اور ہلتی ہے ــــ"

"سیدھی سادی بولی میں سمجھاؤ مولوی ساب۔" کیپٹن تیجا سنگھ بڑے میاں سے کہہ رہا تھا۔ "تو مجا بھی آئے ــــ آپ حیدرآباد کی بھاری بولتے ہو تو ہماری سمجھ جلے لائل پور میں جا پہنچتی ہے۔ پر چلو، ٹھیک ہے، اب تو شاید لائل پور میں بھی جاٹ بھائی اپنی بھاری جبان سے ہی روٹی ٹکر کھاتے ہوں گے۔"

"معاف کیجیے اب میں اپنی زبان کو سلیس کروں گا۔"

"سلیس؟ ــــ" تیجا سنگھ ہنسنے لگا ــــ "سلیس کیا ملا ہوئی! ــــ چل کوئی بات نہیں، آگے بولو!"

"یہ دیکھیے!" بڑے میاں نے آگے بڑھ کر ایک دیوار کی طرف اشارہ کیا ــــ "یہ ڈیزائن ــــ بمبئی کے بڑے بڑے سیٹھ لوگ یہیں سے ساڑھیوں کے ڈیزائن لے جاتے ہیں۔"

"ہاں، ویری گڈ، مولوی!" کیپٹن بولا۔ "یہ تو بات ہوئی نا ــــ آؤ ڈارلنگ!"

پروفیسر اپنی بیوی کو ایک عورت کی تصویر کی طرف لے گیا ــــ "وہ جھکے دیکھو شششی۔ اچھے ہیں نا؟"

شششی نے مسکرا کر سر ہلایا۔

"تمھیں پسند ہیں نا ؟"
ششی نے پھر مسکرا کر سر ہلایا۔
"تو کل رام لعل سنار کے پاس چلیں گے۔" پروفیسر نے اپنی بیوی کا ہاتھ تھام لیا۔ "خوب اچھی طرح ڈیزائن کو اسٹڈی کر لو۔"
اُن کی طرف دیکھتے ہوئے مجھے پروفیسر کے سالے کا خیال آیا۔ جو ایک طرف تنہا کھڑا نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔
میں اُس کے قریب چلا آیا۔
"کیا سوچ رہے ہیں سود صاحب ؟"
"میں سوچ رہا ہوں کہ اپنے کلچر اور کلا کی آلوچنا ایک مسلمان کی بھاشا میں کیوں سنوں ؟"
"اس میں کیا بُرائی ہے سود صاحب ؟ میں نے تو گیتا بھی انگریزی میں ہی پڑھی ہے ؟"
"شکر ہے آپ نے اُسے عربی یا فارسی میں نہیں پڑھا۔"
"پھر بھی گیتا گیتا ہی رہتی سود صاحب۔" میں بحث میں اُلجھنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ لیکن چپ نہ رہ سکا۔ "کوئی بڑا خیال کسی خاص زبان کے کردار کا محتاج نہیں ہوتا۔ بلکہ بڑا خیال کسی بھی زبان کا محتاج نہیں ہوتا۔ یہ تصویریں دیکھیے، بن بولے بول رہی ہیں۔ جو ہندی سمجھتا ہے، اُس سے ہندی میں، اور جو پشتو سمجھتا ہے اُس سے پشتو میں۔"
"آئیے صاحبان، اب دوسرے غار میں چلیں۔" بڑے میاں نے ہمیں دُور سے مخاطب کیا اور ہم سب دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ اور باہر چند قدم چلنے کے بعد جب ہم دوسرے غار میں داخل ہو رہے تھے تو مجھے خیال آیا کہ متمدن انسان اپنے استحکام کی کھوج میں چلتا چلتا انجانے غاروں کی جانب لوٹ آیا ہے۔ الو وہ خلا میں اپنا گھر نہ بنا پایا تو از سرِ نو پہاڑوں میں پناہ لینے کے لیے چلا آیا۔ ہر ذرّے کا اصل مقام ہی خاک ہے، انھی دیو قامت چٹانوں میں مخلوق کی ہڈیاں دبی ہوئی ہیں۔ اور ـــ اسی لیے اجنتا کے غاروں کی یہ زندہ صورتیں صرف یہیں ممکن ہیں۔ گویا یہ شکلیں کسی نے بنائی نہیں۔ بلکہ ان کے منتشر اجزا فطرت کی رضا کے عین مطابق اپنے آپ عین اپنی جگہ جڑ جڑا کر سالم زندگی میں ڈھل گئے ہیں۔
"ان تصویروں کو بنانے والے کون تھے ؟" رام ناتھ نے بڑے میاں سے پوچھا۔
"ان غاروں سے متعلق یہی ایک سوال ہے۔" بڑے میاں نے جواب دیا ـــ "جو میری دانست سے باہر ہے۔" کیپٹن تیجا سنگھ سے آنکھ ملنے پر اُس نے اپنا مطلب بیان کیا۔ "یعنی جو مجھے معلوم نہیں۔"
اور یہ سوال اہم بھی نہیں ـــ میں نے سوچا۔ ناسمجھ بچوں کے ماں باپ کا نام پوچھا جائے تو ٹھیک ہے۔ لیکن جس شخص کے چہرے میں اپنی سمجھ بوجھ، اپنا کردار، اُس کی مخصوص شخصیت دکھائی دیتی ہو، اُس کی اپنی ذات ہی اُس کی اصل پہچان ہے، اجنتا کی یہ تصویریں اپنے بالغ شعور کا ظہور ہیں۔ اور انھیں دیکھ کر ان کے خالق کا خیال نہیں آتا۔ بلکہ خود انھی کے خیال سے دل و دماغ معمور ہو جاتے ہیں۔
میری نظر ایک خوبصورت عورت کی تصویر پر جمی ہوئی تھی۔
"آپ یہاں سے نیم دائرے میں گھوم کر اُس سرے تک جائیے۔" بڑے میاں نے مجھ سے کہا۔ "اس عورت کی نگاہ آپ کے ساتھ ساتھ وہاں تک گھومے گی۔"
لیکن اس میں تعجب کی کیا بات ہے ؟ زندہ تصویر محض رسمی طور پر زندہ نہیں کہلاتی۔ بلکہ وہ واقعی زندہ ہوتی ہے۔ خود آپ اپنا آپ ہوتی ہے۔ اُس کا خالق اُسے بناتا نہیں۔ وہ خود بخود اس کے ذہن میں بنتی ہے اور پھر ہو بہو اُسی شکل میں وہاں سے

باہر آجاتی ہے۔ اُسے قطعی یہ گوارا نہیں کہ اُس کے کسی نقش میں مبہم سی تبدیلی بھی واقع ہو۔ اُس کی اپنی فطرت سے اُس کا چہرہ رونما ہوتا ہے اور وہ اپنے اس چہرے کی تمام تر جزئیات سے اپنی فطرت کا ہی تاثر پیش کرتی ہے۔ اگر اس کا خالق اپنی مرضی سے ان جزئیات کو بدلنا چاہے تو وہ مرضی وجود میں آنے سے پہلے ہی دم توڑ دیتی ہے۔

"یہ دیکھیے دو پیار کرنے والے!" بڑے میاں نے کیپٹن تیجا سنگھ سے کہا۔

"آؤ ڈارلنگ!"

یہ دو جانیں نظروں ہی نظروں میں اس لیے ایک دوسرے میں سمائی ہوئی ہیں کہ یہ کہیں سے اپنے آپ اپنے خالق کے ذہن میں آوارد ہوئیں۔ انھیں اپنی خالق کی موجودگی کا قطعاً احساس نہیں، ورنہ یہ دونوں ہڑبڑا کر، سنبھل کر ایک دوسرے سے پرے جا کھڑی ہوتیں۔ اور اپنے خالق کی طرف دیکھنے لگتیں۔ لیکن انھیں اُس کی خبر بھی نہیں۔ ان کے لیے اُس کا وجود ہے ہی نہیں۔ زندہ تصویر کا کوئی خالق نہیں ہوتا۔ وہ اپنے ہی جراثیم سے پیدا ہوتی ہے۔ اور اُس کی رگوں میں اپنا خون دوڑتا ہے۔

میں نے تصویر سے آنکھ ہٹا کر یونہی اپنے آس پاس دیکھا۔

"ایرانی بھائی!" رام ناتھ ایرانی سے کہہ رہا تھا جو اُس کی بیوی کی طرف دزدیدہ گرسنگی سے دیکھ رہا تھا۔ گویا وہ سیخ سے چپٹا ہوا گرما گرم گوشت ہو۔ اور ایرانی کی نظریں کہہ رہی ہوں کہ بھائی، بس گوشت تمھارا ہی لذیذ ہے، باقی سب جھوٹ! کھاؤ اور کھاتے ہی چلے جاؤ ـــ" ایرانی بھائی ایک بات کہوں؟" رام ناتھ ایرانی کا ہاتھ تھام کر غار کی ایک جانب سرکنے لگا۔

"ایک نہیں، سو کہو شری رام ناتھ جی۔ لیکن بھابی کا گوشت ایک بار پھر کھلوا دیجیے!"

"ایک بار نہیں، سو بار میرے یار!" رام ناتھ کی آواز دھیمی ہو گئی ـــ "پر بات سنو میری۔ الیکشن قریب آ رہا ہے، وہ بستی کے مسلمان بھائیوں کے ووٹ ہیں نا ـــ"

"گھبرائیے نہیں رام ناتھ جی!" اُس سے بات کرتے ہوئے ایرانی نے پھر رام ناتھ کی پتنی کی جانب دیکھا ـــ "لیکن ایک دفعہ ـــ"

"ادھر آئیے صاحبان!" بڑے میاں نے ہم سب کو پکارا ـــ "آپ کو ایک شاہکار دکھاؤں!"

پروفیسر اپنی بیوی کو ایک اور تصویر دکھا رہا تھا۔

"یہ دیکھیے اس سے بھی بہتر ہیں شنشی ـــ یہ!"

"آؤ ڈارلنگ، مولوی صاحب کا شاں کار بھی دیکھ لو!" کیپٹن تیجا سنگھ بڑے میاں کے ساتھ چلنے لگا۔ "مولوی شاب شاں کار ہوتا کیا ہے؟ ـــ ڈبل مارچ کرو ڈارلنگ۔ تم تو اس تراں چل رہی ہو جیسے...."

کیپٹن ہنسنے لگا۔

اور بڑا میاں گویا کیپٹن کا کہا ہوا سن کر اُسے اپنی غلطی سمجھ کے خجل سا نظر آنے لگا۔

"بڑے میاں کو کم از کم پانچ روپے دیں گے!" میری پشت پر رام ناتھ نے ایرانی سے مشورہ کیا۔

"نہیں دس تو دیجیے!" ایرانی نے رائے دی۔

"دس؟" سود نے غالباً اُن کی پشت سے آگے بڑھ کر اعتراض کیا۔ "کس بات کے؟ میں تو اپنے حصّے کی ایک پائی بھی ادا نہیں کروں گا!"

"چلو مولوی ساب جلدی جلدی اپنا شاں کار دکھاؤ" میرے آگے کیپٹن تیجا سنگھ بڑے میاں سے کہہ رہا تھا۔ "ٹائم ہو رہا ہے۔"

"ٹائم تو ہوتا رہے گا صاحب" بڑے میاں نے جواب دیا۔ "مگر ایسی لاجواب چیز دکھا رہا ہوں کہ آپ ہمیشہ یاد رکھیں گے"

"لاں جواب!" تیجا سنگھ ہنسنے لگا۔ "مولوی مولوی ساب، آپ اُردو بھاری بڑی سونی بولتے ہو۔ ڈارلنگ سنا لاں جواب! —" پھر اچانک اُسے پروفیسر کا خیال آگیا۔ "اوے پروفیسرا، آ بھائی، تم بھی لاں جواب کو دیکھ لو"

"ٹھہریئے!" بڑا میاں کہنے لگا۔ "ادھر بائیں طرف آجائیے!"

ہم سب اُس کے پیچھے پیچھے چل کر ایک جگہ ٹھہر گئے۔

"اب سامنے دیکھیے!"

ہماری نظریں دوڑ کر سامنے دروازے کے اندر جا گھسیں اور پتھر کے چمتکار سے پتھرا سی گئیں۔

اب کے پھر ہم مہاتما بدھ کے ایک دیو قامت بت کے سامنے کھڑے تھے۔

مہاتما بدھ اپنی آنکھیں کھولے سمادھی میں بیٹھا تھا۔ پتھر میں زندگی متحرک تھی۔ اب مہاتما ہماری طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ اب فکرمند نظر آنے لگا تھا۔ اور اب جیسے اُس کی آنکھوں سے نرم نرم روشنی پھوٹ کر ہماری طرف آرہی ہو۔ ہم تک اس روشنی کی ایک لکیر سی بن گئی ہو۔ اور اب جیسے مہاتما ہماری طرف بڑھنے کے لیے اپنی جگہ سے اُٹھنے کا ارادہ کر رہا ہو! — ہم کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ جیسے ہماری کوئی شخصیت نہ ہو۔ ہم پتھر کے مجسمے ہوں۔ اور وہ مجسمہ زندہ انسان ہو — جیسے ہم نہیں دیکھ رہے، بلکہ وہ ہمیں دیکھ رہا ہے!

ادب کا اعلیٰ معیار ہمارا معیار ہے

اور

نیا دور کا نام اس معیار کی ضمانت ہے

نیا دور کراچی

کا تازہ شمارہ ۳۵-۳۶ شائع ہوگیا ہے۔ قیمت تین روپے

• اس میں پاکستان و ہندوستان کے بہترین لکھنے والے اپنی معیاری اور اعلیٰ تخلیقات کے ساتھ شامل ہیں۔
• اپنے کسی قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیے یا براہ راست ہمیں لکھیے!

منیجر:- نیا دور کراچی ۵

رضیہ فصیح احمد

تہذیب لاہور

کرن رنگِ حنا کی

کتاب کھولی تو وہ پلندہ زمین پر گر پڑا۔

اپنے ماموں کی لائبریری جس میں پرانی دقیانوسی کتابیں اٹی پڑی تھیں، یہ پہلی چیز تھی جس نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا۔ میں کتابیں چھوڑ کر اس پر پل پڑی۔ نسوانی تحریر میں افسانے کی طرز پر لکھا ہوا یہ خاصا وزنی مسودہ تھا۔ سب سے پہلا خیال اسے دیکھ کر جو آیا، وہ یہی تھا کہ اب ماموں کی زندگی کا یہ راز کہ انہوں نے اپنی پہاڑ سی زندگی تنہا پہاڑ پر کیوں کاٹ دی، مجھ پر عیاں ہو جائے گا۔ اسی راز سے واقفیت جسے خاندان بھر میں کوئی نہیں جانتا تھا، کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اس خیال سے میرا دل دھڑکنے لگا... یہ اطمینان تھا کہ ماموں شام سے پہلے تو آئیں گے نہیں، اس لئے میں نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر وہیں بیٹھے بیٹھے اسے پڑھنا شروع کر دیا۔

"اجنبیت ان ویٹنگ روموں میں ہمیشہ پراسرار قسم کی اجنبیت چھائی رہتی ہے۔ کمروں میں گھر کی سی گرم ستا سا اور خوش آمدید قسم کی فضا نہیں ہوتی۔ بلکہ سیلی ٹھنڈی انجان سی فضا، ہلکی ہلکی سی روشنی۔ ملی جلی نامعلوم سی خوشبو، انجانا سا شور۔ نجم ویٹنگ روم میں بید کی بنچ پر دیوار سے ٹیک لگائے خاموشی سے بیٹھی اپنی انگلیوں کو تک رہی تھی۔ کمرے کی عورتیں ابھی ابھی چلی گئی تھیں۔ وہ رات بھر سونے کی کوشش میں جاگتی رہی تھی۔ بنچ سرہانے اور پائینتی دونوں طرف سے اندر دھنسی ہوئی تھی۔ اور درمیان میں اونٹ کی طرح کبھو نکلا ہوا تھا۔ کبھی تکیہ اس طرف رکھتی، کبھی اس طرف سر اور ٹانگیں ہر حالت میں نیچی رہتی تھیں۔ درمیان میں جگہ جگہ لگے ہوئے تختے بھی چبھ رہے تھے۔ چنانچہ اس سولی پر اسے نیند نہ آسکی اور وہ اپنی خمار آلود آنکھوں کو نیم وا کر کے کمرے کی اجنبی فضا کے بھرپور احساس کو اوڑھ کر خاموشی سے بیٹھ گئی۔ ابھی عورتیں جس دروازے سے گئی تھیں۔ اس کا تھوڑا سا پٹ کھلا رہ گیا تھا۔ جالی کے تختے نے دروازے سے پلیٹ فارم کی روشنیاں اور شور اندر آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ آئی ہوئی بڑی بی دوسری بنچ پر منہ کھولے بڑے آرام سے سو رہی تھی۔

دروازہ آہستہ سے کسی نے کھولا۔ اپنی انگلیوں پر سے نظر اٹھا کر اس نے چونک کر دیکھا۔ اندر رکھڑا تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں نیند کا خمار تھا، ہاتھ میں سگریٹ۔ ڈریسنگ گاؤن اور باتھ روم سلیپر پہنے دھیرے دھیرے وہ اندر آیا اور اس کے پاس بیٹھ گیا۔ ایک ہاتھ سے اس کا ہاتھ تھام کر دوسرے سے سگریٹ پیتے ہوئے اس نے کہا۔

"بہت دیر سے دروازے میں کھڑا تمہیں دیکھ رہا تھا۔"

"کیا دیکھ رہے تھے؟"

"یہ دیکھ رہا تھا کہ تم اپنے ہاتھوں میں کیا دیکھ رہی ہو۔ تمہیں اپنے ہاتھ بہت پسند ہیں۔ ہر وقت تمہاری نظریں ہاتھوں پر جمی رہتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ

تمہیں اپنے ہاتھوں سے عشق ہوگیا ہے۔"
نجم شرما گئی۔ "نہیں تو۔"
"نہیں تو۔" انور نے اس کی نقل اُتاری۔ پھر اُس کے ننھے منے گورے سے ہاتھ کو اٹھا کر اپنی ناک پر رکھ لیا۔ "مہندی کی خوشبو اب بھی باقی ہے۔" اس نے
حیرت سے کہا اور دفعتاً اُس کی آواز جذباتی ہوگئی۔ "نجمی! تمہیں نہیں معلوم یہ مہینہ میں نے کیسے گزارا ہے۔ تمہارا خیال ہر وقت میرے ساتھ رہتا تھا رات کو
تمہارے کپڑوں اور ہاتھوں کی خوشبو اکثر مجھے اپنے قریب محسوس ہوتی تھی۔"
"آج رات کو نیند آگئی تھی" نجم نے دفعتاً موضوع پلٹ دیا۔
"نہیں۔" وہ ہنسا۔ "میں برابر گھڑی دیکھتا رہا کہ کب عورتیں جائیں اور میں یہاں پہونچوں۔" اس نے انور کو دیکھا۔ وہ کتنا اچھا لگتا تھا۔ یہ بکھرے بکھرے
ل، یہ الجھی الجھی ادائیں اس پر کتنی سجی تھیں۔ وہ رات بھر اسی خیال میں رہا کہ کب تین بجے ویٹنگ روم خالی ہو اور وہ یہاں پہنچے اس کے لئے اس نے چوکیدار اور
یا کو ضرور بھاری ٹپ دی ہوگی ان کی شادی کو ڈیڑھ مہینہ ہوگیا تھا۔ شادی کے بعد انور کو مکان نہ ملنے کے سبب وہ پھر اپنے میکے میں رہی۔ مگر اب وہی اس کا
رہ کچھ انجان انجان سا لگتا تھا۔ ہر وقت اسے یہ احساس ہوتا تھا کہ اسے کہیں اور ہونا چاہیئے۔ اور ایک دن بڑی ہمت کے بعد اس نے انور کو بڑا جذباتی سا
خط لکھ مارا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انور نے کسی نہ کسی طرح گھر کا انتظام کر لیا اور اسے لینے آپہنچا۔ اب اپنا کام شروع کرنے سے پہلے باقی ماندہ چھٹی انور نجم کے ساتھ مری میں
گزارنا چاہتا تھا اس ڈیڑھ ماہ میں وہ تھوڑی سی جھینک گئی تھی۔ اس کے ہاتھوں اور پیروں کی مہندی کا رنگ پیلا پڑنے کے بعد دن بدن ہلکا ہوتا جا رہا تھا۔ ناخونوں
پہ مہندی کے ہلال آہستہ آہستہ نیچے کو ڈھل رہے تھے۔
"کیا سوچ رہی ہو؟" انور نے دفعتاً کہا۔
"کچھ نہیں!"
"تمہاری نظریں پھر اپنے ہاتھوں پر جمی ہوئی ہیں۔"
"نہیں تو" بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا۔
کسی تیز رو گاڑی کی گڑگڑاہٹ صبح کی نیم خوابیدہ فضا کو کاٹتی ہوئی پورے اسٹیشن پر چھا گئی۔ ساتھ ہی مسافروں اور خوانچہ والوں کے شور سے اسٹیشن
نج اٹھا۔ دفعتاً یوں محسوس ہونے لگا جیسے صبح نقارے بجاتی در آئی ہو۔ کمرے میں روشنی پھیل چکی تھی۔ بلب کی ہلکی روشنیاں اپنا کام سورج کی پہلی کرنوں کو سونپنے
کے بعد بیکاری میں اونگھ رہی تھیں۔ یکایک شور کے ساتھ دروازہ کھلا اور کئی قلی ڈھیر سے سامان کے ساتھ اندر در آئے۔ ان کے پیچھے عورتوں اور بچوں کا قافلہ
دیکھ کر انور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے نرم چوڑی بھرے ہاتھ کو اپنے لبوں تک لے گیا۔ اسے چھوڑنے سے پہلے اسے احساس ہوا کہ وہ کانپ رہا ہے۔ پھر تیزی سے وہ باہر
نکل گیا۔
نجم کو کوئی وزن اپنی روح کی گہرائیوں میں ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ اگر یوں ہی ہونا تھا تو اس سب کی کیا ضرورت تھی۔ کیا وہ اس خوبصورت چہرے، اس
بے پناہ محبت کو کبھی بھول سکے گی۔ دفعتاً اس نے اپنا چہرہ ہاتھوں سے ڈھانپ لیا اور رونے لگی۔ نو وارد عورتیں اسے حیرت سے دیکھنے لگیں۔ پھر ایک نے دوسری
سے کہا۔ "شاید بیاہ کر سسرال جا رہی ہے۔" ایک نو عمر خوبصورت لڑکی ریشمی کپڑوں میں ملبوس مہندی چوڑیوں انگوٹھیوں سے بھرپور ہاتھوں میں چہرے
چھپائے سسکیاں بھر رہی ہو تو اور کیا سمجھا جا سکتا ہے۔
پھر اس کا دل تو کمزور ہوتا ہی چلا جاتا تھا۔ مری میں وہ ہنی مون منا رہے تھے۔ لیکن ذرا ذرا سی بات پر اس کا دل بھر آتا۔ شام کو جب بھورے
بادلوں نے آسمان کو گھیر رکھا ہوتا اور دفعتاً ان پھٹے پھٹے بادلوں میں کوئی اکیلا تارا چمک اٹھتا تو بے اختیار اس کی آنکھیں غم کی گہرائیوں میں ڈوب جاتیں۔ وہ
بدن اداس ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی پلکیں جھکی جھکی رہنے لگی تھیں، جیسے کسی بوجھ سے وہ اٹھ نہ پاتی ہوں۔ بے اختیار کبھی ہنسی آتی بھی، تو یوں جیسے بھٹک کر ادھر آنکلی

ہو۔ انور ان سب باتوں کو محسوس کر رہا تھا۔ شروع میں وہ اسے عزیزوں سے علیحدگی کا سبب سمجھتا رہا اسے امید تھی کہ چند روز میں یہ اداسی ختم ہو جائیگی مگر وہ یہ دیکھ رہا تھا کہ اداسی کم ہونے کے بجائے بڑھ رہی ہے اسے یہ بھی خیال آیا کہ شاید نجم کو کسی اور سے محبت ہو اور اس کے جذبات کا پاس کئے بغیر اُسے میرے پلے باندھ دیا گیا ہو، لیکن یہ خیال اس وقت باطل ہو جاتا جب رات کے دو بجے اس کی آنکھ کھلتی تو نجم کو بیٹھے اور اپنی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتے پاتا۔

"تمہیں کیا ہوا ہے۔ تمہیں کیا تکلیف ہے نجمی؟" کئی مرتبہ نیند سے بھرائی ہوئی آواز میں وہ چلا اٹھا تھا۔

"کچھ نہیں۔ نیند نہیں آ رہی تھی۔" اور وہ جلدی سے آنکھیں بند کر کے یوں چپ چاپ لیٹ جاتی جیسے بچہ ڈر کے مارے دبک جائے۔ اور وہ بہت دیر تک اس الجھن کو سلجھانے میں مصروف رہتا۔

کئی مرتبہ اس نے نجم کے شگفتہ موڈ سے فائدہ اٹھا کر اس مسئلے کو حل کرنا چاہا۔ کئی بار سنجیدگی سے اس پہلو پر بات کرنے کی کوشش کی۔ الغرض بات کو گھما پھرا کر کبھی اسی مرکز تک لایا، مگر یہاں پہنچتے ہی وہ بات کو یکلخت ختم کر دیتی۔ کبھی بات بنا کر خاموشی سے اور کبھی آنسو بہا کر۔ اس نے یہ حربے آزمائے۔ "تم مجھے اپنا نہیں سمجھتیں، تم مجھ سے کچھ چھپاتی ہو۔" کہہ کر بگڑا بھی۔ ناراض ہو کر دو دو تین تین گھنٹے مری کے نشیب و فراز اکیلے طے کرتا رہا، مگر ان سب باتوں کا کچھ بھی نتیجہ نہ نکلا۔ عورت ضد پر آ جائے تو اس سے کون جیت سکتا ہے وہ اس سے ناراض بھی کہاں تک رہتا جب وہ آتا، تو وہ اسے دروازے پر پاتا۔ بالکنی سے جھانکتی ہوئی ملتی۔ محبوب بیوی کی دل نشینی کے ساتھ وہ بدھر ادھر کی باتیں شروع کر دیتی۔ وہ اس کی ہر چیز کا بے حد خیال رکھتی۔ پھر وہ اس سے روٹھتا تو کیسے۔ دو ایک بار اس نے نجم کی بڑی بی کے ذریعہ اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کی، مگر وہ کوشش پہلے سے بھی زیادہ ناکام رہی۔ وہ بڑی بی اُن ہستیوں میں سے تھیں، جن کی ذہنی و جسمانی نشو و نما بچپن میں ہی رُک جاتی ہے، ساڑھے تین وٹ کی ان بڑی بی کو سوائے اپنے کھانے پینے اور پان کی طلب کے کوئی اور فکر نہ تھی۔ وہ بزعم خویش نجم کے بُرے بھلے کی دیکھ بھال کے لئے تشریف لائی تھیں اور بے ہوشی کا یہ عالم تھا کہ کبھی یہ احساس بھی نہ ہوا کہ نجم میں کسی قسم کی تبدیلی ہو رہی ہے انور کو بعض دفعہ اپنی سسرال کی ان عورتوں پر بے حد غصہ آتا، جنہوں نے اس بڑی بی کو جو میلے کپڑوں کی گٹھڑی سے کسی طرح زیادہ نہ تھیں، نجم کے ساتھ باندھ دیا تھا۔ بعض دفعہ اس کا دل چاہتا کہ اُسے ہوٹل کی تیسری منزل سے پھینک دے یا میلے کپڑوں کے ساتھ اس گٹھڑی کو بھی دھوبی کے حوالے کر دے کم بخت کسی کام کی بھی تو نہیں تھی۔ سوائے دن بھر منہ کھول کر سونے کے۔۔۔ یوں وہ نجم کی پیدا کردہ جھنجھلاہٹ کبھی بڑی بی پر، کبھی کسی بیرے اور کبھی خود پر اتارتا۔"

"بیٹی۔ رعنا بیٹی۔" ماموں کی آواز سنائی دی۔ میں نے جلدی سے کاغذ کا پلندہ الماری میں ٹھونسا اور باہر نکل آئی۔ ماموں آ گئے تھے۔ اور شام کی چہل قدمی کے لئے جانے پر مُصر تھے۔ میں نے ٹالنا چاہا لیکن انہوں نے ایک نہایت دلچسپ سچا واقعہ سنانے کا وعدہ کیا جو اُنہی کے سامنے پیش آیا تھا۔ میں تو تذبذب میں پڑ گئی۔ ماموں قصہ یوں سنانے تھے کہ داستان گوئی کا حق ادا ہو جاتا تھا چنانچہ میں نے اس راز کو رات کی تنہائی پر اٹھا رکھا اور ماموں کی زبانی سچا واقعہ سننے کے شوق میں ان کے ساتھ ہو لی۔ پگڈنڈیوں پر اترتے چڑھتے انہوں نے اپنی داستان یوں شروع کی:۔

"یہ پچھلی سردیوں کی ایک رات کی بات ہے۔ وہ رات قیامت کی رات تھی۔ آندھی اور بارش کا طوفان۔ میں نے مری میں عمر گزار دی، مگر ایسا طوفان کبھی نہیں دیکھا بجلی مکان کے شیشوں پر یوں چمک رہی تھی جیسے محاصرہ کرنے والی فوج قلعے پر چو طرفہ حملہ کرتی ہے۔ بادلوں کی گڑگڑاہٹ، ہوا کا شور، درخت ٹوٹنے کی اور پتھروں کے لڑھکنے کی ملی جلی آوازوں سے کانوں کے پردے پھٹے جا رہے تھے۔ بجلی بند ہو چکی تھی۔ ایسے ہی کسی نے میرے دروازے پر دستک دی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ رٹز ہوٹل کا بیرا کھڑا تھا۔ وہاں کوئی شخص بیمار تھا۔ اور اس ہوٹل کے منیجر نے مجھے فوراً بلایا تھا۔ میں نے موسم کو دیکھتے ہوئے منع کرنا چاہا مگر نہ معلوم کیوں انکار نہ کر سکا۔ خاموشی سے میں نے برساتی پہنی۔ بیگ سنبھالا، اور ٹارچ جلائے ہوئے اس آدمی کے پیچھے ہو لیا۔ رٹز ہوٹل کی دوسری منزل کے پہلے کمرے میں کوئی شخص کراہ رہا تھا۔ میز پر ایک لیمپ جل رہا تھا۔ جیسے گتے کی ٹوپی پہنا دی گئی تھی۔ اس کے باوجود بار بار بھڑک کر بجھنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ اس بھڑکتے لیمپ کی روشنی میں میں نے ایک خوبصورت لڑکی کا بھوت دیکھا، کم از کم وہ اس وقت مجھے لڑکی کی بجائے اس کا بھوت ہی معلوم ہوئی۔ اس کا چہرہ موت کی طرح زرد تھا۔ بال بکھرے ہوئے۔ آنکھوں میں ویرانی لیں

ھانک رہی تھی، جیسے اُسے اپنی زندگی کے ختم ہو جانے کا علم نہ یقین ہو۔

مریض درد سے کراہ رہا تھا۔ مگر اُسے کیا تکلیف تھی۔ میں سمجھ نہ سکا۔ اندازاً یہ اپنڈے سائٹس کا درد معلوم ہوتا تھا۔

" ڈاکٹر" کھوکھلی ویران سی آواز نے سرگوشی کی۔ "یہ آج رات بچ جائیں گے ؟"

" آج رات! کیا کہہ رہی ہے بیٹی! انہیں کوئی ایسا مرض نہیں۔ یہ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔ یہ تو معمولی سا درد ہے۔ دوا دیئے دیتا ہوں صبح تک
ام آجائے گا۔ پھر دیکھوں گا۔ اگر ضرورت ہوئی تو آپریشن... "

" ڈاکٹر آج آپ نہ جائیں" اس نے میری بات کاٹ دی "آج رات" ویران آنکھوں میں التجا کی ایک دنیا سمٹ آئی تھی۔

" اچھا بیٹی! میں نہ جاؤں گا" میں نے کہا اور اپنے بیگ میں سے دوائیں نکالنے لگا۔ وہ تیزی سے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ جیسے اسے کوئی بہت
وری کام ہو۔ میں نے مریض کو دوا دی اور گھڑی دیکھی پونے بارہ بجے تھے۔ دوا پی کر مریض کچھ اونگھ سا گیا۔ میں خاموشی سے اسٹول پر بیٹھ گیا کمرے میں اور
ئی نہیں تھا، صرف کونے میں ایک بڑی بی گھٹنوں میں سر دیئے منہ کھولے سو رہی تھی۔ کھڑکی اور دروازوں کے پردے کھنچے ہوئے تھے۔ پھر بھی بجلی جیسے چھپ چھپ
یر چلا رہی تھی۔ یہ خوفناک موسم لیمپ کی بھڑکتی روشنی میں سویا ہوا زرد رو مریض اور یہ منہ کھول کر سوئی ہوئی بڑھیا مجھے کچھ عجیب سا سماں نظر آ رہا تھا۔ دفعتاً مجھے
ہ خوبصورت لڑکی کا خیال آیا۔ کیا وہ جا کر سو گئی۔ اس کی شب بیدار رسناں آنکھیں اتنی جلد نیند میں کھو جانے والی نہیں تھی۔ پھر وہ کہاں چلی گئی۔ کیوں نہ میں اُسے
بنان دلا کر چلا جاؤں۔ یہ طوفان تو صبح سے پہلے تھمنے والا نہیں۔ میں نے بڑی بی کو اٹھایا اور کہا "ذرا اپنی بیگم کو بلا لاؤ"

وہ اندر چلی گئی۔ دس منٹ بعد وہ واپس آئی۔ اس کے جذبات سے عاری چہرے پر اس وقت گھبراہٹ کے آثار تھے۔ "میں دروازہ کھٹکھٹا کھٹکھٹا کے
ئی۔ وہ سنتی ہی نہیں"۔ اس نے کہا۔

" شاید سو گئی ہوں گی" میں نے کہا۔

" آج دو رات سے وہ بستر پر لیٹی بھی نہیں۔ پھر میں نے اتنی زور سے آوازیں دیں اور دروازہ کھٹکھٹایا کہ اگر سوتی ہوتیں تو بھی جاگ پڑتیں"۔

" پھر تمہارا کیا خیال ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ کچھ دیر خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی پھر بولی "ان کا خیال ہے کہ صاحب بچیں گے نہیں، مجھے ڈر ہے کہ کچھ ایسی ویسی بات..."

" یہ کیسے ہو سکتا ہے! وہ تو بڑے مزے سے سو رہے ہیں۔ اب بالکل ٹھیک ہیں"۔

" پتہ نہیں۔ وہ کچھ ایسی ایسی باتیں کرتی تھیں اور... وہ میرے قریب کھسک آئی "میں نے دیکھا آج رات انہوں نے ایک پڑیا میں، بندھی ہیرے سے کوئی چیز
نکالے سو روپیہ کا نوٹ دیا"

اس بیان نے میرے دل میں بھی اندیشے جگا دیئے میرے خیال میں تو مریض کی ایسی خطرناک حالت نہ تھی۔ مگر اس لڑکی کی کیفیت سے یہی ظاہر ہوتا تھا وہ
، بے حد خطرناک سمجھ رہی ہے۔ میں اٹھا اور بڑی بی سے بولا "چلو! کہاں ہیں وہ"

بڑی بی آگے آگے اور میں پیچھے پیچھے دروازے پر جا کر رک گئے۔ میں نے آہستہ سے دروازے پر دستک دی۔ پھر زور سے اور زور سے دروازے
ت لگا کر سنا اندر اندھیرا تھا اور بالکل خاموشی۔ آخر مٹھی بند کر کے میں نے پورے زور سے دروازہ تھپتھپایا دفعتاً کسی چیز کے گرنے اور ٹوٹنے کی آواز آئی۔ الماری
لیے تختے پر کونے میں ایک موم بتی جل رہی تھی تاکہ ہوا سے بجھ نہ جائے مد میں میں کوئی برتن ٹوٹا پڑا تھا۔ اور کوئی سیاہ سی چیز زمین پر بکھری ہوئی تھی۔ اس سے پہلے کہ
اس نقشے کو اچھی طرح سمجھ پاؤں، دروازے سے داخل ہونے والی ہوا کے ایک جھونکے سے موم بتی بجھ گئی۔ اندھیرے میں وہ مجھے نظر نہیں آ رہی تھی۔ دفعتاً مجھے اس کی آواز
اوکا: "بارہ بج گئے ڈاکٹر؟"

" ہاں" میں نے بے خیالی میں کہا۔

یکایک وہ بھاگ کر دیوار سے ٹکرائی اور اس سے بچ کر بھاگی اور کمرے سے نکل گئی۔ میں نے جیب سے دیا سلائی کی ڈبیہ نکال کر ایک دیا سلائی جلائی اور زمین پر پڑی ہوئی سیاہ چیز کو غور سے دیکھا۔ ابھی میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ دیا سلائی بجھ گئی۔ میں نے دوسری دیا سلائی جلانے کی کوشش کی۔ اسی وقت کمرے سے مریض کے کراہنے اور کسی کے زور زور سے رونے کی آواز آئی "بے وقوف لڑکی نے مریض کو ڈرا دیا" میں یہ کہتا ہوا لپک کر دوسرے کمرے میں داخل ہوا۔ مریض بستر پر تڑپ رہا تھا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے تھے۔ جیسے اسے سخت تکلیف ہو۔ لڑکی زمین پر پڑی تھی اس کا سر تخت پر تھا اور دونوں ہاتھ مریض کی سفید چادر پر پھیلے ہوئے تھے۔ میں نے دیکھا کہ اس کی مٹھیاں بند ہیں اور سیاہ چیز اس کے ہاتھوں پر لگی ہوئی ہے۔ دفعتاً یہ خیال بجلی کے مانند میرے ذہن پر کوندا کہ یہ مہندی ہے اس وقت اسے مہندی لگانے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔ یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے لڑکی کو ایک طرف سرکایا اور مریض پر جھک گیا اور جلد ہی مجھے پتہ چل گیا کہ وہ آخری سانس لے رہا ہے۔ لپک کر میں نے سرنج میں دوا ڈالی اور جس وقت بازو سے سوئی نکالی، اس کے ساتھ ہی اس کا سانس جسم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نکل گیا میری نظر میز پر رکھی ہوئی ٹائم پیس کی طرف گئی۔ دونوں سوئیاں شہادت کی انگلی کی طرح اوپر اٹھی ہوئی تھیں۔ اس وقت پورے بارہ بجے تھے۔ لڑکی نے ایک چیخ ماری۔ جھکولا کھا کر پیچھے کو گری اور بیہوش ہو گئی۔ اسے اٹھا کر میں دوسرے کمرے میں لے آیا۔ چیخ و پکار سن کر ہوٹل کا منیجر اور ایک بیرا اندر آ گیا تھا۔ ٹارچ کی روشنی میں میں نے اس لڑکی کو بستر پر لٹا دیا۔ وہ بے ہوش تھی۔ اس کے چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ دائیں بائیں پھیلے ہوئے تھے۔ مٹھیاں کھل گئی تھیں۔ مہندی کے درمیان ڈوبی ہوئی ہاتھ کی لکیریں صاف نظر آ رہی تھیں۔ اس کی ویران پر خوف آنکھوں پر پپوٹوں نے اپنا سایہ ڈال لیا تھا۔ منیجر اور بیرا لڑکی کے ہاتھوں پر لگی ہوئی مہندی کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے بیرے کے ہاتھ سے ٹارچ لے لی اور ان دونوں کو دوسرے کمرے میں جانے کا اشارہ کیا۔ پھر پلنگ کی پٹی پر بیٹھ کر میں نے اس کی نبض دیکھی۔ اور دوا دی۔ جس وقت بڑی بی نے آہستہ آہستہ اس کی گداز کلائیوں سے سہاگ کی چوڑیاں اتاریں، تو مجھے رونا آ گیا۔"

ماموں نے اپنے الفاظ کا ردعمل میرے چہرے پر دیکھا ان کو اپنے قصہ سنانے کے فن پر ناز ہے۔ مجھے رومال سے آنکھیں صاف کرتے دیکھ کر شاید وہ مطمئن ہو گئے اور پھر گویا ہوئے۔

"آخر کار دونوں کو میں اپنے گھر لے آیا۔ جب اس لڑکی کی جس کا نام نجمہ تھا، طبیعت ذرا سنبھلی تو پتہ پوچھ کر میں نے اس کے بھائی کو تار دے دیا کہ وہ آ کر اسے لے جائے۔ اس دوران میں روتے روتے اس کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔ اور ہر وقت سرخ رہتی تھیں۔ وہ بہت کم بولتی تھی۔ اس کی آنکھوں کی ویرانی بدستور تھی۔ مگر اس وحشت میں کمی آ گئی تھی، جو زندگی میں آنے والے اس طوفان سے پہلے تھی۔ وہ ہر روز شام کو انور کی قبر پر جاتی تھی نا معلوم کہاں سے اس نے ایک پودا منگایا تھا جو انور کی قبر کے سرہانے لگایا تھا۔ وہ دیکھو سامنے ایک سفید سی قبر نظر آ رہی ہے نا! یہ اسی کی قبر ہے۔ آہستہ آہستہ ہم اس کے نزدیک پہنچ گئے۔ "دیکھو اب یہ پودا کتنا بڑا ہو گیا ہے۔" انہوں نے کہا۔ میں نے دیکھا، قبر کے سرہانے مہندی کا ایک پودا لگا ہوا ہے۔ سفید سفید نازک پھول اور ہرے گول مٹول پتوں سے بھرا ہوا سرسبز شاداب پودا۔

دفعتاً مجھے خیال آیا کہ اس نے مہندی ہی کا پودا قبر کے سرہانے کیوں لگایا۔ اور وہاں اس نے اپنے شوہر کے مرتے وقت ہاتھوں پر مہندی کیوں لگائی"

ماموں مسکرائے جیسے ان کی محنت ٹھکانے لگی ہو۔

"ہاں یہ بات میں نے خود اس سے پوچھی تھی"۔ ماموں نے کہا۔ "ایک مرتبہ اس نے کہا کہ آپ نے ہم لوگوں کو اپنے پاس رکھ کر ایسا احسان کیا ہے جس کا بدلہ میں کبھی نہ اتار سکوں گی مگر کبھی بھی آپ کا کوئی کام ہوا تو اس سے دریغ نہ کروں گی۔ اس وقت میں نے اس سے کہا کہ "میرا ایک معمولی سا کام ہے وہ کر دو" اس نے وعدہ کر لیا اور میں نے کہا کہ "مجھے اس مہندی کے راز سے آگاہ کر دو۔" وہ بتانا نہیں چاہتی تھی، مگر وعدہ کر چکی تھی، مجبوراً اس نے مجھے سارا قصہ بتا دیا۔"

"کیا کہا اس نے؟" میں نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"اس نے مجھے زبانی کچھ نہیں بتایا۔ بلکہ چلتے وقت وہ مجھے چند کاغذات دے گئی تھی، جس میں پورے واقعات درج ہیں۔ یہ تو خدا ہی جانے کہ وہ سچ ہیں یا غلط، مگر میں انہیں صحیح سمجھتا ہوں۔"

"مگر لکھا کیا تھا اُن میں؟" میں نے بیقرار ہو کر پوچھا۔

"گھر چل ہی رہے ہیں، دیکھ لینا۔ وہ کاغذات اب تک محفوظ ہیں۔ یوں پوری طرح مجھے یاد بھی نہیں، لطف نہیں آئے گا۔"

یہ ذرا سا فاصلہ بڑی مشکل سے کٹا۔ گھر پہنچ کر میں نے مسودے کی فرمائش کی، تو ماموں نے کہا۔ "ابھی نہیں، پہلے فرسٹ کلاس چائے بنا کر پلاؤ۔" میں نے ہیٹر پر پانی رکھا اور ہم دونوں لائبریری میں آ کر مسودہ ڈھونڈھنے لگے۔ ماموں نے بڑی سی کتاب اٹھا کر کھولی اور بولے۔ "جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میں نے اس کتاب میں رکھا تھا۔"

میں نے دوسری کتابیں دیکھتے دیکھتے جلدی سے اپنا ٹھونسا ہوا مسودہ نکالا اور بولی۔ "یہ تو نہیں ماموں جان؟"

"یہی ہے۔" ماموں جان شرارت سے مسکرائے۔ "مجھے اپنی رکھی ہوئی چیز نہیں ملی اور تمہیں مل گئی۔ کمال ہے۔"

میں نے مسودہ کھولا اور ماموں کی نظر بچا کر جس جگہ سے چھوڑا تھا، پھر اسی جگہ سے شروع کر دیا۔ اب تک مجھے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ اس سے ماموں کی پہاڑی زندگی بسر کر دینے سے دور کا واسطہ بھی نہیں لیکن اب بذات خود اس کہانی میں اتنی دلچسپی ہو گئی تھی کہ میں راز کے معلوم نہ ہو سکنے کے غم کو آسانی سے بھول کر اس کہانی میں کھو گئی۔

"اور ایک دن جب وہ دونوں کشمیر پوائنٹ پر سیر کرنے گئے ہوئے تھے، دفعتاً انور نے نجم کے ہاتھ تھام لئے "للہ بتا دو نجم تمہیں کیا تکلیف ہے۔ تم روز بروز کمزور ہوتی جا رہی ہو۔ بالکل زرد ہو گئی ہو۔ نجم چاہے وہ کسی قسم کی تکلیف ہو، مجھ سے نہ چھپاؤ۔"

وہ چپ رہی، ہونٹ بھینچ لئے کہ کوئی لفظ زبان سے پھسل نہ جائے۔ وہ پھر سے بولا۔ "نجی! مان جاؤ، خدا کے لئے یہ خاموشی مجھ سے نہیں سہی جاتی نہیں سہی جاتی۔ بتاؤ نجی۔ بتا دو گی نا۔" یکایک وہ رو پڑی۔ انور کے کندھے سے لگ کر سسکیاں لیتے ہوئے اس نے کہا۔ "یہ نہیں بتا سکتی انور۔"

یک لخت وہ الگ ہو گیا۔ اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا اور آنکھیں خون کبوتر ہو گئیں۔ "اگر تم نہیں بتاؤ گی تو میں ابھی۔۔ ابھی یہاں سے چھلانگ لگا دوں گا۔ میرے مرنے کے بعد تمہیں چین آ جائے گا۔ مزے سے اس راز کو سینے میں چھپائے پھرنا۔" اس نے ایک قدم آگے بڑھایا اور پھر دوسرا۔ نجم اسے دیکھتی رہی۔ جیسے خواب دیکھ رہی ہو۔ دفعتاً جھپٹ کر اس نے انور کو پکڑ لیا۔ "انور خدا کے لئے یہ نہ کرو میں تمہیں بتا دوں گی سب کچھ بتا دوں گی۔" انور لوٹ آیا۔ دونوں چپ چاپ چلتے رہے ایک ڈھلان پر چیل کے درخت کے سائے میں بیٹھ کر نجم نے اس کو سب کچھ بتا دیا۔ شادی سے پہلے ایک نمائش میں اسے ایک ایرانی منجم سے واسطہ پڑا تھا اس کی سہیلیاں اسے ہاتھ دکھا رہی تھیں۔ وہ لاابالی سی لڑکی تھی۔ بڑی بے پروائی سے اُس نے کہا۔ "ارے تم لڑکیاں کس جادوگرنی کے چکر میں پھنس گئیں!" وہ اس عورت کے نزدیک ہی کھڑی تھی۔ دفعتاً اُس نے اپنا ہاتھ اس عورت کی سخت گرفت میں محسوس کیا۔ کلائی پر سے اس عورت نے اُس کے ہاتھ کو اس طرح دبایا کہ اُس کی انگلیاں خود بخود سیدھی ہو گئیں۔ پھر اُس نے اپنی گول گول سرخ آنکھیں اُسی کے ہاتھ پر جما دیں۔ حنا کا دیکھ رہی ہے ہاتھ۔ وہ سب دلچسپی سے دیکھنے لگیں۔

"حنا ہے نام اس کا؟" بھاری ملکوتی کی سی بے حس آواز میں اُس نے پوچھا۔ حنا نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔

"ہاں حنا ہے اس کا نام۔" لڑکیوں نے بتایا۔

"ہوں۔ بہت اچھا ہے اس نام کا اس کے ہاتھ پر۔" عورت نے اسی بھاری آواز میں کہا جیسے اوپر سے کوئی پتھر لڑھکا دیا جائے۔

"میں ان باتوں پر یقین نہیں رکھتی۔" وہ چلائی۔

"تمہیں یقین کرنا بھی نہیں چاہئے۔ کیونکہ ان باتوں پر یقین تمہارے لئے بہت مہلک ہو گا۔ اگر کوئی یہ کہے کہ جس دن شادی کی مہندی تمہارے ناخونوں پر سے جدا ہو جائے گی اسی دن تم صبح ہونے سے پہلے تم بیوہ ہو جاؤ گی۔ تو تم یقین نہیں کرنا ورنہ زندگی تمہارے لئے دوبھر ہو جائے گی۔"

لڑکیاں منہ پھاڑے اُسے دیکھ رہی تھیں۔ حنا نے جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور خیمے سے باہر نکل گئی۔ لیکن اب وہ پہلی سی ہنس مکھ حنا نہیں تھی۔ اس کا چہرہ سست اور اُترا ہوا تھا اور اُس پر خوف کی لہر پھیلی ہوئی تھی۔ لڑکیوں نے اس قصے پر تبصرے کا ایک لفظ بھی نہ کہا اور ادھر اُدھر کے اسٹالوں پر

ندی جلدی جگر لگا کر ظاہر کیا، جیسے کوئی ناخوشگوار بات نہیں ہوئی ہے۔ حنا نے بھی ظاہر کیا گویا اس نے نجمی کی بات کا کوئی اثر نہیں لیا ہے مگر
نہ کی بات خاموشی سے شعور سے گزر کر اس کے لاشعور میں جا کر چپ چاپ کہیں بیٹھ گئی۔ کچھ دن بعد وہ واقعہ اسے بالکل یاد نہ رہا۔ مگر شادی سے ایک
ت پہلے اس نے خواب میں وہ سارا واقعہ دیکھا جب کا نول، دوسرے دن مہندی لگاتے وقت اس نے مہندی لگانے سے قطعی انکار کر دیا۔ اس بات پر
اندان میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ اس کی دادی، نانی اور ماں نے بار بار آکر سمجھایا کہ بدشگونی کی باتیں نہ کرے۔ چنانچہ اُسے ہار ماننی پڑی۔ مگر جوں جوں وہ اس
ل کو دل سے نکالنے کی کوشش کرتی اور پختہ ہوتا جاتا۔ اس نے انور سے التجا کی تھی کہ وہ اسے حنا کے بجائے نجم کہا کرے۔ انور نے بلا حیل و حجت اس چھوٹی سی
ندعا کو قبول کر لیا تھا۔ مگر پھر بھی یہ خیال اس کے دل سے کسی طرح نہ نکلتا تھا شعوری اور غیر شعوری طور پر اس کی نظریں اپنے ہاتھوں پر دوڑتی رہتیں۔
ہندی کا سرخ مائل رنگ آہستہ آہستہ زرد ہونے لگا۔ وہ ان جلنے میں دھیرے دھیرے چھٹ رہی تھی اور اس طرح نامعلوم طور پر وہ گھلے جا رہی تھی۔ اس
نے اپنے ہاتھوں کو صابن سے دھونا چھوڑ دیا تھا۔ وہ ہر چیز کو اس طرح چھوتی کہ ہاتھ کم سے کم خراب ہوں مگر اس کے باوجود مہندی کا رنگ ہلکا پڑتا گیا اور
س کا خوف گہرا ہوتا گیا۔ یہ خیال اس کے ذہن پر ایک ناسور بن کر رہ گیا۔ "اب تم دیکھ رہے ہو" اُس نے اپنے خوبصورت ہاتھ انور کے آگے پھیلا دیئے۔ ناخنوں
کے اگلے سروں پر زرد سا ایک ہلال تھا انتیس کے چاند کی طرح باریک اور خیالی جو کسی وقت بھی غائب ہونے والا ہے۔

"تم کتنی وہمی ہو نجمی پگلی" انور نے زور کا ایک قہقہہ لگایا "اس ڈیل ڈول کو تو دیکھو، یہ اتنی جلدی خاک ہونے والا نہیں"۔ نجمی کو ہاتھ پکڑ کر اُس نے اٹھایا اور
پنے جسم کو مسکا کر دیکھا۔

"مجھ سے بھی ایک نجومی نے کہا تھا کہ تم جوانی میں مر جاؤ گے۔ میں نے اس کے ایک تھپڑ رسید کیا اور دیکھو لو آج تک ہٹا کٹا ہوں۔ اس جسم کو گھلتے گھلتے بھی دن
لیں گے نجمی۔"

نجم نے بڑھ کر اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "ایسا نہ کہو انور۔"

انور نے زور سے ایک قہقہہ لگایا "نجمی! تم اپنے دل سے یہ خیال بالکل نکال دو۔ وہمی لڑکی! اتنے دن خواہ مخواہ خود بھی پریشان ہوئی اور
مجھے بھی پریشان رکھا۔ کوئی بات بھی ہو، میں ہوٹل پہنچتے ہی یہ ناخن کاٹ دوں گا۔ اور پھر دیکھوں گا۔"

"نہیں نہیں" نجم چلائی۔

"پگلی، میری جان تمہارے دل میں محفوظ ہو تو ہو کم از کم ناخنوں میں نہیں ہو سکتی۔ چلو۔ اٹھو بے وقوف لڑکی! آئندہ میں تمہیں اپنے ہاتھوں کو تکتا نہ
دیکھوں۔"

انور کے اس رویے نے نجم کے دل سے خوف بہت حد تک کم کر دیا۔ اندر کہیں خوف کا ہلکا سا احساس اب بھی تھا۔ مگر اب یہ خیال بھی ہو چلا تھا
کہ اتنے دن خواہ مخواہ گھبراتی رہی۔ اس اندھے تاریک وہم میں جس میں شبے کسی شک و شبہ کی گنجائش معلوم نہیں ہوتی تھی۔ روشنی کے دروازے کھل گئے تھے۔ آج
اس کا دل پہلے سے ہلکا محسوس ہو رہا تھا۔ ذہن کے کسی گوشے میں ہلکا سا یہ احساس بھی تھا کہ یہ سب ختم ہو جائے تو اچھا ہو۔ اگر انور واقعی اس کے ناخن کاٹ دے اور
اس کے بعد سب کچھ ٹھیک ہے تو اسے کتنی زبردست روحانی اذیت سے نجات مل جائے۔ "چائے کا پانی اُبل گیا تھا۔ ناچار مجھے اُٹھ کر چائے بنانی پڑی۔ ایک پیالہ
ماموں کو دے کر اور ایک میں اپنے لئے الٹی سیدھی چائے بنائی پھر اپنی جگہ آبیٹھی اور داستان کا سرا جوڑ دیا۔

"مگر انور نے اس کے ناخن نہیں کاٹے۔ اس بات کا کچھ ذکر بھی نہیں کیا۔ مگر اسی رات اس کے پیٹ میں سخت درد ہوا۔ دوسرے دن بھی وہ درد سے تڑپتا رہا
اُس شام زبردست طوفان آیا۔ نجم کے دل میں بار بار کوئی سرگوشی کر رہا تھا۔ یہ جھکڑ اب تیری زندگی کو ختم کر کے اجاڑ کر ہی ٹلیں گے۔ اسے یقین ہو چلا تھا۔ کہ یہ رات
انور کی زندگی کی آخری رات ہوگی۔ اس کے ناخنوں کا خیالی رنگ بھی دھندلا گیا تھا۔ پھر دفعتاً اس کے ذہن میں ایک خیال کوندا۔ کیوں نہ وہ اپنے ہاتھوں پہ
مہندی رچا لے۔ جس طرح ختم ہوتی بتی سے دوسرا دیا جلا لیتے ہیں۔ جس طرح شمع کی آخری بھڑکتی لو سے دوسری شمع روشن کی جا سکتی ہے۔ اسی طرح یہ مہندی شاید

اُس کے سہاگ کی بھڑکتی لو کو زندگی دے جائے۔ اس سے پہلے بھی اُسے خیال آیا تھا مگر وہ ڈرتی تھی کہ کہیں اس خوفناک لمحے کو وقت سے پہلے نہ بلالے۔ جب وہ لمحہ آہی گیا تھا تو وہ یہ جوا کھیل لینا چاہتی تھی۔ دقت یہ تھی کہ اس طوفانی رات میں وہ مہندی کہاں سے حاصل کرے۔ آخر اس نے ایک بیرے کو انعام کا لالچ دے کر بہت خوشامد سے کہیں سے مہندی لانے پر راضی کیا۔ مہندی پیالی میں گھول کر وہ انور کو دیکھنے آئی۔ مہندی ہاتھوں پر لگاتے ہوئے بھی اُسے ڈر لگ رہا تھا۔ وہ کبھی انور کے کمرے میں جاتی، کچھ دیر پیالی کے پاس کھڑے ہو کر وہ بے اختیار انور کے کمرے میں لوٹ جاتی اور اس کا ماہی بے آب طرح تڑپنا دیکھتی رہتی۔ منیجر نے کسی نہایت قابل ڈاکٹر کو بلانے کے لئے آدمی بھیجا تھا۔ وہ ڈر رہی تھی کہ اس طوفانی رات میں قابل ڈاکٹر آتا بھی ہے یا نہیں اور دل اندر کوئی رہ رہ کر کہہ رہا تھا وہ آبھی گیا تو کیا ہوگا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا کچھ نہیں ہو سکتا۔

ڈاکٹر آ گیا۔ پونے بارہ بجے تھے۔ دفعتاً اس کی نگاہ لیمپ کی روشنی میں اپنے ناخونوں پر پڑی۔ رنگ حنا کی وہ ہلکی سی کرن بھی ڈوب گئی تھی۔ وہ بھاگی۔ کانپتے ہاتھوں سے دروازہ بند کر کے وہ جلد جلد مہندی لگانے لگی۔ مگر ابھی اُس کے دونوں ہاتھوں پر بمشکل مہندی لگی ہوگی کہ ڈاکٹر نے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس کھٹکھٹانے کا مطلب سمجھ کر بھاگی اور جیسا کہ اس کا دل اتنے دنوں سے بتا رہا تھا۔ ٹھیک بارہ بجے اس کی زندگی کا روشن تارا ڈوب گیا، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غائب ہو گیا۔"

ختم کر کے میں کچھ دیر ساکت بیٹھی رہی۔

"پڑھ لیا؟" ماموں نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ غالباً وہ لڑکی افسانہ نگار تھی۔" میں نے قیاس آرائی کی۔

"ہاں افسانہ نگار تھی اور وہمی بھی۔"

"تو کیا یہ وہم تھا؟ آپ اسے وہم کہہ سکتے تھے، جب وہ بات غلط ثابت ہو جاتی۔ وہ تو قسمت کا لکھا تھا جو اتفاق سے اُسے پیشتر معلوم ہو گیا تھا اس کا علاج تو اُس کے پاس نہ تھا۔"

"وہم کا علاج تو لقمان کے پاس بھی نہیں تھا۔" ماموں نے خالص ڈاکٹری لہجے میں کہا۔

"آپ اسے وہم کیسے کہتے ہیں!" میں چڑ گئی۔ "اس کے وہم نے اس کے شوہر کی جان کس طرح لے لی، جبکہ اس نے بیوی کی بات کا یقین ہی نہیں کیا اور مذاق میں اڑا تا رہا۔"

"ہاں ظاہراً طور پر اُس نے یقین نہیں کیا۔ مگر اس کے دل میں یہ بات چھپ کر بیٹھ گئی۔ انسان فطرتاً وہمی ہے بیٹی۔ پھر تمہیں یاد ہوگا کہ اُسے بھی کسی نجومی نے بتا دیا تھا کہ وہ جوانی میں مر جائے گا۔ ان دونوں خیالوں نے اتنا زور پکڑا کہ وہ آناً فاناً ختم ہو گیا۔ ماموں نے چہل قدمی کے لئے پھر اپنی چھڑی سنبھال لی۔ شاید میرے ساتھ آج وہ پوری چہل قدمی نہ کر پائے تھے۔

"میں کبھی نہ مانوں گی۔ میں صاف اڑ گئی۔ "کئی چیزیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں آپ کی ڈاکٹری اور آپ کی نفسیات نہیں سمجھ سکتیں۔"

"ہاں ضرور۔ انہوں نے طنزاً کہا۔ میں تو صرف اتنا ہی کہوں گا کہ تم افسانہ نگار ہو اور وہمی بھی۔

یہ کہہ کر چھڑی ہلاتے ہوئے وہ اپنی لمبی چہل قدمی کو نکل گئے۔ اس وقت سورج ڈوب رہا تھا۔ دور ڈھلوان پر ایک سفید سی قبر چمک رہی تھی جس کے سرہانے زردی مائل سفید سفید نازک پھول جھک کر انہماک سے جانے کیا دیکھ رہے تھے۔

فرصت کے لمحات کا بہترین ساتھی ماہنامہ "نقش" کراچی

پشکر ناتھ — تخلیق دہلی

جرم کا اقبال

کل غفورے نے پھر زینی کو خواب میں دیکھا۔

چپکے سے آئی اور دروازے کی چوکھٹ میں کھڑی اسے خالی خالی نگاہوں سے گھورنے لگی۔ وہی سبز رفل کا فرن پہنے۔ سر پر بندھے ہوئے رعال سے بالوں کی دو لٹیں اُسی انداز میں جھانک رہی تھیں۔ فرن کے نیچے سینے کا زیر و بم اسی طرح عیاں تھا۔ کانوں کے آویزے اسی طرح دھیرے دھیرے ہل رہے تھے۔ لب اسی طرح خاموش تھے۔ کوئی چیز نہیں بدلی تھی۔ نہ نگاہوں کا سکوت۔ نہ سینے کا زیر و بم۔ نہ گالوں کی شفق اور نہ وہ کھڑا رہنے کا انداز۔ داہنے پاؤں کا انگوٹھا اُسی طرح بے خیالی میں زمین کھرچ رہا تھا۔ اور دیکھتے ہی غفورے کے ذہن میں وہ سوال سانپ کے پھن کی طرح کھڑا ہو گیا۔ زینی بولتی کیوں نہیں۔۔۔؟ صرف خالی نگاہوں سے دروازے کی چوکھٹ میں کھڑی تک رہی ہے۔ بالکل اس ماں کی طرح جو انہماک سے اپنے بچے کے معصوم کھیل کو تک رہی ہو۔ یہ نگاہوں کی زہریلی معصومیت غفورے کے دل میں انگارہ بن کر لوٹنے لگی۔ نگاہیں ایک ہی نکتہ پر جمی ہوئی پوچھ رہی تھیں۔ بول میرے سرتاج! میرے تین بچے سوتے میں اچانک ماں کو پکارتے تو نہیں۔؟

"نہیں!" وہ گرج اٹھا۔ "تمہیں کوئی نہیں پکارتا۔ تم چلی جاؤ۔ تمہیں کوئی نہیں پکارتا۔"

مگر زینی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ نہ نگاہوں کا سکوت ٹوٹا۔ صرف اُس کے کانوں میں پڑے ہوئے دو آویزے ہلتے رہے ہلتے رہے۔

غفورے نے پہلی بار یہ خواب پانچ مہینے پہلے دیکھا تھا۔ جبکہ زینی کو مرے ہوئے ابھی صرف آٹھ ہی دن ہوئے تھے۔ مگر اس دن اُس نے وہم سمجھ کر اس خواب کو نظر انداز کیا تھا۔ دوسری مرتبہ جب غفورے نے بالکل یہی خواب پھر دیکھا تھا تو اس کے دل میں ایک عجیب سی بے چینی نے جنم لیا تھا۔ اور تیسری مرتبہ اس خواب نے غفورے کے دل میں وحشت بھر دی تھی۔ اور اس کی زندگی ایک کٹی ہوئی پتنگ کی طرح فضاؤں میں ڈولنے لگی۔ غفورے کی دانست میں اس نے وہ حرکت کی تھی۔ جو ایک غیور مرد کے شایانِ شان تھی۔ اور وہ اپنی اس حرکت پر کبھی بیٹھ کر سوچنے کی ضرورت محسوس نہ کرتا۔ مگر یہ خواب؟ جو ہر دسویں بارھویں دن ذہن کی دہلیز پر آ موجود ہونے لگا۔ ان دھیرے دھیرے ہلتے ہوئے بندوں نے غفورے کے دل میں بے کلی بھر دی تھی۔ زینی کے مرنے کے پورے آٹھ دن بعد تک وہ خوب جی بھر کر سویا تھا۔ جیسے کوئی بھاری بوجھ اُس کے ذہن سے اُتر گیا ہو۔ مگر جب آٹھویں دن زینی پہلی بار خواب میں آئی تو اس کے دماغ میں انگارہ سلگنے لگا۔ اُف! یہ انگارہ کوئی دماغ سے نکال دیتا۔ نیند سے خوف آتا ہے۔ دل کی دھڑکن کو لاکھوں، کروڑوں زبانیں مل گئی ہیں۔ ہر سمت تابوت ہی تابوت نظر آتے ہیں۔ چاروں طرف نگاہیں ہی نگاہیں تک رہی ہیں۔ کونوں کھدروں سے ظلمات کے سائے اُبھر آئے ہیں۔۔۔ خدایا اسے جہنم تو نہیں کہتے

نہیں نہیں۔۔۔ اس شک کی کوئی بنیاد نہیں ہے معاملہ بالکل صاف ہے۔ زینی صرف انتقام کی غرض سے خواب میں آتی ہے۔ مگر میں اس کے انتقام کا شکار

نہیں ہوں گا۔ میں کبھی حقیقت سے انکار نہیں کروں گا۔ پُھندے دھیرے دھیرے جلتے رہے۔ انگارہ جلتے ہوئے جلتا رہا۔ اُف یہ پسینہ بہتا ہی چلا جا رہا ہے۔ یہ ہاتھ۔؟ نہیں یہ وہم ہے۔ یہ ہاتھ کالے نہیں ہیں۔ صبح ہی تو مسجد میں دھوئے تھے۔

بیٹھے بیٹھے غفورے نے حال کی تاب نہ لاکر ماضی کے اندھیروں کو ٹٹولنا شروع کیا۔ شاید کہیں کوئی پناہ ملے۔

آنکھیں بند کئے غفورے نے اپنی ساری زندگی کی مخفی پگڈنڈی پر نظر دوڑانا شروع کی۔ کوئی ستارہ کہیں چمک نہیں رہا تھا۔ کسی گلاب نے کہیں مہک نہیں پھیلائی تھی۔ کتابوں کی شکل کہیں نہیں تھی۔ اسکول کا تصور بھی نہ تھا۔ صرف کچھ پرچھائیاں تھیں۔ گلی ڈنڈے کا ذکر تھا۔ چند گول ٹھیکریوں کے خاکے تھے۔ اس کے بعد بھی یہ خاکے بے رنگ ہو گئے تھے۔ برٹش کا ربٹ فیکٹری کا دروازہ صبح نو بجے کھلتا تھا اور شام کو سات بجے بند ہوتا تھا۔ بس! یہی ماضی بھی تھا اور یہی حال بھی۔ زندگی چند حالتوں میں کس قدر سمٹ جاتی ہے کہ چاول کے ایک دانے میں سما جائے۔ غفورے کی زندگی کا تصور کرنے کے لئے خلاؤں میں کھوجنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ چاند پر کمند پھینکنے کی بھی چنداں حاجت نہ تھی۔ صرف چاول کے ایک دانے پر نظر دوڑانا شروع کی۔ کوئی ستارہ کہیں چمک نہیں رہا تھا۔ کسی گلاب نے کہیں مہک نہیں پھیلائی تھی۔ کتابوں کی شکل کہیں نہ تھی۔ اسکول کا تصور بھی نہ تھا۔ صرف کچھ پرچھائیاں تھیں۔ گلی ڈنڈے کا ذکر تھا۔ چند گول ٹھیکریوں کے خاکے تھے۔ اس کے بعد یہ خاکے بھی بے جان اس موقع پر اس کی ڈور میں ایک جھٹکا لگا۔ اور ایک ڈور اور اس میں شامل کی ہوگی۔۔ یہ زینی تھی۔

گلابی گالوں اور لمبے بالوں والی زینی شادی کے پہلے ہی دن غفورے کے دل میں اتر گئی۔ آنکھوں میں سما گئی۔ خیالوں پر چھا گئی۔ اب سات بجے برٹش کاربٹ کمپنی کا دروازہ کھلتا تھا، تو باہر اندھیری بھیانک رات منہ کھولے منتظر نہ بیٹھی ہوتی۔ بے مقصد کسی دوکان کے چھجے پر بیٹھنے کا شغل اشارے نہیں کرتا تھا۔ محلے کے چند جوان چھوکروں کی بے معنی گپ شپ اپنی باہنیں نہیں کھولتی تھی۔ اب تو ایک مہک ہواؤں میں بھر گئی تھی۔ جو بندھی ہوئی گھر کی دہلیز تک لے آتی تھی۔ پڑھے لکھے لوگ اس مہک کو شاید پیار کرتے ہیں۔ اگر یہی پیار ہے اور پیار کا نشہ ہے، تو غفورے اس نشے میں صرف مست ہی نہیں بلکہ بدمست ہو گیا تھا۔

اون کے گولے پر سے لمبی ڈور اترتی گئی۔ قالین انچ بہ انچ اونچا ہوتا گیا۔ اور ایک دن اس قالین پر ایک گل گوتھنے بچے کی تصویر ابھر آئی۔ ایک پتلی سی ناہموار چیخ بلند ہوئی اس دن غفورا کمپنی نہیں گیا۔ اس دن اس کی ماں نے اپنے دروازے پر کھڑے ہوکر ٹے رنگ دار چاول بانٹ دیئے۔ زندگی نے پر پھیلانے شروع کئے تھے۔ دوسری پرواز میں ایک اور بچے کی تصویر بجلی کی طرح کوندگئی۔ اور یہ احساس دلانے لگی کہ کمپنی والے تنخواہ بہت کم دیتے ہیں۔ تیسری مرتبہ تصویر نے جب پھر مسکرا کر دیکھا تو یہ احساس زیادہ گہرا ہو گیا۔ اب کی مرتبہ غفورے نے چھٹی نہیں لی اور نہ ماں نے ہی دروازے پر کھڑے رنگین چاول بانٹے۔

اور اس دوران میں گولے پر سے چند اور پرت اتر گئے۔ ڈور کے تناؤ میں ڈھیلا پن آگیا۔ برٹش کاربٹ کمپنی سے گھر کی دہلیز تک کا فاصلہ کم ہو گیا اور ایک دن اس دہلیز پر زینی کے لئے تابوت لایا گیا۔ مگر نہیں اس حقیقت کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اُف۔ کسی نے سنا تو نہیں۔

بات پھر حال تک آپہونچی۔ اور حال صرف ایک سوالیہ نشان بن کر رہ گیا تھا۔ ایک جلتے ہوئے انگارے میں سمٹ آیا تھا اور یہ انگارہ دماغ میں بدستور جل رہا تھا۔ آخر کب تک؟

کب تک آگ کا دہکتا ہوا یہ آرہ اندر ہی اندر چلتا رہے گا۔ میں نے تو کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ کوئی بے وفائی نہیں کی ہے۔ پھر یہ دل کے نیچے زخم پر کھرچن سی کیوں ہو رہی ہے۔ یہ پھندے دھیرے دھیرے کیوں جل رہے ہیں۔ یہ لاکھوں کروڑوں لاشیں ذہن میں کیوں تیر رہی ہیں۔ یہ گلی میں ہزاروں گھر درے پتھر کیوں بھر گئے ہیں؟ کہتے ہیں جہنم کی آگ کبھی نہیں بجھتی۔ جلتی ہی رہتی ہے، مگر اس اندر کی آگ میں جو حدت ہے۔ وہ کیسے بجھ سکے گی۔ یہ آگ باہر کے جسم کو کیوں نہیں جلاتی۔ میرے خدا۔ اس سوال کو میرے ذہن سے نکال دو۔ ورنہ میرے دماغ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دو۔

غفورے نے ایک مرتبہ پھر اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھ ڈالا۔ عذاب۔ بے پناہ عذاب!! جیسے کوئی جسم انگاروں پر لوٹ رہا ہو۔ یہ عذاب تو اسی دن شروع ہوا تھا۔ جب وہ زینی کے پیچھے پیچھے کنویں تک آیا تھا۔ پانچ مہینے اور آٹھ دن۔ رات اپنے منحوس اندھیرے لئے ہوئے ہوئے آرہی تھی

آسمان پہ کوئی ستارہ نہ تھا۔ درختوں کی ٹہنیوں میں کوئی جنبش نہ تھی۔ کوئی پرندہ نہ تھا۔ آگے آگے زینی جا رہی تھی۔ ہاتھ میں بالٹی لئے۔ اور پیچھے پیچھے وہ آرہا تھا ننگے پاؤں۔ مگر نہیں۔! یہ بات نہیں دہرائی جا سکتی۔ کیونکہ اس بات کی تہ میں ایک جلتا ہوا، شعلے بکھیرتا ہوا سوال ہے۔ کاش کوئی اس سوال کا جواب بدلنے سامنے آ جاتا۔

غفورے نے حقے کی نے زمین پر پٹک دی۔ اور جوتا پہن کر باہر آ گیا۔ ان پانچ مہینوں میں اس نے کبھی داڑھی نہیں بنائی تھی۔ کبھی نگاہ اٹھا کر کسی کی طرف دیکھا نہیں تھا کبھی کھل کر بات نہیں کی تھی۔ کاش کوئی خنجر کی نوک سے دماغ سے ان دو آنکھوں کی تصویر کھرچ کر مٹا دیتا جو چپ چاپ بس تکے جا رہی تھیں۔

چنار کے نیچے ڈاکٹر نے حسب معمول مجمع لگا یا تھا، اور چند دیہاتیوں کو اپنی دوائیوں کے کرشمے بتا رہا تھا۔

"ڈاگدر جی۔" غفورے نے صدا لگائی۔

"بتاؤ میرے بھائی۔ بہ جٹس کی تکلیف ہے۔ دانتوں میں درد ہو رہا ہے۔ ہاتھ پاؤں ٹوٹتے ہوئے محسوس ہو رہے ہیں۔ آنکھوں میں پانی آتا ہے۔ آنتیں سوجی ہوئی ہیں۔ کمر میں درد ہے۔ سر چکرا رہا ہے۔ تمہیں کون سی تکلیف ہے؟ سبھی موضوں کا ایک علاج۔ یہ عرق فردوسی، صرف دو روپے۔"

ڈاکٹر نے ایک ہی علاج۔ ایک ہی لے اور ایک ہی سانس میں تقریر سنائی۔ غفورا اس عرق کو پہچان گیا۔ ہاں ایک ہی علاج۔ مگر سال بھر پہلے اس نے ایک اور ہی مقصد کے لئے یہ عرق خریدا تھا۔

"ڈاگدر جی اب مجھے کچھ مشورہ کرنا ہے۔" غفورے نے جواب دیا۔

"ضرور۔ ضرور۔ میں پرائیویٹ مشورے خلوت میں دیتا ہوں۔ آؤ ادھر ایک طرف۔"

"ڈاگدر جی۔ کیا آپ کی یہ دوائی ہر حالت میں کارگر ثابت ہوتی ہے؟" غفورے نے ایک طرف جا کر پوچھا۔

"ارے تم پھر آ گئے۔ میں پوچھتا ہوں۔ کیوں روز روز آ کر اپنا اور میرا وقت برباد کرتے ہو۔ ایک مرتبہ کہہ دیا کہ یہ خاص الخاص چیز ہے۔ چل دفعان ہو۔"

مگر غفورا دفعان نہیں ہوا۔ اس کا سارا وجود موم کی طرح پگھل گیا۔ اور پھر یکا یک اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی بہہ نکلی۔

"آپ کو پیر دستگیر کی قسم، سچ سچ بتا دو ڈاگدر صاحب یہ میری زندگی اور موت کا سوال ہے۔ یہ دوائی لے کر میں لٹ گیا ہوں۔" غفورا گڑگڑایا۔

"ارے روتے کیوں ہو۔! یہ دوا کوئی زہر نہیں ہے، سنکیا نہیں ہے، خالی پیلی دو چار قسم کے پھلوں کا رس ہے۔ اس سے کوئی آدمی کیسے لٹ جائیگا۔ کیوں قسم دیتے ہو۔؟ کیوں میرا واحد سبب روزی کا مجھ سے چھین لینا چاہتے ہو، جاؤ شفا پروردگار کے ہاتھ میں ہے۔ جاؤ بھی میرا دھندہ خراب ہو رہا ہے۔"

عرق فردوسی۔ دو چار قسم کے پھلوں کا رس؟ اُف! غفورے کے پاؤں وہیں زمین میں جذب ہو گئے۔ پانچ مہینے اور آٹھ دن کی مدت ایک بھاری پتھر بن کر آسمان سے آ گری۔ ایک ایک لمحہ آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ یا معبود! یہ آندھی اتنے زور سے کیوں چل رہی ہے۔ یہ زمین کی گردش یک لخت کیوں رک گئی ہے۔ یہ آسمان پر لاتعداد آنکھیں کیوں وا ہو گئی ہیں۔ یہ لاکھوں کروڑوں نگاہیں ایک ہی نکتے پر کیوں جم گئی ہیں۔ میرے خدا! ان نگاہوں کو زبان دیدو ان ہاتھوں کو منہ نوچنے کا حکم دو۔ ان ہونٹوں کو داستانیں بیان کرنے کی توفیق بخشو۔ ان ننھی ننھی بوندوں سے کچھ نہیں ہوگا۔ دو جہان کے مالک۔ میرے گناہوں کی سیاہی بہت گہری ہے۔ اپنے افلاک کے سینے چاک کر دو۔ تاکہ وہ سمندر اگل دیں۔ کتنا برا مذاق۔ عرق فردوسی۔

یکا یک فلک کا سینہ چاک ہوا اور غبار سے ساری ہوا اَٹ گئی۔ غفورا دوڑا۔ وہ بے تحاشا دوڑتا گیا۔

"کہاں جا رہے ہو غفورے؟ تمہیں پھانسی ہوگی۔ تمہارے بچے بھوک سے بلک بلک کر مر جائیں گے۔"

"مرنے دو بچوں کو۔ لگنے دو مجھے پھانسی۔ ڈوبنے دو سورج کو۔ آج میں کھلی روشنی میں اقبال کروں گا۔ اقبال جرم کروں گا۔

انسپکٹر صاحب!

انسپکٹر صاحب! غفورا پولیس اسٹیشن کے برآمدے میں چلایا۔

"کیا ہو گیا۔ کہیں قتل ہوا۔۔۔؟ ڈاکہ پڑ گیا۔۔۔ چلا کیوں رہے ہو؟" انسپکٹر نے رعب دار آواز میں ڈانٹ پلائی۔

"انسپکٹر صاحب! میں بیان دینا چاہتا ہوں۔" غفورے نے اسی بلند آواز میں کہا۔

"کل آؤ! میں معروف ہوں۔"

انسپکٹر صاحب پہلے ہی بہت دیر ہو گئی ہے۔ میرا بیان بہت ضروری ہے۔" انسپکٹر نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ دوبارہ اپنے روزنامچے پر جھک گیا۔

"انسپکٹر صاحب! میرا نام غفورا ہے۔ میری بیوی کا نام زینی تھا۔ ہمارے تین بچے ہیں۔ نوٹ کر لیجئے۔ میں برٹش کارپٹ کمپنی میں قالین باف تھا۔ اور میری صرف ایک سو دس روپے تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری اور کوئی اولاد ہو۔ آپ نوٹ کر رہے ہیں نا۔ ایک دن میں اپنے ساتھی قالین باف کے کہنے پر رجی کے پاس گیا۔ وہی جناب جو چنار کے نیچے مجمع لگاتا ہے۔ میں نے مبلغ دو روپے دے کر اس سے عرق خریدا۔ اس نے کہا کہ یہ کھا کر تمہیں یعنی مجھے تین سال اولاد نہیں ہوگی۔ شرطیہ دوائی ہے۔"

"کیا ٹر ٹر لگا رکھی ہے تم نے؟ دیکھتے نہیں۔ میں کام کر رہا ہوں۔" انسپکٹر نے بدستور روزنامچے کی طرف دیکھتے ہوئے ٹوکا۔

"دیکھ رہا ہوں جناب نوٹ کر رہے ہیں۔ اللہ آپ کو ترقی دے۔ ہاں تو جناب! میں نے باقاعدہ دس دن دوائی کھائی۔ اور اس کے بعد کوئی سات گذر گئے۔ ایک دن میں کمپنی سے گھر آیا تو زینی نے میرے کان میں کہا کہ وہ دو پیٹ سے ہے۔ سوچ لو انسپکٹر! بات کی داد دو۔ زینی پیٹ سے تھی اور وہ جب میں نے دوا کھائی تھی۔ میں پاگل ہو گیا۔ میں نے اس کو بہت پیٹا کہ بتا کس سے منہ کالا کرا چکی ہے۔ مگر اس نے کچھ نہیں بتایا صرف کہا کہ تم یعنی کہ میں پاگل ہو گیا ہوں۔ تمہارا یعنی کہ میرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ آپ نوٹ کرتے جاؤ انسپکٹر۔ میرا خون کھول گیا۔ حرافہ، حرامزادی اس کا نام نہیں بتا رہی تھی۔ پھر میں خاموش ہو گیا۔ اور شام کو جب وہ کنوئیں پر پانی لانے کے لئے چلی گئی تو میں بھی چپکے سے اس کے پیچھے گیا۔ اب آپ کہیں گے کہ یہاں کنوئیں ہوتے ہی نہیں ۔۔۔ ہیں نا؟ مگر میں کہوں گا کہ ہمارے مکان کے پچھواڑے جو ملیاری زمین ہے، اس میں میرے دادا نے کنواں بنوایا تھا جو اب بھی موجود ہے۔ ہاں تو جب وہ کھینچنے لگی تو میں بھی اس کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ اندھیرا چھا گیا تھا۔ کوئی نہیں دیکھ رہا تھا۔ جب وہ جھکی تو میں نے اسے دھکا دے کر کنوئیں میں گرا دیا۔ اور خود چپ چاپ گھر میں داخل ہو گیا۔ اب آپ پوچھیں گے کہ تم نے یعنی میں نے اتنے دن بیان کیوں نہیں دیا۔ پوچھیں گے نا آپ؟"

"میں کہتا ہوں بکواس بند کرو ۔۔۔ مجھے کام کرنے دو۔ ورنہ میں گولی سے اڑا دوں گا۔"

"اچھا جناب! میں آہستہ بولوں گا۔۔۔ آپ کو نوٹ کرنے میں دقت ہوتی ہوگی۔ ہاں تو انسپکٹر صاحب! آپ پوچھیں گے تم نے یا میں نے اتنے دن بیان نہیں دیا۔ تو میں کہوں گا کہ میرے دماغ میں جو سوال ابھرا تھا نا، اس کا جواب مجھے آج ہی مل گیا۔ میں نے ڈاگدرجی کو پیر دستگیر کی قسم دی اور اس نے صاف کہہ دیا میں دوڑا دوڑا سیدھا یہاں چلا آیا۔ اُف یہ پانچ مہینے دوزخ کی آگ میں جلتا رہا۔ باہر کتنی ٹھنڈ پڑ رہی ہے۔ ہاں تو بسم اللہ کیجئے اور مجھے ہتھکڑی دیجئے۔"

"ارے کوئی سپاہی ہے۔۔۔؟ ذرا اس پاگل کو باہر پھینک دو، اس نے میرا دماغ چاٹ لیا۔" انسپکٹر نے جواب دیا۔

"کیا کہہ رہے ہو انسپکٹر صاحب! میں نے زینی کا خون کیا ہے۔ میں بیان دے رہا ہوں۔ میں نے زینی کا خون کیا ہے۔"

غفورے نے حلق پھاڑ کر صدا بلند کی۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ مگر لڑکھڑا کر فرش پر گر پڑا۔ اور ساتھ ہی دروازے میں ایک سپاہی نمودار ہوا۔

"کیا کہہ رہا ہے یہ۔۔۔! تم نے خون کیا ہے۔۔۔؟ سپاہی اسے ہتھکڑی پہنا دو۔" انسپکٹر بھی کھڑا ہو گیا۔ خون کا لفظ سن کر وہ چونک پڑا تھا۔ سپاہی نے آگے بڑھ کر غفورے کا بازو تھام لیا۔ مگر یہ بازو سرد تھا۔ سرد اور بے حس۔

یعمر تمکیں

سیپ کراچی

ہنی مون

میں ابھی بستر ہی میں تھا کہ کمرے کے برآمدے میں آہٹ ہوئی پھر کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے اپنے بازو کی طرف دیکھا۔ نسیمہ غالباً بہت سویرے اٹھ چکی تھی اور اب غسل خانے میں تھی۔ میں ابھی اٹھا تھا اور دروازے پر ایک نوجوان بلکہ لڑکا کھڑا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی یہ کون ہے۔ پھر بھی میں نے اس کو اندر بلایا اور سگریٹ پیش کر کے اس کی آمد کا مقصد دریافت کیا۔

وہ کچھ پریشان سا تھا اور سگریٹ نوش کرتے ہوئے کچھ جھجک رہا تھا۔ اس کی گھبراہٹ سے مجھ کو یہ موقع مل گیا کہ پوری طرح اس کا جائزہ لے سکوں۔ اس کی عمر زیادہ سے زیادہ بیس اکیس برس کی رہی ہوگی۔ چہرہ بہت ہی دلکش بلکہ بہت خوبصورت تھا۔ [illegible] پتلون میں لگی ہوئی تھی بلکہ گردن میں اونی مفلر اس طرح لپٹا ہوا تھا کہ معلوم ہوتا تھا وہ ابھی کھیل کے میدان سے لوٹا تھا۔

"میرا نام شنکر ہے۔" وہ کچھ کچھ شرمندہ اور گھبرایا ہوا تھا۔

میں نے کہا۔ "بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ آپ چائے پئیں گے یا کافی؟"

مگر اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کسی بچے کو مٹھائی چراتے ہوئے پکڑ لیا گیا ہو۔ وہ نسیمہ کو دیکھ کر گھبرا گیا تھا۔ میں نے جب نسیمہ کو دیکھا تو چند ساعتوں کے لئے سب کچھ بھول گیا۔ وہ بہت ہی خوبصورت تھی مگر اس وقت نہانے کے بعد ہلکا میک اپ کر کے لیڈی چسٹر کوٹ میں ملبوس وہ بالکل سامان آرائش کی دکانوں کا ماڈل معلوم ہو رہی تھی۔ مگر اس کے چہرے پر تیوریاں دیکھ کر مجھے خیال ہوا کہ ایک اجنبی کو اپنے کمرے میں دیکھ کر اسے غصہ آ گیا تھا خاص طور پر اس وجہ سے کہ سارے کمرے میں تمام سامان انتہائی بے ترتیبی سے بکھرا پڑا تھا۔

"میں چلتا ہوں۔ پھر آپ سے ملوں گا۔" وہ انگریزی میں بہت ہی گڑبڑ میں یہ کہہ کر چلتا بنا اور میں صرف دروازے کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا۔

"یہ کون تھا۔ کیوں آیا تھا؟" اپنی خفگی چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے نسیمہ نے پوچھا مگر میں نے اپنی لاعلمی اور حیرت کا اظہار کیا۔

"بدمعاش ہے۔ کل رات کو ڈائننگ ہال میں برابر مجھ کو گھورے جا رہا تھا اور صبح بھی اس نے گالف کلب سے ہوٹل تک میرا پیچھا کیا۔"

"مبارک ہو آپ کے عشاق بڑھ رہے ہیں۔ پر یہ بیچارہ۔ مگر بھئی میں کسی سے خواہ مخواہ کی ڈوئل لڑنے کو تیار نہیں ہوں۔"

"میں خود ہی صورت حال سے نپٹ لوں گی۔" وہ بدستور خفگی سے بولی۔

جب ہم اپنے کمرے سے نیچے آئے اور ڈائننگ ہال میں ناشتے کی میز پر بیٹھے تو نسیمہ دوبارہ شگفتگی پر مائل ہو چکی تھی۔ میں بھی بظاہر اطمینان سے سگریٹ پینے میں مشغول تھا مگر میرا خیال بار بار اس خوبصورت لڑکے کی طرف ہی تھا۔ مگر یہ کہنا ٹھیک تھا کہ وہ بدمعاش تھا تو وہ اتنا جری کبھی بھی

نہیں ہو سکتا تھا کہ میرے کمرے میں مجھ سے ملاقات کرنے آ پہونچا تھا جیسے اس کے چہرے سے شرافت برس رہی تھی۔ اور صاف معلوم ہوتا تھا کہ اس کا تعلق کسی بڑے گھرانے سے تھا۔

جب ہم گھوڑوں پر سوار ہو کر ہوٹل کی طرف روانہ ہو رہے تھے تو مجھ کو اس کی ایک جھلک اور دکھائی دی وہ پیدل گالف کورس کی طرف سے مڑ کر بازار جانے والی سڑک کی طرف دھیرے دھیرے جا رہا تھا۔

دن بھر کی تفریحات اور پر فضا خوش نما پہاڑوں کے دامن میں گھومتے ہوئے اور نسیمہ کے ساتھ شادی سے پہلے کی باتیں کرتے ہوئے مجھ کو اس کا بالکل خیال نہ آیا۔ دن بھر کی تفریح سے نسیمہ بہت تھک گئی اور ہوٹل کے کمرے میں پہونچتے ہی وہ بستر پر آرام کے لئے ایسی لیٹی کہ فوراً ہی گہری نیند سو گئی۔ میں نے اس کو جگانا مناسب نہ سمجھا اور کھانے کے لئے اکیلا ہی ڈائننگ روم چل دیا۔ وہاں دو تین جاننے والے سیاح مل گئے اور میں ان سے دیر تک دنیا زمانے کی باتیں بگھارتا رہا۔ جب ہجوم کچھ کم ہوا اور میں اکیلا کھانے بیٹھ کر رہ گیا کہ نجانے کہاں سے شنکر میرے پاس آ گیا اور بغیر میری اجازت لئے میری ہی میز پر بیٹھ گیا۔ میں نے چاہا کہ کچھ بد دماغی اور ترش روئی سے کام لوں مگر اس کا دل کش چہرہ دیکھ کر یہ خواہش ہوئی کہ اس سے باتیں کی جائیں۔

"آپ کی وائف کھانے پر نہیں آئیں" اس نے بچوں کی سی معصومیت سے پوچھا۔

"کیا آپ کو ان کو جانتے ہیں"۔ بہت ہی بے اختیارانہ طور پر میرا لہجہ کچھ تیز ہو گیا۔

"نہیں۔ مگر میں ان کو بہت پسند کرتا ہوں" یہ جملہ بہت ہی بے باکی کے ساتھ اس نے انگریزی میں کہا۔

میں کچھ عجیب سناٹے میں آ گیا۔ اگر وہ اتنا دلکش اتنا معصوم اور اتنا بے باک نہ ہوتا تو شاید اس وقت ڈائننگ ہال میں کوئی غیر خوشگوار واقعہ ہو جاتا مگر میں اس کو خاموشی سے دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ میرے ذہنی و اعصابی خم و پیچ کا اندازہ لگاتے ہوئے بولا "اس کے لئے ہی میں صبح آپ سے معافی مانگنے آیا تھا"۔

میں اب بھی کچھ نہ بولا۔ مجھے شاک کے ڈرامے اور موپاساں کی وہ کہانیاں یاد آنے لگیں۔ جن میں کم عمر لڑکے بیاہتا عورتوں سے معاشقے کرتے ہیں یہ سب کچھ پڑھتے ہوئے مجھ کو بڑا مزہ آتا تھا اور خود میں بھی تو مسز بخشی کے بارے میں عجیب عجیب سے ایسے ویسے تصورات رکھتا تھا۔ مگر پھر بھی وہ سب انگلینڈ اور فرانس کی باتیں ہیں۔ اور میں نے تو مسز بخشی پر کبھی کبھی کچھ نہ ظاہر ہونے دیا یہ ان صاحبزادے کو کیا سوجھی کہ نہ صرف میری نئی نویلی بیوی کا پیچھا کیا بلکہ اس کے شوہر سے یعنی یہ کہ اس خاکسار سے اپنے عشق کا اعتراف کرنے آ پہونچے۔ "شوہر بیوی"۔ یہ الفاظ ذہن میں آتے ہی مجھ کو کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔ ابھی چار پانچ مہینے قبل میں خود ایک طالب علم تھا اور شادی ہی کے سلسلے میں قانون کا فائنل کا امتحان چھوڑ گیا تھا اور نسیمہ۔ نسیمہ تو اب بھی کسی اسکول کی کوئی طالبہ ہی معلوم ہوتی تھی۔ اس کو بیوی کہنا تو بڑا ظلم تھا۔ یہ سب باتیں میرے ذہن میں چند منٹوں کے اندر آتی رہیں اور وہ لڑکا میز پر رکھے ہوئے کانٹے کی نوک سے کھیلتا رہا۔

"آپ کیا کرتے ہیں کہیں پڑھتے ہیں"۔ میں نے موضوع بدلنا چاہا۔

"میں نے سینئر کیمبرج کے بعد پڑھنا چھوڑ دیا۔ نیوی جوائن کر رہا ہوں۔ جلد ہی ٹریننگ پر چلا جاؤں گا"۔ اب وہ بڑے اطمینان سے باتیں کرنے لگا جیسے ہم دونوں دوست ہو گئے ہوں اور ایک دوسرے کے بارے میں جاننے کے مشتاق ہوں۔

"یہاں کیسے آنا ہوا"۔

وہ کچھ خاموش ہوا۔ پھر بڑی پھیکی مسکراہٹ سے بولا۔ "یوں ہی گھومنے"۔

"یا عشق لڑانے اور دل بہلانے"۔ نہ جانے کیوں یہ گھٹیا الفاظ میرے منہ سے پھسل پڑے۔ اصل میں ہر انسان کے ذہن کے کسی گوشے میں کینہ اور حسد جیسے جذبات کہیں نہ کہیں ضرور پوشیدہ رہتے ہیں۔ اور اکثر اوقات ان کا غیر شعوری طور پر بے محل مظاہرہ ہو جاتا ہے۔ اس دلکش اور کم عمر

لڑکے نے کچھ ایسی نظروں سے مجھے دیکھا کہ باوجود سردی کے مجھے پسینہ آگیا اور میں اپنے گھٹیا پن پر تاسف کرنے لگا۔ یہ کہتے ہوئے اٹھ گیا "آپ نے غلط سمجھا ـــ"

تھوڑی دیر تک تو میں نے اپنے کو ملامت کی مگر پھر اپنی لیلیٰ کا جواز بڑی عقلیت پسندی سے دینے لگا۔ ٹھیک ہے مگر وہ بھی تو بدمعاش ہے۔ بتائیے بھلا آپ کو پہاڑ کی سیر کے لئے آنا تھا تو صرف اس خاکسار ہی کی بیوی پر عاشق ہونے کی کیا ضرورت تھی اور ہو بھی جائے تو کوئی آپ کو منع نہیں کر سکتا۔ ارے آپ کیا ساری دنیا عشق کرنے لگے تو بھی میں کیا بگاڑ سکتا ہوں۔ کسی کو بھی عشق سے نہیں روکا جا سکتا۔ مگر ان صاحبزادے کو مجھ سے آکر کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ صریحاً حرمزدگی ہے ـــ اتنی موٹی سی گالی اس خوبصورت لڑکے کے بارے میں سوچتے ہی میں پھر نادم ہو گیا۔

اپنے کمرے میں پہونچتے ہی میں نے دروازہ بند کر دیا اور صوفے پر پڑا ہوا نہ معلوم کیا کیا فضول سی باتیں سوچتا رہا۔ آتش دان میں آگ جل رہی تھی۔ اس بند کمرے میں بڑی خوشگوار گرمی تھی ورنہ باہر سے پورا ہوٹل گھرے بادلوں کی دبیز ردا میں ملبوس تھا اور شاید ہلکا ترشح بھی ہو رہا تھا۔ آتش دان میں لکڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ڈالتے ہوئے میرا خیال اچانک بنارس کی گرمی کی طرف گیا۔ جہاں خدا جانے گوربچن سنگھ مینیبا اور بردا گرمی سے بوکھلائے ہوئے شام ہی سے رکشوں پر لد کر سارناتھ جاتے ہوں گے اور وہاں کھلی ہوا میں ہندوستان کی آزادی اور گاندھی جی کی تحریکات کے موضوعات پر گرم گرم بحثیں کرتے ہوں گے۔ ان کو کیا معلوم کہ یہاں سردی سے دانت بج رہے ہیں۔ یہ سوچتے سوچتے میں ہنس پڑا۔ نسیمہ شاید مجھ کو دیکھ رہی تھی اس لئے حیرانی سے بولی "کیوں ہنسے ـــ"

" تم جاگ رہی ہو ـــ؟"

" میں بڑی دیر سے آپ کو یونہی سوچتے دیکھ رہی ہوں۔"

" مجھے ان صاحبزادے پر ہنسی آ رہی ہے۔ وہ ابھی ڈائننگ ہال میں ملے تھے اور کہہ رہے تھے کہ مجھے آپ کی بیوی سے لو ہو گیا ہے ـــ" یہ بات میں نے یونہی بڑھا کر کہی۔

نسیمہ ہنسی اور پھر غصے میں بولی "آپ نے کچھ تواضع بھی کی ان کی ـــ!"

" میں کیا کر سکتا ہوں، کوئی آدمی اگر آپ کے عشق میں مبتلا ہے تو دنیا کے کس قانون کی رو سے میں اس کو روک سکتا ہوں۔ دوسری بات یہ کہ میں اس لڑکے میں کچھ اپنی پرچھائیں دیکھتا ہوں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ جری ہے اور میں ہمیشہ سے بزدل رہا ہوں۔ تیسری بات یہ کہ آپ کے ماضی سے مجھے اچھی طرح واقفیت نہیں ہے اس لئے بھی کچھ کہتے ڈرتا ہوں۔ اور آخری بات یہ کہ وہ آپ کو چاہتا ہے اور میں آپ کو چاہتا ہوں اس لئے میں آپ کے چاہنے والے کو بھی چاہتا ہوں۔"

تیسری بات تو میں نے نسیمہ کو چڑھانے کے لئے کہی تھی۔ مگر اس کی شدت کم کرنے کے لئے میں نے فوراً چوتھی بات کہی یہ اس کو خوش کرنے اور بڑی بہار کے ساتھ اس کو مسکرانے پر مجبور کرنے کے لئے کہی تھی۔

" ہونہہ آپ کی باتیں بھی انوکھی ہوتی ہیں کوئی آدمی آپ سے آپ کی بیوی کی تعریف کرے تو کیا آپ کو برا نہیں لگے گا۔"

" کیا ضرورت ـــ ہاں اگر وہ آپ کے بارے میں الزام تراشیوں سے کام لے تو شاید میں A W of 9 ROTS کی کسی ضمنی دفعہ کے تحت کچھ کارروائی کر سکوں۔" (میں نے عرض کیا نا کہ میں نے قانون کا امتحان ادھورا چھوڑ دیا تھا اسی وجہ سے قانون سے اپنی اکلوتی واقفیت کا ذکر نا میں نے بہت ہی برموقع اور مناسب خیال کیا)

" بہرحال اب اگر وہ صاحبزادے تشریف لائے تو اب کے میں خود ان کے مزاج پوچھوں گی۔" نسیمہ نے جھک آکر کہا۔

" نہیں نہیں بھئی۔ کوئی ایسی ویسی بات نہ کر بیٹھنا کہ خواہ مخواہ کا کوئی اسکینڈل کھڑا ہو جائے ـــ" مجھے خیال آیا کہ متوسط درجے کی عورتیں اکثر اوقات اپنے بالائی

کے اظہار کے لئے ایسے غیر شریفانہ افعال پر اتر آتی ہیں کہ اور بھی رسوائی اور جگ ہنسائی ہوتی ہے۔"

نسیمہ سے اور مجھ سے اس مسئلے پر کئی بار تیز و ترش گفتگو بھی ہوئی جس نے ہماری رخصت کی دلچسپی میں خاصی کبیدگی پیدا کر دی۔ میں نے اس پر سنجیدگی سے غور کرنے سے انکار کر دیا جبکہ نسیمہ چاہتی تھی کہ میں شنکر کے ساتھ سختی سے پیش آؤں۔ وہ تمام دن بلا کسی خاص شگفتگی یا تفریح اور مسرت کے ایسا لگتا تھا جیسے ایک کانٹا تھا جو رہ رہ کر ہم سب کو چبھ رہا تھا۔ نسیمہ کو زیادہ الجھن اور کوفت اس بات کی تھی اس کا شوق سے پہاڑوں کی تفریح کا بنایا ہوا پروگرام ہوگیا تھا۔ مجھ کو اس سے اس سلسلے میں ہمدردی تھی۔ مگر میں اس سے بھی ہمدردی محسوس کر رہا تھا کہ میرا سارا پیسہ مفت ہی میں برباد ہو رہا تھا کاش میں کسی اور پہاڑی جگہ پر چلا جاتا۔ یہ خیال مجھ کو بار بار آتا۔ اس کے علاوہ مجھ کو شنکر سے بھی ہمدردی تھی جو معلوم نہیں بیٹھے بٹھائے کس خبط کا شکار ہوگیا تھا۔ میں نے اس کو ہر جگہ دیکھا۔ جہاں کہیں میں نے نسیمہ کے ساتھ نکلتا پاس یا دور کہیں نہ کہیں شنکر ضرور مل جاتا۔ گو اب وہ مجھ سے ملتا نہیں تھا۔ تھک ہار کر یا یوں کہئے کہ بور ہو کر ہم وقت سے پہلے واپسی کا پروگرام بنالیا۔

جس دن ہم چلنے والے تھے وہ سارا دن تمام سامان سمیٹنے کچھ خریداری کرنے اور روانگی کا انتظام کرنے میں گذرا۔ سہ پہر کے وقت کافی ہاؤس میں مجھ کو شنکر مل گیا میں خود اس سے ملا غالباً وہ بھی ملنا چاہتا تھا اس لئے اس کو اپنے ساتھ لے کر میں ایک نسبتاً غیر آباد ریسٹوران میں چلا گیا۔ گرم کافی پیتے پیتے میں نے اس کو اپنے روانگی کے پروگرام سے مطلع کیا۔ اور باتوں باتوں میں میں نے کہا "اچھا یہ سب ڈرامہ کرنے سے آپ کا مقصد کیا تھا۔"

اس نے مجھ کو ایک عجیب انداز سے دیکھا بالکل ایسے ہی کوئی سمجھدار شخص کسی بچے کو دیکھ کر کہے۔ "بھئی تم نہیں سمجھتے۔" مگر درحقیقت وہ چپ رہا پھر کہا۔ "آج ہم لوگ جا رہے ہیں اگر آپ کہیں تو میں آپ کو اپنی بیوی سے متعارف کرا دوں۔ آپ خود ان سے بات کر لیجئے اور آپ دونوں جو فیصلہ کریں گے مجھے منظور ہوگا۔"

وہ پھر بھی کچھ نہ بولا بلکہ گرم کافی پیتا ہوا نہ معلوم کیا سوچتا رہا آخر میں جب میں نے اس سے ہوٹل چلنے کو کہا تو وہ نہ مانا اور اکیلا ہی کسی طرف چل دیا۔

اس روز ہم ایک ذاتی موٹر گاڑی سے واپس میدانوں کی طرف چل دیئے۔ جس دوست کی گاڑی تھی اس کا ملازم ڈرائیور پہاڑوں کی سیاحت و سیاحوں کے بارے میں نہ معلوم کیا کیا قصہ سناتا رہا۔ گو نسیمہ شاید دلچسپی سے سن رہی تھی۔ مگر میرا دھیان صرف ایک ہی طرف تھا شنکر کی طرف۔ ایک نامعلوم سا گھراؤ، میرے دل کو کچھ اس طرح ٹھنڈے اور گہرے بادلوں میں ڈھکے ہوئے تھا جس میں سے چھن کر سورج کی کوئی سنہری خوشگوار کرن آتی معلوم ہی نہ ہو رہی تھی۔

رات کو ہم لوگ ایک نسبتاً غیر آباد اور گمنام گاؤں کے ڈاک بنگلے میں ٹھہرے۔ میں تھکا ہوا تھا۔ گرم بستر بچھنے کا انتظار کئے بغیر صوفے پر اک کمبل تان کر سو گیا۔ نسیمہ دیر تک کچھ لکھتی رہی۔

کوئی دس گیارہ بجے کے قریب آہستہ آہستہ باتوں کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ باہر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے اور گھٹا ٹوپ اندھیرا طاری تھا۔ میرے کمرے میں صرف ایک شمع جل رہی تھی۔ مگر ڈرائنگ میں جہاں نسیمہ کسی سے باتیں کر رہی تھی بڑی پرانی وضع کا ایک فانوس جل رہا تھا۔ مجھے خیال ہوا کہ نسیمہ چوکیدار سے باتیں کر رہی ہے یا ڈرائیور اپنی نہ ختم ہونے والی کہانی سنا رہا ہے۔ مگر نسیمہ کا لہجہ کچھ درشت تھا جس سے مجبور ہو کر میں نے کمرے کے پردے کی آڑ میں ہو کر ڈرائنگ میں جھانکا شنکر کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اسی لڑکپن اور لاپروائی کے انداز سے جس میں کہ وہ پہلی بار میرے کمرے میں آیا تھا۔ اس کو دیکھ کر میرے ذہن کے سارے تار ایک ساتھ جیسے جھن جھنا اٹھے۔ "کیا نسیمہ اس سے متاثر تو نہیں ہوگئی ہے؟" یہ خیال آتے ہی میرے پورے بدن میں ایک سرد لہر سی دوڑتی معلوم ہوئی۔ اور اپنی تمام ترقی پسندی کے باوجود میں غصہ میں پاگل سا ہو اٹھا۔ مگر اس وقت صرف خاموشی سے سب کچھ دیکھتے رہنا ہی مناسب سمجھا۔ شنکر بہت ہی آہستگی سے نسیمہ کو اپنی دماغی کیفیت

کا حال بتا رہا تھا۔ وہ معذرت بھی کر رہا تھا۔ معافی بھی مانگ رہا تھا۔ اور نسیمہ خاموشی سے بیٹھی ہوئی یہ سب کچھ سن رہی تھی۔

"تو تم آخر مجھ سے چاہتے کیا ہو؟" نسیمہ نے بڑی درشتی سے پوچھا۔ "تم کو معلوم ہے کہ میں شادی شدہ ہوں۔ دوسری شادی نہیں کر سکتی۔ میرا شوہر میرا خود پسند کیا ہوا ہے۔ کوئی جبر و ظلم کی بات بھی نہیں ہے کہ میں اس کو چھوڑ دوں۔ اور پھر یہ کہ تمہارا صرف دماغ خراب ہے۔ جاؤ کوئی ڈھنگ کا کام کرو۔"

نسیمہ کے الفاظ سے مجھے قدرے سکون کے آثار نمودار ہوئے اور میں نے سارے منظر میں بڑی ڈرامائی دلچسپی محسوس کی۔

"آپ میری ایک خواہش پوری کر دیں۔"

نسیمہ نے کچھ سوچا اور پھر بولی "بولو۔ جو کچھ مجھے منظور ہے۔ مگر پھر تم کو بھی میری ایک خواہش پوری کرنا ہوگی۔"

"شوق سے جو آپ جو کہئے گا مجھے منظور ہوگا۔" شنکر نے بشاشت سے کہا۔ پھر اس نے جیب سے ایک انگوٹھی نکالی اور بولا یہ میں آپ کے ہاتھ میں دیکھنا چاہتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ بچوں کی طرح شرم سے سرخ بھی ہو گیا۔

نسیمہ نے بڑے میکانکی انداز میں انگوٹھی لے لی ہاتھ کی چوتھی انگلی میں پہنی۔ شنکر نے کہا کہ وہ ہاتھ کو روشنی کے رخ پر کرے۔ نسیمہ کئی منٹ تک اٹھا ہاتھ اٹھائے ہوئے روشنی کے رخ پر کئے رہی اور شنکر غور سے اس کی گوری گوری انگلی میں انگوٹھی کی خوبصورتی دیکھنے لگا۔

ایکدم وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں وہ بولا "بس جی۔ میں جاؤں گا۔ تھینک یو۔ ہاں آپ کیا کہہ رہی تھیں۔"

"میں ــ میں ــ" نسیمہ نے کچھ سوچا اور پھر شاید جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو بولی "اب تم ڈاک بنگلے کی روش سے چپ چاپ نیچے کھائی میں پھاند پڑو"

"آپ سنجیدگی سے کہہ رہی ہیں۔" شنکر نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں ــ پوری سنجیدگی سے اب کبھی تمہارا منحوس چہرہ میں دیکھنا بھی پسند نہیں کروں گی۔"

شنکر نے ایک منٹ غور سے نسیمہ کو دیکھا اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے شاید وہ اتنے سخت الفاظ سننے کے لئے تیار نہیں تھا۔ وہ چپ چاپ کمرے سے باہر نکل گیا۔ باہر اس نے روش کی فصیل پر کھڑے ہو کر ایک دفعہ خوفناک اندھیری کھائی کی طرف دیکھا اور پھر اس کمرے کی طرف جس میں سے فانوس کی روشنی چھن کر آ رہی تھی۔ اپنے کمرے سے میں دیکھ رہا تھا اور ڈرائنگ روم سے نسیمہ اس نے صرف نسیمہ کے کمرے کی طرف دیکھا اور چپ چاپ نیچے کود پڑا اس نے صرف ایک ہی لفظ کہا "انیتا۔"

"ارے" بیساختہ میرے منہ سے نکلا میں دوڑ کر باہر نکلا مگر چاروں طرف اندھیرا تھا گھٹا ٹوپ ــ گھور اندھیرا۔

نسیمہ خاموش بت بنی ہوئی ایک ہی انداز میں ــ باہر کی طرف دیکھے جا رہی تھی، وہ مجھے اس وقت اتنی ذلیل اور اتنی کمین معلوم ہو رہی تھی کہ میں نے اس سے بات بھی نہ کی اور چپ چاپ صوفے پر بیٹھا رہ گیا۔ معلوم نہیں کب اس حالت میں صبح ہو گئی۔

ان باتوں کو ایک زمانہ گذر چکا ہے۔ ہم میں ــ کبھی اس بارے میں کوئی ذکر بھی نہ ہوا۔ دونوں کے دلوں میں جیسے چور تھا۔ اس لئے ہم پہاڑ پر بنی ہوئی ان کا ذکر ہمیشہ کسی نہ کسی طرح ٹال دیتے۔ معلوم ہوتا تھا جیسے ہم دونوں میں کوئی غیر تحریری قسم کا معاہدہ ہو چکا ہو کہ ہم ایک دوسرے کو کبھی اس بارے میں نہیں چھیڑیں گے۔

برس بیتتے چلے گئے۔

درمیانی مدت میں ہزاروں دلچسپ اور غیر معمولی واقعات پیش آئے۔ بہت سے ایسے مواقع بھی آئے جب ہم میں ــ کسی معمولی سی بات پر خاصی کشیدگی ہو گئی۔ بہت بار ایسا ہوا کہ اس نے میری بے رخی کی شکایت کی۔ متعدد بار اس نے اپنی قسمت کا گلہ کیا کہ کیسے ناقدرے انسان سے اس کا پالا پڑا تمام مشکلوں، طعنوں، اشتعال انگیزیوں یا محبتوں کے باوجود ہم میں کبھی ان دنوں کا ذکر نہ آیا۔ میری تو رائے تھی کہ ایک عام خود غرض عورت کی طرح نسیمہ

کے اظہار کے لئے ایسے غیر شریفانہ افعال پر اتر آتی ہیں کہ اور بھی رسوائی اور جگ ہنسائی ہوتی ہے۔"

نسیمہ سے اور مجھ سے اس مسئلے پر کئی بار تیز و ترش گفتگو بھی ہوئی جس نے ہماری رخصت کی دلچسپی میں خاصی کبیدگی پیدا کر دی۔ میں نے اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کرنے سے انکار کر دیا جبکہ نسیمہ چاہتی تھی کہ میں شنکر کے ساتھ سختی سے پیش آؤں۔ وہ تمام دن بلا کسی خاص شگفتگی یا تفریح اور مسرت کے ایسا لگتا تھا جیسے ایک کانٹا تھا جو رہ رہ کر ہم سب کو چبھ رہا تھا۔ نسیمہ کو زیادہ الجھن اور کوفت اس بات کی تھی اس کا شوق سے پہاڑوں کی تفریح کا بنایا ہوا پروگرام برباد ہو گیا تھا۔ مجھکو اس سے اس سلسلے میں ہمدردی تھی۔ مگر میں اس سے بھی ہمدردی محسوس کر رہا تھا کہ میرا سارا پیسہ مفت ہی میں برباد ہو رہا تھا کاش میں کسی اور پہاڑی جگہ پر چلا جاتا۔ یہ خیال مجھ کو بار بار آتا۔ اس کے علاوہ مجھ کو شنکر سے بھی ہمدردی تھی جو معلوم نہیں بیٹھے بٹھائے کس خبط کا شکار ہو گیا تھا۔ میں نے اس کو تقریباً ہر جگہ دیکھا۔ جہاں کہیں میں نے نسیمہ کے ساتھ نکلتا پاس یا دور کہیں نہ کہیں شنکر ضرور مل جاتا گو اب وہ مجھ سے ملتا نہیں تھا۔ تھک ہار کر یا یوں کہئے کہ بور ہو کر ہم نے وقت سے پہلے واپسی کا پروگرام بنا لیا۔

جس دن ہم چلنے والے تھے وہ سارا دن تمام سامان سمیٹنے کچھ خریداری کرنے اور روانگی کا انتظام کرنے میں گذرا۔ سہ پہر کے وقت کافی ہاؤس پر مجھ کو شنکر مل گیا میں خود اس سے ملا غالباً وہ بھی ملنا چاہتا تھا اس لئے اس کو اپنے ساتھ لے کر میں ایک نسبتاً غیر آباد ریسٹوران میں چلا گیا۔ گرم کافی پیتے پیتے میں نے اس کو اپنے روانگی کے پروگرام سے مطلع کیا۔ اور باتوں باتوں میں میں نے کہا "اچھا یہ سب ڈرامہ کرنے سے آپ کا مقصد کیا تھا"

اس نے مجھ کو ایک عجیب انداز سے دیکھا بالکل ایسے ہی کوئی سمجھدار شخص کسی بچے کو دیکھ کر کہے "بھئی تم نہیں سمجھتے" مگر درحقیقت وہ چپ رہا پھر کہا "آج ہم لوگ جا رہے ہیں اگر آپ کہیں تو میں آپ کو اپنی بیوی سے متعارف کرا دوں۔ آپ خود ان سے بات کر لیجئے اور آپ دونوں جو فیصلہ کریں گے مجھے منظور ہوگا۔"

وہ پھر بھی کچھ نہ بولا بلکہ گرم کافی پیتا ہوا نہ معلوم کیا سوچتا رہا آخر میں جب میں نے اس سے ہوٹل چلنے کو کہا تو وہ نہ مانا اور اکیلا ہی کسی طرف چل دیا۔

اس روز ہم ایک ذاتی موٹر گاڑی سے واپس میدانوں کی طرف چل دیئے۔ جس دوست کی گاڑی تھی اس کا ملازم ڈرائیور پہاڑوں کی سیاحت در سیاحوں کے بارے میں نہ معلوم کیا کیا قصے سناتا رہا۔ گو نسیمہ شاید دلچسپی سے سن رہی تھی۔ مگر میرا دھیان صرف ایک ہی طرف تھا شنکر کی طرف۔ ایک نامعلوم سا گہراؤ، میرے دل کو کچھ اس طرح ٹھنڈے اور گہرے بادلوں میں ڈھکے ہوئے تھا جس میں سے چھن کر سورج کی کوئی سنہری خوشگوار کرن آتی معلوم ہی نہیں ہو رہی تھی۔

رات کو ہم لوگ ایک نسبتاً غیر آباد اور گمنام گاؤں کے ڈاک بنگلے میں ٹھہرے۔ میں تھکا ہوا تھا۔ گرم بستر بچھنے کا انتظار کئے بغیر میں نے پرانا کمبل تان کر سو گیا۔ نسیمہ دیر تک کچھ لکھتی رہی۔

کوئی دس گیارہ بجے کے قریب آہستہ آہستہ باتوں کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ باہر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے اور گھٹا ٹوپ اندھیرا طاری تھا۔ میرے کمرے میں صرف ایک شمع جل رہی تھی۔ مگر ڈرائنگ میں جہاں نسیمہ کسی سے باتیں کر رہی تھی بڑی پرانی وضع کا ایک فانوس جل رہا تھا۔ مجھے خیال ہوا کہ نسیمہ چوکیدار سے باتیں کر رہی ہے یا ڈرائیور اپنی نہ ختم ہونے والی کہانی سنا رہا ہے۔ مگر نسیمہ کا لہجہ کچھ درشت تھا جس نے مجبور ہو کر میں نے کمرے کے پردے کی آڑ میں ہو کر ڈرائنگ میں جھانکا شنکر کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اسی لڑکپن اور لاپروائی کے انداز سے جس میں کہ وہ پہلی بار میرے کمرے میں آیا تھا۔ اس کو دیکھ کر میرے ذہن کے سارے تار ایک ساتھ جیسے جھن جھنا اٹھے "کیا نسیمہ اس سے متاثر نہیں ہو گئی ہے؟" یہ خیال آتے ہی میرے پورے بدن میں ایک سرد لہر سی دوڑتی معلوم ہوئی۔ اور اپنی تمام ترقی پسندی کے باوجود میں غصہ میں پاگل سا ہو اٹھا۔ مگر اس وقت صرف خاموشی سے سب کچھ دیکھتے رہنا ہی مناسب سمجھا۔ شنکر بہت ہی آہستگی سے نسیمہ کو اپنی دماغی کیفیت

کا حال بتا رہا تھا۔ وہ معذرت بھی کر رہا تھا۔ معافی بھی مانگ رہا تھا۔ اور نسیمہ خاموشی سے بیٹھی ہوئی یہ سب کچھ سن رہی تھی۔

"تو تم آخر مجھ سے چاہتے کیا ہو؟" نسیمہ نے بڑی درشتی سے پوچھا۔ "تم کو معلوم ہے کہ میں شادی شدہ ہوں۔ دوسری شادی نہیں کر سکتی۔ میرا شوہر میرا خود پسند کیا ہوا ہے۔ کوئی جبر و ظلم کی بات بھی نہیں ہے کہ میں اس کو چھوڑ دوں۔ اور پھر یہ کہ تمہارا صرف دماغ خراب ہے۔ جاؤ کوئی ڈھنگ کا کام کرو۔"

نسیمہ کے الفاظ سے مجھے قدرے سکون کے آثار نمودار ہوئے اور میں نے سارے منظر میں بڑی ڈرامائی دلچسپی محسوس کی۔

"آپ میری ایک خواہش پوری کر دیں۔"

نسیمہ نے کچھ سوچا اور پھر بولی۔ "بولو۔ جو کچھ مجھے منظور ہے۔ مگر پھر تم کو بھی میری ایک خواہش پوری کرنا ہوگی۔"

"شوق سے جو آپ جو کہئے گا مجھے منظور ہوگا۔" شنکر نے بشاشت سے کہا۔ پھر اس نے جیب سے ایک انگوٹھی نکالی اور بولا "میں آپ کے ہاتھ میں دیکھنا چاہتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ بچوں کی طرح شرم سے سرخ بھی ہو گیا۔

نسیمہ نے بڑے جیکھے انداز میں انگوٹھی لے کر ہاتھ کی چوتھی انگلی میں پہنی۔ شنکر نے کہا کہ وہ ہاتھ کو روشنی کے رخ پر کرے۔ نسیمہ کئی منٹ تک اسی طرح ہاتھ اٹھائے ہوئے روشنی کے رخ پر کئے رہی اور شنکر غور سے اس کی گوری گوری انگلی میں انگوٹھی کی خوبصورتی دیکھنے لگا۔

ایکدم وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں وہ بولا۔ "بس جی۔ میں جاؤں گا۔ تھینک یو۔ ہاں آپ کیا کہہ رہی تھیں۔"

"میں۔۔۔ میں۔۔۔" نسیمہ نے کچھ سوچا اور پھر شاید جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو بولی۔ "اب تم ڈاک بنگلے کی روش سے چپ چاپ نیچے گھاٹی میں پھاند پڑو۔"

"آپ سنجیدگی سے کہہ رہی ہیں۔" شنکر نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔ پوری سنجیدگی سے۔ اب کبھی تمہارا منحوس چہرہ میں دیکھنا بھی پسند نہیں کروں گی۔"

شنکر نے ایک منٹ غور سے نسیمہ کو دیکھا اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے شاید وہ اتنے سخت الفاظ سننے کے لئے تیار نہیں تھا۔ وہ چپ چاپ کمرے سے باہر نکل گیا۔ باہر اس نے روش کی فصیل پر کھڑے ہو کر ایک دفعہ خوفناک اندھیری گھاٹی کی طرف دیکھا اور پھر اس کمرے کی طرف جس میں سے فانوس کی روشنی چھن کر آ رہی تھی۔ اپنے کمرے سے میں دیکھ رہا تھا اور ڈرائنگ روم سے نسیمہ۔ اس نے صرف نسیمہ کے کمرے کی طرف دیکھا اور چپ چاپ نیچے کود پڑا۔ اس نے صرف ایک ہی لفظ کہا "اینتا"۔

"ارے" بیساختہ میرے منہ سے نکلا میں دوڑ کر باہر نکلا مگر چاروں طرف اندھیرا تھا گھٹاٹوپ۔ گھور اندھیرا۔

نسیمہ خاموشی بت بنی ہوئی ایک ہی انداز میں۔۔۔ باہر کی طرف دیکھے جا رہی تھی وہ مجھے اس وقت اتنی ذلیل اور اتنی کمین معلوم ہو رہی تھی کہ میں نے اس سے بات بھی نہ کی اور چپ چاپ صوفے پر بیٹھا رہ گیا۔ معلوم نہیں کب اس حالت میں صبح ہو گئی۔

ان باتوں کو ایک زمانہ گذر چکا ہے۔ ہم میں۔۔۔ کبھی اس بارے میں کوئی ذکر بھی نہ ہوا۔ دونوں کے دلوں میں جیسے چور تھا۔ اس لئے ہم پہاڑوں پر جانے کا ذکر ہمیشہ کسی نہ کسی طرح ٹال دیتے۔ معلوم ہوتا تھا جیسے ہم دونوں میں کوئی غیر تحریری قسم کا معاہدہ ہو چکا ہو کہ ہم ایک دوسرے کو کبھی اس بارے میں نہیں چھیڑیں گے۔

برس بیتتے چلے گئے۔

درمیانی مدت میں ہزاروں دلچسپ اور غیر معمولی واقعات پیش آئے۔ بہت سے ایسے مواقع بھی آئے جب ہم میں۔۔۔ کسی معمولی سی بات پر خاصی کشیدگی ہو گئی۔ بہت بار ایسا ہوا کہ اس نے میری بے رخی کی شکایت کی۔ متعدد بار اس نے اپنی قسمت کا گلہ کیا کہ کیسے ناقدرے انسان سے اس کا پالا پڑا لیکن تمام مشکلوں، طعنوں، اشتعال انگیزیوں یا محبتوں کے باوجود ہم میں کبھی ان دنوں کا ذکر نہ آیا۔ میری تو رائے تھی کہ ایک عام خودغرض عورت کی طرح نسیمہ بھی

شنکر کے واقعے کو ذہن کی ہر سطح سے فراموش کر چکی ہے۔ تاہم میں نے ایک دو بار نہیں بلکہ کئی بار شدت سے جذباتی موقعوں پر اس کو یاد کیا۔ وہ کون تھا کس گھرانے کا تھا۔ کہاں سے آیا تھا۔ اس کے گھر والوں پر اس کی پراسرار گمشدگی سے کیا گزری ہو گی! یہ سب سوچتے ہوئے میرے ذہن میں اس کی خوبصورت اور جیتی جاگتی شبیہ آجاتی۔ اور اپنے تصور ہی تصور میں میں اس شبیہ پر آنسوؤں کی جے مالا چڑھاتا۔

میں اس بات کا قائل ہوں کہ مرد کا قربانی کا جذبہ عورت سے زیادہ دیرپا اور بھرپور ہوتا ہے۔ صرف کسی ایک عورت کے عارضی حسن کی خاطر سب کچھ قربان کر دینے کا جذبہ ہر دور اور ہر زمانے میں رہا ہے۔ اور اس کی لاتعداد مثالیں فنون لطیفہ کے شہپاروں کی شکل میں آج بھی تہذیب انسانی کا انمول ترین خزینہ ہیں۔ برخلاف اس کے عورتوں کا کوئی ایسا کارنامہ نہیں ملتا ہے۔ وہ ہر زمانے اور ہر رنگ و نسل میں محض اپنے عارضی حسن کو زیادہ سے زیادہ آرام دہ ماحول میں رکھنے کی کوشش میں لطیف ترین جذبات کو ٹھکراتی ہیں یہ فنکاروں کی حماقتیں ہوتی ہیں کہ وہ اپنے باکمال اور عدیم النظیر شہپارے عورتوں کے فانی حسن کے نام پر معنون کر دیتے ہیں، گویا یہ جفا پیشہ عورتیں ہر طرح فائدہ میں رہتی ہیں۔ زندگی میں ہر شبستان کے دروازے ان کے لئے کھلے رہتے ہیں۔ اور تمام ممکن آرام اور آسائشیں ان کے لئے فراہم کی جاتی ہیں اور مرنے کے بعد یہ فنکاروں کے تخیلات اور فن پاروں کے ذریعے زندہ جاوید ہو جاتی ہیں۔ وہ گمنام اور پھٹے حالوں رہنے والے شاعر و مصور اور افسانہ نویس جن کا یہ مغرور عورتیں نوٹس بھی نہیں لیتیں، اپنی تخلیقات کے ذریعے ان کو امر بنانے میں مصروف رہتے ہیں۔ یہ ہر دور کا المیہ ہے کہ شیریں ہر زمانہ میں پرویز کے عشرت کدوں میں محو طرب رہتی ہے۔ جبکہ اس کو بقائے دوام دلانے والا کوہکن ہر عہد اور ہر ملک و قوم میں تیشہ زنی پر مجبور رہتا ہے۔

میں ان باتوں کے بارے میں حال ہی میں ذرا شدت سے سوچنے لگا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھ کو حال ہی میں خالد کے کئی خط ملے ہیں جن میں اس نے مختلف طریقوں سے مجھ سے دنیا میں محبت کی ضرورت پر بحث کی ہے۔ اس نے ایک خط میں لکھا ہے کہ محبت ایک اہم سماجی ضرورت ہے۔ میں نے سنجیدگی سے اس کی رائے سے اتفاق کیا ہے اور اکثر اوقات ہم دونوں میں اختلاف رائے بھی رہا ہے

دفتر سے آتے ہی معلوم ہوا کہ خالد یہاں آگیا ہے اور ابھی نہا کر سویا ہے۔ میں نے نسیمہ سے کچھ تفصیل پوچھنا چاہی۔ مگر اس نے تشویش سے صرف اتنا ہی کہا کہ کہہ رہا تھا کہ دو دن کی چھٹی لے کر آگیا ہوں۔ "کچھ بہت پریشان لگتا ہے۔"

نسیمہ کا خیال تھا کہ کالج میں کسی سے جھگڑا ہو گیا ہے یا کوئی پیسے کی ایسی کوئی فوری ضرورت آپڑی ہے کہ وہ خود مانگنے آگیا ہے۔ میں نے شرارت آمیز لہجے میں کہا "صاحبزادے کو عشق ہو گیا ہے کسی سے معلوم ہوتا ہے۔"

وہ ایکدم برا مان کر بولی "ہنہہ، آپ کو تو ایسی ہی سوجھتی ہے۔"

میں خالد کے کمرے میں گیا وہ آنکھیں کھولے برابر چھت کو دیکھے جا رہا تھا۔ مجھ کو دیکھتے ہی اٹھ بیٹھا۔ "آگئے آپ" وہ کچھ شرمندہ شرمندہ سا بھی تھا۔ مگر میں نے ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں اور وہ باقاعدگی سے میرے سوالوں کے جواب دیتا رہا۔

باتوں باتوں میں خود خالد ہی اصل موضوع کی طرف آگیا اور اس نے بہت ہی باغی اور سرپھرے انداز میں کہا کہ وہ بغیر سحاب کے زندہ نہیں رہ سکتا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر تم سحاب میں دلچسپی رکھتے ہو اور وہ بھی تم سے متاثر ہے تو پھر تم میرے پاس کیوں آئے ہو۔ تم دونوں مل کر جو فیصلہ کرو گے وہ مجھ کو بھی منظور ہو گا۔" مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ نسیمہ دروازے سے لگی ہوئی ہم دونوں کی باتیں سن رہی تھی۔

"بات اتنی آسان نہیں ہے" خالد نے اصل مشکل کی طرف مجھ کو متوجہ کرایا "اصل میں سحاب کا رویہ کچھ واضح نہیں ہے۔ میرے خیال میں وہ اپنے گھر والوں کے خلاف شاید نہ جاسکے۔ اور اس کے گھر والوں سے بات چیت کی نوعیت ذرا مختلف ہو گی۔"

"میں تمہارا مطلب سمجھ گیا۔ مگر اس سلسلے میں میرا دلچسپی لینا قطعی مناسب نہیں ہو گا۔ پہلی بات تو یہ کہ ہماری تمہاری بے تکلفی کچھ دوستوں کی قسم کی ہے اور دنیا والے دو باپ بیٹوں میں اس طرح کی مفاہمت اور بے تکلفی کو شاید کچھ زیادہ اچھی نظر سے نہ دیکھیں۔"

"مگر ڈیڈی آپ ہی تو دنیا والوں کو گولی مارنے کی تلقین کرتے ہیں۔"

"ہاں جہاں تک میری سوچ کبھی اُسے کا تعلق ہے تو دنیا والوں کے بارے میں میرا رویہ یقیناً ایسا ہی رہتا ہے مگر یہ معاملہ ایسا ہے جس میں صرف میری رائے زیادہ دور تک نہیں جا سکتی۔ خیر چھوڑو ــــ ہاں سحاب کے گھر والوں سے میری کوئی واقفیت نہیں ہے۔ جو حال تم نے بتایا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ لوگ خاصے پیسے والے اور اس کی بنا پر کچھ بددماغ لوگ ہیں۔ بہرحال اگر میں کسی ذریعے سے بات چیت کا کوئی سلسلہ نکالوں تو اس کی نوعیت بڑی باضابطہ اور باقاعدہ ہوگی۔ اس صورت میں دو سوال اٹھیں گے جن کے جواب فی الحال میرے پاس نہیں ہیں۔ اول یہ کہ لڑکے کی یعنی تمہاری عمر صرف بیس برس کی ہے اس قدر کم عمری میں شادی کی عجلت کا کیا جواز ہے۔ دوسری بات اس سلسلے میں یہ اٹھے گی کہ تم ابھی پڑھ رہے ہو تعلیم مکمل کئے بغیر شادی کا کیا تک دوسرے یہ کہ لڑکے کا مستقبل کیا ہے۔ یہ وہ زمانہ تو ہے نہیں کہ میں لوگوں کو یہ کہہ کر مطمئن کر دوں کہ گھر میں اللہ کا دیا بہت کچھ ہے۔ یہاں اللہ کا دیا اول تو کچھ ہے نہیں اور اگر ہو بھی تو لوگ آج کل لڑکی دیتے وقت لڑکے کے گھر والوں کی حیثیت نہیں بلکہ خود لڑکے کا مستقبل دیکھتے ہیں۔ اگر تمہارا خیال فارن سروس میں جانے کا ہے جس کے لئے تم شروع ہی سے کہہ رہے ہو تو تم کو کچھ ضرورت سے زیادہ محنت کرنا ہوگی۔ اگر تم نے شادی کر بھی لی تو ایسی صورت میں تمہارا فارن سروس کا خیال تشنۂ تکمیل رہے گا۔ کیونکہ شادی اور اس کی ذمہ داریاں تم کو مقابلے کی تیاری کا وقت ہی نہ دیں گی۔ یہ بات میں صاف صاف نہ صرف ایک دوست اور ایک باپ کی حیثیت سے کہہ رہا ہوں بلکہ ایسا کہتے وقت میرے سامنے خود سحاب کی خوشی و مسرت کا بھی سوال ہے۔ تم یہ فرض کر سکتے ہو کہ یہی باتیں کسی لڑکی کا باپ بھی کہہ سکتا ہے۔"

خالد چپ رہا۔ جس سے مجھے یہ اندازہ نہ ہو سکا کہ وہ میری رائے سے اتفاق کر رہا ہے یا اختلاف۔

"مگر پھر بھی جذبات کی منزل پر میں تمہارا رفیق ہوں ــــ" میں نے پھر کہنا شروع کیا۔ "ان معنوں میں کہ تم سحاب کو گھر والوں کی مرضی کے خلاف شادی کرنے پر رضامند کر لو۔ اگر وہ تمہارے ساتھ بھاگ کر یہاں آ جائے تو میں بصد شوق تم دونوں کا استقبال کروں گا۔ اور ایسی صورت میں وہ تمام مشکلیں جو میں نے دلائل کی شکل میں تمہارے سامنے پیش کی ہیں خود بخود حل ہو جائیں گی۔"

خالد "بھگانے" کے لفظ پر چونکا اور حیرت سے بولا "ڈیڈی ــ آپ ــ"

"ہاں ہاں میں ــ" میں نے پوری سنجیدگی سے کہا۔ "میں تم کو اکسا رہا ہوں کہ تم سحاب کو بھگا لاؤ۔ پھر میں باقاعدہ کچہری میں مقدمے کے لئے تیار رہوں گا۔"

خالد سوچ میں پڑ گیا۔ اس کے چہرے پر بڑی شرارت آمیز مسکراہٹ ابھری اور اس نے معنی خیز نظروں سے مجھ کو تولا۔ میں نے پھر سنجیدگی سے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ محبت اور جنگ میں سب روا ہے۔"

خالد میری باتوں سے خوش ہو گیا۔ اسے کامیابی کا کچھ کچھ یقین پیدا ہو چلا تھا۔ اس نے پوری دلچسپی سے رات کا کھانا کھایا اور صبح سویرے ہی کی گاڑی سے واپس یونیورسٹی کے لئے چل دیا۔

نسیم بظاہر میری باتوں سے ناراض تھی۔ لیکن خالد کو خوش دیکھ کر وہ بھی مطمئن ہو گئی۔ صرف میرے دل میں چور تھا۔ نہ معلوم کیوں دل آپ ہی آپ بیٹھا جا رہا تھا۔

درمیانی مدت میں وہی سب کچھ ہوا جو ہر دور اور ہر زمانے میں اور ہر ملک اور ہر قوم میں ہوتی آئی ہے۔ میرے لئے کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ مگر خالد کے لئے ضرور جیسے زمین آسمان کے نظام میں زبردست فرق پڑ گیا تھا۔ ہوا یہ کہ ایک متوسط درجے کے نوکری پیشہ باپ کے لڑکے خالد میں سحاب کو کچھ زیادہ کشش نظر نہیں آئی وہ کسی اور متمول ہم جماعت کی طرف متوجہ ہو گئی۔ "شہریار ــ یہ مجھے شہریار ہے... ریاست کی معزول رانی کا لڑکا ہے۔ یہ رانی یہاں سیاسی پناہ گزین ہے۔ رانی صاحبہ کے پاس اتنے قیمتی جواہرات اور نایاب پتھر ہیں کہ ان سے میرے جیسے کتنوں کو خرید کر غلاموں کی ایک پوری فوج تیار کی جا سکتی ہے۔" خالد نے نہ معلوم کن جذبات کے تحت مجھ کو خط لکھا۔

میں امتحان کے دنوں میں وہ دل شکن کے احساس کے ساتھ بہت ہی تھکا تھکا سا واپس گھر آ گیا۔ میں نے کچھ بھی نہیں کہا۔ امتحان میں شرکت کے لئے بھی زور

نہیں دیا بلکہ رات کو اپنے ساتھ ہی اس کو ایک پرانی تاریخی فلم دکھانے لے گیا۔ رات گئے تک دنیا زمانے کی بات کرتے ہوئے میں نے اس کو اپنی مخصوص فلا
ھائی "یہ عورتیں فانی ہیں ان کا حسن فانی ہے چند سالوں کے بعد تم سحاب کی طرف نظر ڈالنا بھی گوارا نہ کروگے اور تم کو یقین ہوگا کہ ایک زندگی جو تم کو
یک ہی بار اپنے طور پر گذارنے کے لئے دی گئی تھی۔ تم نے کس غلط فہمی کی نذر کر دی۔" اور پھر میں نے باتوں باتوں میں اس کو پیار دل پر بیتی ہوئی کا ایک پر
ا وبیش بیس برس پرانا قصہ بھی سنایا۔ مجھ کو اس کی فکر نہیں تھی کہ نسیمہ حسب دستور کمرے کے دروازے سے لگی ہماری باتیں سن رہی ہے۔

"وہ عورت کون تھی۔" خالد نے انتہائی حقارت اور غصے سے پوچھا۔

"نسیمہ — تمہاری ماں — میں نے کہا۔

خالد دنگ رہ گیا۔ صرف اتنا ہوا کہ وہ پلنگ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا جیسے اس کو یقین نہ آرہا ہو۔

اور اس وقت نسیمہ اندر آگئی اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اس نے آتے ہی خالد کو گلے لگا لیا۔ "میرے لعل۔ میرے بیٹے —" نسیمہ ایسے اس
نی گودی میں چھپائے لے رہی تھی جیسے کوئی ابھی خالد کو اس کی گود سے چھین لے جائے گا — مگر خالد صرف ایک ہی بات پوچھ رہا تھا۔ "کیوں ممی کی
یہ سچ ہے۔"

"ہاں —" روتے ہوئے ہچکیوں کے بیچ میں نسیمہ نے کہا۔

دوسرے دن صبح ہوتے ہی خالد ماں سے ملے بغیر واپس الہ آباد چلا گیا۔

نسیمہ خاموش خاموش ہر کمرے میں ٹہلتی رہتی ہے۔ ہر دروازے اور ہر دریچے سے باہر خالی خالی نگاہوں سے نہ معلوم کیا گھورا کرتی ہے
ماری بات چیت بند ہے۔ جیسے ہم ایک دوسرے کے سامنے مجرم ہوں۔ اس کو خیال ہے کہ میں نے خالد کو ہمیشہ کے لئے اس سے برگشتہ کر دیا ہے۔
مجھے صرف ایک ہی اطمینان ہے۔ میں نے وجے شنکر کو ایک بار پھر کسی گہری خوفناک گھاٹی میں پھاندنے سے بچا لیا ہے۔

ردو کی پہلی کتاب — حصہ اول تا چہارم — مصنفہ محمد حسین آزاد۔ مرتبہ ڈاکٹر اسلم فرخی — ۵،۰۰
رنگ خیال — (ادب و تنقید) — ″ ″ مقدمہ ″ — ۳،۲۵
نقیدی نقوش — ″ — مصنفہ ڈاکٹر عبدالقیوم — ۳،۷۵
صول تنقید — ″ — ″ لیسل ایبر کرومبی۔ مترجمہ عبدالسلام — ۲،۵۰
ئی زہر عشق اور اس کے نقاد — ″ — ″ محمد حسن — ۵،۷۵
ردو رباعی — ″ — ″ ڈاکٹر فرمان فتح پوری۔
تحقیق و تنقید ڈاکٹر فرمان فتحپوری — ۴،۰۰
حاجی بغلول — (طنز و مزاح) — ″ منشی سجاد حسین۔ مقدمہ جمیل جالبی — ۴،۵۰
لٹ پھیر — ″ — ″ شوکت تھانوی — ۳،۰۰
بے زبان دوست — بچوں کا ناول — ″ انور عنایت اللہ — ۱،۵۰
محصول ڈاک بذمہ خریدار
فہرست کتب بلا قیمت
پتا: مشتاق بک ڈپو۔ شیلڈن روڈ — کراچی ۱

جاوید لطفی

صبا۔ حیدرآباد دکن

کاروبار

جب کریا نے مجھے دو روپے واپس لا کر دیے تو مجھے بہت حیرت ہوئی۔ یہ دو روپے میں نے اُسے اُس کے ایک عزیز کی موت پر کفن دفن کے لیے چندہ میں دیے تھے۔ دو روپے لوٹاتے وقت کریا کے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ تھی جو خوشی کی ہی ہو سکتی تھی۔ مجھے تعجب تھا کہ اس کے گھر میں کسی کے مر جانے پر بھی اس کی ایسی کیفیت کیوں ہے؟ اور اُس نے میرے روپے واپس کیوں لوٹا دیے ہیں۔ شاید وہ میرا مطلب سمجھ گیا تھا۔ ہنستے ہوئے کہنے لگا۔

"بابو صاحب، میں خوشی سے یہ روپے لوٹا رہا ہوں۔ آپ ناراض نہ ہوں، اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔"

"لیکن کریا — میں نے یہ روپے اچھے مقصد کے لیے دیے تھے۔ اور تم انھیں واپس کر کے میری نیکیوں کو گھٹا رہے ہو۔"

"اچھی، کہاں کا مقصد بابو صاحب.... بس رہنے دیجیے۔" کریا نے تلخی آمیز انداز سے ہنستے ہوئے کہا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم! — کسی غریب کی میت عزت سے ٹھکانے لگوانا اچھا مقصد نہیں ہے کیا۔ اور پھر مرنے والا تمھارا اپنا رشتہ دار بھی تو تھا۔" میں نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"پیسے دیے تھے لیکن..... لیکن....." اور یہ کہتے کہتے کریا کچھ ہچکچا گیا۔ جانے کیا سوچ کر اُس نے جملہ پورا نہیں کیا۔

"کیا بات ہے آخر کہو نہ صاف صاف، یقیناً تم ایسے آدمی نہیں ہو کہ اس میت کے سلسلے میں کچھ گول مال کر سکو۔ .....کیا وہ..... وہ......"

اور کریا نے بیچ ہی میں میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"اسی لیے تو بابو جی میں وہ.... دو روپے لوٹا رہا ہوں۔ رہی میت تو وہ آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔ چادر اٹھا کر نعش کا معائنہ میں نے ہی کروایا تھا۔ حالانکہ آپ اس کے لیے تیار نہیں تھے۔ لیکن نعش کا معائنہ کرانے کے اصرار میں ایک راز یہ بھی تھا، کہ آپ کے ساتھ دوسرے لوگ بھی اچھی طرح مردے کو دیکھ لیں۔ اور تسلی کر لیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میت کے متعلق کوئی گول مال نہیں تھا۔"

"تو پھر آخر کیا بات ہے — کیا میرے روپے اس لائق نہیں تھے کہ ... کسی کی موت مٹی میں لگائے جا سکیں۔ آخر بات کیا ہے؟"

"کچھ نہ کچھ بات ضرور ہے بابو جی۔ لیکن سردست میں اس کی وضاحت نہیں کرنا چاہتا۔" یہ کہہ کر اور میرے سامنے رکھ کر کریا تیزی سے چلا گیا۔

کریا کا اصلی نام کریم ہوگا، عبدالکریم، سید کریم یا شاید کریم خاں۔ لیکن لوگ اُسے کریا ہی پکارتے تھے۔ اور وہ بھی اپنا نام کریا ہی بتاتا تھا۔ وہ مفلوک الحال اور بے حد غریب آدمی تھا۔ میری وساطت سے اُسے کہیں عارضی ملازمت مل جایا کرتی تھی۔ نہ جانے کیوں مجھے اُس سے ہمدردی تھی۔ گو مجھے اس کا صحیح نام اور اُس کا اتا پتا تک نہیں معلوم تھا۔ تاہم اتنا علم ضرور تھا کہ وہ درگاہ شریف کے قریب کئی بے گھر لوگوں کے ساتھ کسی ایک جھونپڑے میں رہتا ہے۔ اس کے لواحقین میں کون کون تھے اور کیا کرتے تھے کچھ خبر نہ تھی۔ سرِراہ ایک دن مجھ سے بھیک مانگی تھی تو میں نے یوں ہی کہہ دیا تھا کہ کوئی کام کیوں تلاش نہیں کرتے۔ بھیک مانگنا ٹھیک نہیں۔ کہنے پر اُس نے بھیک میں دیے ہوئے پانچ پیسے کا سکہ فوراً لوٹا دیا تھا۔ اور کہا تھا کہ بابو صاحب آپ ہی مجھے کوئی کام دلا دیجیے۔ خود بھیک مانگنا پسند نہیں کرتا۔ اور اُس کی یہ حرکت مجھے بھلی معلوم ہوئی تھی۔ جب میں نے استفسار کیا تو مجھے پتہ چلا کہ وہ لکھا پڑھا نہیں ہے۔ اور صحتِ جسمانی کے اعتبار سے وہ فوج یا پولیس میں بھرتی ہونے کے قابل بھی نہیں ہے۔ ہنر اُسے کچھ آتا جاتا نہ تھا۔ کرتا تو کیا کرتا۔ پھر میں نے کچھ سوچ کر اُسے ایک خط کے ساتھ اپنے ایک دوست کے پاس بھیج دیا تھا۔ جو گورنمنٹ ایمپلائمنٹ ایکسچینج میں ملازم تھا۔ خط میں میں نے یہی سفارش کی تھی کہ وہ اس غریب آدمی کے لیے روزگار کی کوئی سبیل نکالے۔ چنانچہ میرا دوست جب بھی موقع ملتا اور کریا کے لائق کوئی کام نکلتا تو ضرور اس کا خیال رکھتا تھا۔ اور اس کا نام لسٹ میں شریک کروا کر اُسے کہیں ملازمت دلوایا کرتا تھا۔ گو یہ نوکری عارضی ہوتی تھی۔ لیکن اس سے کچھ عرصہ کے لیے کریا کی بے روزگاری دور ہو جایا کرتی تھی۔

شاید ادھر بہت عرصہ سے کریا کو کوئی نوکری نہیں ملی تھی۔ ایک دو بار حالتِ پریشانی میں وہ مجھ سے ملا بھی تھا اور پوچھنے پر اُس نے یہ بتلایا تھا کہ وہ ایمپلائمنٹ اکسچینج کے دفتر اکثر جاتا ہے۔ لیکن ادھر بہت دنوں سے اس کے لائق کوئی کام نہیں۔ ہاں، اس کے کارڈ کی وقت پر تجدید ہو جایا کرتی تھی۔ اور بس.....

کریا ایسی صورت میں یقیناً بھیک پر گزارہ کرتا ہوگا۔ لیکن اس نے مجھ سے کبھی کچھ طلب نہیں کیا۔ جب بھی مجھے وہ دُور نزدیک دکھائی دیا۔ پریشان ہی نظر آیا۔

جب صبح میں بازار سے گزر رہا تھا تو فٹ پاتھ کی ایک طرف میں نے کچھ لوگوں کا ہجوم دیکھ کر اپنا بائیسکل روک لیا تھا۔ اِ دیکھنے کے لیے کہ کیا بات ہے، قریب گیا تھا۔ وہاں میں نے کریا کو روتی صورت بنائے بیٹھا دیکھا تھا۔ اور کچھ لوگ ایک طرف پڑے ہوئے مردے کے کفن دفن کے لیے چندہ جمع کر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر کریا فوراً اُٹھ کھڑا ہوا تھا اور قریب آ کر کہنے لگا تھا۔

"بابو صاحب میرے ایک بوڑھے عزیز چل بسے ہیں۔ ہمارے ہوتے بھی لاش لاوارث ہے۔ اس لیے کہ وارثوں میں لاش ٹھکانے لگانے کی سکت ہی نہیں ہے۔ کھانے کے لیے ہی کچھ نہیں تو کفن دفن کیسے ہو سکے گا۔ ہم خود زندہ لاشیں ہیں۔ اور اب مردہ عزیز کو بازار میں لے آئے ہیں اور چندہ کر رہے ہیں۔.."

کریا کے کہنے پر میں نے فوراً دو روپے جیب میں سے نکالے تھے۔ اور جو صاحب روپے اکٹھا کر رہے تھے انھوں نے میرے ہاتھ سے روپے لے کر ایک تھالی میں ڈال لیے تھے۔ اور چندہ دہندگان کی فہرست میں میرا نام شریک کر لیا تھا۔ نام نوٹ کرتے کرتے انھوں نے کریا سے کہا تھا۔

"کریا ــــ بابو جی کو میت دکھا دو ــــ"

میں نے میت کا دیدار کرنے سے انکار کیا تھا۔ لیکن کریما کے مجبور کرنے پر اور کئی لوگوں کے ساتھ میں نے بھی میت دیکھی
ایک بوڑھے کی تھی۔ شاید بے چارہ کوئی طویل اور جانکاہ بیماری کاٹنے کے بعد انتقال کر گیا تھا۔۔۔۔ افسوس۔۔۔۔
صبح کے اس واقعہ کے بعد سہ پہر کے وقت کریما نے مجھے گھر پر میرے دان دھرم میں دیے ہوئے دو روپے واپس کر
تھے۔ اور مجھے حیرت واستعجاب میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس کے چلے جانے کے بعد میں سوچ میں پڑ گیا تھا کہ آخر وہ کیا بات
بن کی وضاحت کرنے سے کریما نے انکار کر دیا تھا۔۔۔۔۔ اسی تشویش میں کچھ دیر مبتلا رہ کر پھر میں اپنے روزمرہ کے کاموں
ے گیا۔
رات کو حسب معمول جب میں ایرانی کی ہوٹل سے چائے پی کر اور دوستوں سے گپ شپ کر کے گھر واپس ہو رہا تھا تو
نہ کے چوراہے کے پاس مجھے کچھ دُور ایک آدمی نشہ میں بہک کر لڑکھڑاتا اور بڑبڑاتا دکھائی دیا۔ نہ جانے وہ کسے گالیاں
رہا تھا۔
جب میں قریب پہنچا تو توقع نہیں تھی کہ وہ کریما ہوگا۔ جو اس قدر گندے کردار کا آدمی ثابت ہوگا۔ میں نے سوچا کہ شاید
ار میں نے اُسے اس عالم میں دیکھا ہے، ہوسکتا ہے کہ وہ پرانا شرابی ہو، اور میرے مشاہدے میں پہلی بار اُس کی یہ حرکت آئی ہو۔
زور ہے کہ نہ جانے کیوں وہ مجھے جب بھی ملتا تھا ایک اچھا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اس سے ملنے کا پہلا اتفاق ہی میرے لیے
ز ثابت ہوا تھا۔ اُس نے میری بھیک کے پیسے لوٹا دیے تھے۔ اور کوئی جائز کام یا محنت کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ میرے
نٹ ایکسچینج کے دفتر والے دوست کی رائے بھی اُس کے متعلق اچھی ہی تھی۔ کریما جہاں کہیں کام کرنے جاتا تھا ایک اچھا ریکارڈ
کر آتا تھا۔ لیکن آج ۔۔۔۔۔ اس وقت ۔۔۔۔۔ وہ ہاتھ بھیٹی کی اوزاں شراب پی کر بہکا ہوا پھر رہا تھا۔۔۔۔ اس کے تعلق سے میرا
دمجروح ہو گیا تھا۔ ہوسکتا ہے میں نے اُسے سمجھنے میں غلطی کی ہو۔ میں نے سوچا۔ بہت سے لوگوں کا ظاہر کچھ ہوتا ہے
طن کچھ۔۔۔ بعض لوگ اپنے چہروں کی معصومیت کے باوجود بڑے کمینے ثابت ہوتے ہیں۔ بعض لوگ ہوتے ہی نالائق ہیں
اپنے آپ کو شرافت کے جھوٹے لبادے میں چھپائے رہتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے اس وقت میرے سامنے کریما ظاہر
ا تھا۔
میں نے اس سے بچ کر نکل جانے کی کوشش کی۔ لیکن جہاں کریما کھڑا تھا وہاں سڑک کے دونوں طرف بجلی کے کھمبے
۔ اور اتنے حصے میں سڑک اور فٹ پاتھ پر خوب روشنی پھیلی ہوئی تھی۔
مجھے گزرتے ہوئے اُس نے دیکھ ہی لیا۔
"بابوجی ۔۔۔۔ بابو صاحب ۔۔۔۔ ایک منٹ ۔۔۔۔ صرف ایک منٹ ۔۔۔۔"
کریما نے لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ، لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں مجھ سے کہا۔ اور میرے پاس آگیا۔ اس وقت رات کے
۔ ۹ بج چکے تھے۔ سڑک پر سوائے آنے جانے والوں کے، خواہ مخواہ رکنے اور تماشا دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ اگر یہی شام
نت ہوتا تو آس پاس کے رہنے بسنے والوں، آباد سڑکوں پر گزرنے والوں کا ہجوم سا ہو جاتا۔ لیکن اس وقت ایسا ہجوم
، ہو سکتا تھا۔ ورنہ ایک بہکے ہوئے شرابی کے ساتھ میرا بھی ایک تماشا ہی بن جاتا۔
"کیا ہے کریما ؟۔۔۔ جاؤ گھر جا کر سو جاؤ۔ اس وقت مجھے بھی جلدی ہے۔"
میں نے اُس سے پیچھا چھڑانے کے لیے کہا۔

"کچھ نہ کچھ بات ضرور ہے بابو جی۔ لیکن بردست میں اس کی وضاحت نہیں کرنا چاہتا۔" یہ کہہ کر اور میرے سامنے دورو رکھ کر کریا تیزی سے چلا گیا۔

کریا کا اصلی نام کریم ہوگا، عبدالکریم، سید کریم یا شاید کریم خاں۔ لیکن لوگ اُسے کریا ہی پکارتے تھے۔ اور وہ بھی اپنا یہی نام بتاتا تھا۔ وہ مفلوک الحال اور بے حد غریب آدمی تھا۔ میری وساطت سے اُسے کہیں عارضی ملازمت مل جایا کرتی تھی۔ نہ جانے کیوں مجھے اُس سے ہمدردی تھی۔ گو مجھے اس کا صحیح نام اور اُس کا اتا پتا تک نہیں معلوم تھا۔ تاہم اتنا علم ضرور تھا کہ وہ درگاہ شریف کے پیچھے کئی بے گھر لوگوں کے ساتھ کسی ایک جھونپڑے میں رہتا ہے۔ اس کے لواحقین میں کون کون تھے اور کیا کرتے تھے کچھ خبر نہ تھی۔ کریا نے سر راہ ایک دن مجھ سے بھیک مانگی تھی تو میں نے یوں ہی کہہ دیا تھا کہ کوئی کام کیوں تلاش نہیں کرتے۔ بھیک مانگنا ٹھیک نہیں۔ میرے کہنے پر اُس نے بھیک میں دیے ہوئے پانچ پیسے کا سکہ فوراً لوٹا دیا تھا۔ اور کہا تھا کہ بابو صاحب آپ ہی مجھے کوئی کام دلا دیجیے۔۔ میں خود بھیک مانگنا پسند نہیں کرتا۔ اور اُس کی یہ حرکت مجھے بھلی معلوم ہوئی تھی۔ جب میں نے استفسار کیا تو مجھے پتہ چلا کہ وہ لکھا پڑھا نہیں ہے۔ اور صحتِ جسمانی کے اعتبار سے وہ فوج یا پولیس میں بھرتی ہونے کے قابل بھی نہیں ہے۔ ہنر اُسے کچھ آتا جاتا نہ تھا۔ واقعی وہ کرتا تو کیا کرتا۔ پھر میں نے کچھ سوچ کر اُسے ایک خط کے ساتھ اپنے ایک دوست کے پاس بھیج دیا تھا۔ جو گورنمنٹ ایمپلائمنٹ ایکسچینج میں ملازم تھا۔ خط میں میں نے یہی سفارش کی تھی کہ وہ اس غریب آدمی کے لیے روزگار کی کوئی سبیل نکالے۔ چنانچہ میرا دوست جب بھی موقع ملتا اور کریا کے لائق کوئی کام نکلتا تو ضرور اس کا خیال رکھتا تھا۔ اور اس کا نام لسٹ میں شریک کروا کر اُسے کہیں نہ کہیں ملازمت دلوایا کرتا تھا۔ گو یہ نوکری عارضی ہوتی تھی۔ لیکن اس سے کچھ عرصہ کے لیے کریا کی بے روزگاری دور ہو جایا کرتی تھی۔

شاید ادھر بہت عرصہ سے کریا کو کوئی نوکری نہیں ملی تھی۔ ایک دو بار حالتِ پریشانی میں وہ مجھ سے ملا بھی تھا اور میرے پوچھنے پر اُس نے یہ بتلایا تھا کہ وہ ایمپلائمنٹ ایکسچینج کے دفتر اکثر جاتا ہے۔ لیکن ادھر بہت دنوں سے اس کے لائق کوئی کام نہیں نکلا تھا۔ ہاں، اس کے کارڈ کی وقت پر تجدید ہو جایا کرتی تھی۔ اور بس .....

کریا ایسی صورت میں یقیناً بھیک پر گزارہ کرتا ہوگا۔ لیکن اس نے مجھ سے کبھی کچھ طلب نہیں کیا۔ جب بھی مجھے وہ دُور یا نزدیک دکھائی دیا۔ پریشان ہی نظر آیا۔

جب صبح میں بازار سے گزر رہا تھا تو فٹ پاتھ کی ایک طرف میں نے کچھ لوگوں کا ہجوم دیکھ کر اپنا بائیسکل روک لیا تھا۔ اور یہ دیکھنے کے لیے کہ کیا بات ہے، قریب گیا تھا۔ وہاں میں نے کریا کو رونی صورت بنائے بیٹھا دیکھا تھا۔ اور کچھ لوگ ایک طرف رکھے ہوئے مردے کے کفن دفن کے لیے چندہ جمع کر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر کریا فوراً اُٹھ کھڑا ہوا تھا اور قریب آ کر کہنے لگا تھا۔

"بابو صاحب میرے ایک بوڑھے عزیز چل بسے ہیں۔ ہمارے ہوتے بھی لاش لاوارث ہے۔ اس لیے کہ وارثوں میں لاش ٹھکانے لگانے کی سکت ہی نہیں ہے۔ کھانے کے لیے ہی کچھ نہیں تو کفن دفن کیسے ہو سکے گا۔ ہم خود زندہ لاشیں ہیں۔ اور اپنے مردہ عزیز کو بازار میں لے آئے ہیں اور چندہ کر رہے ہیں۔"

کریا کے کہنے پر میں نے فوراً دو روپے جیب میں سے نکالے تھے۔ اور جو صاحب روپے اکٹھا کر رہے تھے انھوں نے میرے ہاتھ سے روپے لے کر ایک تھالی میں ڈال لیے تھے۔ اور چندہ دہندگان کی فہرست میں میرا نام شریک کر لیا تھا۔ نام نوٹ کرتے کرتے انھوں نے کریا سے کہا تھا۔

"کریا ـــــ بابو جی کو میت دکھا دو ـــــ"

میں نے میت کا دیدار کرنے سے انکار کیا تھا۔ لیکن کریما کے مجبور کرنے پر اور کئی لوگوں کے ساتھ میں نے بھی میت دیکھی
ں ایک بوڑھے کی تھی۔ شاید بے چارہ کوئی طویل اور جانکاہ بیماری کاٹنے کے بعد انتقال کر گیا تھا۔۔۔۔ افسوس۔۔۔۔

صبح کے اس واقعہ کے بعد سہ پہر کے وقت کریما نے مجھے گھر پر میرے دان دھرم میں دیے ہوئے دو روپے واپس کر
یے تھے۔ اور مجھے حیرت و استعجاب میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس کے چلے جانے کے بعد میں سوچ میں پڑ گیا تھا کہ آخر وہ کیا بات
ی جس کی وضاحت کرنے سے کریما نے انکار کر دیا تھا۔۔۔۔۔۔ اسی تشویش میں کچھ دیر مبتلا رہ کر پھر میں اپنے روزمرہ کے کاموں
لگ گیا۔

رات کو حسب معمول جب میں ایرانی کی ہوٹل سے چائے پی کر اور دوستوں سے گپ شپ کر کے گھر واپس ہو رہا تھا تو
خانہ کے چوراہے کے پاس مجھے کچھ دُور ایک آدمی نشہ میں بہک کر لڑکھڑاتا اور بڑبڑاتا دکھائی دیا۔ نہ جانے وہ کسے گالیاں
ے رہا تھا۔

جب میں قریب پہنچا تو توقع نہیں تھی کہ وہ کریما ہوگا۔ جو اس قدر گندے کردار کا آدمی ثابت ہوگا۔ میں نے سوچا کہ شاید
ی بار میں نے اُسے اس عالم میں دیکھا ہے، ہو سکتا ہے کہ وہ پرانا شرابی ہو، اور میرے مشاہدے میں پہلی بار اُس کی یہ حرکت آئی ہو۔
امزور ہے کہ نہ جانے کیوں وہ مجھے جب بھی ملتا تھا ایک اچھا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اس سے ملنے کا پہلا اتفاق ہی میرے لیے
انگیز ثابت ہوا تھا۔ اُس نے میری بھیک کے پیسے لوٹا دیے تھے۔ اور کوئی جائز کام یا محنت کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ میرے
بلائمنٹ ایکسچینج کے دفتر والے دوست کی رائے بھی اُس کے متعلق اچھی ہی تھی۔ کریما جہاں کہیں کام کرنے جاتا تھا ایک اچھا ریکارڈ
وڑ کر آتا تھا۔ لیکن آج۔۔۔۔۔ اس وقت۔۔۔۔۔ وہ ہاتھ بھٹی کی ارزاں شراب پی کر بہکا ہوا پھر رہا تھا۔۔۔۔ اس کے تعلق سے میرا
تبار مجروح ہو گیا تھا۔ ہو سکتا ہے میں نے اُسے سمجھنے میں غلطی کی ہو۔ میں نے سوچا۔ بہت سے لوگوں کا ظاہر کچھ ہوتا ہے
رباطن کچھ۔۔۔ بعض لوگ اپنے چہروں کی معصومیت کے باوجود بڑے کمینے ثابت ہوتے ہیں۔ بعض لوگ ہوتے ہی نالائق ہیں
لیکن اپنے آپ کو شرافت کے جھوٹے لبادے میں چھپائے رہتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے اس وقت میرے سامنے کریما ظاہر
ہو گیا تھا۔

میں نے اس سے بچ کر نکل جانے کی کوشش کی۔ لیکن جہاں کریما کھڑا تھا وہاں سڑک کے دونوں طرف بجلی کے کھمبے
ے۔ اور اتنے حصّے میں سڑک اور فٹ پاتھ پر خوب روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

مجھے گزرتے ہوئے اُس نے دیکھ ہی لیا۔

"بابوجی۔۔۔۔ بابو صاحب۔۔۔۔۔ ایک منٹ۔۔۔۔۔ صرف ایک منٹ۔۔۔۔"

کریما نے لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ، لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں مجھ سے کہا۔ اور میرے پاس آ گیا۔ اس وقت رات کے
بارہ بج چکے تھے۔ سڑک پر سوائے آنے جانے والوں کے، خواہ مخواہ رکنے اور تماشا دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ اگر یہی شام
وقت ہوتا تو آس پاس کے رہنے بسنے والوں، آباد سڑکوں پر گزرنے والوں کا ہجوم سا ہو جاتا۔ لیکن اس وقت ایسا ہجوم
یں ہو سکتا تھا۔ ورنہ ایک بہکے ہوئے شرابی کے ساتھ میرا بھی ایک تماشا ہی بن جاتا۔

"کیا ہے کریما؟۔۔۔ جاؤ گھر جا کر سو جاؤ۔ اس وقت مجھے بھی جلدی ہے۔"

میں نے اُس سے پیچھا چھڑانے کے لیے کہا۔

"میں ...... میں بابو جی ...... آپ کا زیادہ وقت ..... نہیں لوں گا ..... میری بات سن لیجیے ..... آپکے دو روپے والی بات۔"
اس کے یہ کہنے پر واقعی مجھے بریک سا لگ گیا۔ آخر وہ بات کیا ہوگی۔ میری تشویش جو سو گئی تھی، پھر جاگ اٹھی۔ میت کے چندے کا راز جاننے کی جستجو اور بھی تیز ہو گئی۔

"تو آؤ ذرا اس طرف چلیں وہ سامنے بند دکان کا چبوترا ہے اس پر جا بیٹھیں گے۔"

"بابو جی ..... بڑی مہربانی ہوگی ..... چلیے .... !"

ہم دونوں کچھ قدموں کے فاصلے پر ذرا ذرا اُجالے میں چبوترے پر جا بیٹھے۔ کریا اپنے جس دشمن کو گالیاں دے رہا تھا
ار بک بک کر رہا تھا مجھے دیکھتے ہی چپ ہو گیا تھا۔ میرے سامنے وہ ہمیشہ باادب بننے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ اور اس وقت بھی
ں کی نیت ایسی ہی تھی۔ لیکن دارو کی وجہ سے اُس سے بن نہیں پڑ رہا تھا۔ قدموں میں لڑکھڑاہٹ تھی۔ اور زبان لغزش کھا رہی تھی۔
وہ میرے برابر نہیں بیٹھا، بلکہ چبوترے کی ایک سیڑھی پر میرے قدموں میں بیٹھ گیا۔ میں نے منع بھی کیا۔ لیکن وہ نہیں مانا۔ اور "ٹھیک
ں بابو جی .... ٹھیک ہوں بابو جی ...." کہتا ہوا پیروں میں بیٹھ گیا۔

اور اس طرح تقریباً ایک گھنٹہ گزر گیا۔ اس ایک گھنٹہ کے عرصے میں اُس نے مجھے بڑی عجیب و غریب باتیں بتائیں۔ ایسی
تیں جنھیں سن کر میں حیران رہ گیا۔

کریا اس وقت نجو دادا سے خوب پٹ کر آ رہا تھا۔ نجو دادا فقیروں کی ایک ٹولی کا سردار تھا۔ جو خود بھیک مانگتا
ا۔ اُس نے فقیروں کا ایک گروہ بنا لیا تھا۔ یوں تو کریا نے نجو دادا کے کئی قصے بیان کیے کہ کس طرح فقیروں سے مختلف کام
ا ہے۔ اس کے منہ چڑھے اور خوشامدی فقیر اچھی اچھی نیازوں کی دعوت میں اچھے کھانوں کے لیے بھیجے جاتے ہیں۔ جہاں انھیں
ندر بھی ملتی ہے جس میں نجو دادا کا بھی حصہ ہوتا ہے۔ اس سے نظر ملانے والے یا نہ دینے والے فقیر غریب اور کمتر لوگوں کی دعوتوں میں
جانے کے لیے منتخب کیے جاتے تھے۔ جہاں اُنھیں چراغی یا نذرانہ ملتا ہی نہیں۔ اور اگر ملتا بھی تو آنوں اور پیسوں کی صورت میں۔
.. اور نہ جانے کیا کیا قصے بیان کیے تھے کریا نے۔ لیکن جس بات پر نجو دادا نے اُسے شراب پلا کر خوب پیٹا تھا۔ وہ آج صبح کی
ت سے ہی متعلق تھی۔

در اصل صبح والی میت سے کریا کا کوئی واسطہ نہیں تھا۔ وہ مرنے والا بوڑھا اس کا رشتہ دار بھی نہیں تھا، بلکہ اس کے
ں میں رہنے والی ایک غریب عورت کا باپ تھا جس نے ایک لمبی اور اکتا دینے والی بیماری سے جان دی تھی۔ نجو دادا اور اس
بیٹی کو بوڑھے کے مرنے کی خبر ہو چکی تھی۔

دادا اس قدر کمینہ تھا کہ وہ مرنے والوں کے نام پر بھی کمائی کرنے سے نہیں چوکتا تھا۔ کریا غریب تھا حاجتمند تھا
میت کی بے حرمتی اور کسی مردے کی کمائی وہ پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ نجو دادا کی ٹولی میں شریک نہیں تھا۔ لیکن پہلے اپنی مفلسی
بتی اور مجبوریوں سے عاجز آ کر نجو دادا کے کچھ کام کر چکا تھا۔ وہ کچھ عرصہ اُس کے ساتھ ضرور رہا تھا۔ لیکن دادا اسکے اور
کے نظریات میں عظیم فرق تھا۔ ایک دو بار اُس نے نجو دادا کو وارننگ بھی دی تھی کہ دیکھو دادا تم سب کچھ کرنا، مگر کسی میت کی
مٹی مت کرنا، ورنہ میں سارا بھانڈا پھوڑ دوں گا۔

آج جب وہ تلاش معاش میں گھر سے باہر چلا گیا تھا تو نجو دادا نے اُس کی غیر حاضری میں اُس غریب عورت کو دس روپے
کر دو گھنٹوں کے لیے مرنے والے کی نعش کرایے پر حاصل کر لی تھی۔

دادا کے لوگ نعش کو فوراً بازار کے پورا ستے پہلے آئے تھے ۔ اور فٹ پاتھ کے ایک سرے پر کفن دفن کے نام سے لاوارث میت کے لیے چندہ جمع کر رہے تھے ۔

جب وہ اپنے جھونپڑے میں واپس آیا تھا تو اُسے پتہ چلا تھا کہ بوڑھے کی میت کا کاروبار کرنے کے لیے نجّو دادا اٹھا لے گیا ہے ۔ وہ غصّہ کے مارے نجّو دادا سے نپٹنے کے لیے بازار میں پہنچا تھا، جہاں دادا اپنے کام میں معروف تھا ۔

کریا کو معلوم تھا کہ نجّو دادا کو اس دھندے میں اچھا خاصا نفع ہو جاتا ہے ۔ کوئی اللہ کا لال اُسے چالیس پچاس روپے بھی دے دیتا ہے اور تھوڑا تھوڑا چندہ جو جمع ہو جاتا ہے وہ الگ ۔ پھر اس کام میں ہاتھ بٹانے کے لیے جن صاحب خیر حضرات کی فہرست دادا کے پاس رہتی ہے ۔ ان سے الگ چندے آتے ہیں ۔ غرض کہ تھوڑی دوڑ دھوپ میں اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی، کریا کو دادا کی اس آمدنی سے حسد نہیں تھا، بلکہ اس انسانیت سوز اور ناپاک طریقہ کار سے نفرت تھی ۔

جب وہ میّت کی جگہ پہنچا تھا تو ہشیار دادا نے کریا کے تیور پہچان لیے تھے اور فوراً اس کا ہاتھ پکڑ کر علیحدہ لے گیا تھا۔ اور بڑی لجاجت سے کریا سے معافی مانگ کر کہا تھا کہ :-

" بھائی بس، یہ آخری دھندہ ہے، آیندہ میری توبہ، چل تو بھی چل سنا ہے کہ تو بہت پریشان ہے ۔ چل اللہ نے کرم کر دیا ہے ۔ تجھے بھی کچھ مل جائے گا ۔"

کریا کیا کر سکتا تھا ۔ وہ غصّہ میں چیختا چلّاتا ضرور ۔ لیکن اس وقت دادا کی چکنی چپڑی باتوں میں آگیا ۔ اور اُس کے ساتھ ہو گیا۔ اُس نے دادا کی بات کو سچ مان لیا تھا کہ چلو، اب یہ آخری بار ہے ۔ دادا نے معافی بھی مانگی ہے ۔ معاملہ ختم ہو جانا چاہیے ۔ اُسے اس بات کی خوشی تھی کہ دادا اُس سے اس قدر دب گیا ہے ۔ اور معافی مانگنے پر اُتر آیا ہے ۔ اور اس طرح با دل ناخواستہ اس کاروبار میں شریک ہو گیا تھا ۔

جب چندہ کی وصولی کا کام ختم ہو چکا تو دوپہر کے وقت کریا نے دادا سے حساب طلب کیا تھا ۔ جس پر دادا نے حساب تو نہیں بتایا ۔ البتہ پانچ روپے اُس کے ہاتھ پر رکھ دیے تھے ۔ اور کہا تھا ۔ "لے بھیا پانچ روپے لے جا تو حساب کتاب کے پھیر میں کیوں پڑتا ہے ؟"

اس پر کریا نے کہا تھا ۔ "دادا مجھے پانچ روپے منظور ہیں مگر اس شرط پر کہ تم آیندہ یہ دھندا نہیں کرو گے ۔"

"ابے چھوڑ بڑا آیا نصیحت کرنے والا ۔" دادا نے اُسے ڈانٹ پلائی تھی، جس پر کریا نے بھی طیش میں آکر دادا کو سخت سست کہا تھا۔ اور پانچ روپے میں سے تین روپے دادا کے منہ پر مار کر اُٹھ کھڑا ہوا تھا کہ وہ اس کی خبر پولیس میں کر دے گا ۔ اُس نے جو دو روپے لیے وہ بھی لاکر واپس کر دیے تھے ۔ اور خدا کا شکر بھی ادا کیا تھا کہ اس بار اُس نے مردے کی کمائی کا ایک پیسہ بھی اپنے لیے استعمال نہیں کیا تھا۔

لیکن شام کے وقت نجّو دادا کے لوگ اُسے بہلا پھسلا کر پھر نجّو دادا کے پاس لے گئے تھے ۔ انہیں خوف تھا کہ واقعی کریا کہیں گڑبڑ کر دے اور نجّو دادا نے پھر اُس کی خوشامد کر کے زبردستی اُس کی دعوت کر ڈالی ۔ اس کے انکار پر بھی اسے دیسی شراب پلائی گئی تھی اور خوب پلائی گئی تھی ــــ اور اس کے بعد ــــ اس کے بعد نجّو دادا اور اس کے ساتھیوں نے خوب زدوکوب کیا تھا ۔ اس کی اچھی مرمت کر ڈالی تھی ۔ اور اُسے خبردار کیا تھا کہ اگر تو ہمارے معاملات کے بیچ آیا تو یاد رکھ تیری خیر نہیں کُتے کی موت مارا جائے گا ..... پھر اُسے راستہ پر لاکر پھینک دیا تھا۔

اس وقت وہ بھٹک رہا تھا ۔ اور اپنے دشمنوں کو گالیاں دے رہا تھا ۔

اور جب میں آدھی رات کے قریب کریا کے دل کی بھڑاس سن کر اپنے گھر واپس جانے لگا تو میں نے سوچا کہ یہ دنیا شاید ایک کالا بازار ہے جس میں زندگی کا سودا بھی ہوتا ہے اور موت کا کاروبار بھی ۔

چند اہم کتابیں

مقدمات عبدالحق ۔ بابائے اُردو کی خدمتِ ادب کا روشن پہلو کسی کی نظر میں کچھ بھی ہو ۔ لیکن مرزا محمد بیگ کا کہنا ہے کہ دوسروں کے کام کو اجاگر کرنا بابائے اُردو کا کارنامہ ہے اور ڈاکٹر عبادت بریلوی کا قول ہے کہ بابائے اُردو کی صحیح شخصیت دوسروں کی شخصیتیں ابھارنے ہی میں نمایاں ہوتی ہے ۔ اور ان کا یہ احسان فن سے زیادہ فن کاروں پر ہے جن کی قلم کاری کے جوہر "مقدماتِ عبدالحق" سے روشنی میں آئے۔ یہ مقدمات عرصہ ہوا دکن میں شایع ہوئے تھے ۔ جن کو خود بابائے اُردو کی ترمیم و اضافہ کے بعد ڈاکٹر عبادت بریلوی نے از سرِ نو ترتیب دیا ہے ۔ اور یہ بیش قیمت مجموعہ اس دمکتے ہوئے آفتاب کے مترادف ہے جو اپنے دامن میں ان گنت ستاروں کی روشنی کے لیے ہے ۔ اور اپنی چمک سے ستاروں کی روشنی کم کرنے کے بجائے بڑھا رہا ہے ۔ علمی ہمہ گیری اور ادبی جامعیت کی ایک عظیم تالیف اردو ادب کا ایک شاہکار ــــــــــ قیمت مجلد ۱۷ روپے ـــــ پیپر بیک ـــ ۵۰ ـــ ۱۲ روپے

تاریخ اسلام ۔ عرب فن تاریخ کے موجد کہے جاتے ہیں ۔ لیکن یہ بھی ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ عربوں کی تاریخ اساس روایات پر رکھی ہوئی ہیں ۔ جن میں مشرق و مغرب کا اختلاف ہے ۔ اسی لیے سید امیر علی نے جب "History of Saracens" لکھنا شروع کی تو مستشرقین کے ساتھ ساتھ یورپ کے مورخین کی رایوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا ۔ اور ہزاروں صفحات پر پھیلے ہوئے واقعات کو پانچ چھ سو صفحات میں سمیٹ دیا ۔ تاریخ دانوں کا اتفاق ہے کہ اسلام کی مختصر تاریخ اب تک اس سے اچھی نہیں لکھی گئی جو زاویۂ نگاہ کے اعتبار سے کسی مکتبۂ خیال کی پابند نہیں ۔ بہر صورت ایک غیر جانبدارانہ تحقیق ہے ۔ اس تاریخ کے کئی ترجمے اس سے قبل شایع ہو چکے ہیں ۔ لیکن وہ سب ناپید ہیں ۔ زیرِ نظر ترجمہ وحشتی محمود آبادی نے ایک نئی ترتیب کے ساتھ پیش کیا ہے جس سے واقعات کو سمجھنا آسان ہو گیا ہے ۔ قیمت :ـــ نَو روپے

مختصر تاریخ ادب اُردو ۔ اُردو ادب کی تاریخ ، ہندوستان کی تمدنی اور انقلابی تاریخ کے ساتھ چلتی ہے جس پر ملک کے اکثر اہلِ قلم نے قلم اٹھایا ہے ۔ اور اُردو میں کئی مکمل اور جامع تاریخیں موجود ہیں ۔ لیکن ڈاکٹر اعجاز حسین نے جس اختصار کے ساتھ یہ تاریخ مرتب کی ہے وہ اپنی افادیت کے لحاظ سے طلبا اور اہلِ ذوق دونوں کے لیے یکساں طور پر اہم ہے ۔ اور اسی لیے اساتذہ کرام اس کے مطالعہ کی سفارش کرتے ہیں ۔ چند سو صفحات میں سموئی ہوئی زبانِ اُردو کی سرگزشت میں تقسیم کے بعد کا دَور بھی شامل کر دیا گیا ہے ۔ اور حال و ماضی کا یہ آئینہ ضروری صحت کے بعد بارِ دگر پیش کیا جا رہا ہے ۔ قیمت مجلد ۷ روپے

ترکی حُور ۔ اُردو میں تمثیل نگاری کا نقشِ اوّل امانت کی اندر سبھا ہو یا کوئی اور کتاب ، لیکن اب تو آغا حشر کا نام اُردو ڈرامہ سے منسلک ہو کر رہ گیا ہے ۔ اور اُن کے ڈرامے آج بھی اتنے ہی مقبول ہیں جتنے اپنے عروجی دَور میں ہوں گے ۔ "ترکی حور" آغا حشر کا ایک کامیاب ڈرامہ ہے جو افادۂ عامہ کے خیال سے سستے ایڈیشن میں شایع کیا گیا ہے ۔ قیمت :ـ ایک روپیہ پچاس پیسے ۔

مسدّس ۔ حالی افقِ مشرق کے ادبی آفتاب کی ایسی کرن تھے جس نے اردو نظم و نثر دونوں کو جگمگا دیا ۔ ڈاکٹر بجنوری "دیوانِ غالب" کو "وید" کے بعد ہندوستان کی دوسری الہامی کتاب کہتے ہیں ۔ لیکن غالب کے اس شاگردِ رشید نے مسدس لکھ کر بتا دیا کہ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں ۔ مسدس کا صدی ایڈیشن صحت کے التزام کے ساتھ شایع کیا گیا ہے ۔ قیمت ۲ روپے ۵۰ پیسے ۔

اُردو اکیڈمی سندھ ـــ کراچی ـــ حیدرآباد ـــ لاہور

اوم پرکاش بجاج
بانو۔ دہلی۔

اپنا حق

سادھنا کی زندگی بچپن ہی سے تیاگ اور تپاگ کی زندگی تھی۔ اپنے سے کہیں زیادہ دوسروں کے دکھ درد کو محسوس کرتی۔ گھر میں کوئی بیمار ہوتا تو وہ اس کی خدمت اتنے انہماک سے کرتی کہ اپنی سدھ بدھ نہ رہتی۔ چھوٹے بہن بھائیوں سے بھی اُسے بے حد دلی محبت تھی۔ وہ خود نہ کھاتی ان کو کھلاکر خوش ہوتی۔ اس کی ماں اگر کبھی بیمار پڑتی تو وہ اپنی پڑھائی کے علاوہ گھر کا کام کاج بھی سنبھال لیتی۔ ویسے بھی گھر کے کام کاج میں اپنی ماں کا ہاتھ بٹانے میں پیچھے نہ رہتی۔ کوئی نئی چیز یا نیا کپڑا اگر وہ خرید کر لاتی اور وہ اس کی کسی سہیلی یا بہن کو پسند آتا تو وہ فوراً انہیں دے ڈالتی۔ گھر میں کوئی مہمان آتا اور اس کے لئے بستر کی ضرورت ہوتی تو سادھنا ہی اپنی بہن یا ماں کے ساتھ سو جاتی اور کسی دوسرے کو پریشان نہ ہونے دیتی۔

اس کا یہ معمول گھر ہی تک محدود نہ تھا بلکہ گھر سے باہر بھی وہ اپنی ہم جولیوں سے یہی سلوک روا رکھتی تھی۔ اگر کسی کو کتاب کی ضرورت ہوتی تو وہ کبھی نہ کہتی کہ میرے پاس نہیں ہے۔ کوئی ادھار پیسے مانگتا تو اس سے انکار نہ ہوتا۔ گھر کے اندر اور باہر وہ اپنے پیار محبت اور خلوص کی جوت جگائے ہوئی تھی۔

بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ کرنے کے بعد اس نے ایک اسکول کی نوکری کرلی۔ وہ نوکری بھی کرتی اور گھر کا کام کاج بھی۔ جس کلاس کو پڑھاتی اس کی بچیاں اُس پر بُری طرح لٹو ہو جاتیں۔ پڑھائی میں صلاح مشورے کے علاوہ وہ اسے اپنے دکھ درد اور دل کی باتیں بھی سناتیں۔ انہیں سادھنا سے پڑھنے میں بہت مزہ آتا۔ اسکول کی لڑکیوں کے علاوہ وہ اپنی ساتھی استانیوں سے بھی بڑے لطف و مہربانی سے پیش آتی۔ اُن کے سوئٹر بُن دیتی۔ اسٹاف روم میں بیٹھ کر ان کی کاپیاں دیکھ دیتی اگر کوئی اُستانی غیر حاضر ہوتی تو اپنے خالی پیریڈ میں اس کی کلاس کو پڑھا دیتی۔

گویا سادھنا کی زندگی ایک بے مثال زندگی تھی۔ جس میں قول اور فعل کی ہم آہنگی تھی، سیوا، تیاگ، بے غرض احساس خدمت کے جذبات کارفرما تھے۔

پچھلے کچھ مہینوں سے اس کی شادی کی بات چیت چل رہی تھی۔ اس بات چیت کے چلنے سے گھر کی فضا میں ایک عجیب سا خلا پیدا ہونا شروع ہوگیا تھا۔ اس کی ماں کو محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی اس کا بازو کاٹ رہا ہو۔ لیکن بیٹیوں کو ہمیشہ کے لئے گھر میں بٹھایا بھی تو نہیں جا سکتا۔ فرض کا احساس اس کا دامن کھینچتا۔ اور پھر اس کے بڑے بیٹے کی شادی بھی تو مستقبل قریب میں ہونے والی تھی۔ بیٹی کی جگہ بہو آنے سے بھر سکتی تھی۔ لیکن نہ جانے بیٹی کے جانے کا ماں کو کتنا دکھ محسوس ہو رہا تھا۔ بچپن ہی سے ماں نے بیٹی کو اپنے گلے سے لگا کر رکھا تھا۔ اور بیٹی نے بھی ماں کو ذرا سا دکھ اٹھانے نہ دیا تھا۔ باہمی محبت کے اس دھاگے کے ٹوٹنے کا خیال اس کے دل میں برچھی کی طرح ترازو ہو رہا تھا۔

ماں بیٹی کس خیال میں تھیں اور آسمان کس خیال میں۔ اچانک سادھنا کی ماں بیمار پڑ گئی اور ایسی بیمار پڑی کہ چارپائی سے نہ اٹھی بیٹی ماں کی بے معذوری کی۔ لیکن اس کے دیکھتے ہی دیکھتے ماں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کی آنکھوں میں یادوں کے آنسو بھر کر چلی گئی۔

اور اب گھر گرہستی اُس کے ذمہ آ گئی تھی۔ جزوًا نہیں مکمل طور پر۔ وہ اپنی رومانی زندگی کے ان تصوّرات کو اب بھول جانا چاہتی تھی۔ جن کے دیکھنے کی وہ کچھ دنوں سے عادی ہو رہی تھی۔ محض اس خیال سے کہ اس کی ماں کا بسایا ہوا گھر نہ اجڑے، اس کے باپ کو بڑھاپے میں تکلیف نہ ہو، وہ اس حصّے میں اپنی شریکِ حیات کے غم کو محسوس نہ کریں، بچّے ماں کی کمی کا احساس نہ کریں۔

واقعی سادھنا نے ماں کی موت کے بعد گھر گرہستی کو سنبھال ہی لیا اور اس نے اپنے ہونے والے پتی ہرش سے، جو کسی زمانے میں اس کے کالج ہی میں تھا اور کسی حد تک اس کے ساتھ بے تکلف بھی تھا۔ صاف لفظوں میں کہا تھا۔

" ہرش اب ہم کچھ عرصے کے لئے اکٹھے نہ ہو سکیں گے۔"

" کیوں ؟"

" اگر میں نے شادی کر لی تو گھر کو کون سنبھالے گا ؟"

" جو تمہاری شادی کے بعد سنبھالتا۔ آخر بیٹیوں کی شادی کے بعد گھر کوئی نہ کوئی سنبھالتا ہی ہے۔" ہرش نے جواب دیا۔

" ابھی گھر سنبھالنے والے کے آنے میں کچھ دیر ہے۔ جب تک وہ نہ آئے گا ہمیں انتظار کرنا ہوگا۔" سادھنا نے صاف اور واضح لفظوں میں کھل کر کہنا چاہا۔

" انتظار میں کر سکتا ہوں۔ انکار سننا نہیں چاہتا۔" ہرش نے اپنے دل کی بات کہنی چاہی۔ سادھنا کو کچھ اداس اور بجھا بجھا سا پا کر اس نے پیار بھرے جذ سے کہا۔ "ڈارلنگ جیسے تم کہو گی مجھے منظور ہے۔" وہ ہرش کو بے حد حسین نظر آ رہی تھی۔ اس کو حاصل کرنے کے لئے تو وہ حشر تک بھی انتظار کر سکتا تھا۔

ہرش نے جو کہا اس نے نبھایا بھی۔ ہرش کی ماں بیٹے کی شادی بہت جلد کرنا چاہتی تھی۔ لیکن کمانے والے بیٹے سے کچھ نہ کہہ سکی۔ دو چار بار وہ چُپ ہو گئی۔ اپنے لاڈلے کی اور سادھنا کی محبت سے وہ بخوبی واقف تھی۔ اس لئے اُس نے کسی دوسری لڑکی کا نام بھی نہ لیا۔ اور ہرش محض ان لمحات انتظار کرنے لگا جب سادھنا کی گھر سے خلاصی ہو، وہ آزاد پرندے کی طرح آسمانوں کی سیر کریں جو اُن کے خوابوں کی طرح وسیع اور روشن ہیں۔

دو سال کے بعد جب سادھنا کے بھائی ونود کی شادی ہو گئی تو ہرش نے سادھنا سے اس جان لیوا انتظار کو ختم کرنے کے لئے کہا جو اب گھن کی ہرش کو کھلنے لگا تھا۔ لیکن سادھنا ابھی اپنی نئی نویلی بھابی کے مہندی لگے ہاتھوں کا رنگ گھر گرہستی کے تیزاب سے مٹانا نہیں چاہتی تھی۔ ہرش کئی بار آتا چند ٹھہرتا، اپنے وعدہ کی یاد دلاتا اور اس کے جواب میں انتظار کی گھڑیوں کو ساتھ لے کر لوٹ جاتا۔ سادھنا سوچتی تھی کہ جلد ہی نئی بہو گھر سنبھال لے گی اور پھر اسے منزل کی جانب جانے کی اجازت مل جائے گی۔ لیکن ایک دن امید کا یہ چراغ بھی اس کی توقعات کے خلاف تیز ہوا کے جھونکے سے بجھ گیا۔ ونود اور اس کی بیوی۔ اپنا آشیانہ علیٰحدہ بنا لیا۔ کیونکہ میاں بیوی دونوں کماتے تھے اور گھر گرہستی کے دھندوں میں پھنس کر وہ اپنی رومانی زندگی کو غارت نہیں کرنا چاہتے تھے۔

ہرش اور سادھنا کی شادی پھر افق کی طرح آگے کھسک گئی۔ سادھنا کا خیال تھا کہ چھوٹے بھائی کی شادی کے بعد وہ آزاد ہو جائے گی۔ اس کا چھوٹا ضرور اس کے بوڑھے باپ کو سنبھال لے گا۔ لیکن چھوٹے بھائی نے موقعہ ہی نہ دیا۔ شادی ہوتے ہی وہ بھی الگ ہو گیا اور سادھنا ایک بار پھر اپنے بوڑھے باپ کی ذمہ داریوں سمیت مکان میں اکیلی رہ گئی۔ اب اس کے لئے کوئی امید نہیں رہ گئی تھی۔ کیونکہ باپ کو چھوڑ کر گھر بسانے کا وہ تصوّر بھی نہیں کر سکتی اور فرض کا احساس اس کی زندگی کا آخری احساس بن چکا تھا۔

ہرش نے اس کو بہت سمجھایا۔ اس نے اس کو یہاں تک یقین دلایا کہ وہ شادی کے بعد بھی اپنے والد کو اپنے ساتھ رکھ سکتی ہے۔ اسے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ لیکن سادھنا راضی نہ ہوئی۔ وہ جانتی تھی دوسرے کے گھر میں اپنے پتا کو رکھنا کتنا مشکل ہوگا۔ اس لئے اس نے صاف انکار کر دیا۔ وہ سب طرف سے ہو کر اور سب طرح سے من کو سمجھا کر اپنے پتا جی کی خدمت میں از سرِ نو لگ گئی۔ اس کا پورا فرصت کا وقت اور آدھی سے زیادہ تنخواہ ان پر خرچ ہوتی۔ ان کا

سدھر گئی تھی اور مکور کھاؤ پہلے سے کہیں بہتر ہو گیا تھا۔

لیکن پچھلے دنوں سے سادھنا کو بہت ہی تھا پڑ رہا تھا اس کے پتا جی کا رویہ بدل رہا تھا۔ سادھنا کی پرواہ تو انہوں نے کبھی کی ہی نہ تھی۔ اس کی خدمت کو اپنا حق سمجھ کر وہ اس کی طرف سے مکمل طور پر بے نیاز تھے۔ لیکن اب وہ بے حس بھی ہوتے جا رہے تھے۔ وہ اس کی تھکن بیماری اور مصروفیت کا خیال کئے بغیر اس سے طرح طرح کے کھانوں کی فرمائش کرتے رہتے۔ اچھے اچھے کپڑوں کا مطالبہ کرتے، چھینک آتے ہی ڈاکٹری علاج کی توقع کرتے۔ سادھنا نے یہ سب کچھ بھی کیا۔ لیکن اب وہ گھر سے بھی بے نیاز ہونے لگے تھے۔ صبح ہی ناشتہ کر کے دوپہر کا کھانا ڈبے میں رکھوا کر وہ بیٹوں اور بیٹیوں کے یہاں ملنے چلے جاتے۔ ہر تہوار پر ان کو تحفہ تحائف دینے کے لئے روپیوں کا مطالبہ کرتے۔ شام کو دیر سے لوٹتے۔ اکثر اطلاع کئے بغیر بیٹوں کے یہاں رہ جاتے اور بے چاری سادھنا ان کا کھانا لئے بیٹھی رہتی۔ صبح جب وہ آتے تو نادم یا معذرت خواہ ہونے کی بجائے رکھائی سے جواب دیتے۔ "ہو کیا گیا؟ اس کا لڑکا بیمار تھا۔ رات کو وہاں رہنا ضروری تھا۔"

"پوتا بیمار تھا۔ اس لئے وہاں رہنا ضروری تھا۔ اور بیٹی بھوکی پیاسی اکیلی تھی۔ اس کے پاس آنا ضروری نہیں تھا۔" اب سادھنا کے ذہن میں کوئی یہ سوال کرنے لگا تھا۔ یہ باپ کیسا ہے جو کھانا تیرے پاس کھاتا ہے۔ پر من اس کا ان بیٹوں میں پڑا رہتا ہے جنہوں نے اسے گھاس بھی نہیں ڈالی جو شادی کے فوراً بعد اپنے سکھ کی خاطر الگ ہو گئے؟ تو اب اس باپ کے لئے مر رہا ہے؟" وہ بڑی عجلت سے ان سوالات کے سر دبا دیتی۔ لیکن سوالات پھر سر اٹھانے لگتے کیونکہ اب اس کا باپ پوتوں اور نواسوں کے چکر میں زیادہ الجھتا جا رہا تھا۔ اگر وہ بیٹوں کے پاس چلا جاتا تو سادھنا کو کوئی گلہ نہ تھا۔ وہ کھاتا سادھنا کے پاس۔ روپیہ لیتا سادھنا سے اور سدھ لیتا بیٹے بیٹیوں کی، پوتے پوتیوں کی۔ وہ ان کے یہاں جانے سے پہلے کھانے کے علاوہ پوتے اور نواسوں کے لئے مٹھائیاں بنوا کر اور سوئٹر اور کپڑے بنوا کر لے جانے لگا تھا۔

ایک دن سادھنا کو زور کا بخار چڑھا۔ وہ صبح اٹھی تو بے حد کمزور تھی۔ لیکن اسے چائے بنا کر دینے کی جگہ اس کے باپ نے الٹا اس سے چائے کے ساتھ حلوہ بنا کر دینے کی فرمائش کی۔ اسے بہت صدمہ پہنچا۔ لیکن جیسے تیسے اس نے اُن کو ناشتہ بنا کر دیا۔ وہ حسب معمول باہر جانے لگے تو اس نے دس روپے کا نوٹ دیتے ہوئے کہا۔ "پتا جی میری طبیعت بہت خراب ہے۔ ڈاکٹر سے دوا لے کر دیتے جائیے گا۔" وہ چلے گئے اور سادھنا دوا کا انتظار کرتی رہی نہ دوا آئی نہ وہ آئے۔ دوپہر ہونے کو آئی، بخار کے ساتھ ساتھ سادھنا غصے میں بھننے لگی۔ اس نے کھانا نہ کھایا۔ تیسرا پہر ہوا۔ شام ہوئی۔ رات آئی اور دوسری صبح آ گئی۔ سادھنا نے کچھ نہ کھایا۔ کچھ نہ پیا۔ ایک پل کے لئے اس کی آنکھ نہ جھپکی۔ غصے، بخار اور بھوک اور نیند اڑنے کی آگ میں جل جل کر اس کا دماغ گرم توے کی طرح تپ اٹھا۔ "میری قربانیوں کا یہ صلہ؟ میری یہ وقعت!"

دن کے دس بجے کے قریب اس کے پتا لوٹے۔ ان کے ہاتھ میں دوا نہ تھی۔ انہیں شاید یاد بھی نہ تھا کہ ان کی بیٹی بیمار تھی۔ گھر میں گھستے ہی وہ بولے "بیٹے مجھے بھوک لگی ہے۔ میرا ناشتہ لا دو!"

سادھنا کے دماغ میں بارود سی اُڑی۔ وہ سمجھ نہ سکی کہ بے حسی اس حد تک بھی ہو سکتی ہے۔ اس نے بخار اور غم اور غصہ کے آنسوؤں سے جلتی ہوئی نگاہوں سے اپنے باپ کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایک بہیمانہ بے حسی تھی۔

"آپ رات کہاں رہے؟"

"پرمود کے۔"

"کیوں؟"

"وہ میرا بیٹا نہیں ہے؟ تو مجھے دو ٹکڑے دیتی ہے تو کیا سمجھتی ہے کہ میں اپنے بیٹے بیٹیوں کے یہاں نہیں جاؤں گا؟ پوتے پوتیوں سے نہیں ملوں گا"

"اور میں چاہے دوا کے بغیر تڑپ تڑپ کے مر جاؤں۔ تم بیٹے اور پوتے پوتیوں سے مل کر کلیجہ ٹھنڈا کرتے رہو، اور میں بیماری محنت اور محرومی

کے انگاروں میں جھلستی رہوں؟ تم نے مجھے سمجھا کیا ہے؟"

ایک طمانچہ سادھنا کے منہ پر پڑا۔ گالی کی ایک بجلی اس کے کانوں پر گری۔ اس نے سنا، اُس کا وہ باپ، جس کی خاطر اس نے اپنی زندگی کی خوشیاں جھلسا کے رکھ دی تھیں، کہہ رہا تھا "اور بتاؤں تجھے، سمجھا کیا ہے، جب مجھے میرے بیٹے پوتوں سے چھڑانے کی کوشش کرتی ہے۔ جو میری چتا کو آگ دیں، میرا دوسرا جنم سدھاریں گے؟ میں تیرے جھگڑ میں اپنا دوسرا جنم نہیں گنواؤں گا۔"

اسی دن بلکہ اسی گھڑی سادھنا نے بھی ایک فیصلہ کیا۔ اپنے باپ کو ناشتہ دے کر، اپنا بخار سے تپتا اور نقاہت سے لڑکھڑاتا جسم سنبھالے، جب وہ باہر نکلی تو اس نے رکشہ والے کو اسکول کی طرف جانے کی بجائے ادھر جانے کو کہا جدھر پرکاش کا گھر تھا۔

اس نے اپنا موجودہ جنم سدھارنے کی ٹھان لی تھی۔

اُردو کے مایہ ناز شاعر عبدالعزیز خالد کی

تخلیقات

سرودِ رفتہ — یونانِ قدیم کی شاعرہ سیفو کے نغمے — ۴ روپے
غزل الغزلات — عہد نامہ عتیق کا نغمہ سلیمان — ایک روپیہ ۵۰ پیسے
دکانِ شیشہ گر — منظوم ڈرامے۔ دوسرا ایڈیشن آفسٹ — ۵ روپے
برگِ خزاں — " " دوسرا ایڈیشن آفسٹ — ۶ روپے
ورقِ ناخواندہ — " " — ۳ روپے
سلومی — دوسرا ایڈیشن مع اضافہ ترگوم — ۳/۵۰ روپے
گلِ نغمہ — ٹیگور کی گیتانجلی — ۴ روپے
زنجیرِ رمِ آہو — طویل مختصر نظمیں دوسرا ایڈیشن آفسٹ — ۵ روپے
کلکِ موج — نظمیں غزلیں — ۷/۵۰ روپے
کفِ دریا — نئی غزلیں آفسٹ — ۷ روپے
فارقلیط — (آدم جی انعام یافتہ) نام ختم رسل انجیل میں ہے فارقلیط۔ ذکرِ دُکر رسولؐ — ۸ روپے
دشتِ شام — نئی نظمیں آفسٹ — ۵ روپے
ماتمِ یکِ شہرِ آرزو — نوحے (نیا ایڈیشن) (زیرِ طبع)
زرِ داغِ دل — طویل نظمیں " "

مشتاق بک ڈپو۔ کراچی ۱

ش لاپی
انتی کمار

بکھری سنوری زندگی

گلابی جاڑوں کی ایک تاریک رات آسمان پر چھائے ہوئے سیاہ بادل، ایسا لگتا تھا جیسے آج ہی سب برس پڑیں گے۔ سنسان جنگلوں، پہاڑوں اور ندیوں کو پیچھے چھوڑتی ہوئی ریل گاڑی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ دوسرے درجے کے ڈبے میں پانچ سات مسافر تھے۔ سبھی اپنی اپنی جگہ پر لیٹے ہوئے تھے، اور میں کھڑکی کے پاس بیٹھا دور تک پھیلی ہوئی تاریکی میں گھور رہا تھا۔ آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔ دل میں خیالوں کا طوفان مچا ہوا تھا۔

آج تین سال بعد میں اپنے عزیز دوست جگدیش سے ملنے جا رہا تھا۔ مجھے اچانک دیکھ کر وہ چونک پڑے گا۔ اُسے تو اب بھی یہی توقع ہوگی کہ میں سات سمندر پار کیلی فورنیا یونیورسٹی میں پڑھ رہا ہوں۔ دیکھتے ہی لپٹ جائے گا، اور مجھ سے امریکی زندگی کے بارے میں پوچھنے لگے گا۔ لیکن میں اُسے کچھ نہیں بتاؤں گا، کہوں گا، "پہلے مجھے بھابی کو دکھاؤ، کہاں ہیں وہ! کیسی ہیں؟" تب وہ اپنی نئی نویلی بیوی کو کسی پیارے نام سے پکارے گا۔ سر سے پاؤں تک حیا میں لپٹی ہوئی ایک خوبصورت عورت میرے سامنے آکھڑی ہوگی۔ میں اس پر ایک نظر ڈالنے کے بعد پاؤں چھو لوں گا اور کہوں گا، "بھابی میں ہوں کمار، افسوس کہ شادی پر نہ آسکا۔"

پھر میں جگدیش سے پوچھوں گا کہ بھلا ایسی بھی کیا ناراضگی تھی۔ جو شادی کی اطلاع تک نہیں دی۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم ہو سکا کہ تم پائیلٹ کی ٹریننگ حاصل کر کے اب پائیلٹ آفیسر بن گئے ہو، کیوں چھپایا تم نے مجھ سے یہ سب؟ مجھے تو یقین ہی نہیں آیا، جب ماں نے بتایا تھا کہ تیرا دوست جگدیش آج کل ڈیرہ دون میں ہے۔ سنا ہے شادی بھی کر لی ہے۔ اس سے زیادہ ماں کچھ نہ بتا سکی تھی۔

میں نے کلائی گھڑی کی طرف دیکھا۔ ایک بج رہا تھا۔ کچھ اونگھ سی آنے لگی تھی۔ تبھی ایک بڑا سا اسٹیشن آیا۔

میں گاڑی سے اتر پڑا اور ایک کپ چائے پی کر دوبارہ اپنے ڈبے میں آبیٹھا۔ دیکھا کہ میری سیٹ پر ایک عورت بیٹھی تھی اس کی گود میں ایک بچہ تھا۔ ایک پتلی سی چادر میں وہ خود کو سرد لہروں سے بچانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

اس نے میرا بچھا ہوا بستر اپنے بیٹھنے پر ہٹا دیا تھا۔ اخلاقاً میں نے کہا، آپ آرام سے بستر پر بیٹھئے میں اوپر کی برتھ پر چلا جاؤں گا۔" لیکن عورت نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں بھی خاموش رہا۔ گاڑی چلتی رہی۔

چلتی گاڑی میں داخل ہوتے ہوا کے جھکڑوں سے وہ عورت ٹھٹھرنے لگی۔ گود کا بچہ بھی کسمسانے لگا۔ میں نے اٹھ کر بستر سے کمبل نکالا اور اُسے دیتے ہوئے بولا، "آپ اسے اوڑھ لیجئے۔ بچے کی حفاظت کیجئے۔ بہت سردی ہے۔"

" رہنے دیجئے، آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں۔" ایک نرم اور میٹھی آواز آئی۔ میرے کان کھڑے ہو گئے۔ ایسا محسوس ہوا جیسے یہ آواز کہیں پہلے بھی

نی ہوہ میں نے کمبل کھول کر اس کے جسم پر ڈالتے ہوئے کہا: آپ بھی عجیب ہیں ایسی سردی میں سفر کر رہی ہیں اور وہ بھی بغیر گرم کپڑوں کے. کہاں
ل جا رہی ہیں آپ ؟"

" ڈیرہ دون" مختصر سا جواب ملا.

" تب آپ مطمئن ہو کر آرام سے بستر پر بیٹھئے. مجھے بھی ڈیرہ دون جانا ہے، اور وہ کل صبح آٹھ بجے آئے گا." اس بار اُس عورت نے مجھے دیکھنے
کے لئے اپنا گھونگھٹ اٹھایا. میری آنکھیں اُدھر ہی دیکھ رہی تھیں. نگاہیں ملتے ہی وہ چونک پڑی. شال سر سے نیچے آ گرا. مجھے ایسا محسوس ہوا، جیسے کسی
م توسے پر میرا ہاتھ پڑ گیا ہو. ہم نے ایک دوسرے کو پہچان لیا تھا.

" تم . . . آپ . . ." عورت دبے لہجے میں بولی.

" ہاں، رینو میں پہچان لیا تم نے ؟"

عورت نے اپنی گردن جھکا لی، اور میں سوچنے لگا، کیا یہ وہی رینو ہے جس کے ساتھ میرا بچپن گزرا تھا. اس کے ساتھ تو میں نے گھروندے
ائے تھے، آنکھ مچولی کھیلی تھی، مستقبل کے رنگین سپنے دیکھے تھے. چاند ستاروں کی نرم چھاؤں میں پیار کے گیت گائے تھے، اور قسمیں کھا کر ہمیشہ ساتھ
ہنے کا عہد کیا تھا. کیا یہ وہی رینو ہے جس نے عمر بھر میرا ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا لیکن اب . . ."

رینو ذات کی برہمن تھی، اور میں بنئے کا بیٹا تھا. ذات پات، سماج اور مذہب کی آڑ لے کر ہمارے ملنے جلنے پر پابندیاں لگا دی گئی تھیں. ایک
سرے کے راستے میں دیواریں کھڑی کر دی گئی تھیں. اور پیار کی اس پاکیزگی پر کیچڑ اچھالی گئی تھی.

سب ختم ہو گیا. تنکے سے بنے ہوئے گھونسلے کی طرح جنہیں پنچھی ایک ایک تنکا جوڑ کر بڑی محنت سے بناتا ہے، مگر ہوا کا ایک تیز جھونکا آکر اُسے
ست و نابود کر دیتا ہے. تنکے اِدھر اُدھر بکھر جاتے ہیں.

" بدیس سے کب لوٹے کمار بابو." اس نے مجھ سے پوچھا.

ایک وقت تھا جب رینو مجھے کمار کہہ کر پکارتی تھی. لیکن آج کمار کے ساتھ بابو لگا دینے سے وہ قربت کی حدود سے کتنی دور چلی گئی تھی. زبردستی
نے کی کوشش کرتا ہوا میں بولا." پندرہ دن ہو گئے ہیں. تم کیسی رہیں ؟ پچھلے تین سال اور . . . یہ بچّہ . . . . ؟" کہتے کہتے میں چپ ہو گیا. میرا ادھورا سوال
ایک مکمل سوال تھا.

" کچھ نہ پوچھئے کمار بابو. کیا کریں گے، کیا کریں گے جان کر، میں اپنا ماضی دہرانا نہیں چاہتی."

" جانتا ہوں، رینو. ماضی کوئی بھی دہرانا نہیں چاہتا. پھر بھی تمہارے بارے میں جاننے کی خواہش ہوتی ہے. اگر بُرا نہ مانو . . ."

وہ میرا اصرار ٹال نہ سکی. بولی." آپ کے پردیس چلے جانے پر پتا جی کا یہ خوف دُور ہو گیا کہ آپ کبھی ان کے وقار کے لئے خطرہ بن سکتے ہیں بھائیوں نے
اطمینان کا سانس لیا لیکن کچھ لوگ جو ہمارے خاندان سے دشمنی رکھتے تھے. اور ہمارے بارے میں جانتے تھے سدور سرپنے رہے.

میرے لئے بر کی تلاش ہونے لگی. آئے دن اُن لوگوں کے سامنے میری نمائش ہونے لگی. جن کے ساتھ میری شادی کی بات چیت چلتی.
، نہ معلوم کیسے سبھی کو معلوم ہو جاتا کہ میں ایک لڑکے سے پیار کرتی ہوں. اور وہ لڑکا مجھے چھوڑ کر چلا گیا.

پسند کر لئے جانے کے بعد بھی میں شادی کے لائق نہ سمجھی جاتی. منگنی ٹوٹ جاتی. ماں باپ اور بھائیوں کا سر میری وجہ سے جھک جاتا تھا. ایک دن
سنا، پتا جی ماں سے کہہ رہے تھے، یہ لڑکی تو ہمارے خاندان کے لئے کلنک کا ٹیکہ بن گئی. ہر جگہ کوشش کی، مگر رشتہ کہیں طے نہیں پاتا. جہاں طے پاتا
. وہاں اس کے لچھنوں کا علم ہو جانے پر ٹوٹ جاتا ہے. جی میں آتا ہے زہر کھا کر سو جاؤں۔ کمار بابو میں سب کچھ سننے کے باوجود چپ تھی. دن رات یہی سوچا
تھی کہ کسی طرح میرے گھر کا کھویا ہوا سکون دوبارہ واپس آ جائے. ماں باپ کی آنکھوں کی نیند حرام نہ ہو، ان کا خاندانی وقار بحال ہو جائے.

ایک دن ماں نے بتایا کہ آج کوئی لڑکا مجھے دیکھنے آ رہا ہے۔ میں نے سوچا کہ آخر کب تک یہ روز روز کی بے عزتی برداشت کرتی رہوں گی۔ میں نے اپنی زبان سے کچھ بولوں۔ ان نوجوانوں سے کہوں کہ لڑکی کوئی گائے بکری ہے یا موٹر اسکوٹر؟ جسے ہر روز ٹھاٹ سے دیکھنے آتے ہیں، اور کچھ نہ کچھ خامی نکال کر خریدے بغیر چلے جاتے ہیں۔ کیا کسی سے محبت کرنا اتنا بڑا گناہ ہے کہ آج مجھے اپنانے میں ہر کوئی اپنی ہتک سمجھتا ہے۔

" شام ہوئی میں چائے لیکر بیٹھک میں گئی۔ جہاں وہ پتاجی سے باتیں کر رہے تھے۔ میرا تعارف کرایا گیا۔ رینو! تم ان کے لئے چائے بناؤ میں ابھی آیا۔" کہکر پتاجی چلے گئے۔ اس طرح انہوں نے میری جانچ پرکھ کا پورا موقع دیا تھا۔

" انہوں نے پوچھا، شادی کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ آپ کیسا شوہر چاہتی ہیں؟ میں حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔ اب تک مجھے دیکھنے کے لئے آنے والے لوگوں سے وہ قطعی مختلف تھے۔ انہوں نے یہ عجیب سا سوال پوچھا تھا۔ لیکن میں فیصلہ کر کے گئی تھی کہ چپ نہیں رہوں گی۔ بولی، جو میرے خیالات کو سمجھے، جو شک و شبہے کی دنیا سے دور، کسی پر اعتماد کرنا اور کسی کا اعتماد پانا جانتا ہو۔ میرے ماضی کو نہ دیکھے مستقبل کو جاننے کی کوشش کرے۔ پیار کو گناہ نہ بنا کر جذبات تصور کرے۔ ۔ ۔ بس۔"

" ایک ہی سانس میں نہ جانے کہاں سے ہمت جمع کر کے میں کہتی چلی گئی۔

" انہوں نے خود ہی چائے بنا کر پیالی میری طرف بڑھادی۔ ہم دونوں چپ چاپ چائے پیتے رہے۔ پتاجی کے آنے پر میں اندر چلی گئی میں نے سنا، وہ کہہ رہے تھے، مجھے شادی منظور ہے، پتاجی خوشی سے دیوانہ ہو کر دور ہی سے کہتے ہوئے آئے، رینو کی ماں، سنتی ہو، لڑکے نے شادی کرنا منظور کر لیا ہے۔ ماں کو بھی شاید اسی جواب کی توقع تھی۔ بولیں، کون سی نئی بات کہہ رہے ہو؟ ہمیشہ سے یہی سنتی آئی ہوں، پتاجی کا منہ بند ہو گیا۔ مجھے بھی ماں کی بات سچ معلوم ہوئی یہ تماشا تو پچھلے چھ ماہ سے ہو رہا تھا۔

" لیکن اس بار نہ مجھ میں کوئی کمی بتائی گئی اور نہ منگنی ٹوٹی۔ شادی ہو گئی۔ میں دل ہی دل میں آپ کو یاد کرتی اپنے خوابوں کی لاشوں پر پاؤں رکھتی، آنسو بہاتی، سسرال چلی گئی۔"

میں نے دیکھا، رینو یہ کہتے کہتے آنکھیں پوچھنے لگی تھی۔ میرا دل بھی بھاری ہونے لگا۔ دلاسا دیتے ہوئے میں نے کہا، "رو نہیں رینو۔" اُسے کچھ قرار آیا تو میں نے پوچھا، "پھر؟"

" پھر ایک عجیب سی اداسی مجھے گھیرے رہنے لگی۔ وہ مجھے ہر طرح خوش رکھنے کی کوشش کرتے۔ پھر بھی نہ جانے کیوں میں اپنے آپ کو بجھا بجھا سا پاتی۔ آخر ایک دن انہوں نے مجھ سے پوچھ ہی لیا۔ کیا بات ہے رینو؟ شاید تم مجھ سے شادی کر کے خوش نہیں ہو؟"

" نہیں تو۔" میں نے جواب دیا۔ آپ ایسا کیوں سوچتے ہیں، میں تو بہت خوش ہوں۔"

" کیوں مجھے بہلانے کی کوشش کرتی ہو۔ سچ بتاؤ، کیا تمہیں ان کی یاد نہیں ستاتی؟ ہاں، یہ بتاؤ کہ وہ صاحب تھے کون، جو تمہارے ساتھ پیار کا ناٹک کھیل کر چلے گئے؟ ان کی کوئی تصویر تو ہوگی تمہارے پاس؟"

" کوئی تصویر نہیں ہے۔"

" یہ کیسے ہو سکتا ہے! جب ایک پریمی اپنی محبوبہ سے بچھڑ کر جاتا ہے تو اپنی یاد کے لئے ایک فوٹو ضرور دے جاتا ہے۔ کوئی گھٹیا قسم کا عاشق رہا ہوگا۔ پھر وہ ۔ ۔ ۔"

" سچ کہتی ہوں، میرے پاس کوئی فوٹو نہیں ہے۔ آپ کو یقین نہیں آیا؟"

" نہیں رینو ۔ ۔ ۔ یہ بات نہیں ہے۔" وہ بولے۔ "میں تو صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مجھے تم سے پوری پوری ہمدردی ہے، پیار ہے، نفرت ہے تو اس شخص سے جو تمہاری زندگی میں آیا اور درد دے کر چلا گیا۔ اب شوہر کے ناطے اسے میرا حکم سمجھو یا میری درخواست کہ اپنے آپ کو اس کی طرف سے ہٹانے کی

کوشش کرو۔ اس کی یاد اپنے دل سے نکال دو۔ ہو سکتا ہے کہ کل وہ بدیس سے لوٹے اور تم۔۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکوں گا۔ تم جس دن اس سے ملوگی، اس دن کے بعد سے میرا تمہارا کوئی تعلق نہیں رہے گا۔۔"

میں نے ان کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ "ایسا نہ کہئے۔ ایسا کبھی نہ ہوگا۔" اور زندگی گزرتی رہی۔ یہ تھا بھی۔۔" وہ رک گئی۔

ریل گاڑی اسی رفتار سے چلی جا رہی تھی۔ گھڑی کی سوئیاں آگے بڑھ رہی تھیں۔ میں خاموش بیٹھا رہا۔ رینو کے شوہر کے الفاظ میرے ذہن میں چکر لگا رہے تھے۔ دل خدشوں سے دھڑک رہا تھا۔ میں کچھ نہ بولا۔

ناراض ہو گئے؟ آپ ہی تو کہتے تھے۔ سچ کتنا کڑوا کیوں نہ ہو، اُسے سننے کی ہمت ہر شخص میں ہونی چاہئے۔" کچھ رک کر وہ پھر بولی۔ "کمار بابو کچھ یاد ہے۔ جب آپ کو بدیس جانے کے لئے اسکالرشپ ملی تھی۔ اس دن آپ بہت خوش تھے، اور مجھے من مانگی چیز دینے کے لئے کہہ رہے تھے، وہ چیز میں اب مانگ لوں؟ وہ مجھے ملنی ہی چاہئے کیونکہ آپ بدیس سے واپس بھی آ گئے ہیں۔"

مجھے تشویش ہو رہی تھی۔ اس کا ایک ایک لفظ زہر میں ڈوبا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔

"اپنے وعدے سے پھر رہے ہیں۔ کیا؟" اُس نے پوچھا۔

"نہیں تو، مانگو، کیا مانگتی ہو؟" کہنے کو تو میں کہہ گیا لیکن دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔

"کمار بابو،" اس نے سختی سے کہا۔ "آپ جانتے ہیں۔ میں ڈیرہ دون جا رہی ہوں۔ آپ بھی وہیں جا رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی ایسا موقع پیش آئے کہ آپ اور میں اُن کے سامنے پڑ جائیں۔ ایشور کے لئے اس وقت خود کو قابو میں رکھئے گا۔"

وہ چپ ہو گئی۔ اُس کی آنکھیں خاموشی فریاد کر رہی تھیں۔ میرے سامنے 'ہاں' کہہ دینے کے علاوہ دوسرا چارہ ہی نہ تھا۔ وہ بولی "جب ایک دوسرے سے مل نہیں سکتے، ایک دوسرے کے ہو نہیں سکتے تو پھر گزرے ہوئے دنوں کی یاد سے دکھی ہونا بے کار ہے۔ آپ بھی شادی کر لیجئے۔ ہو سکتا ہے، نئی زندگی پرانی یادوں کے نقش مٹا دے۔"

"شادی تو میں کر ہی لوں گا۔ کیونکہ یہ بھی زندہ رہنے کے لئے ضروری ہے۔۔ میں آگے کچھ نہیں کہہ سکا۔

ڈیرہ دون اسٹیشن آ گیا۔ رینو اتر گئی۔ اور کچھ کہے بغیر پلیٹ فارم سے باہر نکل گئی۔ میں بھی اسٹیشن سے باہر آ کر ٹیکسی میں بیٹھ کر جگدیش کے گھر کی طرف چل دیا۔

جیسے ہی میں نے ٹیکسی کا دروازہ کھول کر باہر آنے کے لئے قدم نکالا، کیا دیکھتا ہوں کہ رینو کا ہاتھ تھامے جگدیش کھڑا مسکرا رہا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا، "تو تم آ ہی گئیں۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ تم اتنی جلدی آ جاؤ گی۔ بیماری تو تمہیں بلانے کا ایک بہانہ تھا۔"

"بڑے عجیب ہیں آپ بھی۔" یہ رینو کی آواز تھی۔ دونوں بنگلے کے اندر چلے گئے۔

"صاحب یہیں اترنا ہے آپ کو۔" ڈرائیور نے مجھے مطلع کیا۔

"نہیں، اسٹیشن واپس چلو۔" میں نے ڈرائیور سے کہا۔

ٹیکسی چل پڑی۔ اُس کے انجن کی گھڑگھڑاہٹ میں بھی رینو کے الفاظ گونج رہے تھے۔ "کمار بابو، آپ میری زندگی سے دور چلے جائیے۔"

نقش ادب کی خدمت کرتا ہے۔ آپ نقش کی سرپرستی کیجیے

نقش خریدیے۔ نقش میں اشتہار دیجیے۔

فرصت کے لمحات کا بہترین ساتھی ماہنامہ "نقش" کراچی۔

برج موہن طوفان

شمع دہلی۔

میں ہوا کافر.....

جلوس شہر کی تنگ اور پیچیدہ گلیوں میں گشت کرتا ہوا نئی دہلی کے اسٹیشن تک پہنچا تو کافی حلق خشک ہو چکے تھے۔ مزدوروں کے چہروں پر گرد اور تھکن کی کئی تہیں جم چکی تھیں۔ مگر منزل مقصود پر پہنچ کر ایک بار پھر ان میں تازگی سی آ گئی جنہوں نے آخری فلک شگاف نعرہ بلند کیا اور پلیٹ فارم ٹکٹ خریدے بغیر گاڑی کے اس ڈبے تک پہنچ گئے جس میں ان کا راہنما کامریڈ ایشور بھائی سوار ہو چکا تھا۔ قلی سامان رکھ کر اجرت مانگنے کے لئے آگے آیا تو سینکڑوں [illegible] بعد دیکھ سے سرخ وردی میں ملبوس قلی کو یوں بھلا دیا کہ اسے بھی محسوس ہونے لگا کہ وہ نمائندوں سے اجرت طلب نہیں کی جاتی۔ کامریڈ ایشور بھائی نہایت خندہ پیشانی سے ڈبے کے دروازے پر نمودار ہوا تو محنت کشوں نے پرچم لہرا لہرا کر انقلاب کی دہائی دی۔ مکے تنے اور بازو ہوا میں اٹھے۔ لیکن جلد ہی سب پر سکوت کا عالم طاری ہو گیا۔ کامریڈ صاحب خطیبانہ انداز میں ہجوم سے مخاطب رہے تھے اور ان کے ہر جملے پر ہجوم بے پناہ تالیاں بجا رہا تھا۔ تالیاں ختم ہوئیں تو از سر نو نعروں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور یہ اس وقت ختم ہوا جب کہ اسٹیشن کے ایک دوسرے کونے سے ہولناک آوازیں آنے لگیں۔

وہ ہولناک آوازیں اسٹیشن کی لوہے کی چھت سے ٹکرائیں تو ایک بے ہنگم گونج بن کر مزدوروں کے ہجوم پر منڈلانے لگیں۔ سینکڑوں گردنیں ایک دم گھوم گئیں ایک دوسرا ہجوم بے پناہ رفتار سے اسی ڈبے کی طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا جس کے دروازے میں کامریڈ ایشور بھائی نہایت تمکنت اور رعب سے دونوں ہینڈلوں کو تھامے کھڑا تھا۔ مزدوروں پر جو سکتہ طاری ہونا تھا وہ تو ہوا ہی، کامریڈ ایشور بھائی کے چوڑے ماتھے پر بھی پسینے کی بوندیں تیرنے لگیں۔ نیا ہجوم ایک درویش صورت بزرگ کو اپنے نرغے میں لئے ایسی بولیاں نکال رہا تھا جو ایک عام شخص کی عقل و فہم سے بالاتر تھیں۔

"کلنات کا رانعلی کی آواز"

"ولی دولی" کسی نے کہا تو سینکڑوں لوگ بیک آواز چلا اٹھے۔ "بجرنگ بلی۔" بجرنگ بابا کی بے ہنگم صدا کا جواب سینکڑوں آوازوں نے یوں دیا "تیری کرامات"

اتنا بڑا ہجوم ساتھ ہو تو تھرڈ کلاس کے ڈبے تک میں بھی جگہ مل جاتی ہے۔ اور یہ تو فرسٹ کلاس کا ڈبہ تھا جس میں صرف دو ہی آدمیوں کی گنجائش تھی اور دو [illegible] ہستیاں اب شانہ بشانہ دروازے پر آ گئی ہوئی تھیں۔ گاڑی چھوٹنے میں چند ہی لمحے باقی تھے۔ کامریڈ ایشور بھائی نے اچانک ہاتھ اٹھایا تو [illegible] جمع شدہ ہجوم کے ایک حصے نے بآہنگ دہل غریب محنت کشوں کو کارخانہ جات کا مالک گردان لیا اور دقیانوسی رجعت پسند اور بوسیدہ نظام کی دھجیاں اڑانے کا ارادہ کر لیا۔ موقع پا کر درویش صورت ولی صاحب نے اپنی ریش پر ہاتھ پھیرا تو ہجوم کے دوسرے حصے پر دیوانگی کے اثرات ہونے لگے۔ نعروں کے یہ کرتب کامریڈ ایشور بھائی نے دیکھے تو وہ بھنا کر اپنے ڈبے کے اندر آ گیا اور کھڑکی کے قریب بیٹھ کر آہستہ آہستہ ہاتھ ہلانے لگا۔

گاڑی حرکت میں آ چکی تھی۔

درویش صورت ولی نے اپنی چھ گوشی کپڑے کی ٹوپی اتار کر ہوا میں اچھال دی۔ معتقدین نے ہوا میں بوسے لینے شروع کر دیئے اور ایک ایک کر دلی بجرنگ
کے پاؤں چھونے لگے۔ کامریڈ الیشور بھائی نے روحانیت پرستوں کی طرف ایک خشمگیں نگاہ اٹھائی جس میں ہر فرقے اور ملت کے لوگ شامل تھے۔ اس کے خیال میں
مسلمان ان کے انقلابی پرچم کے سوا اور کسی شے سے متاثر ہو کر ایک جگہ اکٹھے نہیں ہو سکتے تھے۔ گاڑی کالوڈ بیچ مسلمان پھولوں کے ڈھیر اور انواع و اقسام کی اشیائے
خوردنی سے اٹا پڑا تھا ولی بجرنگ بلی ایک سیٹ پر اس بات کی پرواہ کئے بغیر کہ ان کے پیچھے کوئی اور حضرت بھی تشریف فرما ہیں دراز ہو گئے۔ ان کے ہاتھ میں تسبیح تھی جس کی
انگلیاں زور سے گھوم رہی تھیں۔

کامریڈ الیشور بھائی نے پاس پڑے ہوئے کتابوں اور رسالوں کے ایک ڈھیر کو قرینے سے ہموار دیا۔ یہ گاڑی میں وقت گزارنے کا ذریعہ تھا۔ ایک رسالہ ابھی
انہوں نے ختم ہی کیا تھا کہ تیری رضا تیری کرامات کا ورد شروع ہو گیا۔ ولی صاحب اٹھ کر بیٹھ گئے تھے۔ ان کے چہرے پر بے پناہ جلال تھا۔ اور ان کا لمبا کرتا گھٹنوں
اور ہاتھ تسبیح کے دانے اپنی جگہ گھوم رہے تھے اور پان کے بیڑے پے در پے ولی صاحب کے منہ کے اندر جا رہے تھے۔ انہوں نے کمال بخشش سے ایک بیڑا الیشور بھائی کے
منہ میں ٹھونس دیا، جہاں پہلے سے ایک سگریٹ سلگ رہا تھا۔ سگریٹ ہونٹوں سے چھوٹ کر فرش پر آ گرا۔ ولی صاحب نے الیشور بھائی کے بگڑتے ہوئے تیوروں کی جنبش
دانہ کرتے ہوئے اس کے منہ پر الفاظ کا ایک غبار چھوڑ دیا۔ کام ادھورا ہے، مجھ لگے رہو۔ زمین کس کی۔ انسان کس کا۔ ہندو بھی کمال۔ مسلمان بھی کمال۔ صدقے صدقے۔ بیڑا ملک
باشندوں کے صدقے۔ رام بابا کیڑے مکوڑوں کو خوراک دیتا ہے۔"

کامریڈ الیشور بھائی ان تابڑ توڑ جملوں سے گھبرا اٹھا۔ ان کے منہ سے پان کا بیڑا نکل کر کھڑکی سے باہر جا چکا تھا۔ دوسرا سگریٹ سلگانے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے اس نے
اوپر تلے چھ سات کش کھینچے اور ڈبہ دھوئیں سے بھر دیا۔ ولی بجرنگ بلی کھانسنے لگے۔ الیشور بھائی نے ان کے ہاتھ کے چست اشارے کا مطلب نہ سمجھ کر ایک رسالہ ان کے آگے
کر دیا جس کے سرورق پر ایک نیم عریاں عورت کی تصویر تھی۔ ولی صاحب نے ایک وحشت ناک قہقہہ بلند کیا تو کامریڈ الیشور بھائی کو مسکراتے ہی بنی۔ اور اس کے ساتھ ہی ان
کی تقریر شروع ہو گئی۔ "انسانیت ذبح ہو رہی ہے۔ سرفروشی کی تمنا ختم ہو گئی ہے۔ ملک کی حدود خطرے میں ہیں۔ حکومت محنت کشوں کی، باقی سب فریب ہے۔" تقریر شاید اور
کھنچتی، لیکن ولی صاحب کی سسکیوں نے اس کا خاتمہ کر دیا۔ وہ ایک بچے کی طرح بلک رہے تھے۔ یکا یک انہوں نے اپنا سر لکڑی کے تختے کے ساتھ مارنا شروع کر دیا۔ الیشور بھائی
کے پاؤں تلے سے ریل کا ڈبہ کھسکنے لگا۔ اس نے ایسا نظارہ زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔ سراسیمگی کے عالم میں وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس وقت تک کھڑا رہا جب تک کہ اگلا اسٹیشن نہیں آ گیا
کئی اسٹیشن آئے اور نکل گئے۔ کامریڈ کئی بار اٹھا اور اٹھ کر پھر بیٹھ گیا۔ اس نے کئی اخباروں پر نظر ثانی کر ڈالی۔ مختلف کتابوں کے کئی صفحات پر سرخ پنسل سے نشانات
لگا دیئے۔ فرش پر سگریٹ کے ٹکڑوں کا انبار لگ چکا تھا۔ مزدور تحریک کے نشیب و فراز کے بارے میں ایک جامع مضمون بھی سپرد قلم ہو چکا تھا۔ لیکن زندگی موت اور محبت
کے رازوں کی مانند ولی بجرنگ بلی کی شخصیت کا راز اس کے لئے سربستہ ہی رہا۔ یہ راز کھلا اسی وقت جب خود فراموشی کے عالم میں ولی صاحب دنیا و مافیہا سے چند
ساعتوں کے لئے فرار ہو گئے اور نیند نے ان پر غلبہ پا لیا۔ کامریڈ الیشور بھائی کو محسوس ہونے لگا کہ وہ کسی آسمانی مخلوق کا ہم سفر ہے۔ اس نے ولی صاحب کو دھرتی
کے لال اکلوتے آدمی کے روپ میں دیکھنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ پھر ولی صاحب کی باتوں اور حرکتوں کو جنون اور خفقان سمجھ کر بھی کامریڈ نے جب اپنی گزشتہ بیس برس
کی محنت کا جائزہ لیا تو اس میں وزن کچھ کم ہی دکھائی دیا۔ آخر اس نے طے کر لیا کہ موقع پاتے ہی وہ ولی صاحب کے راستے کو ٹٹولنے کی کوشش کرے گا۔ کیونکہ زندگی کا
ہر بیماری کا علاج انقلاب ہی تو نہیں۔

ولی صاحب کی نیند گاڑی کو ایک جھٹکا لگنے کے ساتھ ٹوٹی۔ آنکھ کھولتے ہی انہوں نے اپنی تسبیح کامریڈ الیشور بھائی کے ہاتھ میں یہ کہہ کر تھما دی کہ انہیں رنگ
کا مزاج مل گیا۔ پھر آہستہ آہستہ سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا تو کامریڈ الیشور بھائی کو یہ محسوس ہوا کہ ولی بجرنگ بلی بھی دنیا سے بے نیاز نہیں ہیں۔ ان کا بڑھیا سوٹ کیس
ان کا ریشمی کرتا، چاندی کا پاندان، ان کے مریدوں کی طرف سے بھیجی ہوئی رقمیں ـــ یہ سب کیا ہے! ہاں چہرے کا جلال البتہ بے مثال ضرور تھا اور باعث رشک
تھی۔ ولی صاحب گہری سوچ میں غوطہ زن تھے۔ رہ رہ کر ان کے دل میں یہ پوچھنے کی کسک اٹھ رہی تھی کہ زندگی کا کونسا یقین کامریڈ کو زندہ رہنے پر مجبور کرتا ہے۔
مزدور، جن میں ہر مذہب و ملت کے مزدور شامل ہیں؟ جہاں کامریڈ الیشور بھائی کو ولی صاحب کی بے نیازی پر رشک ہو رہا تھا۔ وہاں ولی صاحب کامریڈ کا جلال

نکات کا گہری نظر سے مطالعہ کر رہے تھے۔

"عوام کو بھائی چارے اور مساوات کا اگر سبق دینا ہے تو لازم نہیں کہ سر پھٹول کرا کے ہی ایسا کیا جائے۔ نفرت پھیلانے سے فائدہ؟" کامریڈ ایشور بھائی نے سوچا اور طے کر لیا کہ وہ آئندہ سگریٹ نہیں پیئے گا۔

ولی صاحب نے ایک بار پھر حوصلہ کیا اور چاندی کا پاندان یہ کہہ کر کامریڈ کے حوالے کر دیا کہ زندگی کو خواب سمجھنے والے اب کچھ عرصہ کے لئے سامنے سے ہٹ ہی جانے چاہئیں۔

امرتسر تک پہنچتے پہنچتے ولی صاحب اپنا کل ساز و سامان لٹا چکے تھے۔ ہر اسٹیشن پر کچھ نہ کچھ سامان بکس اور بستر سے نکال کر کسی نہ کسی کو بس یونہی دے دیتے۔ کامریڈ پر اس کا بے حد اثر پڑ رہا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو کئی صلواتیں سنا دیں۔ "وہ اب صرف مہر و محبت کی دولت کا خریدار رہے گا۔" یہ اس کا آخری فیصلہ تھا۔

چند روز بعد جب اخبار میں یہ خبر شائع ہوئی کہ کامریڈ ایشور بھائی دنیا کو تیاگنے والا ہے اور اس نے اپنا نام تبدیل کر کے سوامی ایشور رکھ لیا ہے، تو سارے شہر میں ہلچل سی مچ اٹھی۔ مزدور ہزاروں کی تعداد میں اکٹھے ہونے شروع اور ان کے ساتھ ہی دیگر اہالیان شہر بھی۔ ہندو مسلمان بھی قیاس آرائیاں کرنے لگے تھے۔ کچھ نے افسوس بھی ظاہر کیا۔ لیکن عموماً یہی بات سننے میں آئی کہ پرماتما کا بندہ تھا، اب پرماتما کے کام میں لگ گیا ہے۔ عقیدت مندوں کی ایک بھیڑ تھی جو کم ہونے میں نہیں آتی تھی۔ سوامی ایشور کی کٹیا کے باہر ایک میلہ سا لگنے لگا تھا۔ ان میں عورتوں کی تعداد کافی ہوتی تھی۔

انہی دنوں ولی بجرنگ بلی کے پیروکاروں تک جب یہ خبر پہنچی کہ ولی صاحب نے عوام کی بہبودی کے لئے فقیری کا چولا چھوڑ کر ہاتھ میں سیاست کی تلوار پکڑ لی ہے تو لاکھوں زبانوں سے بہ یک وقت یہی سنائی دیا۔ "اللہ کے بندے ہی ظلم کے خلاف صحیح طور پر جہاد کر سکتے ہیں۔" اور پھر شہر میں نعرہ گونجا۔ "کامریڈ کرامت علی، زندہ باد۔" عوام نے سمجھ لیا کہ قوم کو گہری نیند سے جگانے کے لئے کامریڈ کرامت علی نے جنم لیا ہے۔ گزشتہ ریکارڈ تو صاف تھا ہی، دیکھتے ہی دیکھتے کامریڈ کرامت علی کے جھنڈے تلے لاکھوں مزدور اکٹھے ہو گئے۔ ان کی تقریروں میں بے خوفی، جوش اور بغاوت کے جذبات زیادہ ہوتے۔ شہر کی ہر گلی میں مزدور تحریک پھیل گئی اور عوام کے دل و دماغ پر صدائے انقلاب کامریڈ کرامت علی کا سکہ بیٹھ گیا۔

ایشور سوامی کو اپنی کٹیا میں ریاضت کرتے ہوئے پانچ روز گزر چکے تھے اور کامریڈ کرامت علی کو سحر بیانی کرتے ہوئے چھ دن ہو گئے تھے۔ شہر میں ان دونوں ناموں ہی کا چرچا تھا، جتنے منہ اتنی باتیں۔ ایشور سوامی کو کسی نے سراما بھگت کا اوتار قرار دیا تو کامریڈ کرامت علی کو ایشیا کا ٹراٹسکی بنا دیا گیا۔

"ایشور سوامی کو کل رات بھگوان وشنو کے درشن ہوئے ہیں۔" ایک پنجابی عورت نے محلے میں چائے کھاتے وقت گڑ بیچنے والے سے کہا۔

"کامریڈ کرامت علی کے پاس امریکہ اور روس کے لیڈروں کے خط آتے ہیں۔" کپڑا مزدور یونین کے ایک مزدور نے مالک مکان کو کرایہ دیتے ہوئے سنا دیا۔

جس دن کپڑا مزدور یونین میں ہڑتال ہوئی اسی روز سورج کو گرہن لگا۔ جیوتشیوں نے علم "غیب کا حساب پھیلایا تو یہ نتیجہ نکلا کہ شہر کے سب سے بڑے دھرماتما کو جو دن کا برت رکھنا چاہیئے ورنہ زمین میں دراڑ پڑ جائے گی۔ ہزاروں مرد عورتوں نے صبح اشنان کیا اور ایشور سوامی کی کٹیا کی طرف چل دئے، کیونکہ شمالی ہندوستان میں ان کے علاوہ اب اور کوئی برگزیدہ ہستی نہ تھی، جو یہ مبارک کام سرانجام دے سکتی۔ ایشور سوامی ابھی ٹھنڈے بادا موں کا گلاس پینے ہی والے تھے کہ انہیں عقیدت مندوں کی خواہش سنا دی گئی۔ چنانچہ اسی وقت سے ان کا برت دیدوں کے منتروں کے ساتھ شروع ہو گیا۔

کپڑا مزدور یونین کی ہڑتال پھیلی تو دوسرے کارخانے بھی اس خدشے سے بند کر دیئے گئے کہ کہیں مزید گڑبڑ نہ ہو۔ گاندھی میدان میں ایک جلسہ صدائے انقلاب کامریڈ کرامت علی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ لاوا پھوٹ نکلا۔ "ظالم حکومت سے کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔ حکومت مزدوروں کی، باقی فریب ہے۔" کامریڈ کرامت علی انتہائی غصے میں تین گھنٹے تک خطبۂ صدارت پڑھتے رہے۔ اور جلسے کے بعد جب وہ موٹر میں بیٹھ کر شہر کے گشت کے لئے نکلے تو راستے میں گرفتار کر لئے گئے۔ ان پر تعزیرات ہند کی کئی دفعات لگا دی گئیں اور وہ مرکزی جیل میں پہنچا دیئے گئے۔

شہر کے سب تجارتی مرکز بند ہو چکے تھے۔ ایک طرف ایشور سوامی کی جھونپڑی زیارت کدہ بن چکی تھی۔ دوسری طرف مرکزی جیل کا طواف ہو رہا تھا۔ پولیس کے

گشتی دستے الگ پریشان تھے۔ ان کے لئے نقب زنوں سے محلے بچانے مشکل ہو رہے تھے۔ ایشور سوامی کے گرویدہ عوام اب اس بات کے آرزو مند تھے کہ سوامی جی انہیں درشن دیں۔ اور مزدوروں کا یہ مطالبہ تھا کہ ان کے ایک وفد کو کامریڈ کرامت علی سے ملاقات کرنے کی اجازت دی جائے۔ اخباروں کے نامہ نگاران ہر دو اصحاب سے مل کر ان کے بیانات قلمبند کرنے پر مصر تھے۔ مگر نا امیدی کے علاوہ انہیں ابھی تک کچھ نہ ملا تھا۔

شام کو شہر کی خدا پرست عورتوں نے فیصلہ کیا کہ وہ آدھی رات کو ایشور سوامی کو خود اپنے ہاتھوں سے اشنان کر دائیں گی۔ مزدوروں کی عورتیں یہ پہلے ہی طے کر چکی تھیں کہ وہ آدھی رات کو جیل گھر کے سامنے چھاتیاں پیٹ کر زبردست ماتم منائیں گی۔ یہ دونوں فیصلے کسی نہ کسی طرح ایشور سوامی اور کامریڈ کرامت علی تک بھی پہنچ گئے۔ آدھی رات کو شہر میں ایک نیا جوش و خروش تھا۔ لوگ گھروں میں جانے کا نام نہ لیتے تھے۔ صرف جیل کے اندر اور ایشور سوامی کی کٹیا کے اندر خاموشی تھی اور وہ خاموشی کان پھوڑ سناٹوں میں تبدیل ہو چکی تھی۔

آدھی رات کو جب عورتوں کے دو علیحدہ علیحدہ جلوس اپنے اپنے مقصد کی خاطر روانہ ہوئے تو اس وقت ایشور سوامی اور کامریڈ کرامت علی چادریں پہنے ایک پسنجر گاڑی کے تھرڈ کلاس کے ڈبے میں گھسنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جو آدھی رات ہی کو وہاں سے روانہ ہوتی تھی اور جس میں آج رش بالکل نہیں تھا۔

ایشور سوامی پندرہ روز کے برت کی تاب نہ لا کر بھاگ نکلے تھے اور کامریڈ کرامت علی معافی نامہ لکھنے پر رہا کر دیئے گئے تھے۔ ایشور سوامی پھر سے کامریڈ انیسو بھائی بننے کی سوچ رہے تھے اور کامریڈ کرامت علی کا خیال تھا ان کو دوبارہ ولی بجرنگ بلی بن جانا چاہئے۔

بارہ ۱۲ سالہ نمبر کی بے پناہ مقبولیت کے بعد
اپنی مثال آپ

ماہنامہ "جام نو" کراچی

کا

افسانہ نمبر

جس میں ہند و پاک کے مشہور اہل قلم حصہ لے رہے ہیں
ماہ اگست میں

یوم آزادی کے موقع پر پیش کیا جا رہا ہے۔ ضخامت ۲۵۰ صفحات۔ بہترین لکھائی ستھری چھپائی اور دلکش سرورق کے ساتھ اس حسین و جمیل مجموعہ کی قیمت دو روپے ہوگی۔ سالانہ خریداروں کو یہ نمبر مفت پیش کیا جائے گا۔

اس نمبر کو مفت حاصل کرنے کے لیے
جلد از جلد جام نو کی مستقل خریداری قبول فرمائیے۔ زر سالانہ :- پانچ روپے ـــ تین سال کی قیمت۔ دس روپے

ترسیل زر کا پتا :- منیجر جام نو ـــ ۲۹ بے/۶۷ بلاک نمبر ۲۔ پی ای سی ایچ سوسائٹی۔ فون نمبر :- ۴۲۰۷۲

ایم کاٹھیاواڑی راہی

بیسویں صدی دہلی۔

رئیسِ اعظم

ہارن کی تیز آواز نے کیلاش کی سوچ کو منقطع کر دیا، کنارے ہوتے ہوئے اُس نے مڑ کر دیکھا، کار رک گئی تھی۔

"ارے دیکھ کیا رہے ہو رومیو!" ایک خوش پوش نوجوان کار سے نکلتے ہوئے بولا "کیا بھول گئے؟"

"نریندر" وہ زیرِ لب بڑبڑایا۔ اور پھر جیسے اُسے اپنا ایک بھولا ہوا دوست یاد آ گیا۔ کالج کا منچلا ساتھی۔ مفلس، مگر من کا راجہ! کیلاش حیرت سے تکنے لگا۔

"ارے گھورتے کیا ہو میں کوئی حسینہ نہیں۔" نریندر اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے چہکا "کب آئے۔ کیسے ہو۔ کیا کرتے ہو... آؤ آؤ... میری کار میں بیٹھو، میری کوٹھی میں چلو۔"

نریندر کا یہ ٹھاٹ باٹ کیلاش کے احساسِ کمتری کو ہوا دینے لگا۔ وہ کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے بولا۔

"نہیں رہنے دو۔ مجھے ذرا ایک کام ہے۔"

"ارے واہ!" نریندر بولا "یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ سالوں بعد ہم ملے ہیں، یوں ہی نہیں جانے دوں گا۔ تمہیں میری کوٹھی میں چلنا ہی پڑے گا!"

"مگر نریندر... یہ تم کوٹھی بنگلے والے کب سے ہو گئے، کیسے ہو گئے..."

"یہاں سڑک پر کیا بتاؤں۔ اب دیر نہ کرو جلدی سے چلو۔ چل کر فوراً سوٹ وغیرہ پہنو... یہاں اس بھیچڑ لباس میں تمہیں دیکھ کر لوگ مجھے کیا کہیں گے۔ میری مزید انسلٹ نہ کرو..."

"بڑے آئے عزت والے!" کیلاش تنک کر بولا "جاؤ رئیس صاحب جاؤ، اپنی راہ لو۔ میں ٹھہرا بیکار قلاش۔ میرا تمہارا کیا ساتھ!"

"دیکھو بیٹے! یہ طنز بازی نہیں چلے گی۔ سیدھی طرح چلتے ہو کہ..." نریندر اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا "بلاؤں پولیس کو!"

لیکن بات اسے لگ گئی تھی۔ نریندر طرح طرح سے اصرار کرتا رہا۔ کیلاش ہاتھ چھڑا کر آگے بڑھ گیا۔ نریندر نے لپک کر اپنے پتے کا کارڈ تھما دیا۔ اور بولا۔

"میرا دولت خانہ تمہارا غریب خانہ بن سکتا ہے۔ اس شہر میں جب تمہاری خودداری دم توڑنے لگے تو سیدھے سے چلے آنا..."

کئی دنوں کی تگ و دو کے بعد کیلاش کو ملازمت مل گئی۔ ایک لانڈری میں پچاس روپے ماہوار کی۔ فی الحال اسی کو اُس نے غنیمت جانا۔ لانڈری ہی میں رہنے لگا۔ ایک روز اُسے نریندر کی یاد آئی۔ وہ سوچنے لگا۔ نریندر اتنا بڑا آدمی کیسے بن گیا۔ اس دور میں جبکہ قسمت ایک خواب ایک خیال بن کر رہ گئی ہے، کیسے بدلا جا سکتی ہے۔ پتے کے کارڈ پر موٹے حرفوں میں اس کا نام چھپا تھا۔ کیلاش نے سوچا، کیوں نہ ایک بار جا کر اس سے مل آئے۔ وہ اگر "رئیس" ہے تو اپنے گھر کا۔ لیکن دوا کوئی پیتا مر گیا تھا۔ بازار بند تھا۔ کیلاش نے جو اس کی لانڈری میں سب سے اچھا سوٹ دھلنے آیا تھا، زیب تن کیا۔ جوتوں پر پالش کروائی۔ ایک پیکٹ قیمتی سگریٹ اور

خرید کر تحفہ دینے ملنے کے لئے چل پڑا۔

شام کا وقت تھا۔ کوٹھی کے خوبصورت لان پر ایک نوجوان لڑکی بیٹھی کوئی ناول پڑھ رہی تھی۔ بہار کا موسم تھا۔ کیلاش نے لڑکی کو متوجہ کرنے کے لئے سیٹی بجائی۔

"سیٹی آپ نے بجائی؟"

"جی ہاں۔"

"لوفر معلوم ہوتے ہیں آپ!"

"آپ کا کیا خیال ہے؟"

"کون ہیں آپ؟"

"ہونگا کوئی۔ آپ کی بلا سے۔ ہو سکے تو ذرا نریندر صاحب سے کہہ دیجئے کیلاش صاحب آئے ہوئے ہیں۔"

"تو جناب کا نام کیلاش ہے!"

"جی نہیں کیلاش صاحب!"

لڑکی غصے کے باوجود مسکرا دی۔ جواب میں کیلاش ہنسنے لگا۔ وہ اٹھ کر پاس آتے ہوئے بولی۔

"آپ نریندر صاحب کے دوست ہیں۔"

"جی ہاں!"

"بھیسے پچھلے ہیں!"

"کون، میں یا نریندر؟"

"آپ دونوں۔"

وہ زیرِ لب مسکرانے لگی

کیلاش نے پوچھا۔

"کیا وہ اس وقت موجود نہیں ہیں؟"

"جی نہیں" لڑکی چلتی ہوئی بولی۔ "آیئے ہم ڈرائینگ روم میں بیٹھیں۔ وہ اب آ ہی رہے ہوں گے۔"

ڈرائینگ روم کافی شاندار تھا۔ قالین کے شیر بتا رہے تھے۔ ہم رئیس اعظم ہیں۔ دیواروں کی تصویریں بتا رہی تھیں۔ ہم رئیس اعظم ہیں، شیشے کے گلدان در سنگ مرمر کے ننھے ننھے مجسمے بتا رہے تھے ہم رئیس اعظم ہیں۔ ہر شئے یہی کہہ رہی تھی۔۔۔ کیلاش کا دل دھڑکنے لگا۔ لڑکی سامنے والے صوفے پر جا بیٹھی تھی۔ کیلاش کو چپ پا کر بولی

"آپ خاموش کیوں ہو گئے؟"

"کیا کہوں؟"

"کیا آپ دونوں کالج میں ساتھ ہی پڑھتے ہیں؟"

"جی ہاں!"

"تب۔۔۔ تب شاید وہ آپ ہی کا ذکر اکثر کیا کرتے ہیں۔۔۔!"

لڑکی نریندر کے گن گانے لگی تھی۔ کیلاش کو شک ہونے لگا۔ کہیں یہی تو اس کی بیوی نہیں ہے۔ آخر پوچھ بیٹھا۔

"کیا آپ ان کی واقف ہیں؟"

"جی!__ جی نہیں۔۔۔ میں تو۔۔۔ میں تو۔۔" وہ شرم سے سرخ ہونے لگی۔

"معاف کیجئے گا۔ یہ پوچھ کر میں نے گستاخی کی۔"

اور ابھی وہ کچھ کہنے ہی کو تھی کہ چائے آگئی۔

بوڑھے ملازم نے کیلاش پر ایک اچٹتی نگاہ ڈالی۔ اور پھر لڑکی کو گھورتا ہوا ڈرائینگ روم سے نکل گیا۔

"مگر نریندر صاحب تو آپ کو ہمیشہ گاندھی جی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔۔" لڑکی چائے بناتے ہوئے بولی۔

"جی ہاں، کالج میں سب مجھے یہی نک نیم ملا تھا۔" کیلاش نے کہا۔

"ہر نک نیم کے پیچھے کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی ہے۔" لڑکی ہنستی ہوئی بولی۔ معلوم ہوتا ہے آپ کی عادت اپدیش دینے کی رہی ہے!"

"نریندر نے اس بارے میں کچھ نہیں بتلایا؟" کیلاش نے اپنی جھجک محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

لڑکی کھل کھلا کر ہنسنے لگی۔ کیلاش نے غور سے دیکھا۔ وہ ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ دل کش خدوخال۔ بڑی بڑی آنکھیں۔ لانبی لانبی پلکیں گھنی زلفیں۔۔۔ بکن اُسے ہنستے دیکھ کر کیلاش سے نہ رہا گیا۔ جانے کہاں آپھنسا ہوں! جانے نریندر کی یہ کون ہے؟ جانے نریندر کہاں لاپتہ ہے! اس نے یہی کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

"نریندر صاحب آخر کہاں ہیں؟"

"ہوں گے کہیں۔ چھوڑیئے ان کی بات۔" وہ بے تکلفانہ لہجے میں بولی۔ "آپ کی باتیں اُن سے سُن سُن کے آپ کو دیکھنے کا شوق پیدا ہو چلا تھا۔ شکر ہے درشن ہو گئے۔ لیکن وہ کہتے تھے۔ ہمارا گاندھی اپنی نیک خصلتوں کی بنا پر بھکاری بنا گھومتا ہے۔ مگر میں دیکھ رہی ہوں آپ نریندر صاحب سے کم رئیس نہیں نظر آتے۔

"دیکھئے۔ آپ کو مجھ پر چوٹ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔۔۔"

"اگر اسے آپ چوٹ سمجھتے ہیں تو نریندر صاحب کی طرف سے سمجھ لیجئے۔" یوں جانئے۔ میں انہی کی طرف سے بول رہی ہوں۔ اس نے آنکھیں مٹکا کر کہا۔

کیلاش پھر سوچ میں پڑ گیا۔ اپنے آپ پر اُسے غصہ آنے لگا۔ اور اس سے زیادہ اس سوٹ پر جسے وہ نریندر اور اس کی فیملی پر رعب جمانے کے لئے پہنے ہوئے تھا وہ جلد سے جلد یہ جان لینا چاہتا تھا کہ نریندر دیکھتے ہی دیکھتے "رئیس اعظم کیسے بن گیا۔ یہ کوٹھی یہ شان و شوکت، بڑے شہر میں قدم رکھتے ہی اس جیسے جنم جنم کے مفلس کو کیونکر مل گئی۔

"کس سوچ میں پڑ گئے گاندھی جی؟" لڑکی نے پھر چوٹ کی۔ وہ تلملا اٹھا۔

"کیا آپ نہیں جانتیں، گاندھی جی لنگوٹ باندھا کرتے تھے۔"

"مگر بڑھاپے میں!" لڑکی چہک کر بولی۔ "جوانی میں تو سوٹ ہی پہنتے تھے۔"

وہ لاجواب سا ہو گیا۔ اسے ہنسی آگئی۔ لڑکی اب قہقہہ لگانے لگی تھی۔ اور اس قہقہے نے اس کے آنچل کو سینے سے ڈھلکا دیا تھا لیکن وہ اس سے بے نیاز تھی۔ کیلاش کا "گاندھی پن" لرز اٹھا۔ اتنے میں لڑکی نے موضوعِ سخن بدلا۔

"نریندر صاحب نے تو شادی کر لی۔ لیکن کیا میں پوچھ سکتی ہوں آپ نے کی؟"

"جی نہیں۔"

"کیوں؟"

"آپ جیسی کوئی شوخ بیرمان نہیں ہوئی ابتک۔" کیلاش نے طنز کیا۔

وہ یک بیک سنجیدہ ہو گئی۔ اور سنجیدہ ہی نہیں کچھ مغموم بھی اور مغموم ہی نہیں . . .

"یہ کیا؟ آنسو دیکھ کر کیلاش بول اٹھا۔

"یوں ہی۔ بس یوں ہی۔" وہ اپنے آنسوؤں کو نہ روک سکی۔ کیلاش حیرت میں پڑ گیا۔ اُسے محسوس ہوا جیسے کوئی ڈرامہ دیکھ رہا ہو۔ یا خواب؟ سکون کی غرض سے پوچھ بیٹھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"لتا۔"

"تم نریندر کی کون ہو؟"

"آپ کا کیا خیال ہے؟"

"پہلے خیال تھا، بیوی۔"

"اور اب کیا خیال ہے؟"

"اب . . . اب تو یہی خیال ہے کہ اس کی بیوی کی رشتہ دار ہو۔"

لڑکی کی آنسو بھری آنکھیں ہنس پڑیں۔ اس کی آنسو بھری ہنسی نے کیلاش کو الجھن میں ڈال دیا۔ ایک نئی الجھن میں۔ وہ کہنے لگی۔

"یہ شہر بہت بڑا ہے۔ بہت بڑے بڑے لوگ اس شہر میں بستے ہیں۔ نریندر صاحب بھی اس شہر میں غریب آئے تھے۔ مگر شادی کرکے مالدار بن گئے۔ آپ بھی شادی کرکے مالدار بن جائیے۔ آپ بھی شادی کرکے مالدار کہلا سکتے ہیں۔ رئیس کہلا سکتے ہیں۔ کلب جا سکتے ہیں۔ ڈانس کر سکتے ہیں۔ کار میں گھوم سکتے ہیں کیونکہ آپ میں وہ سب خوبیاں ہیں جو نریندر صاحب میں تھیں۔ آپ ان سے کہیں زیادہ پرکشش اور تندرست ہیں۔"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔ کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"دستے میں مجھے جو دولت ملنے والی تھی وہ ساری کی ساری نریندر صاحب کو مل گئی۔ میرے پاس تو حسن ہی حسن رہ گیا۔ مگر خالی حسن کیا کر سکتا ہے۔ اس زمانے میں تو لوگ شادیاں دولت سے کرتے ہیں۔ کوٹھی سے کرتے ہیں۔ کار سے کرتے ہیں۔

لتا ابھی اور جانے کیا کیا کہتی۔ اتنے میں ہارن کی آواز نے اسے چونکا دیا اس نے جلدی سے آنسو خشک کئے۔ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اور بولی۔

"میری باتیں بری لگی ہوں تو خیال نہ کیجئے گا۔ نریندر صاحب آ گئے۔"

"آخاہ . . ." اندر قدم رکھتے ہی نریندر بول اٹھا۔ اور لپک کر کیلاش سے لپٹ گیا۔

اس کے پیچھے بھدی سی ایک بوڑھی عورت کھڑی تھی۔ لتا اس عورت سے سرگوشیانہ لہجہ میں بولی۔ "یہ نریندر صاحب کے دوست کاندھی ہیں۔"

"پھر تم نے نام لیا؟" وہ عورت بگڑی۔ "سو بار کہا کہ ڈیڈی کہا کرو!"

"ڈیڈی!" نریندر کی گرفت سے اچھلتے ہوئے کیلاش چیخا۔ "کون ڈیڈی۔ تم ڈیڈی؟ ــــ تم نریندر! اس نوجوان لڑکی کے ڈیڈی؟"

وہ عورت اپنے مصنوعی دانت پیستی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ لتا چلی گئی۔ نریندر کے شگفتہ چہرے پر ملال کا گہرا رنگ چھا گیا۔ سر جھک گیا۔ ایک مالدار کا سر۔ ایک رئیس اعظم کا سر۔ اور لتا کے الفاظ کیلاش کے دماغ میں گونجنے لگے۔ "ورثے میں مجھے جو دولت ملنے والی تھی وہ ساری کی ساری نریندر صاحب

[illegible] شادیاں دولت سے کرتے ہیں۔ کوٹھی سے کرتے ہیں۔ کار سے کرتے ہیں!"

ایک زر پرست درویش

۱۹۱۲ء میں حکیم محمد اجمل خاں صاحب کے ایما پر میں نے ہفتہ وار اخبار طبیب جاری کیا تھا. اس کی وجہ سے حکیم صاحب کے ہاں میرا بہت جانا تھا. دلی سے آٹھ میل دور ایک جگہ ہے جو کالکاجی کہلاتی ہے. یہ کوئی آباد بستی نہیں ہے. صرف کالکا دیوی کا مندر ہے. اور مورتی کے زائرین کے لئے چھوٹے چھوٹے دو تین کمرے مندر سے بنے ہوئے ہیں جو حکیم صاحب بغرض تبدیلی آب و ہوا کبھی کبھی کالکاجی جاکر رہتے تھے. مجھے حکم تھا کہ اتوار کے اتوار وہاں بھی حاضر ہوں. ایک دفعہ گیا تو حکیم صاحب کے احباب خاص نواب فیض احمد خاں، خان بہادر غلام محمد حسن خاں، شمس العلما مولوی سید احمد امام جامع مسجد اور خان بہادر مولوی عبدالاحد مالک مطبع مجتبائی وغیرہ تو صحن میں تشریف فرما تھے اور دھوپ کا لطف لے رہے تھے. جاڑے کا موسم تھا، لیکن خود حکیم صاحب موجود نہ تھے. ادریس ملازم نے بتایا "کمرے کے اندر ہیں." مجھے دلچسپی کی جلدی تھی. ادریس سے کہا "اطلاع کر دو." کمرے میں عجیب منظر دیکھا، حکیم صاحب مسند کے کنارے دوزانو بیٹھے تھے اور مسند پر گاؤ تکئے سے ٹیک لگائے کوئی صاحب جوان العمر قصباتی وضع قطع کے رونق افروز تھے. اخبار کے متعلق گفتگو شروع ہوئی تو ان قصباتی صاحب نے دخل دیا. میں تھا اس وقت نوجوان ایڈیٹر. میں قصباتی صاحب سے اس طرح بولا جیسے کہہ رہا ہوں "تم کیا سمجھو گے!" حکیم صاحب نے گردن بہت آہستہ سے ہلائی. گویا مجھے منع کیا کہ ایسا طرز مت اختیار کرو. حکیم صاحب سے میں بے حد متاثر تھا حکیم صاحب دلی کے بے تاج بادشاہ تھے. حکیم صاحب کے مرتبے کا آدمی دلی میں دوسرا نہیں تھا. مسیح الملک کے دور میں تو وہ ملک کے عظیم ترین آدمی تھے ہی، حاذق الملکی کا دور بھی کچھ کم نہیں تھا. اس دور میں کم از کم مسلمان لیڈر انہیں ضرور اپنا پیشوا مانتے تھے. ایسے اجتماع میری نظر میں ہیں، جن سے ثابت ہوتا تھا کہ مسلمان لیڈروں کو حاذق الملک کی رہنمائی کی احتیاج ہے. اس شان کے شخص کا جوان العمر قصباتی کے سامنے مودب بیٹھنا اور پھر مجھے بھی تنبیہ کرنا، ایسا معمولی امر نہیں تھا کہ میں قصباتی صاحب سے مرعوب نہ ہو جاتا.

کالکاجی سے دلی آنے کے واسطے ریلوے اسٹیشن پر گاڑی کا انتظار کیا جا رہا تھا. حکیم صاحب کے سب احباب میرے بزرگ تھے. میں ان سے الگ کھڑا تھا کہ وہی جوان العمر قصباتی درویش وارد ہوئے اور حکیم صاحب کے احباب کے بجائے میرے پاس آ گئے. کہا کہ میں بلی مارو[ں] میں حاجی عبدالغنی کے ہاں مقیم ہوں. آج تو نابھے جا رہا ہوں، وہاں فلاں مجذوب بیمار ہیں. انہوں نے بلایا ہے. غالباً بچیں گے نہیں. تم اگلے ہفتے ملنے آؤ. میں جانتا تھا کہ اہل اللہ مرنے لگتے ہیں تو اہل اللہ کو ہی بلاتے ہیں. عقیدت کا رنگ اور گہرا ہو گیا. میرے چچا زاد بھائی سید منظور احمد اتفاق سے اس زمانے میں نابھے گئے ہوئے تھے. تیسرے چوتھے دن دلی لوٹے تو ان سے مجذوب صاحب کا حال دریافت کیا. منظور احمد نے کہا کہ مجذوب صاحب اترسوں انتقال کر گئے. مشہور مجذوب تھے. نام ذہن سے اتر گیا ہے. غرض عقیدت میں اور اضافہ ہوا اور حکیم صاحب کے شاہ صاحب سے اتنا ملنا شروع کیا کہ خواجہ حسن نظامی

بڑبڑ گئے کہ تم کیوں چکر میں پڑے ہو۔

میں خواجہ صاحب کے روکنے کے بعد گیا تو شاہ صاحب نے کہا "روکتا ہے، ہمارے پاس آنے سے روکتا ہے۔ گویا ہم تیرے لال توڑ لیں گے۔ شاہ صاحب بھی تو کہتے تھے، کبھی آپ، کبھی سالک رہتے تھے، کبھی جذب طاری ہو جاتا تھا۔ ایک دن شام کو پہنچا۔ چوہدری فتح محمد کو قوال دہلی اور کئی اور پولیس افسر شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر تھے۔ مجھے دیکھتے ہی فرمایا "تو نے ہماری نماز خراب کر دی۔" میں حیرت سے منہ تکنے لگا، تو کو قوال صاحب نے کہا "ابھی ہم لوگ عصر کی نماز پڑھ رہے تھے۔ سلام پھیر کر شاہ صاحب نے فرمایا تھا کہ واحدی آ رہا ہے۔ نماز میں آپ کا خیال شاہ صاحب کو آ گیا تھا۔"

ایک دفعہ ایک اور صاحب میرے ساتھ تھے جو شاہ صاحب نہیں جانتے تھے۔ انہیں دیکھ کر شاہ صاحب نے ان کی ایک ایسی پوشیدہ بات بتا دی کہ ان کی گھگی بندھ گئی۔

ایک دفعہ ایک صاحب نے مجھ سے کہا کہ اپنے شاہ صاحب کو ذرا میرا یہ پیغام دینا کہ "دلّی میں دو نہیں رہ سکتے"۔ پیغام والے صاحب محکمۂ ڈاک کے نسپکٹر تھے۔ کوٹ، پتلون، ترکی ٹوپی اور انگریزی جوتا پہنتے تھے، مگر داڑھی بھی رکھتے تھے اور نماز روزے کے بہت پابند تھے اور نیک عمل انسان تھے۔ مجھ سے کہا کرتے تھے کہ آپ کی خاطر دلّی کا تبادلہ کرا لیا ہے۔ میرے ہاں فرض منصبی ادا کرنے کے علاوہ اکثر تشریف لاتے تھے۔ میں نے ان کا پیغام شاہ صاحب کو سنایا تو شاہ صاحب نے فرمایا "اچھا کہہ دینا ایک ہی رہے گا۔" پہلی جنگ عظیم شباب پر تھی۔ انسپکٹر صاحب میدان جنگ کے ڈاک خانے میں بھیج دیئے گئے اور وہاں ہلاک ہو گئے۔ بس نے "دو نہیں رہیں گے" کا مطلب لیا کہ دو قطب ایک ایک شہر میں نہیں رہیں گے۔ انسپکٹر صاحب میں بھی قطبوں کے سے اوصاف تھے۔

المختصر اس قسم کے واقعات روز دیکھتا تھا اور عقیدت میں اضافے پر اضافہ ہو رہا تھا۔ یکایک شاہ صاحب نے حاجی عبدالغنی کا مکان چھوڑ دیا۔ اور حکیم صاحب کی ایک کوٹھی جا بسائی۔ کوٹھی کشمیری دروازے کے قریب کہیں تھی۔ میں وہاں نہیں گیا۔ وہاں کی بابت معلوم ہوا کہ حکیم صاحب نے راجاؤں اور نوابوں سے تعارف کرا دیا ہے۔ اور شاہ صاحب پر رُپے کا مینھ برس رہا ہے اور اب ہر کس و ناکس کی باریابی دشوار ہے۔ میں نے اس امتحان میں پڑنا پسند نہیں کیا۔ البتہ بہت عرصے بعد ایک دفعہ خاص شاہ صاحب کی کوٹھی دیکھنے گیا۔ کوٹھی شاہ صاحب نے قصبہ مہرولی کے جنگل میں ایکڑوں زمین خرید کر کئی لاکھ رُپے کی لاگت سے بنائی تھی، شاندار کوٹھی تھی۔ اب بھی ہو گی۔ مگر میں شاہ صاحب سے نہیں ملا۔ کوٹھی کی سیر کر کے چلا آیا۔

یوں ہی دن گزرتے گئے۔ ایک دفعہ خواجہ حسن نظامی صاحب نے ٹیلی فون میں کسی سے کہا "بیٹا میری عمر بیالیس سال ہے"۔ خواجہ صاحب کا انداز گفتگو عجیب سا تھا۔ میں نے پوچھا "کون صاحب تھے؟" جواب دیا "جناب کے شاہ صاحب تھے۔ مجھ پر رعب جما رہے تھے کہنے لگے، بیٹا، میری عمر چالیس ہے، میں نے بھی کہہ دیا کہ میری عمر بیالیس سال ہے۔"

ایک دن میں اور خواجہ صاحب موٹر میں جا رہے تھے۔ شاہ صاحب پیدل آتے نظر آئے۔ شاہ صاحب نے موٹر رکوائی اور خواجہ صاحب سے چپکے چپکے باتیں کیں۔ مجھ سے ایسے رہے جیسے پہچانتے نہیں۔ میں بھی خاموش رہا۔ چلے گئے تو خواجہ صاحب نے فرمایا "حیدر آباد دکن جانا چاہتے ہیں۔ مہاراجہ کشن پرشاد اور دوسرے عمائد کے نام تعارف نامے مانگتے تھے کہئے دوں یا نہ دوں؟" خواجہ صاحب نے تعارف نامے دے دیئے اور شاہ صاحب کئی برس حیدر آباد میں ٹھہرے اور ۱۹۴۰ء میں دوبارہ دلّی آئے۔

۱۹۴۰ء کا واقعہ ہے، ایک دن میں اپنے دفتر میں بیٹھا میونسپل پریس کے منیجر مسٹر عبدالستار تیموری سے باتیں کر رہا تھا کہ اچانک شاہ صاحب میز کے آگے آ کر کھڑے ہو گئے اور بولے "خواجہ صاحب ہیں؟" میں نے کہا "نہیں ہیں"۔ تیموری صاحب نے کہا "شاہ صاحب تشریف رکھئے"۔ اور تیموری صاحب شاہ صاحب کا مجھ سے تعارف کرانے لگے۔ تیموری صاحب نے حیدر آباد میں شاہ صاحب کو دیکھا تھا۔ میں نے کہا "میں ۱۹۱۲ء سے واقف ہوں۔ شاہ صاحب مجھے بھول گئے۔ میں نہیں بھولا ہوں"۔ اب شاہ صاحب کا میرے ہاں آنا جانا کھل گیا۔ میں نے ایک دن شاہ صاحب سے پوچھا کہ آپ کا وہ وصف کہاں جاتا رہا۔ فرمایا "بس یہ سوال مت چھیڑیئے"۔ شاہ صاحب کنگال ہو چکے تھے۔ مہرولی والی کوٹھی بک چکی تھی۔ اُن کے بیوی بچے نہیں تھے۔ ایک لڑکے کو متبنیٰ کر لیا تھا۔ متبنیٰ نے خوب رُپیہ اڑایا۔ اپنے تئیں

تم کر لیا اور شاہ صاحب کو بھی ختم کر دیا۔

شاہ صاحب کا وہ وصف تو روپیہ برستے ہی سلب ہو گیا تھا۔ متعلقین نے روپیہ بھی خالی سے لگا دیا۔ نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم۔ نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر رہے۔

۱۹۱۳ء، ۱۴ء، ۱۵ء میں شاہ صاحب کو جو شے حاصل تھی، ۱۹۴۰ء میں اس کا نشان سا باقی تھا۔ ۱۹۱۳ء، ۱۹۱۴ء میں بھی شاہ پر وحی نہیں اترتی تھی۔ وحی پونے چودہ سو سے نہیں اتری اور جب اترا کرتی تھی، تب بھی اللہ نے اپنے سب سے بڑے رسولؐ سے فرمایا تھا: قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَکُمْ عِنْدِیْ خَزَآئِنُ اللّٰہِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَیْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَکُمْ اِنِّیْ مَلَکٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ ۭ قُلْ هَلْ یَسْتَوِی الْاَعْمٰی وَالْبَصِیْرُ ۭ (کہو مجھے دعوا نہیں ہے کہ میں اللہ کے خزانوں کا مالک ہوں نہ مجھے غیب کا علم بھی نہیں ہے اس کا مدعی ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔ میں تو وحی کا متبع ہوں۔ اللہ کی طرف سے جو علم ہوتا ہے اور حکم آتا ہے۔ اس کے مطابق کہتا اور کرتا ہوں (مزید) کہو یہاں تک وحی کا تعلق ہے، بے شک وہ میں جانتا ہوں، جو دوسرے نہیں جانتے۔ اور وہ دیکھتا ہوں، جو دوسرے نہیں دیکھتے اور دیکھنے والا اور نہ دیکھنے والا کیا برابر ہو سکتا ہے؟ (مفہوم سورۃ ۶ آیت ۵۰)

دوسری جگہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہوایا۔ قُلْ لَّآ اَمْلِکُ لِنَفْسِیْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُ ۭ وَلَوْ کُنْتُ اَعْلَمُ الْغَیْبَ لَاسْتَکْثَرْتُ مِنَ الْخَیْرِ ۚ وَمَا مَسَّنِیَ السُّوْٓءُ ۚ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِیْرٌ وَّبَشِیْرٌ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ (کہہ دو کہ میری اپنی ذات کا نفع نقصان (بھی) میرے ہاتھ میں نہیں ہے۔ میرے ساتھ وہی ہوتا ہے جو اللہ چاہتا ہے۔ میں اگر غیب کی بات (بطور خود) جان لیا کرتا تو (اپنے لئے) نفع ہی نفع سمیٹتا۔ اور نقصان مجھے چھونے نہ پاتا۔ میں تو بس ان لوگوں کو جن میں ایمان لانے کی صلاحیت ہے اور جو ایمان لاتے ہیں (اللہ کی جانب سے) ڈرا اور خوش خبری سنانے والا ہوں (غلط روش کے تباہ کن عواقب اور صحیح روش کے خوش گوار نتائج سے آگاہ کرنے والا) اسی کا علم مجھے وحی کے ذریعے ملتا ہے۔ (مفہوم سورہ ۷، آیت ۱۸۸)

ایک اور مقام پر ہے:۔ وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَکْسِبُ غَدًا ۭ وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌۢ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ۭ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ (کسی کو خبر نہیں ہے کہ کل کیا کرنا ہے اور کسی کو خبر نہیں ہے کہ وہ کہاں مرے گا۔ علیم اور خبیر (حقیقی معنوں میں فقط اللہ ہے۔ (مفہوم سورہ ۳۱، آیت ۳۴)

پھر شاہ صاحب کیسے بتا دیا کرتے تھے۔ میں ۱۹۱۳ء۔ ۱۹۱۴ء میں انہیں غیب کی باتیں ہی سمجھتا تھا، لیکن مذکورہ بالا آیات پڑھ کر میرا خیال یہ ہے کہ وہ محض دل و دماغ کی ایک خوبی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے شاہ صاحب کو دل اور دماغ اچھا عطا کیا تھا۔ اچھے دل اور دماغ کی وجہ سے شاہ صاحب نے اللہ سے لو لگائی اور دل و دماغ میں مزید صفائی پیدا کی۔ دل و دماغ کو آئینہ بنا لیا۔ لیکن پھر اس کا استعمال اچھا نہیں کیا۔ جو نعمت حاصل ہو گئی تھی، اس سے دھونس جمائی اور روپیہ کمایا۔ اس نے آئینے کو گندلا دیا۔ نعمت کا استعمال اللہ کے لئے کرتے تو اسلام کے بڑے کام انجام دے سکتے تھے اور نہایت اونچے جا سکتے تھے۔ روپے سے رغبت کر کے شاہ صاحب نے نعمت کی ناقدری کی اور اپنے آپ کو تباہ کر لیا۔

ہم عام لوگوں میں دیکھتے ہیں کہ جو جس لائن پر انہماک کامل کے ساتھ پڑ جاتا ہے، وہ اپنی لائن کی باتوں کی تہہ تک اتنا پہنچ جاتا ہے کہ دوسرے حیران رہ جاتے ہیں۔ شاہ صاحب ریاضتِ روحانی کی لائن پر انہماک کامل کے ساتھ چلے تھے، مگر ضبط نہ کر سکے۔ اوّل تو پھوٹ پڑے۔ کمال کا مظاہرہ کرنے لگے اور پھر روپیہ کے پیچھے اس کمال کو بھی کھو دیا۔ روپے کی الفت اہلِ سیاست کو مرجھا دیتی ہے۔ اہل اللہ غیب دانی کا ادعا اور کمال کا اظہار کر کے اور روپے کے پیچھے پڑ کے اہل اللہ کیسے رہ سکتے ہیں۔ شاہ صاحب نے تو بھی اتنی سی بات حاصل کی تھی کہ اندازے اور قیاس سے اور قیافہ دیکھ کر ایسی باتیں کہہ جاتے تھے اور ایسے ڈھنگ سے کہہ جاتے تھے کہ چسپاں نہ بھی ہوتی تھیں تو انسان زبردستی اپنے اوپر چسپاں کر لیتا تھا اور جنہیں اس لائن سے واسطہ نہیں ہے، وہ متحیر ہو جاتے تھے۔

مجھے اس کا اقرار ہے کہ اگر کوئی اللہ والا نفسانیت سے پاک ہو کر اللہ سے اللہ ہی کے کام کے لئے دعا مانگے گا۔ ایسوں سے سابقہ پڑ گیا ہے، جو کرامت کے مظاہرے کے بغیر بھی سے اچھی بات قبول نہیں کریں گے تو اللہ اس بندے کے دل میں مناسب جواب ڈال دیتا ہے اور اس کے ہاتھ سے غیر معمولی عمل کرا دیتا ہے لیکن یہ سب کچھ حضرت جبریلؑ آکر نہیں کراتے اور اسے تماشا نہیں بنانا چاہئے۔ اصل کرامت تو قرآن و سنت کی پیروی ہے۔

ڈاکٹر اسلم فرخی

اُردو نامہ۔ کراچی

مولانا صلاح الدین احمد

مولانا صلاح الدین احمد نے اپنے بے نیاز ہم عصر مولانا عبدالمجید سالک کی وفات پر اظہار افسوس کرتے ہوئے لکھا تھا "ہمارے ادبا اور شعراکی وہ صف۔ جو پختہ کاروں پر مشتمل تھی۔ اب قریب قریب خالی ہو چکی ہے اور سالک کے رخصت ہونے سے وہ شخص بھی جو شعر و ادب میں حسنِ ذوق، تالیف و تصنیف میں حسنِ بیان اور اسلوبِ زندگی میں شرافت کہلاتی ہے۔ ان کا دامن تھامے ان کے ساتھ ساتھ چلی جا رہی ہے۔ اب ہمیں کون سہارا دے گا۔ ہمارے حوصلے کون بڑھائے گا۔ اور اپنا دامنِ شفقت ہمارے لیے کون دراز کرے گا۔" مولانا نے سالک مرحوم کی شخصیت میں جن خوبیوں کی جھلک دیکھی تھی وہ دراصل خود ان کی اپنی شخصیت کی نمایاں خوبیاں بھی ہیں۔ انسان جو معیار اپنی ذات کے لیے مقرر کرتا ہے اسی معیار پر دوسروں کو پرکھتا ہے۔ اور اسی کی روشنی میں دوسروں کی صفات کا جائزہ لیتا ہے۔ حسنِ ذوق، حسنِ بیان اور شرافت مولانا صلاح الدین کی شخصیت کے اہم پہلو تھے۔ ان میں خلوص کا اضافہ کر لیجیے۔ تو مولانا کی شخصیت کے عناصر اربعہ مکمل ہو جاتے ہیں۔ ان کی زندگی کا کوئی گوشہ ہو۔ کوئی ادبی یا ثقافتی کارنامہ ہو ان عناصر کی کارفرمائی ہر جگہ موجود ہے اور مولانا کے نیاز مند اس امر سے بھی پوری طرح واقف ہیں۔ کہ وہ اپنی زندگی میں کبھی اس سطح پر نہیں آئے۔ جہاں شخصیت کے ان عناصر اربعہ نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا ہو۔ یہ استقامت اور یک رنگی کم لوگوں کے حصے میں آتی ہے۔ مولانا صلاح الدین جیسے انسان کے اٹھ جانے سے تو یہ اور بھی عنقا ہو گئی ہے۔ حسنِ ذوق اور حسنِ بیان کے حامل اور بھی ہیں۔ لیکن وہ شرافت اور خلوص جو مولانا کی تحریروں اور تقریروں اور عمل میں نمایاں ہے۔ اس کارگاہ سود و زیاں میں ذرا مشکل ہی سے دستیاب ہو گا۔ اپنی اسی خصوصیت کی وجہ سے مولانا ہر مکتب خیال کے لوگوں میں محترم سمجھے جاتے تھے۔ ملک کے علمی اور ادبی حلقوں میں ان کی فکر و نظر کا احترام کیا جاتا تھا۔ اور ان کی تحریروں کو خاص وقعت دی جاتی تھی۔ افسوس یہ ہے کہ مولانا کی وفات سے ہم سب ایک ایسی قابلِ احترام ہستی سے محروم ہو گئے۔ جس کے خلوص اور شرافت نے ہمارے ثقافتی سرمائے میں خوش گوار اضافے کیے ہیں۔

مولانا صلاح الدین احمد بیک وقت طرحدار ادیب، منتقد مدیر، ادیب گر، عاشقِ اردو اور اپنی ثقافتی میراث پر جان دینے والے بزرگ تھے۔ ان کی تحریریں حسنِ بیان، خلوص اور شرافت سے معمور ہیں۔ خلوص کے متعلق انہوں نے لکھا ہے۔ کہ "خلوص ہی سے وہ خوش نظری پیدا ہوتی ہے۔ جو انسان کو زندگی بسر کرنے کے قابل بناتی اور راہ نوردِ زندگی کو اپنا دامن راستے کے کانٹوں سے بچانے کا سلیقہ سکھاتی ہے

خوش نظری صرف زندگی بسر کرنے کا سلیقہ ہی عطا نہیں کرتی۔ تحریر میں بھی دل آویزی پیدا کر دیتی ہے۔ مولانا کی کوئی تحریر دیکھ لیجیے ادبی دنیا کا اداریہ ہو ادبی مضمون ہو، علمی بحث ہو یا بچوں سے گفتگو ہو، خوش نظری کے ساتھ ساتھ دل آویزی بھی ہر جگہ نمایاں ہے۔ مولانا نے زندگی گذارنے کے جس سلیقے کو اپنا لیا تھا وہی ان کی تحریر میں بھی موجود ہے۔ مولانا نے ایک مرتبہ یہ انکشاف کیا تھا کہ دو ایک مضامین کے علاوہ انھوں نے اپنے باقی تمام مضامین امتثال امر کے طور پر اس [illegible] ے لکھے ہیں کہ نظر ثانی کی نوبت بھی نہیں آئی۔ تعجب اس پر نہیں بلکہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ مولانا کے ہر مضمون میں خواہ وہ امتثال امر کے طور پر روا روی میں لکھا گیا ہو یا غور و فکر کے بعد، تعمیری سلیقے، حسنِ ذوق، حسنِ بیان اور خلوص کا چراغ پوری طرح روشن ہے۔ فن پر ان کی گرفت پیشہ ورانہ نہیں محرمانہ تھی۔ فن اُن کے نزدیک پیشہ نہیں۔ ایک مقدس امانت تھا جسے وہ موزوں اور مستحق افراد کو سونپنا چاہتے تھے۔ مولانا اظہارِ فن کو انتشارِ مسرت کا منشائے خداوندی تسلیم کرنے کے قائل تھے۔ شاید یہی وجہ ہے ان کی تحریروں میں دردِ دل کی آنچ کے با وصف شگفتگی موجود ہے۔ ادب کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا نے ایک جگہ لکھا تھا کہ فصاحت، بلاغت، حسنِ انتخاب، الفاظ، احساسِ توازنِ مطالب، زورِ طبیعت، لطافتِ ذوق، یہ سب برسوں کی مشقت کے بعد جب ایک جگہ مل کر محفل جلاتے اور خلوص کا چراغِ نیم شب جلاتے ہیں تو ادب کی تخلیق ہوتی ہے اور فن کی نئی نئی بلندیوں کی نوید دلاتی ہے۔ یہ بیان مولانا کے تصورِ فن اور خود اُن کے فن دونوں کو سمجھنے، سمجھانے کے لیے بہت کافی ہے یہ تصورِ فن اسی ادیب اور انشا پرداز کے یہاں فروغ پا سکتا ہے جس کی فنی گرفت محرمانہ ہو۔ اس تصور کے ابتدائی عناصر آج کے دور میں دور از کار سمجھے جائیں یا ان کی افادیت میں شبہ کا اظہار کیا جائے لیکن امرِ واقعہ یہ ہے کہ فن کی نئی نئی بلندیوں کی نوید ان کے بغیر ممکن نہیں۔

ان عناصر کو دور از کار سمجھنے کا جواز بھی مولانا نے پیش کیا ہے۔ ان کے بقول "دورِ حاضر میں ادب اور ادیب کے یہ تصورات مسلسل ماند ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اور نوبت اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ ہر وہ بر خود غلط نوجوان جو کسی محنت اور کسی کاوش کے بغیر چند الٹی سیدھی سطریں لکھ کر کسی موسمی رسالے میں چھپوا لیتا ہے۔ انشا پرداز ہونے کا مدعی بنتا اور ادیب کہلوانے پر اصرار کرتا ہے اور اگر آپ اسے سمجھانے کی کوشش کریں یا اس کا دعویٰ فی الفور تسلیم نہ کریں۔ تو وہ کسی انجمن بہبودِ مصنفین کی فہرست میں سے جھٹ اپنا رجسٹرڈ نمبر نکال لاتا ہے۔"

آخری جملوں کی تلخی اور تیزی میں بھی مولانا کے خلوص کی جھلک ہے۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں نئے لکھنے والوں کی پذیرائی بھی کی ہے اور سکوتِ سخن شناس کے بجائے غلغلۂ تحسین سے کام لیا ہے۔ آج کے بہت سے پختہ کار ادیبوں کو معروف بنانے میں مولانا کا حصہ بھی کچھ کم نہیں۔ لیکن وہ اس بے راہ روی کے بالکل قائل نہیں جو آج کل ادب کے نام پر روا رکھی جاتی ہے۔ آمیزشِ خونِ جگر کے بغیر فن میں روشنی نہیں ہوتی۔ مولانا کی تحریروں میں آمیزشِ خونِ جگر ہے۔ ریاض اور فن کا احترام ہے۔ زبان و بیاں کا [illegible] م ہے۔ مولانا صلاح الدین، محمد حسین آزاد کی انشا پردازی سے بہت متاثر تھے۔ آزاد کی تحریر کا حسن فطری نہیں۔ صنّاعی کا مرہونِ منت ہے۔ یہ صنّاعی بے ساختگی کا جامہ پہن کر محض صنّاعی نہیں رہی، پرانی اصطلاح کے مطابق زورِ کلام اور حسنِ بیاں بن گئی ہے۔ مولانا صلاح الدین کی تحریریں بھی زورِ کلام اور حسنِ بیان کا مظہر ہیں۔ اور صنّاعی کے باوجود ان میں بے ساختگی کی جھلک ہر جگہ ملتی ہے۔

مولانا کی انشا پردازی پر تبصرہ یہاں ممکن نہیں۔ بات حسنِ بیاں کی تھی۔ مرزا غالب پری وشوں کے ذکر میں حسنِ بیاں کی معراج پر پہنچے تھے۔ مولانا صلاح الدین اغیار کے تذکرے میں بھی اس منزل پر جا پہنچے کہ ان کا حسنِ بیان ہر موقعے پر ان کا ساتھ دینے کے لیے آمادہ رہتا تھا۔ ان کی ہر تحریر میں موضوع سے ایک ایسا جذباتی رابطہ ملتا ہے جو ان کے حسنِ بیاں میں تاثر اور گہرائی پیدا کر دیتا ہے۔ یہ رابطہ ادبی موضوعات ہی میں محدود نہیں ملی، قومی، معاشرتی اور ثقافتی مسائل میں بھی اس جذباتی رابطے کے نشانات محکم ملتے ہیں۔ مولانا کی دوسری تمام تحریروں سے قطع نظر میں یہاں ان کے ایک خطبے کا تذکرہ کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ہماری زبان میں موضوع سے جذباتی رابطہ

حسنِ بیان، حق گوئی، بیباکی اور دردمندی کی ایسی مثالیں کم ملیں گی۔ میری رائے میں یہی ایک خطبہ مولانا کو شہرتِ عام اور بقائے
کے دربار کا مسند نشین بنانے کے لیے کافی ہے۔ آزادیِ فکر و گفتار کا نعرہ لگانے والے دیکھیں کہ ایک مردِ گوشہ نشین نے تلخ مباحث
بیان کی منزل سے گزار کر کس درجہ قابلِ قبول بنا دیا ہے مولانا کا یہ خطبہ جرأتِ فکر اور آزادیِ رائے کا وہ شاہکار ہے جس میں
رالطوں اور حسنِ بیان دونوں کی کارفرمائی ہے۔ ابتدا میں مولانا نے بڑے خوبصورت انداز میں اپنی صاف گوئی کا جواز پیش کیا ہے
جملے توجہ طلب ہیں۔

" یہ ہماری خوش بختی ہے کہ تین سال کے اندر دو مرتبہ جناب امیرِ قوم نے اس قومی انجمن میں قدم رنجہ فرما کر ہمیں عامۃ المسلمین
دلوں کی چند دھڑکنیں آنجناب کے کانوں تک پہنچانے اور چند ایسی باتیں بالمشافہ عرض کرنے کا موقعہ عطا فرمایا۔ جن میں بصورتِ دیگر
دو دربان کی بے مہریاں اور نامہ نگاروں اور اخبار نویسوں کی پردہ داریں سماعتِ عالیہ تک پہنچنے نہ دیتیں اور اس عنایت اور سعادت
ہم خداوند تعالیٰ کا جتنا بھی شکر ادا کریں کم ہے۔"

صاف گوئی کا یہ انداز انوکھا بھی ہے اور پرخلوص بھی۔ اس میں طنز کی شدید نشتریت تو نہیں لیکن عصرِ حاضر کی پرفریب نامہ نگاری
خلاف موثر احتجاج ضرور ہے۔ اس احتجاج کی تہہ میں سعدیؒ کے اس شعر

بہ بانگِ دہل خواجہ بیدار گشت　　　　ندانند شب۔ پاسباں چوں گزشت

کی جھلک بھی ملتی ہے۔

اس خطبے میں آگے چل کر مولانا نے ہندوستانی مسلمانوں کے مسئلے پر بڑی بصیرت افروز باتیں کہی ہیں ان کا انداز فکر صرف پر
اور ہمدردی کے جذبات سے لبریز نہیں، نیا بھی ہے۔ کہ اس کے بدوں مولانا کے اندازِ فکر کی وضاحت ممکن نہیں۔ مولانا کہتے ہیں۔ " یہ
ڈھکی چھپی بات نہیں کہ ہندوستان کی تقسیم بلکہ بہ الفاظ بہتر پاکستان کا قیام دو قومی نظریے کے تحت عمل میں آیا تھا پس اگر اسلا
ہند پہلے بھی ہمارے ہم قوم تھے۔ تو آج ہم سے ملکی طور پر کٹ جانے کے باعث ان کی اسلامی قومیت بدل نہیں گئی وہ آج بھی ہمار
ہی جزوِ قوم اور جزوِ بدن ہیں۔ کم از کم مسلمانوں کے سوادِ اعظم کا نظریہ یہی تھا۔ اور یہی ہے اور مفکرِ اسلام علامہ اقبال اور قائدِ اعظم
جناح نے اپنی تعلیمات اور مساعی کی بنیاد اسی نظریہ مقدس پر رکھی تھی۔ پس اگر یہ نظریہ غلط ہے تو پاکستان کے قیام کا بھی کوئی جواز
اور اگر صحیح ہے تو ہمیں ہرگز اس بات کا حق نہیں پہنچتا کہ ہم اپنے بدن کے ایک حصے کا درد اور اس کی جراحت محسوس نہ کریں اور اس سے ا
غافل ہو جائیں۔ گویا ہمارے لیے اس کا وجود ہی باقی نہیں رہا۔"

یہ استدلال یہیں ختم نہیں ہوتا۔ بلکہ اس میں دردمندی اور سوز کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور مولانا یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ " م
ہر اس شخص سے سوال کرنا چاہتا ہوں۔ جس کے پہلو میں دل ہے اور اس دل میں ضمیر کی کچھ روشنی بھی باقی ہے۔ کہ کیا ہماری قومیت و اخوت کی اسا
جغرافیے کی عارضی تقسیموں پر قائم ہے۔ اگر واقعی ایسا ہے تو پھر ہمیں کسی سے کوئی گلہ یا مطالبہ کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ لیکن اگر ایسا نہیں
تو یاد رکھیے کہ ہم ہندوستان میں صرف تاج محل چھوڑ کر نہیں آئے۔ صرف اپنے شناخواں دریاؤں اور سجدہ ریز میدانوں سے منہ موڑ کر ایک
نئے ملک کے مواقع اور منافع میں سرتاپا غرق ہونے کے لیے۔ یہاں وارد نہیں ہوئے، بلکہ ہم نے ایک پوری قوم کو خدا کے حوالے کیا ہے جو آ
بھی ہماری نصف بہتر ہے، جس نے ہمارے قصرِ مملکت کی تعمیر میں اپنے خون سے گارے کا کام لیا ہے اور جس نے اپنے آپ کو ہمیشہ ہمیشہ کے
لیے محض اس غرض سے سرنگوں کیا ہے۔ کہ ہم سرفراز رہیں جس نے اپنے مستقبل کو اس لیے تباہ کیا ہے کہ ہمارا مستقبل روشن ہو۔ جس نے اپنی
کو اس لیے سلا دیا ہے کہ ہماری تقدیر بیدار ہو جائے۔ اور جس نے اپنے علم کو اس لیے نیچا کر لیا ہے کہ ہمارا علم ہوا نے آزادی میں لہرائے اور

خوشحالی میں گذارا جائے۔ پھر ہمیں یہ کس طرح زیب دیتا ہے کہ ہم وطن کی علیحدگی اور ملک کی یکجائی کی سعادتیں تلاش کریں۔ آج وہ شمع ہماری آنکھوں کے سامنے گل ہوتی جارہی ہے۔ جو سرزمین ہند میں ایک ہزار برس سے روشن چلی آتی تھی وہ بساط الٹ رہی ہے۔ جو ایسی شان سے بچھائی گئی تھی وہ فضا معدوم ہوتی جارہی ہے جو تہذیب اسلامی کی سانسوں سے اب تک معطر ہے "..... یقیناً یہ منظر دور سے دیکھنے کا نہیں ہے اور اگر ہم اسی طرح اسے دور سے دیکھتے رہے تو ہماری نصف قوم ہمارے دیکھتے دیکھتے فنا کے دھندلکوں میں غائب ہوجائے گی اور ہماری پیشانیوں پر سے اس کے ساتھ بے وفائی کا داغ قیامت کے دن تک نہیں مٹ سکے گا۔"

یہ پورا بیان بہت اہم اور معنی خیز ہے۔ مولانا اگرچہ میدانِ سیاست کے شہسوار نہیں تھے۔ لیکن اس سے ان کی سیاسی بصیرت کا صحیح اندازہ ہوسکتا ہے۔ سیاسی بصیرت کو چھوڑیے، آج کے دور میں سیاسی بصیرت کا دعویٰ تو ہر اس شخص کو ہوتا ہے جو اخبار میں دو چار الٹی سیدھی خبریں پڑھ لینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس بیان کا خلوص صفائی اور واشگاف انداز کچھ کم اہم نہیں۔ سربلندی حاصل کرلینے کے بعد دوسروں کی خدمات کا اعتراف ذرا کم ہی کیا جاتا ہے۔ لیکن مولانا اعتراف محاسن میں بے باک تھے۔ وہ حقیقت سے آنکھیں چرانے کے بجائے مردانہ وار اس کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ یہ خطبہ اسی جذبۂ صالح کی یادگار ہے۔

میں نے اس خطبے کا تذکرہ خاص طور پر یوں کیا ہے۔ کہ اسے مولانا کی تحریروں میں منفرد مقام حاصل ہے۔ مولانا کے ادبی کارنامے اور اسلوب کا جائزہ لینے والا اسے نظر انداز نہیں کرسکتا۔ اس خطبے سے مولانا کی شخصیت کی دلکشی، ہمہ گیری اور جرأت مندی کے ساتھ ساتھ ہمارے ایک اہم مسئلے پر ایسا بے لاگ تبصرہ بھی ملتا ہے جو اور کہیں دیکھنے میں نہیں آتا۔ صنّاع ادیب ہونے کے باوجود مولانا نے اس خطبے میں بے ساختگی اور روانی کا ایسا پر اثر طلسم باندھا ہے جس سے متاثر ہونا، ناگزیر ہے۔

مولانا کی تحریروں اور اسلوب پر تبصرہ مقصود نہیں۔ نہ یہاں اس کی گنجائش ہے۔ اس خطبے کا تذکرہ آنے کی وجہ صرف یہ تھی۔ کہ اس سے مولانا کی شخصیت کا ایک اہم رُخ سامنے آتا ہے۔ یہ رُخ اُن کی فکر ہے۔ جو ادب کی طرح زندگی میں بھی اُن کی عظمت کا چراغ روشن کرتی ہے مولانا کی یہ فکر انھیں کا حصّہ تھی۔

مولانا صلاح الدین احمد کی شخصیت کا ایک نمایاں پہلو نئی تحریکوں کو لبیک کہنا تھا۔ انھیں نوجوانوں کے جوش اور جذبات دونوں کا صحیح اندازہ تھا۔ اور وہ ان کا احترام کرنے کے قائل تھے۔ نئی تحریکوں کے بارے میں شک و شبہ کا اظہار کرنا کوئی نامناسب بات نہیں۔ کہ انسان نئے تجربوں سے ہمیشہ ڈرتا ہے۔ بالغ نظر انسان کی پہچان یہی ہے کہ وہ نئی تحریک پر ناک بھوں نہ چڑھائے۔ برافروختہ نہ ہو۔ اور دوسروں کی پرخلوص مساعی کو اپنی سیادت اور بزرگی کے ختم ہوجانے کی علامت نہ سمجھے۔ بالغ نظر اور صاحب اعتماد ہی نئی تحریک کو لبیک کہتا ہے، نئے آنے والوں کا خیر مقدم کرتا ہے اور اعتراف محاسن میں بیباک ہوتا ہے۔ کم از کم میں مولانا کی کسی ایسی تحریر سے واقف نہیں ہوں جس میں انھوں نے کسی کے فن یا شخصیت پر معاندانہ تبصرہ کیا ہو۔ دل بڑھانے اور حوصلہ بلند کرنے میں تو وہ یقیناً بے باک تھے۔ انہوں نے نہ کسی کی دل آزاری کی، نہ کسی تحریک پر شبہ کا اظہار کیا۔ مولانا کی ذہنی تربیت قدیم دبستان فکر کی مرہون منت ہے۔ اگرچہ قصہ جدید و قدیم محض دلیل کم نظری ہے تاہم زندگی کے متعلق مولانا کا نظریہ ان قدیم اصولوں پر مبنی تھا۔ جو ایک ہزار سال کے تجربوں اور آزمائش کے بعد وضع ہوئے ہیں۔ اور اب ہم ان سے بیگانہ محض ہوتے جارہے ہیں۔ قدیم دبستان فکر کے تربیت یافتہ طبقے میں ہمیں وہ ولولہ انگیز نئی فکر بھی ملتی ہے جو خود نئے ذہن میں بھی موجود نہیں، اسی نئی فکر یا ندرت فکر نے مولانا کو نئی تحریکوں کا خیر مقدم کرنے کے لیے آمادہ کر دیا۔ اور انھیں نئی نسل میں بھی محبوب و محترم بنادیا۔ اعتراف محاسن میں بیباک ہونے کی وجہ سے مولانا کو ادیب گر اور ادیبوں کے ادیب کی حیثیت حاصل ہے۔ بڑا آدمی وہ نہیں ہے جو صرف اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لے آئے۔ بڑا آدمی تو وہ ہے۔ جو دوسروں کی صلاحیتوں کا صحیح اندازہ کرکے ان کو اجاگر کرنے کی کوشش کرے۔ مولانا صلاح الدین اسی

لحاظ سے یقیناً بڑے آدمی تھے۔ انہوں نے ہمارے بہت سے ادیبوں اور انشا پردازوں کی رہنمائی کی ہے۔ ان کی صلاحیتیں ابھارنے میں
پوری پوری امداد کی ہے۔ اور ان کے فن کو پروان چڑھنے کے مواقع فراہم کیے۔ یہ مولانا کا بہت اہم کارنامہ ہے اور اس سے اغماض
یا کھلے دل سے اس کا اعتراف نہ کرنا مولانا کے ساتھ نا انصافی نہیں خود اپنی فکر و نظر کی کم ظرفی کا ثبوت فراہم کرنا ہے۔ میرے
کے ایک دوست اور ادبی دنیا کے مقتدر مقالہ نگار علی عباس صاحب جلال پوری کا بیان ہے۔ کہ وہ ایک زمانے میں افسانے لکھا کرتے
تھے۔ مولانا نے انہیں مشورہ دیا۔ کہ آپ علمی تحقیق کو اپنا خاص میدان بنائیں۔ مولانا کی اصابت رائے کا اس سے بہتر ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ
آج اہل علم کے حلقے میں علی عباس صاحب کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ ان کے نتائج و افکار سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ان کی ژرف
نگاہی اور علمی دید و دریافت سے انکار ممکن نہیں۔ علی عباس صاحب کا کوئی افسانہ میرے ذہن میں نہیں۔ ممکن ہے انہوں نے اچھے افسانے
لکھے ہوں۔ لیکن آج کی علمی تحقیق میں ان کا جو مرتبہ ہے شاید افسانہ نگاری میں انہیں وہ مرتبہ حاصل نہ ہوتا۔ علی عباس صاحب جلال پوری
ہوں یا میراجی، بظاہر ان دونوں میں ایک مشترک قدر ہے۔ کہ دونوں اردو زبان کے لکھنے والے ہیں۔ اس کے علاوہ کسی اور مشترک قدر
کا تصور مشکل ہے۔ مولانا نے دونوں کی صلاحیتوں کا صحیح اندازہ کر لیا تھا۔ شاید یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا۔ کہ میراجی کی ذہنی تربیت میں
نے بھی نمایاں حصہ لیا تھا۔ میراجی کی شگفتہ اور رواں دواں نثر سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے۔ اردو افسانے کو پروان چڑھانے کا سلسلہ
ترقی پسند تحریک ہو یا جدید شاعری کا دفاع، مولانا کسی سے غیر متعلق نہیں رہے۔ وہ ہر مسئلے پر ایک جچی تلی اور متوازن رائے رکھتے تھے
اور اپنی رائے کے اظہار میں انہوں نے مصلحت اندیشی کی پروا کبھی نہیں کی۔ ادبی دنیا کے دور ہفتم میں، جسے افسوس کے ساتھ مولانا کی
"ادبی دنیا" کی آخری بہار کہنا چاہیے، مولانا نے پرانے لکھنے والوں کے ساتھ نئے لکھنے والوں کو جس طرح شریک کیا تھا۔ وہ مولانا کی
ادیب گری، کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔ مولانا کی یہ حیثیت اردو ادب میں ہمیشہ ممتاز رہے گی۔

مولانا کی ادب پروری کا سب سے نمایاں مظہر "ادبی دنیا" تھا، جو محض ایک رسالہ نہیں ایک تحریک بھی ہے۔ "ادبی دنیا" کا
کوئی شمارہ دیکھ جائیے۔ اس میں وہ تمام عناصر ملیں گے۔ جو مولانا کی شخصیت میں موجود تھے۔ "ادبی دنیا" حسنِ ذوق اور حسنِ بیان دونوں
کا مرقع ہے۔ اور مولانا کے خلوص کی جیتی جاگتی تصویر۔ مولانا نے اس کی آبیاری اپنے خونِ جگر سے کی تھی۔ مضامین کا تنوع۔ افسانوں
کی بوقلمونی، نظموں کی رنگا رنگی۔ اور غزل کی لطافت دوسرے رسالوں میں بھی ملتی ہے۔ لیکن ادبی دنیا معیار و وقار دونوں کے اعتبار
سے بہت بلند تھا۔ مولانا نے اسے اپنی بہترین تمناؤں کا مظہر اور اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کا آئینہ بنانا چاہا تھا۔ اور وہ اس میں پوری طرح
کامیاب بھی ہوئے، نامساعد حالات اور ہمت شکن ماحول میں خالص علمی اور ادبی رسالے کا جاری رکھنا ایک نوع خودکشی ہے۔ مگر ادبی
دنیا کا دور ہفتم شاہد ہے کہ عزم و عمل اور خلوص لذت مرگ سے آشنا ہونے کے باوجود زندگی کا ولولہ ڈھونڈ ہی نکالتا ہے۔ مولانا
کے عزم و عمل سے یہ واضح ہو گیا۔ کہ اردو طباعت کی بے چارگیوں اور دقتوں کے باوجود اس زبان میں دنیا کا سب سے ارزاں رسالہ
شائع کرنا محض امکانات کا جائزہ نہیں۔ ایک خوش گوار عمل بھی ہے جسے مثال بنایا جا سکتا ہے اور جس پر فخر کیا جا سکتا ہے۔

"ادبی دنیا" اردو کے ان معدودے چند رسالوں میں ہے جسے مضمون نگاروں کے تعاون کے ساتھ ساتھ ان کے مدیران کرام
کی پرکشش اور سحر انگیز شخصیت نے رنگ دوام بخشا ہے۔ یہ رسالے اپنے مدیروں کی قد آور ادبی شخصیت کی وجہ سے نامہ نگاروں
کا مقتدر حلقہ رکھتے ہیں۔ یہ امتیاز "ادبی دنیا" کو بھی حاصل ہے۔ مولانا کی اس صالح ادبی یادگار کو برقرار رکھنا۔ وہ علمی اور ادبی
فریضہ ہے۔ جس سے پہلو تہی کرنا بہت بڑی بد دیانتی ہے۔ کاش ہم اس بد دیانتی کے مرتکب نہ ہوں۔

عاشق اردو کی حیثیت سے بھی مولانا کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ انہوں نے اپنا تن من دھن سب کچھ اردو کی نذر کر دیا۔ انہوں نے

سان دانش

تھی کس کو خبر اوج پہ قسمت نہ رہے گی
راتوں کو خوشی دن کو مسرت نہ رہے گی

یہ علم کہاں تھا مرے پندارِ جنوں کو
آنکھیں بھی اُٹھانے کی جسارت نہ رہے گی

پابندِ وفا عشق بھی ملتا ہے بمشکل
اس دین میں یہ شرطِ عبادت نہ رہے گی

شکوہ تو محبت کے بھروسے پہ کیا تھا
یہ کس کو خبر تھی کہ محبت نہ رہے گی

تقدیر بھی یہ عرضِ تمنا کا نتیجہ
معروضِ تمنا کی اجازت نہ رہے گی

بارِ غمِ دنیا تو میسر ہی کسے ہے
بارِ غمِ ہستی کی بھی ہمت نہ رہے گی

آجاؤ کہ آثارِ زمانہ سے ہے ظاہر
اب بھی جو ہے ملنے میں سہولت نہ رہے گی

یہ دن تھا خیالات و تصور سے بھی باہر
ہم سے تمھیں ملنے کی بھی فرصت نہ رہے گی

چل دو گے کہیں چھوڑ کے تنہا مجھے اک دن
تم سے بھی کبھی خط و کتابت نہ رہے گی

درپیش ہیں کچھ میرے جنوں کو مراحل
اب تم کو نہیں، پھر مجھے فرصت نہ رہے گی

راتوں کی کمیں گہ سے وہ نکلیں گے ستارے
صبحوں کی جبیں پر یہ صباحت نہ رہے گی

دانشؔ یہ زمانے کے رویے سے ہے ظاہر
باقی کوئی اب قدرِ شرافت نہ رہے گی!

غلام ربانی تاباں — آج کل، دلی

فرصت کہاں جو دل کی جراحت کا غم کریں
اک تیر اور کھائیں کہ آنکھوں کو نم کریں

موجِ ستم کو سر سے گزرنا بھی آگیا
اب وقت ہے سپاسِ عزیزاں رقم کریں

بزمِ مغاں سے رکھتے ہیں ہم تشنگی کا ربط
آسودگانِ جامِ غم بیش و کم کریں!

ذوقِ جفائے حسن کی تسکیں تو ہوگئی
یہ اور بات نازِ شکستوں پہ ہم کریں

شامِ فراق آئی ہے ملنے کو یادِ دوست
اک انجمنِ نشاط کا ساماں بہم کریں

ہر آرزو میں بھرتے چلیں حسرتوں کا رنگ
اک تازہ اہتمام سے جشنِ الم کریں

اُن کی خوشی وہ عہدِ ستم کا بھی توڑ دیں
تاباں مگر جو فرضِ وفا ہے وہ ہم کریں!

خلیل الرحمن اعظمی — پونم، حیدرآباد دکن

مرے ہونے سے دنیا بھی ہے دیں بھی
میں صورت بھی ہوں صورت آفریں بھی

مسلسل آرہی ہے کس کی آواز؟
ہے مجھ سے دور بھی مجھ سے قریں بھی

یہی اک قطرہ صہبائے مصفّا
یہی اک لمحہ زہرِ انگبیں بھی

اسی ہستی کے کھاؤں گا فریب اور
اسی ہستی پہ ہے کچھ کچھ یقیں بھی!

وہی اک شے جو ہاتھ آتی نہیں ہے
وہی اک شے مگر ہے کیوں حسیں بھی

اُسے کھو کر بھی میں کب خوش رہوں گا،
جسے پا کر ہوں کچھ اندوہگیں بھی

ابھی پھرنا ہے اپنی جستجو میں!
میں گردش میں ہوں اور میری زمیں بھی

مجھی پر فاش کر دے اپنے سب راز
میں صادق بھی ہوں صابر بھی، امیں بھی

مرا نغمہ یہ مجھ سے کہہ رہا ہے!
کہ میں تیرا ہوں اور تیرا نہیں بھی

عرش ملسیانی

ماہِ نو، کراچی

تیری نگہ سے تجھ کو خبر ہے کہ کیا ہوا
دل زندگی سے بارِ دگر آشنا ہوا

دشتِ جنوں میں ریگِ رواں سے خبر ملی
پھرتا رہا ہے تو بھی مجھے ڈھونڈتا ہوا

احساسِ نو نے زیست کا نقشہ بدل دیا
محرومیوں کا یوں تو چمن تھا کھلا ہوا

چمکا ہے بن کے سروِ چراغاں تمام عمر
کیا آنسوؤں کا تار تھا تجھ سے بندھا ہوا

بکھرے ہیں زندگی کے کچھ اس طرح تار و پود
ہر ذرّہ اپنے آپ میں محشر نما ہوا

پوچھو تو ایک ایک ہے تنہا سلگ رہا
دیکھو تو شہر شہر ہے میلا، لگا ہوا

پردہ اٹھا سکو تو جگر تک گداز ہے
چاہو کہ خود ہو یوں تو ہے پتھر پڑا ہوا

انسان دوستی کے تقاضوں کا سلسلہ
انسان دشمنی کی حدوں سے ملا ہوا

اقدار کے فریب میں اب آ چکا نظر
کشتی ڈبو گیا جو خدا، ناخدا ہوا

بیسویں صدی، دہلی

زندگی کچھ نہیں بجز غم بیش و کم
راحتِ یک نفس عمر بھر کا الم

مجھ میں ہرگز نہیں اتنی تابِ کرم
کس لیے ہو گئی آپ کی آنکھ نم

اب نہ للّٰہ جاؤ حرم آئے ہو
وقت کے اُٹھ کے مڑتے نہیں ہیں قدم

ہم میں اے شیخ خوئے ملامت نہیں
بادہ کش ہی سہی پھر بھی ہیں مغتنم

زندگی ایک عشرت کدہ بن گئی
راس آیا ہے جب سے مجھے تیرا غم

دوستی تو بڑی چیز ہے چھوڑیے
دشمنی ہی کا تھوڑا سا رکھتے بھرم

آپ کا التفات اک بڑی شے سہی
بات تو میری سن لیجیے کم سے کم

جان ہے مغتنم میں نے مانا مگر
جان سے کھیلنا بھی تو ہے مغتنم

عرشؔ ان تک پہنچنا تو مشکل نہ تھا
راہ میں اڑ گئے میری، دیر و حرم

شاعر لکھنوی — نقوش۔ لاہور

پیار کی خوشبو پھیل گئی تو ہوتی ہے رسوائی بھی
محفل سے گھبرانے والے مہکے گی تنہائی بھی

جن آنکھوں کو خشک سمجھ کر تم نے نظر انداز کیا،
اُن آنکھوں میں ڈوب گئی ہے دریا کی گہرائی بھی

آئی تھی کیا کیا ارماں لیکر، مل نہ سکی دیوانے سے "
خالی در پہ دستک دیکر لوٹ گئی تنہائی بھی

عشق کی راہ میں چلنے والے اپنے کو تنہا نہ سمجھ
شہرت بن کر ساتھ چلے گی صدیوں کی رسوائی بھی

کس گل کو سینے سے لگائیں کس گل کا دیدار کریں
راہِ بہاراں تکتے تکتے خون ہوئی بینائی بھی

زعم تھا کتنا حسنِ بیاں پہ اُن سے مگر کچھ کہہ نہ سکے
اپنی طلب کی آگ میں جل کر خاک ہوئی گویائی بھی

سلطان زبیری — سیپ۔ کراچی

غم سے مرا دل پگھل گیا ہے
اشکوں کی لڑی میں ڈھل گیا ہے

منزل کا پتا نہیں ہے کوسوں،
رستہ تو نہیں بدل گیا ہے

زندانِ چمن میں ہے بہاراں
پھولوں کا فریب چل گیا ہے

ہیں رُوح کے بام و دَر منوّر!
فانوسِ خیال جل گیا ہے

شہکارِ تصوراتِ آدم!
سانچے میں خدا کے ڈھل گیا ہے

یہ چاند بھی ہے بس اِک کھلونا،
اِنسان کا دِل بہل گیا ہے

دُنیا کا خیال ہے کہ تیرا
اِک دیپ سا دِل میں جل گیا ہے

مصطفیٰ زیدی

فنون۔ لاہور

فراق

ہم نے جس طرح سبو توڑا ہے ۔۔۔ ہم جانتے ہیں
دلِ پرخوں کی مئے ناب کا قطرہ قطرہ
جوئے الماس تھا، دریائے شبِ نیساں تھا
ایک اک بوند کے دامن میں تھی موجِ کوثر
ایک اک عکس حدیثِ حرمِ ایماں تھا
ایک ہی راہ پہنچتی تھی تجلیٰ کے حضور!
ہم نے اس راہ سے منہ موڑا ہے ۔۔۔ ہم جانتے ہیں

ماہ پاروں کے طلسمات میں تیرا افسوں
شیوہ و شعبدہ و رسم و حکایت میں تو
حرف و تقریر میں تو رمز و کنایات میں تو
خواب کی بزم تری، دیدۂ بے خواب ترا
صبح کے نور میں تو، نیند بھری رات میں تو
دل کی دھڑکن کا ترے قرب کے لمحوں پہ مدار
ہم نے جس طرح تجھے چھوڑا ہے ۔۔۔ ہم جانتے ہیں

ذیب سہیل

سیپ۔ کراچی

دریچے کا داغ

داغ اِک خوشنما عمارت کا
دل پہ کھائے ہوئے زمانہ ہوا
اتنے عرصے میں وادیِ دل سے
صرصرِ تند پے بہ پے گذری
دستِ موسم نے سنگ برسائے
پھر بھی ہر لحظۂ رواں کے ساتھ
داغ اُسی بانکپن سے روشن ہے

ہجر کے سانحے کا وہ لمحہ
کتنے برسوں پہ اب تو پھیل گیا
مجھ کو معلوم ہے دریچے پر،
اب کوئی چشمِ منتظر نہ رہی
پھر بھی یہ حال ہے کہ جب اُس سے
آنکھیں ناگاہ چار ہوتی ہیں
دل کو محسوس ایسا ہوتا ہے
بالکونی میں اب کوئی کھل کر،

پنکھڑی سے مہین آنچل میں
رنگِ گل سے سُبک جمال لیے
دادِ جلوہ گری کی چاہے گا
اَب کسی در سے خیر مقدم کو
سچ کی ہوگی طلوعِ گلبدنی
بامِ لب سے کوئی حسین تتلی
دل کے آنگن میں اُڑ کے آئیگی
شاخِ نازک کی طرح دلکش ہاتھ
اَب اُٹھے گا سلام کی خاطر

جانتا ہوں کہ اس دریچے پر
کوئی دلدار اَب نہ آئے گا!
کوئی غمخوار اب نہ آئے گا!
دیدہ دانستہ یہ فریبِ رنگ
دِل سے مجبور کھائے جاتا تھا

پا بہ زنجیر

ہوا تھم گئی ہے
درختوں پہ اک گہری چپ خیمہ زن ہے
ہری گھاس پہ چاندنی سو رہی ہے
فضا میں خموشی کی خوشبو بسی ہے!
میں اک نیم روشن پہاڑی پہ بیٹھا
درختوں کی وہ چوٹیاں گن رہا ہوں
جو اک دوسرے سے برابر گریزاں
حسیں رات کی چاندنی میں فروزاں
مجھے میری تنہائیٔ جان و تن کی
خبر دے رہی ہیں!
اُدھر سامنے ایک خاموش میداں
فضاؤں کے ہمدوش پھیلا ہوا ہے
اِدھر پشت پر کوہساروں کی دنیا
افق تا افق آسماں تک گئی ہے۔
میں اپنی پہاڑی کی چوٹی پہ بیٹھا
نگاہیں جھکائے ہوئے سوچتا ہوں
کراں آسمانوں ——
کراں کوہساروں ——
کراں مرغزاروں میں کیا شے ہے میری!
مجھے سب خبر ہے۔
مرا کچھ نہیں ہے!
نہ کہسار میرے،
نہ میدان میرا،
فقط نیم روشن پہاڑی ہے میری!
ازل سے میں اس برج کا کیشیا کا
پرومی تھیس ہوں!!

پہاڑوں کے اُس پار ہے ایک وادی
جسے میں تخیل کی آنکھوں سے اکثر
سجا دیکھتا ہوں،
کبھی میں وہیں تھا،
مگر اب پہاڑوں کا وہ سلسلہ درمیاں ہے
جو دروں کے ہر طور امکاں مٹائے
کراں تا کراں آسماں تک گیا ہے۔
مرے سامنے ہے جو خاموش میداں
یہاں بھی کئی بار محفل سجی ہے۔
کئی بار اُٹھے ہیں نغمے یہاں سے
وہ نغمے کہ جن سے جواں زندگی ہے
کئی بار اُس نے پکارا ہے مجھکو
کئی بار میں نے بھی آواز دی ہے۔
مگر میں ہوں اپنی پہاڑی کا قیدی
(اُدھر دشتِ فردا، اِدھر کوہِ ماضی)
یہ سب دور ہی دور سے دیکھتا ہوں

شارق صدیقی — الشجاع کراچی

خلا

نہ حکیموں کا مقدّر نہ رسولوں کا نصیب
نہ کہیں زہر کے پیالے، نہ کہیں دار و صلیب
نہ کوئی سچ کا پجاری نہ کوئی حق کا نقیب

یہ زمانہ کہ ترستا ہے اجالوں کے لیے
زہر ہے روشنیٔ طبع، خیالوں کے لیے
نشترِ فکر نہیں ذہن کے چھالوں کے لیے

فکر سے نطق تلک حبس ہے سناٹا ہے
ہر طرف لوگ ہیں، ہر شخص مگر تنہا ہے
سچ جو کہتا ہے یہاں سب سے بڑا جھوٹا ہے

مخمور سعیدی — اَدبی دنیا۔ لاہور

سلسلہ

زندگی کا مآل کیسا ہوگا ؟
لگا ہے لگا ہے یہ سوچتا ہوں میں
ہر طرف دھند پھیل جاتی ہے
روشنی کو جو کھوجتا ہوں میں
ذہن کی تیرگی سے گھبرا کر،
اپنے دل کو ٹٹولتا ہوں میں
عمرِ رفتہ اک آئینہ لا کر،
مجھ کو دیتی ہے، دیکھتا ہوں میں
اپنی صورت پہ شک یہ ہوتا ہے
میں نہیں، کوئی دوسرا ہوں میں
دوسرا کون ؟ مجھ سا کوئی بھی!
موت، پر جس کی جی اٹھا ہوں میں
پڑ رہا ہوں نئے افق پہ، مگر
عکس، بسی کی حیات کا ہوں میں

زندگی کا مآل کیسا ہوگا؟
لگا ہے لگا ہے یہ سوچتا ہوں میں
ہر طرف نور پھیل جاتا ہے
اور ایسے میں دیکھتا ہوں میں
موت نے توڑ دیں حدیں میری
بے کراں جیسے ہو چلا ہوں میں
نقش کتنے دلوں پہ میری حیات
کتنے ذہنوں میں، جی رہا ہوں میں
مجھ کو دہرا رہا ہے دورِ زماں
اک نئے عہد کی صدا ہوں میں
آ رہا ہوں، نئی زبانوں پر!
اک نیا ' اسم ' بن گیا ہوں میں

نسیم درّانی

سیپ۔ کراچی

چچا سام کے نام گیارہواں خط

پیارے چچا جان — تسلیمات۔

کافی عرصہ بعد آپ کو خط لکھ رہا ہوں — یعنی پورے تین سال بعد — پچھلے دنوں میں بے مصروف رہا، اور آپ بھی — اور آپ تو کہیں زیادہ،
ہی پریشان رہے۔ کتنے عظیم حادثات سے آپ کو دوچار ہونا پڑا۔ یوں تو میں آپ کے ہر غم میں برابر کا شریک ہوں، کیونکہ آپ کا غم میرا غم ہے۔ یہ اور بات ہے
کہ آپ کو پوری دنیا کا غم ہے (یعنی وہی بات، قاضی جی دبلے کیوں؟) لیکن مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ جب —

آپ کی چہیتی مریلین منرو نے خواب آور گولیاں کھا کر خودکشی کی — (اور صبح بستر مرگ پر برہنہ پائی گئی، ہائے کیا منظر ہوگا وہ بھی! معلوم ہوتا ہے ننگا پن آپ
امریکیوں کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے)

پاکستان نے زمین سے مضبوط بنیادوں پر دوستی کا رشتہ قائم کیا — (چچا جان، چڑیاں چگ گئیں کھیت)

آپ کے بڑے بھائی مسٹر کینیڈی قتل کر دیئے گئے — (دیکھیو یارب یہ در گنجینۂ گوہر کھلا) —

میرے ملک کے عوام نے آپ کی خارجہ پالیسی کے خلاف علم بغاوت بلند کیا (جو میرے ملک کی سترہ سالہ تاریخ میں پہلا واقعہ تھا کہ عوام کو بدہضمی کی شکایت
ہوئی — مگر چچا جان، یہ تحفہ بھی تو آپ ہی کا تھا)

ادھر آپ کی مغربی تہذیب کے علمبردار اور آپ کے عزیز دوست ملک برطانیہ کے ڈاکٹر وارڈ کو خودکشی کرنا پڑی — (خس کم جہاں پاک — لیکن کہاں، ابھی آپ
جو زندہ ہیں) —

ایشیا میں بقول آپ کے، آپ کے سب سے بڑے دوست پنڈت نہرو کا انتقال ہوا — (نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا)

الزبتھ ٹیلر نے میرے بجائے نالائق برٹن سے شادی کر لی —

اور تو اور متحدہ حزب اختلاف صدارتی انتخاب میں ہار گئی۔ (صدر ایوب بھاری اکثریت سے کامیاب ہو گئے چچا جان — اور سے

مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے)

لیکن میں نے کسی موقعہ پر بھی آپ کو خط نہیں لکھا —

پھر یہی نہیں جب آپ تخت نشین ہوئے (اور ماموں جان خروشچیف کا پٹڑہ ہوا)، اور ویت نام پر آپ نے حملہ کیا، میں نے ہر موقعہ پر اپنی ناخلفی کا ثبوت
اس طرح دیا کہ آپ کو مبارکباد کا تار بھی نہیں بھیجا، اگر آپ اپنے ڈالروں کے علاوہ خدا کے وجود پر بھی یقین رکھتے ہیں، تو یقین کیجئے، میں نے اس روز چپکے چپکے جو مٹھی

سے بغلیں بجائی تھیں کہ آپ میرے چچا ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے بشیر اونٹ والے کے پرانے دوست بھی ہیں، اور بس، اب اپنے "پو بارہ" ہیں۔ لیکن آپ کی تو رہی بات ہے، کہ اشرفیاں لیٹ اور کوئلوں پر مہر۔

دیکھئے نا چچا جان یہ کتنے شرم کی بات ہے میرے لئے کہ میرے ملک کے ایرے غیرے تو آپ کے "عظیم امریکہ" کی سیر کریں، اور آپ کا یہ خاکسار بھتیجہ صرف شیر شاہ کالونی سے صدر تک کے سفر سے آگے نہ بڑھے۔ اور وہ بھی بس کا سفر۔ بڑی تمنا ہے چچا جان آپ کا ملک دیکھنے اور ہوائی جہاز میں سفر کرنے کی۔ میں نے کبھی ہوائی جہاز میں سفر نہیں کیا۔ اب چاہتا ہوں کہ آپ کے سہارے لنگوٹی میں پھاگ کھیل لوں۔

ہوائی جہاز کے سفر کی خواہش تو میں اپنے ملک کی ہوائی سروس "پاکستان انٹرنیشنل ایرلائنز" جس کا مخفف "پیا" ہے (اور جسے پیا چاہے وہی سہاگن) کے بوئنگ ۷۰۷ میں بیٹھ کر بھی پوری کر سکتا ہوں لیکن اب دل تو صرف آپ کے "پان امریکن" کے آرام دہ جیٹ طیارے ہی میں سفر کرنے کو چاہتا ہے، اور وہ بھی صرف عظیم امریکہ تک۔ (انگلستان میں نہیں جاؤں گا۔ مجھے پلیٹیں صاف کرنا ابھی اچھی طرح نہیں آیا ہے) ہاں تو اپنے اس خاکسار بھتیجے کو بھی شرف باریابی بخش دیجئے نا چچا جان۔ چلئے یہ طے ہے کہ اس کے بدلے میں آپ کا کوئی کام کر دوں گا۔ اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ میں بہت کام کا آدمی ہوں: قاضی کے گھر کے تو چوہے بھی سیانے ہوتے ہیں۔ اور خیر سے میں تو آپ کا بھتیجہ ہوں۔ چلئے ایک مضمون لکھ دوں گا۔ "آہنی پردے کے پیچھے" اسے آپ بعد میں کسی رسالے میں بغیر منٹو کے ساتھ چھپوا بھی دیجئے گا۔ اور اگر آپ کا ہاتھ تنگ ہو تو کوئی حرج نہیں، میں اس کے چھپنے کا بندوبست بھی کر دوں گا۔ یہاں کچھ رسائل ایسے ہیں جو چند سالانہ "چندے" بھجوا دینے پر ہر قسم کی چیز چھاپنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ بہرحال آپ کو کسی قسم کی فکر کی ضرورت نہیں ہو گی۔

لیجئے بات کہاں سے چلی تھی اور کہاں آگئی۔ سوال یہ ہے چچا جان کہ آخر میں یہ خط کیوں لکھ رہا ہوں۔ بات یہ ہے چچا جان کہ آج ۱۸ر جنوری ہے، آج اردو کے مشہور افسانہ نگار اور آپ کے بھتیجے سعادت حسن منٹو کی دسویں برسی ہے۔ مجھے آپ منٹو کی برسی پر ضرور یاد آتے ہیں۔ میں نے اردو کے اس ادیب کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے قلم اٹھایا ہی تھا کہ اچانک آپ اپنی لمبی تاروں بھری ٹوپی پہنے میرے سامنے "اٹرکر" کھڑے ہو گئے۔ "اٹرنا" چونکہ آپ کی خصلت ہے (تفصیلات کے لئے جھانکئے گریبان میں)، لہٰذا مجھے آپ کی "امداد" قبول کرنا پڑی۔ آپ کی امداد نے جہاں دنیا کے بیشتر ملکوں کو آپ کا محتاج بنایا ہے وہاں مجھ جیسے باصلاحیت نوجوانوں کو (اپنے منہ میاں مٹھو بننے والی بات نہیں) "ناکارہ" بنانے میں بھی آپ نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ یہاں "ناکارہ" بنانے سے مراد وہ نہیں ہے جس کا ذکر میں نے اپنے پچھلے خط میں کیا تھا۔ یعنی جو آپ نے ہمارے ہوٹلوں میں استعمال ہونے والے دودھ میں میرے ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی کا "سدباب" شامل کر کے ہم پر اپنا مزید کرم فرمایا ہے۔ بلکہ آپ نے اپنی فلموں، اپنے لٹریچر، اور اپنے نت نئے فیشنوں سے ان لوگوں کو اس طرح رجھایا ہے کہ بس وہ دھوبی کا کتا ہو کر رہ گئے ہیں، نہ گھر کے نہ گھاٹ کے۔ آپ کی اندھی تقلید ان کا مسلک اور "امداد" ایمان بن کر رہ گیا ہے۔

خیر۔ تو میں کہہ رہا تھا کہ اگر منٹو سے مجھے عقیدت نہ ہوتی، اور آپ میرے چچا نہ ہوتے تو شاید میں آپ کو یہ خط نہ لکھتا۔ تین سال قبل ۱۸ر جنوری سنہ ۱۹۶۲ء کو جو میں نے دوسرا خط بھیجا تھا۔ اس کی وجہ بھی یہی تھی۔ اور آج بھی یہی ہے۔

چچا جان، اگر آپ شرمندہ نہ ہوں تو ایک بات کہوں (مشکل تو یہی ہے کہ آپ کی مٹی میں شرمندگی کے ذرات ہوتے ہی نہیں)۔ کہ آپ کی "دریا دلی" اور "حاتم طائیت" کی وجہ سے یہاں بڑے لوگوں میں ایک رسم ادھر چلی ہے کہ جہاں کوئی بات ہوئی بس جھٹ سے آپ کا نام لے دیا کہ یہ سب کرنے اور کرانے والے ہاتھ آپ کے ہیں، اور سچ پوچھئے تو اس میں ان بیچاروں کا کوئی قصور نہیں ہے، آپ نے میرے ملک میں گزشتہ چودہ پندرہ سال میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں ان کی روشنی میں اگر ایسا کہتے بھی ہیں تو کیا برا کہتے ہیں۔

ایک بات ہے چچا جان، میری سمجھ میں نہیں آتا، کہ آپ یہ دوسر ٹانگ کیوں اڑاتے ہیں؟ دنیا کے بیشتر ممالک میں مجھے آپ کی ٹانگ نظر آرہی ہے۔ (کتنی ٹانگیں ہیں چچا جان آپ کی بھی) کیوبا میں، کانگو میں، ویٹ نام میں اور ادھر پاکستان میں بھی آپ کی ٹانگ کہیں نہ کہیں نظر آ ہی جاتی ہے۔ چچا جان ہم پاکستانی بڑے صلح کن اور "امن پسند" انسان ہیں۔ چلئے ہم آپ کی ٹانگیں بھی برداشت کر لیں گے، لیکن شرط یہ ہے کہ اچھی ٹانگیں ہوں،

خوبصورت سڈول چکنی اور ملین ڈالر ٹانگیں (شاید آپ کو یاد ہو منٹو نے بھی آپ سے ایسی ٹانگیں مانگی تھیں) پھر جو مزاج یار میں آئے کریں۔۔۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ ویسے کیا ہم نے کبھی اعتراض بھی کیا ہے؟! ۔۔۔

ایک اخباری اطلاع ہے چچا جان کہ آپ نے مالی بجٹ میں فوجی مصارف کے لئے ۲۵ ارب ۴۵ کروڑ ۶۰ لاکھ ڈالر کے مطالبات منظور کئے ہیں جو پاکستانی روپے میں تقریباً اڑھائی کھرب روپے کے برابر ہے۔۔ خدا آپ کو اور ترقی دے۔ اور رہتی دنیا تک سلامت رکھے۔۔ خبر میں یہ بھی ہے کہ اس رقم میں دوسرے ملکوں کی فوجی امداد کے مصارف بھی شامل ہیں۔۔ میری ناچیز درخواست تو یہ ہے چچا جان کہ آپ دوسرے ملکوں کو دیئے جانے والی مجموعی امداد صرف پاکستان ہی کو دیں۔۔۔ اس لئے کہ آپ نے ہندوستان کے مقابلے میں پچھلے چند سالوں میں ہمیں بہت کم امداد دی ہے۔ اس سے ایک تو یہ کسر پوری ہو جائے گی دوسرے اتنی امداد ملنے پر ہم آپ کے متعلق ذرا سنجیدگی سے بھی سوچ سکیں گے۔۔۔ اس کام میں ذرا جلدی کیجئے گا، ابھی چین سے معاہدوں پر دستخطوں کا مرحلہ جاری ہے، اگر یہ تمام مراحل طے ہو گئے تو پھر کچھ بھی نہ ہو سکے گا۔

چچا جان پچھلے کچھ دنوں سے تو یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے آپ کے ستارے گردش میں ہوں، اب یہی دیکھئے انڈونیشیا بھی آپ کے خلاف علم بغاوت بلند کرتے ہوئے اقوام متحدہ سے الگ ہو گیا، چچا جان دراصل یہ منہ لگائی ڈومنی والی بات ہے۔۔ اور کیا، صدر سوئیکارنو کہتے ہیں کہ اقوام متحدہ کچھ عرصے سے نامناسب رویہ اختیار کر رہا ہے اور عالمی مسائل حل کرنے میں ناکام رہا ہے۔۔۔ ارے بھئی اس میں بیچاری اقوام متحدہ کا کیا قصور، خدا کی قسم چچا جان یہ لوگ بڑے ہی بھولے ہیں، کشمیر، کانگو، کیوبا، ویٹ نام کے مسائل حل نہ ہو سکے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ اقوام متحدہ ناکام رہی۔۔ بلکہ آپ نے چاہا ہی نہیں اور پھر اقوام متحدہ ہے کیا، ایسے بیسیوں ادارے آپ کی جیب میں پڑے رہتے ہیں، بڑے چچا جان مرحوم روز ویلٹ صاحب یہ ادارہ تو اقوام عالم پر آپ کی برتری قائم رکھنے کے لئے قائم کر گئے تھے۔۔ لیکن برا ہو برے وقت کا، وہ وقت آ ہی گیا جسے کہتے ہیں چور کے گھر مور۔۔۔

میرا جی چاہ رہا ہے چچا جان کہ میں آپ کو کچھ پاکستان میں ادبی سرگرمیوں کے بارے میں بھی لکھوں، آج کل ہمارے یہاں منوں کے حساب سے ادب تخلیق ہو رہا ہے جبکہ لکھ صرف وہی ادیب رہے ہیں جن کی نوکریوں کا رائٹرز گلڈ اور پریس ٹرسٹ نے ابھی بندوبست نہیں کیا ہے۔ اللہ نے چاہا تو بیکار ادیبوں کا مسئلہ بھی جلد ہی حل ہو جائے گا۔ چچا جان اگر آپ کو اپنے ملک کے کچھ ادیبوں کا لکھنا پسند نہ ہو، اور آپ چاہتے ہوں کہ وہ نہ لکھیں تو آپ اپنے یہاں بھی ایک رائٹرز گلڈ بنا دیجئے۔۔۔۔۔ اس کام کے لئے آپ یہاں سے مرزا جمیل الدین عالی صاحب کو بلا لیں جو بابائے گلڈ ہیں۔ اور گلڈ چلانے کا خاصا تجربہ رکھتے ہیں۔۔۔

چچا جان یہ رائٹرز گلڈ بھی بڑی عجب چیز ہے۔ یہ یوں تو لکھنے والوں کی جماعت کہلاتی ہے۔ لیکن یہاں لکھنے والوں کے علاوہ ہر قسم کا آدمی پایا جاتا ہے۔ اس جماعت کو بقول شمیم احمد "سوائے ادب کے ادیبوں کے تمام مسائل سے دلچسپی ہے۔" ویسے عام طور سے لوگوں کا خیال یہ ہے کہ گلڈ نے اور کچھ کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ ادیبوں کی "تحقیق" ضرور کی ہے۔ اگر تمام کارکنان گلڈ کو نہیں تو کم از کم ایک کو اس "تحقیقی کام" پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری دے ہی دینا چاہئے۔ اچھا یہ کیجئے ایک کمیشن بٹھا دیں جو یہ فیصلہ کرے کہ ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی جائے یا نہیں۔

پچھلے دنوں اطلاع ملی تھی کہ سارتر نے نوبل پرائز لینے سے انکار کر دیا ہے۔ چچا جان مجھے تو کچھ دال میں کالا معلوم ہوا تھا۔ آپ نے غور سے دیکھ تو لیا ہے نا اس کا رنگ "سرخ" تو نہیں۔۔ اگر ایسا ہے تو سارتر کو پاکستان کے دورے پر بھجوا دیجئے۔۔۔ مجھے اپنے ملک بلانا نہ بھولئے گا، ماموں ڈیگال تو آپ کے دوست ہیں ہی۔ وہ آپ کا حکم نہیں ٹالیں گے۔۔ اور سارتر ماموں جان کا۔۔۔ ان کا رنگ چاہے کتنا ہی سرخ کیوں نہ ہو، ہم یہاں کالا نہ کر دیں تو کہئے ۔۔۔ اور شاید آپ کو علم نہیں، پاکستان میں جتنے بڑے ترقی پسند ادیب تھے، سب کے سب ادب چھوڑ کر پیٹ پر آ گئے ہیں۔۔ بیچاروں نے کسان، مزدور خون پسینہ کے نعروں میں بال سفید کر لئے۔ لیکن اس دوران کسی نے بھی تو ان سے یہ نہ پوچھا، میاں تمہارے منہ میں کے دانت ہیں؟۔۔ ادب کی بات تو سب ہی کرتے رہے، معاملہ کی بات کسی نے نہ کی۔۔ (آپ نے بھی نہیں) ویسے مجھے بڑی خوشی ہے چچا جان کہ اب ان کو عزت آبرو سے تو روٹی مل رہی ہے، یہ کیا کہ ادھر بند ہوئے اُدھر نکلے، اُدھر بند ہوئے اِدھر نکلے۔۔۔

دیکھا آپ نے یہ کمیونزم میرے ملک میں کس بری طرح مر رہا ہے (کسی لڑکی پر نہیں) بلکہ بے موت مر رہا ہے۔ یقین جانئے کچھ عرصہ بعد اس دنیا کے نقشہ پر صرف آپ کا "ڈالرازم" ہی باقی رہے گا — انشاءاللہ — معاف کیجئے غلط لکھ گیا "ڈالر اللہ"۔

ٹی۔ ایس ایلیٹ تو بیچارے اپنی موت ہی مرے ہیں، لیکن مجھے افسوس اردو کے ان بہت سے نقادوں کا ہے جو بیچارے بے موت مارے گئے۔ میں پریشان ہوں یہ اب لکھیں گے کیا؟

چچا جان مجھے انگریزی بالکل نہیں آتی، اور اردو بھی بس واجبی ہی آتی ہے، خدا بھلا کرے جمیل جالبی صاحب کا جنہوں نے "ایلیٹ کے مضامین" ترجمہ کر دیئے ہیں — اور محترمہ قرۃ العین حیدر کا جنہوں نے دو ایک ڈرامے اور چند نظموں کا ترجمہ کر دیا ہے۔ اب میں ان چند مضامین، ایک ڈرامے اور چند نظموں کے سہارے ایلیٹ پر دھڑلے سے بحث کر لیتا ہوں —

یہ اطلاع دیر سے دے رہا ہوں کہ آپ کی مہربانیوں کے طفیل "ٹویسٹ ڈانس" بھی ہمارے یہاں آگیا ہے۔ خدا آپ کو ہمیشہ زندہ سلامت رکھے۔ آپ ہم لوگوں کی تفریح و طباع کا کس قدر خیال رکھتے ہیں — آپ کا ٹویسٹ تو ہمارے اونچے طبقے میں تو کافی مقبول تھا ہی۔ لیکن متوسط طبقے میں بھی اب پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے — اب آپ نے "گو ٹیسٹ" بھیج دیا ہے — جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ ڈانس رگ و پٹھوں کو تازگی، توانائی اور نشاط بخشتا ہے — واہ واہ چچا جان واہ — کیا بات ہے آپ کی بھی — لیکن ایک بات بتائیے، یہ جو ہمارے یہاں تر و تازگی اور توانائی کے لئے شربت اور دوسری ادویات تیار ہوتی ہیں پھر وہ کہاں جائیں گی — آپ خریدیں گے انہیں؟ —

لیجئے، آپ تو آپ ہیں ہی — آپ کے ابا جان آرچ بشپ کارڈینل بھی کسی سے کم نہیں، اور پھر یہ ٹھیک بھی ہے جو روم میں انہوں نے پادریوں کے ایک اجتماع میں کہا ہے کہ "ننوں" کا لباس بھی بدلنا چاہئے۔ تاکہ لوگ مذہب کو بھی ترقی پسند سمجھیں — چچا جان ایک بات سمجھ میں نہیں آتی۔ لیکن آپ ضرور سمجھتے ہوں گے۔ اس لئے کہ آپ کے یہاں تو "ننگ" کی بڑی افراط ہے نا — چچا جان یہ لوگ لباس کیوں پہنتے ہیں — اپنے آبا و اجداد کے لباس میں آجائیں تو میرا خیال ہے کہ اس سے بڑی ترقی پسندی اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی — میری ناچیز رائے تو یہ ہے چچا جان کہ انسان چھپائے وہ چیز جس کا دوسرے کو علم نہ ہو — میں جانتا ہوں کہ آپ کے کوٹ اور قمیص کے نیچے کیا ہے، تو پھر لباس کا فائدہ — میرا ملک تو اس معاملے میں بہت دقیانوسی ہے۔ ابھی تک ٹیڈی لباس تک ہی آیا ہے۔ لیکن آپ کو کیا ہوا — آپ کیوں نہیں اپنے ہاں "ننگ" ہی کو قومی ڈریس بنا دیتے۔ اور پھر تن کی عریانی سے بہتر نہیں کوئی لباس۔ خدا آپ کو رہتی دنیا تک سلامت رکھے — اور آپ کے طفیل وہ دن جلد آئے جب لڑکیاں جسموں پر صرف پینٹ کرا کر نکلیں — (اس وقت مجھے اپنے یہاں کی شہریت دینا نہ بھولئے گا چچا جان) —

اور ہاں آپ نے اس کا انتظام بھی نہیں کیا، آپ کو اپنی پچاس ریاستوں کی قسم چچا جان یہ حکم اپنے ملک میں فوراً جاری کر دیں کہ کوئی دبلا پتلا ٹہنی جیسا لڑکا، اور چھپکلی جیسی کھیچی نما لڑکی ٹیڈی لباس نہیں پہنے گی — مجھے وہ لڑکیاں ایک آنکھ نہیں بھاتیں۔ جن کی نہ شکل نہ صورت اور نہ جسم ہوتا ہے۔ اور سڑک پر تنگ لباس پہن کر مٹک کر اس طرح چلتی ہیں کہ گھر واپس آنے کو دل چاہتا ہے —

حسن تو ہمارے یہاں پہلے ہی ناپید ہے — حقیقی حسن تو ابھی تک چچا جان پردے کے اندر ہی ہے (آہنی سلاخوں پر پڑا ہوا پردہ نہیں) اور جو حسن پردے سے باہر آیا بھی ہے، اس کا یہ حال ہے کہ کاجل کی کجلوٹی اور پھولوں کا سنگھار — یہاں کے کالجوں اور یونیورسٹی میں بھی بس پوچھئے نہیں — دراصل ہمارے یہاں جو لڑکیاں اعلیٰ تعلیم کے لئے پردے سے باہر آتی ہیں وہ دراصل تعلیم کو جہیز کے طور پر استعمال کرنا چاہتی ہیں — اس لئے کہ حسن تو اسکول ہی سے چھٹ جاتا ہے۔ جو بچتا ہے، وہ انٹرمیڈیٹ کے بعد کام میں آجاتا ہے۔ اور پھر بچا کھچا گریجوایشن کے بعد — ایم — اے — ٹیوشن — ٹیوشن — اب رہی یونیورسٹی تو بس — اللہ ہی اللہ ہے — آپ ہی کچھ خوبصورت لڑکیاں "امداد" کے طور پر یہاں بھیج دیں — اچھا زیادہ نہیں تو ایک حسین سی لڑکی تو ضرور بھیج ہی دیں — (اس کے بدلے ایک مضمون اور سہی) —

الزبتھ ٹیلر نے تو نالائق برٹن سے شادی کرلی — اور کوئی ایکٹریس مجھے آپ کی پسند نہیں — اگرچہ آپ کا قریبی تعلق نہیں پھر بھی اب میں صرف آپ کی معرفت "کرشاٹن ٹلر" کو پیار کا تحفہ بھیجنا چاہتا ہوں۔ اور یہاں اگر وہ پسند کرے تو پاکستان آجائے۔ یہاں سوسائٹی میں ایک بنگلہ کرایہ پر دلا دوں گا — وہ "باعزت" شہری کی طرح زندگی بسر کرسکے گی۔ لیکن اگر شہر کی اونچی سوسائٹی کی خواتین نے اپنے "حق" کی حفاظت کے لئے اس کے خلاف مظاہرہ کیا تو میں کچھ بھی نہیں کرسکوں گا۔

آپ کسی غلط فہمی میں نہ پڑ جائیے گا چچا جان، ہمارے یہاں صرف چکلوں میں عصمت فروشی پر پابندی ہے — اور وہ بھی کیا — فالہ پابندی نے نہیں ہے۔

اچھا خدا حافظ چچا جان — باقی باتیں پھر —

چلتے چلتے ایک خوشخبری سن لیجئے — نیلو کو ہوش آگیا ہے —

وزیر مینشن، بلاک ڈی

شیر شاہ کالونی۔ کراچی ۲۸

۱۸ جنوری ۱۹۶۵ء

فقط — آپ کا ناچیز بھتیجہ

نسیم درانی

بقیہ :— مولانا صلاح الدین احمد

اُردو کو اپنی بہترین ذہنی کاوشیں ہی عطا نہیں کیں۔ بلکہ اپنا سارا سرمایہ، ساری متاعِ دنیا وی اسی کی جھولی میں ڈال دی۔ ایسے ایثار اور عشق کی مثالیں فی زمانہ بہت کمیاب ہیں۔ مولانا اردو کے مستقبل سے ایک لمحے کے لیے بھی مایوس نہیں ہوئے۔ ان کا عشق صادق اور جذبہ سچا تھا۔ انہوں نے ایک دفعہ کہا تھا کہ برادران گرامی، تسلیم! کہ صورتِ حال حد درجہ اندوہناک اور یاس آفریں ہے مانا کہ آپ کے اشہبِ قلم کا میدان اور ترکتازِ نظر کا صحرا سمٹ کر ایک تنگنائے کی صورت اختیار کر چکا ہے، صحیح ہے کہ اہلِ ملک کا مذاق اور اہلِ اُردو کا مستقبل بدل چکا ہے۔ لیکن الحمد اللہ وہ ایک چیز ابھی باقی ہے جو تنِ مردہ کے لیے اب بھی اعجازِ مسیحائی کی رقیب ہے اور وہ ہے آپ کا ایمان۔ آپ کا وہ ایمان جو آپ اردو اور اس کی ممکنات پر رکھتے ہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں۔ کہ جب تک اس ایمان کی ایک چنگاری بھی آپ بھر جاں میں باقی ہے اُردو کا مستقبل تاریک نہیں ہوگا" اب کون اس اعتماد اور یقین کے ساتھ اردو کے تابناک مستقبل کا مژدہ سنائے گا۔ کون اپنی شرافت اور خلوص سے دلوں کو گرمائے گا۔ ع اُٹھ گیا ناوک فگن مارے گا دل پر تیر کون!

مولانا صلاح الدین اپنی ذات سے ایک انجمن تھے۔ ان کے اُٹھ جانے سے جو خلا پیدا ہو گیا ہے۔ اس کا بھرنا بظاہر تو مشکل ہی نظر آتا ہے۔ ایسی جامع صفات ہستیاں کم پیدا ہوتی ہیں۔ ایک بزرگ کا قول ہے کہ ایمان کا استحکام امورِ ثلاثہ پر مبنی ہے اور وہ ہیں علم، عمل اور خلوص، مولانا کی شخصیت میں یہ تینوں خوبیاں موجود تھیں۔ اور یہی ان کی حیاتِ دوام کا سبب ہیں۔ اردو اپنے ایسے باعمل اور مخلص شیدائی پر جتنا ناز کرے کم ہے۔

فرصت کے لمحات کا بہترین ساتھی • ماہنامہ "نقش" کراچی

اکرم شیروانی

بیگم سے انٹرویو

دہلی سے نکلنے والے ایک ماہنامے کے لئے لوگوں کے انٹرویو لیتے لیتے عمر کے چار قیمتی سال پھر سے اڑ گئے۔ لیکن ہماری فارغ البال چندیا پر ایسی بوکھلاہٹ آج تک نہیں پڑی جیسی اس بار پڑ رہی تھی۔ ایک طرف تو رسالے کے دو عدد ایڈیٹروں اور ایک عدد ایڈیٹرہ کی جانب سے انٹرویو کے تقاضے کے سلسلے میں خط، ایکسپریس خط، رجسٹرڈ خط، تار، ایکسپریس تار اور جوابی ایکسپریس تار بندوق کی گولیوں کے مانند ہمارے ناتواں جسم پر برس رہے تھے، اور دوسری طرف ان تابڑ توڑ حملوں سے بچنے کے لئے ہمارے پاس کوئی معقول یا نامعقول ڈھال نہیں تھی۔ یعنی صبح سے شام تک جوتیاں اور انگلیاں چٹخانے کے باوجود ایک بھی شہرت کا بندہ انٹرویو کے چوہے دان میں پھنسنے کے لئے تیار نہیں ہوا تھا۔ اللہ کے بندوں کے پاس جانے کے لئے سچی بات ہے، ہماری اب ہمت نہیں پڑتی تھی۔ کیونکہ نماز روزے کے سلسلے میں وہ الٹا ہمارا انٹرویو لینے بیٹھ جاتے۔ اور الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے، والے مقولے کی ذرہ برابر پروا نہیں کرتے تھے۔

یہ بات نہ تھی کہ ہمارے انٹرویو لینے کا حلقہ مختصر ہو یا یہ کہ ہم صرف بڑے لوگوں کے انٹرویو لیتے ہوں۔ اب تک اس سلسلے میں ہم نے جن لوگوں کو اکھاڑا پچھاڑا تھا۔ ان میں بڑے لوگوں کے علاوہ چھوٹے لوگ، اونچے لوگ، نیچے لوگ، ووٹ لینے والی چالاک جنتا اور ووٹ دینے والی سادہ لوح جنتا، سیاست داں، ادب داں، شدھ بھاشا داں اور نادان، ٹھیکیدار، صوبیدار، چوبدار اور حولدار، جیب کاٹنے والے اور جیب کٹوانے والے، بٹیر باز، مرغ باز اور سٹے باز، باورچی، ایلچی، طبلچی اور نقلچی، شکاری اور بھکاری، لیڈر اور بلیڈر، اہل دل اور اہل مل، فلمساز، جلد ساز اور معجون ساز، فنکار، قلمکار، اہلکار اور بیکار، انگریز اور رنگریز، جنم جلے عاشق اور دل جلی محبوبائیں، ڈالڈا کھا کر آئی سی ایس کرنے والے کالجوں کے نوجوان اور بستر بند کی طرح کسی بندھی حسینائیں، داڑھی بڑھانے والے آملیٹ ملا اور چوٹی اگانے والے گھاس لیٹ پنڈت غرضکہ سب ہی شامل تھے۔ لیکن آج نہ جانے آئینے میں ہم کس کا منہ دیکھ کر گھر سے نکلے تھے کہ کوئی بات ہی نہیں بن رہی تھی۔ صبح سے کئی گھروں کے سامنے ہم نے "انٹرویو دے دو" کی صدا لگائی تھی۔ متعدد دروازوں کو "خدا کی راہ میں انٹرویو دے بھائی" اور "اپنے بال بچوں کا صدقہ انٹرویو دے دے مائی" کہہ کر کھٹکھٹایا تھا۔ لیکن ہر جگہ سے ٹکا سا بھی نہیں بلکہ نیا پیسہ سا جواب ملا تھا اور ہر در یہ کہہ کر بند کر دیا گیا تھا۔ "آگے بڑھو بابا صبح ہی صبح نہ جانے کہاں سے بھیک مانگنے والے اور ادھار مانگنے والے آ ٹپکتے ہیں!" آخر کار جب جوتیاں گھستے گھستے ہماری تیرہ بار کی گنٹھی ہوئی جوتی کا آخری ٹانکا بھی ٹوٹ گیا تو جھنجھلا کر ہم نے اپنی یہ ماتم زدہ پیر کی عزت ہاتھ میں لے لی اور فیشن زدہ ننگے سر والوں کی بھری پری سڑک پر ننگے پاؤں ہی گھر کی جانب چل پڑے۔

گھر کے اندر قدم رکھتے ہی بیگم کی گلوری آمیختہ مسکراہٹ کو دیکھ کر ہمارے دماغ میں ایک اچھوتا خیال آیا۔ "بیگم سے انٹرویو"۔ ناامیدی کے گھٹا ٹوپ

اندھیرے میں جیسے ہمیں امید کی لالٹین کی مدھم روشنی دکھائی دی اور ایک ہی جست میں ہم صحن پار کر کے دالان میں پہونچ گئے۔ جہاں ہماری لاڈلی بیگم تخت پر پاندان سنبھالے ہمیں گھور گھور کر بلا وجہ سرخ ہوئی جا رہی تھیں۔

آنے کو تو یہ قبول صورت خیال ہمارے ذہن میں آ گیا۔ لیکن جب ہم نے اس کے بعض اہم عملی پہلوؤں پر غور کیا تو پتہ چلا کہ بیگم سے انٹرویو حاصل کر لینا چراغ الہ دین پا لینے سے کم نہیں۔ یہ بات نہ تھی کہ ہماری سیکنڈ ہینڈ بیگم جو خیر سے شادی کے اول چھ سالوں میں پابندی کے ساتھ اولاد آدم کی ضرب تقسیم کا کاروبار سنبھالے ہوئے تھیں اور جس کے نتیجے میں ہم دو درجن نا ٹرڈ ہرٹ ممبروں سمیت ہماری الیون کے پورے ہونے میں صرف ایک گول کیپر، ایک وکٹ کیپر اور ایک لیجر کیپر کی کسر تھی اپنے سرتاج کے حکم سے سرتابی کرنے کی مجال رکھتی ہوں۔ بلکہ ہماری بیگم کا انداز ان حسینان جہاں سے بالکل نرالا تھا جو بزم میں شوخیاں اور خلوت میں حیا کرتے ہیں۔ جب ہمارے چاروں طرف ہمارے شطرنج باز دوستوں کی محفل جمی ہوتی تو کیا مجال کہ بیگم کی آواز نکل جائے، نگاہ پھسل جائے یا دل نادان مچل جائے۔ لیکن تنہائی ملتے ہی وہ ہمارے خرمن ہوش و حواس پر کن کن زاویوں سے بجلیاں گراتیں۔ اسے کوئی جیومیٹری داں ہی زیادہ بہتر طور سے سمجھ سکتا ہے۔ ایسے موقعوں پر ان کا انٹرویو لینا تو در کنار ان سے بات تک کرنا دشوار ہو جاتی۔ وہ اپنی لچکدار مسکراہٹ سے ہمارے دماغ میں ہیجان برپا کرتیں۔ اپنی ہوشربا اداؤں سے ہمارے دل میں زلزلہ پیدا کرتیں۔ اپنی قینچی نما زبان سے ہماری گفتگو کو سنسر کرتیں اور کچھ اس انداز سے ہمارے آگے پیچھے پھرتیں کہ ہمیں اپنے تن بدن کا قطعاً ہوش نہیں رہتا تھا۔

بہرحال چونکہ رسالے کے ایڈیٹروں و ایڈیٹرہ کے ہاتھوں اپنی نقد ضمانت کو ضبطی سے بچانے کے لئے ہمیں کسی نہ کسی طرح اپنی چہیتی بیگم کا انٹرویو لینا ہی تھا۔ لہٰذا ہم نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ماتھے پر بل ڈال، کنوتیاں کھڑی کر بچوں کو وہ زور کی ڈانٹ پلائی کہ پوری پلٹن روتی چلاتی گھر سے بھاگ کھڑی ہوئی۔ پھر محاصرہ ختم ہونے کے بعد جب بیگم محاذ جنگ پر تنہا رہ گئیں تو ہم نے تحکمانہ لہجے میں ان سے بھی باہر ڈرائنگ روم میں چلنے کو کہا جہاں ہمیں اپنی نامہ نگارانہ زندگی کا ایک پل صراط پار کرنا تھا۔ گھونگھٹ اٹھنے کے بعد بیگم نے شاید ایک یا دو بار ہی ہمیں غیظ و غضب کے عالم میں دیکھا تھا۔ آج جب انہوں نے ہمارے تیور بگڑے دیکھے تو چوں چرا کئے بغیر پیشاب میں پلید ہوتے برخوردار کا پالنہ ہلا کر کان دبائے ہوئے ہمارے پیچھے ڈرائنگ روم میں چلی آئیں۔

"بیگم" ہم نے سامنے والے صوفے پر بیٹھ کر اپنے لہجے میں قدرے نرمی پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "آج ہماری چہار سالہ ادبی ساکھ پر وقت آ پڑا ہے کیا تم ایسے آڑے وقت میں ہمارے کام نہ آؤ گی؟"

"کیا کہتے ہیں آپ سرتاج! آپ کے لئے میری جان حاضر ہے۔" انہوں نے ہمارے چہرے کی نرمی سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے محبت کا گویا پورا مرتبان ہمارے سر پر انڈیل دیا اور ساتھ ہی کسی خطرناک ارادے سے اپنی جگہ سے اٹھ کر اٹھلاتی ہوئی ہماری طرف بڑھنے لگیں۔ "خبردار۔ وہیں ٹھہریئے۔" ہم نے پورے انٹرویو کے پروگرام کو معرض خطر میں دیکھ کر کھنکنے لہجے میں للکارا۔ "دیکھیے بیگم کان کھول کر سنئے اس وقت ہم ایک اخباری نمائندے کی حیثیت سے آپ کے سامنے بیٹھے ہیں اور آپ ہمیں انٹرویو دے رہی ہیں۔"

"مگر یہ نگوڑا انٹرویو ہوتا کیا بلا ہے۔!!" انہوں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے ہم سے سوال کیا۔

"یہ ایک ولایتی لفظ ہے۔" ہم نے اپنی انگریزی سے نابلد اور خالص ہندوستانی ماحول میں پلی ہوئی دیہاتی بیوی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ "ہم تم سے چند سوال پوچھیں گے، تم ان کے جواب دینا اور پھر ہماری تمہاری یہ باتیں اخبار میں چھپوا دی جائیں گی۔"

"اے نوج۔ میں تو کبھی اپنی تمہاری باتوں کو اخبار میں نہیں چھپواؤں گی۔" انہوں نے انکار میں گردن ہلاتے ہوئے دانتوں تلے انگلی دبالی۔ "دیکھو مہربان" ہم نے لہجے کو فیصلہ کن بناتے ہوئے کہا۔ "تھوڑی دیر کے لئے نہ تم ہماری بیوی ہو اور نہ ہم تمہارے شوہر۔ جو کچھ ہم پوچھیں اس کا صحیح صحیح جواب دو۔" یہ سنکر ہماری رفیقۂ حیات کا منہ لٹک گیا۔ اور وہ باقاعدہ بسورنے لگیں۔ شاید انٹرویو کو کوئی منحوس شے تصور کر رہی تھیں جو میاں کو بیوی سے جدا کئے دے رہا تھا۔ لیکن ہمیں چونکہ اس وقت صرف اپنی نقد ضمانت کا خیال تھا لہٰذا ہم نے بیگم کے اس عارضی حال زار پر بنظر ثانی کرنے کو غیر ضروری سمجھا اور قلم و نوٹ بک نکال کر انٹرویو شروع کرتے ہوئے

پہلا سوال کیا

"آپ کا نام؟"

بیگم پہلے تو بھونچکا سی ہو گئیں۔ لیکن پھر ان کا چہرہ مرنج مرنجان کی تفسیر بننے لگا اور وہ دھیمے سے بولیں: "آپ کی کنیز ہوں۔"

"لاحول ولا قوۃ" "یہ بھی کوئی نام ہوا! ہم زیر لب بڑبڑائے اور ایک بار پھر بیگم کو سمجھانے والے لہجے میں کہا۔ "دیکھئے ہم آپ سے پہلے کہہ چکے ہیں کہ اس وقت نہ آپ ہماری کنیز ہیں اور نہ ہم آپ کے سرتاج۔ ایک اجنبی کی طرح باتوں کے ٹھیک ٹھیک جواب دیجئے۔"

"ہاں تو آپ کا نام۔۔؟" ہم نے از سر نو قلم اور نوٹ بک سنبھالی۔

"بلقیس فاطمہ عرف پھول بانو۔۔۔" بیگم نے مسمی سی صورت بنا کر رحم طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"کیا آپ کے گھرانے میں عرفیت لگانے کا رواج عام ہے؟" ہم نے پھول بانو پر زور دیتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں۔ آپ تو جانتے ہی ہیں منجھلی آپا کا اصلی نام زہرہ جبیں فاطمہ ہے۔ لیکن خاندان میں وہ حور بانو کے نام سے مشہور ہیں۔ بڑی آپا کا نام نرجس فاطمہ ہے اور عرفیت ہے نور بانو۔ چھوٹے بھائی نور محمد گھر میں 'ٹلو' کہلاتے ہیں اور خدا جنت نصیب کرے ہماری پھپی۔۔"

"بس بس۔" ہم نے ہاتھ اٹھا کر ٹوکا۔ "شجرے کا پورا دفتر کھول دینے کے لئے کس نے کہا تھا!"

"آپ کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی۔" ہم نے اگلا سوال کیا۔

"لو اور سنو! گڑے مردے اکھاڑتے ہیں۔" وہ ایک بار پھر اٹھلائیں۔ لیکن ہمارے تیور دیکھ کر سہم گئیں اور بولیں۔ "ماہونوں کے مہینے میں رامپور ضلع بارہ بنکی میں پیدا ہوئی تھی۔"

"ماہونوں کے مہینے میں۔۔" ہمارا قلم ایک دم چلتے چلتے رک گیا۔ نہیں نہیں یہ لفظ تو ایک ادبی رسالے کے لئے بہت ثقیل ہو جائے گا۔ ہم نے سوچا اور بیزاری سے کہا۔ "ماہونوں کا مہینہ کوئی ادبی مہینہ نہیں ہوتا۔ آپ انگریزی مہینے کا نام بتلایئے۔"

"خاک پڑے یہ ولائتی مہینے کیا مجھے یاد رہتے ہیں۔" انہوں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "ہوگا کوئی جن مری پھوری۔"

"اچھا خیر خیر۔" ہم نے انہیں بھکتا دیکھ کر فوراً اگلا سوال پیش کر دیا۔ "یہ بتلایئے کہ آپ کی عمر کیا ہوگی؟"

اس بار بیگم محاورتاً نہیں بلکہ حقیقتاً بل کھا گئیں اور "چلو ہٹو" کہہ کر نگاہ نیچی کر لی۔ تھوڑی دیر تک وہ پاؤں کے انگوٹھے سے فرش کا قالین کریدتی رہیں پھر خوابناک لہجے میں بولیں۔ "رہی ہوگی یہی کوئی بیس پچیس سال۔"

"جی کیا فرمایا!" اس بار ہم حیرت سے اچھل پڑے کیونکہ بیگم ہمارے سامنے سفید جھوٹ بول رہی تھیں۔ "اللہ کی بندی تم بھی غضب کرتی ہو! تیس بتیس برس کی عمر میں تمہاری ہم سے شادی ہوئی تھی اور اس وقت چھ جیتے جاگتے بچے گھر میں کھیل رہے ہیں۔ اس پر بھی تم کہتی ہو کہ تم بیس پچیس سال کی ہو!" ہم سے لقمہ دیئے بغیر رہا نہ گیا۔

"دیکھئے اس وقت میں آپ کی بیوی نہیں جو آپ کو میری عمر کا سارا کچا چٹھا معلوم ہو۔" بیگم اس بار ہمارے اوپر غرائیں۔ "آپ مجھے انٹرویو بنا کر اخبار میں چھپوا رہے ہیں۔ گھر والے کی نظر میں میری عمر چاہے جو بھی لیکن کیا باہر والوں کو بھی میں اپنا چٹھا چونڈا دکھاتی پھروں گی!"

نسوانی منطق سے بھرپور اس جواب نے تھوڑی دیر کے لئے ہمیں نہ صرف لاجواب بلکہ لاسوال بنا دیا۔

"آپ نے تعلیم کہاں تک اور کس کس سے حاصل کی ہے؟" تھوڑی دیر کے بعد ہم نے مہر سکوت کو توڑا۔

"گھر پر مولوی سلامت اللہ صاحب نے کلام مجید پنج سورۃ اور تھوڑی سی عربی پڑھائی پھر پنڈت دینا ناتھ نے فارسی کا سبق دیا۔ آخر میں ایک ولائتی میم صاحب نے کچھ گٹ پٹ رٹانے کی بھی کوشش کی لیکن وہ نگوڑی بے کبھی یاد ہی نہ ہوئی۔ پھر میں سیانی ہو گئی۔ اور بی اماں نے میرا پڑھنا لکھنا

پڑھائی ختم کردی۔" اس بار بیگم نے بڑی شرافت کا جواب دیا۔

"آپ کے کتنے بچے ہیں؟" ہم نے ڈائری میں نوٹ کرنے کے بعد پوچھا۔

"چھ۔" بیگم جھوم کر بولیں۔ "چار چاند سے بیٹے اور دو پھول سی بیٹیاں۔"

"کیا آپ کی شادی ہو گئی؟" بے خیالی میں ہماری زبان سے نکل گیا۔

"اے نوج اب گالیوں پر اتر آئے! شادی نہیں ہوئی تو مغضبِ خدا یہ فوج کہاں سے آگئی!!" بیگم ایک دم چراغ پا ہو گئیں۔

"ارے نہیں نہیں ہمارا مطلب یہ نہیں تھا۔" ہم نے رنگ میں بھنگ پڑتے دیکھ کر جلدی سے کہا: "ہم یہ پوچھ رہے تھے کہ آپ کی شادی کب اور کس کے ساتھ ہوئی۔" لیکن ہماری سیدھی سادی بیگم ٹیڑھی کی ٹیڑھی ہی رہیں۔

"تمہیں ہمارے سر جڑے کی قسم اب غصہ تھوک دو۔" ہم نے اپنا آزمودہ حربہ استعمال کیا۔ اور حسب توقع بیگم فوراً ریشہ خطمی ہو گئیں۔

"ہاں تو کیا پوچھ رہے تھے آپ؟" انہوں نے غصہ تھوکنے کا عملی ارادہ کرتے ہوئے منہ میں پیک گھمائی۔

"یہی کہ شادی کب اور کس سے ہوئی۔" ہم نے جلدی سے اگالدان سامنے کر دیا کیونکہ "سرخ خطرہ" ہمیں بالکل اپنے سر پہ نظر آ رہا تھا۔

"لو ایسے بھولے بن رہے ہیں جیسے کچھ یاد ہی نہیں۔" وہ شرماتی ہوئی بولیں۔ "اے دس برس پہلے آپ ہی تو دولہا بن کر مجھے بیاہنے گئے تھے۔"

"آپ پھر بہکنے لگیں۔" ہم نے یاد دلایا۔ "ہم آپ کے شوہر نہیں۔"

"توبہ توبہ ایسا بھی کیا کفر منہ سے نکالنا۔ میرے شوہر آپ نہیں تو پھر کون ہے۔ آپ ہی تو میرے سر تاج ہیں، میری زندگی! میرا پہلا پیار۔" اور اس بار انہوں نے باوجود ہماری تمام کوششوں کے نزدیک آکر ہمارے گلے میں باہیں ڈال ہی دیں۔

"وہ تو ٹھیک ہے۔" ہم نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں پرے کھسکتے ہوئے کہا۔ "لیکن خدا کے لئے آپ اس وقت اس رشتے کو بھول جایئے اور ہمیں انٹرویو مکمل کرنے دیجئے۔"

"میری شادی آج سے دس برس پہلے ہوئی تھی۔" انہوں نے گویا ہمارا مدعا سمجھ کر سر ہلا دیا۔

"کس کے ساتھ؟"

"آپ کے ساتھ۔"

"پھر وہی!" ہم نے وارننگ دی۔

"اچھا تو پھر ان کے ساتھ۔" وہ کچھ بے چین سی ہو اٹھیں۔

"ان کا نام؟" ہم نے کوشش جاری رکھی۔

"خالد کے ابا۔" انہوں نے اپنی دانست میں ہمیں مطمئن کر دیا۔

"اُفوہ۔" ہم نے بیزاری سے کہا۔ "آخر آپ انہیں کیا کہہ کر پکارتی ہیں؟"

"کبھی اے جی، اور کبھی او جی، کہہ کر۔" بیگم کے چہرے پر بدستور معصومیت پھیلی رہی۔

"لاحول ولا قوۃ۔" ہم جھنجھلا گئے۔ "آخر آپ کو ان کا ماں باپ کا رکھا ہوا نام بتلانے میں کیا اعتراض ہے؟"

"لے ہے کیا آفت ہے!" وہ بپھرے سے اکھڑ گئیں۔ "آپ کے گھڑی بھر کے کھیل کے لئے کیا میں اپنا نکاح تڑوا لوں!!"

اور یہ بیل کسی طرح منڈھے چڑھتے نہ دیکھ کر چاروناچار شوہر کے خانے میں ہم نے خاموشی سے اپنا نام لکھ دیا اور دماغ میں اگلا سوال ترتیب دینے لگے۔

"آپ کی زندگی میں کوئی ایسا واقعہ بھی پیش آیا جس کی یاد آپ کے دل میں ابھی تک باقی ہو؟"

"وہ واقعہ میں کبھی نہ بھلا سکوں گی جب منگنی سے پہلے کواڑ کی جھری میں سے آپ نے جھانک کر مجھے دیکھا تھا۔ میں کتنی کہ دل دھک دھک کئے جا رہا تھا۔ پسینوں پر پسینے آ رہے تھے اور آپ تھے کہ ندیدوں کی طرح ٹکر ٹکر مجھے گھورے ہی جا رہے تھے۔ توبہ اللہ ایسا بھی کیا ندیدا پن!"

یہ جواب سنکر پہلے تو ہم نے اپنا سر پیٹ لینے کا ارادہ کیا اور پھر کچھ سوچ کر اسے ملتوی کر دیا، آخر کسی نہ کسی طرح ہمیں اپنا انٹرویو مکمل تو کرنا ہی تھا۔

"آپ کو کون سی شے سب سے زیادہ پسند ہے؟" ہم نے پچھلا سوال اور اس کا جواب قلمزد کرتے ہوئے دریافت کیا۔

"آپ، آپ، سو بار آپ اور آپ کے بعد شلجم کا میٹھا اچار!" وہ ایک ساتھ تین تین بل کھا گئیں۔

"استغفر اللہ۔ کہاں لاکر ہماری ریڑھ ماری ہے"، ہم نے دل میں سوچا لیکن دل کی بات زبان پر نہ لانے میں ہی عافیت سمجھی۔ پھر ہم انٹرویو کے خاتمے کے طور پر کوئی ایسا معرکہ آرا سوال سوچنے لگے جو کلرکوں سے لے کر ذمہ دار آفیسروں تک کے انٹرویو میں، انجینئروں سے لیکر ڈاکٹروں تک کے انٹرویو میں، سیاست دانوں سے لے کر ادیبوں اور شاعروں تک کے انٹرویو میں اور دفتروں میں کام کرنے والی ٹائپسٹ لڑکیوں کے انٹرویو سے لے کر زنانہ کالج کی اسٹاف تک کے انٹرویو میں مشترک ہو۔ لیکن جس کے جواب میں ہمارا ذکر خیر نہ آتا ہو۔ کیونکہ یہی ذکر خیر بار بار آکر سارے شر اور فساد کی جڑ بن رہا تھا۔

"اچھا محترمہ۔ اب آخر میں چپکے سے ہمیں یہ بتلا دیجئے کہ آپ کا پیشہ کیا ہے؟" ہم بڑے دور کی کوڑی لائے۔

"اوئی! تمہارے انٹرویو پر خدا کی مار۔" بیگم کے شرارہ نما مزاج پر جیسے کسی نے پٹرول کا ٹین اُلٹ دیا ہو۔

"میں بھی کیا کوئی کلموہی طوائف ہوں جو پیشہ کراتی پھروں۔ خدا کی قسم کسی اور نے کہا ہوتا تو اس حرامزادے کا منہ نوچ لیتی۔ بے شرمی کی انتہا ہو گئی۔ لو اور سنو! غیر مرد سنیں گے تو دل میں کیا کہیں گے۔" بیگم یہ کہکر پیر پٹکتی ہوئی گھر کے اندر سما گئیں جہاں چھوٹے برخوردار نے اپنی بساط کے مطابق چیخ چیخ کر دالان کی چھت سر پر اٹھا رکھی تھی۔ اور ہم یہ سوچتے رہ گئے کہ کاش ہم نے اخبار کے لئے انٹرویو لینے کا یہ پیشہ اختیار ہی نہ کیا ہوتا۔۔۔

قومی زبان کے مُطالبے

۱۔ نجی اور کاروباری خط و کتابت اُردو میں کیجیے۔

۲۔ انگریزی کی ضرورت تسلیم مگر بے ضرورت انگریزی استعمال نہ کیجیے۔

۳۔ دعوت ناموں، عید ناموں، ملاقات ناموں کا اُردو میں ہونا قومی فضا کے لیے ضروری ہے

۴۔ مکانوں اور دکانوں پر اُردو کی تختیاں لگوائیے۔ تاکہ پاکستان، پاکستان معلوم ہو۔

۵۔ یکم جنوری سنہ ۱۹۷۲ء سے پہلے ہی عام زندگی میں اُردو کو اختیار کر کے اپنا قطعی فیصلہ اُردو کے حق میں صادر کر دیجیے۔

انجمن ترقیٔ اُردو، لاہور

منظور شدہ محکمہ تعلیمات کراچی بموجب سرکلر نمبر ڈی۔ ای / جی ڈی / ۸۰۳ ۵ - ۲ ۵۰۰۰ / ۶۰ مورخہ ۲۶ ستمبر سنہ ۱۹۶۰ء

اُردو ادب کا ڈائجسٹ

نقش کراچی

۸ — ۶۵

ادارہ

شاہد احمد دہلوی ۔ شمس زبیری

سالانہ	قیمت
بارہ روپے	ایک روپیہ

کاشانۂ اُردو ۔ پوسٹ بکس ۳۰۲ ۔ کراچی ۳

فون ۷۰۱۵۶

ترتیب

افسانے

طنز و مزاح

منظومات

مضمون

33495
15.6.76

سیپ

ایک رسالہ ——— ایک تحریک ——— ایک زندہ روایت

سیپ

کا

پانچواں شمارہ

ایک مرتبہ پھر ان زندہ روایات کا اثبات کرتا ہے

سابقہ روایات کو آگے بڑھاتے ہوئے

سیپ کا پانچواں شمارہ

شائع ہو چکا ہے

ضخامت ——— ۳۷۰ صفحات

قیمت ——— تین روپے

منیجر، سہ ماہی سیپ، بلاک ڈی، شیر شاہ کالونی، کراچی ۲۸

کرشن چندر

اَدبی دنیا۔ لاہور

گُلشن گُلشن

نواب بڑا اتریلا اور زنخاں سا لونڈا تھا۔ زرینہ کو اس لیے پسند تھا کہ وہ زرینہ کے ہاتھوں سے پٹ کر اور رو دھو کر صبر کر لیتا تھا۔ دوسرے نوکروں کی طرح بوریا بستر باندھ کر رخصت نہیں ہو جاتا تھا۔

اُس کے گندمی رنگ چہرے پر چیچک کے داغ تھے اور وہ بہت دبلا تھا اور بہت کھاتا تھا۔ اور سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جو وہ کھاتا ہے وہ کہاں جاتا ہے۔ اس کی آواز میں ایک ہلکی سی تتلاہٹ تھی۔ جب وہ کھڑا ہوتا تھا تو کبھی سیدھا کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ کسی دیوار یا کسی دروازے سے لگ کر نیم دراز حالت میں یوں کھڑا ہوتا تھا کہ پاؤں فرش پر گھسٹ رہے ہیں سر بائیں طرف کو لٹکا ہوا ہے تو کولھا دائیں طرف کو نکلا ہوا ہے۔ ایک ہاتھ ماتھے پر ہے تو دوسرے سے بیٹھ کھجا رہے ہیں۔ نواب کو عورتوں کی طرح ہاتھ ہلا ہلا کر بات کرنے کا بہت شوق تھا۔ انھی کی طرح وہ فقروں کو چبا کے یا چپٹا کر کے یا ربڑ کی طرح کھینچ کھینچ کے بولتا تھا۔ مگر باہر کے کام میں بہت ہوشیار تھا۔ اس لیے اپنی تمام مضحکہ خیز اداؤں اور غمزوں کے باوجود قابلِ برداشت تھا۔ گھر کا باورچی تین دن سے غائب تھا اور نواب کو کچن میں کام کرنا پڑ رہا تھا۔ حالانکہ اُسے صرف اوپر کے کام کے لیے رکھا گیا تھا۔ زرینہ لڑکیوں کے کالج میں پڑھانے جاتی تھی، میں اپنے دفتر جاتا تھا۔ اس لیے اگر نواب کھانا نہ پکائے تو کون پکائے۔ اور اس سے مشکل مسئلہ یہ تھا کہ باورچی کون ڈھونڈے اور کب؟ یہاں کسی کو فرصت ہی میسر نہ تھی۔

نواب کو جب تین دن کچن میں بینگن بگھارنا پڑے اور لہسن کی چٹنی پیس کر کھڑے مصالحے کا قورمہ تیار کرنا پڑا تو اُس کی ساری تتلاہٹ اور لسانیت ختم ہو گئی۔ مردوں کی طرح بڑے کرخت اور جھنجلائے ہوئے لہجہ میں بول پڑا۔ صاحب ہم سے نہیں ہوتا۔ ہم کو ایک دن کی چھٹی دو۔ ہم آپ کے لیے ایک باورچی ڈھونڈ کے لائے گا۔

"کوئی باورچی ہے تمھاری نظر میں؟" زرینہ نے اُس کی جھنجلاہٹ پر مسکرا کر پوچھا۔

کچن سے باہر آ کر نواب کو جو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے لگے تو اُس کے مزاج کی لسانیت پھر اُبھرنے لگی۔ اس پر اُسے گھر کی مالکن کی مسکراہٹ جو ملی تو اور بھی پھیل گئے۔ آپ نے ایک کندھا اوپر اُچکایا دوسرا نیچے کیا۔ بائیں کولھے کو اندر کی طرف جھکایا۔ دائیں کولھے کو ذرا سا باہر نکالا اور اپنے دونوں ہاتھ بڑی ادا سے ملتے ہوئے بولے۔

"اب لائیں گے کہیں نہ کہیں سے آپ کے لیے باورچی!" نواب نے اپنے دیدے گھماتے ہوئے باورچی کے مسئلہ کو ایک پُراسرار سیاسی راز کی طرح ہمارے سامنے کچھ اس طرح سے پیش کیا کہ جی جل کے کباب ہو گیا۔ جی چاہا سالے کو دو دو جھانپڑ دوں اور اس کی ساری اترا ہٹ نکال دوں

مگر ضرورت باورچی کی تھی اور باورچی ڈھونڈنے کی فرصت مجھے تھی نہ زرینہ کو اس لیے نواب کو ایک دن کی چھٹی دینی پڑی۔

ایک دن کے بعد اتوار تھا۔ میں اپنے کمرہ میں بیزار بیٹھا ہوا مکھی صبح کی نیلی نیلی روشنی میں اپنا سر خود ہی ہولے ہولے دبا رہا تھا۔ کبھی کبھی مجھے سر ٹوتھ پیسٹ کے ٹیوب کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ جب تک دباؤ نہیں کچھ نکلتا نہیں۔

اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ نواب دونوں ہاتھوں سے دروازے کی پٹی کو تھامے گردن ایک طرف کو لٹکائے نیم باز آنکھوں سے مجھے دیکھ رہے

"میں۔ میں۔۔۔" وہ ہنس کر بولے۔ "ہم باورچی لے آئے۔"

"کدھر ہے؟" میں نے ڈپٹ کر پوچھا۔

نواب خائف ہو کر ذرا سے سیدھے ہوئے۔ اپنے دونوں بازو دروازہ کی پٹی سے اتار کر اپنی کمر پر رکھ لیے۔ پھر ذرا پیچھے ہٹ کر کسی اور کو دے کر بولے۔

"اندر چلے آؤ!"

کالا دبلا پتلا کرنجی آنکھوں والا ایک آدمی اندر آیا۔ عمر کوئی پینتیس برس کی ہوگی چھوٹے چھوٹے کالے کالے ہونٹ۔ چھوٹی چھوٹی کرنجی آنکھیں تنگ ماتھا۔ بال الجھے ہوئے گال اندر دھنسے ہوئے۔ دانتوں کی ریخوں میں پانی کا ابھورا میل نمایاں۔ شیو کے باوجود ٹھوڑی پر کہیں کہیں بال رہ گئے تھے۔ عجیب کراہیت سی محسوس ہوئی۔

"تم باورچی ہو؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"جی!"

"کیا نام ہے تمھارا؟"

"اوم پرکاش۔"

میں نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ پھر نواب سے کہا۔ "اسے بیگم صاحب کے پاس لے جاؤ، وہ دیکھ لیں اور چاہیں تو رکھ لیں۔"

دوپہر کے کھانے میں شاہجہانی قورمہ تھا اور شملہ مرچ میں بھرا ہوا قیمہ تھا۔ اور دم کیے آلو تھے۔ مٹر پلاؤ اور رائتہ اور دو طرح کا میٹھا شاہی ٹکڑے اور دودھی حلوا۔ ہر چیز عمدہ اور نفیس تھی صحیح ذائقہ والی۔

میں نے خوش ہو کر کہا۔ "اوم پرکاش، کھانا تو تم ٹھیک پکا لیتے ہو۔"

"اوم پرکاش!" زرینہ میری طرف حیرت سے دیکھ کر بولیں۔ "مگر اس کا نام تو اشتیاق ہے۔"

میں نے باورچی کی طرف دیکھا جو ایک کونے میں اپنے دونوں ہاتھ اپنی ناف پر رکھے کھڑا تھا۔ اور مجھے دیکھنے کی بجائے زمین کو دیکھ رہا تھا۔

"کیوں بے۔ تم نے مجھے اپنا نام غلط کیوں بتایا؟" میں نے باورچی سے پوچھا۔

بولا۔ "صاحب میں آپ کے کمرے میں آیا اور آپ کو دیکھا تو ایسا لگا کہ شاید آپ ہندو ہیں۔ تو میں نے آپ کو اپنا نام اوم پرکاش بتایا۔ پھر میں بیگم صاحب کے کمرے میں گیا تو مجھ کو ایسا لگا جیسے وہ مسلمان ہیں تو میں نے ان کو اپنا نام اشتیاق بتا دیا۔"

"مگر بے وقوف، تم ایک کمرہ میں اوم پرکاش اور دوسرے میں اشتیاق کیسے ہو سکتے ہو؟"

"دلّی میں ایسا کرنا پڑتا ہے صاحب۔ ایک گھر میں اوم پرکاش تو دوسرے گھر میں اشتیاق بتانا پڑتا ہے۔۔ ..... پیٹ روٹی مانگتا ہے صاحب!" اس نے کسی قدر شکایت کے لہجے میں کہا۔ اور اس کے لہجہ سے یہ بھی معلوم ہوتا تھا۔ جیسے اس کو شکایت اس امر کی نہیں ہے کہ اسے اپنا نام غلط کیوں بتانا پڑا۔ بلکہ اس بات کی ہے کہ پیٹ روٹی کیوں مانگتا ہے۔

گرمیوں کے دن تھے دوپہر میں جب حبس بڑھنے لگا تو میں گھبرا کر دوبارہ نہانے کے لیے باتھ روم میں گھسا۔ ٹونٹی گھما کر معلوم کیا کہ شاور خراب ہو چکا ہے۔ نواب کو آواز دی تو معلوم ہوا کہ وہ اپنے تلووں میں تیل چڑھا رہا ہے۔ اشتیاق بھاگا بھاگا آیا۔ میں نے اُس سے کہا۔

"چوک میں جا کر منشی سنگھ پلمبر کو بلا لاؤ۔ شاور خراب ہے۔"

"میں ٹھیک کیے دیتا ہوں" اشتیاق بولا۔

"تم؟"

"وہ سر جھکا کر بڑی عاجزی سے بولا۔ "جی میں پلمبنگ کا کام بھی جانتا ہوں"

پانچ منٹ میں اُس نے شاور ٹھیک کر دیا۔

شام کو بجلی کا پیڈسٹل پنکھا جو صحن میں چلتا تھا خراب ہو گیا۔ زرینہ نے نواب کو آواز دی تو معلوم ہوا کہ وہ ابھی دوپہر کی نیند سے فارغ نہیں ہوا ہے لہٰذا اشتیاق کو بلایا گیا اور اُس سے کہا گیا کہ وہ چوک میں پنکھے والے کے پاس چلا جائے اور اپنے سامنے پنکھا درست کرا کے لائے۔ بہت گرمی ہے آج تو رات بھر صحن میں پنکھا چلے گا۔ اشتیاق نے گہرے تجسس سے پنکھے کا معائنہ کیا۔ معائنہ کرنے کے بعد اُس نے اپنے دونوں بازو اپنی ناف پر رکھ لیے۔ بولا۔ "حضور میں یہ پنکھا ٹھیک کر سکتا ہوں"

"کیا تم پنکھے کا کام بھی جانتے ہو؟" میں نے اُس سے پوچھا۔

سر جھکا کر بولا۔ "جی بجلی کا کام بھی جانتا ہوں۔ پنکھا فٹ کر لیتا ہوں۔ ابھی کر کے دکھاتا ہوں"

ڈیڑھ گھنٹہ میں پیڈسٹل فین فر فر چلنے لگا۔ میں نے اشتیاق کو نئی نظروں سے دیکھا۔ وہ کچھ شرمایا کچھ مسکرایا۔ آخر میں کچھ سکڑ کر کچھ سمٹ کر کچھ دبک کر کچن میں چلا گیا۔

رات کے کھانے میں رامپوری چکن تھا چکن کاٹو تو اندر بریانی ملتی ہے۔ بریانی ہٹاؤ تو اندر چکن چاٹ نظر آتی ہے۔ چکن چاٹ کھا لو تو اندر انڈوں کا خاگینہ ملتا ہے بادام اور کشمش کے ساتھ۔ عجیب بھول بھلیاں قسم کی ڈش تھی۔ مگر ستھری اور مزیدار۔ میں نے ایک روپیہ انعام دیا تو جھک کر سات بار کورنش بجا لائے۔ بولے۔

"آپ نے دیا ہے انعام۔ یہ ہے بندے پر اکرام!"

"ارے!" میرے منھ سے نکلا

"جی ہاں!" سر جھکا کر بولے۔ "میں شاعر بھی ہوں۔ میرا تخلص تنہائی ہے"

میری طبیعت شاعروں سے بہت اُلجھتی ہے۔ سنا ہے ہر وقت پان کھاتے رہتے ہیں۔ اور شعر اُگلتے رہتے ہیں۔ پہلے جی،" آج ہی جواب دے دوں۔ پھر اگلے بیس روز میں معلوم ہوا کہ حضرت بیس بائیس دوسرے پیشے بھی جانتے ہیں۔ کرسیاں بن لیتے ہیں۔ مونڈھے ٹھیک کر لیتے ہیں۔ لکڑی کا ٹوٹا پھوٹا سامان ٹھیک کر لیتے ہیں کیونکہ بڑھئی کا کام بھی سیکھا ہے۔ سنیما کے گیٹ کیپر بھی رہ چکے ہیں۔ گنڈیریاں بیچی ہیں۔ پنواڑی کے ہاں کام کیا ہے ٹھیلہ کھینچا ہے۔ کھلونوں کی فیکٹری میں کام کیا ہے۔ حجام بھی رہ چکے ہیں۔ سلائی سے لے کر کپڑوں کی دھلائی تک کے سب مراحل کو بہ حیثیت پیشہ ور کی حیثیت سے پرکھ چکے ہیں۔ بڑے عمدہ مالشیے ہیں۔ سری چمپی کے استاد ہیں۔ کن میلیے بھی ہیں۔ چاٹ بنانا جانتے ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ انتہائی کم خوراک تھا۔ زرینہ کو اُن کی یہ عادت بہت بھا گئی۔ کیونکہ وہ نواب کی اشتہا سے عاجز رہتی تھی۔ اس لیے اس نے دھیرے دھیرے گھر کا سارا کام اشتیاق کو سونپ دیا۔

دو ماہ میں اشتیاق کا سکہ سارے گھر پر جم گیا۔ اس طرح بھاگ بھاگ کے کام کرتا تھا کہ نواب اور بھی کاہل اور ناکارہ ہوتا گیا— اور

ں نے دیکھا کہ اشتیاق بھی یہی کچھ چاہتا ہے۔ عمر میں نواب اشتیاق سے سترہ اٹھارہ سال چھوٹا ہوگا۔ مگر تھوڑے ہی عرصہ میں نواب اشتیاق سے
یسا سلوک کرنے لگا جیسے وہ مالک ہو اور اشتیاق اس کا غلام ہو۔ پہلے تو میں نے یہ سمجھا کہ یہ سب کچھ جذبۂ احسان مندی میں ہو رہا ہے۔ بعد میں
یال آیا ممکن ہے اشتیاق نواب پر عاشق ہوگیا ہو۔ حالانکہ نواب پر عاشق ہونا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ عاشق کی
نکھوں کی بینائی بے حد کمزور ہو، حسِ سماعت تقریباً نہ ہو اور کوئی لطیف جذبہ دل میں نہ ہو۔ بعد میں معلوم ہوا کہ میرا یہ خیال بھی صحیح نہ تھا۔ اشتیاق
نواب کو اپنا محسن سمجھتا تھا نہ اس پر فریفتہ تھا۔ بس اُسے دوسروں کو کھلانے کا مرض تھا۔ اور دوسروں کو کھلا پلا کے دل میں ایک عجیب سی خوشی
سوس کرتا تھا۔ چونکہ وہ خود کم کھاتا تھا اس لیے وہ اپنے حصّہ کی خوراک بھی نواب کو منتقل کر دیتا۔ ہمارے بعد اُس کے لیے سالن کا بہترین حصّہ
صوص کر دیتا۔ پہلے اُسے کھلاتا۔ پھر خود کھاتا۔ ہوتے ہوتے نواب نے کام میں دلچسپی لینا بالکل ختم کر دیا۔ کسی بڑی بی کی طرح ایک کھٹیا پر پڑا کراہتا رہتا۔
ریں نے دیکھا کہ اشتیاق اُس کی فرضی بیماری کو بڑھا چڑھا کے بیان کرنے میں بڑا مزا لیتا اور اُسے کھٹیا پہ مستقل آرام کرنے کا مشورہ دیتا۔ اس کے
ہ بازار سے دوا لاتا اور پھل سگریٹ بیڑی کے پیسے بھی خود دیتا۔ کبھی کبھی ایک آدھ لش شرٹ اور پاجامہ یا پتلون بھی سلا دیتا۔ ہوتے ہوتے اشتیاق
تنخواہ کا بیشتر حصّہ نواب پر خرچ ہونے لگا۔ اور نواب اپنی تنخواہ کی کل رقم بچا کے اپنی ماں کو علی گڑھ بھیجنے لگا۔

زرینہ نے کئی بار اشتیاق کو سمجھایا۔ اُسے اپنی تنخواہ جمع کرنے کے فائدے سمجھائے۔ مگر اشتیاق پر اُس کے سمجھانے بجھانے کا کوئی اثر نہ ہوا۔
سکرا کر بولا۔

"بیگم صاحب، بچہ ہے کھا لیتا ہے تو کیا کرتا ہے!"

"ارے تو اپنے لیے بھی تو کچھ کر لے کمبخت۔" زرینہ چڑ کر اُس سے کہتی۔ "دوسروں کے لیے کیوں مرتا ہے؟"

"میرا آگے پیچھے کون ہے بیگم صاحب؟" اشتیاق گردن جھکا کر جواب دیتا۔ "بھائی نہیں، بہن نہیں، ماں نہیں، باپ نہیں۔ سب بلوے اور فرقہ وارانہ
فسادوں میں مارے گئے۔ میرا سینہ ہر وقت خالی خالی سا رہتا ہے۔"

کچھ دنوں کے بعد نواب کی ماں کا خط علی گڑھ سے آیا۔ اُس نے نواب کے لیے ایک لڑکی ٹھیک کر لی تھی، دو ماہ بعد شادی تھی۔ ماں
سے واپس بلا رہی تھی۔ غفور اسائکل والا جس کے ہاں دہلی آنے سے پہلے نواب کام کرتا تھا۔ وہ اب پھر اُسے کام دینے کے لیے تیار تھا۔ اس لیے
ب واپس جانے کے لیے تیار ہوگیا۔ ہم بھی اندر سے بہت خوش تھے۔ کیونکہ نواب اب تو تقریباً مفت کی کھاتا تھا۔ ورنہ سارا کام تو اشتیاق نے
نبھال لیا تھا۔ زرینہ نے بھی طے کر لیا تھا کہ نواب کے جانے کے بعد دوپہر کے کام کے لیے کسی کو نہ رکھے گی۔ اشتیاق کی موجودگی میں کسی دوسرے
کی ضرورت نہ تھی۔

زرینہ بولی۔ "دیکھ نواب کی شادی ہو رہی ہے۔ اب تو بھی شادی کر لے۔ اشتیاق میں تیری بیوی کو رکھ لوں گی۔ مجھے ایک ملازمہ کی ضرورت ہے۔"
شادی کے نام پر میں نے دیکھا کہ اشتیاق کچھ چڑ سا گیا ہے۔ اُس کی بھنویں تن گئیں۔ تنگ ماتھے پر بالوں کی لٹیں ڈولنے لگیں اور اُس کے
ٹے سے ہونٹ پھڑکنے لگے۔ مگر وہ کچھ بولا نہیں۔ سر جھکا کر کھانے کے کمرہ سے باہر نکل گیا۔ اُس کے جانے کے بعد نواب کے چہرے پر ایک عجیب سی
راہٹ آئی۔ کھانے کی میز کے قریب آکر بڑی رازداری سے بولا۔

"ارے صاحب، یہ کیا شادی کرے گا۔ اس کی بیوی تو شادی کے دوسرے دن ہی اِسے چھوڑ کر بھاگ گئی تھی۔"

"کیوں؟" زرینہ نے پوچھا۔

"معلوم نہیں بیگم صاحب۔" یہ کچھ بتاتا تو ہے نہیں۔"

چند منٹ کے بعد جب ہم لوگ کھانا کھا کے صحن میں ہاتھ دھونے کے لیے آئے تو دیکھا کہ اشتیاق کچن میں میلے برتن اور راکھ کا ڈھیر اپنے

سامنے رکھے خلا میں گھور رہا ہے۔ اور اُس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں کسی نامعلوم جذبہ سے بھیگ کر تارا سی چمک رہی ہیں۔

مجھے پہلی بار اشتیاق میں دلچسپی پیدا ہوئی۔

آٹھ دس روز کے بعد نواب نے علی گڑھ جانے کا پروگرام بنا لیا۔ اُس کے جانے پر اشتیاق چپکے چپکے بہت رویا۔ اُس کی آنکھیں سرخ تھیں اور ہونٹوں کے کونے بے طرح پھڑکتے تھے۔ مگر زبان سے اُس نے کچھ نہیں کہا۔ اُس نے نواب کے لیے سفری ناشتہ تیار کیا۔ حالانکہ صرف ڈھائی گھنٹہ کا سفر تھا۔ مگر قیمے کے پراٹھے اور سرخ مرچوں کا اچار اور آلو کا بھرتہ اور بیسنی روٹی اور مکھن کی ایک گولی۔ وہ نواب کی بھوک سے واقف تھا۔ خود اپنے خرچ سے اُس نے نواب کا ناشتہ تیار کیا تھا۔ اس لیے ہم شکایت بھی نہیں کر سکتے تھے۔ وہ خود نواب کے لیے اسکوٹر لے کر آیا۔ اس کا سامان اسکوٹر میں رکھا اور اُسے پرانی دلی کے اسٹیشن پر تھرڈ کلاس میں سوار کر کے واپس آیا۔

دو دن تک اس طرح مضطرب اور بے چین پھرتا رہا جیسے اُس کا گھر لٹ گیا ہو۔ اور وہ کسی اجاڑ ویرانے میں گھوم رہا ہو۔ کھانے کا معیار ایک دم گر گیا تھا۔ قورمہ اُس کے جذبہ کی طرح تلخ تھا۔ اور قلیہ اتنا پتلا جیسے کسی نے اُس کی ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا ہو۔ چپاتیاں بے ڈول اور بے ڈھنگی اور اُن پر جگہ جگہ مایوسی کی راکھ لگی ہوئی۔ دو دن تک تو ہم نے کسی نہ کسی طرح صبر کر کے کھانا زہر مار کیا۔ اور یہ سوچ لیا کہ اگر معاملہ یوں ہی چلتا رہا تو اشتیاق کو جواب دینا پڑے گا۔

مگر دو دن کے بعد اشتیاق سنبھل گیا۔ کہیں سے وہ ایک بلی کا بچہ اُٹھا لایا۔ اور اب وہ بلی کا بچہ اشتیاق کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ گھر کا کام کرنے کے بعد وہ اپنا سارا وقت جو اس سے پہلے وہ نواب کو دیتا تھا اب بلی کے بچے پر صرف کرنے لگا۔ اور اپنی تنخواہ کا کافی حصہ بلی کے لیے دودھ اور گوشت پر خرچ کرنے لگا۔ اور یوں دیکھا جائے تو بلی کا بچہ نواب سے کچھ کم نہیں کھاتا تھا۔ اس کے عشوے اور نخرے بھی نواب سے کم نہ تھے وہ اتنا ہی اتریلا تھا۔ اور ویسی ہی ادائیں دکھاتا تھا۔ دو ہی دن میں اشتیاق سنبھل گیا۔ اور کھانے کا معیار بھی ٹھیک ہوتے ہوتے پھر اپنی پہلی اور اصلی حالت پر آ گیا۔ اور ہم لوگوں نے چین کا سانس لیا۔

اشتیاق کسی کام کو ناں نہ کرتا تھا۔ کیونکہ وہ اپنی دانست میں سب کچھ جانتا تھا۔ یہ کسی شیخی خورے کی عادت نہ تھی۔ اس قدر جس قدر یہ احساس کہ مجھے یہ کام بھی کر کے دکھا دینا چاہیے۔ اُسے اپنے ذاتی وقار کے تحفظ کا بہت خیال تھا۔ اور ایک عجیب سی لگن تھی اُس کے دل میں جو اُسے ہر کام کو پورا کرنے کے لیے اُکساتی تھی۔ چاہے وہ اُسے جانتا ہو یا نہ جانتا ہو۔ کئی دنوں سے ریڈیو خراب تھا۔ اور میں چونکہ ریڈیو کا کام اچھی طرح جانتا ہوں اس لیے زرینہ نے مجھے کئی بار ریڈیو ٹھیک کرنے کے لیے کہا۔ مگر دفتر کی طویل جھک جھک کے بعد ذہن اور جسم دونوں اس قدر تھک جاتے ہیں کہ ریڈیو کو کھولنے اور ٹھیک کرنے کی ہمت کہاں سے لائیں؟ میں اس کام کو آج اور کل پر ٹال رہا تھا۔

ایک دن دفتر سے جو آیا تو دیکھا کہ ڈرائنگ روم کے ایک کونے میں پورا ریڈیو کھلا پڑا ہے اور اشتیاق عجیب گھبرائی ہوئی حالت میں اُسے ٹھیک کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اور زرینہ قریب کھڑی ہوئی رو دنکھی ہو رہی ہے۔ میں نے آنکھوں کے اشارے ہی اشارے میں پوچھا کہ کیا بات ہے؟

زرینہ بولی۔ "اشتیاق نے کہا تھا' میں ریڈیو بھی ٹھیک کر لیتا ہوں اور تمھیں کئی دن سے فرصت نہیں مل رہی ہے۔ اس لیے میں نے اشتیاق کو اس کام پر لگا دیا۔ وہ ڈھائی گھنٹے سے ریڈیو پر کام کر رہے ہیں۔ حالانکہ تم نے بتایا تھا کہ معمولی سا نقص ہے!"

میں معاملہ کی نزاکت کو سمجھ گیا۔ اشتیاق اپنے چھوٹے سے ماتھے پر بال گرائے مجھ سے آنکھیں چرائے ریڈیو پر کام کر رہے تھے۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ ریڈیو کھول تو لیا ہے، مگر اب جوڑنا نہیں آتا۔ چہرے سے پسینہ پھوٹ پڑا تھا۔ میں نے زرینہ کو باہر بھیج دیا۔ اور خود اشتیاق کے ساتھ کام کرنے میں مصروف ہو گیا۔ مگر میں نے اشتیاق کو یہ بھی محسوس نہیں ہونے دیا کہ مجھے معلوم ہے کہ اُسے یہ کام نہیں آتا۔ بلکہ میں نے اس طریقہ پر کام کو آگے

بڑھایا جیسے ہر کام اشتیاق کی مرضی سے ہو رہا ہے۔

گھنٹہ بھر میں ریڈیو ٹھیک ہو گیا۔ زرینہ بہت خوش ہوئی۔ اُس نے اشتیاق کو دو روپے انعام میں دیے۔ مگر چند دنوں کے بعد پھر اشتیاق کی شامت آئی ـــ زرینہ نے کہیں اُس سے پوچھ لیا۔ "کیا تم رس گلے بنا سکتے ہو؟"

"جی ہاں!" اشتیاق فوراً بولے۔

"ایک دن بنا کے دکھاؤ!"

"آج رات ہی کو بناؤں گا۔"

رات کے کھانے کے بعد دیر تک اشتیاق کچن میں کچھ کھڑ پڑ کرتا رہا۔ انگیٹھی سے دیر تک دُھواں سلگتا رہا۔ منہ میں بیڑی جلتی رہی ماتھے کے بال اُلجھتے رہے۔ اور کچن کی زرد روشنی دیر تک صحن میں اپنا سر پٹکتی رہی۔ کوئی ایک بجے کے قریب کچن کی بتی بجھی۔ اور اشتیاق نے دوسرے دن صبح ناشتہ میں برف میں ٹھنڈے کیے گئے رس گلے تازے اور عمدہ اور گلاب کی خوشبو سے مہکتے ہوئے پیش کیے۔

"یہ رس گلے تم نے بنائے ہیں!" زرینہ نے حیرت سے پوچھا۔

"جی، اسی خاکسار نے!" اشتیاق دروازے سے لگ کر نظریں جھکا کر پاؤں سے فرش کو کریدنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

"بالکل بازار کے سے معلوم ہوتے ہیں!" زرینہ تعریف کرتے ہوئے بولی۔

"یہی تو ان کی خوبی ہے!" میں نے کہا ـــ "سیدھے بازار سے لائے گئے ہیں۔"

"جی نہیں!" اشتیاق نے زور سے احتجاج کیا۔

اُس کے احتجاج کی شدّت دیکھ کر زرینہ کا شبہ اور بڑھ گیا۔ بولی۔ "تو آج رات کو میرے سامنے رس گلے بناؤ ـ میں خود دیکھوں گی۔"

"جی بہت اچھا!"

اشتیاق نے رس گلوں کے سلسلے میں ایک فہرست پیش کی جو منظور کر دی گئی ـ دوپہر میں بہت دیر تک اشتیاق بازار میں رہے پھر شام زرینہ نے اُن کے جھولے کی تلاشی لی کہ کہیں وہ رس گلے بازار سے نہ لے آئے ہوں۔ رات کے کھانے کے بعد اشتیاق نے بڑے اہتمام سے رس گلے بنانے کا کاروبار کچن میں پھیلا دیا۔ زرینہ نے گھر کو اندر سے بند کر کے تالا لگا دیا تھا۔ اور ہر پندرہ بیس منٹ کے بعد کچن میں جھانک لیتی تھی۔ کوئی دو بجے کے قریب جب نیند کا غلبہ شدید ہونے لگا تو رس گلے تیار ہو گئے۔ اشتیاق ایک قاب میں رس گلے لے کر آئے۔ کھانڈ کے معطر شیرے میں فینائل کی گولیوں سے بھی دو تہائی کم کے حجم کی سفید سفید گولیاں سی تیر رہی تھیں۔ زرینہ چیخی!

"ارے، یہ رس گلے ہیں۔ بکری کی مینگنی کے برابر؟"

"ابھی چھوٹے ہیں، دیکھیے، سمجھیے بیگم صاحب۔ یہ رس گلے ابھی چھوٹے ہیں۔ مگر رات بھر شیرا پیئیں گے، صبح کو پھول کر پورا رس گلہ ہو جائیں گے۔"

اشتیاق نے سمجھایا۔

زرینہ کو یقین آیا نہ مجھے۔ مگر نیند کا غلبہ شدید تھا، اس لیے ہم سو گئے۔ صبح اُٹھے تو ناشتہ پر پورے حجم کے بڑی گولائی کے سفید رس گلے کھانے کو ملے۔ کسی طرح یقین نہ آتا تھا کہ رات کو کونین کی گولیوں کے برابر حجم والے رس گلے پھول کر اس قدر بڑے ہو گئے تھے ـــ مگر رات بھر کون جاگے؟ اور کون چوکیداری کرے؟ اشتیاق ضرور صبح صبح بازار سے رس گلے خرید لائے ہوں گے۔ اور رات کی گولیوں کو اُنھوں نے

نالی میں بہادیا ہوگا۔ مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔ جو شخص اپنے ذاتی وقار کی خاطر رات بھر جاگ سکتا ہے اور اپنی جیب سے پیسے خرچ کرکے دو مردوں کو رس گلے کھلا سکتا ہے محض اپنی ذات کی اہمیت جتانے کے لیے ۔اُس سے اُلجھنا بے کار ہے۔

جوں جوں بلی کا بچہ بڑا ہوتا گیا اشتیاق کا جذبِ دروں بڑھتا گیا۔ چند ماہ میں ہمارے سامنے ایک خوبصورت بلی صحن میں گھوم رہی تھی۔ جس کے بال مکھن کی طرح ملائم تھے، جو انتہائی میٹھی سرگوشی میں خُرخُر کرتی تھی۔ اور جب گردن نیوڑھا کے آنکھیں جھپکا کے اشتیاق کی طرف دیکھتی تو وہ بیچارہ دل تھام کے رہ جاتا تھا۔ تھی بھی قیامت کی حرافہ۔ موٹی گل گوتھلی سی۔ کبھی دھیرے دھیرے مٹک مٹک کر چلتی کبھی ایک دم چنچل ہو کر چھلانگ لگاتی اور اشتیاق کے کندھے پر جا کر بیٹھ جاتی۔ اور پیار سے اُس کی گردن چاٹنے لگتی۔ کبھی ادن کا گولا بنی ہوئی پائنتی پر بیٹھ کر دھوپ کا مزا لیتی کبھی اُس کی باہوں میں پوری پھیل کر لیٹ جاتی۔ عورت کی پوری سپردگی کے ہر انداز میں۔ کبھی شریر تغافل ادا سے ایک مست انگڑائی لیتی اور جب اشتیاق اُسے پکڑنا چاہتا تو بدن چرا کر بھاگنے لگتی۔ اور اشتیاق ایک عجیب مسرت اور حسرت سے اُس کی طرف دیکھنے لگتا۔ اشتیاق نے اُس کا نام گلشن رکھا تھا۔ مگر پیار کی اہمیت میں اُسے صرف گلو کہہ کر پکارتا تھا۔

ایک دن میری غیر حاضری میں اشتیاق نے زرینہ کے بیڈ روم پر دستک دی۔

سردیوں کے دن آ چلے تھے۔ اس لیے زرینہ صبح ختم ہونے کے باوجود اپنے نائٹ گون میں ملبوس ایک سویٹر بن رہی تھی۔

"کون ہے؟" زرینہ نے پوچھا۔

"میں ہوں اشتیاق!"

"اندر آجاؤ!" زرینہ بولی۔

کاغذ پنسل لیے ہوئے اشتیاق جھجکتے جھجکتے انتہائی مؤدب انداز میں دروازے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اُس نے جھجک سے کاغذ اور پنسل آگے بڑھا دیا۔ اور بولا لکھیے۔

زرینہ بولی۔ "کیا کل کا حساب ہے، ابھی نہیں بعد میں دیکھ لوں گی۔"

"حساب نہیں ہے۔"

"پھر کیا ہے؟"

"آپ لکھیے تو۔" اشتیاق بار بار کاغذ اور پنسل آگے بڑھا رہے تھے۔ زرینہ نے کاغذ اور پنسل تھام کر ذرا سختی سے پوچھا۔

"آخر ہے کیا؟"

"ایک غزل کے تین شعر ہوئے ہیں۔"

زرینہ چند لمحوں کے لیے بھونچکی رہ گئی۔ پھر اُس کے دل میں ہنسی پھوٹنے لگی۔ مسکرا کر بولی۔

"تم تو دستخط نہیں لکھ سکتے؟"

"جی نہیں، میں نہ لکھ سکتا ہوں نہ پڑھ سکتا ہوں۔"

"مگر شعر کہہ سکتے ہو۔" زرینہ نے فقرہ مکمل کیا۔

"جی، جی بالکل کہہ سکتا ہوں۔ آپ لکھیے میں بولتا ہوں۔"

"کہیے۔" زرینہ نے زچ ہو کر کہا۔

اشتیاق نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اور ایک عجیب محویت کے عالم میں بولا۔

تنہائی میرا کام ہے گلشن تیرا نام ہے جو ہو سو ہو
ہم مرتے ہیں تجھ پر تو ڈرتی ہے مجھ سے جو ہو سو ہو

"مگر اس کی بحر کیا ہے؟" زرینہ نے پوچھا۔
"بحر؟" اشتیاق نے حیرت سے آنکھیں کھول کر پوچھا۔ "بہرحال غزل تو غزل ہے۔"
"مگر اس کا وزن؟" زرینہ نے پھر توجہ دلائی۔"
"بڑی وزنی غزل ہے بیگم صاحب۔ آپ لکھیے تو۔" اشتیاق نے کامل دلجمعی سے کہا۔
بڑی مشکل سے زرینہ نے اپنی ہنسی روکی۔ بولی۔ "آگے چلیے۔"
اشتیاق نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ اور گہرے مراقبے میں جا کر بولے۔

تیری جدائی میں ہوئے ہم مست فگار جو ہو سو ہو
کہتا ہے تنہائی اب گلشن میں کون آیا جو ہو سو ہو

زرینہ نے پوچھا۔ "کہتا ہے تنہائی! مگر تنہائی تو مؤنث ہے۔"
"مگر تنہائی تو میرا تخلص ہے۔ اور میں مؤنث نہیں ہوں۔!" اشتیاق نے سمجھایا۔
اس کے چہرے پر کچھ ایسی مسکراہٹ تھی جیسے وہ کہنا چاہتا ہو۔" اجی بیگم صاحب، یہ شعر و شاعری ہے۔ آپ کیا جانیں۔"
"اور یہ مست فگار کہاں کی ترکیب ہے تنہائی صاحب۔؟" زرینہ نے پھر پوچھا۔
"ہمارے مراد آباد میں ایسا ہی بولتے ہیں!" اشتیاق نے جواب دیا۔
زرینہ نے ایکدم کاغذ پنسل بیڈ روم کی کھڑکی سے باہر پھینک دیے۔ گرج کر بولی۔ "اشتیاق اگر آج کے بعد تو نے مجھے اپنی کوئی شعر سنایا تو کھڑے کھڑے گھر سے باہر نکال دوں گی۔" اشتیاق نے کھسیا کر سر جھکا لیا، پھر سر کھجانے لگے۔ بے حد مجوب اور شرمندہ سے دکھائی دے رہے تھے۔ زرینہ کو اس پر رحم آ گیا۔ نرم لہجے میں مسکرا کر کہنے لگی۔
"میرے خیال میں اگر آپ شعر و شاعری چھوڑ کر ناول نگاری کی طرف توجہ کریں تو بہتر ہو گا۔"
فوراً سر اٹھا کر بولے۔ "ایک ناول بھی تیار کر رہا ہوں۔"
"کیا نام ہے اس ناول کا؟" زرینہ نے پوچھا۔
"لائف اینڈ گُک۔" اشتیاق انگریزی میں بولے۔
اشتیاق کی انگریزی ایسی تھی جیسے پرانے زمانے میں اُن باورچیوں کی ہوا کرتی تھی جو انگریزوں کے پاس کام کیا کرتے تھے۔ یا آج کے اُن مزدوروں کی جو اَن پڑھ ہونے کے باوجود ٹیکنیکل دھندوں میں پڑ جاتے ہیں۔ یہ انگریزی بڑی مختصر اور جامع ہوتی ہے اور بالعموم مصدر کی محتاج نہیں ہوتی۔ مگر اپنا مفہوم ادا کرنے میں اُس انگریزی سے کہیں بہتر ہوتی ہے جسے آج کل کے طالب علم میٹرک تک پڑھتے ہیں۔
ایک دن جب اشتیاق میرے سر کی چمپی سے فارغ ہو چکا تو میں نے اُس سے کہا "تم اتنے سارے دھندے جانتے ہو۔ اگر تم کسی ایک دھندے کو پکڑ کر بیٹھ جاتے تو غالباً بہت ترقی کر جاتے۔"
"صاحب، میرا کسی کام میں زیادہ دیر تک جی نہیں لگتا۔" اشتیاق ایک چھوٹے سے تولیے سے اپنے ہاتھ صاف کرتے ہوئے بولا۔ "سال، ماہ ایک دھندا کیا۔ پھر دوسرے میں چلا گیا۔ اسی طرح زندگی کے پینتیس چھتیس برس گزار دیے ہیں۔ باقی بھی ایسی ہی گزر جائے گی۔"

"تو تم کسی ایک دھندے میں جی کیوں نہیں لگاتے ؟" میں نے پوچھا۔

"جی نہیں لگتا" اشتیاق سر جھکا کر کسی اقبالی مجرم کی طرح شرمندہ ہو کر بولا۔

"میرا سینہ ہر وقت خالی خالی سا رہتا ہے۔"

"میاؤں"

دروازہ پر گلو تشریف لائیں۔ اور وہ منہ اٹھا کے بڑی بڑی آنکھوں سے اشتیاق کی طرف دیکھنے لگی۔ اشتیاق نے اسے گود میں اٹھا لیا۔ اور اس کے بالوں پہ دھیرے دھیرے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ "گلو بھوکی ہے اسے دودھ دے آؤں۔"

"جاؤ!"

اشتیاق پر کبھی کبھی ذہنی غشی کے لمبے لمبے دورے پڑتے تھے۔ جبکہ وہ گھنٹوں اپنے خیالوں میں ڈوبا ہوا کچن میں غائب بیٹھا رہتا تھا۔ جانے کیا سوچتا ہے، خود ہی مسکراتا ہے۔ خود ہی گھورتا ہے۔ خود ہی سسکنے لگتا ہے۔ کبھی کبھی منہ میں بڑبڑانے لگتا ہے۔ کیا گزرتی ہے اس پر، وہ کون سا کرب ہے جو اسے اندر ہی اندر کھائے جاتا ہے۔ کون جانے کچھ بتاتا تو ہے نہیں۔ کبھی کبھی نشہ بھی کرتا ہے۔ قیاس غالب ہے کہ جب دل کی گھٹن اور سینے کا سونا پن حد سے گزرنے لگتا ہے تو کوئی لت ضرور کرتا ہے۔ کیونکہ ہفتے میں ایک دو دن ایسے آتے ہیں جب اشتیاق کوئی کام نہیں کر سکتا۔ سارا دن تقریباً نیم غشی کی حالت میں اپنی چارپائی پر پڑا رہتا ہے۔ اور اس کا سینہ دھونکتا رہتا ہے۔ اور دو دن کے بعد جب وہ ہوش میں آجاتا ہے تو اصرار کرتا ہے کہ نہ دن بدلا ہے نہ تاریخ بدلی ہے۔ نہ اس نے کوئی نشہ کیا ہے۔ اور ہم بھی اس لیے چپ رہتے ہیں کہ اپنا کام بہت اچھا کرتا ہے۔ ماہر ہی نہیں آرٹسٹ ہے اپنے کام کا اور فنکاروں کے دماغ کی ایک چول تو ڈھیلی ہوتی ہی ہے۔ یہ سب جانتے ہیں۔

اس لیے کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے کہ اس سے کہا حیدرآبادی بیگن بنائے۔ اور وہ لے آیا کچھ عجیب سی ڈش جس میں شوربہ پانی کی طرح پتلا تھا۔ اور اس میں بیگن کے سالے کاٹے ٹکڑے مرے ہوئے چوہوں کی طرح تیر رہے تھے۔

"یہ حیدرآبادی بیگن ہیں ؟" زرینہ چیخ کر پوچھتی ہے۔

"جی نہیں، یہ جاپانی ماؤں ہے۔" اشتیاق کہتا ہے۔ "بالکل نئی ڈش ہے، کھا کے دیکھیے، سمجھیے، چکھیے۔ بالکل نیا مزا ہے۔"

"اٹھا کے لے جا ابھی ابھی یہاں سے ورنہ تیرے سر پہ دے ماروں گا!" میں گرج کر کہتا ہوں۔ کیونکہ مجھے تو اس ڈش کو دیکھ کر ہی متلی ہونے لگتی تھی۔

اس وقت تو اشتیاق ڈش اٹھا کر لے گیا مگر بعد میں اس نے زرینہ سے کہا۔ "صاحب بھی کیسی ناانصافی کرتے ہیں۔ چکھے بغیر نا پاس کر دیتے ہیں کھانے کو۔"

اشتیاق موتی قلیہ بہت عمدہ پکاتا ہے۔ ایک دفعہ گھر پر مخصوص مہمانوں کی دعوت تھی۔ اشتیاق سے موتی قلیہ پکانے کی فرمائش کی گئی۔ جب دسترخوان بچھا تو منجملہ دوسری چیزوں کے ایک نہایت بدبو دار اور سڑی ہوئی ڈش سامنے آئی۔

"یہ موتی قلیہ ہے ؟" زرینہ نے حیرت سے پوچھا۔

"جی نہیں!" اشتیاق فوراً بولے۔ "یہ پیسٹ ہے۔"

"پیسٹ کیا ؟ تمھیں تو موتی قلیہ تیار کرنے کو کہا تھا، کہا تھا کہ نہیں ؟" زرینہ خفا ہو کے بولی۔

"جی، موتی قلیہ بگڑ گیا۔ اس لیے میں نے نئی ڈش تیار کر دی۔" اشتیاق کی یہ عادت اب ہمیں معلوم ہو چکی ہے، کہ جب کوئی سالن بگڑ جاتا ہے تو وہ فوراً اسے نیا نام دے کر دسترخوان پر پیش کر دیتے ہیں۔ اور ڈش کے بگڑنے کا یوں تذکرہ کرتے ہیں جیسے کسی اعلیٰ خاندان کا لڑکا خود بخود بگڑ جائے۔ اور اس کے

بگاڑنے میں ان کا کوئی ہاتھ نہ ہو۔

اب کیا کہیں۔ چند ایسے مہمانوں کی دعوت تھی جن کے سامنے میں بے تکلف نہ ہو سکتا تھا۔ ورنہ آج میرا ارادہ اشتیاق سے بے تکلف ہونے کا تھا۔ مگر مہمان موجود تھے۔ اور دوسرے سالن بے حد عمدہ تھے۔ اس لیے خاموش رہ جانا پڑا۔

دوپہر کے کھانے کے بعد ہم اپنے مہمانوں کو لے کر میٹنی شو دیکھنے چلے گئے۔ اور چلتے چلتے زرینہ نے اشتیاق کو رات کے کھانے کے متعلق ہدایات دے دیں۔ میٹنی شو دیکھ کر جب ہم شام کو واپس آئے تو دیکھا کہ گھر کے باہر فائر بریگیڈ کھڑا ہے۔ بہت سے لوگ جمع ہیں اور کچن کی چمنی اور چھت اور کھڑکیوں سے دھوئیں کے بادل اُٹھ رہے ہیں۔

"آگ، آگ۔ میرا گھر بچاؤ!" سینٹ لارڈ زور زور سے چیخ رہا تھا۔

"اشتیاق کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کیا معلوم؟" سینٹ لارڈ اپنے سر کے بال نوچتے ہوئے بولا۔ "ایک گھنٹہ سے چیخ رہا ہوں۔ دروازہ ہی نہیں کھولتا۔ اندر کچن میں شاید نشہ کرکے بے ہوش پڑا ہے۔"

میں نے اور زرینہ نے۔ دونوں نے چلا چلا کر اشتیاق سے دروازہ کھلوایا۔

اشتیاق بے حد حیرت زدہ کچن سے نکلے اور دھواں دیکھ کر پلٹے اور کچن کی دونوں انگیٹھیوں پر پانی ڈال کر بجھانے لگے۔ دونوں پتیلیوں کے سالن جل چکے تھے۔ مگر خدا جانے اُن میں اُس نے کون سا مصالحہ ڈالا تھا کہ دھوئیں کے گہرے سیاہ بادل اب تک ان پتیلیوں سے اُٹھ رہے تھے۔

"آگ، آگ!" سینٹ لارڈ غصہ سے چیخ رہا تھا۔

"کدھر ہے آگ؟" اشتیاق حیرت سے پوچھنے لگا۔

زرینہ بولی۔ "یہ بے چارے ایک گھنٹہ سے چیخ رہے ہیں۔ دروازہ پیٹ رہے ہیں اور تمھیں کچھ پتہ ہی نہیں۔ فائر بریگیڈ تک آ گیا۔ اور تم کچن کا دروازہ بند کیے غافل بیٹھے ہو۔"

اشتیاق سب لوگوں کو متوجہ دیکھ کر کچھ چونکے۔ شرمندہ ہو کر سر کھجانے لگے۔ ایک انگلی اپنی کھوپڑی پر رکھ کر بولے۔

"بحث چل رہی تھی۔"

"کیسی بحث؟" زرینہ کا پارہ چڑھنے لگا۔ "تم تو یہاں اکیلے بیٹھے ہو؟"

"کورٹ میں مقدمہ تھا۔"

"کیسا مقدمہ؟"

"آبائی مکان کا مقدمہ تھا۔ میرے اور چچا زاد بھائی لطیف کے درمیان۔ وکیل استغاثہ اور وکیل صفائی کے درمیان بحث ہو رہی تھی۔"

"کدھر ہے وکیل استغاثہ اور وکیل صفائی۔" زرینہ کے غصہ کا پارہ چڑھنے لگا۔

"میں خود دونوں طرف سے وکیل ہوں، خود ہی کورٹ ہوں، خود ہی مدعی۔ خود ہی مدعا علیہ۔ خود ہی بحث کرتا تھا، خود ہی جواب دیتا تھا۔" اشتیاق نے بتایا۔

"مگر کہاں بحث چل رہی تھی۔؟" زرینہ نے دانت پیس کر پوچھا۔

"یہاں!" اشتیاق نے اپنی کھوپڑی پر انگلی رکھ کر کہا۔ اور سر جھکا لیا۔

زرینہ کا دل اشتیاق سے ہٹنے لگا۔ میرا بھی۔ عمدہ باورچی ہونے کے باوجود اُس کی خامیاں اب جان لیوا ثابت ہونے لگیں۔ ادھر اشتیاق نے

زیادہ اُس کی بلّی بی گلشن نے مجھے عاجز کر دیا۔ میں دراصل اشتیاق کی وجہ سے اُس سے بے اعتنائی تو نہ برتتا تھا۔ کیونکہ اشتیاق نہیں چاہتا تھا کہ اُس کے سوا کوئی دوسرا اُس کی بلّی پر توجہ دے۔ مگر غالباً گلشن کو یہ بات پسند نہ تھی۔ وہ مجھے بھی اپنے مداحوں کی فہرست میں شامل کرنے پر مصر تھی دو ایک بار وہ میرے کمرے میں اٹھلاتی ہوئی آئیں۔ مگر میں نے شش کہہ کر بھگا دیا۔ پھر میری غیر حاضری میں ایک بار وہ میرے بستر پر چڑھ کے سو گئیں۔ دراصل سوئی نہ تھیں۔ سونے کا بہانہ کر رہی تھیں۔ وقت بھی بی گلشن نے وہ چنا تھا جو میرے دفتر سے آنے کا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ دیکھو ہم تمھارے بستر پر چڑھ کے سوئیں گے۔ اور اگر تم اسے برداشت کر گئے تو دوسری بار تمھارے سینے پر چڑھ کے سوئیں گے۔ یعنی جس قدر میں بے اعتنائی دکھاتا تھا۔ اُسی قدر وہ مجھے اپنے قریب، لانے پر مصر تھیں۔ اس وقت میں نے جو اُنھیں بستر پر سوئے ہوئے دیکھا تو غصّہ میں آ کر اُنھیں دُم سے پکڑا اور بستر سے نیچے پھینک دیا۔ بے حد خفا ہو کر غرّائیں اور جھلّا کر کمرے سے باہر چلی گئیں۔ مگر اس کا بدلہ گلشن نے یوں لیا کہ دوسرے دن دفتر سے جو آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرے کمرہ میں سمبل کی ریشمی روئی کے دونوں تکیے اُدھڑے پڑے ہیں اور گلشن اُنھیں پنجے مار مار کر نوچ رہی ہے اور سمبل کو ہوا میں اُڑا رہی ہے۔

میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ جھپٹا مارنے کے لیے آگے جو بڑھا تو گلشن چھلانگ لگا کر دروازے سے باہر۔ اور بلّی چلانے لگی — "میاؤں! میاؤں!" مگر آج میں نے بھی قسم کھائی تھی۔ آج میں اس حرافہ کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں نے صحن کا دروازہ بند کر دیا — اور ڈرائنگ روم سے، بیڈ روم اور ڈائننگ روم سے، کچن سے، صحن سے باتھ روم تک گلشن کے پیچھے پیچھے بھاگ کر آخر میں نے اُسے پکڑ لیا۔ اور دونوں ہاتھوں سے دبا کر اُسے گھر سے باہر لے چلا۔ اشتیاق سہما ہوا میرے پیچھے پیچھے آنے لگا۔ مگر میرے غصّے کو دیکھ کر منہ سے کچھ بول نہیں رہا تھا۔ صرف اُس کے ہونٹوں کے کونے پھڑک رہے تھے۔

بڑی سڑک پر آ کر میں ایک کونے میں کھڑا ہو گیا۔ اس سڑک پر کئی کھڈے اور گڑھے تھے۔ اور اس پر ان گنت وزنی ٹرک گھوں گھوں کرتے ہوئے گزرتے تھے۔ میں نے ایک ٹرک کو قریب آتے ہوئے دیکھ کر یکایک گلشن کو زور سے جھلایا اور قصّابانہ باندھ کر گزرتے ہوئے ٹرک کے نیچے پھینک دیا۔ اشتیاق کے گلے سے ایک گھٹی ہوئی چیخ نکلی۔

ٹرک سڑک پر سے گزر گیا۔ چند لمحوں تک ایسا محسوس ہوا جیسے گلشن سڑک پر پس کر بھی لیٹی ہے۔ پھر یکایک وہ چونک کر کھڑی ہوئیں۔ اور بجلی کی سرعت سے چھلانگ لگا کر سڑک کو پار کرتی ہوئی مخالف سمت چلی گئیں۔ دو ایک بار اُس نے پلٹ کر ہماری طرف دیکھا۔ مگر ادھر ہمارے گھر کی طرف آنے کی بجائے وہ مخالف سمت ہی دوڑتی چلی گئی۔ اور پھر کبھی ہمارے گھر نہیں آئی۔

تین دن تک اشتیاق نے انتظار کیا مگر گلشن کہیں نظر نہیں آئی۔ چوتھے دن اُس نے سامان باندھ لیا۔ اور بولا — "صاحب میرا حساب کر دیجیے۔ میں جانا چاہتا ہوں"۔

"کیوں؟ تمھیں یہاں کیا تکلیف ہے۔؟" زرینہ نے پوچھا۔

اشتیاق نے مجھ سے آنکھیں چرا کے زرینہ سے کہا۔ "بیگم صاحب، جس طرح صاحب نے میری بلّی کے ساتھ سلوک کیا ہے — وہ میں برداشت نہیں کر سکتا۔"

"اور وہ جو تمھاری بلّی نے میرے چالیس روپے کے دو قیمتی تکیے پھاڑ ڈالے ہیں اس کا ہرجانہ کون دے گا؟" میں نے غصّہ سے بلند آواز میں کہا۔

زرینہ معاملے کو سلجھانے کے خیال سے بولی۔ "ارے ایک بلّی کی وجہ سے لگی لگائی نوکری چھوڑتا ہے۔ میں تجھے ایسی ایسی دس بلّیاں لا دوں گی۔"

"نہیں، وہ تو میری گلشن تھی۔" اشتیاق کی آواز کمزور ہو کر لرزنے لگی جیسے وہ ابھی رو دے گا۔

"ارے گلشن تھی کہ زلفن کہ کرمین جو نام چاہے رکھ لینا۔" میں نے بھی اُسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "سیکڑوں بلیاں گھومتی ہیں اس علاقہ میں۔"

اشتیاق نے پھر نظریں چرا کر مجھ سے رُخ موڑ کر زرینہ کی طرف دیکھا۔ بولا

"مجھے صاحب سے بڑا ڈر لگتا ہے اب تو۔"

"کیوں؟" زرینہ نے پوچھا۔

"جب صاحب نے گلشن کو اُٹھا کر سڑک پر پھینک دیا تو مجھے ان کا چہرہ بالکل اپنے باپ کی طرح نظر آیا۔"

"اپنے باپ کی طرح؟ کیا بکتے ہو!" زرینہ غصہ سے بولی۔

اشتیاق نے ایک دو لمحہ توقف کیا۔ پھر گمبھیر لہجہ میں کہنے لگا۔ "اسی طرح میرے باپ نے ایک دن نشہ کی حالت میں مجھے گھر سے اٹھا کر باہر سڑک پر پھینک دیا تھا۔ اُس وقت میری عمر صرف چار سال کی تھی۔ میں یقیناً مر جاتا۔ مگر سڑک پر جہاں میں گرا اُس پر ایک بڑا سا گڈھا تھا اور میں اُس گڈھے سے باہر نہیں نکل سکا۔ اور رات کا وقت تھا۔ اور دو ایک ٹرک پرے سے پرے گزر گئے۔ پھر شاید میں بے ہوش ہو گیا۔ میری ماں دوہتڑ مار کر چیخنے لگی۔ یکایک میرے باپ کو ہوش آ گیا۔ اور وہ بھاگا بھاگا آیا۔ اور سڑک کے گڈھے سے مجھے اُٹھا کے اپنے سینے سے لگا کے گھر لے گیا۔ اور وہ میرا منہ چومتا تھا۔ اور زور زور سے روتا تھا۔ اور کبھی میری ماں مجھے اُس سے چھین کر اپنے سینے سے لگا لیتی تھی۔ اور کبھی میرا باپ مجھے میری ماں سے لے کر اپنی چھاتی سے لگا لیتا تھا۔ مگر میں اُس کا وہ چہرہ کبھی نہیں بھول سکتا جب اُس نے مجھے غصہ میں اپنے ہاتھوں سے اُٹھا کر سڑک پر پھینک دیا تھا۔ بالکل ایسا ہی چہرہ تھا اُس وقت صاحب کا۔ اس لیے میرا حساب کر دو۔ میں یہاں نہیں نہیں رہوں گا۔"

اشتیاق میرے پاؤں کو ہاتھ لگانے لگا۔ جیسے اپنی گستاخی کی مجھ سے معافی مانگ رہا ہو۔

زرینہ نے اُس کا حساب کر دیا۔

تین سال کے بعد جب ہمارا تبادلہ بمبئی میں ہو گیا تو وہ ہمیں بمبئی میں ملا۔ ہمیں ایک گھر کی تلاش تھی۔ اور اشتیاق ایک ہاؤس ایجنٹ تھا۔ اور اُس کا نام اب لالو کرمانی تھا۔ اور وہ سندھی تھا۔ اور سندھی زبان وہ بڑے فرّاٹے سے بولتا تھا۔ وہ کھدر کا پاجامہ اور کھدر کا ایک لمبا کرتا پہنتا تھا۔ اور پہلی نظر میں کسی محلہ کمیٹی کا کانگریسی نیتا معلوم ہوتا تھا۔

"یہ کیا ڈھنگ ہیں تمھارے یہاں پر؟" زرینہ نے اپنے دونوں ہاتھ اُٹھا کر اُس سے پوچھا۔

"اِدھر ــــ بــــلڈنگ کا اکھّا دھندا سندھی لوگ کے پاس ہے۔ اس لیے ہم بھی سندھی بن گیا ہے بیگم صاحب! کیا کریں۔ پیٹ روٹی مانگتا ہے۔"

"کوئی بلّی وِلّی پال رکھی ہے ادھر بھی؟" میں نے اُس سے پوچھا۔

وہ شرمندہ سا ہو گیا۔ آنکھیں جھپکاتے ہوئے بولا۔ "صاحب ادھر بمبئی میں جندہ رہنا بھی مشکل ہے۔ ایک ایرانی ہوٹل کے مالک نے ترس کھا کر میرا ٹرنک اور بستر اپنے باورچی خانہ میں رکھنے کی اجازت دے دی ہے۔ رات کو اُس کی دکان کے سامنے پڑ رہتا ہوں۔ صبح گیارہ بجے تک اُس کی دوکان میں سموسے بناتا ہوں۔ پھر رام داس ماکی جانی کے دفتر میں جاتا ہوں۔"

"یہ ماکی جانی کون ہے ؟" زرینہ نے پوچھا۔
"اصل میں ہاؤس ایجنٹ تو وہی ہے۔ میں اُس کا دوسرا اسسٹنٹ ہوں!"
"تم کو کیا ملتا ہے؟"
"کمیشن ملتا ہے۔"
"کتنا؟"
"ماکی جانی کو ٹوئنٹی فایو پرسنٹ ملتا ہے۔ پہلے اسسٹنٹ کو فایو پرسنٹ ملتا ہے۔" اشتیاق انگریزی بگھارنے لگے۔ "ہم کو ون پرسنٹ!"
"ون پرسنٹ؟" زرینہ نے پوچھا۔ "ون پرسنٹ آف واٹ؟" *One percent of what?*
اشتیاق بولے۔ "ون پرسنٹ آف دی فایو پرسنٹ آف دی ٹوئنٹی فایو پرسنٹ آف دی ہنڈرڈ پرسنٹ!"
زرینہ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئی۔ اشتیاق خود بھی بے حد محظوظ ہوئے۔ آخر جب زرینہ نے کسی طرح سے اپنی ہنسی پر قابو پالیا تو بولے۔
"آپ کو ایک فلیٹ دے سکتا ہوں۔"
"کیسا ہے وہ فلیٹ؟"
اشتیاق انگلی پر کمرے گنواتے ہوئے بولے۔ "ون بیڈ روم، ون باتھ روم، ون بیڈ روم مور، ون کچن، ون ہال اینڈ سیپریٹس۔"
"یہ *and separates* کیا بلا ہے۔؟" زرینہ نے پوچھا۔
"یس اینڈ سیپریٹس!" اشتیاق نے اس طرح حیرت سے زرینہ کی طرف دیکھا گویا کہہ رہا ہو۔ ایم۔ اے کرنے کے باوجود اتنی معمولی سی انگریزی نہیں سمجھ سکتیں آپ۔؟
"اینڈ سیپریٹس۔ بیگم صاحب!" اشتیاق نے پھر سمجھایا۔
زرینہ نے یکایک سمجھ کر کہا۔ "اچھا، تمھارا مطلب ہے آل *seperates*۔ یعنی ہر کمرہ دوسرے سے الگ الگ ہے۔"
"یس اینڈ سیپریٹس!" اشتیاق کے چہرے پر احساس برتری کی ایسی جھلک آئی گویا کہہ رہا ہو۔ اُفوہ کتنی دیر سے بات آپ کی سمجھ میں آئی۔
زرینہ پھر ہنسنے لگی۔ میں نے بات ٹالنے کی غرض سے کہا۔ "اور بھی کچھ کام کرتے ہو؟"
"جی ہاں، ایک ٹوتھ پیسٹ تیار کیا ہے۔ میری ٹوتھ پیسٹ!"
"یہ میری کون ہے؟" زرینہ نے چونک کر پوچھا۔
شرما کر بولے۔ "ایک چھوکری ہے۔"
"تمھاری منگیتر؟"
"جی نہیں!" سر ہلا کر بولے۔ "ہمارے ہوٹل میں ایک عیسائی بڑھیا کام کرتی ہے۔ اُس کی چھوکری ہے۔ کوکن کے گاؤں میں پتہ ہم اپنی چھوکری کی شادی بناتا ہے۔"
"تمھارے سنگ؟" زرینہ نے خوش ہو کر پوچھا۔

"نہیں، کسی عیسائی چھوکرے کے سنگ۔ ایلفرڈ اُس کا نام ہے۔ وہ بھی اُدھر کوکن کے گاؤں میں رہتا ہے۔ مگر بڈھی بہت گریب ہے۔ اُس کے پاس پیسہ نہیں ہے۔ اس لیے ہم نے میری لونڈیا کو تو پیسٹ نکالا ہے۔ اور اُس کو شام کے ٹائم میں بھیجا ہے اور اس کا پیسہ اُس کر سچین بڈھی کو دیتا ہے۔"

"تاکہ اپنی چھوکری کی شادی تمھارے سوا کہیں اور کر سکے؟" زرینہ نے بے حد تلخ ہو کر پوچھا۔

یکایک اشتیاق سٹپٹا گیا۔ اُس کی آنکھوں کی پتلیاں جلدی جلدی گھومنے لگیں۔ اس کے ہونٹوں کے کونے تیزی سے پھڑکنے لگے۔ اور گال اور بھی اندر کو دھنستے گئے۔ اور اُس کا چہرہ ایک ایسی کالی کھوپڑی کی طرح نظر آنے لگا جس پر صرف کھال ہی کھال منڈھی ہو۔ مجھے اُس کو دیکھ کر بہت رحم آیا۔ وہ اس وقت زرینہ سے نظریں چرا کر یوں چاروں طرف دیکھ رہا تھا جیسے چاروں طرف سے دیواریں اُس پر گر رہی ہوں۔ اور اُس کے بچ نکلنے کا کہیں کوئی راستہ نہ ہو۔

میں نے جلدی سے بات کا رُخ پھیرتے ہوئے اُس سے پوچھا۔

"شعر و شاعری جاری ہے؟"

اُس نے انکار میں سر ہلا دیا۔

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"اب تو ایک فلمی کہانی لکھ رہا ہوں۔" اشتیاق نے بڑے فخر سے اعلان کیا۔ وہ اپنی گھبراہٹ پر قابو پا چکا تھا۔

"ہیرو کون ہے؟" میں نے پوچھا

"اشتیاق!" اپنا نام لے کر بولے۔ "ڈبل رول ہے اشتیاق کا اس پکچر میں۔"

"اور ولین کون ہے؟" زرینہ نے پوچھا۔

"شاید دلیپ کمار نبھا جائے۔" اشتیاق سوچ سوچ کر بولے۔ "ولین کا رول بہت مشکل ہے۔"

زرینہ نے ہنسی روکنے کے لیے اپنے منہ میں دوپٹہ ٹھونس لیا۔

"اور ہیروئن؟" میں نے پوچھا۔

"فلم انڈسٹری میں تو کوئی ہے نہیں۔" اشتیاق سنجیدہ ہو کر بولے۔ "باہر دیکھ رہا ہوں۔"

"فلم انڈسٹری میں کوئی نہیں ہے۔؟" میں نے پوچھا۔ پھر اُسی کا انگریزی فقرہ میں نے دُہرا کر پوچھا

"Not enen one percent of the five percent of the twenty five percent of the hundred percent ?

"نو سر!" اشتیاق نے سر ہلا کر کہا۔

"تو اس فلم کے گانے کون لکھے گا؟ تم نے تو شاعری ترک کر دی ہے۔"

"جی!" اشتیاق اپنے ہاتھ کے ایک ناخن کو دوسرے ناخن سے کریدتے ہوئے بولے۔ "شاعری تو چھوڑ دی ہے۔ مگر اس فلم کے گانے تو میں ہی لکھوں گا۔ ایک ٹکڑا کہا ہے....."

"کیا؟"

نگاہیں نیچی کیے آنکھوں کے کونوں سے ڈرتے ڈرتے چور نگاہوں سے زرینہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ "صاحب بات یہ ہے کہ

قبل سے بیگم صاحب نے ہم کو بہت ڈرا دیا تھا کہ اس کا وزن بہت بڑا ہوتا ہے۔ اس لیے ہم نے غزل کو چھوڑ دیا۔ مگر فلمی گیت میں ہم دیکھتے ہیں کہ اس کا وزن چھوٹا ہوتا ہے۔ کیا مطلب کہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہوتے ہیں۔ اور بیچ بیچ میں میوزک ہوتا ہے۔ اس لیے ہم نے ایک فلمی گیت شروع کیا ہے۔ اس طرح چھوٹے چھوٹے ٹکڑے والا۔"

"تو سناؤ!" میں نے بے چین ہو کر کہا۔

اشتیاق نے کھنکار کے گلا صاف کیا۔

"او صنم! او صنم!

میں نے لیا

اُلّو کا جنم

تیرے لیے۔"

زرینہ کی بُری حالت تھی۔ منہ میں دوپٹہ ٹھونستے ہوئے اُس کا چہرہ لال ہوتا جا رہا تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے اپنی ہنسی روکی۔ اور اُس سے پوچھا۔

"مگر اُلّو کا جنم کیوں اشتیاق؟" روکنے کے باوجود میری ہنسی میرے سوال سے باہر چھلکی پڑتی تھی۔

"اُلّو کا جنم اس لیے صاحب۔" اشتیاق نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "کہ اشتیاق کو یعنی فلم کے ہیرو کو رات میں نیند نہیں آتی ہے۔ ہیروئن کے فراق میں.... ہیروئن کے فراق میں رات رات بھر جاگتا ہے۔ اور اُلّو بھی رات کو جاگتا ہے۔ اس لیے.... بات کو سمجھیے ذرا۔ ذرا سوچیے کیا گہری حقیقت بیان کیا ہوں۔"

"ارے اُلّو کے پٹھے!" زرینہ نے دوپٹہ منہ سے نکال کر یکایک چیخ کر کہا۔ "بھاگ جا یہاں سے ورنہ اپنی چپل اتار کر اتنے ماروں گی اتنے ماروں گی کہ....."

زرینہ چپل اتارنے لگی۔

اشتیاق بھاگ کھڑا ہوا۔

اشتیاق کا کاروبار ایرانی ہوٹل والے کے ہاں خوب چمک گیا۔ پہلے وہ صرف سموسے بناتا تھا۔ پھر اُس نے ایرانی ہوٹل کے مالک کو ڈھرّے پر لگا کر اُسے شاہی ٹکڑے بیچنے کی ترغیب دی

"بہت سستے میں بن جائے گا سیٹھ۔ تمہارے ادھر ڈبل روٹی کا کتنا ٹکڑا ایسے کا ایسے پھینکتا ہے۔ ہم اس کو کام میں لائے گا۔ خالی شکر کا خرچ ہے۔ اور تھوڑی سی بالائی۔" اشتیاق نے اُسے سمجھایا۔ "اور تمہارے پاس تین تین ریفریجریٹر ہے۔ ایک ریفریجریٹر میں شاہی ٹکڑا رکھے گا۔ گاہک کو ٹھنڈا ٹھنڈا سرو (Serve) کرے گا۔" ایرانی مان گیا۔ کیونکہ خرچہ بہت کم تھا اس مٹھائی کا۔ پہلے دن اشتیاق نے جو شاہی ٹکڑا بنایا تو وہ دو آنے فی ٹکڑے کے حساب سے ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔ ایسی عمدہ ڈش جس سے پیٹ بھی بھرے اور مٹھائی کی مٹھائی بھی معلوم ہو ____ ایرانی ہوٹل میں بیٹھنے والوں نے آج تک کاہے کو کھائی تھی۔ اب تو یہ حالت ہو گئی کہ اشتیاق کو دن میں دو بار شاہی ٹکڑے تیار کرنے پڑتے اور بکری کو بڑھتے دیکھ کر ایرانی ہوٹل کے مالک نے اشتیاق کو اپنے کچن کا ہیڈ کک مقرر کر دیا۔ کچن میں کام کرنے والے نوکر اشتیاق کو استاد جی کہہ کے پکارتے تھے۔ اور ہوٹل کا مالک اشتیاق کو شاہی ٹکڑے کی مناسبت سے میرے دل کا ٹکڑا کہتا تھا۔

اگر میں نے کبھی اشتیاق کے جسم اور روح پر بہار آتے ہوئے دیکھی ہے تو وہ یہی دن تھے ۔۔۔ اُس کے گال بھرنے لگے ۔ اور کالے رخساروں پر صحت کا اُودا پن جھلکنے لگا ۔ اور وہ کشتیاں اس کی پتلیوں کی جو اُس کی آنکھوں میں ہر وقت بے چین اور مضطرب ہو کر تیرتی رہتی تھیں اب بمبئی کے ساحل پر لنگر ڈالتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ جہاں اشتیاق نے ہمیں مکان دلوایا تھا اُس کے قریب کوئی ایک فرلانگ کے فاصلہ پر وہ ایرانی کا ہوٹل تھا۔ چوک کے نکڑ پر۔ سامنے ٹیکسیوں کا اڈا تھا۔ اور قریب ہی ایک نئی مارکیٹ کھل گئی تھی۔ اس لیے صبح سے شام تک اس ایرانی ہوٹل میں بڑی بھیڑ رہتی تھی۔ بوٹ پالش کرنے والے اور پان بیچنے والے اور بھیل پوری کی چاٹ بیچنے والے اور آس پاس کے گھروں اور بنگلوں کے نوکر چاکر اور کالجوں کے ٹیڈی بوائز، اور کام کی تلاش میں گھومنے والے بے کار اور آوارہ گرد لونڈے جو کالج کے لڑکوں سے زیادہ ٹیڈی معلوم ہوتے تھے ان سب کا جمگھٹا اس ہوٹل کے اندر اور باہر رہتا تھا۔ اور اس ہوٹل میں اشتیاق بہت پاپولر ہو گیا تھا۔ آتے جاتے میں اُسے دیکھتا تھا۔ سہ پہر تک تو وہ اپنے میلے کپڑوں میں کبھی کچن کے اندر کبھی کچن کے باہر بڑی مستعدی سے کام کرتا دکھائی دیتا۔ کوئی چار بجے کے قریب وہ نہا دھو کر گیروے رنگ کا بنگالی کرتا اور اُس کے نیچے کھلے پائنچوں والا پاجامہ اور چپل پہن کر ایرانی ہوٹل کے باہر آ کھڑا ہوتا۔ اُس وقت اُسے کام کی تلاش میں آئے ہوئے اِدھر اُدھر سے بہت سے لونڈے گھیر لیتے۔ وہ اِدھر اُدھر کے بنگلوں اور فلیٹوں میں اُن لڑکوں کو نوکر کرا دیتا۔ کیونکہ ہاؤس ایجنٹ کا اسسٹنٹ ہونے کی وجہ سے آس پاس کی بلڈنگوں میں اُس کی خاصی جان پہچان ہو گئی تھی۔ جن لونڈوں کو وہ نوکری نہ دلوا سکتا اُنھیں دوسرے دن آنے کا مشورہ دے کر چلتا کرتا۔ پھر بیڑی سلگا کر لانڈری کے مالک سے باتیں کرتا جو اُس کا ہم وطن تھا۔ یعنی مراد آباد کا رہنے والا تھا۔ اور جس کے لیے وہ ایک نہایت ہی عمدہ اور نہایت ہی سستی قسم کا ایسا صابن بنانا چاہتا تھا جس میں خرچ بہت کم ہو۔ اور کپڑے بھی بہت عمدہ دھل جائیں۔ مگر اشتیاق ابھی اپنی ایجاد میں کامیاب نہ ہوا تھا۔

ٹھیک لانڈری سے فارغ ہو کر وہ اپنے ہاؤس ایجنٹ کے ہاں چلا جاتا۔ یا نئے گاہکوں کو لے کر مکان دکھانے کے لیے چلا جاتا۔ رات کو نو دس بجے فارغ ہو کر ایرانی ہوٹل میں کھانا کھاتا۔ اور پھر ایک کپ چائے پی کر اور پھر بیڑی سلگا کر اور پان کھا کر وہ سنتو باورچی کے جھونپڑے میں جا کر سو رہتا۔ کیونکہ اب وہ بڑا آدمی ہو گیا تھا۔ وہ اب ایرانی ہوٹل کے باہر نہیں سو سکتا تھا۔ سنتو باورچی کا جھونپڑا بارھویں نمبر کی سڑک کے پیچھے ایک چھوٹے سے خالی پلاٹ پر تھا۔ اور اُس کی بیوی، بچہ ہونے کے لیے اپنے میکے ٹڑمی گڑھوال کے کسی گاؤں میں گئی ہوئی تھی۔ اور کہیں چار ماہ کے بعد واپس آنے والی تھی۔ تب تک اشتیاق سنتو کے جھونپڑے میں رہ سکتا ہے۔ سنتو نے اُستاد جی سے کہا تھا۔

شاہی ٹکڑوں کی روز افزوں بکری کو دیکھ کر میں نے اندازہ کیا تھا کہ اب اشتیاق کے قدم یہاں جم جائیں گے۔ اس لیے دو ماہ کے بعد مجھے بڑی حیرت ہوئی جب ایرانی ہوٹل کے مالک نے مجھے بتایا کہ اُس نے اشتیاق کو نکال دیا ہے۔

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔ "کوئی غبن کیا؟"

"نہیں، آج تک ایک پیسہ کا غبن نہیں کیا۔" ایرانی ہوٹل کا مالک بولا۔

"پھر کیا کام میں گڑبڑ کرتا تھا؟"

"نہیں، کام تو اشتیاق بہت اچھا کرتا تھا۔"

"پھر۔۔۔؟"

ایرانی ہوٹل کے مالک نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔ پھر جلدی سے بند کر لیا۔ پھر ایک ٹھنڈی سانس بھری اور بولا۔ "اُس کا بھیجا پھر گیلا ہے۔ ہم اُس کو ستر روپیہ پگار دیتا تھا۔ وہ پگار بھی اُس نے خرچ کر دیا۔ اوپر سے پانچ سو کپ چائے اور دو سو سلائس کا بل ہو گیا۔"

"پانسو کپ چائے اور دو سو سلائس؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "اشتیاق تو اتنا پیٹو کبھی نہ تھا۔ وہ تو بہت ہی کم خوراک کھاتا تھا۔"

"ہم جانتا ہے، اس لیے تو ہم بولتا ہے۔" ایرانی ہوٹل کا مالک خفا ہو کے بولا۔ "وہ خود پالسو کیا سات سو کپ چائے پیتا تو ہم اُس کو منع نہیں کرتا تھا۔ مگر وہ خود نہیں پیتا تھا۔ اِدھر اُدھر کے بے کار اور لفنگے لونڈا لوگ کو جو اِدھر اُدھر آجو باجو کی بلڈنگوں میں نوکری بنانے کے لیے آتا ہے وہ اُن کو بھوکے پیٹ دیکھ کر چائے پلاتا تھا۔ جب ہم منع کرتا تھا تو بولتا تھا میرے حساب میں لکھ لو۔ اب پالسو کپ چائے اور دو سو سلائیس کا بل ہو گیا۔ اس کو کس کے حساب میں لکھے گا؟ اس لیے ہم نے اُس کو نکال دیا۔"

"بہت اچھا کیا۔" میں نے ایرانی سے کہا۔ اور پیسے کاؤنٹر پر رکھتے ہوئے کہا۔ "ایک ڈبیہ کیونڈر کی دو!"

"عجب مغز پھریلا ہے اس کا۔" ایرانی نے میرے پیسے گنتے ہوئے کہا۔ "دو پیسہ کم ہے۔"

"ساری!" کہہ کر میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر اُسے دو پیسے اور دیے اور کیونڈر کی ڈبیا لے کر اُس سے پوچھا۔ "تو آج کل اشتیاق کہاں پر ہے۔!"

"جیل میں ہے!"

"جیل میں!" میں حیرت سے ایرانی کی طرف دیکھنے لگا۔ "تم نے اُس بے چارے کو جیل بھجوا دیا؟"

"ہم نے کہاں پہنچایا ہے صاحب! وہ تو اپنی کرنی سے گیا ہے۔ شراب کی اسمگلنگ کے دھندے میں۔"

"اچھا، یہ دھندا بھی اُس نے شروع کر دیا تھا!"

"وہ تو یہ دھندا نہیں کرتا صاحب۔ مگر ہمارا باورچی سنتو اپنے کھالی ٹائم میں یہ دھندا کرتا تھا۔ اور اِدھر اُدھر کی بلڈنگوں میں رات کو باٹلی پہنچاتا تھا۔" ایرانی بولا۔ "پھر ایک رات پولیس نے اُس کے جھونپڑا پر چھاپہ مارا۔ چھ باٹلی پکڑا گیا تو اشتیاق بولا کہ سنتو بے گناہ ہے۔ میں نے یہ چھ بوتل شراب کا اِدھر لا کے رکھا تھا۔ اس واسطے اشتیاق کو تین مہینے کی سجا ہو گئی ہے۔"

"اُس نے ایسا کیوں بولا؟"

"وہ بولا ہمارا کیا ہے ہم اکیلا آدمی ہے تین مہینے کی سجا چٹکی بجاتے کاٹ لے گا۔ مگر جب سنتو کی گھر والی اپنے بچے سنتو کو لے کر اس جھونپڑے میں آئے گی تو جھونپڑا خالی دیکھ کر رو دے گی۔"

ایرانی ہوٹل کا مالک اپنے سر پر انگلی رکھ کے بولا۔ "بھیجا پھریلا ہے اس کا!"

تین ماہ بعد ــــ

زرینہ کو خیال آیا کہ جیل سے رہا ہوتے ہی اشتیاق ہمارے گھر آئے گا۔ لیکن جب تین ماہ سے اوپر کئی دن گزر گئے اور اشتیاق نہ آیا تو اُسے کچھ مایوسی سی ہوئی۔ مایوسی مجھے بھی ہوئی۔ پھر میں نے سوچا کہ اشتیاق اگر ہمارے گھر نہیں آئے گا تو ممکن ہے اِدھر اُدھر ایرانی ہوٹل کے باہر ضرور دکھائی دے گا۔ پر اُدھر بھی نہیں۔ سنتو باورچی سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ اُس کے ہاں بھی نہیں آیا۔ پھر ہم دونوں نے سوچا ممکن ہے اشتیاق شرم کے مارے یہ علاقہ ہی چھوڑ گیا ہو۔ یا بمبئی سے کہیں باہر چلا گیا ہو۔ جب دو اڑھائی ماہ اور گزر گئے اور اشتیاق نہ آیا تو ہمارا یہ خیال پکا ہو گیا۔

پھر ایک روز ــ ہم نے یکایک اُسے ایک دعوت میں دیکھا۔ سردار زور آور خاں کے یہاں ہماری دعوت تھی جن کی بیوی نصرت خانم میری بیوی کی خاص سہیلی تھی۔ ہم تو کھانے کے شروع کے دو لقمے کھاتے ہی سمجھ گئے کہ یہ کس کا اسٹائل ہے۔ پہلا لقمہ چکھتے ہی میں نے زرینہ کی طرف اور زرینہ نے میری طرف چونک کر دیکھا۔ مگر ہم دونوں چپ رہے۔ کھانے کے بعد جب دعوت کی تعریفیں ہونے لگیں تو کچن سے خراماں خراماں اشتیاق برآمد ہوئے۔ کالی پتلون کے اوپر لال بش شرٹ، اور لال بش شرٹ کے اوپر بھورے رنگ کا ایک میلا ایپرن پہنے ہوئے اور سر جھکا کر کورنش

بجالاتے ہوئے شاعروں کے انداز میں داد بٹورنے لگے۔

نہ میں نے نہ زرینہ نے اُس وقت اُنھیں پہچاننا مناسب سمجھا۔ اشتیاق نے بھی اس وقت ہمارا رویہ سمجھ کر مکمل اجنبیت اختیار کی۔ بعد میں نصرت نے زرینہ کو الگ لے جا کے بتایا۔ "بہت اچھا کُک مل گیا ہے مجھے۔ اشتیاق احمد خاں نام ہے اس کا۔ اپنی طرف کا ہے قاضی خیل کا۔ پشتو بہت اچھی بول لیتا ہے۔ حالانکہ بچپن ہی سے اِدھر رہا ہے۔ پھر کھانا تو غضب کا پکاتا ہے۔ کچن میں بڑی بچت سے کام لیتا ہے۔ جب سے یہ آیا ہے میرے کچن کا خرچ ڈھائی سو روپے کم ہو گیا ہے۔ پورے ڈھائی سو روپے۔ سنتی ہو؟ میں اُس کو صرف ستّر دیتی ہوں حالانکہ سو بھی دوں تو سستا رہے گا۔"

زرینہ انجان بن کر بولی۔ "آدمی تو شریف معلوم ہوتا ہے۔"

"ارے شریف ایسا شریف!" نصرت اشتیاق کی تعریف کرتے ہوئے بولیں۔ "میرے بچوں پر تو جان چھڑکتا ہے۔ اور میرے سب سے چھوٹے نجّو کو تو دل و جان سے چاہتا ہے۔ کوئی سگی ماں اُس کی کیا خدمت کرے گی جیسی وہ نجو کی کرتا ہے۔ ابھی چار دن کی بات ہے نجو موٹر مانگ رہا تھا۔ میں نے کہا لا دوں گی۔ میں ٹال رہی تھی کیونکہ گھر میں دو کھلونے موٹروں کے پہلے سے پڑے ہیں۔ پُرانے ہو گئے ہیں ذرا تو کیا ہوا۔" نصرت زرینہ کا ہاتھ پکڑ کر خوشی سے بولی۔ یہ موا اشتیاق دس روپے کی موٹر میرے نجّو کے لیے لے آیا تو میں نے غصّہ سے جلّا کر کہا۔ میں تو اس موٹر کے پیسے نہیں دوں گی۔ تو موا بولا "نہ دیجیے بیگم صاحب۔ میں تو اپنے پیسوں کی موٹر لایا ہوں نجّو کے لیے۔" اس پر وہ غصّہ سے گرج کر بولے۔ "تو تم سے کس نے کہا تھا نجّو کے لیے موٹر لانے کو؟" تو اشتیاق پہلے تو اُن کی گرج سن کر سہم گیا۔ پھر ہولے سے سر اُٹھا کر بولا۔ "صاحب، میں نجّو کا کہنا نہیں ٹال سکتا۔ وہ جو کہیں گے میں ضرور لے کر آؤں گا۔"

اُس نے ایسے مضبوط لہجہ میں اُن سے بات کی کہ اُن کا سارا غصّہ اتر گیا۔ مسکراتے ہوئے ایک طرف کو سرک گئے۔ میں بھی کیا بولتی بہن؟ چپ ہو کر سروتے سے سپاری کاٹنے لگی۔

زرینہ خاموشی سے مسکرا مسکرا کر نصرت کی باتیں سنتی رہی۔ مگر اُس نے ایک دفعہ بھی نہیں بتایا کہ وہ اشتیاق کو جانتی ہے۔ نہ اگلے ایک سال میں اشتیاق نے ایک بار بھی جتایا کہ وہ ہم لوگوں کو پہلے سے جانتا ہے۔ ہم نے سوچا بے چارہ جہاں لگا ہے لگا رہے۔ اُس کی خامیاں جتانے سے کیا فائدہ؟ اور یہاں زور آور خاں صاحب کے ہاں رہ کر اشتیاق بہت ٹھیک ہو چلا تھا۔ بال ماتھے پر نہیں لٹکتے تھے۔ ذہنی طور پر بہت کم غائب رہتا تھا۔ کپڑے صاف ستھرے پہنتا تھا۔ شعر و شاعری ترک کر دی تھی۔ دن بھر یا تو کچن میں رہتا یا خاں صاحب کے بچوں کی دیکھ بھال کرتا۔ حالانکہ اُن کی دیکھ بھال کے لیے دو آیائیں الگ سے مقرر تھیں۔ مگر بچے جس قدر اشتیاق سے مانوس ہو گئے تھے اُتنے گھر کے کسی دوسرے ملازم سے نہ تھے۔ میں نے اور زرینہ نے سکھ کا سانس لیا۔ "چلو۔ یہ اشتیاق نارمل تو ہوا۔"

ایک رات زور کی گھنٹی بجی۔ کوئی تین بجے کا وقت تھا۔ میں نے گھبرا کر دروازہ کھولا۔ باہر سردار زور آور خاں کا ڈرائیور حامد کھڑا تھا۔

"حضور جلدی چلیے۔ بیگم صاحب نے گاڑی بھیجی ہے۔"

"کیا بات ہے حامد؟" میں نے پوچھا۔

"اشتیاق نے زہر کھا لیا ہے۔"

"ارے!" میرے منھ سے نکلا۔

"ہاں صاحب۔ اشتیاق نے زہر کھا لیا ہے۔ اور خان صاحب پونا میں ہیں۔ گھر پر بیگم صاحب کے دو بھائی ہیں۔ مگر ان کی سمجھ میں نہیں

آتا کہ کیا کیا جائے۔ ڈاکٹر مقصود کو ٹیلیفون کیا تھا بیگم صاحب نے۔ مگر وہ بولے۔ یہ پولیس کیس ہے۔ میں نہیں آسکتا۔ اور اشتیاق مر رہا ہے۔"
زرینہ میرے پیچھے کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ لرزتے ہوئے لہجہ میں بولی۔ "تم جلدی سے چلے جاؤ بے چاری نصرت سخت پریشان ہوگی۔"
خاں صاحب کے ڈرائنگ روم کے عین مرکز میں فرش پر سر سے پاؤں تک ڈھکی ہوئی ایک لاش رکھی تھی۔ اور نصرت اور اُن کے بھائی بہن اور گھر کے دوسرے ملازم حیرت سے صمٌ بکمٌ کھڑے تھے۔
"کیا مر گیا؟" میرے منھ سے بے اختیار نکلا۔
"نہیں، ابھی تو زندہ ہے۔" ایک آیا آہستہ سے سسکتے ہوئے بولی۔
میں نے چادر ہٹا کر نبض دیکھی۔ سینے کے زیر و بم میں زخرے کی گھر گھراہٹ تھی۔ اور نبض ٹوٹ رہی تھی۔ نصرت ایک بھوری شال اوڑھے دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنی پھٹی پھٹی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔
"کب اس نے زہر کھایا۔؟" میں نے نصرت سے پوچھا۔
نصرت کچھ نہیں بولی۔ جیسے اُس نے میرا سوال سنا تک نہ ہو۔
نصرت کا چھوٹا بھائی بولا۔ کوئی دو بجے کے قریب میں نے اپنے بستر کے قریب کسی کی آواز سُنی۔ کوئی آہستہ آہستہ سے مجھے جھنجھوڑ کر جگا رہا تھا۔ جب جاگا تو معلوم ہوا اشتیاق ہے۔ وہ باورچی خانہ سے رینگتا رینگتا میرے کمرے میں پہنچا تھا۔ اور مجھ سے کہہ رہا تھا۔ "مجھے بچا لیجیے، میں نے زہر کھا لیا ہے۔"
میں نے پوچھا۔ "کون سا زہر؟"
بولا۔ "ٹِک ٹو!"
"ٹِک ٹو کیا؟"
"ٹِک ٹو! ٹِک ٹو۔" اُس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی اور آواز میں لکنت تھی۔ وہ کہنا چاہتا تھا ٹِک ٹوئنٹی۔ لیکن اُس کے منھ سے نکلتا تھا صرف ٹِک ٹو۔ پھر وہ میری چارپائی سے لگ کر قے کرنے لگا۔" میں نے مزید داستان سننا بے کار سمجھ کر فوراً کہا۔ "اسے اٹھا کر نیچے گاڑی میں فوراً ڈالو۔ ہسپتال لے جائیں گے۔"
"مگر پولیس؟" نصرت کانپ کر بولی۔
"پولیس کو وہیں سے اطلاع کر دیں گے۔" میں نے کہا۔ "نزدیک کا ہسپتال کون سا ہے؟"
"جاناوتی۔"
"یہاں سے کتنی دُور ہوگا۔؟"
"کوئی چار میل۔"
"جلدی چلو!"
جس وقت چار آدمیوں نے مل کر اشتیاق کو پہلی منزل سے نیچے اتارا اُس وقت ہلکی ہلکی سی بارش ہو رہی تھی۔ سڑک کے کنارے کنارے روشنی کے کھمبے پانی میں بھیگے ہوئے یوں سر جھکائے کھڑے تھے جیسے اپنی زرد زرد زندگی پر رو رہے ہوں۔ بھیگی ہوئی سڑک پر کہیں کہیں روشنی کے پھٹے چیتھڑے نظر آتے۔ پھر اندھیرا اُنھیں کھا جاتا۔ پھر تنگ و تاریک گڈھوں کی ماری ہوئی ایک سڑک پر کار یوں لڑکھڑا کر چلنے لگی جیسے ایک عورت اپنی عصمت لٹا کر رات کی اوٹ میں اپنے گھر کی طرف بھاگ رہی ہو۔

"ایمرجنسی وارڈ میں"
اے فارم بھرو!
بی فارم بھرو!
سی فارم بھرو!
زندگی تم بھی تو رکو!!
اشتیاق کا سر بھورے رنگ کے آئل کلاتھ کے گدّوں پر ٹکا ہے۔ اس کی آنکھیں کسی گہرے گڑھے میں جا گری ہیں اور اُن پر یادوں کا ٹرک گھوں گھوں کرتا ہوا چل رہا ہے۔
"پچھتر روپیہ اڈوانس دو۔"
"یہ رسید لو!"
"دھڑل۔ مریض کو کمرہ نمبر سات میں لے جاؤ۔ اوپر۔ لفٹ سے۔ میں ابھی ڈاکٹر کو تمھاری کو ٹیلیفون کرتا ہوں۔"
باہر سے کوئی ٹرک گزرتا ہے۔
گھوں گھوں۔
اشتیاق کا سینہ ہونکتا ہے۔
ہوں ہوں۔
آئل کلاتھ کا بھورا بستر اپنے پایوں میں لگی ہوئی ربڑ کی چرخیوں کے ذریعہ لفٹ کی جانب حرکت کرنے لگتا ہے۔ لفٹ اوپر کی منزل پر جا کر رک جاتی ہے۔ بستر برآمدے میں سے گزر رہا ہے۔ کمرہ نمبر سات کے اندر جاتا ہے۔ ایک ڈاکٹر اور دو نرسیں اندر آئیں — سات نمبر کا پردا گرا دیا جاتا ہے۔ ایک ڈاکٹر اور دو نرسیں اندر آتی ہیں۔ اور ہم باہر بینچ پر بیٹھ جاتے ہیں۔
لمبے کوریڈور میں بے آواز نرسیں خاموشی سے گھوم رہی ہیں۔ اردلی نیند کی غنودگی سے بیزار ٹہل رہے ہیں۔ کہیں کوئی ہولے ہولے کراہتا ہے۔ کوئی دھیرے دھیرے سسکتا ہے۔
"اشتیاق نے زہر کیوں کھایا؟" میں پوچھتا ہوں۔
"غبن کیا ہوگا۔" نصرت کا چھوٹا بھائی اندازہ لگا کے کہتا ہے۔
"بہن نے ہوتے ہوئے گھر کا سارا خرچہ اشتیاق کے سپرد کر دیا تھا۔ ہر وقت چار پانسو روپے اشتیاق کی جیب میں رہتے تھے کل بہن نے اشتیاق سے حساب دینے کو کہا تھا۔ آج اُس نے زہر کھا لیا۔ میرا خیال ہے کہ....."
"تمھارا خیال غلط ہے۔" نصرت کا دوسرا بھائی بولا۔ "اشتیاق میں دس بُرائیاں ہوں مگر وہ چور نہیں ہے۔ آج تک اُس نے ایک دھیلے کی چوری نہیں کی۔ میرے خیال میں پچھلے ہفتہ جو مراد آباد سے اُسے اطلاع ملی تھی کہ اُس کے آبائی مکان والے مقدمہ کا فیصلہ اُس کے خلاف ہوا ہے۔ معلوم ہوتا ہے اس کا غم اُسے بہت ہوا ہے۔"
"اجی نہیں" بڈھا حامد اپنی گھنی بھنوؤں پہ ہاتھ پھیر کر بولا۔ "اشتیاق کو مکان دوکان روپے پیسے سے کبھی محبت نہیں رہی۔ یہ سب اُس لونڈیا کا چکر ہے۔ گلشن کا!"
"گلشن؟" میرے کان کھڑے ہوئے۔ گلشن کون ہے! میرے ذہن میں ایک بلّی کو دنے لگی....."

"ایک نئی آیا رکھی ہے صاحب نے۔ بڑی بدصورت لونڈیا ہے۔ مگر سولہ سترہ برس کی ہے۔ بھاگ بھاگ کر کام کرتی ہے۔ اُس کا نام گلشن ہے۔ اور صاحب ہم نے سنا ہے کہ اشتیاق کی پہلی بیوی کا نام بھی گلشن تھا۔"

"ارے!" میں چونک گیا۔

"جی ہاں! اسی لونڈیا کے چکر میں زہر کھا لیا ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"پہلے تو صاحب سے کہتے رہے کہ اس لڑکی کو نکال دو۔ یہ کام ٹھیک سے نہیں کرتی ہے۔ پھر ایک دن مجھ سے کہنے لگے کہ میں اس وجہ سے اس کو نکلوانا چاہتا ہوں کہ اس کا نام گلشن ہے۔ میں نے کہا بھلے مانس اس کا نام گلشن ہے تو کیا ہوا۔ کام تو ٹھیک کرتی ہے مگر اشتیاق نہیں مانے۔ برابر اُس کی شکایت کرتے رہے۔ مگر جب صاحب کسی طرح نہیں مانے تو صاحب کو تو معلوم نہیں کب انھوں نے ہار مانی اور کب اشتیاق میاں نے رویہ بدل دیا۔ اب یہ اُس لڑکی پر مہربان ہونے لگے۔ دوسرے نوکر تو چائے پیتے تھے۔ یہ اُس کو کافی پلانے لگے۔ جو صرف صاحب اور بیگم صاحب پیتی ہیں۔ پھر ایک دن گلشن کو جو پتہ چلا کہ اُس کو کافی ملتی ہے جبکہ دوسرے نوکروں کو صرف چائے ملتی ہے تو وہ ایک دم بدک گئی۔ اور اُس دن سے اُس نے کافی پینے سے انکار کر دیا۔ ایک دن اُس نے اشتیاق کو بازار سے دیسی صابن لانے کو کہا تو یہ اُس کے لیے انگریزی صابن لے آئے۔ اُس نے کھوپرے کا تیل مانگا تو یہ گلزار ہیر آئل نمبرون اٹھا لائے۔ کل گلشن کی ماں کا خط آیا جو بیگم صاحب نے پڑھ کر سنایا۔ اب اشتیاق کی تو عادت تھی دروازے پر کھڑے چوروں کی طرح سنتے رہتے تھے۔ گلشن کی ماں نے لکھا تھا کہ اُس نے گلشن کی شادی کی بات چیت پکی کر لی ہے۔ لڑکا کسی سیمنٹ کمپنی میں دربان ہے۔ یہ خالی باورچی تھے وہ انھیں کیا منھ لگاتی۔ بس جب سے یہ سنا کچن ہی میں بیٹھے بیٹھے ٹھنڈی سانسیں بھرتے تھے اور مجھ سے کہتے تھے اب جینا بیکار ہے۔ میں نے پوچھا کیا ہوا؟ بولے "کچھ نہیں!" اور پھر اپنے سینے پر ہاتھ مار کر بولے "مگر اب جینا بے کار ہے۔" یہ آج دوپہر کی بات ہے.... رات کو انھوں نے زہر کھا لیا....." حامد اتنا کہہ کر چپ ہو گئے۔

میں نے چند لمحوں کے سکوت کے بعد پوچھا "مگر زہر کھانے سے پہلے اُس کمبخت نے لڑکی سے کوئی بات نہیں کی؟"

"بالکل نہیں صاحب!" حامد خفا ہو کر بولے۔ "بالکل یک طرفہ عشق تھا۔ دس دن تو ہوئے ہیں گلشن کو آئے ہوئے۔ ان دس دنوں میں آپ نے اُس لڑکی سے نفرت بھی کی۔ دوستی کی ابتدا بھی کی۔ محبت بھی کی پھر آپ ہی آپ مر بھی گئے۔ سب کچھ دس دنوں میں کر لیا۔ لڑکی کو تو کچھ خبر بھی نہیں ہے صاحب۔ وہ تو ایسی بدصورت ہے۔ اور ایسی بھیجے کی خالی ہے کہ اُسے تو گمان تک نہیں گزر سکتا کہ کوئی اُس سے عشق کر سکتا ہے۔"

حامد چونکہ بڈھے تھے اور زندگی کے اُس دَور میں سے گزر رہے تھے جب کوئی کسی سے محبت نہیں کر سکتا ہے۔ اس لیے داستان سناتے وقت اُن کے لہجے کی شدید تلخی جس طرح اُن کی مجبوری کی غمازی کر رہی تھی اُس سے مجھے بڑا لطف آیا۔

کوئی ساڑھے چھ بجے کے قریب ڈاکٹر کوٹھاری کمرہ نمبر سات سے برآمد ہوئے اور مجھے دیکھ کر بولے۔ "ابھی کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ مگر اگلے چوبیس گھنٹے اس پر بہت نازک ہیں۔ میں نے اس کا معدہ صاف کر دیا ہے۔ گلوکوز کے سیلائین پر رکھ دیا ہے۔ کھانے کو دوا دے دی۔ انجکشن دے دیے ہیں۔ کچھ لکھ دیے ہیں۔"

"شکریہ ڈاکٹر صاحب۔ مگر کیا مریض اس وقت ہوش میں ہے؟"

"ہوش میں تو ہے۔ مگر ابھی بہت کمزور ہے۔ ابھی زیادہ لوگ اس سے نہ ملیں تو بہتر ہوگا۔" ڈاکٹر نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے "صرف آپ اُس سے چند منٹ کے لیے مل لیں۔ میں نے تھانے ٹیلی فون کر دیا ہے کسی وقت بھی پولیس انسپکٹر اس کا بیان لینے کے لیے آتا

"ایمرجنسی وارڈ میں"
اے فارم بھرو!
بی فارم بھرو!
سی فارم بھرو!
زندگی تم بھی تو رکو!!
اشتیاق کا سر بھورے رنگ کے آئل کلاتھ کے گدّوں پر ٹکا ہے۔ اس کی آنکھیں کسی گہرے گڑھے میں جا گری ہیں اور اُن پر یادوں کا ٹرک گھوں گھوں کرتا ہوا چل رہا ہے۔
"پچھتر روپیہ اڈوانس دو"
"یہ رسید لو!"
"وہیل۔ مریض کو کمرہ نمبر سات میں لے جاؤ۔ اوپر۔ لفٹ سے۔ میں ابھی ڈاکٹر کو تمھاری کو ٹیلیفون کرتا ہوں!"
باہر سے کوئی ٹرک گزرتا ہے۔
گھوں گھوں۔
اشتیاق کا سینہ ہونکتا ہے۔
ہوں ہوں۔
آئل کلاتھ کا بھورا بستر اپنے پایوں میں لگی ہوئی ربڑ کی چرخیوں کے ذریعہ لفٹ کی جانب حرکت کرنے لگتا ہے۔ لفٹ اوپر کی منزل پر جا کر رک جاتی ہے۔ بستر برآمدے میں سے گزر رہا ہے۔ کمرہ نمبر سات کے اندر جاتا ہے۔ ایک ڈاکٹر اور دو نرسیں اندر آئیں —
سات نمبر کا پردا گرا دیا جاتا ہے۔ ایک ڈاکٹر اور دو نرسیں اندر آتی ہیں۔ اور ہم باہر بینچ پر بیٹھ جاتے ہیں۔
لمبے کوریڈور میں بے آواز نرسیں خاموشی سے گھوم رہی ہیں۔ اردلی نیند کی غنودگی سے بیزار ٹہل رہے ہیں۔ کہیں کوئی ہولے ہولے کراہتا ہے۔ کوئی دھیرے دھیرے سسکتا ہے۔
"اشتیاق نے زہر کیوں کھایا؟" میں پوچھتا ہوں۔
"غبن کیا ہوگا" نصرت کا چھوٹا بھائی اندازہ لگا کے کہتا ہے۔
"بہن نے ہولے ہولے گھر کا سارا خرچہ اشتیاق کے سپرد کر دیا تھا۔ ہر وقت چار پانسو روپے اشتیاق کی جیب میں رہتے تھے کل بہن نے اشتیاق سے حساب دینے کو کہا تھا۔ آج اُس نے زہر کھا لیا۔ میرا خیال ہے کہ....."
"تمھارا خیال غلط ہے" نصرت کا دوسرا بھائی بولا۔ "اشتیاق میں دس بُرائیاں ہوں مگر وہ چور نہیں ہے۔ آج تک اُس نے ایک دھیلے کی چوری نہیں کی۔ میرے خیال میں پچھلے ہفتہ جومرادآباد سے اُسے اطلاع ملی تھی کہ اُس کے آبائی مکان والے مقدمہ کا فیصلہ اُس کے خلاف ہوا ہے۔ معلوم ہوتا ہے اس کا غم اُسے بہت ہوا ہے۔"
"اجی نہیں" بڈھا حامد اپنی گھنی بھنوؤں پر ہاتھ پھیر کر بولا۔ "اشتیاق کو مکان دوکان روپے پیسے سے کبھی محبت نہیں رہی۔ یہ سب اُس لونڈیا کا چکر ہے۔ گلشن کا!"
"گلشن؟" میرے کان کھڑے ہوئے۔ گلشن کون ہے! میرے ذہن میں ایک بلّی کو دنے لگی....."

"ایک نئی آیا رکھی ہے صاحب نے۔ بڑی بدصورت لونڈیا ہے۔ مگر سولہ سترہ برس کی ہے۔ بھاگ بھاگ کر کام کرتی ہے۔ اُس کا نام گلشن ہے۔ اور صاحب ہم نے سنا ہے کہ اشتیاق کی پہلی بیوی کا نام بھی گلشن تھا۔"

"ارے!" میں چونک گیا۔

"جی ہاں! اسی لونڈیا کے چکر میں زہر کھا لیا ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"پہلے تو صاحب سے کہتے رہے کہ اس لڑکی کو نکال دو۔ یہ کام ٹھیک سے نہیں کرتی ہے۔ پھر ایک دن مجھ سے کہنے لگے کہ میں اس وجہ سے اس کو نکلوانا چاہتا ہوں کہ اس کا نام گلشن ہے۔ میں نے کہا بھلے مانس اس کا نام گلشن ہے تو کیا ہوا۔ کام تو ٹھیک کرتی ہے مگر اشتیاق نہیں مانے۔ برابر اُس کی شکایت کرتے رہے۔ مگر جب صاحب کسی طرح نہیں مانے تو صاحب کو تو معلوم نہیں کب انھوں نے ہار مانی اور کب اشتیاق میاں نے رویہ بدل دیا۔ اب یہ اُس لڑکی پر مہربان ہونے لگے۔ دوسرے نوکر تو چائے پیتے تھے۔ یہ اُس کو کافی پلانے لگے۔ جو صرف صاحب اور بیگم صاحب پیتی ہیں۔ پھر ایک دن گلشن کو جو پتہ چلا کہ اُس کو کافی ملتی ہے جبکہ دوسرے نوکروں کو صرف چائے ملتی ہے تو وہ ایک دم بدک گئی۔ اور اُس دن سے اُس نے کافی پینے سے انکار کر دیا۔ ایک دن اُس نے اشتیاق کو بازار سے دیسی صابن لانے کو کہا تو یہ اُس کے لیے انگریزی صابن لے آئے۔ اُس نے کھوپرے کا تیل مانگا تو یہ گلزار ہیر آئل نمبر ون اُٹھا لائے کل گلشن کی ماں کا خط آیا جو بیگم صاحب نے پڑھ کر سنایا۔ اب اشتیاق کی تو عادت تھی دروازے پر کھڑے چوروں کی طرح سنتے رہتے تھے۔ گلشن کی ماں نے لکھا تھا کہ اُس نے گلشن کی شادی کی بات چیت پکی کر لی ہے۔ لڑکا کسی سیمنٹ کمپنی میں دربان ہے۔ یہ خالی باورچی تھے وہ انھیں کیا منہ لگاتی۔ بس جب سے یہ سنا کچن ہی میں بیٹھے بیٹھے ٹھنڈی سانسیں بھرتے تھے اور مجھ سے کہتے تھے اب جینا بیکار ہے۔ میں نے پوچھا کیا ہوا؟ بولے "کچھ نہیں!" اور پھر اپنے سینے پر ہاتھ مار کر بولے "مگر اب جینا بے کار ہے۔" یہ آج دوپہر کی بات ہے.... رات کو انھوں نے زہر کھا لیا....." حامد اتنا کہہ کر چپ ہو گئے۔

میں نے چند لمحوں کے سکوت کے بعد پوچھا۔ "مگر زہر کھانے سے پہلے اُس کمبخت نے لڑکی سے کوئی بات نہیں کی؟"

"بالکل نہیں صاحب!" حامد خفا ہو کر بولے۔ "بالکل یک طرفہ عشق تھا۔ دس دن تو ہوئے ہیں گلشن کو آئے ہوئے۔ ان دس دنوں میں اُنے اُس لڑکی سے نفرت بھی کی۔ دوستی کی ابتدا بھی کی۔ محبت بھی کی پھر آپ ہی آپ مر بھی گئے۔ سب کچھ دس دنوں میں کر لیا۔ لڑکی کو تو کچھ خبر بھی نہ ہے صاحب۔ وہ تو ایسی بدصورت ہے۔ اور ایسی بھیجے کی خالی ہے کہ اُسے تو گمان تک نہیں گزر سکتا کہ کوئی اُس سے عشق کر سکتا ہے۔"

حامد چونکہ بڈھے تھے اور زندگی کے اُس دَور میں سے گزر رہے تھے جب کوئی کسی سے محبت نہیں کر سکتا ہے۔ اس لیے داستان سناتے وقت اُن کے لہجے کی شدید تلخی جس طرح اُن کی مجبوری کی غمّازی کر رہی تھی اُس سے مجھے بڑا لطف آیا۔

کوئی ساڑھے چھ بجے کے قریب ڈاکٹر کوٹھاری کمرہ نمبر سات سے برآمد ہوئے اور مجھے دیکھ کر بولے۔ "ابھی کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ مگر اگلے چوبیس گھنٹے اس پر بہت نازک ہیں۔ میں نے اس کا معدہ صاف کر دیا ہے۔ گلوکوز کے سیلائین پر رکھ دیا ہے۔ کھانے کو دوا دے دی ہے۔ انجکشن دے دیے ہیں۔ کچھ لکھ دیے ہیں۔"

"شکریہ ڈاکٹر صاحب۔ مگر کیا مریض اس وقت ہوش میں ہے؟"

"ہوش میں تو ہے۔ مگر ابھی بہت کمزور ہے۔ ابھی زیادہ لوگ اس سے نہ ملیں تو بہتر ہوگا۔" ڈاکٹر نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "صرف آپ اُس سے چند منٹ کے لیے مل لیں۔ میں نے تھانے ٹیلی فون کر دیا ہے کسی وقت بھی پولیس انسپکٹر اس کا بیان لینے کے لیے آ سکتا

کیونکہ مریض کی حالت بہت نازک ہے.....“

اتنا کہہ کر ڈاکٹر کوٹھاری چلے گئے۔ تو نفرت کا چھوٹا بھائی برافروختہ ہو کے بولا۔ ”خاں صاحب گھر پر نہیں ہیں اور یہاں پولیس کے سامنے نہ جانے کس کس کے بیان ہوں گے۔ اُلّو کے پٹھے کو اتنی عقل نہیں آئی کہ اگر مرنا ہی تھا تو سمندر میں ڈوب کے ہی مرجاتا۔ کسی گاڑی کے نیچے آکر ہی مرجاتا۔ کہیں پر مرتا مگر اس گھر سے دُور رہ کر ہی مرتا۔ اور یوں ہی ہم سب کو پریشان کرکے تو زہر نہ کھاتا...“

”بجا فرمایا آپ نے“ میں نے کہا۔ ”مرنے والوں کو ہمیشہ اپنے بعد زندہ رہنے والوں کی سہولت کا خیال کرکے مرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں اگر آپ ایک رہنمائے خودکشی شایع کریں تو بہتوں کا بھلا ہوگا۔“

اتنا کہہ کر میں کمرہ نمبر سات میں داخل ہو گیا۔

اتفاق سے اُس وقت کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ نرس کوئی دوا لانے کے لیے گئی تھی۔ اشتیاق گھرے تکیوں میں سر ٹکائے لیٹا تھا۔ اس کے دائیں بازو کی رگ میں سیلائین جا رہا تھا۔ دوسرا بازو اُس کے سینے پر تھا۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں۔ اُس کے سیاہ چہرے کے پیچھے، سفید تکیوں سے پرے کھڑکی کی پلکوں پر بارش کے قطرے لرز رہے تھے۔ اور کانچ کی سطح پر روشنی اور سایے امید و بیم کی کشمکش کی طرح لرزاں تھے۔

”اشتیاق!“ میں نے اُس کے بستر کے قریب جاکر سرگوشی میں کہا۔ ”اشتیاق سنو!“

میں نے پھر ذرا اونچی سرگوشی میں کہا۔ ”کان کھول کے سنو، میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ نرس آرہی ہے۔“

اشتیاق نے آنکھیں کھولیں۔ اور جب میں نے دیکھا کہ اُس نے مجھے پہچان لیا ہے تو میں نے اُس کے قریب جھک کر کہا۔ کسی وقت بھی پولیس انسپکٹر تمھارے پاس بیان قلم بند کرنے کے لیے آجائے گا۔ اُس سے صرف یہ کہنا ہوگا کہ تمھارے پیٹ میں درد تھا۔ اور تم امرت دھارا لگا کر سو گئے تھے کچن میں۔ اتفاق سے کچن میں تمھارے سرہانے Telk - 20 کی شیشی بھی پڑی تھی۔ وہ بھی اتنی ہی بڑی ہوتی ہے۔ جتنی امرت دھارا کی۔ اس لیے رات کو جب تمھارے پیٹ کا درد بڑھا تو تم نے غلطی سے امرت دھارا کی جگہ Telk - 20 پی لی۔ غلطی سے پی لی۔ بس اور کچھ مت کہنا۔ سمجھتے ہو؟

اشتیاق نے میری طرف دیکھ کر خاموشی سے سر ہلا دیا۔

آنکھوں کی پتلیاں نیم ساکت، ہونٹ اندر کو بھینچے ہوئے۔ رخساروں کے گڈھے گہری اور اتھاہ تاریکی میں کھوئے ہوئے۔ سینہ کھلا اور اُجاڑ خشک بالوں سے ڈھکا ہوا۔ کسی ویران جزیرہ کی مانند اور دبلی پتلی پسلیاں کسی شکستہ معبد کی سیڑھیوں کی طرح زندگی کے سوکھے تالاب کی طرف جاتی ہوئیں......

”اشتیاق! اشتیاق۔ تم نے ایسا کیوں کیا؟“ میں نے اُس کے سر پر جھک کر گہری شدت سے پوچھا۔

اُس کا چہرہ دیر تک بالکل ساکت رہا۔ جیسے اُس نے میرا سوال نہ سنا ہو۔ پھر اُس کا ہاتھ اُس کے سینے پر سرکنے لگا۔ دھیرے دھیرے وہ اپنا سینہ اپنی انگلیوں سے سہلاتے ہوئے ہوا کی سی سرگوشی میں بولا۔

”سینہ خالی ہے۔“

سینہ خالی ہے کتنی صدیوں سے انسان کا سینہ خالی ہے۔ اور انسان کے اس خالی سینے کو رام نہ بھر سکے، مسیح نہ بھر سکے اور حسینؓ نہ بھر سکے تو تم کیا بھر سکوگے احمق باورچی! ارے اس سینے کے اندر خوفناک گڈھے ہیں اور گہری کھائیاں۔ کیسے کیسے بسیط خلا ہیں۔ جن کے اندر تم کہاں کہاں سے کوڑا کباڑ لا کے ڈالتے رہے ہو۔ تاکہ کسی طرح سے یہ خلا بھر جائے۔ پہلے تم نے اس زنخے نواب کو اس میں پھینکا۔ پھر ایک سوتلی کو دُم سے باندھ کر اس میں لٹکا دیا۔ پھر سیکڑوں کپ چائے کے تم نے اُس میں اُنڈیل دیے اور ڈبل روٹیاں کاٹ کاٹ کر اُس کے اندر

باقی ص۴۴ پر دیکھیے

کوثر چاند پوری

افکار۔ کراچی

چناؤ

آج گاؤں میں بات چیت کے دو ہی عنوان تھے۔

سجنی اور ہر سجن کا بیاہ نہیں ہوگا۔

ہر سجن چناؤ لڑ رہا ہے۔

گاؤں میں جگہ جگہ جمگھٹے لگے تھے، پنگھٹ، کھلیان، چوراہہ، غرض جہاں دو چار مرد اور عورتیں کھڑی نظر آ رہی تھیں وہاں سجنی، ہر سجن اور چناؤ ہی کی باتیں چل رہی تھیں۔

"شادی کیوں نہیں ہو گی!"

"فصل بہت اچھی آئی ہے"

"کھلیانوں میں لاکھ کے اونچے اونچے ڈھیر لگے ہیں"

"اور ہر سجن کو دیپ سنگھ کے مقابلے میں کس نے کھڑا کر دیا!"

"چیونٹی کے پر کیوں نکل آئے —؟"

سجنی اور ہر سجن کی محبت طویل اور پر پیچ پگڈنڈیوں پر گھومتی، ندی کی لہروں پر ناچتی۔ اور دھان کے کھیتوں میں گنگناتی کامیابی کے مرحلہ پر پہنچنے ہی والی تھی کہ چناؤ کا جھگڑا کھڑا ہو گیا۔ اور دیپ سنگھ نے بیچ میں آ کر کچے دھاگے اور مکڑی کے جالے کی مانند اس رشتہ کو توڑ دیا۔ اُس نے سجنی کے باپ سے کہہ دیا۔

"رگھو ویر، گاؤں میں رہنا چاہتے ہو تو سگائی توڑ دو"

وہ کب گوارا کر سکتا تھا کہ ایک معمولی کسان اس کا حریف بن کر الیکشن لڑے، اُس نے پوری بے دردی کے ساتھ ہر سجن اور سجنی کی آرزوؤں کے ہرے بھرے پودے اپنے پیروں سے روند ڈالے۔

پورب کے رنگین کنارے پر سورج انگارے کی طرح دہک رہا تھا۔ اس کی کرنیں کھیتوں میں رقصِ بے تابی کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ اور عورتوں کی ایک لمبی قطار سروں پر خالی گھڑے رکھے کنوئیں کی سمت رینگ رہی تھی۔ سب کے پیچھے سجنی تھی۔ وہ اس طرح گن گن کر پاؤں رکھ رہی تھی جیسے دل ہی دل میں ہر سجن کے ووٹ گنتی جا رہی ہو۔ اور جب اُس نے پنگھٹ پر پہنچ کر گھڑا سر سے

اُتارا ہے۔ ہربھجن کئی ووٹ سے جیت چکا تھا۔ وہ اُسی جگہ کھڑی ہو گئی۔ برگد کی شاخوں پہ ہریل پھدک رہے تھے۔ اور سجنی کا گورا چٹا چہرہ نیلے دوپٹے کے درمیان یوں چمک رہا تھا جیسے آسمان کے گہرے نیلے سمندر میں چاند کی چھوٹی سی کشتی رکی کھڑی ہو۔ اس کی آنکھیں برگد کی خالی ڈالیوں میں اُلجھی ہوئی تھیں۔ سارے ہریل ساون کی چڑیوں کے مانند اُڑ گئے تھے۔ جتنی عورتیں پنگھٹ پر موجود تھیں، وہ سب ہربھجن ہی کی باتیں کر رہی تھیں۔

"جیت بھی جائے گا!"

"کنگال تو رکھا ہے!"

"چناؤ جیتنے کے لیے پیسہ چاہیے!"

سجنی یہ باتیں سن کر ہنس پڑی۔ اُسے عورتوں کے بھولپن پر بڑے زور کی ہنسی آگئی! اُس نے سوچا ہربھجن محبت کی بازی ہار گیا تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہر جگہ مات اُسی کو ہو گی۔

وہ چناؤ میں نہیں ہار سکتا۔

سارے کسان اُس کے ساتھ ہیں۔

وہ اس ہاتھ کو مروڑ کر ہی رہے گا جس نے میری مانگ تک، ان اُنگلیوں کو پہنچنے نہیں دیا جو اس میں سیندور بھرنے والی تھیں۔ ناکامی کے صدمہ نے ہربھجن کے ارادوں کو نہایت سنگین بنا دیا تھا۔ وہ جیتے جی محاذ چھوڑنے کو تیار نہ تھا۔ سجنی کو چھوڑ کر وہ زندگی کے اندھیرے راستے کو خوب تیز دوڑ کر طے کر لینا چاہتا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ سجنی وہاں ضرور اُسے مل جائے گی، جہاں زمین و آسمان ملتے ہیں۔ اور جہاں سورج غروب ہو کر اگلے دن طلوع ہونے کے لیے ذرا آرام لیتا ہے۔ کسان اُس کے حوصلے بڑھا رہے تھے۔ وہ چھوٹا سا قافلہ بنا کر چل پڑے تھے۔ اور قدم قدم پہ نئے ساتھی ملتے جا رہے تھے۔ مقابلہ بظاہر دیبی اور ہربھجن کا تھا۔ مگر حقیقت میں غربت اور امارت کی جنگ تھی۔ ایک فریق کے پاس لڑنے کے لیے تلوار بھی نہ تھی۔ دوسرا فریق ہر طرح کے آلات سے لیس تھا۔ اُس نے پہلے قدم ہی پر اتنے زور کا دھکا دیا تھا کہ ہربھجن کے ہاتھ سے امیدوں کا تاج محل چھوٹ کر دُور جا پڑا تھا۔ مگر وہ اپنے اور ساتھیوں کے فیصلہ پر قائم رہا تھا۔ فیصلہ یہ سوچ کر نہیں کیا گیا تھا کہ جیت سولہ آنے ہماری ہی ہو گی۔ بھاگ چند اور گھاسی کا انجام سب کے سامنے تھا۔ پچھلے الیکشن میں دیبی نے ان دونوں کو بُری طرح ہرایا تھا۔ ان پر مقدمے چلے تھے۔ گھاسی کو جعلی ووٹ ڈلوانے کے سلسلہ میں جیل کاٹنی پڑی تھی، حالانکہ ووٹ خود دیبی ہی نے ایک مرے ہوئے آدمی کے نام سے ڈال دیا تھا۔ یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی ہربھجن محض اس لیے میدان میں آگیا تھا کہ اور کسی میں دیبی سنگھ سے آنکھ ملانے ہمت نہ تھی۔ ہربھجن ہی ایک ایسا جیالا نوجوان تھا جس نے خوشی خوشی اپنے آپ کو دار و رسن کے لیے پیش کر دیا تھا۔ اُس نے مار پیٹ، جرمانہ اور قید غرض ہر چیز سے بے خوف ہو کر اپنا نام دے دیا تھا۔ اور اس جرم کی پہلی سزا یہ تھی کہ سجنی اس سے چھن گئی تھی۔ اس ضرب نے اس کے دل کو زخمی ضرور کیا۔ مگر ارادے کے فولاد کو نہیں پگھلا سکی۔ اس کا حوصلہ اور بڑھ گیا۔ اُس نے اپنے مٹھی بھر ساتھیوں کے کہنے سے کیسری لباس پہن لیا۔ اور وہ اُس کے جسم پر بالکل چُست نکلا، اُس نے اس خیال کو دماغ سے نکال دیا کہ سجنی عمر بھر روتی رہے گی، وہ اُس کے آنسو پونچھنے کے لیے ہزاروں کسانوں کو طوفان کے حوالہ نہیں کر سکتا تھا۔ مگر سجنی روئی نہیں۔ اُس کی آنکھوں سے چنگاریاں جھڑیں آنسو نہیں برسے۔ ایک شام کو جب سورج تھکی ہاری دنیا کو الوداعی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ سجنی نے اُسی کنویں پر جہاں وہ ہربھجن کی جیت کے منصوبے بنایا کرتی تھی اس سے کہا۔

"ڈٹے رہنا ہرجن!

میں تمہارے ساتھ ہوں!

مجھے کوئی تم سے نہیں چھین سکتا!"

اُس کے منہ سے یہ باتیں سن کر ہرجن کا دل اُچھلنے لگا تھا۔ پھر ایک دن اسی کنویں پر اُس نے عہد کیا کہ وہ ہرجن کے جیتنے کا انتظار کرے گی!

اور گاؤں کے لوگ بار بار ایک ہی بات کہہ رہے تھے۔

یہ ہاتھی اور چیونٹی ــــــ شیر اور بکری کا مقابلہ ہے۔

ہرجن کے پاس بھی اس کا ایک ہی جواب تھا۔

ہاتھی مست ہو کر آدمیوں کو پیروں سے کچلنے لگے۔ اور شیر آدم خور ہو جائے تو اس کا علاج آدمی ہی کو کرنا ہوگا۔ دیپ سنگھ نے اسے ہرا بھی دیا تو اس سے کسانوں کی روایت کو شکست نہ ہوگی۔ میری جگہ دوسرا اور پھر تیسرا کسان آئے گا اور دیپ سے الیکشن لڑے گا۔ آخر ایک دن آئے گا جب دیپ سنگھ کا زور ٹوٹ جائے گا۔ مجھے یقین ہے کہ میرے بعد کسانوں کو امیدوار ڈھونڈنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ وہ آپ ہی سر ہتھیلی پر لیے یہاں آ جائے گا۔

دیپ اچھی طرح جانتا تھا کہ وقت بدل گیا ہے۔ اُبھرتے ہوئے سورج کی کرنیں برچھی کی طرح فضا میں چمک رہی ہیں۔ لیکن اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ تبدیلی اوپر ہی اوپر آئی ہے۔ دھرتی کے نیچے جہاں اُس کی دولت دبی ہوئی ہے ابھی گھپ اندھیرا ہے۔ وہ ہاتھ نیچے دبے ہوئے سونے اور چاندی کو آفتاب کی گرمی ابھی پگھلا نہیں سکی۔ جیت اُسی کی ہوگی جو سونے چاندی کی گنگا جمنی نہریں بہا سکے گا۔ سرسراتے ہوئے نوٹوں اور کھنکتے ہوئے سکوں سے ہر مہم سر کی جا سکتی ہے۔ وقت کی تبدیلی اس کے نزدیک مگر چاندنی کی طرح تھی جو صبح ہونے سے پہلے ہی پھیل جاتی ہے۔ حالانکہ سویرا ابھی دور ہوتا ہے۔ ادھر کسان کسی طرح اُسے سرپنچ بنانے کو تیار نہ تھے وہ صدیوں کے اس بوجھ کو سر سے اُتار کر پھینک دینا چاہتے تھے۔ اُنھوں نے ہرجن سے شروع ہی میں کہہ دیا تھا کہ دیپ تمھیں ہرا بھی سکتا ہے۔ جیل بھی بھیج سکتا ہے۔ پھر بھی تمھاری جگہ کبھی خالی نہ رہے گی۔ ایک کے بعد دوسرا آدمی آتا رہے گا۔

چناؤ قریب آ گیا۔ ہرجن نے جلوس نکالنے شروع کر دیے۔ وہ بہت بڑا جتھا لے کر دیپ کی چوپال پر گیا۔ جس میں نہ جانے کتنی دوشیزاؤں کی چیخوں نے دم توڑ دیا تھا۔ اور ہزاروں لاکھوں نوجوانوں کی آرزوؤں کا گلا گھٹا تھا۔ چوپال گاؤں میں سب سے اونچی جگہ تھی۔ اس کے سامنے سے گزرتے وقت صدیوں سے کسان سلام کے لیے اپنا سر جھکا رہے تھے۔ ہرجن نے دیپ کو مخاطب کر کے کہا۔

"کسان کسی کی مار اور گالیاں نہیں کھائیں گے!

وہ اپنا سرپنچ بہت دیکھ بھال کر چنیں گے!

ہم میں سے ہر شخص سرپنچ بن سکتا ہے!"

دیپ کا خون کھول اُٹھا۔ وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ مگر منہ سے کچھ نہ کہا۔ اندر ہی اندر ہرجن کو پھنسانے کے منصوبے بناتا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ ہرجن غریب ہے۔ اس کا بال بال قرض میں بندھا ہوا ہے۔ اُس کے ساتھی بھی غریب ہیں۔ اور میں الیکشن میں روپیہ کا مینہ برسا دوں گا۔ نوٹ ہوا میں اس طرح اُڑاؤں گا جیسے لڑائی کے وقت ہوائی جہاز اُڑائے جاتے ہیں۔ دیپ نے بہت سے آدمیوں کو

کام پر لگا رکھا تھا۔ وہ کسانوں کو ہر بھجن کے خلاف بھڑکا رہے تھے۔ لوگوں کو اُس کے جال میں پھنسنے سے بچا رہے تھے۔ بہت سے آدمی دو ٹوک فیصلہ کر چکے تھے کہ ہر بھجن کا ساتھ نہ چھوڑیں گے۔ کچھ ایسے بھی تھے جن کا ایک ہاتھ دیبی کی طرف بڑھا ہوا تھا۔ اور دوسرا ہر بھجن کی طرف۔

دیبی کی ہر کوشش ہر بھجن کو بٹھانے میں ناکام ہوگئی۔ آخر کار اُس نے آس پاس کے دیہات سے بڑے بڑے کسانوں کو بلا کر ایک جلسہ کرنے کا ارادہ کیا، خیال تھا کہ وہ زور دے کر سب سے کہیں گے کہ ووٹ دیبی کو دیں، تو اُن کی بات کا اثر ضرور ہوگا۔ لیکن جلسہ کامیاب نہ ہوسکا۔ مجمع بہت کم تھا۔ اب دیبی سنگھ بوکھلا گیا۔ لیکن وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے والا نہیں تھا۔ اس کا شمار ان لوگوں میں تھا جو آخر دم تک لڑنے میں عقیدہ رکھتے ہیں۔ اس نے پوری دریا دلی کے ساتھ روپیہ بہانا شروع کر دیا۔ اور افسروں سے بھی کسانوں پر دباؤ ڈالنے کو کہا۔

الیکشن سے چند روز پہلے دیبی نے اپنے یہاں ایک خفیہ میٹنگ کی۔ اس میں وہی لوگ شریک تھے جو ماضی میں بہت بڑے زمیندار رہ چکے تھے۔ صدارت تواری جی نے کی جو عمر میں سب سے بڑے تھے۔ اور کافی تجربہ کار سمجھے جاتے تھے۔ یہ کوئی نہ جان سکا کہ اس میں کس قسم کی تجویزیں پاس ہوئیں۔ اگلے دن ہر بھجن نے بہت بڑا جلوس نکالا۔ اور خوب نعرے لگائے۔

ووٹ ہر بھجن ہی کو دیں گے۔

دیبی کو سرپنچ نہیں بنائیں گے۔

دیبی اطمینان سے حقّہ کی نے ہونٹوں میں دبائے بیٹھا رہا۔ اس کے دوست احباب بھی خاموشی کے ساتھ تماشہ دیکھتے رہے۔ نعرے ابھی فضا میں گونج ہی رہے تھے کہ اچانک دیبی کی پاکھل کے ایک کونے سے دھوئیں کا بادل اُٹھا۔ اور سارے آسمان پر چھا گیا۔ اس کے نیچے شعلوں کی بڑی بڑی زبانیں لپکتی رہیں۔

"آگ، آگ !!"

ہر شخص بدحواسی کے عالم میں چیخ اُٹھا۔ آگ اس حصّہ میں لگی تھی جہاں مویشی باندھے جاتے تھے۔ لوگ پانی کے گھڑے اور رسّے لے کر دوڑ پڑے۔ ہر بھجن اور اُس کے ساتھی نہایت بے جگری کے ساتھ شعلوں سے لڑتے رہے۔ ہر بھجن کے دونوں ہاتھ کہنیوں تک جھلس گئے۔ دیبی کی دو بھینسیں جل کر مر گئیں۔ ایک بیل انگاروں پر لوٹ رہا تھا۔ دیبی ایک جگہ کھڑے ہو کر چیخا۔

"آگ ہر بھجن نے لگائی ہے" ——— "وہ اسی لیے اتنے آدمی لے کر آیا تھا۔" ذرا دیر بعد ہی پولیس آگئی۔ جیسے وہ قریب ہی کہیں چھپی آگ لگنے کا انتظار کر رہی ہو۔ فوراً ہر بھجن اور اُس کے پندرہ ساتھیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ پھر کسانوں کا یہ قافلہ ہتھکڑیاں لگائے اور بیڑیاں پہنے بڑی شان سے روانہ ہوا۔ ہر بھجن نے مسکرا کر کہا۔

"چلو ساتھیو، آج یہاں کا بازار بھی ہے !"

کنوئیں کے قریب رجنی کھڑی تھی، اس نے روتے روتے اپنی آنکھیں پونچھ ڈالیں۔ شاید رونا اور پریشان ہونا اُس کے نزدیک کافی نہیں تھا۔ ہتھکڑیاں اور بیڑیاں ٹکرا کر بجیں تو عجیب طرح کا راگ پیدا ہوا، جیسے دُور کوئی گا رہا ہو۔

پا بجولاں چلو ! ——— مست و رقصاں چلو ! ——— دل فگارو چلو !

رجنی اس وقت چونکی جب گرفتارانِ بلا کا یہ قافلہ ذرا دُور جا چکا تھا۔ اُس نے اپنی جگہ کھڑے کھڑے بلند آواز سے کہا۔

"ہر بھجن جیت گیا !"

اقبال متین

فنون۔ لاہور

رابی اپیا

جب وہ پیٹ میں پڑی تھی تو رابی اپیا کے پیٹ میں سوائے اُس کے جیسے کچھ رہ ہی نہ سکتا تھا۔ نہ پانی کی بوند نہ سنگترہ کی پھانک کا رس نہ چمچہ بھر بادام کا حریرہ۔ برف کے ٹکڑے مانو ان کی غذا بن گئے تھے۔ اس طرح اپنا آپا تج کر اُسے اپنے بطن سے جنم دیا۔ اُسے اپنی چھاتیاں نچوڑ کر دودھ اس طرح پلایا کہ لہو کی بوندیں بھی ساتھ پلانی پڑیں۔

پھر جب وہ دنیا میں آئی تو کتنی راتوں کی نیند، کتنے دنوں کا چین رابی اپیا نے اپنے پر حرام کر لیا۔ تب کہیں جا کر وہ اس قابل ہوئی کہ دو قدم چل پھر لیتی۔ ورنہ وہ کون ایسی صحت مند تھی جو رابی اپیا کی آغوش میں ایک ہمکتی سی جان، کلکاریاں لگاتی ہوئی علانیہ محسوس ہوتی اور آنے جانے والے اس نئی زندگی کی طرف توجہ دیتے۔

لیکن آج جبکہ اس نے اسکول میں داخلہ لے لیا تھا۔ آج جبکہ وہ پٹ پٹ باتیں کر سکتی تھی اُس نے ماں کو سبھوں کی طرح رابی اپیا بھی تو نہ پکارا۔

اور رابی اپیا سب کچھ سن کر اگر کچھ سیکھ سکیں تو پاگلوں کی طرح مسکرانا۔ ایسی مسکراہٹ جو اپنی بے بضاعتی اور کم مائگی کا احساس چھپانے کے لیے ہونٹوں تک لائی جاتی ہے۔ اور اگر وہ ہونٹوں سے چپک کر ہی رہ جائے تو زندگی کیسی لٹ کر رہ جاتی ہے۔ رابی اپیا ٹین کا ایک ایسا خالی ڈبہ تھیں جس کو ذرا سے ٹہوکے پر ٹن سے بول اُٹھنا چاہیے۔ لیکن یہ خالی ڈبہ لبالب بھرے ہوئے ڈبوں کی طرح خاموش تھا۔ اب اس خالی خولی خاموشی کے سہارے تپ دق کو نس نس میں سمائے وہ زندگی سے سفر پر چل پڑیں۔

رنگ روپ آہستہ آہستہ اس طرح غائب ہوا جیسے کٹے ہوئے سُرخ سُرخ سیب کے گودے کی سفیدی ہوا کھا کر غائب ہوتی ہے۔ اور رابی اپیا ہوا نہیں دھوپ کھا رہی تھیں۔ دھوپ بھی کیسی دھوپ جس کی چمک تو دکھائی نہ دیتی تھی مگر حرارت بدن کا حصہ ہو کر رہ گئی تھی۔ اس حرارت میں سب رنگ روپ پگھل گیا۔ اس حرارت میں سب لطیف احساس پگھل گیا ـــــ اور رابی اپیا ایک ایسی مسکراہٹ کو پکڑ کر رہ گئیں جس کا ناتا رشتہ آنسوؤں سے جا ملتا ہے۔ میں نے تو اس مسکراہٹ میں ہمیشہ آنسو ہی دیکھے۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہہ دوں کہ سبھوں نے اس مسکراہٹ میں یہی کچھ دیکھا ـــ سارے گھر نے ـــ اور سب ہی نے آنکھیں پھیر لیں۔ یہ بھی بُرا نہ تھا۔ رابی اپیا کہاں ہر ایک نظر کو ٹٹولتی پھر رہی تھیں کہ کس میں کتنا پیار ہے؟ ان کو ہر بات کا اندازہ ہو چکا تھا ـــ وہ جان چکی تھیں کہ ان کے فرائض کیا ہیں۔ اپنے وجود کو گھر بھر

سے اس طرح الگ کر لو کہ ہمتا ! سایہ بھی کم ہی کسی پر پڑے ـــ راؔبی تم ماں ہو، تم بیوی ہو، تم بہن ہو۔

سو رابی نے خود کو بھرے گھر میں تنہا تنہا محسوس کیا۔

حارؔث بھائی، اپیا کی تپتی ہوئی زندگی پر نیم کا گھنا سایہ بنے ٹھنڈک پہنچانے کے لیے ڈولتے رہے۔ لیکن جلد ہی جب اس نیم کے سایے کو اس بات کا یقین سا ہو چلا کہ اپیا کا تپ دق ٹھنڈے سایوں پر بھی آگ پھینک دے گا تو ڈوبتے ہوئے سورج کے ساتھ ساتھ نچلے دیوار پر چڑھنے لگے ـــ حارؔث بھائی اپیا کی زندگی سے کچھ اس طرح بوکھلا کر نکلے کہ اپیا کی ہمدردی میں جھوٹ موٹ کی اداکاری بھی وہ کامیابی سے نہ کر سکے۔ اور وہی جست میں انھوں نے چوکی نشین ہو کر مصلیٰ سنبھال لیا اور لگے وظائف پڑھنے اور تسبیح پھیرنے۔

اتنے بڑے سے گھر میں اب چار روحیں ایک دوسرے سے بیگانہ بیگانہ سی پھرنے لگیں۔ پھر تین روحوں نے آہستہ آہستہ سر جوڑ لیا ـــ اور راؔبی اپیا نے آنکھیں کھول کھول کر سب کو دیکھا، سب کو سمجھا اور اب صرف وہی اکیلی رہ گئیں۔

رابی آپیا پہلے ماں تھیں۔ ویسے حارؔث بھائی کو بھی انھوں نے کب ٹوٹ کر نہ چاہا۔ لیکن حارؔث بھائی خود بھی تو سیانے تھے حفظ ماتقدم کے لیے انھوں نے جانماز کی جیسے چادر تان لی تھی۔ پانچ منٹ نماز پڑھتے، پھر وظائف پڑھتے اور گھر میں جب تک رہتے تسبیح ہاتھ میں رہتی اور یوں اپنی دنیوی خواہشوں کو بے چاروں نے جانماز کے نیچے چھپا کر رکھ چھوڑا تھا ـــ اور راؔبی اپیا نے بھی خدا کا شکر ادا کیا تھا کہ مجھ نصیبوں جلی نے جو کچھ محبت حارؔث کو دی ہے، جو کچھ سکون اسے بخشا ہے، جو کچھ تسکین اسے پہنچائی ہے اس کی عمر اس قدر قلیل تھی کہ اس نے مجھ سے جدا ہو کر اپنی بھری جوانی میں جانماز اوڑھ لی تھی ـــ حارؔث بھائی کی زندگی کی اس طہارت پر رابی اپیا کبھی جی ہی جی میں خوش ہوتیں۔ کبھی ان کا جی مسوس کر رہ جاتا، کبھی ایسی دل گرفتہ ہو جاتیں کہ ان کے بس میں ہوتا تو ٹوٹ ٹوٹ کر حارؔث بھائی کی تسکین کا باعث بنتیں ـــ رہ گئی لاڈلی، سو وہ کچھ دن بے کل بے کل سی گلی گلی پھرتی رہی۔ جب کبھی رابی اپیا کے قریب آنا چاہا انھوں نے دونوں ہاتھ آگے بڑھا کر اس کو روک دیا ـــ خدارا میری جان ـــ خدارا میری بچی ـــ مجھ سے نہ لپٹو ـــ اللہ تیرا محافظ رہے۔

اس طرح لاڈلی کو پیچھے ڈھکیلتے ہوئے کتنی ہی بار رابی آپیا نے ایسا محسوس کیا جیسے وہ اپنی روح کو اپنے تن سے جدا کر رہی ہیں ـــ امڈ امڈ کر پلکوں تک آئے ہوئے آنسوؤں کو انھوں نے پلکیں جھپک جھپک کر اس لیے روکا کہ لاڈلی پوچھ نہ لے کہ امی تم رو رہی ہو۔ لیکن لاڈلی جب راؔبی اپیا سے دور ہوتی گئی تو آہستہ آہستہ اس نے اپنی خالہ امی کا سہارا لیا ـــ اس آغوش میں بھی لاڈلی کو بڑا سکون ملا۔ خالہ کی گردن میں بانہیں ڈال کر وہ جھول جھول جاتی۔ خالہ نے بھی اپنی کنواری ممتا اسے بخ دی۔ لاڈلی ویسے بھی اس کی چہیتی تو تھی ہی۔ لیکن ٹوٹے ہوئے زرد پتے کی طرح جب وہ رابی اپیا کی مرجھاتی ہوئی شاخ سے ٹوٹ کر ادھر ادھر ہواؤں میں ڈول رہی تھی، چھوٹی آپی نے اسے سنبھال کر رکھ لیا۔

بھائیں بھائیں کرتے گھر میں کوئی اور ننھا منا تو تھا نہیں جو لاڈلی کسی سے کھیلتی، لڑتی، ہنستی، ہنساتی، روتی، رلاتی ـــ جب بھی تنہائی کے احساس سے اس کا جی ادب جاتا، جب بھی سناٹے اس کے چہرے سے ذہن میں سائیں سائیں کرتے اور اکیلا پن ہراس بن کر دل پر چھانے لگتا۔ وہ بگٹٹ ماں کی طرف بھاگتی۔ کیونکہ حارث بھائی دفتر چلے گئے ہوتے۔ اور چھوٹی آپی بے چاری بھنڈار سے گھر کے کام میں جٹ جاتی۔

رابی اپیا اس کو بے تحاشا اپنی طرف دوڑتا ہوا دیکھتیں تو دور ہی سے دونوں ہاتھ بڑھا کر پکار اٹھتیں ـــ خدارا میری جان ـــ خدارا میری بچی ـــ اور لاڈلی ٹھٹک کر اس طرح کھڑی رہ جاتی کہ تنہائی سے اکتا کر جس سمت وہ بھاگ رہی تھی ادھر صرف تنہائی ہی نہیں بھیانک اندھیرا بھی ہے۔

اور اس بڑھتے ہوئے اندھیرے نے آہستہ آہستہ ایک خوف سا لاڈلی کے ذہن پر ہمیشہ کے لیے مسلط کر دیا۔ اب کبھی لاڈلی کا جی بھر آتا تو وہ خالہ امی خالہ امی پکارتی پھرتی۔ اور چھوٹی آپی کے کانوں میں اس کی آواز کا رس ٹپکتا تو وہ بھی اُس پر نچھاور ہو جاتی۔

رابی اپیا چھوٹی آپی کے دل میں لاڈلی کے لیے جب اتنی جگہ دیکھتیں تو اُن کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں خوشی سے چمک اُٹھتیں۔ رابی اپیا جان چکی تھیں کہ دلاسوں اور تسلیوں سے اب اُن کی جلتی ہوئی روح کو کوئی تسکین نہیں پا سکے گی ــــ وہ جسم جو اپنا رنگ روپ تج کر ایسی تصویر کی طرح ہو جائے جو دھوپ کھا کھا کر زرد پڑ گئی ہو تو پھر سارا وجود تصویر ہی بن کر رہ جاتا ہے ــــ اور رابی آپا بس ایک چلتی پھرتی مری مری سی تصویر بن کر رہ گئی تھیں ــــ اس تصویر کے ہونٹوں پر البتہ ایک ایسی زخمی مسکراہٹ چپکی ہوئی تھی جیسے کسی تصویر کو چھپانے کے لیے بھک سفید کاغذ چپاں کر دیا گیا ہو ــــ اور یہ بھک سفید کاغذ دیکھنے والوں کو کتنا اکھرتا ہے۔ رابی اپیا کہاں اس بڑے سے گھر کا اُجالا بنی ہوئی تھیں ــــ کہاں، اب ہر گوشے اور ہر اندھیرے کے ساتھ ان کا تصور اُبھرتا تھا۔

لاڈلی تو ہراساں ہراساں بھاگ کھڑی ہوئی تھی۔ اب نہ وہ رابی اپیا کی طرف توجہ ہی کرتی نہ اُن کی توجہ کی طالب ہوتی۔ اُس کے چھوٹے سے ذہن نے اس بات کو قبول کر لیا تھا کہ رابی اپیا کوڑے کرکٹ کا ایک ایسا ڈھیر ہیں جس کو چھونے سے کچھ، الجھن سی ہوتی ہے ــــ رابی آپیا سے جب وہ اس طرح دُور ہو گئی تو اُن کی ممتا نے آہستہ آہستہ سسکنا سیکھ لیا۔ لاڈلی دن دن بھر رابی اپیا کے کمرے کا رُخ ہی نہ کرتی۔ اور وہ گھر میں رہ کر بھی اس کی صورت کو ترس ترس کر رہ جاتیں ــــ کبھی ممتا کے پرسکون سمندر میں ایسی موجیں اُٹھتیں جنھیں رابی اپیا خود بھی نہ دیکھ پاتیں، صرف محسوس کر سکتیں تو وہ چپکے سے دالان میں چلی آتیں ــــ دُور کھڑی لاڈلی کو اتنی پیار بھری نظروں سے دیکھتیں جیسے چوم رہی ہوں ــــ پھر کچھ بات ہی کر لینے کے لیے اُسے پکار کر چھیڑتیں تو وہ نظر اُٹھائے بغیر ہی تڑاخ سے کچھ اوٹ پٹانگ سا جواب دے دیتی اور رابی آپیا کی زخمی مسکراہٹ اپنی بے بسی کو چھپانے کے لیے اُن کے خشک ہونٹوں پر پھیل جاتی۔

ان ہونٹوں پر جن پر پپڑیاں بن گئی ہوں، مسکراہٹ چاند کی کرن تو بن نہیں سکتی، سوئی کی نوک بن جاتی ہے۔ اور اپنے ہونٹوں پر سوئی کی اس نوک کو رابی اپیا علانیہ محسوس کر لیتیں۔ چھوٹی آپی یہ منظر دیکھ کر اس طرح انجان بن جاتی جیسے اُس نے کچھ دیکھا ہی نہیں۔

حارث بھائی کا مصلیٰ تو تخت پر بس بچھا کا بچھا رہتا ــــ ایک کونہ موڑ کر وہ اُٹھ کھڑے ہوتے اور اس طرح گویا عبادت کے اختتام کا اعلان ہو جاتا، پھر دفتر جانے کی تیاریوں میں اس طرح لگ جاتے کہ بات کرنے کی بھی جیسے فرصت نہ ہو۔

رابی اپیا جب سے پڑ گئی تھیں چھوٹی آپی کے سر پر اتنا کام آپڑا تھا کہ اُسے سر کھجانے کی بھی فرصت نہ ملتی ــــ پتہ نہیں صبح شام بال سنوار لینے، آنکھوں میں کاجل پھیر لینے اور چہرے پر اُلٹا سیدھا پوڈر مل لینے کے لیے وہ کس طرح وقت نکال لیتی تھی۔

ہر شخص مصروف ہو گیا تھا ــــ ہر چیز جہاں کی تہاں تھی۔ زندگی کے دن جو رابی اپیا کی بیماری کے اعلان کے بعد کچھ اکھڑے اکھڑے سے گئے تھے اب پھر ٹھیک ٹھیک پڑنے لگے تھے۔ وہ ناؤ جو ڈگمگا گئی تھی، اب دھیرے دھیرے بہہ رہی تھی۔

جب سبھوں کا چھینا ہوا سکون سبھوں کو واپس مل گیا تو رابی اپیا سمجھ بیٹھیں کہ حارث بھائی اور چھوٹی آپی نے اُن کی بیماری سے سمجھوتہ کر لیا ہے۔ اور اب وہ تن تنہا مقابلہ کرنے کے لیے رہ گئی ہیں۔ اب رابی آپا اوس کا وہ قطرہ تھیں جو پھول کی پنکھڑی پر نہیں سوئی کی نوک پر ٹھہرا ہوا کھڑی دوپہر کا منتظر تھا کہ سورج سر پر چمکے اور تحلیل ہو کر اس اذیت سے چھٹکارا پائے جس کا نام زندگی ہے۔

حارث بھائی نے رابی اپیا کے علاج معالجے میں پہلے پہلے تو کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ جتنا بن پڑتا کرتے۔ بساط سے زیادہ ہی انھوں نے کیا۔ اور اب بھی مقدور بھر کر رہے تھے۔ لیکن رابی اپیا کا دُکھ درد علاج کے سوا اور بھی تو کچھ چاہتا تھا۔ اور یہ چاہت سوائے اس کے اور کچھ نہ تھی کہ حارث بھائی، چھوٹی آپی اور لاڈلی سب مل جل کر ان کی تنہائی کا احساس چھین لیں ــــ لیکن اب یہ مشکل تھا۔

لاڈلی کے دل میں تو آہستہ آہستہ پتہ نہیں کیسے کیسے جذبوں نے سر اُٹھایا کہ وہ سرے سے رابی اپیا سے بغاوت کر بیٹھی۔ اُس کی اس روش پر نہ کوئی ٹوکنے والا تھا نہ کوئی سمجھانے والا ـــــ وہ جان گئی تھی کہ رابی اپیا گھر کا وہ بے مصرف کمرہ ہیں جو گھر میں داخل ہوتے ہی مقفل کر ـــــ ایسا درخت جو پھل پھول ہی دے سکے نہ ٹھنڈا سایہ۔ گھر میں اُگے تو کیا، جنگل میں اُگے تو کیا۔ بس لاڈلی تو رابی اپیا کو کچھ ایسا ہی درخت لگی تھی۔ اس کے لیے تو جو کچھ تھیں چھوٹی آپی تھیں۔

"خالہ امی بھوک لگی ہے۔"

"خالہ امی کپڑے بدل دو۔"

"خالہ امی آج اسکول میں نہیں جانے کی۔"

"خالہ امی چاکو بار کھلا دو۔"

رابی اپیا نے سوچا، معبود میرے۔ تیرے ان گنت احسانوں میں یہ بھی ایک ہے کہ لاڈلی کو اس کی خالہ امی سے مانوس کر دیا۔ ورنہ وہ ماں کی محبت کے لیے ترس ترس جاتی۔

اب رابی اپیا سرتا پا صبر و شکر بن کر رہ گئی تھیں۔ لاڈلی تو بھول بھال گئی تھی کہ رابی اپیا اُس کی ماں ہیں ـــــ وقت پڑنے پر وہ انھیں امی پکار لیتی تو رابی اپیا جیسے سوتے سے چونک پڑتیں۔ ورنہ وہ تو اب رابی اپیا کو خاطر ہی میں نہیں لاتی تھی۔

لاڈلی کے اس رویے کو حارث بھائی اور چھوٹی آپی نے اپنی یک لخت خاموشی سے جیسے جائز قرار دے دیا تو رابی اپیا کو یقین ہو گیا کہ وہ اپنا سماجی موقف بھی اس گھر میں کھو رہی ہیں۔ وہ جس کے اشارے پر گھر کی کایا پلٹ ہو جاتی تھی۔ اب ہر ایک کے رحم و کرم کا منتظر تھا۔ کوئی شے اس کے اپنے بس میں تھی تو وہ زخمی مسکراہٹ تھی جو سوکھے ہونٹوں پر یوں معلوم ہوتی جیسے تڑختی ہوئی زمین پر پیلی پیلی دھوپ کا سا ـــــ اور اس مسکراہٹ کو رابی اپیا نے کچھ اتنی مجبوری سے اپنے ہونٹوں پر ضرورتاً بکھیر لینے کا اہتمام کر رکھا تھا کہ انھیں مسکراتا ہوا دیکھ کر وحشت سی ہوتی تھی۔ جیسے کوئی سچائی کا منھ بند کر کے چیخ چیخ کر جھوٹ کہہ رہا ہو۔

معبود میرے ـــــ کتنی ہی بار تو وہ مسکراتی ہوئی مجھے پاگل سی لگی ہیں۔

واقعی رابی اپیا کو دق کے بجائے کوئی دماغی مرض لاحق ہوتا تو شاید اُن کے لیے بہتر ہی ہوتا۔ آدمی کا ذہن ماؤف ہو جائے تو اپنی سوچ کے زہر سے تو وہ محفوظ ہو جاتا ہے۔

ادھر کچھ دنوں سے رابی اپیا کی طبیعت کچھ زیادہ ہی خراب رہنے لگی تھی۔

کسی کا بے سہارا ہو جانا اُسے بڑا طاقت ور بھی تو بنا دیتا ہے۔ ہوا کے جھونکوں سے، جلتے ہوئے چراغ کی لو کو بچانے کے لیے کوئی ہاتھ حفاظت ہی نہ کر سکے تو سمجھ لو دیا جلے یا بجھے، فرق کوئی پڑنے والا نہیں ہے ـــــ رابی اپیا یہ سب کچھ جان گئی تھیں۔ اسی لیے تو یوں بھی ہونے لگا تھا کہ سینے کے درد کو ہاتھوں سے دبائے وہ چپکے سے کسی رات کو خون تھوک آتیں تو صبح ہونے پر بھی سونے والوں کو پتا نہ چلتا ـــــ

زندگی ہمیشہ زندگی کا ساتھ دیتی ہے۔ موت کا وہ کبھی ساتھ نہیں دیتی ان دونوں میں اللہ واسطے کا بیر ہے۔ دو قدم ساتھ چلیں تو کوئی نہ کوئی کسی نہ کسی کا گلا دبوچ لیتا ہے۔ اور یہ فتح و شکست جتنی کم مدت میں طے پا سکے اتنا ہی آدمی کے لیے اچھا ہے ـــــ لیکن رابی اپیا کی زندگی اور موت نے جیسے آپس میں کچھ سازش کر لی تھی ـــــ نہ یہ اُس پر وار کرتی تھی نہ وہ اس پر ـــــ دونوں سر جھکائے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ لیکن ایک دوسرے سے خائف تھے۔ پتا نہیں کون کب جُل دے جائے ـــــ اور رابی اپیا خون تھوک تھوک کر یا گا

کی طرح مسکرا رہی تھی۔

آج سویرے سویرے ہی رابی آپا بڑے کرب میں مبتلا تھی ــــ اس کو کیا ہو رہا تھا یہ تو کہنا مشکل ہے۔ لیکن اس کی آنکھیں کچھ اس طرح جاگ رہی تھیں۔ جیسے بس اب سو جانے والی ہوں۔ آج صبح صبح اُس کے ہونٹوں پر اس کی وہ مخصوص مسکراہٹ بھی نہیں تھی جس سے وہ پاگل ہی نظر آتی ــــ اور جی چاہتا تھا کہ رابی آپا کچھ تو نظر آئے۔

اس وقت ــــ اس وقت اگر میں تمھیں کچھ دے سکتا رابی آپا ــــ تو موت دے دیتا ــــ اور تم جانتی ہو کہ تمھارے لیے اس سے زیادہ خوبصورت کوئی تحفہ نہیں ہے ــــ لیکن ہم سب بندے عاجز ہیں۔ مجبور ہیں۔ کسی کو موت بھی تو نہیں دے سکتے۔

لیکن تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے کہ تمھاری زندگی کو تمھاری موت نے چُل دے کر اپنے شکنجے میں لے لیا ہے اور تمھارا یہ سوتا جاگتا چہرہ کیا اسی اطمینان کا باعث تو نہیں ہے۔

دراصل ہوا یوں کہ رابی آپا کے رات سینے میں درد اُٹھا ــــ وہ اپنے سینے کو دبا کر سنبھلی تھی کہ اُس کا منھ خون سے بھر گیا اور پلنگ کے پاس پیک دان نہ پا کر وہ قریبی راستے سے صحن کی طرف لپکی تو کمرے میں بستر پر حارث بھائی چھوٹی آپی پر جھکے ہوئے تھے ــــ آہٹ پا کر انھوں نے اپنے کو چھوٹی آپی کے لحاف میں چھپا لیا۔

رابی آپا خون تھوک کر لوٹ رہی تھی تو وہ بے حد نڈھال تھی ــــ دیواروں کا سہارا لے کر وہ پھر اُسی کمرے سے ہو کر گزرنے کے لیے مجبور تھی۔ ہانپتے ہوئے جب وہ اپنے کمرے کے دروازے تک پہنچی تو رک کر اُس نے لحاف کی طرف نظر اُٹھائی لیکن اُس کی نظر لحاف سے ہٹ کر لاڈو پر ٹھہر گئی جو لحاف کے برابر ہی بے سُدھ سو رہی تھی۔ اُس نے لاڈلی کو اس طرح دیکھا جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں آخری بار چوم رہی ہو۔ اور سنبھلتی ہوئی اپنے پلنگ تک پہنچ کر پڑ رہی۔

صبح چھوٹی آپی جب رابی آپا کے برتنوں میں، جو الگ رکھے جاتے تھے کچھ تلاش کرنے آئی تو رابی آپا نے بہت غور سے اُس کی آنکھوں میں پھیلا پھیلا کاجل دیکھا جو کہیں کہیں گالوں پر بھی نمایاں تھا۔

"کیا ڈھونڈ رہی ہو؟" ــــ رابی آپا نے کچھ اس طرح سے پوچھا جیسے اُن کی اپنی کوئی چیز کھو گئی ہے۔ اور چھوٹی آپی کھوج کو ہتھیا لینا چاہتی ہے۔

"گلاس ڈھونڈ رہی ہوں آپا ــــ بہت پیاس لگی ہے۔"

رابی آپا کی وہ آنکھیں جو بس اب سو جانے والی تھیں، اس طرح چمک اُٹھیں جیسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بیدار ہو گئی ہوں۔

کچھ سوچ کر انھوں نے برابر کی تپائی پر رکھے ہوئے گلاس کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"یہ دھرا ہے۔ پی لو!" چھوٹی آپی نے لمحہ بھر کے تذبذب کے بعد ہاتھ بڑھا کر گلاس اُٹھا لیا اور ہونٹوں سے لگا رہی تھی کہ آواز آئی۔

"خالہ امی ــــ خالہ امی، تم کہاں ہو؟" بدن کی ساری قوت سمیٹ کر رابی آپا اپنے بستر سے اُچھل پڑیں ــــ دیوانوں کی طرح انھوں نے ہاتھ مار کر پانی کا گلاس گرا دیا جو چھوٹی آپی کے ہونٹوں تک پہنچ چکا تھا۔ "یہ مت پیو ــــ مت پیو یہ ــــ یہ میرا جھوٹا ہے۔"

گلاس چھوٹی آپی کے ہاتھ سے چھوٹ کر ٹوٹا نہیں۔ وہ رابی آپا کے پلنگ پر گر پڑا تھا۔ اور پانی بستر اور فرش پر پھیل کر جذب ہو رہا تھا ــــ پیاسی چھوٹی آپا دیدے پھاڑ کر رابی آپا کو تک رہی تھی جو ہانپتی ہوئی نڈھال ہو کر اپنے تکیے پر گر پڑی تھیں۔

"جاؤ۔" ــــ مری ہوئی آواز میں رابی آپا نے کہا ــــ "منھ ہاتھ دھو لو۔ یہ کیا حالت بنا رکھی ہے اپنی۔ نہ کنگھی نہ چوٹی۔ نہ اُبٹن نہ غازہ ــــ حارث اور لاڈلی ناشتے پر تمھارے منتظر ہوں گے ــــ اتنی دیر کیسے جاگتی ہو۔"

فہمیدہ اختر

آسماں دیکھتا رہا

اس روز نگینہ کو یوں لگا جیسے بیس سال کے تفکرات کا آج خاتمہ ہو گیا ہے اس کی تمام بے چینیاں اور بے قراریاں مٹ گئی ہیں جو لپیٹ میں وہ بیس سال سے تھی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اب اُسے حیات کی ہر خوشی اور تمام آسائش مل گئی ہے۔ زندگی میں پہلی بار ہی تو سے یوں جیسے وہ دنیا میں ہر قدم پر کامیاب رہی ہے۔ اور ساری کائنات اس کی ہے۔ اس نے اپنے سفید میلے سے دوپٹے کے پلو سے دو روپے کے نوٹ کھو اور جہانگیر کے دوست آدم خیل کے ملازم کو دیتے ہوئے خوشی میں تھرتھراتی آواز میں کہا۔ "یہ تمہارا انعام ہے مٹھائی کھانا۔" جب ملازم نے روپے لے تو بولی۔ "جہانگیر سے کہنا ذرا جلدی آئے۔" جب وہ اچھا کہہ کر چلا گیا تو اس نے گلی میں کھلنے والی بوسیدہ کھڑکی کا ایک پٹ کھول دیا۔ مٹی اڑ کر اس چہرے اور ہاتھوں پر پڑی اس نے یوں اس مٹی سے بے نیازی اختیار کی۔ جیسے پھول برس پڑے ہوں ــ وہ گلی میں جھانکنے لگی اس روز سے وہ تنگ تاریک اور غلیظ گلی بڑی حسین لگی۔ اور اسے یوں لگنے لگا۔ جیسے بیس سال تک جس عمارت کی تعمیر وہ اپنے خون جگر سے کرتی رہی ہے جس کی تیاری میں اس اپنا گوشت پوست جلایا ہے۔ اپنے رنگین خوابوں کو مٹایا ہے۔ اپنی دولت صرف کی ہے اپنی زندگی کے آرام اور سکون کی بازی لگائی ہے وہ عمارت ا۔ تیار ہو گئی ہے اور اس کی تمام قربانیوں کا صلہ اسے مل گیا ہے۔

اس وقت اس اندھیری، گندی اور تنگ گلی پر جھکنے والے نیلے آسمان کے اس ٹکڑے پر ابر چھا گیا تھا۔ گردشِ دوران تھم تھم سی گئی تھی اور تھم کر پیچھے کی طرف لوٹ لوٹ سی گئی تھی۔

اس نیلے آسمان نے کبھی اسے جوان بھی دیکھا تھا۔ صحت مند اور رعنا صورت بھی ــ جب اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیلتی تھی تو آنکھوں میں ایسی چمک پیدا ہو جاتی تھی کہ چمکیلے ستارے بھی شرما جاتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہی مسکراہٹ تھی جس نے شماس کے دل کو رنگین نغموں سے ہم آہنگ کر تھا آہستہ آہستہ ان نغموں نے نگینہ کے پاکیزہ دل کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا اور جب شماس نے ان نغموں کا دائمی امتزاج چاہا تو اس کے اس فیصلے کو دونوں کے گھرانوں کو رضا اور خوشی کے ساتھ سنا تھا۔ اور جب یہ نغمے شماس کے دل اور نگینہ کی روح سے نکل کر فضاؤں میں تحلیل ہونے والے تھے او اس سلسلے میں فریدہ کو نگینہ کے ہاں آئے ہوئے تیسرا دن تھا کہ فریدہ بیمار پڑ گئی۔

خوشی کی راہ پر دونوں گھرانوں کے بڑھے ہوئے قدم رک گئے۔

فریدہ کے تین سال کے بچے کی دیکھ بھال نگینہ ہی کرنے لگی تھی۔ وہ اسے وقت پہ دودھ پلاتی۔ اس کے منہ ہاتھ دھلاتی، اسے نہلاتی صاف کپڑے پہناتی اس کے بال سنوارتی اور جب وہ اسے گود میں لئے بہن کے پاس لے جاتی تو اس کی بیمار آنکھوں میں تھوڑی دیر کے لئے چمک پیدا ہو جاتی۔ چند

دنوں میں اس کی بیماری خطرناک صورت اختیار کر گئی لیکن اس کے دل سے اپنی جسمانی تکلیف کا احساس جاتا رہا۔ وہ بچے کی فکر میں کھو گئی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا میاں قابلِ اعتماد انسان نہیں ہے۔ اس کی ماں بلڈ پریشر کا شکار ہے اور باپ دل کی بیماری کا مریض ہے۔ ان باتوں پر غور کر کے وہ سوچا کرتی تھی کہ اگر وہ اس بیماری سے بچ نہ سکی تو اس بچے کا کیا بنے گا؟ جب اسے یہ خیال آتا تو اس کا دل ایسی تپش پیدا کرتا کہ اس کی سانسوں میں چنگاریاں بھر جاتیں۔ ایک دن اس نے دیکھا کہ نگینہ انتہائی خلوص کے ساتھ اس کے بچے کی پیشانی پر بوسہ دے رہی ہے۔ بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا۔ "یہ تمہارے حوالے" اور پھر اسے یوں لگا تھا جیسے اس کے دل کی تپش ہمیشہ کے لئے سرد ہو گئی ہے اور اس کے لبوں پر پھیلی ہوئی چنگاریاں ہمیشہ کے لئے بجھ گئی ہیں۔ اسے روحانی طور پر آسودگی مل گئی تھی۔

چند دنوں کے اندر ہی اندر اس کے بچنے کی کوئی امید نہ رہی اور پھر ایک دن ایسا بھی آیا کہ اس کا نڈھال جسم ہمیشہ کے لئے بے جان ہو گیا۔ نگینہ نے بلکتے ہوئے دل اور روتی ہوئی آنکھوں سے جب پہلی بار بے حس بہن کے چہرے کو دیکھا تو اسے یوں لگا جیسے وہ بے حد مطمئن ہے اور اسے جہانگیر کا کوئی غم نہیں۔ اس کے درد بھرے احساسات میں مدوجزر پیدا ہونے لگے۔ وہ کمرے سے صحن کی طرف بھاگ گئی اور سوئے ہوئے جہانگیر کو گود میں اٹھا لیا اور بے تحاشا اس کے بوسے لینے لگی۔

وقت برق رفتاری سے گزرنے لگا۔

تین ماہ کے بعد نیلے آسمان نے یہ بھی محسوس کیا کہ نگینہ کے بیمار ماں باپ کے لئے جوان بیٹی کی موت کا صدمہ برداشت کرنا ناممکن ہے۔ ان کی بیماری میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا ہے اور ان کے رنجور دلوں سے یہ خواہش ٹکرانے لگی ہے کہ جلد از جلد نگینہ کی شادی کر دی جائے۔

جس سہ پہر کو نیلے آسمان نے جہانگیر کے باپ کی دوسری شادی کا سماں دیکھا۔ اس رات کو یہ منظر بھی دیکھا کہ نگینہ رات بھر جہانگیر پر ہاتھ رکھے رہی۔ اس کی ننھی سی پیشانی کا بوسہ لیتی رہی۔ اس کی آنکھیں برابر اشکبار رہیں اسے یوں لگتا رہا۔ جیسے اس کے والدین اس کے کسی امانت میں خیانت کرنے کے متعلق سوچ رہے ہوں اور روحوں کی پاکیزہ دنیا میں اداسی پھیل رہی ہو۔

صبح ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد جب وہ چنبیلی کے پودوں کے قریب بچھے تخت پر جہانگیر کی قمیص سینے بیٹھی تو ان کے ہاں مہمان آئی ہوئی اس کے ماموں کی لڑکی شمشاد بھی آ کر بیٹھ گئی اس نے پوچھا۔ "تمہاری آنکھیں سوجی سوجی سی ہیں؟"

دریا کا بند گویا ٹوٹ گیا۔ وہ بے قابو ہو کر رونے لگی شمشاد متعجب ہو گئی۔ "خدا کے لئے بتاؤ کیا بات ہے؟"

37495
15.6.76.

اس کے غمگین لہجے میں بڑا درد تھا۔ "بے بے اور دادا سے کہہ دو کہ میں نے اپنی زندگی جہانگیر کے لئے وقف کر دی ہے۔"

شمشاد سناٹے میں آ گئی۔ "کیا مطلب ہے؟"

اس نے دوپٹے سے آنسو پونچھے۔ "مطلب یہی ہے کہ میری قسمت سے ان دنوں جو خیال ان کا ہے وہ ترک کر دیا جائے۔"

شمشاد ہراساں ہو گئی۔ "یعنی"

نگینہ کی آواز میں دکھ کے ساتھ ساتھ سختی بھی پیدا ہو گئی۔ "یعنی میں تمام عمر جہانگیر کے ساتھ اس گھر میں گزار دوں گی"

شمشاد کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ "منگنی وعدہ ہے غیرت مند پٹھان جان پر کھیل جاتا ہے لیکن وعدے سے نہیں پھرتا ہے"

نگینہ رنجیدہ آواز میں الفاظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ "یہ بھی یاد رکھو کہ پٹھان جان کی بازی لگا دیتا ہے۔ لیکن امانت میں خیانت نہیں کر سکتا۔"

شمشاد کا انداز ناصحانہ ہو گیا۔ "شماس بھائی غیر نہیں رشتے میں جہانگیر کے ماموں لگے۔ اس گھر میں بھی تم اسے اپنے پاس رکھ سکتی ہو"

نگینہ تلخی سے مسکرائی۔ "یہ بھی پختو کے خلاف ہے۔ میں جہیز میں بہن کے بچے کو نہیں لے جا سکتی گھر عم زاد کا کیوں نہ ہو"

نگینہ کے فیصلے سے بوڑھے والدین پر سکتہ طاری ہو گیا۔ شماس بھی بت بن گیا۔ خاندان کے بزرگوں نے اسے نرمی اور سختی کے ساتھ سمجھایا لیکن وہ

ضد پہ قائم رہی۔ شماس نے بوڑھے اور بیمار چچا کے پاس کئی جرگے بھیجے۔ لیکن نتیجہ کچھ نہ نکل سکا۔

گاؤں بھر میں نگینہ کو ملامت کیا جانے لگا اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے والدین کو بھی۔ خان جعفر نے اپنے حجرے میں یہاں تک کہہ دیا کہ "وہ بے غیرت ماں ہے۔ ورنہ بیٹی کی اتنی ناجائز اور پختون کے خلاف بات سنتا ؟"

ملک نے ندی کنارے مشک میں پانی بھرتے ہوئے دوسرے بہشتیوں سے کہا "اس دنیا میں اتنا شریف کوئی نہیں ہو سکتا کہ کسی کے لئے اپنی زندگی دے دے یہ بہانہ ہے۔ بہانہ نگاہ میں کوئی اور ہوگا۔"

خاندان ترک تعلق کی دھمکیاں دینے لگا۔

نگینہ نے یہ سب کچھ سنا اور مطمئن رہی۔ بوڑھے والدین نے یہ سب کچھ جانا اور ہر وار مجروح دل پر سہہ گئے۔ اگر ایک وقت انہیں اپنی عزت کا خیال ہوتا تو دوسرے وقت بیٹی کے نیک جذبات اور بچے کی محبت کے سامنے بے بس ہو کے رہ جاتے۔

نیلے آسمان نے ایک اور سماں بھی دیکھا۔

ایک شام جبکہ چاند ماہ خوش نارنگی کے مقابل مغرب میں تیزی سے چمک رہا تھا اور کرنے کی شگفتہ کلیوں کی مہک فضا میں پھیل رہی تھی۔ نگینہ نے کے قریب ایک سایہ دیکھا۔ اس کے لہجے میں جرأت تھی "کون ؟"

دھیمی سی افسردہ آواز آئی "میں"

نگینہ کے استفسار میں حیرت تھی "شماس"

"ہاں۔"

نگینہ کی آنکھیں بھیگ گئیں لیکن وہ مصلحت پر اتر آئی "بھائی"

شماس کی روح تڑپ گئی۔ "یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ اپنی مسکراہٹوں کے چراغوں کو بجھانا چاہتی ہو؟"

ایک لمحے کے لئے نگینہ کشمکش غم میں پڑ گئی لیکن دوسرے ہی لمحے وہ بڑے استقلال سے بولی "میں تو ان چراغوں کی لو بڑھا رہی ہوں بھائی"

شماس چیخ پڑا "نگینہ"

وہ اطمینان سے بولی "کیا ہے بھائی"

بھائی۔ بھائی۔ ہتھوڑے شماس کے لفظوں بھرے دل پر پڑنے لگے۔ وہ دروازے کی طرف مڑ گیا۔

نگینہ پیڑ کے تنے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ دل کی دنیا میں آئے ہوئے انقلاب پر کرب کا رنگ اور گہرا ہو گیا۔ تارے رنجیدہ ہو گئے۔ چاند نڈھال ہو گیا۔ آسمان کی نیلاہٹوں میں تھرتھری پیدا ہو گئی۔

گاؤں کی جوان چنچل لڑکیاں مٹی کے گھڑے سروں پر رکھے اور بغلوں میں دابے ندی کی طرف جا رہی تھیں۔ نرم آواز میں ایک ٹپہ گونج اٹھا۔

دبیلتا نہ قلعہ خوربزی   وَخپہ لاسعہ درلہ خبنتی چلوولاً

(جدائی کا قلعہ تیار ہو رہا ہے میں خود اس کے لئے اینٹیں اکٹھی کر رہی ہوں)

نگینہ نے نارنگی کے پیڑ کی ایک شاخ پر سر رکھ دیا اس کے آنسو گرنے کی معصوم کلیوں پر پڑنے لگے۔ کلیوں کے ننھے ننھے دل دھڑک اٹھے۔

چند دنوں کے بعد نگینہ کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ اور اس کے دو ماہ بعد ہی باپ کا بھی اس کے ساتھ ہی زمین کے وارث اٹھ کھڑے ہوئے۔ زمین تقسیم ہوئی نگینہ کے حصے میں چند جریب دی اور رہائشی مکان!

آسمان کی نیلاہٹیں اس سہ پہر کو کیسے فراموش کر سکتی ہیں جبکہ شماس کی بارات کے شادیانے اس مختصر سے گاؤں میں زندگی پھیلا رہے تھے۔

شماس کا جوان دل رو رہا تھا اور نگینہ کے بے جان لبوں پر یہ ٹپہ کانپ رہا تھا

قسم پہ خدائی هیر دنه کړم   که د آسمان تر ستورو ډیر ښې کلونه

(خدا کی قسم تجھے کبھی بھی فراموش نہیں کروں گی اگرآسمان پر موجود ستاروں کے برابر بھی سال گزر جائیں)

جب جہانگیر نے میٹرک پاس کر لیا اور پشاور کے اسلامیہ کالج میں ایف ایس سی میں داخلہ لے لیا تو نگینہ کسی سوچ میں پڑ گئی۔ جہانگیر کا گاؤں سے تنہا شہر جانا اور تنہا شہر سے گاؤں لوٹنا نگینہ کے لئے یہ امر کش مکش کا سبب بن گیا۔ وہ دشمنوں سے خائف رہنے لگی اور پھر اسے یہ احساس بھی تھا کہ جہانگیر کو آنے جانے میں بے حد تھکاوٹ ہو سکتی ہے۔ آخر کار اس نے پشاور میں رہنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے ایک تنگ اور اندھیری گلی میں ایک مختصر سا کم کرایہ کا مکان لیا اور جہانگیر کو لے کر شہر آ گئی۔ مکان کا کرایہ — شہر اور کالج کے اخراجات — وہ مالی مشکلات میں پڑ گئی۔ ہر ماہ اسے اپنا کوئی نہ کوئی زیور بیچنا پڑتا — نیز وہ مجبور ہو گئی کہ مشین پہ سلائی کا کام کرے وہ رات گئے تک مشین پہ محلے کے لوگوں کے کپڑے سیتی رہتی۔

نگینہ گاؤں کے یک منزلہ کھلے مکان میں رہنے کی عادی تھی جہاں سورج کے طلوع ہوتے ہی روشنیاں پھیل جاتیں۔ اور سورج کے غروب ہونے تک روشنیاں بکھری رہتیں۔ شہر کے تنگ اور تاریک مکان میں اس کا دم گھٹ گھٹ جاتا۔ گاؤں میں ان کے مکان کے ارد گرد شاداب کھیت تھے۔ اور گھر میں نارنگیوں کے کئی پیڑ — بہار کے آغاز میں ان میں کرنے کی سفید سفید اور موٹی موٹی کلیاں مسکرانے لگتیں اور چاروں طرف روح کو وجد میں لانے والی مہک پھیل جاتی اور سردیوں میں سرخ سرخ نارنگیاں ڈھلی ڈھلی فضاؤں میں اپنا حسن پھیلاتی رہتیں — اور شہر میں ان کے مکان کے ارد گرد غلیظ گلیاں تھیں اور اندھیرا تھا۔ بعض اوقات اس کے لئے سانس لینا دشوار ہو جاتا تھا۔ لیکن جب نگینہ کی نگاہ جہانگیر پر پڑتی تو وہ زندگی کے تمام مصائب بھول جاتی۔ تمام کلفتوں کو فراموش کر دیتی۔ اس کی روح نامعلوم مسرتوں میں کھو جاتی اور اس کا ذہن زندگی کی تمام آسودگی محسوس کرنے لگتا اور اسے یوں لگنے لگتا جیسے تمام کائنات اس کی ہے۔ اس نے کبھی بھی جہانگیر کے سامنے اخراجات کا کوئی ذکر نہ کیا شاید اسی لئے جہانگیر میں کبھی احساس ہی پیدا نہ ہو سکا کہ ہر ماہ کتنا روپیہ خرچ ہو رہا ہے اور وہ کہاں سے آتا ہے اس کی کوئی خواہش کبھی رد بھی تو نہیں ہوئی تھی۔ اس کے پاس اچھے سے اچھے سوٹ تھے۔ بوٹوں کے کئی جوڑے — کبھی کوئی کتاب وغیرہ خریدنے میں اسے کوئی دقت نہ ہوئی تھی۔ پڑوس والوں نے کئی بار نگینہ سے کہا بھی کہ بچے کی فیس معاف کرانے کی کوشش کرو۔ لیکن وہ سوچتی کہ اس طرح سے جہانگیر میں احساس کمتری نہ پیدا ہو جائے۔ بہن کی وفات کے بعد کسی نے اس کے جسم پر اچھا کپڑا نہیں دیکھا تھا اس نے کبھی اچھا کھانا نہیں کھایا تھا۔ جہانگیر سے بچا کچا کھانا ہی اس کے نصیب میں ہوتا تھا۔

اخراجات برابر بڑھتے چلے گئے۔ جب زیور بک گیا تو وہ اپنے جہیز کے کپڑے بھی بیچنے لگی۔ یہاں تک کہ زمین کے بکنے کی بھی نوبت آ پہنچی — اسے مخلصانہ انداز میں مشورے دیئے گئے کہ زمین نہ بیچو۔ مگر جب اس کی نگاہ جہانگیر پر پڑتی تو اس کے کانوں میں صدا آنے لگتی — ڈاکٹر — ایکدم حال کے اندھیرے مٹ جاتے اور مستقبل کے اجالے پھیل جاتے اور وہ زمین کو حقیر چیز سمجھنے لگتی۔

جب جہانگیر میڈیکل کے آخری سال میں تھا تو نگینہ کے زیور کپڑے اور تقریباً تمام زمین بک چکی تھی۔ اس کا صحت مند جسم کمزور اور نحیف ہو گیا تھا اس کے بال بالکل سفید ہو گئے تھے اور نظر بے حد کمزور ہو گئی تھی۔

اور جب ایک دن جہانگیر کے دوست آدم خیل کے ملازم نے اسے خبر دی کہ جہانگیر ڈاکٹری کے آخری امتحان میں کامیاب ہو گیا ہے تو اسے یوں لگا تھا جیسے راستہ کا تمام گرد وغبار پیچھے رہ گیا ہے اور وہ منزل تک پہنچ گئی ہے۔ اور منزل کے ارد گرد اجالے پھیل رہے ہیں پھر نیلے آسمان نے دیکھا۔ وہ بوسیدہ کھڑکی کا ایک پٹ کھول کر بیتابی سے جہانگیر کا انتظار کرنے لگی ہے اور جب جہانگیر گلی کا موڑ مڑا اور اسے نظر آنے لگا تو اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اس کی سانس تیزی سے آنے جانے لگی۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ وہ کمرے سے نکلی اس کے کمزور وجود میں اتنی طاقت پیدا ہو گئی کہ وہ تیزی سے سیڑھیاں اتر گئی۔ جب جہانگیر نے دروازے میں قدم رکھا تو اس نے اسے سینہ سے لگا لیا۔ اور دیوانہ وار اس کی صحت مند چھاتی کے بوسے لینے لگی۔

اوپر چھت پر جاکر جہانگیر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اور بڑی سنجیدگی کے ساتھ نظریں جھکا کر زمین کی طرف دیکھنے لگا نگینہ حیرت زدہ ہوگئی جہانگیر کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ نگینہ کو یقین ہوگیا کہ جو خبر آدم خیل کے ملازم نے اسے سنائی ہے وہ غلط ہے۔ جہانگیر پاس نہیں ہوا۔ اس خیال سے کہ جہانگیر کو رنج نہ ہو اس نے کسی قسم کی پریشانی کا اظہار نہ کیا۔ اس کے پاس بیٹھ کر اور اس کے صحت مند شانے پر بوسہ لے کر بولی۔ "کیوں بیٹا اداس ہونے کی کونسی بات ہے۔؟"

جہانگیر کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے۔ وہ غمگین آواز میں بولا۔ "خالہ اگر آج میری ماں زندہ ہوتی تو میری کامیابی پر کتنی خوش ہوتی۔"

"خالہ؟" نگینہ کے تھرتھراتے لبوں نے دہرایا۔ اسے یوں لگا جیسے جہانگیر نے اپنے تنومند ہاتھوں سے اس کے بوڑھے اور بیمار چہرے کو نوچ لیا ہے۔ کیا وہ آج بھی خالہ ہے محض خالہ؟؟۔ کیا لو کے تیز کرنے میں زندگی کے چراغ بجھ گئے؟؟ اس کے مجروح دل نے ہولے سے پکارا "شماس" مگر تاریکیاں گہری ہوگئیں۔ وہ بیمار وجود کمزور نظر سفید بالوں اور خالی ہاتھوں کے ساتھ تنہا ان اندھیروں میں کھو گئی۔ بالکل تنہا!!

اور آسمان دیکھتا رہا!!

بقیہ۔ گلشن گلشن

بھٹکتے رہے۔ تم میری ڈوبتی ہوئی ہستی بناتے رہے۔ اور خود بے گھر رہ کر دوسروں کے لیے گھر ڈھونڈتے رہے۔ اور اپنے بچوں کی مایوسی میں دوسروں کے بچوں سے محبت کرتے رہے۔ مگر تم گلشن کو کبھی بھول نہ سکے۔ اور کسی طرح یہ خلا پُر نہ ہو سکا۔ گلشن گلشن تم کانٹے چنتے رہے۔ اور بے قرار اور مضطرب ہو کر ایک پیشے سے دوسرے پیشے کی چکی میں گھستے رہے۔ تاکہ کسی طرح تم اس خلا کو بھر سکو۔ جسے صرف ایک عورت کی محبت بھر سکتی ہے...... پگلے!

نرس اندر آگئی۔

میں نے ایک لمحہ کے لیے اشتیاق کے خاموش ستے ہوئے بدہیئت چہرے کو دیکھا۔ تکیوں کے پیچھے بند کھڑکی کی پلکوں سے چند قطرے ہوا سے لرز کر ٹوٹے اور کانچ کے رخساروں پر بہتے ہوئے چلے گئے۔..... میں کمرہ سے باہر نکل آیا۔

فرصت کے لمحات کا بہترین ساتھی ماہنامہ نقش کراچی

نقش ادب کی خدمت کرتا ہے آپ نقش کی سرپرستی کیجیے

نقش خریدیے۔ نقش میں اشتہار دیجیے۔

آثم میرزا سیارہ۔ لاہور

کانٹا

گاہک نے جو چیز مانگی تھی اشفاق نے وہ اُس کے سامنے پیش کر دی۔ گاہک نے اُسے ہاتھ میں لے کر جانچا۔ مہر پڑھی۔ اور پورا اطمینان کر لینے کے بعد قیمت دریافت کی۔ اور قیمت سن کر اُس کی آنکھوں میں استعجاب کے سایے یوں جھانکنے لگے جیسے مسمریزم کا کھیل دیکھتے ہوئے تماشائی اپنے حواس پر بارِ گراں محسوس کر رہے ہوں۔ گاہک نے حیران کن لہجہ میں پوچھا۔ "کیا واقعی آپ صحیح قیمت بتا رہے ہیں ؟" ـــ "جی ہاں !" اشفاق نے پُراعتماد لہجہ میں کہا۔ گاہک کی حیرانی کم نہ ہوئی تھی۔ "آپ کو یقیناً غلطی ہوئی ہے۔ پانچ روپے کی چیز آپ تین روپوں میں کیسے فروخت کر رہے ہیں ؟" ـــ اشفاق نے مسکرا کر کہا۔ "یہاں ہر چیز کا ایک دام ہو گا۔ ایک دام معقول منافع کے ساتھ" ـــ "یقین نہیں آتا"۔ ـــ "گاہکوں کو یقین دلانے کے لیے ابھی ابتدا کی ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ میں اس کوشش میں ضرور کامیاب ہوں گا"۔ ـــ "نئی دکان کھولی ہے کیا ؟" ـــ "جی ہاں، چند ماہ ہوئے ہیں اور اس دَوران میں مجھے ہر نئے گاہک نے پہلے تو مشکوک نظروں سے دیکھا اور پھر تذبذب کے عالم میں اپنے دام سمیٹ کر چلا گیا۔ میرے طرزِ عمل میں نمایاں صحت مند ماحول کے تقاضوں کو محسوس تک نہ کیا جا سکا"۔ ـــ "آپ کا رویّہ واقعی مشکوک ہے۔ جیسے آپ اونے پونے مال بیچ کر یہاں سے بھاگنا چاہتے ہوں"۔ ـــ اشفاق زیرِ لب مسکرانے لگا۔ گاہک نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔ "آپ ماحول کا ساتھ دینے سے کیوں کتراتے ہیں"۔ ـــ "یوں پوچھیے کہ آنکھیں بند کر کے ماحول کی اندھی تقلید سے کیوں اجتناب برتتا ہوں"۔ "ایسا ہی سمجھ لیں"۔ ـــ "مختصراً عرض ہے کہ میں پہلے ملازم تھا۔ ایک کلرک کی بساط ہی کیا ہوتی ہے۔ لیکن ہزار بچت کے بعد بھی اخراجات پورے نہ ہوتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی چیزیں خریدنے کو بھی جیب اجازت نہ دیتی تھی۔ بازار کے نشیب و فراز میں عوام کی تمنّاؤں کو سسکتے دیکھ کر میں نے سوچا کہ اگر ایک نئی طرح ڈالی جائے۔ اُبھرنے کی صلاحیت کو تقویت پہنچائی جائے، تو ہو سکتا ہے، ہم میں انسانیت کا شعور پیدا ہو جائے۔ اور اس طرح عوام کی سسکتی ہوئی تمنّاؤں کی ڈھارس بندھ جائے۔ میں نے اپنا اثاثہ کاروبار میں لگا دیا۔ گاہک کو وقتی طور پر اچنبھا تو ہوتا ہے۔ لیکن بعد میں اُسے جو سکون ملتا ہے، وہ میرے لیے تسکینِ قلب کا سامان بن جاتا ہے"۔ ـــ "پھر بھی۔ ماحول سے بگاڑ اچھا نہیں"۔ گاہک نے نیچے اُترتے ہوئے دبے الفاظ میں کہا۔ اور اشفاق دوسرے گاہک کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ـــ اُس نے واقعی ماحول کی چٹان تلے دبی اُن قدروں کو رہائی دلانے کا عہد کر لیا ہوا تھا جو زندگی کے ناہموار راستوں کی سیاہی کو جگمگاتے فانوس بن کر شکست دیتی رہی ہیں۔ جنھوں نے حالات کے خونی موڑوں پر گلاب کے پھول کھلائے ہیں۔ اور کیف آور نکہتوں کی لہریں نئے ولولوں کی پرورش کرتی رہی ہیں۔

تیسرے گاہک کے ہاتھ میں پیکٹ تھما کر اشفاق اسٹول پر بیٹھ گیا۔ وہ یوں سکون محسوس کر رہا تھا جیسے برفیلی چوٹیوں سے پھسلتا ہوا صبح کا نور اُس کی دکان میں تابناک مسکراہٹوں کے ہار پرو رہا ہو۔ جیسے اُس نے ماحول کی اندھی تقلید کی بجائے اسے اپنے سامنے جھکا لیا ہو۔ گاہک کو دکان میں داخل ہوتے دیکھ کر وہ کھڑا ہو گیا۔ غیر ارادی طور پر اُس کی نگاہ بازار کی طرف گھوم گئی۔ عبدل اپنی دکان کے شوکیس پر کہنیاں ٹکائے اسے گھور رہا تھا۔ رمضان اپنی دکان کے تھڑے پر کھڑا تیوری چڑھائے اس کی طرف تکے جا رہا تھا۔ اشفاق نے گہرا سانس بھر کر محسوس کیا۔ ایسا دکھ، جو کسی عزیز کے مصائب کی یاد میں جنم لیتا ہے اور جس کا تاثر روح کے گداز میں چھپن سمو دیتا ہے۔ اس نے دوبارہ بازار کی طرف دیکھا۔ تو عبدل کی دکان پہ دوسرے دکانداروں فیض اور حمید کو کھڑے دیکھ کر اُس نے پھر روح میں ایک کرب محسوس کیا۔ "میں نے ان کا کیا بگاڑا ہے؟ ان کے رویّہ میں تبدیلی کیوں پیدا ہو گئی ہے؟" اور پھر اسے یوں سنائی دیا۔ جیسے اس سوال کا جواب دکان کی ہر چیز سے اسے مل رہا ہو۔ "یہ کیا کم بگاڑ ہے کہ تم نے ان کی کاروباری روایات کا طلسم توڑ دیا ہے۔" "تم کیسے باور کر سکتے ہو۔ کہ بازار کے ماحول میں جو انقلاب کا بیج بو رہے ہو اُس سے دکانداروں کے رویّہ میں فرق نہ پڑے۔" "تم کم منافع، اور ایک اصول" کی روش اختیار کر کے ایک سے نوٹ کمانے والوں کو اپنا حامی بنا سکتے ہو۔" اشفاق کے شعور میں خواہش سی پیدا ہونے لگیں۔" آخر اس میں میرا کیا قصور ہے؟ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ دوسروں سے زندہ رہنے کا حق نہ چھینوں۔ اس میں بُرائی کیا ہے؟"۔ اسے یوں دکھائی دیا، جیسے کاؤنٹر قہقہے لگا رہا ہو۔ "تم پاگل ہو۔ تم خبطی ہو۔ تم اگر لوگوں سے زندگی کی آخری رمق تک چھیننا نہیں چاہتے۔ تو دکان خالی کر دو۔ تم اگر سال کے اندر اندر نئی آبادی میں کوٹھی بنوانے کی تگ و دو نہیں کر سکتے۔ تو کاروبار کی بجائے گھاس کاٹ کر بیچا کرو۔ یہاں تمہارا کیا کام؟"۔ "نہیں!" اشفاق کے منہ سے غیر شعوری طور پر "نہیں" کا لفظ نکل گیا۔ سر کو تیز جنبش دے کر اُس نے نظریں اُٹھائیں۔ اور پھر اُس کی نظریں یوں جھک گئیں جیسے درخت کی سب سے موٹی ٹہنی آندھی کی زد میں آ کر ٹوٹ گئی ہو۔ اُس کے سامنے چست بھڑکیلے لباس میں ملبوس ایک نوجوان لڑکی کھڑی تھی۔ اُسے نظر بھر کر دیکھنے کی اشفاق میں جسارت پیدا نہ ہو سکی تھی۔ اُس نے اپنے وقار کے پیشِ نظر مطلوبہ چیز پیش کر دی۔ وہ لڑکی میٹھی ہنسی کا زہر دکان کی فضا میں رچا رہی تھی۔ اشفاق ایسے گاہکوں کے بے مقصد چکر لگانے کی اصلیت جانتا تھا۔ شروع میں وہ کچھ خائف بھی نظر آتا تھا۔ لیکن جلد ہی اُس نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ اس کے خیال کے مطابق وہ صرف دکاندار تھا۔ اور دکاندار کا کام فقط اپنا مال پیش کر کے معقول قیمت بتانا تھا۔ گاہکوں کی اقسام سے واسطہ پڑتے ہوئے وہ سب کو جان چکا تھا۔ اس نوجوان لڑکی جیسے گاہکوں سے کیسے دل و دماغ کو کھولنے سے بچایا جا سکتا ہے۔ اس کا بہتر علاج اُس کے پاس یہی تھا کہ اس کے میک اپ اور لباس کی عریاں تراش پر کوئی توجہ نہ دی جائے۔ اُس کے لہجہ کی کھنک کو اتنی اہمیت نہ دی جائے کہ وہ کسی غلط فہمی کا شکار ہو جائے۔ وہ لڑکی قیمت کے متعلق بحث کرنا چاہتی تھی۔ اور اشفاق قیمت بتا کر خاموش ہو گیا تھا۔ لڑکی نے دو چار مرتبہ معنی خیز نظروں سے بازار کی طرف دیکھا تھا۔ جب اشفاق ٹس سے مس نہ ہوا تو لڑکی اونچی آواز میں بولی۔ "کیا یہی ہے تمہاری شرافت۔ گاہک کے ساتھ زیادتی سے پیش آتے ہوئے تمہیں شرم آنی چاہیے۔ آخر۔ تم نے مجھے سمجھا کیا ہے۔" اشفاق ہکّا بکّا رہ گیا۔ اُس نے مضطرب لہجہ میں کہا۔ "ٹھہریئے! آپ چاہتی کیا ہیں۔ مجھ پر کوئی داؤ نہ چلے گا۔ آپ تشریف لے جائیں"۔ لڑکی کی آواز اور بلند ہو گئی۔ "تم نے میرا ہاتھ دبانے کی کیسے ہمت کی؟" دو چار راہگیر دکان کے سامنے ٹھہر گئے۔ عبدل اپنی دکان سے اُٹھ کر قریب آ گیا۔ ایک آدمی نے پوچھ لیا۔ "بی بی معاملہ کیا ہے؟" لڑکی روہانسی ہو کر بولی۔ "میں نے چیز کے دام پوچھے تو اس نے کہا کہ تم مسکرا دو تو مجھے دام وصول ہو جائیں گے اور پھر اس نے جھپٹ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔" سامنے کھڑے ہوئے راہگیر جوش میں آ گئے۔ جو منہ میں آیا کہہ دیا۔ اشفاق کی غیرت مجروح ہو گئی تھی۔

اُس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ وہ اس سازش کی تہ تک نہ پہنچ سکا تھا۔ اُس کے کانوں میں تو نکیلے ملفنے گرم سیسے کی مانند اتر رہے تھے۔ لڑکی ھنکارتی ہوئی دکان سے باہر چلی گئی ــ راہگیر ابھی تک اُسے بُرا بھلا کہہ رہے تھے۔ عبدل کی آواز سن کر اشفاق کی شریانوں میں خون کی گردش تیز ہوگئی۔ عبدل کہہ رہا تھا۔ "اس جیسے بہروپیوں کی بدولت سارے بازار کی ساکھ بگڑ رہی ہے۔ دکانداری تو صرف بہانہ ہے۔ یہ تو کانٹا پھینکنے آتا ہے۔ تاکہ کوئی رنگین شکار پھانس کر ماحول کو گندا بنا رہا ہے۔ ہمیں ضرور کچھ کرنا ہوگا۔ ورنہ ـــ !" ـ "ورنہ کیا ؟" اشفاق کی رُوح لرز اُٹھی ــ "ورنہ یہی ہوگا.... کہ کاروبار کی صفا کا نہ روایات کا بھرم قائم نہ رہ سکے گا۔" اُس نے زہر خند کے ساتھ بازار کی طرف دیکھا۔ اور اُسے یوں محسوس ہوا جیسے راہگیروں کی شعلہ بار نظریں اس کی زندگی کے افق پر لہراتے ہوئے ایک دام اور ایک اصول کے پرچم کو نوچ رہی ہوں ــ اور عبدل کے تمسخر آمیز قہقہے ان کی حوصلہ افزائی کر رہے ہوں ــ "اب کیا ہوگا ؟" اُس کے سینے میں ایک پھانس سی چبھنے لگی۔ اس کا جی چاہا کہ ابھی دکان بند کرکے گھر چلا جائے۔ زخم تازہ ہے۔ اگر کوئی مزید چرکا لگا ــ تو زخم کبھی مندمل نہ ہو سکے گا۔ اس نے بے بسی کے سے انداز میں سر جھکا لیا۔ لوگ اب بھی چہ میگوئیاں کرتے گزر رہے تھے۔ سارے بازار میں یہ خبر کڑوے دھوئیں کی مانند پھیل گئی تھی۔ اور جس نے بھی سنا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے سانس میں تکلیف دہ رکاوٹ پیدا ہو جانے کی وجہ سے اُسے اُچھو لگ گیا ہو۔ اشفاق بھی دکان میں یوں گھٹن محسوس کرنے لگا تھا، جیسے ہوائی حملہ کے خوف سے تاریک سیلی پناہ گاہ میں دبکا بیٹھا ہو ــ "یہ کیا ہوگیا ہے ؟ اس کا تو کبھی وہم تک نہ ہوا تھا۔ وہ لڑکی کون تھی ؟ دکان سے اترنے کے بعد کہاں غائب ہوگئی تھی ! لوگوں کو کیسے اپنی بے گناہی کا یقین دلاؤں۔" اُس پر یہ حملہ ایسی شدت سے اور ایسا اچانک ہوا تھا کہ اس کا تاثر بہت دیر بعد بھی زائل نہ ہو سکا۔ اس کے بعد دو چار گاہکوں کے ہاتھ سامان بھی بیچا تھا۔ لیکن اس کے چہرے پر شگفتگی پیدا نہ ہوئی تھی۔ اس کے لہجہ کی حلاوت واپس نہ آسکی تھی ــ اُس نے فیصلہ کر لیا کہ دکان بند کرکے شہر سے باہر خاموش فضا میں نکل جائے گا۔ ہنگاموں کے نرغے میں وہ پھنسا رہا تو یقیناً وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے گا۔ وہ کاؤنٹر سے باہر نکلا وہ شوکیس کے گرد بازو حمائل کرکے اُسے اُٹھانے ہی لگا تھا کہ بازار کے مشرقی حصّہ کا ایک دکاندار دکان میں آگیا ــ اشفاق کی گرفت ڈھیلی پڑگئی ــ سلام کا جواب دے کر اُس نے پوچھا ــ "آئیے صوفی صاحب، کیسے تکلیف فرمائی ؟" اور ایک دم اُس کے چہرے کا رنگ متغیر ہوگیا ــ صوفی صاحب بھی شاید کوئی نیا زخم لگانے آئے ہیں۔ ان کے سامنے کیسے اپنی صفائی پیش کروں گا ؟" صوفی نے دکان کے اندر ہوتے ہوئے کہا ــ "تمھارے ساتھ جو حادثہ پیش آیا ہے، ہو سکتا ہے تمھارے لیے وہ بہت اذیت ناک ہو۔ لیکن یقین کرو۔ یہاں کے بعض دکاندار تو اس کے لیے ترستے رہتے ہیں۔ وہ تو اسے اپنی شہرت کا اشتہار سمجھتے ہیں ــ !" "جی ــ !" اشفاق کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں ــ صوفی نے تسلّی آمیز لہجہ میں کہا۔ "مجھے کسی کی بات پر یقین نہیں۔ میں چار ماہ سے تمھارے کردار کا مطالعہ کر رہا ہوں ــ تم تو ہم سب سے بہت مختلف ہو" ــ "میری سمجھ میں تو ابھی تک کچھ نہیں آرہا ہے" ــ "اس سے بھی سخت وار سہنے پڑتے ہیں" ــ "لیکن کوئی وجہ بھی تو ہو" ــ "ایسی باتیں اصول سے تعلق رکھتی ہیں ــ اور یہاں کی اکثریت بے اصولی کو ایمان کا جزو بنا چکی ہے۔ ایسے حالات میں تمھاری پریشانی صحیح ہے" ــ "آپ تو جانتے ہیں کس اصول کے تحت میں نے دکان کھولی ہے" ــ "تمھارے علاوہ میں عبدل کو بھی جانتا ہوں۔ اس کے حواریوں کی سرگرمیوں کا بھی مجھے علم ہے" ــ "میں تو بہت دل برداشتہ ہوگیا ہوں۔ ایسے کاروبار سے تو نوکری اُٹھانا بہتر ہے" ــ "تم تو سمجھدار ہو۔ ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے ! تمھارے اصولوں کو شکست دینے کے لیے تو یہ ایک معمولی حملہ ہے۔ ابھی تو اس راہ میں بہت سنگین موڑ آئیں گے" ــ "میں تو بوکھلا گیا ہوں" ــ "یہ جواں مردی سے بعید ہے۔ تم تو ہراول دستہ کی شان رکھتے ہو۔ اگر یہ شان مٹ گئی تو اس بازار میں مکمل طور پر حیوانیت اپنا تسلط

جائے گی۔ تم کوئی فکر نہ کرو۔ ہر شریف آدمی تمھاری حمایت پر تیار ہے "۔ ایک دم اشفاق کو محسوس ہوا جیسے وہ گہرے ساکن پانی میں غوطے کھانے کے بعد سطح پر اُبھر آیا ہو۔ صوفی نے بھرپور یقین کے ساتھ کہا۔ "تمھارے آنے سے ہم چند دکانداروں کی ہمت بندھی تھی۔ ہم تمھارے ساتھ ہیں۔ تم ثابت قدمی سے ڈٹے رہو" اشفاق زور لگا کر کنارے پر آگیا تھا۔ مایوسیوں کی دھند صاف ہوگئی تھی۔ اُس نے بھی صوفی کو یقین دلانے کی کوشش کی تھی۔ کہ خواہ ہزار برق گرے، لاکھ آندھیاں اُٹھیں۔ لیکن اس کا آشیانہ ہر خطرہ سے محفوظ رہے گا۔ صوفی کے جانے کے بعد وہ اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ اس کی سوچ کے زاویے بدل گئے تھے۔ اُس کے خیالات کا انتشار مٹ گیا تھا۔ کئی گاہک آئے اور سامان خرید کر چلے گئے۔ اور اشفاق خود میں ایک تغیر محسوس کرتا رہا۔ دن ڈھلے ویسی ہی ایک اور صورت نظر پڑی جو اُس کے وقار کو مجروح کر گئی تھی۔ وہی قدوقامت، ویسا ہی میک اپ اور لباس۔ ۔ اشفاق کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ جب وہ دکان سے آگے نکل گئی۔ تو اشفاق نے گہرا اطمینان بخش سانس لیا۔ لیکن چند لمحے بعد اُسے محسوس ہوا جیسے اُس پر منوں بوجھ لاد دیا گیا ہو۔ راہگیروں کی طرف دیکھ کر اس کا دل ڈوبنے لگا۔ آرام حاصل کرنے کی خواہش شدت اختیار کرنے لگی۔ اُس نے شوکیس اندر رکھے۔ دکان کا دروازہ بند کرتے ہوئے اُسے عبدل کی چبھتی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ کسی سے کہہ رہا تھا۔ "یہ کانٹا اب نکلا ہی سمجھو۔ صبح بولی دینے کے لیے جلدی آجانا"۔

اشفاق اس کی طرف نظر اُٹھائے بغیر گھر کی طرف بڑھنے لگا۔ اُس کی سوچ میں بھنور پڑ رہے تھے۔ "میرے خلاف کوئی گہری سازش تیار کی گئی ہے۔ یہ لوگ آخر چاہتے کیا ہیں؟ میں نے تو کبھی ان سے بگاڑ پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ تو کیا صحت مند معاشرے کی تشکیل کی جدوجہد قابلِ تعزیر جرم ہے؟ کیا انسان بن کر زندہ رہنے کی لگن ناقابلِ برداشت ہے؟ آخر کیوں؟" وہ محسوس کر رہا تھا جیسے اُڑتے ہوئے پنچھی کے پر ٹوٹ گئے ہوں۔ اور وہ قلابازیاں کھاتا زمین کی طرف آرہا ہو۔

گھر میں داخل ہوتے وقت اُس کا سر جھکا ہوا تھا۔ اُس کی چال میں نقاہت تھی۔ اُس کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ اُس کی بیوی شاہدہ نے پہلے تو اُسے غور سے دیکھا۔ پھر اُس کی آنکھوں میں استعجاب کے ڈورے اُبھر آئے۔ اشفاق چارپائی پر بیٹھ گیا تو شاہدہ نے پریشان کن لہجہ میں پوچھا۔ "اللہ خیر کرے! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔؟ دکان سے بھی جلدی لوٹ آئے ہیں!" اشفاق نے نظریں اُٹھائیں۔ اُس کی آنکھوں میں یاس کے دھندلکے گڈمڈ ہو رہے تھے۔ "آپ خاموش کیوں ہیں؟" شاہدہ کا فکر بڑھ گیا۔ اشفاق نے گہرا ٹوٹا ہوا سانس بھر کر کہا۔ "ایک حادثہ ہوگیا ہے۔ سوچتا ہوں زندگی جب کانٹا بن گئی ہے تو بہاروں کے خواب دیکھنے کے کیا معنی؟"۔ "کچھ مجھے بھی تو پتہ چلے! کہیں وہ بات تو نہیں جو خالہ حسین بی بی بتا گئی ہے"۔ "کیا بات! تو کیا محلہ والوں کو بھی علم ہوگیا ہے؟"۔ "اگر وہی بات ہے۔ تو کیا ہم اپنی ذمہ داریوں سے منہ موڑ لیں"۔ کیا مطلب؟"۔ "کیا مطلب؟" "لوگ تو موقع ڈھونڈتے ہیں۔ رائی کا پہاڑ بنتے دیر نہیں لگتی۔ اس حادثہ کا سب سے گہرا اثر تو مجھ پر ہونا چاہیے تھا۔ لیکن مجھے آپ پر اعتماد ہے"۔ "سچ!۔ تو کیا تم مجھ سے بدظن نہیں ہوئیں!"۔ "نہیں تو۔ میں کیوں بدظن ہونے لگی"۔ اشفاق کو محسوس ہوا جیسے منوں بوجھ اُس پر سے اُتر گیا ہو۔ تو اس زاویہ سے اس حادثہ کو پرکھا بھی نہ تھا۔ سب سے زیادہ اثر تو شاہدہ پر ہونا چاہیے تھا۔ کوئی بیوی نہیں چاہتی کہ اس کا خاوند کسی غیر عورت کو بھرپور نظروں سے دیکھے۔ اگر اُسے سراغ مل جائے، تو گھر جہنم کدہ بن جاتا ہے۔ لیکن شاہدہ خبر ملنے پر بھی اعتماد کا اظہار کر رہی ہے۔ میں کتنا بزدل ہوں۔ شاہدہ نے پائنتی کی طرف بیٹھتے ہوئے کہا۔ "آپ ہی نے تو کہا تھا۔ کہ مخالف قوتیں بازار میں آپ کے وجود کو برداشت نہ کر سکیں گی"۔ ۔ "لیکن ایسے حملہ کا وہم تک نہ ہوا تھا"۔ "مخالفت میں تو اس سے بھی گہرے چرکے کھانے پڑتے ہیں"۔ "میں تو بے حد پریشان

ہوگیا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ یہ جگہ چھوڑ دوں "۔ "آپ نے آخر ایسا کیوں سوچا۔ ہم جا بھی کہاں سکتے ہیں۔ جو یہاں کا ماحول ہے وہی دوسری جگہ کا بھی ہو سکتا ہے۔ کیا ہر جگہ سے یونہی بھاگتے رہیں گے "۔ "تم نے ٹھیک کہا ہے۔ اگر زندہ رہنا ہے تو یہیں رہیں گے "۔ "اور مخالف قوتوں سے یہیں مقابلہ کریں گے۔ آپ نے ایک دفعہ کسی لکھنے والے کی کہانی سنائی تھی کہ سچائی کا اظہار کرنے کی بدولت جب اُس کے ہاتھ کاٹ دیے گیے تو اُس نے قلم دانتوں میں پکڑ لیا "۔ "ہاں یاد آگیا۔ اگر ہمیں کانٹا سمجھا گیا ہے تو یہی سہی۔ ہم بتا دیں گے کہ بعض کانٹوں میں بھی ایسی مدہوش کن خوشبو ہوتی ہے کہ سارا ماحول جھوم اُٹھتا ہے۔ اشفاق کے چہرے پر ایک عجیب چمک پیدا ہوگئی۔ اس میں مسکراہٹ کی تابانی بھی تھی اور زندگی کا نکھار بھی۔ شاہدہ نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "ہنڈیا چولھے پر رکھی ہے۔ ذرا میں اُسے دیکھ آؤں "۔ "تم اطمینان سے بیٹھو۔ میں دکان پر جا رہا ہوں۔ وقت کے مطابق ہی آؤں گا "!

اور جب وہ باہر نکلا تو اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ کانٹے کی مہک گلی میں پھیلتی جا رہی ہے۔

پاک و ہند کا واحد جریدہ جسے اُردو ادب کے پہلے ڈائجسٹ ہونے کا فخر حاصل ہے

گزشتہ پندرہ سال سے اُردو رسائل میں شائع ہونے والی بہترین تخلیقات کا انتخاب پیش کر رہا ہے۔ نقش نے ایک معیار بنایا ہے اور اس کو قائم رکھا ہے۔

ادارۂ نقش

جنوری ۱۹۶۶ء سے ضخامت میں اضافہ کرکے اس کے دامن کو مزید وسیع کر رہا ہے۔ تاکہ زیادہ سے زیادہ منتخب تحریریں نقش کے صفحات کی زینت بن سکیں۔

ضخامت ——— ۱۷۵ صفحات

قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے۔ سالانہ ۱۶ روپے

کاشانۂ اردو۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۰۲۔ کراچی ۳

ہمارے سب سے بڑے قومی مسئلے پر ایک فکر انگیز کتاب

پاکستانی کلچر

قومی کلچر کی تشکیل کا مسئلہ

جمیل جالبی

• یہ تصنیف اپنے موضوع کی اہمیت، اپنی معنوی خوبی۔ اور فاضل مصنف کی خوش دلانہ کاوش کے لحاظ سے بڑی قابلِ قدر تصنیف ہے۔ اس کی زبان، اس کا اسلوب بیان اس قدر شگفتہ، سلیس و دلکش ہے کہ وہ ایک دلچسپ داستان معلوم ہوتی ہے۔

علامہ نیاز فتحپوری

• اس کتاب میں بے شمار مسائل ہیں جو توجہ طلب ہیں۔ خدا کرے کہ یہ کتاب تعلیم یافتہ لوگوں کو بیدار کر دے۔

ڈاکٹر سید عبد اللہ

• پہلی مرتبہ اس ملک کے ایک دانشور کو یہ سعادت نصیب ہوئی کہ وہ اس مشکل مسئلہ پر ایسی مدلّل اور تفصیلی بحث کرے۔ یہ کتاب خیال و اظہار کی آزادی کی قابل تعریف مثال پیش کرتی ہے۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری

جمیل جالبی صاحب نے جس طرح مسئلہ کی پیچیدگیوں کا تذکرہ کیا ہے وہ اپنی جگہ نہایت سنجیدہ اور ہوشمندانہ ہے۔

محمد حسن عسکری

اس دور کی ایک بہترین کتاب جسے ۶۴-۱۹۶۵ء کا داؤود ادبی انعام بھی ملا

قیمت :- آٹھ روپے

ناشر :- مشتاق بک ڈپو شیلڈن روڈ۔ نزد اردو کالج کراچی

عفت موہانی

سیپ۔ کراچی

کچھ خواب ہے کچھ اصل

اور میں اُسے تکتی ہی رہ گئی۔
جتنی کہانیاں میں نے خالہ بی سے سنی تھیں وہ سب سچ لگ رہی تھیں۔
"ارے! اُس کلموہی نے سارے گھر کو نچا رکھا ہے۔" خالہ بی راستے بھر کنیز کی داستان سناتی رہیں۔ "ایک تو بیچارے بھیا کا بڑھاپا۔ اوپر سے آپا کی شکی طبیعت۔ اور دوسرے ولایت سے لوٹے ہوئے صاحبزادے۔ گھر میں قیامت مچی ہو گی!"
"وہ کیا کرتی ہے، خالہ بی؟" جب اُنھوں نے مجھے بلیٹن نہ پڑھنے دیا تو میں نے جھنجلا کر پوچھ لیا۔ "یہ پوچھو کہ کیا کیا نہیں کرتی۔" خالہ بی چڑ گئیں۔ "اُسے تو بھیا نے لاوارث سمجھ کر اپنے یہاں رکھ لیا تھا۔ کون جانتا تھا کہ سپولیا پال رہے ہیں۔ شروع ہی سے اُٹھان غضب کی تھی۔ اور اب تو عروسہ نے تصویر بھیجی تھی۔ بالکل گڑیا سی ہو گئی ہے۔ نافذ کو انگلیوں پر نچا رکھا ہے۔"
"نافذ بھائی ناچ رہے ہیں۔ یہ کون سا ناچ ہوتا ہے بھلا؟" میں نے یوں ہی کہہ دیا تھا۔ لیکن خالہ بی نے ایسا موڈرن جواب دیا کہ میں ہکا بکا رہ گئی ....
"عشق بازی کا ناچ .... اور کیا ـــ" وہ سچ کوئلے کی طرح چٹخ گئیں۔ "اسی لیے تو منع کر رہی تھی کہ ہوکے کے مارے لڑکے کو ولایت نہ بھیجو ـــ!"
"نافذ بھائی کیوں ننھے منے بچے بن جاتے ہیں؟" میں چڑ گئی۔
"ایسے معاملوں میں موئے مردوے اور بھی چھنرا ہو جاتے ہیں۔ اور پھر نافذ، وہ تو ولایت میں کیا کیا نہ دیکھ آئے ہوں گے۔ عورتوں پر کچھ بند ہیں ـــ وہ..... خدا بُرا کلمہ منھ سے نہ نکلوائے۔ ایک سے ایک موٹی حرافائیں لٹو ہوتی پھرتی ہیں۔ بہت کچھ آ جاتا ہے۔ یہی تو میں کہتی تھی کہ نافذ منھ سے بولنا نہ جانے۔ یہ یکایک اُسے کیا ہو گیا؟"
"خالہ بی۔ نافذ بھائی نے کیا کیا؟" میری دلچسپی بڑھنے لگی۔
"عروسہ نے لکھا تھا کہ وہ دیوانہ بنا پھرتا ہے۔ کنیز کلا ایک سے ایک اونچے گھرانے میں پیغام بھیجے جا رہے ہیں۔ مگر نافذ نے کہہ رکھا ہے شادی کریں گے تو کنیز سے۔ ورنہ کسی سے بھی نہیں ـ!"

"اچھا! —!"

"اور کیا، اسی سے تو میرے آگ لگ گئی تھی۔ منتوں مرادوں کا ایک بچہ، وہ یوں ہاتھ سے بے ہاتھ ہو جائے!"

"یہ سب ہنگامی باتیں ہیں — خالہ بی!" مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ "بھلا چچی جان کب گوارا کریں گی۔ ایسی باتیں تو ہوتی ہی رہتی ہیں۔ نافذ بھائی کی شادی ہو جائے گی۔ وہ سب بھول بھال کے برابر کریں گے!"

"دیکھ لیجیو۔ وہ نہ بھولیں گے۔ ایسے ہی ضدی ہٹیلے ہیں کہ بس۔ اُودھم جوت دیں گے۔ ہاں!"

"کنیز کی صورت کیسی ہے؟"

"ہزاروں میں ایک ہے!" اُن کے منھ سے بے اختیار نکل گیا۔

"کیا وہ نیچ ذات ہے؟"

"ذات پات کس نے بھائی۔ گھر کی انا کی لڑکی ہے! تمھیں یاد نہیں۔ تمھارے ہی برابر ہو گی!" کتنے ہی سال بیت چکے تھے۔ میں نے نہ نافذ بھائی کو دیکھا تھا نہ کنیز کو.... جب وہ ولایت جا رہے تھے میں دہلی میں تھی۔ ان دنوں امی اور چچی جان میں اَن بن تھی۔ نافذ بھائی نے مجھے اپنے جانے کی خبر دی تھی! میرا دل بہت چاہ رہا تھا! لیکن امی نے منع کر دیا۔ امی اس کے بھی خلاف تھیں۔ وہ مجھے خط کیوں لکھتے ہیں۔ امی کی تو عجیب باتیں تھیں۔ کلکتہ سے انھوں نے مجھے بہت سے تحفے بھیجے تھے۔ امی کو وہ بھی ناگوار ہوا تھا!۔ نافذ بھائی مجھ سے آٹھ دس سال بڑے تھے۔ پسندیدہ اطوار، سنجیدگی اور متانت سے بھرپور — چھچھورے لڑکوں کی طرح میں نے اُنھیں بے محل ہنستے ہوئے کبھی نہیں دیکھا۔ ہر وقت خاموش خاموش سے۔ نہ جانے کیا کچھ سوچتے رہتے! مدتوں ہم میں باتیں نہ ہوتیں۔ وہ تھے اور اُن کی لائبریری! میں اُن سے انگریزی پڑھا کرتی۔ اور اس وقت امی کسی نہ کسی کو میرے سر پر مسلط کر دیتیں۔ یا تو عروسہ چلی آتی کبھی کبھار امی آ جاتیں۔ شرم کے مارے میرے کان جلنے لگتے۔ وہ بھی بھانپ گئے تھے۔

"عشرت۔ امی کو یہ پسند نہیں ہے کہ میں تمھیں پڑھا دیا کروں!"

"نہیں تو نافذ بھائی!" میں محجوب ہو گئی۔

"تمھارے ساتھ باڈی گارڈز بھی آتے ہیں!" وہ ہنسنے لگے۔

"جی وہ —" میں شرم کے مارے ہکلانے لگی — "میں تو نہیں لاتی!"

اور پھر جب میں اکیلی پڑھنے کے لیے گئی تو انھوں نے خود ہی عروسہ کو آواز دے دی۔ میری طرف دیکھ کر مسکرائے — "آج کل کی مائیں مارے عاقبت اندیشی کے بھائی بہن کو بھی مشکوک دیکھ رہی ہیں۔ امی سے کہنا.... ٹیوٹر رکھیے — اچھا — وہ تو میری فیس بھی نہیں دیتیں۔" وہ جلدی سے ہنس پڑے۔ "خیر! چلو — تھوڑے سے دن رہ گئے ہیں۔ تمھیں پڑھا دیں۔ پھر تم کہاں۔ اور ہم کہاں؟"

جب میں تعلیم کے سلسلے میں خالہ بی کے یہاں چلی گئی۔ وہ مجھے برابر خط لکھتے رہے۔ ان خطوں میں کیا کچھ نہ ہوتا تھا۔ میں بھائی کو ترسی ہوئی تھی۔ میرے لیے وہ بھائی سے بڑھ کر تھے۔ کتنا پیار ہوتا تھا اُن کی تحریر میں۔ جیسے دل کے خون میں قلم ڈبو کر لکھتے ہوں۔ ان کی محبت میری زندگی میں سما چکی تھی۔ ایک دیوتا کی طرح میں اُن کی پرستش کرتی تھی۔ یورپ سے بھی ان کے خط برابر مجھے ملتے رہے! لیکن پھر دفعتہً خط آنے بند ہو گئے۔ اور جیسے ہی وہ یورپ سے آئے چند ہی ہفتوں بعد کنیز سے

ان کی محبت کی داستان جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی ۔

خالہ بی کنیز پر لعنت بھیج کر سو چکی تھیں ۔ میں بچپن کی دھند میں جھانکنے لگی ۔ بڑی دیر بعد مٹا مٹا سا ایک دبلا پتلا سفید ہیولیٰ دکھائی دیا ۔ سر پر پھٹی اوڑھنی ..... کرتے میں جا بجا پیوند چپکے ہوئے ۔ گالوں پر بہے ہوئے آنسوؤں کے بجھے بجھے نشان واضح تھے ۔ وہ ہمارے ساتھ کھیلتی تھی ۔ گھر بھر کے کام کرتی تھی ۔ اور جب رات کو تھکی ہاری بستر پر لیٹتی تو اپنی ماں کو یاد کرکے ضرور رو لیتی تھی ۔

بچپن کی یادیں کربناک بھی تھیں اور طربناک بھی ۔ میں ماضی میں گم ہوگئی ۔

"کنیز کہاں ہے ؟" نافذ بھائی جب بھی کھیلنے آتے سب سے پہلے اسی کو پوچھتے ۔

"امی کا سر دبا رہی ہے ۔" کوئی کہتا ۔

"امی کا سر تم دباؤ ۔ اور کنیز کو ہمارے ساتھ کھیلنے کے لیے بھیج دو ۔" وہ اپنی بہن کے سر پر ایک ہلکی سی چپت لگا کر بھگا دیتے ۔

"کنیز تو نوکر ہے ۔ بھائی جان !"

"کنیز اگر نوکر ہے تو تم سب بھی نوکر ہو ۔" نافذ بھائی لڑنے پر آمادہ ہو جاتے ۔ "اس کی بھی تو دو آنکھیں ہیں ۔ ایک ناک ہے ۔ منہ ہے ۔ وہ تمھاری طرح بولتی ہے ۔ ہنستی ہے ۔ روتی ہے ۔ پھر وہ نوکر کیوں ہے ۔ اور تم نوکر کیوں نہیں ہو ؟"

اور امی گھبرا کر کنیز کو ساتھ کھیلنے کے لیے بھیج دیتیں ۔ کھلی فضا میں پہنچ کر کنیز کے مرجھائے ہوئے چہرے پر سرخی دوڑ جاتی ۔

"آؤ کنیز !" وہ دوڑ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیتے ۔ اور پھر آنکھ مچولی شروع ہو جاتی ۔ کنیز جہاں جاکے چھپتی ۔ نافذ بھائی اسے ڈھونڈ لاتے ۔ وہ بار بار اسی لیے چور بنتے تھے ! کنیز کو کنجوں، ٹیلوں اور جھاڑیوں میں ڈھونڈتے انھیں بہت لطف آتا ۔ جب کبھی کنیز کام میں الجھی ہوتی وہ کھیلنے سے انکار کر دیتے ۔

دھیرے دھیرے بچپن کے نقوش پر شباب کی تازگی چھا گئی تھی ۔ سب کچھ نئے سرے سے انگڑائی لے کر جاگ اٹھا تھا ! میں نہ جانے کب تک یہ خواب دیکھتی رہی ۔

مدتوں کے بچھڑے ملے ۔ خالہ بی کی مدالی مشین تو ایسی چلی کہ چچی جان بھی ہکا بکا رہ گئیں ۔ پل بھر کے لیے ان کے چہرے پر اجلاہٹ نمودار ہوئی ۔ چچا جان کو وہ کسی کام کے قابل نہیں سمجھتی تھیں ۔ وہ خود ہی گھر کے معاملات میں دخل نہیں دیتے تھے ۔ اور جب کبھی چچی جان انھیں آڑے ہاتھوں لیتیں بے چارے تھکی تھکی آواز میں کہتے ۔ "اب تو ہم چل چلاؤ پر ہیں بیگم ۔ جو کچھ کہنا سننا ہو نافذ سے کہہ لو ۔"

"عقل پر تو بالکل زنگ لگ گیا ۔" چچی جان نقلی دانت پیستیں ۔

"بھیا ۔ یہ وطیرے کیا ہیں ؟" خالہ بی دبنگ بن جاتیں ۔

اور بوڑھوں میں چونچلے ہونے لگتے ۔ لیکن اب کی بار زندگی جیسے کونے میں منہ دیے سسک رہی تھی ۔ ماحول عجیب سا تھا ۔ سب کے سب اداس تھے ۔ سلوک میں نہ گرم جوشی تھی نہ گفتگو میں کوئی جان ۔

میری نگاہیں نافذ بھائی کو ڈھونڈ رہی تھیں ۔ مگر میں نے چچی جان سے نہیں پوچھا ۔ وہ اپنے دکھڑے رو رہی تھی ۔ "ان کے ولایت سے آنے کے بعد لڑکیوں نے ایک چھوٹا موٹا جلسہ کیا تھا ۔ ایسی ہی خوشی تھی سب کو ۔ مجھے کیا پتا ۔ میں نے کہا بچیاں تھک کے چور ہو جائیں گی ۔ خود میں تو کچھ کر نہ سکتی تھی ۔ ارے اس جانمار خون کے بلڈ پریشر نے آدھا کر کے رکھ دیا ہے ۔" چچی جان نے بھرّائے

ہوئے گلے سے آواز نکالی۔ "کہاں کہاں علاج کروایا۔ حکیم ڈاکٹر نگوڑے لٹھ لے کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ نمک چھوڑ دو۔ پر بو ہم سے تو نمک نہ چھوٹا۔"

"تو پھر کنیز سے تم نے کیا کہا؟" خالہ بی نے انھیں لقمہ دیا۔

"ارے مجھے کیا پتا تھا۔ یہ بہانہ غضب ہو جائے گا۔ موتی مالن کے ساتھ باغ میں کام کرتے کرتے گلاب کے پھول بو میں لگا آتی تھی۔ دیکھنے میں جیسے ناگن بیٹھ پر پڑی ہو۔ غوسہ دوائیاں کرتے کرتے تھک گئی۔ لیکن وہی میموں کے سے جھڑے جھڑ بال۔ ایک وہ ہے آخو کی بھرتی۔ برسوں تیل کنگھی نصیب نہیں ہوتا۔ مگر بال دیکھو کمر کے نیچے جا رہے ہیں۔!"

خالہ بی کا منہ بن گیا۔ مگر کچھ بولیں نہیں۔ چچی جان نے چھالیہ کا ایک پھنکا را مارا۔ پھر رازداری سے بولیں۔ لڑکیاں اِ اُدھر دوڑی دوڑی پھر رہی تھیں اتنے میں یہ قطامہ چوٹی میں پھول لگائے نیلا دوپٹہ اوڑھے تمھارے بھیا کو چائے دینے گئی نافذ میاں بیٹھے ہوئے تھے۔ بس غضب ہو گیا۔ اپنے بہنوئی سے پوچھ لو۔ کیا وہ سیدھے بھاؤ باتیں کر رہے تھے۔ کیا تو اس صورت حرام کو دیکھتے ہی آپے سے جاتے رہے!"

"توبہ!" خالہ بی کے ہاتھ گالوں پر پہنچ گئے۔"

"پھر رات کو جب میرے پاس آئے تو بار بار پوچھ رہے تھے۔" امی وہ لڑکی کون ہے جس نے نیلا دوپٹہ اوڑھ رکھا ہے امّی اُس کے اتنے لمبے لمبے بال ہیں۔ امی اُس کے بالوں میں گلاب کے پھول لگے ہوئے تھے۔" میں تو بڑی کھٹکی تھی اسی وقت جب تک کوئی بہانہ بناتی۔ غوسہ بول اُٹھی۔" بھائی جان' آپ کو کنیز یاد نہیں۔ وہ تو کنیز ہیں۔" جیسے بجلی کا الیکٹرک شا لگا! چچی جان آخر یورپ پلٹ بیٹے کی ماں تھیں۔ انگریزی بول گئیں۔

"پھر؟" خالہ بی نے مرعوب ہو کر پوچھا۔

"پھر کیا۔ اب میں اپنے منہ سے کیا پھوٹوں۔ قیامت کھڑی کر دی لڑکے نے۔ نہ میرا خیال۔ نہ باپ کا کچھ ڈر۔ جیسے ولایت میں ہوا تھی۔ کہتا ہے۔ ہلو کنیز!"

"ہائے اللہ!" خالہ بی ایکی اُچھل پڑیں۔ "تو تم نے اُسے اپنی چھاتی پہ کودوں دلنے کے لیے رکھ چھوڑا ہے۔"

"اب تو وہ میرے ساتھ قبر میں جائے گی۔ تمھیں خبر نہیں کیا کیا اِدھر اُدھری ہو چکی ہے۔ میرا خیال نہ کیا تھا نہ کرتے۔ باپ سے کہہ گزرے وہ انا کی لڑکی ہے تو کیا ہوا۔ مجھے تو وہی پسند ہے!"

"نافذ ہیں کہاں؟" خالہ بی نے اِدھر اُدھر دیکھ کر پوچھا۔

"باہر ہی ہوں گے۔" چچی اماں کا منہ ذرا سا نکل آیا۔ "ہم سب سے خفا ہیں بول چال بند ہے۔ میں ہی منہ پھوڑ کر کچھ کہتی ہوں تو اوندھا سیدھا جواب دے کر چل دیتے ہیں۔"

خالہ بی نے اُنھیں بلوایا۔ چند منٹ خاموشی رہی۔ ذرا سی دیر بعد ہی نافذ بھائی آئے اور ہنستے ہوئے خالہ بی سے لپٹ گئے۔ "آپ کب آئیں خالہ امی؟"

"تجھے خبر بھی تو لگے لڑکے۔ اب بڑا آدمی ہو گیا ہے نا؟" خالہ بی نے دونوں ہاتھوں سے ان کا چہرہ دبا لیا۔ چشم بد دور نظر بھر کر دیکھا نہیں جاتا۔"

وہ شرما گئے۔

"اچھی جاتی تھی لڑکی" خالہ بی نے مجھ سے کہا ۔ "نافذ بھائی سے ملوں گی ۔ اب کیوں چُپکی سادھ لی" وہ میری طرف مڑے ۔

"اُف فوہ ۔ امی ۔ یہ عشرت ہے ..... کتنی بڑی ہوگئی ہے" انھوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور میں گرتے سے سنبھلی ہوئی اُن کے سینے سے لگ گئی ۔

"آپ مجھے بھول گئے" جب میں شرماگئی تو میں نے گلہ کیا ۔

"کون تمھیں بھول سکے گا عشرت !" انھوں نے بزرگانہ انداز میں میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ۔ "کچھ ایسے حالات ہوگئے کہ ـــ اچھا ۔ پھر تم سے کہوں گا ۔ ابھی تو تم رہو گی نا ؟"

"جی ہاں ۔ ابھی تو ہوں !"

"مجھے بڑی خوشی ہوئی ۔ پتہ ہی نہیں چلا کہ تم آئی ہوئی ہو ۔ ورنہ میں بھاگ آتا ۔ دوستوں میں بیکار گپ شپ کر رہا تھا ۔ میں تمھارے لیے بڑی اچھی اچھی کتابیں لایا ہوں ۔ کیا کر رہی ہو آج کل ؟"

"جی ۔ ایم اے تو کر چکی ۔ اب جو آپ سب کی رائے ہو ؟"

"بڑی جلدی ترقی کر لی ۔ امی ۔ اس کی عمر کیا ہوگی ۔ مجھے یاد ہے ۔ میں اسے چاکلیٹ دیا کرتا تھا ۔ ایک دفعہ اس نے میرے ہاتھ میں کاٹ کھایا تھا ۔ خدا جانے وہ نشان کہاں گیا ۔ ابھی تک خون جھلک رہا ہوگا ۔"

وہ کتنے بڑے پن کی باتیں کر رہے تھے ۔ مگر میں بناوٹ صاف پہچان گئی ۔ اُن کی آنکھوں میں کوئی دکھ چھپا ہوا تھا ۔ ایسا انجانا دکھ ..... جو صرف محسوس کیا جا سکتا ہے ۔ بتایا نہیں جاتا ۔ بار بار پہلو بدل رہے تھے ۔ ہونٹوں پر زبان پھیر رہے تھے ۔ جیسے وہ محض جسماً ہمارے پاس ہوں ۔ اور ذہن کہیں اور ہو ۔

"مگر خالہ امی ـــ میں نے اسے کبھی نہیں ستایا" وہ پھر بولے ۔ "میرے پاس پڑھنے بھی تو آتی تھی ۔ اور ہاں میری فیس ابھی تک قرض ہے ....."

میں اُن کی خاطر ہنس پڑی ۔

"آہ ۔ عشرت وہ بھی کیا زمانہ تھا ۔ جیسے میں کچھ کھو کر گیا تھا ۔ کچھ کھو کر آیا ہوں ۔ نہ مجھے یہاں کوئی ملا نہ وہاں" یکایک وہ انگریزی میں مجھ سے کہنے لگے ۔ "تم دیکھ لینا ۔ تمھیں پتا چلے گا ۔ میری جاہل بہنوں اور ناسمجھ ماں نے مجھے اغوا کر لیا ہے ۔ میں وہ نہیں ہوں جو کبھی تھا" وہ خالہ بی کے بھونچکال چہرے کی پروا کیے بغیر بولتے رہے ۔ "میں اب پوچھتا ہوں عشرت ۔ میں یہاں کیوں آیا ؟" ...

"مجھے تو کچھ پتا نہیں بھائی جان ۔ مگر آپ یہ کیوں سوچتے ہیں ؟"

"یہ کون سی بولی ہے" خالہ بی آخر نہ رہ سکیں ۔ "کوئی راز کی بات ہو تو ـــ ہم چلے جائیں !"

"جی نہیں ۔ خالہ امی ..... آپ بیٹھیے ۔ میں ذرا عشرت کو کتابیں دے دوں ! ـــ چلو !"

میں اُن کے پیچھے باہر نکل آئی ۔ وہ اپنے سلوک میں ذرا بھی تو نہ بدلے تھے ۔ یا یہ بات کم از کم میں نے ہی محسوس کی تھی ۔ وہ ویسے ہی مخلص ۔ اتنے ہی پُر محبت اور متین تھے ۔

"خالہ امی کا تم نے چہرہ دیکھا تھا ؟" وہ یکایک کھلکھلا کر ہنس پڑے ۔ مجھے بھی ہنسی آگئی ۔ وہ مجھے اپنے کمرے میں لے آئے ۔ اور پھر الماری سے کتابیں نکالتے ہوئے بولے ۔ "تمھیں دیکھ کر مجھے بے انتہا خوشی ہوئی ۔ جیسے مجھے میرے خیال اور میری زبان مل گئی ہو ... تم ابھی چلی تو نہ جاؤ گی ۔"

"نہیں بھائی جان! ابھی کہاں..... میں آپ کی شادی میں شرکت کرکے جاؤں گی۔ ابھی چھٹیاں باقی ہیں۔"

"شادی!" وہ رک گئے۔ "یہ تم سے کس نے کہہ دیا۔؟"

"چچی جان کو تو بڑا ارمان ہے! وہی کہہ رہی تھیں۔"

"امی چاہتی ہیں جلد از جلد مجھے زنجیریں پہنا دیں۔ جیسے میں کہیں بھاگا جا رہا ہوں۔ مگر بس وہ جو کچھ چاہتی ہیں۔ میں نہیں چاہتا۔ امی کو کیا پتا۔" تھوڑی دیر ٹھہر کر انھوں نے بڑی بے بسی سے کہا۔ "اگر میں اس سلسلے میں اپنی پسند سے کام لوں تو کیا یہ کوئی گناہ ہے؟"

"آپ کی مرضی اور پسند تو ہر لحاظ سے دیکھی جائے گی!" میں نے سوچ سمجھ کر جواب دیا۔

"مگر میری پسند پر امی آگ بگولہ ہو گئی تھیں۔" انھوں نے کہا۔ "عشرت..... سچ سچ بتاؤ..... اگر تمھارا کوئی بھائی ہوتا۔"

"واہ بھائی جان۔ آپ نے میری محبت کی اچھی قدر کی۔ میرا کوئی بھائی ہوتا؟ کیا اب میرا کوئی بھائی نہیں ہے۔" میں نے شکوہ کیا۔

ایک لمحے کے لیے وہ شرمندہ ہو گئے۔ "ہاں..... میں تمھارا بھائی ہوں..... کیا تم میری زندگی نہیں چاہو گی؟"

"دل و جان سے بھائی جان۔ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ آپ کے لیے اگر میری جان بھی درکار ہو تو میں دے دوں گی۔"

اُن کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ "لڑکیوں کی طرح مجھے بیچنے اور خریدنے کے چرچے ہوتے ہیں۔ میرا کوئی ہم خیال نہیں ہے۔" وہ شاید کنیز کا نام لیتے ڈر رہے تھے۔ "صبح و شام مجھے یہی فکر رہتی ہے کہ میں جسے اپنے خیالوں میں بسائے پھر رہا ہوں۔ اس کا کیا ہوگا؟ — وہ مجھے بے حد پسند ہے۔ عشرت!" اور وہ کتاب کی طرح کھل گئے۔

کتنی دیر تک انھوں نے اپنے دل کی تمام باتیں مجھ سے کہی تھیں۔ ان دس برسوں کی ایک ایسی بات نہ تھی جو انھوں نے فراموش کی ہو..... ہنسے اور ہنسایا..... روئے اور مجھے بھی رُلایا.....! شام کو چائے پر میں اُن کے ساتھ اندر آئی۔ اُنھوں نے دھیرے سے مجھے اشارہ کیا خالہ امی اور چچی جان کے چہروں پر بدستور خفگی کے غلاف منڈھے ہوئے تھے۔ بڑی فضول سی خاموشی کے ساتھ چائے ختم ہوئی۔ پھر وہ سیر کے لیے تیار ہو گئے۔

"چلتی ہو عشرت؟" انھوں نے مسکرا کر کہا

"کیوں چچی جان؟" میں ٹلپا گئی۔

"یوں کھلے بندوں؟" خالہ امی لگیں روڑے اٹکانے۔

"آپ لوگ سیکڑوں سال پیچھے کی باتیں کرتی ہیں۔ اب میں تو ساتھ ہوں۔ دے دیجیے اجازت!"

"برقعہ لے جاؤ!" چچی جان نے کہا۔

"برقعہ؟" انھوں نے قہقہہ لگایا۔ "آپ لوگ اگر یورپ کا ماحول دیکھیے تو پھر..... آپ کو.....!"

"یہ یورپ نہیں، ہندوستان ہے۔" اچانک خالہ بی پھٹ پڑیں۔ "یورپ کا نگوڑا ماحول میں کیا دیکھوں، تمھی کو مبارک رہے۔ جو کچھ یہاں نہ آتا تھا، وہ وہاں جا کر سیکھ آئے۔ بڈھے ماں باپ کو ڈگڈگی بجا بجا کر.....!"

مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔

کیا تو بھائی جان کا چہرہ مسکراہٹ کے مارے کھلا پڑ رہا تھا۔ کیا مرجھا کر رہ گئے۔

اُسی شام، میں نے برآمدے کے سرے پر کنیز کو دیکھا۔ جیسے دیکھنے کے لیے تڑپ رہی تھی۔ پل بھر کے لیے میں دم بخود رہ گئی۔ نکھرے

سنہرے آسمان پر چودھویں کا چاند چمک رہا تھا۔ مگر میرے سامنے چاند سے کہیں زیادہ حسین چہرہ تھا۔ لمبی لمبی پلکوں کا عکس چاندنی میں رخساروں پر کانپ رہا تھا۔ پتلے پتلے مرجھائے ہوئے لب نیم وا تھے، کھلے ہوئے بال کمر سے نیچے لہرا رہے تھے۔

"کنیز.....!" میں گنگنائی — "مجھے نہیں پہچانا۔؟"

"عشرت بی بی!" وہ مجھ سے لپٹ گئی — "آپ کب آئیں؟"

"تم مجھے بھول گئیں —" میں نے ہنستے ہوئے اس کے گال پر تھپکی دی۔

"میں تو نہیں بھولی، مگر آپ سب بھول گئے" — وہ اُداس ہو گئی۔

"تم اندر نہیں آتیں؟" میں رہ رہ کر اُس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ کتنی لڑکیاں میں نے دیکھی تھیں۔ مگر کنیز کا سا حسن زندگی بھر میں پہلی بار دیکھ رہی تھی۔

وہ آہستہ سے بولی — "بیگم صاحب آنے نہیں دیتیں۔ بی بی میں تو جنجال میں پھنس گئی ہوں۔ مجھے موت بھی تو نہیں آتی۔ مجبوروں اور بےکسوں سے موت بھی پناہ مانگ کر رہ جاتی ہے!"

"فضول باتیں مت کرو!"

"آپ کو کیا پتا؟" وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی۔ لب کانپ رہے تھے۔ مگر وہ کہہ نہ سکی۔ دفعتہً اُس کی آنکھیں بھر آئیں — آپ... مجھے بہت چاہتی ہیں نا — میرے مرنے کی دعائیں مانگا کیجیے!"

اور اُس نے سب کچھ کہہ دیا۔ اُس کے ایک ایک لفظ سے درد چھلکا پڑتا تھا۔ نہ جانے کتنے دکھوں کو گلے لگائے جی رہی تھی۔

"میرا کوئی نہیں ہے۔ اکیلی ہنستی ہوں۔ اکیلی روتی ہوں.... دنیا اتنا کیوں ستاتی ہے۔ عشرت بی بی۔ میرے آس پاس کتنا اندھیرا ہے۔ آپ اچھی طرح دیکھیے!"

اور دوسری طرف نافذ بھائی تھے۔

"عشرت!..." وہ چپکے چپکے کہا کرتے۔ "تم نے کنیز کو دیکھا.... وہ کتنی خوبصورت ہے.... میری برباد زندگی سے کہیں زیادہ حسین اور معصوم۔ پہلے پہل جب اُس نے مجھے دیکھا تھا۔ آہ — آشی — میں وہ نگاہیں نہیں بھول سکتا۔ ان نظروں میں کوئی گہرا احساس تھا۔ میری روح میں اُتر گیا۔ اگر میں اُسے اپنا نہ سکا.... اگر میں —" چچی جان خطرے کی بُو پا چکی تھیں۔ خالہ بی نے ڈکٹیٹروں جیسا ردیہ اختیار کر رکھا تھا۔ بھائی جان مقابلے پر تیار رہتے۔ چچی جان صوبیدار صاحب کی لڑکی کی بات کرتیں۔ اور وہ رسیاں تڑاتے۔

"اگر تم ہاں کہہ دو —" خالہ گھما پھرا کر کہتیں۔

"میں قیامت تک نہ کہوں گا۔ میں کسی کا جبر سہہ نہ سکوں گا۔"

"کسی نے تم پر جادو کر دیا ہے... بہکا دیا ہے ایک کلموہی کے پیچھے!"

"میرے گھر میں کوئی کلموہی نہیں ہے!" دبے ہوئے غصے سے ان کا چہرہ سُرخ ہو جاتا۔

"خوب تم نے ولایت پاس کر کے باپ دادا کا نام اُچھالا ہے۔ تم سے تو ایسی امید نہیں ہے!"

"آخر میں بھی تو کچھ سوچتا ہوں!"

"ماں باپ تمھارے بھلے کی کہاں سوچتے ہیں۔ وہ تو تم خود سوچ لو گے!"

"بلاشبہ!"

"سن لیا بہن!" چچی جان کی گنگا جمنا بہ نکلتیں.

"آپ نے خواہ مخواہ بات کا بتنگڑ بنا رکھا ہے۔ یہ میرا معاملہ ہے۔ آپ دوسروں کی ہمدردیاں کیوں سمیٹ رہی ہیں؟"

خالہ بی کے جل تھل ایک ہو گئے "ہاں ہاں' میں کون ہوتی ہوں! جب تم چھوٹے تھے تب میں نے تمھیں گودی میں کہاں کھلایا. جب تمھاری اماں بیمار تھیں تو میں تمھارے ساتھ ساری ساری رات کہاں جاگی. جب تم بھوک سے روتے تھے تو میں نے تمھیں دودھ کب پلایا۔ وہ تو کوئی اور تھا۔ میں تو دوسری ہوں... تمھاری کوئی نہیں!"

"میری خالہ امی آپ خفا نہ ہوں۔ یہ سب کچھ آپ نے کیا تھا۔ جسے آپ نے گودی میں کھلایا ہے. جس کے لیے آپ ساری ساری رات جاگی ہیں۔ پھر آپ اُس کی ایک آرزو بھی پوری نہیں کرتیں۔؟ خدا کے لیے انصاف کیجیے۔ آپ سے اپنے لیے میں کچھ نہ مانگوں؟"

"ایک دو ٹکے کی چھوکری کے لیے۔ جو ہماری تمھاری جوتیاں سیدھی کرتی تھی۔!"

"زندگی اس کی بھی ہے۔ جو کچھ میں سوچتا ہوں۔ وہ بھی سوچتی ہے۔ نہیں! خالہ بی' میں نے سوچ لیا ہے۔ میں اگر شادی کروں گا تو اُسی کنیز سے جو آپ کی اور میری جوتیاں سیدھی کرتی ہے۔ صوبیدار صاحب کی لڑکی اس گھر کی بہو کبھی نہیں بن سکتی۔ کبھی نہیں!"

"نافذ!" چچا جان بھی ایک بار تلملا گئے۔

"اگر وہ غریب ہے تو میں اُس کے قدموں میں دولت کے انبار لگا دوں گا. اگر اس کا کوئی مقام نہیں ہے تو میں اُسے اُس کا صحیح مقام دوں گا۔!"

"نافذ۔ تم پاگل ہو گئے ہو۔... تمھیں شرم نہیں آتی۔ تم زبان لڑاتے ہو!" چچا جان گرج برس گئے۔ "شرم اور غیرت....!" وہ زہریلے لہجے میں ہنسے۔ "ایک مجبور اور بے بس کا ہاتھ تھامنا باعث شرم ہے۔ ایک بے سہارا زندگی کو سہارا دینا بے غیرتی ہے! ایک غریب لیکن شریف لڑکی کو اپنانا بے حیائی ہے۔ یہ سب دنیا کیوں سوچتی ہے۔ میں مر کیوں نہیں جاتا۔ خدا مجھے موت کیوں نہیں دیتا۔ میں گھر سے نکل جاؤں گا۔ میں دیواروں سے سر ٹکرا دوں گا!"

"یہ کیا دیوانہ پن ہے....." خالہ بی نرمی اختیار کر لیتیں۔ تم یہ نہیں سوچتے۔ ہمارا خاندان۔ ہمارا وقار۔ اور۔ چار لوگوں میں بنا بنایا نام۔"

"یہ اونچ نیچ ہم نے بنائی ہے۔ محبت دولت ہے۔ ہم جب چاہیں یہ فرق مٹا سکتے ہیں۔ مجھے اُس کے ہر عیب سے پیار ہے... اُس کی غربت سے۔ اُس کی مجبوری سے۔ آپ چار لوگوں سے مت ڈریے۔ میں اُنھیں بڑی آسانی سے منھ دکھا سکتا ہوں۔"

دل کے قلعے حباب ہوتے ہیں۔ مگر نافذ بھائی کا قلعہ تو سنگین تھا۔ کسی کے آنسوؤں کا اُن پر اثر نہ ہوتا۔ "عشرت.... میں کہاں جاؤں..... میں کیا کروں؟" وہ بچوں کی طرح مچلتے۔ "یہ سب کچھ کنیز بھی سنتی ہوگی۔ اُس کا کیا حال ہوتا ہوگا۔ کاش میں اُسے تسلیاں دے سکتا۔ اُس سے کہہ سکتا۔ وقت کے دھارے چاہے جس رُخ پر پڑیں۔ مگر نافذ تمھارا ہے۔ اور زندگی بھر تمھارا ہی رہے گا۔ عشرت بہن، اگر تم چاہو تو۔" وہ التجائیہ انداز میں میرے ہاتھ دبا لیتے۔ "میری طرف سے کہہ دینا..... وہ غم نہ کھائے.... آنسو نہ بہائے۔ موت کی دعائیں نہ مانگے! میں اُسے چاہتا ہوں.... وہ غریب ہو تو ہو۔ نیچ نہیں ہے۔ یہ لوگ کیوں نہیں سوچتے۔ کنیز کے پاس بھی دل ہے!"

نافذ بھائی کا یہ انداز سوہانِ روح ہو گیا تھا۔ ان سے کچھ بس نہ چلتا! کنیز کو چچی بی قہر بھری نظروں سے اس طرح گھورتیں کہ وہ مجسم ہو جاتی۔ نافذ بھائی کی محبت میں وہ اپنے آپ کو بھول چکی تھی! یہ تو بعد کو اُسے پتا چلا کہ وہ لاکھ بار سیدزادی ہو تو کیا۔ بہت کمینی ہے بہت گری ہوئی ہے۔ بھلا اتا کی لڑکی کی یہ مجال؟ اُس کا احساس کا مراق فنا ہو گیا تھا! کتنے چاؤ سے وہ نافذ بھائی کی باتیں

مجھ سے سنتی تھی : ان کے قدموں کی آہٹ سننے کے لیے وہ پہروں جاگا کرتی ! میں دل و جان سے چاہتی تھی نافذ بھائی اُسے اپنا لیں وہ سب سے جُدا تھی۔ الگ تھلگ کمرے میں پڑی رہتی۔ جیسے کوئی گندی بیماری ہو.... صرف میں ہی تھی جو خالہ بی کے کڑے تیوروں کی پرواکرکے بھی اُس کے پاس چلی جاتی تھی۔

"نافذ کو راضی ہونا پڑے گا۔ میں صوبیدار صاحب کو زبان دے چکی ہوں !" چچی جان نے الٹی میٹم دے دیا۔

"آپ کو پچھتانا پڑے گا۔" نافذ بھائی نے کہا۔ "شادی میری پسند کی ہوگی۔"

"نافذ تم کچھ بھی کہو۔ تمھارا بیاہ اس کلموہی سے ہرگز نہیں ہوسکتا۔ غضب خدا کا کل کی چھوکری جس کی ماں میرے پاس پندرہ روپے ماہوار پر نوکر تھی۔ آج میری بہو بن جائے۔ جسے میں نے نالی کا کیڑا سمجھا وہی میری برابری میں بٹھایا جائے۔ یہ دن نہ دکھا ہے پروردگار۔ میرا گھر غلیظ ہوگیا۔"

"اسی لیے تو کہتا ہوں طاعونی چوہوں کو گھر سے نکال پھینکیے۔"

"ناخلف۔ اس سے تو اچھا تھا، تم یورپ میں رہ جاتے۔ مجھے تم پر فخر تھا ! اگر تم ہماری پسند کو اپنا نہیں سکتے تو نہ سہی، مگر میں اتنا اور کہہ دوں کہ کنیز میرے خاندان میں شامل نہیں ہوسکتی۔"

"مگر ڈیڈی۔" نافذ بھائی جھکنا نہیں چاہتے تھے۔ "کنیز کی صرف یہی خطا ہے کہ وہ غریب ہے۔ اس کے سوا اور اس میں کیا عیب ہے؟"

"غربت اور افلاس ہی اُس کے عیب ہیں۔" خالہ بی نے بات اُچک لی۔ "تمھارے لیے اونچے اونچے گھرانوں کی کیا کمی ہے؟ ایک سے ایک خوبصورت اور دولت مند لڑکی منھ پھیلائے بیٹھی ہے۔ کل کلاں کو کوئی کیا کہے گا۔ بیرسٹر صاحب کے صاحبزادے نے گھر کی چھوکری سے بیاہ کرلیا۔"

"میں کنیز کے نام ساٹھ ستر ہزار روپیہ جمع کرائے دیتا ہوں۔ پھر تو کوئی اُسے غریب نہ کہہ سکے گا۔" نافذ بھائی بولے۔

"قسم قرآن کی میں سنکھیا پھانک لوں گی۔ اگر تو نے پھر کنیز کا نام لیا۔" چچی جان نے آخری حربہ استعمال کر ڈالا۔

"نہیں امی ....." نافذ بھائی کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ "آپ کی زندگی ..... آپ کی خواہش میری آرزو سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے۔ آپ کی مرضی بھی میری مرضی ہے — !"

وہ تھکے ہارے قدموں سے اپنے کمرے کی طرف مڑ گئے ..... میں پیچھے لپکی، مجھے ڈر لگتا تھا، کہیں وہ کچھ کر نہ لیں۔ مجھے دیکھ کر اُن کا رہا سہا قرار جواب دے گیا۔ "زمانہ خواہ کتنا ہی گزر جائے۔ مگر ہم ابھی اتنے بلند نہیں ہوئے کہ ایک مجبور اور بے بس لڑکی کو سہارا دے سکیں۔ ہمیں اپنی ناک اور دوسروں کے دانتوں کا ڈر لگا رہتا ہے۔"

"یہ کیسا ظلم ہے بھائی جان !" میں بھی ضبط نہ کرسکی۔

"اب میں کیا کروں ؟— !"

"بھائی جان، آپ ان سے نکاح کیوں نہیں کرلیتے۔"

"نکاح ؟" وہ بھونچکا ہوکر میری طرف دیکھنے لگے۔

"پھر کوئی کچھ نہ کہے گا۔"

لوگ کہتے ہیں کہ قیامت آسمان پر سے آتی ہے۔ مگر وہ قیامت جو بند دروازے کے پیچھے سے آئی ! خالہ بی نے جھپٹ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا — "بس کی گانٹھ۔"

"تم لوگ کیوں میرے گھر کا گھر وادا کرنے پر تلے ہوئے ہو۔" چچی جان آگ بگولا ہو گئیں۔ "یہ انگل بھر کی فتنی اپنے چھیتے بھائی کو سکھا رہی ہے نکاح کر لیجیے۔ منہ توڑ دوں گی۔ کالج میں آشنائیاں کرانا سیکھا ہے.... بن جا قاضی.... نکاح کر والے دیکھ.... ہائے میں مر کیوں نہیں گئی۔"

چچی جان کی دھاڑوں میں چچا جان کی گرج سنائی دی۔ "دُور ہو جاؤ میری آنکھوں کے آگے سے۔"

"ضرور ڈیڈی — مگر میں اکیلا نہیں جاؤں گا۔ میرے ساتھ کنیز بھی جائے گی!"

"اس کا ڈولا نکلے گا۔ ابھی اور اسی وقت —" چچی جان اُس کے کمرے کی طرف بھاگیں۔ اور جب تک ہم لوگ اُن کے پیچھے دوڑے اُنھوں نے کنیز کے بال جکڑ کر اُسے کئی ایک پٹخنیاں دے دی تھیں۔

"یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے؟" نافذ بھائی نے کنیز کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ کنیز سسک رہی تھی۔ نافذ بھائی بپھر گئے۔

خالہ بی نے آخر ایسے غصیلے ناگ کے لیے ایک منتر یاد ہی کر لیا۔

"میرا ڈرائیور گاؤں میں رہتا ہے۔ کئی بار وہ مجھ سے کسی لڑکی کے لیے کہہ چکا ہے۔ اگر اُس کے ساتھ راتوں رات کنیز کی شادی کر دی کسی کو خبر نہ لگے۔" چچی جان نے کہا۔

"تم مطمئن رہو۔"

ڈرائیور کی شکل میری نظروں میں گھوم گئی.... کتنی ڈراونی صورت تھی۔ پیشانی پر کسی چوٹ کا نشان تھا جو اُسے حد درجہ بھیانک بنا دیتا۔

نافذ بھائی اونچے خاندان کے بیٹے تھے۔ زندگی صرف اُنھی کی تھی۔ کنیز کی نہیں۔ دل صرف اُنھی کا دھڑکتا تھا۔ کنیز کے پہلو میں راکھ کا ڈھیر تھا اور ایک امیر کبیر ماں باپ کے چہیتے بیٹے کی فلاح کی خاطر کنیز ڈرائیور کی بھینٹ چڑھا دی گئی۔ اُسے تاکید کر دی گئی تھی وہ اُسے لے کر گاؤں چلا گیا۔

"تمھیں قسم ہے اپنے ماں باپ کی۔ جو تم نے نافذ سے کچھ کہا!" چچی جان نے میرے پاؤں پکڑ لیے۔ اور میں رو پڑی، اُن کی سنگدلی پر۔ صبح کو منہ لٹکائے خالہ بی نے خبر سنائی — "بھاگ گئی، موئی فاحشہ۔ اپنے کسی ہوتے سوتے کے ساتھ!"

"بھاگ گئی —!" نافذ بھائی کا خون سوکھ گیا۔

"میاں، میں کہتی ہی تھی۔ دو ٹکے کی اوقات کے منہ نہ لگو۔ مگر تم کہاں سننے والے تھے۔ یہ بھی تو تم نے نہ سوچا ہم سب تمھارے بھلے کی کہتے تھے۔"

نافذ بھائی کے دل پر بہت شدید چوٹ لگی تھی۔ انھیں تپ نے گھیر لیا۔ ہفتوں بستر پر پڑے ہذیان بکتے رہے۔ بخار کی شدت میں کنیز کو پکڑنے کے لیے اُٹھتے۔ اُسے رو رو کر پکارتے۔

"عشرت، بتاؤ — کنیز کہاں گئی؟" جیسے اُنھیں یقین ہو کنیز بھاگ نہیں سکتی تھی۔ اور بدنصیب عشرت کے منہ پر ماں باپ کی قسم تالے ڈال دیتی — "میں تمھارے ہاتھ جوڑتا ہوں، تمھارے پاؤں پڑتا ہوں۔ بتاؤ کنیز کہاں گئی؟" وہ اب کسی بچے کی طرح روتے تھے۔

مجھے ان سب سے نفرت تھی۔ وہ ظالم اور نامہربان تھے۔ ایک کی زندگی بنانے کی خاطر دوسرے کی اجاڑ دیتے تھے۔ جو کسی کے لیے ایثار نہیں کر سکتے تھے۔ جو تفریحاً زندگیوں سے کھیلتے تھے۔

میرے دل سے اُس کی یاد نہ نکل سکی.... وہ بھائی جان کو کتنا چاہتی تھی۔ ہنسنا رونا... آشنا نہ آشنا... اس کے پاس ان چیزوں کے سوا اور تھا ہی کیا۔ جسے یقین تھا، وہ بھائی جان کی ہو جائے گی..... مگر افلاس اور بے بسی کتنی ہولناک چیزیں ہوتی ہیں۔

بھائی جان رات کے سناٹے میں مجھے اپنے پاس بٹھائے آنسو بھری آواز میں کہتے۔ "وہ بھاگ نہیں سکتی۔ اُس نے اس زندگی سے گھبرا کر موت کے دامن میں پناہ لی ہوگی۔ وہ ڈرتی تھی۔ روتی تھی۔ اُس کے ساتھ کسی نے اچھا سلوک نہیں کیا.... میں بھی اُسے کچھ نہ دے سکا عشرت.... کیا اس نے تم سے بھی کچھ نہیں کہا۔؟"

"نہیں بھائی جان۔" میں کہتی اور میرا دل چلّا چلّا کر رو پڑتا۔

چچی جان نے سکھ کی سانس لی۔ کیسی عجیب ماتا تھی جو اپنی محبت کے اسٹیج پر کسی دوسرے کی محبت کا وجود برداشت ہی نہ کر سکتی تھی۔

اور پھر جس سہ پہر کو بھائی جان کی بارات بڑی دھوم دھام سے صوبیدار صاحب کے گھر جا رہی تھی۔ میں الگ تھلگ کھڑی سوچ رہی تھی۔ ایک دیا جل رہا ہے۔ ایک بجھ گیا۔ مرد کتنی جلدی بہل جاتے ہیں....! میرے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"خالہ بی مجھے اُداس دیکھ کر چونک پڑیں۔ "تم ساتھ نہیں جا رہیں۔؟"

"مجھے کندھا دینا نہیں آتا!"

"کیا بکتی ہے۔ لڑکی۔"

"یہ بارات نہیں ہے۔ کنیز کی محبت کا جنازہ ہے.... آپ نے اچھا نہیں کیا۔ خالہ بی۔ کنیز کی بربادی کی ذمہ دار آپ ہیں۔"

"بڑھ بڑھ کے نہ بول لڑکی۔ یہ کیا سودا اُچھلا ہے؛ اُسے بھگا نہ دیتی تو کیا اپنے خاندان میں میل کراتی۔ ہمارا گھرانا ہے۔ وقار ہے تمھاری بہنیں ہیں تم ہو۔ کنیز اس گھر میں مل جاتی تو پھر کون سے راجے مہاراجے تمھارے لیے پیام بھیجتے۔ انا کی بیٹی بہو بن سکتی ہے گر سودا سلف لانے والا گھر کا داماد نہیں بن سکتا۔ تم لوگوں نے عقل کہاں بیچ کھائی۔ خاندان کی آن بہت بڑی چیز ہے!"

"بہت بڑی چیز۔" میں نے جل کر کہا۔ "اس کی خاطر ایک لڑکی کو آوارہ بنایا جاتا ہے۔ ایک ہستی کو جیتے جی دوزخ میں دھکیل دیا جاتا ہے۔ جیسی کنیز تباہ ہوئی ہے، خدا کرے کہ سب تباہ ہو جائیں!"

"میں تھپڑ مار دوں گی۔"

"وہ میری بہن تھی۔" میرے آنسو چھلک آئے۔

بارات چلی گئی۔ رات کے اندھیرے دُھندلکے میں مجھے نور کی دھلی مورت دکھائی دے رہی تھی۔ جس کی لمبی لمبی پلکوں پر ان گنت ستارے جھلملا رہے تھے۔ ننھے منّے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ جو ڈرائیور کی بھیانک آغوش سے نکلنے کے لیے زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑا رہی تھی۔

"عشرت بی بی، میں کیا کروں؟"

"عشرت بی بی، میں کدھر جاؤں۔"

میں پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

دوسرے دن بھاری دعوت تھی؛ مگر اب میرا جی گھبرا رہا تھا۔ نافذ بھائی کی معصومیت اور بچپن سے چڑ ہو رہی تھی۔؛ ٹرنک میں کپڑے رکھتے دیکھ کر اُنھوں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

کہاں۔؟!

"مجھے جانے دیجیے۔ امی یاد آتی ہیں۔!"

اور وہ روکتے رہے۔ لیکن میں امّی کے پاس چلی گئی۔

[illegible] یادیں کسی دھاسا کی طرح بہادیں! تھوڑے دنوں مجھے کنیز کا ملال رہا۔ پھر میں اپنی مصروفیات میں اُسے بھی بھول گئی۔

شاید ایک سال بعد مجھے سروس کے سلسلے میں کلکتہ جانا پڑا۔ خالہ بی سے ملنے کا تو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ لیکن امی کی ہدایت تھی میں اُنھی کے ہاں ٹھہروں۔ اسٹیشن پر میں نے ٹیکسی لی۔ دفعتہً مجھے کچھ شبہ سا ہوا۔ وہ چہرہ جانا پہچانا سا لگ رہا تھا! ڈرائیور مجھے دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔

"بی بی جی — آپ؟"

"وہ خالہ بی کا ڈرائیور ہی تھا۔

"کنیز کیسی ہے؟" بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

"بہت اچھی ہے۔" رحمٰن کی ہنسی نکلی پڑ رہی تھی۔ "بیگم صاحبہ نے خزانہ دے دیا سرکار! ایسا بھاگوان قدم ہے کہ میرا گھر جنت بن گیا۔ اب میں بیگم صاحب کے یہاں نہیں ہوں۔ اپنی الگ کار خرید لی ہے۔ وہی چلتی ہے۔ آپ کو کہاں لے چلوں؟"

"اپنے گھر —!"

"اپنے گھر؟" وہ متحیر رہ گیا

"ہاں!" میں نے سوٹ کیس اندر رکھا۔ پھر خود بھی بیٹھ گئی۔ "پہلے میں کنیز سے ملوں گی۔"

وہ مجھے گھر لے گیا۔ سامنے ہی کنیز کھڑی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ دوڑی اور مجھ سے لپٹ گئی۔ پھر اُس کے لبوں سے سوائے میرے نام کے اور آنکھوں سے سوائے آنسوؤں کے اور کچھ نہ نکلا۔

میری نگاہوں میں منہدم اور مسمار تاج محل گھومنے لگا۔ محبت کا کھنڈر بھی کتنا حسین ہوتا ہے۔ اُس کی آنکھوں میں پڑے اپنے دُکھ کی ٹیسیں ابھی تک اُبھری ہوئی تھیں۔ میرے دل پر کسی نے پتھر رکھ دیا۔

رحمان میری خاطر میں بچھا جا رہا تھا۔ وہ ضیافت کا سامان لینے کے لیے باہر بھاگا۔ "جب تک تم چائے بناؤ۔ میں سرکار کے لیے کچھ لے آؤں۔"

"کنیز بہن تم —" میں اُس سے کیا کہتی۔

"چائے پی لیجیے۔ بی بی۔" وہ آنسو پونچھتی ہوئی بولی۔ "کہاں میرا جھونپڑا، کہاں آپ کے قدم۔ آج میں نے کس کا منہ دیکھا تھا، آپ کے درشن ہوئے۔ آپ کے یہاں سب اچھے تو ہیں۔ عشرت بی بی؟"

اُس کی ہمت نہ پڑی۔ وہ کسی اور کا نام بھی لیتی۔ میں نے سر ہلا دیا۔ وہ خاموشی سے چولھا جلانے لگی۔ اس کے ہونٹوں پر نہ اپنی بربادی کا ماتم تھا۔ نہ ہمارے سلوک کا نوحہ۔ شاید تقدیر پر قانع ہو چکی تھی۔

میں اُسے دیکھ رہی تھی۔ محلوں میں روشنی پھیلانے والا حسین فانوس بے ہنگم سے جھونپڑے میں چپکے چپکے جل رہا تھا۔ دفعتہً پلنگ پر رکھا ہوا گودڑ کلبلایا۔ اور ننھے منے چار ہاتھ پاؤں باہر اُچھلے۔ اُس نے اپنے بچے کو جھپٹ کر اُٹھا لیا۔ اور شرمائی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ "بہت پیارا بچہ ہے۔ کیا نام رکھا اس کا؟" میں نے بچے کا نرم نرم گال چٹکی میں دبا لیا۔ یک بیک اُس کی حالت عجیب ہو گئی۔ وہ ہنس بھی رہی تھی۔ رو بھی رہی تھی۔ پھر اُس نے مدھم سے گلوگیر لہجے میں کہا۔ "اس کا نام ..... اس کا نام نافذ حسین ہے۔ عشرت بی بی!"

اور ننھے کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں بھینچ کر اُس کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیے — !!!

— — —

رفعت کامران سرگودھا

ولایتی پتھر

گھر میں بیری ہو تو پتھر آتے ہی ہیں۔ اب تو یہ مالکن کی مرضی ہے کہ اُٹھا کر آنگن کے کونے میں ڈھیر کر دے یا بھنگن کے ٹوکرے میں ڈال دے۔ مگر سلطانہ کی اماں کا دستور ہی نرالا تھا۔ وہ ہر نئے آنے والے پتھر کو جھولی میں ڈال محلّے میں نکل جاتی اور جیسے چھاج میں ڈال کر پھٹک آتی۔

"اے بوا، یہ بھی دن آنے تھے اپنی سلطانہ کے لیے قدیر کی ماں نے پیغام بھیجا ہے۔ اور سنو، دس جماعت پڑھ کر بجلی کے محکمہ میں گھر گھر جا کر میٹر دیکھتے۔ یہ کیا نوکر ہوا۔ مجھے کہتی ہے لاٹ صاحب کے دفتر میں افسر لگ گیا ہے..... میں تو سلطانہ کو دس کے بعد کالج پڑھانے کا سوچ رہی ہوں۔ ہاں ــــ!

اے خالہ! سنتا تو، یہ اسلم کی بہن کی کیسے ہمت پڑی..... میں کہوں لوگ اپنی اوقات نہیں دیکھتے۔ میں بارھویں میں پڑھتی لڑکی اس کے بھائی اسلم کے ساتھ بیاہ دوں ــــ توبہ! ــــ اے ہے تو موا دوکاندار ہی ــــ اب دوکاندار کیا جانیں پڑھی لکھی بیوی سے پیار بھی کیسے کرتے ہیں۔......"

لو، اور سنو بہن! بچو نرگی آئی تھی، گھر والوں ہی نے کہلوایا ہوگا۔ کہتی تھی اعجاز کا بی۔اے کا آخری سال ہے۔ پھر اسکول ماسٹری میں سال بھر لگائے گا۔ اور سنا ہے ایم۔اے بھی کرے گا۔ میری ماں تو لڑکے پہ ہاتھ رکھ لے۔ لاکھوں میں ایک ہے۔..... میں نے جواب دیا۔ کیا باتیں کرتی ہے میری بیٹی۔ تو خود بی۔اے کر رہی ہے۔ اگلے برس ڈگری لے لے گی۔ اُس کے لیے ایسے ایسے ہزاروں..... اے میں کہوں۔ اسکول ماسٹر۔ کما ہی کتنا لیتے ہیں۔ سدا سر کھپائی اور پلاّ خالی کا خالی۔..... میں تو اونچا گھر دیکھ کر بیٹی دوں گی...... اب خود تو سلطانہ ہنڈیا چولھا کرنے سے رہی۔ شیخ حامد کی بیوی کا خیال تھا، میں اُس کے چھوٹے بیٹے قاسم سے کردوں ــــ مگر اُن کے گھر کا دستور مجھے نہیں بھاتا ــــ ہنڈیا روٹی خود کرتی ہیں لڑکیاں دُلہنیں ــــ نوکر تو برتن جھاڑو کے لیے رکھتی ہیں۔ میری سلطانہ تو چولھا جھونکنے سے رہی ــــ .....!" اور یوں آنے والے رشتوں کے ساتھ ساتھ سلطانہ اور اُس کی ماں کے اونچے طور طریقے بھی لوگوں پر عیاں ہوتے رہے۔

سلطانہ کا باپ خود بھی اونچی پوسٹ یا اعلیٰ حیثیت کا فرد نہیں تھا۔ لکڑی کے کھلونے اور کھیلوں کے سامان بنانے والی

ب اوسط درجہ فرم کا کمیشن ایجنٹ ہی تھا۔ ہاں، یہ خوش نصیبی ضرور تھی کہ خاندانی منصوبہ بندی کے دَور سے بھی قبل قدرت نے
ہی ترس کھا کر صرف تین ہی بچوں سے نوازا تھا۔ سلطانہ پہلوٹھی کی تھی۔ بعد میں دو لڑکے تھے۔۔۔۔ سلطانہ تو پڑھتی رہی۔ مگر بڑے
کے اکرم نے دسویں کے بعد ریلوے کے محکمہ میں نوکری کرلی۔۔۔۔۔ اب تو اماں اُس کے بارے میں یہ بھی کہتی تھی کہ وہ بڑا اچھا اسٹیشن ماسٹر
، درجہ اول کا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ وہ بڑے اسٹیشنوں پر نہیں لگتا۔ ہر وقت بڑے افسروں کا خوف سر پہ۔ خود ہی چھوٹے چھوٹے
یشنوں پہ کام کرتا ہے کہ اکیلا اکیلا رہے۔ اپنا افسر آپ ہی۔۔۔۔ اور اُس سے چھوٹا تو ابھی مڈل کے درجوں کو عبور کر رہا تھا۔۔۔ گھر کا
یار کچھ ایسا نہ تھا کہ ظاہری ساکھ رکھنے کو جا و بے جا خرچ کر کے اپنی سفید پوشی کا بھرم رکھا جاتا۔ بلکہ جو کچھ بھی کمائی گھر آتی اُسے گھر
خرچ کرنے کے علاوہ سلطانہ کے جہیز کے مد میں لگا دیا جاتا۔۔۔۔ سلطانہ اُن لڑکیوں میں سے تھی جو اَن پڑھ ماؤں کو کالج کے نامعلوم خرچوں
نام غلط انگلش میں سنا سنا کر پیسہ بٹور کر کالج کینٹین کا بل چکاتی ہیں۔ یا اپنے فیشنوں پر خرچ کرتی ہیں۔ اور اپنے پاس سے تحفے دے کر
کیوں سے اپنی تعریف کرواتی ہیں۔

گھر میں اماں سلطانہ کو دیکھ دیکھ کر جس قدر احساس برتری سے تنی رہتی۔ کالج میں سلطانہ اونچے گھروں کی لڑکیوں کو دیکھ دیکھ
اُس سے بھی زیادہ احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتی۔ اور پھر اُن سے انتقام لینے کو، اُنھی کا فیشن اور اسٹائل اپناتی۔ اسی لیے
ں کو یقین تھا کہ کالج میں اس کے ساتھ اونچے گھرانوں میں پڑھنے والی لڑکیاں اُسے ضرور اپنے کسی آفیسر بھائی یا عزیز کے لیے پسند
کے بیاہ لے جائیں گی۔۔۔۔۔ اب وہ نادان کیا جانے کہ احساس کمتری میں مبتلا لڑکیوں کو اونچے گھرانے کی لڑکیاں اپنے معیار کے راستے
ڈال کے اُن پر "دیٹ" پر جانے کے چور دروازے تو کھول سکتی ہیں۔ مگر بنگلوں میں رہنے والی تقدیر نہیں بخش سکتیں۔

یوں یہ بھی غنیمت کہ احساس کمتری میں مبتلا ہو کر انتقاماً اُس نے کبھی اِن اونچے گھروں کی کاروں، اسکوٹروں اور ٹیکسیوں پر اعتماد
ا نہ کیا۔ ہر بار دامن بچا کر اونچے گھر کے تصور کو اور بھی مضبوط کر لیا۔۔۔۔۔

بیری پہ بھی پتھر جبھی آتے ہیں کہ کھٹے میٹھے بیروں سے لدی رہے۔ جہاں پت جھڑ کا موسم آیا پتھر خود بخود ہی راہ بھول گئے۔
بھی کسی نیچے کی پتنگ اٹک گئی، یا شریر لڑکوں نے زخمی پرندوں کو چھدرے پتوں کی پناہ میں بیٹھا دیکھا تو دھاگا بندھی گاٹیاں چلا دیں۔
لطانہ پر بھی بین بین یہی عالم تھا کہ ایک پتھر جیسے ریشم میں لپیٹ کر آن پڑا۔

کہنے والی کا کہنا تھا کہ لڑکا انجنیئری کی تعلیم پوری کرنے انگلینڈ گیا ہوا ہے اور چاہتا ہے کہ وہاں کی بد اخلاقی سے دامن بچانے
اپنی پاکستانی لڑکی بیاہ کر لے جائے۔۔۔۔ جو تعلیم یافتہ بھی ہو اور شریف بھی۔ تاکہ ولایت کے گندے ماحول میں اسے مشرقی ماحول اور سکون
ں سکے۔۔۔۔۔۔۔

ولایت! اللہ کس قدر حسن ہے اس لفظ میں، غلام طبقہ ہنوز اسی حسن پر مرتا ہے۔ اسی کا دلدادہ ہے۔ لڑکا تو ملکی ہے مگر گیا
وا تو آقاؤں کے دیس ہے ناں۔۔۔۔ ڈگری کیسی۔؟ کہاں کی پڑچول پرکھ۔ اے انگریزوں کے ملک کوئی ایسا ویسا نالائق تو جا نہیں
سکتا۔ سنا ہے ولایت میں اُس کے پاس کار ہے۔ گھر کی تصویریں بھیجتا ہے۔ اپنے کمرے میں ٹیلیفون ہے۔ ریڈیو ہے۔ اتنا بڑا۔۔۔۔ کیا
سلیقے سے رہتے ہیں لوگ وہاں۔۔۔۔۔ سلطانہ کے لیے ایسے ہی اونچے معیار کی تو تلاش تھی۔ فوراً ہی "ہاں" کر دی گئی۔ کیونکہ اگلے ماہ ہی
لڑکا تین ماہ کے لیے پاکستان آرہا تھا۔ اور دلہن ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔۔۔۔۔ پاسپورٹ اور ویزا کے لیے ابھی سے تیاری شروع
ہو گئی اور جہیز کی فہرست تیار ہونے لگی۔ داماد ولایت میں رہتا ہے۔ جہیز بھی تو شایانِ شان ہونا چاہیے ناں۔
لڑکے والوں کا گھر بھی اوسط درجے کا تھا۔ یوں گھر میں ولایت سے لڑکے کا بھیجا ہوا ٹرانزسٹر، کوکر، ہیٹر، استری اور ریشم ضرور تھا۔

مگر گھر کے صرف دو کمرے تھے اور وہ بھی تیسرے درجے کے سامان سے اٹے ہوئے۔ گندی دیواروں نیچی نیچی چھتوں
..... ایسے گھر کا لڑکا ولایت انجنیری کرنے گیا ہے — بڑا ہی ہونہار ہوگا — پھر میری بیٹی کو کہاں اس جھونپڑے میں رہنا
ہے — وہ تو ولایت جائے گی ....

اب میں پاکستان میں کہاں کردیتی — اس اسکول ماسٹر سے ...... زندگی بھر بچوں کو سبق دیتے دیتے خود زندگی گزارنے
سبق بھول جاتا — مر کر بھی کار نہیں خرید سکتا تھا۔ ..... اور وہ دوکاندار، ہر گاہک سے بول بول کے اپنی بولی ہی بھول گیا ہے۔
ایسے بولتا ہے کہ گھن آنے لگتی ہے اس سے ..... اور وہ ......

اب سلطانہ کی اماں کو ہر پاکستانی لڑکے میں کچھ نہ کچھ نقص وافر ہی نظر آنے لگا تھا۔ بیٹی سے زیادہ ولایت کا نشہ ماں
چڑھ گیا تھا۔

سرخ رنگ کے گوٹا لگے جال والے دوپٹے کو ایک طرف کرکے نوٹوں کے ہار گلے میں ڈالے ڈھیلے ڈھالے سیاہ سوٹ
ں ملبوس جب دولہا خاص ادا سے عروسی گھوڑے سے سسرال کی دہلیز پہ اُترا تو جھروکے سے دیکھتی سلطانہ نامعلوم خوف سے
نپ اُٹھی .... یہ کون سی ولایت سے آیا ہے کہ اسے یہ بھی نہیں پتا پتلون کی موری سولہ انچ ہوگئی ہے پاکستان کے اونچے طبقے
ں — اور پائنچے سیدھے ہوتے ہیں اُلٹے ہوئے نہیں — اُس کی سہیلی نے تھیلا ایسی پتلون کا مذاق کیا۔

اور یہ نوٹوں کے ہار — کس اکھاڑے سے آرہا ہے — توبہ — کالج کی سہیلیوں نے قہقہے پہ قہقہہ لگایا۔ اور سلطانہ
کا جسم کانپتا ہی رہا۔ ......

"یہ ہوتے ہیں شریف بچے، ولایت میں پڑھتا ہے۔ مگر ماں باپ کا کہنا نہیں موڑا۔ بہنوں نے باگ پکڑائی لینا تھی — تو
گھوڑے پر بٹھایا — تو خوشی سے بیٹھ گیا۔ بھاوج نے سرمہ لگاکر دوپٹہ اُڑھایا تو انکار نہیں کیا۔ دوستوں نے نوٹوں کے ہار
پہنائے تو بولا نہیں ..... اور دیکھ لو فیشن اُلٹے سیدھے نہیں کرتا — کیا شریف لباس پہنا ہے، کھلا کھلا سوٹ .... اپنے باپ دادا ایسا۔
یہ آج کل کے چار جماعت پڑھ کر فیشن میں دس قدم آگے رکھنے والے لونڈوں کی طرح ٹانگوں میں پھنسی رانوں میں اُلجھی پتلون نہیں پہنی
.. ہاں — سلطانہ کی اماں نے داماد کی طرفداری کرکے اس کا بھرم رکھ ہی لیا۔ ....

اپنے دولہا کے عامیانہ مذاقوں اور تیسرے درجے کے لوگوں والی حرکتوں سے پریشان سا ہوکر سلطانہ نے آخر ولایت
کی بات پلٹنے کے لیے پوچھا۔ " وہاں آپ کا کورس کتنا باقی ہے —؟ انجنیری کرکے وہاں ہی کچھ عرصہ سروس کرنے کا خیال ہے یا
فوراً پاکستان آجائیں گے آپ —؟"

"کورس .... ؟ وہ پان آلود دانت نکال کر ہنس دیا — "کورس کیسا ؟ ہم تو وہاں فیکٹری میں لیبر ہے۔ یہاں سے گئے
دس جماعت پڑھے لڑکوں کو تو وہاں جاکر ماشین کے ساتھ ماشین کے مافک ورک کرنا پڑتا ہے تو پھر پونڈ کی شکل دیکھتے ہیں ..."

"ہم وہاں پونڈ جمع کرکے پاکستان آئے گا — اِدھر آکے بزنس کریگا۔ یا کوئی دوکان لے لے گا۔ تھوک کی .... تم اُدھر جاکر
کسی شاپ پہ سیلز گرل کا جاب لے لے گا۔ ویسے تو اُدھر ہوٹل میں برتن دھونے۔ فیکٹری میں استری کرنے یا نرسری میں بچوں کی دیکھ
بھال کا جاب بڑی آسانی سے مل جاتا ہے۔ تم پارٹ ٹائم جاب لے لینا — ہم دونوں خوب کمائیں گے .... ولایت میں میاں بیوی

بچہ سب خود کماتا ہے ..... ہمارے ملک کی طرح نہیں۔ عورتوں کو گھر سے نہ نکلنے دیں۔ اور چولہے میں ساری عمر جلا دیں — وہاں سارا باہر کا کام ہے۔ ایک دم فس کلاس .....

سلطانہ کو یوں لگا جیسے پاکستان اور ولایت کی سرحد پر آ کر اُس کے جہاز کو آگ لگ گئی ہے۔ پاکستانی پھولوں کی مہک اُس میں جل گئی۔ جہاز کی آگ میں تپتا ہوا ولایتی پتھر اُس کی روح تک کو جھلسا رہا ہے — !

اُردو کے مایہ ناز شاعر عبدالعزیز خالد کی

تخلیقات

سرودِ رفتہ	یونان قدیم کی شاعرہ سیفو کے نغمے	چار روپے
غزل الغزلات	عہد نامہ عتیق کا نغمہ سلیمان	ایک روپیہ ۷۵ پیسے
دکانِ شیشہ گر	منظوم ڈرامے۔ دوسرا ایڈیشن۔ آفسٹ	پانچ روپے
برگِ خزاں	" " دوسرا ایڈیشن۔ آفسٹ	چھ روپے
ورقِ ناخواندہ	" "	تین روپے
سلومی	دوسرا ایڈیشن مع اضافہ ترگوم	۳/۵۰ روپے
گلِ نغمہ	ٹیگور کی گیتانجلی	چار روپے
زنجیرِ رمِ آہو	طویل مختصر نظمیں۔ دوسرا ایڈیشن۔ آفسٹ	پانچ روپے
کلکِ موج	نظمیں، غزلیں	۷/۵۰ روپے
کفِ دریا	نئی غزلیں۔ آفسٹ	۷ روپے
فارقلیط	(آدم جی انعام یافتہ) نام ختم رسل انجیل میں ہے فارقلیط۔ ذکر و فکر رسولؐ۔	۸ روپے
دشتِ شام	نئی نظمیں۔ آفسٹ	۵ روپے
ماتمِ یک شہرِ آرزو	نوحے (نیا ایڈیشن) (زیر طبع)	
زرِ داغِ دل	طویل نظمیں " "	

مُشتاق بک ڈپو۔ کراچی ۱

گھر کا آدمی

میرا تبادلہ الہٰ آباد ہوا تو مجھے کچھ عرصہ کے لیے اپنے دوست شرما صاحب کے ہاں رہنا پڑا۔ ایک مکان کرایہ پر تو مل گیا تھا۔ اور شرما صاحب یقیناً وقت پہ کام آنے والے دوستوں میں سے تھے۔ انھوں نے خود ہی مکان ملنے تک مجھے اپنے ہاں ٹھہرنے کی پیش کش کی تھی۔ اتفاق کی بات کہ میں ان کو اپنے پہنچنے کی صحیح تاریخ اور گاڑی کے وقت سے مطلع نہ کر سکا۔ ایک روز صبح پانچ بجے مع بیوی بچوں کے اُن کے ہاں جا پہنچا۔ شرما صاحب صبح دیر تک سوتے رہنے کے عادی ہیں۔ مجھے دو تین آوازیں دینا پڑیں۔ جب کہیں دروازہ کھلا۔! اور پھر مجھے "ہیلو" اور میری بیوی کو "نمستے" کہنے کے بعد وہ میرے ساتھ رکشا سے سامان اتروانے لگے۔ ٹرالسفر کا سامان تھا۔ دو رکشا لدے ہوئے تھے۔ میں نے غیر ارادی طور پہ اِدھر اُدھر دیکھا کہ کہیں اُن کا نوکر نظر آ جائے۔ تو وہ بھی مدد کرے۔ لیکن نوکر کہاں تھا۔ ہم دونوں ہی نے سامان اُتارا۔ اور مسز شرما کی ہدایت سے ایک کمرے میں لگا دیا۔

شرما صاحب دبلے پتلے، لمبے قد کے انسان ہیں۔ شکل و صورت بھی دلکش ہے۔ اور خوش مذاق بھی ہیں۔ سامان بھی اتارتے جاتے تھے اور کوئی نہ کوئی فقرہ بھی چست کرتے جاتے تھے۔ اور مجھے اور میری بیوی کو خوب ہنسا رہے تھے۔ اس کے برخلاف ان کی شریمتی جی خاموش تھیں۔ اُن کے لیے شرما صاحب کی باتیں روزمرہ کی باتیں تھیں۔ اور ویسے بھی مسز شرما ایک سنجیدہ عورت ہیں۔ درمیانہ قد بھاری جسم، گول چہرے اور سانولے رنگ کی مسز شرما!

سامان قاعدے سے لگ چکا تھا۔ اور اس وقت میری بیوی بے بی کو گود میں لیے مسز شرما کے پاس رسوئی میں بیٹھی تھی۔ اور میں شرما صاحب کے ساتھ باہر صحن میں پڑی چارپائی پر بیٹھا اُن کے چٹکلوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اچانک مجھے ایک مضبوط جسم اور گورے رنگ کا لڑکا ربڑ کے جوتے، سفید قمیص اور خاکی نیکر پہنے اندر داخل ہوتا دکھائی دیا۔ مجھے دیکھ کر اُس نے ہاتھ جوڑ کر نمستے کی اور پھر سیدھا اندر بڑھتا چلا گیا۔ میری سوالیہ نگاہوں کے جواب میں شرما صاحب مسکرائے۔

"یہ دھرم دت ہے — اپنا نوکر۔ سیر کر کے لوٹ کے آ رہا ہے۔"

میں نے حیرت سے اُس لڑکے کی طرف دیکھا۔ اور پھر تمسخر آمیز نگاہیں شرما صاحب کی طرف پھیر دیں۔

نوکر — اور سیر؟ ٹھاٹ ہیں بھئی — لیکن الفاظ میرے منہ میں ہی رہ گئے۔

شرما صاحب نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

بھی اپنے رام تو سیر پر جا نہیں سکتے ۔ یہ ہمارا نوکر ہمارا یہ کام بھی کر دیتا ہے ۔ ہی ہی ہی ہی !
لیکن مجھے شرما صاحب کے قہقہے میں ان کی بے وقوفی نظر آئی ۔ اتنے بھاری ٹرنک ہم دونوں نے رکشا سے اتارے
اندر رکھے تھے ۔ ہمارے ہاتھوں میں لاسے پڑ گئے تھے ۔ شرما صاحب خود ایک ٹرنک کے بوجھ سے دُہرے ہو گئے تھے ۔

میں نے سوچا تھا ۔ عجیب ہیں یہ شرما صاحب بھی ۔ اچھی بھلی تنخواہ پاتے ہیں ۔ لیکن نوکر نہیں رکھا ۔ مجھے کیا معلوم کہ
نوکر کو صبح سویرے سیر پر جانے کی اجازت دے رکھی ہے ! اور اس بدمعاش کو تو دیکھو ۔ کس شان سے صبح سویرے گھوم
ہے جیسے نوکری کرنے نہ آیا ہو ۔ نوکر ہو کر مالکوں جیسی باتیں ۔ ! ۔ آخر کچھ تو فرق ہونا چاہیئے نوکر اور مالک میں ۔ اونہہ !
بنا رہا ہے ، اِن لوگوں کو ۔ اتنے اچھے اچھے کپڑے پہنتا ہے تو انھیں پونا بھی خوب لگاتا ہو گا ۔

اور دھرم دت کے لیے میرے دل میں غصّہ ، نفرت ، جلن اور شک ایک ساتھ اُبھر آئے ! دھرم دت اس وقت
میں پڑی ہوئی چارپائیوں پر سے بستر اکٹھے کر رہا تھا ۔ میرے ان جذبات سے بے خبر !

دھرم دت پہاڑی تھا ۔ الموڑہ کی طرف کا رہنے والا ۔ شرما صاحب کے پاس کام کرتے اُسے پانچ برس ہو رہے تھے ۔
بارہ روپیہ ماہوار اور کھانے پر ۔ اور اس وقت پچیس روپیہ ماہوار اور کھانا لے رہا تھا ۔ بقول شرما صاحب اُس نے اپنی تنخوا
سے ہر ماہ تھوڑا بچا کر ایک سکینڈ ہینڈ رکشا بھی خرید لیا تھا ۔ اور اس وقت پچاس روپے ماہوار اس سے اس کی آمدنی تھی ۔ گھر میں
ماں کو بھی ہر ماہ بیس پچیس روپیہ بھیجتا تھا ۔ خود بھی اچھے اور صاف ستھرے کپڑے پہنتا تھا ۔ آیا تھا تو بالکل گنوار تھا ۔ لیکن اب تو منی
بھی خود کر لیتا تھا ۔ دو سال سے محلّہ میں رہنے والے ایک پرائمری اسکول کے ٹیچر سے ہندی سیکھ رہا تھا ۔ اور اُسے چار روپے ماہوار
فیس دیتا ۔ لیکن جو بات مجھے سب سے زیادہ کھٹکتی تھی وہ تھا اُس کا اپنا کچھ کام ایک اور نوکر سے کرا لینا دور کے رشتہ کی ایک بڑھیا کو
جیب سے آٹھ روپے دیتا تھا ۔ اور وہ شرما صاحب کے گھر کے برتن مانجھتی تھی ۔ کپڑے دھوتی تھی ۔ اور گھر میں جھاڑو لگاتی تھی ۔ اور وہ خو
پکاتا تھا ۔ بچوں کو اسکول کے لیے تیار کرتا تھا ۔ اور گھر کے دوسرے کام کرتا تھا ۔ سب صاف ستھرے کام ! یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اُس
اپنے ماتحت ایک اور نوکر رکھ لیا تھا ۔

اُس کے ڈھیلے پاجامے اور قمیص کو دیکھ کر یا کالے رنگ کی جیکٹ اور چمک دار چپل کو دیکھ کر یا بچوں پر اُس کے اختیارات
دیکھ کر کوئی بھی یہ نہیں سوچ سکتا تھا کہ وہ محض ایک نوکر ہے ۔ وہ ہر لحاظ سے اُسی کنبہ کا ایک فرد معلوم ہوتا تھا ۔ اور مسز شرما تو جیسے ا
اپنا بیٹا سمجھتی لگتی تھی ۔

"بیٹا دھرم دت ! آج شام بچوں کو نہرو پارک لے جانا ۔"

"دھرم دت بیٹا ! یہ لو ، یہ دو سو روپے ۔ بمبئی کلاتھ ہاؤس والوں کا بل ادا کر آؤ ۔ !"

"ارے دھرم دت ! بیٹا ذرا میرے اٹیچی کیس میں سے پرس تو نکال لانا ۔ چابیوں کا گچھا اندر میز پر پڑا ہے ۔"

اور اُدھر دھرم دت بھی ان کو "ماں جی" کہہ کر مخاطب کرتا

"ماں جی ، آج سیر سے لوٹتے ہی کپڑے استری کر دوں گا ۔ آپ فکر کیوں کرتی ہیں ماں جی ۔"

"آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ماں جی ! آپ آرام کیجیے ۔ میں خود سب کام کر لوں گا ۔"

"ماں جی ، کہیے تو آج آلو کے پراٹھے بنا دوں ۔ شاب کو آلو کے پراٹھے بہت اچھے لگتے ہیں ۔"

لیکن جہاں تک شرما صاحب کا تعلق ہے ۔ اُن کو آج سے پانچ سال پہلے کے دھرم دت میں اور اس وقت کے دھرم دت میں

کوئی فرق ہی نظر نہ آتا تھا۔ دراصل اُنھوں نے اُس میں پیدا ہوتے ہوئے فرق کو سمجھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی تھی۔ یا تو وہ پہلے ہی دن سے اُسے گھر کا آدمی سمجھنے لگے تھے۔ اور یا پھر اب بھی اُسے نوکر ہی سمجھتے تھے۔ ان کی ڈکشنری میں نوکر اور گھر کے آدمی کے معنی ایک ہی تھے۔ اُس پر وہ رعب تو کچھ ڈال ہی نہ سکتے تھے۔ اور مجھے یہ سب دیکھ کر بڑی کوفت ہوتی۔ اس ماحول میں بھلا میں اُسے کسی ذاتی کام کے لیے کہنے کی ہمت بھی کیسے کر سکتا تھا۔ پولیس ڈپارٹمنٹ کی ملازمت مجھے اس کو تحکمانہ انداز میں مخاطب کرنے کے لیے اکساتی ضرور تھی لیکن الفاظ میری زبان تک آتے آتے نرم پڑ جاتے تھے۔

"بھئی دھرم دت! تمھیں تکلیف تو ہوگی۔ یہ ہمارا خط ڈاک میں ڈال آنا۔"

"نہیں بابو جی تکلیف کاہے کی۔"

اور میں اُس کا جواب سننے کے بعد اپنی چھوٹی چھوٹی مونچھوں پر تاؤ دینے لگتا۔ مجھے دھرم دت باہر سے سیدھا اور اندر سے چالاک نظر آتا۔

مجھے پتہ چلا تھا کہ اُس نے بنک میں بھی اپنا حساب کھول رکھا ہے۔ اور اس وقت تقریباً پچاس روپے اُس کے جمع ہیں۔ اور یہ جان کر مجھے عجیب سی جلن ہوئی تھی۔ اُس کے یہ پچاس روپے مجھے بنک میں اپنے پانچ سو روپے سے زیادہ نظر آئے۔ اگر اسی طرح روپیہ جمع کرتا رہا تو ایک دن نوکری ہی چھوڑ دے گا۔ اور اپنا کوئی دھندا کھول لے گا۔ پھر ہوش آئے گا ان لوگوں کو۔ اونہہ۔ اس طرح اسے آگے بڑھنے میں اور اونچا ہونے میں مدد کر رہے ہیں۔ جیسے وہ سچ مچ ان کا بیٹا ہو! بےوقوف کہیں کے۔

شرما صاحب اور مسز شرما کو ایک ایسے نوکر کی کہانی سنانے کے بعد کہ جس نے پہلے اپنے مالک پر اپنا خوب اعتبار جما لیا تھا۔ اور پھر موقع پاتے ہی ایک دن گھر کی صفائی کر کے چلتا بنا تھا۔ میں نے کہا۔ "بھئی شرما صاحب نیت بدلتے دیر نہیں لگتی۔ اور پھر نچلے طبقے کے لوگ تو بڑے چالاک ہوتے ہیں۔ وقت پر سب احسان بھول جاتے ہیں۔ آپ بھی ذرا محتاط رہا کیجیے!"

ان دونوں نے جیسے ٹس سے مس نہ ہونے کی ٹھان رکھی تھی۔ شرما صاحب بولے۔

"اجی ہم تو ہمیشہ محتاط رہتے ہیں۔ لیکن بھیرو پرشاد جی۔ آدمی آدمی میں فرق ہوتا ہے۔"

اور مسز شرما نے کہا۔

"میں تو جانتی ہوں، غریب آدمی دولت سے زیادہ محبت کا بھوکا ہوتا ہے۔"

اور ان دونوں کی باتیں سن کر مجھے غصہ آ گیا۔ جاؤ جہنم میں۔ ان لوگوں کو پتا اس وقت چلے گا جب وہ گھر کی صفائی کر کے چلتا بنے گا!

اپنی بیوی کو میں روزانہ تنبیہ کرتا رہتا کہ وہ اپنی چیزیں سنبھال کر رکھا کرے۔ دھرم دت کے ہاتھ سے بچی رہے۔ اگر ہماری کوئی چیز گم ہوگئی، تو ان حالات میں ہم دھرم دت پر شبہ کا اظہار بھی نہ کر سکیں گے۔ دھرم دت پر شک کو یہ لوگ اپنے اوپر شک سمجھ لیں گے۔ لیکن شانتی کو تو جیسے اس بات کا کبھی خیال ہی نہ تھا کہ یہ پرایا گھر ہے۔ وہ اپنی قیمتی چیزیں، پرس، گھڑی، زیور وغیرہ نہایت لاپروائی سے میز پر چھوڑ دیتی۔ جیسے اپنے ہی گھر میں بیٹھی ہو۔ اور مجھے ہر بار اُس کی لاپروائی سے رکھی ہوئی قیمتی چیز کو اُٹھا کر دیتے وقت اُسے ڈانٹنا پڑتا۔

تھوڑے ہی دن رہ گئے تھے ہمارے اُن کے ہاں ٹھہرنے میں۔ ان ہی دنوں تین دن کے لیے مجھے دورے پر جانا پڑا۔ جب واپس آیا تو مجھے مسز شرما کا منہ لٹکا ہوا نظر آیا۔ شرما صاحب کی بھی شگفتگی غائب تھی۔ میں کچھ حیران ہوا ہماری وجہ سے ان میں تبدیلی آگئی ہو۔

یہ بات تو ہو نہیں سکتی۔ کیونکہ شرما صاحب اور اُن کی مسنر اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ اب ہم آٹھ دس روز اور رہیں گے۔ مکان ملتے ہی والا شانتی سے مسز شرما کی کوئی جھڑپ ہوگئی ہو! یہ بھی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ شانتی نہایت معصوم عورت ہے۔ زیادہ پڑھی لکھی نہیں اس دبی دبی سی رہتی ہے۔ پچھلے ڈیڑھ ماہ کے قیام کے دَوران اُس نے مسز شرما کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ مسز شرما کے لیے کئی میز پو تکیہ کے غلاف اور چادریں وغیرہ بنا دی ہیں۔ اور بچوں میں لڑائی کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا کیونکہ میرے اور اُس کے بچوں کی عمروں فرق ہے ــ تو پھر کیا وجہ ہو سکتی ہے!

جب تک میں اُن کے درمیان بیٹھا رہا، یہی سوچتا رہا۔ اور پھر میں وہاں سے اُٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ تاکہ شانتی سے لوگوں میں اچانک تبدیلی کی وجہ معلوم کروں۔ اُس نے بتایا

"دھرم دت چلا گیا ہے!"

"اچھا ـــ!"

مجھے حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ میں نے دَورے سے واپس آنے کے بعد دھرم دت کے متعلق ابھی تک نہیں سوچا تھا۔ جانے وہ میرے دماغ سے نکل کیوں گیا تھا! ــــ حالانکہ اس سے بیشتر ہر وقت میرے اعصاب پر سوار رہتا تھا۔ "چلا گیا ـــ چلو اچھا ہوا ـــ لیکن اس میں اُداس ہونے کی کیا بات ہے ـــ؟"

مجھے شرما اور مسز شرما کی بے وقوفی پر ہنسی آ گئی۔

"ارے ہاں شانتی، مسز شرما کا تو وہ بیٹا تھا نا؟"

میں نے طنزاً مسکراتے ہوئے کہا۔ لیکن شانتی نے کوئی نوٹس نہ لیا۔ شانتی کو اس وقت اپنی بات سنانے کی پڑی تھی۔ اُس نے پھر سرگوشی کی۔

"آپ ٹھیک کہتے تھے۔ وہ چور نکلا ـــ!"

"ہوں ــــ وہ تو تھا ہی ــــ میں نے دس سال پولیس انسپکٹری کی ہے۔ کوئی گھاس نہیں چھیلی۔ ایک ہی نظر میں آدمی کو پہچان لیا ہوں ـــ!"

میں نے داد طلب نگاہوں سے شانتی کی طرف دیکھا۔

"اچھا ــــ تو چرایا کیا تھا۔ اُس نے ــــ؟ میری دلچسپی بڑھ گئی تھی۔

"میری گھڑی!"

"ہیں ــــ کیا کہا ــــ؟ تمھاری گھڑی ــ؟!" مجھے ایک دھکّا سا لگا۔

"ہاں، جس دن آپ گئے تھے نا۔ اُسی دن صبح میں نے میز پر رکھی تھی۔ جب اُٹھانے گئی تو غائب تھی۔ لیکن آپ گھبرائیے نہیں۔ گھڑی کی قیمت پوری وصول ہوگئی ہے!"

"قیمت! ــــ کیسی قیمت ــ! یہ کیا کہہ رہی ہو تم ــ؟"

میری حیرت بڑھتی جا رہی تھی ــــ لیکن وہ اپنی ہی کہے جا رہی تھی۔

"یہ لیجیے ــــ یہ خط پڑھیے ــــ یہ خط مسز شرما کے نام دھرم دت لکھ کر رکھ گیا تھا ــــ اور مسز شرما نے غصّے میں آکر یہ خط مجھے دے دیا ہے۔

اور اُس نے میرے ہاتھ میں ایک خط دے دیا۔ کاپی میں سے پھاڑے ہوئے ایک کاغذ پر پنسل سے لکھا ہوا میلا سا خط:۔

ماں جی!

صاحب کے دوست کی گھڑی گم ہو گئی ہے۔ اور شک مجھ پر کیا گیا ہے۔ پر ماں جی! میں نے تو گھڑی نہیں چرائی۔ صاحب بے چارے کرتے بھی کیا۔ اُن کے دوست کا نقصان جو ہوا ہے۔ اور اسی گھر میں ہوا ہے۔ میں نے سوچا کہیں صاحب پر ہمیشہ کے لیے اُن کا طعنہ نہ ہو جائے۔ اُن کے نقصان کو پورا کر دینا چاہیے۔ میں نے رکشا بیچ دیا ہے ماں جی! اور بینک میں سے روپے بھی نکال لیے ہیں۔ اس طرح کل ایک سو ساٹھ روپے اکٹھے ہوئے ہیں، جو اس لفافہ میں رکھ رہا ہوں۔ اِن روپیوں سے اُن کی گھڑی اُن کو لے کر دے دیجیے گا۔ اچھا ماں جی! اب میں جا رہا ہوں میری غلطیاں معاف کر دینا۔

آپ کا بیٹا ـــــ دھرم دت

خط پڑھنے کے بعد میں گم سُم شانتی کی طرف دیکھتا رہا۔ شانتی پوچھتی رہی "بات کیا ہے! خط پڑھ کر آپ اُداس یوں ہو گئے؟ ـــ کیا سوچ رہے ہیں آپ؟"

لیکن میں کچھ بھی نہ بولا ـــ میں بول ہی نہ سکا۔ شرما صاحب اور مسز شرما کی تو خیر بات ہی دوسری تھی، کتنی ہی دیر تک میں شانتی کو بھی نہ بتا سکا کہ اُس کی گھڑی تو اُس روز میں نے اُسے اُس کی لاپروائی کا سبق سکھانے کے لیے خود اُٹھا کر اپنے سوٹ کیس میں رکھ لی تھی۔ اور پھر دَورے پر جاتے ہوئے اُسے دینا بھول گیا تھا ـــ!

"دیواریں"

حمید کاشمیری کے منتخب افسانوں کا مجموعہ

شائع ہو گیا

سفید کاغذ۔ آفسٹ کی دیدہ زیب چھپائی

خوبصورت گٹ اپ۔ قیمت چھ روپے

ناشر "مکتبہ ماحول۔ بہادر شاہ مارکیٹ بندر روڈ۔ کراچی

رتن سنگھ

منشور۔ کراچی

اپنا شہر

ملازمت کے سلسلے میں پورے پانچ سال امرت سر میں گزارنے کے بعد وہ ایک مہینے کی چھٹی لے کر اپنے شہر لکھنؤ لوٹ رہا تھا۔ امرت سر کی دو دھاؤ والی گلی میں اپنے مکان کو تالا لگاتے ہوئے اُس کا ذہن اپنے لکھنؤ کے مکان کے دروازے کی چیں چیں سن رہا تھا۔ تبھی سردار دساکھا سنگھ نے اپنی کھڑکی سے جھانکتے ہوئے کہا۔

"کیتھے چلےاو بادشاؤ" (کہاں چلے بادشاہ)

"ادجی، ایک مہینے کی چھٹی لے کر گھر جا رہا ہوں۔ لکھنؤ۔

"اچھا اچھا۔ میں نے کہا جی۔ چھیتی چھیتی واپس آنا، آپ نے۔ آپ کے بنا تو رونق نہیں لگے گی۔"

وہ تالا لگا کر ہٹا تو رکشے والا اُس کا سامان رکشے پر رکھ چکا تھا۔ ابھی وہ رکشے پر بیٹھنے ہی لگا تھا کہ دربار صاحب سے لوٹتی ہوئی ہرمندر کور نے اُس سے کہا۔ "تے بیٹیا توں تردی پیا ایں" (اور بیٹیا تم چل بھی دیے)

"ہاں ماتا جی، اب گاڑی کا وقت ہو گیا ہے۔ اب اجازت دیجیے۔"

"جگ جگ جی پتر۔ واتیاں مائیں۔" ہرمندر کور نے اُسے آشیرواد دی۔

اُس نے رکشہ والے سے کہا۔ "تم بڑھو۔ وہاں سڑک پر چل کر بیٹھوں گا۔" رکشے والے کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے اس کے کانوں میں ہرمندر کور کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ وہیں کھڑی اُسے آشیرواد دیے جا رہی تھی۔ ہربنس لال کے گھر کے سامنے سے گزرا تو اُس نے اپنی چھت سے پکارتے ہوئے کہا۔ "ارے سرلیا استوا جی، کہاں چل دیے چپکے چپکے۔ کچھ بتایا ہی نہیں۔"

"ماسٹر جی، پانچ سال ہو گئے، گھر نہیں گیا تھا۔ بس ایک مہینے کے لیے۔"

گلی پار کرتے ہوئے محلّے کے دو تین بچّے اُس کے ساتھ ہو لیے جن کو بڑے دلار سے اُس نے واپس لوٹایا۔ دو تین اور دو ستوں نے کھڑکیوں سے ہاتھ ہلاتے ہوئے اُسے الوداع کہی۔ اور جب وہ سڑک پر پہنچ کر رکشے پر سوار ہونے لگا تو اُس نے دیکھا کہ محلے کا کتا ڈبو دُم ہلاتا ہوا اُس کے پاؤں سے لپٹ رہا تھا۔ وہ بہت محبت بھری آنکھوں سے بے زبانی کی زبان سے گویا اُس سے پوچھ

رہا تھا۔ "کہاں جا رہے ہو مالک ؟" اُس نے کتے کی پیٹھ تھپتھپائی اور کہا۔ "گھبراؤ نہیں یار، جلد لوٹ رہا ہوں !"

رکشہ امرت سر کے تنگ بازاروں اور گلیوں سے ہوتا ہوا اسٹیشن کی طرف بڑھ رہا تھا۔ رکشے والے کو بھیڑ کی وجہ سے قدم قدم پر گھنٹی بجانی پڑتی تھی راستہ بنانے کے لیے راہ گیروں کو پکارنا بھی پڑتا تھا۔

"او بچ موڑ توں ۔"

"تیرے بچے جیون او ماتا ۔ ہٹ جا کرما والیے ۔"

"ہٹ کے او پتر۔ تینوں سائیں دیاں رکھاں !"

رکشا جب ہال بازار میں پہنچا تو سرلیو استوا ایسا محسوس کر رہا تھا کہ جیسے وہ لکھنؤ کے چار باغ اسٹیشن سے اتر کر لاٹوش روڈ سے ہوتا ہوا اپنے مکان کی طرف بڑھ رہا ہو۔ ایمپلائمنٹ ایکسچینج، اے بی سین روڈ، انڈسٹریل کالج ۔ مراری لعل حکیم کی دوکان، امین آباد کا موڑ، ہنومان کا مندر، جھنڈے والا پارک، کچا احاطہ ان سب کی مدھم سی تصویر اُس کی آنکھوں کے سامنے آ رہی تھی ــــ یکایک رکشے والے نے ایک موڑ پر تیزی سے رکشہ گھمایا تو اُسے احساس ہوا کہ وہ ابھی ہال بازار سے نکل کر ریلوے پل تک ہی پہنچا ہے۔

ریلوے اسٹیشن پر بھی دو تین دوست اُسے چھوڑنے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ اس لیے گاڑی چلنے تک اُس کا ذہن کچھ نہ سوچ سکا۔ لیکن گاڑی چلتے ہی جب اُسے کچھ سکون ملا تو اس کا ذہن پھر لکھنؤ کے بازاروں اور گلیوں میں بھٹکنے لگا۔ امین آباد۔ قیصر باغ لال باغ، حضرت گنج، اور ..... افسوس ہو رہا تھا کہ وہ اتنے سال لکھنؤ کیوں نہ جا سکا۔ اور اب جب پنجاب میل فراٹے بھرتی ہوئی تیزی سے بھاگ رہی تھی تو اُسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بہت ہی سست رفتاری سے چل رہی۔ اُس کا بس چلتا تو وہ اب تک اُڑ کر لکھنؤ پہنچ گیا ہوتا۔

اُس نے سوچا۔ اپنا شہر اپنا ہی ہوتا ہے۔ وہاں کی سڑکیں، پارکیں، بازار، گلیاں اور اپنے محلے کے تو ہر موڑ سے وہ واقف ہے۔ اُسے یہ تک معلوم ہے کہ امامی مسجد کے موڑ کے پاس جو کنواں ہے اُس پر چڑھنے کے لیے پانچ چھوٹی چھوٹی سیڑھیاں ہیں اُن میں سے سب سے نچلی سیڑھی کی دو اینٹیں تب ٹوٹی ہوئی تھیں۔ ممکن ہے اب بھی ٹوٹی ہوں۔ اور غلام حیدر کے پھاٹک کی پانچ میں سے دو درازیں اتنی کھلی ہیں کہ ان سے جھانک کر اندر آنگن میں کھلے پھولوں کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ انھیں درازوں میں سے کبھی کبھی رفعت کی ایک جھلک دیکھنے کو مل جاتی تھی۔ اب پتا نہیں رفعت کہاں ہو۔ ہو سکتا ہے اُس کی شادی ہو گئی ہو .... اور پھر جب وہ اپنی گلی میں نکلتا تھا تو قدم قدم پر لوگوں سے علیک سلیک ہوتی تھی۔ اور امین آباد کے بازار میں تو اس کا پکا اڈا تھا۔ جس ہوٹل میں دوستوں کے ساتھ بیٹھ جاتا وہاں سے اُٹھنے کی نوبت ہی نہ آتی۔ نوری سے اُٹھے تو سندر سنگھ کے ہاں۔ وہاں سے اُٹھے تو کاظمی میں۔ اس طرح صبح سے شام ہوتی تھی۔

پرانی یادوں کے انھیں حسین خوابوں میں کھویا ہوا جب وہ لکھنؤ کے چار باغ ریلوے اسٹیشن پر اُترا تو خوشی کے مارے اُس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ قلی کے سامان اتارنے میں جو دیر لگ رہی تھی وہ بھی اس کو کھل رہی تھی۔ وہ جلد سے جلد لکھنؤ کی اس زندگی میں پہنچنا چاہتا تھا۔ جہاں اُس کے دوست احباب تھے۔ جانے پہچانے لوگ تھے۔ پھاٹک کے پیچھے پھول چنتی ہوئی رفعت تھی۔ اور نہ جانے کیا کیا۔ ریلوے اسٹیشن اُسے اسی طرح لگا۔ قلیوں میں ایک آدھ صورت ایسی لگی جیسے پہلے کبھی

دیکھی ہوئی ہو۔ ریلوے پلیٹ فارم پر اُس نے ارد گرد چاروں طرف دیکھا۔ شاید کوئی جانی پہچانی صورت دکھائی دے جائے۔ وہ چاہتا تھا کوئی چپکے سے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتا ہوا کہے۔ "اماں حضرت، کہاں سے تشریف لا رہے ہو۔ کہاں رہے اتنے دن؟" لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔ اُس کے دل میں دکھ کی ہلکی سی لہر اُٹھی۔ لیکن اُس نے دبا دیا اسے۔ مایوس ہونے کی بات ہی نہیں تھی۔ اس نے کسی کو اطلاع دی ہوتی تو اسٹیشن پر اسے لینے کے لیے دوستوں کی ایک بھیڑ لگ جاتی۔ گھر پر اطلاع بھجوائی تھی، ماں کو وہ بے چاری بوڑھی عورت کہاں آ

چار باغ سے اب رکشہ لاٹوش روڈ پر بھاگا جا رہا تھا۔ وہ سڑک کے کنارے بنے ہوئے مکانوں اور دکانوں کو غور سے دیکھتا جا رہا تھا۔ ایسا کرتے ہوئے اُسے بڑی مسرت ہو رہی تھی۔ امین آباد میں پہنچ کر اُس نے رکشہ والے کو آہستہ آہستہ چلنے کو کہہ دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ کوئی پرانا دوست مل جائے۔ سندر سنگھ ہوٹل کے سامنے سے جب اس کا رکشہ گزرا تو اُس نے غور سے اندر کی طرف جھانک کر دیکھا۔ وہاں پر کوئی دوست یار تو کیا کوئی صورت بھی نہیں جسے پہلے دیکھا ہو۔ رکشا آگے بڑھ چکا تھا۔

اپنے محلے کچے احاطے جانے کے لیے اب اُسے جھنڈے والی پارک کی طرف مڑنا تھا۔ لیکن اُس نے رکشے والے سے کہا کہ ہنومان منڈی کی طرف سے ہو کر رفیوجی پارک کا چکر لگاتے ہوئے چلو۔ رفیوجی پارک کے کچھ حصّے میں پکّی دکانیں بن گئی تھیں۔ بازار میں اسی طرح کی رونق تھی۔ کوئی نہیں تھا تو کوئی اس کا اپنا یار بیلی، کوئی ہمجولی۔

رکشہ آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ لیکن اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ بہت تیز چل رہا ہو۔ اور اسی لیے وہ اپنے جاننے پہچاننے والوں کو دیکھ نہ پا رہا ہو۔ دانش محل کی طرف جاتے ہوئے اُسے ایک دو جانی پہچانی صورتیں دکھائی بھی دیں لیکن اُن سے اس کے کوئی مراسم نہیں تھے۔ رکشہ کچے احاطے میں داخل ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ وہاں تو کوئی اپنا ملے گا ہی۔ گلی میں بہت سے لوگ آ جا رہے تھے۔ لیکن کوئی ایسا نہیں تھا جسے وہ بلا سکے۔ اچانک سامنے سے ایک لڑکا آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس نے سوچا وہ دوبے ہے اُس کا پڑوسی۔ اُس نے آواز دی اور اُس کے رکنے پر اُسے شرمندہ ہونا پڑا۔ وہ کوئی اور نکلا۔

آخر اس کا یہ رکشا اپنی گلی میں پہنچا وہاں تو اُسے جاننے والے لوگ رہتے ہی تھے۔ لیکن بدقسمتی سے گلی میں کوئی نہیں تھا۔ اس وقت کسی کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ صرف رکشے کی کھڑ کھڑ تھی۔ گلی کے تنگ موڑ پر رکشے والے نے رکشہ روک دیا۔ اپنے گھر تک پہنچنے کے لیے گلی کے دو اور چھوٹے چھوٹے موڑ تھے تنگ سے جہاں رکشہ نہیں جا سکتا تھا۔ اس لیے رکشے والے کو سامان اتارنے کے لیے کہہ کر وہ اپنے گھر کی طرف مڑا۔ ایک موڑ۔ پھر دوسرا موڑ۔ اور سامنے اس کا گھر تھا۔

اچانک ایک غیر آدمی کو دیکھ کر ایک کتّا بھونکنے لگا۔ اُس نے سوچا، شاید وہ کتّا رکشے والے پر بھونک رہا ہو۔ اُس نے پیچھے گھوم کر دیکھا تو وہاں کوئی نہ تھا۔ کتا اُسی کی طرف دیکھتا ہوا بھونکے جا رہا تھا۔

اُس نے ایک ہاتھ سے گھر کی کنڈی کھٹکھٹاتے ہوئے سوچا، شاید وہ کسی اجنبی شہر میں آ گیا ہے۔ اُس کا شہر تو امرت سر ہے جہاں کا ڈبو کتّا بھی اُس سے آشنا ہے۔

جنوری ۱۹۶۶ء سے نقش پونے دو سو صفحات پر شایع ہو گا اور قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے ہو گی۔

شرد ندو بنرجی
ترجمہ:۔ قدوس صدیقی

خرام ۔ چاٹگام

کمرہ نمبر ۲

نرالا ہوٹل کا منیجر ہرلیش مکرجی نے جاگتے ہی گھڑی کی طرف دیکھا۔ ساڑھے چھ بج چکے تھے۔ وہ بستر سے فوراً اُٹھ گیا۔ آج جاگنے میں اُسے کافی دیر ہوگئی تھی۔ مسٹر مکرجی نے رام پرشاد کو پکارا۔ ہوٹل کی وردی پہنے ہوئے ہیڈ خانساماں فوراً حاضر ہوا۔ ہیڈ خانساماں رام پرشاد نہایت ہی تیز اور چالاک آدمی تھا۔ اور ہوٹل کی دیکھ بھال میں ہمیشہ مستعد رہتا تھا۔ مکرجی نے اُس سے پوچھا۔ "بیڈ ٹی (Bed Tea) بھجوا دی گئی ہے ؟" رام پرشاد نے جواب دیا۔ "جی ہاں، سوائے دوسری منزل پر کمرہ نمبر ۲ کے۔ دستک دینے پر بھی اندر سے کوئی آواز نہیں آئی۔"
مسٹر مکرجی نے کہا "کمرہ نمبر ۲ میں راج کمار بابو ہیں۔ پندرہ منٹ بعد دوبارہ جانا۔ بازار کون گیا ہے ؟"

"جرنیل سنگھ کو ساتھ لے کر سرکار بابو گئے ہیں۔" رام پرشاد نے جواب دیا۔

"اچھا میرے لیے چائے لے آؤ۔" مسٹر مکرجی یہ کہتے ہوئے غسل خانے میں چلے گئے۔

راش بہاری ایونیو اور گڑیا ہاٹ روڈ کے چوراہے پر نرالا ہوٹل واقع ہے۔ اگرچہ یہ دیسی ہوٹل ہے۔ مگر طور طریقے کچھ ولایتی ہوٹلوں جیسے، ملازم وردی پہنے ہر وقت حاضر رہتا۔ صدر دروازے پر صبح شام فوجی افسروں کی طرح وردی پہنے تمغہ لٹکائے دربان کھڑا رہتا۔ اور ہوٹل میں آنے والوں کا فوجی سلوٹ سے خیر مقدم کرتا۔ تین منزلہ عمارت اور ہر منزل میں آٹھ آٹھ کمرے۔ نچلی منزل میں منیجر کا کمرہ، ہوٹل کا دفتر، ڈائننگ ہال، باورچی خانہ، ملازموں کا کمرہ وغیرہ۔ ہوٹل میں دیسی اور ولایتی دونوں قسم کے کھانے ملتے ہیں۔ جس کی جیسی مرضی۔ ہوٹل کا کرایہ ولایتی ہوٹلوں سے کم، لیکن عام دیسی ہوٹلوں سے کچھ زیادہ ہے۔ کمرے بہت کم ہیں۔ اس لیے ہمیشہ بھرا رہتا ہے۔ اعلیٰ متوسط طبقے کے لوگ زیادہ تر یہیں ٹھہرتے ہیں۔

تقریباً آدھ گھنٹہ بعد مسٹر مکرجی غسل خانے سے باہر آئے۔ کوٹ پتلون میں جاذب نظر لگتے تھے۔ عمر تقریباً پینتالیس سال ہوگی۔ صورت سے تجربہ کار اور ذہین نظر آتے تھے۔ میز پر چائے اور ناشتہ سجائے ہوئے رام پرشاد سامنے ہی کھڑا تھا۔ مسٹر مکرجی ناشتے پر بیٹھ گئے۔ کھاتے وقت بات نہیں کرتے۔ پانچ منٹ میں ناشتہ ختم ہوا۔ "راج کمار بابو کی خبر لی تھی ؟" مسٹر مکرجی نے رام پرشاد سے پوچھا

"جی ہاں، مگر اس مرتبہ بھی کمرے کے اندر سے کوئی آواز نہیں آئی۔" رام پرشاد نے جواب دیا۔
مسٹر مکرجی کی پیشانی پر چند لکیریں اُبھر آئیں۔ اپنے کمرے سے دفتر میں آئے۔ میز کی دراز سے کنجیاں نکالیں۔ پھر رام پرشاد سے کہا۔

"چلو دیکھتے ہیں۔"

اس وقت اگرچہ صرف سات ہی بجے تھے۔ مگر باورچی خانے میں سب لوگ مصروف نظر آرہے تھے۔ ٹھیک آٹھ بجے کھانے کے کمرے میں ناشتہ پہنچانا ضروری تھا۔ سیڑھی سے اوپر اُٹھتے ہوئے مسٹر مکرجی نے رام پرشاد سے دریافت کیا "کل رات کمار بابو کمرے ہی میں تھے تو ؟"

"جی ہاں، کمرے ہی میں تھے، پونے نو بجے میں نے خود اُن کے کمرے میں کھانا پہنچایا تھا۔"

"رات کو صدر دروازہ کس وقت بند ہوا ؟" مکرجی نے دریافت کیا۔

"آپ کے واپس لوٹنے کے فوراً بعد ہی تقریباً گیارہ بجے۔"

دوسری منزل پر ایک ہی طرف آٹھ کمرے تھے۔ سیڑھی سے اوپر اُٹھتے ہی کمرہ شروع ہوتا تھا۔ تمام دروازے بند تھے۔ مسٹر مکرجی نے کمرہ نمبر ۲ کے دروازے پر رُک کر زور سے دستک دیا۔ اندر سے کوئی آواز نہیں آئی۔ مسٹر مکرجی نے زور زور سے پکارا۔ "راجکمار بابو ! راجکمار بابو !" مگر جواب میں وہی خاموشی۔ مسٹر مکرجی نے ہینڈل گھما کر دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔ مگر بے سود۔ دروازے پر Yale تالا لگا ہوا تھا۔ باہر سے جب تک کنجی نہیں ڈالی جائے دروازہ نہیں کھلتا۔ البتہ کھینچنے سے دروازہ آپ ہی آپ بند ہو جاتا ہے۔ مسٹر مکرجی نے جیب سے چابیوں کا گچھا نکالا۔ اسی وقت دو نمبر کمرہ کے دونوں بازوؤں سے دو چہرے اُبھرے۔ ایک نمبر کمرہ سے ایک محترمہ جھانک رہی تھیں۔ اور تین نمبر کمرہ سے ایک ادھیڑ عمر کا شخص۔ محترمہ نے پوچھا "منیجر صاحب کیا بات ہے ؟" تین نمبر کمرہ کے ادھیڑ شخص نے منیجر سے کہا۔ "میری طبیعت خراب ہوگئی ہے فوراً کسی ڈاکٹر کو بلوائیے !"

یہ سن کر ایک نمبر کمرہ سے محترمہ نکل آئیں اور کہنے لگیں۔ "میں ڈاکٹر ہوں ؟" اور تین نمبر کمرہ کے سامنے آکر رک گئیں۔ پہلے تو تین نمبر کمرہ کے مسٹر سانیال حیرت سے اُنھیں دیکھتے رہے پھر کہا "اندر تشریف لائیے۔"

مسٹر مکرجی نے دو نمبر کنجی سے کمرہ کا دروازہ کھولا۔ اور اندر کی طرف جھانکنے لگے۔ کچھ دیر چپ چاپ کھڑے رہے۔ پھر دروازہ بند کر دیا۔ اس وقت وہاں سوائے رام پرشاد کے اور کوئی نہیں تھا۔ رام پرشاد سے کہا "تم یہاں کھڑے رہو۔ یہاں سے کہیں جانا نہیں میں ابھی آتا ہوں۔" مسٹر مکرجی آہستہ سے نیچے اتر گئے۔

تین نمبر کمرہ میں لیڈی ڈاکٹر شو بھنا رائے نے مسٹر سانیال کو بستر پر لٹا کر پہلے اُن کا ٹمپریچر لیا۔ پھر نبض اور زبان دیکھنے کے بعد بتایا کہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ معمولی سردی بخار ہے۔ اسپرین کی دو ٹکیہ کھا کر لیٹ جائیے۔ طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔ مسٹر سانیال نے دریافت کیا۔ "آپ کی فیس کتنی ہے ؟" لیڈی ڈاکٹر نے جواب دیا۔ "نہیں، فیس کی ضرورت نہیں۔ آپ لیٹے رہیئے۔" اور یہ کہتے ہوئے تین نمبر کمرہ سے باہر آگئیں۔ دو نمبر کمرے کے سامنے رام پرشاد کو دیکھ کر رک گئیں۔ اور رام پرشاد سے دریافت کیا۔ "اس کمرے میں کیا واقعہ ہوا ہے ؟" رام پرشاد نے صرف سر ہلا کر بتایا کہ کوئی بات نہیں۔ ڈاکٹر شو بھنا رائے مزید سوال کیے بغیر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ نیچے اس وقت مسٹر مکرجی اپنے دفتر سے پولیس کو فون کر رہے تھے۔ انھوں نے فون پر تھانے میں خبر دی کہ نرالا ہوٹل میں خون ہو گیا ہے۔ فوراً پولیس بھیجیے۔ گزشتہ رات تھانے کے داروغہ انسپکٹر راکھال سرکار کے یہاں دوستوں کی دعوت تھی۔ اس دعوت میں مشہور سراغ رساں مسٹر بکیش داس بھی شریک تھے۔ مسٹر سرکار پولیس افسر ہونے کے باوجود نہایت ہی ملنسار اور یار باش آدمی تھے۔ اور ہمیشہ دوستوں کی دعوت کرتے رہتے تھے۔ گزشتہ رات دعوت میں دیر ہو گئی تھی۔ اس لیے سراغ رساں بکیش داس وہیں ٹھہر گئے تھے۔ دوسرے دن اس وقت وہ واپس جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ اسی وقت تھانے سے قتل کی خبر ملی۔ مسٹر سرکار نے سراغ رساں بکیش سے دریافت کیا۔ "کیا آپ بھی میرا ساتھ دیں گے ؟" "ہاں، میں بھی چل رہا ہوں۔" بکیش نے جواب دیا۔

انسپکٹر راکھال سرکار سراغرساں بکبیش کے ساتھ جس وقت نرالا ہوٹل پہنچے اس وقت وہاں تھانے سے دو سب انسپکٹر اور سپاہی پہنچ چکے تھے۔ ہوٹل کے صدر دروازے پر ایک سپاہی پہرا بھی دے رہا تھا۔ ہوٹل سے کسی کو باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ منیجر کے کمرے میں سرکاری ڈاکٹر بھی بیٹھا ہوا تھا۔ انسپکٹر سرکار نے کہا "ڈاکٹر صاحب آپ بھی پہنچ گئے ہیں۔" پھر مسٹر ہرلیشی مکرجی سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ "آپ ہی منیجر ہیں؟" — "جی ہاں!" مسٹر مکرجی نے جواب دیا۔

انسپکٹر سرکار اور سراغرساں بکبیش کرسی کھینچ کر قریب ہی بیٹھ گئے۔ اس کے بعد انسپکٹر نے منیجر سے کہا کہ اس قتل کے بارے میں آپ کو جو کچھ بھی معلوم ہے اختصار سے بیان کریں۔ آج صبح سے جو جو واقعات رونما ہوئے تھے۔ منیجر نے انسپکٹر کو بتایا۔ سننے کے بعد انسپکٹر نے ڈاکٹر سے کہا۔ "آئیے ڈاکٹر صاحب لاش کا معائنہ کیا جائے۔"

دوسری منزل پر کمرہ نمبر ۲ کے سامنے رام پرشاد کے بجائے ایک سپاہی پہرہ دے رہا تھا۔ منیجر نے آگے بڑھ کر کنجی سے دروازہ کھول دیا۔ اب باہر سے کمرے کی تمام چیزیں صاف نظر آرہی تھیں۔ ٹھیک دروازے کے سامنے ایک مرد کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ لنگی اور گنجی پہنے ہوئے۔ شکل دیکھتے ہی سب لوگ چونک اٹھے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کسی نے چہرے کو چھری سے روٹی کے ٹکڑے کی طرح تراش کر پھر اُسے بے ترتیبی سے جوڑ دیا ہو۔ زخم کے یہ نشانات تازہ نہیں، بلکہ برسوں پرانے تھے۔ مقتول کا چہرہ بے حد خوفناک نظر آرہا تھا۔ سینے پر زخم کا گہرا نشان نظر آرہا تھا۔ اور گنجی پر خون جم گیا تھا۔

انسپکٹر سرکار نے ڈاکٹر سے کہا۔ "آپ پہلے لاش کا معائنہ کر لیں۔ پھر ہم لوگ اپنی کارروائی کریں گے۔"

ڈاکٹر کمرے میں داخل ہوا۔ اور سب لوگ باہر ہی کھڑے رہے — "کیا مصیبت ہے مجھے ضروری کام سے باہر نکلنا ہے مگر پولیس مجھے باہر نکلنے نہیں دیتی۔" پیچھے سے ایک زنانی آواز سنائی دی۔ انسپکٹر نے مڑ کر پیچھے کی طرف دیکھا ایک نمبر کمرہ کے دروازے پر ایک عورت غصہ سے بھری ہوئی کھڑی تھی۔ انسپکٹر سرکار نے منیجر سے پوچھا۔ "آپ کون ہیں؟" — "لیڈی ڈاکٹر شوبھنا رائے ایک نمبر کمرہ میں رہتی ہیں۔" منیجر نے جواب دیا۔

انسپکٹر نے ملائمت سے لیڈی ڈاکٹر سے کہا۔ "دیکھیے، اس کمرے میں کل رات قتل ہو گیا ہے۔ لہٰذا یہاں جتنے لوگ ٹھہرے ہوئے ہیں۔ سبھوں کا یہاں رہنا ضروری ہے۔ بیان لینے سے قبل کوئی باہر نہیں جا سکتا۔ بہر حال آپ مطمئن رہیں۔ میں سب سے پہلے آپ ہی کا بیان لوں گا۔ اور جس قدر جلد ممکن ہوا۔ آپ کو چھوڑ دوں گا۔"

یہ سن کر لیڈی ڈاکٹر اپنے کمرے میں چلی گئی — جانے سے پہلے حیرت سے پوچھا۔ "خون ہو گیا ہے؟ کس نے خون کیا ہے؟"

انسپکٹر نے جواب دیا۔ "ابھی تک پتہ نہیں چلا ہے۔" انسپکٹر سرکار نے اپنے دو ماتحت سب انسپکٹروں سے کہا کہ وہ دوسری اور تیسری منزل کے رہنے والوں کے بیانات قلمبند کریں۔ سوائے کمرہ نمبر ایک اور تین کے۔ سبھوں کا نام و پتہ، پیشہ کلکتہ آنے کا سبب اور کل رات کون کہاں تھا تفصیل سے لکھ لیں۔ تقریباً دس منٹ کے بعد ڈاکٹر معائنہ ختم کرنے کے بعد باہر نکل آیا۔ اور انسپکٹر سرکار سے کہا۔ "معائنہ ہو چکا ہے۔ اب لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج سکتے ہیں۔"

انسپکٹر سرکار نے ڈاکٹر سے دریافت کیا۔ "آپ کے معائنہ سے کیا پتہ چلتا ہے؟"

"موت چھری کے زخم سے واقع ہوئی ہے، چھری یا اسی قسم کے کسی تیز اوزار سے وار کیا گیا ہے۔ جو دل تک اتر گیا ہے۔ یہ کسی تجربہ کار ہاتھ کا کام ہے۔ موت کس وقت ہوئی ٹھیک بتایا نہیں جا سکتا۔ لیکن رات کے دس بجے کے درمیان ہوئی ہے۔"

سراغرساں بکبیش نے ڈاکٹر سے دریافت کیا۔ "چہرے پر زخموں کے جو نشانات ہیں، وہ کتنے دنوں کے ہیں؟"

"دس بارہ سال سے کم نہیں۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔ "عمر تقریباً چالیس سال ہوگی۔ اچھا اب اجازت دیجیے۔ لاش جس قدر جلد ممکن ہو بھیج دیجیے۔ آج ہی پوسٹ مارٹم ختم کر دوں گا۔ کل تک آپ کو رپورٹ مل جائے گی۔" یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر واپس چلا گیا۔ ڈاکٹر کے جانے کے بعد انسپکٹر نے منیجر سے کہا۔ "آپ اپنے کام پر جائیے۔ البتہ دفتر میں بیٹھیے گا۔"

لاش چالان کرنے کے بعد انسپکٹر سرکار نے سراغرساں بکیش داس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ... ایک نمبر کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "چلیے محترمہ کا بیان لے لیا جائے۔" انسپکٹر نے ۲ نمبر کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ ایک نمبر کمرے کے دروازے پر دستک دیتے ہی لیڈی ڈاکٹر شو بھنا رائے نے دروازہ کھول دیا۔ لیڈی ڈاکٹر کا چہرا مرجھایا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اور وہ کچھ پریشان نظر آ رہی تھی۔ ناٹا قد، گٹھیلا جسم، چاق چوبند۔

"جس قدر جلد ممکن ہو مجھے چھوڑ دیجیے۔ میرے کام کا نقصان ہو رہا ہے۔"

"صرف دو چار سوال کے بعد آپ کو چھوڑ دوں گا۔ آپ اطمینان رکھیں۔"

کاغذ پنسل لے کر انسپکٹر سرکار نے کہا۔ "آپ کا پورا نام؟"

"مسز شو بھنا رائے۔"

"عمر؟"

"اڑتالیس سال۔"

"شوہر کا نام؟"

"مرحوم رام رتن رائے۔"

"آپ ڈاکٹر ہیں، کہاں کام کرتی ہیں؟"

"برہم پور اسپتال میں۔"

"کلکتہ کس لیے آئی ہیں؟"

"میں زنانہ امراض کی ماہر ہوں۔ یہاں کے سیوا سدن سے بھی تعلق ہے۔ اور اسی سلسلے میں کبھی کبھی کلکتہ آنا پڑتا ہے۔"

"کلکتہ میں کوئی رشتہ دار بھی ہے؟"

"میرا کہیں بھی کوئی نہیں۔"

"بال بچے؟"

"نہیں ایک لڑکی تھی، عرصہ ہوا مر چکی۔"

"آپ ہمیشہ اسی ہوٹل میں ٹھہرتی ہیں؟"

"جی ہاں، یہاں مجھے آرام ہے۔"

"اب کے آپ یہاں کب آئیں؟"

"پرسوں۔"

"کل رات آپ کے بغل کے کمرے میں راجکار یا سو نامی ایک شخص کا خون ہو گیا ہے۔ ان کو آپ پہچانتی تھیں۔"

"نہیں، اگر قسم کا چہرہ دیکھنے سے یقیناً یاد رہتا۔"

"کل رات آٹھ بجے کے بعد آپ کہاں تھیں؟"

"کل رات آٹھ بجے میں سیوا سدن سے واپس آئی۔ منہ ہاتھ دھونے کے بعد کھانے کے کمرے میں گئی تھی۔ نو بجے سے پہلے ہی میں کھانا کھا کر اپنے کمرے میں واپس آگئی تھی۔ اور اس کے بعد باہر نہیں نکلی۔"

"رات کو کوئی آواز بھی سنی تھی؟"

"میں سوا نو بجے ہی سو گئی تھی۔ مگر بغل کے کمرے کی آہٹ سے کئی مرتبہ نیند ٹوٹ گئی۔ دروازہ کے کھولنے اور بند ہونے کی آواز بار بار آرہی تھی۔"

"کیا وقت ہوا ہوگا؟"

"ٹھیک نہیں بتا سکتی۔ اندازاً ساڑھے نو سے دس بجا ہوگا۔"

"آپ نے انھیں کچھ کہا نہیں؟"

"کیا کہتی ہوٹل میں مختلف قسم کے لوگ ٹھہرتے ہیں۔ جن میں بعض نہایت غیر ذمہ دار بھی ہوتے ہیں۔ انھیں دوسروں کی تکلیف کا خیال نہیں رہتا۔"

"قتل کی اطلاع کس وقت ملی؟"

"آپ سے معلوم ہوا۔ صبح منیجر صاحب زور زور سے پکار رہے تھے۔ مگر پوچھنے پر انھوں نے کچھ نہیں بتایا۔"

انسپکٹر سرکار نے سراغرساں کی طرف دیکھا۔ سراغرساں بکیش نے کہا۔ "ٹھیک ہے اب اور کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں۔"

انسپکٹر نے لیڈی ڈاکٹر شو بھنا رائے کو باہر جانے کی اجازت دے دی۔ البتہ یہ تاکید کر دی کہ پولیس کو بتلائے بغیر وہ کلکتے سے باہر نہیں جا سکتیں۔ لیڈی ڈاکٹر اپنا بیگ اٹھائے کمرے سے نکل آئی۔ اور دروازہ بند کرکے سیڑھی سے نیچے اتر گئی۔ انسپکٹر سرکار اور مسٹر بکیش دوبارہ کمرہ نمبر ۲ میں آئے۔ انسپکٹر نے کہا۔ "محترمہ مزاج کی کچھ تیز معلوم ہوتی ہیں۔ مگر کچھ بہت خوفزدہ نہیں معلوم ہوتیں۔ پولیس سے پہلے بھی سابقہ پڑا ہوگا۔ آخر ڈاکٹر جو ٹھہریں۔"

"آئیے دیکھتے ہیں کمرے میں قاتل کی کوئی نشانی بھی ملتی ہے یا نہیں۔"

انسپکٹر نے پہرہ دینے والے سپاہی سے کہا۔ "تم نیچے جا کر تھانے میں فون کردو کہ انگلیوں کے نشانات کے ماہر (Finger Print Expert) کو فوراً یہاں بھیج دیں۔" انسپکٹر سرکار نے سراغرساں کے ساتھ کمرے کا جائزہ لینا شروع کیا کمرے کی لمبائی بارہ فٹ اور چوڑائی دس فٹ ہوگی۔ دیوار کے قریب ایک لوہے کا پلنگ اور ایک چھوٹی سی میز ایک کرسی کپڑا ٹانگنے کی ایک الگنی جس پر ایک دھوتی اور کرتا ٹنگا ہوا تھا۔ بستر سے پتہ چل رہا تھا کہ مسٹر راجکمار باسو اس پر سو رہے تھے۔

سراغرساں بکیش نے انسپکٹر سرکار سے کہا۔ معلوم ہوتا ہے کہ راج کمار بابو کھانا ختم کرنے کے بعد کرتا اور دھوتی اتار کر لنگی اور گنجی پہن کر سو رہے تھے۔ رات کو دروازے پر دستک سن کر انھوں نے دروازہ کھولا ہوگا۔ دروازہ کھلنے کے ساتھ ہی ساتھ کسی نے باہر ہی سے حملہ کیا۔ مسٹر راج کمار باسو گر پڑے اور دوبارہ اٹھنے کی نوبت نہیں آئی۔ قاتل نے کمرے میں قدم بھی نہیں دھرا۔ لہٰذا انگلیوں کے نشانات کے باہر کو کمرے میں مقتول کے علاوہ کسی اور کی انگلیوں کے نشانات نہیں ملیں گے۔"

انسپکٹر سرکار نے جواب دیا، "آپ کا اندازہ صحیح ہے۔ پھر بھی کمرے کی اچھی طرح تلاشی لینی چاہیے۔ شاید کچھ پتہ چلے۔"

انسپکٹر سرکار نے تلاشی شروع کی، میز کے دراز، بستر کے نیچے، کرتے کے جیب میں کہیں بھی کچھ نہ ملا۔ پلنگ کے نیچے ایک چھوٹا سا

سوٹ کیس مع کنجی کے رکھا ہوا تھا۔ اس کے کھولنے پر اندر سے کچھ کپڑے اور کپڑوں کے نیچے دس دس روپے کے بہت سارے نوٹ اور ایک چھوٹی سی ڈائری ملی ایک سو بیس عدد نوٹ یعنی کل بارہ سو روپے تھے۔ نوٹ جیب میں رکھتے ہوئے انسپکٹر نے کہا۔

"قتل روپے کے لیے نہیں کیا گیا ہے، بلکہ اور کوئی وجہ ہوگی"۔ ڈائری پر نام کی جگہ سوکانتو سین لکھا ہوا تھا۔ انسپکٹر نے سراغرساں بکیش کی طرف دیکھا۔ راج کمار باسو فرضی نام ہے۔ لیکن سوکانتو سین یہ نام کچھ گوش آشنا معلوم ہوتا ہے۔ آپ نے یہ نام کبھی نہیں سنا؟ مسٹر بکیش نے سوال کیا۔

"یاد نہیں پڑتا!" انسپکٹر نے ڈائری الٹتے ہوئے جواب دیا۔ ڈائری میں ہر صفحہ پر کسی شہر کا نام لکھا ہوا تھا۔ جیسے بنارس، بمبئی، لکھنؤ، کلکتہ۔ وغیرہ اور اُس کے نیچے کچھ نام تھے۔ اور فون نمبر درج تھے۔ کلکتہ کے نیچے چار ناموں کے سامنے کچھ روپے۔

نمبر۱ موہن لال کنڈو
۱۱۷ پانا پوکھر لین } ۶۰۰

نمبر۲ شاما کانتو لاہری
۳۰/۱ لیک کالونی } ۵۰۰

نمبر۳ جگت بندھو
۵۶/۲ رام بہادری لین } ۴۰۰

نمبر۴ مسز لتیکا چودھری
۱۷ گاندھی پارک } ۳۰۰

ڈائری مسٹر بکیش کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے انسپکٹر سرکار نے کہا "دیکھیے شاید ان لوگوں سے کچھ پتہ چلے"۔
مسٹر بکیش نے ڈائری کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ میرے خیال میں اس شخص کا پیشہ بلیک میلنگ (Black - Mailing) تھا"۔

"کیا دوسرا پیشہ ممکن نہیں۔ جیسے بیمہ کی دلالی وغیرہ۔ انسپکٹر نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"ناممکن نہیں، لیکن بیمہ کے دلال کو کوئی قتل نہیں کرتا۔ اور اسے فرضی نام رکھنے کی بھی ضرورت نہیں پڑتی"۔

"تو کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہ جن لوگوں کو بلیک میل کر رہا تھا اُنھیں میں سے کسی نے اس کو قتل کیا ہے۔ شاید ان لوگوں سے کچھ پتہ چلے۔ چلیے پہلے تین نمبر کمرہ کا بیان لے لیں"۔

کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اور مسٹر سانیال بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔ قدموں کی آواز سن کر پوچھا۔ "کون؟" اور ان لوگوں کو دیکھ کر اُٹھ بیٹھے۔ مسٹر سرکار نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "میں آپ سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ آپ کو شاید اس کا علم ہوگا کہ بغل کے کمرے میں خون ہوگیا ہے"۔

"کس کا خون ہوگیا؟" مسٹر سانیال نے سوال کیا۔ انسپکٹر نے جواب میں کہا۔ "آپ کے بغل کے کمرے میں جو صاحب ٹھہرے ہوئے تھے، ان کا خون ہوگیا ہے۔ ان کا نام راج کمار باسو تھا۔ آپ انھیں نہیں پہچانتے۔؟"

"نہیں، میں نہیں پہچانتا۔ کس نے قتل کیا ہے؟"

"ابھی تک پتہ نہیں چلا۔ آپ کا نام کیا ہے؟ انسپکٹر سرکار نے پوچھا:

"سی توش سانیال"
"مکان ؟"
"بھاگلپور ہے۔ میری طبیعت خراب ہے۔ ڈاکٹر نے مجھے لیٹے رہنے کی تاکید کی ہے۔"
"کون سا ڈاکٹر ؟"
"لیڈی ڈاکٹر جو ایک نمبر کمرے میں رہتی ہیں۔ کہتی تھیں سردی لگ گئی ہے"
"سردی کیسے لگی ۔۔ ؟"
"کل شام گرم کپڑے کے بغیر باہر چلا گیا تھا"
"رات کو باہر کیوں نکلتے ہیں ؟"
"نہیں! رات کے نو بجے کھانے کے کمرے سے آنے کے بعد اور کہیں نہیں گیا"
"آپ کلکتہ کب آئے ؟"
"پرسوں، آج واپس جانے کی بات تھی، مگر طبیعت خراب ہو گئی ہے"
"آپ کلکتہ کس لیے آئے تھے ۔ ؟"
"گھی کی تجارت کرتا ہوں منگھو رام کو گھی دینے آیا تھا"
"آپ کی عمر کیا ہے ؟"
"بیالیس سال !"
"راج کمار باسو کو آپ نہیں پہچانتے تھے ؟"
"نہیں! میں نے نام بھی نہیں سنا"
"سوکانتو سین کا نام کبھی سنا تھا ؟"
"نہیں، میرے سالے کا نام سٹری کانتو تھا۔ لیکن وہ مر چکا ہے"
"کل رات آپ نے بغل کے کمرے میں کوئی آواز سنی تھی ۔ ؟"
"نہیں میں سویرے ہی سو گیا تھا"
"آپ پولیس کی اجازت کے بغیر یہاں سے نہیں جائیں گے۔ یہ کہتے ہوئے انسپکٹر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور دونوں کمرے سے باہر آ گئے۔ نیچے دفتر میں مسٹر ہرلش کمر جی چپ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان لوگوں کو دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے۔ اور پوچھا۔ کیسے کچھ پتا چلا؟"
انسپکٹر نے بغیر جواب دیئے ہوئے کہا۔" اب آپ کے ملازموں کا بیان لوں گا۔ سب سے پہلے آپ اپنا بیان دیجیے'
بیٹھیے ۔۔۔ آپ کا نام ؟"
"ہرلش چندر مکرجی"
"آپ ہوٹل کے منیجر ہیں۔ یہیں رہتے ہیں ؟"
"ہاں !"
"کتنے دنوں سے ؟"

"تقریباً آٹھ سال سے ۔"

"مقتول راج کمار کے متعلق کیا جانتے ہیں ؟"

منیجر نے ایک ضخیم رجسٹر کھول کر بتانا شروع کیا ۔ "نام راج کمار باسو، پتہ آدم پور ضلع پٹنہ ۔ گزشتہ پانچ سال سے وہ اس ہوٹل میں ٹھہرتے ہیں ۔ اور زیادہ سے زیادہ دو یا تین دن ٹھہرتے ہیں ۔ قیام کے دوران باہر کہیں نہیں جاتے ۔ البتہ وہ چند دوستوں کو فون کرتے ۔ اور وہ لوگ شام کے بعد ان سے ملنے آتے ۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں بتا سکتا ۔"

"اس مرتبہ وہ کب آئے تھے ۔ ؟"

"پرسوں رات ۔"

"کیا وہ ہمیشہ کمرہ نمبر ۲ ہی میں ٹھہرتے ہیں ؟"

"نہیں، جب جو کمرہ خالی مل جاتا ہے اُسی میں رہتے ہیں ۔"

"کل رات آپ ہوٹل ہی میں تھے ؟"

"جی، صرف دو گھنٹے کے لیے باہر گیا تھا ۔ میں تو ہوٹل ہی میں رہتا ہوں، مگر بال بچے شہر میں کرائے کے مکان میں رہتے ہیں۔ میں کبھی کبھی گھر چلا جاتا ہوں ۔ کل رات جب سب لوگ کھانے کے کمرے میں تھے، میں باہر گیا تھا ۔ تقریباً گیارہ بجے واپس لوٹا ۔"

"آپ کی غیر موجودگی میں ہوٹل کی دیکھ بھال کون کرتا ہے ؟"

"ہیڈ خانساماں رام پرشاد ۔"

"اُس کو ذرا بلائیے ۔"

منیجر نے رام پرشاد کو بلایا ۔ دوبارہ سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا ۔

"راج کمار باسو جن کا کل رات خون ہو گیا ہے اس کے متعلق کیا جانتے ہو ؟"

"جی، میں کچھ زیادہ نہیں جانتا ۔ وہ کبھی کبھی اس ہوٹل میں آکر ٹھہرتے اور دو تین دن کے بعد واپس چلے جاتے ۔"

"ان سے تمھاری بات چیت نہیں ہوتی تھی ؟"

"بہت کم ۔"

"ان کی دیکھ بھال کون کرتا تھا ؟"

"میں صبح کی چائے سے لے کر رات کا کھانا میں ہی پہنچایا کرتا تھا ۔"

"راج کمار بابو کھانے کے کمرے میں کیوں نہیں آیا کرتے تھے ۔ ؟"

"چونکہ زخموں کی وجہ سے اُن کی صورت بگڑ گئی تھی ۔ شاید اسی لیے لوگوں کے سامنے جانے سے جھجکتے تھے ۔"

"کل تم نے انھیں آخری بار کس وقت دیکھا تھا ۔ ؟"

"پونے نو بجے کھانا پہنچایا ۔ اس کے بعد نو بجے برتن کمرے سے لے آیا ۔ اُس وقت وہ صحیح سلامت تھے ۔"

"کل اُن سے ملنے کے لیے کون کون آیا تھا ۔ ؟"

"میں نہیں بتا سکتا جرنیل سنگھ شاید بتا سکے ۔"

"جرنیل سنگھ کون ہے ؟"

"ہمارے ہوٹل کا دربان!" ــــ جرنیل سنگھ حاضر ہوا ــــ بھوج پوری جوان جرنیل سنگھ کافی قد آور اور صحت مند تھا۔ اُس نے آتے ہی فوجی طریقے سے سلام کیا۔ انسپکٹر سرکار نے اُس سے پوچھا۔

"تم ہوٹل کے دروازے پر پہرہ دیتے ہو؟"

"جی ہاں صبح نو بجے سے بارہ بجے تک، پھر شام کے چھ بجے سے رات کے دس بجے تک۔"

"جو لوگ یہاں آتے ہیں اُن کا نام پتہ بھی لکھتے ہو۔؟"

"جی نہیں ایسا کوئی حکم نہیں ہے۔ البتہ پوچھنے پر مسافروں کے کمرے کا نمبر بتا دیتا ہوں۔"

"کل دو نمبر کمرے کے مسافر سے کون کون ملنے آیا تھا؟"

"دو مرد ایک عورت۔ عورت تقریباً رات کے سوا نو بجے ملنے آئی تھی۔ پانچ منٹ بعد واپس چلی گئی۔"

"اس کی عمر کیا ہو گی؟"

"بیس پچیس سال ہو گی۔ خوبصورت دبلی پتلی۔ اور آنکھ پر چشمہ لگائے ہوئے تھی۔ اس کے بعد اور کوئی نہیں آیا۔"

"ٹھیک ہے اب تم جا سکتے ہو۔" یہ سن کر جرنیل سنگھ نے فوجی سلوٹ کیا اور واپس چلا گیا۔

انسپکٹر سرکار نے جیب سے روپیہ نکال کر منیجر کے سپرد کیا۔ اور اس کی رسید مانگی۔ منیجر نے رسید دیدی۔ دونوں سب انسپکٹر بیان لینے کے بعد واپس آئے اور بتایا کہ ان لوگوں کے نام پتے پیشے اور دوسری تمام باتیں لکھ لی ہیں۔ سبھوں نے بتایا کہ وہ لوگ نو بجے کے بعد نہیں گئے۔ "مگر اسے سچ کیسے مان لیا جائے؟" مسٹر سرکار نے پوچھا۔

"ہوٹل کے ملازمین سیڑھی کے قریب ہی سوتے ہیں۔ اور کوئی شخص انھیں پھلانگ کر باہر نہیں جا سکتا۔ یہ ہوٹل کے ملازمین سیڑھی کے قریب کس لیے سوتے ہیں؟"

"تاکہ بلانے پر فوراً حاضر ہو سکیں۔" منیجر نے جواب دیا۔

اس وقت بارہ بج رہا تھا۔ انسپکٹر سرکار نے سراغرساں بکلیش سے کہا۔ "چلیے اب ہم چلیں۔ راستے میں کہیں کھانا کھا لیں گے۔ ڈائری میں جو پتے درج ہیں خوش قسمتی سے سبھی نزدیک ہیں۔ زیادہ دوڑ دھوپ کرنی نہیں پڑے گی۔"

منیجر مسٹر مکرجی نے کہا۔ "اگر اعتراض نہ ہو تو کھانے کا یہیں بندوبست کرتا ہوں۔" انسپکٹر سرکار نے ہنستے ہوئے کہا "بہت بہتر!" نرالا ہوٹل کا کھانا کافی عمدہ تھا۔ کھانا ختم کر کے سب لوگ ڈائننگ ہال سے باہر آئے۔ انسپکٹر سرکار نے سب انسپکٹر دتا سے کہا۔ "تم یہیں رہنا۔ دو نمبر کمرے کی کنجی اپنے پاس رکھو۔ انگلیوں کے نشانات کے ماہر کے آنے پر دروازہ کھول دینا۔ ہم لوگ کچھ دیر کے لیے باہر جا رہے ہیں۔" ــــ سراغرساں بکلیش، انسپکٹر سرکار اور سب انسپکٹر گھوش ہوٹل سے نکل کر باہر آئے۔ انسپکٹر نے ڈائری جیب سے نکالی۔ "اس وقت گھر پر بھی کوئی ملے گا یا نہیں؟ خیر چلیے، سب سے پہلے جگت بندھو سے ملا جائے۔" ٹیکسی لے کر تینوں جگت بندھو کے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ ٹیکسی پر انسپکٹر نے بکلیش سے دریافت کیا۔ "آج صبح سے آپ بالکل خاموش ہیں۔ آخر اس قتل کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟"

"ابھی کچھ کہنے کا وقت نہیں آیا ہے۔ وقت آنے پر میں اپنی رائے ظاہر کروں گا۔" بکلیش نے جواب دیا۔

جگت بندھو ایک تین منزلہ عمارت کے نیچے کی فلیٹ میں رہتا تھا۔ دروازہ کھٹکھٹاتے ہی ایک شخص باہر آیا۔ خشخشی ڈاڑھی سیاہ رنگ ناٹے قد کا آدمی عمر تقریباً چالیس سال۔ انسپکٹر نے پوچھا۔ "جگت بندھو آپ ہی کا نام ہے؟"

"جی ہاں" اُس نے جواب دیا۔ پولیس کو دیکھ کر گھبراہٹ اور پریشانی اُس کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہی تھی۔ اُس نے پوچھا، "آپ کو کیا چاہیئے؟"

"نرالا ہوٹل میں کل رات خون ہو گیا ہے۔ مقتول کا نام راج کمار ساہو ہے۔" یہ سن کر جگت بندھو چونک اٹھا۔ اور کہنے لگا۔ "راجکمار کا قتل ہو گیا ہے؟"

"ہاں اسی قتل کے سلسلے میں آپ سے چند سوالات کروں گا۔"

"آئیے اندر آئیے" یہ کہتے ہوئے جگت بندھو نے ان لوگوں کو کمرے میں بٹھایا اور کہا "تشریف رکھیے، میں ابھی حاضر ہوا" اور اندر کی طرف چلا گیا۔ کمرے میں سامان کچھ زیادہ نہیں تھا۔ ایک میز، تین کرسیاں، میز پر ٹیلیفون۔ جگدیش نے چاروں طرف غور سے دیکھا۔ مگر مالک مکان کی شخصیت کا پرتو کسی چیز میں نظر نہیں آیا۔ میز کی دراز سے البتہ گھوڑ دوڑ کی بہت سی کتابیں نکلیں۔ پانچ منٹ گزرا۔ دس منٹ۔ مگر جگت بندھو کمرے سے نہیں نکلے۔ انسپکٹر سرکار نے پکارا۔ "جگت بندھو بابو!" مگر کوئی جواب نہیں۔ جگدیش نے انسپکٹر سے کہا "جگت بندھو گھر پر نہیں ہیں۔" انسپکٹر سرکار اندر کے کمرے میں گئے۔ اور دیکھا کہ پیچھے کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ اور مکان میں کوئی نہیں ہے۔ انسپکٹر نے جگدیش کو بتایا کہ وہ بھاگ گیا ہے۔ فون سے تھانے میں خبر کی کہ ایک سپاہی فوراً یہاں بھیج دیا جائے۔ تاکہ وہ یہاں پہرہ دے۔ اور انگلیوں کے نشانات کے ماہر کو بھیج دے۔ اس کے بعد سب انسپکٹر گھوش سے کہا کہ تم بھی یہیں ٹھہرو کم از کم انگلیوں کے نشانات سے تو ملزم کا پتہ چل سکتا ہے۔ پرانا مجرم معلوم ہوتا ہے۔ سب انسپکٹر گھوش کو وہاں چھوڑ کر جگدیش اور انسپکٹر سرکار باہر نکل آئے۔ انسپکٹر نے جگدیش سے پوچھا۔ "جگت بندھو کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ قتل میں اس کا بھی ہاتھ ہو سکتا ہے؟"

"ٹھیک نہیں بتا سکتا۔ قتل کی خبر سے چونک اٹھا تھا۔ مگر اداکاری بھی ہو سکتی ہے۔" یہاں سے وہ لوگ موہن لال کنڈو کے یہاں پہنچے۔ معلوم ہوا کہ کنڈو بابو بال بچوں کے ساتھ بنارس گئے ہوئے ہیں۔ اور لوٹنے میں دیر ہو گی۔ یہاں سے شیاما کانتو بابو کے گھر جانے پر معلوم ہوا کہ وہ دفتر گئے ہوئے ہیں۔ پورٹ کمشنر کے دفتر میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں۔ اور شام سے پہلے ان سے ملاقات نہیں ہو سکتی۔ انسپکٹر سرکار نے کہا۔ "اب ہمیں مسز لتیکا چودھری کے یہاں چلنا ہے۔ محترمہ اس وقت یقینی گھر پر ہوں گی۔"

مسز لتیکا چودھری فلیٹ کے بجائے ایک علیحدہ مکان میں رہتی تھیں۔ مکان نہایت ہی صاف ستھرا۔ سامنے چھوٹا سا خوبصورت باغیچہ۔ گھنٹی بجاتے ہی چشمہ لگائے مسز چودھری باہر آئیں اور کہا۔ "مسٹر چودھری گھر پر نہیں ہیں۔"

انسپکٹر سرکار اس کو دیکھتے ہی چونک پڑا۔ جرنیل سنگھ نے صبح کو جس عورت کا حلیہ بتایا تھا، صورت اس سے ملتی تھی۔ عمر بیس پچیس کے بجائے تقریباً تیس سال ہو گی۔ صحت نہایت ہی عمدہ اور کافی خوبصورت۔

انسپکٹر سرکار نے سوال کیا۔ آپ کا نام مسز لتیکا چودھری ہے۔؟"

"جی ہاں، کہیے، کیا ضرورت ہے۔؟"

"آپ سے چند باتیں پوچھنی ہیں۔"

"اندر تشریف لائیے۔" یہ کہتے ہوئے مسز چودھری انہیں کمرے کے اندر لے آئیں۔ اور بیٹھنے کی درخواست کی۔ بیٹھنے کا کمرہ سلیقے سے سجا ہوا تھا۔ صوفہ، بک شیلف، سینٹر پیس، ریڈیوگرام، دیوار پر ایک ادھیڑ عمر شخص کی تصویر ٹنگی ہوئی تھی۔ جس کے چہرے سے سختی نمایاں تھی۔ سراغرساں جگدیش اور انسپکٹر ایک ہی صوفے پر بیٹھ گئے۔ مسز چودھری سامنے ہی ایک کرسی پر بیٹھیں۔ وہ بے حد پریشان نظر آ رہی تھیں۔"

"آپ کے شوہر کا کیا نام ہے؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"تارا کمار چودھری۔"

"کیا کام کرتے ہیں؟"

"ریلوے میں انجینیر ہیں!"

"آپ کے کتنے بچے ہیں؟"

"ایک بھی نہیں۔"

"کل رات آپ سوا نو بجے نرالا ہوٹل کس لیے گئی تھیں؟"

"نہیں نہیں، میں تو کل سنیما دیکھنے گئی تھی۔"

"ہوٹل کے دربان نے کل رات دیکھا ہے، وہ آپ کی شناخت کر سکتا ہے۔"

مسز چودھری یہ سن کر اور بھی گھبرا اٹھیں۔ اور کہنے لگیں۔ "میں کل سنیما دیکھنے گئی تھی۔ ٹکٹ کا آدھا حصہ اب بھی میرے پاس موجود ہے۔"

"آپ نے سنیما کا ٹکٹ ضرور خرید ا تھا اور سنیما بھی گئی تھیں۔ مگر ہال سے باہر آ گئیں۔ اور پھر نرالا ہوٹل گئی تھیں، اور راج کمار باسو سے بھی ملی تھیں۔"

"راج کمار باسو، میں کسی راج کمار باسو کو نہیں جانتی۔"

سراغرساں بکلیش نے دوسرا وار کیا۔ "سوکانتو سین کو جانتی ہیں؟"

اب مسز چودھری بے قابو ہو گئیں۔ اور زار و قطار رونے لگیں۔ سراغرساں نے آہستہ سے مسز چودھری کو تسلّی دیتے ہوئے کہا۔ "ہمیں معلوم ہے کہ راجکمار باسو اور سوکانتو سین ایک ہی شخص تھا اور عرصہ سے آپ کو بلیک میل (Black Mail) کر رہا تھا۔ کل سنیما سے نکل کر آپ اُسے روپے دینے گئی تھیں۔ آپ اُس کے متعلق جو کچھ جانتی ہیں ہمیں تفصیل سے بتائیے۔ آپ کو کوئی خطرہ نہیں۔ کل رات اس کا خون ہو گیا ہے۔"

"مجھے اس کے متعلق جو کچھ بھی معلوم ہے تفصیل سے بتاؤں گی۔ مگر بھگوان کے لیے اس کی خبر میرے شوہر کو نہ ہونے پائے، وہ بہت سخت مزاج آدمی ہے۔"

انسپکٹر نے کہا۔ "اگر کوئی خاص مجبوری نہیں ہوئی تو، تمام باتیں ہمیں تک محدود رہیں گی۔"

مسز چودھری نے کہنا شروع کیا۔ "آج سے تقریباً بارہ سال پہلے جب میں کنواری تھی اور کالج میں پڑھتی تھی اُس زمانے میں سوکانتو سین فلمی دنیا کا مشہور ہیرو تھا۔ اور کالج کی لڑکیاں اُس پر مرتی تھیں۔ میں ماں باپ کی اکلوتی لڑکی تھی۔ لہٰذا میرا وقت ہمیشہ کھیل کود اور تفریح میں گزرتا تھا۔ ہمارے گھر کے لوگ آزاد خیال تھے۔ اور لڑکیوں پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ میں بھی سوکانتو سین پر بُری طرح فریفتہ ہو گئی اور اُس سے خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہم لوگ اکثر چھپ چھپ کے ملتے بھی تھے۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر شادی کروں گی تو سوکانتو سے ہی کروں گی۔ اتفاق کی بات مجھے کسی طرح معلوم ہو گیا کہ سوکانتو سین شادی شدہ ہے۔ اور فریب دے کر لڑکیوں کی زندگی برباد کرنا اس کا مشغلہ ہے۔ میں اُس سے کنارہ کش ہو گئی۔ میرے والد صاحب کو بھی میری محبت کی بھنک پڑ گئی تھی۔ انھوں نے میری شادی کر دی۔ شادی کو دو سال ہو چکے تھے کہ اخبار میں یہ سنسنی خیز خبر شایع ہوئی کہ سوکانتو سین ایک لڑکی کے

قتل کے جرم میں گرفتار ہو گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اُس نے ایک لڑکی کو فریب دے کر بھگا لیا۔ وہ لڑکی اُسی کے ساتھ رہتی تھی۔ وہ شادی کی بات جب بھی کرتی سوکانتو ٹال جاتا۔ ایک دن اُس لڑکی نے سوتے میں سوکانتو پر چھری سے حملہ کیا اور اُس کے چہرے کو بری طرح زخمی کر دیا۔ سوکانتو نے اپنی مدافعت میں اُس لڑکی کا گلا دبوچنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ وہ ختم ہو گئی۔ مقدمہ بہت دنوں تک چلتا رہا اور اس عرصہ میں میں بے حد پریشان رہی مجھے ڈر تھا کہ کہیں میرا ذکر نہ آجائے۔ بہرحال مقدمہ ختم ہو گیا۔ اور چونکہ یہ ثابت ہو گیا تھا کہ سوکانتو نے اپنی جان بچانے کے لیے اس لڑکی کا خون کیا تھا۔ لہٰذا وہ رہا ہو گیا۔ مگر اس کی زندگی برباد ہو چکی تھی۔ ایک بدشکل آدمی کو ہیرو کون بناتا۔ بہت دنوں تک اس کی کوئی اطلاع نہیں ملی۔ یکایک ایک دن میرے گھر پر حاضر ہوا۔ مجھ سے روپے کا تقاضا کیا۔ اُس نے کہا کہ اگر میں اُسے چھ چھ مہینے پر تین سو روپے نہیں دوں گی تو وہ میرے تمام خطوط میرے شوہر کو دے دے گا۔ بہرحال مجھے اس کی بات ماننی پڑی اور میں اُسے روپے دے رہی ہوں۔ کل رات میں اُسے روپے دینے ہی کے لیے نرالا ہوٹل گئی تھی۔"

مسز چودھری کی کہانی سن کر انسپکٹر اور بکیش کچھ دیر خاموش رہے۔ اس کے بعد کہا کہ اب ہم لوگ جا رہے ہیں۔ آپ مطمئن رہیں۔ آپ کو کوئی خطرہ نہیں۔ گھر سے نکل کر دونوں سڑک پر آگئے۔ انسپکٹر سرکار نے بکیش سے کہا۔" مسز — چودھری کی رام کہانی تو سنی مگر اس سے قاتل کا کوئی سراغ نہیں ملتا" بکیش نے کہا۔ "مگر اس سے ہمیں تفتیش میں بہت مدد ملے گی۔"

مسٹر بکیش نے انسپکٹر سے کہا۔" آج جتنے بیانات لیے گئے ہیں اُن میں کسی نے اپنے بیان میں ایک ایسا جملہ کہا تھا جو اب تک میرے ذہن سے محو نہیں ہو سکا۔ اگرچہ یہ بات غیر شعوری طور پر کہی گئی تھی۔ مگر اس سے قاتل کے سراغ لگانے میں مدد مل سکتی ہے۔ مگر یہ خیال نہیں پڑتا کہ یہ جملہ کس نے کہا تھا۔" انسپکٹر نے گھڑی کی طرف دیکھا کہ تین بج رہے تھے۔ انسپکٹر سرکار بکیش سے رخصت ہو کر تھانے میں چلا گیا۔

تقریباً پانچ بج رہا تھا۔ سراغ رساں بکیش چائے پینے کے بعد بستر پر لیٹ گیا۔ تقریباً ساڑھے چھ بجے کسی ضرورت سے مسز بکیش جب سونے کے کمرے میں آئیں تو بکیش یکایک بستر سے اُٹھ بیٹھا۔ مسز بکیش نے پوچھا کیا بات ہوئی؟ آپ اتنی جلدی کیوں اُٹھ بیٹھے؟ بکیش نے کہا "مجھے ایک ضروری بات یاد آگئی ہے اور ابھی ابھی باہر جانا ہے۔" "دو دن کے بعد تو گھر لوٹے اور پھر جانے کی اتنی جلدی پڑ گئی۔ آخر کہاں جائیے گا؟" "روزنامہ ہنگامہ کے دفتر جا کر پرانی فائلیں دیکھنی پڑیں گی۔ مجھے دس سال پہلے کے اخبارات کی ضرورت ہے۔" تھوڑی دیر بعد مسٹر بکیش باہر نکل گیا۔

دوسرے دن صبح کو مسٹر بکیش نے انسپکٹر سرکار کو فون کیا۔ کوئی تازہ خبر ہے؟۔ نہیں کوئی خاص بات نہیں۔ شاما کانتو کے گھر پر گیا تھا۔ مگر اُنھوں نے راج کمار کو پہچاننے سے انکار کر دیا۔ اور یہ بھی کہا کہ وہ نرالا ہوٹل کبھی نہیں گیا۔ انھیں اب تک گرفتار نہیں کیا گیا ہے۔ مگر پولیس نگرانی کر رہی ہے۔ اس کے بعد مسٹر بکیش نے دریافت کیا۔ جگت بندھو کی خبر ملی۔ اس کا اصلی نام بھگوان رام ہے۔ ایک عورت کے قتل کے سلسلے میں اسے چودہ سال کی سزا ہوئی تھی۔ وہ جیل سے بھاگا ہوا قیدی ہے۔ اور کلکتے میں فرضی نام سے ریس کی دلالی کرتا ہے۔ پولیس تلاش میں ہے۔" انسپکٹر سرکار نے جواب دیا۔ ہوٹل کی کیا حالت ہے؟ بکیش نے پوچھا — ہوٹل کے تمام مسافر جانے کے لیے بے چین ہیں۔ سوچ رہا ہوں کہ آج شام تک جانے کی اجازت دیدوں گا۔ آپ کو کچھ پتہ چلا؟ مسٹر سرکار نے پوچھا — ہاں میں ابھی نرالا ہوٹل آرہا ہوں۔ آپ بھی فوراً پہنچیے۔ یہ کہہ کر بکیش نے ٹیلیفون رکھ دیا۔

ایک نمبر کمرے کے سامنے انسپکٹر سرکار اور سراغ رساں بکیش دونوں پہنچ کر ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ دستک دیتے ہی کمرے کا دروازہ کھل گیا۔ اور لیڈی ڈاکٹر شوبھنا رائے انسپکٹر سرکار کو دیکھتے ہی برس پڑی۔ آپ بلا وجہ ہمیں اور کتنے دنوں تک پریشان کریں گے۔ کسی کو اس طرح روکنا بھی جرم ہے۔"

"میری غلطی اگر آپ کو کوئی شکایت ہے تو عدالت ہی میں کیجیے گا۔" یہ کہتے ہوئے انسپکٹر سرکار اور سراغ رساں بکلیش کمرے میں داخل ہوئے۔ مسٹر بکلیش نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "مجھے آپ سے چند سوالات کرنے ہیں بیٹھیئے!" ڈاکٹر شوبھنا رائے چیخ پڑی۔ "آپ کون ہیں؟ اور آپ کو مجھ سے کیا کام؟" انسپکٹر سرکار نے جواب دیا کہ "آپ مشہور سراغ رساں مسٹر بکلیش داس ہیں۔ اور قتل کے سلسلے میں آپ سے مزید کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔" یہ سن کر ڈاکٹر شوبھنا رائے کا رنگ فق ہو گیا۔ اور چپ چاپ پلنگ پر بیٹھ گئی۔ پھر کہنے لگی۔ "جو کچھ پوچھنا ہو جلد پوچھیے۔ میں آج ہی شام برہم پور واپس چلی جاؤں گی۔"

"یہ تو مستقبل کی بات ہے ابھی جو کچھ کہہ رہا ہوں اُسے غور سے سنیے!" مسٹر بکلیش نے کہا۔ "سوکانتو سین ایک مشہور فلمی اداکار اور مقبول ہیرو تھا۔" لیڈی ڈاکٹر شوبھنا رائے یہ سن کر چونک پڑی۔ بکلیش دوبارہ کہنے لگا۔ "آپ سوکانتو سین کو پہچانتی ہیں۔ کیوں نہیں پہچانیں گی۔ آخر آپ کا داماد تھا۔ سوکانتو سین نے کافی نام پیدا کیا تھا۔ جس زمانے کی بات ہے اُس وقت آپ اپنی اکلوتی بیٹی کے ساتھ بردوان میں رہا کرتی تھیں۔ آپ کی لڑکی سے سوکانتو کے اچھے خاصے مراسم تھے۔ اور وہ اکثر اُس سے ملنے بردوان جایا کرتا تھا۔ آخر ایک دن سوکانتو آپ کی لڑکی کو لے کر کلکتہ بھاگ آیا۔ وہ اُسے ہیروئن بنانے کی لالچ دے کر یہاں لے آیا تھا۔ دونوں ایک ہی فلیٹ میں رہا کرتے تھے۔ ایک دن دونوں میں خوب لڑائی ہوئی۔ رات کو جس وقت سوکانتو سو رہا تھا اندھیرے میں آپ کی لڑکی چھری لے کر اُس پر حملہ آور ہوئی۔ سوکانتو نے اپنی جان بچانے کے لیے آپ کی لڑکی کو گلا دبوچ کر مار ڈالا۔ سوکانتو کی صورت مسخ ہو چکی تھی۔ اور وہ بُری طرح زخمی ہو گیا تھا مہینوں پولیس ہسپتال میں زیر علاج رہا۔ جب وہ عدالت میں حاضر ہوا، تو اُس کی صورت بگڑ گئی تھی۔ اور چہرہ اس قدر خوفناک ہو گیا تھا کہ اُسے دیکھ کر حاکم بھی چونک پڑا۔ زخم سوکھ گیا تھا۔ مگر اب وہ اداکاری کے قابل نہ تھا۔ آپ بھی اس مقدمہ میں گواہ کی حیثیت سے پیش ہوئی تھیں۔ آپ نے بے انتہا کوشش کی تھی کہ سوکانتو کو سزا ہو جائے۔ مگر آپ کی تمام کوششیں بیکار گئیں اور اور سوکانتو رہا ہو گیا۔"

لیڈی ڈاکٹر شوبھنا رائے چیخ اُٹھی۔ "بالکل غلط ہے۔ میری لڑکی کو سوکانتو ہی نے قتل کیا تھا۔ پہلے اس نے میری لڑکی کو مار ڈالا۔ اور پھر خود اپنے ہاتھوں سے چہرے کو بگاڑ لیا۔"

سراغ رساں بکلیش نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "بالکل ناممکن۔ کیونکہ ایک اداکار کسی قیمت پر بھی اپنی صورت کو بگاڑ نہیں سکتا۔ خیر جانے دیجیے سوکانتو رہا تو ہو گیا تھا۔ لیکن اس کی زندگی برباد ہو چکی تھی۔ اب وہ کسی کام کے قابل نہ تھا۔ لہٰذا وہ کلکتہ سے پٹنہ بھاگ گیا۔ اور وہاں جا کر اُس نے بلیک میلنگ (Black Mailing) کا پیشہ شروع کیا۔ گذشتہ دس سال کے عرصہ میں دہلی، کلکتہ، بنارس میں اُس نے بہتوں کو اپنا نشانہ بنایا۔ اُس کا طریقہ نرالا تھا۔ وہ کسی کو پریشان نہیں کرتا۔ وقت مقررہ پر آتا اور پیسے وصول کر کے واپس چلا جاتا۔ اس سلسلے میں جب بھی وہ کلکتہ آتا۔ نرالا ہوٹل ہی میں ٹھہرتا۔ آپ اس عرصہ میں بردوان سے تبدیل ہو کر برہم پور چلی گئی تھیں۔ آپ بھی جب کبھی کلکتہ آتیں تو نرالا ہوٹل ہی میں ٹھہرتیں۔ مگر ایسا کبھی نہیں ہوا کہ بیک وقت آپ دونوں نے یہاں قیام کیا ہو۔ اب کی دفعہ اتفاق سے وہ آپ کے بغل کے کمرے ہی میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اُس کی نظر آپ پر نہیں پڑی تھی۔ ورنہ وہ ہوشیار رہتا۔ انتقام کا جذبہ آپ کے دل میں پرورش پا رہا تھا۔ مگر دس سال کے طویل عرصے نے اسے کچھ دبا دیا تھا۔ اب اُسے قریب پا کر یہ جذبہ دوبارہ جاگ اُٹھا۔ اور اسی رات کھانا کھانے کے بعد آپ اپنے کمرے میں موقع کا انتظار کرنے لگیں۔ سوکانتو کے قتل کرنے کی اسکیم آپ پہلے ہی بنا چکی تھیں۔ سوا نو بجے سے لوگ اُس کے پاس آنے لگے۔ اور یہ سلسلہ دس بجے تک جاری رہا۔ اس وقت دوسرے کمرے میں سب لوگ سو چکے تھے۔ سیڑھی پر جو نوکر سوتا تھا وہ اب تک نہیں آیا تھا۔ آپ اوزار ہاتھ میں لیے باہر نکلیں۔ دو نمبر کمرے کے دروازے پر دستک دیا۔ سوکانتو اپنے بستر پر تھا اُس نے اُٹھ کر جیسے ہی دروازہ کھولا۔ آپ نے باہر سے چھری اُس کے سینے میں اتار دی۔ اور ہینڈل کو کھینچ کر دروازہ بند کرنے کے بعد اپنے کمرے میں چلی آئیں۔ آپ کے ایک ہی وار سے راج کمار یا سوکانتو بابو کا کام تمام ہو چکا تھا۔ آپ سے اور راج کمار بابو سے جو تعلق تھا

اس کی جرأت سی لانہ سی۔ لہٰذا آپ پر کون شبہ کر سکتا تھا۔ بلکہ رات کو جو لوگ راجکمار سے ملنے آئے تھے، پولیس کو انھیں پر شبہ ہوا اور پولیس ان کے پیچھے پڑ گئی۔ مگر آپ کی صرف ایک معمولی غلطی نے تمام راز فاش کر دیا۔ انسپکٹر صاحب جس وقت آپ سے جرح کر رہے تھے تو اُس وقت آپ نے یہ جملہ بھی کہا تھا کہ آپ نے راجکمار کو کبھی نہیں دیکھا۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ نے یہ بھی کہا تھا کہ ایسا چہرہ بھی کوئی بھول سکتا ہے۔ اگر آپ نے اُسے کبھی نہیں دیکھا تھا تو یہ بات کیسے کہہ سکتی تھیں۔ لاش کمرے کے اندر پڑی تھی۔ اور آپ کمرے کے اندر نہیں گئیں۔ اگر یہ جملہ آپ کی زبان سے نہ نکلتا تو مجھے تفتیش میں بڑی دشواری ہوتی۔ اسی جملے نے اخبارات پڑھنے پر مجبور کیا۔" اتنا کہہ کر سراغ رساں بمکیش خاموش ہو گیا۔

لیڈی ڈاکٹر شو بھنا رانے زور زور سے رونے لگی۔ اور کہنے لگی۔ "یہ سراسر بہتان ہے۔ میں نے راجکمار کو قتل نہیں کیا۔ میں عورت ہو کر کیسے قتل کر سکتی ہوں۔ میرے پاس کوئی اوزار نہیں۔"

سراغ رساں بمکیش نے لیڈی ڈاکٹر کے بیگ کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ "اوزار اس کے اندر ہے۔"

"نہیں، اس کے اندر نہیں ہے۔" کہتی ہوئی لیڈی ڈاکٹر بیگ کی طرف دوڑ پڑی۔ اور بیگ سے ایک تیز جراحی کی قینچی (Surgical Scissor) نکال کر اپنے سینے میں گھونپنے کی کوشش کی۔ مگر انسپکٹر سرکار نے دونوں ہاتھوں سے اُسے پکڑ لیا۔ لیڈی ڈاکٹر پکار اُٹھی۔

"مجھے چھوڑ دو، مجھے مرنے دو۔"

بمکیش نے کہا۔ "شکر ہے کہ اوزار بھی مل گیا۔ اس کے نہ ملنے سے جرم کے ثابت کرنے میں بے حد دشواری ہوتی۔"

ادب کا اعلیٰ معیار ہمارا معیار ہے

اور

نیا دور کا نام اس معیار کی ضمانت ہے

نیا دور کراچی

کا تازہ شمارہ ۳۵-۳۶ شائع ہو گیا ہے۔ قیمت تین روپے

- اس میں پاکستان و ہندوستان کے بہترین لکھنے والے اپنی معیاری اور اعلیٰ تخلیقات کے ساتھ شامل ہیں۔
- اپنے کسی قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیے یا براہ راست ہمیں لکھیے۔

منیجر نیا دور کراچی ۵

دسمبر کی ٹھٹھری ہوئی رات کا سناٹا کائنات پر چھایا ہوا تھا۔ تاریکی کی دبیز چادر آکاش سے دھرتی تک تنی ہوئی تھی۔ اُس کے وارڈ کے سامنے جامن، نیم، برگد، شہتوت اور شیشم کے گھنے درخت کہر میں ڈوبے آسیب زدہ معلوم ہو رہے تھے۔ اور پتوں میں سے گزرتی ہوئی پچھوا ہوا کی سراسراہٹ دکھی دکھی سسکیاں بھر رہی تھی۔ آخری مہینہ کا بیمار زرد چاند کا چہرہ بھی سہما ہوا معلوم ہو رہا تھا ہسپتال کی راتیں کیسی کربناک ہوتی ہیں کہ بیمار کے ساتھ تیماردار بھی بے حد اُداس ہو جاتا ہے۔ اور وہ تو تھی ہی بیمار۔ دکھی۔ مختلف وارڈوں سے مریضوں کے کراہنے کی آواز میں خود اُس کی آواز دب گئی تھی۔ یوں بھی تو وہ بڑی مستقل مزاج اور ثابت قدم تھی۔ اور پھر ابھی صرف ایک ماہ قبل اسی ہسپتال کی نامی گرامی ہر دلعزیز لیڈی سرجن تھی۔ اس لیے بھی مریضوں کے دُکھ میں اپنا دُکھ بھول جانے کی تو وہ عادی ہو چکی تھی۔ آج ہی اس کا تیسرا آپریشن ہوا تھا۔ اور ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ ذرا بھی غم اور فکر سے حالت نازک ہو سکتی ہے۔

لیکن مجھے اب کس کے لیے جینا ہے؟ — اُس نے سوچا۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ اور ابھی ابھی نرس اُسے دوا پلا کر گئی تھی۔ اور کوریڈار سے اُس کے سینڈلوں کی ٹک ٹک صاف سنائی دے رہی تھی۔ سامنے پلنگ پر اُس کی امی لیٹی تھیں۔ کئی راتیں جاگنے کے بعد ابھی ذرا اُن کی آنکھ لگی تھی۔ اور اُن کے جھرّیوں دار حسین چہرے پر مصائب کی لکیریں دیکھ کر اُس کا دل مسوس گیا۔ لیکن نرس اور ڈاکٹروں کے کہنے کے بالکل خلاف وہ آج سب کچھ سوچے گی۔ شاید یہ زندگی کی آخری رات ہو اور کاروانِ ہستی کو الوداع کہنے کے لیے اُسے بہت کچھ سوچنا تھا۔

اُس نے بے حد نڈھال انداز میں چاروں طرف اپنی نیلی نیلی خوبصورت آنکھوں سے دیکھا۔ تو بات یہ تھی کہ میں جو کہ بے حد لائق فائق اور علی گڑھ یونیورسٹی کی تیز طرار لڑکی تھی اور جس کے متعلق لوگوں کا خیال تھا کہ وہ بے انتہا سنگدل ہے اور جس کو دیکھ کر بڑے بڑے شوپن ہائر ٹائپ کے لڑکے بھی دل تھام کر رہ جاتے تھے۔ اور جو ہر محفل ہر تقریب میں، کلب میں، ہوٹلوں میں ہر گاہ میں ہر جگہ دوستوں میں مقبول تھی۔ اور لوگوں کو سرپرائز دے کر کئی کئی دن موضوعِ سخن بنی رہتی تھی۔ اب کچھ نہیں۔ کیونکہ لوگوں کو سرپرائز دیتے دیتے قسمت نے اُسے سرپرائز دینا شروع کر دیا۔ وہ دراصل دُکھی ہے۔ بہت دُکھی ہے۔ کاش زندگی میں وہ لازوال سا لمحہ آیا ہی نہ ہوتا جب نینی تال کی پہاڑیوں میں بہت دُور تک قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہونے کے لیے چلی گئی تھی۔ اور پھر ایک دم رات کی دیوی نے ہمالہ کی چوٹیوں سے اُترنا شروع کیا۔ اور وہ عجیب غریب انسان اسے ملا۔ اور پھر اسے گھر تک بڑے احترام اور بے حد اخلاق سے چھوڑ گیا۔ بس یہ لمحہ زندگی میں آیا ہی نہ ہوتا تو — کتنا اچھا تھا۔ میں

کیسی بدنصیب ہوں ۔ میں یعنی زیبا علی کاظمی ۔ اور اب میں نہیں رہوں گی ۔ انسان کے ہونے نہ ہونے میں فرق ہی کیا ہے ۔ جب عدم ہے تو وجود نہیں اور وجود ہے تو عدم نہیں ۔ لیکن اس کا کیا ثبوت کہ وہ اب تک واقعی تھی ۔ شاید اس لیے کہ چلتی پھرتی تھی، بولتی چالتی تھی ۔ کانگریس کے جلسوں میں تقریریں کرتی تھی ۔ مسلم لیگ کا مذاق اُڑاتی تھی اور جلسوں، تقریبات اور کلب میں یہ بھول جاتی تھی کہ وہ لڑکی ہے اور جب کوئی صاحب عشق کا اظہار فرماتے تھے وہ چٹکیوں میں اُڑا دیتی تھی اور سہیلیوں میں بیٹھ کر گپاشپ کیا کرتی تھی ۔ اور جیسے موسیقی سے خدا واسطے کا بیر تھا ۔ یہ سب وجود کا ہی تو ثبوت ہے ۔ الفاظ ۔ صرف الفاظ ہماری زندگی کی سب سے اہم چیز ہیں ۔ یہ بھی تو ایک لفظ ہے "سرپرائز" ۔

اب اس کا کیا علاج کہ وہ جنم جنم سے ایسی ہی تھی ۔ سفید رنگت ۔ بڑی بڑی نیلگوں آنکھیں ۔ اماوس کی راتوں جیسے سیاہ بال ۔ موٹے لیکن بے حد خوبصورت ہونٹ اور چہرے پر پھیلی ہوئی معصومیت اور شوخی کی ملی جلی کیفیت یہ ذہانت، اس کو دیکھنے والے کو پہلی نظر میں زبردست سرپرائز کا شکار ہونا پڑتا ۔ بچپن میں بھی اُس کی حرکتیں عجیب ہوتیں ۔ بہترین کھلونوں کو پھینک دیتی اور ٹوٹے پھوٹے کھلونے انتہائی احتیاط سے سنبھال کر رکھ لیتی ۔ اسکول میں جو لڑکیاں لڑکے اُس پر فدا ہوتے انھیں بالکل لفٹ نہ دیتی ۔ اور جن لڑکیوں اور لڑکوں کو کوئی لفٹ نہ دیتا اُن سے انتہائی ہمدردی سے ملتی ۔ اور جب وہ کالج تک پہنچی تو اُس کی اول جلول حرکتوں سے گھر کے علاوہ باہر والوں کا بھی ناک میں دم رہتا ۔ اکلوتی بچی ہونے کی وجہ سے ماں اُسے دیکھ کر جیتی، باپ بھی بیحد چاہتے ۔ لیکن وہ ماں کی طرح لاڈ کرنے کے قائل نہیں تھے، وہ خاصے درشت مزاج اور سخت گیر تھے اور ان کا خیال تھا کہ بچوں کو ذمہ دار بنانے کے لیے ان سے زیادہ پیار ظاہر نہیں کرنا چاہیے پھر بھی جیسے باپ، اس کے آئیڈیل ہوکر رہ گئے تھے ۔ کالج میں اُسے اس وقت کتنا لطف آتا جب کالج کے کسی ڈرامے کی ہیروئن ہوتی ۔ ریہرسل میں اُس کی ایکٹنگ پر تحسین و آفرین کے کلمے بلند ہوتے ۔ اور وہ عین ڈرامے کے دن علی گڑھ کے بجائے آگرے میں بیٹھی تار دے دیتی کہ ممی یاد آرہی تھیں، اس لیے آگئی ۔ اُس نے اس طرح کی کئی تقریبات کا ستیاناس کیا تھا ۔ اس طرح لوگوں کو پریشان کرکے اور پھر بالواسطہ خود بھی پریشان ہوکر وہ کہتی ۔ "کیسا مزے کا سرپرائز دیا" اور جب اُسے انتہائی بے ڈھنگی لڑکی سمجھ کر علیحدہ کر دیا جاتا تو وہ بغیر کچھ کہے سنے کسی تقریب کی فوری ذمہ داری لے کر اور بڑے اہتمام سے کام سرانجام دے کر پھر ایک بار لوگوں کو سرپرائز دیتی ۔ اور جب لڑکیاں اُسے اس حرکت پر بُرا بھلا کہتیں تو کہتی "یار کیا کروں مجھے تو اصل انداز میں کام کرتا بڑا بے ہودہ معلوم ہوتا ہے ۔ جب دنیا کی ہر شے بے ڈھنگی ہے ہر چیز توازن سے خالی اور تضاد سے بھری ہے تو میرا بے ڈھنگا پن تم لوگوں کو کیوں کھلتا ہے ۔ اور پھر اس سرپرائز دینے میں خود مجھے بھی تو پریشانی اُٹھانی پڑتی ہے ۔ لیکن میں کروں کیا ۔ دوسروں سے زیادہ مجھے اپنی ذات کو پریشان کرکے لطف آتا ہے ۔" اور لڑکیاں حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر کہتیں ۔ "ایک اور سرپرائز ۔"

اُسے یاد آرہا تھا کہ ایک دفعہ اشفاق نے کہا تھا کہ وہ تو خود ہی ایک چلتا پھرتا سرپرائز ہے ۔ اور اُس دن جب وہ سب پکنک پر فتح پور سیکری گئی تھیں تو قلعہ کی ایک بہت ہی خطرناک دیوار پر بیٹھ کر کوئی سرپرائز والی بات کہتے ہوئے دیکھ کر اُس کی پیاری سی کزن ثریا جنید نے پیار بھرے غصے میں لڑکیوں سے کہا تھا ۔ "ارے بکو سویٹ! اس کی تو پیدائش ہی سب سے بڑا سرپرائز ہے ۔ کیونکہ اس کی پیدائش سے مہینوں پہلے امی خطرناک حد تک کمزور اور بیمار ہوگئی تھیں اور ڈاکٹروں کا خیال تھا وہ نہیں بچیں گی ۔ لیکن اس کے باوجود یہ اس حالت میں پیدا ہوگئی اور نہ صرف پیدا ہوئی بلکہ پانچ بھائی بہنوں کے مرنے کے بعد زندہ بچ گئی ۔ اور یہی نہیں امی بھی قابلِ رشک حد تک صحت مند ہوگئیں ۔ اس لیے یہ حیرت انگیز سے حیرت انگیز حرکتیں کر ڈالے تو بھی کم ہیں ۔" (کاش بچپن میں وہ مرجاتی) اُس نے کراہ کر سوچا ۔

اور اُس معاملہ کی سنگینی کو ذرا بھی نہ سوچتے ہوئے اُس نے کیسے اطمینان سے ناظم رضا سے اپنی بچپن سے ہوئی منگنی اپنے خاندانی روایت کے خلاف یہ کہہ کر توڑ ڈالی تھی کہ ناظم پائپ اور سگریٹ کیوں پیتا ہے ۔ والز اور رمبا اتنا اچھا کیوں ناچتا ہے ۔ دنیا بھر کی لڑکیوں کو اپنے گرد کیوں اکٹھے رکھتا ۔ اور بگڑے ہوئے نوابوں کی طرح ہفتوں شکار کے پیچھے کیوں مارا پھرتا ہے ۔ کاؤ بوائز کی طرح لباس کیوں پہنتا ہے ۔

لڑکیوں کی طرح اُس کے ہاتھ نازک اور ہونٹ پتلے اور سرخ کیوں ہیں! اور پھر ان سب کے علاوہ اس حد تک کیوں چاہتا ہے ۔ جیسے بچاری ہو۔ جبکہ میرا باپ جبر و جلال کا مجسمہ ہے ۔ اور ۔ اور ۔ یہ اُس کی ہر محبت ہر نفرت میں جانے اُس کے باپ کا لاشعور کیوں نا شعوری طور پہ اُس کے ذہن میں داخل ہو جاتا ۔ پھر اُس کے اس فیصلے سے سارے خاندان میں کہرام مچ گیا ۔ لیکن وہ اپنے فیصلہ پر اڑی رہی خود کو اور دوسروں کو اذیت پہنچا کر اپنی آن پر اڑے رہنا اس کی فطرت میں داخل تھا ۔ اور جب باپ نے بلا کر درشتگی سے ڈانٹا تو اُسے بڑا اچھا لگا ۔ چلو اس بہانے پاپا نے ڈانٹا تو ۔ خاندانی روایتوں پر چلنے کے باوجود وہ آزاد خیال تھے ۔ اس لیے اُنھوں نے زبردستی مناسب نہیں سمجھی ۔ پھر اُنھیں معلوم تھا کہ اُن کی بیٹی بالکل اُن کی طرح ضدی ہے ۔ جو بات اُدھ می کھوپڑی میں آجائے بمشکل ہی تو نکلتی ہے ۔ مگر یہ سب ہی گزر گیا ۔ وقت کیسا گزر جاتا ہے اور بس اپنے گزرنے کا اذیت ناک احساس چھوڑ جاتا ہے ۔

اس کے باپ خاصے بڑے علاقہ دار تھے ۔ جو گرمیاں شملہ اور نینی تال اور سردیاں آگرہ اور علی گڑھ میں گزارتے تھے ۔ کئی برس آئی سی ۔ ایس رہ چکے تھے ۔ اور کئی رفاہی تنظیموں کے ممبر تھے ۔ اس لیے کانگریس میں بھی بڑی نمایاں شخصیت تھی ۔ مسلم لیگ سے اُنھیں چڑ تھی ۔ کیونکہ ان دنوں یہ ایک کنگال، بھینچر جماعت تھی ۔ اور قائدِ اعظم تھے جو ایسی کنگال جماعت کی سرپرستی کے لیے چل پڑے تھے ۔ اور اس لیے زیبا علی کاظمی کو بھی مسلم لیگ سے انتہائی نفرت تھی ۔ اس کے نظریوں کا مذاق اُڑاتی ۔ کانگریس کے لیے بڑی تن دہی سے کام کرتی ۔ تقاریر کرتی ۔ سوشل ویلفیر کے پروگراموں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتی ۔ آزادی کے لیے چندہ جمع کرتی ۔ علی گڑھ میں پڑھنے کے باوجود اُسے مسلمانوں اور غرباء کے مفاد سے کوئی دلچسپی نہیں تھی ۔ اعلیٰ طبقہ میں پیدا ہونے کا یہی تو فائدہ ہوتا ہے ۔ نام بڑے درشن تھوڑے ۔ ورنہ حقیقت میں سوشل ویلفیر کے لیے تو بڑی قربانی کی ضرورت ہوتی ہے ۔ وہ سب کچھ بہرحال گزر گیا ۔ اور میں جس کی قسمت پر لڑکیاں رشک کرتی تھیں ۔ اور جس کے لیے ناظم رضا دُکھی ہو کر جلا وطن ہو گیا تھا ۔ اور امریکہ کے جنگلوں میں شانتی کی تلاش میں سرگرداں تھا وہ حقیقت میں بہت دُکھی ہے ۔ تب ہی تو ایک دن یوں ہوا کہ اُس نے ایک جگہ مسلم لیگ کے خلاف تقریر کی ۔ اور دوسرے دن قائدِ اعظم کی آمد پر سب سے پہلے اُن سے ملاقات کی ۔ اور ایک دن لکھنؤ کانگریس کے ایک جلسہ میں شرکت کرنے کے لیے گئی اور ہفتہ بھر بعد بڑے وثوق سے یہ خبر ایک صاحبہ علی گڑھ لے کر پہنچیں کہ ایم ۔ بی ۔ بی ۔ ایس کی زیبا علی کاظمی نے اپنی مرضی سے ایک ایسے شخص سے شادی کر لی ہے جو نہ صرف اُس کے باپ دادا کی طرح شاہانِ مغلیہ سے لے کر انگریزی حکمرانوں تک سے حاصل کیے ہوئے خطاب نہیں رکھتا، بلکہ پکا مسلم لیگی ہے ۔ اس کی جائداد بھی ہندوستانی حکومت چھین لے گی ۔ اور جو تین بچوں کا باپ بھی ہے ۔ اور پاکستان بننے پر فوراً نئے وطن چلا جائے گا ۔ اس کی اس حرکت سے باپ کو ایسی مایوسی ہوئی کہ ان پر دل کا دورہ پڑ گیا ۔ یہ تو ایسا سرپرائز تھا کہ ایک جہان دنگ ہو کر رہ گیا ۔ اس کی عقل کا ماتم کرنے لگا ۔ اور اس سے بڑھ کر تو بعد میں لوگوں کو یہ سرپرائز ملا کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ ہرگز پاکستان نہیں جائے گی ۔ نہ ہی اُس کے رشتہ داروں سے ملے گی ۔ اور نہ اس کو یہاں رہنے اور واپس آنے پر مجبور کرے گی ۔ کیونکہ اُسے اپنے نظریات اور اپنی جائداد اور اپنا ماحول بیحد عزیز تھا ۔ ان سب کو چھوڑنے سے اُس کی آن میں فرق پڑتا تھا ۔ اور جب اُس کے شوہر نے کہا تھا کہ ہو سکتا ہے میں کبھی واپس نہ آؤں ۔ تو تم یہ پہاڑ سی زندگی تنہا کیسے گزارو گی تو وہ چڑ گئی ۔

" بھلا یہ آپ مرد لوگ یہ کیوں سمجھتے ہیں کہ آپ کے بغیر زندگی نہیں کٹے گی ۔ عورت مرد سے کہیں زیادہ مضبوط فطرت کی مالک ہوتی ہے ۔ میں دکھا دوں گی میرے ارادوں میں کتنی قوت ہے سمجھے ۔ اور یہ شادی تو ۔ اس لمحہ کو مقید کرنے کے لیے تھی جب میں نے آپ کو اپنا سمجھا ۔ دنیا میں بعض چیزیں بڑی پراسرار ہیں ۔ ان میں سے ایک میرا یہ فعل بھی ہے جب میں اس شادی کے لیے راضی ہو گئی ۔ جس کے بعد سے اس کی آواز مدھم ہو گئی ۔ اور اس کا شوہر ڈوبتے ہوئے سورج کی آخری کرنوں کو مندر کے کلس اور مسجد کے میناروں پر

دیکھتا رہا۔ اور وقت بیتتا رہا۔ اور وہ اُس کو دیکھ کر سوچتی رہی۔ اُس کی عادات، اطوار، غرور، لاپروائی، ذہانت اور سنجیدگی میں بڑی
پاپا کی کس قدر مشابہت ہے سوائے اس کے کہ اس کی شخصیت اور زیادہ پُرکشش ہے۔ اس کی آواز۔ ہاں بھی تو۔ خیر۔ اور مسلم لیگی
ہے۔ لیکن میں اس کے نظریہ کو ایک منٹ کے لیے بھی نہیں مانتی۔ نہ مانوں گی۔ وہ لمحہ کیسا تھا!۔ اُس نے بڑے دکھ سے سوچا۔

اور پھر تو جیسے اُس پر سوالوں کی بوچھار ہوگئی ۔ امی کو تو اُس نے یہ جواب دے دیا کہ وہ بہرحال ذات برادری کا ہے
خاندانی اور حد سے زیادہ اونچے کردار کا ہے۔ اور پھر یہ کہ میری جائداد کہیں نہیں جائے گی۔ اُس نے خالص جاگیردارانہ ٹرم میں
بات سمجھائی۔ لیکن لڑکیوں سہیلیوں کے اس سوال کا جواب وہ کیا دیتی کہ کیا دیکھ کر مرمٹی ہو تم۔ ڈارلنگ تم جس پر ایک جہان فدا تھا۔
تو وہ اُنھیں کیسے سمجھاتی کہ بعض وقت کوئی ایک جھونکا، کوئی ایک مسکراہٹ، کسی کی ایک نظر، ذرا سی خوشبو پلک جھپکنے کا انداز
یا ذرا سا جملہ کیسا تمام زندگی کو بیکار کر دیتا ہے۔ یہ چیز تو ایسی نازک ہے کہ بتائی ہی نہیں جا سکتی۔ اور وہ ہنس کر صرف یہی
کہتی کہ ایک عظیم سرپرائز۔ اب اسے کیا معلوم تھا۔ یہ سرپرائز اُس نے نہیں قسمت نے اُسے دیا ہے۔ اور پھر تو جیسے قسمت کو سرپرائز
دینے کا چسکا ہی پڑ گیا۔ اور اسے تاج محل کی برج سے اُترتے ہوئے چراغ کی مدھم روشنی میں اُس کا سراپا کبھی نہ بھولتا وہ کیسا
حیرت انگیز لگ رہا تھا۔

اُف وہ۔ اور پھر اُنھوں نے شادی کی اور پاکستان بن گیا اور وہ چلا گیا۔ اور وہ ایم۔بی۔بی۔ایس کرکے آگرہ کے سرکاری
ہسپتال میں ملازم ہوگئی۔ اور اُس کے باپ جن کا کبھی ڈنکا بجتا تھا۔ ایک دم بوڑھے ہوگئے۔ لوگوں کی ابن الوقتی اور طوطا چشمی نے
اُن کا دل توڑ دیا۔ جائداد کا بڑا حصہ سرکاری قبضہ میں چلا گیا۔ حکومت نے اُنھیں دودھ کی مکھی کی طرح نکال دیا۔ اور وہ جو آزادی کا
اتنا بڑا آئیڈیل لیے قائداعظم پر ہنستے تھے روپڑے اور بستر سے لگ گئے۔ اور باپ کی ایسی حالت سن کر وہ تڑپ اُٹھی اور آکر اُس نے
اُنھیں منا لیا۔ اور جب باپ نے ایک دن کہا کہ وہی لوگ حقیقت میں صحیح راستے پر تھے جو چلے گئے۔ تب اُسے اپنا شوہر یاد آیا۔
لیکن وہ تو اس سے اُس کے وطن نہ آنے کا پکا ارادہ ظاہر کر چکی ہے۔ یاد کرکے وہ چپ ہوگئی۔ اور باپ اس دنیا سے چل بسے۔
بہرحال اس کے وقار کا ہی تقاضا تھا کہ وہ زندگی کے میدان میں ہر طرح کے طوفان سے مقابلہ کرکے منزل تک پہنچے گی۔

کچھ وقت اور گزر گیا۔ ہسپتال میں مریضوں کے درمیان گھر کر وہ سب کچھ بھول گئی۔ یوں بھی وہ غیرمعمولی قوت برداشت اور
قوتِ ارادی کی مالک تھی۔ اور آزادی کے باوجود زندگی کی پاکیزگی سے اُسے گہرا لگاؤ تھا۔ گہری عقیدت تھی۔ اس کی بھی وہی بات
یعنی اپنے شوہر کی تو اُسے بہت پسند آئی تھی۔ اور پھر وہ ایک خوبصورت کالی کالی آنکھوں والے بچے کی ماں بن گئی۔ پھر تو وہ
اس قدر بدل گئی، ایسی سنجیدہ ہوگئی کہ اس کی ماں بھی دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ وہ بچہ اس کی تمام خوشیوں، تمام تمناؤں،
تمام امیدوں کا مرکز تھا۔ وہ ذمہ دار ہوگئی تھی۔ کیونکہ وہ ماں ہوگئی تھی جس کو قدرت کی تخلیق کی ذمہ داری ملی تھی۔
جس کو پوری کرنے کے لیے جان دے دینا بھی معمولی بات تھی۔ اس معاشرہ کی عورت بس ہے ہی ایسی، وہ انسان کو
خوشیاں، مسرتیں، پاکیزگی، تقدس، زندگی اور حسن سب کچھ دیتی ہے حتیٰ کہ جان تک۔ لیکن خود کچھ نہیں مانگتی۔ وہ سب
کے لیے ہے، اس کے لیے کوئی نہیں۔ وہ سب کے حقوق کو پورا کرتی ہے۔ لیکن اس کا کسی پر حق نہیں۔ تو یہ حقیقت تھی
وہ ایک مکمل عورت ایک مکمل اور مقدس ماں بن گئی تھی۔ اب تو اُسے نہ اپنے بچپن کی حماقتوں پر ہنسی آتی نہ سرپرائز
کے مالیخولیے پر تعجب ہوتا نہ سیاسی نظریہ سے اختلاف ہونے کا دکھ ہوتا۔ نہ حیرت انگیز اور متاثر کرنے والے شوہر کی یاد آتی۔ نہ اپنی
ضد اور آن پر افسوس ہوتا۔ اب اُس کی زندگی کا مقصد تھا۔ بڑا مقدس بڑا اہم۔ لیکن اُس نے بچے کے باپ کو اس کی پیدائش کی

اطلاع تک نہیں دی۔ وہ محبت میں رقیب نہیں پیدا کرنا چاہتی تھی۔

اور وقت کی پرواز ایک دم بڑی تیز ہو گئی۔ پھر ایک دن دو نوکروں اور اپنے بچے فاروق کو لے کر وہ نینی تال گئی اور اُسے سینٹ جوزف جیسے اچھے ادارے میں داخل کر کے خوشی خوشی واپس آئی۔ وہ اُسے ہر ماہ منی آرڈر اپنے شوہر کی طرف سے کرتی وہ خوش ہو جاتا۔ پاپا نے مجھے لَو دیا ہے ۔۔۔ اور جب چھٹیوں میں گھر آکر وہ اُس کے گلے میں باہیں ڈال کر پوچھتا

"ممی سب کے پاپا تو یہیں ہیں۔ میرے پاپا کیوں نہیں آتے؟" تو وہ ۔۔۔ بڑی سنجیدہ معتبر اور باوقار لہجہ میں کہتی۔

"ڈارلنگ، جب تم پڑھ لکھ لوگے تو پاپا آئیں گے۔" اور وہ ہنستا ہوا لان میں جا کر چھوٹی سی سائکل سے کھیلنے لگتا! اور وہ بڑی ویران آنکھوں سے خلا میں تکتے ہوئے سوچتی۔ اس کی آنکھیں بھی بالکل باپ کی طرح ہیں اور ہاتھ پیر بھی اور چہرہ بھی ۔۔۔ اور ۔۔۔ بڑے ہو کر شاید آواز بھی ایسی ہی پرکشش ہو۔ میرا اسے صرف رنگ ملا ہے۔ اور پھر اسے بلا کر وہ گلے سے لگا لیتی۔ بے تحاشا چومتی ایسے جیسے ڈر ہو کہ کوئی لے جائے گا۔ خیر بڑا ہو جائے گا تو میں اس کے پاپا کو لکھوں گی۔ پھر تو وہ بھاگتے ہوئے آئیں گے اور میں فخر سے اُن سے متعارف کرواؤں گی ۔۔۔ یہ کتنا دلچسپ سرپرائز ہوگا۔ کتنا حسین، وہ اکثر ہسپتال میں راؤنڈ لیتی ہوئی سوچ کر مسکراتی ۔۔۔ لیکن اسے کیا معلوم تھا کہ ۔۔۔ یہ سرپرائز۔

پھر ایک دن ثریا جمشید کی بہن کی شادی میں شرکت کے لیے وہ فاروق اور امی کے ساتھ گئی۔ سارا خاندان ہی جمع تھا۔ اُس دن اُس نے سات آٹھ سال بعد رنگین نارنجی رنگ کی ساڑی باندھی اور زیور پہنے۔ اور اس کا بچہ بھی چست پتلون، گرم کوٹ، مفلر میں سارے ہی بچوں سے نمایاں اور اہم معلوم ہو رہا تھا۔ ہر شخص نے اس کے بچے کی بڑی تعریف کی۔ اس دن وہ بہت خوش تھی۔ کسی کام سے وہ بڑی تیزی سے مہمانوں کے کمرے سے باورچی خانہ کی طرف جا رہی تھی کہ ایک شخص سے ٹکرائی۔ اور پھر لرز کر رہ گئی۔ اس کے سامنے ہزاروں مایوسیوں کی تصویر بنا ویران آنکھیں لیے ناظم رضا کھڑا تھا۔ وہ بڑی پریشان ہوئی۔ لیکن تیسرے دن خاندان بھر کے ساتھ اُس نے ناظم رضا سے دنیا بھر کی باتیں کیں۔ جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ وہ تو شادی شدہ عورت تھی۔ اُسے کیا کہ ناظم سے پہلے کیا رشتہ تھا۔ اور وہ بھی تو اب بدل گیا تھا۔ وہ بھی یوں ملا جیسے زیبا بی بی اُس کی سگی بہن ہے۔ اور یہ سن کر تو اُسے سچ مچ سرپرائز ہوا کہ اُس نے اُس کی تمام ناپسندیدہ حرکات مدتیں ہوئیں چھوڑ دی ہیں ۔۔۔ رات کو جب اُس نے بھاری ریشمی ساڑی اور زیوروں میں خود کو دیکھا تو دُکھ کی ایک لہر اُس پر سے گزر گئی۔ یہ سب کس کے لیے؟ ۔۔۔ پھر اُس نے یوں یہ کپڑے اور زیور اتار پھینکے جیسے بچھو ہوں۔ اس رات وہ کتنی مضطرب تھی۔ کس قدر دکھی ہو گئی۔ وہ دو بجے رات تک جاگی۔ پھر خوب روئی ۔۔۔ اور پھر فاروق کو بھینچ کر پیار کر کے وہ ایسے مطمئن ہو گئی جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ میں ماں ہوں نا ۔۔۔ ہاں اور پھر وہ سو گئی۔ فاروق کو تو دیکھ ہی کر دکھ بھول جاتے تھے۔

ناظم بھی اُسی کے شہر میں ملازم تھا۔ وہ اکثر خیریت دریافت کرنے آتا۔ بڑے خلوص سے کوئی کام ہوتا تو کر دیتا۔ اور فوراً ہی چلا جاتا۔ اب تو وہ خود ہی جیسے زیادہ بیٹھنا نہیں چاہتا۔ ویسے اُس کی حالت پر اُسے بڑا دُکھ ہوتا ۔۔۔ اور وہ اُس کا رویہ دیکھ کر سوچتی ۔۔۔ تو ۔۔۔ بات ساری یہ ہے کہ یوں بھی ہو جاتا ہے۔ اب قسمت کو یوں بھی منظور تھا کہ وہ اتنا پرخلوص ہو کر مجھے سہارا دے گا ۔۔۔ یہ بھی ایک سرپرائز ہے۔ یہ سب کچھ سرپرائز ہے۔ زندگی ہی سرپرائز ہے۔ چودھویں کا چاند جھک جاتا۔ وہ چاندنی میں اپنا حسین سا چہرہ ہتھیلی پر رکھے سوچتی رہتی۔ ہوائیں سرسراتی گزر جاتیں۔ اور وہ بے چین ہو کر لیٹ جاتی۔ کبھی باپ اور کبھی بیٹے کے تصور میں سو جاتی اور خواب میں ان سے ملتی رہتی۔

کیسا المیہ ہے کہ انسان کو زندگی ملی ہے۔ عقل ملی ہے۔ خواہش ملی ہے۔ لیکن وہ مجبور ہے۔ وہ جو چاہے کر نہیں سکتا۔ اُسے نہیں معلوم ہوتا کہ آنے والا لمحہ اپنے جلو میں کیسا ہیبت ناک طوفان لائے گا، جو زندگی کو شاہراہ حیات کے کسی خطرناک موڑ پر کھڑا کر دے گا۔

جب جینا نہیں چاہتا تو جینا پڑتا ہے۔ اور جب زندگی کی آرزو کرتا ہے تو زندگی روٹھ جاتی ہے۔ عجیب المیہ ہے۔ چھٹیوں میں فاروق آیا ہوا تھا۔ وہ ہسپتال سے ڈیوٹی دے کر واپس آئی اُسے سست پڑا ہوا دیکھ کر اس کا معائنہ کیا۔ اُسے زبردست انفلوئنزا ہو گیا تھا۔ وہ تڑپ کے رہ گئی۔ دوائیں دیں۔ تمام رات جاگی۔ لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ صبح کو ناظم نے کسی اور تجربہ کار ڈاکٹر کو دکھانے کا مشورہ دیا۔ ــــ دکھایا گیا۔ ناظم نے اُسے سہارا دیا۔ امّی نے دلاسا دیا۔ لیکن وہ تو نیم پاگل ہو گئی تھی۔ اور تین دن کی کشمکش کے بعد موت کے خونیں پنجے اُس کے فاروق کو دبوچ لے گئے۔ اور وہ اس بھری پری دنیا کی وسعتوں میں تنہا اور ویران ہو کر رہ گئی۔ بے مقصد۔ بے منزل۔ اُس کی زندگی اُجڑ گئی۔ اُس کی آرزوؤں کے محل منہدم ہو گئے۔ اُس کی دنیا میں اذیت کی بادِ سموم چلنے لگی۔ اور وہ بالکل ساکت، مجسم لاش ہو گئی۔ یوں بھی ہونا تھا۔ قسمت کو ایسا سرپرائز دینا تھا۔ وہ ہسپتال میں ہو یا سڑک پر، گھر میں ہو یا بازار میں، بڑبڑانے لگتی۔ ایک دن یوں ہی رو رو کر جب وہ نڈھال ہو گئی تو اُسے خیال آیا کہ کیوں نہ اب فاروق کے پاپا کو اطلاع دے دی جائے۔ وہ خود نہ بھی آئے تو دلاسے کا خط تو لکھیں گے۔ اُسے ہمیشہ ہی شوہر کے خط سے سکون ملتا تھا۔ چاہے چار سال میں ایک ہی آئے ــــ وہ سوچتی ہی رہی دو دن اور گزر گئے۔ اور ہسپتال سے واپس آ کر تھکی تھکی سی صوفے میں گری تو میز پر جانی پہچانی تحریر اور لفافہ دیکھ کر اُچھل پڑی۔ اُس نے خوشی سے آواز دے کر فاروق کو بلانا چاہا کہ ــــ پھر اس کی آواز حلق میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔ پھر اُسے خیال آیا شاید اُنھیں کسی طرح معلوم ہو گیا کہ وہ یوں اتنا بڑا ہو کر مر بھی گیا۔ میری منزل میرے کتنے قریب تھی افسوس! ــــ وہ کتنی ہی دیر خط کھولے بغیر سسکتی رہی۔ پھر لرزتے ہاتھوں سے خط کھولا۔ اور ــــ ڈرتے ڈرتے پڑھا۔ پھر اس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ وہ الفاظ کو گھورتے گھورتے چکرا کر گر پڑی۔ چند مختصر الفاظ جس نے اُس کی بدقسمتی پر آخری مہر لگا دی تھی۔ طلاق نامہ کے ساتھ اُس نے مختصر خط میں لکھا تھا :ــ

> "چونکہ سیاسی نظریہ پرستی اور اپنی ضد کی وجہ سے تم یہاں نہیں آ سکتیں۔ اپنی ذمہ داریوں کے باعث میرے آنے کا بھی سوال نہیں۔ یہاں آنے کے بعد فوجی ملازمت کی وجہ بھی پیشِ نظر سمجھو۔ ایسے میں تمھیں بلاوجہ اپنے نام کے ساتھ باندھے رکھنا غیر اخلاقی بلکہ غیر انسانی فعل ہے۔ اب تمھیں بالکل آزادی ہے۔ تم باحوصلہ عورت ہو جیسے مناسب سمجھنا زندگی کی راہ متعین کرنا۔"

اس کے تیسرے ہی دن سے وہ ہسپتال میں داخل ہے۔ پے در پے قسمت کے حملوں نے اُسے پندرہ بیس دن میں اس عالم کو پہنچا دیا ہے۔ اُس کے دل میں زخم ہیں۔ اُس کی آنتوں کا آج صبح تیسرا آپریشن ہوا ہے۔ ہر ڈاکٹر، ہر نرس بے حد مستعد ہے۔ مگر وہ کیا کرے وہ جینا نہیں چاہتی۔ بالکل نہیں۔ رات کے اس سناٹے میں لرزتے ہاتھوں سے اُس نے اپنے شوہر کو آخری خط لکھا جس میں فاروق کی پیدائش سے مرنے تک سب کچھ لکھا۔ پھر اُس نے سوچا۔ اور اس کے ساتھ ہی میرے مرنے کا خط بھی ضرور جائے گا۔ جانا چاہیے ــــ یہ کیسا مزیدار کتنا دلچسپ سرپرائز ہو گا۔ خط بند کرتے ہوئے اُس نے سوچا۔ اور اُس کے نیلے پڑے ہوئے ہونٹوں پر طنزیہ بے جان سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اور تب وہ تکیے میں منہ چھپا کر اتنا روئی کہ جتنا زندگی میں کبھی نہیں روئی تھی۔ اُس کی گھٹی گھٹی سسکیوں کی آواز سے امّی جاگ گئیں۔ اُنھوں نے گھبرا کر قریب آ کر دیکھا۔ گلوکوز پلایا۔ خط کے بارے میں تاکید سنی۔ اور اُس کے کانپتے ہاتھوں سے خط لیتے ہوئے سوچا۔ کاش، باقیوں کی طرح یہ بھی مر جاتی ــــ میں اس کے سانس اُکھڑنے کا منظر کیسے دیکھوں ــــ اور پھر ہسپتال کا سارا عملہ ہی جمع ہو گیا۔ لیکن موت کا علاج کسی کے پاس نہیں۔ وہ حسرت سے تکتے رہے۔ اور وہ اُکھڑی اُکھڑی سانسوں کے درمیان کہتی رہی ــ "ممی، یہ کیسا ہولناک سرپرائز ہے ــــ یہ کیسا اندھیرا ہے ــــ ناظم ــــ اوہ ناظم ــــ بھیّا۔ ہائے مجھے معاف کر دینا ــــ بالکل ــــ مم ــــ معاف ــــ ممّی ــــ مجھے ــــ جانا ہے علی گڑھ میں جلسہ ہے۔ کانگریس بہت اچھی جماعت ہے ــــ مسلم لیگ گنہگار ہے ــــ مسلم لیگ اچھی ہے۔ فاروق ڈارلنگ میرے

گلے سے لگ جاؤ — اوہ — ممی — ہاں — نہیں نن نہیں۔ تمھارے پاپا نہیں آئیں گے — یہ سب کیا ہو گیا۔ اندھیرا بڑا دبیز اندھیرا۔ — سرپرائز — ہولناک سرپرائز — میں خالی ہاتھ ہوں — سمجھے' تم کتنے بے وفا ہو — فاروق ڈارلنگ آجاؤ —"

اور کہیں گرجے کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ دھند گہری ہو گئی — گھنے درختوں میں چڑیاں شور مچانے لگیں۔ پچھلے پہر کا چاند مغرب میں جاں کنی کے عالم میں معلوم ہو رہا تھا۔ مسجد سے فجر کی اذان کی آواز آئی — اُس نے آخری بار سحر انگیز آنکھیں پوری کھول کر سب کو دیکھا۔ اور پھر ہمیشہ کے لیے بند کرلیں — ہواؤں کی سسکیاں تیز ہو گئیں۔ ایک پاکیزہ روح خلا کے پار جا چکی تھی۔ اینگلو انڈین نرس دھیرے دھیرے کہہ رہی تھی: "لڑکے کی موت نے اسے مار ڈالا — اُف زیبا ڈارلنگ تمھاری موت کیسا سرپرائز ہے۔ رادر ٹیریبل۔" لمحہ بیت رہا تھا۔ وقت کا تسلسل جوں کا توں تھا۔ زندگی کو ذرا بھی معلوم نہ ہوا کہ اس قافلہ سے کوئی جدا ہو گیا۔ رات گزر گئی۔ دن طلوع ہو رہا تھا۔ ایک نیا دن — یہ سب کچھ نہیں — سب سرپرائز ہے — زندگی موت — سب کچھ۔

محمد حسین آزاد

حیات و تصانیف

مصنفہ :- ڈاکٹر اسلم فرخی

مولوی محمد حسین آزاد کے بارے میں یوں تو مضامین کی صورت میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ لیکن اُن کی مبسوط سوانح عمری اور اُن کے ادبی کارناموں کا کوئی مکمل جائزہ اب تک منظر عام پر نہیں آیا۔ ایک آزاد ہی کیا، ہمارے سبھی مشاہیر ادب کے بارے میں ابھی تک تفصیلی طور پر کچھ نہیں لکھا گیا۔

اُردو ادب کی خوش قسمتی تھی۔ کہ اسے آزاد جیسا صاحبِ طرز انشا پرداز اور ادبی مورخ نصیب ہوا اور یہ آزاد کی خوش قسمتی ہے کہ اسے اسلم فرخی جیسا سوانح نگار ملا۔ یہ بات محض "سخن آرائی" کے لیے یا صنعت مدح بما یشبہ الذم" کی مثال میں نہیں ہے۔ بلکہ یہ حقیقت ہے کہ اسلم فرخی نے آزاد کی سوانح حیات لکھ کر ایک بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ محمد حسین آزاد مطالعہ آزاد ہی کے لیے نہیں۔ بلکہ اُردو میں فنِ سوانح نگاری کے سلسلے میں بھی ایک اہم اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ "روزنامہ" انجام" کراچی۔

جلد اوّل حالات زندگی۔ قیمت ۸ روپے۔ جلد دوم۔ ادبی و علمی کارناموں کی روداد قیمت ۱۲ ۔ روپے

ملنے کا پتہ مشتاق بک ڈپو۔ شیلڈن روڈ۔ کراچی ۱

۹۰

سلطان سبحانی

شاعر۔ بمبئی

انعام

کلّو دادا کو کون نہیں جانتا۔۔۔؟

شہر کا کوئی اجنبی جب اس سنگلاخ وادی سے ہوتے ہوئے ہزاروں جوان مزدوروں کے ہجوم سے گذرتا، اور ان جوانوں کے پہلو بہ پہلو ایک لمبے تڑنگے بوڑھے کو اتنی مستعدی سے کام کرتے ہوئے دیکھتا، تو اس کے قدم خود بخود وہاں رُک جاتے تھے۔ اور حیرت سے منہ کھلا کا کھلا رہ جاتا۔ ان کی محنت کشی اس علاقے میں بہت مشہور تھی، اس بڑھاپے کے عالم میں بھی ان کا بدن جیسے بجلی کی طرح کام کرتا تھا۔ تیز اور چلچلاتی دھوپ میں پورے جسم پر صرف ایک نیلی لنگی باندھے وہ ہر لمحہ کام میں لگے رہتے۔ جھرّیوں دار سانولے چہرے پر ہمیشہ سنجیدگی اور طمانیت رہتی زردی مائل سفید داڑھی، بجھی ہوئی آنکھیں اور ماتھے کی دو گہری گہری لکیریں ہمیشہ خاموش اور گم سم رہتی تھیں۔

اُن کے ہاتھوں نے اب تک جانے کتنی عمارتوں اور درسگاہوں کی دیواریں اٹھائی تھیں۔ جانے کتنے ایوان، پل، کارخانے، ڈیم اور بجلی گھر کھڑے کئے تھے۔ اور آج بھی اُن کے ہاتھ دوسرے ہزاروں ہاتھوں کے ساتھ مل کر اس وادی میں ایک مضبوط ڈیم اٹھا رہے تھے...

وادی میں ایک عجیب سا شور تھا۔ کدال، ٹیکم، پھاوڑے اور پاٹیوں کی آوازیں ہم آہنگ ہو کر فضا میں مسلسل گونجے جا رہی تھیں۔ مکسچر مشین، رولرز، کرشر مشین، بلڈوزر اور کرین کی تیز آواز سے وادی وادی چنگھاڑ رہی تھی۔ ہر طرف ایک ہنگامہ سا تھا۔ انتشار اور بھاگ دوڑ تھی۔۔ سامنے ڈیم پر ہزاروں مزدور چیونٹیوں کی طرح رینگ رہے تھے۔ وادی کے اس سرے سے لے کر اُس سرے تک مزدور ہی مزدور تھے، جو مشینوں کے شور میں ساتھ ساتھ مل کر گا بھی رہے تھے، اور اپنی عادت کے مطابق چیخ بھی رہے تھے۔

نیچے سینکڑوں مزدور سیمنٹ، پتھر، لوہے اور فولاد کے پہاڑ نما ڈھیروں کے پاس کام میں معروف تھے، جن سے تھوڑے فاصلہ پر کلّو دادا نیلی لنگی رانوں تک چڑھائے چٹانوں کے نوکیلے اور بے ہنگم انداز میں باہر نکلے ہوئے حصوں کو ہتھوڑے سے توڑ توڑ کر ہموار کر رہے تھے۔

کچھ دنوں سے مزدوروں میں یہ خبر گشت کر رہی تھی کہ کلّو دادا کی محنتوں سے بڑے صاحب بہت خوش ہیں۔ اور وہ ڈیم بن جانے کے بعد انہیں ایک انعام دینے والے ہیں... ایک بڑا سا انعام! یہ خبر سنکر کلّو دادا خوشی میں اُچھلے نہیں تھے۔ کیونکہ وہ بہت پہلے سے جانتے تھے، کہ ان کا بچپن سے بہتا ہوا پسینہ ایک دن ضرور رنگ لائے گا۔

اور اب وہ دن قریب آ رہا تھا۔ تمام مزدور اب اس لمحے کے منتظر تھے۔ جب کلّو دادا کو ان کی عظیم محنتوں کا خراج ملنے والا تھا... پتہ نہیں کیا ہوگا... پتہ نہیں کیا ملے گا... اُنہیں کلّو دادا کی بڑی فکر تھی، کیونکہ سب کے دل میں ان کی محنتوں کی بڑی قدر تھی۔

وادی کا گوشہ گوشہ جلتی ہوئی تیز دھوپ میں تمتما رہا تھا۔ سیمنٹ کی مخصوص بُو اور ہزاروں قسم کی پُرشور آوازیں فضا اور ماحول پر حاوی ہو رہی تھیں۔ پتھر، لوہے اور فولاد کے ڈھیروں کی طرف سے مال ٹرک کی گھڑگھڑاتی ہوئی آواز بار بار اٹھ رہی تھی۔ ایک بار جب ٹرک زور سے گھڑگھڑایا تو کلّو دادا نے ہتھوڑا چھوڑ کر ایک گہرا سانس لیا، اور گردن ایک طرف نیوڑھا کر ماتھے سے پسینہ نچوڑا۔ پسینے کی ایک مختصر سی دھار نکلی اور ٹوٹ کر پتھروں پر پھیل گئی۔ پسینے کی طرف دیکھ کر وہ فاتحانہ انداز میں مسکرائے... پسینہ... جو زندگی کے مستقبل میں رنگ بھرتا ہے، جس کے درپن میں دھرتی کا ذرّہ ذرّہ نظر آتا ہے، اور جس میں انسان جھونپڑے سے لے کر تاج محل، اور تاج محل سے لے کر چاند تک دیکھ سکتا ہے۔ چاند کیا... اگر انسان چاہے تو پوری کائنات دیکھ سکتا ہے۔ ان کی مسکراہٹ گہری ہوتی گئی۔ پیچھے کرین تیزی سے گرگرا رہی تھی۔

وہ پھر ہتھوڑا اٹھا کر کام میں معروف ہو گئے۔ دور ڈیم کی سمت سے مزدوروں کے گانے کی آواز بار بار آ رہی تھی۔ گیت کے بول کچھ ادھورے سے سنائی دے رہے تھے، قریب ہی ایک انجینئر ہاتھ میں دوربین ایک ڈگڈگی کی طرح تھامے کھڑا تھا، اور آپ ہی آپ چیخ رہا تھا۔ سپروائزر بھی بار بار چلّا رہے تھے، اور پیر پٹکتے ہوئے ادھر اُدھر گھوم رہے تھے۔

تقریباً ایک گھنٹہ گزر جانے کے بعد مزدوروں کے گانے اور چیخنے چلّانے کی آواز یکا یک کم ہو گئی۔ کلّو دادا نے سر اٹھا کر دیکھا کہ کرین کے پاس بڑے صاحب کار سے اتر رہے تھے۔ ان کے ساتھ ان کی سَرو قد اور دھان پان سی بیوی بھی تھی۔ سکریٹری اور ایک اورسیر بھی تھا۔ ان پر نگاہیں ڈال کر وہ پھر اپنے کام میں محو ہو گئے ــــ مزدوروں کے ہاتھ آپ ہی آپ اور بھی تیزی کے ساتھ چلنے لگے تھے، جیسے ان کے جسم میں از خود بجلی بھر گئی ہو۔ بڑے صاحب کرین اور مکسچر مشینوں کے گرد گھومتے ہوئے قریب آ رہے تھے، اور جوں جوں وہ قریب آ رہے تھے، کام کرنے کی رفتار بتدریج تیز ہوتی جا رہی تھی۔

بڑے صاحب جس طرح خاندانی پارسی تھے، اسی طرح خاندانی ٹھیکیدار بھی تھے... بہت بڑے ٹھیکیدار ــ یوں تو اُن کا نام جمشید جی مرزبان جی تھا، مگر لوگ انہیں بڑے صاحب کہتے تھے، کہنے کو تو کچھ لوگ حضور، سرکار اور مائی باپ بھی کہا کرتے تھے، ان کا ذکر ہی کیا۔!

بڑے صاحب بڑے پستہ قد اور موٹے تھے، ان کا رنگ سونے کی طرح کھلتا ہوا تھا۔ پیشانی نئے سکّوں کی طرح ٹھوس، اُجلی اور چمکدار تھی۔ چہرہ چیک بک کی طرح سپاٹ تھا۔ اور آنکھیں سَو کے نوٹ کی طرح ہلکی سبز تھیں۔ جس آدمی کے چہرے اور خد و خال میں ہی اتنے گُن ہوں، وہ اگر چاہے تو وزیروں کو بھی بے وقوف بنا سکتا ہے۔

مہتاب بلیموریہ ان کی دوسری بیوی تھی۔ اس وقت سفید اجلی ساڑی میں وہ بہت خوب لگ رہی تھی۔ وہ ساڑی انہوں نے امریکہ سے منگوائی تھی۔ بڑی نفیس اور صابن کے جھاگ کی طرح ملائم تھی ــ اس میں ایک خوبی یہ تھی کہ چلتے وقت اس کی سلوٹوں سے اُجالا سا پھوٹتا تھا.. سمابی اجالا... جس کا اتار چڑھاؤ سلوٹوں کے ہلکورے کے ساتھ ساتھ ہوا کرتا تھا ــ وہ ساڑی اسے بہت جچ رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ اور جمشید جی سب کا جائزہ لیتے ہوئے آگے ڈیم کی طرف چلے گئے۔ کلّو دادا کے ہاتھ بڑی تیزی سے چل رہے تھے۔ پیچھے مکسچر مشین بھی اسی تیزی کے ساتھ غرّا رہی تھی۔ ہتھوڑے کی دَنادَن میں چٹانوں سے پتھّر کے ٹکڑے چیخ چیخ کر اچٹ رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے ابھی اک ذرا دیر ہی میں ان چٹانوں سے میٹھے چشمے کے ہزاروں سوتے اُبل پڑیں گے، اور انہیں اپنی تمام عمر کی محنتوں کا انعام آن کی آن میں مل جائے گا... انعام تو ضرور ملنا چاہئے کیونکہ بچپن ہی سے ان کی زندگی کدال، ٹیکم اور پھاوڑے کے گرد گھومتی ہوئی اب اس مقام پر پہنچ رہی تھی، جہاں جا کر بازو شل ہو جاتے ہیں، اور ہزاروں میٹھے چشمے بہانے کے بعد تیشہ ہاتھ سے چھوٹ کر گر جاتا ہے۔ لیکن ان کے بازو ابھی شل نہیں ہوئے تھے، انہیں پورا یقین تھا کہ تیشہ ابھی نہیں گرے گا، کیونکہ کام تو ابھی ادھورا تھا۔ ڈیم ابھی نامکمل تھا۔ اس کی تصویر ابھی نا تمام تھی۔ اور اس نا تمام تصویر میں ابھی انہیں اپنے پسینے کا رنگ بھرنا تھا۔ پھر ان کی تمام محنت رنگ لانے والی تھی ــ وہ محنت، جسے تمام مزدور احترام کی نظروں سے دیکھ رہے تھے، اور ساتھ ہی ساتھ ایک عرصہ سے سوچ بھی رہے تھے.. "وہ دن کب آئے گا، جب اس بوڑھے تیشہ بردار کا ایک زمانے سے جھکا ہوا سر فخر سے اونچا ہو جائے گا... اتنا اونچا... جتنی اونچی ان کی محنت تھی جتنے اونچے ان کے حوصلے تھے۔ جتنا اونچا ان کا کردار تھا، اور جتنی اونچی انہوں نے عمارتیں بنائی تھیں۔"

ڈیم کی طرف سے مہتاب اور جمشید جی واپس آ رہے تھے۔ مہتاب اپنے سفید آنچل کو ہوا میں کھلا چھوڑے بڑی سرمستی میں چلی آ رہی تھی، اور پیچھے جمشید جی اپنے سکریٹری اور مادر سیئر سے باتیں کرتے ہوئے خراماں خراماں چل رہے تھے۔ کلّو دادا پسینے میں سر تا پا بھیگ چکے تھے، مگر ہاتھ تھے کہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ اور حوصلے تھے کہ ابھرتے ہی جا رہے تھے۔ ان کی لگن دیکھ کر یوں لگ رہا تھا جیسے بس اب جوئے شیر پھوٹنے ہی والی ہے۔ صبر آزما قوت مسکرانے ہی والی ہے۔ اور ہتھوڑے کی دعائیں دعائیں میں ان کی محنت کھلکھلا کر ہنسنے ہی والی ہے... بس ابھی کچھ دیر بعد میٹھے چشمے کے ہزاروں سوتے پھوٹ پڑیں گے... وادی لہرا اٹھے گی... ناچ اٹھے گی، اور ان کی محنتوں کا انعام ان کے قدموں پر آ گرے گا، بڑھاپے کو سہارا مل جائے گا۔ اور وہ مرتے وقت کسی کے محتاج نہیں رہیں گے۔ ہتھوڑے کی مسلسل آواز میں مست ہو کر وہ مسکرا اٹھے۔

دفعتاً خوشبو کی ایک لہر سی آئی۔ ہتھوڑا دعائیں سے چٹان پر پڑا۔ پتھر کے ٹکڑے اڑے۔ اور ایک نسوانی چیخ لہرا اٹھی۔ چیخ کے ساتھ ہی ان کا دل تیزی سے اچھلا، اور پورا جسم مرتعش ہو گیا۔

"کیا ہوا۔ کیا ہوا؟" ذہن میں جیسے کرین چرچرا کر چیخ اٹھی ہو۔ وہ فوراً پلٹے۔

سامنے مہتاب اپنی پیشانی سہلا رہی تھی، اور دھیمی دھیمی سسکیاں لے رہی تھی۔ پتھر کے اڑے ہوئے ٹکڑے کی ہلکی سی خراش سرخ ہو رہی تھی شفاف پیشانی پر سرخ خراش۔ ؟ کلّو دادا لرز گئے۔ اسے سہارا دیتے وقت اُن کی بوڑھی آنکھیں بھر آئیں۔ کچھ مزدور ارد گرد جمع ہو گئے۔ پیچھے سے جمشید جی اپنے سکریٹری کے ساتھ تیزی سے چلے آ رہے تھے۔

"مجھے معاف کر دو بیٹی" کلّو دادا کی آواز انتہائی گلوگیر تھی۔ "مجھے معاف کر دو۔ مگر میرا کوئی قصور نہیں ہے۔" کہتے کہتے وہ بے اختیار رو پڑے۔ آنسوؤں کے قطرے جھرّیوں دار گالوں سے ہوتے ہوئے داڑھی کو بھگو گئے۔ بجھی ہوئی آنکھیں پتھرائی پتھرائی سی لگ رہی تھیں۔ اور جس ہاتھ سے انہوں نے مہتاب کو سہارا دیا تھا وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اور ساتھ ہی جبار آلود ماتھے سے پسینہ پھوٹ کر اُس کی ساڑی پر ٹپکتا جا رہا تھا۔ وہ پسینہ جو زندگی کے مستقبل میں رنگ بھرتا ہے۔ اور جس کے درپن میں انسان جھونپڑے اور تاج محل سے لے کر چاند تک دیکھ سکتا ہے، جسے بہانے کے بعد ہی کوئی تخلیق وجود میں آتی ہے، اور جس کی حرارت سے پوری دنیا گھومتی ہے۔ وہی پسینہ مہتاب کی ساڑی پر ٹپک رہا تھا، اس ساڑی پر.. جو امریکہ سے منگوائی گئی تھی اور جس کی سلوٹوں کے بکھرنے اور سنورنے میں اجالے کا مدّوجزر ہوتا تھا

چند ہی لمحوں میں جمشید جی آن کھڑے ہوئے۔

اُنہوں نے آتے کے ساتھ ہی مہتاب کے ماتھے کی خراش کو دیکھا۔ اُس کی دُودھیا اور سیمابی ساڑی پر پڑے ہوئے پسینے کے دھبّوں کو دیکھا۔ اور پھر کلّو دادا کے جھرّیوں دار گال پر آتنی زور سے ایک طمانچہ پڑا کہ وہ چٹان پر لڑھک گئے۔ فضا ساکت سی رہ گئی۔ اُسی وقت کام کرتے ہوئے تمام ہاتھ ایک ساتھ رک گئے۔

فرصت کے لمحات کا بہترین ساتھی ماہنامہ نقش کراچی

نقش ادب کی خدمت کرتا ہے آپ نقش کی سرپرستی کیجیے۔

نقش خریدیے ــ نقش میں اشتہار دیجیے!!

فتخار احمد خاں عدنی

نئی قدریں حیدرآباد

غالب اور فرہاد

سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر غالب کو فرہاد سے ایسی کیا پرخاش تھی۔ کہ بے چارے کا نام آتے ہی وہ اپنے آپ کو طنز پر مجبور پاتے تھے۔ ممکن ہے غالب اور فرہاد کے ناخوشگوار تعلقات کی طرف پہلے کسی کا خیال نہ گیا ہو اور وہ اس رنجش کو صرف خیال آرائی پر محمول کرے۔ لیکن اگر غالب کے ان تمام اشعار کو سامنے رکھا جائے، جن میں فرہاد کا ذکر ہے یا اس کی طرف اشارہ ہے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ کہ وہ اس غریب کو نہایت حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ شلاً:-

عشق و مزدوریِ عشرت گہِ خسرو کیا خوب   ہم کو تسلیم نکو نامیِ فرہاد نہیں

یا:-   تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ   سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

ان دونوں اشعار سے غالب کے جذبات صاف ظاہر ہو جاتے ہیں۔ اقلیم محبت میں اس کی نکو نامی پر طعن کرتے ہیں اور وہ بھی خاص تلخی کے ساتھ، زندگی میں فرہاد کا کارنامہ یہ تھا کہ اس نے شیریں کے عشق میں ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔ اور جب اس کی موت کی خبر سنی تو تیشے سے سر پھوڑ کر جان دے دی۔ لیکن غالب کو نہ اس کی زندگی ایک آنکھ بھائی اور نہ اس کی موت۔ زندگی کو رقیب کے گھر مزدوری کرنے کا طعنہ دے کر خاک میں ملا دیا اور موت پر کچھ نہیں تو یہی طعنہ جڑ دیا۔ کہ وہ تیشے کے بغیر جان تک نہ دے سکا۔ اور ستم یہ ہے کہ اس سے نتیجہ یہ نکالا۔ کہ وہ اس قدر ادنیٰ درجے کا آدمی تھا کہ پابستگیِ رسم و رہِ عام سے آزاد ہونا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ یہ تو ایسا ہی ہے کہ کسی کو صرف اس لیے مورد الزام قرار دیا جائے۔ کہ وہ بغیر کچھ کھائے پیے زندہ نہیں رہ سکتا۔ سوال یہ ہے کہ آخر فرہاد مرنے کے لیے کیا تدابیر اختیار کرتا۔ اس کے زمانے میں نہ تو (گیس چیمبر) GAS CHAMBER بنے تھے۔ نہ بجلی کے تار تھے۔ کہ انھیں ہاتھ میں لے کر جان دے دیتا۔ نہ خواب آور گولیاں تھیں جنہیں کھا کے بیہوشی میں موت کی سرحد پار کر جاتا۔ اس بے چارے کو تو اپنے ہی ہاتھوں اپنی جان لینا تھی۔ اور وہ بھی تیشے سے، پستول سے نہیں۔ اب اگر وہ اس طرح جان نہ دیتا تو اور کیا کرتا۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ میر تقی میرؔ کی طرح غم و اندوہ کو اپنا وطیرہ بنا لیتا۔ اور اگر ایسا کرتا تو شاید میر صاحب کی طرح موت کی بجائے سو سال کی عمر اُسے نصیب ہو جاتی۔ اور اس پر غالب اور بھی زیادہ ناخوش ہوتے۔

بات یہ ہے کہ غالب کی زندگی میں بھی ایک ایسا موقع آیا تھا کہ وہ جان دے کر اپنی محبت کا ثبوت دے سکتے تھے۔ جب عارفؔ کی موت پر ان کی زندگی تاریک ہو گئی۔ تو خود انھیں موت کا خیال آیا تھا لیکن وہ تن آسان آدمی تھے۔ ایک خوبصورت سا عذر کر کے صاف اپنا دامن بچا گئے

نادان ہو جو کہتے ہو کیوں جیتے ہو غالب — قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

فرہاد نے عشق کی راہ میں کیسے کیسے ہفت خواں سر کیے۔ شیریں کے حصول کے لیے کیا کیا کچھ نہ کیا۔ پہاڑوں کو کاٹ کر جوئے شیر لایا۔ حد یہ ہے کہ جوئے شیر لانے کو خود غالب نے بھی ایک کارنامہ تسلیم کیا ہے: "صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا"۔ اور جب شیریں کے حصول سے مایوس ہو گیا تو جان دے دی۔ اس کی داستان محبت میں زندگی بھی ہے اور موت بھی ہے۔ زندگی میں جد و جہد کی تو ایسی کہ ضرب المثل ہو گئی۔ اور جب موت کی طرف التفات کیا تو وہ بھی شہیدوں کی سی بے قراری کے ساتھ۔ محبت کی راہ میں وہی ایک ایسا گذرا ہے جو بیک وقت شہید بھی ہوا اور غازی بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ غالب کو فرہاد کی اسی کارکردگی سے چڑ سی ہو گئی تھی۔ فرہاد کی زندگی میں عمل پر جو زور تھا۔ وہ غالب کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ غالب ٹھہرے رند مشرب، خوش طبع، آزاد منش آدمی۔ باتوں کے رسیا۔ تصور کے باسی، انہیں عمل سے کیا واسطہ، نہ انھوں نے عملی زندگی سے کوئی سروکار رکھا نہ کسی مقصد کے تحت عمل کرنے والوں کو نظرِ استحسان سے دیکھا۔ وہ تو طاعت میں بھی مے و انگبیں کی لاگ کو گوارا نہ کر سکتے تھے۔ اور اس بات پر مصر تھے کہ بہشت کو دوزخ میں ڈال دیا جائے۔ حالانکہ طاعت سے انھیں کوئی طبعی مناسبت نہیں تھی۔ جب لاگ سے انھیں اتنا بیر تھا وہ عشق کے سلسلے میں فرہاد کی مقصدیت کو کس طرح برداشت کر سکتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے غیر مبہم الفاظ میں یہ اعلان کر دیا تھا کہ عشق کے میدان میں وہ قیس کے سوا اور کسی کو درخورِ اعتنا نہ جانتے تھے۔

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار — صحرا مگر بہ تنگیٔ چشمِ حسود تھا

اس اعلان کا رخ صرف فرہاد کی ہی طرف ہو سکتا تھا۔ ایک تو اس لیے کہ قیس کا اس کے علاوہ اور کوئی ہمراز اور حریف نہ تھا۔ دوسرے غزل کے مقطعے میں انھوں نے کوہکن پر تیشے بغیر مر نہ سکنے کا طعن کیا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شعر کہتے وقت ضرور ان کا روئے سخن فرہاد ہی کی طرف تھا۔

مزاج کے معاملے میں اگر یہ کہا جائے کہ فرہاد کو اقبال سے زیادہ مناسبت تھی تو کچھ بیجا نہ ہوگا۔ دونوں کے یہاں سخت کوشی ہے، جوشِ عمل اور ذوقِ انقلاب ہے۔ شاید اسی لیے اقبال نے فرہاد کو آنے والے عوامی انقلاب کی ایک علامت قرار دیا ہے۔ اور اس کے تیشے کی زد میں پرویز کی خواجگی کو درہم برہم ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔

کوہکن تیشہ بدست آمد و پرویزی خواست

یہاں ممکن ہے فرہاد کا کوئی طرفدار یہ بھی کہے کہ اقبال تو صرف شعر کہہ کے رہ گئے۔ فرہاد پہلے ہی اپنے عمل سے وہ سب کچھ کر کے دکھا چکا تھا۔ جس کی انہیں تمنا تھی۔ اس نے پہاڑوں کے جگر چاک کیے۔ اپنے جوشِ عمل سے مسندِ اقتدار کو ہلا دیا۔ اور "ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی" والی بات کو سچ کر دکھایا۔ اور اگر غالب زندہ ہوتے۔ تو وہ شاید یہ بھی چوٹ کر جاتے۔ کہ فرہاد نے اقبال کی ایک اور نصیحت کا نمونہ بن کر بھی دکھایا۔

لڑا دے ممولے کو شہباز سے

کہاں خسرو پرویز اور کہاں ایک گرسنہ مزدور۔ شاید اسی لیے غالب نے نہایت حقارت کے ساتھ کہا تھا۔ ع

کوہکن گرسنہ مزدورِ طرب گاہِ رقیب

ممکن ہے فرہاد کا اپنی حد سے تجاوز کرنا ہی غالب کی ناراضگی کا سبب ہو۔ وہ خود بڑے وضعدار آدمی تھے۔ نام و نسب پر انھیں ناز تھا۔ اور امتیاز کو وہ تمدن کی ضمانت جانتے تھے۔ وہ کب اس بات کو گوارا کر سکتے تھے۔ کہ وہ صرف اشتراکِ عشق کے باعث انہیں فرہاد جیسے کم ظرف لوگوں کی صف میں کھڑا کر دیا جائے۔

پیشے میں عیب نہیں رکھیے نہ فرہاد کو نام — ہمیں آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا

اس شعر کے پہلے مصرعے میں کس قدر غضب کا طنز ہے۔ جگر صاحب مرحوم کہا کرتے تھے۔ کہ انسانوں کی تفریق اس طرح بھی کی جاسکتی ہے کہ وہ مزاج کے اعتبار سے یا تو سیاسی ہوتے ہیں یا غیر سیاسی۔ ان کا خیال تھا۔ کہ سیاسی مزاج کے لیے ضروری نہیں کہ سیاست میں عملی طور پر حصہ لیا جائے سیاست سے غیر متعلق ہوتے ہوئے بھی آدمی خالص سیاسی مزاج کا ہوسکتا ہے۔ فرہاد نے خسرو سے ٹکر لے کر اور شیریں کو بہر عنوان حاصل کرنے کا تہیہ کر کے بیستون کو سیاست کا اکھاڑا بنا دیا تھا۔ یہ بات غالب کو ضرور بہت گراں گزری ہوگی۔ کیونکہ وہ تو سیاست سے اس قدر خائف تھے۔ کہ سیاست کی باں کے بھی متحمل نہ ہوسکتے تھے۔ البتہ اگر بات دشنام سے آگے نہ بڑھی تو اسے ہنسی میں ٹالنے سے انھیں گریز نہ تھا ع

بارے آشنا نکلا ان کا پاسباں اپنا

فرہاد کی سیاسی افتاد طبع ان کے لیے ضرور پریشانی کا موجب ہوگی۔ فرہاد نے تیشے کے بل پر شیریں کو جیتنے کا منصوبہ بنا کر ایک بہت بڑے فتنے کی داغ بیل ڈالی تھی۔ ممکن ہے کہ اگر تحقیق کی جائے تو یہ بات ثابت ہو جائے کہ دنیا نے جتنے بھی سیاسی اور جمہوری اور اقتصادی انقلابات دیکھے ہیں ان سب کی ابتدا فرہاد کے تیشے کی بے اماں ضربوں ہی سے ہوئی تھی۔ یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ سیاسی مطالبات کا جواب سیاسی چالوں سے دیا جاسکتا ہے۔ اس لیے خسرو نے مجبور ہو کر پیرزن کی چالاکی سے مدد لی۔ اور فرہاد کو اسی تیشے سے جس سے اس کے محل کی بنیادیں ہل جاتیں۔ اپنی زندگی کا خاتمہ کرنے پر مجبور کر دیا۔ اگر فرہاد خسرو کے فریب میں نہ آگیا ہوتا۔ تو شاید اس کے پہلو میں شیریں کو دیکھنے کا غم بھی غالب کو اٹھانا پڑتا۔ خسرو اور فرہاد کے تصادم میں غالب کی ہمدردیاں خسرو کے ساتھ تھیں۔ حالانکہ مصلحتاً انہوں نے اس امر کا اظہار نہیں کیا بلکہ اپنے جذبات پر پردہ ڈالنے کے لیے رسمی ہمدردی کے بول بھی بول دیے ہیں

ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پاؤں
دی سادگی سے جان پڑوں کوہکن کے پاؤں

خسرو میں سرمایہ داری کی زیرکی اور عیاری تھی۔ اور غریب فرہاد میں مزدور کی سادہ لوحی۔ ممکن ہے اگر میرے ایک دوست سے جنہیں باتوں کی تہ تک پہنچنے کا خاص درک ہے۔ رائے لی جائے تو وہ یہ کہیں گے کہ غالب نے خسرو سے اپنی ہمدردی کا صاف اظہار کر دیا ہے ع

پیتا ہوں دھو کے خسروِ شیریں سخن کے پاؤں

یہاں شیریں سخن کے لفظ سے غالب نے یہ بات بتائی ہے کہ انھیں عقیدت نہ بہادر شاہ ظفر سے تھی نہ امیر خسرو سے بلکہ ان کا اشارہ شیریں والے خسرو کی طرف تھا۔ باوجود سیاسی افتادِ طبع کے وہ سیاسی سوجھ بوجھ سے محروم تھا۔ ممکن ہے یہی وجہ ہو تیشے کو اپنا نشان بنانے والے مقلد باوجود اپنے زورِ عمل کے سیاست میں بیشتر ناکام ہی رہے۔ غالب کو یہ معلوم تھا کہ فرہاد کے اس شوقِ فضول اور جراَت رندانہ کا حاصل کچھ نہ تھا۔ اور وہ اس کی جانکاہی کو ایک سعیِ لاحاصل جانتے تھے

کوہکن نقاشِ یک تمثالِ شیریں تھا اسد
کوہ سے سر مار کر ہو سے نہ پیدا آشنا

غالب کو فرہاد سے ایک شکایت بھی تھی۔ کہ وہ ایک قوی ہیکل مزدور تھا۔ جسے ذوقِ نظر حاصل تھا نہ شعور بس اس نے ایک دفعہ شیریں کو دیکھا اور ایک جانور کی طرح اس کے حسن سے مسحور ہو گیا اور لگا اس کے عشق میں تیشہ چلانے۔ نہ غمِ عشق میں اپنا دل جلایا۔ نہ خواب و خور سے محروم ہوا، نہ ہدفِ ملامت بنا۔ نہ پتھر کھائے۔ اور نہ عشق میں اپنے آپ کو بھولا۔ وہ تو ایک پہلوان کی طرح تیشہ اٹھا کر شیریں کو حاصل کرنے کی دھن میں لگ گیا۔ اس مقام تک اس کی پہنچ نہیں تھی۔ جہاں زورِ بازو سے گذر کر ہمت کا امتحان ہوتا ہے

کریں گے کوہکن کے حوصلے کا امتحاں آخر
ہنوز اس خستہ کے نیروئے تن کی آزمائش ہے

بہرحال اعلیٰ صلاحیتوں سے محروم ہونے کے باوجود اس نے اپنے فن میں تو کمال حاصل کر لیا۔ اور کدال چلا کر لوگوں کی اور خاص طور پر شیریں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ غالب کی نظر میں یہ بھی غنیمت تھا۔ چنانچہ انہوں نے سعادت مند لوگوں کی نصیحت کے لیے

"نسب کمال فن کہ عزیز جہاں شود" کی مثال کے طور پر فرہاد کی زندگی کو پیش کیا ہے۔

ہم سخن تیشے نے فرہاد کو شیریں سے کیا
جس طرح کا بھی کسی میں ہو کمال اچھا ہے

اِس تعریف میں بھی بلا کی تحقیر ہے۔ بات یہ ہے کہ غالب یا تو قلم کے کمال کے مدّاح ہو سکتے تھے۔ یا شمشیر کے کمال کے۔ ان دونوں صورتوں میں کمال کی نوعیت سے غرض قلم کی ہوتی ہے لیکن تیشے کا کمال ان کی سمجھ میں نہ آسکتا تھا۔ مزدور تیشہ چلاتا ہے اجرت کے لیے۔ اجرت چاہے مزدوری کی شکل میں مانگے چاہے شیریں کی صورت میں۔

غالبؔ کے اشعار کے اس جائزے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ ایک تو فرہاد سے وہ اس لیے ناخوش تھے۔ کہ وہ ان کے طبقے سے تعلق نہیں رکھتا تھا ممکن ہے وہ اس کی پیدائش کو نظر انداز کر دیتے۔ لیکن وہ اس بات کو کیسے بھول سکتے تھے۔ کہ اس نے عمداً مزدوری کا پیشہ اختیار کیا تھا۔ پہلی چیز جسے انھوں نے ناقابلِ معافی سمجھا وہ اس کا پیشہ تھا۔ ع

"پیشے میں عیب نہیں رکھیے نہ فرہاد کو نام"

دوسری بات یہ تھی کہ (ان) کی نظر میں وہ غیرت اور خودداری سے اس قدر محروم تھا۔ کہ رقیب کے در پر مزدوری کرتے ہوئے اسے عار بھی نہ آئی۔ ع

"عشق و مزدوریِ عشرت گہِ خسرو کیا خوب"

تیسری بات یہ کہ اس قدر کور ذوق اور تنومند تھا کہ پہلوانِ سخن ناسخ کی طرح زورِ بازو سے میدان جیتنا چاہتا تھا۔ ع

ہنوز اس خستہ کے نیروئے تن کی آزمائش ہے

چوتھی بات یہ تھی کہ عاشقوں کی روایت کے برعکس عشق میں سب کچھ بھول جانے کے بجائے وہ اپنے فن میں اور زیادہ چابکدست ہو گیا۔

ہم سخن تیشے نے فرہاد کو شیریں سے کیا

اور پانچویں بات یہ کہ اسے مرنے کا قرینہ بھی نہ آیا۔ مرا بھی تو تیشہ مار کے۔ حالانکہ مرنے کا انداز تو یہ ہونا چاہیے۔ کہ کوئی عیسیٰ نفس بھی انگشت بدنداں رہ جائے۔

مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالبؔ

یہ تھا فرہاد غریب سے غالب کی عداوت کا ایک مختصر خاکہ۔ اس کے برعکس قیسؔ کی طرف سے غالبؔ کا دل بچپن سے ہی نرم تھا۔

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا۔

مجنوںؔ کے معاملے میں تو غالبؔ نے اس قدر احتیاط کی۔ لیکن فرہاد بے چارے پر وہ آخر وقت تک سنگ باری کرتے رہے۔

ناشر ... ... شمس زبیری

سرورق ... ... اختر ہلال زبیری

کتابت ... ... محی الدین صابر۔

طباعت ... ... انٹرنیشنل پریس ــــ کراچی

اشاعت ... ... اگست ــــ سنہ ۱۹۶۵ء

مقامِ اشاعت:۔ کاشانۂ اردو ۲/۶۔ اکبر روڈ۔ صدر کراچی ۳

فراقؔ گورکھپوری

قفس دیا کہ ہمیں دے دیا وطن صیّاد
بھٹک رہے تھے ابھی تک چمن چمن صیاد

مری نوا کی لَویں جس میں جگمگاتی تھیں
تجھے ہے یاد گلوں کی وہ انجمن صیّاد

انہیں کے دل ہیں امینِ رموزِ آزادی
سمجھتے ہیں جو اسیری کا ہے ایک فن صیّاد

تمام اہلِ چمن ایک قوم ہیں جس میں
مرا ترا نہیں چلتا نہ ما و من صیّاد

ہمیں ہیں گل، ہمیں بلبل، ہمیں بہار و خزاں
تمام اہلِ چمن، ایک جان و تن صیّاد

چھپا لیا ہے مجھے خوشبوؤں کی چادر نے
ملا ہے نکہتِ گل کا مجھے کفن صیّاد!

گلابیوں سے ہے رنگیں فضلۂ گلشنِ راز
ہزاروں دستِ صبا آبگینہ زن صیّاد

جو چیر دے دلِ خارا نوا کے تیشوں سے
ترے اسیر ہیں وہ رشکِ کوہکن صیّاد

کب اس سے وحدتِ گلشن میں فرق پڑتا ہے
ہزار الگ ہوں گل و لالہ کے چلن صیّاد

وہ فصلِ گل، وہ چراغاں، ہر اک خیاباں میں
کہ نو دمیدہ شگوفے تھے شعلہ زن صیّاد

گلوں کے برگ پہ لرزاں تھے قطرۂ شبنم،
ٹکے تھے لعلِ یمن میں دُرِ عدن صیّاد

کھلیں تو کس کے لیے، دیں مہک تو کس کے لیے
ہزاروں پھول ہیں، گلہائے بے چمن صیّاد

امامِ مذہبِ گلشن، ضمیرِ فطرت ہے!
نہیں ہیں رہبرِ دیں، شیخ و برہمن صیّاد

مری نوا سے گلوں کی صفیں الٹتی تھیں
مری صدا تھی، مئے گلستاں فگن صیّاد

نزولِ لالہ و گل تھا کہ کارواں اُترا،
جلے چراغ سرِ منزلِ چمن صیّاد

بس ایک نکہتِ برباد، اک طلسمِ نظر
یہی چمن تھا یہی حاصلِ چمن صیّاد

فراقؔ کا نہ لگے جی کہیں تو کیا ہے علاج،
قفس قفس ہے یہ مانا، چمن چمن صیّاد!

شان الحق حقی

فنون۔ لاہور

بکھر جائے گی شام آہستہ بولو — ترٹق جائیں گے جام آہستہ بولو

نکل جاتا ہے نام، آہستہ بولو — زباں آئے نہ کام، آہستہ بولو

نہ دو داغوں کے بھید آہوں کو دیکھو — نہ لو، نالوں کا نام، آہستہ بولو

وہ اُبھری یاد میں بھولی سی اک دھن — یہ ہے اُس کا پیام، آہستہ بولو

نہ اُڑ جائیں ترانے شاخِ دل سے — بچھا رکھا ہے دام، آہستہ بولو

یہی ہوتے ہیں آدابِ محبت — کہ جب لو اس کا نام، آہستہ بولو

نہ لے تنہائی کی راتوں میں اک دن — خموشی انتقام، آہستہ بولو

بہت ہے صدمۂ یک آہ اس کو — ہے نازک یہ نظام، آہستہ بولو

نہ جانے کون بیٹھا ہو کمیں میں — اندھیری ہے یہ شام، آہستہ بولو

فغانِ دل سے کس کا دل پسیجا — یہ ہے سودائے خام، آہستہ بولو

ابھی تو راہ میں دیوار و در ہیں — ابھی دو چار گام، آہستہ بولو

زبانوں سے زبانے اُٹھ رہے ہیں — سلگ اُٹھے کلام، آہستہ بولو

ابھی تو بادۂ الفت کا حقیؔ

پیا ہے ایک جام، آہستہ بولو

احمد فراز — فنون۔لاہور

رنجش ہی سہی، دل ہی دکھانے کے لیے آ
آ پھر سے مجھے چھوڑ کے جانے کے لیے آ

کچھ تو مرے پندارِ محبت کا بھرم رکھ
تو بھی تو کبھی مجھ کو منانے کے لیے آ

پہلے سے مراسم نہ سہی، پھر بھی کبھی تو
رسم و رہِ دنیا ہی نبھانے کے لیے آ

کس کس کو بتائیں گے جدائی کا سبب ہم
تو مجھ سے خفا ہے تو زمانے کے لیے آ

اک عمر سے ہوں لذتِ گریہ سے بھی محروم
اے راحتِ جاں مجھ کو رلانے کے لیے آ

اب تک دلِ خوش فہم کو تجھ سے ہیں امیدیں
یہ آخری شمعیں بھی بجھانے کے لیے آ

اختر ہوشیار پوری — کامران سرگودھا

شب کا سناٹا بھی کیا ہوتا ہے
ہر نفس دل کی صدا ہوتا ہے
یوں نہ ویرانۂ جاں سے گزرو
ہر قدم نقشِ وفا ہوتا ہے
سونی شاخیں یہ پتا دیتی ہیں
مسکرانا بھی خطا ہوتا ہے!
اپنے ہاتھوں سے تراشا ہو جسے
وہی بت اپنا خدا ہوتا ہے
رہیے گر چپ تو سبب پوچھتے ہیں
کہیے گر کچھ تو گلہ ہوتا ہے!
جستجو ہو تو بھٹکنا کیسا،
راستہ راہ نما ہوتا ہے
دل دھڑکتا ہے ترے نام کے ساتھ
جیسے تو دل سے جدا ہوتا ہے
پھر بہار آئی چمن میں اختر
پھر کوئی زخم ہرا ہوتا ہے

مجیب خیرآبادی — خرام۔ چالگام۔

کانپ اٹھا ہے لبِ نغمہ و فریاد اب کے
"صید" ہو جائے نہ خود آپ ہی صیاد اب کے
اتنی محکم تو نہ تھی پہلے تمنائے ستم
لے ہی ڈوبے نہ کہیں حسرتِ فریاد اب کے
جیسے دل ڈوب ہی جائے گا سرِ قلزمِ غم
کس قدر لوٹ کے برسی ہے تری یاد اب کے
باز آ جاؤ ہوا خواہیِ گل سے یارو
صحنِ گلشن میں اکیلا نہیں صیاد اب کے
جانے کس دل نے جلائے ہیں تمنا کے چراغ
شمع روشن ہے سرِ رہگزرِ باد اب کے
عشق تو جب بھی اٹھا تیشہ بکف اٹھا ہے
حسن بھی مان گیا، عظمتِ فرہاد اب کے
دل سلگتا ہے نہ آنکھوں سے لہو بہتا ہے
اک چراغِ تہِ داماں ہے تری یاد اب کے
سرحدِ منزلِ جاناں تو نظر آئی مجیبؔ
آرزو یہ ہے نہ لوٹے کوئی افتاد اب کے

شوکت عابدی — منشور۔ کراچی

کیسے کیسے میخانے بن گئے ہیں ویرانے
وقت کے تقاضے کو پھر بھی لوگ کم جانے

گردشِ غمِ دوراں تو نے وہ کیے احساں!
دور دور رہتے ہیں اپنے ہوں کہ بیگانے

اہلِ عقل و دانش بھی مات کھا گئے کیا کیا
منزلوں پہ پہنچے ہیں، منزلوں کے دیوانے

آفتاب سے چہرے ماہتاب سے مکھڑے
کھو گئے کہاں آخر کیا ہوئے خدا جانے

آس بھی ہے یاس آگیں آرزو بھی حسرت ہے
زیست کے کرشموں کو کوئی کس طرح جانے

جستجو، تمنائیں، آرزو، طلب، ارماں
شوکتؔ جنوں کے ہیں کامیاب افسانے

سردار جعفری

صبا۔ حیدرآباد دکن

پانچ نظمیں

ترے پیار کا نام

دل پہ جب ہوتی ہے یادوں کی سنہری بارش،
سارے بیتے ہوئے لمحوں کے کنول کھلتے ہیں
پھیل جاتی ہے ترے حرفِ وفا کی خوشبو
کوئی کہتا ہے مگر رُوح کی گہرائی سے
شدتِ تشنہ لبی بھی ہے ترے پیار کا نام

درد اک چاند ہے

درد اک چاند ہے ہوتا ہے جو سینے میں طلوع
غم ہے اک نشترِ نور
جو دل وجاں کے اندھیرے میں اتر جاتا ہے

جب ترا نام لیا

جب ترا نام لیا دل نے تو دل سے میرے
جگمگاتی ہوئی کچھ وصل کی راتیں نکلیں
بھیگی پلکوں پہ سجائے ہوئے اشکوں کے چراغ
سر جھکائے ہوئے کچھ ہجر کی شامیں گذریں
قافلے کھو گئے پھر درد کے صحراؤں میں
درد جو تیری طرح نور بھی ہے نار بھی ہے
دشمنِ جاں بھی ہے، محبوب بھی دلدار بھی ہے

غم کا ہیرا

غم کا ہیرا
دل میں رکھو،
کس کو دکھاتے پھرتے ہو
یہ چوروں کی دنیا ہے

شعلہ لبی

یہ مری شعلہ لبی تشنہ لبی کی تکمیل
اور تری شعلہ لبی آتشِ سیال کا رنگ
کر دیا جس نے حریفِ لبِ پیمانہ مجھے

اختر الایمان

سیپ۔ کراچی

ساتویں دن کے بعد

غرضِ نقشِ ثانی ہوا جب مکمل تو دیکھا خدا نے
کہا خود سے ہی زیرِ لب مسکرا کر کہ "اچھا ہے!"
اور آدمی کو جو تنہائی کا ایک احساس تھا مٹ گیا۔
بوئے گل کی طرح، چاند کی ضو کی مانند نغموں کی صورت،
چلے دونوں گلگشت کے واسطے اور باغِ جناں
آج تک جو فضول ایک تخلیق تھی۔ ایک جنگل تھا خود رو
چمن ساز کی قوتِ صالحہ کا کرشمہ بنا
موجِ تسنیم و کوثر بنی راحتِ جاں فزا،
اور پھر یوں ہوا وقت جیسے گزرتا گیا
ایک احساس پھر سے ابھرنے لگا دونوں ہیں اجنبی،
پھر وہی پہلی تنہائی شدت سے محسوس ہونے لگی
دونوں کو پھر کہیں سے یہ تحریک ملنے لگی، وہ شجر
جس کو چھونے کی بالکل اجازت نہیں، آخرش ہے وہ کیا
اور یہ جاننے کے لیے دونوں بے چین اتنے ہوئے،
سخت تنبیہ کے بعد بھی، چھپ کے ممنوعہ پھل کھا لیا۔
زلزلہ سا اٹھا، کھاتے ہی دونوں کے ہوش جاتے رہے،
اور جب آنکھ کھولی تو دیکھا کہ آغوشِ جنت نہیں
پاؤں سے تا جبیں، دونوں عریاں ہیں چاروں طرف ہے زمیں
دوڑ کر جسم پتوں سے ڈھانپے۔ لگے سوچنے کیا کریں
ایسے دن ڈھل گیا، رات نے لے لیا دونوں کو اپنی آغوش میں
آسمانوں سے دیکھا خدا نے کہا مسکرا کر کہ "اچھا ہے!"
اور عرش سے روح انسان میں آ گیا۔ دوسرا ساتواں دن ہوا

وزیر آغا کامران بسرگودھا

ڈولتی ساعت

سلونی سی اک شام
اور لاکھ رنگوں کی برکھا میں بھیگا ہوا کوئی لمحہ
انگوٹھی کے پاتال میں اک نگینے کے مانند ہنستی ہوئی کوئی ساعت
چمکتا ہوا وہ سماں جب کسی ڈولتے پل کو جھولا بنا کر
ہلا کر،
عجب میٹھی نظروں سے میری طرف تو نے دیکھا
ہر اک سمت سے بے خبر، لفظ و معنی کے رشتے سے نا آشنا
کوئی اندھا، لرزتا ہوا ایک جملہ ترے کپکپاتے ہوئے نرم ہونٹوں پہ آیا
تو اک جگمگاتے ہوئے پل میں ڈھل کر
مرے ذہن کی تیرگی میں اُجالے کا روشن ستوں بن گیا!

مگر تو نے یہ بھی تو دیکھا
اِدھر شام کی آگ ٹھنڈی پڑی اور اُدھر
کہنہ بیساکھیوں کے سہارے، اپاہج سی اک بڑھیا
بے دانت کے پوپلے منہ سے سیٹی بجاتی ہوئی سامنے آکے رک سی گئی۔
اندھیری رات بن کر
تجھے ڈس گئی!
پھر مجھے ڈس گئی!

وہ لمحہ کہ جس کے لیے ہم نے لمبی مسافت کا ہر دکھ اُٹھایا
فقط ایک پل تھا
پہاڑوں پہ بل کھاتی وحشی ندی پر
درختوں سے لٹکا ہوا
کچے رستوں کا اک پل!!

شادؔ امرتسری
فنون - لاہور

ادھیڑ عمر

کسی کا بھائی، کسی کا شوہر کسی پیارا
وہ کون ہے
اتنی دور رہ کر بھی میری خوشیوں، مرے غموں میں
شریک سا ہے
وہ کون ہے جس کے منتروں نے
گئے دنوں کے دہکتے لمحوں
کو میرے گوشے لگے دوپٹے
مری حنا بستہ انگلیوں سے جدا کیا
جدا کیا ہے
کبھی وہ میرے بھی روبرو ہو تو اس سے پوچھوں
تو کس کا بھائی ہے کس کا شوہر ہے کس کا پیارا ؟

مجید امجد
فنون - لاہور

بے نشان

میں اب آیا ہوں، اتنے برسوں کے بعد
آندھیاں آئیں، بدلیاں برسیں
دب گئیں خاک کی تہیں، تہِ خاک
بہتی مٹی میں بہ گئی مٹی...!
میرے نادیدہ پیش رو! تری قبر
کس جگہ تھی، یہ اب کسے معلوم!
یونہی اپنے قیاس سے، میں نے،
ریت کی اک شکن کو پہچانا!
مٹتی سطروں پہ ایک ڈوبتی سطر:
اک خطِ خاک! جس پہ کچھ کنکر
میں نے پہلے تو چن کے رکھ بھی دیے
پھر خیال آیا! اب یہ کون کہے۔
قبر تیری یہیں کہیں تھی، مگر
تھی کہاں، شاید اس جگہ تو نہ تھی
کچھ جو سوچا نہ جانے کیا سوچا
ذہن میں لاکھ الجھ گئے خاکے
میں نے کنکر وہ سب بکھیر دیے
بے نشاں خاک میرے سامنے اب
ان جہانوں کا ایک حصہ ہے
جن کے بھیدوں کی تھاہ میں تو ہے
جن کے سایوں کی قبر میں، میں ہوں!

مشفق خواجہ　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　فنون۔ لاہور

ڈاکٹر عندلیب شادانی

(تحقیق کی روشنی میں)

"تحقیق کی روشنی میں" ڈاکٹر عندلیب شادانی کے تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان مضامین کو سمجھنے اور پرکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی سابقہ ادبی فتوحات پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے تاکہ زیر تبصرہ کتاب کی اہمیت و افادیت پورے طور پر واضح ہو سکے۔

شادانی صاحب لکھنے والوں کی اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جس نے پہلی جنگِ عظیم کے فوراً بعد ادبی دنیا میں قدم رکھا۔ اُس زمانے میں لکھنے والوں کو اپنے آپ کو منوانے کے لیے بڑی ریاضت کرنی پڑتی تھی۔ اگر کوئی روشِ عام پر چلتا تھا تو اُسے لوگ بہت جلد نظر انداز کر دیتے تھے۔ اگر روشِ عام سے ہٹنے کی کوشش کی جاتی تھی تو اقبال کے سامنے کسی کا چراغ نہ جلتا تھا۔ ایسے عالم میں جن لوگوں نے کچھ کرنے یا کر گزرنے کی جسارت کی ان میں شادانی صاحب بھی شامل ہیں۔ ان کی ادبی زندگی کی روداد مسلسل جدّ و جہد اور جاں فشانی سے عبارت ہے۔ وہ جس طرح ہمارے ادب میں داخل ہوئے اور جس انداز سے اُنھوں نے اپنے آپ کو منوانے کی کوشش کی اس کی تفصیل دلچسپی سے خالی نہیں۔

شادانی صاحب کی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے ہوا۔ انھوں نے بقول خود یہ کام دوسروں کی دیکھا دیکھی شروع کیا (دیباچہ "نشاطِ رفتہ") اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے کم از کم ایک درجن شعر ایسے ضرور کہے جو ہمارے بہترین ادب کا حصہ ہیں۔ ایسا ہی ایک شعر یہ ہے جو تقریباً ہر اُردو جاننے والے نے سنا ہوگا ؎

گزاری تھیں خوشی کی چند گھڑیاں　　　اُنھیں کی یاد میری زندگی ہے

شادانی صاحب نے ۱۹۲۴ء میں باقاعدہ شاعری شروع کی۔ اس زمانے کے لاہور کے ادبی ہنگاموں میں انھوں نے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ بے شمار مشاعرے لوٹے اور نام پیدا کیا۔ اس "لوٹ مار" میں شاعری سے زیادہ پڑھنے کے انداز نے حصّہ لیا۔ انھوں نے بلا کا گلا پایا ہے۔ بڑے سوز سے کلام پڑھتے تھے۔ اور اب بھی پڑھتے ہیں۔ لیکن یہ شہرت عارضی تھی۔ وہ اپنے ہم عصروں کے مقابلے پر بہ حیثیتِ شاعر نہ تو کوئی خاص رنگ پیدا کر سکے۔ اور نہ کوئی شعری کارنامہ ان کی ذات سے منسوب ہو سکا۔ یہ المیہ شادانی صاحب

کی ادبی جد و جہد کو ایک دوسرے میدان میں لے آیا۔ اور انھوں نے ۱۹۳۴ء کے لگ بھگ افسانہ نگاری کے میدان میں قسمت آزمائی شروع کی۔ اس زمانے میں سستے رومانی افسانوں کی بڑی مانگ تھی۔ شادانی صاحب نے بھی اسی رنگ کو اپنایا۔ لیکن پیشے کی ثقاہت کی بنا سے وہ یہ رومانی افسانے اپنے نام سے منسوب نہ کرنا چاہتے تھے۔ نیز اس میدان میں بھی وہ ناکامی کا وار سہنے کے لیے تیار نہ تھے لہٰذا انھوں نے "پریم پجاری" کے فرضی نام سے "ساقی" میں سستے رومانی افسانے لکھنے شروع کر دیے۔ انھوں نے ان افسانوں کو بھی کہانیاں بنا کر پیش کیا۔ شادانی صاحب کی توقع کے خلاف لیکن اس زمانے کے مزاج کے عین مطابق یہ کہانیاں بہت پسند کی گئیں ادبی حلقوں میں ان کا بڑا چرچا ہوا اور عام پڑھنے والوں نے انھیں بہت سراہا۔ یہ مقبولیت بھی شادانی صاحب کے لیے وجہ ملال ہوئی۔ اس لیے کہ اگر یہ کہانیاں ان کے اصلی نام سے چھپتیں تو شہرت حاصل ہوتی۔ لیکن "پریم پجاری" کے فرضی نام نے یہ موقع بھی کھو دیا۔ "پریم پجاری" کا نام ادبی حلقوں میں بحث کا موضوع بنا، لوگ قیاس آرائیاں کرتے تھے کہ اس "پردۂ زنگاری" میں کون ہے؟ یہ صورت حال دیکھ کر شادانی صاحب میں ضبط کا یارا نہ رہا۔ اور انھوں نے اعلان کر دیا کہ "پریم پجاری" دراصل انھیں کا فرضی نام ہے۔ کہانیوں کا مجموعہ دوبارہ چھپا۔ اور نام کا پردہ اٹھنے سے کہانیوں کی مقبولیت بھی رفتہ رفتہ ختم ہو گئی۔ یہاں تک کہ اب ان کہانیوں کو پڑھنے والے تو کیا واقفیت رکھنے والے بھی دو چار ہی ہوں گے۔ ادبی دنیا میں شادانی صاحب کی یہ دوسری پسپائی تھی۔

شاعری اور افسانہ نگاری کے ساتھ تنقید و تحقیق سے بھی شادانی صاحب کو خاصی دلچسپی رہی۔ شاید تدریسی مشغلے کی بنا پر وہ اس کے لیے مجبور بھی تھے۔ لیکن اس فن کو ایک ادبی حربے کے طور پر انھوں نے افسانہ نگاری کے فوراً بعد کے زمانے (۱۹۴۰ء-۴۷ء) میں اپنایا۔ اور "ساقی" میں دورِ حاضر کے غزل گو شعرا کے بارے میں بڑے چونکا دینے والے مضامین لکھے۔ حسرت، اصغر، جگر اور فانی۔ اس زمانے میں بے انتہا مقبول تھے۔ شادانی صاحب نے ان بتوں کو توڑنے پر کمر باندھی۔ انھوں نے صنفِ غزل کے علائم و رموز کے معانی لغت میں دیکھے۔ اور یہ اعلان کیا کہ ان سب شاعروں نے فرضی اور مصنوعی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان کے جذبات سچے نہیں ہیں۔ انھوں نے اپنی وارداتِ قلبی کو بیان نہیں کیا۔ بلکہ تقلید پرستی میں کھو گئے ہیں۔ ایک تو موضوع چونکا دینے والا۔ دوسرے شادانی صاحب کا اندازِ بیان طنز بلکہ مزاح سے بھرپور۔ لہٰذا یہ مضامین بھی ادبی حلقوں میں بحث کا موضوع بنے۔ انھیں سب نے پڑھا۔ اور بہت کم لوگوں نے اتفاق کیا۔ بہرحال شادانی صاحب ایک بار پھر سب کی نگاہوں کا مرکز بن گئے۔ ۱۹۵۰ء یا ۱۹۵۱ء میں یہ مضامین کتابی شکل میں شایع ہوئے تو اس وقت نئے پڑھنے والوں کو بڑی حیرت ہوئی کہ صرف دس سال پہلے اردو ادب میں ایسے مضامین بھی لکھے جاتے تھے۔ "دورِ حاضر اور اردو غزل گوئی" کو اب بھی ایک مزاحیہ کتاب کی حیثیت سے پڑھا جاتا ہے۔ اگر شادانی صاحب باقاعدہ طور پر طنز و مزاح کی طرف توجہ کرتے تو یقیناً کچھ کر لیتے۔ لیکن انھوں نے اس میدان میں سنجیدگی سے قدم رکھا ہاں، تو بات ہو رہی تھی شادانی صاحب کی مضمون نگاری کی۔ یہ سلسلہ تھوڑے بہت وقفوں کے ساتھ اب بھی جاری ہے۔

ان کے مضامین کا ایک مجموعہ "تحقیقات" شاید آزادی سے پہلے شایع ہوا تھا۔ دوسرا اب چھپا ہے۔ جس پر تبصرہ لکھنے کے لیے یہ تمہید اٹھائی گئی ہے۔

شادانی صاحب کے ادبی مزاج کو سمجھنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ ان کے یہاں ذاتی پسند اور ناپسند کو سب سے بڑے تنقیدی اصول کی حیثیت حاصل ہے۔ اگر انھیں کوئی چیز پسند آ گئی تو وہ اسے بہتر ثابت کرنے کے لیے ہر ممکن دلیل لائیں گے

اور اگر پسند نہیں آئی تو پھر دنیا کی کوئی طاقت انھیں اپنے خیال سے نہیں ہٹا سکتی۔ اس بات کو ایک مثال سے سمجھیے۔ پروفیسر اختر انصاری دہلوی کا حسب ذیل شعر شادانی صاحب کو بہت پسند ہے ؎

کامیابی محال ہے اختر ذوق اتنا بلند رکھتا ہوں۔

اس کی تعریف وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں :۔

"اختر کے ذوق کی بلندی کا آئیڈیل ہے جس تک پہنچنا کسی حالت میں ممکن نہیں۔ کامیابی کا محال ہونا اس کے آئیڈیل ہونے کی صریح دلیل ہے۔ (تحقیقات ۲۴۴)

اس شعر کے مقابلے پر حسرت کا مندرجہ ذیل شعر انھیں سخت ناپسند ہے ؎

غم آرزو کا حسرت سبب اور کیا بتاؤں مری ہمتوں کی پستی مرے ذوق کی بلندی

وجہ یہ ہے۔ "ہمتوں کی پستی نے شعر کو بھی پست کر دیا ہے۔ پھر بلندیِ شوق کی بھی کوئی حد مقرر نہیں کی گئی۔ بلندی کم بھی ہو سکتی ہے، زیادہ بھی ہو سکتی ہے۔ اتنی بھی ہو سکتی ہے کہ اس سے زیادہ متصور نہ ہو سکے۔ علاوہ ازیں حسرت کے شوق کی بلندی جو ادنیٰ درجہ کی ہے شاید اس لیے بھی زیادہ معلوم ہوتی ہے کہ بہت پست ہے۔" (تحقیقات صفحہ ۲۴۴)

اختر اور حسرت کے اشعار میں جو فرق ہے وہ محتاج تشریح نہیں۔ ایک اوسط درجے کے شعر کو ایک بلند شعر سے بڑھانے کے لیے شادانی صاحب نے سخن فہم سے زیادہ ایک طرفدار کا کردار ادا کیا ہے۔ شادانی صاحب کا تنقیدی بہی کھاتا اسی قسم کی میزانوں سے بھرا ہوا ہے۔

شادانی صاحب کی ذاتی پسند اور ناپسند کا سرچشمہ ان کی خود پسندی ہے جس کی طرف ان کے ایک شخصیت نگار ڈاکٹر منیر واری نے بھی اشارہ کیا ہے (نقوش "شخصیات نمبر) شادانی صاحب تنقید و تحقیق کے میدان میں دوسروں کے بت توڑنے کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ لیکن اپنا بت انھیں بے انتہا عزیز ہے اور اس کی پرستش ان کے نزدیک کارِ ثواب ہے۔ جب وہ سخن کے محاسن و معائب کی بحث چھیڑتے ہیں تو معائب دوسروں کے کلام سے لائیں گے اور محاسن کی مثالیں اپنے کلام سے دیں گے۔ اس کی سب سے بہترین مثال "دورِ حاضر اور اردو غزل گوئی" میں ملتی ہے۔ شادانی صاحب مسلسل غزل کے سلسلے میں بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"لکھنے والوں نے اردو میں بھی مسلسل غزلیں لکھی ہیں۔ ذیل میں کسی گمنام شاعر کی ایک مسلسل غزل درج کی جاتی ہے کل نو شعروں میں ایک مکمل داستانِ محبت بیان کر دی ہے۔ وہ ابتدائے محبت کی ملاقاتیں، وہ صحن چمن اور چاندنی راتیں، باغوں میں وہ کھیل کود، وہ آنکھ مچولی، پھر آہستہ آہستہ کچھ اور بے تکلفی، کوئی گلاب کے تختوں میں جا گھسا۔ ڈھیر سے پھول لایا اور کسی کے بالوں میں لگا دیے.... پڑھیے اور خود فیصلہ کیجیے کہ ایک اچھی مسلسل غزل کس قدر قیمت کی مستحق ہوتی ہے۔ (صفحات ۱۳۱-۱۳۲)

اس کے بعد شادانی صاحب نے ایک غزل نقل کی ہے جس کا پہلا اور آخری شعر یہ ہے ؎

پھر اپنے حال کو ابھی بنا رہا ہوں میں پھر آستیں میں ستارے چھپا رہا ہوں میں

کچھ اور بس نہیں کا شانۂ تصور میں نشاطِ رفتہ کی شمعیں جلا رہا ہوں میں

آپ کو جان کر حیرت ہوگی کہ یہ گمنام شاعر خود حضرت شادانی ہیں۔ اس لیے کہ یہی غزل اُن کے دیوان "نشاطِ رفتہ" میں بھی شامل ہے (صفحہ ۲۵۱) خود ستائی کی ایسی مثال اُردو ادب میں ذرا کم ہی ملے گی۔

شادانی صاحب کی ایک اور صفت تکرار بھی ہے۔ یعنی وہ ایک ہی بات کو بار بار بیان کرتے ہیں۔ ایک ہی مضمون پر متعدد مرتبہ طبع آزمائی کرتے ہیں۔ اپنے نئے مضامین میں پرانے مضامین کے بیشتر حصوں کو بلا حوالہ لفظ بہ لفظ نقل کر جاتے ہیں۔ مثلاً سرقہ، توارد ـــ اور امرد پرستی کے بارے میں انھوں نے اپنی کتابوں میں جو کچھ لکھا ہے وہ ایک دوسرے کی صدائے بازگشت ہے۔ ایک مضمون "کسوٹی" کے بہت سے حصّے ایک دوسرے مضمون "مواد، ہیئت اور اسلوب" میں لفظ بلفظ شامل کر دیے ہیں۔ غالب کی "پنج آہنگ" میں چند غلطیاں نظر آئیں تو اُن کو تحقیق کی روشنی میں دو جگہ بیان کیا ہے (صفحات ۲۱۸ اور ۴۳۸) شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ شادانی صاحب نے گنتی کے موضوعات پر لکھا اور غور کیا ہے۔ لہٰذا اُنھیں کو بار بار دُہراتے رہتے ہیں۔

یہاں تک تو شادانی صاحب کی عام خصوصیات کے بارے میں گفتگو تھی۔ اب اصل کتاب پر آئیے۔ اس میں ۲۱ مضامین ہیں ان میں سے مندرجہ ذیل مضامین کے بارے میں کچھ کہنا بے کار ہے :-

(۱) اوزانِ رباعی کے بارے میں ایک نئی دریافت ـــ (۲) دیوانِ جہاں ـــ (۳) ناسخ کی جذبات نگاری۔

اس لیے کہ یہ مضامین ڈاکٹر صاحب کے کم اور دوسروں کے زیادہ ہیں۔ پہلے مضمون میں اوزانِ رباعی سے متعلق امیر الاسلام شرقی کی دریافت کی تفصیل ہے۔ دوسرے میں 'دیوانِ جہاں' کی نقل (بحذف اشعار) ہے۔ تیسرے میں بغیر کسی تنقیدی تجزیے کے ناسخ کے کلام کا انتخاب ہے۔ اس مضمون کے عنوان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب شاید ناسخ کی جذبات نگاری کا تفصیلی جائزہ پیش کریں گے۔ لیکن مضمون کا متن دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی طرف سے کچھ نہیں کہا۔ بلکہ ناسخ کے ایسے اشعار یکجا کر دیے جو بقول اُن کے پڑھنے والے کے دل پر ایک گہرا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ اس انتخاب میں ایسے اشعار بھی دیے ہیں :-

پاس یار جانی ہے، بادہ ارغوانی ہے ـــ شغل شعر خوانی ہے، عالمِ جوانی ہے

منعم کے شکر میں بھی ہلائیں کبھی کبھی ـــ تنہا برائے لذتِ دنیا زباں نہیں!

منعمِ موذی کے گھر کو اہلِ حاجت لوٹ لیں ـــ مانگتا ہے کب کوئی جا کر عسل زنبور سے

دیکھنا اے اہلِ عبرت انتقامِ آسماں ـــ بنتے ہیں جامِ گدا خاکِ سرِ فغفور سے

شادانی صاحب اس قسم کے اشعار کو "جذبات نگاری" کا نام دیتے ہیں۔

اس مجموعہ کا پہلا اور طویل ترین مضمون "شیفتہ ایک نقاد کی حیثیت سے" ہے۔ کتاب کے مقدمہ نگار نے اس مضمون کو خاص طور پر سراہا ہے۔ نیز پہلی مرتبہ جب یہ "صحیفہ" (لاہور) میں شائع ہوا تھا تو اُس وقت اُس کی خاصی شہرت ہوئی تھی۔ یہ مضمون تفصیلی مطالعہ کا مستحق ہے۔ لہٰذا اس پر میں تبصرے کے آخر میں کچھ عرض کروں گا۔

اس مجموعے کا دوسرا اہم مضمون "مواد، ہیئت اور اسلوب" ہے۔ اس کی بسم اللہ ہی غلط ہوئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے پوری اُردو شاعری کو تین ادوار میں اس طرح تقسیم کیا ہے :-

پہلا فارسی اثر کا دور۔ ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک

دوسرا انگریزی اثر کا دور۔ ۱۸۵۷ء سے پہلی جنگِ عظیم کے چند سال بعد تک۔

تیسرا اشتراکی اثر کا دور۔ دوسرے دور کے خاتمے سے لے کر آج تک۔

پہلے دَور کی تعریف شادانی صاحب نے اس طرح کی ہے :۔

"اُردو کو فارسی کی بیٹی تو نہیں کہہ سکتے ۔ لیکن اُردو شاعری یقیناً فارسی شاعری کی معنوی اولاد ہے ۔ اور سیرت و صورت دونوں میں ہو بہو اپنی ماں کی تصویر ہے ۔ مضامین و خیالات بھی وہی ۔ طرز و اسلوب بھی وہی ۔ پہلے دَور میں ہماری شاعری کا عام انداز یہی ہے ۔"

ظاہر ہے کہ دکنی شاعری بھی پہلے دَور ہی میں شامل ہوگی ۔ کیا اسے بھی شادانی صاحب مضامین و خیالات اور انداز و اسلوب میں فارسی کی ہو بہو تصویر کہیں گے ؟ پہلے دَور کے زمانے کو اگر وہ دو حصوں میں تقسیم کرتے تو بہتر تھا ۔ دوسرے دَور کو انگریزی اثر کا دَور کہنا صحیح ہے لیکن تیسرے دَور کو اشتراکی دَور کا اثر کہنا مبہم سی بات ہے ۔ روس میں اشتراکی انقلاب ۱۹۱۷ء میں آیا ۔ اس وجہ سے اُردو ادب میں اشتراکی اثرات کا زمانہ بھی یہی قرار پایا ۔ اس پر لطف یہ کہ اشتراکی اثر کا یہ دَور آج تک قائم ہے ۔ پہلے دَور کے اثرات کو ۱۸۵۷ء کے حادثے نے ختم کر دیا تھا ۔ لیکن تیسرے دَور کے اثرات ۱۹۴۷ء کے انقلاب سے بھی ختم نہ ہو سکے ۔ اس تقسیم کے بعد شادانی صاحب نے غرب مصنفین کے نظریاتِ شعر و ادب سے بحث کی ہے ۔ اس ضمن میں وہ ایک جگہ فرماتے ہیں :۔

"سچ پوچھیے تو ایک ماہر صناع ادنےٰ درجہ کے مواد پر انتہائی کوشش کے باوجود اپنے کمال کا اظہار بدرجۂ اتم کر ہی نہیں سکتا ۔ کیونکہ اس مادے میں اتنی قابلیت ہی نہیں ہوتی کہ کمالِ صنعت کو قبول کر سکے .... یہی حال شاعر کا ہے کہ ایک باکمال آرٹسٹ ہوتے ہوئے بھی ادنیٰ اور پست مضامین سے بلند پایہ ، قابلِ قدر اشعار تیار نہیں کر سکتا (صفحہ ۱۴۷)

چند ہی صفحوں بعد شادانی صاحب اپنے اس خیال کی تردید ان لفظوں میں کرتے ہیں :۔

مشاہیر ادب کی اس رائے سے مجھے کلی اتفاق ہے کہ ایک باکمال شاعر معمولی خیالات سے بھی تیر و نشتر تیار کر سکتا ہے اور شاعری کو ساحری بنا سکتا ہے ۔" (صفحہ ۱۶۲)

یہ شادانی صاحب ہی بتا سکتے ہیں کہ جس نقاد کے اپنے خیالات میں ایسا زبردست تضاد موجود ہو وہ ہیئت ، مواد اور اسلوب کے بارے میں کوئی رائے دینے کا کہاں تک اہل ہے ؟ یہ پورا مضمون اسی طرح کی تضاد بیانیوں کا مجموعہ ہے ۔

اسی مضمون میں ڈاکٹر صاحب نے اُردو کے "اشتراکی" (؟) ادیبوں کے بارے میں فرمایا ہے :۔

"اشتراکی ادیب فن کی جمالیاتی اقدار کو اچھی طرح سمجھتے ہیں ۔ اور اُنھوں نے نظم و نثر دونوں کی ایسی قابلِ قدر تخلیقات پیش کی ہیں جو فن کے معیار پر پوری اُترتی ہیں ۔ لیکن اس قسم کے ادبی شہ پارے ناخواندہ عوام میں ان کے اشتراکی خیالات کی اشاعت کا مؤثر ذریعہ نہیں بن سکتے ۔ اس لیے وہ اُن کے کام کی چیز نہیں ۔" (صفحہ ۱۷۶)

اشتراکی ادیبوں کی مخالفت کے جوش میں شادانی صاحب ایک ہی سانس میں اپنی ہی بات کی تردید کر گئے ۔ وہ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اشتراکی ادیبوں نے قابلِ قدر تخلیقات پیش کی ہیں ۔ اور ساتھ ہی اشتراکی ادیبوں پر یہ بھی الزام عائد کر دیا ہے کہ ایسی قابلِ قدر تخلیقات اُن کے کام کی چیز نہیں ۔ گویا شادانی صاحب چاہتے ہیں کہ "اشتراکی ادیب" اپنے کام کی چیزیں پیش کریں ۔ انھیں قابلِ قدر تخلیقات سے پرہیز کرنا چاہیے ۔ آگے چل کر شادانی صاحب نے اشتراکی ادیبوں کے دل کی بات بھی بیان کر دی ہے ۔ جو نہ جانے ان تک کس ذریعے سے پہنچی ۔

"اشتراکی ادیب فن کے تقاضوں کو اچھی طرح سمجھتے ہیں ۔ فنی محاسن سے بخوبی واقف ہیں اور جو فن پارے فنی اعتبار سے مکمل ہوتے ہیں ۔ وہ اُن سے لطف اندوز بھی ہوتے ہیں ۔ چاہے زبان سے اس کا اعتراف نہ کریں ۔" (صفحہ ۱۸۰)

یہی صورتِ حال ایک دوسرے مضمون "ادب میں عریانی اور فحاشی" میں بھی نظر آتی ہے۔ یہ موضوع بھی شادانی صاحب کی دسترس سے باہر ہے۔ دراصل کسی موضوع کی نظریاتی حیثیت پر کچھ کہنا ڈاکٹر صاحب کا منصب نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہ صرف محقق ہیں۔ نقاد نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس مضمون میں انھوں نے پہلے تو فحاشی اور عریانی کی مذمت کی ہے اور آخر میں ادب میں اس کے جواز کا فتویٰ بھی صادر کر دیا۔ منٹو اور عصمت کی فحاشی کو مضر بتایا ہے اور کلاسیکی ادب کی فحاشی کو غیر مضرت رساں کہا ہے۔ لیکن اس کی کوئی وجہ نہیں بتائی۔ انھوں نے اس مضمون میں ادب اور جنسی معلومات حاصل کرنے کے مختلف تحریری ذرائع کو گڈمڈ کر دیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ادب کے ساتھ فحاشی کا بھی ان کے ذہن میں کوئی خاص تصور نہیں ہے۔

اس مجموعے کا ایک اور دلچسپ مضمون "خضر کیوں کر بتلائے کیا بتائے ہم" ہے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ شادانی صاحب نے اپنے سابقہ مجموعے "تحقیقات" میں رباعی پر بحث کرتے ہوئے علامہ اقبال کے ایسے قطعات کو جو بحر ہزج مسدس مقصور یا محذوف میں ہیں، رباعی سے موسوم کیا تھا۔ فرمان فتح پوری نے رسالہ "صحیفہ" (ستمبر ۱۹۵۸ء) میں اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے شادانی صاحب کے اس خیال کی تردید کی تھی۔ نیز یہ بتایا تھا کہ شادانی صاحب کا دوبیتی اور رباعی کو ایک ہی چیز سمجھنا غلط ہے۔ "خضر کیونکر بتائے، کیا بتائے" میں فرمان فتح پوری کے اسی مضمون کا جواب دیا گیا ہے۔ جن لوگوں کی نظر سے اس سلسلے کے سب مضامین گزرے ہیں، وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ شادانی صاحب فرمان فتح پوری کے اعتراضات کو رد کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ انھوں نے اپنے زیر نظر مضمون میں بابا طاہر کے کلام کو (جو مذکورہ بحر میں ہے) فنی طور پر رباعی ثابت کرنے کی یہ دلچسپ دلیل بھی دی ہے:

"بعض اہلِ علم مغربیوں نے انگریزی یا فرانسیسی میں بابا طاہر کے متعلق کچھ لکھا ہے۔ یا اُس کے اشعار کا ترجمہ کیا ہے اُنھوں نے کلام بابا طاہر کو Quatrains کہا ہے۔ رباعی کا انگریزی اور فرانسیسی ترجمہ ـــــ Quatrain ہی ہے۔ اس لیے رباعی یا Quatrain ایک ہی بات ہے۔"

اس دلیل سے کلام بابا طاہر کا فنی طور پر رباعی ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ تمام علمائے فن اس امر پر متفق ہیں کہ رباعی کے اوزان مخصوص ہیں۔ اور ان مخصوص اوزان سے ہٹ کر جو کلام ہوگا وہ رباعی کہلانے کا مستحق نہ ہوگا۔ اس سلسلے میں یہ بتا دینا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ فرمان فتحپوری نے "خضر کیوں کر بتلائے کیا بتائے" کا جواب الجواب لکھا تھا جس کا عنوان "کیا کیا خضر نے سکندر سے" (نگار مارچ ۱۹۶۰ء) تھا۔ اس کے بعد شادانی صاحب خاموش ہو گئے۔ شادانی صاحب کو اگر اپنا یہ مضمون مجموعے میں شامل کرنا ہی تھا تو انھیں فرمان فتح پوری کے جواب الجواب پر بھی ایک نظر ڈال لینی چاہیے تھی۔

شیفتہ سے متعلق مضمون کا تفصیلی جائزہ پیش کرنے سے پہلے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگر تمام مضامین پر فرداً فرداً تبصرہ لکھا جائے تو میری یہ تحریر خاصی طویل ہو جائے گی۔ لہٰذا بقیہ مضامین کے بارے میں مختصراً عرض ہے کہ ان میں چند واقعی اچھے مضامین ہیں۔ "ریختی کا موجد" "محبوب کے لیے فعل مذکر کا استعمال" "لکھنوی شاعری کی چند خصوصیات" "مخزنِ فوائد" اور "گلشن نوبہار" ایک اچھا تحقیقی معیار پیش کرتے ہیں۔ شادانی صاحب کے بقیہ مضامین بھی اگر اسی معیار کے ہوتے تو انکا یہ مجموعہ ہر اعتبار سے قابلِ قدر ہوتا۔ دیگر مضامین (سرقہ اور توارد) ـ (حالی اور پیرویِ مغرب) وغیرہ میں کوئی خاص بات نہیں۔ ایسے موضوعات پر دوسروں نے بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ اور شادانی صاحب سے بہتر لکھا ہے۔ آئیے، اب اس مجموعے کے سب سے بہتر مضمون کی سیر کریں۔ اس مضمون میں پہلے سے یہ طے کر لیا گیا ہے کہ شیفتہ کو ایک اچھا سخن فہم اور نقاد نہ مانا جائے۔ اس مقدمے کو قوی بنانے کے لیے وہ تمام قوت صرف کی گئی ہے جس کی ادبی نقاد یا محقق سے توقع نہیں ہو سکتی۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک ایسے وکیل کا کردار ادا کیا ہے

جس کی تمام قوتیں سچائی تک پہنچنے کے لیے نہیں، بلکہ مقدمہ جیتنے میں صرف ہوتی ہیں۔ انھوں نے سب سے پہلے ان تمام آرا کو یک جا کر دیا ہے جو مختلف اہلِ علم حضرات نے شیفتہ کی سخن فہمی کے بارے میں دی ہیں۔ اور پھر یہ بتایا ہے کہ شیفتہ سے یہ "حسنِ ظن" حالی کی وجہ سے ہے جنھوں نے سب سے پہلے "یادگارِ غالب" میں شیفتہ کی سخن فہمی کی تعریف کی ہے۔ شادانی صاحب نے "گلشنِ بے خار" کی تالیف کے زمانے سے لے کر "یادگارِ غالب" کے زمانے تک کے تذکرہ نگاروں کے حوالے دے کر ثابت کرنا چاہا ہے کہ "انیسویں صدی کے یہ تمام بزرگ .... شیفتہ کی سخن گوئی کی حد سے زیادہ تعریف کرتے ہیں۔ لیکن ان کی سخن فہمی کے متعلق یکسر خاموش ہیں۔" یہاں ادب کا ایک بنیادی سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک اچھا فن کار ایک اچھا نقاد بھی ہوتا ہے یا نہیں؟ شادانی صاحب جانتے ہوں گے کہ تخلیقی عمل تنقیدی عمل کے بغیر وجود میں آ ہی نہیں سکتا۔ اچھا سخن گو ہر عالم میں اچھا سخن فہم ہوتا ہے۔ اور اگر وہ اچھا سخن فہم نہیں ہے تو اس کا اچھا سخن گو ہونا مشکوک ہے۔

حالی اور غالب نے شیفتہ کی سخن فہمی کی جو تعریف کی ہے اس کو ڈاکٹر صاحب نے ان الفاظ میں رد کیا ہے۔ "حالی نواب صاحب کے ملازم اور مصاحب تھے۔ اور پورے سات برس نواب صاحب کے ساتھ رہے۔ لہٰذا انھوں نے شیفتہ کی سخن فہمی کی تعریف کر کے حقِ نمک ادا کیا۔" اگر ڈاکٹر صاحب کی یہ رائے تسلیم کر لی جائے تو پھر ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ حالی نے اپنی مختلف تحریروں میں مختلف ادیبوں کے بارے میں جو آرا دی ہیں ان کی بنیاد بھی ذاتی تعلقات پر تھی۔ کیا شادانی صاحب حالی کی تمام تحریروں کے بارے میں یہی رائے دے سکتے ہیں؟ غالب کا جرم یہ ہے کہ انھوں نے یہ شعر لکھا ہے

غالب بہ فنِ گفتگو نازش بدیں ارزش کہ او   ننوشت در دیواں غزل تا مصطفٰے خاں خوش نکرد

اس جرم کو ثابت کرنے کے لیے انھوں نے تفصیل سے بتایا ہے کہ "اس (شعر) کی حیثیت رسمی تعارف اور شاعرانہ سخن سازی سے زیادہ نہیں۔" اس سلسلے میں انھوں نے غالب کی مختلف تحریروں سے (۱۰) اقتباسات پیش کر کے بتایا ہے کہ "غالب ایک مرنجاں مرنج قسم کے انسان تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہر شخص ان سے خوش رہے۔ اس کے علاوہ اس زمانے کی تہذیب کا تقاضا یہی تھا کہ ہر شخص کو اچھے لفظوں میں یاد کیا جائے۔" اگر شادانی صاحب کی اس بات کو درست تسلیم کر لیا جائے تو غالب کی ان تحریروں کے بارے میں کیا رائے ہوگی کہ جن میں اُس نے اس روش کی پیروی نہیں کی۔ اور خود ڈاکٹر صاحب کے بیان کے مطابق صہبائی جیسے استاد فاضل کو خاطر میں نہیں لاتے اور فرماتے ہیں کہ "وائے اس ہیچ و پوچ پر جس کو صہبائی کا تلمذ موجبِ عزّ و وقار ہو۔ اور قاضی محمد صادق اختر جیسے جیّد فاضل اور دربارِ لکھنؤ کے ملک الشعراء کے باب میں یہ ارشاد ہوتا ہے کہ قاضی ..... اختر عالم ہوں گے شاعری سے انھیں کیا علاقہ؟ (تحقیق کی روشنی میں صفحہ ۳۴۴) غالب کی تحریروں سے بہت سے اقتباسات پیش کیے جا سکتے ہیں جن میں انھوں نے لوگوں کی دل آزاری کی ہے تو کیا ان کی بنا پر ہم غالب کو ایک کینہ پرور اور حاسد کہنے لگیں گے۔ حالانکہ بقول ڈاکٹر صاحب "غالب چاہتے تھے کہ ہر شخص ان سے خوش رہے۔"

اس تمام بحث کے بعد ڈاکٹر صاحب نے "گلشنِ بے خار" کی تمہید کا یہ اقتباس نقل کیا ہے :-

"مطمحِ نظر از یں تصنیف فرو آوردن اشعارِ دل آراست نہ شمارِ اسامیٔ شعرا، از اں کہ سامعہ قریب بیستے بہ نظم نہ رسید عام تراز مہاہیل و معارف و احیاء و اموات نامش دریں سفینہ چوں ابیاتش درج نہ گردید ..... و بدیں علت اکثرے از مدعیان کاذب را دریں اوراق نہ بینی۔ جمل از عالی شان بہ فقیر نسبت نہ کنی و اگر کسے را با خیالاتِ شیریں و افکارِ نمکیں دریں مجادہ ذکر ست نیست پنداری بہ ما نہ رسیدہ و از مرد کین احباب و اعدا انشاء اللہ ...... دریں بیاض اثرے نہ یابی۔"

اور حسبِ ذیل تین اعتراض کیے ہیں :-

۱۔ "شیفتہ نے بہت سے مشاہیر اور اکابر اور مسلم الثبوت اساتذہ کو یکسر نظر انداز کر دیا۔"

جن مسلم الثبوت اساتذہ کی فہرست دی ہے ان میں سے چند یہ ہیں ۔ لالہ نول رائے وفا۔ برشتہ، شاگرد میر سجاد دہلوی۔ عرش پسر میر۔

۲۔ "شیفتہ نے بعض نامور شاعروں کا ذکر تو کیا ہے لیکن" ان کے کلام کے متعلق کسی قسم کی رائے کا اظہار نہیں کیا حالانکہ ایک نقاد کی حیثیت سے قدرتی طور پر ان سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ ان لوگوں کے متعلق کچھ نہ کچھ ضرور کہیں گے ۔"

۳۔ "انھوں نے اپنے مخصوص احباب کی تعریف دل کھول کر کی ہے ۔"

ہمارے نزدیک یہ تینوں اعتراضات بے جا ہیں ۔ اس لیے کہ شیفتہ نے کہیں یہ دعویٰ نہیں کیا کہ ان کا تذکرہ اردو کے تمام اساتذہ کے ذکر کا احاطہ کیے ہوئے ہے ۔ مذکورہ اقتباس میں واضح طور پر انھوں نے کہا ہے :۔

"اگر یکے را با خیالاتِ شیریں و افکارِ نمکیں درین عجالہ ذکرے نیست پنداری کہ بما نہ رسیدہ ۔"

لہٰذا یہ اعتراض کرنا بے معنی ہے کہ شیفتہ نے بعض شعرا کو نظر انداز کر دیا ہے ۔ یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ نول رائے وفا، برشتہ، حیا اور عرش وغیرہ کا شمار شادانی صاحب کے لفظوں میں واقعی مشاہیر، اکابر اور مسلم الثبوت اساتذہ میں ہوتا تھا ۔ یا شیفتہ پر اعتراض کرنے کے لیے شادانی صاحب نے ان تیسرے درجے کے شعرا کو "قد آور" بنانے کی کوشش کی ہے ۔

شادانی صاحب کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ شیفتہ نے بعض شاعروں کے کلام پر تنقیدی رائے نہیں دی ۔ شاید شادانی صاحب اس حقیقت کو نظر انداز کر گئے کہ تذکرہ نگاری میں بنیادی چیز انتخابِ کلام ہے ۔ اسی سے متعلقہ شاعر کی سخن دانی اور تذکرہ نگار کی سخن فہمی کا اندازہ کرنا چاہیے ۔ تذکرہ نگار کے لیے ضروری نہیں ہے کہ وہ واضح لفظوں میں تنقیدی رائے کا بھی اظہار کرے ۔ اس کے دیے ہوئے انتخابِ کلام سے بھی شاعر کے متعلق تذکرہ نگار کی رائے معلوم ہو جاتی ہے ۔ بشرطیکہ قاری یہ جانتا ہو کہ کسی شاعر کے کلام کا انتخاب کرنا بھی ایک تنقیدی عمل ہے ۔ مزید براں شیفتہ نے واضح لفظوں میں کہا ہے کہ اس کا اصل مقصد اچھے اشعار کو یکجا کرنا ہے نہ کہ شاعروں کے نام گنوانا۔

"مطمحِ نظر ازیں تصنیف فرو آوردن اشعار دل آراست نہ شمار اسامئ شعرا و ۔"

یہ جملہ شادانی صاحب کے پہلے اعتراض کی بھی تکذیب کرتا ہے جس میں انھوں نے یہ کہا ہے کہ شیفتہ نے کئی شاعروں کو نظر انداز کر دیا۔

شادانی صاحب کا تیسرا اعتراض یہ ہے کہ شیفتہ نے اپنے مخصوص احباب کی بڑی تعریف کی ہے ۔ زیرِ نظر کتاب کے صفحہ ۴۶ پر یہ اعتراض کر کے وہ لکھتے ہیں " (اس) کی تفصیل آیندہ پیش کی جائے گی" اس کے بعد صفحہ ۶۷ پر " تفصیل" دی ہے ۔ یعنی صرف ایک مثال پیش کی ہے کہ شیفتہ نے غلام علی خاں وحشت کی بڑی تعریف کی ہے ۔ وحشت شیفتہ کے دوست تھے ۔ شادانی صاحب کا کہنا ہے کہ وحشت اس تعریف کے مستحق نہ تھے ۔ نیز ان کے کلام کا جو طویل انتخاب دیا گیا ہے وہ بھی طرفداری بے جا کا آئینہ دار ہے ۔ صرف ایک مثال سے پورے تذکرے کے بارے میں کوئی رائے قائم کر لینا دانشمندی نہیں ہے ۔ شیفتہ ہی کیا، تمام تذکرہ نگاروں نے اپنے مخصوص احباب کا ذکر اچھے لفظوں میں کیا ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تذکرہ نگار عام طور پر شاعر سے ذاتی طور پر واقف نہیں ہو سکتے ۔ وہ بیشتر ایسے لوگوں کے بارے میں لکھتے ہیں جن کا ذکر انھوں نے پڑھا یا سنا ہے ۔ جب کہیں ایسے شاعروں کے بارے میں لکھنے کی نوبت آئے جنھیں وہ ذاتی طور پر جانتے ہیں تو وہ ان شاعروں کا ذکر تفصیل سے کرتے ہیں ۔ یہ تذکرہ نگاری کی ایک خصوصیت ہے اور اس سے کسی تذکرہ نگار نے انحراف نہیں کیا ۔ اگر شیفتہ نے بھی اس روش کی پیروی کی تو کیا گناہ کیا ! یہاں ایک دلچسپ امر کی طرف اشارہ کرنا نامناسب نہ ہوگا کہ اگر شیفتہ نول رائے وفا، برشتہ اور عرش جیسے شاعروں کو نظر انداز کر دیتے ہیں تو شادانی صاحب، انھیں مشاہیر اور مسلم الثبوت اساتذہ کے زمرے میں شامل کرتے ہیں اور اگر غلام علی خاں وحشت کی شیفتہ نے تعریف کی ہے تو شادانی صاحب اس کی تحقیر کرتے ہیں ۔ جب کہ وحشت کی تعریف شیفتہ ہی نے نہیں کی بلکہ دوسرے تذکرہ نگار بھی ان کے بارے میں اچھا خیال رکھتے ہیں ۔ چند آراء ملاحظہ ہوں:

"شعر ان کے خوب ہوتے ہیں ۔" (سخنِ شعرا، نساخ صفحہ ۵۱۲)

"پیشِ اربابِ سخن جہاں آباد' ارجمند ست"۔ (گلشن ہمیشہ بہار، نولشگی، صفحہ ۱۳۲)
"ایجادِ معانی او رابداعِ سخن اور جودتِ فکر میں بے نظیر ..... خوش فکری کو حدِ کمال تک پہنچایا"۔ (گلستانِ سخن، صابر، صفحہ ۵۴۸)
شیفتہ نے وحشت کے ۴۴ شعر انتخاب کئے ہیں۔ اس پر شادانی صاحب کو اعتراض ہے۔ حالانکہ شیفتہ نے بعض شاعروں کے اشعار اس سے بھی زیادہ دیے ہیں۔ اور وہ شعرا بھی وحشت کی طرح "کم معروف" ہیں۔ وحشت کا درجہ گھٹانے کے لیے شادانی صاحب نے وحشت کے چند اشعار بھی شیفتہ کے انتخاب سے نقل کیے ہیں۔ یہ اشعار نسبتہً کمزور ہیں۔ لیکن اچھے اشعار کو شادانی صاحب نے نظرانداز کر دیا ہے۔ آخر وحشت نے ایسے اشعار بھی کہے ہیں۔

گزرا اس اعتمادِ محبت سے میں خدا   مجھ سے چھپائیں کاش وہ الفت رقیب کو

دل ترا سنگ ہے پر آگ نہ نکلی گل سے   رُخ ترا آئینہ ہے پر کبھی حیراں نہ ہوا

جوشِ وحشت سے یہ حالت ہے کہ سایہ مجھ سے   یوں گریزاں ہے کہ سایے سے گریزاں میں ہوں

حالی سے زمانہ حال تک کے جن نقادوں اور محققوں نے شیفتہ کی سخن فہمی کی تعریف کی ہے۔ ان کے تقریباً تمام اقتباسات شادانی صاحب نے یک جا کر دیے ہیں۔ اور ان تعریفی کلمات کی تکذیب پر انھوں نے بڑی محنت کی ہے اور بتایا ہے کہ ان بزرگوں نے شیفتہ کا تذکرہ نہیں پڑھا۔ بلکہ مولانا حالی کی رائے کو بنیاد بنا کر چراغ سے چراغ جلایا ہے۔ لیکن ان بزرگوں نے اگر کوئی غلطی کی ہے تو اس کا شیفتہ سے کیا تعلق؟

شادانی صاحب کا یہ خیال بھی درست نہیں کہ حالی سے پہلے کسی نے شیفتہ کی سخن فہمی کی تعریف نہیں کی۔ مومن خاں مومن نے شیفتہ کے بارے میں کہا تھا:

یوں نکتہ شناس ہیں پر ایسا   کوئی نہیں قدر دانِ معنی

اس کو تو شادانی صاحب یہ کہہ کر نظر انداز کر سکتے ہیں کہ مومن شیفتہ کے استاد تھے۔ لہٰذا شاگرد کی تعریف خود اپنی تعریف کے مترادف ہے۔ لیکن مفتی صدر الدین آزردہ کے بارے میں کیا خیال ہے جنھوں نے پورے ساڑھے تین صفحے شیفتہ اور اُن کے تذکرے کی تعریف میں لکھے ہیں۔ اور پھر امام بخش صہبائی سے بھی یہی جرم سرزد ہوا ہے۔ ان سب لوگوں کی آرا "گلشن بے خار" کے آخر میں موجود ہیں۔ لیکن شادانی صاحب نے ان کا ذکر تک نہیں کیا۔

۱۔ گلستانِ سخن کا ذکر آیا ہے تو ایک لطیفہ بھی سن لیجیے۔ اس تذکرے کے بارے میں شادانی صاحب لکھتے ہیں:۔
"بہر صورت یہ امر قرینِ قیاس ہے کہ گلستانِ سخن مولانا صہبائی کی اصلاح سے مزین ہوا ہو۔" (صفحہ ۲۹)
اس عبارت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مذکورہ تذکرہ شادانی صاحب کی نظر سے نہیں گزرا۔ اگر وہ یہ تذکرہ دیکھتے تو اس کے سرورق کی یہ عبارت انھیں ضرور نظر آتی۔
"گلستانِ سخن از ..... مرزا قادر بخش بہادر صابر تخلص ..... کہ عبارتش بزیورِ اصلاح یکتائے عصر و یگانۂ دوراں ... مولوی امام بخش صہبائی آراستہ" [illegible] (ملاحظہ ہو تذکرہ ہذا مطبوعہ مطبع مرتضوی، صفحہ ۱۷)

صفحہ ۳۰ پر شادانی صاحب لکھتے ہیں کہ شیفتہ نے "اساتذہ، متقدمین و معاصرین کا ذکر اسی طرح کیا ہے جو اس زمانے میں اور اس سے پہلے اکثر تذکرہ نویسوں کا معمول تھا۔ یعنی عبارت آرائی اور قافیہ پیمائی، جس سے نہ شاعر زیرِ بحث کی انفرادی خصوصیات کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ نہ دوسرے کے مقابلے میں اس کے مرتبے کا تعین کیا جا سکتا ہے، بلکہ ایک کی تعریف اگر دوسرے کے ساتھ چسپاں کر دی جائے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ کیونکہ اگر شاعر کا نام اور دوسرے حوالے حذف کر دیے جائیں تو ان عبارتوں کو پڑھ کر کوئی شخص یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کس کے متعلق ہیں"

شادانی صاحب تذکرہ نگار سے ان تنقیدی اصولوں کی توقع رکھتے ہیں، جو آج ہمارے سامنے ہیں۔ تذکرہ نگاروں نے ہمیشہ اجمالی طور پر شاعروں کی خصوصیات کی طرف اشارے کیے ہیں۔ تفصیلی تجزیہ کسی تذکرہ نگار نے نہیں کیا۔ کیونکہ یہ تنقیدی اندازِ نظر بہت بعد کا ہے۔ یہ بالکل ویسی ہی بات ہے جیسے ہم یہ کہیں کہ قطب قلی شاہ نے تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی تھی۔ لیکن آزاد نظم ایک بھی نہیں لکھی ظاہر ہے کہ یہ اعتراض معترض کی کم علمی اور کم نظری کا آئینہ دار ہوگا۔ اس سے قطب قلی شاہ کی ذات متاثر نہ ہوگی۔ یہی معاملہ یہاں بھی ہے تذکرہ نگار سے کسی تفصیلی تنقیدی تجزیہ کی توقع بے جا ہے۔

رہی یہ بات کہ شیفتہ نے ایسی آرا دی ہیں کہ جو عمومیت کی حامل ہیں۔ اور وہ کسی بھی شاعر پر چسپاں ہو سکتی ہیں۔ تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ اول تو شیفتہ کی تمام آرا کے بارے میں یہ خیال ظاہر کرنا بڑی زیادتی کی بات ہے۔ دوسرے اگر اس کو صحیح بھی مان لیا جائے تو یہ کوئی اعتراض کی بات نہیں۔ اس لیے کہ یہ شیفتہ کا نہیں فنِ تذکرہ نگاری کا عیب ہے۔ ویسے یہ بات تو آج کل کے نقادوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ خود شادانی صاحب کی کتاب میں ایسی ہی تنقیدی آرا بکثرت موجود ہیں۔ مثلاً "وہ ایک طرزِ خاص کے مالک ہیں۔ اور ان کی شاعرانہ عظمت کو ہر دور میں تسلیم کیا گیا ہے۔" (صفحہ ۶۹) ـ "(ذکی شاعری) میں سوز بھی ہے اور شوخی بھی اور محبت کی نفسیات کے سادہ جذبات کی ترجمانی اور واقعات کی مصوری بھی۔" (صفحہ ۱۳۲)

یہ آرا ایسی ہیں کہ کسی بھی شاعر پر چسپاں کی جا سکتی ہیں۔

شادانی صاحب کا کہنا ہے کہ شیفتہ نے اپنے پیش رو تذکرہ نگاروں کی آرا کو دہرایا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے چند مثالیں بھی دی ہیں۔ ان کا تجزیہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا:۔

۱۔ "آشفتہ کے بارے میں "تذکرہ ہندی" میں مصحفی نے لکھا ہے کہ "شعر درد مندانہ کہ شستہ و صاف باشد دوست دارد"۔

شیفتہ نے آشفتہ کی شاعری پر یوں اظہارِ خیال کیا ہے: "شعرش شستہ و صاف و فکرش مطبوعِ اہلِ انصاف"۔

شادانی صاحب نے دونوں اقتباسات درج کر کے یہ نتیجہ نکالا ہے۔ "آپ نے دیکھا کہ شیفتہ نے مصحفی کے صرف ایک فقرے کو دُہرا دیا۔ اور بس"۔ شادانی صاحب تو فارسی کے اُستاد ہیں۔ لیکن معمولی فارسی جاننے والا بھی مصحفی اور شیفتہ کی آرا کا یہ اختلاف محسوس کرے گا کہ مصحفی نے آشفتہ کی پسندیدگی کا ذکر کیا ہے۔ اور شیفتہ نے اہلِ انصاف کی پسند کا۔

۲۔ بقا کے بارے میں شیفتہ نے لکھا ہے "خاطر ظرافت پسند داشت بل از ظرافت گزشتہ سر بہ ہجا کشیدہ در مراتبِ نظم طبعے شگفتہ و رنگین و طرزے بامزہ و شیریں داشت"

شادانی صاحب نے بقا کے بارے میں میر حسن، لطف، مصحفی، یکتا اور قاسم کی آرا بھی دی ہیں اور لکھا ہے کہ "یہاں بھی شیفتہ نے دوسروں کی کہی ہوئی صرف بعض باتوں کو اپنے الفاظ میں دُہرا دیا ہے اور بقا کی کئی اہم خصوصیتیں جو دوسروں نے بیان کی ہیں ان سے چھوٹ گئیں"

مندرجہ بالا پانچ تذکرہ نگاروں میں سے صرف ایک (مصحفی) نے بقا کی ہجو گوئی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہ خصوصیت ایسی ہے بقا کا ذکر اس کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا۔ لہٰذا اس امر کو مصحفی کی تقلید نہیں بیانِ حقیقت کہنا چاہیے۔ شادانی صاحب ایک طرف تو شیفتہ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ وہ اپنے پیش رَووں کی باتوں کو دُہرا دیتا ہے۔ اور دوسری طرف یہ اعتراض بھی کرتے ہیں کہ وہ اپنے پیش رَووں ، باتوں کو دہراتا نہیں نظر انداز کر دیتا ہے۔ گویا بیچارے شیفتہ کے لیے نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن والا معاملہ ہے۔ شادانی صاحب تے ہیں کہ "بقا کی کئی اہم خصوصیتیں جو دوسروں نے بیان کی ہیں ان سے چھوٹ گئیں۔ یہ اہم خصوصیتیں کیا ہیں وہ بھی ملاحظہ کر لیجیے :-

(۱) "نکتہ سنج و باریک بیں معنی بند و سخن آفریں" (لطف)

(۲) ۔" بہ قوتِ صفائی و فصاحتِ الفاظ حضیض ریختہ را بہ اوجِ فارسی رساند و بتوانائی بلاغت و متانت کلامِ او ہندی را بہ اشہبِ عربی دواندہ" (یکتا)

اگر شیفتہ بقا کو یہ بلند مرتبہ نہیں دیتے تو یہ اُن کی ناقدانہ بصیرت کا اظہار ہے۔ شادانی صاحب بقا کا کلام خود ملاحظہ مائیں تو انھیں وہ خصوصیات بالکل نظر نہیں آئیں گی جو لطف اور یکتا نے بیان کی ہیں۔ اس مثال سے شادانی صاحب کا یہ دعویٰ بھی طل ہو جاتا ہے کہ شیفتہ اپنے پیش رَووں کی باتوں کو دُہراتے ہیں۔ شیفتہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ وہ کسی شاعر کے بارے ں آنکھیں بند کر کے رائے قائم نہیں کرتے۔ اور اگر اُن کے پیش رَو کسی شاعر کی مبالغہ آمیز تعریف کرتے ہیں تو اُسے نظر انداز کر دیتے ہیں۔

(۳) حاتم کے بارے میں تقریباً سبھی تذکرہ نگاروں نے ان کے قدیم و جدید طرزِ سخن کی طرف اشارہ کیا ہے۔ شیفتہ نے بھی اس قیقت کو بیان کیا ہے۔ شادانی صاحب شیفتہ کے اس بیان کو بھی دوسروں کی تقلید کا نتیجہ بتاتے ہیں۔ حالانکہ حاتم کا کلام جس نے ی دیکھا ہے وہ اس خصوصیت کو فوراً سمجھ سکتا ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس تک پہنچنے کے لیے شیفتہ کو دوسرے تذکرہ نگاروں محتاج ہونے کی ضرورت نہیں۔

(۴) اسی طرح شادانی صاحب نے حسرت، درد، فراق، مصحفی اور جوشش کے بارے میں شیفتہ کی آرا کو دوسروں کی صدائے بازگشت لا دیا ہے حالانکہ وہ سب بیانات ایسے ہیں جن تک شیفتہ ذاتی مطالعہ سے بآسانی پہنچ سکتے تھے۔ مثلاً درد کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے۔

"گفتارش از رکاکت و اغلاط پاک و دیوانش از اشعار پُر کن خالی است"

یا یہ بات ایسی ہے کہ شیفتہ کو صرف دوسرے تذکرہ نگاروں ہی سے معلوم ہوئی ہوگی۔ اور وہ درد کے کلام کے مطالعے سے اس نتیجے پر پہنچے ہوں گے؟ شادانی صاحب کو اس سلسلے میں شاید ہی کوئی ہم خیال مل سکے۔

اس کے بعد شادانی صاحب نے ایسی ناقدانہ رایوں کا تجزیہ کیا ہے جو شیفتہ سے مخصوص ہیں۔ شادانی صاحب کے نزدیک شیفتہ تنقیدی آرا درست نہیں ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ ذرا ان پر بھی نظر ڈال لیجیے۔ وہ لکھتے ہیں:-

۱۔ "شیفتہ نے سودا کے بارے میں لکھا ہے۔" و آن کہ بین الانام شہرت پذیر است کہ قصیدہ اش بہ از غزل است حرفیست مہمل بزعم فقیر غزلش بہ از قصیدہ و قصیدہ اش بہ منزلہ غزل است"

یعنی شیفتہ کا یہ کہنا ہے کہ سودا کے قصیدے کو جو عام طور پر اس کی غزلوں سے بہتر کہا جاتا ہے تو وہ درست نہیں۔ وہ جتنا بڑا قصیدہ نگار ہے اتنا ہی بڑا غزل گو بھی ہے۔ شادانی صاحب اس پر یوں تنقید فرماتے ہیں:-

"قصیدے میں سودا کا ہم پایہ کوئی نہیں۔ اب اگر سودا کی غزل کو بھی ان کے قصیدے کے ہم پلہ مان لیا جائے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ غزل میں بھی ان کا مرتبہ سب سے بلند ہے۔ اور یہ امر حقیقت کے سراسر خلاف ہے"

اسے کہتے ہیں شعرم را کہ بمدرسہ رفت، شیفتہ بے چارا تو صرف یہ کہنے کا گنہگار ہے کہ سودا بڑا قصیدہ نگار ہی نہیں بڑا غزل گو بھی ہے اور یہ بات خوبصورت انداز سے یوں کہی "غزلش بہ از قصیدہ و قصیدہ اش بہ از غزل ہست" فارسی ادبیات کے استاد نے اس سادہ سے فارسی جملے سے یہ نتیجہ نکالا کہ شیفتہ سودا کو سب سے بڑا غزل گو سمجھتے تھے۔ لہٰذا ان (شیفتہ) کی رائے سے کوئی اتفاق نہیں کر سکتا۔ شیفتہ کے بیان سے یہ نتیجہ نکالنا کہ سودا سب سے بڑے غزل گو ہیں شادانی صاحب کی اپنی اختراع ہے۔ شیفتہ نے ایسی کوئی بات نہیں کہی۔

(۲) شیفتہ نے سوز کے بارے میں لکھا ہے: "کلامش از جادۂ مستقیمہ برکران است"

شادانی صاحب کا کہنا ہے کہ شیفتہ کی یہ رائے غلط ہے اسلئے کہ "تذکرہ شعرائے اُردو (میر حسن)، گلشن ہند، دستور الفصاحت تذکرہ مبتلا، تاریخ فرخ آباد اور مجموعۂ نغز میں سوز کی بہت تعریف کی گئی ہے۔ گویا شادانی صاحب کو اصرار ہے کہ شیفتہ صرف وہی بات لکھیں جو دوسرے تذکرہ نگاروں نے کہی ہے۔ (تاکہ شادانی صاحب شیفتہ پر دوسروں کی باتوں کو اپنے لفظوں میں بیان کرنے کا اعتراض کریں)۔ بات دراصل یہ ہے کہ شیفتہ کی نظر سے سوز کا تمام کلام گزرا ہوگا، جن لوگوں نے سوز کا کلام پڑھا ہے، وہ یقیناً شیفتہ کے ہم خیال ہوں گے۔ شادانی صاحب ذاتی تجربے کی روشنی میں کوئی بات کرتے تو وہ قابلِ توجہ ہوتی۔ لیکن شاید انھوں نے مختلف رسمی انتخابات میں مشمولہ کلام کے سوا سوز کی کوئی چیز نہیں پڑھی۔ اسی لیے انھوں نے دوسروں کا سہارا لے کر شیفتہ کے بیان کی تردید کی ہے۔

(۳)۔ یہی معاملہ جرأت کے ساتھ بھی ہے۔ شیفتہ نے جرأت کو نہیں سراہا۔ شادانی صاحب خفا ہیں۔ اس لیے کہ میر حسن مصحفی اور لطف وغیرہ نے جرأت کو سراہا ہے۔ لہٰذا شیفتہ کو بھی یہی کچھ کرنا چاہیئے تھا۔

(۴) شیفتہ نے انشا کے بارے میں لکھا ہے "ہیچ صنف را بہ طریقۂ راسخہ شعرا نہ گفتہ"

شادانی صاحب کہتے ہیں اس جملہ کو "شیفتہ کا ایک زبردست انتقادی کارنامہ سمجھا جاتا ہے حالانکہ بات کچھ بھی نہیں" اور آگے چل کر شادانی صاحب کہتے ہیں کہ یہی بات مصحفی نے بھی ان ہی لفظوں میں کہی تھی۔ "اگرچہ ہمہ کلامش در عالمِ ظرافت خالی از کیفیتے نیست" اب شادانی صاحب کو کون بتائے کہ مصحفی اور شیفتہ کے بیانات میں بڑا فرق ہے۔ شیفتہ نے انشا کے پورے شاعرانہ مزاج کو واضح کیا ہے۔ اور مصحفی نے صرف ایک خصوصیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

(۵) نظیر اکبر آبادی کے متعلق شادانی صاحب نے شیفتہ کی مندرجہ ذیل رائے درج کی ہے۔

"اشعار بسیار دارد کہ بہ زبان سوقییں جاری ست و نظر بہ آں ابیات در اعداد شعرا نشایدش شمرد"

شیفتہ کی اس رائے کو شادانی صاحب ہی نے نہیں بلکہ دیگر نقادوں نے بھی غلط قرار دیا ہے۔ اور یہ سمجھا ہے کہ شیفتہ نظیر کو شاعر نہیں سمجھتے تھے۔ حالانکہ شیفتہ نے صرف اس قدر کہا ہے کہ نظیر کے جو اشعار بازاری لوگوں کی زبان پر ہیں محض ان کی بنا پر انہیں شاعر نہیں سمجھنا چاہیے، اور اُس کے پورے کلام کو نظر میں رکھنا چاہیے۔ اگر شیفتہ کا یہ خیال نہ ہوتا تو وہ ہرگز نظیر کے ایسے عمدہ اشعار درج نہ کرتے:۔

میں دست گریباں ہوں دم بازپسیں سے ۔۔۔ ہمدم اُسے لانا ہے تو لا جلد کہیں سے

سبھوں کو مے ہیں خوں ناب دل پلانا تھا ۔۔۔ فلک ہمیں یہ تجھے کیا یہ زہر کھانا تھا

اس مضمون کے آخر میں شادانی صاحب نے بتایا ہے کہ چونکہ کسی تذکرہ نگار نے شیفتہ کو سخن فہم نہیں کہا۔ اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے کہ تذکرہ نگار سخن فہمی کی صفت کو قابلِ ذکر نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ تذکرہ نگاروں نے بعض شعرا کی سخن فہمی کی خاص طور پر صراحت کی ہے۔ ایسے شاعروں کے نام بھی سن لیجیے۔ کرم اللہ خاں دَرد۔ جعفر علی خاں عمدہ، نجم الدین سلام، میر سجاد، سید جمال گل، ابراہیم بیگ مقتول، محمد نصیر رنج۔ شادانی صاحب کی منطق یہ ہے کہ مذکورہ شعرا کی سخن فہمی مستند ہے۔ کیونکہ تذکرہ نگاروں نے انھیں سخن فہم قرار دیا ہے۔ اس کے برعکس شیفتہ کو کسی تذکرہ نگار نے سخن فہم نہیں کہا لہٰذا انھیں سخن فہم نہیں ماننا چاہیے۔ میں عرض کروں گا کہ ایک شیفتہ ہی کیا میں سیکڑوں ایسے شاعروں کی فہرست پیش کر سکتا ہوں جن کے بارے میں کسی تذکرہ نگار نے سخن فہم ہونے کی صراحت نہیں کی، تو کیا ایسی حالت میں وہ تمام شعرا سخن فہمی کی صفت سے عاری سمجھے جائیں گے؟ اس ضمن میں شادانی صاحب اگر شیفتہ کے کلام کی طرف توجہ کرتے تو انھیں بہت سے ایسے شعر نظر آجاتے جن میں شیفتہ نے اچھی اور بُری شاعری کا فرق بتایا ہے اور ایسے اشعار ہی سے شیفتہ کی سخن گوئی کے ساتھ ساتھ سخن فہمی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

کسی بات پر رائے دیتے وقت اس کی جزئیات سے کل کا اندازہ نہیں کیا جاتا۔ بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ خوبیوں اور خامیوں میں کس کا پلّہ بھاری ہے۔ اگر شادانی صاحب کے تمام اعتراضات درست بھی تسلیم کر لیے جائیں تو یہ جاننا ضروری ہوگا کہ "گلشنِ بے خار" میں اِن خامیوں کے علاوہ بھی کچھ ہے کہ نہیں۔ اگر اس تذکرے میں ایسی خوبیاں نظر آتی ہیں جو خامیوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہیں تو ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ تذکرہ اپنی خامیوں کے باوجود قابلِ قدر ہے۔ شادانی صاحب نے عمداً اس تذکرے کے روشن پہلوؤں سے بحث نہیں کی۔ اور اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ وہ اگر اس طرف توجہ کرتے تو ان کے دلائل میں وزن نہ رہتا۔

ملہ اس موقع پر ایک لطیفہ یاد آگیا۔ شادانی صاحب نے اسی کتاب کے صفحہ ۵۷۴ پر غالب کا یہ شعر درج کیا ہے۔

آئے ہے بے کسیِ عشق پہ رونا غالب ‏ ‏ ‏ ‏ کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد

اور یہ رائے دی ہے کہ اس شعر کا مضمون خیالی اور تاثیر سے خالی ہے۔

• "میرا مطالعہ" کے خاص موضوع پر دانشور اہلِ قلم کی خود نوشت ذہنی داستانیں!

حسین سرورق کئی رنگوں میں • کتابت وطباعت نظر افروز • ضخامت ۲۰۰ سے زائد صفحات قیمت ۲/-

سیارہ — ادب میں ملت پاکستان کی ترجمان

چند اہم کتابیں

تاریخ اسلام۔ عرب فنِ تاریخ کے موجد سمجھے جاتے ہیں لیکن یہ بھی ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ عربوں کی تاریخی اساس روایات پر رکھی ہوئی ہے جو مشرق و مغرب کا اختلاف ہے اسی لیے سید امیر علی نے جب History of Saracens لکھنا شروع کی تو مستشرقین کے ساتھ ساتھ یورپ کے مورخین کی رایوں کو بھی نظر انداز کیا۔ اور ہزاروں صفحات پر پھیلے ہوئے واقعات کو پانچ چھ سو صفحات میں سمیٹ دیا۔ تاریخ دانوں کا اتفاق ہے۔ کہ اسلام کی مختصر تاریخ اب تک اس سے اچھی لکھی گئی جو زاویۂ نگاہ کے اعتبار سے کسی مکتبۂ خیال کی پابند نہیں۔ بہرصورت ایک غیر جانبدارانہ تحقیق ہے۔ اس تاریخ کے کئی ترجمے اس سے قبل شائع ہو لیکن وہ سب ناپید ہیں۔ زیرِ نظر ترجمہ رشیق محمود آبادی نے ایک نئی ترتیب کے ساتھ پیش کیا ہے جس سے واقعات کو سمجھنا آسان ہو گیا ہے۔ قیمت نو روپے

مقدمات عبدالحق۔ بابائے اردو کی خدمتِ ادب کا روشن پہلو کسی کی نظر میں کچھ بھی ہو لیکن مرزا محمد بیگ کا کہنا ہے کہ دوسروں کے کام کو اجاگر کرنا اردو کا کارنامہ ہے؛ اور ڈاکٹر عبادت بریلوی کا قول ہے کہ بابائے اردو کی صحیح شخصیت دوسروں کی شخصیتیں ابھارنے میں ہی نمایاں ہوتی ہے۔ اور ان کا یہ احسان سے فائدہ فنکاروں پر ہے۔ جن کی قلمکاری کے جوہر مقدمات عبدالحق سے روشنی میں آئے۔ یہ مقدمات عرصہ ہوا دکن میں شائع ہوئے تھے جن کو بابائے اردو کی ترمیم و اضافہ کے بعد ڈاکٹر عبادت بریلوی نے از سرِ نو ترتیب دیا ہے اور یہ بیش قیمت مجموعہ اس دمکتے ہوئے آفتاب کے مترادف ہے جو اپنے دامن میں ان گنت ستاروں کی روشنی لیے ہے اور اپنی چمک سے ستاروں کی روشنی کم کرنے کے بجائے بڑھا رہا ہے۔ علمی ہمہ گیری اور ادبی جامعیت کی ایک عظیم تالیف اور اردو ادب کا ایک شاہکار

قیمت مجلد ۱۷ روپے۔ پیپر بیک ۵۰-۱۲ روپے

مسدس حالی۔ حالی افقِ مشرق کے ادبی آفتاب کی ایسی کرن تھے جس نے اردو نظم و نثر دونوں کو جگمگا دیا۔ ڈاکٹر بجنوری "دیوانِ غالب" کو "وید" کے بعد ہندوستان کی دوسری الہامی کتاب کہتے ہیں۔ لیکن غالب کے اس شاگرد رشید نے مسدس لکھ کر بتا دیا کہ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔ مسدس کا صدی ایڈیشن صحت کے التزام کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔

قیمت دو روپے پچیس پیسے

ہماری داستانیں۔ کون ہے جو سید وقار عظیم کے نام سے واقف نہیں۔ کسی نے اگر ان کے نقادانہ کمالات کا جائزہ نہیں لیا ہے تب بھی ان کی کوئی نہ کوئی تحریر ضرور دیکھی ہوگی۔ سید وقار عظیم نے یوں تو مختلف شعبہ ہائے ادب پر قلم اٹھایا ہے لیکن افسانوی ادب ان کا خاص موضوع ہے۔ اس سلسلے میں کتنی ہی تصانیف شائع ہو چکی ہیں اور ہماری داستانیں ان کی ایک عظیم کڑی ہے۔ جو نہ صرف مصنف کے وقار کی شایانِ شان ہے بلکہ اردو ادب کی ایک گرانقدر تصنیف ہے اس کتاب کو داستان گوئی اور داستان نویسی کی تاریخ کا درجہ حاصل ہے۔ جس میں تنقید کے معیارِ فن پر ہر فن کار کی صحیح جگہ متعین نظر آتی ہے۔ نقاد کے قلم کو بے لاگ ہونا چاہیے۔ اس کا ثبوت وقار عظیم کی ہر تحریر دیتی ہے مگر اس کتاب میں تو انہوں نے انصاف پسندی اور معتدل نقد و نظر کی ایک نظیر قائم کر دی ہے۔ اردو کی داستانیں ہمیشہ جس کی منت کش رہیں گی۔ فنِ داستان گوئی و داستان نگاری کی یہ بیش قیمت دستاویز مصنف کی نظرِ ثانی کے بعد بارِ دگر شائع کی گئی ہے اور حسنِ کتابت و طباعت کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔

قیمت دس روپے۔

مختصر تاریخ ادب اردو۔ اردو ادب کی تاریخ، ہندوستان کی تمدنی اور انقلابی تاریخ کے ساتھ چلتی ہے۔ جس پر ملک کے اکثر اہلِ قلم نے قلم اٹھایا ہے۔ اور اردو میں کئی مکمل اور جامع تاریخیں موجود ہیں۔ لیکن ڈاکٹر اعجاز حسین نے جس اختصار کے ساتھ یہ تاریخ مرتب کی ہے وہ اپنی افادیت کے لحاظ سے طلبا اور اہلِ ذوق دونوں کے لیے یکساں طور پر اہم ہے اور اسی لیے اساتذۂ کرام اس کے مطالعے کی سفارش کرتے ہیں۔ چند سو صفحات میں سمائی ہوئی زبانِ اردو کی سرگذشت میں تقسیم کے بعد کا دور بھی شامل کر دیا گیا ہے اور حال و ماضی کا یہ آئینہ ضروری صحت کے بعد بارِ دگر پیش کیا جا رہا ہے۔

قیمت صرف پانچ روپے۔

اردو اکیڈمی سندھ ——— کراچی ——— لاہور ——— حیدرآباد